جمہوریت ہمارے خون میں ہے، ہمارے رگ و ریشہ میں پیوست ہے۔ صدیوں کے نامواقف حالات نے اِس خون کی گردش کو سست کر دیا تھا۔ یہ منجمد ہو گیا تھا اور آپ کی شریانیں کام نہیں کر رہی تھیں۔ مگر خدا کا شکر ہے کہ خون کی گردش دوبارہ شروع ہو گئی ہے۔

قائداعظم

ماہنامہ

قومی زبان

کراچی

جنوری ۱۹۹۰
جلد : ۶۲
شمارہ : ۱

مضمون نما

سرورق :۔ ایس فرزانہ

بدلِ اشتراک
فی پرچہ ...... ۵ روپے
سالانہ ...... ۵۰ روپے
سالانہ رجسٹری سے ۱۰۰ روپے

بیرونِ ملک
فی پرچہ ...... ایک ڈالر
سالانہ ...... دس ڈالر
سالانہ رجسٹری سے پندرہ ڈالر

انجمن ترقی اردو پاکستان
بابائے اردو روڈ، کراچی ۱، فون: ۲۲۰۲۳۴

حبیب بینک کی ایک اور خدمت
حبیب بینک ویزا ٹریولرز چیکس
دنیا کا سفر، بے خوف و خطر
Habib Bank Limited
TWENTY U.S. DOLLARS
Habib Bank Limited
SPECIMEN
$20
VISA
SPECIMEN

نورالحسن جعفری

عرضِ حال

[۷ نومبر ۱۹۸۹ء کو لاہور میں بابائے اردو مولوی عبدالحق کی یاد میں ایک بڑا جلسہ ہوا تھا۔
صدرِ انجمن جناب نورالحسن جعفری نے اس اجلاس میں جو صدارتی خطبہ پیش کیا تھا
اسے ہم اداریے کے طور پر شائع کر رہے ہیں]

اہلِ علم و دانش کے اس مجمع میں میری صدارت انجمن کے واسطے سے ہے اور یہ میرے لیے زندگی کا سب سے بڑا
عزاز ہے۔ مجھے بڑی خوشی ہے کہ خادمِ اردو کی حیثیت سے مجھے آپ کے درمیان حاضر ہونے کا موقع ملا۔ یہ شہر داتا کی
نگری ہے اور اس سے میری وابستگی بہت پرانی ہے۔ زندگی کا ایک طویل عرصہ اسی شہر کے سایۂ عاطفت میں گزرا
ہے۔ یہ شہر مجھے بے حد عزیز ہے۔ اگرچہ کراچی آبادی کے اعتبار سے ملک کا سب سے بڑا شہر ہے تاہم علمی، ثقافتی
ر ادبی مرکزیت لاہور ہی کو حاصل ہے۔ یہ شہر علم و ادب کا گہوارہ ہے۔ تہذیب و ثقافت کا مرکز اور ارباب دانش
پناہ گاہ ہے۔ یہی وہ شہر ہے جہاں محمد حسین آزاد نے اپنی زندگی کا بڑا حصہ گزارا اور اردو ادب کو مالا مال کیا۔
سید احمد خاں اور مولوی نذیر احمد کے لیکچروں کی گونج اسی شہر میں سنائی دی۔ مولانا حالی نے قومی نظمیں اسی
شہر میں پڑھیں۔ یہ حکیم الامت کا شہر ہے۔ مولانا صلاح الدین احمد، ڈاکٹر سید عبداللہ اور فیض احمد فیض کا شہر
جو سب یہیں آسودۂ خواب ہیں۔ ان سب حضرات نے قومی زبان کی جو خدمات انجام دی ہیں وہ ہماری تاریخ کا
ہیں۔ شاعرِ مشرق علامہ اقبال کے فکر و فن کو اسی شہر نے پروان چڑھایا ہے۔ آج بھی اس کو اوّلیت حاصل ہے۔
ہ درس و تدریس کا عمل ہو یا طباعت کا۔ اس شہر سے جو رسائل اور کتابیں شائع ہوتی ہیں ان سے اردو زبان و
ب کی وسعت اور ترقی کا اندازہ ہوتا ہے۔ ہمارے ملک میں جو کچھ لکھا جاتا ہے اس کا بڑا حصہ اسی شہر سے تعلق
تا ہے۔

خواتین و حضرات۔ زندہ دلوں اور ژرف نگاہوں کے اس شہر میں انجمن ترقی اردو پاکستان اور

اس کے موجودہ پروگراموں کے بارے میں کچھ عرض کرنا چاہتا ہوں۔ یہ بات غالباً آپ کے علم میں ہوگی کہ انجمن ترقی اردو پاکستان، ملک کا قدیم ترین علمی اور ادبی ادارہ ہے جس نے ۱۹۰۳ء سے اب تک اپنی چھیاسی سالہ عمر میں زبان و ادب کی بیش بہا خدمات انجام دیں۔ بڑے بڑے نامور عالم، انشا پرداز اور رہنما انجمن سے وابستہ رہ چکے ہیں۔ پاکستان میں انجمن کے پہلے صدر بزرگ ادیب، انشا پرداز اور ادیب گر، سر شیخ عبدالقادر تھے جن کے نام اور کاموں سے ایک زمانہ واقف ہے۔ بابائے اردو مولوی عبدالحق نے انجمن کی جس طرح خدمت کی اور اسے ایک نہایت فعال اور منظم ادارہ بنانے میں جو کوششیں کیں وہ ہماری علمی اور قومی تاریخ کا حصہ ہیں۔ مولوی صاحب نے اپنی زندگی کا بڑا حصہ انجمن کی نذر کیا۔ ان کی وابستگی اتنی گہری تھی کہ انجمن ترقی اردو اور مولوی صاحب دونوں کا مفہوم ایک ہی ہو گیا تھا۔ مولوی صاحب روشن خیال اور دور بین عالم تھے۔ انھیں آنے والے دور کا علم اور تعلیمی ضرورتوں کا احساس تھا۔ اس لیے انھوں نے انجمن کے توسط اور وابستگی سے ایسے علمی اور تعلیمی کاموں کی طرف توجہ کی جن کی افادیت ہم آج پوری طرح محسوس کر رہے ہیں۔ مولوی صاحب نے قیام پاکستان کے فوراً بعد علمی اصطلاحات کے تراجم کی راہ ہموار کر کے تدریسی ضروریات کے لیے سہولت فراہم کی۔ ہم بھی مولوی صاحب کی پیروی میں اس اصول پر عمل کر رہے ہیں۔ انجمن جلد ہی بینکاری اصطلاحات کی ایک فرہنگ شائع کر رہی ہے جو تقریباً دس ہزار اصطلاحات کے ترجموں پر مشتمل ہے۔ بنکاری کی ان اصطلاحات میں تجارت، صنعت و حرفت اور دوسرے متعلقہ مضامین کی اصطلاحیں بھی شامل کر لی گئی ہیں۔ میری دانست میں یہ ایک بڑا علمی کام ہے جس کو ہم نے نہایت مستعدی اور تندہی سے انجام دیا ہے۔ یہ فرہنگ ان دنوں کمپوزنگ کے مرحلے میں ہے اور مجھے امید ہے کہ ہم اسے رواں مالی سال ختم ہونے تک شائع کر دیں گے۔

۱۹۳۷ء میں انجمن نے اسٹینڈرڈ انگریزی اردو ڈکشنری شائع کی تھی۔ اس کے بعد یہ ڈکشنری متعدد بار شائع ہوئی اور اس میں دو ضمیموں کا اضافہ بھی کیا گیا ہے، لیکن آپ جانتے ہیں کہ ہمارے موجودہ دور میں نئے نئے الفاظ اور اصطلاحیں بڑی تیزی سے وضع ہو رہی ہیں اور زبان کا حصہ بنتی جا رہی ہیں۔ علم و فنون کے فروغ سے زبان میں وسعت پیدا ہو رہی ہے۔ نئے نئے الفاظ وجود میں آ رہے ہیں چنانچہ اس صورت حال کو مدنظر رکھتے ہوئے ہم نے یہ فیصلہ کیا ہے کہ اسٹینڈرڈ انگریزی اردو ڈکشنری میں پندرہ ہزار الفاظ کا اضافہ کیا جائے۔ دس ہزار الفاظ آکسفورڈ ڈکشنری سے منتخب کیے گئے ہیں اور چونکہ انگریزی زبان میں امریکی اثرات کا بے حد اضافہ ہوا ہے جن سے واقفیت ہمارے لیے ضروری ہے، اس لیے پانچ ہزار الفاظ ویبسٹر سے منتخب کیے گئے۔ ان نئے پندرہ ہزار الفاظ کی معنی نویسی مکمل ہو چکی ہے اور نظر ثانی کا عمل شروع ہوا ہے۔ مجھے توقع ہے کہ جلد ہی یہ کام بھی مکمل ہو جائے گا اور اسٹینڈرڈ انگریزی اردو ڈکشنری پندرہ ہزار نئے الفاظ کے اضافے کے ساتھ شائع ہو سکے گی۔ اسٹینڈرڈ انگریزی اردو ڈکشنری اس وقت انگریزی اور اردو کی سب سے اہم اور مبسوط لغت ہے۔ یہ ڈکشنری پاکستان اور ہندستان کے علاوہ برطانیہ، یورپ اور ریاست ہائے متحدہ امریکہ میں بھی استعمال ہو رہی ہے اور اسے مستند حیثیت حاصل ہے۔ ڈکشنری ہی کے سلسلے میں یہ بات بھی عرض کرنا ضروری ہے کہ انجمن نے مترادفات و متضادات کی بھی ایک لغت مرتب کرنے کا منصوبہ بنایا ہے

جس پر عمل ہو رہا ہے۔ یہ منصوبہ تقریباً مکمل ہو چکا ہے۔ مترادفات و متضادات کی یہ لغت تقریباً بیس ہزار الفاظ پر مشتمل ہے۔ طالب علموں، عام علمی کام کرنے والوں اور زبان و ادب سے تعلق رکھنے والوں کے لیے یہ لغت بڑی مفید ثابت ہوگی۔

انجمن ہر سال تحقیقی اور تنقیدی کتابیں شائع کرتی ہے۔ انجمن کا اشاعتی پروگرام نہ نفع نہ نقصان کی بنیاد پر چلایا جاتا ہے اس وجہ سے ہماری کتابوں کی قیمتیں بہت کم ہوتی ہیں۔ ہماری کوشش ہے کہ اردو زبان و ادب سے متعلق جو تحقیقی مقالے برصغیر کی جامعات میں لکھے جاتے ہیں انھیں شائع کریں، یہ انجمن کی قدیم روایت ہے۔ شیخ چاند کی "سودا" سے لے کر ڈاکٹر صابر جلبسری کی "احسن مارہروی" تک ہم نے بے شمار تحقیقی مقالے شائع کیے ہیں جن سے تحقیق کرنے والے طالب علم اور عام قارئین نے پورا پورا فائدہ اٹھایا ہے۔ انجمن کا اشاعتی پروگرام اگرچہ لمبا چوڑا نہیں تاہم اپنی بساط کے مطابق ہر سال کچھ ایسی کتابیں ضرور شائع کرتے ہیں جن سے اردو زبان و ادب کے فروغ اور ترقی میں مدد ملتی ہے۔

انجمن "قومی زبان" اور "اردو" دو رسالے بھی شائع کرتی ہے۔ اردو انجمن کا قدیم اور مستند علمی جریدہ ہے جو ایک عرصے سے جاری ہے اور اردو تنقید و تحقیق میں ایک خاص مقام کا حامل ہے۔ "قومی زبان" ماہوار رسالہ ہے۔ اردو زبان و ادب کی ترقی کے بارے میں اطلاعات فراہم کرتا ہے۔ ہمارے یہ دونوں رسالے پاکستان و ہندستان کے علاوہ دنیا کے دوسرے ممالک میں بھی مقبول ہوتے ہیں اور شوق سے پڑھے جاتے ہیں۔

میں اس موقع پر یہ اظہار بھی ضروری سمجھتا ہوں کہ ایک عرصے تک انجمن ترقی اردو کی ساری جدوجہد اور سارے پروگرام ایک تحریک کی شکل میں بروئے کار آئے تھے۔ یہ تحریک تھی اردو کو قومی زبان قرار دینے کی۔ پاکستان کی جدوجہد میں انجمن نے بھی ایک مثبت کردار ادا کیا اور اردو کی قومی حیثیت کو واضح کرنے کی بھرپور کوشش کی چنانچہ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ قائداعظم علیہ الرحمۃ نے دوٹوک الفاظ میں اعلان کیا کہ "اردو اور صرف اردو پاکستان کی قومی زبان ہوگی"۔ بعد میں دستورِ پاکستان میں اردو زبان کی قومی حیثیت کو تسلیم بھی کر لیا گیا چنانچہ انجمن نے اردو کی تحریک کے پروگرام کو ختم کر کے اپنے آپ کو علمی و ادبی سرگرمیوں تک محدود کر لیا۔ نفاذ و رواج اردو کے لیے حکومتِ پاکستان نے مقتدرہ قومی زبان قائم کیا ہے۔ جس کا مقصد و منشا اردو زبان کو رائج کرنا اور دفتروں میں اس کے نفاذ کی راہ ہموار کرنا ہے۔ ان حقائق کے پیشِ نظر انجمن نے نفاذ و رواج اردو کے کام سے قطعِ نظر علمی، تحقیقی اور ادبی کام اپنے ذمے لے لیا ہے اور ہم اپنی بساط کے مطابق اسے انجام دے رہے ہیں۔

اتنا عرض کرنے کے بعد میں اپنے چند مسائل بھی آپ کے سامنے بیان کرنا چاہتا ہوں۔

پہلا مسئلہ انجمن کی مطبوعات کی فروخت کا ہے۔ انجمن کی کتابیں خالص علمی نوعیت کی ہوتی ہیں۔ ہم کوشش کرتے ہیں کہ ان کی قیمت کم ہو اس پر کتب فروش حضرات خوش نہیں ہوتے۔ باوجود کوشش کے لائبریریاں ان کو خریدنے کے لیے تیار نہیں ہیں۔ گو کہ یہ طلبہ تحقیق والوں کے لیے اہم ہیں ان کے اپنے مسائل ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ

وہیں میں رقم ملتی ہے۔ رقم ایسی کتابوں کے لیے مختص کی جاتی ہے جو مقبول ہوں اور علمی کتاب کو مقبولِ عام کا درجہ مشکل سے حاصل ہوتا ہے۔ یہ معاملہ انجمن کا نہیں ہے ان تمام علمی اداروں کا ہے جو صرف حکومت کی سرپرستی میں کام کر رہے ہیں جس میں مقتدرہ قومی زبان، اردو ڈکشنری بورڈ، اقبال اکیڈمی وغیرہ شامل ہیں۔ یہ مسئلہ صرف حکومت کے تعاون سے طے ہو سکتا ہے کہ ایک ایسا ادارہ قائم کیا جائے جو کتابیں خرید کر ملک کی کم از کم پانچ سو لائبریریوں میں تقسیم کرے۔ کام مشکل ضرور ہے ناممکن نہیں۔

انجمن کا دوسرا مسئلہ موزوں عمارت کا ہے۔ فی الحال انجمن کے دفتر اور کتب خانے جس عمارت میں ہیں وہ ایک قدیم اور تنگ متروکہ عمارت ہے۔ اس کا محل وقوع کچھ اس طرح کا ہے کہ اسکالر ادھر کا رخ کرتے ہوئے گھبراتے ہیں۔ ہم بھی یہ چاہتے ہیں کہ انجمن کے لیے شایانِ شان عمارت ہو۔ اس کام کے سلسلے میں ہمیں ادارہ ترقیات کراچی نے گلستانِ جوہر میں ایک قطعہ زمین قیمتاً الاٹ کیا ہے مگر آپ جانتے ہیں کہ شایانِ شان عمارت بنوانا آسان کام نہیں ہے اس کے لیے کثیر رقم درکار ہے جو ہماری دسترس سے باہر ہے۔ اگرچہ ہم نے ایک تعمیراتی کمیٹی بھی بنائی ہے اور یہ کوشش کر رہے ہیں کہ تعاون اور امداد حاصل ہو تاہم ابھی تک ہمیں اس سلسلے میں کوئی کامیابی حاصل نہیں ہوئی ہے اور جب تک یہ مسئلہ بطریقِ احسن حل نہیں ہوتا اس وقت تک انجمن کے سارے عزائم اور پروگرام نامکمل رہیں گے۔ اس سلسلے میں یہ عرض کرنا بھی ضروری ہے کہ حکومتِ پاکستان نے قائداعظم کمپلکس کے نام سے جو تعمیراتی منصوبہ مرتب کیا ہے اس میں انجمن کی عمارت بھی شامل ہے۔ ایک اندازے کے مطابق اس منصوبے پر تقریباً چار کروڑ روپے صرف ہوں گے۔ چار کروڑ تو بڑی رقم ہے انجمن کے لیے موجودہ صورتِ حال میں چار لاکھ اکٹھا کرنا بھی مشکل کام ہے لیکن جب تک سانس تب تک آس۔ میں اس منصوبے کے مستقبل یا اردو زبان و ادب کے مستقبل سے کبھی مایوس نہیں ہوا۔ اردو ہماری قومی زبان ہے۔ یہ پیار محبت اور رابطے کی زبان ہے۔ تمام علاقائی زبانوں نے اس کی آبیاری کی ہے۔ یہ وفاق کی علامت ہے۔ انشاء اللہ یہ زندہ رہے گی اور پھلے پھولے گی۔ انجمن کو آپ کی دعاؤں اور تعاون کی ضرورت ہے۔

میں ایک بار پھر آپ سب کا شکریہ ادا کرتا ہوں۔ آج بڑی مدت بعد مجھے یہ احساس ہو رہا ہے کہ میں ایسے لوگوں کے درمیان ہوں جو زبان و ادب کی خدمت میں مجھ سے زیادہ سرگرم ہیں۔ یقین کیجیے کہ یہ احساس میرے لیے انتہائی طمانیت کا سبب ہے۔

آج کے مقالوں میں بابائے اردو کے اردو یونیورسٹی کے خواب کا تذکرہ کیا گیا ہے۔ انشاءاللہ ان کا یہ خواب لاہور کے شہر میں پورا ہوگا۔ یہاں جذبہ بھی ہے تجربہ بھی ہے اور خدا کے فضل سے وسائل بھی ہیں۔ مجھے افسوس کے ساتھ اعتراف کرنا پڑ رہا ہے کہ انجمن فی الحال اس پر غور نہیں کر رہی ہے۔ مجھ کو اس بات کا بھی اعتراف ہے کہ باوجود کوشش کے ہم "سائنس" اور "معاشیات" کا دوبارہ اجرا نہ کر سکے۔ خدا کے فضل سے ان رسالوں کے لیے وسائل تو مہیا کیے جا سکتے تھے لیکن ہم کو لوگوں کا تعاون حاصل نہ ہو سکا۔

عزت افزائی کے لیے میں ایک بار پھر آپ سب کا شکریہ ادا کرتا ہوں۔

یونائیٹڈ بینک لمیٹڈ
بینکاری میں جدّت اور پیش رفت کے
پُرمسرّت ۳۰ سال
Bank
United
Limited
PAKISTAN
UBL
۱۹۵۹ـ ۱۹۸۹ء

خطّاطی کی نمائش

[صدرِ پاکستان جناب غلام اسحاق خاں صاحب نے ۱۰ دسمبر ۱۹۸۹ء کو کراچی میں محترمہ نیّر احسان رشید کی خطاطی کی نمائش کا افتتاح فرمایا تھا اُس موقع پر جنابِ صدر نے جو خطبہ ارشاد فرمایا اسے ہم اپنے قارئین کے لیے یہاں پیش کر رہے ہیں]

نیّر احسان رشید ہمارے ملک کی مایہ ناز مصوّرہ ہیں۔ آج کی یہ نمائش ان کی شخصیت کے دو انتہائی دلفریب پہلوؤں کا امتزاج پیش کرتی ہے۔ ایک پہلو جذبۂ ایمانی کی فراوانی سے معمور ہے اور دوسرا قدرتِ فن کے کمال سے۔ انھوں نے برش اور رنگوں کے ماہرانہ استعمال سے اللہ سبحانہ و تعالیٰ کے اسماءِ حسنیٰ اور صفاتِ اقدس کی نورانی کیفیات کو اپنے کمالِ فن کے اظہار کا ذریعہ بنایا ہے اور وہ بھی اتنی گہری جمالیاتی حس کے ساتھ کہ یہ فن پارے ایک طرف تو عشقِ حقیقی کی وارفتگی اور جذب و سرور کی وجدانی کیفیت کا والہانہ اظہار بن گئے ہیں تو دوسری طرف مصوّرانہ حسن و جمال اور دل آویزی کے شاہکار۔ اور آپ جانتے ہی ہیں کہ حُسن صفاتِ خداوندی میں شامل ہے۔ قرآن حکیم میں بتایا ہے کہ پروردگارِ عالم خود ہی منتہائے جمال بھی ہیں اور حُسن کو پسند کرتے ہیں۔ اَللّٰہُ جَمِیْلٌ وَّیُحِبُّ الْجَمَال

معزز حاضرین !

اسلام نے جہاں بنی نوع انسان کو ایک مکمل ضابطۂ حیات دیا وہیں فہم و ادراک اور بصیرت کی بے پایاں راہیں بھی کھول دیں اور اپنے نظامِ اخلاقیات کے دائرے میں رہتے ہوئے انسان کی تخلیقی جبلّتوں اور جمالیاتی ذوق کی تسکین کے راستے بھی ہموار کر دیے۔ یوں اسلام نے مروجہ ثقافتی قدروں کا مزاج بدل کر رکھ دیا۔ ثقافت کے مظاہر خالق و مخلوق کے باہمی رشتے سے ہم آہنگ ہو گئے۔ وہ جو دشمنوں کی ہجو اور محبوب کے حسن و جمال کی بے ہودہ اور جذبات انگیز شاعری کو کمالِ فن سمجھتے تھے، حمد باری تعالیٰ اور ثنائے پیمبرؐ کو قادرالکلامی کی معراج سمجھنے لگے۔ پتھروں سے بت تراشنے والے محراب و منبر کی تعمیر میں لگ گئے۔ طاؤس و رباب کے رسیا علم کے جویا بن گئے۔ فنون و ثقافت سے دیومالائیت کا عنصر ختم

ہو گیا اور دیکھتے ہی دیکھتے ایک ایسی صاف ستھری ثقافت کے خد و خال ابھرنے لگے جو انسانی فطرت کے قریب تھی۔ ایک ایسی ثقافت جو انسان کی وحشی جبلتوں کی تہذیب کرتی ہے۔ اس کی عملی اور تخلیقی صلاحیتوں کو بیدار کرتی ہے اور اسے ان رفعتوں کے راستے پر ڈالتی ہے جو زمین پر اللہ کا خلیفہ ہونے کے ناطے اس کا مقدر ہیں۔ ہمیں اسی ثقافت کو فروغ دینا ہے کہ یہی ہمارا ورثہ بھی ہے اور یہی ہمارا تشخص۔ ہم غیروں کی نقالی کے خبط میں اپنی تہذیب کی اصل روح کو مسخ نہیں کر سکتے کہ یہی ہماری انفرادیت کی پہچان ہے۔

علم ہمارے ثقافتی ورثے کی خشتِ اوّل ہے۔ اور علم ہی کے حوالے سے اسلامی معاشرے میں کچھ ایسے فنون نے رواج پایا تھا جو اس کا طرۂ امتیاز بن گئے۔ خطاطی ان میں سے ایک ہے۔ کلامِ الٰہی کو تحریری شکل میں محفوظ کرنے اور اسے دوسروں تک پہنچانے کی ضرورت نے رفتہ رفتہ ایک فن کی صورت اختیار کر لی اور یوں صحیح معنوں میں پہلا عربی نژاد اسلامی فن وجود میں آ گیا۔ ہونے کو تو قدیم چینی تہذیب اور بازنطینی معاشروں میں بھی خطاطی کو مقبولیت حاصل رہی تھی مگر یہ مسلمان ہی تھے جنھوں نے اسے ایک باقاعدہ فن کی شکل دی اور بامِ عروج تک پہنچا دیا۔

کاتبانِ وحی سے لے کر ہمارے ہم عصر فنکاروں تک خطاطی کا فن ارتقا کی بے شمار تدریجی منازل سے گزرا اور نت نئے اسالیبِ تحریر کی مناسبت سے اس میں وسعت، نیرنگی اور تنوع آتا چلا گیا اور ہر اسلوبِ تحریر کے باکمال اساتذہ پیدا ہوئے۔ خالد بن ابو الہیاج نے خط کوفی میں خطّاطِ قرآن کی حیثیت سے لازوال شہرت پائی۔ خط ریاسی میں فضل بن سہیل درجہ کمال کو پہنچا۔ خط نسخ میں ابو علی مقلہ کی خطّاطی کو قبولِ دوام حاصل ہوا۔ امیر علی تبریزی نے خطِ نستعلیق میں اپنے جوہر دکھائے۔ خود ہمارے یہاں یہ فن انتہائی مقبول رہا اور ایسے خطّاط پیدا ہوئے جن کے نام اس فن کی آبرو بن گئے۔ صادقین کو کون بھول سکتا ہے؟

خطاطی میں فن کی جن اعلا قدروں کا بتدریج اضافہ ہوتا رہا۔ ان کے پیچھے بنیادی طور پر یہ جذبہ کارفرما تھا کہ کلامِ الٰہی کو باضابطہ تحریر میں لانے کا انداز اس ذاتِ پاک کی شایانِ شان ہو۔ چنانچہ خطاطی اسلامی تہذیب کا سب سے اہم فن بن گئی اور پندرھویں صدی تک انتہائی مقبول رہی۔ مگر پھر مسلمانوں کے زوال کے ساتھ ساتھ غیر تہذیبوں کے زیرِ اثر مصوّری پر زیادہ زور دیا جانے لگا اور خطاطی پس منظر میں چلی گئی۔ مگر پھر بھی مساجد کی تزئین و آرائش میں اس کا استعمال عام رہا۔ یوں تو یروشلم کے گنبدِ صخرا میں بھی خطّاطی کا کام کیا گیا تھا۔ مگر مساجد میں مسجدِ نبویؐ وہ پہلی مسجد تھی جس کی آرائش کے لیے ۷۰۹۔ ۷۰۵ء میں خطاطی سے استفادہ کیا گیا اور یوں خطاطی پورے عالمِ اسلام میں مساجد کی تزئین کا مروجہ اور مسلمہ فن قرار پائی۔

فن خطاطی کی مقبولیت اور پذیرائی کی وجہ محض مذہبی لگاؤ ہی نہیں بلکہ وہ حسن اور دل آویزی بھی ہے جو تصویری کی ایک شکل کے طور پر اس میں پائی جاتی ہے اور جس کے قدرداں اسلامی دنیا سے باہر بھی پائے جاتے ہیں۔ تبھی تو جرمن بادشاہوں نے تاج پوشی کے موقعے پر پہنے جانے والے اپنے لبادے پر خطِ کوفی میں خطّاطی کروا رکھی تھی۔ دراصل عمودی اور افقی خطوط اور زاویوں اور قوسوں کے امتزاج سے پیدا ہونے والا حسن، خطوط کے

طول وعرض میں کمی بیشی کی بے پناہ گنجایش کے ساتھ ساتھ ان کے زیر و بم کی ہم آہنگی اور جدت طرازی کے لامحدود امکانات رنگوں کے استعمال سے کبریائی عظمتوں کے تاثر کو ابھارنے اور روحانی کیف و مستی کے جذبوں کو صفحۂ قرطاس پر منتقل کرنے کے بے پایاں مواقع ——— یہ سب ایسے چیلنج ہیں جو کسی بھی مصوّر کے کمالِ فن کا امتحان ہیں۔ اور انہی فن کارانہ امکانات نے "لفظ" کو جو بذاتِ خود محض ابلاغ کا ایک وسیلہ ہے، صوری حسن عطا کر کے ایک منفرد آرٹ کا درجہ دے دیا ہے۔

نیر احسان کے جو فن پارے آج اس نمایش کی زینت بنے ہیں وہ خطاطی کے انہی لامحدود امکانات اور مصورانہ قدر و قیمت کی ترجمانی کرتے ہیں ——— میں ان شہ پاروں کو فنِ خطاطی کے شاندار ماضی اور درخشاں مستقبل کے درمیان ایک اہم رابطہ سمجھتا ہوں۔ ان کے تکنیکی حسن و قبح پر کچھ کہنا ناقدانِ فن کا کام ہے۔ لیکن انھیں دیکھ کر میں نے جو تاثر لیا ہے وہ یہ ہے کہ مصورہ نے ایک وجدانی کیفیت میں ڈوب کر اللہ تعالیٰ کے ننانوے نام نقش کیے ہیں اور صفاتِ الٰہی کی بیکراں وسعتوں اور ہمہ گیریت کا رنگوں کی آمیزش اور برش کی جنبشوں سے احاطہ کرنے کی کوشش کی ہے۔ چاندی سونے کے پانی کا استعمال بھی فنِ خطاطی کی ایک قدیم روایت رہی ہے اور نیر احسان نے اس روایت کو بھی نہایت خوبصورتی، موزونیت اور فن کارانہ مہارت سے نبھایا ہے۔ پروردگارِ عالم کے اسمائے مبارکہ اور قدرتوں کی تجلیوں میں محو ہونے کی جستجو اور اس کا صوری اظہار یقیناً ایک بہت بڑی سعادت ہے۔ میں نیر احسان رشید کو یہ عظیم سعادت پانے پر تہِ دل سے مبارک باد دیتا ہوں۔

بیت الحکمۃ کا افتتاح

[صدرِ پاکستان جناب غلام اسحاق خان نے ۱۱ دسمبر ۱۹۸۹ء کو کراچی میں "بیت الحکمۃ" کا افتتاح فرمایا تھا۔ اس موقعے پر جنابِ صدر نے جو خطبہ ارشاد فرمایا اسے ہم قارئین کے لیے یہاں پیش کر رہے ہیں]

آج میں مختلف شعبہ ہائے زندگی سے تعلق رکھنے والے معززین اور اہلِ علم حضرات کے اس شاندار اجتماع میں شرکت پر از حد مسرت محسوس کر رہا ہوں۔ یہ اجتماع ایک ایسے مقام پر منعقد ہو رہا ہے جہاں علم، ثقافت اور سائنس کے شہر "مدینۃ الحکمۃ" کی بنیادیں اٹھائی جا رہی ہیں۔ عظمتِ رفتہ کے دھندلے خاکوں میں تازہ رنگ بھرنے کی مراد بر آنے کے لیے "بندر مراد" سے زیادہ مناسب جگہ اور کون سی ہو سکتی ہے کہ یہی وہ جگہ ہے جہاں مسلمان محمد بن قاسم کی سربراہی میں اسلام کا علم لیے برصغیر میں داخل ہوئے۔ وہ اس خطۂ ارض پر ہماری روشن تاریخ کا نقطۂ آغاز تھا۔ آج یہاں بیت الحکمۃ کا افتتاح انشاء اللہ ہمارے درخشاں مستقبل کی علامت ثابت ہوگا۔ میں حکیم محمد سعید صاحب، مجلس امینان ہمدرد فاؤنڈیشن اور مشیرانِ بیت الحکمۃ کا تہِ دل سے مشکور ہوں کہ انھوں نے اس عظیم ادارے کے افتتاح کا اعزاز مجھے بخشا۔

خواتین و حضرات!

ادارے ان قدروں اور روایتوں کے فروغ، تحفظ اور ترویج کے لیے قائم کیے جاتے ہیں جنھیں معاشرہ اپنے لیے ضروری خیال کرتا ہے۔ بیت الحکمۃ اور وسیع تر تناظر میں مدینۃ الحکمۃ، علم و حکمت، تعلیم و تعلم اور تحقیق و کاوش کی ان قدروں، ان روایتوں کے احیا کی ایک کوشش کا نام ہے جو ہماری عظیم ثقافتی میراث ہیں۔ یہ علم و دانش کے اس سلسلے کو جاری رکھنے کی مخلصانہ مساعی کا حصہ ہے جو چودہ سو سال قبل مدینے میں مٹی اور گارے کی کچی دیواروں اور کھجور کے پتوں سے بنی ہوئی ایک مسجد سے شروع ہوا، بغداد، دمشق، قرطبہ، قسطنطنیہ و غرناطہ تک پھیلا اور صدیوں تک عالمِ معلوم پر ضوپاشی کرتا رہا۔ حکیم سعید صاحب نے اپنے عالمانہ خطاب میں ہمارے علم و فضل

کے ان گم گشتہ ابواب کی نشاندہی کی ہے اور ہمیں ہارون اور مامون کا دور یاد دلایا ہے جب چہار طرف پھیلی ہوئی تاریکی میں اسلامی معاشرہ علم و دانش اور کمال و فضل کے واحد روشن مینار کی حیثیت رکھتا تھا۔ یقیناً ہم اس درخشاں ماضی پر فخر کر سکتے ہیں اور کرتے ہیں۔ مگر فخر کا یہ احساس درد کی اس کسک کو کم نہیں کر سکتا جو ہر اہلِ دل یہ سوچ کر محسوس کرتا ہے کہ جب زمانہ بڑے شوق سے سن رہا تھا تو پھر ہم داستان کہتے کہتے سو کیوں گئے؟

سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ وہ کیا اسباب تھے کہ علم و عمل کے وہ مسافر جنھوں نے اپنے سفر کا آغاز انتہائی پُر اعتماد انداز میں کیا تھا، راستے ہی میں تھک کر بیٹھ گئے۔ اجنبی قافلے گزرتے رہے مگر ان کے ذوقِ سفر کو تحریک نہ ہوئی اور پھر اغیار نے منزلیں سر کر لیں اور ہم حسرت سے غبارِ راہ کو تکتے رہ گئے۔ ہمارا دین وہی تھا جس نے کبھی ہماری تحقیقی صلاحیتوں کو مہمیز کیا تھا۔ فکر و تدبر، تلاش و جستجو اور تسخیرِ کائنات کے احکامات بھی نہیں بدلے تھے پھر ہم نے اپنا شعار کیوں ترک کر دیا؟ میری دانست میں اس کی ایک اہم وجہ یہ تھی کہ ابتدائی کامیابیوں اور دنیاوی جاہ و حشم کے حصول نے اسلامی معاشرے میں پائی جانے والی خود اعتمادی کو احساسِ تفاخر میں بدل دیا اور برتری کے زعم نے اسے رفتہ رفتہ ان تبدیلیوں کی طرف سے بے نیاز کر دیا جو باقی دنیا میں وقوع پذیر ہو رہی تھیں۔ جہالت اور جاہلوں کے مقابلے میں دانش اور اہلِ علم کی بے قدری نے امت کی قوتِ نمو کو مضمحل کر دیا اور علم، عملی اطلاق سے محروم ہو کر محض ذہنی عیاشی کا ذریعہ بن گیا۔ چنانچہ جب یورپ ایک نئی کروٹ لے رہا تھا تو عالمِ اسلام اس کے محرکات اور اثرات سے لاتعلق مدہوش پڑا رہا اور اپنے ہی خول میں بند رہ کر اس نے ان تخلیقی قوتوں پر کسی مثبت یا بامعنی ردِ عمل کا اظہار نہیں کیا جو مغرب میں ایک نئے دور کی نقیب ثابت ہو رہی تھیں اور جب بالآخر ہم جاگے تو دنیا بہت آگے نکل چکی تھی۔

اب اگر ہمیں زمانے کے قافلے سے جا ملنا ہے تو اپنی ترجیحات کو از سرِ نو مرتب کرنا ہوگا اور ان کی مناسبت سے اپنی رفتار کو تیز کرنا ہوگا۔ مگر قوموں کی ترقی کی رفتار کو تیز کرنا علم کے بغیر ممکن نہیں۔ بنیادی تعلیم کو عام کرنا اس سلسلے کی پہلی کڑی ہے۔ جس کے لیے خواندگی کی شرح میں اضافہ ناگزیر ہے۔ لیکن محض پڑھنے لکھنے کی اہلیت پیدا کر لینا ہی کافی نہیں۔ علم نام ہے ذہن کے دریچے وا کرنے کا، غور و فکر کی راہیں کھولنے کا، ذوقِ تحقیق اور شوقِ جستجو پیدا کرنے کا۔ اور یہ سب اسی وقت ممکن ہے جب خواندگی کا فروغ اعلا تعلیم کے حصول کے شوق پر منتج ہو۔

بڑی بڑی ڈگریاں اعلا تعلیم کی نشانی ضرور ہیں مگر ہر سند یافتہ فرد کو اعلا تعلیم یافتہ تصور نہیں کیا جا سکتا اعلا تعلیم یافتہ محض وہ ہے جس کے علم میں اتنی وسعت ہو کہ معروضی حقیقتوں کا احاطہ کر سکے، اتنی گہرائی ہو کہ حقائق کے منفی اور مثبت پہلوؤں کا ادراک کر سکے، اتنی صلاحیت ہو کہ حالات میں ضروری تبدیلیوں کی نشاندہی کر سکے، اتنا حوصلہ ہو کہ ان تبدیلیوں کے لیے جد و جہد کر سکے اور اتنا خلوص ہو کہ اس راہ کی دشواریوں کو خندہ پیشانی سے جھیل سکے۔ اعلا تعلیم کا یہ انداز جن باتوں کا تقاضا کرتا ہے ان میں حصولِ علم، شوقِ جستجو اور جذبۂ خدمت شامل ہیں اور یہ تینوں مقاصد مجھے مدینۃ الحکمۃ کی منصوبہ بندی میں کارفرما نظر آتے ہیں۔ اللہ کرے کہ تکمیل کے بعد اس ادارے کی کارکردگی بھی اس معیار کی ہو جو اس کے مقاصد کی رفعت کا تعین

کرتے وقت پیش نظر رکھا گیا ہے اور مجھے یقین ہے کہ انشاء اللہ ایسا ہی ہو گا۔

میرے اس یقین کی وجہ رسمی حسن ظن نہیں بلکہ وہ اعتماد ہے جو مجھے حکیم سعید صاحب کے خلوص اور صلاحیتوں پر ہے۔ حکیم صاحب کا شمار ہمارے ملک کے ان لوگوں میں ہوتا ہے جو فکرِ رسا بھی رکھتے ہیں اور جوشِ عمل بھی۔ مضبوط قوتِ ارادی کے بھی مالک ہوتے ہیں اور ثابت قدمی کی خصوصیت کے بھی۔ ان میں حبّ الوطنی بھی کوٹ کوٹ کر بھری ہے اور انسان دوستی بھی۔ مجھے امید ہے کہ ہمدرد فاؤنڈیشن کی سنہری روایات کی طرح قوم مدینۃ الحکمۃ کی زرّیں خدمات کے لیے بھی ہمیشہ حکیم صاحب کی سپاس گزار رہے گی۔ میری دعا ہے کہ خدا ان کی عمر میں اتنی برکت دے کہ وہ اس عظیم، طویل المیعاد منصوبے کو اپنے ہاتھوں تکمیل تک پہنچائیں اور اس خواب کو شرمندۂ تعبیر ہوتے دیکھ لیں جو انھوں نے خانۂ کعبہ کے مقدس سائے میں دیکھا تھا۔

آج اس خواب کے ایک حصے کی شاندار تعبیر ہماری آنکھوں کے سامنے ہے۔ کل مدینۃ الحکمۃ کو جو روپ دھارنا ہے بیت الحکمۃ اس کی ایک جھلک ہے اور جیسا کہ ہم نے حکیم صاحب کی زبانی سنا، ایسے اسلامی ثقافت کے ایامِ عروج کی ان لائبریریوں کی طرز پر تشکیل دیا گیا ہے جو اپنے مقاصد کی ہمہ گیریت کے پیشِ نظر دار الحکمۃ اور خزانۃ الحکمۃ یعنی علم و دانش کے مراکز کہلاتی تھیں۔ اس میں وہ مطبوعات، مسودے اور مخطوطات بھی موجود ہیں جو مسلمانوں کے علم، تجربات اور فکری ارتقا کا دستاویزی ورثہ ہیں اور وہ کتابیں بھی جو جدید علوم و فنون کا خزینہ ہیں۔ یوں بیت الحکمۃ اسلامی اور مغربی علوم کا ملا جلا ذخیرہ ہے جس کی صحیح قدر و قیمت کا اندازہ صرف اہلِ علم، اہلِ نظر اور محققین ہی کر سکتے ہیں۔ حکیم صاحب نے اس لائبریری کے لیے اپنے انتہائی قیمتی ذاتی کتب خانے کا عطیہ دے کر ایک ایسی قابلِ قدر مثال قائم کی ہے جس کی فراخدلانہ تقلید ہونی چاہیے۔

مجھے یہ سن کر بڑی خوشی ہوئی ہے کہ بیت الحکمۃ میں فی الوقت تقریباً دو لاکھ کتابیں ذخیرہ کی گئی ہیں اور تقریباً پچیس لاکھ کی گنجائش رکھی گئی ہے۔ اور یہ کہ یہاں مطالعے اور ریسرچ کے لیے بین الاقوامی معیار کی جدید ترین سہولتوں کا اہتمام کیا گیا ہے۔ یہ بھی بڑی خوش آیند بات ہے کہ بیت الحکمۃ کے کمپیوٹر سسٹم کو دنیا کی اہم لائبریریوں سے مربوط کیا جاتا ہے۔ گویا اس لائبریری کو ابتدا ہی سے پاکستان کی سب سے بڑی اور سب سے زیادہ جدید سہولتوں سے لیس لائبریری ہونے کا اعزاز حاصل ہو رہا ہے۔

امید کی جا سکتی ہے کہ آگے چل کر اس کا شمار دنیا کے اس حصے کی اہم لائبریریوں میں ہونے لگے گا۔ اور شاید اس سے قوم میں کتابوں کا شوق پیدا کرنے میں بھی مدد ملے جس کے فقدان کا رونا حال ہی میں اپنی کسی تقریر میں رو چکا ہوں۔

یہ اطلاع کم از کم میرے لیے انکشاف کا درجہ رکھتی ہے کہ ہمارے اپنے ملک میں مختلف زبانوں کے تقریباً ایک لاکھ قدیم نسخے، مسودات اور مخطوطات پائے جاتے ہیں۔ ماضی کے اس بیش بہا علمی خزانے کو محفوظ رکھنا ہماری قومی ذمے داری ہے۔ ہر صوبے میں نیشنل ARCHIVES کے دفاتر موجود ہیں لیکن ان کے محدود وسائل کو مدِنظر رکھتے ہوئے ہمیں چاہیے

کہ کوئی ایسا طریقۂ کار وضع کریں کہ اس قیمتی ذخیرے کو ایک جگہ جمع کیا جا سکے جہاں جدید لائبریری سائنس کے تقاضوں کے مطابق اس کی ماہرانہ دیکھ بھال کا بندوبست ہو، فہرستیں مرتب کی جا سکیں اور سیاق و سباق کے حوالے ترتیب دیے جا سکیں۔ یہ اس لیے ضروری ہے کہ اہلِ علم اور محققین اس عظیم فکری ورثے سے استفادہ کر سکیں اور ہماری علمی تاریخ کی گم شدہ کڑیاں مل سکیں۔ میں ان تمام حضرات اور اداروں سے اس کام میں بھرپور معاونت کی اپیل کرتا ہوں جو اس بات پر یقین رکھتے ہیں کہ علم کسی کی انفرادی ملکیت نہیں، انسانیت کا اجتماعی ورثہ ہے۔ خصوصاً اس دین کے پیروکاروں کی تو یہ اولین ذمے داری بنتی ہے جن کے دین کی ابتدا لفظ "اقرا" سے ہوئی ہو اور جو رَبِّ زِدنی علماً کی دعا مانگنے کے عادی ہوں۔

خدا کا شکر ہے کہ رفتہ رفتہ تعلیم کے فروغ کے معاملے میں ہمارے اصحابِ ثروت میں اپنی ذمے داریوں کا احساس بڑھتا جا رہا ہے اور ان کی فراخدلی کے نتیجے میں اب کئی ایک بہت اچھے تعلیمی ادارے وجود میں آ چکے ہیں۔ چند ایک پرائیویٹ یونیورسٹیاں بھی کام کر رہی ہیں۔ میں اس فہرست میں ہمدرد یونیورسٹی کے اضافے کا متمنی ہوں۔ حکومت کو اس میدان میں نجی شعبے کی حوصلہ افزائی اور اس کی خدمت پر اظہارِ تشکر کے طور پر ان قوانین و ضوابط پر نظرِ ثانی کرنا چاہیے جو اس راہ میں رکاوٹوں اور دشواریوں کا سبب بنتے ہیں۔ حکیم سعید صاحب نے بھی چند ایک مشکلات کی طرف اشارہ کیا ہے۔ ہمدرد یونیورسٹی سے ہمدردی کے اظہار کے طور پر انھیں ضرور دور کیا جانا چاہیے۔ اگر اس معاملے میں تغافل برتا گیا تو ایک اہم قومی فریضے سے کوتاہی کا ارتکاب ہو گا۔

موقع کی مناسبت سے یہ بھی عرض کرنا چاہوں گا کہ اگر ایک یونیورسٹی قائم ہو بھی جائے لیکن اس کی خود مختاری کو یقینی نہ بنایا جائے تو اس کے قیام کے مقاصد کما حقہ پورے نہیں ہو سکتے۔ علم و دانش کا فروغ اور تحقیقی و تخلیقی صلاحیتوں کا بھرپور اظہار صرف پابندیوں سے آزاد ماحول ہی میں ممکن ہے۔ غیر ضروری انتظامی اور انضباطی بندشوں میں جکڑے ہوئے اداروں سے یہ توقع عبث ہے کہ وہ درس گاہوں کی سطح سے بلند ہو کر صحیح معنوں میں دانش گاہیں بن سکیں۔ اور جب تک اعلا تعلیم کے ادارے دانش کدے نہ بنیں، قوم کا فکری معیار اوسط درجے کا ہی رہے گا۔

اور اب میں انتہائی مسرت اور اس دعا کے ساتھ بیت الحکمۃ کے باقاعدہ افتتاح کا اعلان کرتا ہوں کہ یہ ادارہ جو حکمت و دانش کی ان روایتوں کی پاسداری کی توقع پر قائم ہوا ہے جو مامون الرشید کے بغداد میں پختہ ہوئی تھیں، نہ صرف ان روایتوں کے احیا اور فروغ کا وسیلہ ثابت ہو بلکہ تن آسانی، بے عملی اور نفاق کے اثرات سے بھی سدا محفوظ رہے جو دجلہ کی موج بن کر انھیں بغداد سے بہا لے گئے تھے۔

حکیم محمد سعید اور ان کے رفقائے کار کی کامیابی اور مدینۃ الحکمۃ کی رونق کے لیے نیک تمناؤں کے ساتھ آپ سے اجازت چاہتا ہوں۔

پاکستان پائندہ باد

جناب ابنِ انشا کی الوداعی پارٹی لندن روانگی سے قبل مشفق خواجہ صاحب نے غالب لائبریری میں دی
۱۹۷۷ء
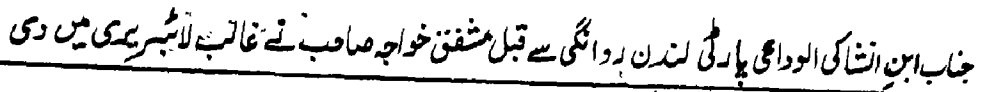
پہلی صف میں بیٹھے ہوئے: ابنِ انشا مداحوں کے درمیان۔
پہلی صف میں کھڑے ہوئے: زبیر صدیقی (مرحوم)، مختار زمن، منہاج برنا، ابراہیم جلیس (مرحوم) محسن بھوپالی، شان الحق حقی، ڈاکٹر عبدالقیوم، صہبا لکھنوی اور سید شبیر علی کاظمی (مرحوم)
آخری صف میں: ڈاکٹر ابوسلمان شاہ جہان پوری، ذوالفقار مصطفیٰ، وقار احمد رضوی، مرزا ظہور الحسن (مرحوم) سبطِ حسن (مرحوم) پروفیسر ممتاز حسین، سحر انصاری اور مشفق خواجہ ——— بہ شکریہ ادارہ یادگارِ غالب

قاضی محمد اختر جوناگڑھی

چاند نگر کا مسافر

ابن انشا کی گیارھویں برسی کے موقع پر

وفات ۱۱ جنوری ۱۹۷۸ء

کمر باندھے ہوئے چلنے کو یاں سب یار بیٹھے ہیں
بہت آگے گئے باقی جو ہیں تیار بیٹھے ہیں

یہ مشہور مطلع انیسویں صدی میں دبستانِ لکھنؤ کے ایک ممتاز شاعر انشا اللہ خاں انشا کا ہے۔ بیسویں صدی کے جوگ بجوگ کے شاعر ابنِ انشا نے بھی یہی بات کہی تھی مگر اپنے مخصوص انداز میں

انشا جی اٹھو اب کوچ کرو اس شہر میں جی کا لگانا کیا
وحشی کو سکوں سے کیا مطلب جوگی کا نگر میں ٹھکانا کیا

۱۱ جنوری ۱۹۷۸ء کو لندن سے خبر آئی کہ انشا جی سے مزید صبر اور انتظار نہ ہو سکا اور وہ آخر کار اس "شہر" سے کوچ کر ہی گئے۔

مرگِ مجنوں پہ عقل گم ہے میر
کیا دوانے نے موت پائی ہے

ایک عجیب اتفاق ہے کہ انشا جی کی ایک مشہور و معروف غزل کو گانے والے استاد امانت علی خاں بھی اس دنیا سے کوچ کر گئے۔ نہ معلوم اس غزل میں ایسی کیا خاص بات پوشیدہ ہے کہ اس کے لکھنے والے اور گانے والے دونوں آج ہمارے درمیان نہیں۔ کہیں ایسا تو نہیں کہ شہر کے لوگوں نے ان دونوں کو [illegible] سے انکار کر دیا تھا۔

شیر محمد خاں جنھیں اردو زبان، شاعری اور ادب سے شغف رکھنے والے ابنِ انشا کے معروف قلمی نام سے جانتے اور پہچانتے ہیں۔ اپنی تخلیقی اور ادبی فتوحات کے اعتبار سے واقعی ادب کے سکندرِ اعظم تھے، شاعری، طنز و مزاح، سفرنامہ نویسی اور کالم نگاری یہ چاروں قلمرویں ان کے زیرِ نگیں تھیں اور وہ دوسروں سے اپنی تخلیقی جینئس کا خراج وصول کرتے اور اپنی انفرادیت کے نقوش کا سکّہ لوگوں کے دلوں پر بٹھاتے تھے۔

ابنِ انشا ایک شخص یا ذات نہیں بلکہ ایک انجمن اور ادارے کا دوسرا نام تھا۔ وہ ایک ایسے ہمہ جہت اور جامع الحیثیات تخلیقی فن کار تھے کہ یہ تعیّن کرنا بے حد دشوار ہے کہ وہ اچھے شاعر تھے یا بڑے طنز و مزاح نگار،

بہر لعزیز کالم نویس تھے یا مقبول ترین سفر نامہ نویس، حقیقت یہ ہے کہ انھوں نے جس صنفِ ادب کی طرف توجہ کی اسے اپنے منفرد اسٹائل اور مخصوص لب و لہجے سے طلسماتی بنا دیا۔

آج جب کہ وہ اس دنیا میں نہیں رہے اور میں ان کے تخلیقی شعلے کے مختلف رنگ دیکھنے کی کوشش کرتا ہوں تو مجھے بے ساختہ ان کا یہ مقطع بڑی شدت سے یاد آرہا ہے:

تیرا نور ظہور سلامت اک دن تجھ پہ ماہِ تمام
انشاجی سا لکھنے والا "چاند نگر" لکھ جائے گا

چاند نگر دراصل انشاجی کی غزلوں، نظموں اور گیتوں کا پہلا مجموعہ ہے جو اب سے ۳۲ برس قبل شائع ہوا تھا اور یہی کتاب ان کی زندگی کا اوّلین نقش ہے۔ اس اعتبار سے ان کی ہمہ جہت تخلیقی کامیابیوں کے باوجود میں ذاتی طور پر انھیں بنیادی لحاظ سے شاعر ہی سمجھتا ہوں لہٰذا سب سے پہلے ان کی شاعری پر گفتگو کروں گا... اگر آپ انشاجی کے دونوں شعری مجموعے "چاند نگر" اور "اس بستی کے اک کوچے میں"، بغور پڑھیں تو تین شاعروں کے نام آپ کو تسلسل اور تکرار کے ساتھ ملیں گے، کبیر، میر اور نظیر۔ انشاجی کی شاعری ان تینوں عظیم شاعروں کی روایت کے سائے میں سفر طے کرتی ہے۔

بھگت کبیر داس ہندستان میں بھگتی تحریک کا ایک ممتاز اور نمایندہ کوی تھا اس کی کویتا ہندو اور مسلمانوں کے سنجوگ اور ملاپ کی کویتا ہے۔ کبیر داس انسان کو انسان سے پریم اور پیار کرنے کا اُپدیش دیتا ہے۔ دھرم اور سماج کی دیواریں گرانے پر زور دیتا ہے جو انسان کو انسان سے دور رکھتی ہیں۔ اس کے دوہے ایک سچّی اور بے ریا آتما کی پکار ہیں وہ انسان کے لیے پریم کا سندیسہ لایا تھا۔

میر تقی میر زندگی کے اداس اور دکھی لمحوں کا شاعر تھا۔ اس کے دیوان درد و غم سے عبارت ہیں وہ بیشتر دکھوں اور غموں کا شاعر تھا۔

دنیا کی بے ثباتی، انسان کی بے وقعتی، حالات کی ناپائیداری اسے ہر لمحہ گریہ کناں رکھتی تھی۔ اسی صوفی منش اور قلندر مزاج میر نے اپنے آسمان پر چمکتے ہوئے چاند میں ایک موہنی صورت کو دیکھا اور فریفتہ ہو گیا۔ انشاجی کی شاعری کے آکاش پر بھی یہ چاند طلوع ہوتا رہتا ہے:

کل چودھویں کی رات تھی شب بھر رہا چرچا ترا
کچھ نے کہا یہ چاند ہے کچھ نے کہا چہرہ ترا

انشاجی کے اشعار بھی اسی چاند چہرے کی چاندنی سے منوّر ہیں جس چاند چہرے کی جھلک میر نے دیکھ لی تھی۔

نظیر اکبر آبادی ہندستان کا آوارہ شاعر اور بنجارہ تھا۔ وہ نگر نگر گھومنے والا ایک جوگی تھا جس نے اپنی شاعری میں اپنے پورے عہد کو، اس کی تہذیب اور ثقافت اس طرح سمیٹ لیا ہے کہ اس کا کلام ایک البم کی شکل اختیار کر گیا ہے جس میں ہندستانی تہذیب اور معاشرے کی مختلف تصویریں مختلف رنگوں میں نظر آتی ہیں۔ اس نے "آدمی نامہ" اور "بنجارہ نامہ"، جیسی لازوال نظمیں تخلیق کیں جن میں اس کا طبقاتی اور انقلابی شعور پوری طرح نمایاں ہے۔

چنانچہ آپ دیکھیں گے کہ بھگت کبیر داس، میر تقی میر اور نظیر اکبر آبادی تینوں کبھی انفرادی اور کبھی اجتماعی طور پر آپ کو انشا جی کے ہمراہ نظر آئیں گے، لیکن ٹھہریے کچھ لوگ اور بھی ہیں ــ بات یہ تھی کہ انشا جی ایک درویش صفت اور قلندر منش انسان تھے ــ جسم تو ان کا بیسویں صدی کے ایک جدید صنعتی شہر میں رہتا تھا لیکن جسم میں جو روح تھی وہ ایک فقیر ایک سنیاسی ایک جوگی کی روح تھی جو اپنی جستجو اور تلاش میں مسلسل سرگرم سفر تھی اسی روحانی سفر میں انشا جی کی ملاقات کبھی "سلطان باھو" سے ہوتی ہے اور کبھی بُلھے شاہ سے ہوتی ہے، وہ انھیں کے لہجے میں بات چیت کرتے اور سوچتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ اس اعتبار سے میرے نزدیک انشا جی کا سب سے بڑا کارنامہ یہ ہے کہ انھوں نے سب سے پہلے اردو کے کلاسیکل شعرا اور علاقائی زبانوں کے لوک شاعروں کے طرزِ احساس و اظہار اور لب و لہجے کی آمیزش اور امتزاج سے ایک ایسی صحت مند روایت کی بنیاد رکھی جو ہماری شاعری اور مجموعی ادب کو ہمیشہ تازہ لہو فراہم کرتی رہے گی اور ہماری زبان اور اظہار کے سرچشموں کو تر و تازہ اور شاداب رکھے گی۔ انشا جی کا یہ واحد کارنامہ ہی انھیں زبان و ادب کی تاریخ تازہ رکھنے کے لیے کافی ہے۔

شاعری کی قلمرو کے بعد انشا جی نے طنز و مزاح کے میدان میں جو فتوحات حاصل کیں اس کا اندازہ آپ کو انشا جی کی شگفتہ تحریر اور گہری اور تیز حسِ مزاح کو محسوس کر کے ہو جائے گا۔ میں یہ بات بلا خوفِ تردید کہہ سکتا ہوں کہ انشا جی اس عہد کے اردو نثر لکھنے والوں میں ایک نمایاں اور امتیازی حیثیت کے حامل تھے۔ ان کے الفاظ فقرے اور جملوں کی نشست اور پھر جملوں کے بین السطور ایک ایسا طنز جو آپ کے دل و دماغ کو بڑی لطافت اور ملائمت کے ساتھ شگفتہ کر دیتا ہے۔ انشا جی درحقیقت بڑی ہی شگفتہ اور باغ و بہار نثر لکھنے پر قادر تھے۔ ان کا مزاح قہقہہ پرور نہیں بلکہ تبسّم زیرِ لب کا محرک ہے، وہ اپنے قاری کو قہقہہ مار کر ہنسنے پر مجبور نہیں کرتے بلکہ آہستہ آہستہ گدگدی کرتے ہیں جو دماغ سے لے کر پورے جسم پر پھیل جاتی ہے۔ ان کے ہاں آپ کو مزاح کے پٹاخے نہیں ملیں گے۔ وہ طنز و مزاح کی پھلجھڑیاں جلاتے ہیں جو بغیر کسی آواز کے جلتی ہیں اور پھر بجھ جاتی ہیں۔ یہ دراصل انشا جی کی اپنی شائستگی اور تربیت یافتہ حسِ مزاح تھی جس نے انھیں یہ سلیقہ بخشا تھا۔ سچ تو یہ ہے کہ وہ اس طرز اور اسلوب کے موجد بھی تھے اور خاتم بھی ــ "اردو کی آخری کتاب" اس بات کا منھ بولتا ثبوت ہے۔

سفرنامہ غالباً نہیں بلکہ یقیناً وہ واحد صنف ہے جس پر انشا جی نے مجموعی طور پر اپنی تخلیقی زندگی کا بیشتر حصہ صرف کیا ہے۔ ایک بات جو ان کی شاعری اور سفرناموں میں قدرِ مشترک کی حیثیت رکھتی ہے، وہ ہے ان کی فقیرانہ روش اور جوگیانہ اُفتادِ طبع ــ سفر، فقیروں سنیاسیوں اور جوگیوں کے نزدیک مقصدِ حیات کا درجہ رکھتا ہے۔ یہ سفر دراصل ایک تلاش اور ایک جستجو کی علامت ہے۔ جوگی بظاہر اس زمین پر سفر کرتا ہے لیکن درحقیقت وہ اپنے باطن کی گہرائیوں میں سفر کرتا ہے ــ گزشتہ زمانوں میں جب یہ جوگ بجوگ کے متوالے سفر کرتے تو اپنے تجربات اور مشاہدات کو اپنی "آنکھوں کے دریچوں" اور "سینے کے دروازوں" میں بند رکھتے تھے۔ انشا جی جدید صنعتی دور کے وہ آوارہ گرد سیاح ہیں جنھوں نے اس سفر کے دوران اپنی آنکھوں اور سینے دونوں کو کھلا رکھا ہے، نتیجے کے طور پر

"چلتے ہو تو چین کو چلیے" "آوارہ گرد کی ڈائری" "دنیا گول ہے" "ابنِ بطوطہ کے تعاقب میں" ہمارے سامنے ہیں۔ سفرنامے یوں تو انشاجی سے پہلے بھی لکھے گئے ہیں لیکن ان میں سے بیشتر ایسے ہیں جن میں آپ سفر کرنے والوں کے ساتھ ساتھ نہیں چلتے۔ ان کا رخ کہیں ہوتا ہے اور آپ کا منھ کہیں اور ـــــ انشاجی کی سفرنامہ نویسی کا اعجاز یہ ہے کہ وہ کہیں بھی اپنے سفری تجربات میں قاری کو تنہا نہیں چھوڑتے بلکہ ہر جگہ اور ہر مقام پر اسے اپنے ہمراہ لے کر چلتے ہیں یہاں تک کہ ایک لمحہ ایسا آجاتا ہے کہ انشاجی اپنے قاری کا ہاتھ چھوڑ کر ایک طرف ہو جاتے ہیں اور بقیہ سفر قاری اپنے آپ طے کرنے لگتا ہے۔ اپنے تجربات و مشاہدات میں کسی دوسرے کو اس طرح شریک کر لینے کا ہنر اسی وقت ہاتھ آتا ہے جب سفر کرنے والا اپنے مقصدِ سفر سے پوری طرح آگاہ ہو اور اس کے حواسِ خمسہ پوری طرح کام کر رہے ہوں۔ انشاجی کے یہ سفرنامے پڑھ کر نہ جانے کتنے لوگ اکثر ملکوں کی سیر کر چکے ہیں۔

لیکن اب وہ ایک ایسے نگر کے سفر پر جا چکے ہیں جس کی تلاش اور جستجو نے انھیں عمر بھر اس زمین پہ بے چین و مضطرب رکھا۔ اس نگر کا نام ہے "چاند نگر" زمین سے چاند نگر تک کا سفر انشاجی کا آخری اور طویل ترین سفر ہے۔ کتنا اچھا ہوتا اگر انشاجی چاند نگر سے واپس آسکتے اور ہمیں وہاں کا احوال اپنے دلچسپ اور دل نشیں پیرائے میں سناتے مگر چاند نگر کو جانے والے کب واپس آتے ہیں۔ بہرکیف دروازہ کھلا رکھنا!

غزل نما
تعارف و انتخابِ کلام

ادا جعفری

اسمٰعیل میرٹھی

نام محمد اسمٰعیل، تخلص اسمٰعیل

پیدائش ۱۸۴۴ء مطابق ۱۲۶۰ ھ۔ وفات ۱۹۱۷ء مطابق ۱۳۳۶ ھ

میرٹھ میں پیدا ہوئے۔ اس خاندان کے افراد علم و فضل اور فنون سپہ گری میں ممتاز تھے۔ ابھی کم عمر تھے کہ والد کا انتقال ہو گیا اور انھیں ملازمت اختیار کرنا پڑی اور پھر تمام عمر تعلیم و تدریس و تصنیف میں بسر کی۔

مولانا خود کو مرزا غالب کا شاگرد کہتے تھے۔ یہ نہیں کہا جا سکتا کہ واقعی غالب سے مشورۂ سخن کیا تھا یا یہ محض ان کا اعترافِ عقیدت تھا۔

اسمٰعیل میرٹھی عالم تھے، استاد تھے اور دردمند انسان تھے۔ زیادہ تر تدریسی ضروریات کے لحاظ سے کتابیں تصنیف کیں۔ بچوں کے لیے سادہ و سلیس زبان میں نظمیں لکھیں۔ تراجم بھی کیے۔ مضامین بھی لکھتے تھے۔ کچھ عرصہ ایک اخبار "نجم الاخبار" سے بھی وابستہ رہے۔ اساتذہ کے کلام سے اشعار کا انتخاب بہ لحاظ مضامین بھی کیا تھا۔ یہ تذکرہ کتابی شکل میں شائع ہوا تھا لیکن اب دستیاب نہیں ہے۔

فارسی اور اردو کی متعدد درسی کتب تالیف کیں۔ قواعد اردو کی تحقیق کی۔ پرائمری اسکول کے بچوں کے لیے جو نظمیں لکھی تھیں وہ ان کے کورس کی کتابوں میں طبع ہوئیں۔ پنجاب کے اردو مڈل کورس میں بھی مولانا کی نظمیں شامل تھیں۔

"مثنوی فکرِ حکیم" کے نام سے چھوٹی چھوٹی اخلاقی نظمیں مثنوی کی صورت میں ہیں۔ اسمٰعیل میرٹھی نے جو کتابیں تصنیف و تالیف کیں ان کی فہرست طویل ہے۔

زیادہ تر نظمیں لکھی ہیں۔ کلیات میں غزلیں بہت کم ہیں۔ ان کی غزلوں میں بھی زیادہ تر اخلاقی، اصلاحی اور صوفیانہ مضامین ملتے ہیں۔ قادر الکلام شاعر تھے اور قومی درد سے سرشار۔ علم کو عام کرنا ان کا مقصدِ حیات تھا۔ انجمن ترقی اردو کی مجلسِ شوریٰ کے رکن بھی رہے۔

یہ انتخاب "کلیات وحیاتِ اسمٰعیل" مرتّبہ محمد اسلم سیفی مطبوعہ ۱۹۳۹ء (دیار پرنٹنگ پریس دہلی) سے کیا گیا۔

انتخابِ کلام

سر اس غبار کا دامانِ شہ سوار پہ ہے
ملا فرشتہ کو رتبہ کہاں بشر کا سا

پیامِ مرگ سے لیتا ہوں میں شگونِ وصال
گماں ہے تیر پہ بھی مرغِ نامہ بر کا سا

تو اور عذرِ طعنِ رقیباں غضب ہوا
دل پارہ پارہ جب نہ ہوا اٹھا تو اب ہوا

لبریزِ شکوہ ہائے تغافل تھا میں ولے
لو شکر کا سبب گلۂ بے سبب ہوا

کیا آگے اس کے ولولۂ شوق سر اٹھائے
سجدہ کیا تو ملزمِ ترکِ ادب ہوا

میرے سوا حریفِ ستم کوئی بھی نہ تھا
اب مہربان ہو گئے یہ کیا غضب ہوا

نخوت ہے جس کے کاسۂ سر میں بھری ہوئی
کب مستحق ہے محفلِ رنداں میں جام کا

ظلمت میں کیا تمیز، سفید و سیاہ کی
فرقت میں کچھ حساب نہیں صبح و شام کا

ہیں بے قرار، منزلِ مقصود بے نشاں
رستے کی انتہا نہ ٹھکانا نہ مقام کا

گر دیکھیے تو خاطرِ ناشاد، شاد ہے
سچ پوچھیے تو ہے دلِ ناکام، کام کا

رسوا ہوئے بغیر نہ نازِ بتاں اٹھا
جب ہو گئے سبک تو یہ بارِ گراں اٹھا

یا آنکھ اٹھا کے چشمِ فسوں ساز کو نہ دیکھ
یا عمر بھر مصائبِ دورِ زماں اٹھا

اس انجمن میں جائیے اب کس امید پہ
ہم بیٹھنے نہ پائے کہ وہ بدگماں اٹھا

بے یادِ دوست عمرِ گرامی نہ صرف کر
اس گنجِ شائگاں کو نہ یوں رائگاں اٹھا

واں سے جب کہ اشارہ ہو خود نمائی کا
عجب کہ بندہ نہ دعویٰ کرے خدائی کا

میرا نشاں مٹا تو مٹا پر یہ رشک ہے
وردِ زبانِ شوق ترا نام ہو گیا

اب تک بھی ہے نظر طرفِ بامِ ماہ وش
میں گرچہ آفتابِ لبِ بام ہو گیا

کام اگر حسبِ مدعا نہ ہوا — تیرا اچھا ہوا، برا نہ ہوا
سب جتا یا کیے نیازِ قدیم — وہ کسی کا کبھی آشنا نہ ہوا
رخشِ ایام کو قرار کہاں — اِدھر آیا اُدھر روانہ ہوا
سخت فتنہ جہان میں اٹھتا — کوئی تجھ سا ترے سوا نہ ہوا

کرے جو پاؤں بدراہی تو سونا اس کا بہتر ہے — نہ ہو جس ہاتھ سے نیکی تو ایسا ہاتھ شل اچھا

فراخی و عسرت میں شادی و غم میں — بہر حال یاروں کے تم یار رہنا
خبر بھی ہے آدم سے جنت چھٹی کیوں — خلافِ جبلت تھا بے کار رہنا
سمجھ نہ دیاں اپنی ناکامیوں کو — کہ ہے شرطِ ہمت طلب گار رہنا
اگر آدمی کو نہ ہو مشغلہ کچھ — بہشتِ بریں میں ہو دشوار رہنا

اک کسوٹی ہے ترے کردار کی — مرتبہ کیا، مال کیا، اولاد کیا

سنو گے مجھ سے میرا ماجرا کیا — کہا کرتے ہیں افسانوں میں کیا کیا

کبھی بھول کر کسی سے نہ کرو سلوک ایسا — کہ جو تم سے کوئی کرتا، تمہیں ناگوار ہوتا
ہے اس انجمن میں یکساں عدم و وجود میرا — کہ جو میں یہاں نہ ہوتا، یہی کاروبار ہوتا

دم قدم سے تیرے ہی آباد یہ ویرانہ تھا — تو ہی خود مہمان تھا اور تو ہی صاحب خانہ تھا
رنگِ محفل موجبِ عبرت تھا ہنگامِ سحر — خفتہ مطرب، شمع مردہ، سوختہ پروانہ تھا

کرنے دو بدی کرے جو کوئی — اس کا بھی خدا بھلا کرے گا

خواہشوں نے ڈبو دیا دل کو — ورنہ یہ بحرِ بے کراں ہوتا

ہوں کنجِ قفس میں بند لیکن — بیرون زمین و آسماں ہوں

تاثیر ہو کیا خاک جو باتوں میں گھڑت ہو | کچھ بات نکلتی ہے تو بے ساختہ پن میں

ساقی اِدھر تو دیکھ کہ ہم دیر مست ہیں | کچھ مستیِ نگہ بھی ملا دے شراب میں
کس کس کے جَور اٹھائیں گے آگے تو دیکھیے | دشمن ہے چرخِ پیر زمانِ شباب میں

بس اے رنگ و بو تو نہ کر نازِ بے جا | خدا جانے کیا بات ہم دیکھتے ہیں

جو تشریف لاؤ تو ہے کون مانع | مگر تو کے بد کو بہانے بہت ہیں
ہوا میری روداد پر حکم آخر | کہ مشہور ایسے فسانے بہت ہیں

اتنا تو جانتے ہیں کہ بندے خدا کے ہیں | آگے حواس گم خرد نارسا کے ہیں
احباب کا کرم ہے اگر نکتہ چیں نہ ہوں | ورنہ ہم آپ معترف اپنی خطا کے ہیں

کبھی تقصیر جس نے کی ہی نہیں | ہم سے پوچھو تو آدمی ہی نہیں
کچھ مری بات کیمیا تو نہ تھی | ایسی بگڑی کہ پھر بنی ہی نہیں
کی ہے زاہد نے آپ دنیا ترک | یا مقدر میں اس کے تھی ہی نہیں

افسانہ ہائے شوق سناتا ہوں میں اسے | جو عالمِ خیال میں بھی روبرو نہ ہو

ناصح جو ملامت میں محابا نہیں کرتے | انصاف کریں دل میں کہ وہ کیا نہیں کرتے
اظہارِ مشیخت ہے نشاں بے ہنری کا | جو اہلِ ہنر ہیں کبھی دعویٰ نہیں کرتے
کہتے بھی ہیں پھر صاف مکر جاتے ہیں کہہ کر | کیا شخص ہیں کچھ خوف خدا کا نہیں کرتے

منہ پہ لاؤں تو یہ کم ظرف بہک جائیں ابھی | بات جو پیرِ خرابات نے سمجھائی ہے

بے معصیت خزانۂ رحمت ہے رائگاں | سچ پوچھیے تو جرم نہ کرنا قصور ہے

ہر شکل میں تھا وہی نمودار — ہم نے ہی نگاہ سرسری کی
شاہنشہِ وقت ہے وہ جس نے — تیرے در کی گداگری کی

ذاتِ بشر میں کوئی کرامت ضرور ہے — کیوں بات بات اس کی فرشتے لکھا کیے

تری عطا ہے مری احتیاج سے سابق — کبھی سوال کی نوبت نہ تو نے آنے دی
نہ عرضِ حال کی میں آپ کر سکا جرأت — نہ پوچھنے کی اجازت انھیں حیا نے دی

خارج ہے عہدِ طفلی و پیری حساب سے — البتہ زندگی ہے عبارت شباب سے

دوستی کا میں نے دعوا کب کیا — دور کی صاحب سلامت ہی سہی

ناشناسا کو نہ آئی باور — داستاں اس کی زبانی میری
رخنہ گر ہے مری آزادی میں — ہوسِ بال فشانی میری
خاتمہ ہے مری تمہید میں درج — ہے دل آویز کہانی میری

لو جان بیچ کر بھی جو فضل و ہنر ملے — جس سے ملے، جہاں سے ملے، جس قدر ملے
ملنا برا نہیں ہے ولیکن یہ لت بری — جس سے ملے بصورتِ شیر و شکر ملے

ہے آج رخ ہوا کا موافق تو چل نکل — کل کی کسے خبر ہے کدھر کی ہوا چلے

تمہیدِ پیام ہی میں اپنی — تقریر تمام ہو گئی ہے

شبِ زندگانی سحر ہو گئی — بہرکیف اچھی بسر ہو گئی
یہ ہنگامہ آرا ہیں سب بے خبر — وہ چپ ہیں جنھیں کچھ خبر ہو گئی

مہربانی بھی ہے عتاب بھی ہے — کچھ تسلی، کچھ اضطراب بھی ہے
ہے تو اغیار سے خطاب مگر — میری ہر بات کا جواب بھی ہے

واں زیرکی پسند نہ ادراک چاہیے — عجز و نیاز و دیدۂ نم ناک چاہیے

اچھا ماضی۔ روشن مستقبل
ہم نے ۱۹۵۲ء میں سوئی کے مقام پر قدرتی گیس دریافت کی اور صرف تین سال بعد ۱۹۵۵ء میں اسکی پیداوار اور باقاعدہ فراہمی کا آغاز کرکے صنعت، زراعت اور توانائی کی پیداوار میں اضافہ کیا، پاکستانی معیشت کو توانائی بخشی۔
اب سوئی گیس پاکستان کے چاروں صوبوں میں دستیاب ہے، جس سے معیارِ زندگی بہتر ہو رہا ہے۔ اس طویل عرصے میں کثیر زرِ مبادلہ کی بچت بھی ہوئی - اور آئندہ بھی ہوتی رہے گی۔
قدرتی گیس کے ذخائر کے علاوہ پاکستان پیٹرولیم نے خام تیل بھی دریافت کیا ہے، ہم قومی جدوجہد میں مقدور بھر حصہ لے رہے ہیں۔ اس پر ہمیں فخر ہے۔
پی پی ایل۔ توانائی کی تلاش میں سرگرم عمل
پاکستان پیٹرولیم لمیٹڈ
پی آئی ڈی سی ہاؤس۔ ڈاکٹر ضیاء الدین احمد روڈ۔ پی او بکس نمبر ۳۹۴۲۔ کراچی ۴

احمد ندیم قاسمی

اردو افسانہ

آج کل ہمارے ہاں چرچے تو شاعری کے بہت ہیں، مگر افسانہ بھی کچھ کم پڑھا نہیں جاتا بلکہ شاعری سے کچھ زیادہ ہی پڑھا جاتا ہے۔ افسانہ صحیح معنوں میں ایک عوامی صنفِ ادب ہے۔ اگر وہ سلیقے سے لکھا گیا ہو تو سیدھا معمولی پڑھے لکھے آدمی کے بھی دل میں اتر جاتا ہے۔ یوں ادب کا ایک موثر ہتھیار افسانہ بھی ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ اس کے اثرات دلوں اور دماغوں میں غیر محسوس طور پر نفوذ کرتے ہیں چنانچہ تبدیلی کا احساس صرف انھی کو ہو سکتا ہے جو خود تنقیدی کے فن سے واقف ہیں اور اپنے ذہن اور نفسیات کا جائزہ لینے میں کوئی عار محسوس نہیں کرتے۔

۱۹۴۷ء تک اردو افسانہ ایک معینہ ڈگر پر چلتا رہا۔ لکھنے والوں کے سامنے چند واضح مسائل تھے اور وہ مسائل سراسر ان کے اپنے تھے۔ مغرب کے مختصر افسانے سے انھوں نے بیشتر تکنیک اور ہیئت ہی مستعار لی تھی۔ انھوں نے اپنے معاشرے سے کٹ کر اپنے سیاسی حالات سے آنکھیں پھیر کر افسانہ لکھنے کی شاذ ہی کوشش کی۔ یہ الگ بات ہے کہ اس دور میں بھی اکا دکا ایسے افسانے مل جاتے ہیں جن کے مطالعے سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ افسانہ نگار کے پاس کہنے کے لیے کچھ نہیں ہے اور اگر کچھ ہے تو بہت واجبی سا ہے۔ وہ ذہین ہے اس لیے اس نے مغرب کے افسانوں کے گہرے مطالعے کے بعد انھی کے چربے اپنی زبان میں منتقل کر دیے ہیں، مگر ہمارے مختصر افسانے کے ارتقا میں ان افسانوں کو کوئی دخل حاصل نہیں ہے کیونکہ ان میں صاف معلوم ہوتا ہے کہ افسانہ نگار ایک پُر تکلف جھوٹ بول رہا ہے۔

اعلانِ آزادی کے ساتھ ہی افسانہ نگاروں کے مسائل و موضوعات ایک دم بدل گئے۔ ان میں سے ہر مسئلہ بہت پھیلا ہوا بھی تھا اور بہت اہم اور بنیادی بھی تھا۔ افسانہ نگار ان مسائل کا احاطہ کرنے کی کوشش میں ایک مختصر سی مدت کے لیے تو بالکل چکرا کر رہ گئے۔ وہ بچے کی طرح ہر اس مسئلے پر جھپٹے جو ان کے تخلیقی اظہار کا سہارا بن سکتا تھا، مگر جب وہ اپنے افسانے میں اس مسئلے سے نمٹ رہے ہوتے تھے تو دوسرے بے شمار مسائل انھیں کچوکے دیتے رہتے تھے کہ کچھ ہمارے بھی تو مطالبات ہیں اور ہم بھی تو آپ کی توجہ کے مستحق ہیں۔ یوں یہ دور بوکھلاہٹ اور انتشار کا تھا۔ اس دور کے افسانوں کا عام موضوع فرقہ وارانہ فسادات اور تبادلۂ آبادی تھا۔ عقل اور فکر سے زیادہ ذہنوں

پر جذباتیت اور طیش مسلط رہے ۔ یہی وجہ ہے کہ ان افسانوں سے اس دور کی معاشرتی اور جذباتی تاریخ تو مرتب ہوسکتی ہے مگر ایسے افسانے بہت کم ہیں جنھیں تخلیق پارہ کہا جاسکے۔ میرے خیال میں تو ابھی اس موضوع پر لکھنا باقی ہے۔ جب آج کے افسانہ نگار اپنی ذات کے محبس سے نکل کر اپنے آپ کو اپنے معاشرے اور اپنے عصر کے پس منظر میں دیکھنے اور پہچاننے لگیں گے تو تاریخِ انسانی کے اس بہت بڑے واقعے پر غیر فانی افسانے اور ناول لکھے جائیں گے۔ یہ تاخیر کچھ ایسی قابلِ اعتراض بھی نہیں ہے۔ تخلیقی ادیب کسی واقعے کے سلسلے میں REACT تو فوراً کرتا ہے مگر وہ تخلیقی اظہار پر صرف اس وقت قادر ہو پاتا ہے جب وہ اس ردِّ عمل کو اپنے خون اور اپنی شخصیت میں کھپا لے۔ اس میں کچھ دیر لگتی ہے، مگر یہ دیر مثبت اور نتیجہ خیز ہوتی ہے۔

جب مہاجرین آباد ہونے لگے اور سطح کا تلاطم کم ہوا حالات میں معمول پر آنے کا رجحان نمایاں ہوا تو افسانہ نگاروں نے اپنے آس پاس یوں چونک کر دیکھا جیسے وہ ابھی تک کسی خوفناک طوفان میں سے گزر رہے تھے اور اب ہوا تھمی ہے اور فضا نکھری ہے تو وہ یہ سوچ رہے ہیں کہ وہ کہاں کھڑے ہیں اور انھیں کون سا رخ اختیار کرنا چاہیے۔ اس دور میں افسانہ نگار ملک کے تعمیری مسائل کی طرف متوجّہ ہو گئے۔ ظاہر ہے کہ جب موضوع اپنے وطن اور قوم کی تعمیر ہو تو ضمناً ان عناصر کا بھی ذکر آجاتا ہے جن کی وجہ سے ارتقا کا سلسلۂ عمل ہموار انداز میں نہیں چل سکتا۔ یہیں سے افسانہ نگاروں کے مقاصد پر شبہ کرنے کا رجحان پیدا ہوا اور واضح طور پر افسانہ نگاروں کے دو گروہ بن گئے۔ ایک وہ جو ملک کی تعمیر کی خاطر ان قوتوں سے مصالحت کرنے کو تیار نہ تھے جو تخریبی تھیں اور دوسرے وہ جو ردِّ عمل کے طور پر اپنی ذات کے خول میں بند ہونے لگے تھے۔ صرف اپنی ذات کو اس کی نفسیاتی پیچیدگیوں کو اور اس کی نارسائیوں کو افسانے کا موضوع بنانے کا رجحان آج بھی موجود ہے بلکہ کچھ شدّت اختیار کر گیا ہے۔ اوّل الذکر گروہ کے فن کار افسانے آج بھی لکھ رہے ہیں لیکن وہ کوئی دعویٰ نہیں کرتے۔ البتہ دوسرا گروہ اس امر کا دعویدار ہے کہ انھیں کا افسانہ مستقبل کا اردو افسانہ قرار پائے گا۔ میری نظر میں ذات کا مطالعہ کوئی گناہ نہیں ہے۔ بلکہ میں تو سمجھتا ہوں کہ شعر ہو یا افسانہ، تصویر ہو یا نغمہ، وہ ہر فن کار کی اپنی شخصیت اور اپنی ذات کا اظہار ہوتا ہے۔ لیکن جب فن کار اپنے آپ کو اپنے معاشرے کے دوسرے افراد کے مقابلے میں بہت اونچا یا بہت مختلف یا بہت ذہین یا بہت حقیر سمجھنے لگے تو وہ حادثہ رونما ہوتا ہے جو آج کے جدید اردو افسانے کی صورت میں ہمارے سامنے ہے۔ ذات کا یہ محدود مطالعہ اگر ہمارے اپنے سیاسی اور معاشرتی حالات کی پیداوار ہوتا تو ظاہر ہے کہ اس افسانے کا ہر قاری اسے اپنی ذات کا اظہار قرار دیتا۔ مگر دشواری یہ ہے کہ یہ رجحان دراصل یورپ اور امریکہ کے خاص حالات کا نتیجہ ہے اور وہیں کے افسانہ نگار یہ انداز اختیار کرتے ہوئے بھلے لگتے ہیں اور نقّالی کتنے ہی سلیقے سے کی جائے، آخر نقّالی ہے۔

دوسری جنگِ عظیم کے آخر میں ایٹم بم کی ایجاد اور اس کے بعد انسانیت کی ہمہ گیر ہلاکت کے خوفناک سے خوفناک تر ہتھیاروں کی ایجادیں مغربی ادیبوں کو یہ سوچنے پر مجبور کر رہی ہیں کہ جب ان کی زندگی اور ان کا مستقبل کسی بڑے ملک کے کسی بڑے سیاسی لیڈر کی ذراسی خفگی یا بدلے ہوئے موڈ پر منحصر ہے تو زندگی کا مقصد کیا ہے اور زندہ رہنے

ں مصلحت کیا ہے اور انسانی رشتوں میں کوئی مفہوم کیسے پیدا کیا جاسکتا ہے اور انسان ان کیڑوں مکوڑوں سے
ے مختلف ہوسکتے ہیں جو نہ جانے کتنی تعداد میں روزانہ ہمارے قدموں تلے آکر کچلے جاتے ہیں۔ پھر سائنس کی برق رفتار
ی نے وہاں ان کی جہد و عمل کو بھی شدّت سے متاثر کیا ہے۔ انسانوں کو بیٹھے بٹھائے اتنی سہولتیں میسّر ہو جاتی ہیں
نہیں اپنا وجود سراسر بیکار محسوس ہونے لگتا ہے۔ انھیں اسباب کی بنا پر وہاں کے معاشرے میں انتشار کی
یت ہے۔ پرانی اخلاقی قدریں بے معنی نہیں ہوئیں تو بظاہر اپنی افادیت کھو چکی ہیں اور ان کا مذہب بھی اب تک
کا سہارا نہیں بن سکا۔ ظاہر ہے کہ ہمارے ہاں حالات ایسے نہیں ہیں۔ ہم مشرقی ہیں اور مادے کے ساتھ ہمارا تعلق
شدید نہیں ہے کہ ہم روحانیت اور وجدان کو نظر انداز کر کے زندگی کے مسائل پر غور کریں۔ ظاہر ہے کہ ہمارے
سانہ نگاروں کا طرزِ عمل مغربی افسانہ نگاروں کے مقابلے میں بہت نمایاں حد تک مختلف ہونا چاہیے۔ لیکن افسوس
بات یہ ہے کہ آہستہ آہستہ یہ اختلاف جس کا دوسرا نام انفرادیت ہے، ختم ہو رہا ہے اور یوں جو نیا افسانہ تخلیق ہوتا
۔ وہ ہماری زندگی کی کما حقہٗ عکاسی نہیں کرتا اور جو فن پارہ ہماری اپنی زندگی، ہمارے اپنے معاشرے، ہمارے اپنے
ی وطن کے ظاہر و باطن کی عکاسی میں کامیاب نہیں ہوتا، اسے اپنے ادب میں شامل کرتے ہوئے ہمیں ذرا سی جھجک
ور محسوس ہوتی ہے۔ کسی حد تک یہ صورتِ حال بھی گوارا تھی اگر نئے افسانہ نگار تجرید اور اس کی بہت سی دوسری
حتوں سے اس شدّت سے متاثر نہ ہوتے۔ تجرید کی اہمیت سے مجھے کوئی انکار نہیں، فن میں تجرید کا عنصر ہمیشہ
جود رہا ہے۔ ہماری غزل اس کی بہترین مثال ہے۔ لیکن اس زمانے کا انسان انتہا پسندی کا شکار ہو کر رہ گیا
۔ وہ ہر معاملے میں افراط تفریط سے کام لیتا ہے، ایک انتہا سے دوسری انتہا تک جاتا ہے مگر اعتدال کا کوئی
ستہ اس کو دکھائی نہیں دیتا۔ یا وہ اس رستے پر چلنا ہی نہیں چاہتا۔ نتیجہ یہ ہے کہ ہمارے نئے افسانے میں افسانے
ے زیادہ تجرید ہوتی ہے اور ابہام کا جو طوفان ہماری نئی شاعری میں آج سے چند برس پہلے پیدا ہوا اس نے ہمارے
سانے کو بھی اپنی لپیٹ میں لے لیا ہے۔ کتنے دکھ کی بات ہے کہ نثر جس میں فن کار کی شخصیت کا براہِ راست اظہار ہوتا
، اور جو شعر کے مقابلے میں آج بھی بہت مقبول صنف ہے، ابلاغ کی قوت سے محروم ہو رہی ہے۔ سوال یہ ہے کہ جو افسانہ
ار اپنے نقطۂ نظر یا اپنے فن کے حسن یا اپنے جذبے اور خیال کو قاری تک منتقل نہیں کر سکتے وہ افسانہ نگاری کرتے ہی کیوں ہیں۔

افسانے میں ابہام کی یہ روش بہت سے نئے افسانہ نگاروں کو جنم دے رہی ہے اس لیے کہ ایسے افسانے لکھنا
ت آسان ہے جن کا کوئی واضح مفہوم مرتب نہ ہو اور جب افسانہ نگار سے پوچھا جائے کہ اس افسانے میں آپ کہنا
ا چاہتے ہیں تو وہ یہ جواب دے کہ مجھے تو جو کہنا تھا وہ کہہ چکا۔ اب اس کی تشریح اور تفسیر میری ذمہ داری نہیں۔ یہ
کل اس استاد کی سی روش ہے جو اپنے طالب علم کے کسی سوال کے جواب سے بے خبر ہونے کی بنا پر اسے ڈانٹ دے کہ
بے معنی سوال کر رہے ہو۔ اس کے باوجود آج بھی بعض خوبصورت، بہت واضح اور بہت نکھرے ہوئے افسانے
ے جا رہے ہیں.... ان کی تعداد کم سہی مگر اندھیری رات میں چند چراغ بھی ٹمٹما رہے ہوں تو تیرگی ایسی تشویشناک
ہیں رہتی۔ پھر نئے افسانہ نگاروں میں جوہرِ قابل کی کمی نہیں ہے۔ مجھے یقین ہے کہ جب وہ ذرا سے بڑے ہوں گے

ان کا مشاہدہ وسیع ہوگا، ان کے تجربات میں اضافہ ہوگا، انسانی رشتوں کی خوبصورتیاں اور خامیاں ان پر واضح ہوں گی، پھر جب وہ اپنے وطن کی دھرتی سے پیار کرنا سیکھیں گے اور جب انھیں محسوس ہوگا کہ بعض خصوصیات کے معاملے میں ہمارا ملک اور ہماری قوم منفرد ہے اور مشرقی اور پاکستانی اور مسلمان ہونا ہمارے لیے باعثِ ندامت نہیں ہے اور مغرب کی اندھادھند تقلید ہمارے لیے باعثِ فخر نہیں ہے تو وہ ایسے افسانے لکھیں گے جن کے لیے اردو افسانہ نگاری کی آغوش ہمیشہ وا رہے گی۔ میں یہ نہیں کہتا کہ افسانے کی مروّجہ تکنیک میں کوئی تبدیلی نہ ہو۔ میں یہ بھی نہیں کہتا کہ افسانہ نگار کے موضوعات محدود کر دیے جائیں۔ میں فن میں تجربے کی اہمیت سے بھی منکر نہیں ہوں، لیکن ان کوششوں کے لیے بے حد ضروری ہے کہ کہنے والا جو کچھ کہے، اسے خود بھی سمجھتا ہو۔ اس لیے کہ اگر وہ خود سمجھے گا تو جبھی دوسروں کو سمجھا سکے گا۔ اردو افسانے کا مستقبل میری رائے میں تاریک نہیں ہے۔ بس اتنا ہے کہ جس دور سے ہم گزر رہے ہیں وہ مختصر سے مختصر کر دیا جائے تو بہتر ہے۔

جدید افسانے میں ذہانت اور انفرادیت کی جھلکیاں بہت افراط سے ملتی ہیں مگر ابھی یہ افسانہ اپنے آپ کو پا نہیں سکا ہے۔ نیا افسانہ نگار تجربے کر رہا ہے، نئے امکانات کے سراغ لگا رہا ہے، نئے طرزِ احساس کے مطابق نئے طرزِ اظہار کی جستجو میں ہے۔ ابھی اس کے قدم جمنے نہیں پائے، مگر آخر کار اس کے قدم جمیں گے کیونکہ اب آہستہ آہستہ وہ پاکستان کی دھرتی پر اُتر رہا ہے اور اس کے ہاں پاکستانیت نمایاں ہو رہی ہے جو ہمارا فخر بھی ہے اور ہماری پہچان بھی ہے۔

ڈاکٹر مظفر حنفی

قرۃ العین حیدر ــــ ایک مطالعہ

یادش بخیر! اب سے کوئی چالیس برس اُدھر اپنے زمانے کی ایک بڑی ادیبہ نے ایک نئی افسانہ نگار کے نام اپنے طویل ناصحانہ خط میں بعد دعا کے واضح کرنا چاہا کہ بھئی یہ شوشو، فوفو، بھارت ناٹیم، سیوائے ڈیلامار کے سوئمنگ پول میں کب تک ڈبکیاں لگاتی رہوگی۔ ایک بار ذرا باہر جھانک کر بھی دیکھو۔ ایک ہی نکتے پر کتنے چکر دوگی۔ کیا ساری عمر "میری گو راؤنڈ"، پر ہی گھماتی رہو گی ؟ لوگ کہیں بَولا نہ جائیں اور پھر جب وہ چڑھ کر تنقید کریں گے تو اس میں جھنجلاہٹ اور انتقام کے نشتر پوشیدہ ہوں گے۔ پھر تمہارا دل ٹوٹ جائے گا اور تم اس کوچے سے بچ کر کوئی دوسری "ہوبی" پکڑلوگی۔

یہ خط قرۃ العین حیدر کے نام تھا، لیکن اس کی مکتوب نگار عصمت چغتائی نے اسے سپرد ڈاک کرنے کی بجائے اس خیال سے ردّی کی ٹوکری کے حوالے کر دیا کہ کہیں ان کے اعتراض سے دل برداشتہ ہو کر چڑیا پھر سے اُڑ کر دوسری ڈال پر نہ جا بیٹھے۔ وہ تو خیر سے کئی برس بعد جب ان کا مضمون "پوم پوم ڈارلنگ" شائع ہوا تو پتا چلا کہ ترقی پسند افسانہ نگار عینی کے بارے میں کیا سوچتے تھے۔

یہ وہ زمانہ ہے جب قرۃ العین حیدر "رقصِ شرر"۔ "مونا لیزا"۔ "جہاں کارواں ٹھہرا تھا"۔ "پروانہ کے بعد" اور اسی طرز کے دوسرے افسانوں کی تخلیق میں مصروف تھیں جو ان کے اوّلین افسانوی مجموعے "ستاروں سے آگے"، میں شامل تھے۔ ان افسانوں میں جدید طرزِ ادا اور پُرلطف اسلوبِ نگارش کے باوصف تخلیقی کائنات کے محدود ہونے کا احساس ہوتا ہے۔ خواب ناک ماحول اور عنفوانِ شباب کے رومانی احساسات سے مملو یہ افسانے ایک نوع کی یکسانیت کا شکار ہیں۔ ملاحظہ ہو۔ "جہاں کارواں ٹھہرا تھا"، کا اقتباس :

> "اس سنسان، اکیلی روش پر نرگس کی پتّیوں کا سایہ جھک گیا۔ بیکراں رات کی خاموشی میں چھوٹے چھوٹے خداؤں کی سرگوشیاں منڈلا رہی تھیں۔ پیانو آہستہ آہستہ بجتا رہا اور اسے ایسا لگا جیسے ساری کائنات ایک ذرّے کے برابر بھی نہیں ہے اور اس وسیع خلا میں صرف اس کا خیال اس کی یاد، اس کا تصوّر لرزاں ہے اور اس وقت اس نے محسوس کیا کہ رات، مرغزاروں کی ہوا اور اس کی یاد ایک بار پھر جمع ہو گئے تھے، لیکن اسی وقت دھندلے ستاروں کی مدّھم

چیخیں آسمان پر گونج اٹھیں اور ان تینوں ساتھیوں کو منتشر کرتی ہوئی پہاڑیوں کی
دوسری طرف جا کر ڈوب گئیں۔"

پیش کردہ عبارت کی دل کشی اور رومانیت اپنی جگہ، لیکن اتنے سے فقروں میں ہی "چھوٹے چھوٹے خداؤں کی سرگوشیاں" اور "دھندلے ستاروں کی مدھم چیخیں"، جیسی مماثل اور یکساں ترکیبیں دیکھنے اور پڑھنے میں آتی ہیں۔ "ستاروں سے آگے" میں شامل تقریباً سبھی افسانوں میں اس خامی کا احساس ہوتا ہے۔ ان کے برعکس عینی کے دوسرے افسانوی مجموعے "شیشے کے گھر" میں شامل بیشتر کہانیاں وہ ہیں جن کی روشنی میں اس عہد کے باکمال کہانی کار پیشن گوئی کرتے تھے کہ یہ ستارہ جلد ہی آفتاب ادب بن کر آنکھوں کو خیرہ کر دے گا۔ ایک اقتباس "برف باری سے پہلے" کا ملاحظہ ہو:

"کائنات اتنی بشاش ہے۔ یہ معصوم سپید پھول، بلوریں جھرنے، کنوارے مقدس برفیلے پہاڑ — اُس بڑی لڑکی نشاط نے اس سے کہا تھا — دیکھو یہ کھلا نیلا آسمان، اُونچے درخت قرمزی بادل، ہمارے چاروں طرف ہر چیز اتنی عظیم ہے، اتنی بلند ہے، اتنی فراخ دل ہے — ایسے میں کیا تم زندگی سے مایوس ہو سکتے ہو۔"

یہ مطالعے کی نمایش اور ماڈرن لڑکیوں کی عشوہ طرازیاں، یہ کرشن چندر جیسی ٹھوس رومانیت، حجاب اسمٰعیل جیسی طلسمی فضائیں اور عصمت چغتائی جیسے چٹخنے ہوئے مکالمے مل جل کر خاص قرۃ العین حیدر کی اپنی تراش خراش، رنگینی اور لوچ دار اسلوب کی تشکیل کرتے ہیں، لیکن جب عینی نے اسی اسلوب کو اپنا فن قرار دے لیا تو عصمت اور دوسری ترقی پسند افسانہ نگار اور نقاد اس سینڈریلا سے زمین پر اُتر آنے کا اصرار کرنے لگے اور "یوم یوم ڈارلنگ" کو اطالوی دریچے سے ہٹ کر زندگی کی تیز دھوپ میں سفر کرنے کا مشورہ دیا جانے لگا۔ اس موقع پر ان کے ایک افسانے "کیکٹس لینڈ" کا یہ حصہ بھی پیش کرنے کے لائق ہے:

"اب خزاں بھی واپس جا رہی ہے اور سفیدے کے جنگل پر ہریالی اُتر رہی ہے اور جھیل کے پرے کنارے تک پھیل آتے ہیں۔ اور جب سبز بانس کا جھنڈ پانی کی سطح پر جھک کر ہواؤں میں ڈولتا ہے تو چپکے سے رونے کو جی چاہتا ہے۔ سفیدے کا چھوٹا سا جنگل اسی طرح چُپ چاپ کھڑا ہے اور ایسی کی خانقاہ بھی اسی طرح خاموش اپنی جگہ پر موجود ہے اور کبھی کبھی کوئی راہ گیر پتوں کو روندتا، سفیدے کے جھنڈ سے گزر جاتا ہے۔"

عینی کے یہ افسانے تقسیم ملک اور ہجرت کے المیوں سے بھی واسطہ رکھتے ہیں اور دو عالم گیر جنگوں کے وسیلے سے اُبھرنے والے بین الاقوامی مسائل زندگی کے آئینہ دار بھی ہیں جنھوں نے ہماری جذباتی، ثقافتی اور روحانی بنیادوں کو متزلزل کر دیا ہے۔ بٹوارے کے بعد برصغیر کی معاشرتی زندگی جس اخلاقی زوال اور اقدار کی شکست و ریخت سے دوچار ہوئی۔ انسانی رشتوں کی بے وقعتی کے دردناک پہلو جس طرح حقیقت بن کر ہمارے سامنے آئے ان کی جیتی جاگتی تصویریں قرۃ العین حیدر کے ان ابتدائی افسانوں میں دیکھی جا سکتی ہیں۔ بایں ہمہ چوں کہ بعض لوگ انھیں ایک خاص سیاسی نظریہ کی عینک لگا کر دیکھتے تھے اس لیے

ان کہانیوں کی معاشرتی حقیقت نگاری ان کی نگاہوں سے پوشیدہ رہی۔ ان کہانیوں میں شعور کی رو سے لے کر لاشعور کے تجزیے تک بات کہنے کے متعدد اسالیب بھی تخلیق کیے گئے ہیں اور پلاٹ اور کردار پر مشتمل روایتی افسانوں سے الگ ہٹ کر تجریدی اور علامتی کہانیاں پیش کرنے کی کامیاب کوششیں بھی کی گئی ہیں لیکن مجموعی حیثیت سے یہ افسانے اودھ کی مشترکہ تہذیب کے زوال کا مرثیہ ہیں۔

"شیشے کے گھر" کے بعد قرۃ العین حیدر کی بہترین تخلیقات میں بیشتر طویل افسانے ہیں مثلاً "سیتا ہرن"، "ہاؤسنگ سوسائٹی"، "چائے کے باغ"، "دلربا"، "اگلے جنم موہے بٹیا نہ کیجو" اور "سینٹ فلورا آف جارجیا کے اعترافات" وغیرہ۔ ہر چند کہ علی کے علاوہ کرشن چندر، عزیز احمد، ممتاز شیریں، اشفاق احمد، جمیلہ ہاشمی، جیلانی بانو، تسنیم سلیم چھتاری، راجندر سنگھ بیدی، ابو الفضل صدیقی اور چند دیگر اہل قلم نے بھی طویل کہانیاں لکھی ہیں لیکن معیار و تعداد کے اعتبار سے اس میدان میں قرۃ العین حیدر کا پلڑا سب پر بھاری نظر آتا ہے۔ موصوفہ کے طویل افسانوں میں جو عمق، وسعت اور ہمہ گیری ہے مذکورہ بالا دیگر افسانہ نگاروں میں اس کا اکثر فقدان ہے۔ تاریخ کے خلّاقانہ شعور کے ساتھ اپنی تہذیبی جڑوں کی تلاش ان افسانوں میں جس فن کاری کے ساتھ کی گئی ہے وہ اپنی مثال آپ ہے۔ علاوہ ازیں اپنی کہانیوں میں قرۃ العین حیدر نے تکنیک کی جتنی جہتیں کی ہیں، منٹو کے علاوہ اس کی اور نظیریں اردو فکشن میں کم نظر آتی ہیں۔ "ہاؤسنگ سوسائٹی" میں سلمیٰ اور زاویری کو ایک ساتھ دیکھ کر اچانک ثریّا کا ذہن واقعات کے تانے بانے ماضی سے ملا لیتا ہے:

> "دفعتاً ایک بھیانک دھماکہ ہوا اور سامنے کے اس سنیما اسکوپ نظارے کے پرخچے اُڑ گئے۔ سیاہ دھواں اور سرخ شرارے ساری فضا میں رقصاں تھے۔ بہت دور ایک مہیب جوالامکھی نے آگ اگلنا شروع کی گرم گرم لاوا اُبل کر سارے   میں پھیل گیا۔ آتش فشاں کی گڑگڑاہٹ، زلزلے کے دھماکوں، آرکیسٹرا کے سروں، راک اینڈ رول کے شور، قہقہوں اور گلاس کی کھنکھناہٹ میں سے گزرتی ایک مدھم، اداس، خوبصورت آواز ثریّا کے کانوں میں گونجی — ماضی کی محل سرائیں جل کے راکھ ہوئیں مگر ابھی اس ملبے کی بنیادوں پر دونوں ملکوں میں بورژوازی کے نئے محل کھڑے ہوں گے۔ کل کے جاگیردار کی جگہ آج کا سرمایہ دار ——— ثریّا نے سہم کر آنکھیں بند کر لیں۔ یہ بلوریں کٹ گلاس کے فانوسوں سے جگمگاتے اطالوی معمار کا بنایا ہوا الٹرا ماڈرن جمشید ہاؤس نہیں تھا۔ یہ ضلع سلطان پور کے تعلقے درگا کنڈ کی نیم تاریک گڑھی تھی جس میں وہ خود لبنیٰ بیگم مقید تھی۔ پھر درگا کنڈ کی گڑھی جمشید ہاؤس میں تبدیل ہوگئی۔ اس میں چھوٹی بٹیا قید تھیں۔"

حال سے ماضی میں لمبی چھلانگ لگانا اور ماضی کو حال کے تناظر میں دیکھنا قرۃ العین حیدر کا محبوب تخلیقی مشغلہ ہے اور وہ حال کو مستقبل سے جوڑنے کے فن میں بھی طاق ہیں جس کی ایک تابناک مثال علی کا افسانہ "روشنی کی رفتار" ہے لیکن ہم فی الحال اپنی گفتگو کا دائرہ ان کے طویل افسانوں تک محدود رکھیں گے۔ لہٰذا "سیتا ہرن" کے اختتامیہ سے

یہ سطریں دیکھیے :-

" ابھی دن باقی ہے۔ پھر رات ہوگی۔ ایک اور دن ــــ ایک اور رات سلسلۂ روز و شب نقش گرِ حادثات۔ دن اور رات کا حساب رکھنے کی غلطی کبھی نہ کرنا۔ وقت کا حساب کوئی نہیں لگا سکا ہے۔ مجھ کو یہ کہنا ہے یہ، مجھ کو یہ کہنا ہے یہ ـــ سلسلۂ روز و شب، صیرفیِ کائنات "

" سیتا ہرن " نئی ہندوستانی عورتوں کا المیہ ہے۔ آج کی عورت قرۃ العین حیدر کے نزدیک ایک بے وفا تمدن کی پیداوار اور بے کردار تہذیب مخلوق ہے جو زندگی کی لڑائی بار بار ہارتی ہے اور وقت کا راون اس کے ساتھ روپ بدل بدل کر جبر و جور کرتا ہے۔ آزادیِ نسواں کے بارے میں لمبی چوڑی تقریریں کرنے والے مرد کے ہاتھوں عورت کو آج بھی ظلم ہی سہنے پڑتے ہیں اور اسے محض آلۂ تفریح تصور کیا جاتا ہے۔" چائے کے باغ " میں نہایت معصوم اور مقدس فطری منظرنامے پر جدید معاشرے کے تصنع پسند مرد اور عورتیں جھوٹی محبتوں کے سوانگ رچاتے اور جنسی بے راہ روی کے مظاہرے کرتے نظر آتے ہیں اور اس منظرنامے کو سرمایہ دار و مزدور کی طبقاتی کشمکش کے رنگ مزید پُراسرار بناتے ہیں، لیکن اکثر علاقائی انداز میں عینی روشن مستقبل کی ہلکی سی جھلکیاں بھی دکھلا دیتی ہیں۔ مثلاً :

" لیکن گھنے درختوں سے گھری سڑک سنسان پڑی تھی۔ خود رو اودے پھولوں پر سفید تتریاں اُڑ رہی تھیں۔ جھاڑیاں شہد کی مکھیوں کی بھنبھناہٹ اور پرندوں کی چہکار سے گونج رہی تھیں۔ مسٹر فریند کا کہیں نام و نشان نہ تھا۔ میں نے ایک اونچے ٹیلے پر پہنچ کر ڈرائیور سے جیپ روکنے کو کہا اور نیچے اُتر کر دُور بین کے ذریعے چاروں طرف دیکھنے لگی۔ راستے کے آگے سے مکمل خاموشی شروع ہوتی تھی۔ اس خاموشی میں زرد پتوں پر چلتی ہوئی میں وادی کے سناٹے میں داخل ہوگئی۔ نیچے سڑک پر دو دکھاسی نوجوان سائیکلوں پر جا رہے تھے اور سفید گھاس ہوا میں لہرا رہی تھی "

یہ تصنع تہذیب کی نمائندہ مسٹر فریند کی موجودگی سے پاک، معطر اور رنگین منظرنامے پر دو دکھاسی نوجوانوں کا سفر طے کرنا اور سفید گھاس کا لہلہانا خوش گوار مستقبل کی واضح بشارت نہیں تو اور کیا ہے؟ " اگلے جنم موہے بٹیا نہ کیجو " میں عینی کی کردار نگاری اپنی معراج پر نظر آتی ہے۔ ہر چند کہ اس طویل افسانے کا موضوع بھی عورت کی بے بسی اور اس کا استحصال ہے جس کی علامتیں دو مختلف جہات میں دو بہنیں ہیں۔ جن میں جو غیرت مند اور خود دار، ایثار پیشہ اور مخلص ہے اور دوسری بہن رشکِ قمر جو قدرے دنیا دار ہے، لیکن انجام کار دونوں سرمایہ دارانہ نظام کے استحصال کا ہدف بنتی ہیں۔ مفلس، پسماندہ اور مجبور عورتوں کی یہ داستان انتہائی لرزہ خیز ہے جس کا بنیادی رنگ قنوطیت آمیز ہے۔ ان طویل کہانیوں میں کسی منظم اور باقاعدہ پلاٹ پر زور کم ہے اور شعور کی رَو کے سہارے طنزیہ اسلوب میں روانیِ طبع اور جولانیِ فکر کے جوہر دکھائے گئے ہیں۔ بعض نقاد انھیں ناولٹ بھی کہتے ہیں۔ بہر نوع خواہ یہ طویل افسانے کہے جائیں یا ناولٹ، اس فن پر عینی کی مکمل گرفت اور تخلیقی زبان کے استعمال نے انھیں قرار واقعی نوعیت کا حامل بنا دیا ہے۔

اس کا مطلب یہ نہیں کہ عینی کے مختصر افسانے غیر اہم ہیں۔ ان کی درجنوں کہانیوں میں سے " جلاوطن "

"بت جھڑ کی آواز"۔ ملفوظاتِ حاجی گل بابا بیکتاشی"۔ "یہ غازی یہ تیرے پُر اسرار بندے"۔ "کہرے کے پیچھے"۔ "روشنی کی رفتار" "لکڑ بگھے کی ہنسی"۔ "آئینہ فروشِ شہر کوراں"۔ "نظارہ درمیاں ہے"۔ "سیرتِ آوارہ گرد"۔ "یاد کی اک دھنک جلے" وغیرہ اردو کے ہر اچھے انتخاب میں شامل کیے جانے کے لائق نگارشات ہیں۔ ان کہانیوں میں کہیں عینی ماضی قریب کی تاریخ کو حال سے جوڑتی ہیں، کہیں قدیم ہندوستانی تہذیب کے نقوش ابھارتی ہیں تو کہیں اسلامی متصوفانہ روایت سے استفادہ کرتی نظر آتی ہیں۔ اکثر و بیشتر ان افسانوں میں بھی "شیشے کے گھر" کی کہانیوں کی مانند تقسیمِ ہند سے پیدا شدہ مسائل، فسادات، ہجرت اور نئی زندگی کے تقاضوں تلے ٹوٹتی بکھرتی قدیم جاگیردارانہ اقدار کی پامالی کو موضوعِ سخن بنایا گیا ہے۔ مثال کے طور پر "جلا وطن" یا یہ اقتباس پیشِ خدمت ہے:

"اب ڈپٹی صاحب کی مالی حالت بھی ابتر ہوتی جا رہی تھی۔ اصغر عباس پاکستان سے روپیہ نہ بھیج سکتا تھا۔ جو تھوڑی بہت زمینیں تھیں ان پر ہندو کاشت کار قابض ہو گئے تھے اور دیوانی کی عدالت میں ڈپٹی صاحب کی فریاد کی شنوائی کا سوال ہی پیدا نہ ہوتا تھا۔ چھوٹی اماں مرحومہ کی مقدمہ بازیوں کے بعد جو کچھ زیور بچ رہا تھا وہ بڑی بھاوج نے سمیٹ کر بہو کے حوالے کر دیا جو وہ پاکستان لے گئی۔ باقی روپیہ ڈپٹی صاحب کی پنشن کا کشوری کی تعلیم پر خرچ ہو رہا تھا، ان کے علاج کے لیے کہاں سے آتا اور رفالج تو بُوا ایسا روگ ہے کہ جان لے کر پیچھا چھوڑتا ہے۔ چناں چہ نوبت یہ پہنچی کہ چپکے چپکے بھاوج نے چھمّو بیگم کے ذریعے چند ایک گہنے جو بچ رہے تھے، فروخت کرا دیے۔ ویسے اس میں ایسی شرم کی تو کوئی وجہ بھی نہ تھی۔ وہ جو مثل ہے کہ مرگِ انبوہ جشنے دارد۔ ان گنت مسلمان گھرانے ایسے تھے جو اپنے اپنے گہنے اور چاندی کے برتن بیچ بیچ کر گزارا کر رہے تھے۔"

اور ملک کی تقسیم کے نتیجے میں جس طرح ادب اور آرٹ کو بھی تقسیم کرنے کی کوشش جاری تھی۔ عینی کے افسانوں میں اس ستم ظریفی پر بھی شدید احتجاج کی جھلکیں نظر آتی ہیں۔ مثلاً "ہاؤسنگ سوسائٹی" کا یہ اقتباس دیکھیے:

"مشرقی پاکستان کے کلچر کا ایک سمبل ہے۔ وہاں کی ندیاں، بوٹ مین، ہاتھی اور مچھلیاں۔"

موئی فرانسیسی نے جو شکل سے ذرا احمق معلوم ہوتا تھا، عینک ناک کی پھننگ پر اچھی طرح جمائی اور آنکھیں سکیڑ کر تصویر کو دیکھا۔

اس طرح کے چلتے پھرتے بظاہر بے ضرر لیکن دراصل گہرے کٹیلے طنز آلود فقرے قرۃ العین کے مختلف افسانوں میں تلاش کیے جا سکتے ہیں۔ ایسا ہی مکالمہ ان کی کہانی "روشنی کی رفتار" میں توت اور پدما کرن کے مابین ہوتا ہے۔ اور توت جو صدیوں پہلے کا کردار ہے، عہدِ حاضر کی پدما سے طنزاً سوال کرتا ہے:

"بتاؤ مجھ سے ساڑھے تین ہزار سال بعد تم کتنی متمدن ہو۔ ہم بنی اسرائیل پر ظلم ڈھاتے تھے اور اشوریہ سے لڑتے تھے۔ تم سب ایک دوسرے کے ساتھ بے انتہا پیار و محبت سے رہتے ہو۔ ہمارے فراعنہ ستم پیشہ تھے، تمہارے حکمراں فرشتے ہیں۔ ہم موت سے ڈرتے تھے، تم موت کے خوف سے آزاد ہو چکے ہو تم عالیشان مقبرے نہیں بناتے، مردہ پرستی نہیں کرتے، نوحے نہیں لکھتے، شعر و شاعری بھی ترک کر چکے ہو۔ تمہارے مذاہب، فلسفے، اخلاقیات، نفسیات، وہ وہسکی کا گلاس میز پر پٹخ کر زور سے ہنسا۔ تمہاری

دیو مالائیں، نظریۂ تثلیث، روحانیت، یہ، وہ، سب عین سائینٹفک ہیں۔ تمہاری جنگیں بھی مونزم پر مبنی ہیں، تمہارا نیوکلیئر بم بھی خالص انسان دوستی ہے ــــ ہے نا؟ تمہاری روشنی کی رفتار واقعی تیز ہے!"

قرۃ العین حیدر کا کمال یہ ہے کہ وہ تاریخ کے حوالے سے ماضی کے کرداروں کی سوانح حیات کو پیش کر دینا کافی نہیں سمجھتیں بلکہ کہانی کو گزشتہ تہذیبی اقدار کی بازآفرینی کا وسیلہ بنا دیتی ہیں۔ عینی کے افسانے تاریخی حیثیت کے حامل ہیں تو اس کا سبب محض ان کا وسیع مطالعہ و مشاہدہ ہی نہیں، اصل قوت وہ تخلیقی جوہر ہے جس کے لمس سے ماضی، حال اور حال مستقبل میں تبدیل ہو جاتا ہے۔

عینی کے افسانوں میں سے بیشتر کا مرکزی کردار کوئی عورت ہے اور ان کے نسائی کردار زمانے کی بے اعتباری، فریب خوردگی، شکستِ آرزو اور ہزیمت کے نمایندہ ہیں۔ "جلاوطن" کی کنول رانی، "چائے کے باغ" کی راحت کاشانی، "دلربا" کی گلنار ــــــــ "اگلے جنم موہے بٹیا نہ کیجو" کی قمرن "ہاؤسنگ سوسائٹی" کی ثریا حسین، ایسے ہی افسانوں کے مرکزی کردار ہیں اور ان میں سے اکثر مردوں کے مقابلے پر بڑی خود اعتمادی کے ساتھ اس انداز میں پیش کیے گئے ہیں کہ کہیں کہیں خود پسندی کی جھلک نظر آنے لگتی ہے۔ ان میں رومانیت، جذباتیت، خلا، سرکشی اور حق پسندی کے اوصاف نمایاں طور پر محسوس کیے جا سکتے ہیں۔ اکثر یہ کردار زود حس اور زود رنج بھی ہیں لیکن نرمی اور لطافت ان کے مزاجوں کا جزوِ لازم ہے۔

اس نکتے پر بھی دو رائیں نہیں ہو سکتیں کہ قرۃ العین حیدر کو بیانیہ پر مکمل قدرت حاصل ہے اور وہ شستہ، شائستہ، سلیس اور رواں دواں زبان استعمال کرنے پر عبور رکھتی ہیں۔ ان کے مکالمے برجستہ ہوتے ہیں اور لہجے میں حسبِ ضرورت نرمی یا کاٹ پیدا کرنے کا شعور بھی انھیں حاصل ہے۔ مختلف مواقع، مدارج، طبقات اور طبائع کے کرداروں سے مزاجی مطابقت و موافقت رکھنے والا طرزِ گفتار وہ بخوبی اختیار کر سکتی ہیں۔ ذرا ایک مکالمے کا یہ جزو دیکھیے:

الف: "یہ سمبلز کی دنیا ہے۔ مجھے ہر شے میں سمبل نظر آتا ہے۔ میں ہمہ وقت سطروں کے درمیان پڑھتا رہتا ہوں۔

ب: تم نے جو کچھ پڑھا ہے بھول جاؤ۔ ہمارے ماہرینِ تعلیم اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ تعلیم بے کار ہے۔

الف: وہ ٹھیک کہتے ہیں۔ ہمیں کتابوں کے بجائے بندوقوں کی زیادہ ضرورت ہے۔ قوم کے نونہالوں کو کتابوں کی جگہ بندوقیں دو تاکہ وہ مجاہد بنیں۔ مردِ مومن، شاہین۔

ب: تعلیم، یہ سب غریبوں کی افیم ہے۔ غریبوں کو افیم مت دو۔ اسے کھا کر ان کا دماغ چکرا جاتا ہے۔ ان کی عقل چرخ ہو جاتی ہے!

الف: مگر یہ اتنا چلاتے ہیں۔

ب: چلانے دو۔ تم نے ان کتوں کو دیکھا ہے جو سرد راتوں میں چاند کے نیچے بیٹھ کر آسمان کی سمت منہ اٹھائے روتے ہیں؟

الف: چاند کی تمنا ہیں؟

ب: نہیں۔ ان کو محض سردی لگتی ہے۔"

مکالموں میں ندی کی سی روانی، بات سے بات پیدا کرنے کا انداز اور معمولی معمولی جملوں میں نشتر کی نوک پیدا کرنا عینی کے قلم کا وصف ہے۔

قرۃ العین حیدر کے افسانوں کا مطالعہ ہمیں اس نتیجے پر پہنچاتا ہے کہ ایک طرف تو ان کے طویل افسانے ناولٹ کی حدوں کو چھوتے ہیں اور دوسری طرف موصوفہ کا مختصر سے مختصر افسانہ بھی کتاب کے کم از کم بیس پچیس صفحات ضرور گھیرتا ہے جب کہ افسانے کے ساتھ اختصار اور وحدتِ تاثر کی بنیادی شرائط ابتدا سے وابستہ رہی ہیں۔ لگتا ہے ان کے پاس کہنے کے لیے بہت ساری باتیں ہیں جنھیں وہ سمیٹ کر کہنا نہیں چاہتیں یا کہہ نہیں سکتیں۔ وہ تو عمری سے تنہا رہتی آئی ہیں، گھریلو زندگی کے جھمیلوں سے آزاد رہی ہیں۔ خوب دنیا دیکھی ہے۔ مشاہدے اور مطالعے کی سہولت اور استطاعت انھیں حاصل رہی ہے۔ پڑھنے کے لیے انھیں مواد بھی خوب ملا ہے اور وقت بھی ان کے پاس وافر تھا۔ اعلیٰ طبقے یا اپر مڈل کلاس سے تعلق رکھنے کی بنا پر ان کے ساتھ وہ پابندیاں کم تھیں جو غیروں سے ملنے جلنے کے معاملے میں مثال کے طور پر عصمت چغتائی یا ہاجرہ مسرور وغیرہ کو اوائلِ عمر میں درپیش تھیں۔ نتیجتاً عینی مختلف ممالک اور مختلف طبقوں کے کرداروں سے بے جھجک ملتی جلتی رہیں۔ ان تمام باتوں نے مل کر ان کو علم اور تجربے میں بے پناہ اضافہ کیا اور اپنی تحریروں میں وہ اس کا اظہار بھی کرتی رہیں۔ کہیں یہ اظہار کہانی کو راس آیا تو اعلیٰ درجے کے فن پارے وجود میں آئے اور کہیں یہ اظہار بیزارکُن طوالت بھی اختیار کر گیا کیوں کہ افسانہ بہرحال مختصر رہنا چاہتا ہے۔ البتہ عینی کا کمال یہ ہے کہ ان کے ایسے طویل اور غیر ضروری بیانات بھی محض طرزِ ادا کی شگفتگی یا ندرت کی بنا پر پڑھے جانے کے لائق ہوتے ہیں۔ بات کو خوب پھیلا کر اور جما کر کہنا ناول کی شان ہے اور افسانے کی خامی۔ زندگی کے تمام مظاہر کی آئینہ داری ناول کا فریضہ ہے۔ افسانہ تو اس کے کسی ایک نکتے پر اپنی نگاہیں مرکوز رکھتا ہے۔ عینی کے افسانے میں وہ ارتکاز کم کم ہے اسی لیے ان کے ہاں کردار اور پلاٹ کا افسانہ بہت کم ملتا ہے۔ معاشرے کی عمومی خامیوں پر، اخلاقی زوال، تہذیبی انحطاط، ماضی کی بازیافت، ہجرت کے المیے اور ایسے ہی دوسرے موضوعات پر طبع آزمائی زیادہ ہے۔ یہی اسباب ہیں جن کی بنا پر قرۃ العین حیدر کے ناول نے نئی نسل پر اپنے اثرات مرتسم کیے اور ان کی تقلید میں ناول لکھنے کی کئی کوششیں ہوئیں لیکن ان کی افسانہ نگاری کو نئے کہانی کاروں نے اپنے لیے نمونہ نہیں بنایا کیوں کہ عینی کی کہانیوں میں مختصر افسانے کی خوبیاں کم تھیں جس کی بھرپور تلافی ان کا زورِ قلم اپنے اسلوب سے کرتا ہے۔ لیکن بدقسمتی سے اسلوب کی تقلید ممکن نہیں یا کم از کم مقلد کو کامیابی سے ہمکنار نہیں کرتی۔

وقت آگیا ہے کہ ہم اپنی گفتگو کا رُخ قرۃ العین حیدر کے ناولوں کی طرف موڑیں کہ حقیقتاً انھیں ناولوں نے عینی کو عظمت کی بلندیوں تک پہنچایا ہے۔ اگر ان کا ادبی سرمایہ صرف افسانوں تک محدود ہوتا تو ہم انھیں عصمت چغتائی، ہاجرہ مسرور، بلونت سنگھ اور احمد ندیم قاسمی جیسے اردو کے اچھے افسانہ نگاروں میں تو شمار کرتے لیکن پریم چند، منٹو، یا بیدی کی ہم پلہ عظیم کہانی کار وہ نہیں ہو سکتی تھیں۔

علیمی کا پہلا ناول "میرے بھی صنم خانے" ۱۹۴۹ء میں منظرِ عام پہ آیا اور "سفینۂ غمِ دل" ۱۹۵۲ء میں شائع ہوا۔ ہر چند کہ ان ناولوں میں کوئی واضح منصوبہ، پلاٹ یا باقاعدہ نظریۂ حیات نظر نہ آتا تھا اور یہ دراصل اپنے تخلیق کار کے احساسات، مطالعے اور مشاہدے کی عکاسی کرتے تھے لیکن ان کی تکنیک اور اسلوب میں اتنا نیا پن اور تنوع تھا کہ نئے لکھنے والے ان سے بے حد متاثر ہوئے۔ مجھے یاد آتا ہے کہ ان ناولوں کی اشاعت کے بعد آٹھ دس برسوں میں ہی صرف کلیم عرفی نے اسی طرز کے پانچ چھ ناول لکھ کر خود ہی شائع کیے اور اپنی بربادی کا سامان کر لیا، کیوں کہ جیسا عرض کر چکا ہوں کہ کسی اسلوب کی تقلید کامیابی تک کم ہی پہنچاتی ہے۔ ان دونوں ناولوں میں ایسی خوبیاں یا خامیاں بدرجۂ اتم موجود تھیں جن کی جانب عصمت چغتائی نے اپنے مضمون "پوم پوم ڈارلنگ" میں اشارے کیے تھے۔ ان کا کہنا سچ بھی تھا کہ علیمی کا رویہ اور ان کے کردار دونوں اُلجھے اُلجھے سے تھے۔ گڑیا گڈے جیسے پیارے پیارے ایک ہی فرمے میں ڈھلے ہوئے کردار مشنری کے انگریزی اسکولوں میں تعلیم حاصل کرنے والے، نیلی آنکھوں اور سنہرے گھنگھریالے بالوں والی لڑکیاں اور جاذبِ نظر اور پرکشش خوب صورت نوجوان جمگھٹوں میں کھوئے کھوئے سے۔ ایک دوسرے کی محبتیں دلوں میں چھپائے، سلگتے ہوئے سے، لیکن جنسی لذت کوشی سے یہ ناول بہر حال پاک تھے۔ ایسے بے ضرر سے ناولوں میں کردار سازی یا واقعہ نگاری کی گنجایش کم ہوتی ہے۔ چناں چہ قرۃ العین حیدر نے شعور کی رو کی تکنیک برت کر طرزِ نگارش میں انفرادیت اور انوکھا پن پیدا کیا۔ "میرے بھی صنم خانے" کا ایک اقتباس:

"نیچے باغ میں شہد کی مکھیاں بھنبھنا رہی تھیں۔ اندر ہال میں سجے ہوئے سنگِ مرمر اور تانبے کے مجسموں اور پرانی روغنی تصویروں کے نقوش دوپہر کے اندھیرے میں زیادہ گہرے، زیادہ پُراسرار نظر آ رہے تھے۔ فضا پر وہ خواب آگیں سناٹا چھاتا جا رہا تھا جو گرمیوں کی بھرپور دوپہروں میں کائنات کے ذرّے ذرّے میں سما کر دھیرے دھیرے دھڑکتا رہتا ہے اور خیال آتا ہے کہ اگر دنیا یہی ہے تو بُری نہیں۔"

اس قسم کے مناظر اور بیانات دونوں ناولوں میں عام ہیں جن سے سطحی رومانیت اور فن کارانہ ادھ گدرے پن کا احساس پیدا ہوتا ہے۔ دونوں ناولوں میں پیش کش کا انداز اور پیش کردہ زندگی کی جھلکیوں میں اتنی یکسانیت ہے کہ کسی ارتقائی کیفیت کا پتا کم کم چلتا ہے البتہ اسلوب اپنی جگہ منفرد ہے۔ "سفینۂ غمِ دل" سے چند سطور دیکھیے:

"پھر مدھم چاند تیرتا ہوا اندھیرے میں نیچے اتر آیا اور اس کی ہلکی سی سرخ روشنی سارے میں پھیل گئی۔ اس روشنی میں زلزلے آ رہے تھے اور دیواریں ہل رہی تھیں اور ہر طرف ٹوٹے ہوئے پھاٹک اور بند دروازے تھے۔ اس کی جانی پہچانی گومتی کے کنارے کنارے جو راستہ جاتا تھا اس کے آخری سرے پر شمشان تھا جس میں اب شعلے لپکنے لگے تھے۔ جتنا جتنا وہ آگے بڑھتی ان شعلوں کی لپک زیادہ ہوتی جاتی۔"

اس امر کا اعتراف بہرطور کرنا ہو گا کہ دوسرے ناول میں اس تکنیک کا استعمال جسے شعور کی رو کا نام دیا جاتا ہے علیمی نے مقابلتاً زیادہ مہارت اور رچاؤ کی دستی کے ساتھ کیا ہے۔ "میرے بھی صنم خانے" کا واحد متکلم کردار ہندوستانی

سرزمین اور اپنے آبائی وطن سے فطری رشتے استوار کیے ہوئے ہے اور اس کے سامنے اودھ کی جاگیر وارانہ تہذیب کا زوال اور نئے ابھرتے ہوئے سرمایہ دار طبقے کی کم ظرفیاں اور بوالعجبیاں ہیں جب کہ "سفینۂ غم دل" میں یہی واحد متکلم کردار تاریخی جبر کے تحت ہجرت کے المناک اور عمیق تجربے سے دوچار ہوتا ہے اور اس کے سامنے ایک دوسرے ملک میں درپیش قطعی مختلف مسائل سر ابھارتے ہیں۔ ظاہر ہے اس اعتبار سے دونوں ناولوں کے واقعات میں تنوع آنا لازمی تھا، لیکن بنیادی شخصیت چوں کہ ایک ہی ہے اس لیے احساسات و تاثرات کی یکسانیت بہرحال تکرار کا احساس دلاتی ہے۔

۱۹۵۸ء میں قرۃ العین کا ترجمہ کردہ ہنری جیمز کا ناول "ہمیں چراغ ہمیں پروانے" منظر عام پر آیا۔ اس ترجمے کے ایک برس بعد ہی ان کا ناول "آگ کا دریا" شائع ہوا۔ اور واقعہ یہ ہے کہ اس ناول کی شہرت جنگل کی آگ کی طرح دیکھتے دیکھتے پاک و ہند کے اس سرے سے اُس سرے تک پھیل گئی۔

عینی شعور کی رَو کے خلاقانہ استعمال پر قدرتِ کاملہ رکھتی ہیں۔ جس طرح قدیم داستانوں میں بعض کردار بندریا طوطے کے قالب میں اپنی روح منتقل کر سکتے تھے اسی طرح عینی شعور کی رَو کے فن کارانہ استعمال سے کسی زمانے یا کسی علاقے سے دوسرے زمانے یا دوسرے علاقے کے قالب میں اپنی روح منتقل کر سکتی ہیں اور اس قلبِ ماہیت یا روح کے حلول سے انھیں وحشت اس لیے نہیں ہوتی کہ تبدیل شدہ زمانہ یا ماحول ان کے لیے اجنبی نہیں ہے۔ ان کے وسیع مطالعے نے اس تہذیب، اس زمانے اور اس علاقے سے انھیں بہت مانوس بنا رکھا ہے۔ اس تکنیک کا استعمال قرۃ العین حیدر اپنے بیشتر افسانوں، ناولٹ اور اولین دو ناولوں میں کر چکی ہیں۔ اب ان تمام مہارتوں اور تجربوں کو سمیٹ کر وہ زیادہ خلاقی اور مہارت کے ساتھ "آگ کا دریا" میں بروئے کار لاتی ہیں۔ اس ناول کے کینوس کو وہ پچھلے ناول کی طرح محض دو نسلوں پر نہیں کئی نسلوں اور متعدد صدیوں پر پھیلا دیتی ہیں اور ہندوستان کی تہذیبی روح کا نمائندہ گوتم نیلمبر کو قرار دے کر نسل در نسل اس کے روحانی سفر کا جائزہ لیتی ہیں۔ یہ ناول عقیدوں کے تنوع، زندگی کے پھیلاؤ اور تہذیبوں کی رنگا رنگی کو ایک وحدت کی صورت میں دیکھنے کی کاوش کا ثمرہ ہے۔ ناول میں خود عینی ایک غیر جانبدار مورخ کا سا کردار ادا کرتی ہیں۔ تہذیب جب تاریخ کے جبر کا شکار ہوتی ہے اور تاریخی تبدیلیاں اسے کسی نئی تہذیب سے ٹکرانے پر مجبور کرتی ہیں تو نئے تہذیبی اُفق نمودار ہوتے ہیں۔ قرۃ العین حیدر کے نزدیک تاریخ ایک زمانی جبر کا نام ہے۔ انقلاب آتے ہیں لیکن وقت کے دریا کی روانی میں کوئی فرق نہیں پڑتا اور پرانی تہذیب کا حلقہ نئی تہذیب سے جڑ کر اس سلسلے کو اور دراز کرتا رہتا ہے۔ "آگ کا دریا" ایک اعتبار سے ہندوستان کی تہذیبی تونگری اور اس کی روحانی بالیدگی کا آئینہ خانہ ہے۔ عینی نے اس ناول میں برصغیر کی تہذیبی آویزشوں اور آمیزشوں کو اُجاگر کرنے کی کامیاب کوشش کی ہے۔ ہر چند کہ "آگ کا دریا" اردو کا پہلا بڑا ناول ہے جس کے تیرا تمہ آگے چل کر کئی اچھے ناول منظر عام پر آئے لیکن یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ اس ناول کے بہت سے مقامات پر قرۃ العین حیدر نے تاریخ، تہذیب، فلسفہ، مابعد الطبیعیات، تصوف اور سیاسی نظریات سے متعلق اپنی وسیع معلومات کا غیر ضروری مظاہرہ بھی کیا ہے۔ البتہ ناول کا کینوس اتنا وسیع اور اس کی خوبیاں اتنی کثیر ہیں کہ پڑھنے والے ان اکتا دینے والی تفصیلات کو بھی

گوارا کر لیتے ہیں۔ ایک مثال حاضر ہے:

"سامنے مرگھٹ تھا، مرگھٹ میں کالی ناچ رہی تھی۔ کالی جو ساری کائنات کو اس کے خاتمے پر اپنے میں سمیٹ لیتی ہے۔ صرف وہی انسان اس سے خوف زدہ ہوئے بغیر اس کی عبادت کر سکتا ہے جو اپنی خواہشوں کو ختم کر کے اس کی ذات میں فنا ہو سکے۔ مرگھٹ، یہاں ساری خواہش جل کر بھسم ہو جاتی ہیں اور کالی، جو ذہن و گویائی سے ماورا ساری کائنات کو نفی میں تبدیل کر دیتی ہے۔ وہ جو شونیہ کو پورن بناتی ہے۔ پورن، جو روشنی اور سکون ہے۔ کالی جس کا لباس سماوی ہے، وہ وسعت ہے کیوں کہ وہ لامحدود ہے، عظیم طاقت ہے، مایا سے بلند تر ہے، کیوں کہ خود مایا بن کر دنیا کی تخلیق کرتی ہے۔ مرگھٹ میں کالی شیو کے سفید جسم پر کھڑی ہے۔"

بلاشبہ "آگ کا دریا"، اپنی چھوٹی موٹی کمزوریوں کے باوصف اردو ناول کے میدان میں ایک عظیم کارنامہ ہے اور یہ بھی ایک ناقابلِ تردید حقیقت ہے کہ "آگ کا دریا" کے ردِّ عمل میں ہی ہمارے ادب میں کئی اور بڑے ناولوں کا اضافہ ہوا ہے جن میں "اداس نسلیں"، "سنگم"، "علی پور کا ایلی"، "خدا کی بستی"، "لہو کے پھول" اور متعدد دوسرے ناولوں کے نام لیے جا سکتے ہیں۔ لگتا ہے جیسے عینی نے "آگ کا دریا" لکھ کر بڑے ناولوں کے لیے چوتھی کھونٹ کا ساتواں دروازہ کھول دیا ہو۔

بقول شخصے، واحد متکلم میں لکھنے والے اپنے ناولوں میں جلد ہی تکرار اور یکسانیت کا شکار ہو جاتے ہیں کیوں کہ ایک ہی شخصیت میں اتنا تنوع، گہرائی اور وسعت مشکل سے ہوتی ہے کہ اس کے اظہار کے لیے کئی بڑے ناول درکار ہوں۔ کئی ناولوں میں ایک یا ایک جیسی شخصیت کی مرکزی حیثیت کو برقرار رکھنا دشوار ہو جاتا ہے اور جلد ہی وہ مرکزی شخصیت اپنی کشش کھو بیٹھتی ہے۔ اس خیال کی منہ بولتی تصویر قرۃ العین حیدر کے سوانحی ناول "کارِ جہاں دراز ہے" میں دیکھی جا سکتی ہے۔ جس کی پہلی جلد ۱۹۷۷ء میں اور دوسری ۱۹۷۹ء میں شائع ہوئی۔ اسے نقادوں نے بجا طور پر عینی کا "فیملی ساگا" کہا ہے۔ تاریخی شعور کی کارفرمائی اس ناول میں بھی دیکھی جا سکتی ہے اور شعور کی رَو کی تکنیک پر مہارت سے یہاں بھی قرۃ العین حیدر نے بھرپور کام لیا ہے۔ جس فنی چابکدستی کے ساتھ انھوں نے اپنے سلسلۂ نسب کے سراغ لگاتے اور ٹوٹی ہوئی کڑیوں کو جوڑا ہے اس کی داد دینی پڑتی ہے، لیکن بہ حیثیتِ مجموعی "کارِ جہاں دراز ہے"، کئی بارہ صدیوں کا احاطہ کرنے والی داستان ایک ایسے خاندان کا نسلی سفر ہے جو اپنے وجود کو برقرار رکھنے کے لیے پوری طرح چاک و چوبند اور اپنے معاشی و سیاسی تحفظ کے لیے کوئی دقیقہ اٹھا نہیں رکھتا۔ ہر چند کہ اس ناول کا فنی مرتبہ بہت بلند نہیں لیکن اس کی اہمیت اپنی جگہ مسلّم ہے کہ اس میں قرۃ العین حیدر کی خود نوشت سوانح بھی موجود ہے اور اپنے فن کے بارے میں ان کے بہت سے بیانات اور وضاحتیں بھی۔

۱۹۷۹ء ہی میں قرۃ العین حیدر کا ایک اور ناول منظرِ عام پر آیا۔ میری مراد "آخری شب کے ہم سفر" سے ہے۔ اس ناول میں عینی نے بنگال کی ان انقلابی تحریکوں کو اپنا موضوع بنایا ہے جو رومانیت پسند انقلابیوں کی شدید جذباتیت کے زیرِ اثر ناکام ہو گئیں۔ اسی کے ساتھ ناول کی انفرادیت یہ بھی ہے کہ اس میں اینگلو انڈین طبقے کی تہذیبی نمایندگی نہایت موثر انداز میں پائی جاتی ہے۔ جس طرح "آگ کا دریا" میں بھگتی تحریک کے تناظر میں ہند و مسلم تہذیبی اشتراک کو

نمایاں کیا گیا تھا اسی طرح "آخری شب کے ہم سفر" میں قرۃ العین حیدر نے بڑی فن کاری کے ساتھ اینگلو انڈین طبقے میں مغربی اور ہندوستانی تہذیب کی آویزش و آمیزش کو اُجاگر کیا ہے۔ طویل زمانے پر پھیلی ہوئی تہذیبی رنگا رنگی کو چند افراد کی باطنی کیفیات اور نفسیاتی کشمکش کے وسیلے سے ایک وحدت میں منتقل کر دینا اس ناول کا ایک اور بڑا وصف ہے۔ جگہ بہ جگہ عینی کے قلم سے ناول میں اس عہد کے بنگال کی ایسی جیتی جاگتی تصویریں محفوظ ہو گئی ہیں جن کی بنا پر اگلی نسلوں کے لیے یہ ناول تہذیبی ورثے کی حیثیت اختیار کرے گا۔ ایک ایسی ہی تصویر:

"سکانیک میں رات کو آسمان کی شفاف جھیل پر چاند خزاں آلود کنول کی طرح تیرا تیرا پھرتا ہے۔ کچی سڑک پر گنے کے چھلکے بکھرے ہوئے ہیں۔ ہوا میں زعفرانی گرد اُڑتی ہے۔ بجوی بالیوں پر طوطے بیٹھے ہیں۔ تیز چاندنی میں مچھیروں نے اپنے جال دریاؤں پر پھیلا دیے۔ ان کی بانسریوں کے سروں نے پردیس جانے والے مسافروں کو مضطرب کر دیا۔ فضا میں آسمان کا دریا بہہ رہا ہے۔ اُڑتے بگلے اور سفید بادل اس کے رتیلے ساحل ہیں اور ستارے اس کے نیلوفر۔ ندی کنارے کھنڈی کیچڑ میں جیرہ والا سوتا ہے۔"

اس ناول میں عینی اپنے فن کے نقطۂ عروج پر ہیں اور بنگال کی روح میں اُترتی نظر آتی ہیں۔ جدید عالمی تمدن کی عکاسی بھی "آگ کا دریا" کی مانند اس ناول میں نہایت چابک دستی کے ساتھ کی گئی ہے۔ گوتم نیلمبر کی طرح اس ناول کے ریحان الدین احمد اور دیپالی بھی اردو ادب کے زندۂ جاوید کرداروں میں شمار کیے جانے کے لائق ہیں۔ پھر اس ناول میں یوں کہ اکثر دہشت پسندوں کی کارروائیاں پُراسرار ڈھنگ سے انجام پاتی ہیں اس لیے پڑھنے والوں میں تجسس اور تحیر کے جذبات اُبھرتے ہیں اور اس طرح ناول زیادہ دلچسپ محسوس ہونے لگتا ہے۔

مقامِ حیرت ہے کہ عینی کا یہ ناول اتنا تہلکہ خیز ثابت نہیں ہوا جتنا کہ "آگ کا دریا" ہوا تھا۔ غالباً اس کا سبب یہ ہے کہ "آگ کا دریا" اردو کا پہلا بڑا ناول تھا اور اس کے بعد اچھے اور بڑے ناولوں کا ایک سلسلہ سا لگ گیا جس کی ایک کڑی "آخرِ شب کے ہم سفر" بھی ہے۔ دوسرے یہ کہ "آگ کا دریا" دو قومی نظریے کا بطلان ہے جس کو ترقی پسند اور غیر ترقی پسند سبھی ناقدوں نے سراہا جب کہ "آخرِ شب کے ہم سفر" میں اشتراکی دہشت پسندوں کو انقلابی تحریک کی ناکامی سے دوچار ہوتے دکھایا گیا ہے جو ایک تلخ حقیقت ہونے کے باوجود اکثر لوگوں کے لیے پسندیدہ نہیں ہے۔ ورنہ حق تو یہ ہے کہ بعض اعتبار سے یہ ناول "آگ کا دریا" سے بھی بلند ترفنی مرتبہ رکھتا ہے۔

پچھلے دنوں قرۃ العین حیدر کا تازہ ترین ناول "گردشِ رنگِ چمن" منظرِ عام پر آیا ہے۔ بنیادی طور پر یہ ایک طوائف خاندان کی پانچ پشتوں پر پھیلی ہوئی حکایتِ لذیذ ہے جس کا سلسلہ ہندوستان پر انگریزوں کے تسلط سے شروع ہو کر ہمارے دور پر منتج ہوتا ہے۔ قرۃ العین حیدر کے اس وصف کا ذکر قبل ازیں کیا جا چکا ہے کہ وہ ماضی اور حال کے حقائق کو ایک طرح سے بھی لگا کر ہی خوبی کے ساتھ ہم رشتہ کر دیتی ہیں کہ صدیوں کا فرق مٹ جاتا ہے اور سماجی، ثقافتی، معاشرتی اور تاریخی واقعات کو بالترتیب اور باقاعدگی کے ساتھ پیش کرنے کی ضرورت نہیں رہ جاتی۔ یہ تکنیک عینی کے اس ناول میں بھی برتی گئی ہے لیکن یہاں دلچسپی اور دلکشی پیدا کرنے پر زور زیادہ دیا گیا ہے۔ پلاٹ اور کردار سازی پر ناول نگار نے زیادہ توجہ صرف نہیں کی۔ کچھ یہ بھی

اس ناول میں پشت در پشت طوائفوں کے جس خاندان کا تذکرہ ہے اس کو اپنی حقیقی زندگی میں عینی نے اتنے قریب سے کبھی نہیں دیکھا جتنے قریب سے انھوں نے اپنے دیگر ناولوں کے کرداروں کا مشاہدہ کیا ہے۔ بایں ہمہ ان کی بے پناہ خلاقی نے دلنواز، نواب بیگم اور مسز عندلیب بیگ جیسے کرداروں کی نفسیاتی کشمکش کو بہت چابکدستی سے پیش کیا ہے لیکن ان کے ماحول کو اتنی وضاحت سے پیش کرنے میں عینی کامیاب نہیں رہیں لیکن اگر اس ناول میں اتنا کچھ ہی ہوتا یعنی طوائفوں کے زندہ زندہ سے کرداروں کے ساتھ غیر حقیقی ماحول، تب بھی یہ ایک اوسط درجے کا ناول ہوتا لیکن اس ناول کا المیہ یہ ہے کہ قرۃ العین حیدر نے اسے عام قاری کے لیے بھی پُر لطف بنانے کی ہر ممکن کوشش کی ہے۔ چناں چہ اگر ایک طرف دل نواز بازارِ حسن سے منہ موڑ کر جوگن بن جاتی ہے اور راشد الخیری کے ناولوں کی یاد تازہ کرتے ہوئے دردناک انجام سے دوچار ہوتی ہے تو دوسری طرف عندلیب بیگم ایک ماڈرن بازاری کی طرح کلکتہ کی شاہراہ پر غمزہ و ادا بکھیرتی ہے، کہیں لکھنؤ کے گمنام نواب زبان زدِ عام قصّوں کی مانند خود چنے چباتے اور دوسروں کو بادام کھلاتے پائے جاتے ہیں۔ پھر فاتر العقل خواجہ سبز پوش ہیں جو نہایت مضحکہ خیز انداز میں ناول کے مختلف حصّوں کو عام پڑھنے والے کے لیے دلچسپ بناتے رہتے ہیں۔ ناول کے اختتام پر ڈرامائی انداز میں سنجیدہ ہو جاتے ہیں۔ ملاحظہ ہو :

> "کچھ دیر تک ساکت بیٹھے رہنے کے بعد بیرونی پھاٹک ٹوٹنے کی آواز پر وہ چونکے۔ انگلیوں سے پلکیں رگڑا کیے، ماچس تلاش کرکے بجھی ہوئی موم بتی جلائی، چہرے پر ہاتھ پھیرا، ہتھیلی پر لگی راکھ آستین سے پونچھی۔ پاؤں کی بیڑیاں گھسیٹتے، کھسکتے گھڑونچی تک پہنچے، اس کے ایک شکستہ پائے کے نیچے رکھی اینٹ نکالی۔ گھڑے کا پانی چھلک گیا۔ دوسرا دھکا لگا۔ گھڑا نیچے آ رہا۔ پانی سے شرابور ہو گئے لیکن انھوں نے پروا نہیں کی۔ اینٹ اٹھا کر اسے ہاتھ میں تولا۔ پھر پوری طاقت کے ساتھ اپنی زنجیریں توڑنے کی کوشش میں منہمک ہو گئے۔"

ظاہر ہے زنجیروں سے رہائی پانے کی یہ کوشش پاگل پن نہیں کہی جا سکتی لیکن "گردشِ رنگِ چمن" کے متعدد صفحات پر یہی خواجہ سبز پوش کسی جاسوسی ناول کے کردار کی طرح بالکل مختلف روپ میں کیا اسی لیے پیش کیے گئے تھے کہ آخر میں پڑھنے والوں کو چونکایا جا سکے۔ کئی سال قبل قرۃ العین حیدر کے سوانحی ناول "کارِ جہاں دراز ہے" پر تبصرہ کرتے ہوئے ایک نقّاد نے نسیم حجازی کو ان سے بہتر سوانحی ناول نگار کہا تھا تو مجھے بڑا رنج ہوا تھا لیکن "گردشِ رنگِ چمن" کے خواجہ سبز پوش، گمنام نواب، راجہ دلشاد علی خاں اور خدا رسیدہ 'میاں' بے ساختہ ابنِ صفی کی یاد تازہ کرتے ہیں کہ ایسے کردار وہ اپنے ناولوں میں خوب تخلیق کرتے تھے اور ان جیسے کردار وہی سجھتے بھی تھے۔ ایک ادبی ناول میں دلشاد جیسے بین الاقوامی مجرم کی موجودگی، جس کی تلاش میں انٹرپول سرگرداں ہے، بے موقع بھی ہے اور عجیب بھی، کیوں کہ باقی ماندہ ناول سے اس کا کوئی تعلق نہیں ہے۔ مزید ستم یہ کہ ناول کا تقریباً ایک تہائی حصّہ 'میاں' کے کشف و کرامات کے تذکروں سے لبریز ہے۔ سنتے آئے ہیں کہ ایک کرامت کے ظہور پر صاحبِ کرامت بزرگ روحانی بلندی سے دس درجے نیچے آ جاتے ہیں اور 'میاں' ہیں کہ ان سے دن رات کرامات ظہور میں آتی ہیں۔ اور یہ بھی سنا جاتا ہے کہ موصوف واقعی ایک حقیقی کردار ہیں۔ لگتا ہے کہ مقبول فلموں کی طرح عینی نے بھی اس ناول میں قبولِ عام حاصل کرنے کی ہر ممکن کوشش کی ہے اور اس کوشش میں "گردشِ رنگِ چمن" کو بارہ مسالے کی چاٹ بنا دیا ہے۔

میرزا ادیب

بچوں کا ادب — ایک تجزیاتی مطالعہ

اردو کے تین، ساڑھے تین سو سالہ کلاسیکی ادب میں ان ناموں کو ڈھونڈا جائے جنھوں نے بچوں کے ادب کی طرف توجہ کی ہے تو ہمیں یہ دیکھ کر بڑی مایوسی ہوتی ہے کہ اس سارے دور میں سب سے پہلا نام جو ہمارے سامنے آتا ہے وہ نظیر اکبر آبادی کا ہے اور نظیر اکبر آبادی سے لے کر ڈپٹی نذیر احمد تک یہ پورا زمانہ بچوں کے ادب سے ناآشنا ہے۔ اس کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ اس ساری مدت میں بچوں کے لیے مذہبی تعلیم ہی کو کافی سمجھ لیا جاتا تھا۔ یہ ضروری نہیں سمجھا جاتا تھا کہ بچوں کے لیے نصابی کتابوں کے علاوہ بھی کتابیں تحریر کی جائیں۔ بچیوں کو تو صرف قرآن مجید پڑھا دیا جاتا تھا اور لڑکے بیشتر مساجد میں بیٹھ کر مذہبی تعلیم حاصل کر لیتے تھے ایسے میں بچوں کے ادب کا کون خیال کرتا؟

کہانی پڑھنے اور سننے کا شوق چھوٹوں اور بڑوں میں ایک قسم کی فطری خواہش کے مترادف ہے۔ یہ فطری خواہش انسان کے باطن میں اس وقت ابھری تھی جب اس نے غاروں کے اندر یا درختوں کے اوپر دوسروں سے مل جل کر رہنا شروع کیا تھا۔ کہانی کہنے اور سننے کی یہ روایت انسانی تہذیب کے ساتھ ساتھ اپنا سفر طے کرتی رہی ہے اور آج بھی طے کر رہی ہے۔

جب کتابیں نہیں ہوتی تھیں تو دادیاں اور نانیاں رات کے وقت خاندان کے بچوں کو کہانیاں سنایا کرتی تھیں۔ یہ روایت آج بھی زندہ ہے اگرچہ اس کے تسلسل میں کافی فرق آ گیا ہے۔

ہاں تو اوپر عرض کیا گیا ہے کہ اردو کے کلاسیکی ادب میں بچوں کے ادب کے حوالے سے جو نام سب سے پہلے ہمارے سامنے آتا ہے وہ آگرے کے ایک معلم شاعر نظیر اکبر آبادی کا ہے۔

نظیر اکبر آبادی بچوں کو پڑھاتے تھے۔ یہی ان کا ذریعۂ معاش تھا۔ دربارداری سے ان کا قطعی طور پر کوئی تعلق نہیں تھا۔ سلجھے دل و دماغ کے آدمی تھے۔ حالِ مست قلندر تھے۔ کائنات اور زندگی کے حسن سے متاثر تھے۔ خود خوش رہتے تھے، دوسروں کو بھی خوش و خرّم دیکھنا چاہتے تھے۔ ان کا خصوصی تعلق بچوں کے ساتھ تھا۔ چاہتے تھے کہ اپنے شاگردوں کے لیے خوشی کے لمحے قائم کریں۔ اس مقصد کو پیشِ نظر رکھ کر انھوں نے بچوں کے لیے نظمیں لکھیں اور ایسی نظمیں لکھیں کہ آج بھی بچے ان نظموں کو

بڑے شوق اور دلچسپی سے پڑھتے اور گاتے ہیں۔

نظیر اکبر آبادی نے بچوں کے لیے بڑی خوبصورت اور مترنم نظمیں لکھی ہیں۔ مثلاً "بلبلوں کی لڑائی"، "گلہری کا بچہ"، "بیا اور ریچھ کا بچہ" آخر الذکر نظم تو خاص طور پر بچوں میں مقبول ہوئی تھی اور آج بھی مقبول ہے۔

یہ نظم مخمس ہے۔ یعنی اس کے ہر بند میں پانچ مصرعے ہیں۔ ایک بند ملاحظہ فرمائیے۔

کل راہ میں جاتے جو ملا ریچھ کا بچہ　　لے آئے وہیں ہم بھی اٹھا ریچھ کا بچہ

سو نعمتیں کھا کھا کے پلا ریچھ کا بچہ　　جس وقت بڑھا ریچھ ہوا ریچھ کا بچہ

جب ہم بھی چلے ساتھ چلا ریچھ کا بچہ

۱۸۵۷ء کے بعد جب ایک ہمہ گیر فکری انقلاب کی آہٹیں واضح طور پر محسوس ہونے لگیں اور اس فکری انقلاب نے نئے تصورات، نئے افکار اور وقت کے نئے تقاضوں کے زیر اثر نئے نظریات کے لیے راہیں ہموار کر دیں تو سوچنے والوں نے سوچا کہ بچے قوم کا مستقبل ہوتے ہیں۔ ایک قوم اگر اپنے مستقبل کو نظر انداز کر دیتی ہے تو وہ یقیناً ایک مجرمانہ اقدام کی مرتکب ہوتی ہے۔ اس سوچ کے نتیجے میں کئی ممتاز اہل قلم نے بڑوں کے ادب کے علاوہ بچوں کے ادب کو بھی اپنانے کی مخلصانہ کوشش کی اور یہ کوشش اپنے نتائج کے لحاظ سے خاصی کامیاب رہی۔

ان مخلصانہ کوشش کرنے والوں میں اس دور کی بعض بڑی اہم ادبی شخصیتیں شامل تھیں۔ ڈپٹی نذیر احمد، علامہ راشد الخیری، مولوی محمد حسین آزاد اور مولوی اسمٰعیل میرٹھی۔ ان میں ایک اور نام کا اضافہ کیا جا سکتا ہے اور یہ نام ہے سورج نرائن مہر۔ اسمٰعیل میرٹھی اور محمد حسین آزاد کی تحریریں پڑھیں تو معلوم ہوتا ہے قدرت نے انھیں صرف بچوں کا ادب لکھنے کے لیے ہی پیدا کیا تھا۔ آزاد کی نثر بے حد خوبصورت ہے اور اسمٰعیل میرٹھی نے بچوں کے لیے جو شاعری کی ہے وہ گلاب کا ایک ایسا پھول ہے جو آج تک شگفتہ ہے اور اس کی شگفتگی آیندہ بھی برقرار رہے گی۔ ان دونوں کا طریق کار اپنے محترم معاصرین یعنی نذیر احمد اور راشد الخیری سے مختلف ہے۔ یہی طریقہ سورج نرائن مہر کا بھی ہے۔ یہ بزرگ بچوں کو کھلم کھلا نصیحت نہیں کرتے۔ جو بھی سبق دینا چاہتے ہیں اسے لفظوں میں لپیٹ کر، چھپ چھپا کر دیتے ہیں۔ یہ طریقہ زیادہ منطقیانہ اور حقیقت پسندانہ ہے، نتیجتہً بڑا کامیاب ہے۔ اہل قلم کا یہ گروہ بچوں کے مصنفین کا پہلا دور متعین کرتا ہے۔ دوسرا دور دارالاشاعت پنجاب کے قیام سے وابستہ ہے جسے شمس العلما مولوی سید ممتاز علی نے لاہور کی ریلوے روڈ پر قائم کیا تھا۔ مولوی صاحب اور ان کے رفقائے کار نے بچوں کے ادب کو بڑی ترقی دی ہے۔ ان رفقائے کار میں سب سے پہلے تو ان کی رفیقۂ حیات مخترمہ محمدی بیگم کا نام لیا جا سکتا ہے۔ یہ ان کے فرزند ارجمند سید امتیاز علی تاج ہیں۔ ان کے علاوہ مولانا عبدالمجید سالک، مولانا چراغ حسن حسرت، ابوالاثر حفیظ جالندھری اور اردو کے نامور افسانہ نگار غلام عباس ہیں۔

دارالاشاعت پنجاب نے بچوں کے ادب میں تاریخ ساز اضافہ کیا ہے۔ قیام پاکستان کے بعد وہ روایات جو اس ادارے نے قائم کی تھیں، مسلسل آگے بڑھتی چلی گئی ہیں اور جو کام پہلے نہیں ہوا تھا، کچھ تو ان روایات کی وجہ سے اور کچھ نئے تقاضوں سے ہم آہنگی کی وجہ سے ہوا ہے اور برابر ہو رہا ہے۔

بچوں کے ادب پر دو تھیسس منظر عام پر آئے ہیں۔ ایک تھیسس ڈاکٹر محمود الرحمٰن کا ہے "اردو میں بچوں کا ادب" کے نام سے اور دوسرا تھیسس "بچوں کا ادب" ڈاکٹر اسد ادیب کا ہے۔

فن اور ادبی مسائل کے سلسلے میں دو کتابیں چھپی ہیں۔ "بچے اور ادب" جسے شیما مجید نے مرتب کیا ہے۔ اس میں ۲۱ مضامین شامل ہیں۔ پہلا مضمون علامہ اقبال کا ہے "بچوں کی تعلیم و تربیت" کے زیر عنوان۔ شیما مجید نے بڑی جستجو اور کوشش سے بچوں کے ادب سے متعلق مشاہیر ادب کے مضامین فراہم کیے ہیں اور سلیقہ مندی سے انھیں ترتیب دیا ہے۔

دوسری کتاب ہے "بچوں کا ادب ۔ ایک جائزہ" یہ کتاب راقم الحروف کے قلم سے ہے۔ جسے مقبول اکیڈمی نے چھاپا ہے۔ بچوں کے نفسیاتی مسائل پر بھی کئی کتابیں چھپ چکی ہیں۔ "بگڑے بچے" پروفیسر مظفر احمد قریشی نے تحریر کی ہے۔ محترمہ منور جہاں رشید نے بچوں کے نفسیاتی مسائل کی طرف خصوصی توجہ کر کے "چونچال بچے" اور "بچوں میں حسد" دو کتابیں ہمیں دی ہیں۔ گورنمنٹ کالج لاہور کے شعبۂ نفسیات نے بھی اس ضمن میں قابل قدر کام کیا ہے۔ پروفیسر مظفر احمد قریشی اسی شعبے سے متعلق ہیں۔ اس شعبے نے ایک الگ کتاب بھی دی ہے "غیر معمولی بچے اور اساتذہ"۔ اردو مرکزی بورڈ نے بچوں کا انسائیکلوپیڈیا شائع کیا ہے۔ اس کے مرتب ذوالفقار احمد تابش ہیں۔

بچوں کے لیے پاکستان کے اہم پہلوؤں پر بھی درجنوں کتابیں اشاعت پذیر ہوئی ہیں۔ "پاکستان کی کہانی، دادی اماں کی زبانی" محترمہ سلمیٰ زمن نے لکھی ہے اور محترمہ رضیہ فصیح احمد نے بچوں کو پاکستان کی سیر کرائی ہے۔ ان کی کتاب کا نام "سیر پاکستان" ہے۔ دونوں کتابیں بڑی دلچسپ ہیں۔

قیام پاکستان کے بعد بچوں کی کتابوں کی پاکستان کے مختلف شہروں میں نمائش ہو چکی ہیں۔ اس ادب کے حوالے سے کئی سیمینار بھی انعقاد پذیر ہوئے ہیں جن میں بڑے مفید اور معلومات افزا مقالات پڑھے گئے ہیں۔ یہ مقالات کتابی صورت میں بھی محفوظ ہو چکے ہیں۔

پاکستان نیشنل بک کونسل نے بچوں کی کتابوں کی ایک جامع فہرست کے علاوہ بچوں کے مصنفین کی ڈائرکٹری بھی چھاپی ہے۔ حمدیہ اور نعتیہ مجموعے بھی چھپے ہیں۔ اردو کی بعض کلاسیکی کتابوں کو بھی بچوں کی عام استعداد کے مطابق اختصار کے ساتھ لکھا گیا ہے۔ میں نے ان سرگرمیوں کا مختصر طور پر تذکرہ اس بنا پر کیا ہے کہ ہمارے نقاد اکثر کہتے رہتے ہیں کہ بچوں کا ادب اگر صحیح معنوں میں لکھا گیا ہے تو یورپ میں لکھا گیا ہے۔ پاکستان میں اس کی طرف کوئی توجہ نہیں کی گئی۔ اسے قطعی طور پر نظرانداز کیا گیا ہے۔

اسے غلط فہمی کہا جائے، خود فریبی یا محض احساس کمتری۔ نہ جانے یہ نقاد حضرات اپنی رائے کا اظہار کرتے وقت اس حقیقت کو کس طرح نظرانداز کر دیتے ہیں کہ ہمارا بچوں کا ادب اتنا کم مایہ بھی نہیں کہ ہم اس کی کم مائیگی کا ڈھنڈورا پیٹنا شروع کر دیں۔ ہمارا بچوں کا ادب کافی وسیع ہے۔ یہ نہیں کہ ہم اپنے اس ادب کی خامیوں سے آگاہ نہیں ہیں۔ ہم خوب جانتے ہیں کہ ہمارے بڑے بڑے ادیبوں نے بچوں کے ادب سے صرف نظر کر رکھا ہے۔ یہ لوگ غالباً اس غلط فہمی میں مبتلا ہیں کہ اگر انھوں نے بچوں کا ادب لکھا تو اپنی بلند سطح سے نیچے آجائیں گے۔ یہ محض احساس کمتری ہے۔ ورنہ واقعہ یہ ہے کہ یورپ میں اور دنیا کے ہر ترقی یافتہ ملک میں بڑے ادیبوں نے بچوں کے لیے بھی لکھا ہے اور خوب لکھا ہے۔

روس کا ٹالسٹائی کتنا بڑا ادیب ہے۔ اس نے بچوں کے لیے بڑی خوبصورت کہانیاں لکھی ہیں۔ ڈنمارک کا ہینز کرسچن اینڈرسن تو آج بھی بچوں کا محبوب ترین مصنّف ہے۔ اینڈرسن نے بڑوں کے لیے بھی لکھا ہے۔ جرمنی کے گرم اینڈ برادرز کو بھی یہ امتیاز حاصل ہے۔ انگریزی میں آسکر وائلڈ نے بچوں کو بڑی پیاری کہانیاں دی ہیں۔ اندازہ کیجیے کہاں سلومی اور پکچر آف ڈورین گرے کا مصنّف آسکر وائلڈ اور کہاں شہزادہ خرم HAPPY PRINCE جیسی کہانیوں کا مصنّف آسکر وائلڈ۔

سر والٹر سکاٹ نے بچوں کے لیے خوبصورت نظمیں لکھی ہیں۔ رابرٹ لوئس اسٹیونسن نے بھی بچوں کے ادب کو عملاً اہمیت دی ہے۔ بچوں کے ادب کے حوالے سے دوسری کمی جو چبھتی ہے وہ ہے اس ادب میں تنوع کا فقدان۔ ایک گلدستے میں بہت سے پھول سجا دیے جائیں اور ان کا رنگ اور مہک ایک جیسی ہو تو یہ گلدستہ آنکھوں کو بھلا نہیں لگے گا۔ گلدستے کی خوبی یہ ہے کہ اس میں رنگا رنگ پھول ہوں۔ ان میں سے ہر ایک کی شگفتگی میں بھی فرق ہو۔ اس کی مہک میں بھی یکسانیت نہ ہو۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ ہمارے بچوں کے ادب میں بہت زیادہ لکھا گیا ہے۔ بے شمار ناول ہیں۔ بے شمار کہانیاں ہیں۔ مگر جب انھیں پڑھتے ہیں تو بڑی ناخوشگوار یکسانیت کا احساس ہوتا ہے۔

ناولوں کی تعداد بہت زیادہ ہے۔ یہی حال کہانیوں کا بھی ہے۔ ان دونوں صنفِ ادب میں موضوعاتی رنگا رنگی نہیں ہے۔ ان میں ایک جیسا پلاٹ ہے۔ کہانیوں کی ایک جیسی فضا ہے۔ کردار بھی کم و بیش ایک جیسے ہیں۔

میں کافی غور و خوض کے بعد اور دوسرے ملکوں کی کہانیوں کا مطالعہ کرکے اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ دنیا میں کوئی بھی موضوع بذاتِ خود بڑا یا گھٹیا نہیں ہوتا۔ اس کا انحصار لکھنے والے پر ہے کہ وہ کس موضوع کو کس انداز میں لیتا ہے۔ اس کا اپنا تخلیقی نقطۂ نظر کیا ہے۔ وہ کن فنّی تقاضوں کو اہمیت دیتا ہے۔

اہمیت اصل میں ایک مصنّف کے تخلیقی زاویۂ نگاہ کی ہوتی ہے۔ یہ تخلیقی نقطۂ نظر مصنّف کو ایک خاص پیرایۂ بیان اختیار کرنے کی غیر شعوری طور پر ترغیب دیتا ہے۔ اس کے علاوہ مصنّف ان فنّی تقاضوں کو بھی ساتھ لے کر چلتا ہے جو اس کے تخلیقی نقطۂ نظر کے ساتھ وابستہ ہوتے ہیں۔ میں نے عرض کیا ہے کہ دنیا میں کوئی موضوع بھی بے کار، بے مصرف یا سطحی درجے کا نہیں ہوتا۔ مصنّف کی تخلیقی شخصیت عام سے عام خاکے میں ایسے رنگ بھر دیتی ہے کہ وہ ایک شاہکار بن کر رہ جاتا ہے۔

آج کل یہ اعتراض کیا جاتا ہے کہ ہمارے بچوں کے لکھاری اپنی ساری توجہات جن، پریوں کی کہانیوں پر صرف کر دیتے ہیں۔ ان سے آگے نکلتے ہی نہیں۔ اعتراض کلیتہً غلط نہیں ہے، ایک حد تک درست معلوم ہوتا ہے۔ مگر جیسا کہ میں نے پہلے کہا ہے کہ یہ موضوع میں از کار رفتہ نہیں ہے۔ بہت پرانا سہی مگر آج بھی بہت دل چسپ ہے۔ اسے بچوں کے لیے کہانیاں لکھنے والے بنا سکتے ہیں۔ ان کہانیوں کا تعلق جنوں، پریوں اور جادوگروں سے ہوتا ہے۔ میں یہاں ایک مثال پیش کرتا ہوں:

ہینز کرسچن اینڈرسن (۱۸۰۵ – ۱۸۷۵ء) ڈنمارک کا مصنّف ہے۔ جو آج بھی بچوں میں بچوں کا محبوب ترین مصنّف گردانا جاتا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ موجودہ دور سائنسی دور ہے۔ اس دور میں بچوں کا شعور خاص طور پر یورپ میں پرورش پانے والے بچوں کا شعور بہت بڑھ چکا ہے۔ اس دور میں ابنِ آدم نے سمندروں کی گہرائیوں اور آسمانوں کی پنہائیوں کو مسخر کر لیا ہے آج کا انسان خلاؤں کی وسعتوں میں سے گزرتا ہوا چاند پر قدم رکھ چکا ہے۔ ایسے میں یہ کہے جو ان انسانی فتوحات سے بیگری

کے بچوں کے مقابلے میں بہت زیادہ آگاہی رکھتے ہیں، بھلا پرانی جنوں، پریوں اور دیوؤں وغیرہ کی کہانیوں کو کیوں پسند کریں گے۔ یہ حیرت کی بات نہیں ہے کہ یورپ کے بچے، جن کے بارے میں میں نے عرض کیا ہے کہ وہ سائنسی معلومات اور فتوحات سے ہمارے بچوں کے مقابلے میں بہت زیادہ واقف ہیں۔ اینڈرسن کی کہانیوں کو بھی انہی ذوق و شوق سے پڑھتے جس ذوق و شوق سے ان کے باپ دادا پڑھتے تھے۔ آج بھی کسی بچے کے ہاتھ ایسی کتاب لگ جائے جس میں اینڈرسن کی کہانیاں دی گئی ہیں تو وہ اس کتاب کو پڑھنے میں ذرّہ برابر ہچکچاہٹ کا مظاہرہ نہیں کرے گا! آخر اس کی وجہ کیا ہے۔

اس کی ایک وجہ اور بنیادی وجہ یہ ہے کہ بچہ فطرتاً معصوم ہوتا ہے۔ اس کی معصوم فطرت کائنات سے رابطہ قائم کرنے کی آرزومند ہوتی ہے اور جب ایسی کہانیوں کے ذریعے جن میں اَن دیکھی مخلوق اور اس کے کارناموں کا تذکرہ ہوتا ہے تو اس کی قوتِ متخیلہ اسے اس اَن دیکھی، اَن جانی مخلوق کے قریب لے آتی ہے۔ وہ محسوس کرتا ہے کہ یہ کائنات کتنی وسیع، کتنی حیرت زا، کتنی خوبصورت ہے جس میں ایسی عجیب و غریب مخلوق رہتی ہے۔ یہ تصوّر اسے ذہنی طور پر اور روحانی طور پر بھی خوشی مہیا کرتا ہے اور یہ خوشی بچوں کے لیے ایک متاعِ گراں بہا کی حیثیت رکھتی ہے۔

میں ایک اور مثال پیش کرتا ہوں۔ آپ کبھی کسی بچے کو ایک ایسی کہانی دیں جس میں ایسی ہی مخلوق کا کوئی واقعہ بیان کیا گیا ہو۔ مثلاً یہ ایک ایسی کہانی ہے جس میں ایک ظالم جادوگر ایک شاندار محل میں رہتا ہے اور اس نے کئی شہزادوں کو اپنے جادو کے زور سے پتھر کی مورتیاں بنا رکھا ہے۔ لوگ اس جادوگر سے بہت ڈرتے ہیں اور اس کا مقابلہ کرنے کا خیال تک نہیں کرتے۔ مگر ایک بہادر شہزادہ ہے جو اس کے مقابلے میں محل کے اندر داخل ہو جاتا ہے۔ وہ اپنی بہادری، جرأت اور فراست سے جادوگر پر غالب آ کر پتھر کی ساری مورتیوں کو واپس انسانی صورت میں لے آتا ہے۔

یہ تو ہوئی کہانی۔ اب اگر آپ بچے کے قریب بیٹھے ہیں تو آپ مشاہدہ کریں گے کہ بچے کے چہرے پر تواتر اور تسلسل کے ساتھ تغیرات رونما ہو رہے ہیں۔ کبھی اس کے چہرے پر مایوسی کے اثرات ہیں، کبھی وہ کیفیت جسے خوف اور ڈر کہہ سکتے ہیں۔ اور کبھی یہ چہرہ ایک اندرونی جوش سے یک بیک سرخ ہو جاتا ہے۔ آپ یہ بھی محسوس کرتے ہیں کہ آخر میں بچے کے چہرے پر اطمینان کی سی کیفیت چھا جاتی ہے۔

یہ کہانی پڑھنے والے بچے کے ہر دم متغیر اثرات اس امر کی نشاندہی کرتے ہیں کہ بچہ کہانی پڑھتے ہوئے خود بھی ایک کردار بن گیا ہے۔ یہ کردار جادوگر کا نہیں ہو سکتا، اس شہزادے کا ہوگا جو اس ظالم جادوگر کو ہلاک کر کے بے گناہ انسانوں کو اس کے جادو سے نجات دلاتا ہے۔ میں بچے کے چہرے پر تغیرات کو اس کے مصروفِ مقابلہ کردار کی بدلتی ہوئی کیفیات کہہ سکتا ہوں۔ شہزادہ جو اب بچہ خود ہے، جب جادوگر کو للکارتا ہے تو اس کا چہرہ سُرخ ہو جاتا ہے۔ اور جب وہ جادوگر پر غالب آ کر اسے ختم کر کے انسانوں کو اس کے چنگل سے رہائی دلاتا ہے تو اس کے چہرے کی کیفیت ایک فاتحانہ مسرت میں منتقل ہو جاتی ہے۔

جادوگر کو شر کی علامت قرار دیں تو شہزادہ جو اس کا مقابلہ کرتا ہے، نیکی کی علامت قرار پاتا ہے۔ یہ گویا بدی اور نیکی کی جنگ ہے۔

اگر کہانی کار نے کہانی کو ہنر مندی سے فن کارانہ حُسن کے ساتھ اور خوبصورت، موثر پیرایہ بیان دیا ہے تو کیا بچہ اس سے یہ سبق نہیں سیکھتا کہ نیکی اور بدی کی لڑائی میں فتح نیکی ہی کی ہوتی ہے۔ کیا اس سے کہانی کا مقصد پورا نہیں ہو جاتا؟ کہانی لکھنے والے کو کہانی کے فنی تقاضوں سے عہدہ برآ ہونا چاہیے۔ واقعات کی حُسن کارانہ ترتیب کرداروں کو زندہ کردار بنانے کی صلاحیت اور کرداروں کے درمیان اس واضح تصادم اور اس تصادم کے عقب میں نیکی کی فتح کا وہ یقین جو اس کہانی کا حقیقی مقصد ہے، یہ سب کچھ ضروری ہے۔

میں نے یہاں ذرا تفصیل سے کام لیا ہے کیونکہ بچوں کے ادب کے نقاد عام طور پر جن، پریوں کے موضوع کو خطرناک سمجھتے ہیں۔ مجھے اس سے اختلاف ہے اور اس کی وجہ میں ابھی ابھی بیان کر چکا ہوں کہ موضوع بذاتِ خود خطرناک یا سطحی یا بے کار نہیں ہوتا۔ لکھنے والا اسے جو چاہے بنا سکتا ہے اور اسے جس رنگ میں پیش کرنا چاہے پیش کر سکتا ہے۔

مجھے اس حقیقت کا اعتراف ہے کہ ہمارے بچوں کے ادب میں خوبصورت نظمیں کافی تعداد میں لکھی گئی ہیں۔ مولوی محمد حسین آزاد، حالی، اسمٰعیل میرٹھی، سورج نرائن مہر، تلوک چند محروم، اختر شیرانی، حفیظ جالندھری، حامداللہ افسر، خود علامہ اقبال نے بڑی خوبصورت، بہت پیاری نظمیں لکھی ہیں۔ یہ سب پرانی نسل کے لوگ ہیں۔ نئے دور میں صوفی غلام مصطفےٰ تبسم، پروفیسر قیوم نظر، رفیق احمد خاں، شیدا کاشمیری، خالد بزمی، عابد نظامی، نظر زیدی اور کئی دوسرے شعرا نے بچوں کی شاعری میں اس روایت کو زندہ رکھنے کی کوشش کی ہے، جو بچوں کے ادب کے پہلے اور دوسرے دور کے افق سے چھوٹی تھی مگر یہاں مجھے دو تین خامیوں کا احساس ہوتا ہے۔ پہلی خامی تو یہ ہے کہ بچوں سے جو لکھی جانے والی شاعری میں شاعر مظاہر قدرت سے وہ رابطہ پیدا نہ کر سکا یا پیدا کر سکا ہے تو بہت کم جو پڑھنے والے بچے کے لیے مزید خوشی کا ذریعہ بن سکے۔

میں اپنی بات کی ذرا وضاحت کروں گا۔ آزاد کی وہ نظم کسے یاد نہیں ہو گی؟

سویرے جو کل آنکھ میری کھلی — عجب تھی بہار اور عجب سیر تھی

اس کے بعد سیر کے مناظر دکھائے گئے ہیں۔ پڑھنے والا بچہ یہ نظم پڑھتے ہوئے محسوس کرتا ہے کہ وہ بھی سیر کر رہا ہے۔

یا مولوی اسمٰعیل میرٹھی کی بڑی پیاری نظم ہے۔

نہر پر چل رہی ہے پن چکی — دُھن کی پوری ہے بات کی پکّی
بیٹھتی تو نہیں کبھی تھک کر — تیرے پہیے کو ہے سدا چکّر
منہ برستا ہو یا چلے آندھی — تو نے چلنے کی شرط ہے باندھی

شاعر پن چکی سے مخاطب ہے۔ بچہ بھی شاعر کی طرح اس سے مخاطب ہو جاتا ہے اور اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ جو خوبیاں شاعر پن چکی کی بیان کرتا ہے وہ غیر شعوری طور پر بچے کے اپنے دل کی گہرائیوں میں اترتی چلی جاتی ہیں۔

یہ ہے اس نظم کی خوبی۔

افسر نے ایک نظم لکھی ہے۔ اس بہت خوبصورت نظم کا پہلا شعر ہے۔

تم ندی پر جا کر دیکھو — جب ندی میں نہائے چاند

بچے بار ہا چاند کو دیکھتے ہیں۔ اس کی خوبصورتی سے متاثر بھی ہوتے ہیں۔ مگر میں سمجھتا ہوں جب وہ افسر کی اس نظم کو پڑھ کر چاند پہ نظر ڈالیں گے تو انھیں چاند پہلے سے زیادہ خوبصورت، پہلے سے زیادہ پیارا لگے گا۔

یہ نظم اتنی پیاری ہے کہ میں اس کے چند اور شعر لکھے بغیر نہیں رہ سکتا۔

کہیں لگائی ڈبکی اس نے　　ڈر ہے ڈوب نہ جائے چاند
کرنوں کی اک سیڑھی لے کر　　چھم چھم اترا آئے چاند
جب تم اس کو پکڑنے جاؤ　　پانی میں چھپ جائے چاند
پھر چپکے سے نکل کر دیکھے　　اور پھر خود کو چھپائے چاند
اب پانی میں چپ بیٹھا ہے　　کیا کیا روپ دکھائے چاند
چاہے جدھر کو جاؤ افسر　　ساتھ تمھارے جائے چاند

اس نظم کی ایک اور خوبی بھی ہے۔ شاعر نے چاند کو بچوں کا ہمجولی بنا دیا ہے۔ ایک ایسا ہمجولی جو اپنے ساتھیوں کے ساتھ کھیل رہا ہے۔ ہمارے ہاں آج کل کرداری نظمیں بہت کم لکھی گئی ہیں۔ ایک زمانے میں سید سجاد حیدر یلدرم نے ایک نظم لکھی تھی جس کا عنوان تھا "مرزا پھویا" یہ مرزا پھویا بچوں کا ایک جانا پہچانا کردار بن گیا تھا۔ موجودہ دور میں صوفی غلام مصطفےٰ تبسم نے اپنی شاعری کے ذریعے ایک بڑا مقبول کردار دیا ہے۔ "ٹوٹ بٹوٹ"

اس نوعیت کے کردار جن نظموں میں آتے ہیں وہ نظمیں بچوں میں بڑی مقبول ہو جاتی ہیں۔ مولوی اسمٰعیل میرٹھی اور علامہ اقبال نے ایسی ہی خوبصورت کرداری نظمیں دی ہیں۔

میں نے سورج نرائن مہر کی کسی نظم کا حوالہ نہیں دیا۔ اب دیتا ہوں۔

رستہ ہے زندگی کا کٹھن پر بڑھے چلو　　مانا خطر ہے اس میں سنبھل کر بڑھے چلو
منزل نظر کے سامنے ہے گر بڑھے چلو　　رحمت خدا کی تم پہ مقرر بڑھے چلو

ہمت نہ ہارنا، کبھی ہمت نہ ہارنا

اس نظم میں بچوں کو ہمت نہ ہارنے کا سبق دیا گیا ہے۔ مگر نظم وعظ و نصیحت کے باوجود مترنّم اور بڑی ہلکی پھلکی ہے۔ بچہ اسے بڑی آسانی سے یاد کر سکتا ہے۔

بچوں کی نظموں میں غنائیت بہت ضروری ہے۔ موجودہ شعرا اس امر کا زیادہ خیال نہیں رکھتے۔

ہمارے ہاں بچوں کے ادب میں سائنس فکشن کی بھی کمی محسوس کی جاتی ہے۔ اس کمی کے لیے ہمارے ہاں جو سائنسی سرگرمیوں کا قحط ہے اسے وجہ جواز بنایا جاتا ہے۔

یہ درست سہی مگر ہمارے لکھنے والوں کو یہ بات تو لازماً معلوم ہوگی کہ اگر آج ہم اپنے بچوں کو سائنس فکشن سے محروم رکھیں گے تو ہم ان بچوں کے اندر سائنسی شعور پیدا کرنے میں ناکام رہیں گے۔ جو بچے آج سائنس فکشن پڑھ رہے ہیں، کیا یہ ممکن نہیں کہ یہی بچے آگے چل کر سچ مچ سائنسی کارنامے دکھانے لگیں۔ آج کی سائنس فکشن بچوں کے ذہنوں میں تخیلات کو حقائق بنانے کے جذ

اور شوق کی تعمیر کر سکتی ہے۔

ناول نگاری پر بڑا زور دیا جاتا ہے۔ یہ بڑا آسان راستہ ہے بچوں میں مقبول رہنے کا۔ مگر سائنس فکشن پر بھی ناول لکھے جا سکتے ہیں۔ جیولس ورن، فرانسیسی مصنف جسے سائنس فکشن کا باپ کہا جاتا ہے، اس نے "اسّی دنوں میں دنیا کا سفر" اور ایک اور ناول لکھا ہے TWENTY THOUSAND LEAGUES UNDER THE SEA یہ ناول نہ صرف بہت مقبول ہوئے بلکہ ان کا ایک اہم کردار یہ بھی ہے کہ انھوں نے بچوں کے ذہنوں میں خیالی مہمات کو حقیقی مہمات بنانے کے بیج بوئے۔ ہم ایسا تو کر سکتے ہیں کہ دنیا میں جو سائنسی فکشن لکھی گئی ہے اس میں سے انتخاب کر کے بعض تحریروں کو اردو میں منتقل کر دیں۔

ہمارے ہاں بچوں کے لیے مزاحیہ ادب کی بھی بڑی کمی ہے۔ اس سلسلے میں اتنی کتابیں بھی معرض تحریر میں نہیں آئیں جنھیں انگلیوں پر ہی گنا جا سکے۔ یہ کمی پوری ہونی چاہیے۔

میں نے خامیوں کے ضمن میں تفصیل سے کام نہیں لیا۔ جو خاص خامیاں مجھے معلوم ہوئی ہیں صرف انھیں کا ذکر کر دیا ہے اور یہ بھی بڑے اختصار کے ساتھ۔

آخر میں ایک بات کا ذکر کروں گا اور یہ ضروری بھی ہے۔

ہم اپنے بچوں کے اندر خود اعتمادی پیدا کرنے کی کوشش سے گریز کرتے ہیں۔ مثلاً بچوں کو جب اپنے ادب کے متعلق بزرگوں سے یا بچوں کے لکھنے والوں سے سوال و جواب کا موقع ملتا ہے۔ ایسے موقع پر ہونا تو یہ چاہیے کہ بچے خود اپنے مطالعے کی روشنی میں سوال سوچیں اور بزرگوں سے پوچھیں۔ سوال بچوں کے ادب سے متعلق ہیں اس لیے بزرگوں سے میری مراد بچوں کے لیے لکھنے والوں سے ہے۔

کہا جاتا ہے کہ موجودہ دور کے بچے بہت ذہین، بہت باشعور ہیں۔ بالکل درست، مگر ایسا کیوں ہوتا ہے کہ ان بہت ذہین بچوں کو خود سوچ کر سوال کرنے کا موقع ہی نہیں دیا جاتا۔ بزرگ خواہ مخواہ مداخلت کرنے لگتے ہیں۔ اس مداخلت سے بچوں کی خود اعتمادی کو نقصان پہنچتا ہے۔

میرا ذاتی تجربہ یہ ہے کہ بچے بہت کم خود سوال بناتے ہیں۔ یہ کام بڑے کر دیتے ہیں۔ اس کا آخر کیا فائدہ ہے۔

ایک بچی نے مجھ سے سوال کیا۔ "انکل! انسان چاند پر چلا گیا ہے، آپ جن، پریوں ہی کی کہانیاں لکھ رہے ہیں۔ میں نے کہا —— عزیز بچی! مجھے یہ بتاؤ تم نے اپنے ادب میں کیا کچھ پڑھا ہے۔

بچی صرف اپنی درسی کتاب کا حوالہ دے سکی۔ میں نے کہا بچوں کے لیے تو بے شمار کتابیں لکھی گئی ہیں۔ اگر تم نے صرف چند کتابوں کا بھی مطالعہ کیا ہوتا تو تم کو معلوم ہو جاتا کہ بچوں کے لیے لکھنے والوں نے پریوں، جنوں، دیوؤں اور جادوگروں کی کہانیوں کے علاوہ بھی سیکڑوں کہانیاں لکھی ہیں۔

میں وثوق سے کہہ سکتا ہوں کہ اگر اس بچی نے اپنے ادب کے کچھ حصے کا مطالعہ کیا ہوتا تو وہ اپنے مطالعے کی روشنی میں خود سوال سوچ کر کرتی۔ ایک بچے نے مجھ سے پوچھا تھا۔ یہ جادوگروں کی جانیں طوطوں میں کیوں ہوتی ہیں؟

یہ سوال بچے نے خود کہانیاں پڑھ کر، خود سوچ کر کیا تھا۔ مجھے یہ سوال سن کر خوشی ہوئی تھی۔ بچوں کے اندر خود اعتمادی ابھارنے کے لیے بچوں کی اپنی سوچ بہت ضروری ہے۔

یہ خود اعتمادی آیندہ زندگی میں بھی روشنی دیتی ہے اور دیتی رہتی ہے۔

مظفر علی سید

منشا یاد ــــ کاریگر افسانہ نگار

"کہانی کہنے کا فن آخری دموں پر ہے۔ ڈھنگ سے کہانی کہنے کی اہلیت ہمارے درمیان کم سے کم تر ہوتی جاتی ہے۔ جب بھی ہم کوئی قصہ سننا چاہیں تو اکثر و بیشتر سنانے والا گھبرا کر پہلو بدلنے لگتا ہے۔ گویا ایک ایسی چیز جو ہم سمجھتے تھے ہم سے کوئی نہ چھین سکے گا اور جو ہمیشہ ہماری مٹھی میں محفوظ رہے گی" اب ہتھیائی جا چکی ہے ــــ یعنی تجرباتِ زندگی کا تبادلہ کرنے کی صلاحیت"

(والٹر بنجمن: نکولائی لیسکوف کی کہانی پر سوچ بچار)

جرمنی کے اس مفکر نقاد (متوفّی ۱۹۴۰ء) نے زار شاہی کے مقبول عام روسی فن کار پر لکھتے ہوئے کہانی کہنے کے فن کو محنت کشی کے ماحول سے مربوط کیا ہے جو دیہات میں اور شہروں میں بلکہ سمندروں تک [اور آج کی دنیا میں فضاؤں اور خلاؤں تک] پھیلا ہوا ہے۔

"اپنی جگہ قصہ گوئی کا ہنر بھی کاریگرانہ ابلاغ کی ایک صورت ہے اس کا ہدف کسی شے کے جوہرِ خالص کو ہم تک پہنچانا نہیں، جیسا کہ اخباری اطلاع یا رپورٹ کا مقصود ہوتا ہے۔ یہ اس شے کو کہانی کار کی زندگی میں ڈبو دینے کا نام ہے تاکہ اسے پھر سے نمودار کیا جا سکے"

یہیں سے معلوم ہو سکتا ہے کہ ہمارے زمانے کا بیشتر افسانہ کیوں اس قدر اُتھلا ہے۔ اس میں نہ کوئی چیز ڈوبنے پاتی ہے' نہ خود کہانی کار کو جو اپنی انا کا پرچم اٹھائے پھرتا ہے، کسی چیز میں ڈوبنے کی ہمت پڑتی ہے کہ مبادا پھر سے نمودار ہی نہ ہو سکے۔ یوں بھی اکثر و بیشتر جدید افسانہ سطحی اور نمائشی دانشوری کی دین ہے۔ نہ محنت کا ماحول مصور کرتا ہے اور نہ خود محنت سے جنم لیتا ہے۔

انانیت کے الزام پر کوئی ایک لکھنے والے منٹو کی طرف اشارہ کریں گے جو مشہور ہے کہ بڑا خود پسند تھا۔ لیکن محمد حسن عسکری کے خیال میں منٹو کی مبیّنہ انانیت ایک نقاب تھی جو اس نے اپنی سچائی کی حفاظت کے لیے اوڑھ رکھی تھی، ورنہ اس کی فنّی شخصیت کی گہرائی میں ایک سچے فن کار کی نفیِ خودی کارفرما تھی۔ عسکری کے نزدیک:

"انانیت کی مدد سے آدمی، تنقید یا بری بھلی نظمیں لکھ لے تو لکھ لے۔ افسانہ لکھنے کے لیے تو سٹرک کے روڑوں تک کو اپنے اوپر فوقیت دینی پڑتی ہے"

منٹو کے بعد جن افسانہ نگاروں نے اپنے افسانوں میں اپنی انا کو زیادہ سے زیادہ دبا کر رکھا ہے ان میں منشایاد کا شمار بھی لازم ہے۔ اس نے بہت سی چیزوں کو اپنی ذات میں جذب ہونے دیا ہے اور ان سے زیادہ رنگا رنگ اشیا میں اور اشخاص میں خود کو جذب کیا ہے۔ اسے بقولِ خود "لت پڑ گئی ہے" کہ اپنے آپ کو دوسروں کی جگہ رکھ کر دیکھے بلکہ ان کی کھال میں چھپ کر بیٹھ جائے۔ بقول انتظار حسین اس ساجی چاہے تو بکرے کی کھال میں بھی چھپ جائے۔ جیسا کہ اس نے اپنی کہانی "ٹونگر بولی" میں کیا ہے۔ یہ صلاحیت اُس قوتِ مشاہدہ سے مختلف ہے جس پر ہمارے مکتبی ناقدینِ افسانہ اصرار کیا کرتے تھے۔ مشاہدہ تو تجربۂ حیات کی پہلی منزل ہے جہاں بہت سے ترقی پسند اور غیر ترقی پسند افسانہ نگار کسی زمانے میں اٹک کر رہ گئے تھے۔ منشایاد کا کہنا ہے:

"میں نے سیکڑوں روپ بدلے۔ ان گنت قالبوں میں ڈھلا، بہت سی ایسی زندگیوں کے تجربات حاصل ہوئے جو میں نے خود تو نہیں گزاری تھیں لیکن ایسے لگتا تھا جیسے میں نے گزاری ہیں"

ایسے لگتا تھا اور ایسے لگتا ہے۔ اسی کا دوسرا نام کہانی ہے اور منشا کے چار مجموعوں میں شامل اور اخباروں رسالوں میں بکھری ہوئی سوا ایک کہانیوں میں جو پچھلے تیس ایک برسوں کے دوران لکھی گئیں، کم ہی کوئی کہانی ہوگی جو اس نے خود پر گزری ہوئی محسوس نہ کی ہے۔ ان میں ایسی کہانیاں بھی ہیں جو خود اس کی گرفت میں نہیں آسکیں اور ایسی بھی جو ہمیں اپنی گرفت میں لے لیتی ہیں، لیکن ایسی کہانی بہت کم ہوگی جو اس نے محض اس لیے لکھی ہو کہ آج کل اس قسم کی کہانیوں کا فیشن چل نکلا ہے۔

یقیناً اس کا یہ مطلب بھی نہیں کہ اس نے کسی بزرگ یا ہم عمر دیسی یا بدیسی افسانہ نگار سے کوئی اثر نہیں لیا۔ ایسا دعویٰ تو کوئی انفرادیت زدہ، نفیِ خودی سے نا آشنا فن کار ہی کر سکتا ہے اور منشا نے تو نہ صرف سب کا کلام دیکھا ہے بلکہ سال بسال کے افسانوں کا انتخاب بھی کیا ہے۔ اپنے سے سینیئر افسانہ نگاروں کے بارے میں اس کا عام رویّہ ایک ایسے احترام کی نشاندہی کرتا ہے جس میں فکر و نظر کے اختلاف کی گنجایش بھی موجود ہے۔ اردو افسانے کے رائج الوقت موضوعات اور تکنیک کے بارے میں اس کی بے اطمینانی اتنی واضح تو نہیں جتنی کہ ایک معروضی مورخ یا بے لاگ نقاد کی ہونی چاہیے لیکن اس نے اندھادھند ردوقبول کی وہ زیادہ روی بھی اپنے لیے پسند نہیں کی جو اس کے معاصر افسانہ نگاروں میں، مثلاً انور سجاد اور رشید امجد کے یہاں بافراط پائی جاتی ہے اور جس کی ان کے مربّی مدیرانِ جرائد کے یہاں بھی کوئی کمی نہیں۔

(۲)

افسانے کے فن پر اس کے جو بھی شعوری خیالات ہوں یا دوسروں کے افسانوں پر اس نے جتنی بھی وسیع القلبی یا تنگ نظری کا مظاہرہ کیا ہو، خود اس کے اپنے افسانوں کو دیکھیے تو "بند مٹھی میں جگنو" سے لے کر "وقت سمندر" تک بلکہ تازہ ترین افسانوں میں بھی بہت سے رجحانات یکے بعد دیگرے یا بیک وقت موجود یا باہم دست و گریباں ملیں گے۔ سب سے غالب رجحانات میں

۔ تو اس کا دیہاتی پن ہے اور دوسرا اس کی روشن خیالی۔ ظاہر ہے کہ یہ دونوں خصوصیات ایک دوسری کی ضد ہیں لیکن کے باہمی تصادم کے بغیر اس کی بہترین کہانیوں کا تصوّر بھی نہیں کیا جا سکتا۔

ابتدائی کہانیوں میں موضوع اور تکنیک دونوں کے اعتبار سے وہ انداز نمایاں ہے جیسے احمد ندیم قاسمی کے یہاں ۔ کر منٹو نے کہا تھا کہ آپ نہایت درجہ سادہ لوح ہیں اور ہڈیوں کے گودے تک جذباتی۔ منٹو کو یہ تو تسلیم تھا کہ وہ خود بہت سینٹی مینٹل ہے لیکن وہ یہ بھی سمجھتا تھا کہ "ہمیں افسانوں میں سینٹی مینٹ زیادہ نہیں بھرنا چاہیے"۔ اس نے مطالعہ تھا کہ ندیم کے یہاں سینٹی مینٹ اس کی بیخ تک پہنچ چکا تھا اور یہ مشورہ دیا تھا کہ "اسے دبانے کی کوشش کیجیے"

اب یہ تو معلوم نہیں کہ منشا نے اپنی پہلی کتاب (مطبوعہ ۱۹۷۵ء) کے افسانے لکھنے سے پہلے یا ان کے دوران منٹو خطوط ندیم کے نام جو ۶۲ء میں شائع ہو چکے تھے، پڑھے تھے یا نہیں، لیکن صرف پڑھنے سے کیا ہوتا ہے وہ تو خود ندیم صاحب بھی بیس برس پہلے پڑھے ہوں گے۔ تاہم "بند مٹھی میں جگنو"، جن دو حصوں پر مشتمل ہے، ان کے درمیان بقول مرزا مدبیگ کوئی نہ کوئی شعوری غیر شعوری تبدیلی ضرور آئی تھی جس کی بنا پر بہت سے ابتدائی افسانے رسائل میں چھپنے کے جود کتاب میں شامل نہ ہو سکے بلکہ جو چند ایک نمونۂ کلام کے طور پر درج کتاب ہوئے بھی تو ان کو پہلے حصے میں جگہ ملی۔ ج ان میں سے شاید ہی کوئی افسانہ سنجیدہ توجہ کے قابل نظر آئے، خصوصاً اس معیار کو دیکھتے ہوئے جو منشا کے یہاں بعد ں نظر آتا ہے۔

پھر بھی چند ایک کہانیاں ایسی ضرور ہیں جو کسی نہ کسی لحاظ سے آنے والی پختگی کا ایک نہ ایک عنصر نمایاں کرتی ہیں۔ سب سے پہلی کہانی "دل کا بوجھ"، تعمیر مکان کے دوران رکھے گئے چترالی چوکیدار گلبا زخان پر فوکس کرتی ہے اور گول مال ے ماحول میں ایک ایسے دیانت دار محنت کش کی تصویر کشی جو ایک چوکیدار کی تنخواہ میں مزید دو عدد مزدوروں کا کام بھی نمٹا دیتا ہے۔ جذباتی انجام سے ٹیگور کا "کابلی والا" یاد آتا ہے جس کے نمونے پر ہمارے یہاں بیسیوں کہانیاں لکھی جا چکی ہیں۔ لیکن وہ کاریگرانہ ماحول اور تعمیراتی سامان خرد برد کرنے کی تفصیل بیان کرنے کا لہجہ، منشا کا اپنا ماحول اور پنا لہجہ محسوس ہوتا ہے۔ جذبانیت سے کہانی اشک آلود تو ہو جاتی ہے لیکن بنیادی کردار کو اخلاقی سطح پر ایک فوق البشر نا کے رکھ دیتی ہے۔ تاہم اتنا غنیمت ہے کہ اس میں پرانے ترقی پسند افسانے کی طرح محنت کشوں کی عظمتِ کردار پر کوئی خطبہ نہیں دیا گیا، نہ ہر مزدور کو فرشتہ بنا کر پیش کیا گیا ہے۔

"خواہش کا اندھا کنواں" ایک ایسا ابتدائی افسانہ ہے جس میں منشا کی نفیِ خودی انتہا کو پہنچی ہوئی نظر آتی ہے۔ یک بازاری کتے کی کہانی میں اس نے اتنی دردمندی بھرنے کی کوشش کر دی ہے کہ بے چارہ کتا بھی اس کا متحمل نہیں ہو سکتا اور بالآخر ایسوپ (AESOP) کے لالچی کتے کی طرح اسے بھی ایک ناصحانہ انجام کا ہدف بننا پڑتا ہے۔ پالتو اور بازاری کتوں کا مکالمہ طبقاتی امتیاز پر زور دیتا ہے لیکن جب وہ تازہ روٹیوں کی چنگیر اٹھائے ہوئے ایک بڈھے آدمی کو گراتا ہے اور "اتنی ساری روٹیاں جو اس نے کبھی خواب میں بھی نہ دیکھی تھیں"، کھانے میں مصروف ہو جاتا ہے تو اسے اپنے آپ کی سدھ نہیں رہتی۔ عین اس وقت کمیٹی کا ٹرک راولپنڈی کے وہ تمام محلے چھوڑ کر جن سے یہ

بھوکا کتا گزر کر آیا تھا اور جہاں بہت سے خونخوار کتے کھلے پھرتے تھے، یہاں کیسے پہنچ گیا؟ اس قسم کی علت و معلول سے کہانی کار کو کوئی سروکار نہیں۔ یوں لگتا ہے کہ آوارہ کتے کی آوارگی کا پیچھا کرتے کرتے افسانہ نگار بھی تھک گیا ہے اور اسے "خواہش کے اندھے کنویں: میں جھونک دینے کے سوا اس کی سمجھ میں نہیں آیا کہ اب کیا کرے۔

اصل بات یہ ہے کہ افسانہ نگار ایک جاندار کو غذا کی تلاش میں سرگرداں دکھانا چاہتا ہے۔ لیکن وہ بھول جاتا ہے کہ اس جاندار میں بھوک کے سوا جانداری کی کوئی اور علامت موجود نہیں۔ صادق ہدایت کے "سگِ ولگرد" کی طرح کوئی مادہ سگ اس کے راستے میں نہیں آتی، نہ کوئی تازہ گرم خمیری روٹی کا ٹکڑا اس کے آگے پھینک کر اسے پیار سے بلاتا ہے کہ اس کا پٹا اتارے۔ وہ اتنا عام سا بھکاری کتا ہے کہ خود افسانہ نگار بھی اس کی شکل و صورت بیان کرنے پر کوئی توجہ نہیں دیتا۔ اس کے برعکس صادق ہدایت کے پیّٹ کو دیکھیے۔

"جو کتے آدمیوں کی سی دو آنکھیں اس کی اُون بھری منڈیا پر چمک رہی تھیں اور آنکھوں کی تہ میں ایک انسانی روح جھلملاتی تھی۔ اس آدھی رات میں جب زندگی نے اسے گھیرا ہوا تھا، اس کی آنکھوں میں ایک بےپایاں قسم کی چیز لہر بن لے رہی تھی جس میں کوئی پیغام سمویا ہوا تھا جو سمجھ میں تو نہیں آتا تھا لیکن پتلیوں کے پیچھے ٹھٹک کر رہ گیا تھا۔ یہ روشنی تھی نہ رنگ، ایک ناقابلِ یقین لرزش تھی جیسی کہ ایک زخمی ہرن کی آنکھوں میں دکھائی دیتی ہے۔"

پیّٹ کا تعلق، کتوں کی اشرافیہ سے ہے لیکن اب وہ اس طبقے کی مراعات سے محروم ہو چکا ہے۔ منشا کا بازاری کتا، اس کے برعکس ایک پیدائشی بھکاری ہے لیکن سوال یہ ہے کہ جب تک ہمیں اس میں زندگی کی کوئی رمق نظر نہ آئے تو ہم اس کے ساتھ دردمندی کا رشتہ کیسے پیدا کریں۔

پہلے مجموعے کا آخری افسانہ "بند مٹھی میں جگنو" جو کتاب کا عنوان بھی ہے ایک دوسری کشمکش کو پیش کرتا ہے۔ بعض اوقات جدید افسانے کی بوجھل اور غیر متعین لفاظی کی شکل میں جو سوچتے ہوئے کردار دل کے رگ و پے پر مسلط ہو جاتی ہے:

"جب سے کالج بند ہوا تھا اس کے ذہن میں چھوٹی چھوٹی بھنبھیریاں اپنے آپ چلتی رہتی تھیں۔ وہ سوچنا نہ چاہتی تو بھی سوچ کی سخت جان اور بدشکل چھچھوندر اس کے دماغ میں تھوتھنی ڈالے مسلسل چیختی رہتی"

تھوتھنی یا کچھ بھی ہو، یہ کوئی انسانی زبان نہیں، نہ اس کا کوئی افادی مصرف سمجھ میں آتا ہے، تاہم اس افسانے کی لڑکی، محبوس زندگی سے آزاد زندگی کی طرف گامزن ہے۔ پڑوسنوں کی لڑائی میں انسانی اعضا کے نام سن کر:

"........اس کے ذہن کے پنجرے میں قید بےشمار چھوٹی چھوٹی چڑیاں یکبارگی پھر سے اڑ گئیں۔ اس کے بدن سے ہمیشہ سے چمٹی ہوئی جونکیں ایک ایک کر کے جھڑنے لگیں اور دیکھتے ہی دیکھتے اس کے اندر ایک نیا سورج اُگنے لگا۔ اس کا سارا جسم اس کی کرنوں سے دمکنے لگا، لذیذ سی گرمی سے رخسار تمتمانے لگے، پسینے سے جسم بھیگ گیا۔ اسے اپنے پسینے سے پہلی بار تازہ گلاب کی خوشبو آئی اور اسے یوں لگا جیسے اس کا بدن ہلکا ہو کر زمین سے اوپر اٹھتا جا رہا ہو"

لیکن ابھی معلوم نہیں کہ زمین پر واپس آنے کے بعد کیا ہوا، چنانچہ بدصورت چمچھوندروں کی تھوتھنی یا جو کچھ بھی اسے کہیے، پھر واپس آجاتی ہے۔ صاف پتا چلتا ہے کہ منشا کے یہاں زندگی کی لذت کا ایک جھونکا سا تو آیا ہے لیکن ان پاس کی بدبو اب بھی حواس پر مسلط ہے۔

(۳)

"ماس اور مٹی" سے جو پہلی کتاب کے پانچ برس بعد ۱۹۸۰ء میں شائع ہوئی، منشا کی خودشعوری اور ذاتی شناخت کا آغاز ہوتا ہے۔ اس کے بعد اس نے اِکّا دُکّا افسانے ایسے ضرور لکھے ہیں جو پختگی اور معیار کے لحاظ سے فزوں تر ہوں، لیکن اس مرحلے پر یوں لگتا ہے جیسے اس کی آواز دور کا سفر طے کر کے آرہی ہو اور اس کے ساتھ ساتھ اپنے آس پاس کو بھی پورے تناظر میں محسوس کر رہی ہو۔

راستے بند ہیں، بانجھ ہوا میں سانس، اندھیرے سے اندھیرے تک، رکی ہوئی آوازیں — محض عنوانات سے معلوم ہو سکتا ہے کہ اجتماعی حساسیت سے واسطہ ہے۔ اب خود افسانہ نگار ہی چیزوں میں جذب نہیں ہو رہا، اس کے کردار بھی اشیا کے ساتھ ایک باطنی رشتہ قائم کر لیتے ہیں۔

بعض اوقات یہ رابطہ اتنی شدت سے قائم ہوتا ہے کہ سارے بند ٹوٹ جاتے ہیں "راستے بند ہیں" کا مرکزی کردار جس کا راوی کی طرح کوئی نام نہیں، اتنا ہی بھوکا ہے جتنا کہ "خواہش کے اندھے کنویں" کا بھکاری تھا۔ لیکن وہ میلے میں آیا ہوا ہے اور اس طرح کہ "کھانا کھاتے ہوئے آدمی کے سامنے اکثر و بیشتر کتے کی آنکھ میں بھی اتنا ندیدہ پن نہیں ہوتا جتنا حلوا پوری کھاتے اور فالودہ پیتے لوگوں کو دیکھ کر اس کی نگاہوں سے جھلکنے لگتا ہے۔"

قریب ہے کہ وہ میلے پر آئے ہوئے جان پہچان کے لوگوں میں شامل ہو کر یا تو نمبردار کے بیٹے کی چلمیں بھرے اور دلالی کرے یا پھر مہروسانسی کی طرح لذیذ چیزوں کی چوری پر کمر باندھ لے۔ "اس نے کئی بار ارادہ کیا ہے کہ کسی حلوائی کی دکان یا کسی ہوٹل میں گھس کر جی بھر کے کھائے اور خود کو دکاندار یا پولیس کے حوالے کر دے۔"

لیکن راوی اس کو نفسیاتی خودفریبی کا طریقہ سکھاتا ہے اور وہ جو کچھ کسی کو کھاتے پیتے دیکھتا ہے، محض دیکھنے سے وہی چیز کھانے پینے کی لذت محسوس کرنے لگ جاتا ہے۔ مشاہدے کو واردات بنانے کا یہ عمل افسانہ نگار نے بڑی مہارت سے بیان کیا ہے۔ لیکن جب اس خودفریب کے سامنے ایک آدمی ٹرک کے نیچے آکر کچلا جاتا ہے تو اسے لگتا ہے جیسے یہ ٹرک خود اس کے اوپر سے گزر رہا ہے اور یہ پیش آمد اسے اتنی شدت سے محسوس ہوتی ہے کہ وہ دھڑام سے گر پڑتا ہے اور دیکھتے ہی دیکھتے ٹھنڈا ہو جاتا ہے۔

بات انہونی ہے لیکن افسانہ نگار ساڑھے چار صفحوں میں اس میلو ڈرامائی انجام کو نفسیاتی سطح پر قابلِ فہم بنا دیتا ہے۔ تاہم قابلِ فہم بننے کے باوجود، کیا اسے قابلِ قبول بھی کہا جا سکتا ہے؟ شاید نہیں۔ لیکن نکتے کی بات یہ ہے کہ ایک آدمی جس کی جیب میں کوڑی نہ ہو اور وہ زندگی کے میلے کی لذتوں سے اپنا حق مانگتا ہو، پھر اسے چور یا باغی بننے سے روکا جائے تو نفسیاتی بریک ڈاؤن سے وہ کیسے محفوظ رہے؟

پھر بھی "کچی پکی قبروں" کا گورکن لڑکا اپنے آپ کو مطمئن کر لیتا ہے، اس لیے کہ اس کی خود فریبی میں ایک پہلو سا ریگری کا بھی شامل ہو گیا ہے۔

"پانی میں گھرا ہوا پانی" کا دتّا کمھار جانتا ہے کہ زیبا جیسی آگ بگولہ عورت، گھگھو گھوڑوں پر زندہ نہیں رہ سکتی لیکن جب وہ خود کسی طرح ایک "باوا" بنا لیتی ہے تو اسے بھی شہزادے کے پودے کی طرح اپنی تخلیق سمجھنے پر مجبور ہو جاتا ہے۔

نفسیاتی سطح پر یہ ایک پیچ دار کہانی ہے اور سنگر کے "گمپل دا فول" کی یاد دلاتی ہے لیکن جہاں سنگر کا گمپل (ایک نقاد کے الفاظ میں) "مایوسی کے اس پار رنجات کا امکان" پیدا کر لیتا ہے اور مکمل انفعالیت" میں کے ساتھ لڑھکنا سیکھ لیتا ہے، دتّا کمھار ابھی اضطراب اور بے چینی کے عالم میں ہے۔ تاہم وہ اپنی دیوتی پر کوئی جارحانہ ردّ عمل بھی نہیں دکھاتا اور حقیقتِ حال معلوم ہونے کے بعد بھی زیباں کو پھٹی پھٹی نظروں سے دیکھتا رہ جاتا ہے جس کے بعد افسانہ نگار ایک بلیغ جملے کا اضافہ کرتا ہے کہ "وہ اپنے اوزار اٹھا کر باہر نکل گیا"

البتہ دتّے کا یہ کہنا کہ میں پانی میں گھرا ہوا پانی ہوں اور زیباں کا یہ جواب میں آگ میں گھری ہوئی آگ ہوں، ایک ایسی زبان ہے جو دتّے اور زیباں کی بجائے جدید افسانہ نگاروں بلکہ ٹی وی ڈرامے لکھنے والوں کی مصنوعی شعریت سے خطرناک حد تک مشابہ ہے۔

"ماس اور مٹی" کا نانو سانسی غالباً "راستے بند ہیں" کا وہی مہرو سانسی ہے جو شہر منتقل ہونے کے بعد اور بھی کاریگر اور دلیر ہو گیا ہے لیکن ابھی تک اس کی چوریاں، کھانے پینے کی چیزوں سے آگے نہیں بڑھیں۔ پھر بھی اس کا شمار ان بہادروں میں کیسے ہو، جنھوں نے شروع کی حمد کے مطابق "ہر حال میں زندگی کا سفر جاری رکھا" لگتا ہے کہ ایک تفریحی کہانی کو خواہ مخواہ مذہبی فریم ورک میں کس کر مزید تفریح لینے کی کوشش کی گئی ہے لیکن اس سے کہانی کے ابعاد میں کوئی اضافہ نہیں ہوتا۔

اسی طرح "رکی ہوئی آوازیں" میں قرآنی ترجموں کی زبان لکھنے کا التزام ہے لیکن ڈرانے دھمکانے کے بعد جس طرح اپنے لیے کوئی نہ کوئی راستہ نکالنے کی تبلیغ کی گئی ہے، وہ بھی کشمکش کے تضاد میں آسانی کا راستہ معلوم ہوتی ہے۔

شہری اور دیہی زندگی کا تقابل بہت سی کہانیوں میں پیش ہوا ہے۔ "باگھ بگھیلی رات" بس ایک روایتی دیہاتی صورتحال کو خواب کی طرح بیان کیا گیا ہے لیکن یہ خواب آنسوؤں سے بھیگا ہوا ہے۔" اپنا گھر" میں شہری اور دیہی تجربے کا تصادم، تخئیت کو دو لخت کر دیتا ہے۔ "گھر سے باہر ایک دن" جدید شہری زندگی کی بے چارگی کا نقشہ دکھاتا ہے لیکن آخری فقرہ ہجوِ مسیح کے لہجے میں صبر و رضا کی تلقین کرتا ہے۔ یہی زہرخند افسانے کے اندر بھی ایک حد تک موجود ہے، تاہم اس کی تہ میں کوئی ایسی شدت پیدا نہیں ہوتی جس سے کوئی بڑا تصادم نمودار ہو۔

ہجوِ ملیح کا یہی لہجہ "اوور ٹائم" کے آخر میں بھی سنائی دیتا ہے لیکن یہاں منشا کا زہرخند زیادہ ڈرامائی ہے اس لیے کہانی کی بناوٹ میں پیوست ہو جاتا ہے۔ منشا کا کہنا ہے کہ منٹو کے افسانوں کا (تازیانے جیسا) انجام اسے پسند نہیں، اگرچہ خود اس نے اپنے افسانوں میں اسے خاصی کاریگری سے برتا ہے۔

" (ا + ب) ۲" میں اس لہجے کا رُخ راوی کی طرف ہے جو درسی کتابوں کی زبان میں اپنی لغزش کو بیان کرتا ہے تو
ں پر ہنسی آتی ہے " پے اِنگ گیسٹ " کے حمید صاحب جو اپنی بیوی کو لینڈ لیڈی بتاتے ہیں اور بیٹیوں کو غیر کی نظر
یکھتے ہیں، ایک استحصال زدہ صاحبِ خانہ ہونے کے ساتھ ساتھ خود بھی اپنی صورتِ حال کے لیے ذمے دار ہیں اور
لیے بیوروکریٹ جو خود اپنے گھر میں مہمانوں کی طرح رہتا ہے اور اپنے بال بچوں سے بھی اپنائیت محسوس نہیں کرتا۔ کہانی
ع سے آخر تک حمید صاحب کے نقطۂ نظر سے بیان کی گئی ہے لیکن افسانہ نگار کا تحتِ کلام انداز، ان ہی پر ضرب لگاتا ہے۔
"بانجھ ہوا میں سانس" ایک فینٹسی ہے جس کے بعد لکھنے والا بیدار ہو جاتا ہے اور خواب کی مدد سے گرد و پیش کا
ر پیدا کر لیتا ہے۔ کہانی کا یہ سانچہ کہ اس کے بعد آنکھ کھل جاتی ہے، منشا نے متعدد مرتبہ استعمال کیا ہے۔ بہت سی کہانیوں
سے لگتا ہے، وہ دیکھتا ہے، کیا دیکھتا ہے اور اس کے بعد ہڑبڑا کر اٹھنے یا جگائے جانے کا صراحت سے ذکر
ہے۔ اس سے خواب اور بیداری میں ایک میکانکی سا فرق پیدا ہو جاتا ہے۔ لیکن شاید ان کہانیوں کا شمار منشا کی ان
روں میں ہو جن میں اس نے بقولِ خود " قاری کو بہلا پھسلا کر اپنی کہانی پڑھوانے کا اہتمام " کیا ہے۔ اب یہ تو ظاہر ہے
مخ اشاروں کے بغیر افسانہ ذرا مبہم ہو جاتا ہے لیکن یہ وہ ابہام ہے جس کے بغیر فن کی پیچیدگی پیدا نہیں ہوتی، اور
کے باعث افسانے میں سہولتِ فہم تو آ جاتی ہے لیکن سطحیت بھی زیادہ دور نہیں رہ جاتی۔

"زمتانی کہانیوں"، کی خالق وتسین کے نزدیک " افسانے کی یہ کوئی برائی نہیں کہ اس کا زیادہ سے زیادہ آدھا
بھ میں آتا ہے" منشا اس مرحلے پر کوئی ایسا خطرہ مول لینے کو تیار نہیں جو اسے اپنے پڑھنے والوں سے دور کر دے، چاہے
ے ساتھ فن کی تہ داری بھی ہاتھ سے جاتی رہے۔

مجموعی طور پر دوسری کتاب کے افسانے ایک ایسے فن کار کا روپ دکھاتے ہیں جو اپنی بیش آمد کو گرفت میں لانے کی
ش میں مصروف ہے لیکن ساتھ ہی اپنے وسائلِ اظہار کو برتنا بھی سیکھ رہا ہے۔ کبھی کبھی وہ فکر و فن کی وحدت پیدا کرنے
امیاب بھی ہو جاتا ہے لیکن زیادہ تر اس کی کاریگری اسے ایک ایسا کہانی کار بنا دیتی ہے جو بازی گری کا تماشا دکھا کر
بچوں سے تالی پٹوا کر مطمئن ہو جائے۔ یہ اور بات ہے کہ آج کل کے بچے بھی بوڑھے ہو چکے ہیں۔

(۴)

"خلا اندر خلا" اور " وقت سمندر " کے افسانے ایک لحاظ سے " ماس اور مٹی " کے افسانوں کی توسیع پیش کرتے
جب کہ دوسری نظر سے دیکھا جائے تو ان میں کسی قدر پیچیدگی یا ایک بالکل نئی جہت کا سراغ ملتا ہے۔

منشا یاد اب بھی خود فریبی اور خوش گمانی کے افسانے لکھتا ہے اور ایسے خوفناک خواب بار سے بھی جن کے بعد دفعتہً
اُچٹ جائے لیکن اب ان کا طلسم ٹوٹتا ہے تو پھر سے جڑ بھی جاتا ہے جیسے " دھوپ، دھوپ، دھوپ " اور " بوکا "
ے افسانوں میں۔ غالباً ایسی تحریروں کو دیکھ کر امرتا پریتم نے لکھا تھا کہ (رات کو پڑھنے کی بجائے) یہ طلوع ہوتے
ے سورج کی لالی کے وقت پڑھی جانے والی کہانیاں ہیں۔ جاگتے ہوئے باشعور ذہن کی پیداوار۔
ایسی کہانیوں پر علامت کا لیبل لگانا کافی نہیں۔ واضح طور پر ان میں دو قسم کے عناصر موجود ہیں، وانفعالی

اور تخیلاتی۔ حجاب امتیاز کے ہیئت ناک افسانوں سے ان کی مشابہت یک طرفہ ہے کیونکہ ان میں منطق اور معقولیت سے فرار کا رجحان موجود نہیں بلکہ ہیئت کی توجیہ کی طرف واضح اشارے ملتے ہیں۔ لوک کہانیوں کا مافوق الواقعی عنصر ان کہانیوں کا ایک اہم حصہ ہے لیکن یہ عنصر کسی نہ کسی اجتماعی بصیرت کی طرف لے جاتا ہے۔ لاطینی امریکہ کے افسانہ نگار بورخیس اور مارکیز کے یہاں، یہی دو طرفہ پن ایک قسم کی "طلسمی واقعیت" کو جنم دیتا ہے جس میں قریب نظر قریب نہیں رہتا بلکہ ایک شدت سے محسوس کیا ہوا بھرپور انسانی تجربہ بن جاتا ہے جس کی فکری تہ اسے مستحکم بناتی ہے منشا کے یہاں ڈراؤنے سپنوں کا تسلسل اور تکرار غیر شعوری سطح پر اجتماعی تنقید کا مظہر بنتے ہیں۔ خود منشا نے اعجاز راہی سے غیر رسمی گفتگو کے دوران "لوکا" کی سیاسی معنویت کو نمایاں کرنے کی کوشش کی ہے اور اس میں شک نہیں کہ جبر و تشدد کی فضا میں بین السطور بات کرنے کی ضرورت بڑھ جاتی ہے۔ لیکن اگر لوکے کا کتا یہ محض یہاں تک محدود کر دیا جائے کہ ہر بار کوئی نہ کوئی جمہوریت کی طناب کاٹ دیتا ہے، تو افسانہ محض یک پہلو اور یک تہ ہو کر رہ جاتا ہے جب کہ دیہی زندگی سے اخذ کیا ہوا استعارہ، اور باپ بیٹے کا رابطہ، وسیع تر اجتماعی معنویت کے حامل نظر آتے ہیں اسی قسم کے باپ بیٹا "تماشا" کے مداری اور جمورے کا روپ بھر لیتے ہیں تو ماحول کا عدم تعاون شیطانی سنگ دلی بن کر سامنے آتا ہے۔ بقول گوپی چند نارنگ "بہت کم ایسا ہوتا ہے کہ ہم کوئی کہانی پڑھ کر دم بخود ہو کر رہ جائیں یا ذہن کا سارا خون ایک نقطے پر سمٹ آئے" نارنگ صاحب نے اس کہانی کے ترکیبی عناصر کا جنھیں وہ "ساختیے" کہتے ہیں بڑی تفصیل سے تجزیہ کیا ہے اور دہشت کی فضا کو غیر متوقع انجام کے ساتھ مربوط کیا ہے لیکن افسانے کی روایتی، تمثیلی اور علامتی توجیہات پیش کرنے کے بعد انھوں نے جو یہ فیصلہ دیا ہے کہ کہانی کی پوری بُنت یا بافت، اول سے آخر تک علامتی ہے تو ایک نقطے پر سمٹ آنے والی بات کا وزن کم ہو جاتا ہے۔ یہ دقت ان نیم تنقیدی (یا لسانیاتی) اصطلاحوں کی وجہ سے پیدا ہوئی ہے جو افسانے کے مجموعی ارتکاز اور معانی کی مختلف تہوں کو بیک وقت دیکھنے کے لیے زیادہ مدد نہیں دے سکتیں۔

بہرحال "تماشا" کا شمار، پریم چند کے "کفن"، منٹو کے "بابو گوپی ناتھ"، "ہتک" اور "بو"، اور بیدی کے "گرہن"، اور "الٰہ آباد کے حجام" کے شانہ بہ شانہ نہیں تو ان کے فوراً بعد ضرور کیا جا سکتا ہے۔ یعنی ایسے افسانوں کی ذیل میں جن کی نت نئی تفسیریں ہو سکتی ہیں اور کوئی حتمی توجیہ نہیں کی جا سکتی۔ اتنا پھر بھی کہا جا سکتا ہے کہ اس کہانی کی نفسیاتی، اجتماعی، فنی اور فکری تہیں اپنی اپنی جگہ مضبوط ہیں اور ایک سے دوسرے کی نفی نہیں ہوتی۔

"خلا اندر خلا"، کا آخری افسانہ "بیک مرر" بھی خصوصی مطالعے کا متقاضی ہے جو ٹریفک کے ایک حادثے پر توجہ مرکوز کرتا ہے۔ اس افسانے کا پنجابی روپ جو "کال بلیندی اے" کے عنوان سے "لہراں" کے "منشا یاد نمبر" میں شامل ہے، اپنے اردو متن کی نسبت اور بھی زیادہ کارگر ہے۔ نارد اور ہوتی تو اردو افسانے میں بھی، شیطان اور تبا کے لوک ناموں کے ساتھ ظاہر ہوتے ہیں لیکن کال جو اردو میں کل بن گیا تھا، لوک واروں کی وہ فضا پیدا نہیں کرتا جو پنج افسانے کو اساطیری جہت بخشتا ہے۔ اسی طرح پنجابی افسانے کا پہلا پیرا جو رسالے کے آدھے صفحے پر محیط ہے اور تکنیکی

کو نمایاں کرتا ہے اور افسانے کے آغاز میں اس کی ایک چھوٹی سی تلخیص ملتی ہے۔

خود منشا کے بقول، اس نے اپنے بعض افسانے پہلے پنجابی میں لکھے ہیں اور بعض کا پنجابی میں ترجمہ کیا ہے۔ لیکن ترجمہ کرتے کرتے بعض اوقات وہ دوسری زبان میں بازگوئی شروع کر دیتا ہے جس کا پھر پہلی زبان میں ترجمہ لازم ہو جاتا ہے۔ بعض اوقات وہ بالکل نیا عنوان لگا دیتا ہے (جیسے "تاب شنیدن" کی جگہ "ڈنگر لوبی" جبکہ اردو میں بھی مناسب ہوتا)۔ بعض اوقات وہ اصل عنوان کو افسانے کا لازمی حصہ سمجھ کر اس کا ترجمہ نہیں کرتا جیسے "جیکو تجھے"، جیسے "جوکوئی لو" لکھا جاتا تو بہت کچھ بدل جاتا۔

بہرحال "بیک مرر"، ہو یا "کال بلیندی اے"، بذات خود افسانہ حادثے کو محض حادثہ نہیں رہنے دیتا۔ یوں ہمارے رومانی افسانوں اور ٹی وی کے میلوڈراما ئی کھیلوں کی بنیادی حادثاتی واقعات پر رکھی جاتی ہے لیکن ایسا بہت کم ہوا ہے کہ پیش آنے والے حادثے کو افسانوی علت و معلول کے رشتے میں پرو دیا گیا ہو۔ سویڈن کے افسانہ نگار ستیگ دُ کا ایک افسانہ جو اردو میں "بچے کی موت"، کے عنوان سے مرحوم نور عالم نے راقم السطور سے مل کر ترجمہ کیا تھا، حادثے کی دوا اطراف کی تصویر کشی کرتا ہے اور دونوں کو ذمے دار ٹھہراتا ہے۔ لیکن وہ ایک کار کا حادثہ تھا جب کہ یہاں ایک پُر ہجوم بھری ہوئی بس کا معاملہ ہے جس میں ڈرائیور، ڈرائیور کے پس پردہ ٹرانسپورٹ کمپنی کے مالک، بس کا کلینر اور سواریاں صورتِ حال میں شریک ہیں۔ ڈرائیور جو اس قافلے کا میر کارواں ہے، قیادت کے تقاضوں سے بری الذمہ نہیں کہا جا سکتا لیکن کیا سارا قصور اسی کا ہے اور بس کی سواریاں اپنی اجتماعی ذمے داریوں سے سبکدوش قرار دی جا سکتی ہیں؟

یوں تو افسانہ تصویری سطح پر بھی زور دار ہے لیکن شروع کی تکنیکی بحث اور آخر کار متبادل انجام اسے کمزور کرنے کی بجائے سوچ بچار کی جہت میں داخل کر دیتے ہیں جو افسانویت سے زیادہ معنویت سے تعلق رکھتی ہے۔ لیکن جب لوگ حادثوں کو محض حادثہ سمجھتے ہوں اور افسانوں کو محض افسانہ تو یہ بھی کوئی برائی نہیں۔

"وقت سمندر" میں شامل افسانوں میں سے "ڈنگر لوبی" سب سے زیادہ قابلِ توجہ ہے جس کا پہلے ذکر ہو چکا ہے۔ اردو میں پنجابی روپ کا پہلا فقرہ "اوہ میرے تے فتویٰ لان نُوں پھردے نیں" شامل نہیں۔ انور سجاد کی "گائے" سے اس کا موازنہ سامنے کی بات ہوگی لیکن یہاں بکرے کی کھال میں گھس کر کہانی کہنے کا انداز ہے اور گؤ خوری ترک کرنے کی تبلیغ سے بچ بچ کر بات کی گئی ہے۔ [شاید اسی لیے پنجابی کا پہلا فقرہ قلم زد کیا گیا؟] تاہم عقیدے کا حوالہ موجود ہے اور تفسیات بگھارنے یا جذباتیت بکھیرنے سے پرہیز روا رکھا گیا ہے۔

آخری مجموعے کی چند ایک کہانیاں، البتہ امن دوستی کی براہِ راست تبلیغ کرتی ہیں اور چند ایک رومانی صورتِ حال کا تجزیاتی مطالعہ پیش کرتی ہیں، جیسے زیرو زیرو زیرو، ببول سے لپٹی ہوئی بیل، لوہے کا آدمی، اور گیارہ میل۔ آخر الذکر افسانہ وقت سے ماورا ایک دائمی تمثیل کا اسرار پیش کرتا ہے لیکن "اپنا اپنا کاگ" معصومیت سے شروع ہو کر سادہ لوحی تک پہنچ جاتا ہے جس میں افسانہ نگار کا لہجہ طنزیہ نہیں۔ "بیتال کتھا"، انتظار حسین نے

مخصوص میدان میں مداخلت معلوم ہوتی ہے۔ لیکن بالآخر انتظار سے خاصے مختلف انداز کی کہانی بن جاتی ہے۔ "اوپر جانے والا" ایک نیم تجریدی افسانہ ہے جو قیادت کی خود پرستانہ کشش کو مصور کرتا ہے لیکن اس کی اخلاقیات سے بے نیاز نہیں۔

"خوف۔ ۸۵" بظاہر ایک وقتی دہشت پر لکھی ہوئی کہانی ہے لیکن جب بازار کی سراسیمگی گھر تک پہنچ جاتی ہے اور نزدیک ترین رشتوں کے درمیان شک و شبہ کا باعث بنتی ہے تو اجتماعی ماحول کا جبر اور بھی زیادہ شدت سے محسوس ہوتا ہے۔ انجام ساختہ سہی لیکن کاریگرانہ نزاکت سے نبھایا گیا ہے۔

(۵)

آخری کتاب کے بعد اب، یعنی اکتوبر ۸۸ء تک جو بارہ ایک افسانے لکھے گئے ہیں ان میں بھی چند ایک سنجیدہ مطالعے کے متقاضی ہیں۔ "اندر کی گنگناہٹ" لڑکپن کے کچے تجربات کا بچپن کے دور پر ردِ عمل ہے جو منشا کے یہاں پہلے بھی کئی بار آ چکا ہے لیکن یہاں اس کی کارفرمائی شخصیت کی گہرائی میں اترتی ہے۔ "پولی تھین" اسی پرانے کھوک کے موضوع پر لکھا ہوا ایک نیا افسانہ ہے جو پہلے سے کہیں زیادہ ضبط اور کفایت کے ساتھ محرومی کے دور رس اثرات کو پیش کرتا ہے۔

نقوش کے خاص نمبر ۸۷ء میں چھپا ہوا "بکری، شیرا اور گھاٹ" غیر محفوظ اور ناکافی رہائش میں خاندانی زندگی بسر کرنے کی مشکلات دکھاتا ہے لیکن جو معاشرتی بحث، تمہید کے طور پر تقریباً مقالے کی زبان میں کی گئی ہے صورتِ حال کی شدت میں اضافہ کرتی ہے، جیسے "بیک مرر" کے پنجابی روپ کی تکنیکی تمہید نے کیا تھا۔ "سانپ اور سلا" اور "کوکھ پر پاؤں"، بعض ابتدائی افسانوں کی بازگوئی معلوم ہوتے ہیں لیکن خاصے پختہ انداز میں اور نئی سوچ کے تازہ پہلوؤں کو سمیٹتے ہوئے۔ اصل میں کہانی کہنے کا فن جیسا کہ والٹر بنجمن نے زور دے کر لکھا ہے، بنیادی طور پر بازگوئی کا فن ہے۔ البتہ دیکھنے کی بات یہ ہے کہ بازگوئی سے کون سی دائمی حقیقتوں کی ترجمانی ہوئی اور اس ترجمانی کا عصری حقائق سے کوئی رابطہ بنتا بھی ہے کہ نہیں۔

"اوراق" کے سالنامہ ۸۷ء میں مطبوعہ "پنج کلیاں" یقیناً ایک اہم افسانہ ہے۔ شاید اسے منٹو کے "بو" کی بازگوئی کہا جائے لیکن ایک تو یہ اتنا کھلا ڈلا نہیں، عصری دباؤ کے تحت پوری احتیاط کے ساتھ لکھا ہوا اور دیہات کے روایتی ماحول میں رچا ہوا افسانہ ہے۔ دوسرے اس میں دونوں طبقوں کی لڑکیاں باری باری نہیں آتیں، ایک دوسری کا سامنا کرتی ہیں اور پھر بھی کسی ایک کی متقابل کشش سے بے انصافی نہیں ہوتی۔ شاید دیہات کے ایک دانا آدمی کو بیچ میں لانا مستحسن نہیں تھا۔ [خصوصاً اس لیے کہ اشفاق احمد صاحب یہ درفنطنی بہت چلا چکے] لیکن یہاں اس کی ضرورت غالباً اس وجہ سے پڑی ہوگی کہ روایتی لڑکی کو براہِ راست دریافت کرنا آزادی بیانیے کے بغیر ممکن نہیں تھا۔

عشق پر روایتی معاشرے کا جبر "بے سایہ" میں پوری شدت سے محسوس ہوتا ہے، شاید اس لیے کہ یہاں دو نسلوں کے تجربات کا تقابل ہمارے سامنے ہے۔ عفوراں جو اپنے بھائیوں کے ہاتھوں قتل ہو گئی تھی اور صغرا جس کا باپ

یا تو بوڑھا ہو چکا ہے یا بے غیرت، لیکن صغرا کے بچ جانے پر جس طرح غفوراں کی ماں غفوراں کو یاد کرتی ہے تو ایک نسل پرانا واقعہ یوں لگتا ہے جیسے آج ہی پیش آیا ہو۔

"پھلوں سے لدی شاخیں" بظاہر ایک آوارہ بلی کی کہانی ہے۔ جس طرح پہلے مجموعے میں "خواہش کا کنواں" ایک آوارہ کتے کی کہانی تھی، لیکن یہ آوارہ بلی پہلے پالتو رہ چکی ہے اور پھکوائے جانے کے بعد کئی بار گھر لوٹ چکی ہے۔ گھر بڑی اماں، بڑی بہو، چھوٹی بہو، شانو اور کرمو کے ساتھ اس کا مثبت، منفی یا ملا جلا رشتہ قائم ہو چکا ہے۔ افسانہ کا کمال یہ ہے کہ اس نے بلی کے گھر لوٹنے کی کشمکش کو اور گھر والوں کی ہمدردی بیدردی دونوں کو متحرک تصویروں کی طرح دکھایا ہے لیکن معمائی انجام کی روشنی میں دیکھیں تو یہ کہانی اپنی تمام تر تفصیلات کے باوجود محض بلی کے بارے میں نہیں نکلتی اور کہانی پڑھنے کے بعد پھر اس کے عنوان کی طرف لوٹیں تو یہ انسانوں کی حیوانیت یا حیاتیاتی تقاضوں کے بارے میں لکھا ہوا ایک نازک سا نفسیاتی مطالعہ بن جاتی ہے۔

حیرت ہے کہ ایک ہی دور میں کوئی افسانہ نگار اس قدر متنوع قسم کی کہانیاں لکھ یا لکھ سکے۔ آئرستانی افسانہ نگار اور ناقد شان او فاؤلین نے ڈی ایچ لارنس کے افسانوں پر بحث کرتے ہوئے لکھا ہے کہ اچھے افسانہ نگاروں کی ایک پہچان یہ ہے کہ ان کے کوئی سے دو اچھے افسانوں کو آپ ایک دوسرے کے مقابل رکھ کر دیکھیں تو پتا نہیں چلتا کہ ایک ہی لکھنے والے نے ان دونوں کو کیسے لکھ لیا۔ ہمارے دور میں اس تنقیدی تجزیے کا اطلاق منشا یاد سے زیادہ کسی اور افسانہ نگار پر مشکل سے ہو گا۔

تازہ ترین افسانوں میں فرار، چراغ، سلاٹر ہاؤس اور کیچڑ کو پڑھتے ہوئے منشا یاد کے تکنیکی اور موضوعاتی تنوع پر نئے سرے سے غور کرنے کی ضرورت محسوس ہوتی ہے۔ "چراغ" میں ایک پختہ عمر کے راوی کو اپنے بچپن کی روشن خیالی پر جو ایک بزرگ سے برسوں کے بعد خراج تحسین ملتا ہے وہ آگے کی منزلوں کو روشن کر جاتا ہے۔ "سلاٹر ہاؤس" ایک افسانے سے زیادہ احتجاج ہے۔ جدید زندگی کے خطرات کے خلاف، لیکن یہاں بھی اہم بات یہ ہے کہ دیہات کو پناہ گاہ بنا کر پیش نہیں کیا گیا بلکہ وہاں کے خطرات سے آگہی تو اور بھی شدت سے محسوس کی گئی ہے۔

منشا یاد نے اپنے تمام دیہاتی پن اور پنجابیت کے باوجود نہ تو اپنے لیے کوئی جذباتی جنت تعمیر کی ہے اور نہ زمین اور مٹی کو اپنے لیے بت بنایا ہے۔ اس نے اپنی افسانوی زبان میں کثرت سے دیہاتی اور پنجابی الفاظ استعمال کیے ہیں لیکن اوچھی سطح کے کالم نگاروں کی طرح اس نے یہ کام ہنسانے کی کوشش میں نہیں کیا، چنانچہ اس کے برتے ہوئے پنجابی الفاظ نہ صرف ماحول کی فضا بندی کے لیے ناگزیر محسوس ہوتے ہیں اور نہ صرف واقعاتی مکالمے کے لیے لازم ہیں بلکہ افسانے کی ہیبت اور المیہ شدت میں اضافہ بھی کرتے ہیں۔ شاید اسی لیے منشا یاد پنجاب سے باہر بھی اتنا ہی مقبول ہے جتنا پنجاب میں۔

منشا یاد کی ہر دلعزیزی بلکہ اس کی کاریگری میں بھی یہ خطرہ موجود ہے کہ کہیں وہ اپنے دیہاتی پنجابی امیج کا اسیر نہ ہو کر رہ جائے۔ مرحوم شاہد احمد دہلوی تو منٹو سے بھی دیہات کا افسانہ طلب کیا کرتے تھے

اب تک منشا یاد نے دیہات کی غربت اور محرومی، قتل و غارت اور جہالت، رواج اور تعصب کھل کر تنقید کی ہے اور پنجاب کا ایک ایسا نقشہ کھینچا ہے جو مقامی استعمار اور استحصال کے جبر تلے انسانی معیار سے بہت نچلی سطح پر زندگی بسر کرتا ہے۔ ایسے میں اگر وہ بھی ذرائع ابلاغ پر متمکن مبلغین کی طرح، زمین، مٹی کو بت بنانے اور طبقاتی معاشرے کو مستحکم کرنے پر تل جاتے تو یہ جدید افسانے ہی کا نہیں، روشن خیالی کا المیہ ہوگا۔

کاریگر اسی وقت تک کاریگر رہتا ہے جب تک کہ وہ محنت کشی کے ماحول سے منسلک ہو۔

گل ہائے رنگ رنگ

بھیشم ساہنی / ممتاز احمد خان

ظہور بخش کی کہانی

یہ ہو سکتا ہے کہ آپ نے ظہور بخش کے متعلق سنا ہو۔ لیکن یہ نام ہزاروں اشخاص کا ہو سکتا ہے۔ آپ پوچھیں گے کون ظہور بخش؟ بہرصورت میں اس ظہور بخش کی بات کر رہا ہوں جو ایک واقعے کی وجہ سے خاص قسم کے ظہور بخش نامی شخص کی صورت میں ابھرا۔

جب میں نے اسے پہلی بار دیکھا تو میں اس سے کوئی خاص متاثر نہ ہوا۔ وہ ادھیڑ عمر شخص تھا اور خشخشی ڈاڑھی اس کی شخصیت کی خاص بات تھی۔ وہ پرانی سی قمیص اور تہبند پہنے ہوئے تھا۔ اس کے بال بکھرے ہوئے تھے اور پیر میں جوتا نہ تھا۔ وہ بے حس و حرکت کھڑا ہوا تھا۔ اس کے مکان کے سامنے ایک بڑا سا احاطہ تھا جس میں بہت سے مرد عورتیں اور بچے تھے۔ دور سے دیکھنے پر یہ محسوس ہوتا گویا وہاں پھٹے پرانے کپڑے لہرا رہے ہوں۔ وہاں جلے ہوئے برتن، کپڑے جو ان لوگوں نے اپنے اپنے مکانوں سے محفوظ طریقے سے نکال لیے تھے اور دوسری اشیا چاروں طرف بکھری پڑی تھیں۔ ظہور بخش وہاں دلوار کے سہارے کھڑا تھا۔ یہ دلوار اس کا مکان جل جانے کے بعد بچ گئی تھی۔ اس کے سامنے اس کی کہانیوں، ترجموں اور مضامین کے پھٹے پرانے اور جلے ہوئے کاغذات بکھرے پڑے تھے۔ آپ کسی بھی جلے اور ان جلے کاغذ کے ٹکڑے کو اٹھا کر اگر دیکھتے تو محسوس کرتے کہ اس کی تحریر اچھی تھی۔ اس نے اپنی کہانیوں اور مضامین کو اپنے خونِ دل سے لکھا تھا۔

دراصل شہر میں فرقہ وارانہ فسادات کا سلسلہ ابھی ابھی ختم ہوا تھا۔ اور جیسا کہ ایسے فسادات میں ہوا کرتا ہے فسادیوں نے مکانات، انسان اور اشیا سب کو جلایا تھا اور لوگوں کو قتل کیا تھا اور قیمتی اشیا لوٹ لی تھیں۔

ہمارے فساد میں ہمیشہ ایسا ہی ہوتا ہے۔

اس کے مکان میں داخل ہونے کے بعد مکان کے مال و متاں جلانے سے قبل فسادیوں نے ان کی تقسیم کے مسئلے پر خاصا جھگڑا کیا تھا لیکن ان میں سے کسی نے کتابوں پر حق نہیں جتایا تھا۔ کتابوں کے علاوہ باقی چیزیں وہ لوٹ کر لے گئے تھے۔

اپنے قیمتی اثاثے کو بچانے کے عمل میں ظہور بخش کے ہاتھ جل گئے تھے۔ آگ کی آنچ اس کی ڈاڑھی تک پہنچی تھی۔

اور وہ اپنے عجیب و غریب حلیہ میں وحشت زدوں کی تصویر بنا آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر سب کچھ دیکھ رہا تھا۔ کالی داس کی شکنتلا اور پریم چند کے ناولوں کے جلے ادھ جلے اوراق اس کا منھ چڑا رہے تھے۔ اس کی تینتیس سال کی محنت کو ظالموں نے پیروں تلے روندڈالا تھا۔ کتابوں سے اسے والہانہ عشق تھا۔ اسے یاد آیا کہ وہ فسادیوں سے چیخ چیخ کر رحم کی درخواست کر رہا تھا اس کی بیوی بھی ان کی منت سماجت کر رہی تھی، اس کی بیٹیوں کی بھی رقت انگیز آوازیں فضا میں گونج رہی تھیں۔ پھر اس کی بیوی اور بیٹیوں کی آوازیں مدھم پڑتے پڑتے بالکل ہی غائب ہوگئی تھیں۔ خود اسے ہوش نہیں رہا تھا کہ کیا ہو رہا ہے ـــ؟

میں نے ظہور بخش کو دیکھا۔ وہ پہلے ہی کی طرح تہبند باندھے کھڑا تھا۔ اس کی بڑی بڑی وحشت زدہ آنکھیں پہلے ہی کی طرح ادھر اُدھر دیکھ رہی تھیں۔ اس کا کمزور اور نحیف جسم اس کی روح کا بار نہ معلوم کس طرح اٹھائے ہوئے تھا۔ یہ وہی ظہور بخش تھا جس کی کہانیاں میں نے پڑھی تھیں۔ میں نے گلستان اور بوستان کے ہندی ترجمے پڑھے تھے جو ظہور بخش کی کاوش کا نتیجہ تھے۔ میں نے دیکھا کہ وہ ننگے پیر تھا۔

اس دن وہ اپنے تخت پر سے کچھ صفحات لکھ کر اٹھا تھا۔ یہ تخت برسوں سے اپنی جگہ بچھا تھا۔ اس کے چہرے پر لازوال مسکراہٹ پھیلی ہوئی تھی شاید وہ تخلیق کے کرب سے گزر کر شانت ہو چکا تھا پھر اچانک کچھ آوازیں بلند ہوئی تھیں اس کی بیوی اور بچوں کے کان کھڑے ہو گئے تھے۔ اس کی بیوی نے اس سے درخواست کی تھی ـــ خدا کے واسطے دروازہ ہرگز نہ کھولنا۔

"ہونہہ ـــ دروازہ نہ کھولنا ـــ میں ادیب ہوں۔ مجھے سب لوگ جانتے ہیں ـــ"

ظہور بخش نے بڑے اعتماد سے یہ جواب دے کر دروازہ کھول دیا تھا۔

پھر اسے ایسا محسوس ہوا تھا گویا بم پھٹ گیا ہو۔ فسادیوں کے ہاتھوں میں بلّم چاقو اور چھریاں تھیں۔ وہ سب لوگ طوفان کی رفتار سے اندر گھس آئے تھے اور ظہور بخش سمجھ رہا تھا کہ یہ سب کچھ غلط فہمی کا نتیجہ تھا۔ اس کی دونوں بچیاں ماں سے چمٹ گئی تھیں اور تھر تھر کانپ رہی تھیں۔ بعد میں ان سب کے ساتھ کیا ہوا اسے پتا نہیں چل سکا تھا۔ اس ہجوم نے اس کے اور اس کے گھر کے ساتھ وہی سلوک کیا تھا جو انھوں نے سب کے ساتھ روا رکھا تھا۔ آخر میں انھوں نے اس کے گھر کو آگ لگا دی تھی اور اسے باہر دھکا دے دیا تھا۔

اس طوفانِ بدتمیزی میں اس نے وشویشور کو پہچان لیا تھا۔ وشویشور اس کی تحریروں کا دلدادہ تھا۔ وہ برابر والی گلی میں رہتا تھا اور ایک ہندی رسالے میں کام کرتا تھا۔ جب فسادی اس کے گھر میں توڑ پھوڑ کر رہے تھے تو اس وقت چند لمحوں کے لیے وشویشور کو دیکھ کر اس میں جان پیدا ہوگئی تھی۔ اسے یاد آیا کہ وشویشور نے کہا تھا "گو کہ تم مسلمان ہو لیکن تم ہندی ادب کو بہت فائدہ پہنچاؤ گے" اس نے اس کے دو تین مضامین کو اپنے ہندی کے رسالے میں شائع بھی کیا۔ اسے یاد آیا کہ اس نے وشویشور کو زور سے آواز دیتے ہوئے کہا تھا ـــ "برادر۔ تم تو مجھے پہچانتے ہو ناں؟"

لیکن اس کے اس جملے کے ساتھ ہی وہ اچانک کہیں غائب ہو گیا تھا جیسے وہ وہاں موجود ہی نہ تھا! پھر اس نے

فسادیوں سے کہا تھا۔ "میرا سب کچھ لے جاؤ لیکن میرے ان مسودوں اور کتابوں کو چھوڑ دو۔ یہ میری زندگی کا وہ سرمایہ ہے جو میں نے بہت طویل عرصے میں جمع کیا تھا۔" پھر وہ اچانک چیخنے لگا تھا۔

"دیکھو یہ نرالا۔ مہادیوی اور پنت کے انتخاب ہیں یہ رندو ر لال ورما کی کتابیں ہیں۔ یہ سب پریم چند کے ناول ہیں۔ بھگوتی بابو اور ناغر جی جیسے بڑے ادیب مجھے ذاتی طور پر جانتے ہیں۔ وہ میرے دوست ہیں۔ یہ دیکھو میں نے سعدی کی گلستان کو ہندی میں ترجمہ کیا ہے۔ یہ وہی کتاب ہے۔" وہ یونہی چیختا رہا پھر اس کی آواز کا دم خم ختم ہوتا چلا گیا فسادیوں میں سے کسی نے صرف اتنا کہا تھا۔ "ذلیل مسلمان ــ ہندی لیکھک بنا پھرتا ہے۔" اور یہ سن کر اس کا ذہن معطل ہو گیا تھا۔

اس کے بعد انھوں نے اس کے گھر کی چیزیں لوٹ لی تھیں اور ساتھ ہی گھر کو آگ لگا دی تھی۔ پھر اس نے آگے بڑھ کر اپنی بیوی اور بچیوں کا حال چال معلوم کرنا چاہا تھا لیکن ہجوم میں سے کسی نے اسے زور سے دھکا دے کر وہاں سے ہٹا دیا تھا۔ وہ صحن میں اوندھے منھ گر پڑا تھا۔ گھر کے جلنے کے دوران وہ سکوت کا مجسمہ بنا یہ سب کچھ دیکھتا رہا تھا۔ پھر اس نے گھر کی طرف سے منھ پھیر لیا تھا لیکن جب اسے اپنا اثاثہ یاد آیا تو وہ اندر گھس گیا تھا تاکہ جلتے ہوئے مکان سے اپنے مسودے اور کتابیں جو جلنے سے بچ گئی ہوں نکال سکے۔ اس عمل میں اس کے ہاتھ اور پاؤں جل گئے تھے اور پھر وہ زمین پر گر پڑا تھا۔ فی الحال موت اس کے نصیب میں نہ تھی۔

جب ہم صحافی اور معزز شہری وہاں تحقیقات کے لیے پہنچے تو ہم نے دیکھا کہ وہ جلے ادھ جلے مسودات اور کتابیں گندگی کے ڈھیروں ٹیڑھے میڑھے گھریلو برتنوں اور کنستروں کے درمیان کھڑا اپنے گھر کو تک رہا تھا جیسے آگ نگل چکی تھی ہم سب سیکولرازم پر یقین رکھنے والے لوگ تھے اور متاثرین کو تسلی دینے اور ان کے غم کو ہلکا کرنے کی غرض سے وہاں پہنچے تھے۔ میں خاص طور پر ظہور بخش کے پاس گیا اور پوچھا:

"آپ ہی ہندی کہانیوں کے لیکھک ہیں ناں؟ ظہور بخش؟ آپ ہی نے سعدی کی حکایت کو ہندی والوں سے متعارف کرایا تھا؟"

ظہور بخش نے مجھے ایسے دیکھا جیسے اس کے سامنے وشو لیشور کھڑا ہو۔ اس نے کوئی جواب نہیں دیا۔ ایک کہانی تو کہانی کار لکھتا ہے اور ایک کہانی وہ خود ہوتا ہے۔ سو وہ تھا! اسی اثنا میں سیکولرازم کے ایک زبردست حامی نے ایک آدھ جلا نسخہ اٹھایا۔ یہ رامائن تھی جس کی ظہور بخش نے بڑی حفاظت کی تھی۔ اس کے کئی صفحات پر ظہور بخش کے قلم کے نشانات اور تبصرے موجود تھے جس کا مطلب تھا اس نے اس کتاب کو ڈوب کر پڑھا تھا۔ ظہور بخش واقعی انسانیت پرست لیکھک تھا!

فسادات کے خاتمے کے بعد بھی ایسا لگتا تھا جیسے لوگ سسک رہے ہوں۔ آہیں نکل رہی ہوں۔ حالانکہ زندگی کا معمول والا کاروبار پھر سے جاری ہو گیا تھا۔ دکانیں کھل گئی تھیں۔ لوگ تباہ شدہ اور جلے ہوئے گھروں میں واپس آنے لگے تھے۔ آخر کو یہ ان کا وطن تھا۔ پھر گھروں اور دکانوں کی مرمت ہونے لگی تھی۔ زندہ بچ جانے والے بچے گلیوں اور میدانوں میں آ کر آپس میں کھیلنے لگے تھے۔ شاید سب ہمیشہ کی طرح یہ سوچ رہے تھے کہ اب ہندو مسلم فساد کبھی نہ ہو گا۔

دو سال بعد ہماری کار پھر سے انہی سڑکوں پر دوڑ رہی تھی۔ ہم ایک کانفرنس میں فرقہ وارانہ فسادات کے موضوع پر تقاریر سننے کے لیے جا رہے تھے۔ میں ان تمام جگہوں کو دیکھ چکا تھا جو فسادات کا نشانہ بنی تھیں اس لیے مجھے ان کی وجوہ اور نتائج کا پورا پورا علم تھا۔ راستے میں ہمیں کئی متاثرین ملے جن کے شکوک و شبہات کو ہم نے حتی المقدور دور کیا لیکن جیسے ہی ہمری کار آگے بڑھی ایک مخبوط الحواس شخص آگے بڑھا اور بونٹ پکڑ کر کھڑا ہو گیا۔ یہ ظہور بخش تھا۔ مجھے تو یوں محسوس ہوا گویا وہ کار کے آگے آکر مرنا چاہتا تھا لیکن کسی نے اسے نیچے آنے سے بچا لیا تھا۔ میں اسے پہچان چکا تھا۔ اس کی خشخشی ڈاڑھی اب بالکل سفید ہو چکی تھی اس کے بال بکھرے ہوئے تھے۔ مجھے علم تھا کہ لوگوں نے کوششیں کی تھیں کہ وہ اپنے حال پر واپس آجائے لیکن اس پر کسی بھی کوشش کا سود مند اثر مرتب نہیں ہوا اور وہ خود فراموشی میں زندہ تھا۔

چند لمحوں بعد وہ بیچ سڑک پر لڑکھڑاتا ہوا چل رہا تھا۔ ہمارے آگے بڑھنے سے قبل ایک شخص نے کہا "جنابِ عالی۔ یہ ظہور بخش ہے یہ پاگل ہو چکا ہے۔"

ظاہر ہے جس کی بیوی اور بچیاں ماری جا چکی ہوں اور کتابوں اور مسودوں کا ذخیرہ تباہ ہو چکا ہو اس کو تو ایسا ہی ہونا چاہیے تھا۔ پر مجھے یہ خیال ستا رہا تھا کہ آیا کار کا بونٹ پکڑتے وقت کیا وہ مجھ سے کچھ کہنا چاہ رہا تھا؟ کیا وہ وثوق سے کی طرح مجھے بھی پہچان چکا تھا؟ میں جانتا تھا وہ خود اپنی آخری کہانی ہے ___ مجھے نہیں معلوم تھا کہ میں اس لیکھک کو آخری بار دیکھ رہا ہوں۔

کچھ عرصے بعد جب کسی نے مجھے بتایا کہ ظہور بخش اپنے آزار سے نجات پا چکا ہے تو مجھے محسوس ہوا کہ اس کی ذاتی کہانی مکمل ہو چکی ہے۔

گل ہائے رنگ رنگ

ترکی نظم

ناظم حکمت / کرنل مسعود اختر شیخ

آؤ یہ سیسہ پگھلائیں

[ترکی کا یہ مشہور شاعر ۱۹۰۲ء میں پیدا ہوا۔ ماسکو یونیورسٹی میں تعلیم حاصل کی ۱۹۲۸ء میں وطن واپس آکر چند سال مختلف اخبارات، رسائل اور فلم اسٹوڈیوز میں کام کرتا رہا۔ پھر فوج میں بھرتی ہوگیا۔ ۱۹۳۸ء میں ملیٹری اسکول میں ایک انقلابی حادثے میں ملوث ہونے کے جرم میں ۲۸ سال قید کی سزا پائی۔ اس وقت تک نثر اور نظم دونوں میں خاصی شہرت حاصل کر چکا تھا۔ ۱۹۵۰ء میں عام معافی کے نتیجے میں رہا ہو کر ترکی سے باہر چلا گیا اور باقی ماندہ زندگی صوفیہ، ماسکو، وارسا وغیرہ میں گزار دی۔ ۱۹۶۳ء میں ماسکو میں وفات پائی اور وہیں دفن ہے۔]

گر میں نہ جلوں
گر تو نہ جلے
گر ہم نہ جلیں
تو کیسے بدلیں
اندھیرے
اُجیالوں میں۔
دھرتی کی طرح ماحول کے بھی بھاری ہیں قدم
(ماحول میں ایک گھٹن سی ہے)
سیسے کی طرح بوجھل ہے ہوا۔

میں چلاتا،
چلاتا ہوں،
چلاتا ہوں،
چلاتا ہوں،
دوڑو، میں تمہیں
خود جل جل کر
سیسہ پگھلانے
کی خاطر
چلا چلا کے بلاتا ہوں۔

گل ہائے رنگ رنگ
انگریزی نظم

اے ایل خطیب / ادیب سہیل

سانپوں کو کچل دو

کُچل دو، کچل دو ان سانپوں کو
جو پھن پھیلائے ناچ رہے ہیں ....،
جب انتہائے رقص میں
میں ایک کامیاب زقند لگانے ہی والا تھا
کہ میری ریڑھ میں سویا ہوا سانپ سرسرایا
اور مجھے مبہوت کر گیا۔
یہ تشدد کیوں ؟
وہ جو آزاد ہے، آزادی طلب نہیں کرتا
خواہش کی کنڈلیوں میں گرفتار
تم دوہرے رقص کرتے ہو
محبت اور نفرت کا رقص
تم جتنا زیادہ بچنے کی کوشش کرو گے اور الجھو گے۔
الجھتے ہی چلے جاؤ گے
مجھے کاٹ دو
مجھے ٹکڑے ٹکڑے کر دو
ہر ٹکڑا سانپ کا زہریلی سوزن
تمہارے خون میں دوڑے گا
تمہارے سفید پھولوں کو قرمزی
اور تمہارے خواب کو تباہ کر دے گا۔
حوّا، آدم کی پسلی سے تخلیق ہوئی ہے
اس کی نال نہیں کاٹی گئی
باغِ عدن میں سانپ کس کی ناف میں خوابیدہ ہے ؟
آدم باغِ عدن سے نکالے جانے کا الزام حوّا کو دیتا ہے
اور حوّا سانپ کو۔
دونوں میں سے کوئی سادہ حقیقت کا سامنا کرنا نہیں چاہتے
فرائڈ سے ماقبل کے انگوٹھا چوسنے والے معاصر جو کہیں
نہ تم شجرِ ممنوعہ کی خواہش کر سکتے
نہ ہی وہ آدھی سچائی
جو جھوٹ سے بھی زیادہ قابلِ ملامت ہے
تمہاری معصومیت کی اساس بن سکتی ہے
کُچل دو کچل دو سانپوں کو
جو پھن پھیلائے ناچ رہے ہیں

ڈاکٹر انور سدید

کچھ وقت ہندوستانی کتابوں کے ساتھ

مکان ــــــ پیغام آفاقی

پیغام آفاقی کا پہلا ناول "مکان" پڑھ کر میرے ذہن میں جوگندر پال اور ظفر پیامی اور شری لال شکل کے نام گردش کرنے لگے۔ گزشتہ چند سالوں کے دوران انھوں نے ناول کی ہیئت میں ہندوستانی معاشرے کی ایسی سچی اور حقیقت پسندانہ واقعاتی صورتیں پیش کی تھیں اور قاری کے داخل کو اس طرح ہلا دیا تھا کہ ان کے سامنے ترقی پسند تحریک کے زیر ہدایت لکھا جانے والا فکشن بھی حقیقت کا محض چربہ نظر آنے لگا۔ اب "مکان" کی صورت میں میرے سامنے ایک اور ایسا ناول ہے جس نے ہندوستانی معاشرے کے بہت سے ناسوروں کو عریاں کر دیا ہے۔ ان ناسوروں میں کلبلاتے ہوئے کیڑے ہمارے سامنے کرب اور کراہت کا منظر پیش کر رہے ہیں۔ ناول کی خوبی یہ ہے کہ اس میں جیسے جیسے جبر کا پھندہ اپنی آہنی گرفت مضبوط کرتا جاتا ہے ویسے ویسے مرکزی کردار کے داخلی قوت مرتکز اور مجتمع ہوتی ہے اور بالآخر "نادید" اور "فراد" کی طرح یہ ناول بھی ایک ایسے انجام پر اختتام پذیر ہوتا ہے جو مثبت ہے لیکن غیر حقیقی نہیں۔

ناول کی کہانی سادہ اور غیر پیچیدہ ہے۔ وجہ نزاع ایک چھوٹا سا مکان ہے جس کا مالک مر چکا ہے اور اب اس کی بیوی اور بیٹی نیرا جو میڈیکل کی طالب علم ہے اس کے آدھے حصے میں رہتی ہیں، دوسرے آدھے حصے میں ایک کرایہ دار کمار صاحب فروکش ہیں جو کرائے کی ایک معمولی رقم ادا کرتے ہیں۔ نیرا تعلیم مکمل کرنے کے بعد اس مکان میں نرسنگ ہوم کھولنا چاہتی ہے۔ اُدھر کرایہ دار کمار ان سے یہ مکان چھین لینے پر اُدھار کھائے بیٹھا ہے۔ وجہ یہ ہے کہ شہر کے وسط میں ہونے کی وجہ سے اس مکان کی قیمت دن دوگنی رات چوگنی بڑھتی جا رہی ہے اور کمار کو یقین ہے کہ وہ اپنے منفی حربوں سے نیرا کو اتنا زچ کر دے گا کہ وہ مکان چھوڑنے پر آمادہ ہو جائے گی۔ نیرا کی صورت میں پیغام آفاقی نے ایک مثالی کردار پیش کیا ہے ــــ وہ مصائب کا سامنا خندہ پیشانی سے کرتی ہے لیکن اپنے نصب العین سے کسی مقام پر بھی ڈگمگاتی نہیں۔ نیرا معصوم لڑکی تھی اسے حادثاتِ زمانہ نے سوچنے اور تجربہ کرنے والی ایک معاملہ فہم اور مستقبل شناس عورت بنا دیا۔ وہ بدی دیکھتی لیکن پائے ثبات کو متزلزل نہ ہونے دیتی اور بالآخر الجھاؤ ختم ہو گیا تو بدی کی سب قوتیں پسپا ہو گئیں اور زندگی نے حقیقت

کا جو راز افشا کیا وہ یہ تھا:

"انسان کائنات کا ایک نقطہ ہے ۔ کائنات کے تمام جانے مانے نقطوں میں اہم ترین ۔ کائنات کو اپنے نقطۂ نظر سے تولو ۔ جانچو ۔ اور پاؤ ۔ کائنات ہاتھی اور بھینسے اور دریا اور ہوا اور آتش فشاں اور نظام شمسی اور گلیکسیز اور وقت کے بہاؤ کی طرح بڑی اور اپنے آپ میں گم ہے ۔ اس کو پکڑنا سیکھو ۔ کائنات پہاڑی وادیوں کی طرح ہے ۔ تم اپنی جگہ بدلتے ہو تو تمہارے لیے اس کی شکل بدل جاتی ہے ۔ تم اس کے قدموں تلے آؤگے تو یہ نہیں کھل دے گی ۔ تم اس کی پیٹھ پر بیٹھ جاؤ گے تو تم کو یہ کائنات زندگی کی بلندیوں کی سیر کرئے گی ۔ سپاٹ مناظر سے باہر نکلو اور ان پہاڑوں کی سیر کرو ۔ دیکھو کائنات ایسی ہی نہیں ہے اور یہی کائنات سے تمہارا رشتہ ہے ۔"

پیغام آفاقی کا ناول "مکان" اسی فلسفے کی عملی توضیح ہے، اس نکتے کو دریافت کرنے کے لیے تیرا زندگی کے جو ہفت خواں طے کرتی ہے ۔ وہ اتنے حقیقی لیکن اتنے حوصلہ فرسا ہیں کہ ایک عام آدمی کا سانس تھوڑی دور جاکر ہی پھول جاتا ہے اور معاشرتی معائب کے سیلاب میں وہ تنکے کی طرح بہنے پہ آمادہ ہو جاتا ہے ۔ اس لحاظ سے تیرا کی ثابت قدمی، مشکلات کا مستقل مزاجی سے مقابلہ کرنے کا انداز، زندگی کی الجھنوں کے عقب سے روشنی اور قوت تلاش کرنے کا طریق ۔ سب غیر معمولی نظر آتے ہیں ۔ لیکن پیغام آفاقی نے اس ناول کا واقعاتی تانا بانا کچھ اس انداز میں بُنا ہے کہ زندگی کی جراحتیں حقیقی انداز میں آشکار ہوتی ہیں ۔ قاری پر ایک نیا جہانِ ادراک روشن ہو جاتا ہے ۔ اور ایسا معلوم ہونے لگتا ہے کہ ناول نے مصنف کے نہاں خانۂ خیال سے جنم نہیں لیا بلکہ یہ معاشرے کی کوکھ سے پیدا ہوا ہے ۔

پیغام آفاقی نے یہ ناول اس زبان میں لکھا ہے جو فی الوقت بھارت میں پروان چڑھ رہی ہے ۔ یہ زبان سادہ اور قابلِ فہم ہے لیکن ہندی آمیزی کی وجہ سے زیادہ رواں نہیں ۔ اس ناول میں قاری کو شاید وہ چاشنی نظر نہ آئے جو عصمت چغتائی، جوگندر پال، کشمیری لال ذاکر اور دوسرے ہندوستانی ناول نگاروں کے ہاں دستیاب ہے ۔ تاہم ناول کی کہانی قاری کو ابتدا ہی میں اپنی گرفت میں لے لیتی ہے اور زبان ثانوی حیثیت اختیار کر جاتی ہے ۔ پیغام آفاقی دہلی میں محکمہ پولیس میں ملازم ہیں ۔ انھوں نے اس ناول میں اپنی تفتیشی جبلت سے بھی خاطر خواہ فائدہ اٹھایا ہے اور زندگی کے ان گوشوں تک رسائی حاصل کی ہے جو صرف ایک پولیس افسر کی دسترس ہی میں آسکتے ہیں، لیکن جب معاشرے کے علم میں آتے ہیں تو کہرام بپا کر دیتے ہیں ۔ یہ کتاب فکشن اکیڈمی ۔ بٹلہ ہاؤس ۔ جامعہ نگر دہلی سے دستیاب ہے ضخامت ۴۰۰ صفحات ۔ قیمت سو روپے ۔

توفیق الحکیم ــــــ ناول نگاری کا ایک جائزہ ــــــ ڈاکٹر بدرالدین الحافظ

اہلِ پاکستان کے لیے یہ بات شاید ایک تازہ خبر کی حیثیت رکھے گی کہ ہندوستان کے اسلامی اداروں میں علمی تجدد،

ہر آگئی ہے۔ اس لہر نے علما کو دین اور ادب میں ربطِ باہم تلاش کرنے پر مائل کیا ہے۔ چنانچہ ندوۃ العلما لکھنؤ کے
ہتمام ۱۹۸۱ء میں ادبِ اسلامی کے موضوع پر ایک مجلسِ مذاکرہ منعقد کی گئی جس میں عالمی شہرت رکھنے والے
ن سے ادیبوں اور انشا پردازوں نے شرکت کی۔ اس مذاکرے کی رپورٹ مجلسِ ادبیاتِ اسلامی لکھنؤ سے شائع
لی ہے۔ اس مذاکرے کا ایک رہنما عنوان تھا" اسلامی رجحانات اور نثر کی مختلف ادبی اقسام"۔۔ اس کے تحت اسلامی
نہ اور ڈرامے کو بھی شامل کیا گیا اور زیرِ بحث وہ تخلیقات آئیں جو عربی میں لکھی گئی تھیں اور جن میں ایسے جدید رجحانات
یش کیا گیا تھا جو عصرِ حاضر میں عالمی سطح پر بالعموم اور عرب ممالک میں بالخصوص پروان چڑھ رہے ہیں۔ ڈاکٹر بدر الدین
افظ اس مذاکرے سے اتنے متاثر ہوئے کہ انھوں نے عربی زبان و ادب کے تخلیق کاروں کو اردو داں طبقے سے متعارف
نے کا بیڑا اٹھا لیا۔ ان کا ایقان ہے کہ:

"اردو زبان کو فارسی اور عربی نے جو ذخیرۂ الفاظ، شیرینی، سلاست، نزاکت اور
تعبیرات کی فراوانی عطا کی ہے اس میں کوئی دوسری زبان اس قدر حصہ دار نہیں۔ ہر چند
کہ ترکی، ہندی اور انگریزی نے اردو کو مالا مال کیا ہے مگر عربی زبان کا اپنا الگ مقام ہے۔"

ٹر صاحب نے عربی ادب کے جدید رجحانات سے آگہی کو اردو داں طبقے کے لیے مفید مطلب سمجھا اور دو سال قبل "چند
ربی ناول اور افسانے" جیسی عمدہ کتاب پیش کی جس پر معارف، جامعہ، کتاب نما اور نقیب میں بہت اچھے تبصرے شائع
۔ اس حوصلہ افزائی نے ڈاکٹر بدر الدین الحافظ صاحب کو مزید کام کرنے کی تحریک دی اور اب انھوں نے توفیق الحکیم کی ناول نگاری کا ایک تجزیاتی مطالعہ پیش کیا ہے۔
توفیق الحکیم مصر کے صفِ اول کے ادیب تھے۔ عربی ادب میں ان کا طلوع بیسویں صدی کی چوتھی دہائی میں ہوا۔ یہ دور آزادی اور
منیت کی تحریکوں کا تھا۔ بیشتر ادبا اشتراکی نظریات کے فروغ میں سرگرم حصہ لے رہے تھے۔ بعض نے افسانے اور ناول
جنس اور جذبات کے مدوجزر کو پیش کرنے کی کوشش کی۔ توفیق الحکیم نے اخلاقی قدروں کو اسلامی زاویوں سے
کام دینے اور معاشرے کے فکر و خیال پر اثر انداز ہونے کی کوشش کی اور چالیس سے زیادہ کتابیں تصنیف کیں۔
کی وفات ۱۹۸۷ء میں ہوئی۔ احمد لطفی، ڈاکٹر طہٰ حسین، محمد حسین ہیکل اور محمود تیمور ان کے معاصرین میں سے تھے۔

زیرِ نظر کتاب میں توفیق الحکیم کی تین مشہور کتابوں ۔۔ المرباط المقدّس، عصفور من الشرق اور عودۃ الروح
تجرباتی مطالعے کیے گئے ہیں اور یوں توفیق الحکیم کی کہانیوں سے علامتی اور واقعاتی رجحانات دریافت کرنے کی کاوش
گئی ہے۔ یہ کتاب سات ابواب پر مشتمل ہے۔ پہلے باب میں مصری ناول نگاری کا اجمالی جائزہ پیش کیا گیا ہے۔ دوسرے
ب میں توفیق الحکیم کی زندگی کے آثار اور اس دور کے سماجی حالات کا خاکہ ملتا ہے۔ تین ابواب متذکرہ بالا تین کہانیوں
تجربے کے لیے مختص کیے گئے ہیں۔ ایک باب میں توفیق الحکیم کی صحافتی خدمات کا تذکرہ کیا گیا ہے۔ ایک باب
صل مطالعہ کے طور پر سامنے آتا ہے اور اس میں توفیق الحکیم کی مشرقیت، علامتی انداز اور واقعاتی تصویر کشی پر
ث کی گئی ہے۔

یہ کتاب ضخیم نہیں بلکہ مختصر ہے۔ تاہم ڈاکٹر بدر الدین الحافظ صاحب نے موضوع کے ساتھ انصاف کرنے کی

بی کاوش کی ہے اور توفیق الحکیم کی ادبی عطا کو ان کے معاصرین سے الگ کرنے میں کامیابی حاصل کی ہے۔ اس کتاب خوبی یہ بھی ہے کہ توفیق الحکیم کو اردو دنیا سے متعارف کرانے کی یہ پہلی مدلّل کاوش ہے۔ ڈاکٹر صاحب کا اسلوب دلنشیں ہے۔ ان کی تنقید میں روانی اور رومانی کشش ہے۔ یہی وجہ ہے کہ آپ تنقید کی اس کتاب کو بوجھل محسوس کرنے اور پڑھتے وقت مطالب و معانی کی تہ تک پہنچ جاتے ہیں۔ مکتبہ جامعہ دہلی نے یہ کتاب خوبصورت انداز روشن کتابت میں شائع کی ہے۔ ضخامت ۱۰۸ صفحات۔ کاغذ سفید اور دبیز۔ قیمت صرف سات روپے جو رت انگیز طور پر کم ہے۔

دوں کا اجالا ـــــ بھگوان سنگھ

کہتے ہیں کہ ہر انسان کی زندگی میں کچھ واقعات و حادثات ایسے ضرور ہوتے ہیں جن کا لکھا جانا، دہرایا انا اور پھر پڑھا جانا عوام النّاس کے لیے مفید ہوتا ہے۔ بھگوان سنگھ کی زندگی میں بھی ایسے متعدد واقعات ھے لیکن انھوں نے ان واقعات کی بازیافت کی اور اپنے ماضی میں شعور کی آنکھ سے سفر کیا تو شاید ان کے پیشِ نظر لقِ خدا کو فائدہ پہنچانے کا کوئی مقصد نہیں تھا۔ انھوں نے "یادوں کا اجالا" (جو زیرِ نظر کتاب کا عنوان ہے) جمع رنے کی کاوش کی تو یوں لگتا ہے کہ وہ بے ربط سی اور غیر منظم سی خود کلامی کر رہے ہیں اور ماضی کی کوکھ سے گئے وقتوں دوبارہ زمانۂ حال میں لانے کی کوشش کر رہے ہیں۔ یادوں کی اس برات میں بچپن کی وہ یادیں بھی ہیں جب بھگوان سنگھ میں پر ننگے پاؤں چلتے تھے اور زمین ان کے قدموں کو چوم چوم لیتی تھی۔ کچھ یادیں فوجی زندگی سے منتخب کی گئی ہیں۔ چھ نقوش عوامی زندگی کے نکھارے گئے ہیں۔ کچھ احوال بڑے آدمیوں کا رقم کیا گیا ہے، لیکن ہر مقام پر مقصد صادق قدروں افزائش اور ان میں یقین و استحکام پیدا کرتا ہے۔ چنانچہ انھوں نے سر چھوٹو رام، اور فیروز گاندھی اور رفیع صاحب روشن تصویریں مرتب کی ہیں۔ اس کتاب کا ایک اہم حصّہ فجی مجمع الجزائر کا تعارف ہے اور یہ اردو طبقے کے لیے یسے ہی ہے جیسے کوئی نیا خطۂ ارض تلاش کر لیا ہو۔

اس کتاب کا ترجمہ اردو کے ممتاز ادیب ڈاکٹر شمیم حنفی نے کیا ہے اور اسلوب اتنا رواں دواں ہے کہ ترجمے پر تخلیق کا گمان ہوتا ہے۔ کتاب پر مکتبہ جامعہ کے منتظم و منصرم شاہد علی خاں کی نظر پڑی تو اتنے متاثر ہوئے کہ اسے اردو میں منتقل کرنے کا ارادہ کر لیا۔ شمیم حنفی صاحب نے اس ارادے کو عملی جامہ پہنا کر اردو ادب کو ایک ایسی آپ بیتی فراہم کر دی ہے جس کا مصنّف ترگیبت کا شکار نہیں اور زندگی کے کھیت پر ننگے پاؤں چہل قدمی کر رہا ہے۔ کتابت عمدہ طباعت دیدہ زیب جلد مضبوط، سرورق دلکش ضخامت ۲۰۰ صفحات، قیمت ۴۰ روپے۔ یہ کتاب مکتبہ جامعہ نئی دہلی سے دستیاب ہے۔

بگذاروں کے گیت ـــــ غازی القوصیبی ـــ قاضی سلیم

اردو ادب کے ممتاز جدید شاعر قاضی سلیم نے اس دفعہ اپنے احساسات و جذبات کو شاعری کا روپ دینے کے

بجائے انگریزی نظموں کو اردو میں منظوم صورت میں پیش کرنے کی کاوش کی ہے۔ ان کی نئی کتاب "ریگزاروں کے گیت" ایک عربی شاعر غازی القوصیبی کی انگریزی نظموں کا تخلیقی ترجمہ ہے۔ قاضی سلیم کی ان نظموں تک رسائی کا اجمال یہ ہے کہ ۱۹۸۴ء میں ان کے پاؤں کی ہڈی ٹوٹ گئی تو وہ علاج کے لیے سعودی عرب گئے جہاں ان کے چھوٹے بھائی ماجد القاضی طبیب الملکی ہیں عربی ماحول میں رہنے کا موقع ملا تو انھیں عربوں کی شاعری کا مطالعہ کرنے کا شوق پیدا ہوا اور غازی القوصیبی سے جو سعودیہ حکومت میں وزیر ہیں، ملنے کا اتفاق ہوا تو حیران ہوئے کہ غازی صاحب عربی کے علاوہ انگریزی زبان میں بھی شاعری کرتے ہیں اور ان کا ایک مجموعہ لندن سے شائع ہو چکا ہے۔ انھوں نے عربی کی کلاسیکی شاعری کا ایک انتخاب بھی انگریزی میں پیش کیا ہے جس سے عربوں کے شعری محرکات و موضوعات ہمارے سامنے آتے ہیں۔ قاضی سلیم صاحب نے جب غازی القوصیبی کا شعری مجموعہ " فرام دی اورینٹ اینڈ ڈیزرٹ " پڑھا تو فوراً اس کے ترجمے پر آمادہ ہو گئے۔ گویا انھوں نے اردو داں طبقے کو غازی القوصیبی صاحب سے متعارف کرانے اور ان کے صحرائی نغموں کو برِصغیر میں پھیلانے کا ارادہ کر لیا اور یوں یہ کتاب معرضِ وجود میں آ گئی۔

یہ کتاب دو خوبیوں کی وجہ سے ممتاز ہے، ایک تو یہ کہ اس کتاب میں ایک عربی شاعر کی انگریزی نظموں کا ترجمہ پیش کیا گیا ہے۔ دوسرے یہ کہ اس کے خیال انگیز دیباچے میں قاضی سلیم نے ترجمے کے بارے میں اپنے تصوّرات پیش کیے ہیں۔ قاضی صاحب نے منظوم ترجمہ نگار کی مشکل یہ بتائی ہے کہ دوسری زبان کی نظم کے ہر لفظ کے معنی جاننے کے باوجود الفاظ کا طلسمی تال میل دور جا کھڑا ہوتا ہے اور وہ فضا جو کنایے سے پیدا ہوتی ہے، ترجمے کی راہ میں حائل ہو جاتی ہے۔ ترجمے کو تخلیقی صورت دینے کے لیے قاضی سلیم نے ہیئت سے گریز اور ڈکشن سے انحراف کو ترجمے کا حُسن قرار دیا ہے، لیکن نظم کے باطن میں اس کا نفوذ مترجم کے لیے جائز قرار نہیں دیا۔ قاضی سلیم نے مترجم کی مجبوریوں کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے کچھ غیر زبان کو ترک کرنے اور کچھ اپنی زبان سے احتراز برتنے کی طرح ڈالی ہے اور یوں درمیانی راستے پر چلتے ہوئے امکانات کا دائرہ تحدیدات کے مدار میں بنایا ہے۔ اس کتاب میں اس بنیادی نکتے کی توضیح قاضی سلیم نے بورس پیسترناک کی نظم FAME (شہرت) کے دو تراجم سے کی ہے۔ ان میں سے ایک ترجمہ ظ۔ انصاری کا ہے اور دوسرا قاضی سلیم کا۔ ظ۔ انصاری صاحب نے روسی زبان سے ترجمہ کیا۔ جب کہ قاضی سلیم صاحب نے میکائیل ہریری کے ترجمے کو بنیاد بنایا ہے اور یہ ترجمہ در ترجمہ کی مثال ہے۔ تینوں صورتیں حسبِ ذیل ہیں۔

انگریزی ترجمہ ــــ میکائیل ہریری

Success is not your aims
Nor noise but gift of self
Shameful to be a legend
On all lips and an empty name

روسی متن سے ترجمہ ۔ ظ انصاری ـــــــــــ

ہنرکاری کا مقصد خودسپاری
نہ ذاتی شہرت و اقبال مندی
اگر بن کچھ کیے ہی نامور ہو
تو بے شرمی ہے ایسی خودپسندی

انگریزی متن سے ترجمہ ۔ قاضی سلیم ـــــــــــ

شورِ تحسیں سے الگ، ہر واہ واسے ماورا
لذتِ تخلیق ہے خود منتہائے شاعری
لوگ جینے جی جو افسانہ بنا دیں بھی تو کیا
باعثِ رسوائی ہے ہر کھوکھلی نام آوری

اردو کے یہ دونوں تراجم دو مختلف رویوں کو ظاہر کرتے ہیں۔ ظ۔ انصاری نے مفہوم کی صحت کو پیش نظر رکھا ہے۔ قاضی سلیم نے ترجمے میں نغمگی پیدا کرنے اور ترجمے کو اردو شاعری کی پابند ہیئت میں لانے کی کوشش کی ہے۔ قاضی سلیم نے غازی صاحب کے تراجم بھی داخلی آہنگ کو پکڑنے اور اس مفہوم کے باطن میں سموتے کی کاوش کی ہے، لیکن دل چسپ بات یہ ہے کہ ان تراجم میں انھوں نے جاپانی ہائیکو کی لفظ بندی سے استفادہ کیا ہے اور فارسی اور عربی کے الفاظ سے انحراف کی راہ اختیار کی ہے۔ اس عمل میں انھوں نے نظم کے مافی الضمیر کو قائم رکھا اور صوتی نظام سے مطابقت کی کاوش کی۔ امتثالِ امر کے لیے اس کی ایک مثال یہاں پیش کی جاتی ہے۔

غازی القوصیبی

Here I am, thoughts torn, soul perplexed, o
Suffered with a meaningless passion;
my lips never touched springs of contentment,
my eyes never saw volcanoes of light,
my caravan still lost .... no one
knows where the journey will end.

ترجمہ: قاضی سلیم ـــــــــــ

تو یہ میں ہوں
لیکن میرا حاصل کیا
بے معنی جذبوں سے بوجھل ـــ
اجڑی اجڑی بزمِ خیال
چکھ نہ سکے تسکیں کی بہار
تشنہ لب محروم رہے

روشنیوں کی ایک کرن کو
آنکھیں ترس گئیں
تنہا تنہا گھوم رہا ہوں
ٹھور ٹھکانہ منزل کا
ہے جانے کہاں ؟

قاضی سلیم نے ان تراجم سے عربی شاعری کے جدید مزاج اور رجحانات کو اردو دنیا سے متعارف کرایا ہے، لیکن ن نظموں کا ان زاویوں سے تجزیہ قاری پر چھوڑ دیا ہے۔ اس کے باوجود ان کی یہ خدمت قابلِ تحسین ہے۔ اب چونکہ انگریزی ظمیں اور تراجم سامنے آگئے ہیں اس لیے کسی اردو نقاد کو ان کا تجزیہ بھی کرنا چاہیے اور اس علمی و ادبی تحریک میں حصہ لینا چاہیے جس کی طرف ڈاکٹر بدرالدین الحافظ صاحب نے اشارہ کیا ہے۔

یہ کتاب ایمیج پبلی کیشنز اورنگ آباد سے شائع ہوئی ہے۔ ضخامت ۶۰ صفحات، قیمت ۲۵ روپے۔ مکتبہ جامعہ دہلی سے بھی دستیاب ہے۔

(تبصرے کے لیے دو جلدوں کا آنا ضروری ہے)

قومی زبان، یک جہتی، نفاذ اور مسائل ____ مصنف: ڈاکٹر جمیل جالبی

صفحات: ۱۴۰ ـ قیمت: ۳۲ روپے

پتا: مقتدرہ قومی زبان۔ اسلام آباد

"قومی زبان، یک جہتی، نفاذ اور مسائل" ڈاکٹر جمیل جالبی صدر نشین مقتدرہ کی تازہ تصنیف ہے ۔ اس میں
دمی زبان، اس کے نفاذ اور نفاذ کی راہ میں جو مسائل درپیش ہیں ان کی نشاندہی کی گئی ہے اور اس کے حل کے سلسلے میں
بھ مثبت تجاویز اور آرا بھی پیش کی گئی ہیں۔

ڈاکٹر صاحب کی کتاب ان کے خطبات، انٹرویوز اور گفتگو پر مشتمل ہے۔ انھوں نے مختصر سے پیش لفظ
بں اپنے موقف کو نہایت جامعیت کے ساتھ پیش کر دیا ہے

ڈاکٹر صاحب کی تمام تر گفتگو کا لب لباب یہ ہے کہ ملک کے بڑے اور بنیادی مسائل میں "قومی سوچ" کو
روئے کار لانا چاہیے۔ ڈاکٹر صاحب ایک بڑا ذہن رکھتے ہیں۔ بڑا ذہن ملک کے بنیادی مسائل پر مین اسٹریم
ی ہیں رہ کر سوچنے کی ترغیب دیتا ہے۔ اگر ہماری سوچ شاخوں میں بہنے لگے اور ہماری سوچ بچار کا دھارا شاخوں
ے تابع ہو جائے تو پھر ہم کسی مثبت نتیجے کی توقع نہیں رکھ سکتے۔ فلاح کی راہ میں ظاہر اور پوشیدہ رخنے داخل
دنے لگتے ہیں۔

ڈاکٹر صاحب اس کتاب سے بہت پہلے "پاکستانی کلچر" پر اپنے خیالات کا کتابی شکل میں اظہار کر چکے ہیں
رکلچر کے موضوع پر یہ کتاب علمی و ادبی حلقے میں خاصی مقبول رہی ہے۔ دیکھا جائے تو کلچر سے زبان اور یک جہتی
ھو زیادہ دور نہیں بستی۔ یہ سب ایک ہی سلسلے کی کڑیاں ہیں اور ایک ہی پریوار سے تعلق رکھتے ہیں۔ ان میں سے
ہی ایک کا ادراک دوسرے کے بغیر ممکن نہیں اور ایک یہ بات بھی دوسرے کے حوالے کے بغیر مکمل نہیں کہی جا سکتی
اکٹر صاحب کی تازہ کتاب "قومی زبان ....." اس حقیقت کا بھرپور ثبوت ہے۔

ڈاکٹر صاحب اپنی تحریر میں شروع سے ایک ہمدردانہ رویہ رکھتے ہیں۔ قومی مسائل ہوں یا قومی زبان
راس کے نفاذ کا مسئلہ، ادب ہو یا ادبی شخصیات اور ان کے فن کی پرکھ کا معاملہ ہر جگہ ڈاکٹر صاحب کا یہ رویہ

تحریر کی اوپری سطح پر اور بین السطور دیکھا جاسکتا ہے۔
تازہ کتاب "قومی زبان، ایک جہتی، لفاذ اور مسائل"، مذکورہ جہات و مسائل کا احاطہ کرتی ہے اور اپنے قارئین کو غور و خوض کی دعوت دیتی ہے اور انھیں اپنی گرفت میں لیتی ہے۔ وہ ڈاکٹر صاحب کی تحریر میں معاملات و مسائل پر صاف گوئی سے اظہار خیال ہے اور اظہار میں اس طرح کی صاف گوئی بند ذہن سے ممکن نہیں۔
کتاب مقتدرہ قومی زبان نے سلیقے سے چھاپی ہے قیمت بھی مناسب ہے۔ ——— و۔س

چڑیوں کا شور ——— مصنف: ذی شان ساحل

صفحات: ۱۲۰۔ قیمت: ۴۰ روپے
پتا: وکٹوریہ چیمبرز نمبر۲۔ عبداللہ ہارون روڈ، کراچی

اگر ہم نثری نظم کے حوالے سے چند ناموں کو ذہن میں یاد کرنا چاہیں تو جو نام بے ساختہ ہمارے ذہن پر ابھرتے ہیں ان میں کشور ناہید، سارہ شگفتہ، افضال سید، نسرین انجم بھٹی اور عذرا عباس قابل ذکر ہیں ——— ذی شان ساحل کا شمار بھی اسی صنف کے شاعروں میں کیا جاتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ ان شعرا سے اردو شاعری کی اس تازہ صنف کو اعتبار ملا ہے۔ ویسے زبان کا ذائقہ بدلنے کے لیے کئی دوسرے بڑے چھوٹے شعرا نے بھی اس صنف کو در خور اعتنا سمجھا اور اس میں خامہ فرسائی کی ہے لیکن بات "بہت بہرائے بہت" سے آگے کم ہی بڑھ سکی ہے۔ مقفیٰ اور پابند نظمیں (بہ شمول آزاد اور نظمیں) کہنے والے شعرا جب کبھی اس طرف آتے ہیں تو ان کی بحور و اوزان کے دائرے میں بسر کرنے والی فکر، اس طرح آزاد مشرب نہیں ہو پاتی جس طرح نثری نظم کا مزاج رکھنے والے شعرا کے اسلوب میں کھُل کھیلتی ہے۔ کہنے کا مطلب یہ ہے کہ خالص نثری نظم کا مزاج رکھنے والے شاعر اور مقفیٰ و پابند نظمیں کہنے والے شاعر کی نثری نظمیں دو مختلف انداز میں پہچانی جائیں گی۔ ایک بالکل اپنے پیرہن میں اور دوسری پر مانگے کے پیرہن کا گمان ہوتا ہے۔

ذی شان ساحل سو فیصد نثری نظم کے شاعر ہیں۔ ان کے مزاج کو شاعری کی اس صنف سے بڑی مطابقت ہے۔ بے طبعی میلان و مطابقت کے ایسی اچھی اچھی نثری نظمیں اتنے اچھے پیرائے میں نہیں لکھی جاسکتیں۔ ذی شان ساحل کی اس کتاب کی ہر نظم قاری کو اپنی طرف کھینچتی ہے اور اپنے تنوع سے اس پر سحر سا کرتی ہے۔ اس کے اندر تحیّر کو بیدار کرتی ہے اور کچھ لمحوں کے لیے اسے اپنی فضا گم کر لیتی ہے۔

ذی شان ساحل کے اس شعری مجموعے کو پڑھ کر یہ بات بڑے اعتماد کے ساتھ کہی جاسکتی ہے کہ نثری نظموں کے مجموعوں میں "چڑیوں کا شور" ایک خوب صورت اضافہ ہے۔

کلیتے آج کے دور میں مطعون سہی لیکن کبھی کبھی کسی بات کو کہنے کے لیے اس کا سہارا لے لینے میں کوئی حرج نہیں۔ سو میں کہوں گا کہ ذی شان ساحل کی شاعری میں عصری حسیت پوری آب و تاب سے موجود ہے۔ محبت اور

درومندی احساس کے فکر کی اساس ہے اور اس کے شعری دائرہ کار میں شش جہات در آئی ہیں۔ ان باتوں نے ذی شان کے شاعرانہ اسلوب کو نہ صرف قوت بخشی ہے بلکہ منفرد بننے میں بھی مدد دی ہے۔

ذی شان کے یہاں موضوعات سے پیرایۂ بیان تک نیرنگی نظر آتی ہے۔ کسی بھی موضوع تک اس کے خیال کی رسائی بالکل جداگانہ طرز پر ہوتی ہے۔ یہی وہ باتیں ہیں جو کسی شاعر کو سب سے الگ تھلگ کرتی ہیں۔

کتاب سلیقے سے چھپی ہے اور قابلِ مطالعہ ہے۔ ——— ز۔ س

دریچۂ شب ——— مصنف: نسیم سحر

صفحات: ۱۲۳۔ قیمت: ۵۰ روپے

پتا: نیرنگِ خیال پبلی کیشنز، لیاقت روڈ، راولپنڈی

نسیم سحر مسلسل لکھ رہے ہیں۔ مسلسل لکھتے رہنا اور ادبی منظر نامے میں اپنے موجود ہونے کا احساس دلاتے رہنا بذاتِ خود "کارے دارد" کے مترادف ہے۔ ورنہ بے جز او سزا کے اس دور میں کتنے ادبی مسافر راستے ہی میں دم چھوڑ جاتے ہیں۔

نسیم سحر اپنے ادبی سفر میں جس مستقل مزاجی سے قدم بڑھاتے رہے ہیں یہ اس بات کی دلیل ہے کہ ادب کے معاملے میں وہ مخلص ہیں اور ان کا ذوقِ شعری سچا ہے۔

نسیم سحر نے جب اپنا پہلا شعری مجموعہ "اڑان" شائع کیا تھا تو ان دنوں پنڈی میں ہونے کے ناتے اس کی ایک جلد مجھے بھی عنایت کی تھی۔ پھر "ہر بوند سمندر" شائع ہوا۔ یہ دونوں ہی غزل کے مجموعے ہیں اور اب "دریچۂ شب"، ہمارے سامنے ہے لیکن یہ ان دونوں مجموعوں کے برعکس نظموں کا مجموعہ ہے۔ ان تینوں کتابوں کے مطالعے سے نسیم سحر ہر دو اصناف شعری میں ایک اچھے شاعر کی حیثیت سے سامنے آتے ہیں اور ان کی تخلیقات میں مسلسل ارتقا کا احساس ہوتا ہے۔

عام قاری جب کسی تخلیق پہ نظر ڈالنے کے عمل سے گزرتا ہے تو اس کی نظر زیادہ تر اس کے ظاہری و باہری محاسن پہ مرکوز رہتی ہے۔ اگر وہ تخلیق درخت کے پیکر میں رونما ہوئی ہے تو عام قاری کی نگاہ اس کی پھننگیوں، شاخوں، پھولوں، پتّوں اور دوسرے اوپری مناظر تک رسائی کرتی ہے اور انھیں سے وہ حظ اٹھاتا ہے۔ لیکن جب کوئی ناقد اس پہ نگاہ ڈالتا ہے تو سیکڑوں شاخوں میں پھیلی ہوئی کسی شخص کی شاعری کو اس کی جڑ اور اس کے تنے میں تلاش کرتا ہے شاید تنقید کا منصب بھی یہی ہے۔

ہم نے نسیم سحر کی شاعری کو جب اس کلیے کی روشنی میں دیکھنے کی سعی کی تو مجھے وہ جڑ یا تنا اس کی نظم "اسے کیا ہوا؟" سے دستیاب ہو گیا۔ آپ بھی ملاحظہ فرمائیے:

پھر کئی سال کا پُر صعوبت سفر طے ہوا
تو وہ آیا
اور اس نے مجھے ساری دنیا کے مظلوم لوگوں کی آواز سننا سکھایا
اُسی نے مجھے زندگی کے المناک گوشوں کا ادراک بخشا
اُسی نے مرے ہاتھ پاؤں کو آزاد کر کے
کڑے راستوں سے گزرنا سکھایا۔

یہی وہ بنیاد ہے جس پر تسیم سحر کی شاعری کی عمارت کھڑی ہے۔ ——— ا۔ س

مینارۂ نور ——— مصنّف: حیرت الہ آبادی

قیمت: ۴۵ روپے

پتا: بزم عبرت بی ۶۲۲ بلاک ۱۳ ، گلستان۔ فیڈرل بی ایریا، ک

کتاب کا نام "مینارۂ نور" ہے اور حقیقت یہ ہے کہ مینارۂ نور ہی ہے۔" با خدا دیوانہ باش و با محمد ہوشیار" کے معیار پر مجموعۂ کلام پورا اُترتا ہے۔ کتاب کے مطالعے سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ جناب حیرت کو اظہارِ خیال پر قدرت حاصل ہے اور الفاظ کا انتخاب ان کے لیے کوئی مسئلہ نہیں ہے۔ وہ جو کچھ کہتے ہیں پڑھنے والے تک پہنچانے میں کامیاب ہوتے ہیں۔

نئی زمینوں میں اچھوتے انداز میں اپنی محبت اور عقیدت کا اظہار کیا ہے۔ کلام میں پختگی اور کہنہ مشقی نمایاں ہے۔ ان کے کلام میں ایک خوبی یہ بھی ہے کہ ان کی نعتوں میں رنگِ تغزل کی روح جھلکتی ہے۔ نعتوں کے لیے جو زمینیں منتخب کی ہیں وہ بھی بہت دلکش ہیں۔ ان کی نعتوں میں محبت، عقیدت اور دین داری کی بھرپور عکاسی ہوتی ہے جب وہ کہتے ہیں "عمل کر کے جب سے بتایا نبی نے + قرینہ سا اک آگیا زندگی کو" تو حقیقت اور عقیدت کی ایک منہ بولتی تصویر سامنے آجاتی ہے۔ جب وہ کہتے ہیں "وہ اپنے دل کی کثافت تو پہلے دور کریں + جو چاہتے ہیں کہ وہ مدحتِ حضور کریں" تو ان کے پاکیزہ کردار کا نقشہ سامنے آجاتا ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ ایک مدت کے بعد ایک لاجواب اور مکمل مجموعۂ نعت دیکھنے کا موقع ملا ہے جو محبت و عقیدت کا نمونہ ہونے کے ساتھ ساتھ ایک فن پارہ بھی ہے۔ یوں تو فن نعت گوئی میں کافی کوششیں کی گئی ہیں اور کی جا رہی ہیں لیکن جناب حیرت الہ آبادی کی یہ سعی بسیار حاصل، کامیاب اور ذخیرۂ نعت میں ایک اچھا اضافہ ہے۔
اللہ کرے زورِ قلم اور زیادہ

——— توقیر صدیقی

گردوپیش

لاہور میں بابائے اردو مولوی عبدالحق کی یاد منائی گئی

لاہور (ب۔ر) بابائے اردو مولوی عبدالحق کی یاد منانے کے لیے انجمن ترقی اردو پنجاب نے ایک بڑے جلسے کا اہتمام قائداعظم یونیورسٹی لاہور میں کیا۔ جلسے کی صدارت انجمن ترقی اردو پاکستان کے صدر جناب نورالحسن جعفری نے کی۔

انھوں نے اپنی صدارتی تقریر میں فرمایا کہ بابائے اردو کی زندگی کا واحد نصب العین فروغِ اردو تھا اور اس کے لیے انھوں نے بھرپور جد و جہد کی اور کبھی حوصلہ نہ ہارا۔ بابائے اردو انجمن ترقی اردو کے کام کو وسعت دینے کے لیے اس کا دفتر اورنگ آباد سے دہلی لے آئے۔ بھارت میں مولوی صاحب نے اردو کے لیے شاندار خدمات سرانجام دیں اور اسے ہر لحاظ سے ایک عالمی زبان بنا دیا۔ پاکستان بنا تو وہ کراچی تشریف لے آئے۔ یہاں انجمن ترقی اردو کی علاحدہ خودمختار شاخ قائم کی اور اردو کو قومی زبان بنانے میں گراں قدر خدمات سرانجام دیں۔ جعفری صاحب نے کہا کہ اردو کو اب دستوری تحفظ حاصل ہے۔ اس زبان کی قومی حیثیت تسلیم کر لی گئی ہے اس لیے انجمن اب فروغِ اردو اور اشاعتِ کتب کا کام کر رہی ہے۔ انھوں نے کہا کہ اردو یونیورسٹی کا قیام مولوی صاحب کا خواب تھا یہ خواب ضرور پورا ہوگا اور اردو یونیورسٹی کا قیام لاہور میں عمل میں آئے گا۔

اس جلسے میں لاہور کے بہت سے ممتاز ادیبوں، نقادوں اور محققوں نے شرکت کی۔ اردو کے نامور نقاد، شاعر اور انشا نگار ڈاکٹر وزیر آغا نے کہا کہ بیسویں صدی میں اردو زبان کے لیے دو شخصیتوں یعنی مولوی عبدالحق اور مولانا صلاح الدین احمد نے جنگ لڑی۔ مولوی عبدالحق اردو کے قافلہ سالار تھے لیکن انھوں نے یہ جنگ ایک سپاہی کی طرح لڑی۔ بیسویں صدی میں اردو کی دنیا ان کی ذات کے گرد طواف کرتی نظر آتی ہے۔ محترمہ سلمیٰ تصدق نے اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ مولوی عبدالحق جیسا اردو کا عاشق برِصغیر میں پیدا نہیں ہوا۔ انھوں نے اردو کو قوم کے تشخص کا وسیلہ بنایا اور اس زبان سے قومی سوچ کو نکھارا۔

ڈاکٹر انور سدید نے مولوی عبدالحق کی ادبی جریدہ نگاری کا جائزہ لیا۔ انھوں نے کہا کہ مولوی صاحب نے رسالہ "اردو" اور "قومی زبان" کے علاوہ رسالہ "سائنس"۔ "معاشیات" رسالہ "تاریخ و سیاست" کے اجرا سے قوم

کے نکر و نظر کو تبدیل کرنے کی کوشش کی۔ ان کی علمی خدمات میں مولوی صاحب کی صحیفہ نگاری روشن باب کی حیثیت رکھتی ہے۔ ڈاکٹر تحسین فراقی نے مولوی عبدالحق کی ادبی مقدمہ نگاری کا جائزہ لیا۔ انھوں نے کہا کہ مولوی صاحب اردو تحقیق کے جوئے شیر بہالانے والے فرہاد تھے۔ ڈاکٹر معین الرحمٰن نے اس دور کو یاد کیا جب وہ مولوی عبدالحق کی خدمت میں حاضر رہتے تھے۔ ابتدا میں بیدار ملک صاحب نے کہا تھا کہ اردو یونیورسٹی کا قیام مولوی صاحب کی زندگی کا ایک خواب تھا جو پورا نہیں ہوا۔ ڈاکٹر معین الرحمٰن نے بھی افسوس کا اظہار کیا کہ انگریزی کی بالادستی میں ہم اردو یونیورسٹی کے خواب کو شرمندۂ تعبیر نہ کر سکے۔

جناب مختار مسعود نے مولوی صاحب سے اپنی ایک ملاقات کے نقوش تازہ کیے۔ انھوں نے کہا کہ مولوی صاحب سرسیّد کی طرح قوم کے محسن تھے اور انھوں نے اردو کے فروغ میں مسلمانوں کی آزاد شخصیت کا خواب دیکھا تھا اور اردو کی خدمت ایک سچے عبادت گزار کی طرح کی۔

اس جلسے کا اہتمام ڈاکٹر وحید قریشی صاحب نے کیا تھا۔ نظامت کے فرائض ڈاکٹر مسکین حجازی صاحب نے سرانجام دیے۔ آخر میں نورالحسن جعفری صاحب کی خدمت میں مغربی پاکستان اردو اکادمی اور بزمِ اقبال کی کتابوں کے تحائف پیش کیے گئے۔

اس تقریب میں لاہور کے بہت سے ادیبوں اور دانشوروں نے شرکت کی۔

تیسرا سید حسام الدین راشدی یادگاری لیکچر ۱۹۸۹ء

انسٹی ٹیوٹ آف سینٹرل اینڈ ویسٹ ایشین اسٹڈیز کراچی یونیورسٹی کے زیر اہتمام سید حسام الدین راشدی یادگاری خطبات کے سلسلے کا تیسرا لیکچر ۱۴ نومبر ۱۹۸۹ء کو آواری ٹاور کراچی میں منعقد ہوا۔ عالمی شہرت یافتہ جرمن اسکالر اور مشہور مستشرق پروفیسر این میری شمیل نے "خاندان تیمور کا ثقافتی اور تہذیبی تسلسل ہرات سے لاہور تک" کے موضوع پر نہایت پُرمغز خطبہ ارشاد کیا۔ جلسہ میں سامعین کی ایک بہت بڑی تعداد تھی جس میں جامعہ کراچی کے اساتذہ کے علاوہ کراچی شہر کے ادیبوں اور دانشوروں نے نمایاں تعداد میں شرکت کی۔ بڑے عرصے کے بعد اعلا تعلیم یافتہ اشخاص کا اتنا اجتماع ایک ہی چھت کے نیچے دیکھنے میں آیا۔ جلسے میں شرکت کرنے والوں میں قابلِ ذکر ہستیوں کے نام یہ ہیں۔ پروفیسر کرار حسین، ڈاکٹر احمد محی الدین، ڈاکٹر ایف اے خاں، ڈاکٹر احسان رشید، ڈاکٹر انعام اللہ خاں، ڈاکٹر عطاء الرحمٰن، خواجہ حمید الدین شاہد اور پروفیسر ڈاکٹر عقیلہ کیانی۔ سندھ یونیورسٹی جام شورو سے ڈاکٹر یعقوب مغل اور پروفیسر معز الدین صاحب بھی شامل تھے۔ جلسے کی صدارت کراچی یونیورسٹی کے وائس چانسلر ڈاکٹر منظور الدین احمد صاحب نے کی۔

مدینۃ الحکمۃ (ہمدرد) بین الاقوامی شعبہ کی نائب صدر مسز ایل۔ اے ڈی سلوا نے ممتاز مہمان مقررہ کے بارے میں تعارفی کلمات پیش کر کے ان کے علمی کارناموں پر روشنی ڈالی اور یہ بتایا کہ ان کو پاکستانی تہذیب اور اہلِ پاکستان کس قدر گہرا پیار ہے۔

پروفیسر ڈاکٹر ریاض الاسلام نے انسٹی ٹیوٹ کی کارکردگی اور تحقیقی سرگرمیوں کے بارے میں مختصر جائزہ پیش کیا۔ انھوں نے راشدی یادگاری خطبات کا ذکر کرتے ہوئے کہا کہ ان خطبات کا سلسلہ اسی سال سے شروع کر دیا گیا تھا جس سال پیر سید حسام الدین راشدی نے رحلت فرمائی۔

صدر نشین مقتدرہ ڈاکٹر جمیل جالبی کی بھارت سے واپسی

مقتدرہ کے صدر نشین ڈاکٹر جمیل جالبی، ڈاکٹر عابد حسین یادگاری خطبہ دے کر بھارت سے واپس آگئے ہیں۔ ڈاکٹر جمیل جالبی ماہ نومبر کے پہلے ہفتے میں خطبہ دینے کے لیے بھارت بلائے گئے تھے۔ دہلی میں منعقد ہونے والے اس جلسے کی صدارت ہمدرد وقف کے صدر حکیم عبدالحمید نے کی جب کہ ڈاکٹر گوپی چند نارنگ اور غلام السیدین کی فاضل بیٹی بیگم حمید نے ڈاکٹر صاحب کے بارے میں تعارف نامہ پیش کیا۔ اس تقریب میں اعلا تعلیمی اداروں کے اساتذہ، ادبا، نامور سماجی شخصیتوں اور دانشوروں کی ایک کثیر تعداد نے شرکت کی۔ دہلی میں ڈاکٹر جمیل جالبی کے اعزاز میں تین مزید تقریبات ہوئیں۔ پہلی تقریب غالب انسٹی ٹیوٹ کی طرف سے منعقد ہوئی جس کی صدارت معروف غالب شناس مالک رام نے کی جب کہ علی گڑھ یونیورسٹی کے سابق وائس چانسلر سید حامد مہمان خصوصی تھے۔ یہاں ڈاکٹر صاحب نے "طرزِ غالب" کے عنوان سے ایک خصوصی لیکچر دیا۔ تقریب جواہر لعل نہرو یونیورسٹی میں ہوئی جہاں ڈاکٹر جالبی نے "ادب اور عصری آگہی" کے موضوع پر اظہارِ خیال کیا۔ جلسے کی صدارت وائس چانسلر پروفیسر محمد شفیع اگوانی نے کی جب کہ ہندستانی زبانوں کے مرکز کے صدر پروفیسر کیدار سنگھ نے تعارفی کلمات پیش کیے۔ اس تقریب میں ہندی، اردو، تاریخ اور دیگر شعبوں کے اساتذہ اور طلبہ کی کثیر تعداد نے شرکت کی۔ لیکچر کے بعد سوال و جواب کا سلسلہ تقریباً ڈھائی گھنٹے تک جاری رہا۔ تیسری تقریب اردو اکیڈمی میں منعقد ہوئی جہاں ڈاکٹر جمیل جالبی نے "جدید شاعری" کے موضوع پر لیکچر دیا۔ صدارت مالک رام نے کی جب کہ خلیق انجم نے تعارفی کلمات پیش کیے۔ دہلی کے بعد میرٹھ اور سہارن پور میں بھی ڈاکٹر جمیل جالبی کے اعزاز میں مختلف تقریبات منعقد ہوئیں جن میں سے ایک تقریب کا انعقاد اسماعیل میرٹھی پوسٹ گریجوایٹس گرلز کالج کی طرف سے کیا گیا جہاں کالج کے پرنسپل کے علاوہ حکیم سیف الدین نے کہا کہ ڈاکٹر جمیل جالبی کی آمد سے نہ صرف اردو کا وقار بڑھا ہے بلکہ پاکستان کا نام بھی روشن ہوا ہے۔ اس جلسے میں طالبات و اساتذہ کی کثیر تعداد نے شرکت کی اور ڈاکٹر جالبی کے لیکچر سے استفادہ کیا۔ میرٹھ کالج میں منعقد ہونے والی خصوصی نشست میں صدر شعبۂ اردو ڈاکٹر امیر اللہ خاں شاہین نے ڈاکٹر جالبی کے بارے میں اظہارِ خیال کیا۔ اس تقریب میں شہر کے دانشوروں، ادیبوں اور یونیورسٹی کے اساتذہ نے شرکت کی۔ سہارن پور میں ڈاکٹر جالبی کے اعزاز میں منعقد ہونے والی خصوصی تقریبات میں اردو سے متعلق تبادلہ خیال ہوا جہاں ڈاکٹر جالبی نے مختلف سوالات کے جوابات دیے۔ اس کے علاوہ بھارت کے انگریزی اخبار اسٹیٹسمین میں ڈاکٹر جالبی کا ایک خصوصی انٹرویو شائع ہوا جب کہ ٹیلی ویژن سنٹر دہلی اور آل انڈیا ریڈیو نے بھی ڈاکٹر جالبی کے انٹرویو نشر کیے۔

نیشنل اردو انسٹی ٹیوٹ ماریشس میں تقسیم اسناد

ذی نیشنل اردو انسٹی ٹیوٹ میں جامعہ اردو کی اسناد کی تقسیم کے لیے ایک خاص تقریب ہوئی جس کے دوران گزشتہ

سال کے امتحانات میں اوّل آنے والے طلبہ کو بھی تحفے دیے گئے۔ اسناد ان طالب علموں کو دی گئیں جو ۱۹۸۶ء کے امتحانات میں کامیاب ہوئے تھے۔

اس تقریب میں ہندستان کے نئے سفیر جو چند روز پہلے ماریشس آئے ہیں مہمانِ خصوصی تھے مگر علالت کی وجہ سے انھوں نے نائب سفیر جناب سابر وال صاحب کو بھیجا تھا۔ پاکستانی سفارت خانے کے ناظم الامور جناب مدثر نور صاحب بھی اس تقریب کے خصوصی مہمان تھے۔

مہمانوں کا استقبال کرتے ہوئے نیشنل اردو انسٹی ٹیوٹ کے جنرل سکریٹری جناب عنایت حسین عیدن نے بتایا کہ اس ادارے کا قیام انیس سال پہلے ہوا تھا اور اس وقت سے مذکورہ ادارے میں اردو کی ترویج و اشاعت کے لیے کوششیں برابر جاری ہیں۔ یہاں مفت میں اردو پڑھائی جاتی ہے اور جو پڑھانے والے رضا کارانہ طور پر اپنا وقت دے کر لگن سے اردو پڑھا رہے ہیں ان کے نام ہیں فاروق حسنو، صابر گوڈر، سعید میاں جان، فاروق بوچھا، رشید نیروا، حنیف کنہائی اور گوری ٹھونا صاحبہ۔ اب جامعہ اردو کے امتحانات کی ذمے داریاں اسی ادارے کو سونپ دی گئی ہیں۔ اس ادارے کے تحت ادبی پروگرام ہوتے رہتے ہیں۔ جناب عنایت حسین عیدن صاحب نے ان حضرات کا بھی شکریہ ادا کیا جو مالی مدد پہنچا رہے ہیں اور خاص کر انھوں نے نیشنل اردو انسٹی ٹیوٹ کے صدر جناب احمد عبداللہ احمد صاحب سی بی ای کا شکریہ ادا کیا جو نہ صرف مالی مدد کر رہے ہیں بلکہ ہر طرح سے کبھی مدد فرما رہے ہیں۔

جناب احمد عبداللہ احمد صاحب نے اپنی پُرجوش تقریر میں اردو کی اہمیت پر زور ڈالتے ہوئے کہا کہ اردو زبان انسانیت اور خاص کر مسلمانوں کی ایک نایاب وراثت ہے۔ صدر اردو انسٹی ٹیوٹ نے پاکستان کے ناظم الامور جناب مدثر نور صاحب کا بھی شکریہ ادا کیا اور کہا کہ جب سے مدثر نور صاحب ماریشس تشریف لائے ہیں، اردو ترویج و اشاعت کے لیے ہر ممکن کوشش کر رہے ہیں۔ ان کی ذاتی دل چسپی کی بنا پر جدید اردو ادب پر حالیہ سیمینار کامیاب ہوا جس میں احمد فراز جیسے بڑے شاعر تشریف لائے تھے۔

سامعین سے خطاب کرتے ہوئے ہندستان کے نائب سفیر جناب سابر وال نے ہندستان میں اردو کی اہمیت پر زور دیتے ہوئے کہا کہ وہاں ترقی اردو بورڈ قائم کی گئی ہے جس کے تحت بہت سی کتابوں کا ترجمہ ہو رہا ہے۔ انھوں نے اردو انسٹی ٹیوٹ کے کاموں کو سراہا اور طلبہ کو مبارک باد بھی دی۔ ہندستانی سفارت خانے کی جانب سے انھوں نے اس ادارے کو بیس کتابیں تحفے میں پیش کیں۔

پاکستان کے ناظم الامور جناب مدثر نور صاحب نے جذبات سے بھرپور تقریر میں اس بات پر زور دیا کہ اردو زبان محبت کی زبان ہے اور یہ زبان بھی انھیں لوگوں کی زبان ہے جو اس سے محبت کرتے ہیں۔ زبان کے سلسلے میں مدلّل اور مفصل گفتگو کرتے ہوئے انھوں نے بتایا کہ اردو زبان کس طرح ایک تہذیب کی نمایندگی کر رہی ہے۔ مدثر نور صاحب نے بھی نیشنل اردو انسٹی ٹیوٹ کی خدمات کو سراہا اور طلبہ کو مبارک باد پیش کی۔ انھوں نے بتایا کہ اس ادارے کے لیے کتابیں آنے والی ہیں اور امید ظاہر کی کہ اس ادارے کے ذریعے اردو کا مستقبل سرزمین ماریشس میں روشن ہو گا

ماریشس میں اقبال پر ایک خاص پروگرام

(رپورٹ: لوئیس، ماریشس) مہینہ ۱۱ نومبر کو شاعر مشرق علامہ اقبال پر ذی نیشنل اردو انسٹی ٹیوٹ میں ایک خاص پروگرام ہوا جس میں اس ادارے کے طلبہ نے حصہ لیا۔

آغاز میں جناب حنیف کنہائی (جو انجمن ادب اور جامعہ اردو امتحانات کے سکریٹری ہیں) نے حاضرین کا خیر مقدم کرتے ہوئے بتایا کہ ہر سال ذی نیشنل اردو انسٹی ٹیوٹ میں علامہ اقبال کو خراج عقیدت پیش کرنے کے لیے پروگرام ہوتے ہیں لیکن آج کے اس پروگرام کی نوعیت الگ ہے کیونکہ اس پروگرام کو صرف طلبہ نے تیار کیا ہے۔ انھوں نے اپنی مسرت کا اظہار کیا کہ طلبہ کے دلوں میں بھی اردو کے ادیبوں اور شاعروں کے لیے عقیدت کا جذبہ پایا جاتا ہے۔

یہ پروگرام علامہ اقبال کی ایک نظم سے شروع ہوا جسے ادیب کلاسز کے طلبہ نے کورس میں پیش کیا۔ اس کے بعد سلمیٰ اسلام نے اقبال کی نظم "پرندے کی فریاد" سنائی۔ نسرین بانو پیر بخش نے اقبال پر انگریزی میں ایک تقریر کی جس میں انھوں نے اقبال کی زندگی کے چند پہلوؤں پر روشنی ڈالی اور اقبال کی شاعری کی اہمیت کا ذکر کیا۔ تیرہ سال کی اس لڑکی کی تقریر سن کر بڑی خوشی ہوئی اور یقین ہونے لگا ہے کہ یہ طلبہ و طالبات اردو میں مزید تعلیم حاصل کرکے اردو کا نام ہمارے جزیرہ میں روشن کریں گے۔ اس تقریر کے بعد اس ادارے کے ایک ہونہار طالب علم سمیر مہدی نے اقبال کی ایک غزل سنائی اور فیصل بدھو صاحب نے اقبال کی نظم "جاوید کے نام" پُرسوز انداز میں پیش کی۔ آخر میں سمیر مہدی نے علامہ اقبال کی شاعری کی چند خصوصیات پر اردو میں ایک تقریر کی۔

اختتام پر ذی نیشنل اردو انسٹی ٹیوٹ کے جنرل سکریٹری نے اپنی خوشی کا اظہار کرتے ہوئے طلبہ کی محنت و کوشش کو سراہا اور امید ظاہر کی کہ طلبہ اسی طرح دوسرے پروگرام بھی تیار کریں گے۔ انھوں نے بتایا کہ ایسے پروگرام سے نہ صرف امتحان میں فائدہ ہوتا ہے بلکہ طلبہ کے اندر خود اعتمادی بھی پیدا ہوتی ہے۔

تذکرہ نعت گویانِ اردو کی تعارفی تقریب

انجمن ترقی اردو ہزارہ ڈویژن ایبٹ آباد کے زیر اہتمام ایک خصوصی ادبی نشست بسلسلہ "تذکرہ نعت گویانِ اردو" پروفیسر طاہر تاروقی کی صدارت میں منعقد ہوئی۔ اس تقریب کے مہمانِ خصوصی "تذکرہ نعت گویانِ اردو" کے مصنف پروفیسر سید یونس شاہ تھے۔ تلاوت کلام پاک کے بعد پروفیسر صادق زاہد نے "تذکرہ نعت گویانِ اردو کا ایک مطالعہ جائزہ" کے عنوان سے اپنا مقالہ پیش کیا۔ جس میں انھوں نے تذکرہ نعت گویانِ اردو کے حوالے سے کہا کہ نعت کے میدان میں سب سے پہلی کاوش پروفیسر رفیع الدین اشفاق کا تحقیقی مقالہ "اردو کی نعتیہ شاعری" ہے جس پر ۱۹۷۶ء میں ناگ پور یونیورسٹی نے ان کو ڈاکٹریٹ کی ڈگری دی۔ اس عہد کے ایک اور فاضل محقق و نقاد ڈاکٹر فرمان فتح پوری نے بھی "اردو نعت گوئی" کے عنوان سے ایک تحقیقی مقالہ پیش کیا ہے۔ اس سلسلے کی تیسری اہم تحقیق "تذکرہ نعت گویانِ اردو" ہے جو کہ دو جلدوں پر

مشتمل ہے۔ پہلی جلد میں انھوں نے اردو شاعری کی ابتدا سے لے کر ۱۸۵۷ء تک اردو کی نعتیہ شاعری کے ارتقا کا احاطہ کیا ہے اور دوسری جلد میں انھوں نے ۱۸۵۷ء کے بعد کی نعتیہ شاعری کا جائزہ انتخاب کے ہمراہ پیش کیا ہے۔ علاوہ ازیں ان تمام تحریکوں کا مکمل جائزہ بھی لیا ہے جو مذہبِ اسلام کی مخالفت میں غیر مسلموں کی جانب سے وقتاً فوقتاً ظہور پذیر ہوتی رہی ہیں۔ بعدازاں صوفی عبدالرشید نے "تذکرہ نعت گویانِ اردو" کو تحقیقی دنیا کا ایک اہم کارنامہ قرار دیا۔ اس کے بعد پروفیسر مرتضٰے سید نے تذکرہ نعت گویانِ اردو پر اظہارِ خیال کرتے ہوئے اس تحقیقی کاوش پر اس کے خالق کو خراجِ تحسین پیش کیا اور ایبٹ آباد جیسے پسماندہ خطے کی ادبی تاریخ کا ایک اہم تحقیقی کارنامہ قرار دیا۔ اس کے بعد "تذکرۂ نعت گویانِ اردو" کے خالق نے اظہارِ خیال کرتے ہوئے فرمایا کہ گزشتہ تیس سال سے یہ بات میرے ذہن میں جاگزیں تھی کہ اردو شاعری کی تمام اصنافِ سخن کی تاریخ تو ہے لیکن نعت واحد صنفِ سخن ہے جو اپنی برگزیدہ صفات کے باوجود اپنی تاریخ سے محروم ہے۔ مقامِ شکر ہے کہ آج میں "تذکرہ نعت گویانِ اردو" کی صورت میں اردو نعت کی تاریخ پیش کرنے کے قابل ہو سکا ہوں اس کے معیار کا تعین کرنا محققین اور ناقدین حضرات کا کام ہے۔ آخر میں صدرِ مجلس نے سید یونس شاہ صاحب کو خراجِ تحسین پیش کرتے ہوئے ان کی اس اہم ادبی کاوش کو سراہا۔ بعدازاں محفلِ مشاعرہ منعقد ہوئی جس میں شاطر ہزاروی، محمد قاسم، راجہ ریاض الرحمان، وحید قریشی، سلطان سکون، صوفی رشید اور ریاض سالمی نے اپنے کلام سے سامعین کو محظوظ کیا۔

جلسہ یوم ولادت قائداعظمؒ

۲۵ دسمبر ۱۹۸۹ء بعد سہ پہر شام ۳ بجے سوسائٹی خواتین کلب میں ایک جلسہ بسلسلہ یوم ولادت قائداعظم زیرِ صدارت محترمہ بیگم محمد شریف ام اے۔ دو تمغۂ خدمت اعلا منعقد ہوا۔ انجمن ترقی اردو خواتین پاکستان کی عہدیداران اور ممبران نے کثیر تعداد میں شرکت کی، حسبِ ذیل کارروائی عمل میں آئی۔

قاریہ انیقہ عثمانی نے تلاوتِ قرآن کی۔ الحمد شریف کا منظوم ترجمہ خورشید بانو شمع صاحبہ نے پیش کیا بیگم رحیم صاحبہ قرآن مجید کی ایک آیت تلاوت فرما کر اس کے ترجمے کی روشنی میں قائداعظم کے کارناموں پر روشنی ڈالی (۴) پہلے بیگم رئیسہ قریشی صاحبہ نے اور بعد ازاں انیقہ عثمانی نے نعت پیش کی (۶) انجمن کی سکریٹری خورشید بانو شمع صاحبہ نے اپنی ایک نظم سنائی جس کا ایک بند ملاحظہ ہو:

اک مردِ باصفا تھے محمد علی جناح　　　حق بین و حق نما تھے محمد علی جناح

اس نظم کے بعد صدرِ جلسہ بیگم شریف صاحبہ نے قائداعظم محمد علی جناح کے کارہائے نمایاں پر تفصیل کے ساتھ روشنی ڈالی۔ انھوں نے کہا کہ آج جس پاکستان میں ہم بس رہے ہیں یہ قائداعظم کی انتھک جدوجہد کا ثمر ہے۔ اس کی بقا اور تحفظ ہمارا اوّلین فرض ہے۔ بیگم ملک صاحبہ، بیگم رئیسہ قریشی صاحبہ اور انجمن کی نائب صدر اور خازن بیگم سیدہ عثمانی صاحبہ نے قائداعظم کی سیرت اور تدبر پر اپنے خیالات کا اظہار کیا۔ آخر میں بیگم ملک صاحبہ نے پاکستان کی سلامتی اور ترقی کے لیے دعا فرمائی۔

بیگم خورشید بانو شمع
معتمد اعلا انجمن ترقی اردو خواتین پاکستان، کراچی

رَدِّ عمل

شمس الرحمٰن فاروقی

دہلی

اگست ۱۹۸۹ء کے "قومی زبان" میں جناب قدرت نقوی نے مولوی صاحبؒ کی لغت نگاری پر عمدہ مضمون لکھا ہے۔ ان کی خدمت میں بس اتنا عرض کرنا ہے کہ "دتوندھ" کے معنی میں DAY-BLINDNESS اصلی انگریزی لفظ ہے۔ ان کا یہ خیال درست نہیں کہ "روزکوری" یا "دتوندھ" کا مفہوم ادا کرنے کے لیے انگریزی میں کوئی لفظ نہیں۔ انھوں نے لکھا ہے کہ (انگریزی لغات میں) DAY کے تحت الفاظ میں DAY-BLINDNESS مندرج نہیں۔ یہ بات درست نہیں ہے۔ آکسفرڈ انگلش ڈکشنری کلاں (جسے عام طور پر O.E.D. کہا جاتا ہے) اس میں یہ لفظ DAY-BLINDNESS موجود ہے۔ امریکہ کی مشہور ڈکشنری رینڈم ہاؤس میں بھی یہ لفظ DAY BLINDNESS کی شکل میں درج ہے یعنی آکسفرڈ نے DAY اور BLINDNESS کے درمیان HYPHAN دیا ہے جب کہ امریکی ڈکشنری میں دونوں الفاظ ملا کر لکھے گئے ہیں۔

رضوان عنایتی

کراچی

قومی زبان پابندی سے مل رہا ہے۔ بہت بہت شکریہ۔ یہ پرچہ بابائے اردو کے زمانے سے آج تک اپنے معیار پر قائم ہے۔ اسی لیے شائقینِ ادب کے لیے خاص کشش رکھتا ہے۔

اس وقت میرے پیشِ نظر نومبر ۱۹۸۹ء کا شمارہ ہے جس میں چندن متراصاحب کا مضمون

ہندستان میں اردو کو درپیش مسائل" بھی شامل ہے۔ راقم کو اس کے مندرجات سے کلی اتفاق ہے۔
چونکہ یہ معروضی حقائق پر مبنی ہیں البتہ اس مضمون میں مضراصاحب سے ایک تاریخی سہو ہوا ہے جس کی
تنسیخی بہت ضروری ہے تاکہ تاریخ کا ریکارڈ درست رہے۔

مضراصاحب فرماتے ہیں:

"۱۹۳۰ء کے اوائل تک مسلم لیگ کی قیادت نواب چھتاری راجہ سلیم پور اور نواب
رام پور جیسے جاگیردار کر رہے تھے۔" (شمارہ ۱۱، ص: ۶۰، پیرا ۷، سطر ۳)

نواب چھتاری اور راجہ سلیم پور کی مسلم لیگ کی قیادت کے بارے میں راقم کو کچھ زیادہ علم نہیں البتہ
نواب رام پور کا نام مسلم لیگ کے قائدین میں شامل کرنا تاریخی حقائق کے یکسر خلاف ہے۔ مسلم لیگ کے
قائدین میں نواب اسماعیل خاں اور راجہ صاحب محمود آباد اس منصب کے حقیقی سزاوار تھے۔

نواب رام پور ٹھیٹ غیر سیاسی شخص تھے۔ ان کا نہ تو کبھی کانگریس سے تعلق تھا اور نہ مسلم لیگ سے۔
وہ عام جاگیرداروں کی طرح انگریزوں کے نمک خوار اور وفادار تھے بلکہ ان کے والد مرحوم نواب
حامد علی خاں تو "فرزند دلبند دولتِ انگلشیہ" تھے۔ یہ خطاب انھیں اُس ملکہ وکٹوریہ نے عطا کیا
تھا جس کی موت پر علامہ اقبال نے بھی ایک مرثیہ لکھا تھا جس کا ایک شعر یہ ہے۔

اے ہند تیرے سر سے اٹھا سایۂ خدا اک غمگسار تیرے مکینوں کی تھی، گئی

جب مسلم لیگ کی تحریک شروع ہوئی نواب حامد علی خاں رخصت ہو چکے تھے اور ان کے فرزند نواب رضا علی خاں
مرحوم کا دور دورہ تھا جو پاک و ہند کی آزادی کے ساتھ اختتام کو پہنچا۔ رضا علی خاں بھی تمام عرصے
حکومتِ برطانیہ کے وفادار رہے اور ۱۹۴۷ء میں اعلانِ آزادی کے ساتھ ہی پنڈت نہرو کی خدمت میں
حاضر ہو کر سب سے پہلے اپنی ریاست مرکز کی تحویل میں دینے کی پیش کش کی جس کا صلہ نواب صاحب کو یہ ملا کہ
ریاست رام پور کا ادغام کانگریس حکومت نے تمام ریاستوں اور رجواڑوں کے ادغام کے بعد کیا اس
مہلت سے نواب صاحب کو کافی فائدہ پہنچا۔

امید ہے آپ میرا یہ عریضہ قومی زبان کے آیندہ شمارے میں شائع فرما کر مجھے ممنون کریں گے
تاکہ ایک تاریخی سہو کا ازالہ ہو جائے۔

ڈاکٹر وفا راشدی

یہ اشاریہ حسب ذیل عنوانات کے تحت مرتب کیا گیا ہے۔

اس اشاریے کی ترتیب میں جون تا اکتوبر ۱۹۸۹ء کے رسائل و جرائد سے استفادہ کیا گیا ہے۔ صراحت حسبِ ذیل ہے ۔

سہ ماہی	اردو	کراچی	اپریل تا جون ۱۹۸۹ء
״	العلم	״	״ ״ ״ ״
״	دانش	اسلام آباد	شمارہ ۱۷، ۱۸/ ״
״	نیا دور	کراچی	״ ۸۳، ۸۴
ماہنامہ	ادبِ لطیف	لاہور	جولائی ۱۹۸۹ء
״	افکار	کراچی	جولائی، اگست، ستمبر، اکتوبر ״
״	اوراق	لاہور	جون، جولائی ״
״	دائرے	کراچی	جولائی، اگست، ستمبر ״
״	شاعر	بمبئی	شمارہ ۱، ۲ جلد ۶۰ ״
״	صریر	کراچی	جولائی ״
״	طلوعِ افکار	״	״ ״
״	قومی زبان	״	جولائی، اگست، ستمبر ״
״	کتاب نما	نئی دہلی	״ ״ ״ ״
״	ماہِ نو	لاہور	״ ״ ״ ״
״	معارف	اعظم گڑھ	״ — ״ ״
״	نیرنگِ خیال	راولپنڈی	اگست، ستمبر ״
ہفت روزہ	ہماری زبان	دہلی	یکم جولائی، ۸ جولائی، ۲۲ جولائی، ۱۵ اگست، ۸، ۱۵، ۲۲ ستمبر، یکم اکتوبر ۱۹۸۹ء

زبان ــــ مسائل ومباحث

انجم اعظمی	شاعر کی زبان	دائرے کراچی	جولائی	۱۹۸۹	ص ۷
جیلانی کامران/انیس الحق	قومی زبان کے ساتھ بدلو کی	قومی زبان "	"	"	ص ۶۱
سالار ایم خاں	ہندستان میں اردو اشاعت	ہماری زبان دہلی	یکم اکتوبر	"	ص ۳
عبدالحق، بابائے اردو مولوی	قومی زبان	قومی زبان کراچی	اگست	"	ص ۱۱
عبدالمغنی، ڈاکٹر	مسئلہ اردو کی حقیقت ونوعیت	ہماری زبان دہلی	۲۲ جولائی	"	ص ۸
فرمان فتح پوری، ڈاکٹر	اردو لغت اور اردو ڈکشنری بورڈ کراچی	"	۱۵ ستمبر	"	ص ۶
مسعود حسین خان، ڈاکٹر	اردو کا مسئلہ	"	۲۲ جولائی	"	ص ۱
نسیم اختر، ڈاکٹر	نیپال میں اردو کے اثرات	"	یکم اکتوبر	"	ص ۱

ادب ــــ مسائل ومباحث

انور سدید، ڈاکٹر	عالمی مسائل کا اثر ادب پر	صریر کراچی	جولائی	۱۹۸۹ء	ص ۸
جمیل جالبی، ڈاکٹر	شاعر اور مسائلِ حیات	ماہِ نو لاہور	اگست	"	ص ۶۲
رشید نثار	اردو ادب میں طنز ومزاح	نیرنگِ خیال راولپنڈی	"	"	ص ۷
سلیم اختر، ڈاکٹر	گیسٹالٹ نفسیات اور تخلیق	نیا دور کراچی	شمارہ ۸۳، ۸۴	"	ص ۴۵۶
سید محمد عقیل، ڈاکٹر	اکیسویں صدی کی غزل، ایک اندازہ/قسط ۱	شاعر بمبئی	شمارہ ۱ جلد ۶۰	"	ص ۲۳
" "	" " " " " ۲	" "	" ۲ " "	"	ص ۲۴
شمیم حنفی، ڈاکٹر	عوامی ادب کے مسائل اور اردو کی ادبی روایت	ماہِ نو لاہور	جولائی	"	ص ۱۳
شمیم حنفی	اردو طنز ومزاح اور ہماری معاشرتی صورتِ حال	کتاب نما نئی دہلی	"	"	ص ۱۱
صدیق جاوید، ڈاکٹر	ادب کی عمرانیات	ماہِ نو لاہور	اگست	"	ص ۷
طارق عزیز، ڈاکٹر	گیارہ سال کی مزاحمتی ادب	طلوعِ افکار کراچی	جولائی	"	ص ۱۰
عارفہ فرید، ڈاکٹر	تحلیل، تنقید، فلسفہ اور ادب	دائرے "	اگست	"	ص ۲۳
فہیم اعظمی	شعور اور تخلیق	" "	جولائی	"	ص ۱۹
قمر جمیل	سارتر کا نظریۂ ادب	" "	"	"	ص ۲۳
کنول ڈبائیوی	غیر ادبی ڈراما، سوانگ/نوٹنکی	نیا دور "	شمارہ ۸۳، ۸۴	"	ص ۴۶۹
مرزا حامد بیگ، ڈاکٹر	تمثیل یا ناول	ماہِ نو لاہور	ستمبر	"	ص ۱۰

نسیم ستہر کی	نیا افسانہ یا جدید افسانہ کیا ہے؟	دائرے	کراچی	جولائی	۱۹۸۹ء ص ۳۵
نظیر صدیقی	جدید اردو تنقید	قومی زبان	″	ستمبر	″ ص ۴۳

لسانیات

الیاس عشقی، ڈاکٹر	چکابو یا چکا پو	قومی زبان	کراچی	اگست	۱۹۸۹ء ص ۵۵
سعید احمد عثمانی	الفاظ اور املا، لغت کی روشنی میں	دائرے	″	″	″ ص ۳۰
شان الحق حقی	رموزِ انشا	قومی زبان	″	جولائی	″ ص ۴۳
صابر سنبھلی، ڈاکٹر	غنڈہ، غنڈا، گنڈا	ہماری زبان	دہلی	۸ جولائی	″ ص ۶
گوپی چند نارنگ، ڈاکٹر	اردو املا اور لسانیات / قسط ۱	شاعر	بمبئی	شمارہ ۱ جلد ۶۰	″ ص ۸
″ ″	″ ″ ″ ۲	″	″	″ ۲ ″ ۶۰	″ ص ۸
وہاب اشرفی، پروفیسر	اردو اور کلچر کی تفہیم	کتاب نما	نئی دہلی	جولائی	″ ص ۱۹

تحقیق و تنقید

آزاد، جگن ناتھ	ہندستان میں اقبالیات	اوراق	لاہور	جون، جولائی	۱۹۸۹ء ص ۲۱۰
الف ۔ د ۔ نسیم، ڈاکٹر	میر حسن اور شاہ مدار کی چھڑیاں	ماہِ نو	″	جولائی	″ ص ۲۳
ادا جعفری	مرزا محمد قادر بخش صابر دہلوی	قومی زبان	کراچی	اگست	″ ص ۵۱
اسلم فرخی، ڈاکٹر	نوادر کتب خانۂ خاص "تحفۂ ابیٹ" ۱	کتاب نما	نئی دہلی	ستمبر	″ ص ۱۱
آصف فرخی	پرانی کہانیاں	اردو	کراچی	جون	″ ص ۵۹
″	سلیم احمد اور تنقید کا فریضہ	قومی زبان	″	ستمبر	″ ص ۱۷
انتظار حسین	کچھ داستان کے بارے میں	″	″	جولائی	″ ص ۳۷
انصار اللہ نظر، ڈاکٹر	امیر خسرو کا ہندوی کلام	″	″	ستمبر	″ ص ۴۷
انور خاں	سریندر پرکاش کے افسانے	کتاب نما	نئی دہلی	جولائی	″ ص ۳۷
حامدی کاشمیری، ڈاکٹر	فیض احمد فیض کی شناخت	اوراق	لاہور	جون، جولائی	″ ص ۲۵۱
سید حسین عارف	سلسلۂ نوربخشیہ کے علمی آثار	دانش	اسلام آباد	۱۷/۱۸	۱۹۸۹ء ص ۳۰۱

۱ تواریخِ نادر العصر (نام تاریخی ۱۸۶۳ء) مرتبہ منشی نول کشور لکھنؤ مملوکہ انجمن ترقی اردو پاکستان کراچی

نزلہ زکام سے بند ناک!
علاج ۔ جوشینا کی ایک خوراک
نزلے کے اثرات سے پھیپھڑے اور سانس لینے کا نظام متاثر ہوتا ہے۔
جوشینا سانس کی نالیوں کو کشادہ کرتی ہے، بلغمی مادّے کو خارج کرتی ہے اور بند ناک کو کھول دیتی ہے۔
جوشینا۔ جوشاندے کا سریع الاثر خلاصہ (ایکسٹریکٹ) ہے جس میں وہ تمام اجزا شامل ہیں جو ہزار سال سے برصغیر میں نزلہ، زکام، کھانسی، گلے کی خراش اور بخار کے لیے واحد مجرّب نسخے کے طور پر تسلیم کیے جاتے ہیں۔
ہمدرد نے جوشاندے کے ان تمام مفید اجزا کو دورِ حاضر کے تقاضوں اور جدید سائنسی اصولوں کے مطابق سفوف کی شکل اس طرح دے دی ہے کہ ان کی افادیت بھی قائم رہے اور یہ زیادہ سریع الاثر ہو جائیں۔
گرم پانی کی ایک پیالی میں "جوشینا" کا ایک پیکٹ حل کیجیے۔
فوری استعمال کے لیے جوشاندے کی ایک مکمل خوراک تیار ہے۔
جوشینا دو پیکنگوں میں دستیاب ہے
خوب صورت پلاسٹک مگ میں اور گتے کے کارٹن میں
جوشینا
جوشاندے کی مکمل توانائی
نزلہ و زکام ۔ جوشینا سے آرام
ہمدرد
Aderts-JOS-3/89

ماھنامہ

قومی زبان

کراچی

فروری ۱۹۹۰
جلد : ۶۲
شمارہ : ۲

مضمون نما

ادارۂ تحریر

جمیل الدین عالی
ادا جعفری
ڈاکٹر اسلم فرخی

مدیر

ادیب سہیل

بدل اشتراک

فی پرچہ ...... ۵ روپے
سالانہ ...... ۵۰ روپے
سالانہ رجسٹری سے ۱۰۰ روپے

بیرونِ ملک

فی پرچہ ..... ایک ڈالر
سالانہ ...... دس ڈالر
سالانہ رجسٹری سے پندرہ ڈالر

انجمن ترقی اردو پاکستان

بابائے اردو روڈ، کراچی ۱ فون: ۲۳-۲۴۷

۱۸۰ سے زیادہ ممالک میں
گمشدہ چیکس کے دوبارہ اجراء کی ہمہ وقت سہولت

- محفوظ
  نسری سے زیادہ محفوظ
  استعمال میں انتہائی آسان
- بے خطر
  Citicorp اور Visa
  کے تعاون سے
- گمشدہ چیکس
  دوبارہ اجراء
  فوری مہیا
- قبولیت
  دنیا بھر میں قابل قبول
  اور بھنانے میں آسان
- دستیابی
  ۲۰، ۵۰، ۱۰۰، ۵۰۰
  اور ۱۰۰۰ امریکی ڈالر میں دستیاب

حبیب بینک لمیٹڈ

PID (Islamabad)

manhattan International

فروری، اردو کے مشہور و معروف شاعر مرزا اسد اللہ خاں غالب کا مہینہ ہے۔ ۱۵ فروری ۱۸۶۹ء کو، کہ جسے اب
یس سال ہو جاتے ہیں۔ مرزا غالب اس دارِ فانی سے رخصت ہوئے لیکن ان کی یاد کے نقوش روز بروز زیادہ روشن اور
ہوتے جاتے ہیں۔ انجمن ترقی اردو نے اردو کے اس عظیم المرتبت شاعر کو خراجِ عقیدت ہی پیش نہیں کیا ہے۔ بلکہ غالب
ر شخصیت کے بہت سے اہم گوشوں کی نقاب کشائی کی۔

ڈاکٹر عبد الرحمٰن بجنوری کا معرکہ آرا مضمون "محاسنِ کلامِ غالب" انجمن کے رسالے اردو ہی میں شائع ہوا تھا اور اب
ستقل تصنیف کی حیثیت حاصل ہے۔ بجنوری مرحوم کا یہ مضمون غالب شناسی کے سلسلے میں بڑی اہمیت کا حامل
ا ہے۔ بابائے اردو مولوی عبد الحق مرحوم نے غالب کے مقدمے کی پوری مِسل بھی رسالہ اردو میں شائع کی تھی۔ انجمن
ن اردو اور قومی زبان میں غالب کے حوالے سے خصوصی اشاعتوں کے علاوہ بے شمار خیال انگیز مضامین بھی شائع
یں۔

پچھلے دنوں انجمن نے غالب شناسی کے سلسلے میں ایک اور اہم کتاب "غالبِ آشفتہ نوا" شائع کی جو ممتاز غالب
ڈاکٹر آفتاب احمد خاں کی تصنیف ہے۔ ڈاکٹر خلیق انجم نے بڑی محنت، دیدہ ریزی اور تحقیق سے خطوطِ غالب تین
یں مرتب کی ہے۔ اس سلسلے کی پہلی جلد انجمن نے حال ہی میں شائع کی ہے۔ دوسری اور تیسری جلدیں جلد شائع
لی ہیں۔ معروف ہندوستانی غالب شناس جناب کالی داس گپتا رضا نے "دیوانِ کامل" کے عنوان سے غالب کا
اعتبارِ توقیت شائع کیا تھا۔ انجمن نے جناب رضا کی خصوصی اجازت سے اس کی اشاعت کا اہتمام کیا ہے۔ یہ
اپنی ترتیب کے اعتبار سے ایک قابلِ قدر ادبی دستاویز کی حیثیت رکھتا ہے۔ عنقریب پاکستانی قارئین
ں میں پہنچے گا۔

غالب اردو کا بڑا محبوب شاعر ہے۔ اس کی قد آور ادبی شخصیت کے مختلف پہلو سامنے آتے رہے ہیں۔ انجمن کی
ہے کہ غالب شناسی کی تمام کوششوں میں شریک رہے اور غالب کی شخصیت اور شاعری کے حوالے سے
نید تحقیق اور ادب کو تقویت پہنچاتی رہے۔

اچھا ماضی ۔ روشن مستقبل
ہم نے ۱۹۵۲ء میں سوئی کے مقام پر قدرتی گیس دریافت کی اور صرف تین سال بعد ۱۹۵۵ء میں اسکی پیداوار اور باقاعدہ فراہمی کا آغاز کر کے صنعت، زراعت اور توانائی کی پیداوار میں اضافہ کیا، پاکستانی معیشت کو توانائی بخشی۔
اب سوئی گیس پاکستان کے چاروں صوبوں میں دستیاب ہے، جس سے معیارِ زندگی بہتر ہو رہا ہے۔ اس طویل عرصے میں کثیر زرِ مبادلہ کی بچت بھی ہوئی۔ اور آئندہ بھی ہوتی رہے گی۔
قدرتی گیس کے ذخائر کے علاوہ پاکستان پیٹرولیم نے خام تیل بھی دریافت کیا ہے۔ ہم قومی جدوجہد میں مقدور بھر حصہ لے رہے ہیں۔ اس پر ہمیں فخر ہے۔
پی پی ایل ۔ توانائی کی تلاش میں سرگرم عمل
پاکستان پیٹرولیم لمیٹڈ
پی آئی ڈی سی ہاؤس۔ ڈاکٹر ضیاء الدین احمد روڈ۔ پی او بکس نمبر ۳۹۴۲۔ کراچی

۲۰ جنوری سنہ ۱۹۹۰ء کو نیپا کی سماعت گاہ میں چینی ادیب جناب یوان وے شوئے کے اعزاز میں ایک جلسہ منعقد کیا گیا۔ جس میں مہمان چینی ادیب صدر انجمن جناب نور الحسن جعفری کو اپنی کتاب "چین کے ادیب و شاعر" پیش کر رہے ہیں۔

جلسے سے بیان دیتے ہوئے، نورالحسن جعفری، شوکت صدیقی اور ڈاکٹر اسلم فرخی خطاب کر رہے ہیں

حاضرینِ جلسہ

کالی داس گپتا رضاؔ

غالبیات ۔ کچھ مشاہدے اور مطالعے

(الف) اردوئے معلّٰی ۔ پہلا ایڈیشن ۱۸۶۹ء ص: ۴۴۳

غالب، علاء الدّین خاں علائیؔ کو اپنے ایک خط مورخہ یکشنبہ، ۲۷ر جولائی ۱۸۶۴ء[1] میں لکھتے ہیں:

"صاحب وہ زمانہ نہیں، اِدھر متھرا داس[2] سے قرض لیا اُدھر درباری مل کو مارا، اُدھر خوب چند چین سکھ کی کوٹھی جا لوٹی۔ ہر ایک کے پاس تمسک مہری موجود، شہد لگاؤ چاٹو، نہ مُول نہ سُود۔ اس سے بڑھ کر یہ بات کہ روٹی کا خرچ بالکل پھوپھی کے سر، بااین ہمہ کبھی خان[3] نے کچھ دے دیا، کبھی الور[4] سے کچھ دلوا دیا، کبھی ماں[5] نے کچھ آگرے سے بھیج دیا۔ اب میں اور باسٹھ روپے آٹھ آنے کلکٹری کے، سو روپے رام پور کے قرض دینے والا ایک میرا مختارِ کار، وہ سود ماہ بہ ماہ لیا چاہے ...."

خط کا یہ اقتباس اہم ہے کیوں کہ اس کے ذریعے روا روی میں غالب کچھ ایسے انکشاف بھی کر گئے ہیں جو وہ عام حالات میں ظاہر کرنا پسند نہ کرتے۔ یہ بھی ہے کہ یہ خط جس کو لکھا گیا ہے وہ پہلے ہی سے ان کے کوائف سے واقف ہیں اور غالب نے محض انھیں دہرا دیا ہے۔ اب ذرا تفصیل سے نظر ڈالی جاتی ہے:

ہمیں ۲ (یعنی متھرا داس، درباری مل) کے متعلق کوئی علم نہیں۔ یہ بھی نہیں معلوم کہ وہ اصل نام ہیں یا محض ساہوکاروں کی علامت، جن سے غالب کبھی اُدھار لیا کرتے تھے۔ خوب چند چین سکھ کسی فرم کا نام معلوم ہوتا ہے اور کوٹھی سے مراد بھی ساہوکارے کی دکان ہی سے ہے جس سے غالب قرضہ اٹھاتے تھے۔ اگر ان کا تعلق آگرے سے ہے تو گویا غالب کی عمر کے ابتدائی حصّے کی بات ہے اور اگر دہلی سے ہے تو گویا غالب بیس پچیس سال کی عمر تک ان سے وقتاً فوقتاً قرضہ لیتے تھے اور مہری تمسک لکھ دیا کرتے تھے۔ مگر نہ ہی کبھی مُول چکانے کی فکر کرتے تھے نہ سُود ادا کرتے تھے۔ یہ تاوان

---

[1] یہ کاتب کا سہو معلوم ہوتا ہے۔ ۱۸۶۲ء چاہیے۔ کیوں کہ یک شنبہ ۲۷ر جولائی ۱۸۶۲ء کو پڑتا ہے نہ کہ ۲۷ر جولائی ۱۸۶۴ء کو۔ دوسرے اندرونی شواہد بھی ۱۸۶۲ء ہی کے حق میں ہیں۔

ان کے بزرگ بھرتے تھے۔ وہ والدہ، پھوپھی، نانا، خُسر، خُسر کے بڑے بھائی، کوئی بھی ہو سکتے تھے۔
یہ سلسلہ کب تک چل سکتا تھا ملاحظہ کیجیے:

۲ (پھوپھی) اگر روٹی کی فکر یہ کرتی تھیں تو وہ غالب آگرے ہی کی زندگی تک ممکن ہے کیوں کہ غالب کی کسی ایسی پھوپھی کا ذکر نہیں ملتا جو ایسی خوش حال ہو کہ شادی کے بعد بھی غالب کے گھر گرہستی کو چلا سکتیں (ویسے غالب کی آخری پھوپھی کا انتقال ۲۰ ستمبر ۱۸۵۳ء کو ہوا)

۳ (خان) اور ۴ (الور) سے مُراد نواب احمد بخش خاں ہے کیوں کہ الور سے غالب کو وہی دلوا سکتے تھے۔ نواب احمد بخش خاں اکتوبر ۱۸۲۷ء میں مرے۔

۵ ایک تحریر کی بنا پر قیاس ہے کہ غالب کی والدہ کا انتقال ۱۸۴۰ء میں ہوا لیکن مرنے سے قبل وہ اس قابل نہ رہ گئی تھیں کہ غالب کی دامے درمے مدد کر سکتیں۔ غالباً والدہ کی طرف سے فتوحات کا سلسلہ بھی ۱۸۳۰ء تک ختم ہو چکا ہوگا۔

(ب) داغ از تمکین کاظمی۔ آئینۂ ادب، لاہور۔ ۱۹۷۰ء

(ص ۔ ۳۸) "مرزا غالب رشتے میں داغ کے پھوپھا تھے۔ مگر شمس الدین خاں (والدِ داغ) کے دشمن تھے۔ چنانچہ مخبری کر کے شمس الدین خاں کو پھانسی کے تختے پر پہنچانے والے غالب ہی تھے ...."

(ص ۔ ۶۸) "فریزر کے قتل کا پتا ہی نہ چلتا اگر فتح اللہ بیگ اور مرزا غالب مخبری نہ کرتے۔ یہ دونوں مخبر لوہارو ہی کے تھے۔ فتح اللہ خاں تو اسی خاندان سے تھے اور مرزا غالب بھی اسی خاندان کے داماد تھے۔ اس طرح ان لوگوں نے شمس الدین خاں کو پھانسی کے تختے پر پہنچا کر انتقام لیا تھا ...."

یہ درست ہے کہ غالب، شمس الدین خاں کے خلاف تھے اور لوہارو، امین الدین احمد خاں اور ضیاالدین احمد خاں کو واپس دلانے کے حق میں تھے۔ تاہم یہ بات اب مصدقہ ہے کہ غالب نے شمس الدین خاں کے خلاف مخبری نہیں کی تھی غالب نے خود بھی (کلیاتِ نثر غالب۔ ص: ۱۹۲) ایک فارسی خط میں لکھا ہے کہ چوں کہ لوگ جانتے تھے کہ شمس الدین احمد خاں اور میرے تعلقات باہم کشیدہ ہیں۔ انھوں نے بات اڑا دی کہ میں (غالب) نے شمس الدین احمد خاں کے خلاف مخبری کی ہے۔ حالانکہ یہ سارا کیا دھرا شمس الدین احمد خاں کے ابنِ عم فتح اللہ بیگ خاں کا ہے۔ میں اس معاملے میں بالکل بے قصور ہوں۔

یہاں غالب نے اپنے بارے میں قطعی سچ بولا ہے مگر فتح اللہ بیگ خاں کے بارے میں ان کا شک غلط ہے۔

اللہ بیگ خاں، قاسم جان کے پوتے اور محمد بخش خاں کے بیٹے تھے۔ اس طرح فتح اللہ بیگ خاں سے شمس الدین خاں کی ی رشتے داری تھی۔ بزم غالب (عروج) جس ہے کہ جن لوگوں نے نواب شمس الدین احمد خاں کے خلاف جھوٹی شہادتیں یں یا مخبریاں کی تھیں ان کی فہرست ۴ر اکتوبر ۱۸۳۵ء کے 'سلطان الاخبار' میں شائع ہوئی تھی۔ ان میں فتح اللہ بیگ م نہ تھا۔ واللہ عالم۔

ج) تاریخ جدولیہ از منشی خادم علی۔ مطبع مدرسہ آگرہ۔ ۱۲۷۰ھ/۱۸۵۴ء

(ص ۱۳۷) "اسد اللہ خاں غالب (پسر) عبد اللہ بیگ خاں اپنے وقت کے افضل، انوری و خاقانی سے ہیں اور معروف مرزا نوشہ۔ ابتدا میں رونق بخشِ سکونتِ اکبر آباد تھے۔ اب دہلی کو اپنے قیام سے منوّر کیا ہے۔"

(ص ۱۴۳) "ذوق دہلوی۔ سبحان اللہ اپنے وقت کے میر ہیں اور مخاطب خاقانی ہند۔ اور نام شیخ محمد ابراہیم۔"

(ص ۱۴۳) "الٰہی بخش خاں معروف (پسر) قاسم خاں دہلوی۔ قطع نظر شاعری کے فقیر بھی تھے۔ محاورہ بندی میں اچھے۔ کچھ مشورت ذوق سے بھی تھی۔"

یہ دونوں سال (۱۲۷۰ھ اور ۱۸۵۴ء) اس ضخیم کتاب 'تاریخ جدولیہ' کے سرورق پر درج ہیں جس کے یہ معنی ہ کتاب کا مسودہ ۲۳ ستمبر ۱۸۵۴ء سے پہلے مطبع میں برائے طباعت دیا جا چکا تھا۔ دیباچے میں لکھا ہے کہ کتاب ۱۱ھ مطابق (۱۴ اکتوبر ۱۸۵۳ء) تک مدوّن ہو چکی تھی۔ اس وقت غالب کی عمر ۵۶ سال اور ذوق کی (سالِ ولادت ۱۱ھ/ ۸۹ ــ ۸۸ ۱۷ء) ۶۵ سال تھی۔ اور غالب کے خسر مرزا الٰہی بخش خاں معروف کو انتقال کیے ۲۷ برس ہو چکے تھے۔

تاریخ جدولیہ میں غالب کو بجا طور پر "نقشۂ شعرائے فارسی نامی" میں جگہ دی گئی ہے۔ کیوں کہ ۲۸-۱۸۲۷ء غالب نے اردو کی جگہ فارسی میں فکر کرنا شروع کر دیا تھا۔ چنانچہ جہاں اس بیس سال (۱۸۴۷ء تک) کے عرصے میں ں نے تین سو سے کم اردو اشعار کہے وہاں فارسی میں ہزاروں شعر کہہ ڈالے، حتیٰ کہ ان کے کلیاتِ فارسی مطبوعہ ۱۸ء میں ۶۶۹۴ شعر ہیں جب کہ ۱۸۲۷ء سے پہلے صرف ۲۷ فارسی غزلوں اور ۱۳ رباعیوں کی نشاندہی کی جا سکتی لہٰذا انھیں مولفِ تاریخ جدولیہ نے فارسی شاعر مانا ہے اور انوری اور خاقانی سے افضل تسلیم کیا ہے۔

ذوق بلاشبہ اُس عہد کے اردو کے مشہور ترین شاعر تھے۔

معروف کے بارے میں مولفِ تاریخ جدولیہ ایک اہم اطلاع دیتا ہے۔ چوں کہ یہ اطلاع غالب اور ذوق دونوں کی ں میں طبع ہوئی ہے اس لیے خاص توجہ چاہتی ہے۔ وہ کہتا ہے:

"(معروف کو) کچھ مشورت ذوق سے بھی تھی۔"

یعنی معروف کبھی کبھی ذوق سے بھی مشورۂ سخن کرتے تھے۔ اس کی تائید 'تذکرہ شمیم سخن' (۱۸۷۲ء) اس طرح کرتا ہے:

"آخر میں .... ذوق دہلوی سے اصلاح لینا شروع کی"

اور یہ اضافہ کیا:

"دیوانِ معروف جو رائج ہے .... ذوق کا ہی اصلاحی ہے"

آزاد نے ۱۸۸۰ء میں "آبِ حیات" میں ذوق کے ترجمے میں اس بیان کی تائید مزید کر دی ہے بلکہ مبالغہ سے کام لیا تاہم حقیقت وہی ہے جو مولفِ تاریخِ جدولیہ نے لکھی ہے یعنی "دوسرے استاد یا اساتذہ کے علاوہ معروف کو کچھ مشورت ذوق سے بھی تھی" اس میں کبھی کبھار کی اصلاح اور کبھی کبھار اپنے اشعار کی عطا، دونوں شامل ہو سکتے ہیں

(د) مثنوی انبساط و انتشار۔ نواب امین الدین احمد خاں امین مطبوعہ دہلی ۱۸۷۳ء

(ص-۵۷) استفسارِ فرخی بابت معنی "بسمل"، دادائے غالب سے

ابھی فرخی[1] کا تھا کم سن و سال — کہ والد[2] کو ان کے ہوا یہ خیال

ہو تعلیم کا ان کی وہ اہتمام — کہ روشن ادیبوں میں ہو ان کا نام

انھیں پھر وہ ہمراہ لانے لگے

ادب کی مجالس دکھانے لگے

صدارت میں غالب کی اک مرتبہ — ہوئی مجلسِ شعر آراستہ

علائی بھی بیٹے کو لائے وہاں — جہاں جمع تھے سارے اہلِ زباں

بہت شاعروں نے سنایا کلام — جو تھے داد پاتے وہ کرتے سلام

یہاں لفظِ "بسمل" پہ تکرار تھی

ہے کیا چیز سمجھے نہ یہ فرخی

ہوئی ختم مجلس نہ کوئی رہا — وہاں گھر کے افراد کے ماسوا

یہ غالب سے پوچھا جو موقع ملا — بڑے دادا کیا شے ہے "بسمل" بھلا

ہنسے ہنس کے غالب نے پھر یہ کہا — ترے چھوٹے دادا[3] ہیں اس کی دوا

یہ پوچھ ان سے یا جا انھیں دیکھ لے — وہ بتلائیں گے اس کے معنی تجھے

سنا جب علائی نے جز بز ہوئے — اٹھا بیٹے کو ان سے کہنے لگے

---

[1] نواب سر امیر الدین احمد خاں عرف فرخ مرزا

[2] نواب علاء الدین احمد خاں علائی شاگردِ غالب

[3] نواب ضیاء الدین خاں نیر درخشاں شاگردِ غالب، علائی کے سگے چچا

چچا جان[1] بچے سے یہ کیا کہا کوئی اور معنی اسے دیں بتا
سُنا یہ تو غالب نے ہنس کر کہا نہ سمجھیں گے نیّر[2] اسے کچھ بُرا
تمہارا یہ بچہ جو ہے جانشیں اسے علم درکار ہے بہتریں
انھیں باتوں باتوں میں ہوگا علیم
اسی طور ہوتے ہیں ناداں فہیم
غرض ایک دن صبح کو فرخی گئے اپنے دادا[3] کی دی حاضری
نہایت ادب سے بصد احترام کیا چھوٹے دادا کو جھک کر سلام
گلے سے لگا کر بہت خوش ہوئے دعائیں ترقی کی دینے لگے
لگے کہنے ہم نے سُنا ہے یہ حال کہ آؤ گے تم پوچھنے اک سوال
کہا تم سے دادائے غالب نے کیا دیا پوتے[4] نے واقعہ سب سُنا
کہا سُن لو دادا کے تحتِ جگر تمہیں آپ ہو جائے گی سب خبر
حقیقت میں "بِسمل" نہیں کوئی شے مزاحاً بڑھائی ہے غالب نے لے
جسے کہیے زخمی ہے بِسمل" وہی
سُنایا پھر اک قصۂ واجبی
کہا دن ہوئے کچھ کہ دلی میں تھیں گھرانے کی اک تین بہنیں حسیں
تھا زہرہ جمالوں میں ان کا شمار جمال ان کا دلکش تھا آئینہ دار
کٹی عمر دو کی تو بس سرسری مگر تیسری نامور ہو گئی
ہوئے پانچ خوش بخت اس کے اسیر
ملی رتبۂ بِسملی اسے صغیر
کہا فرخی نے کہ "پھر کیا ہوا" کہا "بیٹا اس کو خدا نے دیا"
کہا "بیٹا ان میں سے کس کا وہ تھا" کہا "جس کو لے باپ اپنا بنا"
کہا کان میں پھر یہ آہستگی
نہیں باپ ایسوں کا ہوتا کوئی "

---

[1] غالب۔ امراؤ بیگم بنتِ الٰہی بخش خاں معروف کے رشتے سے [2] ضیاء الدین احمد خاں نیّر درخشاں [3] ضیاء الدین احمد خاں نیّر درخشاں

[2] ضیاء الدین احمد خاں نیّر درخشاں

[3] ضیاء الدین احمد خاں نیّر درخشاں

[4] فرخی (فرخ مرزا)

اس سے پہلے کہ اس منظوم قصے پر غور کرکے اس کے مرکزی کردار کو ڈھونڈ نکالنے کی کوشش کی جائے، بہتر معلوم ہوتا ہے کہ فرخی (نواب سرامیرالدین احمد عرف فرخ مرزا) اور غالب کے تعلق پر کچھ روشنی ڈالی جائے۔

فخرالدولہ نواب سرامیرالدین احمد خاں عرف فرخ مرزا (فرخی) کی تاریخ ولادت ۲۶ جنوری ۱۸۶۰ء ہے[1]۔ نواب امین احمد خاں کے پوتے اور نواب علاؤالدین احمد خاں علائی کے بیٹے تھے۔ نواب علائی انھیں ۲۰ جون (۱۸۶۸ء[2]) کو اپنے ساتھ لے کر غالب کے مکان پر حاضر ہوئے۔ غالب ۲۲ جون (۱۸۶۸ء) کے خط بنام امین الدین احمد خاں لکھتے ہیں:

"...... ایک کو دکِ غریب الوطن کے اختلاط کی گرمی کا ذکر کرتا ہوں کہ وہ جانسوز نہیں بلکہ دل افروز ہے۔ پرسوں فرخ مرزا آیا، اس کا باپ (علائی) بھی اس کے ساتھ تھا۔ میں نے اس سے پوچھا کہ کیوں صاحب میں تمہارا کون ہوں اور تم میرے کون ہو؟ ہاتھ جوڑ کر کہنے لگا کہ "حضرت آپ میرے دادا ہیں اور میں آپ کا پوتا ہوں" پھر میں نے پوچھا کہ تمہاری تنخواہ آئی۔ کہا "جناب عالی آسا جان (والد) کی تنخواہ آگئی ہے۔ میری نہیں آئی"۔ میں نے کہا "لوہارو جاتے تو تنخواہ پاتے"۔ کہا۔ "حضرت میں تو آسا جان سے روز کہتا ہوں کہ لوہارو چلو۔ اپنی حکومت کو چھوڑ کر دلی کی رعیت میں کیوں مل گئے" سبحان اللہ بالشت بھر کا لڑکا اور یہ فہم درست اور طبعِ سلیم ہیں۔ اس خوبیِ خُو اور فرخی سیرت پر اُس کو فرخ سیر کہتا ہوں۔......"

نواب امیرالدین احمد خاں (فرخ مرزا) نے خود ایک مرتبہ جناب غلام رسول مہر مرحوم کو بتایا[3] کہ خطوں کے چھپنے کا شہرہ سنا۔ یہ بھی معلوم ہوا کہ خاندان کے سب لوگوں کے نام خط ہیں تو میں نے بھی مرزا صاحب سے عرض کیا کہ دادا، ہمارے نام بھی ایک خط لکھ دو۔ اس موقعے پر میرزا نے فرمایا کہ دادا، تمہارے امین الدین خاں ہیں، میں تو تمہارا دل ہوں۔ یہ فقرہ خط میں بھی لکھ دیا۔

یہ بات اواخر ۱۸۶۸ء کی ہوگی۔

پھر (غالباً انھیں تاریخوں (یعنی دسمبر ۱۸۶۸ء یا جنوری ۱۸۶۹ء) میں علائی کے نام) ایک خط میں غالب لکھا "میں تمہارے باپ (نواب امین الدین احمد خاں) کا تابع، تمہارا مطیع فرخ مرزا کا فرمانبردار[4]

---

[1] انتقال ۱۹ جنوری ۱۹۳۷ء

[2] غالب نے سال نہیں لکھا، لیکن ایسی گفتگو کے لیے جو فرخ مرزا نے غالب سے کی، بچے کا سن زیادہ سے زیادہ ہونا چاہیے۔ ساڑھے آٹھ سال کی عمر میں فرخ مرزا نے غالب سے یہ گفتگو کی۔ دسمبر ۱۸۶۸ء (تقریباً ۹ سال کی عمر میں) اپنے نام کا خط جسے غالب نے کچھ دنوں بعد لکھ کر اردوئے معلی میں شامل کرایا۔

[3] خطوطِ غالب۔ کتاب منزل۔ لاہور۔ بار دوم۔ ص: ۱۱۱ حاشیہ۔

[4] کیونکہ رقعہ (خط) فرخ مرزا کے کہنے (حکم) سے لکھا گیا۔

"........ آج فرخ صاحب کے نام کا رقعہ پہنچ جائے گا[1]........"

رقعہ بنام فرخ مرزا یہ ہے:

"اے مردمِ چشمِ جہاں بینِ غالب! پہلے القاب کے معنی سمجھ لو۔ یعنی چشمِ جہاں بینِ غالب کی تلی، چشمِ جہاں بین تمہارا باپ علاء الدین احمد خاں بہادر اور پتلی تم۔ آج میں نے تمہارا خط دیکھا۔ مجھ کو بہت پسند آیا۔ استادِ کامل نہ ہونے کے باوصف تم نے یہ کمال حاصل کیا۔ آفرین صد آفرین۔ میں اپنے اور تمہارے پروردگار سے کہ وہ رب العالمین ہے، یہ دعا مانگتا ہوں کہ تم کو زیادہ نہیں تو تمہارے باپ کے برابر علم و فضل اور تمہارے پردادا حضرت فخر الدولہ نواب احمد بخش خاں بہادر جنت آرام گاہ کے برابر جاہ و جلال عنایت کرے۔ میاں تمہارے دادا امین احمد خاں بہادر ہیں، میں تمہارا دلدادہ ہوں۔ خبردار! ہر جمعہ کو اپنی صورت مجھے دکھا جایا کرو۔ والدعا......"

قصہ جو نظم ہوا وہ یہ ہے: نواب علائی اپنے بیٹے فرخ مرزا کو کم سنی ہی سے اپنے ساتھ ادبی مجالس میں لے جایا کرتے تھے تاکہ بچے کے علم میں اضافہ ہو ــــــ ایک دفعہ غالب کی صدارت میں ایک محفلِ شعر آراستہ ہوئی جس میں لفظ "بسمل" پر تکرار تھی (کہ اس کا صحیح مفہوم کیا ہے) اچھے اچھے ادیب جمع تھے۔ علائی بھی کم سن فرخ مرزا کے ساتھ موجود تھے۔ جب محفل برخاست ہوئی تو فرخ مرزا نے غالب سے 'بسمل' کے معنی پوچھے۔ غالب نے (مذاق سے) کہا کہ اپنے چھوٹے دادا ضیاء الدین احمد خاں نیر درخشاں کے پاس جاؤ اور ان سے پوچھو۔ علائی نے غالب سے عرض کیا کہ یہ کیا مذاق ہے آپ بچے کو کوئی بھی معنی بتا دیجیے۔ خیر، فرخ مرزا، ضیاء الدین احمد خاں کے پاس گئے۔ انھوں نے کہا کہ عزیزم 'بسمل' کے معنی تو 'زخمی' ہی کے ہوتے ہیں۔ تاہم ایک قصہ سنو۔ کچھ عرصہ ہوا کہ دلی میں تین نہایت حسین بہنیں رہتی تھیں۔ دو بہنوں نے تو سرسری طور پر زندگی گزار دی، مگر تیسری بہن مشہور ہو گئی اور پانچ لوگ اس کے اسیر ہو گئے۔ گویا وہ پانچوں اس کے 'بسمل' ٹھہرے۔ پھر اسے اللہ نے ایک بیٹا دیا۔ مگر اب وہ بیٹا کس کو اپنا باپ کہہ کر پکارے؟ پھر خود ہی فرخ مرزا کے کان میں کہا کہ ایسے بیٹوں کا کوئی باپ ہوتا ہی نہیں۔

جب کا یہ واقعہ ہے فرخ مرزا پانچ چھے سال کی عمر سے زیادہ کے نہ ہوں گے۔ گویا لگ بھگ ۱۸۶۵ء کا سن ہوگا۔ تمام واقعے پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ ضیاء الدین احمد خاں نیر درخشاں نے حقیقت میں داغ پر طنز کیا ہے۔ یہ تین بہنیں، محمد یوسف جس کا آبائی پیشہ سادہ دری (سنار) تھا مگر ڈیرے داری بھی کیا کرتا تھا، کی بیٹیاں تھیں اور غیر معمولی طور پر حسین تھیں۔ پہلی دو نے تو باقاعدہ شادی کر لی اور گھر بسا لیا۔ مگر تیسری وزیر بیگم عرف چھوٹی بیگم، ضیاء الدین احمد خاں کے علاتی بڑے بھائی شمس الدین احمد خاں سے متعلق ہو گئی۔ اسی تعلق سے نواب مرزا

---

[1] یعنی کاتب کو یا مطبع میں پہنچ جائے گا۔

داغ پیدا ہوئے۔ داغ کی ولدیت کو ایک عرصے تک تسلیم نہیں کیا گیا۔ سخن شعرا میں نساخ نے تو سرے سے داغ کے باپ کا نام ہی نہیں لیا۔ اور "ولد چھوٹی بیگم" لکھ دیا۔[1]

چھوٹی بیگم کا انتقال تقریباً ۶۶ سال کی عمر میں اگست ۱۸۷۹ء میں ہوا۔ پانچ "بسمل" یہ ہیں:

(۱)　شمس الدین احمد خاں ۱۸۲۹/۳۰ء تا اکتوبر ۱۸۳۵ء

(۲)　آغا تراب علی ۱۸۴۰ء

(۳)　ایک انگریز فارسٹین بلاک

(۴)　خود نواب ضیاء الدین احمد خاں نیر درخشاں

(۵)　مرزا فخرو ۱۸۴۰/۴۴ء تا ۱۸۵۶ء

۱۸۵۶ء تا ۱۸۷۹ء، والدۂ داغ کا کچھ حال معلوم نہیں۔

---

[1] بعد میں تذکرۃ المعاصرین میں اس کی تلافی کر دی تھی۔

پروفیسر نظیر صدیقی

غالب اور غمِ دوراں

اردو شاعری کی تاریخ میں ۱۹۳۶ء ایک نئے موڑ یعنی TURNING POINT کی حیثیت رکھتا ہے۔ ۱۹۳۶ء سے اردو ادب میں جس ترقی پسند تحریک کی ابتدا ہوئی اس نے اپنی پیش رو تحریک سرسید تحریک کی طرح اردو شعر و ادب کے مزاج و میلان کو بدلنے میں ایک انقلابی کردار ادا کیا۔ اس تحریک کی بدولت اردو شاعری میں جو ایک بنیادی تبدیلی پیدا ہوئی وہ یہ ہے کہ اردو شاعری غمِ جاناں کی بجائے غمِ دوراں کی شاعری بن گئی۔ اس تحریک سے پہلے غم کی طرف اردو شاعری کا رویہ تھا کہ جو غم ہوا اسے غمِ جاناں بنا دیا؛ اس تحریک کے طفیل شاعروں نے یہ محسوس کرنا شروع کیا کہ:
"اور بھی دکھ ہیں زمانے میں محبت کے سوا"۔ یہ طرزِ احساس کی ایک بڑی تبدیلی تھی جو ترقی پسند تحریک کی بدولت عمل میں آئی اور عام ہوئی۔ گو طرزِ احساس کی اس تبدیلی کا ایک مضحکہ خیز نتیجہ یہ بھی دیکھنے میں آیا کہ بہت سے شعرا اور بہت سے افسانہ نگار محبوبہ سے اپنی محبت کو بالائے طاق رکھ کر محاذِ جنگ کی طرف جانے لگے۔ اس میں شک نہیں کہ محاذِ جنگ کوئی تخیلی محاذ نہ تھا۔ دوسری جنگِ عظیم نے بہت سے محاذ کھول دیے تھے۔ ممکن ہے عام لوگ صرف پیسے کمانے اور کیریر بنانے کے لیے محاذِ جنگ پر جا رہے ہوں لیکن شعرا اور افسانہ نگار اپنے قارئین کو یہ تاثر دے کر محاذِ جنگ پر جا رہے تھے کہ وہ غمِ دوراں کو غمِ جاناں پر ترجیح دے رہے ہیں یا یہ کہ ان کے نزدیک غمِ زندگی غمِ محبت سے عظیم تر حقیقت ہے جس کے ایک معنی یہ ہیں کہ غمِ دوراں کی موجودگی میں آدمی غمِ جاناں کو بھول سکتا ہے یا بھول جانے پر مجبور ہو سکتا ہے۔

اس میں شک نہیں کہ اردو شعر و ادب میں اس طرح کے میلانات و رجحانات ترقی پسند تحریک ہی کی بدولت آئے ترقی پسند تحریک اردو ادب کی حالیہ تاریخ سے تعلق رکھتی ہے لیکن جب ہم تاریخی طور پر ان میلانات و رجحانات کا سراغ لگاتے ہیں تو فارسی میں بات شیخ سعدی تک جاتی ہے جنھوں نے یہ کہہ کر حقیقت کا حق ادا کر دیا تھا کہ ؎

چناں قحط افتاد اندر دمشق کہ یاراں فراموش کردند عشق

اور اردو میں ان میلانات و رجحانات کا سلسلۂ نسب غالب تک پہنچتا ہے جنھوں نے اردو میں پہلی مرتبہ اس طرح کے شعر کہے ؎

غمِ زمانہ نے جھاڑی نشاطِ عشق کی مستی　　　وگرنہ ہم بھی اٹھاتے تھے لذّتِ الم آگے

تیری وفا سے کیا ہو تلافی کہ دہر میں　　　تیرے سوا بھی ہم پہ بہت سے ستم ہوئے

اس طرح کے شعر کہنے کے لیے ضروری ہے کہ زندگی کی ٹھوس حقیقتوں پہ شاعر نہ صرف نظر رکھتا ہو بلکہ ان حقیقتوں کو قبول کرنے کی جرأت بھی۔ اس طرح کے شعر رومانی اور تخیلی دنیا میں رہنے والا شاعر کبھی نہیں کہہ سکتا، لیکن کون شاعر ہے جو رومانی اور تخیلی دنیا میں نہیں رہتا؟ غالب کے بیسیوں اشعار ان کے رومانی ہونے کا ثبوت فراہم کرتے ہیں۔ یہ ان کی رومانیت ہی تھی جس نے ان سے کہلوایا تھا کہ ؎

کم جانتے تھے ہم بھی غمِ عشق کو پہ اب　　　دیکھا تو کم ہوئے پہ غمِ روزگار تھا

جب رومانیت غمِ عشق کو DEALIZE کرتی ہے تو اسے کم از کم غمِ روزگار کے برابر ٹھہراتی ہے ورنہ وہ غمِ عشق کو غمِ روزگار سے کئی گنا عظیم تر قرار دیتی ہے، لیکن زندگی میں جب آدمی کو آٹے دال کا بھاؤ معلوم ہوتا ہے تو پتا چلتا ہے کہ غمِ روزگار غمِ عشق سے بڑا غم ہے۔ آدمی کو زندگی کے جو ظلم سہنے پڑتے ہیں ان کی تلافی محبوب کی محبت سے بھی نہیں ہو پاتی غمِ زمانہ آدمی کو عشق کے عیش غم سے دستکش ہونے پر مجبور کر دیتا ہے۔ "جو غم ہوا اسے غمِ جاناں بنا دیا" شعری صداقت ہو تو ہو سماجی صداقت ہرگز نہیں ہے۔ غمِ زمانہ انسانی زندگی کی کتنی بے رحم اور بے درد حقیقت ہے اس کا اندازہ غالب کے اس شعر سے کیا جا سکتا ہے ؎

غمِ زمانہ نے جھاڑی نشاطِ عشق کی مستی　　　وگرنہ ہم بھی اٹھاتے تھے لذّتِ الم آگے

ذاتی طور پر میرا خیال ہے کہ اس شعر میں لفظ جھاڑی کا استعمال غالب کے فنی کمالات میں سے ہے۔

ممکن ہے اس موقع پر بعض لوگ میری توجہ ان اشعار کی طرف دلانا چاہیں جو غالب سے پہلے کے شاعروں نے کہے ہیں اور جن میں غمِ زمانہ اپنی مختلف شکلوں میں موجود ہے۔ مثلاً غمِ زمانہ کی مالی شکل کا عکس ولی کے ایک شعر میں یوں ملتا ہے

؎ مفلسی سب بہار کھوتی ہے　　　مرد کا اعتبار کھوتی ہے

یا نظیر اکبر آبادی کی بیسیوں نظمیں ہیں جن میں غمِ زمانہ کی مالی شکل کے بیسیوں پہلو ملتے ہیں۔ مثلاً ؎

کوڑی کے سب جہان میں نقش و نگین ہیں　　　کوڑی نہ ہو تو کوڑی کے پھر تین تین ہیں

پیسا ہی رنگ و روپ ہے پیسا ہی مال ہے　　　پیسا نہ ہو تو آدمی چرخے کی مال ہے

سب کے دل کو فکر ہے دن رات آٹے دال کا

یا میر کی غزلوں میں غمِ زمانہ کی سیاسی اور تہذیبی شکلیں موجود ہیں۔ مثلاً ؎

جہاں آگے بہاریں ہو گئی ہیں وہیں اب خار داریں ہو گئی ہیں

شہاں کہ کحلِ جواہر تھی خاکِ پا اُن کی انھیں کی آنکھوں میں پھرتی سلائیاں دیکھیں

کیسی کیسی صحبتیں آنکھوں کے آگے سے گئیں دیکھتے ہی دیکھتے کیا ہو گیا یکبار گی

جن بلاؤں کو میر سنتے تھے اُن کو اس روزگار میں دیکھا

ردائے لالہ و گل میں جھلک رہی تھی خزاں بھری بہار میں رو یا کیے بہار کو ہم

غرض کہ غالب سے پہلے کبھی شاید ہی کوئی شاعر ایسا ہو جس کی شاعری میں غمِ زمانہ کے نقوش نہ مل سکیں لیکن غالب
متیاز یہ ہے کہ اردو کے شاعروں میں غالب پہلے شاعر ہیں جنھوں نے غمِ جاناں کے مقابلے میں غمِ دوراں کی برتری کو تسلیم کیا
ا غمِ دوراں کی برتر قوت کو مانا۔ غالب کی شاعری کا یہ رجحان ۱۹۳۶ء کی ترقی پسند تحریک کے ہاتھوں اردو شاعری کی ایک
یت بن گیا۔ چونکہ غالب اپنی قسم کے ترقی پسند ہونے کے باوجود اردو ادب کے موجودہ ترقی پسندوں سے مختلف تھے۔
لیے وہ غمِ جاناں کے مقابلے میں غمِ دوراں کی برتری کو ماننے کے باوجود غمِ جاناں کی اہمیت سے منکر نہ ہوئے۔ دورِ حاضر
ترقی پسندوں کی طرح انھوں نے اپنی محبت کو نہ ملتوی کیا نہ موقوف۔ انھوں نے اپنے سماجی یا سیاسی فرائض کو بہانہ بنا کر
بوب سے چھٹی لی نہ محبت سے۔ انھیں یہ جھوٹ بولنے کی ضرورت کبھی محسوس نہ ہوئی کہ ع

تجھ سے بھی دل فریب ہیں غم روزگار کے

روزگار غمِ عشق سے بڑی قوت یا بڑا دباؤ تو ہو سکتا ہے لیکن وہ غمِ عشق سے زیادہ دل فریب ہرگز نہیں ہو سکتا۔ واقعہ یہ
کہ غمِ روزگار میں دل فریبی کے پہلو دیکھنا خود فریبی کے سوا اور کچھ نہیں۔ اپنے محبوب سے ان کا یہ اعتراف نہایت دیانتدارانہ
مخلصانہ ہے کہ سہ

گو میں رہا رہینِ ستم ہائے روزگار
لیکن ترے خیال سے غافل نہیں رہا

اس اعتراف میں غمِ دوراں کی برتری کے باوجود غمِ جاناں کی دلکشی موجود ہے۔ انسان اگر غمِ دوراں
بچ نہیں سکتا تو وہ غمِ جاناں کے بغیر بھی رہ نہیں سکتا۔ کم از کم غالب کی شاعری ہمیں یہی بتاتی ہے۔

کوائف

نام: مشتاق احمد قلمی نام: انجم اعظمی

والد کا نام: عبدالاحد عثمانی

تعلیم: میٹرک (میاں صاحب جارج اسلامیہ انٹر کالج گورکھپور۔ یوپی) ۱۹۴۶ء ۔ انٹر آرٹس (گورنمنٹ کالج الہ آباد۔ یوپی) (۱۹۴۷ء تا ۱۹۴۸ء)

بی۔ اے و ایم۔ اے۔ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ (۱۹۴۸ء تا ۱۹۵۲ء)

تاریخ و جائے پیدائش: ۲/جنوری ۱۹۳۱ء۔ فتح پور تال رتوئے۔ ضلع اعظم گڑھ (یوپی)

تاریخِ وفات: ۳۱/جنوری ۱۹۹۰ء

مطبوعہ کتابیں

۱۔ لب و رخسار (محبت کی نظمیں) ۱۹۵۱ء

۲۔ لہو کے چراغ (شعری مجموعہ) ۱۹۶۱ء

۳۔ چہرہ (آدم جی انعام یافتہ شعری مجموعہ) ۱۹۷۵ء

۴۔ ادب اور حقیقت (تنقید) ۱۹۷۹ء

۵۔ زیرِ آسماں (شعری مجموعہ) ۱۹۸۰ء

۶۔ اعلیٰ تعلیم (فلسفۂ تعلیم) ۱۹۸۰ء

۷۔ شاعری کی زبان (تنقید) ۱۹۸۸ء

زیرِ طبع

۸۔ ساون آیا ہے (نیا شعری مجموعہ)

۹۔ جدید شعری مطالعے (تنقید)

۱۰۔ جدید افسانوی مطالعے (تنقید)

۱۱۔ اصنافِ ادب (تنقید)

۱۲۔ ادب و فن (تنقید)

پتہ: ۱۶/۱۰۸ فیڈرل بی ایریا۔ کراچی ۳۸

ڈاکٹر اسلم فرخی

گردشِ انجم

بیادِ انجم اعظمی

ارذل العمر کے شدائد میں شاید سب سے زیادہ تکلیف دہ بات یہ ہے کہ انسان کو اپنے دوستوں، ساتھیوں اور عزیزوں پیاروں کا ماتم دار ہونا پڑتا ہے۔ دوستوں کا اٹھ جانا بڑا ستم ہے مگر شاد باید زیستن ناشاد باید زیستن۔ بندِ عمر میں جکڑے ہوئے بندے کر ہی کیا سکتے ہیں۔ کل ڈاکٹر سہیل بخاری کی وفات پر دل مسوس کر رہ گیا تھا۔ آج یارِ عزیز۔ ہمدمِ دیرینہ مشتاق احمد عثمانی انجم اعظمی کے جنازے کو کندھا دینا پڑا۔ جنوری کا یہ مہینہ بھی کیا منحوس ثابت ہوا۔ جاتے جاتے دو ادیبوں کا کام تمام کر گیا۔ تیس کو ڈاکٹر سہیل بخاری رخصت ہوئے۔ اکتیس کی شام کو انجم اعظمی کو منوں مٹی کے نیچے دبا دیا گیا۔ کیسا تکلیف دہ نظارہ تھا۔ برسوں پہلے ایک اور اعظمی کی رحلت پر کہا ہوا اپنا شعر پڑھ کر دل پر پتھر کی سِل رکھ لی ؎

آج اپنے ہی ہاتھوں تجھے مٹی میں دبا آئے
کل تک ترے جینے کی دعا مانگ رہے تھے

فن کی آب و تاب انجم اعظمی
جانِ معنی یاب انجم اعظمی
سوئے فردوسِ بریں رخصت ہوئے
نازشِ احباب انجم اعظمی
لکھا اسلم نے پئے سالِ وفات
گوہرِ نایاب انجم اعظمی
۱۴۱۰ھ

۱۹۴۶ء کے آخر یا ۱۹۴۷ء کے اوائل کی بات ہے، دلی سے شائع ہونے والے رسالے "آج کل" میں ایک نظم نظر سے گزری۔ خوبصورت اور پرکشش نظم تھی۔ شاعر کا نام تھا انجم اعظمی۔ نام ذہن میں محفوظ رہ گیا مگر وقت گزرتا رہا۔ میں ۱۹۵۷ء میں سندھ مسلم کالج میں اردو کا استاد تھا۔ ایک دن ہمارے مرحوم پروفیسر فخرالدین ایک صاحب کو ساتھ لیے آئے۔ چھریرا بدن۔ مسکراتا گول چہرا۔ روشن آنکھیں۔ پتلے پتلے ہونٹ۔ مسکرانے اور ہنسنے میں ہونٹوں میں ایک خاص طرح کا ارتعاش۔ لباس میں بے پروائی۔ چال ڈھال میں ربودگی کا اظہار۔ فخرالدین نے تعارف کرایا۔ انجم اعظمی۔ مجھے وہ نظم یاد آ گئی۔ اس حوالے سے انجم بہت خوش ہوئے۔ بڑی دلچسپ گفتگو رہی۔ انجم تازہ وارد تھے۔ جنوبی ہند کے کسی کالج میں اردو کے استاد تھے۔ وہاں جی نہ لگا تو ادھر آ گئے۔ مگر ان دنوں کراچی میں کالج کم اور پڑھانے والے زیادہ تھے۔ کو

باوجود ہم لوگ انجم کو اپنے کالج میں نہ لے سکے۔ گفتگو کے دوران علم ہوا کہ وہ میرے بہنوئی علیم اعظمی کے عزیز ہیں۔ چنانچہ اس حوالے سے تعلق خاطر اور بڑھا۔

ایک دن ریڈیو اسٹیشن گیا تو معلوم ہوا کہ انجم پروگرام پروڈیوسر ہو گئے ہیں۔ ملازمت مستقل اور عمدہ تھی مگر انجم کو پسند نہ تھی۔ انھیں پڑھانے سے شغف تھا۔ ریڈیو کی ملازمت کے ساتھ ساتھ شام کو ایک مقامی کالج میں بھی پڑھاتے رہے۔ ریڈیو ان کے لیے وقت گزاری کا ایک ذریعہ تھا۔ شاید کراچی سے باہر کہیں تبادلہ بھی ہو گیا تھا مگر وہ جلد ہی واپس آ گئے۔ ۵۷ء میں مرکزی حکومت نے ناظم آباد میں ایک کالج قائم کیا۔ میں سندھ مسلم کالج سے یہاں پہنچا۔ کچھ دن کے بعد انجم بھی یہیں آ گئے اور پھر بعد رے بیس سال ہم دونوں ساتھ رہے۔

گورنمنٹ کالج ناظم آباد ایک نیا ادارہ تھا۔ سارے پڑھانے والے نئے۔ نیا عزم نئے حوصلے۔ سب مثبت قدروں اور اعلیٰ روایتوں کو فروغ دینا چاہتے تھے۔ شعبۂ اردو میں ڈاکٹر عبدالسلام تھے۔ انجم تھے۔ بعد میں شاہد عشقی بھی آ گئے تھے۔ انگریزی میں مسیح الدین صدیقی اور ڈاکٹر محمد احسن تھے۔ بنگالی میں عبدالغفور، تاریخ میں ڈاکٹر رؤف اور اسلامیات میں مولانا عامر احمد عثمانی۔ سیاسیات میں ڈاکٹر مقبول احمد۔ نفسیات میں سعید۔ سائنس میں نسیم اللہ۔ شمشاد۔ ملتانی۔ عبدالباطن کے نام یاد آتے ہیں۔ نئے لوگوں میں عرفان حیدر شمسی۔ محمد سبطین۔ امیر علی شاہ۔ عزت اللہ اور اکبر حسینی تھے۔ ہم سب ایک خاندان کی حیثیت رکھتے تھے۔ آپس میں لڑتے جھگڑتے بھی تھے۔ صلح صفائی بھی ہوتی مگر کسی کے دل میں کوئی کھوٹ نہ تھی۔ بڑا اچھا وقت گزرا۔ انجم ہمارے درمیان نسیم بہار کی حیثیت رکھتے تھے۔ ہنسنا۔ مسکرانا۔ ذرا سی بات پر برہم ہو جانا۔ دوسروں کے دکھ کو اپنا دکھ سمجھنا۔۔۔ ایک زمانے میں ابن صفی کے ناول پڑھنے کا شوق ہو گیا۔ اسٹاف روم میں بیٹھے پڑھتے رہتے اور ہم لوگ سلگتے رہتے کہ اچھے بھلے آدمی کو کیا ہوتا جا رہا ہے۔ کلاس میں کبھی برہم ہوتے تو کہتے۔ میں ادب کا استاد ہوں۔ ادب پڑھا رہا ہوں۔ پڑھاتے بڑی محنت سے تھے اور کوشش کرتے تھے کہ طلبہ میں ادب کا صحیح ذوق پیدا ہو جائے۔ لائق اور باصلاحیت طلبہ کی حوصلہ افزائی کرتے۔ عقیل دانش کو مباحثوں میں حصہ لینے کی ترغیب دی۔ انور مقبول انصاری کو سحر انصاری بنانے میں ان کا حصہ بہت اہم ہے۔ طلبہ کو لکھنے لکھانے کی طرف متوجہ کرتے تھے۔ ان کی تحریروں پر اصلاح دیتے تھے۔ طلبہ بھی ان کی طرف کھنچتے تھے اور انھیں پسند کرتے تھے۔ مگر یہ بھی حالات کی ستم ظریفی ہے کہ ان کی تدریسی زندگی کا بڑا حصہ کامرس کالج میں گزرا جہاں وہ انٹر کے طالب علموں کو لازمی اردو کا نصاب پڑھاتے رہے۔ کچھ دن کے لیے یونیورسٹی میں بھی کلاس پڑھانے لگے تھے مگر ان کی طبیعت میں قناعت تھی۔ ضرورت مند ہونے کے باوجود وہ اس قسم کے کاموں سے دور بھاگتے تھے۔ طبیعت کے لاابالی انداز اور قناعت پسندی نے انھیں ہمیشہ تخم عظمت کی ایک خاص سطح پر رکھا۔ ایک طرف تو یہ بے نیازی تھی دوسری طرف شوق کی یہ فراوانی کہ معمولی سے معمولی شعری نشست ادبی محفل اور مشاعرے میں موجود۔۔ دن دن بھر مارے مارے پھرے۔ راتیں مشاعروں اور شعری نشستوں میں کالی ہوتیں صحت کا ناس لگنا تو لازمی تھا مگر انجم ہیں کہ خوش اور مطمئن غزلیں اور نظمیں لکھ رہے ہیں اور جا بجا سنا رہے ہیں۔ وہ ادب کے بڑے زیرک طالب علم تھے۔ مطالعے کے شوقین۔ عالمی ادب پر گہری نظر۔ فلسفے سے خصوصی شغف۔ اچھے اساتذہ سے تعلیم حاصل کی تھی۔ علی گڑھ کے ہونہار فرزند تھے۔ رشید صاحب کا تذکرہ بڑی عقیدت و محبت سے کرتے تھے۔ رشید صاحب

سے خط و کتابت بھی تھی۔ ایک بار انھوں نے رشید صاحب کا ایک خط مجھے بھی دکھایا تھا۔ بڑا اثر انگیز اور خوبصورت خط تھا۔ انگریزی تنقید اور نقادوں کا مطالعہ بڑی محنت سے کیا تھا۔ جس وقت اظہارِ خیال کرتے تو ان کی لیاقت۔ صلاحیت اور مطالعے کا بخوبی اندازہ ہوتا۔

انجم شعر بھی خوب کہتے۔ نثر بھی عمدہ لکھتے اور تقریر کے بھی ماہر تھے۔ بعض اوقات کسی ادبی جلسے میں ان کی تقریر سن کر غالب کا شعر ؎ دیکھنا تقریر کی لذت کہ جو اس نے کہا میں نے یہ جانا کہ گویا یہ بھی میرے دل میں ہے یاد آجاتا تھا۔ بڑی معنی خیز اور بھرپور تقریر ہوتی تھی۔ برجستہ اور برمحل۔ ایک دفعہ میں نے یوم نذیر احمد کا اہتمام کیا۔ انجم موجود تھے۔ میں نے کہا ایک تقریر تمہاری بھی ہوگی۔ کہنے لگے۔ ضرور ہوگی۔ تقریر ہوئی۔ کوئی تیاری نہیں تھی۔ نام پکارا گیا۔ خاموشی سے اٹھے۔ مائک پر آگئے۔ پھر توبۃ النصوح کے کلیم کے حوالے سے گفتگو چھڑی تو اس عہد کے ANGRY YOUNG MEN تک پہنچی۔ انجم نے بڑی خوبی سے کلیم کو اپنے عہد کا اینگری ینگ مین ثابت کر کے نذیر احمد کی ناول نگاری کو سراہا۔ بڑی دلچسپ اور پہلو دار تقریر تھی۔ بیان خوبصورت۔ انداز علمی۔ ادبی تفہیم کے نئے گوشے۔ انجم اکثر ادبی جلسوں میں اسی طرح تقریریں کرتے۔ میں نے انھیں مضمون پڑھتے نہیں دیکھا۔ بس آئے اور تقریر کر کے جلسہ لوٹ لے گئے۔ تعلیم کے موضوع پر انھوں نے ایک طویل مقالہ لکھا تھا جو کتابی شکل میں شائع بھی ہو چکا ہے۔ اس کا کچھ حصہ تو ضرور اساتذہ کے ایک جلسے میں پڑھا تھا ورنہ وہ نثر لکھنے کے جھمیلوں سے بچتے تھے۔ قوتِ تقریر کے فروغ سے نقصان یہ ہوا کہ ان کی توجہ تحریر کی طرف سے ہٹ گئی اور وہ قلم کے بجائے گفتگو کے مردِ میدان ہو گئے۔

مجھے انجم کی شاعری پر تبصرہ نہیں کرنا۔ صرف یہ کہوں گا کہ وہ بہت اچھے شاعر تھے۔ الفاظ کے پارکھ۔ الفاظ و معنی کے آہنگ کے محرم۔ شعر کہنا ان کے نزدیک عبادت کا درجہ رکھتا تھا۔ جو کچھ کہتے بڑے غور و فکر سے کہتے۔ گورنمنٹ کالج میں روزانہ برجستہ گوئی کے مظاہرے ہوتے رہتے تھے۔ اسٹاف روم میں کوئی صاحب کوئی مصرع تجویز کرتے۔ ذرا دیر میں غزل گوئی شروع ہوتی۔ انجم بے تکلفی کی ان محفلوں میں بھی زود گوئی کا مظاہرہ نہیں کرتے تھے۔ مصرع سوچ کر لیتے اور بے پناہ کہتے۔ مگر وہ اسے ایک ادبی کھیل سے زیادہ اہمیت نہیں دیتے تھے۔ کہتے تھے، اسلم بھائی۔ زود گوئی کا وصل کیا۔ کس کو معلوم کہ یہ شعر باتیں کرتے کرتے کہہ دیا گیا ہے۔ معلوم تو یہ ہوتا ہے کہ شعر کہا کیسا گیا ہے۔ ہم لوگ طبع آزمائی کرتے رہتے اور وہ صرف سامع بن کر ہنستے رہتے۔

انجم ذاتی حیثیت میں سادہ دل۔ کسی حد تک شدت پسند اور بے لوث انسان تھے۔ ذرا سی بات پر برہم ہو جاتے۔ پھر ذرا دیر میں برہمی ختم بھی ہو جاتی۔ گورنمنٹ کالج میں ایک بنگالی ہیڈ کلرک تھا نذر الاسلام بھوند و اور کام سے بے بہرہ۔ ایک دن انجم کو نہ جانے کس بات پر غصہ آگیا۔ دفتر میں اسے برا بھلا کہا۔ نذر الاسلام بہت ناراض ہوا۔ دوڑا دوڑا آیا مجھ سے کہنے لگا۔ مشتاق صاحب نے مجھے برا بھلا کہا ہے۔ میں ان کی رپورٹ کروں گا۔ میں نے کہا۔ ہاں ضرور۔ مگر ابھی ذرا ٹھہر جاؤ۔ اسے ٹھنڈا کر کے دفتر بھیجا۔ اتنے میں انجم آگئے، نہایت برہم۔ بڑی دیر تک نذر الاسلام کو برا بھلا کہتے رہے۔ بولے، اسلم بھائی میں نے یہ مارتے مارتے چھوڑ دیا۔ میں نے کہا۔ بھائی لڑنا ہو تو برابر والے سے لڑو۔ چھوٹوں سے لڑتے میں قوت اور صلاحیت

دونوں ضائع ہوتی ہیں۔ وہ تمہیں جواب تو دے نہیں سکتا۔ جواب دینا تو دیکھتے۔ ایک دم ہنس پڑے۔ کہنے لگے، آپ نے تو ہماری بات ہی بگاڑ دی۔ میں نے کہا، نہیں تمہاری بات بالا۔ غصہ ہو چکا۔ اب چل کر اسے گلے لگا لو۔ ہنستے ہوئے ساتھ ہو لیے۔ ہم دونوں دفتر میں گئے۔ انجم نے نذرالاسلام کو گلے لگا لیا۔ نہ بگڑنے میں دیر نہ بننے میں۔ ایک دن اسٹاف روم میں بہت برہم آئے۔ کہنے لگے، اسلم بھائی۔ آپ نے دیکھا۔ میں نے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ اس شخص کا کتنا کام کیا اور وہ میرا مذاق اڑاتا ہے۔ میں اتنے جوتے لگاؤں گا کہ چاند گنجی ہو جائے گی۔ میں نے پیر سے جوتا اُتارا اور کہا۔ یہ حاضر ہے۔ بڑے زور سے ہنسے۔ کہنے لگے۔ آپ نے تو مجھے زچ ہی کر دیا۔ کیا کروں معاف کر دوں۔ میں نے کہا اور کر بھی کیا سکتے ہو۔ ان کا غصہ دودھ کا سا اُبال تھا۔ بات کیا تھی۔ انجم سب کچھ تھے منافق نہیں تھے جو دل میں وہی زبان پر۔ لگی لپٹی نہیں رکھتے تھے۔ جو کچھ محسوس کرتے برملا کہتے۔ بے جھجک کہتے۔ یہ نہیں سوچتے تھے کہ اس بات سے کیا نقصان ہوگا۔ دل کے صاف اور طبعاً شریف آدمی تھے۔ اپنے حال میں مست۔ نہ کسی سے رشک نہ حسد۔ یہ خواہش بھی نہیں کہ مالی فوائد اور آسودگی حاصل ہو۔ کراچی یونیورسٹی کے ایک انٹرویو میں بشیر احمد ہاشمی نے جو اس زمانے میں شیخ الجامعہ تھے، انجم کو اسسٹنٹ لیکچرر کی پیش کش کی۔ انٹرویو لیکچرر کے لیے تھا۔ ہاشمی صاحب کہنے لگے۔ میں آپ کی گفتگو سے متاثر ہوا۔ آپ یونیورسٹی اسسٹنٹ لیکچرر کی حیثیت سے آجائیے۔ انجم نے بڑے روکھے انداز میں جواب دیا " آپ چاہتے ہیں کہ میں ساری زندگی بھوکا ہی رہوں۔ مجھے آپ کی پیش کش قطعاً قبول نہیں ہے "۔

ایک دن ناظم آباد کی پہلی چورنگی پر ایک بینک میں ملے۔ چہرے پر بڑی ناگواری کے آثار تھے۔ دیکھتے ہی برس پڑے دیکھا اسلم بھائی آپ نے۔ کیا سمجھتا ہے وہ۔ میں بھی کچھ ایسا کمزور نہیں۔ وہ مار ماروں گا، چھٹی کا کھانا یاد آجائے گا۔ بدقسمتی سے گورنمنٹ کالج کے ایک شاگرد استاد کر بھی بینک میں موجود تھے۔ وہ انجم کی برہمی دیکھ کر دوڑے آئے۔ کہنے لگے۔ سر۔ آپ کیوں زحمت کرتے ہیں ہمیں بتائیے ہم ابھی دماغ درست کیے آتے ہیں۔ میں نے ان کو تو رخصت کیا۔ انجم سے یہ کہا۔ نہ وقت دیکھو نہ جگہ۔ جو جی میں آئے بے جھجک کہ دیتے ہو۔ کچھ شرمندہ سے ہوئے۔ کہنے لگے۔ ہاں مجھے برسرِعام یہ بات نہیں کہنا چاہیے تھی۔ مگر کچھ دن کے بعد پھر وہی روش۔ یہ برہمی ان کا مزاج تھی۔

صاف گوئی اور بے جھجک انداز سے انجم کو نقصان بھی اٹھانا پڑے۔ ایک دفعہ کامرس کالج کے ایک پرنسپل ان سے ناراض ہو گئے۔ ایسے بگڑے، ایسے بگڑے کہ انجم کا تبادلہ کروا دیا۔ وہ بھی کراچی کے کسی دوسرے کالج میں نہیں، کالے کوسوں دور گھوٹکی جو سکھر سے بھی پرے ہے۔ انجم نے بھی طے کر لیا کہ کہیں اور نہیں جانا ہے۔ مختلف احباب نے کوشش کی کہ تبادلہ منسوخ ہو جائے لیکن پرنسپل صاحب بہادر نے افسرانِ بالا کے کان بھرنے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی تھی۔ بڑی سخت کشمکش رہی۔ انجم چھٹی پر چھٹی لیتے رہے۔ بڑی تکلیف میں رہے۔ جب ملاقات ہوتی تو پرنسپل اور محکمۂ تعلیم کے افسروں کی شان میں قصیدے پڑھتے مگر مایوسی اور اضمحلال کی بات نہ کرتے۔ کہا کرتے تھے۔ یہ لوگ مجھے زبردستی نہیں بھیج سکتے۔ میرا خیال ہے کہ تقریباً پورا ایک برس اسی کشمکش میں گزر گیا۔ آخرکار فتح انجم ہی کی ہوئی۔ تبادلہ منسوخ ہوا اور کامرس کالج ہی میں جگہ ملی۔ اس دوران ان پر جو کچھ بیتی اس کے بارے میں انجم نے کبھی کچھ نہیں کہا۔ میرا خیال ہے کہ وہ اپنی ذاتی تکلیف کا اظہار نہیں کرتے تھے۔ جو کچھ گزرتی اُسے خاموشی سے برداشت کر لیتے لیکن ظلم اور ناانصافی کے خلاف سینہ سپر رہتے۔ احتجاج کرتے اور حق بات کہنے سے کبھی گریز نہ کرتے۔

انجم کے مزاج میں قلندری تھی۔ لباس سے بے پروا۔ کھانے پینے سے بے پروا۔ دوسروں کی مدد کا جذبہ بہت تھا۔ طالب علموں کے مسائل میں دل چسپی لیتے تھے۔ ان کے کام آتے تھے۔ طالب علموں میں گھل مل جاتے تھے۔ اگر کوئی طالب علم کوئی اچھی چیز لکھتا تو اس کا دل بڑھاتے۔ دوسروں سے تذکرہ کرتے۔ کالج میں چرچا کرتے۔ اشاعت کی کوشش کرتے۔ انھیں اپنی چیزوں کی اشاعت سے زیادہ دوسروں کی چیزوں کی اشاعت کا خیال رہتا تھا۔

معاصرین میں عام طور پر چشمک اور کسی حد تک پیشہ ورانہ رقابت کا احساس ہوتا ہے۔ میری رائے میں انجم اس احساس سے مبرا تھے۔ دوستوں اور ملنے والوں سے ناراض ہوتے تھے مگر کسی چشمک یا رقابت سے نہیں۔ اپنی رائے کا اظہار آزادانہ طور سے کرتے مگر ڈنک مارنے کی عادت نہیں تھی نہ کسی کا برا چاہتے تھے۔ حضرت سلطان المشائخ نظام الدین اولیا محبوب الہیٰؒ کا ارشاد ہے "ایک برائی تو ہے برا کہنا مگر اس سے بھی زیادہ شدید برائی ہے برا چاہنا"۔ انجم غصے میں برا بھلا تو کہہ جاتے تھے مگر کسی کا برا چاہنا ان کے مسلک اور مزاج کے خلاف تھا۔ جن لوگوں سے انھیں تکلیفیں پہنچیں۔ جن لوگوں کے ہاتھوں نقصان اٹھایا، ان کا بھی برا نہ چاہا۔ حفظِ مراتب کے کسی حد تک قائل تھے۔ زیادہ تکلف نہیں کرتے تھے۔ رشتوں اور تعلقات میں احترام کو مدِنظر رکھتے تھے۔ انھوں نے مجھے ہمیشہ اسلم بھائی کہا۔ میں انھیں مشتاق کہتا تھا۔ شاید ان کے دوستوں اور معاصرین میں انھیں مشتاق کہنے والا واحد آدمی میں ہی تھا۔

پچھلے کئی برس سے انجم میں آہستہ آہستہ ایک تبدیلی آرہی تھی۔ مذہب کی طرف ان کا رجحان بڑھتا جارہا تھا۔ یہ ایک خوش آیند تبدیلی تھی۔ ایک عہد تھا کہ انجم مذہب کے نام سے کانوں پر ہاتھ رکھتے تھے۔ اسٹاف روم میں بیٹھے ہلتے رہتے۔ مولانا عامر احمد عثمانی سے بحث کرتے رہتے۔ یا یہ کیفیت ہوئی کہ نماز کے پابند ہو گئے۔ نماز باجماعت ادا کرتے تھے۔ ایک دفعہ میں ان کے یہاں گیا۔ مغرب کا وقت تھا۔ معلوم ہوا مسجد گئے ہیں۔ میں بھی وہاں چلا گیا۔ ان کے ساتھ ہی نماز ادا کی پھر ہم دونوں بڑی دیر تک وہیں مسجد کے صحن میں بیٹھے رہے۔ تصوّف کا مطالعہ بھی شروع کر دیا تھا۔ ان کا یہ رنگ بھی خوب تھا۔ ان کی سرشت کے مطابق گہرا لیکن صوفیانہ۔

انجم ادب و شعر کی محفلوں میں گم صحت کی طرف سے بالکل بے نیاز تھے۔ معمولاتِ زندگی میں قاعدے اور ترتیب کے قائل نہیں تھے (جو قائل ہیں انھوں نے کون سا تیر مار لیا) موم بتی کو دونوں سروں سے جلانے کا نتیجہ یہ نکلا کہ صحت برباد ہوگئی۔ بیمار رہنے لگے مگر اس حال میں بھی جلسے جلوسوں کی شرکت میں کوئی کمی نہیں آئی۔ انجمن نے جتنے جلسے کیے انجم سب میں شریک ہوئے۔ وہ ادبی جلسوں میں شرکت کو جزو ادب سمجھتے تھے۔ شام افسانہ ہو یا نوجوانوں کی ادبی نشست انجم ہر جگہ موجود ہوتے تھے اور کارروائی میں بڑی خوش دلی سے حصہ لیتے تھے۔ بڑی صائب رائے دیتے۔ کھری کھری کہتے اور اظہارِ خیال میں کسی کی رعایت نہ کرتے۔ بیماری کے باوجود اپنے آپ کو سنبھالے رہتے۔ کوشش کرتے کہ بیماری کسی پر ظاہر نہ ہو۔ آرٹس کونسل کے الیکشن میں نظر پڑے۔ نحیف و نزار آخری ملاقات ڈاکٹر فہیم اعظمی کے یہاں ۲۵ دسمبر کو ہوئی۔ ہندوستانی افسانہ نگار جناب جوگندر پال کے اعزاز میں شامِ افسانہ تھی۔ میں قدرے تاخیر سے پہنچا۔ انجم ایک گوشے میں چادر اوڑھے بیٹھے تھے۔ محسوس یہ ہوا کہ غنودگی طاری ہے۔ میں ان کے پاس ہی بیٹھ گیا۔ نشست ختم ہوئی تو میں نے پوچھا کیا حال ہے۔ کہنے لگے طبیعت کچھ ٹھیک نہیں ہے۔ لوگ باتوں

ہیں محو تھے۔ وہ بغیر کھانا کھائے چپ چاپ چلے گئے۔ اسی طرح وہ ۳۱ جنوری کو بھی چلے گئے، نامعلوم منزل کی طرف۔ کچھ دن پہلے ہسپتال میں داخل ہوئے تھے۔ بڑی تکلیف میں تھے۔ دونوں گردوں نے کام چھوڑ دیا تھا۔ فالج کا اثر تھا۔ دماغ بھی متاثر تھا۔ شروع میں تو بالکل چپ تھے پھر کچھ بہتر ہو گئے تھے۔ آنے جانے والوں کو دیکھتے۔ بول تو نہیں سکتے تھے۔ گوشۂ چشم سے اشارہ کرتے۔ یہ ایک انتہائی برجستہ گو اور خوش گفتار انسان کا المیہ تھا۔ وہ خوش گفتار اور نغز گو شاعر جس نے سادگی، زندگی، حسن، محبت، آزادی اور حریت کے گیت گائے تھے۔ بستر پہ سوالیہ نشان بنا پڑا تھا۔ مجبور۔ بے بس۔ بے زبان۔ مجھے خیال آتا ہے کہ شاید آج کا ادب اور قومی زندگی بھی بے زبان اور مفلوج انجم اعظمی کی طرح ایک سوالیہ نشان بن کر رہ گئی ہے۔

ڈاکٹر کلثوم ابوالبشر
شعبۂ اردو و فارسی، ڈھاکا یونیورسٹی، بنگلہ دیش

بنگلہ دیش کے چند اہم اردو جرائد

ہم جانتے ہیں کہ ہندوستان کے دیگر صوبوں کی طرح بنگلہ دیش نے اردو ادب کی ترقی میں نمایاں کردار ادا کیا ہے۔ اس کی مثال وہ مایہ ناز شعرا و ادبا ہیں جنھوں نے اس سرزمین کو اپنا مستقر بنایا اور یہاں کی پرکیف و سحر انگیز ہواؤں میں مدہوش ہوکر اردو ادب کے گلستان کو رنگا رنگ پھولوں سے بھر دیا جن کی بھینی بھینی خوشبو اور مہک آج بھی دماغ کو تر و تازہ اور عطر آگیں کرتی ہے۔ شعرا و ادبا کے اس جمگھٹے میں مرزا خان طپش، حافظ اکرام احمد ضیغم، عبدالغفور نساخ، آغا احمد علی اصفہانی، سید محمود آزاد، سید محمد آزاد، عبدالرحیم صبا اور شفاء الملک حکیم حبیب الرحمٰن درخشندہ ستارے کی حیثیت رکھتے ہیں۔ جن کی ضیا پاش کرنیں اردو ادب کے رواں دواں کارواں کی رہنمائی کرتی رہیں۔ ان سبھوں نے اردو ادب کی بے پناہ خدمات انجام دیں۔ انھیں کی بدولت اور ان کی کاوشوں کے سبب بنگلہ دیش میں اردو کو ثقافتی زبان کے لحاظ سے ثانوی حیثیت حاصل ہوئی، مگر سب سے بڑا کارنامہ شفاء الملک حکیم حبیب الرحمٰن (م ۱۹۴۷ء) کا ہے جنھوں نے اپنی اولوالعزمی اور پختہ ارادوں کو عملی جامہ پہنایا اور انتھک سعی و کوشش سے اکتوبر ۱۹۰۶ء میں ڈھاکہ کی سرزمین سے اردو صحافت کی تاریخ کا نیا باب "المشرق" جریدہ[1] کے نام سے شروع کیا۔ "المشرق" کے اجرا سے حکیم صاحب بنگلہ دیش کے مسلمانوں میں سیاسی اور مذہبی بیداری کی لہر پیدا کرنا چاہتے تھے۔

۱۹۰۵ء میں لارڈ کرزن نے انتظامی سہولت کو مدنظر رکھتے ہوئے صوبہ بنگال کو دو حصّوں میں تقسیم کیا تھا۔ مغربی بنگال کا پایۂ تخت کلکتہ کو قرار دیا گیا اور ڈھاکا کو مشرقی بنگال (بنگلہ دیش) کا دارالسلطنت بننے کا شرف حاصل ہوا۔ بنگلہ دیش کے مسلم سیاسی رہنماؤں نے اس تقسیم کو بخوشی قبول کیا، کیونکہ اس تقسیم سے مسلمانوں کی ترقی کی راہیں کھلنے کا زیادہ امکان تھا۔ برعکس اس کے مغربی بنگال کے ہندو سیاسی رہنماؤں نے اپنے مفاد کی خاطر اس تقسیم کی مخالفت شروع کر دی۔ اس وقت مسلمانوں میں سیاسی شعور اور بیداری پیدا کرنے کے لیے اس صوبہ

---

[1] "المشرق" جریدہ پر میرا تحقیقی مقالہ ماہنامہ "روشن ادب" مطبوعہ دہلی دسمبر ۱۹۸۲ء میں ملاحظہ فرمائیے۔

سے کسی اخبار کا اجرا از حد ضروری تھا جو ان کا نقیب بن سکے اور دشمنوں کی مخالفت کا بھی منہ توڑ جواب دے ۔۔
بنگلہ دیش کی کثیر آبادی بنگالی ہونے کے باوجود اردو زبان آسانی سے سمجھ سکتی تھی۔ اُمرا و شرفا اکثر اسی زبان میں ہی گفتگو کرتے تھے اس لیے حکیم صاحب بڑی جانفشانی کے ساتھ ۱۹۰۷ء میں "المشرق" کے مقاصد کو بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

"بنگال و آسام میں مسلمانوں کی قومی زبان اور انڈیا کی لنگوآفرینکا (اردو) کی توسیع و اشاعت کے ساتھ ساتھ مسلمانوں کی دینی و دنیوی فلاح کی تدبیر بتانا اور رعایا گورنمنٹ کے تعلقات میں غلط فہمیوں کے انسداد کی کوشش کرنا اور ہندوستانی برادرانِ مذہب سے بلحاظ خیالات کے ذریعہ رابطۂ اتحاد اور تعلقاتِ اخوت کو مضبوطی سے قائم کرنا جو بلا اردو کے ناممکن ہے۔ اس کے خاص مقاصد ہیں"[۲]

اردو زبان میں بنگلہ دیش سے شائع ہونے والا یہ پہلا ماہوار رسالہ تھا۔ بعد میں یہ ہفتہ وار شائع ہونے لگا۔ ڈھاکہ یونیورسٹی کے کتب خانے میں اس جریدہ کی تین چار کاپیاں محفوظ ہیں۔ خدا بخش لائبریری کے کتب خانے میں بھی ایک کاپی بابت مئی ۱۹۰۷ء کی موجود ہے۔ جہاں تک میرا خیال ہے اس جریدہ کی دیگر کاپیاں نایاب ہیں۔
بنگلہ دیش کے ایک نامور ادیب مرحوم وحید قیصر ندوی نے اپنے ایک مضمون میں دعویٰ کیا کہ ان کے پاس اس جریدہ کی ایک سال کی پوری فائل موجود ہے، مگر افسوس اب وہ تمام کاپیاں ان کے کسی جانشین یا وارث کے پاس ہیں اس کا علم نہیں۔ اس کی تقطیع ۲۰ × ۸ ہے۔ پہلے یہ کلکتہ کے رضوانی پریس میں چھپ کر دارالاشاعت احسن المطابع ڈھاکہ سے شائع ہوتا تھا۔ مگر بعد میں ڈھاکہ ہی سے مطبوعہ سلیمی چھوٹا کٹرہ سے شائع ہونے لگا۔ تقریباً دو سال بعد یہ اخبار بند ہو گیا۔ "المشرق" کی قیمت عام لوگوں کے لیے سالانہ دو روپے تھی مگر رؤسا اور گورنمنٹ کے لیے پانچ روپے سالانہ چندہ تھا۔ ہفتہ وار ہونے کے بعد عام لوگوں سے تین روپے اور والیانِ ملک اور گورنمنٹ کے لیے (مع محصول) بارہ روپے چندہ ہو گیا۔
اس جریدہ کے زیادہ تر مضامین ایڈیٹر (حکیم صاحب) کے زورِ قلم کا نتیجہ تھے جو ان کی وسیع الدماغی اور ذہنیت کی نشاندہی کرتے ہیں۔ "المشرق" کے دوسرے قلمی شعرا و ادبا میں مسٹر ابو الفیض عبدالعلی ایم اے، سید محمود آزاد، سید شرف الدین جہانگیر نگری، احقر سرور کلکتہ، حضرت شاہ محمد اکبر، مولوی نجم الدین اور خواجہ ممتاز جہانگیر نگری وغیرہ قابلِ ذکر ہیں۔
یہ رسالہ اسلامی، علمی، سیاسی، ادبی، اخلاقی اور تاریخی مضامین کے علاوہ دلچسپ اور اہم خبروں سے بھرپور تھا۔ سیاست سے قطع نظر مذہبی و اخلاقی نقطۂ نظر سے بھی "المشرق" کا پایہ بلند ہے۔ "ہماری موجودہ حالت" مضمون میں ابو الفیض عبدالعلی صاحب ایم اے نے مسلمانوں کی سماجی و اخلاقی برائیوں کو اُجاگر کرتے ہوئے

۲۔ "المشرق" مطبوعہ ڈھاکہ۔ اکتوبر ۱۹۰۷ء آخری صفحہ۔

اس بات کی وضاحت کی کہ مسلمان کس طرح دوبارہ اپنی شان وشوکت اور عروج کو حاصل کر سکتے ہیں۔ قوم کی اصلاح کس طرح ممکن ہے۔ انھوں نے لڑکیوں کی تعلیم کی پُر زور حمایت کی اور قوم کی بدحالی کا پوری طرح نقشہ کھینچا۔ ادبی لحاظ سے اس رسالہ کے تمام مضامین معیاری اور بلند پایہ تھے۔

بنگلہ دیش کی صحافت کا دوسرا درخشندہ ستارہ "جادو" کے نام سے چمکا۔ اس کے مدیر بھی حکیم حبیب الرحمٰن ہی تھے۔ جنوری ۱۹۲۳ء میں خواجہ عادل کی معاونت سے انھوں نے اس ماہنامہ کو جاری کیا۔ اس جریدہ کے سرورق پر اکثر خواجہ عادل کا ہی نام بحیثیت مدیر لکھا جاتا تھا۔ مگر کسی پرچہ میں حکیم صاحب اور خواجہ عادل دونوں ہی نام موجود ہیں۔

اس زمانے میں ڈھاکا سے اردو اخبار کا نکلنا کوئی معمولی بات نہیں تھی۔ اس رسالہ کی کچھ فائلیں ڈھاکا یونیورسٹی میں موجود ہیں جن کے مطالعہ سے ڈھاکا میں اردو زبان کی ترقی کا جائزہ لیا جاسکتا ہے۔ اس رسالہ[۵۳] کے لکھنے والوں میں علامہ رضا علی وحشت، مولوی عبدالوہاب، نصیر حسین خیال، مولانا مظفرالدین ندوی، خواجہ شہاب الدین، خالد بنگالی، خواجہ بے دار بخت، حافظ نذیر احمد اور حکیم حبیب الرحمٰن سر فہرست ہیں۔

بقول اقبال عظیم:

"یہ رسالہ ۱۹۲۱ء میں جاری ہوا اور تقریباً ۴ ۱/۲ برس تک جاری رہا۔"[۵۴] جو صحیح نہیں ہے اس رسالہ کا اجرا جنوری ۱۹۲۳ء کو ہوا۔

معتبر ذرائع[۵۵] سے پتا چلتا ہے کہ یہ ماہنامہ ۱۹۳۰ء تک جاری رہا۔ اس زمانے میں یہ مقبول عام پرچہ تھا۔ ادبی اور تعلیمی مضامین اس رسالے کی عام خوبیاں تھیں۔ اس رسالے میں "رام پور کا کتب خانہ" اور "شعرائے ڈھاکا" معرکتہ الآرا مضامین قسط وار شائع ہوا کرتے تھے جن کی ادبی اہمیت سے کسی کو انکار نہیں۔ علامہ وحشت کلکتوی نے "مشتری کا خط مولوی عبدالغفور خان بہادر نساخ کے نام" اس رسالے میں شائع کر کے عبدالغفور نساخ کی زندگی کے نئی اہم پہلوؤں پر روشنی ڈالی ہے۔ غرض ادبی تعلیمی اور ثقافتی نقطۂ نظر سے "جادو" رسالے کو اب نوادرات میں شامل کیا جاسکتا ہے۔

مشرقی بنگال سے شائع ہونے والا تیسرا معیاری جریدہ "اختر" ہے۔ اس رسالے کو خالد بنگالی نے میمن سنگھ کے موضع بولائی سے شائع کیا۔ خالد بنگالی کا اصل نام محمود الرب صدیقی تھا۔ ان کے والد مولانا عبدالحئی اختر ایک بلند پایہ عالم تھے۔ انھوں نے اپنی زندگی میں عربی اور فارسی کو خوب فروغ دیا اور تقریباً پچیس کتابیں لکھی تھیں۔ بچپن سے ہی خالد بنگالی نے ایک ادبی اور علمی ماحول میں پرورش پائی۔ یہ رسالہ انھوں نے اپنے والد مرحوم کی یاد میں نکالا۔ بدقسمتی سے اس کا صرف ایک ہی شمارہ نکل سکا۔ کیوں کہ اس زمانے میں مشرقی بنگال کے کسی دور افتادہ مقام سے اردو کا رسالہ نکالنا کوئی معمولی بات

---

[۵۳] "جادو" مارچ ۱۹۲۶ء، [۵۴] "مشرقی بنگال میں اردو" ڈھاکا ۱۹۵۴ء ص: ۱۴، [۵۵] حکیم صاحب کے بیٹوں کے ذریعے معلوم ہوا

نہ تھی۔ چنانچہ اس رسالے کو سراہتے ہوئے اداریہ میں لکھتے ہیں:

"آج جب کہ برسوں کی آرزوؤں کے بعد "اختر" شائع ہونے لگا ہے۔ گو میں اپنے ذوق اور اپنے جذبات کو ناقابلِ بیان کیف و سرور سے ہم آغوش پاتا ہوں۔ تاہم یہ فکر بھی دامن گیر ہے کہ دیکھیے اہلِ وطن میری اس خدمت کو لائقِ قبول بھی سمجھتے ہیں یا نہیں۔ "اختر" اردو رسالہ ہے اور مجھے اس سے انکار نہیں کہ اس کی اشاعت ایک ایسے مقام سے ہو رہی ہے۔ جہاں اس رسالے کی زبان (یعنی اردو) بعض بعض حلقوں میں صرف سمجھی جاتی ہے اس لیے "اختر" کے مستقبل کی نسبت کوئی ایسی پیش گوئی جو موافق اور خوشگوار ہو، نہیں کی جا سکتی ہے"[۱]

غالباً خالد بنگالی اس حقیقت سے واقف تھے کہ "اختر" کی زندگی بہت کم ہوگی اس کے باوجود ان کا ذاتی شوق و ذوق اور اردو سے بے پناہ محبت "اختر" کی اشاعت کا باعث بنی۔ اگرچہ اس کا صرف ایک ہی پرچہ نکلا، لیکن اسے اردو کے معیاری اور ادبی پرچوں میں شمار کیا جا سکتا ہے۔ اس کے لکھنے والوں میں نیاز فتح پوری، وحشت کلکتوی، دل گیر اکبر الہ آبادی، عزیز لکھنوی واقف بہاری، مائل الہ آبادی اور بسمل بریلوی قابلِ ذکر ہیں۔

یہ رسالہ کتابی سائز کا ہے اور ۶۴ صفحات پر مشتمل ہے۔ کاغذ عمدہ اور کتابت نہایت صاف ستھری ہے۔ خالد بنگالی بنگلہ دیش میں اردو کی ترویج و اشاعت کے لیے دل سے خواہاں تھے، کیونکہ وہ اس بات سے بخوبی واقف تھے کہ یہاں کے اکثر مسلمان گھرانے جن کی مادری زبان بنگالی ہے، ان لوگوں کی نسلیں ہیں جو عربی، فارسی، یا اردو بولنے والے تھے۔ اس کے علاوہ اردو زبان کی ہمہ گیری اور مقبولیت ان کے نزدیک تاریخ السنہ عالم کا ایک زرّیں واقعہ اور نہایت درخشندہ کارنامہ ہے، بنگلہ دیش میں اس کا افسوسناک "فقدانِ ذوق" انھیں عرصہ سے کھٹک رہا تھا۔ انھیں وجوہات کو مدِّنظر رکھتے ہوئے انھوں نے اپنے آبائی وطن سے "اختر" کا اجرا کیا۔ جہاں اردو زبان کا بولنا تو درکنار سمجھنا بھی مشکل تھا۔ اس کے باوجود بلند حوصلگی، پختہ عزم اور نہایت ذمّے داری کے ساتھ "اختر" کا اجرا کرنا ان کا گراں قدر کارنامہ ہے۔

وہ اردو کو صرف بنگال کی زبان نہیں بلکہ دنیا کے تمام مسلمانوں کی مشترکہ زبان سمجھتے تھے۔ چنانچہ جذباتی رَو میں لکھتے ہیں:

"اور یہ کھلی ہوئی حقیقت ہے کہ ایشیا کی کوئی قوم مسلمانوں کے اس پندار کی حریف نہیں ہو سکتی کہ "اردو" اسلامی زبان ہے اور اس کے موجد مسلمان ہیں"[۲]

غرض "اختر" کے ایک شمارہ کو ہی بنگلہ دیش کی سرزمین میں اردو صحافت کا ایک سنہری باب کہا جا سکتا ہے۔ اس طرح ہم دیکھتے ہیں کہ ۱۹۴۷ء تک بنگلہ دیش کی صحافت کی نمائندگی یہی تین رسالے کر رہے تھے

اردو صحافت کی تاریخ میں ان جریدوں کی ادبی اہمیت چاہے کتنی ہی کم ہو، یہی بڑے فخر کی بات ہے کہ بنگلہ دیش

---

[۱] "اختر" مدیر خالد بنگالی۔ مطبوعہ جولائی میمن سنگھ۔ ص ۶۔ [۲] ایضاً۔ ص ۵

یہاں کی کثیر آبادی (عوام) بنگلا زبان میں گفتگو کرتی ہے وہاں بیسویں صدی کے اوائل میں اردو کے تین جریدے شائع ہو چکے تھے۔ الذکر دو جریدوں کے اجرا کے وقت ڈاکٹر شادانی بنگلا دیش تشریف نہیں لائے تھے۔ ڈاکٹر عندلیب شادانی قادر الکلام شاعر متنوع اصنافِ سخن پر حاوی ہونے کے ساتھ ساتھ بحیثیت مدیر نمایاں شخصیت کے مالک تھے۔ حالانکہ اس میدان میں محدود ائع، مالی مشکلات اور طباعت کی پریشانیوں کے باعث پورے نہ اتر سکے۔ اس کے باوجود ۱۹۴۷ء میں قیامِ پاکستان کے بعد مشرقی ستان کی زرخیز اور پُر آب زمین میں اردو صحافت کا بیج انہیں کی کرم فرمائی کا نتیجہ تھا۔

جیسا کہ کہا جا چکا ہے کہ بیسویں صدی کے آغاز میں کلکتہ اور ہندوستان کے دیگر صوبوں میں مختلف علمی اور ادبی اخبار رسائل اردو صحافت کی آبیاری میں تندہی سے مشغول تھے۔ مگر مشرقی پاکستان میں بقول وحید قیصر ندوی:

"تقسیم کے بعد ڈھاکا یا مشرقی پاکستان کے کسی دوسرے شہر سے کسی بھی زبان کے کسی اخبار یا رسالہ کا دور دور تک پتہ نہیں تھا۔ یہ فخر تو صرف اردو ہی کو حاصل ہے کہ یہاں سے ۱۹۴۸ء میں سب سے پہلے اردو کا سہ روزہ اخبار "مشرقی پاکستان" جاری ہوا۔ اس وقت تک بنگلا اور انگریزی وغیرہ کے تمام اخبارات یا تو کلکتہ سے نکل رہے تھے یا کلکتہ سے منتقل ہونے کی فکر میں تھے۔"*

قیامِ پاکستان کے بعد مشرقی پاکستان سے نکلنے والا پہلا سہ روزہ اخبار "مشرقی پاکستان" تھا جو ڈاکٹر عندلیب شادانی نگرانی میں نکلا۔ چونکہ اس اخبار کی کوئی کاپی میری نظر سے نہیں گزری اور نہ ہی اس کی دستیابی کی امید ہے۔ اس لیے مرحوم وحید ر ندوی اور ڈاکٹر عندلیب شادانی نے اس اخبار کے متعلق جو معلومات فراہم کی ہیں اسے ہی پیش کرنے میں اکتفا کرنا ضروری تھی ہوں۔ بقول وحید قیصر ندوی:

"مشرقی پاکستان" کے نکالنے میں جناب ڈاکٹر عندلیب شادانی، جناب مولانا ظفر احمد عثمانی، اور نہال احمد سہسرامی کا خاصا ہاتھ ہے۔ مولانا عثمانی، ڈاکٹر شادانی اور نہال احمد سہسرامی کے مشترکہ سرمایہ سے یہ اخبار جاری ہوا۔ ڈاکٹر عندلیب شادانی کو اس اخبار کا نگراں مقرر کیا گیا اور مولانا ظفر عثمانی صدر جمعیت علمائے پاکستان کے صاحبزادے قمر احمد عثمانی کو اس اخبار کا پہلا چیف ایڈیٹر مقرر کیا گیا۔ کچھ دنوں بعد راقم الحروف کو بھی اس اخبار کی ادارت میں شامل کر لیا گیا۔ جناب قمر عثمانی اور میں نے اس اخبار کو چلانا شروع کیا۔ انتظامی امور اور طباعت وغیرہ کے انتظامات کی ذمہ داری نہال احمد سہسرامی پر تھی جو اس کام میں بڑی دلچسپی لے رہے تھے۔

یہ اخبار عزیز آرٹ پریس میں چھپتا تھا جس کے مالک ایس کے عزیز صاحب تھے جنھوں نے بعد میں یہاں کا سب سے پہلا روزنامہ "پاسبان" نکالا۔ اخبار "مشرقی پاکستان" کا دفتر حکیم حبیب الرحمن روڈ پر حکیم صاحب مرحوم کے ہی مکان میں تھا۔ اس اخبار نے بڑی تیزی سے

* ماہنامہ "نقوش" کراچی۔ مارچ ۱۹۶۳ء ص ۲۷۶

ترقی کی۔ چونکہ یہ مشرقی پاکستان کا پہلا اخبار تھا اس لیے حکومت نے بھی اشتہارات وغیرہ سے کافی مدد کی۔ ان دنوں خواجہ ناظم الدین صاحب یہاں کے وزیرِ اعلیٰ تھے۔ اس اخبار کے مزاحیہ کالم میں کئی بار ان کے بارے میں بڑے دل چسپ انداز میں تبصرے کیے گئے۔[۹]

ڈاکٹر عندلیب شادانی اس اخبار کی اہمیت کو واضح کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ:

"اردو کا سب سے پہلا اخبار "مشرقی پاکستان" مارچ ۱۹۴۸ء میں ڈھاکا سے نکلنا شروع ہوا۔ میں اس کا ڈائرکٹر تھا اور قمر عثمانی ایڈیٹر۔ ہفتہ میں دو بار شائع ہوتا تھا۔ چونکہ یہ اخبار عوام الناس کے جذبات و خیالات کا ترجمان تھا اور اربابِ حکومت کی کوتاہیوں پر بے باکی سے تنقید کرتا تھا اس لیے نہ صرف ڈھاکا میں بلکہ پورے مشرقی پاکستان میں بہت جلد مقبول اور ہر دل عزیز ہو گیا۔ اخباری کاغذ ان دنوں کافی مہنگا تھا۔ پھر بھی جس طرح ممکن ہوا سال بھر تک اخبار کو جاری رکھا۔ جب کاغذ نایاب ہو گیا تو چار و ناچار اسے بند کرنا پڑا۔"[۱۰]

"مشرقی پاکستان" کے بند ہو جانے سے ڈاکٹر شادانی کو بے حد صدمہ ہوا۔ وہ اس کی تلافی کرنا چاہتے تھے۔ اس لیے ۵۲ء میں ڈھاکہ سے ایک دوسرا ادبی و معیاری ماہنامہ "خاور" نکالا۔ مشرقی پاکستان کے رسائل میں "خاور" اپنی گوناگوں خصوصیات کے لیے یہاں کے ادبی اور صحافتی حلقوں میں ایک ان مٹ نشان چھوڑ گیا۔ مشرقی پاکستان سے اس قدر بلند پایہ ادبی رسالہ نکالنا ڈاکٹر شادانی کی شخصیت پر ہی منحصر تھا۔ "خاور" کے اجرا کے بارے میں وہ فرماتے ہیں:

"۱۹۵۱ء میں چند احباب کی کوششوں سے "خاور کوآپریٹیو سوسائٹی" قائم ہوئی اور اپریل ۱۹۵۲ء میں سوسائٹی کی طرف سے "خاور" کا اجرا عمل میں آیا۔ ادارت کے فرائض میرے سپرد کیے گئے۔"[۱۱]

اس رسالے کو جاری رکھنے کے لیے ڈاکٹر عندلیب شادانی نے انتھک کوششیں کیں۔ رسالہ "خاور" کوآپریٹیو کے زیرِ اہتمام ڈھاکا کے ینگ پریس سے شائع ہوتا تھا۔ ڈھاکا یونیورسٹی کے کتب خانے میں ارشد کاکوی کلکشن میں اس کی پوری فائل موجود ہے۔ اس کے پہلے شمارے میں مدیر (ڈاکٹر شادانی) نے اس بات کی وضاحت کر دی ہے کہ اس رسالہ کے اجرا کا بنیادی مقصد تجارت نہیں ہے جو عام طور پر دیگر رسائل کا نصب العین ہوتا ہے، بلکہ اس رسائل کا بنیادی مقصد ہے:

"مملکتِ پاکستان کے مشرقی اور مغربی حصوں کے درمیان ہزاروں میل کا فاصلہ ہونے کی بنا پر دونوں خطوں کے باشندوں میں جو ایک قسم کی مغایرت اور بے گانگی پائی جاتی ہے اور جو بدقسمتی سے آہستہ آہستہ بڑھتی ہی جارہی ہے اسے اپنائیت اور یگانگی میں تبدیل کرنے کی خواہش "خاور" کے اجرا کا باعث ہوئی ہے۔ پاکستان کے دونوں بازو اس بعد المشرقین کے باوجود اگر آپس میں مل سکتے ہیں تو اس کی صرف ایک ہی صورت ہے کہ طرفین کو ذہنی طور پر زیادہ سے زیادہ

۹؎ "تقسیم کے بعد کی اردو صحافت" از وحید قیصر ندوی۔ "نقوش" کراچی۔ مارچ ۱۹۶۳ء ص ۲۷۶

۱۰؎ ماہنامہ، ادبِ لطیف "ڈھاکا" از ڈاکٹر عندلیب شادانی، لاہور دسمبر ۱۹۵۵ء ص ۱۴۳۔ ۱۱؎ ماہنامہ "خاور"

ایک دوسرے کے قریب لایا جائے۔ ایک دوسرے کے حالات اور خیالات سے ناواقفیت باہمی غربت کا سب سے بڑا سبب ہے۔ اگر یہ مٹ جائے تو یقین کیجیے کہ مشرقی اور مغربی پاکستان ایک چہرے کی دو آنکھیں ہوں گی جن کا نقطۂ نظر لازمی طور پر ایک ہوتا ہے۔ اپنی بساط بھر "خاور" کی کوشش یہ ہوگی کہ مشرقی پاکستان کے دامن میں ادب، تاریخ اور کلچر کا جو قیمتی سرمایہ موجود ہے مشرقی پاکستان کو اس سے روشناس کرائے اور مغربی پاکستان کی ہر قابلِ قدر اور لائقِ فخر چیز کو مشرقی پاکستان کے سامنے لائے۔ تاکہ طرفین میں یہ احساس پیدا ہو جائے کہ اِس طرف اور اُس طرف خدا کی جتنی نعمتیں موجود ہیں وہ کل کی کل ہم سب کی ہیں۔ ہمارا یہ ذہنی قرب اور اتحاد نہ صرف ہمارے کلچر کی ترقی بلکہ خود ہماری ریاست کے استحکام کا بھی سبب بن سکتی ہے۔"[۱۲]

یہاں یہ بات قابلِ ذکر ہے کہ ۱۹۵۲ء میں مشرقی پاکستان میں لسانی تنازعہ شروع ہو چکا تھا۔ اس کو دور کرنے کا صرف یہی ذریعہ تھا کہ مشرقی پاکستان کے عوام کو ذہنی طور پر مغربی پاکستان کے قریب لایا جائے۔

ڈاکٹر شادانی نے کبھی سیاست میں قدم نہ رکھا اور نہ ہی وہ اس کے خواہاں تھے، مگر اس وقت پاکستان کی سالمیت خطرہ درپیش تھا اس کے تدارک کی کوشش کرنا اپنا فرض سمجھتے تھے۔ لہٰذا انھوں نے ادبی سطح پر سیاسی امور کو سلجھانے کی شش کی۔ "ماہنامہ خاور" میں ان کا یہی طریقۂ کار رہا۔ مگر یہ اکیلے ان کے بس کا کام نہ تھا۔ اس تحریک کو چلانے کے لیے حکومت ہم کردار ادا کرنا چاہیے تھا، مگر افسوس اس پر توجہ نہ دی گئی۔ اس لیے ڈاکٹر شادانی کا خواب شرمندۂ تعبیر نہ بن سکا جس کا ہ ۱۹۷۱ء میں بنگلہ دیش کی صورت میں نکلا۔ مگر ۲۵ سال پہلے ڈاکٹر شادانی نے جس بے باکی اور جرأت کے ساتھ پاکستان دونوں بازوؤں میں اختلاف کی نشاندہی کی اور جن مسائل پر عوام اور حکومت کی توجہ مبذول کرائی وہ ان کی دوراندیشی اور رو فکر کا بہترین ثبوت ہے۔

"خاور" اپریل ۱۹۵۲ء تا مارچ ۱۹۵۳ء تک باقاعدگی سے نکلتا رہا۔ مگر افسوس کہ ایک سال بعد اپنی مالی مشکلات کی بر یہ بند ہو گیا۔ محدود وسائل کے باوجود کسی رسالہ کا باقاعدگی سے ایک سال جاری رہنا تعجب کی بات ہے۔ ڈاکٹر شادانی دارت نے اس رسالہ کو صرف ایک سال ہی میں ترقی کے اعلیٰ مدارج پر پہنچا دیا تھا۔ اس کی ادبی حیثیت اس بات میں مضمر تھی کہ کا مدیر بذاتِ خود اپنے عہد کا مشہور ادیب، محقق اور نقاد تھا۔ اس وقت کے کئی اربابِ نظر نے "خاور" کے متعلق جو دیں وہ بے حد حوصلہ افزا تھیں۔ "خاور" کا طلوع اور وہ بھی اس شان کے ساتھ، ایک ادبی معجزہ ہے۔[۱۳]

"خاور" میں بزمِ خاور کا کالم ڈاکٹر شادانی لکھا کرتے تھے۔ اس کالم میں وہ قارئین کے سوالوں کے جواب کے بعد ر میں لکھنے والے اربابِ قلم حضرات کا ایک مختصر سا تعارف پیش کرتے تھے۔ بزمِ خاور کے مطالعے سے ان کی بلند نظری، ع القلبی اور تنقیدی زاویۂ نظر کا اندازہ ہوتا ہے۔ اداریہ لکھنے میں ان کا قلم کبھی اعتدال اور توازن کی راہ سے نہ ہٹا۔ زمانے کی بدلتی ہوئی ادبی اور سماجی قدروں کو مدِ نظر رکھتے ہوئے انھوں نے خاور کے معیار کو برقرار رکھنے کی کوشش کی۔

---

[۱۲] ماہنامہ خاور۔ اپریل ۱۹۵۲ء۔ [۱۳] ماہنامہ خاور ڈھاکا ۱۹۵۲ء ص ۵

"خاور" میں اس زمانے کے مختلف اسالیب اور مکاتب فکر کے لکھنے والے حضرات تھے۔ ان لکھنے والوں میں نواب جعفر علی اثر لکھنوی، حامد حسن قادری، احتشام حسین، ڈاکٹر سید محمد عبداللہ، ڈاکٹر عبادت بریلوی، ڈاکٹر ابواللیث صدیقی، پروفیسر آلِ احمد سرور، ڈاکٹر طاہر فاروقی، پروفیسر عطا کاکوی، ابوالفضل صدیقی، ثاقب کانپوری، سید ابوالخیر کشفی، قاضی عبدالودود، امتیاز علی خاں عرشی، جمیل مظہری، سید وقار عظیم اور شوکت تھانوی قابلِ ذکر ہیں۔

ان مشہور حضرات کے ساتھ ساتھ مشرقی پاکستان کے اربابِ قلم نے بھی اس رسالے کو اپنی نگارشات سے زینت بخشی اور یہ کہنا مبالغہ نہ ہوگا کہ مشرقی پاکستان میں اردو ادب کی ترقی کا جائزہ لینے اور یہاں کے اردو اہلِ ادب سے روشناس ہونے کا بہترین ذریعہ ماہنامہ خاور ہی ہے۔ ان حضرات میں ڈاکٹر شادانی (مدیر خاور) کے علاوہ وحشت کلکتوی، ڈاکٹر شوکت سبزواری، ڈاکٹر آفتاب احمد صدیقی، ڈاکٹر حنیف فوق، ڈاکٹر امام الدین، شمس الحق شیدائی، سلیم اللہ فہمی، ڈاکٹر کلیم سہسرامی، پروفیسر نظیر صدیقی، ارشد کاکوی، افسر ماہ پوری، ممتاز شرف الدین شرف، جہانگیر نگری، حفیظ زیدی، عبدالرحمٰن بیخود، مفتون احمد، ڈاکٹر شبیر علوی، حسن عظیم آبادی اور وقار عظیم وغیرہ سرِ فہرست ہیں۔

بحیثیت مدیر ڈاکٹر شادانی نے اس رسالہ کی ترویج و ترقی کے لیے کافی جدوجہد کی۔ "خاور" کے تین شمارے نکالنے کے بعد انھیں پندرہ سو روپے کا نقصان اٹھانا پڑا۔ اس کے باوجود ان کے قدم نہ ڈگمگائے۔ اس وقت مغربی پاکستان کی بہ نسبت مشرقی پاکستان میں کاغذ بہت مہنگا تھا۔ طباعت کی سہولتیں بھی مہیا نہ تھیں مگر قارئین کی گزارش پر انھوں نے پاکستان کے دونوں بازوؤں خاور کی قیمت یکساں رکھی۔ زرِ مبادلہ کے تحت ہندوستان میں اس وقت دگنی قیمت رکھنے کے بجائے برابر قیمت رکھی۔ یہی وجہ تھی کہ "خاور" کے قدر دانوں اور خریداروں کی تعداد بتدریج بڑھ گئی جو مدیر کی دیانت داری اور خلوص کا بہترین ثبوت تھا۔ اردو کے نامور ادیب و شاعر پنڈت برج موہن دتاتریہ صاحب کیفی "خاور" کے متعلق ڈاکٹر شادانی کی حوصلہ افزائی کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> "خاور" آپ نے بہت اچھا نکالا۔ خدا اس کو پروان چڑھائے۔ آپ کی مساعی مشکور ہے امید ہے کہ رسالہ روز بروز ترقی کرتا جائے گا۔ اب بھی وہ صوری و معنوی خوبیوں میں اپنے کسی معاصر سے کم نہیں۔[۱۴]

اس وقت مشرقی پاکستان سے ماہنامہ "دلربا" بھی ڈھاکا سے شائع ہوا کرتا تھا۔ اس کے مدیر اپنے ایک اداریہ میں تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> "ڈاکٹر عندلیب شادانی کی ادارت میں اپریل ۱۹۵۲ء سے خاور پابندیٔ وقت کے ساتھ نکل رہا ہے۔ ڈاکٹر صاحب موصوف کی شخصیت محتاجِ تعارف نہیں۔ رسالے کے اداریے میں آپ کا

---

[۱۴] ماہنامہ خاور دسمبر ۱۹۵۳ء ص: ۳

اسم گرامی پرچے کے معیاری ہونے کی ضمانت ہے . . . . "بزمِ خاور" کے عنوان کے تحت ڈاکٹر شادانی صاحب مدیرِ خاور کے رشحاتِ قلم اور اردو تنقید نگاری میں ایک نئے اسلوب کا آغاز ہے۔" [۱۵]

بنگلہ زبان و ادب کے انمول ذخیروں کو اردو کے قالب میں ڈھال کر اس جریدے نے اردو ادب کے سرمایہ میں گراں قدر اضافہ کیا ہے۔ ڈاکٹر شادانی نے اس رسالے کی ترتیب میں جدّت آمیزی پیدا کی۔ یعنی مشرقی پاکستان کی تہذیب و تمدن کو مغربی پاکستانیوں کے سامنے بڑی خوبی سے پیش کیا۔

"خاور" میں کتابوں پر بے لاگ تبصرے کیے جاتے تھے اس لیے بعض حضرات کو یہ شکایت تھی کہ "خاور" کے تبصرہ نگار سختی سے کام لیتے ہیں اور اپنے تبصروں میں شدّت پسندی کا مظاہرہ کرتے ہیں۔ ان حضرات کی غلط فہمی کے ازالے میں مدیر خاور رقم طراز ہیں:

"خاور کے تبصرہ نگار بعض کہنہ سال نقادوں کی طرح بغیر پڑھے کتاب پر تبصرہ کرنے کے فن سے واقف نہیں۔ اس کے علاوہ ذاتی تعلقات یا تعصب کی بنا پر وہ اپنی تنقید میں مدح و ذم کو راہ نہیں دیتا۔ ہمارے بعض مستند ادیب برنائے مصلحت ایسا ہی کرتے ہیں کہ کسی تصنیف کے متعلق ان کی جو واقعی رائے ہوتی ہے۔ تحریر میں اس کے برعکس خیالات کا اظہار کرتے ہیں۔ "خاور" کے نقادوں کی رائے غلط ہو سکتی ہے۔ دیانت سے منحرف نہیں ہو سکتی . . . . ایک دیانت دار نقّاد صحیح معنوں میں خضر کا جانشین ہوتا ہے اور رہنمائی کے فرائض انجام دیتا ہے۔ اب اگر وہ رہنمائی کے بجائے مخلوق کی گمراہی کا سبب بنے تو اسے عزازیل کی ذرّیات میں شمار کرنا بے جا نہ ہو گا۔ ہمیں امید ہے کہ خاور میں جن کتابوں پر تبصرے شائع ہوئے ہیں ان کے مصنّفین خاور کے تبصرہ نگاروں کی بعض باتوں کو اپنی خواہش کے مطابق نہ پا کر آزردہ خاطر نہ ہوں گے کیونکہ خاور کے تبصرہ نگار صرف "انصاف بالائے طاعت است" کا اصول پیشِ نظر رکھتے ہیں اور ظاہر ہے اس میں شخصی رو رعایت کی کوئی گنجائش نہیں۔" [۱۶]

کتابوں پر تبصروں کے علاوہ اس جریدے میں "دعوتِ فکر" کے عنوان سے ڈاکٹر شادانی نے مضامین کا ایک نیا سلسلہ شروع کیا تھا۔ ان مضامین میں انھوں نے اردو کو سہل بنانے اور اس کے املا میں آسانی پیدا کرنے کے لیے کئی اہم تجاویز پیش کی تھیں اور اس مسئلہ پر آزادانہ زاویۂ نگاہ سے قارئین کو سوچنے سمجھنے اور پرکھنے کی کھلی اور عام دعوت دی۔

---

[۱۵] ماہنامہ "دلربا" ڈھاکا جنوری، فروری

[۱۶] ماہنامہ "خاور" مارچ ۱۹۵۲ء اور جولائی ۱۹۵۲ء ص: ۳/۴

مگر افسوس ان کی یہ تمام تجاویز ناقابلِ قبول ہوئیں۔ ان کے اکثر معاصرین جن میں حامد حسن قادری اور ڈاکٹر عبدالستار صدیقی وغیرہ نے خاور کے ذریعے ہی ان کی تجاویز کو مسترد کر دیا۔ ڈاکٹر شادانی نے اعلا ظرفی کا ثبوت دیتے ہوئے ان معاصرین کے وہ تمام مضامین بھی "خاور" میں شائع کیے۔ اسی سلسلے میں "شوکت تھانوی کا ایک خط عندلیب شادانی کے نام" کافی پُرلطف ہے جس کی ایک نقل پیشِ خدمت ہے۔

اندلیب ساہب کے نام ـ شوکت تھانوی کا خت

خاور کے دو پرچے ملے۔ دیکھ کر تبیّت خوش ہوئی اور کچھ لکھنے کی تہریک تو پیدا ہوئی۔ مگر یہ سمجھ میں نہ آتا تھا کہ کیا لکھا جائے جسے پڑھنے والے پڑھ بھی سکیں۔ دوسرے نمبر میں سفحا انتالیس پر آپ کا مزمون داوتِ فکر دیکھ کر تے کیا کہ وہ لکھو جو آسانی سے پڑھا جاسکے۔ آپ نے رسم الخت کی بہس چھیڑی ہے اور بہت آسان ترایقہ نکالا ہے۔ اردو کا رسم الخت تو اربی ہی رکھا جائے۔ البتہ اربی کے وہ بہت سے ہروف جن کا تلفز اردو میں یکساں ہے اردو سے نکال دیے جائیں اور سرف ایک ایک ہرف رکھ لیا جائے۔ مسلن (ت) اور (ط) میں جب کوئی فرق نہیں ہے اور دونوں کی آواز اردو میں ایک ہی ہے تو دونوں کی کیا زرورت ہے۔ سرف (ت) کافی ہے۔ اور (ؤ) اور (ع) کی آواز بھی یکساں ہے تو (ؤ) کو رہنے دیجیے اور (ع) کو رخست کیجیے زیادہ سے زیادہ یہی نا کہ ڈاکٹر مولوی ابدالہق ناراز ہو جائیں گے۔ تو ان کو اربی میں اردو لکھنے دیجیے۔ آپ کیوں نہ اردو میں اردو لکھیں۔ (س)، (ص) اور (ث) میں سے سرف (س) کافی ہے۔ (ذ)، (ز) (ض) اور (ظ) میں سے سرف (ز) کو رہنے دیجیے۔ اور ساہب یہ (ح) اور (ہ) والا قسہ تو بہت ہی واہیات ہے۔ یہ جو چھوٹی (ہ) کہلاتی ہے یہی ہمارے لیے بڑی چیز ہے۔ مختسر یہ کہ جب (ؤ اور ع) (ت) اور (ط)، (ح اور ہ)، (ث، س، ص)، (ذ، ز، ض، ظ) کی آواز ایک ہی ہے تو ایک ہرف کے بجائے اتنے ہروف کی آخر کیا زرورت ہے۔ آپ نے اس تفسیل کا جو خلاسہ کیا ہے وہ یہی ہے کہ املا کا دار و مدار سوت یا آواز پر ہے۔ اور جب اردو میں ان مختلف ہروف کی ایک ہی آواز ہے تو املا کی غلطیوں کا امکان ختم نہیں ہو سکتا اور اردو خواہ مخواہ اردو ہوتے ہوئے بھی اردو نہیں بن پاتی۔ اربی بنی ہوئی ہے۔ میری سمجھ میں تو اس تالبِ الم کا قسور نظر نہیں آتا جس نے اونٹ کو مہز اس خیال سے (عونت) لکھا تھا کہ اونٹ بہر ہال ارب کا جانور ہے اس لیے (ؤ) سے تو ہو ہی نہیں سکتا ع سے ہوگا۔ اور چونکہ اربی میں (ٹ) نہیں ہے لہازا (ٹ) کی جگہ (ت) لکھنا چاہیے۔ اگر ممتہن ساہب زرا بھی زہین ہوتے تو اس تالبِ الم کو بنچ پر کھڑا کرنے کی جگہ خود میز پر کھڑے ہو کر اس کی تاریف کرتے۔ میں آپ سے ایک بات اور ارز کرتا ہوں اندلیب ساہب کہ اس ترہ نہ سرف اردو کا رسم الخت آسان ہو جائے گا بلکہ ہمارے لکھنے والے مشکل ابارت آرائی بھی شاید چھوڑ دیں (ع ـ ط ـ ح ـ ص ـ ث ـ ذ ـ ض ـ ظ) کی وجہ سے اردو کا مزاج خواہ مخواہ اربی بنا ہوا ہے۔ یہ ہروف جب آپ کے رسم الخت سے

نکل جائیں گے تو اردو جو فلحال "عردو" بنی ہوئی ہے خالس اردو بن جائے گی اور اس اردو کو آسان ہروف میں لکھنے کے لیے آسان زبان بھی اختیار کی جائے گی۔ مسلن اسی نمبر میں آپ ہی کے دو شیر ہیں۔ ایک سفحا سولا پر ہے

دیکھتا ہوں رات کو جب دو ستارے پاس پاس　　　جانے کیوں اس وقت ہو جاتا ہے میرا دل اداس

اس شیر میں کسی تبدیلی کی زرورت مہسوس نہیں ہوئی۔ مگر دوسرا شیر جو سفحا انسٹھ پر زودِ انتخاب کے زیرِ انوان ہے چونکہ اردو کا شیر نہیں ہے لہازا اس کو اردو بنانے کے لیے یوں لکھنا پڑے گا۔

آئی تھیں غم کے باد خوشی کی بھی ساعتیں　　　اب وہ نزامِ گردشِ دوراں نہیں رہا

ہوگا یہ کہ یا تو آپ ساہبان اس تمرہ کے شیر نہ کہیں گے۔ یا کہیں گے تو اس تمرہ لکھیں گے کہ ان کے اربی الفاز بھی اردو ہروف میں آکر مشرف بہ اردو ہو کر کچھ کے کچھ نزر آ جائیں گے مگر ان کے مفہوم و مانی میں کوئی فرق پیدا نہ ہو گا۔

اندلیب ساہب مجھ کو ایتراف ہے کہ آپ کے مجوزہ رسم الخت میں یہ اریزا کس مشکل سے تہریر کیا ہے۔ قدم قدم پہ املا کی غلتی کا خوف مجھ پہ تاری رہا مگر آپ کو نہیں مالوم کہ آج تیس سال کے باد میں نے آپ کا سہارا لے کر کتنا بڑا انتقام والدِ مرہوم مولوی سدیق احمد (احمد کو میں نے اہمد اس لیے نہیں لکھا کہ آپ نے رائے دی ہے کہ احمد و محمد کو احمدؐ و محمدؐ اور صوم و صلوٰۃ کو صوم و صلوٰۃ ہی لکھنا چاہیے۔ ایسے الفاز کی تاداد دو ڈیڑھ سو سے زیادہ نہ ہو گی اور ان کو کلیے کا استثنا سمجھنا چاہیے) ساہب مرہوم و مغفور کی روح سے لیا ہے۔ ساہب سرف اس زراسی غلتی پہ کہ میں نے ایک مرتبہ اُمدہ لکھ دیا تھا۔ جو ان کے نزدیک (عمدہ) ہونا چاہیے تھا۔ کافی مار کھائی تھی اور جب اس اد کے پیشِ نزر دوسری مرتبہ اجمیری دروازے کو (عجمیری دروازہ) لکھا ہے تو کافی سے بھی زیادہ تواززو ہوئی تھی میری کاش! آپ والد مرہوم کے ہم اسروں میں ہوتے۔ اور یہ تجویز میری مرمت سے پہلے ہی پیش کر چکے ہوتے۔ اس کا فائدہ تو اب میری اولاد کو خاتر خواہ پہنچ جائے گا مگر میرے والد کی مجھ خاکسار اولاد کو مہز آپ کی اس تاخیر کی وجہ سے نہ پہنچ سکا۔

اندلیب ساہب خدا کرے آپ کی یہ تجویز مقبولِ آم ہو اور اوام آپ کی اس نیک سلاہ کو شرفِ قبول اتا کریں۔ اس کے باد اور بہت سی آسانیاں پیدا ہونے کی سورتیں نکل آئیں گی۔ مسلن (ء) بھی بڑی نامراد چیز ہے۔ ساہب اس کو تو خدا کے واستے اپنے رسم الخت سے اڑا دیجیے۔ اس کی جگہ بھی الف کو استیمال میں لائیے۔ مسلن (آئے) کو ہم آاے لکھیں تو کیا ہرج ہے۔ (آؤ) کو آاو۔ متلب یہ کہ اسی تمرہ کا کچھ لکھنے لگیں۔ مالوم نہیں کیوں میں زاتی تور پر اس ہمزہ سے بہت گھبراتا ہوں اور اسی قسم کی بے شمار چیزیں ہیں جن کے نکل جانے کے باد بڑی آسانیاں پیدا ہو جائیں گی اور پھر تو ہم یہ

[illegible]

ان: ل ی ب + ش ا د ا ن ی ۔ کتنا خوب سورت ہو جائے گا ہمارا ٹائپ رائٹر۔ بہر حال میں ادھر اس تجویز پر غور کر رہا ہوں۔ آپ اُدھر غور فرمائیے کوئی نہ کوئی سورت نکل ہی آئے گی۔ مگر بہ آنکہ اس ہمزہ کے ماملے کو ماموُلی سمجھ کر نظر انداز نہ فرمائیے گا۔ مکرمی ہقیز ساہب ہوشیار پوری آداب ارض[17] کرتے ہیں اور فرست کی تلاش میں ہیں کہ آپ کو کوئی تازہ غزل جلد سے جلد بھیجیں۔

(احقر الآباد شوکت تھانوی)[18]

شادانی صاحب نے کبھی سیاست میں قدم نہیں رکھا۔ اس لیے بحیثیت مدیر انھوں نے کبھی بھی حکومت کی کوئی مخالفت نہیں کی۔ ادبی لحاظ سے نہایت خوش اسلوبی کے ساتھ اپنے فرائض انجام دیے۔

ان کی زیر نگرانی اور سرپرستی میں ان کے عزیز شاگرد ارشد کاکوی نے ڈھاکا سے ماہنامہ "ندیم" کا اجرا کیا جو تقریباً ایک سال تک جاری رہا۔ مشرقی پاکستان کا یہ دوسرا ادبی معیاری پرچہ تھا جس کے بانی و سرپرست ڈاکٹر عندلیب شادانی ہی تھے۔ اس جریدے کی پوری فائل ڈھاکا یونیورسٹی کے کتب خانے میں موجود ہے۔

---

۱۷ اردو املا کی اصلاح کے سلسلے میں جو تجاویز ڈاکٹر شادانی نے پیش کی تھیں ان کی بازگشت آنے والے برسوں میں "اردو املا" اور "اردو کیسے لکھیں" مصنفہ رشید حسن خاں میں سنائی دی۔ اس موضوع پر ترقی اردو بورڈ کی سفارشات "املا نامہ" بھی بہت اہم ہے۔ اردو املا کے مسائل کے سلسلے میں شعبۂ اردو بمبئی یونیورسٹی نے ۱۹۸۶ء میں ایک عالمی سیمینار کا بھی انعقاد کیا۔ اس موضوع پر یہ پہلا سیمینار تھا جو کسی بھی ادارے یا یونیورسٹی کی طرف سے منعقد کیا گیا۔

۱۸ ماہنامہ "خاور" جولائی ۱۹۵۲ء ص: ۲۸ تا ۳۰ میں یہ خط شائع ہوا۔

ڈاکٹر سعادت علی صدیقی

مثنوی زہرہ عشق

ایک غیر معروف و کمیاب مثنوی

غلام احمد شوق فریدی مصنف "احسن التواریخ" شعرائے سنبھل کے اس قبیل سے تعلق رکھتے ہیں جو اردو شعر و ادب کی خاطر خواہ خدمات انجام دینے کے باوجود گوشۂ گمنامی میں جا پڑے۔ انھوں نے مختلف النوع موضوعات اور متعدد اصنافِ ادب پر جولانیِ طبع کے جوہر دکھائے اور بسیار نویسی و زود گوئی کے نمونے پیش کیے لیکن اردو ادب کی تاریخ میں اپنی جگہ نہ بنا سکے۔ ستم تو یہ کہ ان کے سوانحی حالات بھی پردہ اخفا میں ہیں اور ادبی کاوشیں بھی۔ قدیم کتابوں اور رسالوں بالخصوص شوق کی دستیاب تصانیف میں ان کی ۴۲ مطبوعہ کتابوں کی نشاندہی ملتی ہے لیکن تلاشِ بسیار کے بعد اٹھارہ کتابیں دستیاب ہو سکی ہیں۔ ان کتابوں سے اندازہ ہوتا ہے کہ شوق فریدی زود گو اور نادر الکلام شاعر اور منفرد نثر نگار تھے۔ انھوں نے سوانح عمریاں بھی لکھیں، مذہبی موضوعات پر بھی طبع آزمائی کی، قدیم عربی و فارسی تصانیف کا ترجمہ بھی کیا، سنبھل کی تاریخ بھی تحریر کی، علمِ طب پر بھی دسترس حاصل کی اور فلسفۂ تصوف کا مطالعہ بھی کیا۔ انھیں فارسی، اردو اور عربی پر یکساں قدرت حاصل تھی۔ اردو شعر و سخن کی وادی میں قدم رکھا تو غزلیات بھی کہیں۔ مرثیہ "طوفانِ محشر" بھی لکھا، "مسدس اسلام" بھی تصنیف کیا۔ مثنوی "زہرہ عشق" کی تخلیق بھی کی اور دیگر اصنافِ سخن میں بھی زورِ قلم دکھایا۔

دستیاب شواہد کی رو سے "احسن التواریخ" (تاریخ سنبھل) شوق فریدی کی آخری مطبوعہ کتاب ہے جو ۱۳۲۴ھ مطابق ۱۹۰۷ء میں لکھنا شروع ہوئی اور تین سال کی شبانہ روز محنت کے بعد پایۂ تکمیل کو پہنچی۔ شوق فریدی احسن التواریخ کے پیش لفظ میں لکھتے ہیں:

"۱۳۲۴ھ قدسی میں بہ توفیق الٰہی اس امرِ عظیم یعنی تکمیل تاریخِ سنبھل پر کمرِ ہمت باندھی"   (صفحہ ۴)

اور کتاب کے سرورق پر یہ عبارت درج ہے

جناب مولانا مولوی حکیم غلام احمد شوق فریدی سنبھلی نے متواتر تین سال کی محنت اور عرق ریزی سے بڑی تحقیق اور تفتیش کے ساتھ کتاب لاجواب جو چار جلدوں میں مرتب کی

ہے۔ منجملہ چار جلد کے جلد اوّل یعنی احسن التواریخ سنبھل مع تاریخ مراد آباد"
جس سے یہ نتیجہ اخذ کیا جاسکتا ہے کہ احسن التواریخ سنبھل ۱۹۲۶ء میں مکمل ہوئی۔ کتاب میں باغ سنبھلی کی وفات (۱۹۲۵ء) کی خبر بھی دی گئی ہے جس سے یہ شہادت ملتی ہے کہ کتاب بہرحال ۱۹۲۵ء کے بعد ہی مکمل ہوئی اور غالباً ۲۶ء ہی میں شائع ہوئی (کتاب میں سنہ اشاعت درج نہیں ہے۔)

کتاب کے آغاز میں مولف نے اپنا مختصر تعارف درج کیا ہے پھر اپنی تصانیف تالیفات اور تراجم کی فہرست دی ہے۔ فہرست میں تین کتابوں کے نام دیے ہیں جن میں جمالِ محبوب (نعتیہ دیوان)، مثنوی جوشِ رحمت، مرثیہ طوفانِ محشر، مسدس آئینۂ اسلام، قومی دو نظم و نثر فریادِ روح، جامِ فنا اور مثنوی زہرۂ عشق کے نام قابلِ ذکر ہیں۔ دیگر کتابیں مذہبیات سے متعلق ہیں۔ اس فہرست کے ساتھ شوق نے یہ اطلاع بھی دی ہے

"اس کے علاوہ چند مسودے نظم و نثر واسطے طبع ہونے کے تیار ہیں جن کے لیے وقت کا انتظار ہے"

تلاش و جستجو کے بعد بھی یہ علم نہیں ہوسکا کہ ان مسودوں کا کیا حشر ہوا جو طبع ہونے کے لیے وقت کے انتظار میں تھے؟ فہرست میں درج مطبوعات کے علاوہ دو اور کتابوں کی نشاندہی ملتی ہے لیکن وہ بھی عنقا ہیں۔ سب سے زیادہ تعجب خیز بات یہ ہے کہ احسن التواریخ سنبھل کی پہلی جلد تو تلاشِ بسیار کے بعد ہاتھ آجاتی ہے لیکن بقیہ تین جلدوں کے بارے میں یہ واضح نہیں ہوسکا کہ وہ زیورِ طبع سے آراستہ بھی ہوئیں یا امتدادِ زمانہ کا شکار ہوگئیں۔ کہن سال بزرگوں کا خیال ہے کہ احسن التواریخ کی مذکورہ جلدیں ضائع ہوگئیں۔ بعض اصحاب کی رائے ہے کہ یہ مسودے پاکستان منتقل ہوگئے تھے لیکن پروفیسر شبیر علی کاظمی مرحوم متوفی ۱۹۸۸ء نے راقم السطور کے نام ایک خط میں یہ اطلاع دی تھی کہ پاکستان میں بھی احسن التواریخ کی آخری تین جلدوں کا سراغ نہیں ملتا۔ شوق نے احسن التواریخ سنبھل کی جلد اوّل میں یہ بھی لکھا ہے کہ ان کے سوانحی حالات جلد چہارم میں شامل کیے گئے ہیں لیکن جلد کے لاپتا ہونے کی وجہ سے ان تک رسائی ممکن نہیں ہوسکی۔ کہن سال بزرگوں اور قدیم رسائل سے جو کوائف حاصل ہوسکے سطور ذیل میں قلم بند کیے جارہے ہیں۔

شوق فریدی سنبھل کے قدیم محلے کبیر کی سرائے میں پیدا ہوئے، والد کا نام شیخ غلام محمد تھا۔ سلسلۂ نسب شیخ کبیر الدین کلہ رواں، جن کے نام سے محلہ کبیر کی سرائے آباد ہوا، سے ملتا ہے۔ شیخ کبیر الدین بابا فرید الدین گنج شکرؒ کی اولاد میں سے تھے۔ شوق اپنے جدِ امجد شیخ کلہ رواں کے آستانے کے سجادہ نشیں بھی تھے۔ ان کے سالِ ولادت، تعلیم و تربیت اور دیگر کوائف کی تفصیلات نہیں ملتیں۔ شوق نے اپنے عہد کے مشہور شاعر باغ سنبھلی کو "عزیزی" کے لفظ کے ساتھ یاد کیا ہے جس سے قیاس ہوتا ہے کہ وہ باغ (۱۸۷۱-۱۹۳۵ء) سے بڑے تھے بعض قرائن بھی اس پر دلالت کرتے ہیں کہ ان کی پیدائش انیسویں صدی کی چھٹی یا ساتویں دہائی میں ہوئی۔ اسی طرح انھوں نے مفتیِ شہر و عالم دین مولوی عبدالسلام کو "حضرت مخدومی استاذی" اور "جناب قبلہ مخدومی استاذی" لکھا ہے جس سے یہ نتیجہ نکالا جاسکتا ہے کہ ان کے شاعرانہ ذوق کے فروغ اور تربیت و اصلاح میں مولوی عبدالسلام سلامؔ کا دخل رہا ہے۔

بعض شواہد کی بنا پر یہ حقیقت بھی ظاہر ہوتی ہے کہ شوق کو اپنے زمانۂ حیات میں امتیازی حیثیت حاصل تھی۔ وہ آستانہ ٔقدرواں کے سجادہ نشین ہونے کے باعث تو عزت و افتخار کی نگاہ سے دیکھے ہی جاتے تھے۔ انھیں رشحات کلک گوہر سلک ناظم بے بدل و نثار بے مثل، حاوی فروع واصول اور معجز طرازِ شاعریہ دار، عارف بارگاہ رب احد جیسے خطابات سے نوازا جاتا تھا۔ عمائدین شہر سے ان کے خصوصی تعلقات تھے اور خود رئیسِ شہر کہے جاتے تھے۔ ممتاز علم دوست اور رئیسِ شہر مولوی محمد خلیل اللہ متوفّی ۱۹۷۵ء سے جو سخن فہم و سخن شناس ہونے کے ساتھ ساتھ بہت اچھے خطاط بھی تھے، ان کے گہرے مراسم تھے۔ شوق کی بیشتر کتابیں انھیں کی اعانت و سرپرستی کے باعث منظرِ عام پر آئیں۔ شوق عمر کے آخری حصے میں مرادآباد منتقل ہو گئے تھے اور وہیں مطب کرنے لگے تھے لیکن سنبھل آتے رہتے تھے اور شیخ محمد خلیل اللہ کے یہاں ہی قیام کرتے تھے۔

شوق فریدی کا انتقال ۱۹۴۳ء میں مرادآباد ہی میں ہوا اور وہیں کچہری کے پاس واقع قبرستان میں سپردِ خاک ہوئے۔

یوں تو شیخ غلام احمد فریدی کا خاندان کافی بڑا تھا اور خود ان کے کئی اولادیں ہوئیں لیکن ان کے بیشتر قریبی اعزا کے پاکستان چلے جانے اور سنبھل میں موجود رشتہ داروں کی بے بیاتری کی وجہ سے ان کا ادبی سرمایہ محفوظ نہیں رہ سکا۔ بیشتر مطبوعہ کتابیں بھی دستیاب نہیں۔ شیخ محمد خلیل اللہ مرحوم کے پوتے، شیخ سرفراز حسین ساکن کوٹ غربی کے ذخیرۂ کتب میں چند کتابیں موجود ہیں پر وہ بھی اہلِ علم کی دسترس سے باہر۔ شوق کے کوائف کے بارے میں بیشتر حضرات لاعلمی ظاہر کرتے ہیں۔

سچ تو یہ ہے کہ شوق فریدی کی سبھی تصانیف و تالیفات محتاجِ تعارف ہیں لیکن ان کی مثنویوں اور مرثیہ "طوفانِ محشر" پر خصوصی توجہ دینے کی ضرورت ہے۔ پیشِ نظر سطور میں ان کی مثنوی "زہرۂ عشق" سے متعارف کرانے کی کوشش کی گئی ہے۔

مثنوی "زہرۂ عشق" $\frac{18\times22}{8}$ سائز کے ۴۸ صفحات پر مشتمل ہے جو شمس المطابع مرادآباد سے ۱۹۱۴ء میں شائع ہوئی۔ سرورق کی پیشانی پر گل اور بوٹوں کے درمیان یہ شعر اور عبارت درج ہے:

یوں تو معشوق گل و شمع بھی کہلاتے ہیں دیکھنا یہ ہے کہ مرتا ہے زمانہ کس پر

"الحمد للہ کہ کتاب نایاب تذکرہ معشوقی و عاشقی اعنی رنگ وارثی المعروف بہ مثنوی زہرۂ عشق ۱۹۱۴ء"

کتاب کا نام جلی حروف میں تحریر ہے، نام کے بعد یہ عبارت لکھی گئی ہے

"من تصنیف لطیف شاعر شیریں بیان جناب مولانا مولوی حکیم غلام احمد صاحب رئیس سنبھل سلمہ اللہ عزّوجل۔ منشی محمد عبدالرشید نے اسے شمس المطابع مرادآباد میں چھاپا اور محمد وصی نے شائع کیا۔"

پیشِ نظر نسخہ دوسری بار اور پانچ سو کی تعداد میں شائع کیا گیا جس کی قیمت ۴ر ہے۔ کاغذ معمولی اور کتابت اوسط

درجے کی ہے۔ کتابت کی غلطیاں بکثرت ہیں۔ ناموزوں مصرعوں اور بحر سے خارج اشعار بڑی تعداد میں ہیں جو کاتب کی دین ہے۔ یائے معروف کے بجائے یائے مجہول اور یائے مجہول کی جگہ یائے معروف کا اکثر و بیشتر استعمال کیا گیا ہے۔

سرورق کی پشت پر حضرت وارث علی شاہؒ کی مدح میں ۴۲ اشعار کا قصیدہ ہے۔ اس کے بعد صفت عشق، حمد باری تعالیٰ، نعت سرور کائنات، منقبت حضرت کبار و اہلِ بیت اطہارؓ، منقبت حضرت شیخ عبدالقادر جیلانیؒ اور صفت حسن عنوانات کے تحت ۲۲۶ اشعار ہیں۔ پھر اصل قصہ کا آغاز ہوتا ہے جو ۷۶۴ اشعار پر مشتمل ہے۔ مثنوی کے آخر میں تین اشعار کی مناجات پھر تین غزلیں اور آخری تین صفحات میں مثنوی نگار کی تالیفات و تصنیفات کا مختصر تعارف دیا گیا ہے۔

مثنوی "زہرۂ عشق" کا قصہ سیدھا سادا ہے۔ بنگال کے کسی خوبصورت مقام پر ایک وسیع و عریض بت کدہ تھا جہاں ہر سال بتوں کا ایک بڑا میلہ لگتا تھا۔ میلے میں دور دراز کے لوگ آکر شریک ہوتے اور نذرانۂ عقیدت پیش کرتے تھے۔ میلے میں ایک کافر ادا حسینہ پر ایک نوجوان کا دل آگیا۔ دونوں کی نگاہیں چار ہوئیں، دل دھڑکے، کیوپڈ نے اپنا کام کیا۔ دونوں آتش عشق میں جلنے لگے اس کے بعد وہی سب کچھ ہوا۔ جو ہمارے معاشرے میں ہوتا آیا ہے۔ ہجر و فراق کی اذیتیں، مذہب اور سماج کی دیواریں، حالات کی ناسازگاریاں، عاشق کی مجبوریاں، محبوبہ کی پریشانیاں، ملاقات کی ترکیبیں، وصال کی ساعتیں، انجام — محبت کی راہ میں دونوں کا جان دے دینا کہ :

الفت کا نہفتہ راز یہ ہے　　　انجام نیاز و ناز یہ ہے

"مثنوی زہرۂ عشق" — کے خالق غلام احمد شوق فریدی نے اپنی مثنوی کا آغاز قدیم مثنویوں کے طرز پر کیا ہے — لکھتے ہیں :

اس ہند میں ہے جو ملک بنگال　　　آباد ہے خوب اور خوش حال
بنگالہ ہے غیرت گلستاں　　　اک شہر تھا اس میں جوں پرستاں
خوبی میں وہ شہر خلد سا تھا　　　خود حُسن وہاں پہ آبسا تھا
آباد خوشی سے، غم سے خالی　　　ہر کوچہ گلی میں تھی نرالی۔

بنگال کے اس خوب صورت شہر میں بتوں کا ایک بڑا میلا لگتا تھا جس میں دور دراز کے لوگ بکثرت ہوتے تھے۔ ایک سال اس میلے میں ایک نوجوان بھی آیا جو ایک قاتل ادا حسینہ کو دیکھ کر اس پر دل و جان سے شیدا ہو گیا۔ داستان کے ہیرو نے ہیروئین کو ایک نظر دیکھا اور اس کے تیر نظر کا شکار ہو گیا۔ ہیروئین حسن و جمال اور ناز و ادا کی پیکر ہے۔ دونوں کی نظریں چار ہوئیں۔ نظروں کے چار ہوتے کے بعد دونوں کے دل پر کیا بیتی ؟ فرماتے ہیں :

آنکھیں ہوئیں نازنین سے چار　　　نظریں ملیں دل میں آگیا پیار
پھر چاہ کی رسم و راہ نکلی　　　دونوں کے ہی منھ سے آہ نکلی

پر رسمِ حیا ظاہری کی　　　مانع ہوئی رنگ خودسری کی

ناز و نیاز کا یہ سلسلہ جاری تھا کہ جدائی کا وقت آگیا اور فراقِ یار میں ترک، عاشق اپنی سدھ بدھ بھول گیا۔ دن رات تڑپتا مچلتا اور آہیں بھرتا تھا اور رہ رہ کر دیدارِ یار کی دعائیں کرتا تھا۔

ملے دل ہوا دل دُبا روانہ　　　بے دل اور بُت کا آستانہ
سدھ بدھ اپنی نہ تھی پرائی　　　دشمن ہوئی جان کی، جدائی
دیوانہ تھا وحشی و جنونی　　　ہر روز تپ فراق دونی
چہرے پہ بھبھوت کو رما کے　　　بیٹھا وہ صنم سے لو لگا کے
کھانے کی نہ پینے کی خبر تھی　　　مرنے کی نہ جینے کی خبر تھی

اِدھر محبوب فراقِ یار میں تڑپ رہا تھا اُدھر محبوبہ بھی بے چین و بے قرار تھی۔ اسے بھی کسی پل چین نہ آتا تھا۔ پیا سے ملنے کی آس میں وہ دن گن رہی تھی:

تاثیر جو جذبِ عشق نے کی　　　معشوق نے راہِ عشق کی لی
سودا و جنون و وحشتِ دل　　　نازک دل پہ ہزار مشکل
اک دم نہ تھا یا رین اسے چین　　　رہتی تھی بے کلی میں وہ دن رین
کہتی تھی ملوں پیا سے کیسے　　　دل میرا لیا ادا سے کیسے
پوری بھٹی میں تو پیت کر کے　　　دل لے گیو مو سے جیت کر کے
کیا بھائی مرے پیا کے من میں　　　چھوڑا جو مجھے اکیلے بن میں
جوگن ہوئی سائیں سے بچھڑ کر　　　لوٹے ہو سگری دیہہ ہر کر
درشن ملیں دیکھوں کب سجن کے　　　میں ہار گئی ہر اک جتن سے
میں تو رج سجن کے غم میں جلتی　　　کا سے کہوں جو بیت ہے بیتی

اس طرح ایک سال بیت گیا، میلہ لگنے کے دن قریب آ گئے۔ میلے کے دن دونوں کی ملاقات ہوئی اور ہجر کی بے نالی وصال کی لذت میں بدل گئی، لیکن زمانے کو ان کا وصال ایک آنکھ نہ بھایا۔ محبت کے متوالے حالات کی ستم ظریفیوں سامنے ڈگمگائے نہیں۔ انھوں نے سچے عاشقوں کی طرح دریا میں ڈوب کر جان دینے میں ہچکچاہٹ سے کام نہیں لیا ن جدا ہونا گوارہ نہیں کیا۔

جب ڈوب چکے دو چاہ والے　　　اور ہٹ گئے رسم و راہ والے
میلے میں تھا ایک حشر برپا　　　ہر سمت فغان و شور و غوغا
غرقی کی جہاں میں باڑھ ہو تھی　　　نعشوں کی ندی میں جستجو تھی

دریا سے دونوں کی لاشیں برآمد کر لی گئیں اور پھر

کفن اسے جو لے چلے دلھن کو　　کس منھ سے کہوں میں اس پھبن کو
خلقت کا ہجوم چار سو تھا　　ہر سمت سے شور ہاؤ ہو تھا

آخرکار محبوب اور محبوبہ دونوں کو ایک ہی جگہ دفنا دیا گیا اس طرح عشق کی راہ میں جان دینے والے دو متوالوں کو دائمی وصال نصیب ہو گیا:

تھے گور میں دونوں دوش بر دوش　　کس پیار سے شوق میں ہم آغوش
واپس ہوئے چھپ کے جانے والے　　یکجا رہے دل لگانے والے
چھوڑ آئے ہم انھیں بحالت خویش　　تقدیر سے کچھ نہیں ہے بیش
مٹی سرِ قبر ڈال آئے　　دل شاد بہ صد ملال آئے

انجام نیاز و ناز یہ ہے
الفت کا نہفتہ راز یہ ہے

مشرف احمد

واحد نظامی کا "نیا مکان"

سابق مشرقی پاکستان چونکہ ادب کے اہم اور بنیادی مراکز لاہور اور کراچی سے دور واقع تھا۔ لہٰذا وہاں کے اہلِ قلم کی شہرت مغربی پاکستان تک ذرا کم ہی گئی تھی جنھوں نے قیامِ پاکستان کے بعد ادب کی مختلف اصناف میں لکھنا شروع کیا۔ ممکن ہے اس کا سبب یہ رہا ہو کہ بہت سے اہلِ قلم نے سابق مشرقی پاکستان کے شہروں سے نکلنے والے ادبی جرائد تک خود کو مخصوص رکھا ان میں ایک نام واحد نظامی صاحب کا بھی ہے۔ ہر چند کہ "نیا مکان" میں شامل ان کے بیشتر افسانے مغربی پاکستان کے ادبی رسائل میں شائع ہوئے لیکن مجھے اپنی اس کم علمی کا اعتراف ہے کہ "نیا مکان" ملنے سے پہلے میں واحد نظامی مرحوم کے ادبی کاموں سے ناواقف تھا۔

کتاب ملتے ہی میں نے سب سے پہلے ان کے تعارف پر نظر ڈالی۔ اس تعارف میں ان کی وفات کے بارے میں یہ تحریر ہے۔

> "سقوطِ ڈھاکا کے دوران ۲۹ جنوری ۱۹۷۲ء کی صبح بمقام محمد پور (سابق مشرقی پاکستان) میں آخری مرتبہ دکھائی دیے"

ان سطور کو پڑھتے ہی مجھ پر ایک عجیب سی کیفیت طاری ہو گئی۔ اس آخری لفظ " آخری مرتبہ دکھائی دیے" میں خود ایک بھرپور کہانی چھپی ہوتی ہے جس سے ہم آپ سب واقف ہیں۔ آدمی کا مقدر بھی عجیب ہے۔ شہروں اور مملکتوں کی بنا رکھی جا رہی ہو یا ان کا سقوط ہو رہا ہو، آدمی کی گمشدگی اور اس کی المناک موت اس سارے عمل کا ایک حصہ ہوتی ہے۔ ملتِ سلامیہ کی تاریخ میں یہ سقوط بغداد، غرناطہ، دلّی اور ڈھاکا اور نہ جانے کہاں کہاں تک محیط ہے اور انسان سیاسی ویژنوں، نظریات، فرزند اور غیر فرزند زمین اور ہجرت اور بہت سی دوسری اصطلاحات کا شکار ہو کر اپنا زرجاں لٹاتا پھرتا ہے اور ایسے ہی افراد میں ایک نام واحد نظامی صاحب کا بھی تھا۔

کتاب کے نام " نیا مکان " میں مجھے ایک اور معنویت بھی نظر آئی۔ ہر چند کہ " نیا مکان" کہانی کا تھیم اس معنویت کے بالکل برعکس ہے جس کا اظہار میں کرنا چاہتا ہوں۔

مجھے یہ لگا کہ نیا مکان کے عنوان کی ایک تعبیر وہ گھر بھی ہے جسے برِصغیر کے کروڑوں مسلمانوں نے مل کر پاکستان کے نام سے تعمیر کیا تھا۔ اور جس کا ایک حصہ ۱۹۷۱ء کے طوفان میں گم گیا اور بہت سے دوسروں کی طرح اسی ملبے کے ڈھیر میں "نیا مکان" کا خالق بھی دب کر مر گیا۔

واحد نظامی صاحب کی ادبی اور صحافتی خدمات کے بارے میں کتاب میں جو معلومات فراہم کی گئی ہیں اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ مشرقی پاکستان کے ادبی حلقوں کی ایک فعال اور مستعد شخصیت رہے ہوں گے۔ بیالیس برس کی عمر میں ان کے انتقال کو شعلۂ مستعجل بود کہا جا سکتا ہے۔

ان کی بنیادی شناخت اور ان کی اولین دلچسپی افسانہ نگاری ہی سے تھی مگر انھوں نے شاعری کی جانب بھی توجہ دی اور ان کی شاعری کا ایک مجموعہ "جانبِ در" کے نام سے افسانوں کا ایک اور مجموعہ "ایک حقیقت ایک فسانہ" اور مضامین کا ایک مجموعہ "موجِ رنگ" بھی تیار ہے جسے ان کے لائق فرزند حیات نظامی شائع کرنے کا ارادہ رکھتے ہیں۔

"نیا مکان" میں شامل واحد نظامی کی ساری کہانیوں کا بنیادی موضوع غربت اور غربت کے نتیجے میں پیدا ہونے والے مسائل اور ان کا شکار انسان ہیں۔

اپنی ان کہانیوں میں وہ انقلابی شعور کے حامل ایک دردمند دل رکھنے والے افسانہ نگار نظر آتے ہیں۔ طبقاتی ناہمواری، نچلے متوسط طبقے کی زندگی، بعض سرکاری محکموں کے اہلکاروں کی چیرہ دستیاں اور مظالم اور غربت کے باوجود اپنی خواہشات پورا کرنے کے لیے بعض اوقات پستی کی حد تک گر جانے والے کردار بھی ہمیں ان کی کہانیوں میں نظر آتے ہیں، مگر یہ سب کچھ فطری معلوم ہوتا ہے۔ ان کی کہانیوں میں معاشرتی ناہمواریوں، غربت، طبقاتی استحصال زندگی میں دکھوں کا اظہار ادبی پیرایے میں ہوا ہے۔ وہ علاحدہ سے اپنی کہانیوں میں مروّجہ نظام کے خلاف کوئی بات نہیں کہتے نہ ہی نعرے لگاتے ہیں بلکہ کہانی کے اختتام کے بعد ذہن ان ساری خرابیوں کے بارے میں خود بخود سوچنے لگتا ہے اور شاید یہی کسی ادب پارے کی خوبی ہونا چاہیے۔

"نیا مکان" کی کہانیوں کے کردار محبت بھی کرتے ہیں اور خواب بھی دیکھتے ہیں لیکن ان کے سارے خواب چکنا چور ہو جاتے ہیں اور ان کی محبت میں حالات کا زہر گھل جاتا ہے۔ وہ دیہات سے آنے والا صابو ہو یا شہر کی مل میں کام کرنے والا حمید، ان کے صرف نام بدلتے ہیں۔ ان سب کا مقدر ایک ہی رہتا ہے۔ اور تب صابو کو اپنے مرحوم دوست اور محسن مل مزدور حمید کا کہا ہوا یہ فقرہ یاد آتا ہے جو اس کی زندگی پر بھی صادق آتا ہے:

> "یہ میری بیٹی ریشماں ہے۔ بڑی ڈرتی ہے اندھیرے سے لیکن یہ نہیں جانتی کہ ہمارے ہر طرف تو اندھیرا ہی اندھیرا ہے۔ یہ دنیا تو محض دل کا بہلاوا ہے ورنہ جو اندھیرا ہمارے اردگرد موجود ہے اسے تو صرف موت ہی دور کر سکتی ہے۔"

"انکشاف" کہانی میں اس بات کو موضوع بنایا گیا ہے کہ ازدواجی زندگی کس طرح مشکلات سے دوچار ہوتی ہے۔ مذکورہ کہانی میں ازدواجی زندگی کی تباہی یا مشکلات غربت کی بنا پر نہیں ہے بلکہ کیلاش کے اس رویّے کی بنا پر ہے

بانہ یا وہ وقت خاص طور سے شام کا وقت دوستوں کے درمیان گزارتا ہے اور آخر کار بیوی کے توجہ دلانے سے گھر کی طرف توجہ دیتا ہے۔ یہاں افسانہ نگار نے یہ بتایا ہے کہ بعض بہت چھوٹی چھوٹی سی باتیں ہوتی ہیں، جن کے رس اور گہرے اثرات گھریلو زندگی پر اثر انداز ہو سکتے ہیں۔

واحد نظامی صاحب کا افسانہ "نیا مکان" پڑھ کر مجھے سعادت حسن منٹو کا افسانہ "ننگی آوازیں" یاد آ گیا۔ احب کی کہانی میں بھی میاں بیوی کی خلوت کو بیان کیا گیا تھا اور اصل مسئلے کی جانب توجہ دلائی گئی تھی کہ معاشی ں اور غربت کی وجہ سے "خلوت" خلوت نہیں رہ پاتی۔ "نیا مکان" میں بنیادی مسئلے ایک بڑے مکان سے ایک ے چھوٹے سے مکان میں آنے کے بعد ازدواجی زندگی جس بے کیفی اور بے لطفی کا شکار ہو جاتی ہے، کو بیان کیا گیا اس کے پس منظر میں افسانہ نگار نے غربت کے عفریت کی ہی نشاندہی کی ہے۔

"نیا مکان" کی تمام کہانیوں کا اسلوب سادہ ہے۔ افسانہ نگار تکنیک یا جدت پیدا کرنے کے بجائے حقیقی زندگی خال کھینچنے میں مصروف اور کامیاب نظر آتا ہے۔

کتاب کے ناشر واحد نظامی صاحب کے فرزند حیات نظامی نے اس کی اشاعت کا اہتمام کر کے اپنی محبت کا قرض ہے۔ امید ہے کہ تاریخ، ادب ان کا جو بھی مقام ہے اس کو یاد رکھے گی۔

اشفاق حسین
مدیر "اردو انٹرنیشنل" ٹورانٹو، کنیڈا

اردو تہذیب کی قدریں

(ٹورانٹو میں ۱۰ دسمبر ۱۹۸۹ء کو اس موضوع پر ایک مذاکرہ منعقد ہوا جس میں یہ مقالہ پیش کیا گیا)

کہتے ہیں سقراط جب زہر کا پیالہ پی چکا تو اس کے ایک شاگرد نے پوچھا کہ اے استاد ہم تیری تجہیز و تکفین کن رسموں کے مطابق کریں؟ "میری تجہیز و تکفین" سقراط ہنسا اور پھر سنجیدہ ہو کر کہنے لگا "میں نے تم لوگوں کو تمام عمر سمجھایا کہ لفظوں کو ان کے صحیح معنیٰ میں استعمال کیا کرو مگر معلوم ہوتا ہے کہ تمہیں ابھی بہت کچھ سیکھنا ہے۔ یاد رکھو کہ لفظوں کا غلط استعمال سب سے بڑا گناہ ہے" خواتین و حضرات یہ تو مجھے بھی معلوم نہیں کہ سقراط کے شاگردوں نے اس کی اس نصیحت پر کتنا عمل کیا لیکن آج کے سیمینار کا موضوع "اردو تہذیب کی قدریں" لفظوں کے صحیح استعمال پر غور و فکر کی دعوت ضرور دیتا ہے۔

جذباتی لحاظ سے اردو کو ایک تہذیب کہنا اچھا تو بہت لگتا ہے لیکن اس میں بڑی قباحتیں ہیں۔ اس لیے کہ اردو سے مراد اگر اردو زبان ہے تو اس کی کوئی علاحدہ سے تہذیب نہیں ہو سکتی کیونکہ کوئی بھی زبان کسی تہذیب، ثقافت یا کلچر کے صرف ایک پہلو کا اظہار کرتی ہے۔ یعنی اگر ہم تہذیب کو ایک چہرے سے تشبیہ دیں تو زبان اس کا صرف ایک عضو ہی کہلائے گی نہ کہ پورا چہرہ۔ چنانچہ اردو زبان کسی تہذیب کی نمایندگی تو کر سکتی ہے اور یقیناً اس زبان نے بڑے بھرپور انداز میں ایک تہذیب کی نمایندگی کی ہے لیکن اسے خود کوئی تہذیب نہیں قرار دیا جا سکتا۔

گفتگو کو ذرا اور آگے بڑھانے سے پہلے میں مناسب خیال کرتا ہوں کہ سب سے مشکل مرحلے یعنی تہذیب کی ریف اور اس کی وضاحت ابتدا ہی میں ہو جائے۔ ہماری زبان میں تہذیب، ثقافت، کلچر اور تمدن کے الفاظ کثرتِ استعمال سے آپس میں کچھ ایسے گڈمڈ ہو گئے ہیں کہ ان کے درمیان خطِ فاصل کھینچنا خاصا دشوار طلب مرحلہ ہے۔ یہی وجہ ہے کہ س کی کوئی جامع اور مختصر تعریف ممکن نہیں ہے۔ وسیع معنوں میں دیکھا جائے تو تہذیب سے مراد عام طور پر وہ طریقۂ ندگی اور سماجی کیفیت ہے جس میں کسی معاشرے کے افراد سانس لیتے ہیں۔ یہ سماجی کیفیت ان کے رہنے سہنے کے طریقوں، ن کے عادات و اطوار، ان کے رسم و رواج، ان کی پسند اور ناپسند، اچھائی اور برائی کے معیار، خوب صورتی اور بدصورتی ے تصورات، سلیقے اور بدسلیقگی کے فرق، ان کے لباس، ان کی غذا، ان کے سوچنے کا پیٹرن، آپس میں ملنے جلنے کے طریقے

رہائش کا انداز، ان کے مذہبی عقائد، ان کے فنونِ لطیفہ کی جمالیاتی قدریں اور ان کی زبان ۔ ان عام چیزوں کے مجمو
ہم کسی معاشرے کی تہذیب یا اس کا کلچر کہہ سکتے ہیں۔ تہذیب کی افزائش میں معاشرے کے تمام افراد حصہ لیتے ہیں
کچھ پہلو ایسے ہوتے ہیں جن کا براہِ راست تعلق تمام افرادِ معاشرہ سے نہیں ہوتا تہذیب کا یہ وہ ظاہری یا شعوری پہلو
جس میں تمام فنون مثلاً ڈراما، مصوری اور شعروادب شامل ہیں کسی بھی تہذیب میں زبان کی اہمیت دیگر اور چیزوں کی بہ
اس لیے اور بھی بڑھ جاتی ہے کہ اس کا اظہار دونوں تہذیبی شکلوں میں ہوتا ہے یعنی عام بول چال میں استعمال ہونے کی
سے اس کا تعلق تہذیب کے غیر شعوری پہلو سے وابستہ ہے جس میں چاہتے یا نہ چاہتے ہوئے بھی معاشرے کا ہر فرد شامل ہو
اور شعروادب کی تخلیق کی صورت میں لکھنے والا شعوری طور پر تہذیب کی افزائش میں حصہ دار بنتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ
کسی بھی تہذیب کی تعبیر میں انتہائی کلیدی کردار ادا کرتی ہے بلکہ زبان کو تہذیب کا بنیادی عنصر کہنا چاہیے۔

تہذیب کی نشوونما اور اس کی ترقی میں زبان کے اس انتہائی اہم رول کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے اب ذرا اردو ک
آئیے ۔ میں نے ابھی اوپر اشارتاً کہا کہ اردو تہذیب ایک بامعنی اصطلاح نہیں ہے لیکن سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اگر ا
ایک زبان ہے تو وہ کسی تہذیب کی نمایندگی بھی کرتی ہوگی ۔ آخر وہ تہذیب کیا ہے اور اس کی قدروں کا تعین کیسے
اس سلسلے میں دو راستے اختیار کیے جاسکتے ہیں پہلا تاریخی اور دوسرا جغرافیائی راستہ ہے ۔

تاریخی اعتبار سے دیکھا جائے تو اس برِّصغیر میں جسے ہم پاک و ہند کے نام سے جانتے ہیں۔ آٹھویں صدی عیس
میں مسلمانوں کی آمد اور مقامی لوگوں کے میل جول سے جس زبان کی بنیاد رکھی گئی اس نے آگے چل کر کئی صدی کے سف
بعد اردو کا رنگ اختیار کیا۔ جغرافیائی اعتبار سے دیکھا جائے تو سید سلیمان ندوی کے بقول اس کی ابتدا سندھ میں ہ
مولانا محمد حسین آزاد کے بیان کے مطابق اس کی ابتدا برج بھاشا یعنی دہلی کے آس پاس کے علاقوں میں ہوئی اور علامہ
محمود خاں شیرانی کی تحقیق کے مطابق اس کی ابتدا غزنویوں کے زمانے میں پنجاب میں ہوئی۔ علامہ شیرانی کے اس نظر
بابائے اردو مولوی عبدالحق نے ذرا سی ترمیم کے ساتھ یہ کہتے ہوئے قبول کیا کہ "اردو نے پنجاب میں جنم تو نہیں لیا لیکن اس
بیج پنجاب ہی میں پڑا"۔ ان تمام حوالوں سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ مسلمانوں کی آمد سے قبل اس برِّصغیر میں نہ تو ا
زبان یا اس سے ملتے جلتے نام کی کوئی چیز تھی اور نہ ہی کوئی ایسی تہذیب جس کی نمایندگی کے لیے اردو زبان کا نام لیا ج

برِّصغیر میں مسلمان حکمرانوں کا زمانہ ایک ہزار سال سے زیادہ کے عرصے پر محیط ہے ـــ آٹھویں صد
عیسوی میں سندھ، گیارھویں صدی عیسوی میں پنجاب اور تیرھویں صدی عیسوی میں وادیِ گنگ و جمن میں مسلم
کی آمد سے ہندستانی تہذیب میں ایک نیا، طاقتور اور جاندار عنصر داخل ہوا۔ اس نئے عنصر نے مقامی تہذیب کے
مل کر جس کا غالب رنگ ہند آریائی تھا کئی صدیوں کی آمیزش کے بعد ایک ایسی تہذیب کی نشوونما میں حصہ لیا
بعد میں گنگ و جمن کی تہذیب کہلائی۔ یہ گنگا جمنی تہذیب ہندستان کے دو بڑے تہذیبی دھاروں یعنی ہند ا
تہذیب اور ہند آریائی تہذیب کا آمیزہ تھی اور اس تہذیب کا بہترین ورثہ اردو زبان ہے۔

یہ تہذیب اپنے دامن میں ایک جانب عرب، ایران اور ترک تہذیب و تمدن کے ملے جلے اثرات لیے ہ

تھی تو دوسری جانب یہاں کی قدیم آریائی تہذیب کی مٹھاس بھی لیے ہوئے تھی۔ اس تہذیب میں ہندوستان کی مٹی سا
سوندھا پن تھا تو یہاں کے پھولوں کی مہک اور پھلوں کا رس بھی تھا۔ پنگھٹ کے گیتوں کی تانیں تھیں تو مقامی پرندوں
کی اڑانیں بھی تھیں۔ اسی تہذیب میں ترکوں کا جاہ وجلال تھا اور مغلوں کی گھن گرج بھی تھی۔ ایرانیوں کا جمالیاتی ذوق تھا
صوفیوں کا عام انسانوں سے پیار ومحبت بھرا لہجہ بھی تھا۔ جوگیوں اور سادھوؤں کا ترکِ دنیا کا انداز تھا اور فنونِ لطیفہ
کی اپنی لطیف کیفیات بھی تھیں۔

یہ تہذیب مسلمانوں کی آمد سے اچانک نہیں پیدا ہوئی بلکہ اس میں کم وبیش پانچ چھ صدیاں گزر گئیں تب جاکے کہیں
مقامی اور غیر مقامی مشترکہ تہذیب کے آثار پیدا ہوئے۔ ابتدا میں یہ دونوں تہذیبیں ایک دوسرے کے خلاف صف آرا
رہیں لیکن کوئی بھی تہذیب کسی دوسری تہذیب کو ختم نہ کرسکی۔ نہ تو ایسا ہوا کہ ایران کی طرح اسلام ساری مفتوح قوم پر مکمل
حاوی ہوسکا اور نہ ہی ایسا ہوا کہ اسپین کی طرح مفتوح قوم نے فاتح قوم کی تہذیب کو شدید نقصان پہنچایا یا مسلمان حکمرانوں
بالخصوص مغل حکمرانوں نے ____________ اپنی سیاسی حکمتِ عملی کی بنیاد آپس کے میل جول اور
ایک دوسرے کے احترام و رواداری پر رکھی تھی۔ اس حکمتِ عملی کے نتیجے میں ایک مخلوط تہذیب اور ایک نئی اور مخلوط
زبان کو فروغ ہوا جسے آج ہم اردو زبان کے نام سے جانتے ہیں۔

تہذیب کے معنی ومفہوم متعین کرنے اور اردو زبان کی ابتدائی نشوونما کے بارے میں مختصراً گفتگو کرنے کے بعد ہم ان
قدروں کی تلاش کا سلسلہ آگے بڑھاتے ہیں جنہیں اردو زبان سے وابستہ کیا جاسکے۔ اردو زبان اور یہ زبان جس تہذیب کی
نمائندگی کرتی ہے اس کی ایک بڑی قدر یا ویلیو ماضی میں اس کا سیکولر طریقہ فکر رہا ہے۔ سیکولر کے جدید اصطلاحی معنی سے قطع
نظر اردو شعر وادب میں ہمیشہ سے اور خصوصیت سے اس کی کلاسیکی شاعری میں، سیکولر فکر کی روایت نہ صرف بہت پرانی
بلکہ ہمیشہ سے زندہ و پائندہ ہے اس طرز فکر کے ہدف معاشرے کے وہ عناصر تھے جو ظلم وجبر کی علامت اور مذہب کے نام نہاد
علمبردار تھے۔ اردو کا شاید ہی کوئی ایسا کلاسیکی شاعر ہو جس نے ناصح، شیخ اور واعظ کو اپنے طنز کا نشانہ نہ بنایا ہو، فقیہہ شہر
کی پول نہ کھولی ہو اور پیرمغاں کی عبا وقبا کے پیچھے چھپے ہوئے سیاہ دل کو ہدفِ ملامت نہ بنایا ہو۔ اس دور میں سیکولر خیالات
و جذبات واحساسات کے اظہار کی یہی ایک صورت ممکن تھی۔ یہ روایت ہمیشہ سے اردو شاعری کی بڑی جاندار قدر رہی
ہے۔ اس سلسلے میں سیکڑوں مثالیں پیش کی جاسکتی ہیں مگر یہاں صرف چند اشعار جو یاد آرہے ہیں پیش کیے دیتا ہوں۔

میر کے دین ومذہب کا کیا پوچھتے ہو اب ان نے تو قشقہ کھینچا، دیر میں بیٹھا، کب کا ترک اسلام کیا

کہاں میخانے کا دروازہ غالب اور کہاں واعظ پر اتنا جانتے ہیں کل وہ جاتا تھا کہ ہم نکلے

تر دامنی پہ شیخ ہماری نہ جائیو دامن نچوڑ دوں تو فرشتے وضو کریں

اس سیکولر صداقت کے پروان چڑھنے میں سماجی طرز پر اس سیاسی حکمت عملی نے بڑی مدد دی جیسے مغل حکمرانوں نے اپنی سلطنت کی بنیاد بنائی، مغلوں نے کبھی اردو کی سرپرستی نہ کی بلکہ آخر وقت تک فارسی کو گلے سے لگائے رکھا لیکن وہ ایسے سیاسی اور سماجی حالات کو پیدا کرنے کے سبب سے جس کے نتیجے میں مسلمان اور ہندو دونوں نے مل کر سلطنت کے استحکام میں حصہ لیا۔ اس تاریخی عمل کا لازمی نتیجہ مخلوط تہذیب اور مشترکہ زبان کی شکل میں نکلا۔ اگر اردو زبان میں مسلمانوں کا فکری حصہ ہے تو دوسری جانب دوسرے مذاہب کے لوگوں کا بھی بہت بڑا کنٹری بیوشن ہے۔ پنڈت دیا شنکر نسیم رتن ناتھ سرشار، پریم چند، لوبت رائے نظر، برج نرائن چکبست، لالہ سری رام، پیارے لال آشوب، رام بابو سکسینہ، دیا ترائن نگم سورج نرائن مہر، تلوک چند محروم، لبھورام جوش ملسیانی، درگا سہائے سرور، رگھوپتی سہائے فراق گورکھپوری، پنڈت برج موہن دتاتریہ کیفی، ہری چند اختر، راجندر سنگھ بیدی، مالک رام، کرشن چندر، جگن ناتھ آزاد، رام لعل، اوپندر ناتھ اشک، رتن سنگھ اور سیکڑوں ایسے غیر مسلم شعرا اور ادبا کی ایک طویل فہرست ہے جن کی خدمات اردو زبان کی تاریخ کبھی نہ بھلا سکے گی۔

یہ مخلوط تہذیب اور اس سے متعلقہ زبان ابھی پوری طرح پروان بھی نہ چڑھی تھی کہ ہند کے سیاسی افق پر انگریزوں کی آمد نے اس تہذیب پر پہلا وار کیا۔ مشترکہ تہذیب، مشترکہ زبان اور متحدہ سیاسی قوت انگریزی سامراج کی راہ میں بہت بڑی دیوار تھی۔ انگریزوں نے پہلے دن سے ہندوؤں اور مسلمانوں کے بیچ تضاد اور بدگمانی کے بیج بونے شروع کیے۔ پھوٹ ڈالو اور حکومت کرو ان کی پالیسی کی ایک بنیاد تھی۔ بدیسی پالیسی مغلوں کی حکمت عملی کی عین ضد تھی۔ مغلوں نے اپنی سیاست کی بنیاد ہندو مسلم اتحاد پر رکھی تھی۔ انھوں نے دونوں کو آپس میں لڑانے کی کبھی کوشش نہیں کی بلکہ ایسے معروضی حالات پیدا کیے جن میں دونوں ایک دوسرے کے قریب آسکیں، ایک دوسرے کے عقائد و جذبات کا احترام کریں۔ جو اقدارِ زیست مشترک ہوں ان کو فروغ دیں اور جن روایات سے آپس میں دشمنی بڑھے یا عداوت پیدا ہونے کے امکانات ہوں ان سے ممکنہ حد تک اجتناب برتا جائے۔ اس کے بالکل برعکس انگریزوں نے تمام ایسے حالات پیدا کیے جن میں ہندوؤں اور مسلمانوں کی آپس کی خلیج وسیع سے وسیع ہوتی چلی جائے۔ اردو زبان اس صورتِ حال سے بری طرح متاثر ہوئی۔ اور آہستہ آہستہ یہ زبان صرف اور صرف اسلامیانِ ہند کے مقدر سے وابستہ ہو گئی۔ نتیجتاً اس کی سیکولر اور غیر مذہبی قدروں کے نقوش بھی آہستہ آہستہ ماند پڑنے لگے۔ یہ صورتِ حال نہ صرف ایک زبان بلکہ پوری تہذیب کا المیہ ہے۔

اسلامیانِ ہند کی جدید تاریخ کے تین مفکرین، سرسید احمد خاں، علامہ شبلی نعمانی اور علامہ اقبال کے افکار پر ایک سرسری نظر ڈالیے تو آپ کو اندازہ ہو جائے گا کہ ان سب کے ذہنوں میں ایک مشترکہ زبان، ایک مشترکہ اور ایک مشترکہ نصب العین کا تصور ابتدا میں نہایت واضح تھا۔ سرسید نے جنھیں برِصغیر میں دو قومی نظریے کا خالق بھی کہا جاتا ہے، بنارس ہندو یونیورسٹی کے قیام سے قبل ہندوؤں اور مسلمانوں کو ایک پلیٹ فارم پر جمع کرنے کی کوشش کرتے رہے اور ایک مشترکہ کلچر اور مشترکہ زبان کی مالا جپتے رہے۔ شبلی جیسا جید عالم اور مورخِ اسلام ایک نظم میں مغلوں کی ہندو گھرانوں میں شادیوں جیسے سیکولر رویوں کو ان الفاظ میں سراہتا ہے:

قرابت راجگانِ ہند سے اکبر نے جب چاہی
کہ یہ رشتہ عروسِ کشور آرائی کا زیور تھا
ولی عہدِ حکومت اور خود شاہنشہِ اکبر
گئے انبیر تک جو تخت گاہِ ملک و کشور تھا
دلھن کی پالکی خود اپنے کاندھوں پر جو لائے تھے
وہ شاہنشاہِ اکبر اور جہانگیر ابنِ اکبر تھا
یہی ہیں وہ شمیم انگیزیاں عطرِ محبت کی
کہ جن سے بوستانِ ہند برسوں سے معطر تھا

شبلی کی آنکھوں کے سامنے عطرِ محبت کی یہ شمیم انگیزیاں بوستانِ ہند سے نایاب ہوتی رہیں اور علامہ اقبال نے جن کی شاعری کی اٹھان اس سکولر رویے پر تھی کہ "مذہب نہیں سکھاتا آپس میں بیر رکھنا" اور جو ایک "نیا شوالا" کے خواب بننے ہوئے کہہ رہے تھے ؎

سونی پڑی ہوئی ہے مدت سے دل کی بستی   آ اک نیا شوالہ اس دیس میں بسا دیں

ان کو بھی بالآخر "نیا شوالہ" کے اس خواب کو چکنا چور کرنا پڑا کہ "میں خود اس خیال کا رہ چکا ہوں کہ امتیازِ مذہب اس ملک سے اٹھ جانا چاہیے اور اب تک پرائیوٹ زندگی میں اس پر کاربند بھی ہوں مگر اب میرا خیال یہ ہے کہ قومی تشخص کو محفوظ رکھنا ہندوؤں اور مسلمانوں دونوں کے لیے ضروری ہے" یہاں پر میں اس بات کی مزید وضاحت کرتا چلوں کہ سرسید یا اقبال اپنے ابتدائی تصورات پر نادم یا شرمندہ کبھی نہیں تھے البتہ نئے خیالات میں ان کی فکر وں نے نئے افق دریافت کر لیے تھے۔

مسلمانوں اور ہندوؤں کے درمیان اس خلیج کے پیدا ہونے کا سب سے زیادہ نقصان اردو زبان کو ہوا جو پیدائش کی وجہ آپس میں میل جول اور پیار محبت کی فضا کو پروان چڑھاتا تھا اور جس کے نتیجے میں اردو زبان میں سیکولر رویّہ کا پیدا ہونا ناگزیر تھا۔ ایسا نہیں ہے کہ اردو زبان سے اس کا سیکولر سرمایہ بالکل ختم ہو گیا ہو۔ آج بھی زبان کے سیکولر اور لبرل طرزِ فکر کے چشمے خشک نہیں ہوئے ہیں۔ لکھنے والوں کا ایک بڑا طبقہ آج بھی خود ساختہ مفتیوں اور بے سند فقیہوں کے عذاب کی زد میں ہے لیکن اب جب کہ بیسویں صدی کا آخری عشرہ شروع ہونے والا ہے اور اکیسویں صدی کی چاپ آہستہ آہستہ اپنے کانوں میں سن رہے ہیں۔ تھوڑی دیر کے لیے اپنے آپ سے یہ سوال کریں کہ کیا صدی اردو کے حوالے سے کسی پریم چند، کرشن چندر یا راجندر سنگھ بیدی کو جنم دے سکے گی؟

مکتوب ٹورانٹو (کینیڈا)

شامِ فیض

۱۲ر نومبر اتوار کی شام یہاں ماڈلینڈ کالجیٹ کے خوبصورت آڈیٹوریم میں فیض میموریل اکیڈمی آف کینیڈا نے فیض سیمینار اور مشاعرے کا اہتمام کیا جس کی صدارت معروف شاعر جناب قتیل شفائی نے فرمائی۔ اس محفل کی مہمانِ خصوصی فیض احمد فیض کی صاحبزادی محترمہ سلیمہ ہاشمی تھیں۔ نظامت کے فرائض کنگسٹن سے آئی ہوئی مہمان شاعرہ محترمہ نسیم سیّد نے انجام دیے۔ فیض اکیڈمی کے نگراں اعلیٰ جناب رحیم انجان کو افتتاحی گفتگو کے لیے اسٹیج پر مدعو کیا گیا جنھوں نے سامعین سے کہا کہ

"گنتی کے چند ہفتوں کی بھاگ دوڑ کے نتیجے میں ہم لوگوں کا یہاں اتنی تعداد میں اکٹھے ہو جانا ایک اہم واقعہ ہے جب کہ اس تقریب کی تشہیر بھی کوئی خاطر خواہ نہیں ہو سکی صرف یہاں کے پاکستانی ریڈیو پر وگرام صدائے پاکستان نے اپنی تقریباً تین ہفتہ وار نشریات میں فیض سیمینار کا ذکر کیا ہے۔ اور میں صدائے پاکستان کے میزبان جناب عادل تیموری اور ریڈیو پروگرام پروڈیوسر جناب حاجی ایوب قریشی کا بے حد شکر گزار ہوں جنھوں نے بغیر کسی معاوضے کے میری بھرپور مدد فرمائی ہے۔"

فیض جیسے بڑے نام کے احترام کا تقاضہ یہ ہے کہ خواہشوں کے اس کاغذی محل میں عمل اور فیض کے زندگی بھر کے پیغامِ امن اور انسان دوستی کی شمعیں روشن کی جائیں۔ معاف کیجیے، فیض کے پیغامِ امن اور انسان دوستی کی شمعیں تو پہلے ہی سے روشن ہیں۔ بس ہماری حقیر سی کوشش تو یہ ہونی چاہیے کہ انھیں بجھنے نہ دیا جائے اور پاک و ہند اور شمالی امریکہ میں اردو ادب پر نظر رکھنے والے دانشوروں کی سرپرستی میں فیض کے پیغام کو آگے بڑھاتے رہیں اور اسی ضرورت کے پیشِ نظر ہم نے فیض اکیڈمی کی بنیاد اپنی بے سروسامانی کے صحن میں رکھی ہے۔ اپنی بے سروسامانی کے ضمن میں یہی کہہ سکتے ہیں کہ ہم اپنے بزرگوں سے سنتے آئے ہیں کہ اگر اپنے سفر کی ضرورت پر یقین ہو، قوتِ سفر میں خلوص اور سچائی ہو تو کٹھن سے کٹھن تر مسافتیں آسان ہو جاتی ہیں اور ہمیں نہ اپنی سچائی اور خلوص پر کوئی شک ہے اور نہ ہی محبانِ فیض کی فیض سے محبت پر کوئی شبہ ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہم آئندہ ہر سال انشاءاللہ یومِ فیض مناتے رہیں گے اور یومِ فیض میں پڑھے گئے مقالات و مضامین کی اشاعت کا اہتمام بھی کرتے رہیں گے۔ لیکن ہم آئندہ کبھی بھی فیض کی برسی نہیں منائیں گے۔ اس لیے کہ فیض نہ مرے ہیں اور نہ ہی کبھی مریں گے۔ وہ غالب، اقبال اور سبھی بڑے انسانوں کی طرح ہمیشہ زندہ رہیں گے۔

مجھے بڑی شرمندگی اور افسوس کے ساتھ یہ اعلان کرنا پڑ رہا ہے کہ جناب جمیل الدین عالی اچانک شدید قسم کے فلو کا شکار ہوجانے کی وجہ سے تشریف نہیں لاسکے۔ جب کہ حقیقت یہ ہے کہ فیض کے نام پر انھوں نے بغیر کسی شرط اور معاوضے کے اس تقریب میں شرکت کے لیے حامی بھرلی تھی اور کینیڈا کا ویزا بھی لے لیا تھا لیکن کراچی سے ان کی روانگی سے دو دن پہلے اچانک انھیں شدید قسم کے فلو اور بخار نے مجبور و بے بس کر دیا۔

میں جناب عابد جعفری اور جناب جمال زبیری کا بے حد شکرگزار ہوں جن کا بھرپور تعاون اس تقریب کی کامیابی کی بنیاد ہے۔

رحیم انجان صاحب کے بعد جناب اشفاق حسین اور جناب حفظ الکبیر قریشی نے فیض کی شاعری پر خوبصورت مقالے پڑھے جنھیں سامعین نے بڑی توجہ اور دلچسپی سے سنا اور پسند کیا۔

تقریب کی مہمانِ خصوصی محترمہ سلیمہ ہاشمی نے کہا، الفاظ کی توڑ جوڑ ہمارا مسئلہ نہیں ہے لیکن میں رحیم انجان صاحب کے اصرار پر اپنے ابو کے بارے میں چند باتیں کروں گی اور اس کے بعد اپنی پینٹنگز کے سلو لائیڈز پر وجیکٹر کی مدد سے دکھا کر ٹینا ثانی کی آواز میں فیض کی دو نظمیں شام اور میرے دل میرے مسافر سنواؤں گی۔ اور آخر میں فیض کی نظم دعا فیض کی زبانی سنیں گے۔

محترمہ سلیمہ ہاشمی صاحبہ کی اپنے عظیم والد فیض صاحب کے بارے میں گفتگو اور اس کے بعد ان تین نظموں کا سامعین پر بڑا گہرا اثر ہوا۔ محترمہ سلیمہ ہاشمی صاحبہ ہمارے سمینار کی آخری مقرر تھیں اور پروجیکٹر پر سلو لائیڈز کی مدد سے فیض کی تین نظموں کے بعد وقفہ اور اس کے بعد مشاعرہ شروع ہوتا تھا۔ محترمہ سلیمہ ہاشمی صاحبہ نے صدر فیض سمینار جناب قتیل شفائی سے اظہارِ خیال کے لیے کہا۔ جناب قتیل شفائی نے فرمایا:

میں مقرر نہیں ہوں کہ فیض پر کوئی لمبا چوڑا مکالمہ کروں۔ البتہ فیض صاحب سے دیرینہ تعلقات اور ان کی عادات و اطوار سے آشنائی کی بنا پر میں ایک بات بڑے یقین کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ اللہ نے فیض کو پیغمبرانہ صبر و تحمل اور اخلاقِ حسنہ سے نوازا تھا۔ جناب قتیل شفائی نے اپنی بات کی وضاحت میں چند ایسے واقعات سنائے جنھیں سن کر معلوم ہوتا تھا کہ فیض واقعی بہت بڑے انسان تھے۔

چائے کا وقفہ ہوا اور اس کے بعد مشاعرہ۔ تمام شعرائے کرام نے سامعین سے داد حاصل کی اور ظاہر ہے اس مشاعرے کے حاصل مشاعرہ سب سے بڑے شاعر جناب قتیل شفائی تھے۔ اور جب وہ آئے تو سامعین میں زندگی کی لہر دوڑ گئی۔ جناب قتیل شفائی کو ان کے ایک ایک شعر پر خوب داد ملی۔

شمیم صبائی متھراوی

سنہ نواسی میں جدا ہو گئے ہم سے یہ لوگ

۱۹۸۹ء

(۱)

"اسلم پہلوان ماہِ ریاضِ بہشت"

۱۹۸۹ء

موت کے ہاتھوں ہوئے چپ آہ اسلم پہلوان
پہلوانی کے افق کا تھے وہ روشن آفتاب

ان کی رحلت پر پکارا ہاتفِ غیبی شمیمؔ
"گلشنِ جنت میں اسلم پہلواں ہے باریاب"

۱۴۰۹ھ

(پاکستان کے نامور پہلوان، رستمِ ہند امام بخش پہلوان کے فرزند اور رستمِ ہند گاما پہلوان کے بھتیجے جناب اسلم پہلوان (عرف اچھا پہلوان) نے ۷ رجنوری ۱۹۸۹ء مطابق ۲ رجمادی الاوّل ۱۴۰۹ھ بروز ہفتہ بعمر ۵۹ سال لاہور میں انتقال فرمایا اور وہیں مدفون ہوئے۔)

(۲)

"لیفٹیننٹ جنرل واجد علی برکی راہیِ جناں"

۱۹۸۹ء

اٹھ گئے برکی آج جہاں سے
وجہِ الم ہے رحلت برکی

نکلا شمیمؔ یہ سالِ رحلت
"حالِ سکونِ تربتِ برکی"

۱۴۰۹ھ

(سابق وفاقی وزیر اور کالج آف فزیشن اینڈ سرجنز پاکستان کے بانی صدر لیفٹیننٹ جنرل (ریٹائرڈ) واجد علی خاں برکی نے ۱۷رجنوری ۱۹۸۹ء مطابق ۸ رجمادی الثانی ۱۴۰۹ھ بروز سہ شنبہ بعمر ۸۹ سال راولپنڈی میں رحلت کی۔ ان کی

تدفین، چہارشنبہ کو راولپنڈی میں ہی ان کے آبائی قبرستان میں عمل میں آئی۔)

(۳)

"شبیر افضل جعفری صاحب جناں"

۱۹۸۹ء

شبیر افضل جعفری بھی آہ رخصت ہو گئے — ہو گیا ہم سے جدا اک شاعرِ شیریں بیاں
معجمہ صنعف میں یہ تاریخ ہے ان کی شمیم — "شبیر افضل جعفری ہے آج کل مہبرِ جناں"

۱۴۰۹ھ (معجمہ)

(ممتاز اردو شاعر جناب شبیر افضل جعفری نے ۲۲ جنوری ۱۹۸۹ء مطابق ۱۳ جمادی الثانی ۱۴۰۹ھ بروز بعمر ۸۰ سال جھنگ میں انتقال فرمایا۔ مرحوم کو اسی دن سپردِ خاک کر دیا گیا۔)

(۴)

"مولانا عبدالقدوس ہاشمی فریفتۂ جنّت"

۱۹۸۹ء

مولانا ہاشمی کو جو عالم تھے دین کے — حکمِ خدا سے آج ملا انتظامِ خُلد
تاریخِ مرگ ان کی شمیم حزیں ملی — "مولانا ہاشمی ہوئے شاہِ انامِ خُلد"

۱۴۰۹ھ

(ممتاز مذہبی اسکالر، فقیہہ، عالم اسلام ورلڈ فقہ کونسل، رابطۂ عالم اسلامی کے رکن، حکومتِ پاکستان کے برائے امورِ اسلامی شریعت۔ مولانا سید عبدالقدوس ہاشمی نے ۲۶ جنوری ۱۹۸۹ء مطابق ۱۷ جمادی الثانی ۱۴۰۹ھ بروز بعمر ۸۰ سال کراچی میں انتقال فرمایا۔ انھیں جمعرات کی شام سخی حسن کراچی کے قبرستان میں سپردِ خاک کر دیا گیا۔)

(۵)

"قصۂ رحلتِ صادق الخیری"

۱۹۸۹ء

"مرگِ صادق الخیری باعثِ الم نکلی — علم و فن کے دریا میں ناؤ رنج کی تیری
جب شمیم نے ڈھونڈا سالِ انتقال ان کا — بن گیا سنِ رحلت "رنجِ صادق الخیری"

۱۴۰۹ھ

(ممتاز ناول نگار اور مرحوم علامہ راشد الخیری کے صاحبزادے جناب صادق الخیری نے ۲۶ جنوری ۱۹۸۹ء مطابق ۱۷ جمادی الثانی ۱۴۰۹ھ بروز جمعرات بعمر ۷۲ سال کراچی میں رحلت فرمائی۔ مرحوم کو سخی حسن قبرستان میں جمعرات کی سہ پہر سپردِ خاک کر دیا گیا۔)

(۶)
"مولانا ادریس میرٹھی علامۂ عالمِ خلد"

۱۹۸۹ء

حکمِ خدا سے چل بسے ادریس میرٹھی — ممتاز دینی پیشوا ان جیسے کم ہوئے
تاریخِ مرگ ان کی ملی یوں شمیمؔ کو — "ادریس میرٹھی بھی مقیمِ ارم ہوئے"

۱۴۰۹ھ

(ممتاز عالمِ دین، وفاق المدارس العربیہ کے صدر اور جامعۃ العلوم الاسلامیہ بنوری ٹاؤن کے استادِ حدیث مولانا ادریس میرٹھی نے ۲ر فروری ۱۹۸۹ء مطابق ۲۴ر جمادی الثانی ۱۴۰۹ھ بروز جمعرات بعمر ۸۷ سال کراچی میں انتقال فرمایا۔ مرحوم بعد نمازِ مغرب دارالعلوم کورنگی کے قبرستان میں سپردِ خاک کر دیا گیا۔)

(۷)
"ملال انگیز وفات حاجی مولا بخش سومرو"

۱۹۸۹ء

حاجی مولا بخش بھی دنیائے فانی سے اٹھے — چھین لی دستِ اجل نے آج ان کی زندگی
ہے یہی تاریخِ رحلت ان کی خاطر اے شمیمؔ — "چل بسے ملکِ عدم میں آج مولا بخش بھی"

۱۴۰۹ھ

(ممتاز و بزرگ سیاست داں، سابق وفاقی وزیر، سینیٹر احمد میاں سومرو سابق وفاقی وزیر الٰہی بخش سومرو سابق ریاستی وزیر افتخار سومرو اور ڈاکٹر منظور سومرو کے والد سردار حاجی مولا بخش سومرو نے ۳ر فروری ۱۹۸۹ء مطابق ۲۵ جمادی الثانی ۱۴۰۹ھ بروز جمعہ کراچی میں رحلت کی۔ ان کی میت تدفین کے لیے شکارپور لے جائی گئی جہاں ہفتہ کی شام ان کے آبائی قبرستان پنج پیر میں سپردِ خاک کر دیا گیا۔)

(۸)
"سنہ ارتحال اعجاز حسین حضروی"

۱۹۸۹ء

اعجاز حضروی تھے اک بے مثال گائک — ان کی وفات پر ہم وابستۂ غمی ہیں
بولا شمیمؔ سے یوں رضوانِ باغِ جنت — لکھ "کوچۂ جناں میں اعجاز حضروی ہیں"

۱۴۰۹ھ

(برِ صغیر کے منفرد موسیقار اور مغنی، ممتاز غزل نواز، کلاسیکی و نیم کلاسیکی موسیقی کے مشہور گائک جناب اعجاز حسین حضروی ۵ر فروری ۱۹۸۹ء مطابق ۲۷ر جمادی الثانی ۱۴۰۹ھ بروز اتوار راولپنڈی میں انتقال فرمایا۔)

(۹)

"شامِ ہجر بیگم خورشید مرزا"

۱۹۸۹ء

چل بسیں انجمنِ دہر سے بیگم مرزا		مرگِ فنکارۂ نامی سے ملی غم کی نوید
ان کی تاریخِ فنا سوچ رہا تھا جو شمیم		بن گیا سالِ الم "دردِ و داغِ خورشید"

۱۴۰۹ھ

(فلم، ریڈیو، ٹی وی اور اسٹیج کی نامور اور کہنہ مشق فنکارہ بیگم خورشید مرزا (اکا بوا) نے ۸ر فروری ۱۹۸۹ء مطابق یکم رجب المرجب ۱۴۰۹ھ بروز چہارشنبہ بعمر ۸۳ سال لاہور میں رحلت فرمائی ۔)

(۱۰)

"سید گل حسن رضوی امروہوی جنّتی"

۱۹۸۹ء

گل حسن رضوی سا شاعر چل بسا		اب کہاں سے ان کا ثانی لائیے
بولا رضواں یوں سنِ رحلت شمیم		"گل حسن رضوی جناں میں آئیے"

۱۴۰۹ھ

(ممتاز شاعر سید گل حسن رضوی امروہوی نے ۲۲ر فروری ۱۹۸۹ء مطابق ۱۵ر رجب المرجب ۱۴۰۹ھ بروز چہارشنبہ بعمر ۷۰ سال کراچی میں داعیِ اجل کو لبیک کہا۔)

(۱۱)

"رحلتِ دیدہ ور جناب مہر اکبر آبادی"

۱۴۰۹ھ

جب مہر کی حیات کا سورج ہوا غروب		اور لب پہ رنج و غم کا فسانہ مچل اٹھا
تاریخِ مرگ ان کی ملی یوں شمیم کو		"اک اور پاک لہجہ امیرِ غزل اٹھا"

۱۹۸۹ء

(ممتاز شاعر جناب علی سجاد مہر اکبر آبادی نے ۲۸ر فروری ۱۹۸۹ء مطابق ۲۱ر رجب المرجب ۱۴۰۹ھ بروز شنبہ بعمر ۷۰ سال اسلام آباد میں رحلت فرمائی۔ تدفین اسی شام اسلام آباد کے قبرستان (نزد تریہ وپائنٹ) میں عمل میں آئی ۔)

(۱۲)

"ہائے غمِ ارتحالِ اے آلِ اکرم"

۱۹۸۹ء

اُٹھ گئے جنرل اے آئی اکرم اور ملال بے پایاں غم
ہے یہ شمیمؔ ان کا سنِ رحلت "برزخ قضائے اے آئی اکرم"

۱۴۰۹ھ

(ممتاز اسکالر، ادیب اور "دی سورڈ آف اللہ" کے مصنف، ریٹائرڈ لیفٹیننٹ جنرل اے آئی اکرم (علی ابراہیم اکرم) نے ۴ر مارچ ۱۹۸۹ء مطابق ۲۵ر رجب المرجب ۱۴۰۹ھ بروز ہفتہ بعمر ۶۵ سال اسلام آباد میں رحلت کی۔ انھیں سہ پہر کو راولپنڈی کے فوجی قبرستان میں سپردِ لحد کر دیا گیا۔)

(۱۳)

"بزمی انصاری راوی ریاضِ فردوس"

۱۹۸۹ء

بزمی انصاری بھی تج کر دہر کو بن گئے صدرِ کبیرِ بزمِ خلد
ان کی تاریخِ فنا لکھ دے شمیمؔ "بزمی انصاری ہیں میر بزمِ خُلد"

۱۴۰۹ھ

(ممتاز دانشور، اسکالر، ادیب و محقق اور سابق افسرِ اطلاعاتِ پاکستان جناب بزمی انصاری نے ۹ر مارچ ۱۹۸۹ء مطابق ۲ر شعبان المعظم ۱۴۰۹ھ بروز چہارشنبہ کراچی میں رحلت کی۔ انھیں سخی حسن کے قبرستان میں سپردِ خاک کیا گیا۔)

(۱۴)

"افسانۂ ہجرِ جسٹس مولوی مشتاق حسین"

۱۹۸۹ء

تج کے قصرِ گلشنِ ہستی شمیمؔ مولوی مشتاق جس دم چل بسے
بولا ہاتف بہرِ تاریخِ اجل "مولوی مشتاق صد حیف اُٹھ گئے"

۱۴۰۹ھ

(لاہور ہائی کورٹ کے سابق چیف جسٹس مولوی مشتاق احمد نے ۳۰ر مارچ ۱۹۸۹ء مطابق ۲۱ر شعبان المعظم ۱۴۰۹ھ بروز پنج شنبہ بعمر ۶۵ سال لاہور میں داعی اجل کو لبیک کہا۔ مرحوم کو جمعہ کی سہ پہر گارڈن ٹاؤن میں ان کے آبائی قبرستان میں سپردِ خاک کر دیا گیا۔)

(۱۵)

"دردِ ارتحالِ پروفیسر مجتبیٰ حسین"

۱۹۸۹ء

اک حادثے میں کار کے لاہور میں کہ آہ
بزمِ جہاں کو چھوڑ گئے مجتبیٰ حسین
تاریخِ انتقال ملی یوں شمیم کو
"دارِ فنا سے آج اُٹھے مجتبیٰ حسین"
۱۴۰۹ھ

(بلوچستان یونیورسٹی کے شعبۂ اردو کے سربراہ، مصنّف اور معروف قلم کار پروفیسر مجتبیٰ حسین یکم اپریل ۱۹۸۹ء مطابق ۲۳ شعبان المعظم ۱۴۰۹ھ بروز ہفتہ بعمر ۶۶ سال لاہور میں ٹریفک کے ایک حادثے میں جاں بحق ہوگئے۔ مرحوم کا جسد خاکی کراچی لایا گیا اور تدفین اتوار کے دن سخی حسن کے قبرستان میں عمل میں آئی۔)

(۱۶)

"دلدوز انتقال پیر محفوظ علی"

۱۹۸۹ء

پیر محفوظ علی چھوڑ کے باغِ ہستی
جاچکے ہیں ملک الموت کے ہمراہ کہو
ان کی تاریخِ فنا چاہیے تم کو جو شمیم
"پیر محفوظ علی آج چلے آہ" کہو
۱۴۰۹ھ

(ممتاز علم دوست صنعت کار پیر محفوظ علی نے ۴ اپریل ۱۹۸۹ء مطابق ۲۶ شعبان ۱۴۰۹ھ بروز سہ شنبہ لندن میں رحلت کی۔ مرحوم کی میت کراچی لائی گئی اور تدفین ۶ اپریل ۱۹۸۹ء بروز جمعرات محفوظ فام ملیر سٹی میں عمل میں آئی)

(۱۷)

"مکینِ قبر ڈاکٹر فاضل زیدی"

۱۹۸۹ء

ڈاکٹر فاضل کی رحلت سے شمیم
اُٹھ گیا اک شاعرِ قابل لکھو
آپ کی تاریخِ رحلت کے لیے
"چل بسے رنگیں بیاں فاضل" لکھو
۱۴۰۹ھ

(ہندستان کے ممتاز شاعر میر مہدی مجروحؔ کے پوتے اور ایس ایم سائنس کالج کراچی میں شعبۂ اردو کے پروفیسر ڈاکٹر سبطِ حسن فاضل زیدی شاہ پوری نے ۷ اپریل ۱۹۸۹ء مطابق ۱۰ رمضان المبارک ۱۴۰۹ھ بروز پیر کراچی میں خالقِ حقیقی سے جاملے۔)

(۱۸)

"مرقد یگانۂ جہاں مولانا سید ظفر حسن"

۱۹۸۹ء

ممتاز شیعہ عالمِ دیں تھے ظفر حسن
جو تج گئے بحکم خدا دہر کا چمن
لکھ اے شمیم آپ کے لوحِ مزار پہ
تاریخِ انتقال "مکانِ ظفر حسن"
۱۴۰۹ھ

(ممتاز شیعہ عالمِ دین، ادیبِ اعظم، مفسّرِ قرآن اور جامعۂ امامیہ بلبرسٹی کے بانی مولانا سیّد ظفر الحسن امروہوی نے ۹ مئی ۱۹۸۹ء مطابق ۳ شوال المکرم ۱۴۰۹ھ بروز منگل بعمر ۸۴ سال کراچی میں رحلت کی۔ انھیں جامعۂ امامیہ میں سپردِ خاک کیا گیا۔)

(۱۹)

"صد حیف ارتحالِ ضیا حسین پوری"

۱۹۸۹ء

شاعرِ خوش بیاں ضیا نے جب — بزمِ دنیا کے دوں سے ہجرت کی
بولا ہاتف شمیم سے آکر — "دُمِ ہجرِ ضیا حسین پوری"

۱۴۰۹ھ

(ممتاز صاحبِ دیوان شاعر جناب ضیا حسین پوری (نام ضیا احمد مشتاق) نے ۱۲ مئی ۱۹۸۹ء مطابق ۶ شوال المکرم ۱۴۰۹ھ بروز جمعہ بعمر ۸۷ سال اسلام آباد میں انتقال فرمایا۔ مرحوم کو اسی دن بعد نماز عصر اسلام آباد کے قبرستان (نزد زیرو پائنٹ) میں سپردِ لحد کیا گیا۔)

(۲۰)

"جاں گداز داغِ اجل بریگیڈیر طارق محمود"

۱۹۸۹ء

موت سے کھیلنے والا طارق — ہوگیا بود سے جس دم نابود
یوں شمیم ان کا سنِ مرگ ملا — "دفعتاً اُٹھ گئے طارق محمود"

۱۴۰۹ء

(پاک فوج کے مایۂ ناز کمانڈو اور سپیریر سروسز گروپ (SUPERIOR SERVICES GROUP) کے بریگیڈیر طارق محمود ۲۹ مئی ۱۹۸۹ء مطابق ۲۳ شوال المکرم ۱۴۰۹ھ بروز پیر فری فال انداز میں چھلانگ لگاتے ہوئے پیراشوٹ نہ کھلنے کے باعث گجرانوالہ میں گر کر شہید ہوگئے۔ نعش راولپنڈی لائی گئی اور پورے فوجی اعزاز کے ساتھ منگل کی صبح مرحوم کے آبائی جدید قبرستان واقع ڈھوک الٰہی بخش راولپنڈی سپردِ لحد کی گئی۔)

(جاری)

گل ہائے رنگ رنگ

پنجابی کہانی

رانی نگندر / جاوید دانش

گرین کارڈ

جاڑے کی ایک سرد شام، مین ہاٹن ہیرالڈ اسکوائر، وقت پونے پانچ، خنکی ۳۴ ڈگری فارن ہائیٹ۔ چاروں سمت نہ ختم ہونے والی چوڑی سڑکیں، سڑکوں پر بھیڑ، متبنی شور، بھاگتے نوک دار جوتے۔ ادھورے بھٹکتے سپنے، پھسلتی لمبی کاریں پچھلے آدھ گھنٹے سے میں ہر آتی جاتی ٹیکسی کو ہاتھ کے اشارے سے روکنے کی ناکام کوشش کر رہی ہوں مگر کوئی رکنے کا نام نہیں لیتا جی میں آیا زمین دوز ریل لے لوں مگر اس وقت اس کی بھیڑ سے وحشت ہو رہی تھی۔ سوچا تھوڑی دیر اور دیکھ لوں ــ اچانک ایک لمبی پیلی اپالا ٹیکسی خود بخود سامنے آکر رک گئی۔ عجیب شہر ہے! پچھلی سیٹ پر سامان پھینکتے ہوئے میں نے فوراً خود کو اندر دھکیلا کہ کہیں یہ ٹیکسی بھی ہاتھ سے نہ نکل جائے ــ بیٹھتے ہوئے میں نے "فارسٹ ہل کوئنز" کا پتا بتایا اور ٹیکسی چل پڑی! خود کو بھاری بھرکم گرم کوٹ سے آزاد کر کے میں نے آنکھیں موندلیں۔ سارے دن کی تھکن، پتا نہیں کب آنکھ لگ گئی۔ جب آنکھ کھلی تو دیکھا ٹیکسی شہر کے وسط سے نکل کر ٹول مشین کی لائن میں لگی تھی اور ڈرائیور کھڑکی سے سر نکالے مشین میں ٹوکن ڈال رہا تھا۔ کلیرنس ملتے ہی ٹیکسی دوبارہ سڑک پر پھسلنے لگی۔ گلے میں پھنسے مفلر کی گرفت کو ڈھیلا کرتے ہوئے میں نے ریئر ویو کے شیشے میں جھانکتے ہوئے چشمے کی کمانی کو ناک پر درست کیا۔ ساتھ وائیں بائیں بھی دیکھ لیا۔

آج تھکن کی وجہ سے معمول کے خلاف ٹیکسی میں میری آنکھ لگ گئی ورنہ ٹیکسی میں بیٹھ کر مجھے ہمیشہ اس بات کا احساس رہتا ہے کہ ٹیکسی ڈرائیور کا ساتھ بھلے ہی چند منٹوں کا کیوں نہ ہو اس کا اثر سواری پر ضرور پڑتا ہے۔ پھر باتیں کرتے رہنے سے شہر کے اندرونی حالات کا نقشہ سامنے آجاتا ہے ساتھ ہی ڈرائیور سے کسی اوچھی حرکت کا اندیشہ نہیں رہتا۔ میرے خیال میں بنیادی طور پر ساری دنیا کا ٹیکسی ڈرائیور ایک ہی قماش کا ہوتا ہے۔ ہاں، امریکن ڈرائیور باتیں کچھ زیادہ ہی کرتا ہے۔ موسم سے لے کر تھاٹر کا بھاڈیا پھر کسی ٹی وی اسٹار کے عشق اور طلاق کی داستان اس سے کوئی موضوع بچا نہیں ہے۔ میں سوچ رہی تھی کہ یہ ڈرائیور ابھی تک چپ کیوں کر ہے؟ پھر خاموشی کی کمان سے پہلا تیر میں نے پھینکا۔ "آج خاصی ٹھنڈ ہے۔" ادھر سے کوئی آواز نہ آئی ـ شاید میری آواز راستے ہی میں جم گئی ہو ــ میں نے پھر کہا۔ "آج خنکی ۳۴ ڈگری ہے کیوں؟" "جی ـ بی بی ــ ویسے فارسٹ ہل میں کدھر جانا ہے" اس بار پکے دیسی لہجے نے مجھے چونکایا ــ "کیو گارڈنز" پھر ایک طویل چپ ــ

میں کھڑکی کی ایک آنکھ سے باہر ایک طرف آسمان پر گھرے بوجھل دھوئیں کے بادلوں اور دوسری طرف ٹھنڈی پیلی دھوپ میں سپنوں میں گم سہم آسمان سے ٹنگی برجیوں اور ناگن سی بل کھاتی سڑکوں کو تکنے لگی ـــــ "کہاں کے ہو؟" باہر کے شور میں میرا سوال ضرور کہیں گم ہو جاتا اگر گاڑی کے شیشے بند نہ ہوتے ـــ عجیب شے ہے میں نے دل میں سوچا ــ یہ بھی ہو سکتا ہے اونچا سنتا ہو۔ میں نے پھر بات چھیڑی۔ "کہاں کے ہو بھائی؟" "جی پنجاب کا ہوں" "کون سی جگہ؟" جی بٹالہ! آپ کبھی بٹالے گئے ہو؟" اس نے میرے سوال کے ساتھ اپنا سوال جوڑ دیا۔ ہاں ــ تین چار بار جانے کا اتفاق ہوا ہے۔ دراصل میرے ماما جی رہتے ہیں وہاں۔" کون جی؟" بڑے چاؤ سے چہکتے ہوئے اس نے پوچھا ــ "روز سینما والے بیدی صاحب ــ وہی جن کا روز سٹوڈیو بھی ہے؟" "ہاں ہاں وہی بیدی صاحب۔" ان کو کون نہیں جانتا جی ــ ان کے بیٹے روسی کے ساتھ اپنا اٹھنا بیٹھنا رہا ہے۔ جب ہی مجھے لگ رہا تھا کہ آپ کو کہیں دیکھا ہے۔" میں یہ کہہ کر اس کا دل دکھانا نہیں چاہتی تھی کہ میں نے پہلے اسے کہیں نہیں دیکھا۔ اس نے شیشے میں غور سے میری طرف تاکا۔ بے خیالی کا دکھاوا کرتی میں باہر دیکھنے لگی۔ نام کیا ہے تمہارا؟ "جی، دیپک۔ پر یہاں دوست لوگ مجھے شپی کہتے ہیں شپی ــ جی ہاں شپی کار گو شپ میں کام کرتا تھا۔ ایک بار ہمارا جہاز "نیویارک ہاربر" پر لگا۔ سبھوں کو "شور لیو" (SHORE LEAVE) ملی۔ میری ابھی تک ختم نہیں ہوئی وہ دن اور آج کا دن اس ظالم شہر سے باہر قدم نہیں رکھا۔ دیپک تو دیس رہ گیا ــ شپی پردیس بس گیا" خیر شپی نام دلچسپ ہے۔ "جی، یار لوگ بھی یہی کہتے ہیں۔ میں کہتا ہوں بھائی بندھو یہ نام تم رکھ لو مجھے سبز پتا دلوا دو۔ سبز پتا، ابھی گرین کارڈ۔ اور تو ادھر آئے کتنا عرصہ ہوا ــ" ہو نہ مہینہ کم آٹھ سال ہونے کو آئے! ابھی تک اپنی گاڑی تو ٹیشن پر جولائی تول کھڑی ہے۔ گھر کے نہ گھاٹ کے۔ دھوبی کا کتا بن کر رہ گئے ہیں بس" تو اس کے صبر کا پیمانہ بھی چھلکنے والا ہے۔ میں سوچنے لگی یہ کوئی نئی بات نہیں۔ پردیس میں کتنے لوگ یونہی اندر اندر سلگتے رہتے ہیں چاؤ سے دیس جاتے ہیں کیسر یہاں کا جادو کھینچ لاتا ہے۔ شادی نہیں کی؟" جی کی تھی۔ لڑکی اسپینش تھی رہتی الگ تھی مگر خرچا میں دیتا تھا امیگریشن والوں کو پتا چل گیا، بنتی بات بگڑ گئی۔ اب تو جی ایمنسٹی ایکٹ پاس ہو گیا تو سبز پتا ہمیں بھی مل جائے گا پر وقت لگے گا"

گھر پر کون کون ہے؟" ماں باپ اور ایک بہن پر بہن شادی شدہ ہے۔ سبز پتا ملے تو بڈھے بوڑھی کو یہاں بلا لوں ادھر میں اکیلا ادھر وہ جُل خراب، اس پر پنجاب کے حالات۔" گھر سے خط آیا ہے؟ "ہاں بہن کبھی کبھی لکھتی ہے ــ باتوں اور گاڑی کی تیز رفتار میں پتا ہی نہ چلا کب میرے گھر کا موڑ آ گیا ــ بس بس یہیں داہنے ہاتھ پر اس اونچی بلڈنگ کے آگے روک دو۔ میں نے کرائے والی چھوٹی کھڑکی سے پیسے اس کی طرف بڑھائے۔ "کیوں شرمندہ کر رہی ہو بہن جی۔ پیسہ تو روز کماتے ہیں ایک دن نہ سہی"۔ یہ کہتے ہوئے وہ گاڑی سے اترا، سامان نکالنے میں میری مدد کی۔ میں نے پہلی بار سر سے پاؤں تک اسے دیکھا ــ سانولا رنگ نکلتا ہوا قد بجھی بجھی بڑی آنکھیں ہپیوں جیسے لمبے بال۔ بے ترتیب ڈاڑھی۔ میلی جینز اور مٹیالی جیکٹ۔ اس کا سراپا مجھے مرجھایا سا لگا۔ مجھے گھورتے دیکھ کر اس نے نظریں نیچی کر لیں۔ "اچھا اب چلتا ہوں ــ یہ میرے گیراج کا کارڈ، کبھی ضرورت پڑے تو فون کر لینا۔" بات آئی گئی ہو گئی۔

تین چار ہفتے بعد سپر مارکیٹ میں بازار کر رہی تھی، ہلکی سی جانی پہچانی آواز کانوں کو چھو گئی۔ پیچھے مڑ کر دیکھا

شیبی کھڑا تھا۔ پہلے سے بدلا ہوا، دُھلا نکھرا چہرہ بنے سنورے ہوئے۔ ادھر کدھر؟ ٹیکسی چلانا چھوڑ دی؟ "جی ایرپورٹ جاتے ہوئے ایکسیڈنٹ ہو گیا تھا۔ چھ ماہ کے لیے لائسنس ضبط۔ یہاں کیش رجسٹر پر جگہ خالی تھی بس لگ گیا۔" وقت گزرتا گیا۔ بازار کرتے اکثر اس سے میرا سامنا ہوتا کچھ اِدھر اُدھر کی باتیں ہو جاتیں۔

مارچ کی ایک سہانی دھلی دھلائی صبح تھی، آسمان پر نہ تیرتے بادل تھے نہ سورج کی کرنوں کی لالی۔ ہوائیں برف سے دھلے ہوئے لہجے میں بول رہی تھیں۔ میں جیسے ہی سپر مارکیٹ میں داخل ہوئی، شیبی کی آواز کانوں سے ٹکرائی۔

"اتنی صبح خیر تو ہے؟ سب ٹھیک ہے۔ ہاں آج شام کی فلائٹ سے دیس جا تا ہے شاپنگ اور پیکنگ کا بڑا کام پڑا ہے۔ اسی لیے جلدی میں ہوں۔" آپ بتائے جاؤ گے؟ "پتا نہیں، ہاں کچھ سندیسہ ہو تو بتاؤ، خبر کر دوں گی۔" بس جی سب سکھ ہے۔ بتانے گئے تو ذرا بوڑھا بوڑھی کو مل آنا۔ آپ کو دیکھ کر ان کی آدھی ملاقات میرے ساتھ ہو ہی جائے گی۔ جب آپ واپس آؤ گے ان کی خبر سن کر میری ملاقات ان سے ہو جاتے گی۔" اس کے لہجے کی اپنائیت میرے دل میں اترتی چلی گئی۔

دہلی پہنچ کر مہینہ بھر مہمان نوازیوں میں بری طرح مصروف رہی۔ ضروری کام کچھ ہوئے کچھ رہ گئے۔ ساتھ ہی دربار صاحب کی منت چڑھانا بھی رہ گیا۔ جب بھی اُدھر کا پروگرام بناتی گھر والے یہ کہہ کر روک دیتے کہ آج کل فضا بہت خراب ہے سوچ سمجھ کر گھر سے نکلو۔ غرض جتنے منھ اتنی باتیں۔ اخبار کچھ کہتا لوگ کچھ۔ دل بوجھل اداس تھا۔ یہ مندر صاحب دیکھنے کے لیے بے تاب تھا۔ اسی دوران لندن سے چھوٹی موسی بھی آگئی۔ ان کے بہانے شری امرتسر جانے کا پروگرام بن گیا۔ شانِ پنجاب ایکسپریس میں سفر۔ فسادکی گرم ہوا یادوں کی کتاب کے ورق اڑانے لگی۔ خون میں لتھڑا ایک ورق ۱۹۸۴ء کا فوجی حملہ، جنگ کی سی خون ریزی۔ بارود کی بو۔ رائفلیں۔ اسٹین گن۔ ٹینک۔ خون۔ لاشیں۔ اکال تخت کی بے حرمتی۔ تباہی۔ ظلم۔ زخمی بچے۔ چیختی عورتیں۔ جی ایک دم سے اداس ہو گیا۔

یادوں کی خوشبو سے مہکتا دوسرا ورق۔ بچپن سے جوانی کی دہلیز پر پہنچنے ماں کے ساتھ ان گنت بار دربار صاحب کے درشن، پوتر اشنان، پرکرما۔ گھنٹوں کیرتن سننا۔ لنگر چکھنا۔ منتیں ماننا۔ دربار صاحب کے ساتھ ہی دو دیہ بھیڑ بھرے بازار۔ سکاٹھیا والا بازار۔ آٹا منڈی کی تنگ گلیاں اور کٹڑے۔ جہاں سے کنگھے، کڑے، پاپڑ، بڑیاں اور طرح طرح کی چیزیں خریدنا۔ پھوپی شیرو کے ساتھ سینٹ لارنس روڈ پر سیر کرنا۔ البرٹ روڈ پر پاجیتھیا ہاؤس کے پاس ان کی کوٹھی۔ "یوکلپٹائی" کی سیٹر جیبوں پہ اور لان کے سبزے پر رات گئے تک ان کی بیٹی روی کے ساتھ گپیں ہانکنا۔

کورے کاغذ کی خوشبو میں قلم بند ایک اور ورق۔ نیو پارک میں ہر صبح غسل کرتے۔ بدن پر پانی کی پھوار محسوس کرتے۔ ساتھ ہی رب کا نام لیتے ہوئے ہر مندر کے دیدار کا سوچ کر ایک الگ ہی سکون محسوس ہوتا۔ موسی کے ٹوکنے پر میں یادوں کے بادلوں سے باہر نکلی۔ دور ہر مندر صاحب کے کلس کی جھلک دکھائی دی۔ اکال تخت کی اونچی برجیں سینہ تانے کھڑی نظر آئیں۔ پھر جھلمل کرتی سنگ مرمری روشنیں لش لش کرتی درشن ڈیوڑھی۔ سنگت کی بھرمار۔ ہمیشہ کی طرح کیرتن کا پرواہ چل رہا تھا۔ مہاٹ سے چرن دھولی۔ شردھا سے ہماری آنکھیں چھلک پڑیں۔ دیر تک اکال تخت، لنگر خانہ، ...ل خانہ اور دربار صاحب میں گم ان عمارتوں اور گنبدوں کو تکتی رہی۔ اکال تخت کی بے حرمتی کا نقشہ سامنے آتے ہی

ایک بار پھر آنکھیں بھیگ گئیں۔ ۱۹۸۴ء کے خونی سانحے کے دوران لاکھوں آنکھوں سے نکلے اشکوں، آہوں، چیخوں اور فریادوں کی بازگشت سے جی بوجھل ہوتا چلا گیا۔

سہ پہر اداس اور تھکن سے چور ہم لوگ پنجاب روڈویز کی بس سے بٹالے پہنچے۔ ڈوبتے سورج کی لو میں شام زرد ہو چلی تھی۔ بٹالے بس اسٹینڈ پر پھیلا کالا بدبودار کیچڑ مزید کالا ہو چکا تھا۔ اترتی چڑھتی سواریوں کی بھیڑ کے باوجود ماحول گم سم تھا۔ ہم نے ماموں جی کے گھر کے لیے رکشا کیا۔ رکشے والا دھول سے اٹی کچی سڑک پر سر جھکائے رکشا گھسیٹے لیے جا رہا تھا۔ زنگ آلود سائیکلوں اور گرد کے ڈھیر سے رکشے والا بے رنگ شہر بٹالہ۔ تھکا ہارا اور بوڑھا لگ رہا تھا۔ چار سو اداسی کی بدلی چھائی ہوئی تھی۔ رکشا ماما جی کے مکان والی گلی میں داخل ہو چکا تھا گلی بھی ویران سی تھی۔ آج سواریوں کو گھورتے اپنے کھیل بھولتے بچے کہیں دکھائی نہ دیے۔ نہ کوئی کھڑکی کھلی نہ کوئی پردہ سرکا۔ نہ کسی بانکی چتون کے دیدار ہوئے ایک عجیب چپ سی لگی تھی۔ رکشے والے کو کرایہ دے کر ہم لوگ اپنا ہینڈ بیگ اٹھائے ڈیوڑھی کی طرف بڑھے۔ پٹرول اور گوبر کی ملی جلی بو ناک سے ٹکرائی۔ سامنے ماما جی برآمدے میں مدھم پیلے بلب کی روشنی میں اخبار پڑھ رہے تھے۔ آہٹ پر ان کی دھیان ہٹا پھر خوشی کی لہر کے ساتھ برآمدے میں سارا کنبہ اکٹھا ہو گیا۔ تازہ روغن اور سفیدی کی بو میں گھر نیا نیا مگر اجنبی لگ رہا تھا۔ صرف ماما اور مامی کا کمرہ، اس کی دیواریں اور رنگ برنگی قلعی کی چھت پر جیسے وقت ٹھہر گیا تھا۔ مہمان نوازی پیار دلار، چائے کا دور، گھر باہر کی باتیں، دیس پر دیس کا ذکر خاصی دیر تک چلتا رہا۔ ماما جی کہنے لگے "بی با تو بھی کہاں سات سمندر پار چلی گئی۔ تیری ماں زندہ ہوتی کبھی نہ بھیجتی تجھے اتنی دور" ماں کی یاد آتے ہی سب کی آنکھیں نم ہو گئیں۔ پھر ماں کی باتیں ہوئیں۔ دھرتی ماں کی باتیں ہوئیں۔ جلتے بجھتے پنجاب کی ٹوٹتے اعتباروں کی منادی، سختی اور محتاجی کا ذکر ہوا۔ ماما جی کہہ رہے تھے کہیں کوئی تار کوئی روایت پھر ٹوٹی ہے۔ ہر بستی سہمی ہے ہر دہلیز ہر دیوار جھلسی ہے فضا دھواں دھواں ہر سینہ زخمی ہے۔ آنکھوں میں کیکٹس اگ آئے ہیں۔ ہر کوئی اندر سے ٹوٹ پھوٹ گیا ہے۔ ماما جی جذبات کی رو میں بولے جا رہے تھے۔ آنسوؤں کی لڑیاں ان کے گالوں پر لرز رہی تھیں۔ شام منجمد ہو گئی تھی وقت ٹھہر سا گیا تھا۔ میں نے بات بدلنے کے لیے اچانک پوچھا۔ ماما جی یہاں آپ کسی کرم جیت سنگھ کو جانتے ہو؟ "کرم سنگھ وہ احاطے والا یا صوبیدار کا۔ پتا نہیں بیٹی تو کس کی بات کر رہی ہے"۔ بھئی وہی جس کا بیٹا امریکہ میں ہے۔ بھلا سا نام ہے اس کے لڑکے کا۔ میں نے ذہن پر زور دیتے ہوئے کہا ۔۔۔ دیپک۔ بڑا اچھا لڑکا ہے ۔۔۔ "ہاں کرم سنگھ، وہ بیچارے"۔ کیوں کیا ہوا ان کو؟ "جو ہو بے گناہوں کے ساتھ برا ہوا۔ کچھ دن پہلے وہ لوگ بڑے بیٹے کو ملنے انبالہ گئے تھے راستے میں دہشت گردوں نے بس رکوا بس میں پگڑی والا سردار ایک ہی تھا کرم سنگھ۔ بس سے اتار کر دونوں بوڑھا بوڑھی کو وہیں سب کے سامنے گولی مار دی گئی"۔ نہیں۔۔۔ میں کراہ اٹھی ۔۔۔ ہر انہونی پر بری بری خبر سننے کے لیے تیار کب ہوتا ہے۔ ان کا قصور؟ قصور یہی ان کے سر پر پگڑی تھی۔ ہم سب چپ تھے۔ رات خاموشی سے ماتم کناں تھی ۔۔۔ اگلے دن دوپہر ماما جی ہمیں بس تک چھوڑ آئے۔ بس چل پڑی مگر وہ دیر تک اڑتی دھول میں ہاتھ ہلاتے رہے۔ پھر جتنے دن اپنے دیس میں رہی جی اداس اور بوجھل رہا۔

نیویارک پہنچ کر پہلی بار محسوس ہوا دیس سے آکر میں اتنی اداس نہ تھی جتنی اکثر ہوا کرتی تھی۔ تھکاوٹ اتارتے اور گھر سنبھالتے ایک دو روز لگے۔ دوستوں کو اپنی واپسی کی اطلاع دی۔ شپی کا فون نمبر پاس تھا مگر اس سے بات کرنے کی ہمت مجھ میں نہ تھی۔ ہفتے بعد سپر مارکیٹ گئی کاؤنٹر پر شپی کو دیکھ کر قدم جم سے گئے۔ دھڑکتے دل کے ساتھ میں اس کے سامنے پہنچی۔۔۔ ہم دونوں خاموش تھے۔ اس کی آنکھوں میں آنسو اور سر پر دستار سجی تھی...

گل ہائے رنگ رنگ

روسی نظمیں

ڈیوڈ کگلٹینوف / عبدالعزیز خالد

بادِ شمال

(۱)

جب پہاڑوں کی چوٹیوں سے چھٹے
دُھند، کتنے ہی زر نگار کلس
پاس اتنے دکھائی دیں کہ لگے
ہاتھ پھیلاؤں تو انھیں چھولوں

واقفِ حال لوگ بتلائیں:
تم میں اوران بلندیوں میں ابھی
ایک دن کے سفر کی دُوری ہے!

جب تمھاری پُرالتہاب آنکھیں
یک بیک میرے دل کو پگھلا دیں
اور میں بھولپن میں یہ سوچوں:

اب کوئی فاصلہ نہیں ہم میں!
جانتے ہیں تمھارے دل کو جو لوگ
ہے جنھیں ظاہر و نہاں کی خبر
کہیں: یہ قرب ہے فریبِ نظر
ورنہ دراصل تم ابھی دونوں
ایک دوجے سے دور ہو کوسوں!

(۲)

دے کوئی شخص گرچہ قربانی
گو بہائے پسینہ وہ اپنا
سُود و بہبودِ خلق کی خاطر
اور ہر داغ ننگ وتہمت دے
پاک ہو اس کا دامنِ شہرت
تاہم اس کے ہزار ہا گُن بھی
بخشیں ہرگز نہ اس کو استحقاق
کہ تعدّی کرے کسی پر وہ
چاہے کتنی بھی ہو وہ معمولی!

اور اک حاکمِ علیٰ الاطلاق
رُبعِ مسکوں کو کر سکے غرقاب
ظلم و دہشت میں جو اگر چاہے
عین ممکن ہے ایک دن آجائے
اپنی ایذا رسانیوں سے وہ باز
مگر اس انقلاب کے باوصف
مل سکے گا نہ زینہارِ اعزاز
اسے اس شخص کا کہ جو چُپ چاپ
شور و شر کے بغیر نیکی کا
حسب توفیق کام کرتا ہے
چاہے کتنا بھی ہو وہ معمولی!

مضمون صاف، خوش خط اور صفحے کے ایک طرف لکھیں

گل ہائے رنگ رنگ

مراٹھی نظم

اسرتا پریتم / فہمیدہ ریاض

اولین قبیلہ

جب 'میں' کا موسم کھِلا تھا
اور بدن کے پودے پر بور آیا تھا
صبا کے کان میں مہکار کی سرگوشیاں تھیں
اور 'تو' کا فرق لہلہایا تھا
'میں' اور 'تو' کی چھاؤں میں
جب 'وہ' آکر بے فکری سے سو یا تھا
یہ 'وہ' کی چاہ تھی
کہ ہم نے دانۂ گندم بانٹ لیا تھا
'وہ' فطری تھا ـــ بے ساختہ تھا
میں اور تو کی تکمیل
قبائلی دَور تو بہت دُور کی بات ہے

خلیل مومن / سلام بن رزاق

یقینی، بے یقینی

یقین نہیں ہے، پھر بھی، حساب لگاتا ہوں
ہر روز زندگی کے نشیب و فراز کا
سچ کہوں!
سکھ اور دکھ کا صحیح تخمینہ لگانا ابھی نہیں آیا ـــ
جہاں شام کو صبح سمجھنے کی نادانی
دل میں جاگزیں ہو
وہاں دکھ اور سکھ کے صحیح مفہوم کو
رات یا دن کے پلڑوں میں
تولا جا سکتا ہے؟
یا محض جذبات کا بارِ گراں
زندگی پر لادنے کے بعد
سوجھی ہے ایسی کمزور دلیل!
چلو یہ تسلیم بھی کر لیں کہ ـــــــ
اس ساری بے کلامی سے
مُراد ہے ـــ مٹی
زندگی کا سوال تو پھر بھی باقی رہ جاتا ہے
زندگی ـــــ
جو نہ زمانی ہے
نہ مکانی ـــــ

ڈاکٹر انور سدید

کچھ وقت ہندستانی کتابوں کے ساتھ

شبلی معاندانہ تنقید کی روشنی میں ــــ سیّد شہاب الدین دسنوی

مولانا شبلی نعمانی اردو ادب کی ایک ممتاز اور بے حد قابلِ احترام شخصیت ہیں، انھوں نے اسلامی علوم و فنون اور ریخ و تمدن کے شاندار واقعات کی ترتیب و تدوین کے علاوہ برِصغیر میں مسلمانوں کی تعلیم میں گہری دل چسپی لی اور اردو دب کے خزینوں کو متموّل کرنے میں گراں بہا خدمات سرانجام دیں۔ ان کی ابتدائی تربیت میں سرسیّد احمد خاں نے سرپرستانہ ویہ اختیار کیا اور ان کے اوصافِ خفتہ کو جگا کر ان سے صحیح کام لینے کی کوشش کی، علی گڑھ ہی میں انھیں آرنلڈ کی صحبت صیب ہوئی اور مشرق کے مکین کو مغرب کے علوم سے متعارف ہونے کا موقع ملا۔ مولانا کے مزاج میں عالمانہ شان تھی لیکن لسار اور سنجیدگی اس مزاج کی خصوصیت تھی ــــ دوسری طرف وہ فطرت کے جمالیاتی زاویوں کے مدح خواں بھی ھے اور حسن کی ایک جھلک دیکھ کر بے قرار بھی ہو جاتے تھے۔ لطافت، خوش طبعی اور مزاح ان کے مزاج کا فطری حصّہ ھا اور یہ جس طرح منظرِ عام پر آیا اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ اکتسابی نہیں تھا اور مولانا شبلی موقع اور محل کے مطابق س کا اظہار برملا کرتے تھے۔

مولانا شبلی کے مزاج کے مؤخرالذکر زاویے کا نقصان یہ ہوا کہ اس کا بالواسطہ اظہار جب شاعری میں ہوا تو بعض قدین نے مولانا شبلی کی شخصیت کو نسبتاً گدلی عینک سے دیکھنے کی کوشش کی اور ایک ایسی شخصیت پر جس نے سیرۃ النبیؐ فاروق، المامون، شعرالعجم، سیرت النعمان، موازنۂ انیس و دبیر جیسی کتابیں تالیف کی تھیں الزامات کی بوچھاڑ بکھیرنے سعی کی گئی۔ الزام لگایا کہ مولانا مزاج میں نرگسیت رکھتے تھے۔ وہ لڑکیوں سے عشق لڑاتے تھے، عطیہ فیضی سے نکاحِ ثانی کے ٰرمیں تھے، مہدی حسن کی بیگم کو خوش نظری سے دیکھتے تھے اور مولانا آزاد اور شبلی کے تعلقات کی نوعیت مشکوک تھی، چنانچہ للانا شبلی کے علمی کارناموں پر ایک طویل عرصے تک شیخ محمد اکرام، محمد امین زبیری اور ڈاکٹر وحید قریشی کی کتابوں نے ےپائے رکھا۔ بعض شواہد سے یہ بھی ظاہر کیا گیا کہ شبلی کی شعرالعجم پر حافظ محمود شیرانی کی تنقید بھی فرمایشی تھی اور مقصد بلی کی علمی شخصیت کو گزند پہنچانا تھا لیکن اب دریاؤں کے نیچے سے بہت سا پانی بہہ چکا ہے۔ حافظ محمود شیرانی، شیخ محمد اکرام

اور محمد امین زبیری دنیا سے رخصت ہو چکے ہیں اور ڈاکٹر وحید قریشی اپنی کتاب "شبلی کی حیاتِ معاشقہ" کے بارے میں اب چنداں سنجیدہ نہیں۔ تاہم اس حقیقت سے انکار ممکن نہیں کہ ان مصنفین کی کتابوں پر جس کسی کی نظر پڑی ہے اس کا تصورِ شبلی گدلا ہو جاتا ہے۔ ڈاکٹر خلیق انجم نے اعتراف کیا ہے کہ "میرے ذہن میں شبلی کی وہی تصویر تھی جو شیخ محمد اکرام اور ڈاکٹر وحید قریشی نے پیش کی تھی۔" اس منفی زاویے کو تحقیقی صحت عطا کرنے کا گراں قدر کام سید شہاب الدین دسنوی نے "شبلی معاندانہ تنقید کی روشنی میں" لکھ کر سرانجام دیا ہے۔

اس کتاب کی سب سے بڑی خوبی سید شہاب الدین صاحب کی خنک مزاجی، استدلال اور تہذیبِ اظہار ہے۔ الزامات ایسے ہیں کہ انھیں پڑھ کر خون کھولنے لگتا ہے اور کردار کشی کا عمل ذہن کو مفتوح بنا لیتا ہے۔ سید صاحب نے ہر الزام کو ایک ماہر وکیل کی طرح واقعات کی شہادت اور دستاویزی ثبوتوں سے رد کیا ہے۔ اور ثابت کیا ہے کہ شبلی کا علمی، ادبی اور تحقیقی ارتکازِ فکر انھیں ارزاں جذبوں کی پیروی کی طرف متوجہ نہیں کر سکتا تھا۔ یہ کتاب سولہ ابواب پر مشتمل ہے۔ اس میں شبلی کے مزاج کا تجزیہ کیا گیا ہے۔ قومی تحریکوں میں سرسید کی سرگرمیوں، طیب جی خاندان سے تعلقات اور سرسید سے اختلافات کی نوعیت کا سراغ لگایا گیا ہے۔ چند ابواب مولانا شبلی کی نرگسیت، قیام بمبئی، عطیہ فیضی اور ابوالکلام آزاد کے ساتھ تعلقات کے تجزیے کے لیے وقف کیے گئے ہیں، ان سب ابواب کے علاوہ ایک باب میں متذکرہ معاشقوں کے دور میں شبلی کی علمی سرگرمیوں اور ان کی صحت کا احوال بھی پیش کیا گیا ہے۔ سید صاحب نے حقیقتِ حال تک پہنچنے کے لیے معاصر شہادت بھی فراہم کی ہے اور شبلی کے خطوط سے بھی معاونت حاصل کی ہے۔ چنانچہ وہ الزام جو محمد امین زبیری کے مرتبہ خطوطِ شبلی پر مولوی عبدالحق صاحب کے مقدمے کے ضمنی اشارون سے شروع ہوا تھا اور جو بعد میں دبیز تر ہو گیا۔ زیرِ نظر کتاب کی اشاعت سے صاف ہو جاتا ہے۔ خلیق انجم صاحب نے لکھا ہے کہ شبلی کی حمایت میں یہ پہلی، معقول، مکمل اور مدلل کتاب ہے اور اب شبلی جیسے مظلوم انسان کے ساتھ انصاف ہو سکے گا۔ یہ معنی خیز کتاب مدلل الزام شکنی کا درجہ رکھتی ہے۔ اسے انجمن ترقی اردو ہند نے دہلی سے شائع کیا ہے۔ ضخامت ۱۴۸ صفحات، قیمت ۲۵ روپے ہے۔

دردِ مسعود ——— مسعود حسین خان

سوانح عمری اور خود نوشت سوانح حیات میں بڑا فرق ہے۔ سوانح عمری میں مصنف جتنا چاہے جھوٹ بول سکتا ہے، خود نوشت سوانح حیات میں مصنف جتنا چاہے جھوٹ کو چھپا سکتا ہے۔ ہمارے ہاں چونکہ صداقت کی کھردری اور نوکیلی سطح پر قدم رکھنے سے گریز کیا جاتا ہے اس لیے بالعموم ایسی سوانح عمریاں منظرِ عام پر آتی ہیں جن میں مصنف کی ذات کو بنا سنوار کر پیش کیا جاتا ہے اور مصنف اگر آپ بیتی لکھے تو اس میں تحلیلِ ذات کا کام وہ خود سرانجام دے ڈالتا ہے۔ تاہم اردو میں چند ایسی آپ بیتیاں بھی لکھی گئی ہیں جن میں مصنفین نے اپنا جائزہ غیر جانبداری سے لینے کی کوشش کی اور نقوشِ ماضی ہی کی بازیافت نہیں کی بلکہ خود اپنے آپ کو ڈھونڈنے کی سعی کی۔ اس ضمن میں یہاں اعجاز الحق قدوسی کی آ

"میری زندگی کے پچھتر سال" اور جلیل قدوائی کی "حیاتِ مستعار" کا حوالہ دیا جاسکتا ہے۔ ڈاکٹر وزیر آغا کی آپ بیتی "شام کی منڈیر سے" کی انفرادیت یہ ہے کہ اس میں مصنّف نے اپنی دریافت کے لیے اپنی شاعری کو استعمال کیا۔ ڈاکٹر مسعود حسین خان کی آپ بیتی "ورودِ مسعود" پر سچ اتنا غالب ہے کہ بعض اوقات مسعود صاحب کا اپنا عہد ان کی بیان کردہ صداقت کا سامنا نہیں کر پاتا اور ان سے آنکھیں چرانے لگتا ہے۔

ڈاکٹر مسعود حسین خان ۲۸ جنوری ۱۹۱۹ء کو پیدا ہوئے۔ ورودِ مسعود کا آخری باب انھوں نے ۲۸ جنوری ۱۹۸۹ء کے لگ بھگ لکھا جب وہ اپنی عمرِ عزیز کے ستروین سال کی چوٹی پر کھڑے تھے، ستر سال کے اس عرصے میں انھوں نے برِّصغیر میں آزادی کی جد وجہد دیکھی، ملک کی آزادی کا منظر دیکھا اور آزادی کے بعد قدروں کا تغیّر و تبدّل دیکھا۔ اس تمام عرصے میں انھوں نے اپنی زندگی میں جزر و مد سے گزرتے دیکھا اور قومی زندگی میں پیدا ہونے والے جوار بھاٹے کا مشاہدہ کیا۔ ان کی نظر سے خیر مجسّم بھی گزرا اور انھوں نے وہ آزادی بھی دیکھی جو سرگشتۂ رسوم و قیود نہیں ہوتی اور سانولی سلونی لونڈیوں مہترانیوں کو گوری چٹی پٹھانیوں پر ترجیح دیتی ہے۔ اس قسم کی صدق بیانی نے اس آپ بیتی کو ایک چیز دیگر بنا دیا ہے لیکن یہ آپ بیتی "یادوں کی برات" نہیں بن سکی۔ حالانکہ ڈاکٹر مسعود حسین خاں کا مزاج جلالی بلکہ جمالی اور آتشیں گلابی ہے۔ وہ لذتِ کام و دہن کے شوقین تھے۔ چنانچہ ملائی کی چوری میں انھوں نے اپنی ماموں زاد بہن نجمہ کو اپنا معاون بنا لیا اور دلیل یہ دی کہ

"چوری کی ساری ذمے داری چوری کرانے والے کی ہوتی ہے نہ کہ چوری کرنے والے کی"

چنانچہ یہ ترچ پھر سرخ نہ در نہ ملائی مسعود صاحب کے کام آتی رہی اور اس ملائی چوری کے عمل ہی میں مسعود صاحب کو نجمہ سے دلچسپی کا احساس ہونے لگا۔ لکھتے ہیں :

"وہ مجھے زیادہ اچھی لگنے لگی، چھوٹا سا قد، نور جہانی خط و خال، گدرایا سا جسم، ایسا معلوم ہونے لگا کہ اب وہ بچپن کی سرحدیں پیچھے چھوڑ چکی ہے۔"

اور جب بات کا سرا آگے بڑھا تو محترمہ نجمہ مسعود حسین خاں کی شریکِ حیات اور پاسبانِ عقل بن چکی تھیں۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ مسعود صاحب نے اپنی جوانی کے احوال و آثار اور مہم پیمائیوں پر پردہ نہیں ڈالا اور اس طالبہ کا ذکر بھی کیا ہے جو رقعہ بن کر چلتی تھی لیکن مسعود صاحب تعاقب سے باز نہیں آتے تھے۔ بہت عرصے بعد یہ خاتون فوت ہو گئیں تو ڈاکٹر مسعود حسین خاں نے مرحومہ پر ایک نظم "پرچھائیں کی موت" لکھی اور سارا واقعہ اپنی بیگم کو سنا دیا۔

ڈاکٹر مسعود حسین خاں کا ادبی زاویۂ فکر "لسانیات" ہے لیکن ان کی آپ بیتی خشک نہیں بلکہ یہ اتنی دلچسپ ہے کہ ایک سچا ناول نظر آتی ہے۔ ڈاکٹر صاحب نے اپنے حافظے سے کام لیا ہے لیکن حافظے پر اپنی مرضی مسلّط نہیں کی یہی وجہ ہے کہ آپ بیتی ایجادِ بندہ قسم کی تخلیق کاری سے محفوظ ہے۔ ہمارے سامنے پورے ستر سال کی واقعاتی زندگی اور اس کا ردِ عمل آشکار ہوتا چلا جاتا ہے۔ یہ کتاب خدا بخش اورینٹل لائبریری پٹنہ نے شائع کی ہے اور بلاشبہ اردو کی ایک گراں قدر آپ بیتی ہے جس کے مصنّف نے علم کو اپنی ذات پر بوجھ کی طرح لادنے کی کوشش نہیں کی اور اپنے اندر کے انسانِ ظریف

گو زندہ رکھا ہے۔ ضخامت ۳۵۴ صفحات۔ قیمت ۴۵ روپے

بیان میرٹھی۔ حیات و شاعری — ڈاکٹر محمد شرف الدین ساحل

بیان میرٹھی انیسویں صدی کے شاعر تھے۔ ان کی حیات اور شاعری کے محقق جناب ڈاکٹر محمد شرف الدین ساحل نے لکھا ہے کہ

" بیان میرٹھی وہ بدقسمت شاعر ہیں جن کو شعر و ادب کی تاریخ میں وہ مقام حاصل نہیں ہوسکا جس کے وہ مستحق تھے"

اس کی وجوہ یہ تھیں کہ بیان خلوت نشین قسم کے شاعر تھے۔ خود ستائی کی وجہ سے کسی کو خاطر میں نہیں لاتے تھے۔ صحافتی معرکہ آرائی ہوتی تو آپے سے باہر ہو جاتے۔ زندگی بھر دیوان شائع نہیں کروایا۔ چنانچہ ان پر تحقیقی و تنقیدی مضامین بہت کم لکھے گئے اور یوں وہ آہستہ آہستہ گوشۂ گمنامی میں چلے گئے۔ خم خانۂ جاوید کے مطابق انھوں نے ۱۹۰۰ء میں انتقال کیا۔ اس وقت بقول ڈاکٹر ساحل ان کی عمر پچاس سال کے لگ بھگ تھی۔ عشرت لکھنوی نے اس شعر میں تاریخ وفات کہی۔

یوں دل شکستہ ہو کے دلِ زار نے کہا — اس "دہر بے ثبات سے ہے ہے بیان گیا"

بیان کا دوسرا تخلص یزدانی تھا۔ تذکروں میں ان کا نام تو ملتا ہے لیکن احوال و آثار زیادہ دستیاب نہیں ہیں۔ ساحل صاحب بھی ان کے کلام سے اچانک متعارف ہوئے۔ ایک دن "جلوۂ یار" میرٹھ کی فائلیں دیکھ رہے تھے کہ ان کا پختہ اور بامعنی کلام نظر پڑا۔ ساحل صاحب بہت متاثر ہوئے اور پھر احوال و آثار و کلام کی کھوج میں مسلسل کھڑے ہوئے۔ آخر بیان کے ایک شاگرد تسخیر میرٹھی کو ڈھونڈ نکالا اور دو سال کے عرصے میں بیان کا بہت سا کلام جمع کر لیا۔ ان کی زندگی کے حالات تلاش کر لیے۔ زیر نظر کتاب "بیان میرٹھی — حیات و شاعری" ڈاکٹر محمد شرف الدین ساحل کی متذکرہ تحقیق کا ہی ثمر شیریں ہے۔ اور ڈاکٹر صاحب کی محنت کا منھ بولتا ثبوت ہے۔

بیان میرٹھی کی زندگی کا احوال اگرچہ مختصر ہے لیکن یہ اندازہ کرنا مشکل نہیں کہ بیان نے ادبی لحاظ سے ہنگامہ پرور زندگی گزاری۔ اودھ پنچ اور اخبار فتنہ کے ساتھ تیز و تند صحافتی جنگ لڑی۔ ۱۸۸۸ء میں ایک مجادلہ ایڈیٹر "کلال ہند" کے ساتھ لڑا۔ مولانا حالی پر تنقید لکھی اور نظم شکوہ ہند کے جواب میں "پاسخ ہند" لکھی۔ ان سب باتوں سے ظاہر ہوتا ہے کہ بیان ادبی لحاظ سے ایک فعال شاعر تھے۔ چنانچہ انھوں نے غزل، نظم، مثنوی، ساقی نامہ، قطعات، رباعیات، مرثیہ، نعت اور سلام سب اصناف میں شاعری کی۔ ڈاکٹر سید صفدر حسین قندیلِ حرم، رنگ شہادت اور نقش بیان کے نام سے ان کے تین مرثیے کتابی صورت میں شائع کیے ہیں۔ ڈاکٹر شرف الدین ساحل کا کام تحقیقی نوعیت کا ہے اور یہ ہر لحاظ سے داد کے قابل ہے۔ ۲۴۶ صفحات کی یہ تحقیقی کتاب مصنف نے محمد علی روڈ۔ مومن پورہ۔ ناگ پور سے شائع کی ہے۔ قیمت ۲۵ روپے۔

اردو زبان کے فروغ، ترویج اور بقا کے لیے کام کرتا ہے۔ انھوں نے کہا کہ یہ اکیڈمیاں غیر اردو داں لوگوں کے لیے اردو کی تدریس کا انتظام کرتی ہیں، کتابیں شائع کرتی ہیں اور اچھی کتابوں کے مصنفین میں انعام اور وظائف تقسیم کرتی ہیں۔ انھوں نے دہلی اردو اکیڈمی کی طرف سے شائع ہونے والے ماہنامے "ایوانِ اردو" اور بچوں کے لیے نکلنے والے پرچے "اُمنگ" کا بھی ذکر کیا۔ انھوں نے بتایا کہ ان کاموں کے لیے حکومت کی طرف سے سالانہ پچاس لاکھ روپے کی گرانٹ ملتی ہے۔

دہلی یونیورسٹی میں شعبۂ اردو کے صدر اور معروف محقق و نقاد ڈاکٹر قمر رئیس نے کہا کہ اِدھر ہندستان میں پریم چند پر اردو میں کم اور ہندی میں زیادہ کام ہوا ہے۔ اردو میں جو کام ہوا ہے اس میں مانک ٹالہ کی دو کتابیں خاص اہمیت رکھتی ہیں۔ ان کی ایک کتاب "پریم چند ـــ کچھ نئے مباحث" انجمن ترقی اردو پاکستان بھی چھاپ رہی ہے۔ انھوں نے دہلی یونیورسٹی کی گزشتہ چار سال کی تحقیقی سرگرمیوں کا ذکر کرتے ہوئے بتایا کہ اس عرصے میں خاصا کام ہوا ہے۔ رشید حسن خاں نے باغ و بہار اور فسانۂ عجائب کو نہایت معیار اور سند کے ساتھ ایڈٹ کیا ہے۔ انھوں نے یہ بھی کہا کہ ان کے تاثر کے مطابق پریم چند کی کتاب پاکستان کے نصاب میں شامل نہیں ہیں۔ جمیل الدین عالی اور ڈاکٹر فرخی نے اس تاثر کو غلط قرار دیا۔ ڈاکٹر فرخی نے کہا کہ پریم چند تمام اعلیٰ سطحوں پر شاملِ نصاب ہیں۔

صدرِ انجمن جناب نورالحسن جعفری نے اس موقع پر مہمانوں کی خدمت میں انجمن کی تازہ مطبوعات پیش کیں۔ اس کے بعد انجمن کی بہتر کارکردگی کی راہ میں حائل جو دشواریاں اور مسائل ہیں ان پر اختصار کے ساتھ روشنی ڈالی۔

اس استقبالیے میں برطانیہ سے آئے ہوئے مہمان جناب معین الدین شاہ کے علاوہ بہت سے مقامی ادیبوں نے بھی شرکت کی۔

حلقۂ نیاز و نگار کا دو روزہ اجلاس

۲۱، ۲۲ دسمبر ۱۹۸۹ء کو حلقۂ نیاز و نگار کی طرف سے نیپا کی سماعت گاہ میں علامہ نیاز فتح پوری یادگاری لیکچر ۱۹۸۹ء کا اہتمام کیا گیا۔

اس یادگاری لیکچر کے انعقاد میں انجمن ترقی اردو پاکستان اور ہمدرد فاؤنڈیشن کا تعاون شامل تھا۔ لیکچر دو اجلاسوں اور دو دنوں پر مشتمل تھا۔ پہلے دن کے اجلاس کی مجلسِ صدارت میں ڈاکٹر منظور الدین احمد، حکیم محمد سعید، نورالحسن جعفری، ڈاکٹر ابواللیث صدیقی اور ڈاکٹر قمر رئیس شامل تھے۔ نظامت کی ذمہ داری سرشار صدیقی کے سپرد تھی۔ اجلاس کا آغاز معروف شاعر قمر ہاشمی کی تلاوتِ کلام پاک سے ہوا۔ اس کے بعد ہندستانی مہمان پروفیسر شریف الحسن نقوی کو اپنا خطبہ پیش کرنے کی دعوت دی گئی۔ ان کا خطبہ "اردو میں دانشوری کی روایت اور نیاز فتح پوری" کے موضوع پر تھا۔ انھوں نے کہا کہ دانشوری کو انفرادی اندازِ نظر سے الگ کر کے دیکھنا مشکل ہے۔ دانشور اجتماعی فیصلوں کا پابند نہیں رہتا۔ وہ اپنی انفرادی کوششوں سے سماجی زندگی کو نیا رُخ عطا کرنے کی صلاحیت رکھتا ہے۔

پروفیسر نقوی نے کہا کہ عموماً یہ سمجھا جاتا ہے کہ اردو میں دانشوری کا آغاز سرسید سے ہوا۔ لیکن ہم اس کی ابتدا کا نقطہ غالب کو بھی قرار دے سکتے ہیں۔ غالب اور سرسید کے درمیان ماسٹر رام چندر کا نام بھی آتا ہے۔ جنھوں نے اردو میں سائنسی

نکمہ کو عام کرنے کی کوشش کی۔

فاضل مقالہ نگار نے سرسید کے بعد نذیر احمد، شبلی نعمانی، سید سلیمان ندوی، ابوالکلام آزاد اور علامہ اقبال کا ذکر کیا اور کہا کہ علامہ نیاز فتح پوری کے ہاں دانشوری کی روایت علمی و ادبی پیرائے میں ملتی ہے۔ ان کے ہاں تنقید میں عقلیت پسندی نمایاں ہے۔ ان کی تحریریں سوال اٹھاتی ہیں، یہی سوال جستجو کے لیے اکساتا ہے۔

پروفیسر شریف الحسن نقوی کے مقالے کے اختتام پر محمد احمد سبزواری، ڈاکٹر عالیہ امام، قمر ہاشمی، احمد ہمدانی، رئیس علوی اور شان الحق حقی نے سوالات کیے۔

نور الحسن جعفری نے اس موقع پر خطاب کرتے ہوئے کہا کہ نیاز صاحب کا کارنامہ یہ ہے کہ انھوں نے اپنی تحریروں سے جمود کو توڑا اور غور و فکر کی نئی راہیں کھولیں۔ پروفیسر ڈاکٹر ابواللیث صدیقی نے کہا کہ جب بچہ بڑا ہو کر سوچنے لگتا ہے تو دانشوری کا آغاز ہوتا ہے۔ شیخ الجامعہ کراچی یونیورسٹی ڈاکٹر منظور الدین نے کہا کہ نیاز صاحب کی تحریروں اور افکار کا اثر مجھ پر ہمیشہ رہا ہے۔ انھوں نے کہا کہ ہمیں ماضی، حال، مستقبل تینوں زمانوں کو پیش نظر رکھنا چاہیے۔

قبل ازیں ڈاکٹر فرمان فتح پوری نے جلسے سے خطاب کیا اور ان مشاہیر اہل قلم کے نام بتائے جو نیاز یادگاری خطبات میں شرکت کر چکے ہیں۔

علامہ نیاز فتح پوری یادگاری لیکچر کے دوسرے دن کے اجلاس کا پریسیڈیم ڈاکٹر اختر حسین رائے پوری، پروفیسر کرار حسین، جمیل الدین عالی، شوکت صدیقی اور شریف الحسن نقوی پر مشتمل تھا۔ نظامت حسب سابق سرشار صدیقی نے انجام دی۔

دوسرے اور آخری اجلاس کے مقالہ نگار ڈاکٹر قمر رئیس تھے۔ ڈاکٹر قمر رئیس دہلی یونیورسٹی میں شعبۂ اردو کے سربراہ ہیں۔ ان کا شمار پریم چند اور اردو افسانے کے ماہرین میں ہوتا ہے۔ ان کے مقالے کا عنوان "نیاز فتح پوری اور متوازی افسانہ" تھا۔ ڈاکٹر صاحب نے اپنے مقالے میں کہا کہ اردو افسانے کی عمر ایک صدی سے بھی کم ہے لیکن اس عرصے میں اس نے کئی نشیب و فراز دیکھے ہیں۔ حقیقت نگاری اردو افسانے کی بنیادی روایت ہے لیکن اس کے ساتھ متوازی افسانے کی تحریک بھی چلتی رہی ہے جسے آپ رومانیت کا نام دے سکتے ہیں۔ بنیادی روایت کا افسانہ اجتماعیت اور متوازی افسانہ انفرادیت کا ترجمان تھا۔ متوازی افسانہ تخیل پرستی سے گزر کر ماورائیت کی حدوں تک پہنچا۔ یلدرم متوازی افسانے کے بانی ہیں۔ نیاز فتح پوری کے ہاں اسکر وائلڈ کی بازگشت سنائی دیتی ہے۔ نیاز کے افسانوں سے ان کی سماجی بصیرت کا اندازہ نہیں ہوتا۔ وہ جمالیت پسند اور عینیت پسند ہیں۔ وہ عورت کا حسن بہت خوبی سے اجاگر کرتے ہیں اور اکثر حسن کا رشتہ اخلاقیات سے جوڑ دیتے ہیں۔ متوازی افسانے کی عمر قلیل ہوتی۔ ترقی پسند تحریک کے عروج تک متوازی افسانہ تقریباً معدوم ہو گیا۔ اور پھر یہ ۱۹۶۰ء کے بعد جدیدیت کی شکل میں نمودار ہوا۔

ڈاکٹر قمر رئیس جب اپنا مقالہ پیش کر چکے تو ڈاکٹر حنیف فوق، ڈاکٹر فہیم اعظمی اور پروفیسر رئیس علوی نے کچھ سوالات کیے۔

جناب جمیل الدین عالی نے اس موقع پر خطاب کرتے ہوئے کہا کہ نیاز صاحب اردو کے حوالے سے جنوبی ایشیا

پھر میں خرد افروزی کا ایک خاص ریکارڈ رکھتے ہیں۔ آئندہ سے یہ یادگاری تقریب ایک باقاعدہ سیمینار کی صورت میں ہونی چاہیے۔ انجمن ترقی اردو آئندہ بھی حلقہ نیاز و نگار سے تعاون کرے گی۔ شوکت صدیقی نے کہا کہ نیاز صاحب ایک بڑے ادیب تھے۔ ان پر قمر رئیس کا مقالہ بہت عمدہ تھا۔ پروفیسر کرار حسین نے کہا کہ نیاز صاحب عقلیت پسندی کے نمائندے تھے۔ ہر معاشرے کے گھوڑے کو ایسی مکھی کی ضرورت ہوتی ہے جو اُسے سونے نہ دے۔ نیاز صاحب ایسی ہی ایک مکھی تھے۔

ڈاکٹر اختر حسین رائے پوری نے کہا کہ نیاز صاحب کی فرمائش پر میں نے قاضی نذرالاسلام کی بنگلہ نظموں کو اردو میں منتقل کیا۔ انھوں نے یہ انکشاف کیا کہ ۱۹۳۴ء میں ان کا پہلا افسانہ "نگار" میں شائع ہوا تھا۔ انھوں نے یہ بھی بتایا کہ نیاز، میر ناصر علی دہلوی کے اُسلوب سے متاثر تھے۔ نیاز کے نگار پر بھی میر ناصر علی کے صلائے عام کے اثرات نظر آتے ہیں۔

ڈاکٹر فرمان فتح پوری نے اس موقع پر اظہار خیال کرتے ہوئے کہا کہ مجھے نیاز کی ڈگڈگی بجانے کا طعنہ دیا جاتا ہے۔ میں تو صرف نیاز صاحب کی وصیت سمجھ کر نگار کو زندہ رکھے ہوئے ہوں۔ اگر یہ ڈگڈگی بجانا ہے تو مجھے اس پر فخر ہے۔

آخر میں دونوں مقالہ نگاروں ڈاکٹر قمر رئیس اور شریف الحسن کو سپاس نامے پیش کیے گئے۔ ایک شیلڈ نفیس اکیڈمی کو نیاز صاحب کی کتابیں شائع کرنے پر دی گئی۔ جلسے کا اختتام نیاز صاحب کے صاحب زادے سرفراز نیازی کے اظہار تشکر پر ہوا۔

ایران میں انقلاب کے بعد کے ادبی رجحانات

پاک ایران تعلقات اتنے ہی قدیم ہیں جتنی برصغیر میں مسلمانوں کی تاریخ اور یہ ایک ایسا سرمایہ ہے کہ جس پر کوئی بھی قوم فخر کر سکتی ہے۔ ان خیالات کا اظہار مقتدرہ قومی زبان کے صدر نشین ڈاکٹر جمیل جالبی نے ایران اور پاکستان کے لسانی و تہذیبی روابط کے موضوع پر ادبی پرداز کی طرف سے مسلم لاء کالج بلڈنگ آبپارہ میں منعقد ہونے والی ایک تقریب میں خطبۂ صدارت کے دوران کیا۔ تقریب کے مہمان خصوصی ایران کے کلچرل اتاشی ڈاکٹر کمال خوادی نے اظہار خیال کرتے ہوئے بتایا کہ وہ اردو کے جدید شعرا کے کلام کے فارسی ترجمے شائع کرنے کی طرف خصوصی توجہ دے رہے ہیں۔ لاہور سے آئے ہوئے مہمان ڈاکٹر آقائے صادق گنجی نے ایران میں انقلاب کے بعد کے ادبی رجحانات کے بارے میں اظہار خیال کیا۔ انھوں نے کہا کہ ایران اور پاکستان کے مذہبی اور روایتی رشتوں کے باعث ان دونوں ممالک کے لسانی اور ادبی روابط میں مزید اضافہ ہوگا۔ ادبی پرواز کے صدر ڈاکٹر بشیر گورایہ نے اردو اور فارسی کے لسانی تہذیبی اور ادبی روابط اور ان کی اہمیت کے حوالے سے گفتگو کی۔ نظامت کے فرائض ڈاکٹر انعام الحق جاوید نے ادا کیے جب کہ ڈاکٹر تیمی اور سرفراز شاہد نے منظومات پیش کیں۔

صحرانورد کے خطوط کی پچاسویں سال گرہ

میرزا ادیب کی تصنیف "صحرانورد کے خطوط" کا پہلا ایڈیشن ۱۹۳۹ء میں چھپا تھا اور اب ۱۹۸۹ء میں اس کا تازہ ترین ایڈیشن چھپا ہے۔ اس کتاب نے اپنے مصنّف کی زندگی ہی میں اپنی پچاسویں سال گرہ منائی ہے۔ اگر کسی مصنّف کی کوئی تصنیف پچاس سال تک اس کا ساتھ دے، قدم سے قدم ملا کر چلتی رہے اور آئندہ بھی اس کا دم بھرنے کی ضمانت دے تو یہ ایک غیر معمولی اور تاریخی واقعہ تصوّر ہوگا۔ میرزا ادیب اور ان کی تصنیف "صحرانورد کے خطوط" کا رشتہ کچھ اسی قسم کا ہے۔

انجمن ترقی اردو ایبٹ آباد کے زیرِ اہتمام تعارفی تقریب

انجمن ترقی اردو ہزارہ ڈویژن ایبٹ آباد کے زیرِ اہتمام ایک ادبی تقریب معروف ادیب عبدالغفور تنولی کی تصنیف "تین مظلوم طبقے" کے سلسلے میں منعقد ہوئی۔ اس تقریب کی صدارت کے فرائض پروفیسر سعادت علی خاں نے انجام دیے۔ تلاوتِ کلام پاک کے بعد پروفیسر صادق تاہر، پروفیسر صوفی عبدالرشید، میر فضل الرحمان، عندم جان خاں، طاہر خیلی، عبداللہ خاں اور پروفیسر طاہر فاروق نے اس کتاب پر اپنے اپنے خیالات کا اظہار کیا۔

پروفیسر طاہر فاروق نے کہا کہ عبدالغفور تنولی نے اپنی کتاب "تین مظلوم طبقے" میں ملک کے لاوارث بچوں، لاوارث خواتین اور کہن سال بزرگوں کی اجیرن زندگی کو موضوعِ بحث بنایا ہے اور اصلاحِ احوال کے سلسلے میں سماجی نقطۂ نگاہ سے ان پر بات کی ہے۔ ان کی یہ کوشش قابلِ تحسین ہے اور اس موضوع پر دوسروں کے فکر کرنے کے دروازے کھولتی ہے۔

کتاب کی اس تعارفی تقریب کے بعد ایک محفلِ مشاعرہ ترتیب دی گئی جس میں مقامی شعرا جناب شاطر ہزاروی، جناب آصف ثاقب، جناب سلطان سکون، جناب صوفی عبدالرشید اور جناب اختر بےخود مراد آبادی نے کلام سنایا۔

ایبٹ آباد کالج کے طلبۂ قدیم کی انجمن اردو کا جلسہ

ایبٹ آباد کالج کے شعبۂ اردو کے طلبۂ قدیم کی انجمن اردو کی ترویج و ترقی کے لیے سنگِ میل ثابت ہوگی، ان خیالات کا اظہار صوبہ سرحد کی حکومت کے مشیر جناب فیض محمد خاں نے انجمن کے اجلاس سے خطاب کرتے ہوئے کیا۔ فیض محمد خاں صاحب جو شعبۂ اردو کے پہلے طالب علم رہے ہیں، اس اجلاس میں بحیثیت مہمان مدعو تھے۔ تقریب کی صدارت پروفیسر طاہر فاروق پرنسپل گورنمنٹ کالج ایبٹ آباد نے کی اور مہمان خصوصی صدر شعبۂ اردو پروفیسر صوفی عبدالرشید تھے۔ اجلاس سے کالج کے فارغ التحصیل اور زیرِ تعلیم طلبہ کے علاوہ شعبے کے اساتذہ نے بھی خطاب کیا۔ اس موقع پر کئی تجاویز پیش کی گئیں جن میں اردو کانفرنس کا انعقاد، انجمن کے زیرِ اہتمام مباحثے منعقد کرانا شامل ہیں۔

اس موقع پر حکومت صوبہ سرحد کے مشیر جناب فیض محمد خاں نے اپنی تقریر میں اپنے مکمل تعاون کا یقین

(تبصرے کے لیے دو جلدوں کا آنا ضروری ہے)

مترجم و محشّی قرآن مجید

مکمل ترجمہ معہ تفسیر فوائد ــــــــ موضح الفرقان تا سورہ آلِ عمران از حجۃ الاسلام شیخ الہند حضرت مولانا محمود الحسن رح

بقیہ دینی فوائد تا ختم قرآنِ پاک از شیخ الاسلام (پاکستان) حضرت مولانا شبیر احمد عثمانی رح

دارالتصنیف لمیٹڈ ایک فلاحی اشاعتی ادارہ ہے جو بڑی خاموشی اور خلوص سے دینی خدمت انجام دے رہا ہے۔ اس ادارے نے اپنا شائع کردہ مترجم و محشّی قرآن مجید ہمیں ارسال کیا ہے۔ یہ ایک قابلِ قدر اور گراں بہا اشاعت ہے۔ حنائی متن روشن ترجمہ اور تفسیر۔ کتابت اعلیٰ۔ کاغذ عمدہ۔ جلد نفیس۔ مترجم اور مفسر حضرات ہمارے ایسے نامور بزرگ جن کی زندگیوں کا بڑا حصّہ قرآن فہمی اور قرآنی تعلیمات کو عام کرنے میں گزرا ہے۔ اس قرآن مجید کے آخر میں ناشرین نے دونوں بزرگوں کے مختصر سوانح بھی شامل کر دیے ہیں تاکہ تلاوت کرنے والوں کو ان کے کارناموں سے آگاہی حاصل ہو۔

دارالتصنیف لمیٹڈ کا یہ اشاعتی کارنامہ بڑا قابلِ قدر اور گراں بہا ہے۔

دبستانِ لکھنؤ کے داستانی ادب کا ارتقا ــــ مصنّف: ڈاکٹر آغا سہیل

صفحات: ۲۷۱۔ قیمت: ۹۰ روپے

ناشر: مغربی پاکستان اردو اکیڈمی ۲۳/۷ سمن آباد لاہور

ڈاکٹر آغا سہیل بحیثیت افسانہ نگار، ناول نویس اور محقق و نقّاد دنیائے ادب میں کسی تعارف کے محتاج نہیں "دبستانِ لکھنؤ کے داستانی ادب کا ارتقا" ان کے پی ایچ ڈی کا مقالہ ہے جو حال ہی میں کتابی صورت میں منظرِ عام پر آیا ہے۔ اردو میں داستانیں نظم میں بھی لکھی گئیں اور نثر میں بھی۔ "اردو کی منظوم داستانیں" (ڈاکٹر فرمان فتح پوری) جیسی اہم کتاب انجمن ترقی اردو پاکستان نے ۱۹۷۱ء میں شائع کی تھی۔ "اردو کی نثری داستانیں" کے نام سے ڈاکٹر گیان چند جین کی مشہور کتاب کا پہلا ایڈیشن ۱۹۵۴ء میں اور دوسرا ایڈیشن ۱۹۶۹ء میں انجمن ہی کی جانب سے شائع ہوا ہے جب کہ ڈاکٹر سہیل بخاری کی کتاب "اردو داستان" مقتدرہ قومی زبان اسلام آباد نے شائع کی ہے۔

ڈاکٹر آغا سہیل نے اپنی اس کتاب میں ڈاکٹر سہیل بخاری اور ڈاکٹر گیان چند جین کے خیالات و نظریات کو رد نہیں کیا

بلکہ ان کی کاوش کو سراہتے ہوئے ان سے استفادے کا اعتراف کیا ہے لیکن وہ اردو نظم و نثر میں داستانوں کے تاریخی پس منظر تہذیبی و معاشرتی پہلوؤں کے مطالعہ کا احاطہ کرتے ہوئے اس بات پر اصرار کرتے ہیں کہ "داصل داستان لکھنؤ ہی میں پیدا ہوئی لکھنؤ ہی میں اس پر شباب آیا اور لکھنؤ ہی میں اس کا انتقال ہو گیا۔" (ص: ۷)

ڈاکٹر آغا سہیل نے اپنی بحث کا دائرہ صرف لکھنؤ، دہلی، شمالی ہند یا جنوبی ہند کی داستانوں تک محدود نہیں رکھا بلکہ بیرون ہند اور اس سے بڑھ کر یورپ اور یونان میں لکھی جانے والی داستانوں سے اردو داستانوں کا تقابلی مطالعہ بھی پیش کیا ہے اور متعدد ماخذات کے حوالوں سے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ جس زمانے میں یورپی زبانوں میں داستان طرازی کا رواج ہوا اسی زمانے میں اردو میں بھی داستان نویسی و داستان گوئی کا آغاز ہو چکا تھا۔

ڈاکٹر آغا سہیل نے اپنے موضوع کا احاطہ سات ابواب میں کیا ہے۔ انھوں نے اس کتاب میں اپنے پیش روبزرگوں مثلاً ڈاکٹر گیان چند جین، ڈاکٹر سہیل بخاری، کلیم الدین احمد، حسن عسکری اور عزیز احمد جیسے نقادوں کے نظریات کو پیش نظر رکھتے ہوئے اپنے موقف اور نقطہ ہائے نظر کی صراحت کی ہے۔ ڈاکٹر صاحب کا طرزِ نگارش فاضلانہ ہوتے ہوئے بھی نہایت دلکش اور شگفتہ ہے۔

"دبستان لکھنؤ کے داستانی ادب کا ارتقا" اپنے موضوع اور مواد کے اعتبار سے ایک اہم اور وقیع کتاب ہے۔ اسے تحقیقی و تنقیدی ادب میں ایک امتیازی درجہ حاصل ہو گا۔

دو مسافر دو ملک ______ مصنف: مسعود احمد برکاتی

صفحات: ۹۹۔ قیمت: ۱۲ روپے

پتا: ہمدرد فاؤنڈیشن پریس، کراچی

"دو مسافر دو ملک" میں جناب حکیم محمد سعید اور جناب مسعود احمد برکاتی کے سفرِ انگلستان کے دلچسپ حالات رقم ہیں۔ جناب مسعود احمد برکاتی نے اردو زبان میں ایسے بچوں کا پہلا سفر نامہ کہا ہے اور یوں اس سفر نامے کو لکھ کر انھیں یہ اختصاص و تفاخر حاصل ہو گیا ہے کہ وہ اردو میں بچوں کے لیے لکھے جانے والے پہلے سفر نامے کے مصنف ہیں۔ مصنف کا سفر ۲۹ اگست ۱۹۸۲ء کو شروع ہوا اور ۱۱ ستمبر ۱۹۸۲ء کو اختتام کو پہنچا۔ گویا یہ سفر نامہ چودہ دنوں کی روداد پر مشتمل ہے۔

جناب مسعود احمد برکاتی ۳۷ برس سے بچوں کا ادب پیش کر رہے ہیں۔ وہ بچوں کے مشہور ماہنامہ "ہمدرد نونہال" کے مدیر ہیں۔ ان کا سارا وقت بچوں کے ادب کے لیے بہتر سے بہتر مواد فراہم کرنے میں صرف ہوتا ہے۔ برکاتی صاحب اپنے اس ۳۷ سالہ سفر میں بچوں کی نفسیات، ان کی پسند اور ناپسند اور انھیں کس طرح مخاطب کرنا اچھا لگتا ہے، ان سب باتوں سے بہ خوبی واقف ہو گئے ہیں۔ اس واقفیت سے انھیں یہ فائدہ پہنچا ہے کہ کتاب مذکور کے رقم کرتے میں بہ اعتبار زبان و بیان وہ سارے التزامات اور لحاظ از خود تحریر میں داخل ہو گئے ہیں جن کا خیال بچوں کے لیے لکھی جانے والی کتابوں میں لازمی ہوتا ہے۔

"دو مسافر دو ملک" کے مصنف کی نظر میں پسندیدگی کے لحاظ سے فرانس دوسرے نمبر پر رکھا گیا ہے۔ اپنا وطن سب کو پیارا ہوتا ہے اس لیے پاکستان کو اولیت دی گئی ہے۔ ویسے دیکھا جائے تو "دو مسافر دو ملک" کے مصنف کو بیرونی ممالک میں فرانس سب سے اچھا لگا ہے۔ شاید اسی لیے جن ابواب میں وہ پیرس کا ذکر کرتے ہیں، بڑی وابستگی سے کرتے ہیں۔ ان کی تحریر میں ایک طرح کی چمک پیدا ہو جاتی ہے۔ آدمی جس شے کو زیادہ پسند کرتا ہے اس کے لیے تحسین و آفرین کے کلمات خود بہ خود زبانِ قلم پر آجاتے ہیں۔

"دو مسافر دو ملک" نہ صرف بچوں کے مطالعے کی کتاب ہے بلکہ بڑے بھی اس سے مستفید ہو سکتے ہیں۔ محمد ادریس ... ایک عرصے سے اختصاص کے ساتھ بچوں کا ادب پیش کر رہا ہے۔ اس بارے میں اس کا موقف یہ ہے کہ بچے مستقبل کے معمار ہیں لہٰذا ان کی ذہنی تربیت ابتدا ہی سے کرنی ازبس ضروری ہے اور ظاہر ہے ذہنی تربیت میں کتابیں کلیدی کردار ادا کرتی ہیں۔

———— ا۔س

وادیِ حیرت ———— مصنف: نیّر ندیم

صفحات: ۴۸۔ قیمت: ۲۰ روپے

پتا: گوڈویل آئی بی ایم کمپوزنگ سنٹر، نیو اردو بازار، کراچی

"وادیِ حیرت" نیّر ندیم کا سفرنامۂ نیپال ہے۔ بہ قول مصنف نیپال پر لکھا گیا یہ پہلا اردو سفرنامہ ہے۔ اس کی خوبی یہ ہے کہ اس میں کٹھمنڈو، اس کے گرد و نواح کے حسین قدرتی مناظر اور قدیم عمارات، مناروں اور پگوڈوں کا بیان دل چسپ پیرائے میں ہوا ہے۔ قاری گھر بیٹھے اس کے مطالعے سے ہمالے کی ترائی کے ان خوبصورت مقامات و مناظر کی سیر کر لیتا ہے۔ وہ جتنی دیر "وادیِ حیرت" کا مطالعہ کرتا ہے، گویا وادیِ حیرت میں گم رہتا ہے۔ دوسری خوبی اس کا اختصار ہے۔ کم صفحات میں اتنی ساری معلومات کو قاعدے، قرینے سے یکجا کر دینا بھی کم بات نہیں۔ سفرناموں کے باب میں یہ ایک دل چسپ اضافہ ہے۔

———— ا۔س

اذانِ سحر ———— مصنف: غنی دہلوی

صفحات: ۲۴۰۔ قیمت: ۴۰ روپے

پتا: اردو اکیڈمی سندھ، کراچی

"اذانِ سحر" کے مصنف غنی دہلوی نے مولانا عبدالسلام نیازیؒ، مفتی کفایت اللہؒ اور حضرت خواجہ حسن نظامیؒ کی خانقاہیں دیکھیں اور شرف باریابی حاصل کیا ہے۔ نواب سائل دہلوی اور حضرت بیخود دہلوی کی شعری محفلوں سے فیض یاب ہوئے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ جناب غنی دہلوی کے ہاں شاعری اور سلوک کا بڑا اچھا میل جول ہے۔

کتاب مذکور میں صاحبِ کتاب کی خود نوشت "زندگی کی جھلکیاں" پڑھ کر یوں محسوس ہوتا ہے کہ مسافرت نے ان کے فکری تناظر کو وسعت دی۔ دہلی کی بود و باش نے انھیں سلوک اور شاعری کی ثروت سے مالا مال کیا

اور حیدر آباد دکن کے گلی کوچوں نے انھیں عاشقی کے آداب سکھائے اور بالآخر یہ تمام تجربات ان کی شاعری میں بھی حسین کلام کی صورت میں ظاہر ہوئے۔

اگر آپ غنی دہلوی کے کلام کا بالاستیعاب مطالعہ کریں تو ان کی شاعری کی ان خوبیوں کی تصدیق ہو جائے گی جن کا ذکر اوپر کیا گیا ہے۔

جناب غنی دہلوی کی زیرِ بحث کتاب بہت تنوع کے کلام کا مجموعہ ہے۔ اس میں قومی اور شخصی نظموں کے دوش بدوش گیت اور بچوں کے لیے لکھی گئی نظمیں بھی ہیں۔ اس طرح ان شعری کاوشوں میں شاعر کے فکر کی بہت سی جہتیں منظرِ عام پر آگئیں اور اس کے باطن میں جھانکنے کے لیے بہت سی کھڑکیاں کھل گئی ہیں۔

کوئی ضروری نہیں ہر شاعر ایک ہی چوکھٹے میں رہ کر لکھے۔ ایک شاعر کا کلام دوسرے شاعر سے مختلف ہوتا ہے۔ ہمیں کسی شاعر پر بات کرتے ہوئے اس تخالف و انفرادیت کو پیشِ نظر رکھنا چاہیے اور اسی توسط سے محاسنِ کلام کی جستجو کرنی چاہیے اور میں دل جمعی سے کہہ سکتا ہوں کہ یہ جستجو کامیاب رہی ہے۔

کتاب اچھی چھپی ہے اور مطالعے کی دعوت دیتی ہے۔ ——— ا س

...رن کولمبس ———— مصنّف: جاوید اقبال کارٹونسٹ
سفرنامہ
صفحات: ۱۹۸۔ قیمت: ۱۹۸
پتا: آتش فشاں پبلی کیشنز، شبستان سینما اپیٹ روڈ، لاہور

...ابریشم ———— مصنّف: بانو قدسیہ
شخصیت
صفحات: ۱۵۷۔ قیمت: ۷۵ روپے
پتا: سنگِ میل پبلی کیشنز

...رسن کے بعد ———— مصنّف: گوہر سلطانہ عظمیٰ
ناول
صفحات: ۱۰۹۔ قیمت: ۵۰ روپے
پتا: نگارشات ۳۔ میاں چیمبرز، ٹمپل روڈ، لاہور

...نزلِ مقصود ———— مصنّف: مہر کاچیلوی
افسانے
صفحات: ۱۱۲۔ قیمت: ۱۵ روپے
پتا: مہر پبلی کیشنز میرپور خاص سندھ

...یدہ

...شش ماہی ———— مرتبین: مختار زمن، مشفق خواجہ
صفحات: ۲۲۴۔ قیمت: ۵۰ روپے
پتا: ادارہ یادگارِ غالب۔ پوسٹ بکس ۲۲۶۸ کراچی ۷۴۶۰۰

...پا سالگرہ نمبر شمارہ ۵۵ ———— مدیر: نسیم درّانی
صفحات: ۳۰۲۔ قیمت: ۳۰ روپے
پتا: سیپ پبلی کیشنز، پوسٹ بکس نمبر ۳۲۲۴ب۔ کراچی ۷۵۵۳۰

سالنامہ جنوری، فروری ۱۹۹۰ء ———— مدیران وزیر آغا، انور سدید، سجاد نقوی
صفحات: ۵۱۵۔ قیمت: ۶۰ روپے
پتا: دفتر اوراق، چوک اردو بازار، لاہور ۲

نومبر، دسمبر ۱۹۸۹ء ———— مدیر: احمد ندیم قاسمی
صفحات: ۳۸۸۔ قیمت: ۶۰ روپے
پتا: ۶/۳۹ ملک چیمبرز، لوئر مال، لاہور

ڈاکٹر وفا راشدی

نئے خزانے

گزشتہ سے پیوستہ ـــــ رسائل و جرائد بابت جون تا اکتوبر ۱۹۸۹ء کے موضوع وار اشاریے

تحقیق و تنقید

مصنف	عنوان	رسالہ	مقام	تاریخ	سال	صفحہ
سید سبط حسن رضوی، ڈاکٹر	خواجہ حافظ ہمارے دیس میں	دانش	اسلام آباد	۱۷، ۱۸ /	۱۹۸۹ء	ص ۲۳۱
سید محمد اصغر	مرثیہ بہ زبانِ اردو	"	"	"	"	ص ۱۴۵
شبنم شکیل / مجتبٰی چودھری	حدیثِ دل[1]	ماہِ نو	لاہور	ستمبر	"	ص ۸۴
شہزاد منظر	عسکری کی افسانہ نگاری	اوراق	"	جون، جولائی	"	ص ۲۶۶
ظہور احمد عثمانی	اقبال کے فارسی کلام میں خدا سے خطاب	دائرے	کراچی	اگست	"	ص ۸
عبدالکافی ادیب	پستو افسانہ، ایک جائزہ	ماہِ نو	لاہور	ستمبر	"	ص ۱۷
عطیہ سید، ڈاکٹر	فلسفہ اور قبولِ عام	"	"	اگست	"	ص ۷۷
قمر جمیل	محشر کی شاعری، ایک تجزیہ	"	"	ستمبر	"	ص ۳
کاظم علی خاں	مراثی نسیم امروہوی کا تجزیاتی جائزہ	اردو	کراچی	جون	"	ص ۱۱۷
کلیم الدین احمد	جاپان کی شاعری	دائرے	"	ستمبر	"	ص ۶
کلیم سہسرامی، ڈاکٹر	قند پارسی در بنگال	دانش	اسلام آباد	۱۷، ۱۸ /	"	ص ۱۰۳
گوپی چند نارنگ، ڈاکٹر	ادبی تنقید اور اسلوبیات	اوراق	لاہور	جون، جولائی	"	ص ۲۸۳
گوپی چند نارنگ پروفیسر	ساختیات اور ادبی تنقید قسط ۱	ہماری زبان	دہلی	یکم اکتوبر	"	ص ۲
گوہر نوشاہی، ڈاکٹر	ورثہ ہائے اردو در آثارِ قدیمہ عربی	دانش	اسلام آباد	۱۷، ۱۸ /	"	ص ۱۶۷
محمد علی صدیقی	مجروح سلطان پوری	اوراق	لاہور	جون، جولائی	"	ص ۲۲۹

---

[1] کچھ امرتا پریتم کے بارے میں

مصنف	عنوان	رسالہ	مقام	ماہ	سال	صفحہ
مرزا حامد بیگ، ڈاکٹر	غزل گو	کتاب نما	نئی دہلی	اگست	۱۹۸۹ء	ص ۹
میر خادم حسین تالپور	سندھی غزل پر حافظ شیرازی کے اثرات	دانش	اسلام آباد	۱۸، ۱۷/	″	ص ۵۱
ناہید نوتر، ڈاکٹر	میراثر کی شاہکار مثنوی، خواب و خیال کا تنقیدی جائزہ	نیرنگِ خیال	راولپنڈی	اگست	۱۹۸۹ء	ص ۱۶
نسرین ممتاز بصیر	حسرت کی سیاسی شاعری	معارف	اعظم گڑھ	ستمبر	″	ص ۲۰۷
نسیم احمد، ڈاکٹر	دیوان بیدار میں شامل ایک غزل	″	″	″	″	ص ۲۱۷
نظیر صدیقی	فراق گورکھپوری کی ایک غیر مطبوعہ تحریر	قومی زبان	کراچی	″	″	ص ۲۵
نیر مسعود	حکایتیں	″	″	جولائی	″	ص ۵۵
وزیر آغا، ڈاکٹر	ساختیاتی تنقید	اوراق	لاہور	جون، جولائی	″	ص ۳۹۴

تہذیب و ثقافت

مصنف	عنوان	رسالہ	مقام	ماہ	سال	صفحہ
قمر جمیل	کلچر کا آغاز	دائرے	کراچی	جولائی	۱۹۸۹ء	ص ۲۷
قمر جمیل	کلچر اور تہذیب	″	″	″	″	ص ۲۹
کرار حسین، پروفیسر	کلچر کا مسئلہ	نیا دور	″	شمارہ ۸۳، ۸۴		ص ۱۹۴
مشیر الحق	دلی۔ رسم و رواج کی دلی	قومی زبان	″	جولائی	۱۹۸۹ء	ص ۹۴
		دائرے	″	اگست	″	ص ۷۹

تاریخ و فنِ تاریخ

مصنف	عنوان	رسالہ	مقام	ماہ	سال	صفحہ
حسین کاظمی، پروفیسر	تحریک پاکستان کا فکری پہلو	دائرے	کراچی	اگست	۱۹۸۹ء	ص ۷۹
سید احتشام ندوی، ڈاکٹر	تحفۃ المجاہدین کا ایک مطالعہ	معارف	اعظم گڑھ	ستمبر	″	ص ۱۹۲
سید سلطان محمود حسین، ڈاکٹر	حادثہ کانپور، مسجد مچھلی بازار	ماہ نو	لاہور	اگست	″	ص ۵۷
غلام محمد لاکھو	مدفن میاں نور محمد کلہوڑا اور اس کے کتبے	دانش	اسلام آباد	۱۸، ۱۷/	″	ص ۷۸۲
قدرت اللہ شہاب	سادگی مسلم کی دیکھ	قومی زبان	کراچی	جولائی	″	ص ۵
مبارک علی، ڈاکٹر	مورخ اور تاریخ	″	″	اگست	″	ص ۶۹

علومِ اسلامیہ

مصنف	عنوان	رسالہ	مقام	ماہ	سال	صفحہ
بابائے اردو مولوی عبد الحق	پرانی اردو میں قرآن شریف کے ترجمے اور تفسیریں	اردو	کراچی	جون	۱۹۸۹ء	ص ۱

مصنف	عنوان	رسالہ	مقام	ماہ	سال	صفحہ
خلیق احمد نظامی، پروفیسر	ہندستان میں علوم قرآنی کا نشو و نما اور اسلامی معاشرہ پر اس کا اثر	معارف	اعظم گڑھ	جولائی	۱۹۸۹ء	ص ۵
ضیاء الدین اصلاحی	قرآن مجید کا تصور ربوبیت اور مولانا ابوالکلام آزاد	معارف	اعظم گڑھ	ستمبر	۱۹۸۹ء	ص ۲۵
غلام حسین / تصحیح و تعلیق	رسالہ تعقیبات [1]	دانش	اسلام آباد		۱۹۸۸ء	ص ۱۷۵
محمد نیاز	دی ہولی قرآن - ٹرانسلیٹریشن ان رومن اسکرپٹ	العلم	کراچی	جون	۱۹۸۹ء	ص ۸۴

خودنوشت

مصنف	عنوان	رسالہ	مقام	ماہ	سال	صفحہ
ابن الحسن سید	میں کیوں لکھتا ہوں	نیرنگ خیال	راولپنڈی	ستمبر	۱۹۸۹ء	ص ۹
ادا جعفری	جہاں میں تھی / چوتھی قسط	افکار	کراچی	جولائی	"	ص ۱۷
ادا جعفری	مہربان لمحے / پانچویں قسط	"	"	ستمبر	"	ص ۱۹
ادا جعفری	آئینہ روبرو ہے جو مژگاں اٹھائیے (چھٹی قسط)	"	"	اکتوبر	"	ص ۱۷
ادا جعفری	میرا ادبی سفر	دائرے	"	ستمبر	"	ص ۵۰
ادیب سہیل	میرا ادبی سفر	"	"	جولائی	"	ص ۴۵
انجم اعظمی	میرا ادبی سفر	"	"	اگست	"	ص ۴۴
جلیل قدوائی	آپ بیتی	"	"	ستمبر	"	ص ۳۳
قاضی قیصر الاسلام	ژاں پال سارتر / الفاظ	"	"	"	"	ص ۲۴
ندا فاضلی	دیواروں کے بیچ / قسط ۱	شاعر	بمبئی	شمارہ ۱ جلد ۶۰	"	ص ۲۹
ندا فاضلی	" " " ۲	"	"	" " ۲	"	ص ۳۰

سفرنامہ

مصنف	عنوان	رسالہ	مقام	ماہ	سال	صفحہ
پرتو روہیلہ	فَبَشَرُوْا فَانْظُرُوْا	اوراق	لاہور	جون، جولائی	۱۹۸۹ء	ص ۴۲۵
پرویز پروازی	سفرنامہ کی تاریخ	"	"	"	"	ص ۲۵۶
عبداللطیف اعظمی	مولانا آزاد کا پہلا سفر عراق	ہفت روزہ ہماری زبان	دہلی	۸ جولائی	"	ص ۲
ہرچرن چاولہ	بلگاریہ کی سنہری ریتوں پر سات دن	نیرنگ خیال	راولپنڈی	ستمبر	"	ص ۲۵

---

[1] تصنیف: امیر کبیر میر سید علی ہمدانی عارف بزرگ قرن ہشتم ہجری

گرد و پیش

انجمن ترقی اردو پاکستان کی جانب سے چینی ادیب کے اعزاز میں جلسہ

چین کے اردو ادیب اور مترجم جناب یوان وئے شوئے کے اعزاز میں انجمن ترقی اردو پاکستان کی جانب سے ایک تہنیتی جلسہ ۲۰ جنوری ۱۹۹۰ء کو نیپا کی سماعت گاہ میں منعقد ہوا۔ جس کی صدارت صدرِ انجمن نورالحسن جعفری نے فرمائی۔ نظامت کے فرائض ڈاکٹر اسلم فرخی نے انجام دیے۔ اسی اجلاس میں جناب یوان سوئے کی اردو کتاب "چین کے ادیب اور شاعر" کا تعارف کرایا گیا۔ ڈاکٹر اسلم فرخی نے مہمان خصوصی کا تعارف کراتے ہوئے کہا کہ جناب وئے شوئے نے اردو کے کئی معروف ناولوں اور افسانوں کو چینی زبان میں منتقل کیا ہے۔ انھوں نے صرف اردو سے چینی میں ہی نہیں، چینی سے اردو میں بھی ترجمہ کیا ہے۔ ان کی ایک کتاب "چین کے ادیب و شاعر" پیکنگ سے شائع ہوئی ہے۔ جناب شوئے کو اردو زبان پر غیر معمولی قدرت حاصل ہے۔ اس کا اندازہ ان کی کتاب کے مطالعے سے ہوتا ہے۔

جناب احمد ہمدانی نے کہا کہ پاکستان چین دوستی کا تقاضا ہے کہ ہم ایک دوسرے کے ادب کا مطالعہ کریں۔ ہمیں نہایت افسوس کے ساتھ اعتراف کرنا پڑتا ہے کہ چینی ادب کے بارے میں ہماری معلومات ناکافی ہیں۔ ہمارے چینی دوست نے اپنی کتاب "چین کے ادیب و شاعر" میں کلاسیکی دور سے لے کر دورِ جدید تک کے ایک سو سات شاعروں کا نہایت اختصار اور جامعیت کے ساتھ تعارف کرایا ہے جس سے چینی ادبی شخصیات تک اردو داں قارئین کی رسائی آسان ہوگئی ہے۔ جناب ہمدانی نے جناب شوئے کی تحریر میں سادگی اور سلاست اور ان کی اردو زبان پر گرفت کی تعریف کی اور کہا کہ ان کی تحریر کو پڑھ کر یہ شبہ نہیں گزرتا کہ یہ ایک ایسے شخص کی تحریر ہے جس کی اپنی زبان اردو نہیں۔

جناب شوکت صدیقی نے کہا کہ ایسا نہیں ہے کہ ہمارے چینی دوست شوئے نے صرف چینی زبان کو اردو میں منتقل کر دیا ہے بلکہ انھوں نے زبان کے حسن اور لطافت کو بھی برقرار رکھا ہے۔

جناب یوان وئے شوئے نے اپنی تقریر میں کہا کہ میں نے ۱۹۶۵ء سے ریڈیو پیکنگ میں ملازمت کے دوران اردو زبان سیکھنا شروع کیا۔ میں اس سے قبل بھی دو بار پاکستان آچکا ہوں۔ یہ میرا تیسرا دورہ ہے۔ یہ کہنا نامناسب

نہ ہوگا کہ میں پاکستان کو اپنا دوسرا وطن تصور کرتا ہوں۔ میں پاکستان، پاکستانی عوام اور پاکستانی ثقافت سے محبت
کرتا ہوں۔ مجھے اردو زبان و ادب سے گہری دلچسپی ہے۔ میرے خیال میں اردو ایک ترقی پسند زبان ہے کیونکہ وہ دوسری
زبانوں کی خوبیاں اپناتی ہے۔ اردو ادب، عالمی ادب میں ایک چمکدار موتی کی حیثیت رکھتا ہے، میں یہ موتی چینی عو
کو دکھانا چاہتا ہوں اسی لیے میں ۱۹۷۷ء سے چینی زبان میں اردو ادب کو منتقل کر رہا ہوں۔ میں نے رئیس احمد جعفری
کے ناول "مجاہد"۔ جی۔ الانہ کی کتاب "قائد اعظم محمد علی جناح"۔ عبداللہ حسین کے ناول "اداس نسلیں"۔ خدیجہ مستور
ناول "زمین" اور عزیز احمد کے ناول "ایسی بلندی ایسی پستی"۔ منٹو کے افسانے اور پاکستان کی بہت سی کہانیوں
ترجمہ کیا ہے۔ یہ کتابیں چینی زبان میں شائع ہو چکی ہیں۔ اس کے علاوہ میں نے پاکستان کی ثقافت۔ اس کے رقص
موسیقی اور دوسرے موضوعات پر بیسیوں مضامین لکھے ہیں۔

جناب شوئے نے اپنی گفتگو کو جاری رکھتے ہوئے مزید کہا کہ یہاں یہ بات قابلِ ذکر ہے کہ پاکستان اور چین
درمیان ثقافتی وفود کا تبادلہ تو ہوتا رہا ہے لیکن ادب کا تبادلہ بہت کم ہوا ہے۔ اس لیے میں نے عزم کر رکھا ہے کہ میں اس
کو پُر کرنے کی کوشش کرتا رہوں گا۔ میں نے اس سلسلے میں جو کچھ کیا ہے وہ ناکافی ہے۔ ابھی بہت کچھ کرنا ہے۔

صدرِ انجمن جناب نورالحسن جعفری نے جناب وئے شوئے کو ان کی خدمات کے اعتراف میں انجمن کی جانب سے تشار
پیش کیا اور ان کی ادبی خدمات کو پُرشکوہ الفاظ میں سراہا۔

انجمن میں بھارت سے آئے ہوئے مہمان ادیبوں کی آمد

انجمن ترقی اردو پاکستان کی طرف سے کتب خانۂ خاص میں، بھارت سے آئے ہوئے ادیبوں ڈاکٹر قمر رئیس، پروفیسر
شریف الحسن نقوی اور معروف افسانہ نگار جوگندر پال کے اعزاز میں ایک استقبالیہ تقریب منعقد کی گئی اس سے خطاب
کرتے ہوئے انجمن کے معتمد اعزازی جناب جمیل الدین عالی نے کہا کہ انجمن کے کتب خانے میں اس وقت بیالیس ہزار کتابیں مو
ہیں۔ یہاں تین ہزار آٹھ سو مخطوطے ان مخطوطوں کے علاوہ ہیں جو تحفظ کے خیال سے امانتاً نیشنل میوزیم میں رکھوا دیے گئے ہیں
انھوں نے انجمن کی مطبوعات کے بارے میں اطلاع دیتے ہوئے کہا کہ انجمن نے بابائے اردو مولوی عبدالحق کے انتقال کے بعد تقر
ڈھائی سو کتابیں شائع کی ہیں جن میں نئی کتابیں بھی ہیں، پرانی کتابوں کے نئے ایڈیشن بھی اور قاموس اللغات کی تین نئی جلدیں
اصطلاحاتِ بینکاری اور جدید اقتصادی اصطلاحات زیرِ طبع ہیں۔

جوگندر پال نے اپنے نئے ناول "خواب رو" سے متعلق ایک سوال کے جواب میں بتایا کہ اس کا موضوع مہاجر
ہے۔ یہ ناول اگرچہ کراچی کے پس منظر میں لکھا گیا ہے لیکن اس میں مہاجرت ایک عالمی مسئلے کے طور پر پیش ہوئی ہے اور یہ بتا
کی کوشش کی گئی ہے کہ یہ صورتِ حال آج کے انسان کا مقدر ہے۔

دہلی اردو اکیڈمی کے سکریٹری پروفیسر شریف الحسن نقوی نے اس موقع پر گفتگو کرتے ہوئے بتایا کہ اس اکیڈمی
قیام ۱۹۸۱ء میں عمل میں آیا۔ دہلی اکیڈمی کے علاوہ ہندستان کے مختلف صوبوں میں دس اور اکیڈمیاں قائم ہیں جن کا

...لاتے ہوئے ذاتی طور پر پانچ ہزار روپے کا عطیہ بھی دیا۔ اور یہ بھی کہا چونکہ اس تنظیم کے قیام سے ماضی، حال اور ...ستقبل کے رشتے مضبوط ہوں گے اور اس کے ساتھ ساتھ اردو زبان کی ترویج و ترقی میں اضافہ ہوگا۔ اس لیے وہ ...س انجمن کے تعاون میں فخر محسوس کرتے ہیں۔

مہمانِ خصوصی پروفیسر صوفی عبدالرشید نے اس انجمن کے قیام کو ایک خوش آئند قدم قرار دیا۔

صدرِ تقریب پروفیسر طاہر فاروقی نے انجمن کے ساتھ مکمل تعاون کا اعلان کرتے ہوئے انجمن کے زیرِ اہتمام ...ونے والی تقاریب کے سلسلے میں مکمل تعاون کا یقین دلایا اور اپنے کالج کے ماحول کو خوش گوار بنانے میں ایک اہم موثر ...رار دیا۔ بعد ازاں عہدیداروں کا انتخاب عمل میں لایا گیا۔

سرپرست اعلیٰ: پروفیسر طاہر فاروقی، پرنسپل گورنمنٹ کالج ایبٹ آباد۔ صدر انجمن: فیض محمد خان۔

سینئر نائب صدر: گل محمد خاں جدون۔ سینئر (خاتون) نائب صدر: روبینہ ملک۔ جنرل سکریٹری: ذوالفقار احمد۔

...ائنٹ سکریٹری: رخسانہ بی بی۔ سکریٹری نشر و اشاعت: بابر خان۔ سکریٹری فنانس: شکیل احمد۔ سکریٹری رابطہ: ...طارق تنویر۔

مجلسِ عاملہ: راحیلہ زیب، ساجرہ خاتون، رضوانہ اعوان، نسرین سید، ناظمہ سواتی، قاضی جمیل الدین۔ ملک محمد جہاں گیر، رمضان شیرازی، الطاف خان، جمیل اختر اور ولی آستان۔

آخر میں یہ فیصلہ بھی کیا گیا کہ شعبہ کے اساتذہ اور وہ طلبہ جنھوں نے بی۔ اے میں اردو بحیثیت اختیاری مضمون کے پڑھی ہے وہ بھی اس انجمن کے رکن بن سکتے ہیں۔

این فرینچ
ریشم سے بڑھ کر نرم ، ملائم سراپا

حروف تازہ

کتابیں

نتوب ـــــــــ مصنف: اعجاز راہی
ناولٹ صفحات: ۱۵۲ ـ قیمت: ۷۰ روپے
پتا: نیو کلاسیک ـ اسلام آباد

ـف من و تو ـــــــــ مصنف: آصف فرخی
انٹرویو صفحات: ۲۹۹ ـ قیمت: ۹۹ روپے
پتا: نفیس اکیڈمی اردو بازار، کراچی

جوانوں کا گیت ـــــــــ مصنف: یانگ مو مترجم: رشید بٹ
مضامین صفحات: ۸۶۱ ـ قیمت: درج نہیں
پتا: غیر ملکی زبانوں کا اشاعت بیجنگ، عوامی جمہوریہ چین

ی نگری پھرا مسافر ـــــــــ مصنف: ابن انشا
سفرنامہ صفحات: ۲۴۸ ـ قیمت: ۵۰ روپے
پتا: لاہور اکیڈمی ۲۰۵ سرکلر روڈ، لاہور

سارچمن ـــــــــ مصنف: بانو قدسیہ
ناولٹ صفحات: ۵۹۹ ـ قیمت: ۱۵۰ روپے
پتا: سنگِ میل پبلی کیشنز، لاہور

سبا اور سمندر ـــــــــ مصنف: انور سجاد
ڈرامے صفحات: ۵۱۲ ـ قیمت: ۱۵۰ روپے
پتا: سنگِ میل پبلی کیشنز، لاہور

بیسویں صدی کی لڑکی ________ مصنف: عذرا اصغر
افسانے
صفحات: ۲۳۲۔ قیمت: ۶۰ روپے
پتا: مقبول اکیڈمی ۱۰۔ دیال سنگھ مینشن شاہراہِ قائدِ اعظم، لاہور

بات شناسائی کی ________ مصنف: راشد مراد
نظمیں
صفحات: ۶۴۔ قیمت: ۴۵ روپے
پتا: نمود بکس جہلم

سرچشمۂ فیض ________ مصنف: فیض بخشاپوری
شاعری
صفحات: ۱۱۶۔ قیمت: ۵۰ روپے
پتا: مکلی پرنٹرز، سکھر

لہو چاند اور سویرا ________ مصنف: سیف زلفی
شاعری
صفحات: ۱۶۰۔ قیمت: ۷۵ روپے
پتا: پاکستان پیپلز پروگریسو رائٹرز، لاہور

مفتیانے ________ مصنف: ممتاز مفتی
خود نوشت
صفحات: ۱۵۲۶۔ قیمت: ۳۵۰
پتا: فیروز سنز، لاہور

معاشریاتِ ترقی ________ مصنف: ڈاکٹر سی۔ اے۔ قادر، تدوین و نظرِ ثانی: ڈاکٹر انور سدید
صفحات: ۱۰۱۔ قیمت: ۴۰ روپے
پتا: مغربی پاکستان اردو اکیڈمی، لاہور

مغرب میں "نئی تنقید" کی تحریک ________ مصنف: ڈاکٹر وزیر آغا
تنقید
صفحات: ۲۸۔ قیمت: ۷ روپے
پتا: مغربی پاکستان اردو اکیڈمی، لاہور

دبستانِ لکھنؤ کے داستانی ادب کا ارتقا ________ مصنف: ڈاکٹر آغا سہیل
تاریخِ ادب
صفحات: ۲۷۴۔ قیمت: ۹۰ روپے
پتا: مغربی پاکستان اردو اکیڈمی، لاہور

تعلقاتِ عامہ پیشہ و فن ________ مصنف: نسیم احمد
صفحات: ۲۳۹۔ قیمت: ۹۰ روپے
پتا: مکتبہ احمد بی ۹/ ایم۔ والی پلازہ ناظم آباد ۲ کراچی

PSO
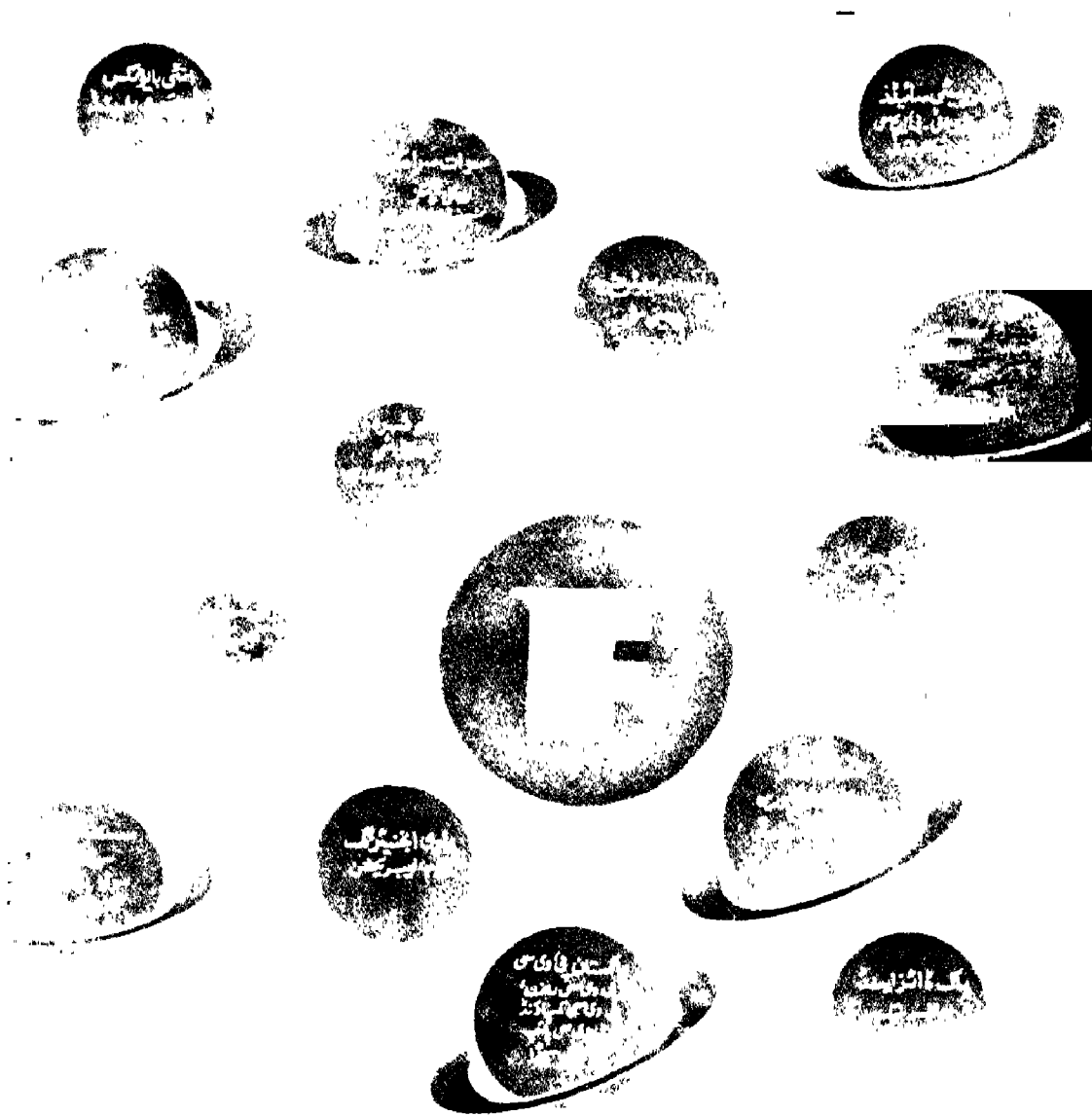
FCCCL
کی روشن کہکشاں
ہر سیارہ کامیابی کی داستان
فیڈرل کیمیکل اینڈ سرامکس کارپوریشن (پرائیویٹ) لمیٹڈ
PID - Islamabad

ماهنامہ
قومی زبان
کراچی

مارچ ۱۹۹۰
جلد : ۶۳
شمارہ : ۳

ادارۂ تحریر
جمیل الدین عالی
ادا جعفری
ڈاکٹر اسلم فرخی

مدیر
ادیب سہیل

بدل اشتراک
فی پرچہ ...... ۵ روپے
سالانہ ...... ۵۰ روپے
سالانہ رجسٹری سے ۱۰۰ روپے

بیرونِ ملک
فی پرچہ ...... ایک ڈالر
سالانہ ...... دس ڈالر
سالانہ رجسٹری سے پندرہ ڈالر

انجمن ترقی اردو پاکستان
اردو روڈ، کراچی، فون: ۲۲۰۲۲

مضمون نما

قومی زبان کے پچاس سال

۲۳ر مارچ ۱۹۹۰ء کو قرارداد پاکستان کی گولڈن جوبلی منائی جارہی ہے۔ اس یادگار موقعے پر یہ بھی ذہن میں رکھنا ضروری ہے کہ قومی زبان کے منصب اور حیثیت کو بھی مدِّنظر رکھا جائے۔ ہم نے پاکستان بناتے وقت یہ فیصلہ توکیا تھا کہ پاکستان کی قومی زبان صرف اردو ہوگی۔ لیکن ۲۳ر مارچ ۱۹۹۰ء کا دن اگر ہم سے یہ دریافت کرے کہ ہم نے اس فیصلے پر کس حد تک عمل کیا ہے تو کیا کوئی مثبت جواب ہمارے پاس ہوگا؟ اگر نہیں، تو اس کا ذمّہ دار کون ہے؟

AZ
ANWARZAIB
WHITE CEMENT
BS 12 1983
40 KG NET WT

ڈاکٹر اسلم فرخی

نوادر کتب خانۂ خاص

بے وقوفوں سے عقل سیکھو

مرتبہ

آنریبل ملک سر فیروز خاں نون نائٹ ایم اے

ہائی کمشنر فار انڈیا

لاہور

رائے صاحب منشی گلاب سنگھ اینڈ سنز

ایجوکیشنل پبلشرز

۱۹۴۰ء

اوّل	قیمت ۱۲

کتاب خانہ

3-8

عابد منزل حیدرآباد

پاکستان کے ایک سابق وزیراعظم خاں سر فیروز خاں نون اپنے مختلف مناصب اور سیاسی اقتدار کی وجہ سے ملکی تاریخ ہرت کے حامل ہیں۔ وہ پنجاب کے وزیر۔ وزیراعلیٰ رہے۔ وائسرائے کی کونسل کے رکن رہے۔ برطانیہ میں ہندوستان کے ہائی کمشنر قیام پاکستان کے بعد وہ وزیر۔ وزیراعلیٰ۔ گورنر اور ملک کے وزیراعظم رہے۔ فیروز خاں نون اپنے عہد کی نہایت معروف ز شخصیت تھے اور اگرچہ انھوں نے زندگی کے آخری دور میں اپنی سوانح مرتب کر کے شائع کر دی تھی تاہم ان کا شمار اہلِ قلم ں ہوتا مگر انجمن کے کتب خانۂ خاص میں ان کی مرتب کردہ کتاب "بیوقوفوں سے عقل سیکھو" انھیں اہلِ قلم کے زمرے میں لی ہے۔ فیروز خاں نون نے یہ کتاب جس زمانے میں مرتب کی ہے اس وقت وہ برطانیہ میں ہندوستان کے ہائی کمشنر تھے۔

اس عہد کی روداد انھوں نے اپنی خود نوشت "چشم دید" میں بڑے دل چسپ انداز سے بیان کی ہے۔ یہ دوسری عالمی جنگ کا زمانہ تھا۔ برطانیہ جرمنی کے مسلسل حملوں کی زد میں تھا۔ جنگی اور سیاسی سرگرمیاں اپنے عروج پر تھیں۔ اس افراتفری کے دور میں فیروز خاں نون نے بچوں کے لیے ایک دل چسپ، معلومات افزا اور مفید کتاب مرتّب کر دی۔ یہ کتاب بچوں کے لیے بچہ بن کر لکھی گئی ہے۔ اچھی درسی کتاب میں مشاہدے، تعقل اور تفکر کے جن عناصر کو اُجاگر کیا جاتا ہے "سرسری مطالعے" کی اس کتاب میں بھی ان عناصر کو بروئے کار لایا گیا ہے اور نو عمر طلبہ کی معلومات میں اضافے کی بڑی کامیاب کوشش کی گئی ہے۔ تعجب یہ ہے کہ ایسی مفید کتاب کی دوبارہ اشاعت کا کوئی سراغ نہیں ملتا۔

"بیوقوفوں سے عقل سیکھو" انیس مضامین پر مشتمل ہے۔ مرتّب نے انھیں اسباق کا نام دیا ہے۔ پہلا سبق جس پر کتاب کا نام رکھا گیا ہے محض ایک صفحے کا ہے اور بیوقوفوں سے عقل سیکھنے والی قدیم روایت پر مبنی ہے۔ باقی اسباق طویل ہیں۔ ان اسباق میں اخلاقی تلقین، غلط کاموں سے بچنے، اچھی عادتیں اختیار کرنے، پنجاب کے دیہاتوں کی عام زندگی اور مفید معلومات کو بڑے سلیس اور اچھے انداز سے پیش کیا گیا ہے۔ فیروز خاں نون کو ذاتی طور پر گھڑسواری اور گھوڑوں سے بڑی دل چسپی تھی۔ اپنی خود نوشت "چشم دید" میں بھی انھوں نے اپنے اس شوق کی روداد تفصیل کے ساتھ بیان کی ہے۔ اس کتاب میں بھی "گھوڑوں کا سوداگر۔ گھوڑے کی خوبیاں اور ایک مویشی چور کے کارنامے" میں گھوڑوں اور گھڑسواری کے بارے میں مفید اور دل چسپ معلومات ملتی ہے۔ مضمون "گھوڑے کی خوبیاں" مکالمے کے انداز میں لکھا گیا ہے۔ نور، جھولی اور عصمت تین بچے اپنے والد فیروز سے گھوڑے کے بارے میں مختلف سوال دریافت کرتے ہیں۔ فیروزان کے ہر سوال کا تفصیلی جواب دیتے ہیں۔ موٹروں کی بہتات کے اس دور میں گھوڑوں سے دل چسپی کم ہوتی جاتی ہے۔ بڑے شہروں میں گھوڑے رکھنے کا رواج بالکل ختم ہوگیا۔ دیہاتوں میں گھوڑے اب بھی پائے جاتے ہیں مگر وہاں بھی ان کی وہ اہمیت نہیں رہی جو پہلے تھی، لیکن پچاس برس پہلے یہ صورتِ حال نہیں تھی۔ پھر یہ کہ مرتّب کو گھوڑوں اور گھڑسواری سے دل چسپی تھی اور وہ اپنے اور دوسرے تمام بچوں میں گھڑسواری کا شوق پیدا کرنا چاہتے تھے۔ انھیں اس وفادار اور شریف جانور کی خوبیوں سے آگاہ کرنا چاہتے تھے انھیں اپنے موضوع پر پوری دسترس حاصل تھی۔ مثلاً بچے کا ایک سوال اور اس کا جواب ملاحظہ ہو:

نور۔ آج کل سب سے اچھے گھوڑے کہاں ملتے ہیں؟

فیروز۔ آئرلینڈ میں

نور۔ کیوں؟ آئرلینڈ میں کیوں؟

فیروز۔ اس لیے کہ آئرلینڈ کی زمین میں پانی اور چونا زیادہ ہے۔ اس سے گھوڑے بہت طاقت در ہوجاتے ہیں اور ایسی زمین کی گھاس بھی بہت قوت بخش ہوتی ہے۔

جھولی۔ کیا آپ کا یہ مطلب ہے کہ جہاں کہیں زمین میں اور پانی میں چونا پایا جائے وہاں کے گھوڑے اچھے ہوتے ہیں۔

فیروز۔ ہاں یہی مطلب ہے۔

یہ سارا بیان تشریحی ہے اور بچوں کی فکر کے عین مطابق۔ اس مضمون کے آخر میں جو تلقین ہے وہ بھی قابلِ توجہ ہے۔ مرتّب بچوں سے کہتے ہیں۔ "بچوں کو زیادہ خوراک کھانی چاہیے اور دودھ بھی زیادہ پینا چاہیے لیکن جب تم بڑے ہو جاؤ گے خاص کر جب چالیس کی عمر کو پہنچو گے تو یاد رکھنا کہ جتنا کھانا تم دسترخوان پر چھوڑ دوگے وہ تمہیں اس کھانے سے زیادہ فائدہ دے گا جو تمہارے معدے میں پہنچ چکا ہے۔"

"بیوقوفوں سے عقل سیکھو" کے بعض مضامین میں اچھے اخلاق اور نیکی کی تلقین ہے۔ حضرت خضر اور حضرت موسیٰ کا واقعہ اور نمرود کے واقعات بچوں کی معلومات اور خدا ترسی میں اضافے کی غرض سے لکھے گئے ہیں۔ مگر حیرت یہ ہے کہ حضرت موسیٰ اور حضرت عیسیٰ کا تذکرہ تو کیا گیا ہے اور حضرت خضر کی زبانی حضرت موسیٰ کو اطلاع دی گئی ہے کہ "چند سو سال بعد یسوع مسیح پیدا ہوگا جس کو خدا ایسی طاقت دے گا کہ وہ مُردوں کو زندہ کر سکے گا" لیکن نبی آخر الزماں صلی اللہ علیہ وسلم کا کوئی ذکر اس مضمون یا کتاب میں نہیں ملتا۔

مضمون "ایک مویشی چور کے کارنامے" پنجاب کی دیہاتی زندگی کا بڑا اچھا مرقع ہے۔ رسّہ گیر کسے کہتے ہیں، مویشی کیسے چرائے جاتے ہیں، چوری کے مویشی کیسے فروخت ہوتے ہیں۔ پچاس برس پہلے پنجاب کے دیہاتوں کی عام حالت کیا تھی، رسم و رواج، طور طریقے کیا تھے۔ اس مضمون میں یہ ساری تفصیل موجود ہے اور یہ نکتہ بھی کہ رسّہ گیر کتنا ہی سیانا کیوں نہ ہو قانون سے نہیں بچ سکتا۔

"سپیرے" نامی مضمون میں بھی پنجاب کی دیہاتی زندگی کے مناظر ملتے ہیں۔ گاؤں کی عام زندگی سپیروں کے کارنامے، سانپوں کی دہشت، ان کے کاٹنے کی دہشت، سانپوں سے بچنے کی تدبیریں بڑے اچھے انداز میں قلم بند کی گئی ہیں۔

"بیوقوفوں سے عقل سیکھو" میں تاریخ کا بیان بھی ہے۔ موئن جوڈارو کے حوالے سے ایک سبق آموز کہانی بیان کی گئی ہے۔ کہانیوں کا انداز اور فضا پُر اسرار۔ دلکش اور بچوں کو متاثر کرنے والی ہے۔

"بیوقوفوں سے عقل سیکھو" آج کل کے بچوں کے لیے بھی ایک دل چسپ اور معلومات افزا کتاب ہے۔ اس میں وطن کی سوندھی مٹی کی خوشبو ہے۔ پچاس سال گزر جانے کے باوجود اس کی دل چسپی اور افادیت پوری طرح برقرار ہے۔ اگر اس کا دوسرا ایڈیشن شائع کر دیا جائے تو آج کل کے بچّے بھی اسے شوق سے پڑھیں گے۔

ڈاکٹر اسلم فرخی

رحمٰن کیانی کی یاد میں

رحمٰن کیانی بھی رخصت ہو گئے۔ اخبار میں چھوٹی سی خبر پڑھی تو ذہن کو دھچکا سا لگا اور دل اُداس ہو گیا۔
غالباً مئی کا مہینہ تھا۔ اتنا یاد ہے کہ گرمی خوب پڑ رہی تھی۔ سال تھا ۱۹۴۷ء۔ شہر تھا لکھنؤ۔ برِ صغیر میں سیاسی سرگرمیاں
پنے عروج پر تھیں۔ تحریکِ پاکستان کے پُر زور اور پُر جوش نعروں سے ساری فضا معمور تھی۔ ایک دن حضرت گنج میں ایک نوجوان
سے ملاقات ہوئی۔ چھریرا قد، سُبک ناک نقشہ۔ مزاج اور انداز میں لکھنوی نستعلیقیت۔ فرنیچر کی چھوٹی سی دکان تھی۔ دکان کیا
فی۔ دکان کے آگے چوڑے چکلے برآمدے میں بید اور لکڑی کا کچھ فرنیچر رکھا ہوا تھا۔ یہ تھی کُل کائنات۔ مگر اس فرنیچر، برآمدے
ور دکانوں کے درمیان وہ نوجوان اس آن بان اور اعتماد سے کھڑا تھا جیسے وہ کوئی معمولی دکاندار نہیں نوادر کا پارکھ اور قدر دان ہے۔
ادر کی تلاش میں سرگرداں ہے۔ تعارف ہوا اور ہم دونوں بید کی کرسیوں پر بیٹھ گئے۔ دنیا بھر کی باتیں ہوتی رہیں۔
عر و شاعری کی باتیں۔ شاعروں کی باتیں۔ لکھنؤ کی باتیں۔ سیاست کی باتیں۔ مطالبۂ پاکستان کی باتیں۔ چائے پیتے رہے
تیں کرتے رہے۔ شعر و شاعری ہوتی رہی۔ ہم دونوں نے ایک دوسرے کو اپنے شعر سنانا شروع کیے۔ آہستہ آہستہ خرید و
روخت کے شور اور تاجرانہ ماحول سے بے نیاز ہو کر شعر سناتے رہے۔ گفتگو سے جی نہیں بھرا تو نوجوان نے جلدی جلدی
رنیچر سمیٹ کر ایک دکان میں رکھا ہم دونوں ہنستے مسکراتے حضرت گنج سے نکلے۔ جیسے دو شریر بچے اسکول سے بھاگ
لے ہوں۔ بے مقصد سڑکوں پر ٹہلتے رہے۔ لال باغ۔ قیصر باغ۔ نظیر آباد ہوتے ہوتے امین الدّولہ پارک آپہنچے۔ یہاں
ک کر بیٹھ گئے۔ بڑی دیر بیٹھے رہے۔ ایک معمّر لکھنوی شاعر سے مڈبھیڑ ہو گئی۔ ان سے زبان کے رموز و نکات سمجھتے
ہے۔ پھر ایک اور استاد اپنے شاگردوں کی ٹولی کے ساتھ آن دھمکے۔ یہ بھی گفتگو میں شامل ہو گئے۔ امین الدّولہ پارک
، اٹھے تو سامنے ڈاک خانے کے ساتھ ایک چھوٹا سا چائے خانہ تھا۔ وہاں بیٹھک رہی۔ سارا دن اسی سیر تفریح میں گزر گیا۔
م ہوئی تو ہم دونوں اپنے اپنے رستے پر ہو لیے۔ نوجوان نے مجھے بتایا کہ وہ عنقریب لاہور جانے والا ہے۔ وہاں اسے فضائیہ
، کوئی نوکری مل گئی تھی۔ وہ بڑا خوش اور مطمئن تھا کہ لکھنؤ کی شعری فضا سے نکل کر لاہور کی شعری فضا میں جاتا ہے۔ ایک
ز سے دوسرے مرکز کی طرف۔ میں نے عزیز لکھنوی کا مصرع دہرایا۔ " اپنے مرکز کی طرف مائلِ پرواز تھا حسن "

یہ رحمٰن کیانی سے میری پہلی ملاقات تھی برسیں گزر گئیں۔ یوں کہنا چاہیے جُگ بیت گیا۔ کوئی ملاقات نہ ہوئی۔ یہ کہنا مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ہم دونوں ایک دوسرے کو بالکل بھول گئے۔ میں رحمٰن کیانی کا نام اور کلام تو پڑھتا تھا لیکن یہ اندازہ نہیں تھا کہ وہ وہی لکھنوی دوست ہیں۔ شمس زبیری نے خواتین افسانہ نگاروں کے افسانوں پر مشتمل نقش کا ایک خصوصی شمارہ شائع کیا۔ اس سلسلے میں ایک تقریب بھی منعقد ہوئی۔ آرٹس کونسل کی اس تقریب میں نسیم درانی نے تعارف کرایا۔ یہ رحمٰن کیانی صاحب ہیں۔ میں نے ایک نظر دیکھا اور مئی ۱۹۴۷ء کا وہ پورا منظر میری نظروں میں گھوم گیا۔ رحمٰن کیانی پھر میں نے اُس دن کی روداد بیان کرنا شروع کی۔ رحمٰن کیانی حیرت زدہ سنتے رہے۔ سر ہلاتے رہے۔ آخر میں کہنے لگے۔ بالکل صحیح۔ کمال ہے کہ آپ کو پوری تفصیل یاد ہے۔ کمال تو یہ ہوا کہ ماہ و سال کا وہ طویل فاصلہ یک لخت ختم ہو گیا اور ہم دونوں اُسی سابقہ بے تکلفی سے ایک دوسرے کا دُکھ سُکھ سُنتے رہے۔

اس ملاقات کے بعد کیانی مرحوم متعدد بار غریب خانے پر آئے۔ بڑی بے تکلفی اور خلوص کے ساتھ گھنٹوں نشست رہی۔ ان کی شاعری اور ان کے پڑھنے ــــ میں بڑی دلکش ہم آہنگی تھی۔ سجل، خوبصورت اور مقصدیت کی حامل اس شاعری میں رحمٰن کیانی کی پوری شخصیت بولتی ہوئی محسوس ہوتی تھی۔ پڑھتے تھے تو سماں بندھ جاتا تھا۔ شعر سنانے میں بخل نہیں برتتے تھے نہ کوئی شاعرانہ پندار تھا۔ مرد سادہ مزاج اور قناعت پسند تھے۔ جس سے ملتے تھے ٹوٹ کر ملتے تھے۔ بڑی عاجزی اور انکساری سے ملتے تھے۔

کراچی میں وہ ایک طویل عرصے تک رہے۔ پھر لاہور چلے گئے۔ لاہور انھیں پسند تھا۔ ادیبوں اور ادب کا یہ شہر کسے پسند نہیں ہو سکتا۔ ان کا خیال تھا کہ وہ اپنا شعری مجموعہ "اذان" لاہور ہی سے شائع کریں گے مگر یہ ممکن نہ ہو سکا اور وہ اس مجموعے کی اشاعت کی تمنا دل میں لیے خاموشی سے رخصت ہو گئے۔ کیانی صاحب اپنے مجموعوں کی اشاعت میں ایک خاص انداز برتنا چاہتے تھے۔ عام روش سے ہٹ کر نادر اور وقیع، لیکن جس معاشرے میں فن کار کو ناشر کے فرائض بھی انجام دینا پڑیں اور اپنے مجموعے چھاپ کر ان کی فروخت کا اہتمام بھی کرنا ہو وہاں چاہتے کا حاصل کیا۔ چاہنے سے ہوتا کیا ہے۔ رحمٰن کیانی کا مجموعہ یوں شائع نہ ہو سکا کہ وہ اس کے لیے عمدہ کتابت اور کاغذ کا انتظام نہ کر سکے۔ اور اگر بغرض محال قرض دام سے کام چلا بھی لیتے تو باقی زندگی قرض ادا کرنے میں گزر تی۔ اس صورتِ حال کے بارے میں لکھنے والوں کو غور کرنا چاہیے۔ یہ حالات کب تک برقرار رہیں گے۔

رحمٰن کیانی طبعاً دانشور تھے۔ اپنے حال میں مست تھے۔ دوستوں کے دوست تھے مگر ان سب باتوں کے باوجود اصولوں میں سخت تھے۔ زندگی کے جو آداب انھوں نے مقرر کر رکھے تھے انھیں ایک لمحے کے لیے بھی نظر انداز نہیں کرتے تھے۔ میں نے ان سے گفتگو کرتے ہوئے ہمیشہ یہ محسوس کیا کہ ان کا لہجہ بظاہر بڑا نرم ہے لیکن اس نرم لہجے کے پس پشت اصولوں پر مفاہمت نہ کرنے کی قوت بھی موجود ہے۔ ان کی شخصیت اور شاعری دونوں میں ایک واضح کمٹ منٹ تھا اور نصب العین کی لگن تھی۔ ان سے مل کر طبیعت خوش ہوتی تھی اور فرحت کا احساس ہوتا تھا۔

زندگی میں بے شمار دوستوں سے ملنے کا اتفاق ہوا۔ بڑے بڑے محبت والے لوگ، بڑے رکھ رکھاؤ کے لوگ، سلیقے اور طنطنے کے لوگ۔ رحمٰن کیانی کی شان ان سب سے الگ تھی۔ انھوں نے پہلی ملاقات کی بے تکلفی اور خلوص کو آخر دم تک نباہا۔ ساری زندگی کے تعلقات اور دوستی کو ایک سطح پر قائم رکھا۔ ایسے لوگ کم ہوتے ہیں اور ایسے شاعر بھی کم ہوتے ہیں جنھیں لفظوں کے استعمال کا ایسا سلیقہ اور الفاظ پر ایسی غیر معمولی دسترس حاصل ہو۔ رحمٰن کیانی اپنے افکار و اشعار کی حیثیت میں ہمیشہ زندہ رہیں گے۔

اسلوب احمد انصاری

غبارِ خاطر پر ایک نظر ؎

از "نقد و نظر" علی گڑھ

("نقد و نظر" علی گڑھ ایک نہایت موقر تنقیدی شش ماہیہ ہے۔ "قومی زبان" نے اس کے فاضل مرتب اسلوب احمد انصاری صاحب کی خاص اجازت سے اس کے بعض مضامین مستقل طور پر شائع کرنے کا فیصلہ کیا ہے۔ ادارہ اس اجازت کے لیے انصاری صاحب کا ممنون ہے۔
مندرجہ ذیل مضمون شمارہ ۲ جلد ۱۱، جنوری ۱۹۸۹ء سے لیا گیا ہے)

"۵ ارجون کو جب بانکوڑا میں رہا ہوا، تو تمام مکتوبات نکالے، اور ایک فائل میں بہ ترتیب تاریخ جمع کر دیے۔ خیال تھا کہ انھیں حسب معمول نقل کرنے کے لیے دے دوں گا، اور پھر اصل آپ کی خدمت میں بھیج دوں گا۔ لیکن جب مولوی اجمل خاں صاحب کو ان کی موجودگی کا علم ہوا تو وہ بہت مصر ہوئے کہ انھیں بلا تاخیر اشاعت کے لیے دے دینا چاہیے۔ چنانچہ ایک خوش نویس کو شملے میں بلا یا گیا اور پورا مجموعہ کتابت کے لیے دے دیا گیا۔ اب کتابت ہو رہی ہے، اور امید ہے کہ عنقریب طباعت کے لیے پریس کے حوالے کر دیا جائے گا۔ اب میں ان مکتوبات کو قلمی مکتوبات کی صورت میں نہیں بھیجوں گا مطبوعہ مجموعے کی صورت میں پیش کر دوں گا۔"
۱۲ ستمبر ۴۵ء

اس اقتباس کے پیشِ نظر اس امر پر مزید زور دینے کی ضرورت نہیں رہتی کہ "غبارِ خاطر" میں جو خطوط یکجا

؎ یہ مضمون ۵۹ء میں لکھا گیا تھا۔ مولوی ابوالکلام آزاد صدی تقریبات کی رعایت سے کسی قدر ترمیم و اضافے کے ساتھ اب دوبارہ شائع کیا جا رہا ہے۔

کیے گئے ہیں، وہ بالقصد لکھے گئے تھے۔ یہاں تک کہ مکتوب الیہ (نواب صدر یار جنگ بہادر) کو بھی اگر یہ خط روانہ کیے جا سکتے تو اس اہتمام کے ساتھ کہ ان کی نقلیں محفوظ کر لی جاتیں۔ انگریزی شاعر پوپ کے طریقۂ خط و کتابت کی نسبت ابوالکلام آزاد کی یہ روش بس ایک ہی قدم پیچھے ہے۔ خطوط کا نام یہاں ایک اعتذار محض کی صورت رکھتا ہے۔ پورے ادبی طریقۂ کار کی طرح خطوط نگاری کا مقصد اوّلین ابلاغ و ترسیل ہے۔ اس ابلاغ و ترسیل میں کاتب اور مکتوب الیہ پہلے شریک ہوتے ہیں عام قارئین ان کے بعد۔ اس مکالمے کے دوران دونوں کے درمیان کوئی پردہ اور حجاب حائل نہیں رہتا۔ کاتب، مکتوب الیہ کو اپنی نجی دنیا کے اندر، جس میں انسانی بڑائی اور کمزوری، امید اور مایوسی، اور چھوٹی بڑی خوشیوں اور حادثوں کے سائے جھلملاتے رہتے ہیں، بے دھڑک داخل کر لیتا ہے۔ خطوط ایک آزاد مرتعش زندگی رکھتے ہیں۔ ان میں ایک دہرے عمل کی کارفرمائی نظر آتی ہے۔ ان کی کائنات میں ایک تنوع ہوتا ہے جس میں شخصیت کے متضاد پہلو اور حالات کی نیرنگیاں غیر ارادی طور پر جھلک اٹھتی ہیں۔ زندگی میں بہ یک وقت جو حسن اور بدصورتی ہے، المیہ اور طربیہ کا جو امتزاج ہے، خوف اور مسرت کے جو پراسرار چشمے ہیں، اور خود خطوط نگار احساسات کے زیر و بم میں جس طور گھرا رہتا ہے، اور تجربے کی طرف اس کے ردِّ عمل میں جو تہیں اور پیچیدگیاں ظاہر ہوتی ہیں، وہ سب کے سب بے ساختہ تحریر میں بغیر کسی رکاوٹ اور تکلف کے سامنے آجاتی ہیں۔ ناول، کہانی یا ڈرامے کے فن میں لکھنے والا ان کرداروں، واقعات اور اس ذہنی اور جذباتی زندگی کا تماشائی ہوتا ہے، جسے اس نے تخلیقی طور پر مجسّم کیا ہے۔ خطوط میں خالق اور تماشائی ایک دوسرے میں مدغم ہو جاتے ہیں۔ یا یوں کہیے کہ شخصیت اور تخلیق میں کوئی بُعد باقی نہیں رہتا۔ یہی اس آسودگی اور تسکین کا منبع اور مخرج ہے، جو خطوط کے پڑھنے سے ہمیں حاصل ہوتی ہے۔

"غبارِ خاطر" میں مکتوب الیہ کی شخصیت اتنی دھندلی ہے کہ مشکل ہی سے کوئی نقش ابھرتا ہے۔ اس قسم کے جملوں سے قطع نظر۔

"دل حکایتوں سے لبریز ہے مگر زبانِ درماندۂ فرصت کو یارائے سخن نہیں۔ مہلت کا منتظر ہوں۔"

یا "تاہم ذوقِ مخاطب کی طلبگاریاں کچھ اس طرح دلِ مستمند پر چھا گئی تھیں کہ قلم اٹھا لیتا تھا، تو پھر رکنے کو جی نہیں چاہتا تھا۔"

یا "طبع نالہ سنج کو کیا کروں کہ فریاد و شیون کے بغیر رک نہیں سکتی۔ آپ سن رہے ہوں یا نہ سن رہے ہوں میرے ذوقِ مخاطبت کے لیے یہ خیال بس کرتا ہے کہ روئے سخن آپ کی طرف ہے۔

جن کی تعبیر میں ادبی تصنع کو بیش از بیش دخل ہے۔ مکتوب الیہ کی موجودگی ان خطوط میں کہیں بھی محسوس نہیں ہوتی۔ کیونکہ از اوّل تا آخر مکتوب نگار کی انا کا ان پر غلبہ رہتا ہے۔ مکتوب الیہ کی حیثیت یہاں ایک ایسے رازدار کی سی نہیں ہے جسے نہاں خانۂ دل میں گزر کی اجازت دی گئی ہو، بلکہ ایک ایسے قاری کی ہے جس کے ایمان کو تازہ کرنے کے لیے دفترِ حکمت کھولے گئے ہیں۔ یہاں لہجہ ہائے زیر لبی کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔ ان خطوط میں نہ مکتوب الیہ ایک ریاضیاتی اکائی سے بڑھ کر کوئی اہمیت رکھتا ہے اور نہ مکتوب نگار کی شخصیت کی برف کہیں پگھلتی نظر آتی ہے۔

اس ذوقِ مخاطبت کی تفصیل مختلف خطوط میں مختلف طور پر کی جا سکتی ہے۔ ۱۷ اور ۱۸ اکتوبر ۱۹۴۳ء کے خطوط میں اس کا اظہار حیات و کائنات کے متعلق ریاضیاتی اور ارتقائی نظریات کی بحث اور شخصی خدا کے تصوّر کے سلسلے میں سامنے آتا ہے۔ ان خطوط میں حقیقتِ آخری کی تلاش و جستجو کا مسئلہ زیر بحث ہے۔ موجودہ حکمائے یورپ کے افکار اور قدیم مکتبہ ہائے فکر کے اجتہادات سے واقفیت اور آگاہی کا ثبوت قدم قدم پر فراہم کیا گیا ہے۔ خود مصنّف کا ذہن بھی کم و بیش اسی نہج پر سوالات کا حل طلب کر رہا تھا۔ ۱۷ اکتوبر کے خط میں یہ جملے ملتے ہیں:

"یہ پورا کارخانۂ ہستی اپنے ہر گوشے اور اپنی ہر نمود میں سرتاپا ایک سوال ہے سورج سے لے کر اس کی روشنی کے ذرّوں تک کوئی نہیں جو یک قلم پرسش و تقاضا نہ ہو۔ یہ سب کچھ کیا ہے؟ یہ سب کچھ کیوں ہے؟ یہ سب کس کے لیے ہے؟ ..... پھر جونہی ہم اپنے پرانے حل کی طرف لوٹتے ہیں اور اپنی معلومات میں صرف اتنی بات بڑھا دیتے ہیں کہ ایک صاحبِ ادارہ و ادراک قوت پسِ پردہ موجود ہے، تو اچانک صورتِ حال یک قلم منقلب ہو جاتی ہے اور ایسا معلوم ہونے لگتا ہے، جیسے اندھیرے سے نکل کر یکایک اُجالے میں آکھڑے ہوئے، اب جس طرف بھی دیکھتے ہیں روشنی ہی روشنی ہے۔"

۱۸ اکتوبر کے خط میں قانونِ ارتقا کے سلسلے میں لکھتے ہیں:

"ذرّات سے لے کر اجرام سماوی تک، سب نے اسی قانونِ تغیّر و تحویل کے ماتحت اپنی موجودہ شکل و نوعیت کا جامہ پہنا ہے۔ یہی نیچے سے اوپر کی طرف بڑھتی ہوئی رفتارِ فطرت ہے، جسے ہم نشو و ارتقا کے نام سے تعبیر کرتے ہیں۔ یعنی ایک معیّن، طے شدہ، ہم آہنگ اور منظم ارتقائی تقاضا ہے جو تمام کارخانۂ ہستی پر چھایا ہوا ہے، اور اسے کسی خاص رُخ کی طرف اٹھائے اور بڑھائے لیے جا رہا ہے۔"

اسی ضمن میں اسی خط میں آگے چل کر یہ اندراج بھی ملتا ہے:

"لیکن ارتقائی تقاضے کا فجائی ظہور EMERGENCE جس طرح ابھرتا ہے، مثلاً زندگی کی نمود، ذہن و ادراک کی جلوہ طرازی، ذہنی شخصیت اور معنوی انفرادیت کا ڈھلاؤ، ان کی کوئی توضیح بغیر اس کے نہیں کی جا سکتی کہ ایک الٰہی قوت کی کارفرمائی یہاں تسلیم کر لی جائے۔ ہمیں یہ صورت بالآخر مجبور کر دیتی ہے کہ فطرتِ کائنات میں ایک تخلیقی اصل CREATIVE PRINCIPLE کی کارفرمائی کے اعتقاد سے گریز نہ کریں۔۔ ایک ایسی تخلیقی اصل جو اس کارخانۂ ظرف و زمان میں ایک لازماں TIMELESS حقیقت ہے۔"

ان مندرجات سے آزاد کی قوتِ فکر کا بخوبی اندازہ لگایا جا سکتا ہے لیکن پورا خط اسی قسم کے علمی مباحث سے بھرا ہو تو اسے خط کی بجائے علمی مقالہ کیوں نہ کہا جائے۔ فاضل مکتوب نگار نے ان موضوعات سے متعلق جو کچھ کہا ہے وہ علمی اور

اصطلاحی ساز وسامان سے پوری طرح آراستہ اور مزین ہے۔ یہاں مشاہدے اور وجدان کی روشنی اور تاثیر کی تجرید اور استدلال کی محکمی ہے۔ یہ خطوط اس مانوس، غیر رسمی اور بے تکلف فضا سے غیر آہنگ، جو دو افراد درمیان مکالمے کے دوران ابھرتی ہے۔ ان میں ادعائے علمیت، اطلاع کی فراہمی اور نمائشِ برتری ہے۔ گا لین دین اور مشترک تجربوں کا انعکاس کا پتا نہیں۔

بعض خطوط میں مولوی ابو الکلام آزاد نے اپنی ذہنی تربیت، اپنی فکر کے محرکات اور اپنی علمی دا کا بالاستیعاب ذکر کیا ہے۔ ان میں ایک غیر معمولی ذہانت و ذکاوت کے تدریجی ارتقا کا نقشہ سامنے آتا ہے۔ واحد متکلم کے صیغے میں سنائی گئی ہے اور گو اس میں وہ لطف نہیں جو غیر شعوری انکشافِ حال میں ہوتا ہے تاہم اس سے کسی حد تک مکتوب نگار کے ذہن اور اس کے روحانی افکار و اعمال اور ان کے خارجی اور اندرو یعنی DETERMINANTS کو سمجھنے میں مدد ملتی ہے۔ چنانچہ ۱۱ر اگست ۴۲ء کے خط میں لکھتے ہیں:

"لیکن میں موروثی عقائد پر قانع نہ رہ سکا۔ میری پیاس اس سے زیادہ نکلی، جتنی سیرابی وہ دے سکتے تھے۔ مجھے پرانی راہوں سے نکل کر خود اپنی راہیں ڈھونڈنی پڑیں۔ زندگی کے ابھی پندرہ برس بھی پورے نہ ہوئے تھے کہ طبیعت نئی خلشوں اور جستجوؤں سے آشنا ہو گئی تھی اور موروثی عقائد جس شکل وصورت میں سامنے آکھڑے ہوئے تھے، ان پر مطمئن ہونے سے انکار کرنے لگی تھی۔"

۱۲ر اکتوبر ۴۲ء کے خط میں اسی قسم کے ایک اور اندراج سے اس عمل پر مزید روشنی ڈالی گئی ہے:

"مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ ابھی پندرہ برس سے زیادہ عمر نہیں ہوئی تھی کہ طبیعت کا سکون ہلنا شروع ہو گیا تھا اور شک و شبہے کے کانٹے دل میں چبھنے لگے تھے۔ ایسا محسوس ہوتا تھا کہ جو آوازیں چاروں طرف سنائی دے رہی ہیں ان کے علاوہ بھی کچھ اور ہونا چاہیے اور علم وحقیقت کی دنیا صرف اتنی ہی نہیں ہے جتنی سامنے کھڑی ہے۔"

۲۹ر اگست ۴۲ء کے خط میں ایک مقام پر یہ حقیقت سامنے آتی ہے کہ مکتوب نگار خلقی اعتبار سے حقیقت پسند نہیں، بلکہ واقع ہوئے ہیں۔ چنانچہ فرماتے ہیں:

"زندگی کی مشغولیتوں کا وہ تمام سامان جو اپنے وجود سے باہر تھا، اگر چھن گیا ہے تو کیا مضائقہ؟ وہ تمام سامان جو اپنے اندر تھا اور جسے کوئی چھین نہیں سکتا تھا، سینے میں چھپائے ساتھ لایا ہوں۔ اسے سجاتا ہوں اور اس کے سیر و نظارے میں محو رہتا ہوں۔"

آئینہ نقش بندِ طلسمِ خیال نیست ۔۔۔ تصویرِ خود بہ لوحِ دگر کشیم ما

۱۲ر ستمبر ۴۳ء کے خط میں موسیقی سے اپنے شغف اور ہندستان میں فنِ موسیقی کے کمالات اور اس کی تاریخ ساتھ بیان کی ہے۔ اس خط کی اہمیت اس میں ہے کہ اسے پڑھ کر ابوالکلام آزاد کی طبیعت کے ایک ایسے رجحان

جس سے لوگ عام طور پر واقف نہیں ہیں۔ اس ذوق کا یہ عالم تھا کہ ایک جگہ لکھتے ہیں:

"میں آپ سے ایک بات کہوں، میں نے بارہا اپنی طبیعت کو ٹٹولا ہے۔ میں زندگی کی احتیاجوں میں سے ہر چیز کے بغیر خوش رہ سکتا ہوں، لیکن موسیقی کے بغیر نہیں رہ سکتا۔ آوازِ خوش میرے لیے زندگی کا سہارا، دماغی کاوشوں کا مداوا اور جسم و دل کی ساری بیماریوں کا علاج ہے۔"

اس خط میں وہ جملے ضبطِ تحریر میں آگئے ہیں جنھیں براہِ راست انکشافِ حال سے تعبیر کیا جا سکتا ہے۔ اس میں گو دانستہ طور پر تفصیل سے گریز کیا گیا ہے، تاہم یہ جرأتِ رندانہ کی طرف ایک اقدام ضرور ہے، اور اس میں ایک ہلکی سی جھلک ہے جو دوسرے خطوط میں یکسر مفقود ہے۔

۲، ۷ اور ۱۸ مارچ ۴۳ء کے خطوط بعض دوسرے خطوط سے اس لحاظ سے مختلف ہیں کہ ان میں بھاری بھرکم موضوعات اور مسائل کی بجائے گرد و پیش کی مانوس فضا سے خط لکھنے کا سامان فراہم کیا گیا ہے۔ ان تین خطوں میں چڑے چڑیا کی کہانی سُنائی گئی ہے اور اس سے اس امر کا اظہار ہوتا ہے کہ ابوالکلام آزاد اپنی مذہبی و سیاسی مصروفیتوں میں انہماک اور ان دبیز پردوں کے باوصف جو انھوں نے تہ بہ تہ اپنے اوپر ڈال رکھے تھے، کبھی کبھار معمولی چیزوں سے بھی دلچسپی لے سکتے تھے۔ اس کہانی پر ادبی رکھ رکھاؤ، تزئین و آرائش اور اہتمام و انصرام کا گہرا رنگ چڑھا ہوا ہے۔ اشعار کا استعمال پے در پے جس کثرت کے ساتھ کیا گیا ہے، اور معمولی سے معمولی چیزوں کی تشریح و تعبیر کے لیے جس طور پر اشعار کے مطالب سے مطابقت ڈھونڈی گئی ہے اس سے مزاحیہ امکانات ابھرنے کی بجائے، جو اس کہانی میں مستتر تھے، ایک طرح کی گراں باری کا احساس پیدا ہو گیا ہے جس نے اس کہانی کے پورے ڈھانچے میں ایک اجنبی عنصر کا اضافہ کر دیا ہے۔ تینوں خطوں میں اگر کہیں کوئی نفیس یا مانوس اشارہ ملتا ہے تو وہ صرف ۷ مارچ کے خط کے اس آخری تراشے میں:

"بارہا ایسا ہوا کہ میں اپنے خیالات میں محو لکھنے میں مشغول ہوں اتنے میں کوئی دلنشیں بات نوکِ قلم پر آگئی۔۔۔۔ اور بے اختیار اس کیفیت کی خود رفتگی میں میرا سر و شانہ ہلنے لگا اور یکایک زور سے پروں کے اُڑنے کی پھرسی سُنائی دی۔ اب جو دیکھتا ہوں معلوم ہوا کہ ان یارانِ بے تکلف کا ایک طائفہ میری بغل میں بیٹھا بے تکلف اپنی اچھل کود میں مصروف تھا۔ اچانک انھوں نے دیکھا کہ یہ پتھر اب ہلنے لگا ہے تو گھبرا کر اڑ گئے۔ عجب نہیں اپنے جی میں کہتے ہوں، یہاں صوفے پر ایک پتھر پڑا رہتا ہے لیکن کبھی کبھی آدمی بن جاتا ہے۔"

۱۸ مارچ ۴۳ء کے خط میں چڑیا کے بچے کی بتدریج پرواز کے عمل سے بے حد متاثر ہوتے ہیں، اور جن مختلف مرحلوں سے گزر کر وہ بالآخر پرواز میں کامیاب ہوتا ہے اس کا مشاہدہ ذہن کو بعض تعیمات کی طرف منتقل کر دیتا ہے:

"دراصل کچھ نہ تھا، زندگی کی کرشمہ سازیوں کا ایک معمولی سا تماشا تھا۔۔۔ اس چڑیا کے بچے میں اڑنے کی استعداد ابھر چکی تھی۔ وہ اپنے کنجِ نشیمن سے نکل کر فضائے آسمانی کے سامنے کھڑا ہوا تھا۔ مگر ابھی تک اس کی خود شناسی کا احساس بیدار نہیں ہوا تھا۔ جونہی اس کی خود شناسی جاگ اٹھی اور اسے اس حقیقت کا عرفان

حاصل ہو گیا کہ میں اڑنے والا پرندہ ہوں، اچانک قالبِ بے جان کی ہر چیز جان دار بن گئی۔ ..... وہی
گرے ہوئے پر جن میں زندگی کی کوئی تڑپ نہیں دکھائی دیتی تھی، اب سمٹ سمٹ کر اپنے آپ کو تولنے لگے تھے۔
چشم زدن میں برش پرواز کی ایک برق وار تڑپ نے اس کا پورا جسم ہلا کر اچھال دیا۔ اور پھر دیکھا تو
درماندگی و بے حالی کے سارے بندھن ٹوٹ چکے تھے اور مرغِ ہمت عقاب وار فضائے لامنتہا کی لا انتہائیوں
کی پیمائش کر رہا تھا۔"

۱۱ اپریل ۱۹۴۳ء کا خط جس میں ابوالکلام آزاد نے اپنی بیوی کی علالت اور وفات کا ذکر کیا ہے۔ وہ واحد خط ہے جس میں جذبات کی ہلکی سی شدت کا احساس ہوتا ہے اور یہ ان کی نجی زندگی پر روشنی کا ایک دز دیدہ کرن ڈالتا ہے۔ اس خط میں بھی حسبِ معمول جگہ جگہ اسی انانیت اور خود پرستی کا ثبوت ملتا ہے جو ان کی طبیعت کا جزو غالب تھی۔ اس میں کہیں کبھی خود سپردگی، اختلاطِ باہمی یا جذباتی تفہیم کا پتا نہیں۔ اس کے برعکس اس میں ایک طرح کے فاصلے، دوری، اجنبیت اور احساسِ برتری کا تاثر ناگزیر ہے جیسا کہ ان جملوں سے مترشح ہوتا ہے:

"وہ جانتی تھی کہ اس طرح کے موقعوں پر اگر اس کی طرف سے ذرا بھی اضطرابِ طبع کا اظہار ہوگا تو مجھے
سخت ناگوار گزرے گا اور عرصے تک اس کی تلخی ہمارے تعلقات میں باقی رہے گی۔ ۱۹۱۶ء میں جب پہلی
مرتبہ گرفتاری پیش آئی تھی تو وہ اپنا اضطراب نہیں روک سکی تھی اور میں عرصے تک اس سے ناخوش رہا تھا۔"

البتہ خط میں آگے چل کر لہجے کی تبدیلی کا کسی قدر احساس ہوتا ہے۔ مثلاً ان جملوں میں:

"میں اعتراف کرتا ہوں کہ یہ تمام ظاہر داریاں دکھاوے کا ایک پارٹ تھیں جسے دماغ کا مغرورانہ احساس
کھیلتا رہتا تھا۔ اور اس لیے کھیلتا تھا کہ کہیں اس کے دامنِ صبر و وقار پر بے حالی اور پریشان خاطری
کا کوئی دھبہ نہ لگ جائے۔"

اس خط میں کئی باتیں قابلِ لحاظ ہیں۔ اوّل ان کی بیوی زلیخا کی بیماری کا آزاد کے دل و دماغ پر ردِ عمل، دوسرے ان کی خود پسند طبیعت کا اس ردِ عمل کو جھٹلانا اور اس کی طرف استغنا برتنا اور تیسرے اس نجی اور خانگی زندگی میں بھی فریقین کے درمیان احساسات کے دہرے عمل کا ناپید ہونا۔ دراصل ابوالکلام آزاد کے لیے اپنی شخصیت کے مقابلے میں کوئی دوسری شخصیت اس حد تک اہم تھی ہی نہیں کہ وہ اسے خاطر میں لاتے۔ البتہ خط کے آخری جملوں سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ کوئی انسان دراصل خود کفالتی یعنی SELF-SUFFICIENT ہو ہی نہیں سکتا اور نہ ہمہ وقت دوسروں سے کلیتہً بے نیاز رہ سکتا ہے۔ کیونکہ ہم اپنی خودی کو ابھارنے اور اسے علیحدگی میں پرورش کرنے کی جتنی بھی سعی و کوشش کریں، بہر حال بعض لمحات میں ہمیں کسی نہ کسی جذباتی سہارے کی ضرورت محسوس ہوتی ہے اور عین اس وقت جب ہم اپنے احساسِ برتری پر نازاں اور مطمئن ہوتے ہیں، دفعتاً جذباتی سپردگی کا شکار ہو جانے پر مجبور ہو جاتے ہیں۔ اس خط میں جو انداز کم و بیش از اوّل تا آخر اختیار کیا گیا ہے اس کی تکذیب ان آخری جملوں سے ہو جاتی ہے:

"اس طرح ہماری چھبیس برس کی ازدواجی زندگی ختم ہو گئی اور موت کی دیوار ہم دونوں میں حائل

ہو گئی ... یہاں احاطے کے اندر ایک پرانی قبر ہے۔ نہیں معلوم کس کی ہے؟ جب سے آیا ہوں سیکڑوں مرتبہ اس پر نظر پڑ چکی ہے لیکن اب اسے دیکھتا ہوں تو ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ایک نئی طرح کا انس اس سے طبیعت کو پیدا ہو گیا ہو۔ کل شام دیر تک اسے دیکھتا رہا اور تمم بن نویرہ کا مرثیہ جو اس نے اپنے بھائی مالک کی موت پر لکھا تھا بے اختیار یاد آ گیا۔"

"غبارِ خاطر" میں باوجود اس کے کہ زیادہ تر علمی مشاغل کا ذکر ہے یا اپنی ذہنی تربیت اور افتادِ مزاج کی طرف اشارے کیے گئے ہیں اور عام طور پر فلسفیانہ اندازِ بیان اختیار کیا گیا ہے، بعض جگہ حسن کا احساس اور فطری مناظر سے وابستگی کا بھی پتا چلتا ہے۔ چائے نوشی کے اہتمام کے ذکر میں ترصیع اور شاعرانہ مبالغہ آرائی کو ضرورت سے زیادہ دخل دیا گیا ہے۔ اور جگہ جگہ فارسی اشعار حافظے سے نقل کر کے ان سے آراستگیِ بیان کا کام لیا گیا ہے لیکن اس سے قطع نظر فطری مناظر کی تصویر کشی اور انشا پردازی کے مرقعے پیش کیے گئے ہیں۔ ۱۱ راگست ۱۹۴۲ء کے خط میں مثال کے طور پر یہ جملے قابلِ توجہ ہیں:

"کار باہر نکلی تو صبح مسکرا رہی تھی۔ سامنے دیکھا تو سمندر اچھل اچھل کر ناچ رہا تھا۔ نسیم صبح کے جھونکے احاطے کی روشوں میں پھرتے ہوئے ملے۔ یہ پھولوں کی خوشبو چن چن کر جمع کر رہے تھے اور سمندر کو کھینچ رہے تھے کہ اپنی ٹھوکروں سے اسے فضا میں پھیلا تا رہے۔"

"حکایتِ بادہ و تریاک" (۱۴ راگست ۱۹۴۲ء) کے ذیل میں لکھتے ہیں:

"صبح جب طباشیر بکھیرتی ہوئی آئے گی اور شام جب شفق کی گل گوں چادریں پھیلانے لگے گی تو صرف عشرت سرائے کے دریچوں ہی سے اس کا نظارہ نہیں کیا جائے گا۔ قید خانوں کے روزنوں میں لگی ہوئی نگاہیں بھی اُنھیں دیکھ لیا کریں گی۔ فطرت نے انسان کی طرح یہ نہیں کیا کہ کسی کو شاد کام رکھے، کسی کو محروم کر دے۔ وہ جب کبھی اپنے چہرے سے نقاب اٹھاتی ہے۔ تو سب یکساں طور پر نظارۂ حسن کی دعوت دیتی ہے۔"

"حکایتِ زاغ و بلبل" (۲۰ مارچ ۱۹۴۳ء) میں جس کا ذکر پہلے کر چکا۔ پھولوں کی دلکشی کے بیان میں شاعرانہ اندازِ گفتگو نمایاں طور پر موجود ہے:

"کوئی پھول یاقوت کا کٹورا تھا، کوئی نیلم کی پیالی تھی، کسی پھول پر گنگا جمنی کی قلم کاری کی گئی تھی کسی پر چھینٹ کی طرح رنگ برنگ کی چھپائی ہو رہی تھی۔ بعض پھولوں پر رنگ کی بوندیں اس طرح پڑ گئی تھیں کہ خیال ہوتا تھا، صناعِ قدرت کے لوحِ قلم میں رنگ زیادہ بھر گیا ہوگا، صاف کرنے کے لیے جھٹکنا پڑا اور اس کی چھینٹیں قبائے گل کے دامن پر پڑ گئیں۔"

اظہار کا ذکر کرتے ہوئے اسی خط میں موسم کے ردوبدل کا اثر اردگرد کی فضا پر اس طرح بیان کیا گیا ہے:

"انسان اپنے جسم کے اندر دیکھتا ہے تو زندگی کا تازہ خون ایک ایک رگ کے اندر ابلتا دکھائی دیتا ہے۔ اپنے سے باہر دیکھتا ہے تو فضا کا ایک ایک ذرّہ عیش و نشاطِ ہستی کی سرمستیوں میں رقص کرتا ہوا نظر آتا ہے۔ آسمان و زمین کی ہر چیز جو کل تک محرومیوں کی سوگواری اور افسردگیوں کی جاں سکاہی تھی۔ آج آنکھیں کھولیے

تو حسن کی عشوہ طرازی ہے۔ کان لگائیے تو نغمے کی جاں نوازی ہے۔ سونگھیے تو سرتاسر بو کی عطر بیزی ہے۔"

۱۷ ستمبر ۱۹۴۳ء کے خط میں جس کا حوالہ اوپر دیا جا چکا ہے۔ ابوالکلام آزاد نے اپنے اشتغالِ موسیقی کا ذکر کیا ہے اور اس سلسلے میں یہ عجیب و غریب انکشاف کیا ہے کہ وہ ستار بجانے کے لیے چاندنی راتوں میں تاج محل کا رخ کیا کرتے تھے۔ اس پُر کے پسِ منظر کا جو نقشہ جس انداز سے کھینچا گیا ہے اس پر شعوری شاعرانہ اندازِ بیان کی چھاپ پوری طرح مرتسم ہے اور اس سے پتا چلتا ہے کہ واقعی موسیقی کا اثر اس درجے پورے ماحول میں نفوذ کر سکتا ہے۔ ماحول کی عکاسی اس طرح کی گئی ہے:

"رات کا سناٹا، ستاروں کی چھاؤں، ڈھلتی ہوئی چاندنی اور اپریل کی بھیگی ہوئی رات چاروں طرف تاج محل کے منارے سر اٹھائے کھڑے تھے۔ برجیاں دم بخود بیٹھی تھیں۔ بیچ میں چاندنی سے دھلا ہوا مرمریں گنبد اپنی کرسی پر بے حس و حرکت متمکن تھا۔ نیچے جمنا کی روپہلی جدولیں بل کھا کھا کر دوڑ رہی تھیں۔ اوپر ستاروں کی ان گنت نگاہیں حیرت کے عالم میں تک رہی تھیں۔ نور و ظلمت کی اس ملی جلی فضا میں اچانک پردہ ہائے ستار سے نالہ ہائے بے حرف اٹھتے اور ہوا کی لہروں پر بے روک تیرنے لگتے۔"

پھر اس کے بعد موسیقی کے عمل کا جو تاثر پوری فضا پر مرتب ہوتا تھا۔ اسے اس طرح معرضِ اظہار میں لایا گیا ہے:

"کچھ دیر تک فضا تھمی رہتی۔ ۔ ۔ ۔ ۔ پھر آہستہ آہستہ ہر تماشائی حرکت میں آنے لگتا۔ یہاں تک کہ سر پر آکھڑا ہوتا، ستارے دیدے پھاڑ پھاڑ کر تکنے لگتے۔ درختوں کی ٹہنیاں کیف میں آکر جھومنے لگتیں۔ رات کے سیاہ پردوں کے اندر سے عناصر کی سرگوشیاں صاف سنائی دیتیں۔ بارہا تاج محل کی برجیاں اپنی جگہ سے ہل گئیں اور کتنی ہی مرتبہ ایسا ہوا کہ ستارے اپنے کاندھوں کو جنبش سے نہ روک سکے۔ آپ باور کریں یا نہ کریں مگر یہ واقعہ ہے کہ اس عالم میں بارہا میں نے برجیوں سے باتیں کیں اور جب کبھی تاج محل کے گنبدِ خاموش کی طرف نظر اٹھائی ہے تو اس کے لبوں کو ہلتا ہوا پایا ہے۔"

۹ جنوری ۱۹۴۳ء کے خط میں ابوالکلام آزاد نے انانیتی ادب کی اصطلاح اپنے اندازِ نگارش کا جواز مہیا کرنے کے استعمال کی ہے اور اس کے امکانات پر بحث کی ہے اور ایسے ادب کے مدارج اور اس کی اہمیت پر مختلف مثالوں روشنی ڈالنے کی کوشش کی ہے۔ مختصر طور پر انھوں نے "ایغو" کی تعریف فکری انفرادیت کے قدرتی سرجوش کے ذریعے کی ہے ا بڑے مصنفوں کی تحریروں میں اس کی موجودگی اور اس کے اثبات کی سعی کو ناگزیر بتایا ہے اور اس کی تصریح کی ہے۔ خط ڈائریوں اور اعترافاتِ خود کے اندراجات سے۔ واقعہ یہ ہے کہ مولوی صاحب نے اگر ادب العالیہ کا مطالعہ کیا تو ان پر یہ نکتہ منکشف ہوئے بغیر نہ رہتا کہ ادب کا بہترین تخلیقی اظہار خطوط اور ڈائریوں میں نہیں، فن ڈرامہ میں ہوا ہے جہاں فن کار انفرادی نفس جیسے وہ "ایغو" کہتے ہیں، ایک آفاقی ذہن کی صورت نمایاں ہوتا ہے اور جو ایک طرح کی IMPERSONALITY نظر آتی ہے یا بہ الفاظِ دیگر جہاں ایک نوع کی OWER OF EMPATHY س کی جگہ لیتی ہے۔ مزید برآں مثال کے طور پر ٹالسٹائی کی جن تحریروں میں ہمیں انکشافاتِ ذات کی جھلکیاں نظر آ ن کی اہمیت بھی اسی لیے ہے کہ یہ ایک اعلیٰ پائے کے ناول نگار کے رشحاتِ قلم ہیں۔ آرٹ کے بارے میں اس نے جو

لکھا ہے، یا شیکسپیئر کے بارے میں جن ناقابلِ قبول خیالات کا اظہار کیا ہے وہ درخورِ اعتنا محض اس لیے ہیں کہ یہ ایک ایسے
نفں کے نظریات یا محسوسات ہیں جس نے "جنگ اور امن" جیسے شاہکار میں تاریخ میں اپنی بصیرت کو اپنے فن میں اس طرح
سو دیا ہے کہ اس کے "الیغو" اور فن پر اس کی گرفت کے درمیان فرق و امتیاز کرنا دشوار ہے۔ یہی آفاقیت آگسٹن جیسی عظیم
نفسیت کے اعترافات میں بھی نمایاں ہے۔ شیکسپیئر کی عظمت کا راز بھی اسی امر میں پوشیدہ ہے کہ اس نے اپنے ڈرامائی کردارو
باطن میں نفوذ کرکے اور ان کی تجسیم کے ذریعے انسانی نفسیات کی پراسرار گہرائیوں کو اس طرح بے نقاب کیا ہے جیسا آج تک
ی فن کار سے بن نہیں پڑا۔ ناول میں بھی بہترین واقعات اور لمحے وہی تسلیم کیے جاتے ہیں جن میں ایک ڈرامائی تشدید
راہو جاتی ہے۔ شیکسپیئر اپنی ذات کے حصار میں گرفتار نہیں بلکہ وہ نہ صرف اپنی ذات سے بلکہ زمان و مکان سے ماورا
جانے کی صلاحیت بھی اپنے اندر رکھتا ہے۔ یہی وہ معروضیت، یہی وہ فاصلہ، یہی وہ غیر ذات کی طرف جھکاؤ اور یہی
ماورائیت ہے جس کا تصور مولوی آزاد جو اپنی انا کے قتیل تھے اور اپنے الیغو کی چھوٹی سی قندیل کو ہمہ وقت روشن
نے پر مصر تھے، نہیں کر سکتے تھے۔ درپردہ ان کا منشا یہ معلوم ہوتا ہے کہ جس اعلیٰ و ارفع مقام پر سینٹ آگسٹن، روسو
ٹالئے، آندرے ژید، اسٹرینڈبرگ، ابنِ خلدون، امام غزالی اور ملّا عبدالقادر بدایونی جیسے زعماء و مشاہیر فائز د
ن ہیں، وہیں انھیں بھی ایستادہ کیا جائے۔ کاش! ایسا کرنا ممکن ہوتا۔ ان خطوط میں آزاد کا مقصد انکشافِ ذات
بلکہ انہی کی اصطلاح میں اثباتِ الیغو بلکہ ادعائے الیغو ہے۔ ان میں غیر نفس کی اہمیت کم سے کم ہے۔ ان میں
بد خود پرستی کا جذبہ حاوی ہے۔ ان میں فکر کی گہرائی، مشاہدے کی صحت اور ژرف بینی اور نئے علوم و نظریات سے
نیت کا ثبوت بے شک ملتا ہے لیکن ان میں وہ مانوس فضا اور وہ جذباتی اُتار چڑھاؤ ناپید ہے جو خطوط میں ہونا
ہے۔ ان میں لہجے کی یکسانیت شروع سے آخر تک غالب رہتی ہے۔ شاعری میں بالعموم شاعر کے الیغو کا نمایاں ہونا
اگوارا ہوتا ہے کیونکہ وہ اپنی ذات کو خلاصۂ کائنات سمجھتا ہے اور ہم اسے اس کا یہ حق دینے میں تامل اور تذبذب کو
یں دیتے۔ غالب اس کی ایک نمائندہ مثال ہیں: "میں عندلیب گلشن ناآفریدہ ہوں" اور انگریزی شاعر
ل کا EGOTISTICAL SUBLIME بھی اسی ضمن میں آتا ہے، لیکن نثر نگار کے لیے یہ عمل نامستحسن ٹھہرتا ہے۔ اندازِ
یں بے ساختگی کی بجائے شعوری اہتمام و التزام کا ابوالکلام آزاد کے ہاں ہر جگہ ضرورت سے زیادہ دخل ہے۔
نثر کے لیے جس خارجیت، قطعیت اور مفہوم و الفاظ کے مابین جس سخت گیر مطابقت کا ہونا لازمی ہے۔ ان خطوط
ناسب کی افسوسناک کمی محسوس ہوتی ہے۔ نمایاں طور پر معرب اور مفرس الفاظ کا بے دریغ استعمال اردو زبان
ڈے کو بدہیئت بنانے کے مترادف ہے۔ لاطینی سے مشتق الفاظ و تراکیب پر خردہ گیری کرتے ہوئے ٹی ایس ایلیٹ
ن کے بارے میں لکھا ہے: HE WROTE ENGLISH LIKE A DEADLANGUAGE اسی کا انطباق معرب و
الفاظ و تراکیب کی اس بھرمار پر بھی ہوتا ہے، جو آزاد اپنی اردو تحریروں میں کرتے ہیں۔ خطوط سے قطع نظر "تذکرہ"
ن تراشے توجہ طلب ہیں:

"یہی تخریج در تخریج، و تفریع در تفریع، و قیاس در قیاس، و استنباطاتِ رائیہ چند در چند،

وانفاع برنجیر و قواعدِ منطقیۂ جزئیات و کلیات و تمثیل و تقسیم ... کتاب و سنت کی معصیت عظمیٰ و رزیتِ کبریٰ ہے جس کی وجہ سے قرناً بعد قرنٍ و نسلاً بعد نسلٍ سخت و شدید غلطیاں بلکہ گمراہیاں واقع ہوتی رہیں اور کارخانۂ شرع میں فسادِ عظیم رونما ہوا۔"

"پھر ان سے بڑھ کر یہ کہ کو راہِ عزیمتِ دعوت، وتجدید واحیا ملت، ورفع اعلام سنت، واخمادِ شرو بدعت وکشف وابرازِ معارفِ مستورۂ کتاب وسنت وغوامض، وسرائرِ معارف وحکمتِ نبوت، وانفجارِ ینابیع الحکمت من اللسان والجنان، وجہاد فی سبیل اللہ بالسیف والقلم واللسان میں منزلوں اپنے پیچھے چھوڑ دیا اور علوم واعمال وہبیہ وسماویہ کی ان بلندیوں پر تن تنہا جا کھڑے ہوئے جہاں ان کے اقران ومعاصرین کے وہم وتصوّر کو بھی بار نہیں۔"

"اس شخص کی طرح جو اپنے آتش زدہ مکان کا سامان جلد جلد کھڑکی سے باہر پھینک رہا ہو، باوجود ہجوم تواترل، واتبوہِ زلازل، واحاطۂ حوادث، وتشتتِ بال، وبے سروسامانیِ حال، جس قدر بھی فرصتِ خاطر ساتھ دیتا ہے۔ صحبتِ قرطاس وقلم وتسویدِ واردات وافکار میں کمی نہیں کرتا۔ کبھی جمعیت وترتیب اور صورتِ انطباع واشاعت بھی نصیب ہوگی یا نہیں؟"

یہ خطوط فنی اعتبار سے خطابت سے قریب تر ہیں۔ اور سو باتوں کی ایک بات تو یہ ہے کہ ادب العالیہ میں تحریر کا امتیاز دوام اور اس کی عظمت لکھنے والے کی اندرونی INTEGRITY اور روشن ضمیری سے پیدا ہوتی ہے کسی بھی دوسری شے سے نہیں۔ موخر الذکر کو انگریزی میں چاہے آپ LUCIDITY OF SOUL کہہ لیجیے چاہے TRANSPARENCY OF VISION مولوی آزاد کو بہر حال ان دونوں میں سے کوئی بھی حاصل نہیں۔ رشید احمد صدیقی مرحوم نے ابوالکلام آزاد اپنے مضمون میں اس رائے کا اظہار کیا ہے کہ "غبارِ خاطر" کے اندراجات کی وہی شان ہے جو رقعاتِ غالب کی ہے۔ حالانکہ سراسر مغالطہ انگیز ہے۔ رقعاتِ غالب میں شخصیت، مفہوم اور زبان اس طرح شیر وشکر ہو گئے ہیں کہ انھیں الگ الگ نہیں کیا جا سکتا۔ ان خطوط سے بہ یک وقت غالب کی شخصیت، ان کے عہد اور ان کے معاصرین اور احباب سے تعلقات کی بھرپور تصویریں لوحِ دل پر نقش ہو جاتی ہیں۔ ان میں جو لچک ہے، جو وسیع المشربی ہے، ذہن اور روح کی عشرتوں اور درماندگیوں کو برہنہ کرنے کا جو جذبہ ہے، طنز و مزاح کی جو لطیف چاشنی ہے، ان کے مقابلے میں ابوالکلام آزاد کے خطوط ایک مصنوعی اور خود پرستانہ نمائش معلوم ہوتے ہیں۔ غالب کے ہاں ایک طرح کی دانائی، بصیرت، پختگی اور ثمر رسیدگی ہے۔ آزاد کے ہاں خالی خولی طنطنہ، للکار اور بلند آہنگی۔ یہاں یہ اضافہ کرنا شاید بے محل نہ ہو کہ انگریزی کی تاریخ میں سب سے زیادہ خوب صورت اور دلآویز خطوط اٹھارہویں صدی میں کوپر (COWPER) نے انیسویں

ہیں جواں مرگ شاعر کیٹس (KEATS) نے اور بیسویں صدی میں ڈی ایچ لارنس (D. H. LAWRENCE) نے لکھے ہیں۔
آزاد اور غالب کے ہاں لب و لہجے کا جو فرق ہے اسے دو مثالوں سے واضح کیا جا سکتا ہے۔ "غبارِ خاطر" میں ایک محبوب موضوع جس پر پیہم اور تواتر کے ساتھ اظہارِ رائے کیا گیا ہے، چائے نوشی کا مشغلہ اور اس کے لوازمات ہیں۔ اس سے متعلق آزاد نے جس مرصّع کاری سے کام لیا ہے اس کی تشریح چند اقتباسات سے ہو جائے گی۔ ۲۹ اگست ۴۲ء کے خط میں لکھتے ہیں:

"وہی چار بجے کا جاں فزا وقت ہے، چائے کا فنجان سامنے دھرا ہے اور طبیعت دراز دستی کے بہانے ڈھونڈ رہی ہے۔ ۔ ۔ ۔ چنانچہ گرفتاری کے دوسرے ہی دن جب حسبِ معمول علی الصباح اٹھا اور جام و مینا کا دور گردش میں آیا تو محسوس ہونے لگا جیسے طبیعت کا سارا انقباض اچانک دور ہو رہا ہو، اور افسردگی و تنگی کی بجائے انشراح و شگفتگی دل کے دروازے پر دستک دے رہی ہو یا مخلص لاہوری نے کیا لف و نشر مرتّب کیا ہے۔ اس ذوقِ سخن میں میرا ساتھ دیجیے۔

خمارِ ما و دِرِ توبہ و دلِ ساقی   بیک تبسّم مینا شکست و بست و کشاد

۷ار ستمبر ۴۲ء کو لکھتے ہیں:

"وقت وہی ہے مگر افسوس وہ چائے نہیں ہے جو طبعِ شورش پسند کو سر مستیوں کی اور فکرِ عالم آشوب کو آسودگیوں کی دعوت دیا کرتی تھی۔ ۔ ۔ ۔ وہ چینی چائے جس کا عادی تھا، کئی دن ہوئے ختم ہو گئی اور احمد نگر اور پونا کے بازاروں میں کوئی اس جنسِ گراں مایہ سے آشنا نہیں ہے۔ ۔ ۔ ۔ مجبوراً ہندوستان کی اس سیاہ پتی کا جوشاندہ پی رہا ہوں جسے تعبیر و تسمیہ کے اس قاعدے کے بموجب کہ برعکس نہند نام زنگی کافور، لوگ چائے کے نام سے پکارتے ہیں اور دودھ ڈال کر اس کا گرم شربت بنایا کرتے ہیں۔"

۷ار دسمبر ۴۲ء کے خط میں لکھتے ہیں:

"ایک مدت سے جس چینی چائے کا عادی ہوں وہ وہائٹ جیسمین کہلاتی ہے۔ ۔ ۔ ۔ اس کی خوشبو جس قدر لطیف ہے اتنا ہی کیف تند و تیز ہے۔ رنگت کی نسبت کیا کہوں؟ لوگوں نے آتشِ سیال کی تعبیر سے کام لیا ہے۔ ۔ ۔ ۔ لیکن آگ کا تخیّل پھر بھی ارضی ہے اور اس چائے کی الوہیت کچھ اور چاہتی ہے۔ میں سورج کی کرنوں کو مٹھی میں بند کرنے کی کوشش کرتا ہوں اور کہتا ہوں کہ یوں سمجھیے جیسے کسی نے سورج کی کرنیں حل کر کے بلوری فنجان میں گھول دی ہوں۔"

اب ان تمام اندراجات کا مقابلہ صرف ایک تماشے سے کر لیجیے جو میر مہدی کے نام غالب کے خطوط سے لیا گیا ہے:

"میر مہدی صبح کا وقت ہے۔ جاڑا خوب پڑ رہا ہے۔ انگیٹھی سامنے رکھی ہوئی ہے، دو حرف لکھتا ہوں، آگ تاپتا جاتا ہوں۔ آگ میں گرمی نہیں۔ مگر ہائے آتشِ سیال کہاں سے لاؤں کہ جب دو جرعے پی لیے فوراً رگ و پے میں دوڑ گئی۔ دل توانا ہو گیا، دماغ روشن ہو گیا، نفسِ ناطقہ کو تواجد بہم پہنچا۔ ساقیٔ کوثر کا بندہ اور

تشنہ لب، ہائے غضب، ہائے غضب ... "
غالب نے شراب نوشی کے عمل کو جس طرح بھرپور، بے ساختہ اور پُرلطف انداز سے بیان کیا ہے وہ ابوالکلام آزاد کی بوجھل، پُر تصنع اور پُر کاوش اندازِ نگارش میں دُور دُور تک نظر نہیں آتا۔
ان خطوط کے مطالعے سے مولوی ابوالکلام آزاد کی جو تصویر ابھر کر سامنے آتی ہے اس میں ابیقوریت یعنی EPICUREANISM کا عنصر خاصا حاوی معلوم ہوتا ہے خود ہی ایک جگہ عالمِ ترنگ و سرمستی میں لکھا بھی ہے:
"جہاں تک زندگی کی سرشاریوں کا تعلق ہے الذبتہ کا زاویۂ نگاہ کام میں لاتا ہوں اور خوش رہتا ہوں۔" (ص ۱۶۸)
مزید "میں نے اپنے کاک ٹیل COCKTAIL کے جام میں دونوں بوتلیں انڈیل دیں۔ میرا ذوقِ بادہ آشامی بغیر اس جامِ مرکب کے تسکین نہیں پا سکتا تھا ...... البتہ کاک ٹیل کا یہ نسخۂ خاص ہر خام کار کے بس کی چیز نہیں ہے۔ صرف بادہ گسارانِ کہن مشق ہی اس سے کام لے سکتے ہیں۔ ورموتھ (VERMOUTH) اور جن (GIN) کا مرکب پینے والے اس رطلِ گراں کے متحمل نہیں ہو سکیں گے۔" (ص ۶۷)
چائے نوشی کا ذکر جس کیف و سرور اور نشاط آگینی کے ساتھ کیا ہے:
"وہی صبح چار بجے کا وقت ہے صراحی لبریز ہے اور جام آمادہ ایک دور ختم کر چکا ہوں، دوسرے کے لیے ہاتھ بڑھا رہا ہوں۔"
مزید "گرفتاری کے دوسرے ہی دن حسب معمول علی الصباح اٹھا، اور جام و مینا کا دور گردش میں آیا تو ایسا محسوس ہونے لگا جیسے طبیعت کا سارا انقباض اچانک دُور ہو رہا ہو۔"
اس ضمن میں حافظ کے خمریہ اشعار جس کثرت، اور تواتر کے ساتھ اور مزے لے لے کر نقل کیے ہیں اس سے یہ گمان گزرتا ہے کہ یہ وہائٹ جیسمین نہیں بلکہ شاید بہ ادنیٰ تصرف کوئی (اور) معشوق ہے اس پردۂ زنگاری میں۔ اسے محض استعاراتی شیوۂ گفتار کہہ کر ٹالا نہیں جا سکتا۔ کہ اس کے پسِ پشت بیرونی شہادت بھی موجود ہے، ملاحظہ کیجیے۔ IAN DOUGLAS کی کتاب

ABUL KALAM AZAD: AN INTELLECTUAL AND RELIGIOUS BIOGRAPHY

۱۷ ستمبر ۱۹۴۳ء کے ایک خط میں ابوالکلام آزاد پہلی اور آخری مرتبہ بے جھجک سامنے آتے ہیں۔ اور پُرانی یادوں کو تازہ کرنے کے سلسلے میں اتفاقاً انھوں نے اس سخت اور کڑے پہرے کو اٹھا دیا ہے جسے انھوں نے اپنے اُوپر بٹھا رکھا تھا:
"جس کوچے میں بھی قدم اٹھایا، اسے پوری طرح چھان کر چھوڑا۔ ثواب کے کام کیے، تو وہ بھی پوری طرح کیے گناہ کے کام کیے تو انھیں بھی ادھورا نہیں چھوڑا۔ رندی کا کوچہ ملا تھا تو اس میں بھی سب سے آگے رہے تھے پارسائی کی راہ ملی، تو اس میں بھی کسی سے پیچھے نہ رہے۔ طبیعت کا تقاضا ہمیشہ یہی رہا کہ جہاں کہیں جائیے ناقصوں اور خام کاروں کی طرح نہ جائیے، رسم و راہ رکھیے تو راہ کے کاملوں سے رکھیے۔"
اب اس طرح کی یادداشتوں کی تجدید کا جو طریقہ غالب نے مرزا حاتم علی مہر کے نام دو خطوں میں استعمال کیا ہے، سامنے رکھیے، ایک خط میں لکھتے ہیں:

"تمہارا حلیہ دیکھ کر تمہارے کشیدہ قامت ہونے پر مجھے رشک نہیں آیا۔ کس لیے کہ میرا قد بھی درازی میں انگشت نما ہے۔ تمہارے گندمی رنگ پر رشک نہ آیا۔ کس واسطے کہ جب میں جیتا تھا تو میرا رنگ چمپئی تھا اور دیدہ ور لوگ اس کی ستائش کیا کرتے تھے۔ اب جو کبھی مجھے اپنا وہ رنگ یاد آتا ہے تو چھاتی پر سانپ پھر جاتا ہے۔ ہاں مجھ کو رشک آیا اور میں نے خونِ جگر کھایا تو اس کلمے پر کہ ڈاڑھی خوب گھٹی ہوئی ہے۔ وہ مزے یاد آگیے۔ کیا کہوں جی پر کیا گزری۔ . . . جب ڈاڑھی مونچھ میں سفید بال آگئے۔ تیسرے دن چیونٹی کے انڈے گالوں پر نظر آنے لگے۔ اس سے بڑھ کر یہ ہوا کہ آگے کے دو دانت ٹوٹ گئے۔ ناچار مسّی بھی چھوڑ دی، اور ڈاڑھی بھی۔"

ہی کو ایک اور خط لکھتے ہیں:

"میں بھی مغل بچہ ہوں۔ عمر بھر ایک بڑی ستم پیشہ ڈومنی کو میں نے بھی مار رکھا ہے۔ خدا ان دونوں کو بخشے اور ہم تم دونوں کی بھی کہ زخم مرگِ دوست کھائے ہوئے ہیں، مغفرت کرے۔ چالیس بیالیس برس کا یہ واقعہ ہے۔ با آنکہ یہ کوچہ چھوٹ گیا، اس فن ہست میں بیگانہ محض ہو گیا۔ لیکن اب بھی کبھی کبھی وہ ادائیں یاد آتی ہیں۔ اس کا مزہ زندگی بھر نہ بھولوں گا۔ جانتا ہوں کہ تمہارے دل پر کیا گزرتی ہوگی۔ صبر کرو، اور اب ہنگامۂ عشق مجازی چھوڑ دو۔"

ان تراشوں میں نہ صرف یہ کہ یادوں کے خزانوں کو کھنگالا گیا ہے۔ بلکہ مختلف کیفیات کے ابھارنے میں تخیّل کے عمل کی جو تیزی ہے اور حقیقت کی جو بے باک مصوری کی گئی ہے، وہ ابوالکلام آزاد کے ہاں یکسر مفقود ہے۔

"غبارِ خاطر" کی ایک بیّن خصوصیت جو خطوط کے حسن کو حد درجے مجروح کرتی ہے وہ یہ ہے کہ اس میں جگہ جگہ علمی اور فلسفیانہ مسائل پر اظہارِ رائے کیا گیا ہے۔ بعض مقامات ایسے ہیں جہاں مشاہدات کو فلسفیانہ انداز میں ڈھالا گیا ہے یا مشاہ . ون سے تعمیمات اخذ کی گئی ہیں۔ مثلاً ۷ اراکتوبر کے ایک خط میں لکھتے ہیں:

"فطرتِ کائنات میں ایک مکمل مثال کی نمود داری ہے۔ ایسی مثال جو عظیم بھی ہے اور مثالی بھی۔ اس کی عظمت ہمیں مرعوب کرتی ہے، اس کا جمال ہم میں محویت پیدا کرتا ہے۔ پھر کیا ہم فرض کرلیں کہ یہ نمود بغیر کسی قوت کے کام کر رہی ہے۔"

۱۸ اراکتوبر ۴۲ء کے خط میں یہ جملے ملتے ہیں:

"غیر صفاتی تصوّر کو انسان پکڑ نہیں سکتا، اور طلب اسے ایسے مطلوب کی ہوئی جو اس کی پکڑ میں آسکے۔ وہ ایک ایسا جلوۂ محبوبی چاہتا ہے جس میں اس کا دل اٹک سکے۔ جس کے حسن گریزاں کے پیچھے والہانہ دوڑ سکے۔ جس کا دامنِ کبریائی پکڑنے کے لیے اپنا دستِ عجز و نیاز بڑھا سکے۔ جس کے ساتھ راز و نیازِ محبت کی راتیں بسر کر سکے۔ جو اگرچہ زیادہ سے زیادہ بلندی پر ہو، پھر بھی اسے ہر دم جھانک لگائے تاک رہا ہو۔"

۱۲ اجون ۴۳ء کے خط میں لکھتے ہیں:

"میں سوچنے لگا کہ انسان کے دل کی سرزمین کا بھی یہی حال ہے۔ اس باغ میں بھی امید و طلب کے بے شمار درخت اُگے ہوئے ہیں اور بہار کی آمد آمد کی راہ تکتے رہتے ہیں۔ لیکن جن ٹہنیوں کی جڑ کٹ گئی ان کے لیے بہار و خزاں کی تبدیلیاں کوئی اثر نہیں رکھتیں۔ کوئی موسم بھی انھیں شادابی کا پیام نہیں پہنچا سکتا۔"

اب ان کے بالمقابل غالب کے خطوط میں سے یہ تین تراشے قابلِ توجہ ہیں:

"مگر بات یہ ہے کہ تم مشقِ سخن کر رہے ہو اور میں مشقِ فنا میں مستغرق ہوں۔ بوعلی سینا کے علم کو اور نظیری کے شعر کو ضائع اور بے فائدہ اور موہوم جانتا ہوں۔ زیست بسر کرنے کو کچھ تھوڑی سی راحت درکار ہے اور باقی حکمت اور سلطنت اور شاعری اور ساحری سب خرافات ہے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ جس سناٹے میں ہوں، وہاں تمام عالم بلکہ دونوں عالم کا پتہ نہیں۔ ہر کسی کا جواب مطابق سوال کے دیے جاتا ہوں۔"

"ناتوانی زور پر ہے، بڑھاپے نے نکما کر دیا ہے، ضعف، سستی، کاہلی، گراں جانی، گرانی، رکاب پاؤں میں ہے، باگ پر ہاتھ ہے۔ بڑا سفر دور و دراز درپیش ہے، زادِ راہ موجود نہیں، خالی ہاتھ جاتا ہوں۔ اگر ناپرسیدہ بخش دیا گیا تو خیر، اگر باز پرس ہوئی تو سقر مقر ہے، اور ہاویہ زاویہ ہے، دوزخ جاوید ہے اور ہم ہیں۔"

"میں جب بہشت کا تصور کرتا ہوں اور سوچتا ہوں کہ اگر مغفرت ہو گئی اور ایک قصر ملا اور ایک حور ملی، اقامتِ جاودانی ہے، اور اسی ایک نیک بخت کے ساتھ زندگانی ہے۔ اس تصور سے جی گھبراتا ہے اور کلیجہ منھ کو آتا ہے۔ ہے ہے وہ حور اجیرن ہو جائے گی۔ طبیعت کیوں نہ گھبرائے گی۔ وہی زمردیں کاخ، وہی طوبیٰ کی ایک شاخ، چشمِ بد دور، وہی ایک حور، بھائی ہوش میں آؤ، کہیں اور دل لگاؤ۔"

ابوالکلام آزاد کے ہاں ان تین تراشوں میں بالترتیب فلسفیانہ، نیم فلسفیانہ اور شعری فلسفیانہ انداز بیان اختیار کیا گیا ہے۔ غالب کے خطوط میں تعلیمات کی بنیاد محسوس اور مادی مدرکات پر رکھی گئی ہے۔ صداقتیں عموماً دو طریقے سے ابلاغ کے عمل سے گزاری جا سکتی ہیں۔ پہلی کا تعلق فلسفے اور منطق کے قضیوں یعنی PROPOSITIONS سے ہوتا ہے اور دوسری کا پیکر تراشی یعنی IMAGERY سے، پہلی کا ردِ عمل محض ذہن پر ہوتا ہے، دوسری کا حواس اور تخیل پر۔ آزاد کے ہاں عام طور سے تفلسف اور حد درجے کا بہروپیہ پن یعنی ATTITUDINIZING ملتی ہے۔ غالب کے ہاں مدرکات کی عکس افگنی اور بے ساختگی، اوّل الذکر کے ہاں ایک طرح کی روشنی اور ادعائیت یعنی DOGMATISMS ہے، غالب کے ہاں نہ صرف وسیلۂ اظہار میں پوری لچک موجود ہے، بلکہ مشاہدہ، وجدان اور وسیلۂ اظہار ایک عضوی کل میں تبدیل ہو گئے ہیں ان کے ہاں خلوت اور جلوت دونوں کی رنگا رنگی ہے۔ "غبارِ خاطر" کے اندراجات کو ایک معنی میں انتسابِ خود یعنی SELF-DEDICATION سے تعبیر کیا جا سکتا ہے۔ ان میں بے ساختگی، عنصری ہمدردی اور زندگی کے سخت و شکست کو ہموار کرکے اس میں دلآویزی پیدا کرنے کا فقدان ہے۔ آزاد اپنی MIRROR-IMAGE کی دنیا کے نہ دانی نظر آتے

ہیں۔ ان خطوط میں اچھی نثر کی خوبیاں نہیں۔ ابوالکلام آزاد یا تو مقدماتِ کبریٰ و صغریٰ قائم کرتے ہیں۔ یا فارسی اور عربی آمیز الفاظ اور تراکیب اور حافظے میں پیوست اشعار سے ان کا تخیل اس درجہ آتش گیر ہو جاتا ہے کہ عبارت توجہ کو اپنی طرف کھینچتی ہے اور اسلوبِ بیان سکون یافتہ نہیں رہتا اور وہ تمام تر اپنی طلاقتِ لسانی اور جوشِ خطابت پر تکیہ کرتے نظر آتے ہیں۔ اس طرح یہ خطوط نثری شاعری کی ایک مایوس کن مثال بن گئے ہیں اور ان خطوط کی طول کلامی پر من حیث الکل انہی کا نقل کردہ غالب کا مصرع پوری طرح صادق آتا ہے: "مگر ستم زدہ ہوں ذوقِ خامہ فرسا کا"

Hamdard
PEELU
پیلو کی بازیافت
ہمدرد
مِسواک سے
ہمدرد پیلو ٹوتھ پیسٹ تک
پیلو کے مؤثر اور مجرّب اجزاء پر مشتمل ایک مکمل طبّی ٹوتھ پیسٹ پیش کر کے ہمدرد نے
حفظِ دنداں کی دنیا میں بھی اوّلیت حاصل کر لی ہے۔
پیلو صدیوں سے دانتوں کی صفائی اور مسوڑھوں کی مضبوطی کے لیے استعمال کیا جا رہا ہے۔
ہمدرد کی تحقیقِ جدید نے پیلو کے ان افادی اجزاء اور دوسری مجرّب جڑی بوٹیوں سے ایک جامع
فارمولے کے مطابق ہمدرد پیلو ٹوتھ پیسٹ تیار کیا جو پوری طرح دانتوں اور مسوڑھوں
کی حفاظت کرنے کی صلاحیت رکھتا ہے۔
Hamdard
ہمدرد
پیلو ٹوتھ پیسٹ
ہمدرد
ہم خدمتِ خلق کرتے ہیں
پیلو کے اوصاف مسوڑھے مضبوط دانت صاف
ہمدرد
پاکستان سے محبت کرو۔ پاکستان کی تعمیر کرو
Adarts-HTP-3/85

ڈاکٹر داؤد رہبر

ڈاکٹر عاشق حسین بٹالوی مرحوم

لندن میں بس گئے وہ اور بوستانٹ میں ہم
تقلید ہم نے کی ہے عاشق بٹالوی کی

تین باتیں ۱۵ اگست ۱۹۴۷ء کو ایک دم ہوئیں: انگریز کے راج کا اختتام، ورودِ آزادی اور تقسیم یعنی ظہور پاکستان
محشر کے بیان میں سوائے درد کے رکھا ہی کیا ہے جو پناہ گزینوں کے قافلوں کا محشر تھا، الاماں، آج کی اس تحریر میں
ن خیال سے تقسیم کا ذکر درمیان آیا وہ یہ ہے کہ تقسیم سے لاہور والوں کی نظر میں بٹالہ اُدھر رہ گیا۔ وہ بٹالہ جو ڈاکٹر
نق حسین بٹالوی کا وطنِ مالوف تھا، بٹالہ کے چھن جانے سے عاشق صاحب کے حساس دل پر جو صدمہ سہا اس کا کچھ
ازہ یہ سوچ کر لگاتا ہوں کہ اگر قصور جو ہمارے باپ دادا کا وطن تھا سرحد پار بھارت کی طرف رہ جاتا تو ہم پر کیا گزرتی۔
وادیِ گنگا اور وادیِ سندھ کا وہ رشتہ ہے جس کا حوالہ ہندوؤں اور مسلمانوں کی ہزار سالہ تاریخ کے بیان میں
ہر صفحے پر ملتا ہے۔ پاکستان کا قیام اٹل تھا لیکن ایک بدیہی بات یہ ہے کہ تقسیم سے سیاست اور ثقافت کی ایک شاندار
لان گاہ ختم ہوگئی، نہ بھارت کی شخصیات میں وہ شان رہی نہ پاکستان کے اکابر کی پہلی سی حیثیت رہی۔ قائدِ اعظم
علی جناح، حضرت علامہ اقبال، گاندھی جی، ابوالکلام آزاد، حسرت موہانی، مولوی ظفر علی خاں، جواہر لعل نہرو، دیوان
لمو مفتون، استاد فیاض خاں، روشن آرا بیگم، استاد بندو خاں، ڈاکٹر ذاکر حسین، بابائے اردو مولوی عبد الحق، چودھری
ر اللہ خاں، پطرس بخاری، جوش ملیح آبادی۔ ان سب بزرگوں کے کارناموں کا اکھاڑہ اکھل ہند اکھاڑا تھا۔ اس اکھاڑے
ا ایک بڑا پن تھا۔ تقسیم کے بعد شخصیتوں کا وہ دبدبہ نہ بھارت میں رہا نہ پاکستان میں۔ سب باتیں چھوٹی ہو کر
ہئیں۔ ڈاکٹر عاشق حسین بٹالوی اس عظیم انقلاب سے گھبرا کر رہ گئے۔ اگر کہا جائے کہ گھبرانے کی اس میں کیا بات تھی، تو

٭ بوستان، بوسٹن کا مفرس ہے۔ یہ تفریس اعجاز حسین بٹالوی کی اختراع ہے۔ یہ شعر ایک غزل میں ہے جو کئی سال پہلے کہی گئی۔

حاسبیں جمہوریہ توجشن کا موقع تھا تو عرض یہ ہے کہ ہم خود بے حد گھبرا گئے تھے۔ ان دنوں صدموں کے مارے لاکھوں تھے۔ قتل عام لوٹ مار اور مار دھاڑ کے دنوں میں گھبرا جانا کوئی گناہ نہیں۔

تقسیم ملک سے پہلے ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان صرف لڑنا بھڑنا ہی معمول نہ تھا، ہم سب جانتے ہیں کہ تقسیم ملک کے بعد تک انجمن ترقی اردو کے صدر پنڈت برج موہن دتاتریہ کیفی تھے۔ سر تیج بہادر سپرو اردو کی حمایت میں تادم مرگ سینہ سپر رہے۔ منشی تلوک چند محروم کی مسلمان دوستی اور اردو پرستی سب کو معلوم ہے۔ لالہ سری رام، مہاراجہ کرشن پرشاد، پنڈت رتن ناتھ سرشار، کرشن چندر، کس کس کا نام لیا جائے۔ بے لاگ سوچ کہتی ہے کہ ہندوؤں اور مسلمانوں کے تعلقات میں کہیں محبت کی مٹھاس بھی پائی جاتی تھی اور ایسی محبت کرنے والے اچھے لوگ تھے۔

پاکستان کے قیام کے پہلے چند سالوں کی فضا میں ادیبوں کے ہاں بھارت سے بیگانگی میں ایسی شدت نہ تھی۔ جب الحاق کشمیر کی طرف سے اہل پاکستان کو نا امیدی سی ہونے لگی تو یہ بیگانگی بڑھنے لگی۔ بھارت اور پاکستان کی پہلی جنگ کے دونوں ملکوں کے تعصبات سخت ہونے لگے۔ گمان یہ ہے کہ مولانا صلاح الدین احمد (ایڈیٹر "ادبی دنیا") جیسا آزاد خیال ادیب بھی اس جنگ کے بعد ہی بالآخر ہندوؤں کی خوش خواہی سے نا امید ہوا اور حمیت اسلام مولانا کے دل میں راسخ تر ہو گئی۔

تقسیم ملک سے پہلے مولانا صلاح الدین احمد کا تجارتی لین دین بیشتر ہندوؤں کے ساتھ تھا (غالباً مولانا نمک کی تجارت سے روپیہ کماتے تھے "ادبی دنیا" اور کتابوں کی اشاعت پیسہ کمانے کی غرض سے نہ تھی) دوارکا داس شعلہ کے کیمسٹ خاندان کی ادویاتی دکان پرانی انارکلی میں "نراین داس بھگوان داس" کے نام سے معروف تھی۔ تقسیم ملک کے دنوں میں جب گمٹی بازار میں مولانا کا جدی مکان جل کر تالو ہوا تو مولانا اپنے کنبے کے ساتھ شعلہ کے مکان میں اٹھ آئے (ہائے آگ میں کود پڑنے کا شوق!) اس گھر میں بیسیوں بار اپنا جانا ہوا۔

عاشق صاحب کے تعلقات مولانا سے غیر معمولی تھے۔ عاشق صاحب کے والد بزرگوار غلام اکبر خاں صاحب مولانا کے والد ماجد مولوی احمد بخش صاحب کے شاگرد تھے۔ اس کے علاوہ عاشق صاحب کے سب سے بڑے بھائی ذوالفقار صاحب اسلامیہ کالج میں مولانا کے ہم جماعت تھے۔ عاشق صاحب اور مولانا کے درمیان ایک قدر مشترک رواداری اور بے تعصبی تھی۔ دونوں کی دوستیاں خوش مذاق ہندو صحافیوں اور ادیبوں سے ۴۷ء تک برقرار رہیں۔

مولانا صلاح الدین احمد کو سیاست سے کوئی واسطہ نہ تھا سوائے اس کے کہ انگریزی گورنمنٹ کی ملازمت۔ انھوں نے پرہیز کیا۔ سیاسی جلسوں اور کانفرنسوں سے وہ دور ہی رہے۔ عاشق صاحب البتہ سیاسی میدان میں اترے پنجاب مسلم لیگ کے کارکنوں میں وہ جانے پہچانے آدمی تھے۔ ملک برکت علی بڑے دھڑلے کے سیاس تھے۔ وکالت میں بھی ان کا بڑا مقام تھا۔ قائداعظم سے قریب قریب مساوات کی سطح پر گفتگو کرتے تھے اور وکالت کی ہم پیشگی کی رعایت سے ان کو صرف "جناح" کہہ کر خطاب کرتے تھے۔ ملک صاحب پنجاب مسلم لیگ کے سکریٹری تھے اور عاشق صاحب جائنٹ سکریٹری لیکن چند سال نہایت جوش سے سیاست کی سرگرمیوں میں شریک رہنے کے بعد عاشق صاحب رفتہ رفتہ سیاست سے کنارہ کش ہونے لگے۔ قائداعظم سے ان کی ایک زمانے میں مراسلت ہوئی جس میں انھوں نے جسارت کے ساتھ پوچھ

لیگ کی لیڈری رؤسا اور نواب قسم کے زمرے تک کیوں محدود ہوتی چلی جا رہی ہے۔
دراصل عاشق صاحب کا رجحان سیاست سے بڑھ کر علم اور ادب کے مشاغل کی طرف تھا۔ سیاست کی ستم ظریفیوں
بالآخر بیزار ہو گئے۔ وکالت کا کام جو روزی کمانے کو انھوں نے جوانی میں اختیار کیا تھا اس میں بھی ان کا جی نہ لگا۔ ازدواج
ان کو راس نہ آیا۔ تجرد میں رفتہ رفتہ تیاگ بھی شامل ہوا۔ قلندری کی تکمیل یوں ہوئی۔
مولانا صلاح الدین احمد کی بڑی دختر حبیبہ اور بڑے فرزند وجیہہ الدین احمد ہمارے بچپن کے ہمجولی تھے۔ موڈل
ن (لاہور) میں ہمجولیوں کی آپس کی آمد و رفت روز ہوا کرتی۔ آگے چل کر جب ہم کالج میں داخل ہوئے تو مولانا کے ادبی
ب سے کچھ آگاہی ہوئی۔ چونکہ وہ ہمارا بچپن دیکھ چکے تھے اس لیے جب میں "ادبی دنیا" کے دفتر میں ان کو سلام کرنے جا پہنچا
ت خوش ہوئے۔ ان دنوں مجھے انشا پردازی کا خیال تک نہ تھا، بس مولانا کی شخصیت کی کشش وہاں کھینچ لے جاتی۔
ہیں ایک آدھ چکر اس دفتر کا کالج کے اوقات کے بعد ہو جاتا۔ وہاں سلام کر کے ایک کرسی پر خاموش بیٹھ جاتا۔
وہیں عاشق صاحب سے تعارف ہوا۔ وہ کچہری سے فارغ ہو کر وہیں آن پہنچتے۔ وکیلوں کی وضع، سیاہ کوٹ اور
ر پتلون اور بوٹائی۔ ہر بار اسی لباس میں ملبوس، کچھ تھکے تھکے اور چپ چپ۔ گرمیوں میں رومال سے چہرے کا پسینہ
چھتے ہوئے آتے ہی بیٹھ کر اخبار بینی میں مشغول ہو جاتے۔ مولانا پروف خوانی میں لگے رہتے۔ بندہ مخل نہ ہوتا۔ خاموشی کی اس
میں عجب راحت تھی۔
کالج کے زمانے میں عاشق صاحب کے برادر خورد اعجاز حسین بٹالوی سے ایسی یاری ہوئی کہ قرابت اس کے آگے کیا چیز ہے!
ق صاحب اس دوستی سے باخبر تھے۔ ۱۹۴۷ء میں یوم آزادی کے چند ہی روز بعد موڈل ٹاؤن میں اعجاز دوڑے دوڑے
ے پاس آئے اور بولے۔ کوئی اچھا خالی مکان تمہاری نظر میں ہو تو بتاؤ۔ میں نے کہا کہ ہمارے تمہارے انگریزی
پروفیسر بلڈون ڈھینگرا صاحب کا مکان (ایف ۸۳) خالی ہے بلکہ غیر مقفل پڑا ہے۔ وہ اس سال سوئے اتفاق سے اسے
سکھ دوست کو کرائے پر دے گئے۔ وہ سکھ بلوہ کے ڈر سے مشرقی پنجاب کو نکل بھاگا۔ پروفیسر صاحب گرمیوں میں شملہ یا
دون جانے سے پہلے بنگلہ یعقوب (ہمارے بھائی) کی حفاظت میں چھوڑ جایا کرتے تھے۔ اس سال خلاف معمول اسے کرائے
ھا گئے اور کرایہ دار مکان کھلا چھوڑ کر امرتسر یا جالندھر کی طرف نکل بھاگا۔ اگر جلد اس کا قبضہ لے لو تو اس کے اندر جو فرنیچر
ماب خانہ ہے وہ محفوظ رہیں گے۔ ورنہ ناشناس کتابیں لوٹ کر ردی کے بھاؤ بیچ دیں گے۔ اعجاز کے سب سے بڑے بھائی
قرنین صاحب ان دنوں سی آئی ڈی کے بہت بڑے افسر تھے۔ ان کی مدد سے مکان کا قبضہ جلد ہی ان کو بٹالے کی
یکہ جائداد کے عوض مل گیا۔ برابر کی دو کوٹھیوں کا قبضہ بھی جلد ہی ان کے برادر خادم حسین بٹالوی اور ان کے بہنوئی عبداللہ
ب کے رہنے کو حاصل ہوا اور تین گھر ساتھ ساتھ ان بٹالے والوں نے آباد کیے۔ ہمارے گھر سے ان مکانوں تک پیدل پہنچنے میں
س منٹ لگتے تھے۔ اس قرب مکانی سے میل جول اور بھی بڑھ گیا۔ مارچ ۱۹۴۹ء تک جاری رہا۔ پھر بندہ عازم انگلستان

پروفیسر ڈھینگرا پر لاہور کی جدائی ایسی شاق تھی کہ یہ صدمہ اٹھا کر وہ ہندوستان چھوڑ کر پیرس میں
ہے اور عمر بھر وہیں رہے۔

ہوا اور چار سال وہاں بسر ہوئے۔ ستمبر ۱۹۴۹ء میں اعجاز صاحب وکالت کی تعلیم کے لیے لندن آگئے۔ اور تقریباً چار سال انگلستان میں بھی مراسم پائیدار رہے۔ اس کے بعد امریکہ میں بھی اعجاز صاحب سے ملاقاتیں ہوئیں۔ آخری ملاقات پچھلے ہفتے نیویارک کے قریب آغا بابر کے گھر میں ہوئی (عاشق صاحب کے چھوٹے بھائی آغا بابر جو ہیں وہی بٹالوی لیکن اپنے نام کے ساتھ بٹالوی نہیں لکھتے) آغا بابر ریٹائر ہو کر امریکہ آگئے ہیں۔ پچھلے تین چار برس میں ان سے بھی بہت محبت بھری ملاقاتیں ہوئی ہیں۔ اور فون پر پنجابی میں لمبی لمبی گپ اکثر ہوتی ہے۔ حالانکہ میری قیام گاہ سے ان کا گھر دو سو میل کے فاصلے پر ہے۔

غرض یہ ہے کہ با ایں خانہ کہ تمام آفتاب است، ہمارا پینتالیس برس پرانا تعلق ہے۔ ان پانچوں بھائیوں سے ملاقاتیں ہوئی ہیں۔ اعجاز کی والدہ مرحومہ نے ہمارے سر پر ہاتھ پھیر کر ہم کو دعائیں دی ہیں۔ بس ایک اعجاز کے والد آغا غلام اکبر خاں کے دیدار نہ ہوئے۔ اس خاندان سے ہماری شناسائی ہونے سے پہلے ۱۹۴۱ء میں وہ چل بسے۔ یہ حسرت قسمت میں لکھی تھی۔ ان کی اولاد کی شخصیتیں دیکھ کر اندازہ ہوا کہ نہایت شاندار اور رنگین آدمی ہوں گے۔

آغا غلام اکبر خاں کی ملازمت پولیس میں تھی۔ اس میں ان کا آخری تقرر منٹگمری میں تھا جہاں آپ سرکل انسپکٹر کے عہدے پر فائز تھے۔ آگے چل کر یہی عہدہ ڈپٹی سپرنٹنڈنٹ آف پولیس (ڈی ایس پی) کہلایا۔ منٹگمری سے آپ ریٹائر ہوئے۔ سابقاً آپ لاہور میں کوتوال تھے۔ اس حیثیت سے آپ نے گرد و نواح کے تھانوں میں خوب شان سے تھانیداری کی۔ منٹگمری سے ریٹائر ہو کر اپنے وطن بٹالے ہی میں زندگی کے آخری سترہ اٹھارہ برس گزار دیے۔ تھانیداری اور ادیبانہ شوق شاذ ہی ایک ذات میں جمع ہوتے ہیں۔ اس کی ایک اور دلآویز مثال جو ذہن میں آتی ہے، ظہیر دہلوی (مصنف "داستانِ غدر") ہیں۔ ظہیر منجھے ہوئے شاعر تھے۔ ان کے باپ خطاطی میں بہادر شاہ ظفر کے استاد تھے۔ داغ نے بھی خطاطی ظہیر کے باپ سے سیکھی۔ رام پور میں داغ اور ظہیر ساتھ ساتھ ملازم تھے۔ حیدرآباد (دکن) میں بھی دونوں کی رفاقت کے اسباب پیدا ہوئے۔ ظہیر نے رام پور چھوڑ کر برسوں الور اور ٹونک میں تھانیداری کی نوکری کی۔

آغا غلام اکبر خاں کا تذکرہ نہ عاشق صاحب نے لکھا نہ آغا بابر نے نہ اعجاز نے، اب میں ان کو اکسانے پر تلا ہوا ہوں۔ اعجاز صاحب نے وعدہ تو کیا ہے کہ کم سے کم ایک دو خطوط میں ان کی کچھ یادیں ضبطِ تحریر میں لائیں گے۔ اعجاز صاحب کا سن ان کے والد بزرگوار کے انتقال کے وقت اٹھارہ انیس سے زیادہ نہ تھا۔ پچھلے ہفتے مجھ سے کہہ رہے تھے کہ ان سے ان کے والد ماجد کی دوستی کا رنگ خاص تھا۔ اس لیے کہ سب سے چھوٹے فرزند یہی تھے اور ان کے باپ ان سے باتیں کرتے ہوئے اگلے وقتوں کے قصے کہتے۔ آغا غلام اکبر خاں کے ظریفانہ مزاج کی ایک جھلکی اس قصے میں دکھائی دی: ایک روز حسب معمول اعجاز سے انھوں نے بطور املا کسی حبیب کو خط لکھوایا، فرمایا: لکھو! القاب کے لیے لکھوایا۔ "سیدنا" اس کے فوراً بعد لکھوایا "(سیدنا میں) نا نفی کا نہیں"، دیکھیے کیسی مزے کی چہل ہے!

ان کی فارسی دانی اور شوقِ علم کی شہادت کو ایک قصہ لیوں ہے۔ اعجاز سے انھوں نے فرمایا کہ لاہور جا کر راجہ نریندر ناتھ سے ملو اور ان سے کہو کہ ہمیں "ظفر نامۂ رنجیت سنگھ" (مصنفہ مفتی علی الدین ؟) کا وہ قلمی نسخہ جو دیال سنگھ کالج کی لائبریری میں محفوظ ہے، دیکھنا منظور ہے، مستعار کر کے ہمیں پہنچا یا جائے۔ آنجہانی راجہ صاحب کا اردو اور فارسی کے

شائقین میں شمار ہوتا تھا۔ یونینسٹ پارٹی کے سر برآوردہ رکن تھے۔ دیال سنگھ ٹرسٹ کی صدارت بھی ان کے حصے میں آئی تھی
غلام اکبر خاں مرحوم کے وطن بٹالہ کو فرقۂ احمدیہ میں خاص تقدس حاصل ہے۔ قادیان اور بٹالہ کے درمیان فاصلہ آٹھ نو میل سے زیادہ نہیں۔ ایک زمانہ وہ تھا کہ میرزا غلام احمد نے ابھی نبوت کا دعویٰ نہ کیا تھا لیکن چھوٹے چھوٹے پمفلٹ ان کے لکھے ہوئے شائع ہو چکے تھے جن میں علم کے ساتھ سوچ کے آثار بھی پائے جاتے تھے۔ اعجاز حسین بٹالوی کا بیان ہے کہ غلام اکبر خاں مرحوم کے ایک نابینا چچا یا ماموں کو میرزا کی ان تحریروں سے دلچسپی تھی اور وہ غلام اکبر خاں سے پڑھوا کر ان کو سنا کرتے تھے۔ یوں لڑکپن میں غلام اکبر خاں کے دل میں کہ یہ پیدا ہوئی کہ میرزا غلام احمد قادیانی کون بزرگ ہیں کیوں نہ قادیان جا کر ان سے جان پہچان پیدا کی جائے۔ پیدل چل کر وہاں میرزا صاحب کے گھر جا پہنچے۔ میرزا صاحب کے رہن سہن میں ابھی احتشام والی بات نہ آئی تھی۔ بہت ہی سادہ مکان میں رہتے تھے۔ وہاں آنگن میں غلام اکبر خاں صاحب نے اپنی آمد کی وجہ بیان کی۔ میرزا نے اس نوجوان کو شفقت کی نظر سے دیکھا اور پوچھا کہ میاں غلام اکبر خاں بڑے ہو کر کیا کام کرنے کے ارادے ہیں۔ انھوں نے بتایا کہ ان کی مرضی پولیس کی نوکری کے لیے عرضی دینے کی ہے۔ میرزا نے فرمایا، تم ہمارے پاس آ کر رہو۔ یہ کہہ کر میرزا صاحب کسی ضرورت سے اندر گئے، واپس آئے تو پوچھا، کہو پھر کیا نیت ہے۔ ہمارے پاس آتے ہو یا نہیں؟ انھوں نے جواب دیا "جی اسی پولیس کی نوکری کا خیال ہے۔

احمدیت کے پرچار کے پھیلنے کے بعد جب میرزا صاحب کا شہرہ سارے ملک میں ہوا تو میرزا صاحب غلام اکبر خاں کو بھولے نہیں۔ حکیم نورالدین اور میرزا بشیرالدین محمود نے بھی یہ تعلق قائم رکھا۔ لاہور کے ایک سیاسی ہیجان میں غلام اکبر خاں صاحب اپنے فرائض کی بجا آوری میں زخمی ہوئے تو میرزا بشیرالدین محمود ہسپتال میں ان کی عیادت کو آئے۔

قادیان کے سالانہ جلسے میں عاشق صاحب اکثر حاضر ہو جاتے کہ وہاں ان کے ملاقاتیوں میں بعض بڑے زندہ دل لوگ بھی موجود ہوتے۔ سب لوگ جانتے ہیں کہ علامہ اقبال کے برادر احمدی تھے، مولانا محمد علی جوہر کے بھائی ذوالفقار علی جوہر نے بھی احمدیت قبول کی تھی، چودھری ظفراللہ خاں صاحب سے عاشق صاحب کے دیرینہ مراسم تھے جن کو دونوں کے قیام انگلستان کے زمانے میں دوام رہا۔

پچھلے ہفتے اعجاز حسین بٹالوی کہہ رہے تھے کہ اگر تاثر میں آ کر غلام اکبر خاں میرزا صاحب سے بیعت کر لیتے تو سارے خاندان کی کہانی کا رخ کچھ اور ہو جاتا۔

قادیان سے یہ تعلقات ظاہر ہے کہ بٹالہ کے نزدیک ہونے کے باعث تھے۔ بٹالے کا تھانیدار اور وہ بھی ایسا رنگین مزاج اور صاحبِ گفتار اور بذلہ سنج ظاہر ہے کہ بٹالہ سے گزرتے ہوئے بہت سے اہلِ ذوق غلام اکبر خاں صاحب سے ملتے آتے۔ ان کی ذات ہی ایسی پرکشش تھی۔

کوتوالی کے فرائض درشتی سے خالی کیسے ہوں۔ غلام اکبر خاں صاحب کی زبان پر دشنام تکیہ کلام بن کر چڑھی ہوئی تھی غنڈے مجرموں سے جرم کا اقرار کرانا بغیر دشنام کے کہاں ہوتا ہے۔ سنتے ہیں کہ جب ان کے فرزندِ اکبر ذوالقرنین صاحب بھی تھانیدار ہوئے تو بیٹے کے اطوار کی یہ بات باپ کی سمجھ میں نہ آسکی کہ تھانیدار ہوتے ہوئے بھی یہ نیک بخت گالی زبان پر کیوں نہیں لاتا۔

علامہ اکبر خان صاحب کی بزم تھا نیداری میں حاضری دینا ہم کو نصیب نہ ہوا لیکن راقم کو اندازہ ہو گیا کہ گفتگو کا طنز
عاشق صاحب نے باپ سے ورثے میں پایا۔

زندگی کے اواخر میں عاشق صاحب گفتگو کے متحمل ہونے سے جاتے رہے۔ صرف قصہ گوئی باقی رہ گئی۔ اپنے ہی تجربا
کے قصے حافظے سے نکال کر بیان کرتے۔ تُندمزاجی اور ایثار کا سا بہاؤ اس قصہ گوئی میں پایا جاتا۔ جملوں کے درمیان و
کا ایسا فقدان رہتا کہ سننے والا ہار کر اپنی کچھ کہنے کا ارادہ چھوڑ دیتا لیکن ان کی جوانی کے دنوں میں یہ انداز نہ تھا۔ اس
میں مولانا صلاح الدین احمد، ڈاکٹر محمد اشرف، باری علیگ اور ڈاکٹر سیف الدین کچلو سے نارمل گفتگو کی بیڈمنٹن کھیلنا
برمحل شعر، لطیفہ، پھبتی، تاریخی قصص، معاصرین کے احوال، معصوم غیبت، مشاعروں کی روداد، تازہ خبروں کے تبصر
سیاست کی گپ۔ اپنے دوستوں کی صحبت میں ان سب باتوں کا لطف اٹھاتے۔ شعر کا حافظہ ان کا بے حساب تھا۔ غرض کہ
مچاکر نہایت زندہ دلی کا ثبوت دیتے۔ وکالت کے کام کی طرف کما حقہٗ ان کا دھیان نہ تھا۔ خوباں کے ناز اٹھانے کا ان کو یا
نہ تھا۔ تجرّد کی شان ان کے ہاں ویسی ہی نمایاں تھی جیسی بابائے اردو مولوی عبدالحق کے ہاں۔ یا شاہ غوث علی قلندر کے ہا
باوجود یار باشیوں کے ان کے اندر ایک تنہائی کی پہنائی تھی۔ دنیا داری سے ان کو وحشت ہوتی تھی۔

ان کا شباب کے عہد کا اشتغال بھی معروف تھا۔ گھر میں اس کے مظاہرے گھر والے جانیں۔ میں نے ایک روز ان
اشتعال لاہور کی نگینہ بیکری میں دیکھا۔ مولانا صلاح الدین احمد، باری علیگ اور خاکسار چائے پی رہے تھے کہ ڈاکٹر
عبداللہ داخل ہوئے اور بیٹھ گئے۔ یکایک عاشق صاحب سید عبداللہ پر برس پڑے۔ سب ششدر کا سہم کر رہ گئے۔ سید صاح
کو باتوں باتوں میں انھوں نے بہت کچھ کہہ ڈالا۔ لاہور کے علمی اور ادبی حلقوں میں بہنوں کی آپس میں ٹھنی رہتی۔ خدا جانے
عاشق صاحب کی اس برہمی کے پیچھے کیا قصہ تھا۔

گفتگو اونچے سُر میں کرتے۔ احتجاج اور جھلاہٹ کی گونج ان کے بیان میں برابر رہتی۔ گفتگو کرتے اور قصہ
سناتے ہوئے مسلسل قہقہہ لگاتے چلے جاتے۔ یہ قہقہہ گاہے بشاشت کے رنگ میں ہوتا اور کبھی زہرخند ہو کر دردِ پنہاں کی غما
کرتا ہستی کی ستم ظریفی کا احساس ان کو شدت سے تھا۔

ان کی اپنے ہی انداز کی تمکنت اثر کیے بغیر نہ رہتی۔ خدا نے ان کو چہرہ ہی ایسا دیا تھا، اس پر آنکھیں ایسی سیمابی کہ آ
چپ بھی ہوں تو کچھ نہ کچھ ماجرا آنکھوں میں جھلکے جائے۔ گردن میں ان کی ضد کے ساتھ قلندرانہ جھٹک تھی جو خرافات سے منہ
لینے کا انداز تھا اور یوں بھی لگتا تھا کہ نا جنس اور ہم خیال کی پہچان اور معقول اور نامعقول کی پرکھ میں لگے رہتے ہیں۔
لطیفے اور اچھے شعر پر پھڑک کر رہ جانا ان کا دیدنی تھا۔

اُٹھنے بیٹھنے اور بولنے کے انداز تو کوتوالی تھے ہی۔ چال بھی ان کی نرالی تھی، قدم زن چال ہر ایک کی نہیں ہوتی۔ ان
پاؤں زمین پر یوں پڑتا جیسے زور بڑہان کا ہتھوڑا۔ اور دیکھنے والے کو یوں بھی لگتا کہ دھرتی کو ٹھکرانے پر آمادہ ہو رہے ہیں
جب چلتے اترا کار کے بانکپن کے ساتھ چلتے۔ سر پر ٹوپی نہ ہوتی لیکن کج کلاہی پھر بھی محسوس ہوتی۔ چال ایسی تھی کہ گو دیکھنے میں تو
سامنے سیدھ میں اٹھتا ہے لیکن کچھ یوں کہ گویا دائیں کو ایک من مانے ترچھے حساب سے بھی رواں ہیں۔ آرٹسٹ والی لہک حرکا

مسلسل رہتی۔ اگر کوئی پوچھے کہ وہ کس فن کے آدمی تھے تو جواب یہ ہے کہ وہ گفتار کے کلاکار تھے اور اس پر نازاں تھے، حجام
بنی سے بیگانہ، پشتِ سر کے بال اپنے حال پر چھوڑ رکھتے تھے۔ کلاکار کا حلیہ بنا رکھا تھا۔

ماڈل ٹاؤن میں ان کے ایک بٹالوی ہمسائے کے ہاں شادی کی تقریب تھی۔ اعجاز نے مجھے بھی دعوت دی۔ وہاں
پر مہمانوں کے درمیان عاشق صاحب کو پورے ایکٹر کے رنگ میں دیکھ کر میں محظوظ بھی ہوا اور حیران بھی۔ خدا جانے انھیں
سوجھی کہ دیسی ٹوپی نہیں بلکہ ٹوپ ہیٹ پہنے ہوتے ہیں اور ساتھ ہی ٹیل کوٹ اور پتلون۔ عین مین لارڈ بٹالوی بن کر میزوں
درمیان گھوم پھر رہے ہیں۔ اسی ہئیت میں سہرا سن رہے ہیں۔ لباس کے انتخاب کی تہ میں تفنن اور استہزا اور مسخرگی، لیکن بظاہر
سنجیدہ نظر آرہے ہیں۔ اب سوچتا ہوں تو گمان ہوتا ہے کہ ازدواج کی ہنسی اڑا رہے تھے۔

سیاست کی نئی بساط سے بالکل بیزار ہو کر لندن کو نکل گئے۔ وہاں روزی کی صورت کیسے ہوئی، بھائیوں کی امداد
ان سے کس قدر ملتی رہی یہ پہیلی ہے۔ تیاگ اور بیکسی زیادہ اور دنیوی آرام کم۔ اسی طرح زندگی کے یہ آخری سال
میں گزار گئے۔ لندن میں کن اصحاب سے ملنا جلنا تھا اس کا مجھے علم نہیں۔ بی بی سی کے اس شعبے میں ان کا آنا جانا البتہ
کو معلوم ہے جس میں اردو پروگرام مرتب ہوتے تھے۔ برٹش میوزیم کی لائبریری سے اپنے مطلب کے نوادرات نکال کر
دستان کے ماضی کی وادیوں کی سیر کیا کرتے۔

پاکستان بننے سے پہلے لاہور میں عاشق صاحب پطرس بخاری کے حلقۂ اثر سے الگ تھلگ ہی رہے۔ ایک زمانہ
جانے کے بعد جب بخاری صاحب کو اقوام متحدہ کے دفتر اعلیٰ (واقع نیویارک) میں منصب ملا تو ایک بار امریکہ سے پاکستان
ہوئے لندن میں رکے اور عاشق صاحب کو وہاں ڈھونڈ نکالا اور ایک پورا دن ان کے ساتھ گزارا۔ ملتے ہی پطرس نے
یہ پوچھا، کس حال میں ہو؟ عاشق صاحب نے آہ بھر کر اقبال کا شعر پڑھ دیا ؎

میں نوائے سوختہ در گلو تو پریدہ رنگ رمیدہ بو
میں حکایتِ غمِ آرزو تو حدیثِ ماتمِ دلبری

کو اقبال کے ہاں بیسیوں دفعہ حاضری کی سعادت حاصل تھی اس لیے اس شعر نے پطرس کی آنکھوں کو اشک آلود کر دیا
ملاقات کا ذکر عاشق صاحب نے کئی دوستوں سے کیا۔

میں ادھر امریکہ میں سر چھپائے بیٹھا تھا اور وہ لندن میں زاویہ نشین تھے۔ مجھ کو آج سے بیس بائیس برس پہلے انھوں نے
سے خط لکھے۔ بعض تو صرف پرسشِ احوال اور بات چیت کی خواہش سے اور بعض کسی امرِ ضروری کے سلسلے میں۔ ایک خط
نا ایک خاص راز بھی لکھا۔ اس ہدایت کے ساتھ کہ اسے اپنے تک ہی رکھنا۔

چودھری ظفر اللہ خاں صاحب نے ان کی بیکسی دیکھ کر اپنی آپ بیتی (بزبانِ انگریزی) کا کاپی رائٹ ان کو
دے دیا تھا۔ اردو میں چودھری صاحب کی آپ بیتی بعنوان "تحدیثِ نعمت" ۱۹۷۱ء میں ڈھاکا سے شائع ہوئی۔
ضخیم کتاب کا نصف اوّل خاصا دلچسپ ہے۔ نصف ثانی میں بے تکلفی کی ہلکی پھلکی باتیں مفقود ہیں۔ ان کی انگریزی والی
بی ایک الگ "تصنیف" ہے جس کا "تحدیثِ نعمت" سے کوئی تعلق نہیں۔ ہوا یوں کہ ایک زمانے میں جب نیویارک

کی کولمبیا یونیورسٹی میں پاکستان انسٹی ٹیوٹ قائم ہو چکی تھی۔ چودھری صاحب اس میں درس دیا کرتے تھے۔ وہاں دو پروفیسروں نے آپ سے کہا کہ ہمارے آپ کے درمیان مکالمہ ہوا کرے۔ ہم آپ کے سوانح حیات کی باتیں آپ سے پوچھ جائیں، آپ جواب دیتے جائیں۔ یہ سب کچھ ٹیپ ریکارڈ کر لیا جائے گا۔ اور پھر ایک سکریٹری مکالمے کو ٹائپ کر ے اور یوں آپ بیتی تیار ہو جائے گی۔ ٹیپ کا ٹائپ بننا کئی سال ملتوی رہا۔ بالآخر جب مکالمے کے کچھ حصے ٹائپ ہو چکے تو چودھری صاحب نے کتاب کا کاپی رائٹ عاشق صاحب کے نام کر دیا۔

عاشق صاحب نے مجھ کو لکھا کہ جمال عبدالناصر کی آپ بیتی کی رائلٹی ایک ناشر نے دس لاکھ ڈالر (یا پاؤنڈ) دی ہے۔ چودھری صاحب کا مرتبہ اس سے کیا کم ہے۔ ان کی آپ بیتی کی رائلٹی ایک لاکھ ڈالر سے کم نہیں ہونی چاہیے۔ امریکا اس کتاب کے لیے کسی ناشر کو راضی کرو۔ میں نے لکھا کہ نمونے کو پہلے دو تین باب مجھ کو بھیجیے، دیکھیں تو سہی پیرایۂ بیان کیسا ہے۔ طویل انتظار کے بعد بالآخر وہ باب موصول ہوئے۔ مجھے تو بالکل بے جان لگے۔ چودھری صاحب کی اردو آپ بیتی کے پہلے ابواب میں کچھ گھریلو احوال اور کچھ محبت اور رقّت کی باتیں بھی ہیں لیکن انگریزی کے اس مکالمے میں پبلک انٹرویو والی رسمیت محسوس ہوئی اور طبیعت مایوس ہوئی۔ سمجھ میں نہ آتا تھا کہ عاشق صاحب کو لکھوں تو کیا لکھ

انہی دنوں اس کتاب کی اشاعت کا مسئلہ چھوڑ کر انھوں نے لکھنا شروع کیا کہ امریکہ میں ان کے لیے کسی عا پروفیسری کی کوشش کی جائے۔ میں نے دو تین یونیورسٹیوں کو لکھا۔ ایک یونیورسٹی نے ان کو بطور "مہمان پروفیسر" کی حامی بھر لی۔ یہ مراسلت جاری تھی کہ عاشق صاحب کا ایک خط آیا۔ اس میں لکھا تھا کہ صدر مملکت فیلڈ مارشل خاں صاحب نے ان کو ایک اعزاز کے لیے پاکستان تشریف لانے کی دعوت دی ہے اور ان کو وظیفہ دے کر تاریخ پاک لکھنے کا کام سونپا جائے گا۔ اور وہ وہیں پاکستان میں قیام کرنے کا ارادہ رکھتے ہیں۔ بعد میں معلوم ہوا کہ اعزاز کی الطاف گوہر صاحب کی سفارش سے ہوئی تھی۔ چنانچہ امریکہ آنے کا ارادہ ترک ہو گیا۔ فیلڈ مارشل صاحب سے ان کی دوستی کا آغاز!

۱۹۷۱ء میں ان سے میری مراسلت زوروں پر تھی کہ مجھے لندن کے جشنِ فنونِ لطیفۂ اسلامیہ کے پروگرام کا دعوت نامہ آیا۔ میں نے عاشق صاحب کو اطلاع دی۔ انھوں نے بڑی گرم جوشی سے لکھا کہ آؤ، آؤ، تمہارا انتظار

لندن میں جشن کے میزبانوں نے میرے ٹھیرنے کا انتظام ایک ہوٹل میں کیا تھا۔ یہ ہوٹل اس علاقے میں ہے جسے (QUEENSWAY) کہتے ہیں۔ عاشق صاحب کی رہائش بھی اتفاقاً اسی علاقے میں تھی۔ ہوٹل میں اپنا سوٹ کیس رکھ کر ٹہلنے نکلا کہ دیکھوں عاشق صاحب کا چوبارہ کدھر ہے۔ سو دو سو قدم ایک سمت کو چل کر میں نے ان کے پتے کی پرچی ایک کو دکھا کر پوچھا کہ یہ مکان کدھر ہے۔ اس راہی نے کہا کہ جدھر سے آ رہے ہو اُدھر ہی پلٹ جاؤ۔ یہ نمبر دور نہیں غور سے دروازوں پر نمبر پڑھنے شروع کیے۔ جلد ہی عاشق صاحب کے گھر والا نمبر آ گیا۔ میں حیران رہ گیا کہ اگر ہوٹل کے دروازے سے سڑک کے آرپار ایک خطِ مستقیم کھینچیں تو اُدھر عاشق صاحب کی رہائش گاہ کا ہے۔ میں نے وہاں جا کر معلوم کیا کہ ان کا فلیٹ دوسری منزل پر ہے۔ دروازے پر ان کے نام کا کارڈ چسپاں دیکھ کر باغ باغ ہوا۔ دروازہ کھٹکھٹایا، جواب ندارد۔ پھر کھٹکھٹایا۔ دو تین منٹ ایسا کیا۔ جواب نہ پا کر ایک نوٹ لکھ

یٹ کے بیچ درز میں اسے اڑس دیا۔ چلنے سے پہلے خیال آیا کہ ممکن ہے عاشق صاحب کے ثقلِ سماعت کی وجہ سے جواب ملنے
دقت ہو رہی ہو۔ اب کے میں نے دروازہ بڑے زور سے کھٹکھٹایا، واقعی عاشق صاحب اندر موجود تھے۔ دروازہ کھلا اور
کر ملے۔ کیا بیان کروں کہ کھلے دروازے سے مجھے ان دھلے جوٹھے برتنوں کا ایک ڈھیر دکھائی دیا جو کئی روز سے جمع ہو رہا تھا۔
پس خوردہ کی ایسی بھبک اندر سے آئی کہ کیا کہوں۔ تھوڑی دیر اندر جا کر بیٹھا۔ میں نے کہا کہ حسنِ اتفاق سے ہوٹل عین سامنے
وہاں لاؤنج میں کیوں نہ چل بیٹھیں۔ کپڑے بدل کر میرے ساتھ ہو لیے۔ وہاں دو تین گھنٹے باتیں ہوئیں۔ مجھے لندن میں ایک
ٹھہرنا تھا۔ سات دنوں میں سے چار روز عاشق صاحب کے ساتھ گزارے، گویا چمٹ ہی گئے۔ چار دنوں میں بہت قصّے سنے
ول شعر برمحل سنے۔ گفتگو ان کی میری ظاہر ہے کہ برابر پنجابی ہی میں ہوئی۔ ایک روز آہ بھر کر بولے۔ "داؤد صاحب اسانوں
شعر نے بچا لیا"، یعنی ہمیں تو شعر نے بچا لیا ورنہ مر ہی گئے ہوتے۔

ہوٹل کے لاؤنج کی طویل نشستوں کے درمیان میں ان کی قصّہ گوئی کو بالآخر ٹوک کر عرض کرتا، چلیے کچھ چہل قدمی
اور پھر کہیں چل کر چائے پی جائے۔ ان کی قصّہ گوئی ٹہلتے ٹہلتے بھی جاری رہتی۔ قصّے میں کوئی زوردار مسئلہ یا واقعہ آ جاتا
ٹھ پر زور کا دھپّا مار دیتے۔ پھر جوش میں آ کر روک لیتے بلکہ میرا راستہ روک کر سامنے روبرو کھڑے ہو جاتے اور تقریر پر
رکھتے۔ ٹائی پکڑ لیتے۔ پھر سے روانہ ہوتے تو میرا بازو گرفت میں لے کر جکڑ لیتے۔ دلیل پر آتے تو اسے چلّا کر پیش کرتے۔
وراں پر پہنچ کر ہم چائے پینے کو بیٹھ جاتے تو گفتگو کرتے ہوئے میرے میز پر رکھے ہوئے ہاتھ پر اپنا ہاتھ پورے دباؤ
ساتھ جما دیتے اور منتظر رہتا کہ میرے ہاتھ کو کب آزاد کریں گے۔ جونہی ہاتھ آزاد ہوا میں نے پیش بینی سے اپنے دونوں
میز تلے اوجھل کر دیے۔

جشن فنونِ لطیفۂ اسلامیہ کے پروگرام میں پروفیسر این مری شمل کا لیکچر مولانائے روم پر تھا۔ میں عاشق صاحب
ساتھ لے گیا۔ بولے کہ دروازے کے پاس ہی رہنا چاہیے کہ اکتاہٹ ہو تو چپکے سے کھسک کر باہر نکل جائیں دروازے کے
دیوار کا سہارا لے کر کھڑے ہو گئے۔ پانچ سات منٹ بعد نہایت بیزاری سے بلند آواز میں مجھ سے کہا چلیں، سخت
رہی ہے۔ حسبِ حاضرین نے یہ جملہ سنا، مجھ کو سخت خفت ہوئی۔ لیکچر کے آخر تک میں وہاں سے ٹلا نہیں۔ یہ سارا وقت
بن رہے۔

جشن کے پروگراموں میں سب سے پُرکیف قونیہ کے درویشوں کا رقص تھا۔ مولانائے روم کے مزار کے زیرِ سایہ
قاروں اور رقّاصوں کا ایک طائفہ رہتا ہے۔ ترکی کی گورنمنٹ کی طرف سے اس طائفے کو وطن سے باہر مظاہرات کی اجازت
۔ اوّلاً حکومتِ فرانس بڑی کوشش کے بعد اس طائفے کو پیرس بلانے میں کامیاب ہوئی۔ لندن کا یہ جشن اس طائفے
رلی مظاہرے کا دوسرا موقع تھا۔ لندن کے شائقین شرق اُمڈ کر ان درویشوں کا رقص دیکھنے آئے جو مولوی معنوی کی
روحانی کا آئینہ دار ہے۔ جلسۂ رقص کی کامیابی کی خوشی میں اس کے بعد منتظمیں ایک ریستوراں میں ڈنر کے لیے جمع
۔ ان میں استاد محمود میرزا ستار نواز بھی شریک تھے۔ پروفیسر شمل اور خاکسار بھی مدعو تھے۔ عاشق صاحب سارا دن
ساتھ ہی رہتے تھے۔ میں نے محمود میرزا صاحب سے کہا کہ ڈاکٹر عاشق حسین صاحب کو بھی اس ڈنر میں شریک کیا جائے انھوں نے

بڑے تپاک سے کہا، ضرور۔

ڈنر کی میز کے گرد گفتگو جستہ جستہ موضوعات پر ہونے لگی۔ عاشق صاحب نے بیسویں صدی کے ہندوستان کے دوا سیاسی قصے چھیڑ دیے لیکن ان کی قصہ گوئی میں ایسی طوالت تھی کہ شرکائے ڈنر نے ان کی باتوں سے کان ہٹا کر دوسری باتیں شروع کر دیں۔ عاشق صاحب ماضی میں کھوئے ہوئے تھے کہ قصہ کہتے ہی چلے گئے۔ کوئی سُنے یا نہ سُنے، بلند آواز سے بولتے چلے جا رہے ہیں۔ قصے کے ساتھ قہقہہ بھی مسلسل ہے۔ انھوں نے رک کر اور ٹوک کر کسی سے شکوہ نہ کیا کہ بدتمیزو، تم میری نہیں سُن رہے ہو، اپنی باتیں کیے جا رہے ہو۔

امریکہ واپس آکر میں نے محبی اعجاز حسین بٹالوی کو خط لکھا کہ از برائے خدا بھائی عاشق کو لاہور بلالو، ان کا حال اچھا نہیں۔ اعجاز نے جلد ہی ان کو لاہور بلوالیا۔ دو سال بعد بیزار ہو کر پھر لندن چلے گئے۔ تاہم بیچ بیچ میں لاہور کے چکر بھی انھوں نے لگانے شروع کر دیے۔

لندن کی ان ملاقاتوں میں ان سے جو کتھا سنی اس میں سے دو چار باتیں یاد رہ گئی ہیں۔ ایک روز اپنے بھا اعجاز کو یاد کر کے فرمایا۔ "اعجاز میں جو خوبیاں ہیں وہ ہم میں سے کسی بھائی میں نہیں" ایک اور موقع پر فرمایا۔ "لاہور میں جگت کے سوا ہمارا مشغلہ ہی کیا تھا۔ اس مشغلہ سے زیادہ معصوم مشغلہ بھلا اور کیا ہو سکتا ہے!" ایک روز مجھ سے پوچھا مولانا صلاح الدین احمد کے اسلوبِ تحریر کے بارے میں تمہارا کیا خیال ہے؟ میں نے کہا۔ "سجا کر پیش کرتے ہیں" اس بے اختیار ہنس پڑے۔

اپنے منتشر کاغذوں کے ڈبوں میں تلاش کروں تو عاشق صاحب کے بہت سے خطوط ملیں گے۔ آخری خط انھوں نے اس سال مارچ کے اخیر میں مجھے لکھا، یوں ہے۔

83 F

MODEL TOWN

29.3-1989

ڈیر داؤد رہبر صاحب، السلام علیکم

مدتیں گزر گئیں آپ سے سلام، پیام، کلام (اور ہائے کس منھ سے کہوں کہ دشنام تک) کا سلسلہ بند ہے۔ یہ پیت کرن کی ریت نہیں۔

میں ۱۷ جنوری کو یہاں آیا تھا۔ اگلے مہینے یعنی اپریل کے شروع میں واپس لندن جانے کا ارادہ ہے۔ جاڑوں میں تین مہینے کے لیے یہاں آجاتا ہوں تاکہ خاکِ وطن سے کچھ رشتہ برقرار رہے۔ آپ کی خدمت میں یہ عریضہ لکھنے کی ایک خاص وجہ ہے۔ انگلستان میں ایک مشہور مصنف SIR WILLIAM ROTHENSTEIN گزرے ہیں جو علامہ اقبال کے دوست تھے، ان کے صاحبزادے SIR JOHN ROTHENSTEIN لندن کی ٹیٹ گیلری کے ڈائرکٹر کی حیثیت سے ریٹائر ہوئے تھے، اب وہ بھی فوت ہو چکے ہیں۔ انھوں نے بتایا تھا کہ اقبال کی ان کے

والد یعنی سر ولیم سے باقاعدہ خط و کتابت رہتی تھی۔ اور اقبال کے یہ تمام خطوط امریکہ کی ایک لائبریری میں محفوظ کرا دیئے گئے ہیں۔ لائبریری اور اس کے انچارج کا پتا یہ ہے۔

W.H. BOND

HOUGHTON LIBRARY

HARVARD UNIVERSITY, MASS

اگر آپ کوشش کر کے اقبال کے خطوط کی فوٹو کاپیاں حاصل کر کے میرے پاس بھجوا سکیں تو ممنون ہوں گا۔ میں چونکہ اپریل کے پہلے ہفتے میں واپس لندن جا رہا ہوں اس لیے اس عریضے کا جواب لندن ہی کے پتے سے دیجیے گا، یعنی

15 MEADOW HOUSE

PENYWERN ROAD

LONDON SW 5

امید ہے آپ کا مزاج بخیر ہوگا۔

عاشق حسین بٹالوی

عاشق صاحب کا یہ خط ملنے پر میں نے اپنے دوست ڈاکٹر نعمان الحق صاحب کو زحمت دی کہ وہ ہارورڈ کی اس لائبریری سے علامہ اقبال کے خطوطِ متذکرہ کے فوٹو حاصل کر کے عاشق صاحب کو بھیج دیں۔ نعمان صاحب فوٹو حاصل کرنے میں کامیاب ہوئے اور لندن بھیجنے کا ارادہ کر ہی رہے تھے کہ عاشق صاحب کے فوت ہونے کی خبر آئی۔ نعمان صاحب سے درخواست کی کہ فوٹو اپنے ایک نوٹ کے ساتھ "قومی زبان" کے ایڈیٹر صاحب کو اشاعت کے لیے بھیج دیں۔ امید ہے کہ وہ جلد ہی مرحوم عاشق صاحب کی یہ امانت ان کے شیدائیوں تک پہنچا دیں گے۔

عاشق صاحب کی انتقال کی خبر نیو یارک سے ان کے بھائی آغا بابر صاحب نے مجھ کو ٹیلیفون پر سنائی اور ایک خط بھی لکھا جس کی نقل پیش کی جاتی ہے:

July 22, 89

عزیزم داؤد رہبر، سلامت

گھر میں ہم بھائی عاشق کو آقا جان کہتے تھے۔ آقا پیارا کا نام میری والدہ نے دیا تھا۔ پھر سارا گھر آقا جان کہنے لگا یہ داستان پایان کو پہنچی۔ یہ ستارہ بھی ٹوٹا۔

مجھ سے تم بہتر جانتے ہو۔ بھائی عاشق گفتگو کے مشّخص تھے۔ جب وہ گفتگو کی عنان ہاتھ میں لے لیتے پھر رنگ باتیں کرتے اور بات سے خوشبو آئے، گفتگو کا فن انھوں نے آپا جی سے سیکھا تھا۔

ہم لکھنے والے بھائیوں کے میرِ قافلہ بھائی عاشق تھے۔ ان کا ذوقِ حیات کبھی مضمحل نہ ہوا۔ لذتِ یکتائی

جذبۂ پیدائی ان کا مولو سا ع شمع ہر رنگ میں جلتی ہے سحر ہونے تک
نعمان کو میرا سلام پیار آداب کہنا۔ اس سے لے کر اُن خطوط کی ایک ایک نقل مجھے بھجواؤ۔ میں اعجاز کو ارسال کر دوں گا۔ دیکھوں اُن خطوط میں علامہ اقبال نے سر ولیم کو کیا لکھا تھا۔

راقم

آغا بابر

میں نے اعجاز بٹالوی کو تعزیت کا خط لکھا، اس کی نقل ملاحظہ ہو:

DEPARTMANT OF RELIGION

BOSTON UNIVERSITY

BOSTON, MASS 02215

۲۴ جولائی ۱۹۸۹ء

محبّی اعجاز! بھائی بابر نے بھائی عاشق کی وفات کی خبر سنائی۔ اللہ مرحوم کی روح کو راحت میں رکھے۔ آپ سب بھائیوں میں تیغری وہی کر گئے۔ ان کی ہجرت کے اسباب کا مجھ کو وجدان نہ ہوگا تو کیسے ہوگا۔ نہ گھر بسایا نہ نوکر ہو کر سر جھکایا۔ تم نے ان کی آخری سالوں میں خبر گیری اور تیمار داری سے ثواب کمایا۔

وہ تقسیم ہندوستان سے پہلے کی شخصیت تھے۔ تقسیم کے بعد ان کی جولانگاہ تنگ ہو گئی۔ انھوں نے جو کچھ لکھا وہ اسی دور کی کہانی ہے۔

۱۹۷۱ء میں میں ایک ہفتے کے لیے لندن میں تھا۔ ان کے ساتھ چار روز گزارے۔ اسی ہفتے کے درمیان ایک روز اتفاق سے وہ فٹ پاتھ پر کہیں جا رہے تھے اور میں ایک بس پر سوار تھا۔ میں نے ان کے انداز کو دیکھا۔ لندن کی خلقت سے بے تعلق اپنے خیال میں مگن صرف اپنے آگے کی گز بھر زمین دھرتی کے ایک گز پر نظریں جمائے چل رہے تھے۔ اجنبیوں کی طرف آنکھ اٹھا کر دیکھنے کی انھوں نے گویا قسم کھا رکھی تھی۔ دھیان سب دور دراز کے ماضی کی طرف تھا۔

تقسیم سے پہلے موڈل ٹاؤن کے کلب گھر میں مقامی مسلم لیگ کا ایک جلسہ ہم نوجوانوں نے برپا کیا تھا۔ اس کی صدارت ڈاکٹر عمر حیات ملک نے فرمائی۔ شاید اس جلسے میں تم شریک نہ ہو سکے۔ بھائی عاشق اس شام خطیبِ خصوصی تھے۔ خطاب کا انھوں نے وہ سماں باندھا کہ سب دم بخود بیٹھے تھے۔ عین بیچ میں اُدھر سے مغرب کی اذان گونجی تقریر کو بریک لگی۔ اعلان ہوا کہ بعد نماز تقریر کی ریل گاڑی پھر سے روانہ ہوگی۔ لیکن بھائی عاشق وہاں سے بات ادھوری چھوڑ کر چل دیے۔ اذان ختم ہوتے ہی حفیظ جالندھری سامعین کی صفِ اوّل سے اٹھ کر آگے بڑھے اور بھائی عاشق کو گلے لگا کر بولے "یار، بہت بولے ہو!"

ان کی یادگار میں اگر کوئی خاص نمبر نکلے تو اس کی خبر مجھ کو کرنا تاکہ اس کے لیے کچھ سطور لکھ کر بھیجوں۔ میرے پاس ان کے بہت سے خطوط ہیں، ڈبوں میں تلاش کروں تو ملیں گے۔

غمگسار

داؤد رہبر

ڈاکٹر الیاس عشقی

دُو کے عدد کی ارتقائی تاریخ

ڈاکٹر شوکت سبزواری مرحوم نے اپنے تحقیقی مقالے "اردو زبان کا ارتقا" میں اعداد کی تحقیق کے سلسلے میں "دُو" کی تاریخ پر اس طرح روشنی ڈالی ہے۔

(۲ "دُو" قدیم ہند۔ ایرانی میں "دُوَ" تھا فارسی اور پراکرت میں "دُو" ہے سنسکرت میں "دوو" بھی "دُو" ہی تھا ۔ تثنیہ کی علامت ہے۔ ترکیب کی حالت میں صرف "دُ" رہ جاتا ہے جیسے "دُپٹہ"، "دُدھاری" اور کبھی "واؤ"، "ب" سے بدل جاتا ہے جیسے بارہ (دوَرہ) تیئیس (دوتیس) بیالیس وغیرہ

لیکن میرے نزدیک تبدّل اصوات کے قانون (GRIMS LAW) کا یہ عام استعمال ہے جس پر استعمال سے قبل غور وفکر کی ضرورت تھی جس کی ڈاکٹر سبزواری جیسے محقق سے امید کی جا سکتی تھی لیکن مناسب مواد کے زیرِ غور نہ ہونے کی وجہ سے ان کا قیاس محض اندازہ بن کر رہ گیا ہے۔

سندھی (اور سرائیکی۔ ملتانی) زبان میں دو کو "ٻہ" کہتے ہیں۔ یہاں ب کی آواز کو "ٻ" کی صورت میں ظاہر کیا گیا ہے اس لیے کہ یہ ب کی ایک مخصوص آواز ہے جو ب کی طرح PLOSSVIE (پھوٹ) نہیں ہے PLOSSVIE درحقیقت (EXPLOSSVIE) ہے جس کے تلفظ کے وقت ہوا منھ کے اندر سے باہر نکلتی ہے لیکن ٻ کے تلفظ میں (جو ب کا ایک مخصوص تلفظ ہے) آواز باہر سے منھ کے اندر جاتی ہے جیسے (IMPLOSSVIE) کہتے ہیں اس عمل میں ب کی آواز مل کر ٻ کی آواز ہو جاتی ہے۔ آوازوں کا "سیدھا" اور الٹا "پھوٹ" ہونا دونوں آوازوں کا بنیادی فرق ہے دو دُو زبانوں کے بنیادی صوتی نظام سے تعلق رکھتا ہے۔ یہ مخصوص تلفظ DRAVIDIANS دراوڑی یا PROTO DRAVIDIANS یا پھر پشاچی زبانوں کی واردی بولیوں کے اثر سے سندھی اور ملتانی زبانوں میں آیا ہے۔

اس کے اردو زبان میں (اور دوسری زبانوں میں بھی) آنے کی داستان دل چسپ ہے۔

تُلسی داس کی رامائن "رام چرتر مانس" کے مطالعے کے دوران ایک بار یہ عقدہ بھی اتفاق سے حل ہو گیا جب میری نظر اس مشہور چوپائی پر پڑی۔

دیکھن باگ کنور دوؤ آئے — بئی کشور سب بھانتی سہائے
شیام گور کمی کہوں بکھانی — گرا انین نین بنو پانی

ترجمہ: "باغ کی سیر کو دو راج کمار آئے ہیں دونوں ہی خوب صورت ہیں اور اچھے لگتے ہیں ایک سانولا ہے ایک گورا ہے (ان کے حسن کو کس طرح بیان کروں اس لیے کہ) زبان (جو بیان کر سکتی ہے) آنکھ نہیں رکھتی اور آنکھ (جو دیکھ سکتی ہے) زبان نہیں رکھتی۔"

یہاں پہلے شعر کے دوسرے مصرعے میں "بئی" کا تلفظ استعمال ہوا ہے جو دراصل (بہ ـ ئی) "دونوں ہی" ہے۔ تلسی داس نے پہلے مصرع میں "دوؤ" (دونوں) اور دوسرے مصرع میں (بئی) دونوں کو ساتھ ساتھ استعمال کیا ہے۔ گویا اودھی زبان میں یہ دونوں الفاظ رائج تھے اور ہیں لیکن دوٗ کا لفظ دوسری زبانوں کی طرح اودھی میں بھی زیادہ عام تھا اور یہ اس لیے ہوا کہ اودھی زبان سورسینی، وراچڈ اور داردی (پشاچی) زبانوں کے سنگم پر واقع تھی لیکن امتداد زمانہ سے ب کی مخصوص آواز ب کی عام آواز میں بدل گئی۔ یہ معنی دوٗ ایک زمانے تک شمالی ہند کی زبانوں میں رائج رہا اور پھر دوٗ نے اس کی جگہ لے لی اور ب۔ صرف گنتی میں باقی رہ گیا چنانچہ اب بارہ، بائیس، بتیس، بیالیس، باون، باسٹھ، بہتر، بیاسی اور بانوے کے اعداد میں یہ گواہی دے رہا ہے کہ جن زبانوں کے علاقے میں یہ اعداد رائج ہیں وہاں کبھی دوٗ کے معنوں میں بہ بھی رائج رہ چکا ہے اس لیے ڈاکٹر سبزواری مرحوم کا یہ قیاس کہ ب ـ د سے بدلا ہے گرم (GRIMM) کے قانون تبدل اصوات پر مبنی ہے، درست نہیں معلوم ہوتا بلکہ دوٗ اور بہ دونوں ہم معنی الفاظ جدا جدا زبانوں سے تعلق رکھتے ہیں اور دونوں کی کہانی جدا جدا ہے۔

میڈیلین چیپسل / شاہ نواز فاروقی

تحریر کے مقاصد

ژاں پال سارتر کے ساتھ ایک انٹرویو

س: میں ادب کے بارے میں آپ سے کچھ پوچھنا چاہتا ہوں!

ج: بہتر ـــــ اب مجھ سے کوئی شخص شاذ و نادر ہی ادب پر بات کرتا ہے۔ البتہ فلسفہ پر اکثر لوگ بات کرتے ہیں۔

س: سنا ہے آج کل آپ بہ یک وقت کئی منصوبوں پر کام کر رہے ہیں ـــــ مثلاً ملارمے اور TINTORETTO، فلوبیئر سے متعلق کتب پر، اس کے علاوہ آپ اپنی سوانح عمری بھی لکھ رہے ہیں۔ ان سب منصوبوں پر آپ بہ یک وقت کام کر رہے ہیں لیکن ان میں سے ابھی تک کوئی ایک کتاب بھی مکمل ہو کر شائع نہیں ہوئی۔ شاید آپ نے چاہا نہیں۔ کیا آپ اس صورتِ حال کی وضاحت کریں گے!

ج: جی ہاں! کیوں نہیں؟ مگر اس کا مطلب یہ ہوا کہ میں ادب کو ایک طرف رکھ کر فلسفہ پر بات کروں۔ دراصل گزشتہ پندرہ برسوں سے میں علم البشریات کی سیاسی بنیادیں رکھنے کی کوشش کر رہا تھا۔ یہ منصوبہ کینسر کی طرح پھیلتا چلا گیا۔ میرے ذہن میں خیالات آتے تھے مگر میں ان خیالات کے بارے میں تیقن کے ساتھ نہیں کہہ سکتا تھا کہ میں ان کا کیا کروں؟ چنانچہ میں ان خیالات کو کسی بھی اُس کتاب میں سمو دیتا تھا جس پر میں اس وقت کام کر رہا ہوتا تھا۔

البتہ اب میرا یہ کام پایۂ تکمیل کو پہنچ چکا ہے۔ میرے سب خیالات اپنی جگہوں پر فِٹ ہو چکے ہیں۔ اب میں ایک ایسے موضوع پر کام کر رہا ہوں جو مجھے ان خیالات سے چھٹکارا دلا سکے گا۔ میری مُراد CRITIQUE OF DIALECTICAL REASON سے ہے۔ اس کتاب کا پہلا حصّہ آیندہ ایک ماہ میں اور دوسرا حصّہ ایک سال کے اندر شائع ہو جائے گا۔ میں نے اب اپنی کتب میں اصل موضوع سے تجاوز یا انحراف کی ضرورت محسوس نہیں کروں گا۔ جیسا کہ میں اس سے قبل اپنی کتب میں فلسفے کا تعاقب کر کے کیا تھا۔ میرا یہ رجحان اب تابوت میں بند ہو جائے گا اور اب میں اپنے آپ کو مکمل طور پر خالی اور مکمل طور پر

پرسکون محسوس کروں گا۔ بالکل اسی طرح جس طرح میں نے BEING AND NOTHINGNESS کی تکمیل کے بعد محسوس کیا تھا۔ اندر سے خالی ہو جانے کی کیفیت ایک ایسی کیفیت ہے جو اگر کسی لکھنے والے کو حاصل ہو جائے تو وہ یقیناً خوش قسمت ہو گا۔ یہ ایک ایسا مرحلہ ہوتا ہے جب لکھنے والے کے پاس کہنے کو کچھ نہیں ہوتا اور وہ سب کچھ کہہ سکتا ہے، چنانچہ جب علم البشریات کی کتاب شائع ہو جائے گی تو میں کسی بھی پسندیدہ چیز کے بارے میں لکھ سکوں گا۔

سوال: کیا آپ کے کام میں فلسفیانہ خیالات کی نوعیت بنیادی ہے؟

جواب: بنیادی باتیں تو میں اب تک نہیں لکھ سکا ہوں۔ شاید آئندہ لکھ سکوں یا شاید کبھی بھی نہ لکھ سکوں ـــــ نظریاتی نوعیت کے سوالات کے ضمن میں کسی نمایاں پیش رفت کے لیے خاصے وقت اور جد وجہد کی ضرورت ہوتی ہے۔ چنانچہ اس تناظر میں آپ کہہ سکتے ہیں کہ میرے کام میں فلسفیانہ خیالات کی نوعیت بنیادی ہے، لیکن ایسا ہمیشہ نہیں ہوتا۔ مثال کے طور پر HAIS CLOS کے عنوان سے لکھے گئے میرے ون ایکٹ کے ڈرامے میں فلسفے کا ایک لفظ بھی شامل نہیں تھا۔ اس سے قبل BEING AND NOTHINGNESS شائع ہو چکی تھی، اور میں نہیں چاہتا تھا کہ اس کو میں دوسرے الفاظ میں دہراؤں ـــــ

ـــــ لیکن جب غیر فلسفیانہ تحریروں میں فلسفہ در آئے جیسا کہ میری تحریروں کے ساتھ گزشتہ دس برس سے ہو رہا ہے! اور جیسا کہ میں نے ابھی گزشتہ دنوں بھی محسوس کیا کہ میری ایک غیر فلسفیانہ تحریر میں فلسفہ آدھمکا ہے تو میں نے بہتر جانا کہ میں اس تحریر کو لکھنا ہی ترک کر دوں۔ شاید اسی لیے میری کئی کتابیں نامکمل ہیں۔ میں چاہتا ہوں کہ وہ مکمل ہو کر شائع ہو جائیں۔ البتہ اس طرح میری خواہش ہے کہ میں کوئی ایسا کام کروں جو اس کام سے مختلف ہو۔ سچ بات یہ ہے کہ ہر عمر رسیدہ لکھنے والے کا خواب ہوتا ہے کہ وہ کچھ مختلف لکھ سکے۔ ہر لکھنے والا یہ سوچتا ہے کہ یہ کچھ مختلف وہ کبھی نہیں لکھ سکے گا ـــــ البتہ وہ یہ بھی سوچتا ہے کہ اس نے مختلف کے سوا اور کچھ لکھا ہی نہیں۔ اس طرح وہ عریاں ہو جاتا ہے۔ میں نے ہمیشہ اتفاقی (OCCASIONAL) تحریریں لکھی ہیں لیکن وقت کی ضرورت کے تحت کبھی کسی سیاسی معاملے نے اور کبھی کسی اور واقعہ نے میری توجہ اپنی جانب مبذول کرائی ہے۔

DIALECTIC پر میری کتاب اتفاقی تحریر ہی کے ذیل میں آتی ہے۔ پولیش (POLISH) رسالے نے مجھ سے درخواست کی کہ میں وجودیت پر ایک مضمون لکھ دوں۔ میں نے لکھ دیا۔ پھر اسی مضمون کو میں نے ایک اور رسالے کے لیے لکھا تو مجھے احساس ہوا کہ مضمون کی بنیاد بے حد کمزور ہے اور اس کی منطق کا جواز اور احاطہ ثابت کرنے کی ضرورت ہے، چنانچہ میں نے وہ مضمون دوبارہ لکھا اور اب وہ مضمون ایک ضخیم کتاب کی صورت میں شائع ہونے والا ہے۔ مطلب یہ کہ خیالات تو موجود تھے مگر ہمت کی کمی تھی۔ بہرحال پولش رسالے کا آرڈر میرے لیے ایک قوت محرکہ ثابت ہوا۔

: کیا فلوبیئر کو زیرِ بحث لانے کے لیے آپ کو DIALECTIC پر لکھنا پڑا ہے!

جی ہاں! حقیقتاً پولش رسالہ کے لیے میں نے جو مضمون لکھا تھا اس میں بھی میں فلوبیئر کو زیرِ بحث لانے سے باز نہیں رہ سکا تھا۔ اس طرح فلوبیئر پر میری جو کتاب ہے CRITIQUE لکھتے ہوئے میں نے اس سے طویل پیراگراف لیے ہیں۔ فی الحال فلوبیئر پر میں جو کتاب لکھ رہا ہوں وہ بے حد طویل ہے اور ابھی تک نامکمل ہے، لیکن میرا خیال ہے کہ اس کتاب میں فلسفہ داخل نہیں ہوگا۔

اس طریقے سے کام کرنا کیا آپ کی خاصیت ہے!

میرا خیال ہے اس کا انحصار صورتِ حال پر ہوتا ہے۔ اس دور میں سب کچھ بدل گیا ہے۔ ہیگل کے زمانے میں تاریخ ایک المیہ کی صورت میں در آئی تھی۔ کیر کے گور کے زمانے میں جو دلوست ڈراما کی صورت اختیار کر گئی تھی۔ ڈیکارٹ نے ان درست اصولوں کی تلاش کی جو انسانی ذہن کی رہنمائی کر سکیں۔ اس سے علم اور اخلاقیات کی عقلی بنیادیں وجود میں آئیں۔

جب کہ آج!

آج کا فلسفہ اپنی نوعیت کے اعتبار سے ڈرامائی ہے۔ آج ایک متحرک آدمی کی تصویر کشی کے لیے ڈراما سب سے بہتر ذریعہ ہے۔ شاید اس لیے آج کا تھیٹر فلسفیانہ انداز اختیار کر گیا ہے اور فلسفہ ڈرامائی۔

اگر فلسفہ کو یہی کچھ ہونا تھا تو پھر آپ کے ادبی کام کا کیا جواز ہے۔ آپ اپنے کو فلسفہ تک کیوں محدود نہیں رکھتے!

جناب! میں اس وقت بھی ناول اور ڈرامے لکھنا چاہتا تھا جب مجھے معلوم تک نہ تھا کہ فلسفہ ہوتا کیا ہے۔ میں اب بھی یہی چاہتا ہوں۔ شاید میں نے پوری زندگی یہی چاہا ہے۔

اسکول کے زمانے سے!

اس سے بھی پہلے سے! جب میں اسکول میں پڑھتا تھا تو فلسفہ مجھے اس قدر بور لگتا تھا کہ میں اسے پڑھنا وقت کا زیاں تصور کرتا تھا۔ فلسفے کے بارے میں میرے اس رویّہ کی وجہ شاید اس زمانے میں فلسفہ پڑھانے کا انداز ہو۔

بہر حال کسی بھی صورت میں انسانی حقیقت کے بارے میں یہ تناظر INTER CHANGEABLE نہیں ہے فلسفہ بلاشبہ ڈرامائی ہو گیا ہے مگر یہ فرد کا فی نفسہٖ مطالعہ نہیں کرتا۔

اگرچہ فلوبیئر پر میری کتاب اور CRITIQUE ایک دوسرے کو OVERLAP کرتی ہیں مگر ایک بات جو ایک کتاب سے دوسری کتاب میں منتقل نہیں ہو سکی وہ فلوبیئر کو ـــــ ایک فرد کے سمجھنے کی کوشش ہے (یہ بات بہت کم اہمیت رکھتی ہے کہ اس کام میں ناکام ہوتا ہوں یا تھوڑا بہت کامیاب)

"ادب کیا ہے" میں آپ نے خیال ظاہر کیا ہے کہ تحریر محض ایک ذریعہ (INSTRUMENT) کے سوا کچھ نہیں دلچسپ بات یہ ہے کہ آپ کو جو ادیب پسند ہیں یعنی فلوبیئر، ملارمے، جینٹ وغیرہ، وہ تحریر کو بجائے خود ایک مقصد سمجھتے ہیں۔ آپ اس تضاد میں کس طرح توافق پیدا کریں گے!

جواب: ان تینوں ادیبوں میں فرق ہے۔ جہاں تک فلوبیئر کا تعلق ہے تو میں اسے یہ دکھانے کے لیے استعمال کرتا ہوں کہ ادب ایک خالص آرٹ (PURE ART) ہے جو اپنے تمام اصول اپنے جوہر سے اخذ کرتا ہے اور نہ صرف یہ بلکہ ادب، ادیب کے کمٹ منٹ اور زندگی کے مختلف شعبوں اور مسائل کے بارے میں ادیب کی رائے کو بھی پوشیدہ رکھتا ہے۔ اس فن میں فلوبیئر ایک نمایاں مثال کا درجہ رکھتا ہے۔ مجھے یقین ہے کہ فلوبیئر کی اس حمایت پر مجھے لعن طعن کی جائے گی۔ مگر سوال یہ ہے کہ اس میں کس کا قصور ہے۔ فلوبیئر ایک عظیم ادیب ہے۔ مادام بواری سے میں آغازِ جوانی کے وقت سے بہت متاثر ہوں۔

دوسری طرف مجھے ملارمے اور جینیٹ سے گہری ہمدردی ہے۔ یہ دونوں افراد اپنے کمٹ منٹ کے بارے میں گہرا شعور رکھتے تھے۔

سوال: ملارمے!

جواب: جی ہاں! میرے خیال میں یہ بات طے ہے کہ حقیقی ملارمے اور ادبی تاریخ کے ملارمے میں بہت کم مشابہت پائی جاتی ہے۔ تاہم وہ ہمارا اعظم ترین شاعر ہے۔ ایک وحشی اور جذبات کو برانگیختہ کرنے والا انسان۔ اس کے ساتھ ساتھ اتنا حساس اور خود پر اتنا قابو رکھنے والا بھی کہ اپنے تنفس میں بے حد معمولی تغیر کے نتیجے میں ہلاک ہو جائے یا خود کو ہلاک کر لے۔ وہ اپنے کمٹ منٹ سے بخوبی واقف تھا۔ اپنے سماجی کمٹ منٹ سے بھی اور شاعرانہ کمٹ منٹ سے بھی۔

سوال: ایک ایسا کمٹ منٹ جو بالآخر تردید ثابت ہوا!

جواب: نہیں ایسا نہیں۔ یہ ٹھیک ہے کہ اس نے اپنے زمانے کو رد کر دیا لیکن اس نے اپنے عہد کو عبوری صورت میں محفوظ کر لیا ہے۔ ایک سرنگ کی صورت میں۔ اسے توقع تھی کہ ایک دن عوام تھیٹر کے بجائے ایک بے خدا عبادت خانے میں جمع ہوں گے اور ایک المیہ کا نظارہ کریں گے۔ واحد اور آخری المیہ کا۔ ایسا المیہ جو انسانی ڈراما، تغیرِ عالم اور پرآشوب موسموں کی آمد کی یکجائی لیے ہوگا جس کا گم نام مصنف مر چکا ہوگا یا عوام کا حصہ ہوگا۔ ملارمے اپنی شاعری کے المیاتی اور اسراری تصورات کو عوام کے باہمی رابطہ سے متعلق کرتا ہے نہ کہ محض رجحانات سے۔ اس طرح ملارمے کی تردید ایک طرح سے بورژوا طبقے کی حمایت کی تردید ہے۔ یقیناً ملارمے کا یہ خیال نہیں تھا کہ ادیب کو کھلم کھلا عوام الناس کے لیے لکھنا چاہیے بلکہ اس کا خیال تھا کہ ادیب کو متحدہ عوام کے لیے لکھنا چاہیے تاکہ بہت سے پیچیدہ رجحانات واضح ہو کر سامنے آ سکیں۔

سوال: تو گویا آپ یہ کہہ رہے ہیں کہ وہ ادبا بھی جن کو معاشرے سے کٹا ہوا سمجھا جاتا ہے وہ بھی کمیٹڈ لوگ ہوتے ہیں۔ کیا آپ نے ملارمے اور فلوبیئر کا مطالعہ یہی ظاہر کرنے کے لیے کیا ہے!

جواب: جی ہاں! یہ بھی اور دوسری بہت سی چیزیں بھی۔ ملارمے کا جہاں تک تعلق ہے تو اس کے مطالعہ کا میں نے ابھی آغاز ہی کیا ہے اور میرا خیال ہے کہ میں آیندہ دوبارہ خاصے وقت تک اس کا مطالعہ نہیں کر سکوں گا۔

میں نے اس کا نام صرف یہ بتانے کے لیے لیا ہے کہ "خالص ادب" محض ایک خواب ہے۔

سوال: توگویا آپ کے نزدیک ادب ہمیشہ کمیٹڈ ہوتا ہے۔

جواب: اگر ادب سب کچھ نہیں ہے تو اس کی کوئی قدر و قیمت نہیں ہے۔ کمٹ منٹ سے میری یہی مراد ہے۔ اگر ادب معصومیت اور نغموں تک محدود رہے تو یہ مرجھا جاتا ہے۔ اگر ایک لکھا ہوا جملہ انسان اور معاشرہ کو ہر سطح پر منعکس نہیں کرتا تو وہ بے کار ہے۔

سوال: آپ پر الزام لگایا جاتا ہے کہ آپ ادب کو سنجیدگی سے نہیں لے رہے اور نہ صرف یہ بلکہ یہ بھی کہ آپ ادب کو اپنے سیاسی مقاصد کے حصول کے لیے ایک آلۂ کار کے طور پر استعمال کر رہے ہیں۔ اس بارے میں آپ کیا کہنا پسند کریں گے؟

جواب: میرے خیال میں اگر لوگ مجھے ادب کی اہمیت کو بڑھا چڑھا کر پیش کرنے کے لیے مطعون کرتے تو یہ زیادہ منطقی بات ہوتی۔ ادب کا حسن خوبصورتی کی روکھی پھیکی تلاش کے بجائے اس بات میں پوشیدہ ہے کہ ادب سب کچھ بن جانا چاہتا ہے کیونکہ ایک مکمل شے ہی خوبصورت ہو سکتی ہے۔ جو لوگ یہ بات نہیں سمجھتے انھوں نے مجھ پر آرٹ کے بجائے اپنے مخصوص مقاصد کے حوالے سے الزام دھرا ہے۔

سوال: اگر آپ کے حوالے سے بات کی جائے تو کیا آپ سمجھتے ہیں کہ ادب نے اپنے امکانات کی تکمیل کی ہے!

جواب: میں نہیں سمجھتا کہ ادب میرے یا کسی اور کے تعلق سے اپنے امکانات کی تکمیل کر سکتا ہے۔ میرے ذہن میں جو بات ہے وہ ایک طرح کے فخر اور خود پسندی کی ضرورت سے متعلق ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ لکھنے کے لیے دیوانگی کی حد تک بڑھی ہوئی خود پسندی یا فخر کی ضرورت ہوتی ہے۔ آپ منکسر المزاج ہونے کے متحمل صرف اسی وقت ہو سکتے ہیں جب آپ نے اپنے فخر یا خود پسندی کو اپنے کام میں جھونک دیا ہو۔ یہ کہہ کر میں ایک بات کا اعتراف کروں گا کہ ایک لکھنے والا ممکن ہے ویسا نہ لکھ پائے جیسا کہ وہ لکھنا چاہتا تھا۔ یہ بھی ممکن ہے کہ کام کے دوران اسے بہت سی رکاوٹوں کا سامنا کرنا پڑے تو اس سے کیا فرق پڑتا ہے۔ آپ سب کچھ لکھنے کی آرزو کرتے ہوئے یہ امید تو بہرحال رکھیں گے کہ آپ کچھ کر رہے ہیں۔

سوال: بس لیا یہ ہر کسی والے کا خواب نہیں ہے کہ وہ کوئی ایسی چیز لکھے جو سب کچھ ہو؟

جواب: ہاں میرے خیال میں ایسا ہی ہے! اور میں امید بھی یہی کرتا ہوں لیکن مجھے بہت سے لکھنے والوں کی توہین کا اندیشہ ہے۔ ایک لکھنے والے کو اتنا منکسر المزاج ہونا چاہیے کہ وہ عالموں اور عام ناقدوں کو برداشت کر سکے۔ دوسری طرف اگر کچھ اشخاص اس کی بے معنی چیزوں سے عظیم الشان باتیں دریافت کریں تو اسے اس کا بھی اظہار کرنا چاہیے۔

سوال: کیوں!

جواب: اس لیے کہ اگر وہ خاموش رہے گا تو وہ ایک نقاد کو استقلال فراہم کرے گا جو دوسرے لکھنے والوں کے لیے

پہلیٹ ان کُن ہو گا۔ ایک لکھنے والے کے پاس نہ تو ہاتھوں میں کچھ ہوتا ہے اور نہ اس کی جیب میں۔ اگر اس کے پاس تاش کے پتوں کی گڈی ہے تو پتوں کو میز پر رکھ دینا چاہیے۔ مجھے ان نیم حکیموں سے شدید کراہت آتی ہے جو لوگوں کو یہ یقین دلانے کی کوشش کرتے ہیں کہ لکھنا کوئی جادوئی ہنر ہے۔ وہ اپنے پیچھے آنے والے لوگوں کو گمراہ کر دیتے ہیں۔ ان کو اپنے جیسے جادوگروں میں تبدیل کر دیتے ہیں۔ آپ لکھنے والے کو جادوگری یا شعبدہ بازی سے دست برداری کی ابتدا کرنے دیں۔ بھلا لکھنے والے، شعبدہ بازوں کے چھچھورپن اور بے تکریمی میں حصہ دار کیوں بنیں! انھیں کھُل کر کہنے دیجیے کہ ان کی آرزوئیں کیا ہیں؟ اور وہ کیا کر رہے ہیں

— عام طور پر نقاد حضرات ادیبوں اور لکھنے والوں کو اس روح کی آواز نہ سننے پر مائل کرتے ہیں جو اُن سب سے بلند تر ہے۔ نقاد حضرات ادیبوں کو ان کی خواہشوں اور ان ذرائع سے کبھی آگاہ نہیں ہونے دیتے جو ان کو (ادیبوں کو) میسّر ہوتے ہیں چنانچہ اکثر ادیب اس رومانوی خیال سے چمٹے رہتے ہیں کہ جس طرح چڑیاں گاتی ہیں اسی طرح ہمیں لکھتے رہنا ہے۔ مگر لکھنے والا ایک چڑیا نہیں ہوتا!

سوال: کیا آپ محسوس کرتے ہیں کہ اشیا پہلے سے خاموشی میں موجود ہوتی ہیں۔ حتیٰ کہ اس وقت بھی جب لکھنے والا ان میں سے کسی ایک یا دو کا انتخاب کرتا ہے۔ فرض کریں کہ آپ NATHALI SARRBUTE's یا ROBB GRILE (اس عہد کے اہم ترین لکھنے والے) کی کسی کتاب پر تبصرہ کر رہے ہیں تو کیا آپ یہ دکھانا پسند کریں گے کہ ایک کائنات وہاں پہلے سے موجود ہے اپنی مکمل شکل میں!

جواب: ادب اپنی پہلی تحریک خاموشی سے حاصل کرتا ہے۔ اس اعتبار سے میرا جواب اثبات میں ہے، لیکن ایسا سوچنا ایک اور اعتبار سے وقت کا زیاں بھی ہے۔ ہمیں دوسری طرف یہ بھی تسلیم کرنا چاہیے کہ مثال کے طور پر فرانس میں ایک ایسا شخص زندہ ہے جو عظیم ادیب بننے کی شدید خواہش اور امکانات رکھتا ہے۔ ۱۹۴۵ء کے بعد کا سب سے عظیم ترین ادیب ہے۔ BUTOR۔

سوال: آپ کی اپنی ادبی سرگرمیوں سے متعلق آپ کا تجربہ کیا ہے؟ کیا آپ نے ادب کو اپنی مرضی کے مطابق برتا، کیا آپ مطمئن ہیں، پُر امید ہیں، یا آپ مایوس ہیں!

جواب: جی نہیں، میں کبھی مایوس نہیں ہوا۔ میرے ادبی کام ہمیشہ ٹھیک ٹھاک رہے ہیں۔ میری کئی کتابیں ایسی ضرور ہیں جن کو مجھے درمیان میں چھوڑنا پڑا کیونکہ مجھے معلوم نہیں تھا کہ میں انھیں کیسے مکمل کروں۔ میری کتابوں میں کچھ ایسی بھی ہیں جن کو میرے خیال کے برعکس پسند نہیں کیا گیا، لیکن بعد میں میں نے تسلیم کیا کہ میں غلط تھا، میرے ناقدین درست تھے۔ بہرحال یہ سب کچھ تو کام کا حصّہ ہے۔ آپ کو ہر پیشے میں ایسے حالات کا سامنا کرنا پڑے گا۔ تاہم میرے کہنے کا مفہوم یہ ہے کہ تجربہ بجائے خود مایوسی کا باعث نہیں ہو سکتا۔ ہاں البتہ اظہار کے دائرے میں کامیابی لازمی ناکامی ہے۔

سوال: آپ نے اپنے ادبی کام کے سلسلے میں عوام کا تذکرہ کیا ہے، میں آپ سے پوچھنا چاہوں گا کہ آپ کے عوام کون لوگ ہیں۔

جواب: طلبہ، اساتذہ اور وہ لوگ جو مطالعہ کو پسند کرتے ہیں یا بہ الفاظِ دیگر مطالعہ جن کی کمزوری ہے۔ یہ ایک مختصر سا دائرہ ہے۔ میری کتابوں کی تعدادِ اشاعت زیادہ اہمیت کی حامل نہیں۔ یہ وسیع بھی ہوسکتا ہے اور مختصر بھی۔ لیکن قارئین کا حلقہ وہی رہتا ہے۔

جہاں تک صحافی حضرات کا تعلق ہے تو ان کی اپروچ بڑی عجیب ہے۔ یہ حضرات عام طور پر اشاعتوں کی تعداد کی فہرست تیار کرتے ہیں، تناسب نکالتے ہیں، شمار کا تقابل کرتے ہیں (جو غلط اعداد و شمار کی وجہ سے عام طور پر درست نہیں ہوتا) اور پھر نتائج اخذ کرتے ہیں۔ اس طرح گویا یہ حضرات کتاب کی تعدادِ اشاعت کو اپنے اخبار کی تعدادِ اشاعت کے ساتھ خلط ملط کر دیتے ہیں۔

ہمارے یہاں کے برعکس رُوس میں جہاں کتابوں کی ریاستی بنیاد اور سرپرستی میں اشاعت ہوتی ہے، کسی کتاب کی اشاعت حقیقی مفہوم کی حامل ہوتی ہے۔ مثلاً اگر وہاں عوام زولاں کی کسی کتاب کی اشاعت کا مطالبہ کرتے ہیں تو اس کا مطلب یہ ہے کہ عوام زولاں کو واقعتاً پڑھنا یا دوبارہ پڑھنا چاہتے ہیں۔ تاہم لبرل کیپٹل ازم والے معاشروں میں اشاعت کے اعداد و شمار کی کوئی اہمیت نہیں ہوتی۔ مثال کے طور پر ابھی کچھ دنوں پہلے میں نے ایک نہایت احمقانہ چہرے بشرے والی ایک خاتون کو دیکھا جو ٹرین میں نہایت آرام کے ساتھ پیسٹری کھاتے ہوئے ایک انتہائی سنجیدہ ناول پڑھ رہی تھیں۔ یہ ٹھیک ہے کہ وہ واقعتاً ناول پڑھ رہی تھیں مگر وہ اس سنجیدہ ناول کے مصنف کے عوام کا حصّہ نہیں تھیں۔

سوال: انسانی تاریخ کی اس سب سے پُرتشدد صدی میں، آپ کے خیال میں ادب کا وظیفہ کیا ہے!

جواب: انسان IMAGES کے درمیان رہتا ہے۔ چنانچہ ادب انسان کو اس کی ذات کا ایک تنقیدی تصوّر (IMAGE) فراہم کرتا ہے۔

سوال: گویا ادب ایک آئینہ ہے؟

جواب: ایک تنقیدی آئینہ! ادب کو لازماً انکشافی، اظہاری اور نمایندہ ہونا چاہیئے تاکہ اس کے لکھے جانے کے بعد لوگ آمنے سامنے ہو کر ایک دوسرے کو دیکھ سکیں اور اپنی خواہش کے مطابق عمل کر سکیں۔ انیسویں صدی میں ادیبوں کو تاریخ نے تحفظ دیا مگر اب وہ مشتبہ ہو چکے ہیں۔ ہمیں اپنے لیے اس مشتبہ رول کو برقرار رکھنا چاہیے۔ ذرا سوچیے کسی ایسے معاشرے کا کیا بنے گا جس میں مشتبہ افراد نہ ہوں۔

سوال: آپ کے خیال میں ادبا مشتبہ افراد ہیں۔ کیا آپ یہ کہ کر ان کی اہمیت کو بڑھا نہیں رہے!

جواب: ان کے بارے میں شبہ ہے کہ ان کی جیبوں میں آئینے موجود ہیں جنھیں وہ کبھی بھی نکال کر اپنے پڑوسی کو دکھا سکتے ہیں۔ ممکن ہے بیچارہ پڑوسی آئینے میں اپنی حقیقی شکل دیکھتے ہی دل کے دورے کا شکار ہو جائے ——

—— اس بات کے علاوہ ادیب اس لیے بھی مشتبہ ہیں کہ نثر اور شاعری دونوں تنقیدی آرٹ کا درجہ اختیار کر گئے ہیں۔ سب سے پہلا آدمی ملارمے تھا جس نے اپنے مکمل کام کو "تنقیدی شاعری" کا نام

دیا۔ تحریر کا مفہوم ماضی کی طرح آج بھی ہر تحریر کو سوالیہ نشان کے سامنے رکھ دیتا ہے۔ یہ بات مصوری، مجسمہ سازی اور موسیقی کے بارے میں بھی کہی جا سکتی ہے۔ اس طرح تحریر کی وہ مہم جوئی جو ہر لکھنے والا اختیار کرتا ہے، پوری انسانیت کے لیے ایک چیلنج کی حیثیت رکھتی ہے۔ ان لوگوں کے لیے بھی جو وہ تحریر پڑھتے ہیں اور ان لوگوں کے لیے بھی جو وہ تحریر نہیں پڑھتے۔

سوال: کیا لکھنے والے کا پیشہ عجیب و غریب نہیں ہے۔ بلاشبہ تحریر جہاں خاصی توانائی طلب کرتی ہے وہیں مزے کی بات یہ ہے کہ تحریر یہ توانائی خالق کی کمزوری سے حاصل کرتی ہے۔

جواب: جہاں تک میرا تعلق ہے تو میں نے تحریر کو موت کے عوض چُنا ہے۔ اور شاید اس لیے بھی کہ میرے پاس کوئی عقیدہ نہیں تھا۔ یہ یقیناً ایک طرح کی کمزوری ہی ہے ـــــــ

جب میں سات آٹھ برس کا تھا تو میں اپنی بیوہ ماں، کیتھولک دادی اور پروٹسٹنٹ دادا کے ساتھ رہتا تھا۔ کھانے کی میز پر ان میں سے ہر شخص ایک دوسرے کے مذہب کا مذاق اڑاتا تھا۔ اگرچہ اس مذاق میں کسی کی تضحیک کا پہلو نہیں ہوتا تھا اور یہ ایک طرح سے خاندانی روایت تھی، لیکن بچّے کا ذہن بعد پر ساری منطق سمجھتا ہے میں نے اپنے بزرگوں کی اس گفت و شنید سے یہ نتیجہ نکالا کہ یہ دونوں عقیدے ہی بے معنی ہیں۔ اگرچہ میرے خاندان نے ایک کیتھولک کے طور پر میری پرورش کرنا اپنا فریضہ سمجھا مگر میرے لیے مذہب میں کوئی کشش نہیں رہ گئی تھی۔

کم و بیش اسی زمانے میں مجھے موت کا شدید خوف لاحق تھا۔ کیوں؟ شاید اس لیے کہ میرے پاس ابدی زندگی کا کوئی تصور نہیں تھا۔ میں نے اس زمانے میں اپنے بچگانہ انداز میں لکھنا شروع کر دیا تھا۔ اس طرح گویا میں نے اپنی متاع کو ابدیت میں ڈھالنا شروع کر دیا تھا۔ ادبی ابدیت میں۔ اگرچہ میں نے تحریری ابدیت کا تصور ترک کر دیا تھا، لیکن بہرحال یہ میری ذہنی توانائی کا اوّلین چیلنج تھا۔

مختصر یہ کہ آپ کا یہ خیال درست ہے کہ لکھنا ایک طرح کا فرار ہے، ایک طرح کی کمزوری ہے۔

سوال: میرے خیال میں ہر لکھنے والا سہارے کی طرف رجوع کرتا ہے چاہے اس کا کام اچھا ہو یا بُرا۔ وہ جب بھی کسی ناقابلِ قبول حقیقت کا سامنا کرتا ہے تو وہ کاغذ اور قلم کی پناہ حاصل کرتا ہے جب کہ عمل کی دنیا کا آدمی حقیقت سے ٹکرا کر سب کچھ کھو دیتا ہے

جواب: آپ نے کچھ اس انداز میں بات کی ہے کہ جیسے انسان کے لیے انتخاب ممکن ہے۔ حالانکہ حکمران طبقہ کے علاوہ کسی اور فیض عام افراد کے لیے لکھنے لکھانے کے کام میں سے کسی ایک کا انتخاب ممکن نہیں۔ اس کا دارومدار صورتِ حالات پر ہوتا ہے۔ مثلاً الجزائر کی مثال لیجیے۔ وہاں کے عوام کے لیے سیاسی مسائل فوری نوعیت کے حامل ہیں۔ الجزائر کی ایک پوری نسل نے اپنے بچپن سے جنگ کے علاوہ کچھ نہیں دیکھا۔ چنانچہ اس صورت میں اس کے لیے تشدد کی طرف رجوع کرنا انتخاب کا نہیں، وقت کے جبر کا معاملہ ہے۔ ممکن ہے جب جنگ ختم ہو جائے تو ان میں سے

کچھ لوگ ادیب بن جائیں لیکن سیاست اور جنگ بہرطور ان کی ابتدائی تقدیر ہوگی۔
مختصر یہ کہ جیسا میں نے پہلے کہا کہ حقیقی معنوں میں ایک کمیٹڈ ادیب کا کام انکشاف اور اظہار کرنا نیز واہموں اور بے دلیل عقیدوں کو تنقیدی تیزاب میں نہلا کر ختم کر دینا ہے۔ ممکن ہے خوش قسمتی سے کچھ لوگ بعد میں اس کام سے عقیدے اور واہمے پیدا کرلیں جیسا کہ لشکو، وغیرہ کے سلسلے میں ہوا۔ جہاں خالص اسٹائل سیاسی عمل کے مترادف بن گیا۔ شاید اس کی وجہ یہ ہو کہ ایک لکھنے والا اپنی قوم کو اس کی زبان کی تلاش میں مدد دیتا ہے۔
—— البتہ ہم لوگوں کو یہ مواقع حاصل نہیں ہیں۔ میں محسوس کرتا ہوں کہ بہت کم نوجوان لکھنے لکھانے کی جانب مائل ہیں۔ میرے دور میں آپ ایک طویل زندگی پانے کے بارے میں کسی شک وشبہ میں مبتلا نہیں ہوتے تھے۔ آپ کو کم و بیش معلوم ہوتا تھا کہ آپ نہایت آرام کے ساتھ اپنے بستر پہ دَم دیں گے۔ میں خود جب اپنے طویل العمر دادا کو دیکھتا تھا تو اسی خیال سے سرشار ہوتا تھا۔ لیکن جب سے سرد جنگ کا آغاز ہوا ہے نوجوانوں کو اس کا یقین ہو چلا ہے کہ موت کسی بھی وقت آکر انھیں دبوچ سکتی ہے۔ گویا خدا کو ایک بار پھر ادب پر فوقیت حاصل ہوگئی ہے —— خدا اب ایک لمحے کے نوٹس پر کسی شخص کو مرنے سے بچا سکتا ہے —— جب کہ میرا خدا (یعنی ادب) ایک ظالم دیوتا مجھ سے پوری زندگی کا کام طلب کرتا ہے —— اور یوں ایک بار پھر اسرار یت ہر چیز سے جڑ گئی۔
میں نے یہ ساری باتیں یہ بتانے کے لیے کی ہیں کہ ادب کی توضیحات جو فنیات کی قوت وکمزوری کے تصورات یا کسی اور ایسے ہی داخلی تصور پر مبنی ہیں، سطحی طور پر درست ہونے کے باوجود انتہائی سادہ دلانہ ہیں۔ آپ یہ مت بھولیے کہ ایک آدمی اپنے اندر پورے دور کو لیے ہوتا ہے۔ بالکل اسی طرح جیسے سمندر کی ایک نہر پورے سمندر کو اپنے ساتھ لیے ہوتی ہے۔

الف: کیا آپ کے خیال میں لوگ لکھنے کی طرف کم توجہ دے رہے ہیں؟

ب: یقیناً ایسی کوئی بات نہیں ہے مگر آج کے لکھنے والے کیا واقعی لکھنے کے سوا کوئی کام نہیں کرنا چاہتے؟ ممکن ہے ایک روز ایسا آئے جب لکھنے لکھانے کی یہ صلاحیت ہر ایک کے اندر پائی جانے لگے۔ کُل وقتی ادیب شاید ماضی کا حصہ بن کر رہ جائیں۔ میرے خیال میں اس وقت ایسے لوگ ہوں گے جو بیک وقت کئی کام کریں گے۔ ان کاموں میں لکھنا بھی شامل ہوگا۔ یہ ایک تسلّی بخش صورتِ حال ہوگی۔ ہر آدمی لکھنے کے ان بنیادی لوازم [illegible] کے زیادہ قریب ہو جائے گا جو آج بھی سب لوگوں میں موجود ہیں۔ ذرا سوچیے، ہم کون لوگ ہیں؟ پلیشہ ور (PROFESSIONAL) ہم دعویٰ کرتے ہیں کہ ہمیں لوگوں کا مینڈیٹ حاصل ہے۔ گویا لوگوں نے لکھنے کا کام خود کرنے کے بجائے ہمیں سونپ دیا ہے۔ ہم اپنے آپ کو اس طرح پیش کرتے ہیں جیسے ہم ان کے منتخب نمایندے ہیں۔ لیکن یہ ایک جھوٹ ہے۔ بڑی تعداد میں چھپنے والی ہماری کتابیں اور اشاعتی ادارے ہمارے اس مکر کو اور زور دار بنا رہے ہیں۔ ہر خریدی جانے والی کتاب اپنے مصنّف کے حق میں خریدار کا ایک ووٹ بڑھا دیتی ہے —— حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ لوگ صرف اس لیے کتاب پڑھتے ہیں کہ وہ خود لکھنا چاہتے ہیں۔ بہرحال مطالعہ بھی ایک طرح کی

REWRITING کا عمل ——

ایک مخصوص تناظر میں میں کہوں گا کہ ہاں لوگوں پر یہ ظاہر ہوتا ہے کہ انھیں اپنی زندگیاں اظہار میں لانے کی ضرورت ہے۔ جس زمانے میں میں جنگی قیدی کی حیثیت سے جرمنی میں تھا اس زمانے میں میری ملاقات ایک ایسے شخص سے ہوئی جو ایک لاوارث بچے کے طور پر پلا بڑھا تھا۔ ریاست نے اس کی پرورش کی تھی۔ وہ جوان ہوا تو اس نے فوج میں ملازمت کر لی۔ انہی دنوں اسے کسی نے خط لکھ کر بتایا کہ اس کی بیوی اس کے ساتھ بے وفائی کر رہی ہے۔ وہ خط ملتے ہی بندوق لے کر روانہ ہو گیا۔ گھر پہنچا تو اس نے اپنی بیوی کو ایک اور شخص کی بانہوں میں پایا۔ اس نے موقع پر ہی دونوں کو گولی مار دی اور خود کو حکام کے حوالے کر دیا۔ یہ ۱۹۴۰ء کی بات ہے۔ اس شخص کو جنگی قیدیوں کے ساتھ جیل میں ڈال دیا گیا۔ ہمیں (جو جیل میں اس کے ساتھی تھے) اس کی یہ کہانی ایک فوجی افسر کے ذریعے معلوم ہو چکی تھی لیکن اس کے لیے شاید یہ سب کچھ کافی نہیں تھا۔ وہ محسوس کرتا تھا کہ اسے دھوکا دیا گیا ہے۔ ایک دکھ اس کے اندر خاموشی کے ساتھ کام کر رہا تھا۔ امکان تھا کہ کچھ وقت کے بعد یہ اس کے ذہن میں ایک مجرد یاد کے طور پر رہ جائے گا۔ چنانچہ اس نے اس واقعہ کو اس کی تمام تر جزئیات اور شدت کے ساتھ ہمیشہ ہمیشہ کے لیے یاد رکھنے کی خاطر اسے تحریری شکل دینے کا فیصلہ کیا۔ بلاشبہ اس نے اس واقعے کو بہت ہی برے انداز میں لکھا تھا۔ شاید یہ وہ مقام ہے جہاں سے لکھنے کی دقتوں کا آغاز ہوتا ہے۔

BLANCHOTS نے PARADOX D'AYRTE —— میں بڑے زبردست انداز میں وضاحت کی ہے کہ اس کی سب کچھ کہہ دینے کی ابتدائی خواہش کس طرح سب کچھ چھپا دینے پر منتج ہوئی۔ لیکن یہ ایک الگ سوال ہے۔ میں یہاں جو کہنا چاہ رہا ہوں وہ یہ ہے کہ دنیا میں ہر جگہ کے افراد یہ چاہتے ہیں کہ ان کی زندگیاں اپنے تمام تر گوشوں کے ساتھ نہ صرف یہ کہ محفوظ ہو جائیں بلکہ دوسرے لوگوں کے سامنے پیش ہوں۔ وہ ان تمام عناصر سے زندگی کو بچا کر رکھنا چاہتے ہیں جو ان کی زندگی کو کچل دینے والے ہیں۔ چنانچہ ہم کہہ سکتے ہیں کہ ہر شخص لکھنا چاہتا ہے تاکہ وہ بامعنی ہو سکے تاکہ اس کے تجربوں کی اہمیت ہو سکے۔ کیونکہ انسانی تجربے رفتہ رفتہ گم ہو جاتے ہیں۔

کچھ عرصہ قبل میں نے ادب کے بارے میں بہت سے توہمات پھیلائے ہیں۔ مثلاً یہ کہ ادب فی نفسہ ایک قدر ہے یا یہ کہ ادب انسان کو بچا سکتا ہے یا اسے تبدیل کر سکتا ہے (ماسوا چند مخصوص حالات کے) تاہم آج مجھے اپنی یہ ساری باتیں آؤٹ آف ڈیٹ لگتی ہیں۔ لیکن ان سب کے باوجود میرے اندر کا ادیب لکھے جا رہا ہے۔ کیوں؟ شاید اس لیے کہ جیسا کہ ایک ماہر نفسیات نے کہا ہے کہ اس نے اپنا سب کچھ اپنے پیشے کو سونپ دیا ہے۔ وہ لکھ رہا ہے بالکل اسی وجہ سے جیسے بہت سے لوگ اپنے خاندان کے بہت سے افراد کو ناپسند کرنے کے باوجود محض اس لیے ان کے ساتھ رہتے ہیں کہ بہرحال وہ ان کے خاندان والے ہیں۔ لیکن میرا ایک یقین ابھی تک قائم ہے اور شاید ہمیشہ قائم رہے اور وہ یہ کہ لکھنا ایک ایسی چیز ہے جس کی ضرورت ہر کوئی محسوس کرتا ہے کیونکہ یہ ابلاغ کی بنیادی ضرورت کی اعلا ترین شکل ہے۔

سوال: اس اعتبار سے وہ لوگ جنھوں نے لکھنے لکھانے کو ایک پیشے کے طور پر چنا ہے، یقیناً دنیا کے مطمئن ترین افراد ہوں گے کیونکہ یہ لوگ ساری زندگی وہ کام کرنے میں گزار دیتے ہیں جس کا مقامی لوگوں نے محض خواب دیکھا ہوتا ہے۔

جواب: نہیں ایسا نہیں ہے کیونکہ یہ تو ان کی جاب ہے۔ ہر انسان کی زندگی میں ایک وقت ایسا آتا ہے جب اسے رات کی مختلف شکلوں میں اپنی زندگی کو بچانا ہوتا ہے۔

سوال: کیا قاری ضروری ہے!

جواب: بلاشبہ! کیونکہ ایک لکھی ہوئی چیز اسی وقت مکمل (ABSOLUTE) ہوتی ہے جب اسے دوسرے لوگوں کی یادداشتوں میں محفوظ کر دیا جائے۔ جب اسے ایک (OBJECTIVE) معروضی روح کا جزو بنا دیا جائے۔ یہ کہنے کی ضرورت نہیں ہے کہ آپ جس عوام تک (جو کہ خیال بھی ہو سکتے ہیں) پہنچنا چاہ رہے ہوں آپ ان کے بجائے دوسرے عوام تک پہنچ جائیں۔ لیکن ممکن ہے کہ کبھی یہ عوام ان عوام کی جگہ لے لیں جن تک آپ پہنچنا چاہ رہے تھے۔

سوال: کیا کہیں بہت اندر ہر انسان ایک لکھنے والا بننا چاہتا ہے!

جواب: میرا جواب ہاں میں بھی ہے اور نہیں میں بھی۔ ہر لکھنے والا خود کو اپنی تحریر سے جدا کر لیتا ہے، یہ ایک افسوس ناک بات ہے۔ جب میری عمر آٹھ برس کے لگ بھگ تھی تو میں سوچا کرتا تھا کہ ایک اچھی کتاب کے منظرِ عام پر آنے سے فطرت بھی ناواقف یا غیر متعلق نہیں رہتی ہوگی۔ میں سوچتا تھا کہ جب ایک لکھنے والا کسی کتاب کے مسودے کے اختتام پر "ختم شد" لکھتا ہوگا تو آسمان پر ایک ٹوٹا ہوا ستارہ نمودار ہوتا ہوگا۔ لیکن آج میں لکھنے کو ایک "کام" سمجھتا ہوں۔ ایک ایسی سرگرمی جو کسی بھی دوسری سرگرمی کی طرح ہے۔ لیکن میں یہ بات دہراؤں گا کہ بنیادی نکتہ یہ نہیں ہے، اہم بات یہ ہے کہ ہر آدمی یہ محسوس کرتا ہے کہ (لاشعوری طور پر سہی) اسے اپنے عہد، اپنی زندگی کا گواہ ہونا چاہیے، نہ صرف دوسروں کے سامنے بلکہ اپنے سامنے بھی۔ آپ کو یہ بات کبھی نہیں بھولنی چاہیے کہ ہمارے احساسات اور افعال غیر واضح اور پیچیدہ ہوتے ہیں۔ ہمارے اندر کوئی چیز ان کے ارتقا میں رکاوٹ ڈالتی رہتی ہے، بالکل اسی طرح جس طرح ریڈیو پر مختلف اقسام کی گھڑگھڑاہٹیں نشریات میں مداخلت کرتی رہتی ہیں۔ یاد رکھیے کہ المیہ میں طربیہ بھی جھلملاتا ہے اور مسرت میں غم بھی در آتا ہے۔ لکھنے کی ضرورت بنیادی طور پر صاف و شفاف ہونے کی جد وجہد ہے۔

بجلی کے میٹر

شمیم صبائی متھراوی

سنہ نواسی میں جدا ہو گئے ہم سے یہ لوگ
۱۹۸۹ء

(گزشتہ سے پیوستہ)

(۲۱)

"جاں کاہ ارتحال آیت اللہ امام خمینی"
۱۹۸۹ء

چوں امام خمینی ایران — کرد رحلت ز دہر رنگ و بو
گفت تاریخ او شمیمِ حزیں — "انتقالِ خمینیٔ حق جو"
۱۴۰۹ھ

(ایران کے مذہبی رہنما اور اسلامی انقلاب کے روحِ رواں حضرت آیت اللہ روح اللہ امام خمینی نے ۳ جون ۱۹۸۹ء مطابق ۲۸ شوال المکرم ۱۴۰۹ھ بروز ہفتہ بعمر ۸۷ سال تہران میں رحلت فرمائی۔ مرحوم کا جسدِ خاکی لاکھوں سوگواروں کی موجودگی میں سرکاری اعزاز کے ساتھ منگل کی شام ۶ جون کو بہشتِ زہرہ قبرستان، تہران میں سپردِ خاک کیا گیا۔)

(۲۲)

"اے ایم قریشی امیر گلِ خانۂ فردوس"
۱۹۸۹ء

تعلیم کے حلقوں میں ہوا جس سے بپا غم — وہ بانیٔ اسلامیہ کالج کی قضا تھی
تاریخ شمیم ان کے لیے یوں ملی ہم کو — "رہ گیرِ ارم ہو گئے اے ایم قریشی"
۱۴۰۹ھ

(مجاہدِ آزادی، قدیم مسلم لیگی رہنما اور اسلامیہ کالج کے بانی الحاج اے ایم قریشی نے ۲۲ جون ۱۹۸۹ء مطابق ۱۷ ذیقعدہ ۱۴۰۹ھ بروز پنج شنبہ بعمر ۷۱ سال کراچی میں داعیِ اجل کو لبیک کہا۔ مرحوم کو ان کی وصیت کے مطابق اسلامیہ کالج کے کمپاؤنڈ میں علامہ شبیر احمد عثمانی کے مزار کے پہلو میں سپردِ خاک کیا گیا۔)

(۲۳)

"اے وائے انتقالِ غلام رازق"
۱۹۸۹ء

اک ایتھلیٹ کا غم سہنا ہے حسب سابق
تاریخ اس کی نکلی "ہے ہے غلام رازق"
۱۴۰۹ھ

(پاکستان کے ممتاز ہرڈلر اعزازی کیپٹن غلام رازق نے ۲۴ جون ۱۹۸۹ء مطابق ۱۹ ذیقعدہ ۱۴۰۹ھ بروز ہفتہ راولپنڈی میں رحلت کی۔ مرحوم کو شام تک آرمی کے قبرستان میں سپردِ خاک کیا گیا۔)

(۲۴)

"ملالِ انتقال قیوّم نظر"

۱۹۸۹ء

قیوّم نظر ہو گئے جس میں رخصت یہ کیسی گھڑی رنج کی آئی ہے ہے
تاریخ شمیم ان کی اجل کی لکھ دے "قیوّم نظر کی یہ جدائی ہے ہے"
۱۴۰۹ھ

(اردو کے مشہور شاعر پروفیسر قیوّم نظر نے ۲۴ جون ۱۹۸۹ء مطابق ۱۹ ذیقعدہ ۱۴۰۹ھ بروز ہفتہ بعمر ۷۵ سال کراچی میں انتقال فرمایا۔ مرحوم کو اتوار کے دن لاہور میں سپردِ خاک کر دیا گیا۔)

(۲۵)

"بشیر الاسلام عثمانی مقیمِ جنّت"

۱۹۸۹ء

وہ کہ تھے ایک صحافی مشہور ہو گئے آج سے فردوس مقام
اے شمیم ان کا ملا سالِ وفات "فدویٔ خلد بشیر الاسلام"
۱۴۰۹ھ

(ممتاز صحافی جناب بشیر الاسلام عثمانی نے ۲۸ جون ۱۹۸۹ء مطابق ۲۳ ذیقعدہ ۱۴۰۹ھ بروز چہارشنبہ بعمر ۶۵ سال راولپنڈی میں رحلت کی۔ اسی دن شام کو مرحوم کا جسدِ خاکی راولپنڈی کے قبرستان میں سپردِ لحد کر دیا گیا۔)

(۲۶)

"قیصر سہارنپوری دل نوازِ میرِ بہشت"

۱۹۸۹ء

شاعرِ نامدار قیصر بھی بن گئے بزمِ خُلد کے سرور
ان کی تاریخِ مرگ لکھ دے شمیم "خُلدِ ربِّ جلیل میں قیصر"
۱۴۰۹ھ

(ممتاز شاعر و ادیب جناب قیصر سہارنپوری (ایجوکیشن سکریٹری علی گڑھ اولڈ بوائز ایسوسی ایشن) نے ۵ جولائی مطابق یکم ذالحج ۱۴۰۹ھ بروز چہارشنبہ راولپنڈی میں رحلت فرمائی۔ مرحوم کی تدفین ۶ جولائی کو راولپنڈی کے قبرستان میں عمل میں آئی۔)

(۲۷)

"میر بشیر مکینِ باغِ جناں"

۱۹۸۹ء

آہ وہ نامی دست شناس		عالم جس سے صدمہ گیر
رحلت کی تاریخ بنا		"جادۂ خلدِ میر بشیر"

۱۴۰۹ھ

(بین الاقوامی شہرت کے حامل، ممتاز دست شناس، ماہرِ فلکیات، ادیب و شاعر اور ناول نگار جناب میر بشیر نے جولائی ۱۹۸۹ء یکم ذالحج ۱۴۰۹ھ بروز پنج شنبہ بعمر ۸۰ سال لندن میں انتقال فرمایا۔ مرحوم کو دوسرے دن بعد نماز جمعہ ہینڈن قبرستان (لندن) میں سپردِ خاک کر دیا گیا۔)

(۲۸)

"یقینِ رحلتِ مشتاق قمر"

۱۹۸۹ء

ایک انشائیہ لکھنے والا		کر گیا دہر سے جس وقت سفر
آئی تاریخ لبوں پر یوں شمیمؔ		"بے گماں چل بسے مشتاق قمر"

۱۴۰۹ھ

(ممتاز انشائیہ نگار اور نقاد جناب مشتاق قمر نے ۱۶ر جولائی ۱۹۸۹ء مطابق ۱۲ر ذی الحج ۱۴۰۹ھ بروز یک شنبہ راولپنڈی میں انتقال فرمایا۔ تدفین راولپنڈی کے قبرستان میں اسی دن عمل میں آئی۔)

(۲۹)

"ڈاکٹر عاشق حسین بٹالوی جانِ محفلِ جناں"

۱۹۸۹ء

جب ہم سے اک محقق نامی بچھڑ گیا		جب عازمِ جناں ہوئے عاشق بٹالوی
ملہم نے اے شمیمؔ پئے سالِ انتقال		"عاشق بٹالوی چلو فردوس میں"، کہا

(برِصغیر کے ممتاز اسکالر، ادیب، تاریخ داں، محقق اور تحریکِ پاکستان کے نامور رہنما ڈاکٹر عاشق حسین بٹالوی نے جولائی ۱۹۸۹ء مطابق ۱۳ر ذی الحج ۱۴۰۹ھ بروز دوشنبہ بعمر ۸۳ سال لندن کے ویسٹ منسٹر اسپتال میں داعیٔ اجل کو لبیک کہا۔ مرحوم کی میت لاہور لے جائی گئی اور ان کے آبائی قبرستان میں سپردِ لحد کی گئی۔)

(۳۰)

"ریاضِ جناں قرارگاہ بدرِ عالم"

۱۹۸۹ء

بدرِ عالم کے لیے جب وہ جہاں سے اٹھ گئے		قطعۂ تاریخ اک با دیدۂ نم لکھ دیا
ان کی لوحِ قبر پر سالِ فنا میں نے شمیمؔ		ہے داخلِ خلد بدرِ عالم لکھ دیا

(پاکستان براڈکاسٹنگ کارپوریشن کے اسٹیشن ڈائریکٹر جناب بدر عالم نے ۲۸ جولائی ۱۹۸۹ء مطابق ۲۴ ذی الحج ۱۴۰۹ھ بروز جمعہ بعمر ۵۶ سال جناح اسپتال کراچی میں رحلت کی۔ مرحوم کو اسی دن شام تک پی ای سی ایچ سوسائٹی قبرستان میں سپردِ خاک کر دیا گیا۔)

(۳۱)

"نواب محمد دلاور خان جی میر، بزمِ خُلد"

۱۹۸۹ء

ہو گئے نواب جونا گڑھ بھی رخصت دہر سے	مل گئی ان کو صدارت محفلِ فردوس کی
مصرعِ تاریخِ رحلت ان کا یوں پایا شمیم	"حاکمِ فردوس زیبا ہیں دلاور خان جی"

۱۴۰۹ھ

(نواب جونا گڑھ اور سابق گورنر سندھ الحاج نواب محمد دلاور خان جی ۳۰ جولائی ۱۹۸۹ء مطابق ۲۶ ذوالحجہ ۱۴۰۹ھ روز اتوار بعمر ۶۷ سال کراچی میں انتقال فرمایا۔ اسی شام مرحوم کو پی ای سی ایچ سوسائٹی کے قبرستان میں سرکاری اعزاز کے ساتھ سپردِ خاک کیا گیا۔)

(۳۲)

"رحلتِ ایڈمرل (ریٹائرڈ) ایس ایم احسن"

۱۹۸۹ء

جب ہوئے ایس ایم احسن مالکِ قصرِ بہشت	ہاتھ ان کے راحت افزا ایک مسکن آ گیا
اے شمیم ان کے لیے رضواں نے تاریخِ وفات	یوں کہی "گل خانۂ جنت میں احسن آ گیا"

۱۴۱۰ھ

(پاک بحریہ کے سابق سربراہ اور سابق مشرقی پاکستان کے سابق گورنر ایڈمرل (ریٹائرڈ) ایس ایم احسن نے ۴ اگست ۱۹۸۹ء مطابق یکم محرم الحرام ۱۴۱۰ھ بروز جمعہ بعمر ۶۸ سال کراچی میں رحلت کی۔ مرحوم کو ہفتہ کی سہ پہر تک پاکستان نیوی کے قبرستان واقع اسٹیڈیم روڈ کراچی میں پورے فوجی اعزاز کے ساتھ سپردِ خاک کیا گیا۔)

(۳۳)

"روشن نگینوی مقیم قصرِ بہشت"

۱۹۸۹ء

ملا جس وقت روشن کو	مکانِ جنتِ روشن
بنا سالِ اجل ان کا	"نشانِ جنتِ روشن"

۱۴۱۰ھ

(ممتاز شاعر جناب روشن نگینوی نے ۷ اگست ۱۹۸۹ء مطابق ۴ محرم الحرام ۱۴۱۰ھ بروز دوشنبہ بعمر ۶۴ سال انتقال فرمایا۔ تدفین راولپنڈی کے مقامی قبرستان میں منگل کے دن عمل میں آئی۔)

(۳۴)

"چوہدری محمد احسن عزیزِ باغِ جناں"

۱۹۸۹ء

چوہدری احسن بھی رحلت کر گئے ۔۔۔ صاحو! ہوں اس لیے رنجور میں
ان کی تاریخِ اجل نکلی شمیمؔ ۔۔۔ "چوہدری احسن بہشتِ نور میں"

۱۴۱۰ھ

(تحریکِ پاکستان کے ممتاز رہنما اور مصنّف چوہدری محمد احسن علیگ نے ۹ راگست ۱۹۸۹ء مطابق ۶ محرم الحرام ۱۴۱۰ھ ارشنبہ بعمر ۸۱ سال لاہور میں رحلت فرمائی۔ مرحوم کو اسی دن شام کو میاں میر کے قبرستان میں سپردِ خاک کر دیا گیا۔)

(۳۵)

"میاں امیر الدین رہ گیرِ باغِ جناں"

۱۹۸۹ء

چل بسے جب میاں امیر الدین ۔۔۔ اور ہوئے گلشنِ جناں کے امین
دل نے سالِ قضا شمیمؔ کہا ۔۔۔ "نجمِ خلقِ ارم امیر الدین"

۱۴۱۰ھ

(بزرگ سیاست داں، تحریکِ پاکستان کے نامور رہنما، انجمن حمایتِ اسلام کے صدر، مرکزیہ مجلسِ اقبال ورقائدِ اعظم کے معتمد ساتھی میاں امیر الدین نے ۱۰ راگست ۱۹۸۹ء مطابق ۷ محرم الحرام ۱۴۱۰ھ بروز پنج شنبہ بعمر ۱۰۱ سال رحلت فرمائی۔ مرحوم کا جسدِ خاکی اسی شام ان کے آبائی قبرستان میانی صاحب لاہور میں سپردِ لحد کیا گیا۔)

(۳۶)

"اندوہ ناک جدائی میر غوث بزنجو"

۱۹۸۹ء

کہ غوث بخش بزنجو نہیں رہے ہم میں ۔۔۔ خبر یہ کر گئی جب ملک کی فضا کو اداس
شمیمؔ مصرعِ تاریخِ انتقال ملا ۔۔۔ "وفاتِ میر بزنجو نشانِ مجلسِ یاس"

۱۴۱۰ھ

(بزرگ سیاست داں، بلوچستان کے سابق گورنر اور پی این پی کے سربراہ جناب میر غوث بزنجو نے ۱۱ راگست ۱۹۸۹ء مطابق ۸ محرم الحرام ۱۴۱۰ھ بروز جمعہ بعمر ۷۲ سال کراچی میں داعیِ اجل کو لبیک کہا۔ نعش بلوچستان لے جائی گئی اور مرحوم کو ہفتہ کے دن نال میں ان کے آبائی قبرستان میں سپردِ خاک کیا گیا۔)

(جاری)

گل ہائے رنگ رنگ
گجراتی کہانی

محمد مانکڈ / غلام مصطفیٰ

ہاشم کی بیوی

[گجراتی زبان کے مشہور ادیب، افسانہ نگار اور کالم نگار محمد مانکڈ کی ایک گجراتی کہانی کا اردو میں ترجمہ۔ یہ کہانی گجراتی کے مشہور میگزین "ابھیان" میں شائع ہوئی تھی۔]

پینتیس سال کی اپنی زندگی میں وہ کسی کو بھی کبھی خوب صورت نظر نہیں آئی شاید ہی کبھی کسی نے اسے زبیدہ بلایا ہو گا۔ جوبی۔۔۔، جو بیلی۔۔۔، جو بڈی۔۔۔ہی کہہ کر اسے پکارا جاتا تھا۔ انگیٹھی کے آر پار آڑی ترچھی کی طرح اس کے نام کی بھی آڑی ترچھی باز گشت ہی اسے سننے کو ملتی۔

پینتیس سال بیت گئے۔ جوان ــــ الہڑ جوانی۔۔۔۔ یہ الہڑ جوانی بھی اسے خوب صورت نہیں بنا سکی تھی اور آنے والا سال اسے زیادہ سے زیادہ بے ڈھب بنا رہا تھا۔ دکھ اور کام کاج کی تپش نے اس کے جسم کو روکھا اپنا کر رکھ دیا تھا۔ آگ میں تپی ہوئی کالی مٹی کی طرح سخت، سوکھے اور ویران کورے بالوں میں دھول اور لے رہتے۔ ناخنوں میں ڈھور ڈنگر کا گوبر بھرا رہتا۔ زبیدہ کی طرف شاید ہی کسی نے کبھی محبت سے دیکھا ہو۔ شوہر ہاشم نے بھی نہیں! ہاشم کے لیے اس کی بیوی باڑی (پائیں باغ) کی کھاری زمین کی طرح بارش میں بھی اُجاڑ کا رسی تھی۔

اور اب وہ مر چکی تھی ــــــ!

زبیدہ مر گئی تھی ــــــ!!

زندگی بھر وہ زمین اور کھیت کے ساتھ بھوتوں کی طرح ہانپا پائی کرتی رہی تھی۔ اب اسی زمین میں اسے دفن ورسکھ اور آرام ملے گا۔ دکھ سے تو بہر حال نجات مل ہی گئی۔ لیکن ابھی اس کی تجہیز و تکفین نہیں ہوئی تھی۔ ابھی دقت باقی تھا۔ پڑوس کے شہر سے جب تک مولوی صاحب نہ آجائے اس بدنصیب کو زمین میں دفن نہیں کر سکتے تھے۔

ہاشم اکیلا تھا۔ برسوں سے اکیلا رہتا تھا۔ ساری زندگی اس نے گاؤں سے دور اپنی باڑی میں بتائی تھی۔ باڑی بھی اس کی ملکیت (جو بنئے کے پاس گروی رکھی ہوئی تھی) تھی۔ اس میں ہی اس کی ایک کھولی تھی۔ زبیدہ نے آتے ہی گوبر کا ٹوکرا اٹھا لیا تھا اور مرتے دم تک وہ گوبر کا کھاد بناتی رہی تھی۔ پھاؤڑا، کدال، کلہاڑی، لوہے کی ٹوکریاں، بانس کی ٹوکریاں، مویشیوں کا فضلہ، پیشاب.... سردی، گرمی، بارش... موت زبیدہ کے لیے ابدی سکون لے کر آئی تھی۔ زندگی کے دکھوں اور پریشانیوں سے وہ چھوٹ چکی تھی۔ گیارہ لڑکے، دس بارہ مویشی، دھول، کھاد اور تکلیف! ان سب سے اسے چھٹی مل گئی تھی۔!

پچیس سال کی عمر میں زبیدہ ہاشم کے ساتھ بیاہ کر اس کے گھر آئی تھی۔ اس نے ہاشم کے پچھلے گھر کے پانچ پانچ لڑکوں کی پرورش کی تھی۔ ان کو بڑا کیا تھا۔ مصیبتوں کے دنوں میں خود اپنے بچوں سے بھی زیادہ گھر کے چوپایوں اور مویشیوں کو اس نے کھلایا پلایا تھا۔ دس سال کے عرصے میں وہ کبھی بھی باڑی چھوڑ کر شہر نہیں گئی تھی۔ صرف تین مرتبہ وہ گھر چھوڑ کر باہر گئی تھی۔ اور وہ بھی صرف پڑوس کے گاؤں تک ہی۔ شہر اس نے دیکھا ہی نہیں تھا۔ موٹر اس نے نہیں دیکھی تھی۔ بجلی کی بتی اس نے جلائی نہیں تھی۔ لوگ جب بولتی مشین کی باتیں کرتے تو وہ خدائے پاک کو یاد کرتی اور شیطان کو بددعائیں دیتی۔ آدمی نے بولتی مشین بنالی؟ مشین؟ بولتی؟ آدمی کی طرح؟..... توتوتو.....

آنے والی دنیا کی اسے کوئی خبر نہیں تھی۔ ریڈیو، ٹیلی ویژن، روبوٹ، نہیں تو وہ پاگل ہو جاتی۔ وہ تو گزرے ہوئے زمانے کی عورت تھی۔ اس کی باتیں سن کر آنے والی نسل کو تعجب ہوتا کہ وہ کوئی عورت تھی یا جانور۔ کام، کام، کام۔ صبح چار بجے سے لے کر رات تک باڑے کے ڈھور ڈنگر مویشیوں کا فضلہ پیشاب صاف کرتا۔ ان کو چارہ اور پانی دینا۔ کھیت اور مزدوری۔ آرام سے نہانے دھونے کی نوبت ہی چھوڑیے۔ وقت مل گیا تو ایک لوٹا پانی سر پر سے پورے بدن پر ڈال لیا... پل دو پل میں تو پھر وہی دھول، گرد و غبار! ہاتھوں میں چوپایوں کا گوبر اور بدن پر کھاد اور مٹی!

یہ سچ ہے کہ خدا نے انسان کو مٹی سے بنایا۔ زبیدہ یقیناً مٹی سے بنی ہوگی۔ سوکھی میلی کچیلی پھٹی ہوئی مٹی سے۔ اندھیرا ہو جاتا۔ سب سو جاتے۔ گھر کے چوپائے بھی جگالی کرتے کرتے لڑھک کر آنکھیں بند کر کے پڑ جاتے.... اس کے بعد ہی زبیدہ ذرا سا لیٹتی اور وہ بھی رات میں کچھ دیر کے لیے۔ آنکھ لگی نہ لگی کہ بس۔

ہاشم بھی سارا دن کام کرتا رہتا۔ سخت محنت مزدوری۔ اس کے عوض وہی پھٹے ہوئے کپڑے، بیمار بیمار ڈھور کے علاوہ کچھ نہیں ملتا۔ جتنی زیادہ سخت مزدوری کرتا اتنا ہی وہ غریبی میں ڈوبتا جاتا۔ اکیلا تھا، سگے سمبھندی سب تھے۔ لڑکوں کا جھمیلا اور زمین بنئے کے پاس گروی تھی۔ گویا وہ قسمت کی پوتھی میں زندگی گروی رکھ کر ہی پیدا ہوا تھا۔ جب اناج کی فصل اگاتا تو بارش ہی نہ ہوتی اور جب کپاس کی فصل کرتا تو موسلا دھار بارش ہوتی۔ آندھی، طوفان اور سیلاب آجاتا۔ سال کے آخر میں ہاشم ہاتھ پر ہاتھ دے کر بیٹھ جاتا۔ ایک آدھ ڈھور کم ہو جاتا یا پھر ایک آدھ بچہ گھر میں بڑھ جاتا... بس اسی طرح چلتا رہا۔

اور اب زبیدہ مر چکی تھی۔ گاڑی کا بیل جیسے بیچ راستے میں ہی پھسل جائے۔ ہاشم کی زندگی کی گاڑی ٹوٹ

ٹیڑھی ہو گئی تھی۔

پڑوس کے گاؤں سے پانچ سات مسلمان آگئے تھے جن میں دو تین عورتیں بھی تھیں۔ زبیدہ کی میت کو غسل دینے کی تیا ہو رہی تھی۔ بچے ننگ دھڑنگ باڑی میں بھٹک رہے تھے۔ کچھ باپ کے ساتھ گم صم بیٹھے تھے۔ باپ کی طرح انھیں بھی کچھ سو نہیں رہا تھا کہ کیا کریں۔ ہاشم کو مذہبی رسموں کی اور طور طریقوں کی خبر نہیں تھی۔ لوگ جو کرتے اسے صرف دیکھتا رہتا۔ گاؤں آئے ہوئے لوگ جان کاری رکھتے تھے۔ انھیں خدا کا کلمہ بھی آتا تھا۔ ہاشم تو بدھو تھا۔ بالکل جانور۔ . . . مالک کی مرضی!

شام ڈھل رہی تھی۔ مولوی صاحب کو لانے کے لیے گیے ہوئے لوگ اب تک شہر سے لوٹے نہیں تھے۔ اگر زبیدہ زندہ تو اس وقت باڑی کے مغرب یا شمال میں پانی نکالتے نکالتے ہانپ رہی ہوتی۔ کبھی کبھی تو وہ کیاریوں میں بہتے پانی کے بہاؤ روک کر ڈھور ڈنگر کے کام میں لگ جاتی۔ ہاشم کی زندگی بھی پانی کے بہاؤ کی طرح تھی . . . . لیکن اس کی آنکھوں سے آ ٹپکتے نہیں تھے۔ اس کا ایک گونگا بیل تھا۔ تین سال ہوئے قحط میں مر گیا تھا۔ اس وقت ہاشم اسی طرح گونگا گم صم ہو گیا تھا زبیدہ کی میت کو غسل دیا جا چکا تھا۔ ابھی تک مولوی صاحب آئے نہیں تھے۔ اندر عورتیں آپس میں باتیں کر ر تھیں۔ کسی نے کہا، ہاشم کو منھ دیکھنے اندر کمرے میں بھیجو۔ یہ سب عورتوں کے اپنے طور طریقے تھے۔ ان کی کتاب اور ان کا مذہ اپنا تھا۔ گاؤں کی مسلمان عورتوں کا رسم و رواج اور زمان و مکان کا اپنا انوکھا میزان ہوتا ہے۔ اور وہ اسی طریقے پر چلتی ہا — بیاہ ہو یا موت —!

ہاشم کو زبیدہ کا منھ دیکھنے اندر جانا تھا۔ اندر میت پڑی تھی۔ دو چھوٹے بچوں کو لے کر وہ اندر گیا۔

زبیدہ خاموش پڑی ہوئی تھی —! مغربی سرے کی ٹوٹی دیوار پر سے غروب ہوتے ہوئے سورج کی روشنی — دھن سنہری سی — اندر آ رہی تھی۔ زبیدہ نہائی دھوئی، دھلی ہوئی صاف ستھری، خاموش، پرسکون! بھینی بھینی زمین کی طرح ا نہائی ہوئی، پہلی مرتبہ۔ ندی کے پانی کی طرح شفاف چہرہ تھا۔ بھیگے ہوئے بالوں کو گوندھ کر سینے پہ رکھا گیا تھا۔ گردن کے گر میل نہیں تھا۔ انگلیوں میں تو کیا، ناخونوں میں بھی گوبر نہیں تھا۔ کفن سے حنا کے عطر کی بھینی بھینی خوشبو آ رہی تھی۔ . . .

"یہ زبیدہ! یہ زبیدہ؟ یہ زبیدہ ہے کہ کوئی ایسا؟ ہاشم نے آنکھیں موند لیں!

دہلیز کے پاس بیٹھی ہوئی ایک بوڑھی 'لاالہ' کہتی ہوئی اٹھی اور باہر چلی گئی۔ ہاشم کے پاس کھڑے ہوئے چھوٹے بچے اس خوب صورت عورت کو ایک نظر دیکھ رہے تھے۔ اس کے ناخون کیسے چمک رہے تھے۔ نہیں بھائی کہیں اٹھ کر پاس آ بیٹھی تو؟ پھر وہ وہا ں سے بھاگ گئے۔

ہاشم دم بخود کھڑا تھا۔ اس نے آنکھیں کھولیں۔ کمرے میں کوئی نہیں تھا۔ شام کا سا سکون تھا۔ اس نے دھیرے سے جھک کر جوبی کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیا۔ ناخن کی چمک کو چھو کر دیکھا اور اس کو چوم لیا۔ اس کی آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے۔

اس کے بعد وہ اپنے لڑکوں سے ہمیشہ کہتا رہتا۔ "لڑکو! تمہاری ماں بہت خوب صورت تھی — . . . . کریم، غفار، جیبو، تم بہت چھوٹے تھے۔ تم نے اسے دیکھا ہی نہیں تھا۔ وہ بہت سندر تھی، بڑی سمجھ دار . . . . !"

حبیب بینک کی ایک اور خدمت
Habib Bank Limited
حبیب بینک ٹریولرز چیکس
دنیا کا سفر بے خوف و خطر
TWENTY U S DOLLARS
Habib Bank Limited
SPECIMEN
$20
VISA
SPECIMEN

گل ہائے رنگ رنگ

سندھی کہانی

ایشور چند / شاہین فاطمہ

احساس

روز کی طرح وہ آج بھی چپ چاپ بالکنی پر کھڑی ہوگئی۔ سترھویں منزل سے نیچے جھانکتے ہوئے اسے انسانوں کا ہجوم
ر کی طرح اِدھر اُدھر لہراتا اور موجیں مارتا نظر آیا۔

اسے اپنی شادی کے وہ دن یاد آنے لگے جب اس کی سہیلیوں نے رشک بھرے انداز میں کہا تھا کہ وہ بڑی قسمت والی
ایک چھوٹے سے گاؤں سے نکل کر شہر جا رہی ہے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ اور وہ بھی ایسے شہر جو دنیا کے بڑے شہروں میں سے ایک ہے۔

اس بات کی خوشی تو اسے بھی بہت تھی۔ اس نے سنا تھا کہ بمبئی ایک ایسا شہر ہے جہاں کبھی کوئی بور نہیں ہوتا۔ وہاں
چوبیس گھنٹے مشینوں کی طرح چلتا اور بھاگتا رہتا ہے۔ سورج کب طلوع ہوتا ہے اور کب غروب یہ احساس کسی کو نہ تھا۔

مگر اب اسے معلوم ہو گیا تھا کہ اتنی مصروف زندگی گزارنے کے بعد بھی یہاں انسان کتنا بور ہو جاتا ہے۔

گاؤں میں وہ ہر اس شخص سے واقف تھی جو اس کے گھر کے آس پاس رہتا تھا۔ اگر نام سے نہیں تو صورت سے ضرور
تھی لیکن یہاں جب وہ اپنے فلیٹ کی بالکنی پر کھڑی ہوتی تو عمارت سے نکلنے والا ہر شخص اسے اجنبی نظر آتا۔

آج بھی اسے یاد ہے کہ گاؤں میں عورتیں گھر کے کام کاج سے فارغ ہو کر اپنے کچے پکے مکانوں کے باہر بنے چبوتروں
دنیا جہان کی باتیں کیا کرتیں۔ باتوں میں انھیں پتا بھی نہ چلتا کہ کب سورج ڈوب گیا اور کب شام ہو گئی۔

لیکن یہاں دن بھر وہ اکیلی گھر میں رہتی۔ پڑوس میں رہنے والے بھی یہاں دوسرے فلیٹ میں رہنے والوں کو نہیں
۔ جان پہچان تو دور کی بات ہے یہاں کوئی ایک دوسرے کے نام سے بھی واقف نہیں۔ یہاں ہر شخص کا تعارف اس کے
ے پر لگی نام کی تختی تک محدود ہے۔

اس کا شوہر بریف کیس لے کر روز صبح آٹھ بجے کے قریب گھر سے نکل جاتا۔ گھر کی صفائی ستھرائی اور جھاڑو پوچھا کرکے
دس بجے کے قریب چلی جاتی۔ اس کے بعد گھر میں وہ اکیلی رہ جاتی۔ شام ہونے کے انتظار میں وہ کبھی بالکنی پر کھڑی ہو جاتی
نے کے لیے ریڈیو پر کوئی پروگرام سن لیتی۔ اس پر بھی سکون نہیں ملتا تو لیٹ جاتی۔ لیٹے لیٹے چھت کو یا چھت میں لگے
تی رہتی۔

صبح اور شام کے درمیان کا یہ وقفہ اس کے لیے ناقابلِ برداشت ہو جاتا ہے۔ اسے معلوم تھا کہ شام چھ بجے کے قریب فلیٹ کی گھنٹی بجے گی تب اس کا شوہر تھکا ماندہ گھر واپس آئے گا۔ درمیان میں اگر کوئی گھنٹی بجتی بھی تو وہ سمجھ جاتی کہ ماسی یا پوسٹ مین کے علاوہ اور کوئی نہ ہو گا۔

شروع شروع میں گاؤں کے خاموش ماحول سے دور شور و غل سے بھرے اس بڑے شہر میں آ کر اسے بہت اچھا لگا۔ آسمان کو چھوتی عمارت کی سترھویں منزل پر بنے اس چھوٹے سے خوبصورت فلیٹ میں بس وہ تھی اور اس کا شوہر۔ اپنے فلیٹ کی بالکنی پر سے جب وہ نیچے جھانکتی تو انسانوں کا جمِ غفیر چیونٹیوں کی طرح رینگتا نظر آتا تب اسے یہ سب بڑا اچھا لگتا تھا۔

لیکن اس کی یہ خوشی چند روزہ تھی۔ کچھ دن کے بعد اسے معلوم ہوا کہ اس بڑے شہر میں وہ صرف تین لوگوں کو جانتی پہچانتی ہے..... ایک اس کا شوہر، دوسری ماسی اور تیسرا پوسٹ مین۔ باقی لاکھوں کی بھیڑ میں نہ وہ کسی کو جانتی اور نہ کوئی اسے پہچانتا۔

صبح شوہر کے جانے کے بعد گھر میں وہ اکیلی رہ جاتی اور رہ جاتا سکوت اور سناٹا..... گھر کے خاموش در و دیوار..... ساکت پڑا گھر کا فرنیچر..... جب ہوا کا کوئی تیز جھونکا کمرے کی دیوار پر لگے کیلنڈر کو زور سے ہلاتا تب کبھی کبھی خوف سے وہ کانپ اٹھتی۔ پھر بلا وجہ کے خوف پر خود ہی مسکرا بھی دیتی..... مجموعی طور پر اس پورے ماحول میں وہ خود کو اجنبی محسوس کرنے لگی۔

کبھی کبھی وہ شوکیس میں رکھی گڑیا کو نکال کر اس سے کھیلنے لگتی۔ اسے محسوس ہوتا جیسے یہ گڑیا خود اس کی بیٹی ہے۔ یہ سوچ کر وہ اس سے باتیں کرنے لگتی..... آخر ایک بے جان گڑیا سے وہ کب تک باتیں کرتی؟..... دیر تک وہ اسے اپنی گود میں سُلا کر اپنا دل بہلاتی..... تھک ہار کر وہ گڑیا کو واپس شوکیس میں رکھ دیتی۔

شام کو اس کا تھکا ہارا شوہر گھر لوٹتا۔ بریف کیس ایک طرف رکھ کر ٹائی کی ناٹ ڈھیلی کرتا اور بنا جوتے اتارے دھڑام سے بستر پر ڈھیر ہو جاتا۔ ایک میٹھی مسکراہٹ سے وہ شوہر کا استقبال کرتی۔ فوراً چائے بنا کر لاتی۔ چائے کے دوران اس کا شوہر اس سے دو چار میٹھی میٹھی باتیں کرتا۔ کچھ دیر بعد جب وہ تازہ دم ہو جاتا تب پھر اپنے کاغذات نکال کر کام میں مشغول ہو جاتا۔

اس کی دن بھر کی بوریت کچھ دیر کے لیے اسی طرح ختم ہو جاتی جیسے بجلی چند لمحوں کے لیے کوند کر غائب ہو جائے۔ شوہر کے کام میں مشغول ہو جانے سے اس کی بوریت پھر بڑھ جاتی۔ تب اپنا دل بہلانے کے لیے وہ ٹی وی دیکھنے لگتی۔ ٹی وی کے کھل جانے سے اس کی خوشیاں پھر لوٹ آتیں۔ اسے محسوس ہوتا جیسے اس کے گھر مہمان آئے ہوئے ہیں۔ وہ ان سب کے درمیان بیٹھی بات چیت میں حصہ لے رہی ہے۔

ٹی وی پروگرام کے درمیان جب کچھ لوگ ہنستے تو وہ خود بھی ان کی ہنسی میں شامل ہو جاتی۔ کبھی کبھی اسے محسوس ہوتا جیسے ٹی وی کے پروگرام میں شامل سب لوگ اس کے جاننے والے دوست احباب ہیں۔ اس کا دل کبھی کبھی چاہتا کہ وہ اپنا ہاتھ آگے

بڑھا کر ان سے ہاتھ ملائے اور گپ شپ کرے۔ لیکن جب زندگی کی حقیقتوں سے اس کا سامنا ہوتا تب یوں لگتا کہ یہ سب ناممکن ہے تب وہ خود کو بہت اکیلا محسوس کرتی۔

دن یونہی گزرتے رہے۔ ایک دن ایک عجیب واردات ہو گئی۔ اس عمارت کی اکیسویں منزل کے فلیٹ سے ایک عورت نے پہلے اپنی بچی کو نیچے پھینکا پھر خود چھلانگ لگا دی۔ پوری عمارت میں شور مچ گیا۔ نیچے ایک ہجوم جمع ہو گیا۔ وہ خود بھی نیچے گئی۔ اس نے دیکھا بچی کا سر ناریل کی طرح پھوٹ کر بھیجہ باہر آ گیا ہے جب کہ ماں کے چہرے کی پہچان مشکل تھی۔ اس ہیبت ناک منظر کو دیکھ کر وہ خوف سے لرز گئی۔ ۔ ۔ ۔ حواس درست ہوتے پر اسے خیال آیا کہ اس عورت نے خودکشی کیوں کی؟ ۔ ۔ ۔ ۔ اسے کیا غم ۔ ۔ ۔ ۔ کیا تکلیف تھی؟

اس عمارت میں رہنے والے تقریباً سب ہی لوگ خوش و خرم تھے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ دولت سے تو دنیا کا سارا سکھ، چین خریدا جا سکتا ہے۔ اس عورت کو کیا تکلیف ہو گی جو اس نے خود کو بھی مارا اور اپنی بچی کی جان بھی لی۔

دل پر پتھر رکھ کر وہ کسی طرح اوپر آئی۔ اوپر آنے کے بعد اس نے پھر نیچے جھانک کر دیکھا۔ ہجوم کے درمیان دونوں لاشیں یونہی بے جان پڑی تھیں ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ اسے اوپر آ کر ایسا لگا جیسے زمین پر اس کی گڑیا بے جان پڑی ہے اور پاس ہی خود اس کی لاش ہے۔ یہ احساس ہوتے ہی خوف کے مارے وہ پیچھے کھسک آئی۔

بھاری قدموں سے وہ پھر صوفے پر آ کر بیٹھ گئی۔ اس عورت کا خیال اسے پھر آنے لگا ۔ ۔ ۔ ۔ اسے کیا تکلیف تھی؟ ۔ ۔ ۔ ۔ اس عمارت میں رہنے والے سب ہی لوگ تو خوش و خرم ہیں ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ دولت سے سب سکھ خریدے جا سکتے ہیں۔ کیا کچھ سکھ ایسے بھی ہیں جو دولت سے حاصل نہیں کیے جا سکتے؟

تب وہ اپنے بارے میں سوچنے لگی ۔ ۔ ۔ ۔ میرے پاس بھی تو سب کچھ ہے ۔ ۔ ۔ ۔ اچھا شوہر ۔ ۔ ۔ ۔ چھوٹا سا خوب صورت فلیٹ، ٹی وی، فریج اور سب جدید آسائشیں ۔ ۔ ۔ ۔ پھر کیا وہ خوش ہے؟ ۔ ۔ ۔ ۔ سکون سے ہے؟

خود سے یہ سوال اس نے بار بار کیا مگر کوئی معقول جواب نہ ملا۔

پھر وہ کیوں زندہ ہے؟ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ یہ سوال بجلی کی طرح اس کے ذہن میں بار بار کوندتے لگا ۔ ۔ ۔ وہ کیوں زندہ ہے؟ ۔ ۔ ۔ ۔ کیا زندہ رہنا ہی زندگی ہے؟

نہ جانے کیا سوچ کر اس نے شوکیس سے اپنی گڑیا نکال کر گود میں لے لی۔

بالکنی سے اس نے ایک بار پھر نیچے جھانک کر دیکھا۔

ہجوم ویسا ہی تھا ۔ ۔ ۔ ۔ بس چہرے بدل گئے تھے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ دونوں لاشیں ابھی تک ویسے ہی پڑی تھیں۔ اس نے ایک بار بچی کی لاش کی طرف دیکھا اور پھر گود والی گڑیا کی طرف ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ اور نہ جانے کیا سوچ کر اس نے گڑیا کو دیکھتے ہی دیکھتے نیچے پھینک دیا ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ اور اپنی آنکھیں خوف سے بند کر لیں۔

آنکھیں بند کر لینے کے بعد پھر اسے ہمت نہ ہوئی کہ وہ نیچے جھانکے۔

آنکھوں کو بند کیے ہوئے وہ کمرے میں لوٹ آئی ۔ ۔ ۔ اور مضطرب سے بستر پر گر کر سسکیاں لینے لگی ۔ ۔ ۔ ۔

..... اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اس نے ایسا کیوں کیا؟..... وہ کیا احساس تھا..... کیسا ردِّ عمل تھا..... سوچتے سوچتے نہ معلوم کب اس کی آنکھ لگ گئی۔

شام کو جب کئی بار گھنٹی بجی تب گھبرا کر اس نے دروازہ کھولا اور شوہر کو سامنے پا کر وہ اس کے سینے سے چمٹ گئی۔

شوہر حیران پریشان کہ اس کی بیوی کو کیا ہوا.......

اور جب بیوی کے چہرے پر اس کی نظر ٹھہری تو وہاں آنسو موتی بن بن کر گالوں پر ڈھلک رہے تھے۔

گل ہائے رنگ رنگ

جنوبی افریقہ کی ایک نظم

اوپانھانڈو تھمکولو/قیصر امام گیلانی

وقت ایک پہیے کی مانند

وقت ایک پہیے کی مانند ہے
جس کی گردش میں سارا زمانہ
کبھی اِس طرف اور کبھی اُس طرف
آج باری میری کل تمہاری

اگر بھوک آج اپنے دامن میں ہے
کل یہی بھوک تیرا مقدّر!
آج بے گھر ہوں میں بے سہارا ہوں میں
تیرے سر پہ بھی کل کوئی سایہ نہ ہو گا
تو بھی میری طرح مارا مارا پھرے گا

میرے پیروں کی زنجیر اور قید و بند
ـــــ جو کہ تیری عطا ہے
آج میں قید میں اپنی ہستی کے دن گن رہا ہوں
کل یہی قید و بند تیرا مسکن بنے گا
کیونکہ ـــ وقت ایک پہیے کی مانند ہے
جس کی گردش میں سارا زمانہ
کبھی اِس طرف اور کبھی اُس طرف
آج باری میری کل تمہاری

شیخ ایاز/ رفیق احمد نقش

نظم

یہ تھر کے کنویں

جن کی گہرائی دھرتی کے دل تک پہنچتی ہے

اور جو اس نیلگوں مہربان آسمان کو

جس میں بادل ہجوم کرنے والے ہیں،

دکھاتے ہیں دھرتی کا دل

جو لہو میں ڈوبا ہوا ہے

اور جس میں دن کو کروڑوں کرنیں

اپنے تیر چبھو جاتی ہیں

اے گھنگھور گھٹا!

تجھے کب آنا ہے؟

یہ نہ ہو کہ کنویں سوکھ جائیں

اور دھرتی کا دل
دھرتی میں تڑپ کر مر جائے

گل ہائے رنگ رنگ

سندھی نظمیں

بھگوان ٹلوانی/غلام مصطفیٰ آفاق

چاند — دو امپریشن

(۱)

یہ ستارے
آسمان میں بکھرے ہوئے ستارے!
غریب کی جھولی میں سے
گرے ہوئے
اِدھر اُدھر بکھرے ہوئے چنوں کی مانند ہیں
اور چاند
ایک غریب بچّے کی مانند
روزانہ
طلوع ہوتا ہے گھسٹتا ہوا
چنے سمیٹنے کے لیے۔

(۲)

چاند
آدھا گول چاند
بادلوں میں نصف چھپا ہوا چاند
جیسے
بھوکے بھاگتے ہوئے
کتّے کے منہ میں روٹی۔

امداد حسینی/غلام مصطفیٰ آفاق

منزل

میری راہیں
گھومتی
بھٹکتی
تھکتی
ٹوٹتی
تمہارے دروازے پر آکر
ختم ہو جاتی ہیں۔

شرجیل/غلام مصطفیٰ آفاق

میرا من

ساون کی برسات کا
اوّلین قطرہ
جب میرے من پر گرتا ہے
تم یاد آجاتی ہو
میرا من
کسی چکنے پتھر کی مورتی تو نہیں!
جس پر سے
پانی پھسل جائے۔

ڈاکٹر انور سدید

کچھ وقت ہندوستانی کتابوں کے ساتھ

مضامینِ رشید ـــــــ رشید احمد صدیقی

مکتبۂ جامعہ نے پچیس تیس سال قبل اردو کے منفرد مزاح نگار رشید احمد صدیقی کے مضامین کا مجموعہ شائع ہوا تو پورے ہندوستان میں بشاشت کی ایک تازہ لہر پھیل گئی۔ اس کتاب کے بیشتر مضامین اس سے قبل رسائل میں چھپ چکے تھے۔ اور رشید صاحب ان پر داد سمیٹ چکے تھے لیکن جب یہ مضامین کتابی صورت میں آئے تو یوں محسوس کیا گیا جیسے مسکراہٹوں کو گلدستے کی صورت دے دی گئی اور گلدستے میں بھی رنگ رنگ کے متنوع پھول جمع کیے گئے ہیں۔

رشید صاحب کے مضامین کا یہ مجموعہ عرصے سے نایاب تھا۔ انجمن ترقی اردو ہند نے اسے اپنے اہتمام سے چھاپنے کا منصوبہ بنایا تو رشید صاحب کی طرف رجوع کیا جو اس وقت حیات تھے۔ انھوں نے اپنی فطری انکساری کو روبہ عمل لاتے ہوئے پہلے تو انکار کیا لیکن آخر مان گئے اور ان مضامین پر نہ صرف نظرِ ثانی پر مائل ہو گئے بلکہ ان کے بارے میں اپنی رائے بھی لکھ دی۔ یہ رائے رشید صاحب کی شائستہ مزاجی کے ایک منفرد نقش کی حیثیت رکھتی ہے۔ وجہ تالیف و تحریر کے سلسلے میں لکھتے ہیں کہ یہ مضامین :

> "مختلف رسالوں کے لیے مخصوص حالات میں کبھی اپنی مرضی سے، کبھی دوستوں اور عزیزوں کے اصرار پر لکھے۔ جو بات جس طرح ذہن میں آئی لکھ ڈالی۔ ایسا نہیں ہونا چاہیے تھا لیکن کیا کرتا عقل سے شرمساری کے وہ دن ہی ایسے تھے۔ اب تو بہت سے وہ مواقع اور واقعات بھی یاد نہیں رہے جن کی طرف ان مضامین میں اشارے ملتے ہیں۔ گو اس زمانے میں ان کا بڑا چرچا تھا۔ ایسا نہ ہوتا تو وہ میرے اس "صحیفۂ اعمال" میں درج کیسے ہو جاتے۔"

"صحیفۂ اعمال" کا ذکر آیا ہے تو رشید صاحب نے اس کی سزا اور جزا کا ذکر بھی بڑی شگفتہ بیانی سے کیا ہے۔ لکھتے ہیں:

> "اب معلوم ہوا کہ آدمی فرشتوں ہی کے لکھے پر نہیں پکڑا جاتا اپنے لکھے پر اور زیادہ پکڑا جاتا ہے۔ فرشتوں کی تحریر پر تو ممکن ہے کہ آخرت میں بخشائش کی کوئی صورت پیدا ہو جائے۔ اپنی تحریر پر دنیا میں کوئی نہیں

بخشا جاتا۔ اور کیا معلوم فرشتوں کا نام کس مصلحت سے لیا جاتا ہے۔ ورنہ ہمارا نامۂ اعمال ہمارے سوا دوسرا کوئی لکھ ہی نہیں سکتا۔ چہ جائیکہ وہ صرف فرشتہ ہو۔ یہ اور بات ہے کہ وہ دستاویز پہلے ہی سے تصنیف شدہ موجود ہو جس کو بقول غالب ہم اپنے اعمال میں نقل مطابق اصل کرتے رہتے ہوں۔"

"مضامین رشید" کے زیر نظر ایڈیشن میں اگرچہ رشید صاحب نے کاٹ چھانٹ سے کام لیا ہے۔ بعض مضامین حذف کر کے ان کے بجائے دوسرے رکھ دیے ہیں تاہم اس سے یہ حقیقت اپنی جگہ پر قائم ہے کہ انھوں نے شخصیات، مناظر اور واقعات کو جس نظر سے دیکھا تھا اور ریشاشت نکھاری تھی وہ اب بھی قائم ہے اور اتنا عرصہ گزر جانے کے باوجود اس کتاب کی مسکراہٹیں باسی نہیں ہوئیں۔ وجہ یہ کہ رشید صاحب کے تہذیبی قلم اور شائستہ مزاجی نے مزاح کو تضحیک کے لیے استعمال نہیں کیا اور پھبتی سے "نقصان ہمسایہ" کرنے کی کبھی کوشش نہیں کی۔ چنانچہ ان کے ہاں جو مزاح ابھرا وہ سدا بہار تھا۔ اور اس سے جو شرمندی کے جوہر ابھرے وہ ہر زمانے کو روشنی عطا کر سکتے تھے۔ مثال کے طور پر "سرگزشت عہد گل" میں فرماتے ہیں

"میں تنقید نگاری کی بڑی قدر کرتا ہوں۔ اس لیے کہ اسے شعر و ادب کا ضمیر سمجھتا ہوں۔ وہ ہماری عزت افزائی یا چشم نمائی نہ کرے تو ہم شعر و ادب کی ذمہ داری کو نہ سمجھ سکیں نہ اس سے عہدہ برآ ہو سکیں لیکن اگر تنقید نگار اپنے آپ کو شعر و ادب کا ضمیر سمجھنے کے بجائے کچھ اور سمجھے تو وہ یقیناً ہمارے احترام و حمایت کا سزاوار نہیں ہے۔"

رشید صاحب نے یہ بات خدا جانے کس عالم میں لکھی تھی اور نہ جانے کون لوگ ان کے مخاطب تھے۔ لیکن ان چند جملوں پر غور کیجیے تو یوں لگتا ہے کہ یہ ماضی کے نقاد کے مقابلے میں ہمارے عہد کے نقاد پر زیادہ صادق آتے ہیں اور نقاد کو اس آئینے میں اپنی بگڑی ہوئی صورت دیکھنے کا موقع عطا کرتے ہیں۔

اقبال احمد خاں سہیل کے ذکر میں دیکھیے کیسے گل کھلاتے ہیں۔

" انگریزی میں نیاز مند تھے، ریاضی سے دلچسپی تھی، سائنس سے قطعاً ناآشنا، ان کے علاوہ کالج میں درسیات کے سلسلے میں جتنے مضامین تھے ہر ایک پر عبور تھا۔ جدید ترین نظریات سے آشنا تھے۔ ذہانت اور حافظے کا حال یہ تھا کہ جس چیز کو عمر میں کبھی کبھار دیکھا یا پڑھا تھا اس کی ادنیٰ جزئیات پر بھی اتنی قدرت تھی کہ اس پر نہایت اعتماد کے ساتھ درس دے سکتے تھے۔ مرشد ڈاکٹر ذاکر حسین خاں کے قائل تھے، اکثر فرماتے " ذاکر کی ذہانت اور فطانت تک پہنچنا آسان نہیں ہے۔ کیا کروں خرابی صحت نے برباد کر دیا۔ ورنہ اس عمر میں بھی ایسا ہی کرتا۔"

شخصیات کے اس پُر لطف تذکرے میں رشید صاحب کے ایک معرکہ آرا مضمون "ارہر کے کھیت" کا ذکر ضروری ہے۔ اب تو خیر دیہاتوں کی شکل و صورت شہروں جیسی ہو گئی ہے اور ارہر کے کھیت ویران ہو گئے ہیں یا اس مصرف میں نہیں لائے جا رہے جو رشید صاحب کے زمانے میں عام تھا لیکن دیکھیے کہ رشید صاحب نے "ارہر کے کھیت" کو کیسی جادوانی کیفیت عطا کر دی ہے۔ لکھتے ہیں:

"ادہر کا کھیت دیہات کی زنانہ پارلیمنٹ ہے۔ کونسل اور اسمبلی کا تصور یہیں سے لیا گیا ہے۔ گاؤں کا چھوٹا بڑا واقعہ یہاں معرضِ بحث میں آتا ہے۔ فلاں کی شادی کب اور کہاں ہو رہی ہے؟ دار وغہ جی کیوں آئے اور کیا لے کر گئے؟ پٹواری کی بیوی نے اس سال کون کون سے نئے زیور بنوائے۔ رکمینا کے بچے کیوں پیدا نہیں ہوتے اور سکھیا کے حمل کیسے ٹھہرا؟ ایک نے کہا "میری گائے کی بچھیا ہوگی" دوسری بولی پہلوٹھی کی بچھیا ہو چکی ہے۔ اب کے بچھوا ہوگا۔ اس پر اختلافِ آرا ہوا اور ہمارے لیڈروں کی طرح دونوں بھول گئیں کہ دراصل کس شغل میں مصروف تھیں اور اب کیا ہو رہا تھا۔ ایک غوغا بلند ہوا بھگدڑ مچ گئی۔ کھیت کے چاروں طرف سے مرد، عورت، بچے، گیدڑ، کتے، لومڑی، بن بلاؤ نکلنے بھاگنے لگے جیسے اسمبلی میں بم گرا ہو۔"

اس کتاب میں "وکیل صاحب"۔ "مثلث"۔ "گواہ"۔ "شیطان کی آنت"۔ "چارپائی"۔ "پاسبان" جیسے ٹرکہ آرا مضامین شامل ہیں۔ پیش لفظ سمیت مضامین کی تعداد ۲۱ ہے۔ ۲۳۸ صفحات کے اس مجموعے کو خندۂ گل سمجھیے جن کا ہ کرتے ہوئے طبیعت نہیں بھرتی اور پھیپھڑے تازہ آکسیجن کے لیے مزید مطالعے کا تقاضا کرتے ہیں۔ انجمن ترقی اردو ہند ے اسے سلیقے اور خوبصورتی سے چھاپا ہے اور قیمت بھی معمولی ہے۔ صرف ۳۲ روپے۔

نئی تذکرے ______ ڈاکٹر عابد مجید

اردو زبان کی جائے پیدائش کے بارے میں اگرچہ محققین کے بہت سے نظریات گردش میں ہیں اور ڈاکٹر محمود شیرانی کا یہ ؤقف بھی زیرِ بحث ہے کہ اردو پنجاب میں پیدا ہوئی تھی اور اس زبان کے پہلے شاعر مسعود سعد سلمان تھے، تاہم اس حقیقت سے نکار ممکن نہیں کہ اردو زبان کا پہلا ادب خطۂ دکن میں تخلیق ہوا۔ اس ادب کی تحقیق و دریافت میں ایک زمانے میں ڈاکٹر محی الدین ادری زور اور مولوی عبدالحق صاحب کو ممتاز و موقر تسلیم کیا جاتا تھا۔ اور ان کی یہ حیثیت اب بھی قائم ہے۔ انھیں کی تحقیقات ، ثمرات نے تحقیق میں دکنیات کا علیحدہ شعبہ متعارف کرایا جس میں نصیر الدین ہاشمی، ڈاکٹر جمیل جالبی، مبارز الدین رفعت لٹر سیدہ جعفر اور متعدد دوسرے محققین کو گم شدہ نوادرات کی بازیافت کا شرف حاصل ہوا اور اس طرح سابقہ نتائج کا یا پلٹ گئی۔ ڈاکٹر مجید بیدار جو مولانا آزاد کالج اورنگ آباد میں شعبۂ اردو میں استاد ہیں اسی سلسلے کی ایک تابندہ شخصیت ہیں۔ انھوں نے پی ایچ ڈی کرنے کا ارادہ کیا تو دکنی تذکروں کی تحقیق کا موضوع منتخب کیا۔ اب ان کی تحقیق پر نہیں نہ صرف پی ایچ ڈی کی ڈگری سے فیضیاب کیا گیا ہے بلکہ ان کی تحقیق کا ثمر شیریں چھپ کر اہل ادب تک بھی پہنچ گیا ہے۔

"دکنی تذکرے" سات ابواب پر مشتمل کتاب ہے۔ ڈاکٹر مجید بیدار صاحب نے اس موضوع کا انتخاب اس لیے کیا تھا کہ اولاً بہت سے تذکرے مخطوطوں کی صورت میں پڑے تھے۔ ثانیاً معراج ناموں، سیر و مناقب، پند و نصائح، داستانوں اور مذہبی قصوں کے برعکس دکنی تذکروں پر تحقیقی نظر ڈالنے کی کوشش نہیں کی گئی تھی۔ جن لوگوں نے اس مشکل پتھر کو اٹھانے کی کوشش کی انھوں نے اپنی توجہ زیادہ تر مطبوعہ تذکروں تک محدود رکھی۔ اس سب کے علی الرغم ڈاکٹر مجید بیدار

کو یہ موضوع اس لیے زرخیز محسوس ہوا کہ "اس صنفِ نثر میں ہزاروں قسم کی جدّتیں روا رکھی گئی تھیں" ڈاکٹر صاحب کا یہ مقالہ محض تذکرہ شماری کا فرض ادا نہیں کرتا بلکہ اس کی خوبی یہ ہے کہ انھوں نے اولاً تذکرے کے فنّی آثار دریافت کیے ہیں ثانیاً دکنی تذکروں کی امتیازی خصوصیات دریافت کی ہیں اور آخر میں ایک باب میں دکنی تذکروں کی اہمیت اور افادیت کو اجاگر کیا ہے۔ ایک باب غیر مطبوعہ دکنی تذکروں کے تحقیقی جائزے کے لیے وقف کیا گیا ہے اور آخر میں کتابیات میں مطبوعہ اور غیر مطبوعہ تذکروں کی فہرست بھی شامل کر دی ہے۔ زمانی اعتبار سے یہ کتاب آصفی دور تک کے تذکروں کا احاطہ کرتی ہے۔ اور ہمارے سامنے ڈاکٹر صاحب کی دکنی ادب سے محبّت، اردو سے خلوص اور تحقیقی لگن کا روشن نقش ابھارتی ہے۔

مجھے یہ اعزاز حاصل ہے کہ اورنگ آباد میں ڈاکٹر عابد مجید صاحب سے ملاقات کا موقع ملا۔ ان کی نوجوان آنکھوں میں وہ چمک نظر آئی جو تحقیق کی جاں کاہ محنت کے بعد بھی زندہ رہتی ہے۔ اہم بات یہ ہے کہ وہ اپنے اس تحقیقی کام پر چنداں نازاں نہیں تھے۔ بلکہ مزید متعدد ادبی کاموں کی فہرست ان کے پاس موجود تھی جو ان دنوں ڈاکٹر صاحب کے زیرِ عمل تھے۔ میں نے "دکنی تذکرے" پاکستان میں واپس آکر پڑھی اور خوشی ہوئی کہ یہ کام ڈاکٹر مجید بیدار کے سلیقہ مند ہاتھوں نے سرانجام دیا۔ ضخامت ۴۷۲ صفحات اور قیمت ساٹھ روپے ہے۔ ملنے کا پتا: مکتبہ شاداب۔ نواب پورہ۔ اورنگ آباد۔

دلّی والے ـــــ سیّد ضمیر حسین دہلوی

"ڈاکٹر فیلن جس کی انگریزی اردو ڈکشنری مشہور ہے، اس گھمنڈ میں تھے کہ انھیں اہلِ زبان سے کہیں زیادہ اردو آگئی ہے۔ سیّد احمد دہلوی، مؤلف فرہنگ آصفیہ نے صاحب کو بتایا کہ دلّی کے شرفا کا تو ذکر ہی کیا، آپ چھوٹی امّت جتنی اردو بھی نہیں جانتے۔ فیلن صاحب ان کی یہ بات سن کر سرخ ہوگئے، بولے "آپ میرا امتحان لیجیے"۔ اتنے میں ایک مہترانی اپنا ٹھیکرا اُٹھائے سامنے سے گزری۔ سیّد صاحب نے کہا۔ ذرا اسی سے بات کر لیجیے۔ ہاتھ کنگن کو آرسی کیا ہے؟" صاحب نے کہا "بلاؤ اسے"۔ سیّد صاحب نے مہترانی کو آواز دی۔ "اے بوا! ذرا یہاں آنا۔ صاحب تم سے بات کرنا چاہتے ہیں"۔ مہترانی نے آکر کہا "فرمائیے کیا بات کرنی چاہتے ہیں؟" صاحب نے کہا "تم ہم سے کچھ پوچھو؟" وہ سٹ پٹا گئی کہ یہ گورا آخر چاہتا کیا ہے؟ کہیں سٹھیا تو نہیں گیا مُوا۔ سیّد صاحب نے کہا "تم ان سے کسی محاورے کے معنی پوچھو؟" مہترانی نے کہا "میں اس ٹوکرے کو ڈلاؤ پر ڈال آؤں پھر پوچھوں گی، صاحب بغلیں جھانکتے رہ جائیں گے"۔ ڈاکٹر فیلن کے کان کھڑے ہوئے کہ مہترانی ایک ہی فقرے میں دو باتیں ایسی کہہ گئی جو مجھے معلوم نہیں۔"

یہ مختصر سی کتاب جو صرف ۳۲ صفحات پر مشتمل ہے ایسے ہی دل چسپ واقعات کا مرقع ہے اور مہترانی بھی رانی نظر آنے لگتی ہے۔ اس رانی کی ایک جھلک سیّد ضمیر حسین دہلوی کی زبان میں دیکھیے۔

"دلّی کی مہترانیوں کا قیاس آج کل کی مہترانیوں پر نہ کیجیے۔ ان کی زبان ہی ستھری نہ تھی کپڑے بھی صاف ستھرے پہنتی تھیں گلے میں موتیا کا موٹا سا کنٹھا دونوں ہاتھ چاندی کی چوڑیوں سے بھرے ہوئے، کلائیوں میں دس دس تولے چاندی کے کڑے، کانوں میں پتّے بالیاں، ناک میں سونے کی کیل، مسّی ملی ہوئی دانتوں کی ریکھیں، ہونٹوں پر لاکھا، چوٹی میں رنگین موباف، جب گھر میں آتیں تو سلام دعا کے بعد ٹوکرا اتار کر صحن میں بیٹھ جاتی تھیں۔ گھر کی بیگمیں کھلا ہوا پان پیش کرتیں اور وہ اپنے شہر بھر کے قصّے سناتیں"۔ اس قسم کی متعدد نظر افروز تصویریں اس کتاب میں جمع کر دی گئی ہیں۔ یہ کتاب اردو اکادمی دہلی نے پیپر بیک میں شائع کی ہے۔

بابِ جدّہ

نسیمِ سحر

جدّہ کی ادبی تقریبات

جدہ کی ادبی تاریخ میں پاکستان و ہند کے چوٹی کے مزاح نگاروں کو جمع کرنے اور ایک یادگار مزاحیہ مشاعرہ ترتیب دینے کا تاریخی اعزاز جدہ کی ایک فعّال تنظیم "بزمِ اردو جدّہ" کو حاصل ہوا۔ اس سے قبل جدہ کے اہلِ ادب نے اتنے بڑے پیمانے پر کوئی اردو کا ادبی اجتماع ہوتے نہیں دیکھا تھا۔ جس طریقے سے اس مشاعرے کو مقبولیت اور یادگار کامیابی حاصل ہوئی وہ بزمِ اردو جدّہ اور زندہ دلانِ جدّہ کی انتظامی صلاحیتوں اور دن رات جان توڑ محنت کا منھ بولتا ثبوت ہے۔ ہفتوں پہلے سے اس مزاحیہ مشاعرے کی پبلسٹی نہ صرف رسائل اور اخبارات کے ذریعے کی گئی بلکہ جدّہ کے تمام مرکزی مقامات اور اردو بولنے والوں کے مراکز پر پوسٹر چسپاں کر کے اہلِ ذوق کو اس اہم تقریب کی اطلاع دی گئی۔

اس شاندار مشاعرے میں شرکت کے لیے پاکستان سے سیّد ضمیر جعفری، دلاور فگار، پروفیسر انور مسعود اور پروفیسر عنایت علی خاں کو مدعو کیا گیا تھا جب کہ ہندستان سے جناب حمایت اللہ، طالب خوندمیری، پاپولر میرٹھی، خواہ مخواہ، پاگل عادل آبادی، مصطفیٰ علی بیگ اور ساغر خیامی مدعو تھے۔ ایک اور نامور مزاح نگار جناب مجتبیٰ حسین کو بھی زحمت دی گئی تھی اور نہایت مسرت کا باعث ہے کہ یہ تمام مدعوئین تشریف لا کر رونقِ محفل کا سبب بنے تھے۔

بزمِ اردو جدہ کے معتمد جناب شریف اسلم نے وقت مقررہ سے کچھ دیر بعد مائیک سنبھالا اور سعودی عرب کے قومی ترانے سے تقریب کے آغاز کا اعلان کیا۔ تمام شرکائے محفل نے سعودی عرب کا قومی ترانہ کھڑے ہو کر سماعت کیا اور پھر ایک پاکستانی طالب علم عثمان نے نہایت دلکش انداز میں تلاوتِ کلامِ پاک کی۔ اس کے بعد جدہ کی معروف ادبی شخصیت مولانا فرید الوحید کو مسندِ صدارت پیش کی گئی اور پھر بزمِ اردو جدّہ کے صدر ڈاکٹر شمس بابر کو مسند پر مدعو کیا گیا۔ حاضرینِ بزم نے پُر زور تالیوں سے ان کا استقبال کیا۔ جناب شریف اسلم نے اس کے بعد پاکستان اور ہندستان کے مہمان شعرا اور ادیبوں کو نام بنام مسند پر بلایا۔ اس کے بعد جدّہ کی نمایندگی کرنے والے تین میزبان شعرا مگار لکھنوی، ناظر رودالی اور نسیمِ سحر کو بھی اسٹیج پر مدعو کیا گیا۔ بزمِ اردو کے معتمد شریف اسلم نے ناظر قدوائی کو نظامت کی دعوت دی اور یہ

یادگار مشاعرہ دو ادوار میں رات کے تین بجے تک جاری رہا۔ باذوق اور سخن فہم سامعین نے مزاحیہ اشعار پر بے ساختہ داد و تحسین کی آوازیں بلند کر کے مشاعرے کو نہایت کامیاب بنایا۔

ان جوشیلی کے مزاح نگاروں کے ساتھ تقریبات کا اختتام ایک ہفتے بعد بزمِ اردو کی طرف سے منعقدہ ایک جشنِ مزاح سے ہوا جو تین حصوں پر مشتمل تھا۔ پہلے حصے میں مزاحیہ مضامین پڑھے گئے۔ اس میں ڈاکٹر عابد معز، جناب خواہ مخواہ، جناب ضمیر جعفری اور جناب مجتبیٰ حسین نے حاضرین کو اپنی برجستگی اور بذلہ سنجی سے محظوظ کیا۔ دوسرا حصہ لطیفہ گوئی پر مشتمل تھا جس میں بزمِ اردو کے اراکین، مہمان ادیبوں وغیرہ نے مختلف ادبی اور غیر ادبی لطیفے سنائے۔ تیسرے دور میں جدہ کے ایک فن کار صادق اعظم نے طبلہ نواز احمد خاں کی سنگت میں آواز کا جادو جگایا۔

جدہ میں ایک اور اہم تقریب معروف پاکستانی شاعر اور دانشور جناب افتخار عارف کے اعزاز میں ہوئی جو لندن سے بغرض عمرہ تشریف لائے تھے۔ اس تقریب کے میزبان رسول احمد علیمی تھے اور اس کی صدارت جدہ میں مقیم پاکستان کے قونصل جنرل سلطان حیات خان صاحب نے کی۔ عشائیے اور مشاعرے پر مشتمل اس محفل میں حسن ظہیر، رسول احمد علیمی، نعیم بازید پوری، مصلح الدین سعدی، طارق غازی، نسیم سحر اور افتخار عارف نے کلام سنایا۔ صاحبِ صدر سلطان حیات خان صاحب نے تقریب سے خطاب کرتے ہوئے جدہ میں اس طرح کے ادبی اجتماعات کی روایت کو برقرار رکھنے اور فروغ دینے پر اہلِ قلم کو خراجِ تحسین پیش کیا۔

ایک اور مشاعرہ "شمع" دہلی کے ایڈیٹر جناب یونس دہلوی کی آمد پر ظفر مہدی کے ہاں بھی منعقد ہوا جس میں نظامت کے فرائض ناظر قدوائی نے ادا کیے اور جس کی صدارت جناب یونس دہلوی نے کی جب کہ مہمان خصوصی ہندستان سے تعلق رکھنے والے اور انگلستان میں مقیم معروف شاعر جناب حسین مشیر ندوی تھے۔ اس مشاعرے میں مسرور انیس، ناظر قدوائی، نسیم سحر، ناظم الدین مقبول، راشد صدیقی، ظفر مہدی، شجاعت علی راہی، رشید صدیقی، نگار لکھنوی، نعیم بازید پوری، یاد صدیقی، سجاد بابر، اعتماد صدیقی، سہیل احمد جدی اور شبیہ الحسنین کے بعد مہمان خصوصی حسین مشیر ندوی نے کلام پیش کیا۔ جناب یونس دہلوی نے صدارتی کلمات سے نوازا۔

ایک اور شاندار مشاعرہ بزمِ عثمانیہ کی پہلی سال گرہ کے سلسلے میں منعقد ہوا جس میں حیدر آباد دکن کی اس مادرِ علمی سے تعلق رکھنے والے قدیم طالب علموں نے نہایت جوش و خروش سے حصہ لیا۔ اس کی صدارت کرنل حسن السعودی نے کی، مہمان خصوصی جناب اکبر حسین تھے اور نظامت کے فرائض ناظر قدوائی نے ادا کیے۔ بزمِ عثمانیہ کے صدر ضیا الدین نیّر نے اپنی تقریر سے مشاعرے کا آغاز کیا اور اس کے بعد جن شعرا نے اپنا کلام پیش کیا ان میں سید معین الدین حسینی، شکور اللہ خاں نجم، ناظر قدوائی، مسرور انیس، راشد صدیقی، نسیم سحر، شبیہ الحسنین، نعیم بازید پوری، طارق سعید، رشید صدیقی، ظفر مہدی اور کرنل حسن السعودی شامل تھے۔

بابِ جدّہ

مسرور انیس

الوداعی مشاعرہ

معروف پاکستانی شاعر تسلیم الٰہی زلفی کی کنیڈا منتقلی کے موقعے پر جدّہ کے تمام علمی اور ادبی حلقوں اور اہلِ ذوق حضرات نے اجتماعی طور پر ان کے اعزاز میں ایک الوداعی مشاعرے کا اہتمام کیا۔ اس یادگار اور پروقار مشاعرے سے قبل پُرتکلف عشائیہ جدّہ کے معروف ہوٹل کی خوبصورت اور کشادہ سماعت گاہ میں ہوا جس کے میزبان اور مہتمم ظفر مہدی اور وسیم الدین تبریزی تھے۔ اس الوداعی تقریب میں تقریباً دو سو خواتین و حضرات نے شرکت کی جن میں جدّہ کے سب ہی معروف شعرا، اہلِ ذوق سامعین، معززینِ شہر اور خاص کر زلفی صاحب کے قدر دان شامل تھے۔

اس محفلِ مشاعرہ میں پڑھے جانے والے اشعار نذرِ قارئینِ کرام ہیں ؎

عیدیہ مشاعرہ تسلیم الٰہی زلفی

بہت اہلِ خرد سے استفادہ کر چکے ہیں ہم　　　سو اب مکتب سے جانے کا ارادہ کر چکے ہیں ہم
محبت، شاعری، کچھ رت جگے اور خانہ ویرانی　　　یہی اوراق تھے اور ان کو سادہ کر چکے ہیں ہم

سجاد بابر

جی میں ہے خواب اوڑھ کر سوؤں　　　ایک شب کو ہی اپنے گھر سوؤں

سید محمد احمد نقوی

وہ شخص مجھ سے بچھڑ کر گیا تو ایسے گیا　　　کہ جیسے لوٹ کے ترکش میں پھر نہ آئے تیر

عتاز صدیقی

بند رکھتا گھروں کے دروازے　　　حادثے پوچھ کر نہیں آتے

یاد صدیقی

جیسے احساسِ دلداری بہت تھا　　　اسی کا دار بھی کاری بہت تھا

ہم تحریر نے زلفی صاحب کے تیسرے شعری مجموعے "تنہا پرندے کی اڑان" کے عنوان کو ردیف بنا کر ایک غزل ان کی نذر کی

وہ تو ساری رونقیں ہمراہ اپنے لے چلا　　　　ہم کہ ہیں دل گیر اور تنہا پرندے کی اڑان
بس یہ ہے زلفی کی ساری زندگی کی داستان　　　　آسماں جا گیر اور تنہا پرندے کی اڑان

نسیم کاظمی　نذرِ زلفی

بزمِ یاراں چھوڑ کے جاتا ہے تُو　　　　تنہا تنہا شہر ہے لگنے لگا

راشد صدیقی

یوں تو ہر روز کوئی جاتا ہے　　　　نقش کچھ دل پہ چھوڑ جاتا ہے

بیَنش نواز شارق

چھیڑ نہ ہم کو اے گردھاری ہم تو فقیری میں ہیں مگن　　　　آگ اسی کی سینک رہے ہیں تا کہ اُجالا رکھیں من

سہیل حیدر جدّی

سر کی بازی میں گیا کاسۂ سر تو لیکن　　　　ایک دستارِ فضیلت تو بچا لی ہم نے

رشید عالم صدیقی

اس خرابے میں تب و تاب کہاں سے لاؤں　　　　نیند آتی ہی نہیں خواب کہاں سے لاؤں

سگار لکھنوی　نے بہت سے مزاحیہ قطعات سنا کر محفل کو زعفران زار بنا دیا۔

سید جمیل حسن شاہ

میں رہگزار پہ بیٹھا تھا نقشِ پا کی طرح　　　　تمہاری یاد آئی اسے لے گئی ہوا کی طرح

مرزا یوسف رہبر۔ نذرِ زلفی

میرے محبوب دل کی دنیا میں　　　　اور ہیں فاصلوں کے پیمانے
تیرے قدموں سے دور رہ کر بھی　　　　تجھ کو پوجیں گے تیرے دیوانے

عبدالباری انجم

ضو فشانی نے جلا دی تری تصویر بھی آج　　　　تو کہاں آ گیا اس دل کے سیہ خانے میں

نعیم بازید پوری۔ نذرِ زلفی

مسلکِ عشق میں دل ہر سے لگانا ہے گناہ　　　　دل کہیں اور لگائیں تو تمہیں یاد کریں

مسرور انیس۔ نذرِ زلفی

ہم کو رُلا رُلا کے چلے جا رہے ہو تم　　　　کیا اپنے دل میں درد بھی کچھ پا رہے ہو تم

کامران مصطفیٰ

سرِ فطرت ہوں تو ہر سانچے میں ڈھل جاتے ہیں لوگ　　　　رنگ جب دنیا بدلتی ہے بدل جاتے ہیں لوگ

م الدین مقبول

اک نئی ہجرت سے ہے تسلیم کو اب سامنا یا الٰہی نصرتیں ذلفی کے حق میں ہوں عطا

ان کے علاوہ ظفر بدایونی اور کئی دیگر نو آموز شعرا نے بھی ابتدا ئے محفل میں اپنا کلام پیش کیا۔ اس طرح
۰ بیں تسلیم الٰہی ذلفی کے شایان شان ہونے والے اس الوداعی مشاعرے کا اختتام آخرِ شب ہوا۔

(تبصرے کے لیے دو جلدوں کا آنا ضروری ہے)

پاکستان اسٹیٹ آئل ریویو ——— سیرت نگار: شاہ مصباح الدین شکیل

خصوصی سیرت نمبر ـ مدنی دور

صفحات: ۷۶ ـ

پتا: پاکستان اسٹیٹ آئل کمپنی لمیٹڈ

یہ مجلہ پی ایس او، کی جانب سے شائع ہونے والے سیرت نمبر کے سلسلے کے مدنی دور کا تیسرا حصہ ہے۔ اگرچہ اس کے اندرونی سرورق پر "غزوۂ خندق سے فتح مکہ تک" تحریر ہے لیکن غزوۂ خندق کے حالات اس میں درج نہیں، بلکہ پہلا غزوہ جس کے تفصیلی حالات دیے گئے ہیں، غزوۂ بنو مصطلق یا مُریسیع ہے۔ اس کے بعد غزوۂ بنو قریظہ کی تفصیلات درج ہیں۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ غزوۂ بنو قریظہ کو جو غزوۂ خندق کے فوراً بعد پیش آیا غزوۂ بنو مصطلق کے ساتھ کیوں مربوط کر دیا گیا۔ اس سہو سے قطع نظر اس خصوصی شمارے کو دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اس میں غزوۂ بنو مصطلق سے فتح مکہ تک کے حالات دیئے اور ہر غزوہ کی پوری تفصیلات درج کی گئی ہیں جو یقیناً ایک مستحسن اقدام ہے۔ سیرت کی دوسری کتابوں میں یہ چیز دکھائی نہیں دیتی اور سیرت نگاران غزوات کا ذکر کرنے پر اکتفا کرتے ہیں جن میں قتال ہوا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ قارئین غزوہ کے صحیح مفہوم سے آگاہ نہیں ہوتے اور اس مقدس لفظ کو جنگ و پیکار کا مترادف سمجھنے لگتے ہیں۔ اور چونکہ انھیں غزوات کی صحیح تعداد کا علم نہیں ہوتا اس لیے نبی کریمؐ کے مدنی دور میں آپؐ کی مصروفیات کا صحیح اندازہ کرنے سے بھی قاصر رہتے ہیں۔ اگر یہ معلوم ہو جائے کہ آپؐ کو اس دس سال کی مدت میں ۲۷، ۲۸ غزوات پیش آئے جن میں عموماً مدینہ سے باہر جانا پڑا اور غزوۂ تبوک جیسی مہم کے موقع پر سخت گرمی میں سیکڑوں میل کا سفر طے کرنا پڑا۔ چالیس سے زیادہ سرایا ترتیب دینے پڑے، متعدد وفود کی پذیرائی کرنی پڑی اور جملہ انتظامی امور کو بنفس نفیس نمٹانا پڑا تو اندازہ ہو کہ آپؐ کے کارناموں کو اتنا کیوں سراہا جاتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اتنی قلیل مدت میں اتنے بہت سے کام اشرف الانبیا ہی انجام دے سکتے تھے۔ جن کو اللہ تعالیٰ نے بے پناہ صلاحیتوں سے نوازا تھا اور ہر موقع پر آپؐ کو نصرتِ خداوندی حاصل تھی۔ بہرحال حضورؐ کی سیرتِ طیبہ کے اس پہلو کو اس قدر شرح و بسط سے بیان کر کے سیرت نگار نے دوسروں کی کوتاہی کا بڑی حد تک ازالہ کر دیا ہے جس کے لیے وہ قابلِ مبارک باد ہیں۔ ایک اور خوبی اس سیرت نمبر کی یہ ہے کہ اس کو زیادہ سے زیادہ مفید

بتانے کے لیے بعض فوٹو، غزوات اور دیگر واقعات سے متعلق نقشے اور نبی کریمؐ کے بعض فرمانوں کے عکس دے دیے گئے ہیں. جن میں بعض نقشے بالکل نئے ہیں۔ جیسے غزوۂ خیبر کا نقشہ۔ مجموعی طور پر یہ تمام مواد گراں قدر ہے لیکن بعض واقعات اور نقشوں میں کسی قدر سہو ہوا ہے جس کی نشاندہی ضروری ہے۔ مثلاً صفحہ ۲۴ پر ناعم کو یہودیوں کا مضبوط ترین قلعہ بتایا گیا اور صفحہ ۳۴ پر قلعہ قموص کو خیبر کے قلعوں میں سب سے مستحکم قرار دیا گیا ہے۔ ان دونوں میں کس بیان کو صحیح سمجھا جائے؟ پھر قلعہ ناعم میں حضرت علیؓ کی موجودگی اور قلعہ قموص کے محاصرے کے وقت حضرت ابوبکرؓ اور حضرت عمرؓ کے لشکر کی قیادت کرنا اور ناکام واپس آنا موضوع روایتیں ہیں۔ سیرت ابن ہشام میں بغیر کسی ابہام کے حضرت محمد بن مسلمہؓ کو بلا شرکت غیرے مرحب کا قاتل بتایا گیا ہے اور دونوں کے درمیان جو معرکہ ہوا اس کی بھی تفصیل بیان کی ہے۔ چونکہ غزوہ اس مہم کو کہا جاتا ہے جس میں رسول اللہؐ خود شریک رہے ہوں۔ لہٰذا موتہ کی مہم کو غزوہ کہنا صحیح نہیں۔ جہاں تک نقشوں کا تعلق ہے ان میں بھی بعض سہو ہوتے ہیں۔ مثلاً صفحہ ۲۵ پر حدیبیہ کو طائف کے جنوب مغرب میں دکھایا گیا ہے اور صفحہ ۵۷ پر مکہ معظمہ اور جدہ کے درمیانی راستے پر، جب کہ موخر الذکر صحیح ہے۔

اگرچہ اس مجلہ کے محاسن کے مقابلے میں کوتاہیاں نہایت خفیف ہیں تاہم یہاں یہ بھی بُری طرح کھٹکتی ہیں۔

سیرت نمبر کے سابقہ حصوں کی طرح یہ حصہ بھی بہت خوب ہے اور پی ایس او کے ارباب حل وعقد اپنی اس کامیاب کوشش پر تبریک اور تعریف وتوصیف کے مستحق ہیں۔

______ ثناء الحق صدیقی

سمجھوتا ایکسپریس

______ مصنف: اختر جمال

صفحات: ۲۲۰۔ قیمت: ۱۳۵ روپے

پتا: مقبول اکیڈمی، لاہور

اختر جمال اردو کی مشہور اور ممتاز افسانہ نگار ہیں۔ "سمجھوتا ایکسپریس" ان کے تیرہ افسانوں کا مجموعہ ہے اور اس مجموعے سے پہلے ان کا ایک ناول اور دوسرے افسانوی مجموعے بھی شائع ہو چکے ہیں۔ اختر جمال کا شمار افسانہ نگاروں کی اس نسل سے ہے جس کے خون میں تحریک پاکستان اور جد وجہد آزادی رچی بسی ہے۔ وہ نسل جس نے پاکستان کا خواب دیکھا، پاکستان کی آزادی اور اس مملکت کو ابھرتے دیکھا، ٹوٹتے دیکھا اور اپنے خوابوں کو بکھرتے دیکھا۔ مگر خوابوں کے بکھر جانے کے باوجود انھوں نے قنوطیت یا افسردگی کو اپنے فن پر طاری ہونے نہیں دیا۔ زندگی۔ حالات اور معاشرے کے بارے میں ان کا نقطۂ نظر رجائی ہے۔ ہم جس صورتِ حال سے گزر رہے ہیں۔ معاشرے میں جو انتشار اور بدنظمی۔ زر پرستی اور بے راہروی رواج پا گئی ہے اختر جمال کو اس کا پورا احساس ہے۔ شدید احساس ہے اور اسی احساس کے تحت ان کا ہر افسانہ پڑھنے والے کے لیے ایک سوال کی حیثیت رکھتا ہے۔ یہ سارے سوال بڑے اہم اور معنی خیز ہیں۔ ان سوالوں سے ہماری ذہنی کیفیت بھی پوری طرح ظاہر ہوتی ہے اور معاصر زندگی کا صحیح اور سچا نقشہ بھی سامنے آتا ہے۔ بڑے عجیب عجیب سوال ہیں۔ نیکی اور ہمدردی کا راستہ چھوڑ کر منشیات کی اسمگلنگ کیوں اختیار کی جاتی ہے۔ تکڑم بازی کا بول بالا۔ تابعداری کا "دیوالہ کیوں ہے"۔ وہ پاکستان

کہاں گیا جو قائد اعظم اور علامہ اقبال بنانا چاہتے تھے۔ ہمارے پاس ان سوالوں کے کوئی جواب نہیں ہیں کیونکہ جوابوں کی راہ ہم بند کر چکے ہیں مگر سوال ہمارا پیچھا نہیں چھوڑیں گے۔ جواب کی راہیں لاکھ بند ہوں مگر اختر جمال کے افسانے اور ان کے سوال ہمیشہ آئینہ دکھاتے رہیں گے۔

اختر جمال کے افسانوں میں پاکستان کی سوندھی مٹی کی خوشبو ہے۔ انھیں اپنے ملک سے بے حد محبت ہے۔ یہ محبت ان کے ہر افسانے سے پھوٹتی محسوس ہوتی ہے۔ ان کے افسانوں کا انداز کلاسیکی اور بیانیہ ہے۔ اگرچہ انھوں نے کوئی نیا تجربہ نہیں کیا لیکن ان کی روایتی تکنیک میں وہ قوت اور توانائی ہے جس سے پڑھنے والا متاثر ہوتا ہے۔

"سمجھوتا ایکسپریس" حقیقی پاکستانی زندگی کا نگارخانہ ہے۔ یہ پاکستان کے کروڑوں عوام کے دلوں کی دھڑکنوں سے معمور ہے۔ اس میں بڑی دیدہ وری۔ فن کاری اور جوش ہے۔ پاکستانی قوم کو درپیش جذباتی اور مادی مسائل کو اختر جمال نے جس ہنرمندی سے موضوعِ سخن بنایا ہے شاید کسی اور معاصر افسانوی مجموعے میں یہ انداز اس خوبی سے اُجاگر نہیں ہوا ہے۔ پُرکشش اور معنی خیز افسانوں کے اس مجموعے کی اشاعت بھی شایانِ شان انداز سے ہوئی ہے۔

———— الف۔ف

غالب (ششماہی) ———— مرتبین: مختار زمن، مشفق خواجہ

مشترکہ شمارہ نمبر جولائی تا دسمبر ۱۹۸۸ء، جنوری تا دسمبر ۱۹۸۹ء صفحات: ۴۲۴۔ قیمت: ۵۰ روپے

پتا: ادارہ یادگارِ غالب، غالب لائبریری۔ ناظم آباد ۲ کراچی ۴۶

ادارہ یادگارِ غالب کے زیرِ اہتمام شائع ہونے والا جریدہ "غالب" پاکستان کا ایک اہم ادبی رسالہ ہے" نقد و نظر" کے تحت عمیق حنفی اور محب عارفی کے مقالات ہیں۔ عمیق حنفی اب ہم میں موجود نہیں رہے لیکن ان کا یہ مقالہ مرحوم کی شعر و ادب پر عمیق نظر کی یادگار کے طور پر ارباب ادب کے زیرِ مطالعہ رہے گا۔

میر تقی میر کے بارے میں شمس الدین فاروقی اور ڈاکٹر اکبر حیدری کشمیری کے مقالات ہیں۔ ڈاکٹر موصوف کے مقالے کی اہمیت یہ ہے کہ انھوں نے ادارۂ ادبیات اردو حیدرآباد کے کتب خانے میں بیٹھ کر دیوانِ میر کے قدیم ترین مخطوطہ کا جائزہ لیا ہے۔

غالب سے متعلق پروفیسر حامد حسن قادری، شان الحق حقی، سید قدرت نقوی اور ڈاکٹر گیان چند جیسے غالب شناسوں کے مقالات کی اشاعت یقیناً شعبۂ غالبیات میں اضافے کا باعث ہے۔

ادارہ یادگارِ غالب کے بانی مرزا ظفر الحسن مرحوم کے حوالے سے فیض احمد فیض کو اس ادارے سے ایک خاص نسبت رہی ڈاکٹر محمد حسن، ڈاکٹر یوسف سرمست اور ڈاکٹر سیدہ جعفر نے بڑے چاؤ اور رچاؤ کے ساتھ فیض کی شخصیت اور فکر و فن پر خیالات و تاثرات کا اظہار کیا ہے۔ فیض کا ایک غیر مطبوعہ خط بنام ڈاکٹر آفتاب احمد خان بھی اس حصے کی زینت ہے۔

"بازیافت" کے زیرِ عنوان خطوط قاضی عبدالودود پر کاظم علی خاں کا مضمون دل چسپ اور معلوماتی ہے

"شخص و عکس" کا حصہ آٹھ مشہور و ممتاز علمی و ادبی شخصیات کے احوال و افکار پر محیط ہے۔ یہ مضامین قابلِ ذکر شخصیتوں کے حوالوں سے معلومات آفریں تذکرے بھی ہیں، دل چسپ خاکے بھی۔

جمیل الدین عالی کا سفرنامہ "آئس لینڈ میں چند روز" بقول مختار زمن "اردو زبان میں اپنی نوعیت کا پہلا سفرنامہ ہے۔
غالب کے اس خصوصی شمارے کو بڑی محنت اور توجہ سے مرتب کیا گیا ہے۔ اس دور پُرآشوب خصوصاً کراچی کے موجودہ کرب و اضطراب کے ماحول میں "غالب" جیسے معیاری، ضخیم اور نفیس صحیفے کی اشاعت کوئی معمولی بات نہیں۔ یہ اشاعتِ خاص اپنی خصوصیات کے اعتبار سے ایک مستقل کتاب کی سی اہمیت کی حامل ہے۔ اسے خرید کر سرکاری و غیر سرکاری کتب خانوں میں محفوظ کیا جانا چاہیے۔

——— ڈاکٹر وفا راشدی

ہندوستان سے پاکستان

مولف: سردار علی احمد خاں
صفحات: ۵۵۱ ۔ قیمت: ۶۵ روپے
پتا: استقلال پبلیکیشنز ۔۳، اے کوپر روڈ، لاہور

سردار علی احمد خاں صاحب تحریکِ پاکستان کے ایک کارکن، ایک صحافی اور ایک سوشل ورکر ہیں۔ انھوں نے اپنی ان تینوں حیثیتوں کو اجتماعی طور پر بروئے کار لاتے ہوئے تقسیمِ ہند کے پس منظر میں چار جلدوں پر مشتمل ایک دستاویز کی ترتیب کا منصوبہ بنایا ہے جس کی آخری جلد میں " المیہ ۱۹۴۷ء کے پس منظر اور محرکات کا معروضی تجزیہ کیا جائے گا۔ اور ہندو اور سکھ ذہن کے پس منظر میں جھانکنے کی کوشش کی جائے گی" (ص ۳) تاہم زیرِ نظر جلد بھی اس دستاویز کا حصہ اوّل ہے، تقریباً انھیں مضامین پر مشتمل ہے۔

کتاب کی ابتدا میں عبدالغفار خاں صاحب، ریٹائرڈ ایڈیشنل سکریٹری (دفاع) حکومتِ پاکستان کا ایک مختصر دیباچہ ہے۔ اس کے بعد تقریباً ایک سو صفحات میں مولف نے اپنی کاوش کا تفصیلی پس منظر یا بالفاظِ دیگر وجہِ تالیف بیان کی ہے۔ بقیہ کتاب ۱۹۴۷ء میں مشرقی پنجاب اور دہلی کے مسلم کش فسادات اور ان کے نتیجے میں رونما ہونے والے مصائب کی تفصیلات پر مشتمل ہیں۔

تفصیلی پس منظر میں مولف نے برِصغیر میں آریوں کی آمد، ہندوستان کے قدیم باشندوں کی شکست اور زبوں حالی، مسلم حکومتوں کا قیام اور اس کے اثرات، سکھ پنتھ کے ظہور، سکھوں پر مغل حکمرانوں کے مبینہ مظالم اور ان کے ردِعمل کے طور پر خود سکھوں کی خونریزیوں اور مسلم دشمنی کے غیر مبدل جذبات وغیرہ جیسے تفصیل طلب موضوعات سے بحث کی ہے۔ اس ضمن میں انھوں نے اپنے انداز میں مسلم لیگ اور قوم پرست مسلم جماعتوں کے نظریات و کردار پر بھی روشنی ڈالی ہے۔ اس حصۂ کتاب کا مقصد پاکستانی مسلمانوں کے لیے ہندوؤں اور سکھوں سے روابط کی حد مقرر کرنے سے پہلے غور و فکر کے لیے مواد اکٹھا کرنا ہے۔

۱۹۴۷ء کے فسادات برِصغیر کی مسلم تاریخ کا ایک قابلِ عبرت اور سبق آموز باب بن چکے ہیں اور چالیس سال سے زیادہ کے یہ پرانے واقعات اب بھی اپنے اندر بڑی کشش رکھتے ہیں۔ یوں بھی کسی معاشرہ کو بیدار رکھنے کے لیے ضروری ہے کہ اس کی تاریخ کے خونچکاں قصہ ہائے پارینہ کی بازخوانی بھی گاہے گاہے ہوتی رہے۔
کتابت اور طباعت عمدہ اور قیمت عام قاری کی استطاعت کے مطابق ہے۔

——— ابنِ منیر

گرد و پیش

معروف افسانہ نگار سیّد انور بھی انتقال کر گئے

یہ خبر ادبی حلقوں میں نہایت افسوس کے ساتھ سنی جائے گی کہ اردو کے مشہور افسانہ نگار سیّد انور کا ۶ مارچ ۱۹۹۰ء کو کراچی میں ۷۴ سال کی عمر میں انتقال ہو گیا۔ ان کا شمار اردو کے صفِ اوّل کے افسانہ نگاروں میں ہوتا تھا۔ ان کا اصل نام سیّد انور حسین شاہ تھا۔ وہ ۱۵ فروری ۱۹۱۶ء کو لدھیانہ (مشرقی پنجاب) کے ایک گاؤں کوٹلا جنیر میں پیدا ہوئے۔ ان کے دادا اپنے دور کے مصلح اور سرسیّد تحریک کے پُرجوش حامی تھے۔

سیّد انور نے ۱۹۳۱ء میں گورنمنٹ ہائی اسکول (لدھیانہ) سے میٹرک اور ۱۹۳۸ء میں گورنمنٹ کالج (لدھیانہ) سے بی۔اے کیا اور اس کے بعد رائل انڈین نیوی میں شامل ہوئے۔ قیامِ پاکستان کے بعد پاکستان نیوی سے وابستہ ہو گئے۔ ان کی ادبی خدمات نصف صدی پر محیط ہیں۔ ان کی اب تک چار کتابیں شائع ہو چکی ہیں جن میں تین افسانوں کے مجموعے "آگ کی آغوش میں" "منزل کی طرف" اور "سورج بھی تماشائی" اور ایک ناول "ایک اور سومنات" شامل ہیں۔ ان کی تین کتابیں "خوشبو کا خون" "مستقبل کی خوشبو" اور "گہرے سمندروں میں" زیرِ طبع ہیں۔ ادبی رجحان کے اعتبار سے سیّد صاحب کا شمار ترقی پسند حلقے کے ادیبوں میں ہوتا تھا۔ وہ پچھلے ایک ڈیڑھ سال سے بیمار رہا کرتے تھے۔ وہ اب ہم میں نہیں لیکن ان کی ادبی خدمات ان کی کتابیں تا دیر ہمارے درمیان رہیں گی۔ ہم بارگاہِ ربّ العزت میں ان کی مغفرت کی دعا کرتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ ان کے لواحقین کو صبرِ جمیل عطا فرمائے۔

نجم اعظمی کی یاد میں جلسہ

۱۸ فروری ۹۰ء کو پاکستان رائٹرز گلڈ، حلقۂ نیاز و نگار، یونی کیرین، آرٹس کونسل اور اربابِ قلم کی جانب سے آرٹس کونسل کی سماعت گاہ میں ایک مشترکہ تعزیتی جلسہ بہ یادِ نجم اعظمی منعقد کیا گیا۔ صدرِ جلسہ پروفیسر ممتاز حسین کے علاوہ ڈاکٹر فرمان فتحپوری، ڈاکٹر ابوالخیر کشفی، ڈاکٹر منظور احمد، پروفیسر سحر انصاری، مشرف احمد، نقاش کاظمی، سیّد محمد سبطین اور انیس زیدی نے حاضرینِ جلسہ سے خطاب کیا۔

پروفیسر ممتاز حسین نے کہا کہ انجم اعظمی ایک سچے اور کھرے آدمی تھے۔ انھوں نے اپنے مقالات میں بعض بہت خیال افروز باتیں کہی ہیں۔ انھوں نے ایک جگہ لکھا ہے کہ غالب اور اقبال کی بڑائی اپنی جگہ مسلّم، لیکن دن رات ہم غالب اور اقبال ہی کا مطالعہ کیوں کریں، عصرِ حاضر کے دوسرے شعرا کو کیوں نہ پڑھیں جو اس عصر کی چھوٹی چھوٹی بصیرتوں کو پیش کر رہے ہیں۔

ڈاکٹر فرمان فتح پوری نے انجم اعظمی کو خراجِ عقیدت پیش کرتے ہوئے کہا کہ کراچی میں تین آدمی مجتبیٰ حسین، سلیم احمد اور انجم اعظمی میری دانست میں اپنی ذات میں واقعتاً ایک انجمن تھے۔ تحقیق، تنقید، تقریر اور تحریر ہر جگہ ان کی ذہانت ظاہر ہوتی تھی۔ وہ یک رُخے ادیب نہیں تھے، کئی رُخ رکھتے تھے اور بصیرت ان سب میں قدرِ مشترک تھی۔

ڈاکٹر ابوالخیر کشفی نے کہا کہ انجم اعظمی نے اپنی زندگی کے چالیس سال ادبی دنیا میں صرف کیے۔ ان کی تحریر ان کی سچائی کا سب سے بڑا ثبوت ہے۔ وہ اپنی ذات، اپنے علم اور نیکیوں کے وسیلے سے یاد رکھے جائیں گے۔ انجم اعظمی اور ہمارے درمیان مخاطبت قائم رہے گی۔ ہم ان کی باتیں کتابوں میں پڑھ کر لکھ رہے ہوں گے۔

ڈاکٹر منظور احمد نے کہا کہ انجم اعظمی سے جب بھی گفتگو ہوتی تو اس کا مثبت رُخ یہ ہوتا تھا کہ وہ صرف اپنا نقطۂ نظر پیش نہیں کرتے تھے بلکہ دوسروں کے نقطۂ نظر کو متانت کے ساتھ سنتے تھے۔

پروفیسر سحر انصاری نے کہا کہ پروفیسر انجم اعظمی شعر اور نثر کے صفِ اوّل کے لکھنے والے تھے۔ وہ اس شہر میں ایک ادبی خاندان دیکھنا چاہتے تھے۔ ہمیں ان کی بے باکی اور جرأت مندانہ زندگی سے بہت کچھ سیکھنے کا موقع ملا ہے۔

مشرف احمد، سید محمد سبطین، نقّاش کاظمی اور انیس زیدی نے انجم اعظمی کی زندگی کے مختلف پہلوؤں پر اظہارِ خیال کیا۔

اس موقع پر راغب مرادآبادی اور پروین جاوید نے منظوم خراجِ عقیدت پیش کیا۔ راغب صاحب کا ایک شعر

تھے ادیب و شاعر و استاد انجم اعظمی   آئیں گے تا زندگی اب یاد انجم اعظمی

اظہارِ تعزیت

حضرت اخگر سرحدی صدر انجمن ترقی اردو سرگودھا اپنے ایک اخباری بیان میں کہا ہے کہ یہ اندوہناک خبر قومی زبان اردو کے علمی و ادبی اور تعلیمی حلقوں میں انتہائی رنج و غم کے ساتھ سنی گئی کہ ڈاکٹر سہیل بخاری، اردو زبان کے ممتاز اسکالر، کراچی میں بہ عارضۂ قلب انتقال کر گئے۔ وہ تقریباً بیس برس سرگودھا کے بی۔ اے۔ ایف کالج میں اردو زبان کے پروفیسر رہے۔ اور کچھ عرصہ ہوتا ہے کہ وہ کالج مذکور سے نہایت عزّت و احترام کے ساتھ سبکدوش ہوئے تھے اور اب وہ کراچی میں اردو بورڈ کے اردو زبان کے بارے میں تحقیق و تنقید کے شعبہ سے تعلق رکھتے تھے۔ ان کی قومی زبان پر کئی ایک بلند پایہ تصنیفات مثلاً "اردو داستان" "اردو کا روپ"، "اردو رسم الخط"، "اصطلاحاتِ بیمہ کاری"، "اردو میں دخیل الفاظ"، "اشتقاقی لغت" وغیرہ مقبولِ خاص و عام ہو چکی ہیں۔ ان کے تحقیقی مقالے پاکستان کے ممتاز رسائل میں اشاعت پذیر ہوتے رہتے تھے۔

ڈاکٹر سہیل بخاری ہر سال موسم بہار میں سرگودھا میں اپنے بڑے لڑکے پروفیسر زرّیت نقوی کے گھر سٹلائیٹ ٹاؤن میں آ کر ٹھہرا کرتے تھے جہاں سرگودھا کے ادبائے کرام ان سے ملاقات کے لیے جایا کرتے تھے۔ اس سال بھی ان کا انتظار کیا جا رہا تھا کہ

وہ اللہ کے پیارے ہوگئے۔ ان کی وفات زبان وادب کے لیے ایک سانحۂ عظیم ہے۔ انھوں نے ایک پاکستانی ہونے کے ناتے اپنی قومی زبان کی جو گراں قدر خدمات انجام دی ہیں انھیں اربابِ علم ادب ہمیشہ یاد رکھیں گے۔ اراکینِ انجمن ترقی اردو سرگودھا ان کی بے وقت موت پر اپنے رنج وملال کا اظہار کرتے ہیں اور اللہ تعالیٰ سے ان کی بخشش کی دعا کرتے ہیں۔

(مرسلہ عظیم مشہود شاہد ناظم، انجمن ترقی اردو سرگودھا)

انڈین گلڈ آف اردو آتھرز

بھارت میں گذشتہ دنوں انڈین گلڈ آف اردو آتھرز (I.G.U.A.) کا قیام عمل میں آیا ہے۔ "اگوا" کے بنیادی ارکان میں اردو کے چند نہایت ممتاز اور مشہور نقّاد، شاعر اور دیگر فعال افراد منتخب ہوئے ہیں۔ اس کے چیئرمین پروفیسر آل احمد سرور، نائب چیئرمین جناب بیکل اُتساہی، پروفیسر گوپی چند نارنگ اور پروفیسر محمد حسن، جنرل سکریٹری شجاع خاور، خازن کمار پاشی اور آفس سکریٹری مظفر سیّد ہیں۔

ابتدائی قرارداد کے مطابق جنرل سکریٹری جناب شجاع خاور کو یہ اختیار اور ذمہ داری سونپی گئی ہے کہ وہ ملک کے تمام صوبوں میں اگوا کی ذیلی شاخیں قائم کریں۔ اس قرارداد میں گلڈ کے مندرجہ ذیل مقاصد کا ذکر کیا گیا ہے۔

(۱) اردو کی مشترکہ تہذیب کا اعادہ۔ (۲) انگریزی و قومی پریس میں اردو کے تخلیقی منظرنامے کی مثبت تصویر کشی (۳) مباحثوں اور مذاکروں کا اس طرح اہتمام کہ اردو کے قلم کار اور اس کے تشخص پر توجہ رہے۔ (۴) اردو کے فروغ سے وابستہ سرکاری و نیم سرکاری تنظیموں اور اداروں سے رابطہ اور ان کی کارکردگی کا جائزہ۔ (۵) اردو میں اعلیٰ سطح کے تخلیقی کاموں کی شناخت اور استناد۔ (۶) اردو میں تخلیقی ادب اور فکر و نظر کی مسلسل اور وسیع تر ترسیل و اشاعت (۷) اردو کے قلم کاروں کی عمومی بہبود پر نظر۔

(ہفتہ وار "کوہسار" بھاگل پور ۹ فروری ۱۹۹۰ء)

شعبۂ اردو پنجابی گورنمنٹ کالج لاہور کی مطبوعات

شعبۂ اردو اور پنجابی گورنمنٹ کالج لاہور نے کالج کے قیام اور استحکام کے ایک سو پچیسویں[۱۲۵] سال کی مناسبت سے جنوری ۱۹۸۹ء سے دسمبر ۱۹۸۹ء تک کے عرصے میں سترہ[۱۷] یادگاری کتابیں لکھنے اور چھپوانے کا اہتمام کیا۔ ان مطبوعات کی تفصیل:

(۱) "یونیورسٹی میں اردو تحقیق" از ڈاکٹر سیّد معین الرحمٰن۔ (۲) "غالب اور انقلابِ ستاون" از: ڈاکٹر سیّد معین الرحمٰن۔ (۳) "غالب کا علمی سرمایہ" از: ڈاکٹر سیّد معین الرحمٰن (۴) رسالہ "نقوش" میں ذخیرۂ غالبیات، از: نائلہ انجم (۵) اشاریۂ "راوی" قیامِ پاکستان تک مرتّبہ: بدر منیر الدین (۶) اشاریۂ "راوی" دسمبر ۴۷ء تا نومبر ۱۹۸۷ء، مرتّبہ: خواجہ خورشید احمد (۷) راوی افسانے، مرتّبہ: پروفیسر صابر لودھی (۸) راوی ڈرامے، مرتّبہ: حق نواز (۹) راوی غزلیات، مرتّبہ: اسرار احمد (۱۰) اقبالیاتِ راوی، مرتّبہ: ڈاکٹر صدیق جاوید۔ (۱۱) راوی طنز و مزاح، مرتّبہ: ڈاکٹر محمد اجمل نیازی (۱۲) راوی کالج نامہ، مرتّبین: ڈاکٹر نسیرِ ہمدانی، ہارون قادر، عارف محمود ثاقب (۱۳) راوی رنگ، مرتّبہ: محمد عباس نجمی (۱۴) راوی فارسی ادبیات، مرتّبہ: پروفیسر ظہیر احمد صدّیقی (۱۵) لوٹے دوست، منظوم فارسی اردو تراجم، از: پروفیسر ظہیر احمد صدّیقی (۱۶) دلھائی است، منظوم اردو فارسی تراجم، از: پروفیسر ظہیر احمد صدّیقی ——

(۱۷) شعبۂ اردو ۔ کوائف اور کارکردگی، مرتبہ: ڈاکٹر سید معین الرحمٰن ۔
یہ کتابیں درج ذیل ناشرین سے رعایتی شرح پر دستیاب ہیں :
یونیورسل بکس، ۴-اے اردو بازار، لاہور ۔ الفیصل ناشران، غزنی اسٹریٹ اردو بازار، لاہور ۔

پی ایچ ڈی کی ڈگری حاصل کرنے والے پہلے نابینا طالب علم

جامعہ کراچی کے جناب عبداللہ قادری دنیا کے پہلے نابینا طالب علم ہیں جنھوں نے سیاسیات میں پی ایچ ڈی کی ڈگری حاصل کی ہے ۔ ان کے مقالے کا موضوع "حضرت امام ابوحنیفہ کے نظریات" ہے ۔ قادری صاحب نے یہ اہم کارنامہ کراچی یونیورسٹی کے وائس چانسلر ڈاکٹر منظورالدین کی زیرِ نگرانی انجام دیا ہے ۔

(روزنامہ جنگ ۴ر فروری ۱۹۹۰ء)

پاکستان میں اردو کمپیوٹر کے بارے میں پہلی مکمل دستاویز

قومی زبان اردو کی اہمیت اور جدید تقاضوں کے پیشِ نظر مقتدرہ قومی زبان نے اپنے ماہنامہ اخبارِ اردو کا "کمپیوٹر" پر فروری ۱۹۹۰ء کا خصوصی نمبر شائع کیا ہے ۔ اسی مجلّہ میں اردو کمپیوٹر سے متعلق تمام سسٹم اور اردو ورڈ پروسیسر / کمپیوٹر کاروبار کرنے والی تمام کمپنیوں کے بارے میں بھرپور اور مفید معلومات فراہم کی گئی ہیں ۔ اخبارِ اردو کے کمپیوٹر کے خصوصی نمبر میں مضمون کے حوالے سے جدید تحقیق پر علمی و فکری مقالے بھی موجود ہیں ۔

اک دیا اور بجھا

ہندوستان کے سرکردہ اردو صحافی مفتی محمد رضا انصاری کا دل کا دورہ پڑنے سے انتقال ہو گیا ۔ ان کی عمر ۷۳ سال تھی ۔ وہ ایک عرصے تک اردو کے روزنامہ "قومی آواز" سے وابستہ رہے ۔ بعد میں علی گڑھ مسلم یونیورسٹی سے وابستہ ہو گئے تھے ۔ یہاں وہ کئی سال تک صدر شعبۂ دینیات رہے ۔ گزشتہ دنوں جب وہ پاکستان تشریف لائے تھے تو انجمن ترقی اردو پاکستان نے ان کے اعزاز میں ایک استقبالیہ دیا تھا ۔ انجمن ان کا ایک ترجمہ "ادب الجاہلی" چھاپ رہی ہے جو عرب اسکالر طٰہٰ حسین کی تصنیف ہے ۔

انجمن مرحوم کے لیے مغفرت اور پس ماندگان کے لیے صبرِ جمیل کی دعا کرتی ہے ۔

حروف تازہ

کتابیں

خاطرِ معصوم ——— مصنّف: ضمیر الدین احمد
تنقید
صفحات: ۱۵۲ ــ قیمت: ۵۰ روپے
پتا: احسن مطبوعات کراچی، بی۔۱۵۵/۵ گلشنِ اقبال، کراچی

شام کا سورج ——— مصنّف: ڈاکٹر انور سدید
مضامین
صفحات: ۶۷۸ ــ قیمت: ۲۰۰ روپے
پتا: مکتبہ فکر و خیال ۱۷۲ ستلج بلاک اقبال ٹاؤن، لاہور

سفینۂ نعت ——— مصنّف: ڈاکٹر سید ابوالخیر کشفی
نعتیہ کلام
صفحات: ۲۴۰ ــ ہدیہ: ۴۵ روپے
پتا: ذکی سنز پرنٹرز، کراچی

تخلیقی عمل اور اسلوب ——— مصنّف: محمد حسن عسکری : مرتّب: محمد سہیل عمر
تنقید
صفحات: ۳۹۹ ــ قیمت: ۹۹ روپے
پتا: نفیس اکیڈمی، کراچی

ارضِ عنکبوت ——— مصنّف: الطاف فاطمہ
افسانے
صفحات: ۲۳۲ ــ قیمت: ۶۶ روپے
پتا: فیروز سنز لمیٹڈ، لاہور، راولپنڈی، کراچی۔

الف لیلیٰ پارک میں ——— مصنّف: اے حمید
طنز و مزاح
صفحات: ۲۵۸ ــ قیمت: [illegible] روپے
پتا: فیروز سنز لمیٹڈ، لاہور، راولپنڈی، کراچی۔

برِ صغیر سے ظفر تک ——— مصنّف: جمیل یوسف
تاریخ
صفحات: ۲۷۰ ــ قیمت: ۱۰۰ روپے
پتا: کتاب نگر ۲۰۷۲ آئی ۱۰/۲ اسلام آباد

اقبالیاتِ راوی ـــــــ مصنف: ڈاکٹر صدیق جاوید
اقبالیات
صفحات: ۳۴۴ ـ قیمت: ۱۱۰ روپے
پتا: الفیصل ناشران و تاجرانِ کتب غزنی اسٹریٹ اردو بازار، لاہور

قطرہ قطرہ قلزم ـــــــ مصنف: واصف علی آصف
صفحات: ۲۰۸ ـ قیمت: ۷۵ روپے
پتا: کاشف پبلی کیشنز ـ ۲۲ فردوس کالونی گلشنِ راوی، لاہور

جراثیمِ ادب ـــــــ مصنف: شرف الدین احمد عظیم آبادی
مضامین
صفحات: ۳۱۰ ـ قیمت: ۱۲۰
پتا: اوسکر ایڈورٹائزنگ کمپنی ۷، ۴ محبوب چیمبر عبداللہ ہارون روڈ، کراچی

پہلا ورق ـــــــ مرتبین: حیدر قریشی، راغب شکیب
اوراق کے اداریے
صفحات: ۱۴۴ ـ قیمت: ۵۰ روپے
پتا: مکتبہ ہم زبان پوسٹ بکس ۱۱۵۳۳ کراچی ۷۴۸۰۰

غالب اور انقلابِ ستاون ـــــــ مصنف: ڈاکٹر سید معین الرحمٰن
غالبیات
صفحات: ۳۹۲ ـ قیمت: ۱۲۵
پتا: الفیصل ناشران کتب ـ غزنی اسٹریٹ اردو بازار، لاہور

لمحوں کا قرض ـــــــ مصنف: زاہد منیر عامر
گفتگو
صفحات: ۹۲ ـ قیمت: ۳۵ روپے
پتا: دانش کدہ ـ ۹۲ ـ اسلام پورہ، سرگودھا

نقوشِ جاوداں ـــــــ مصنف: زاہد منیر عامر
اسلامیات
صفحات: ۲۲۱ ـ قیمت: ۴۰ روپے
پتا: المحمود اکیڈمی اردو بازار، لاہور

اردو شاعری میں تازہ گوئی کی تحریک ـــــــ مصنف: ڈاکٹر ملک حسن اختر
تنقید
صفحات: ۲۶۴ ـ قیمت: ۱۵۰ روپے
پتا: پبلی کیشنز راحت مارکیٹ، لاہور

ریگِ رواں ـــــــ مصنف: حکیم محمد سعید
سفرنامہ
صفحات: ۴۴۸ ـ قیمت: ۱۲۵

جریدے

محراب ——— مرتبین: احمد مشتاق، سہیل احمد
صفحات: ۲۸۰ ـ قیمت: ۱۰۰ روپے
پتا: قوسین ـ لاہور

نگارِ پاکستان ——— مدیر: ڈاکٹر فرمان فتح پوری
سالنامہ ۱۹۸۹ء
صفحات: ۳۸۴ ـ قیمت: ۲۵ روپے
پتا: ۶۰ ورلی روڈ، گارڈن ایسٹ، کراچی

اسرے ——— مدیر: حسنین کاظمی
ترکی نمبر
صفحات: ۱۰۴ ـ قیمت: ۱۰ روپے
پتا: شاہی چیمبرز ۴ ـ کمرشل ایریا ـ بلاک ۸ کے ڈی ایچ ایس، کراچی

لوحِ افکار ——— مرتبین: حسین انجم، مظہر جمیل، مسلم شمیم، نکہت بریلوی
صفحات: ۸۸ ـ قیمت: ۱۰ روپے
پتا: ایچ ـ ۲۸، رضویہ سوسائٹی، کراچی

نامہ افکار ——— مدیر: صہبا لکھنوی
صفحات: ۸۴ ـ قیمت: ۱۰ روپے
پتا: افکار فاؤنڈیشن، رابسن روڈ، کراچی

دستاویز ——— مدیر: اشرف سلیم
شمارہ ۱
صفحات: ۱۹۲ ـ قیمت: ۳۵ روپے
پتا: پوسٹ بکس نمبر ۱۳۲۶ ـ راولپنڈی، ۱۷ ٹیپو روڈ، راولپنڈی

امہ صریر ——— مدیر: فہیم اعظمی
صفحات: ۸۸ ـ قیمت: ۱۰ روپے
پتا: ۱۴ سی/۲۰ فیڈرل بی ایریا، کراچی

ڈاکٹر وفا راشدی

نئے خزانے

گزشتہ سے پیوستہ ـــــ رسائل و جرائد بابت جون تا اکتوبر ۱۹۸۹ء کے موضوع وار اشاریے

خطوط

مصنف	عنوان	رسالہ	ماہ	سال	صفحہ
آزاد مولانا ابوالکلام	بنام مولانا عبدالسلام ندوی	معارف اعظم گڑھ	جولائی	۱۹۸۹ء	ص ۲۱
آزاد، جگن ناتھ	بنام حسنین کاظمی مدیر دائرے	دائرے کراچی	اگست	״	ص ۵۰
اکبر رحمانی پروفیسر	بابائے اردو مولوی عبدالحق کے خطوط				
	بنام سید وحید اکبر آبادی	قومی زبان کراچی	اگست	۱۹۸۹ء	ص ۴۷

خدیجہ مستور

مصنف	عنوان	رسالہ	ماہ	سال	صفحہ
	خدیجہ مستور بنام ہاجرہ مسرور				
	نثار عزیز بٹ	قومی زبان کراچی	جولائی	۱۹۸۹ء	ص ۱۹
رضیہ سجاد ظہیر	بنام رام لعل	نیا دور	״	شمارہ ۸۳، ۸۴	ص ۳۳
عبدالرحمٰن چغتائی	بنام رام لعل	״	״ ״	״ ״	ص ۳۰
کرشن چندر	بنام رام لعل	״	״ ״	״ ״	ص ۳۰

شخصیات

آذر زوبی

مصنف	عنوان	رسالہ	ماہ	سال	صفحہ
معین سعد، ڈاکٹر	اعتدال پسند فن کار	افکار نذرِ زوبی	اگست	۱۹۸۹ء	ص ۱۸
شہ احمد	زوبی میرا دوست	״ ״	״	״	ص ۸۰
رام بریلوی	زوبی کے حروف کی رمز آفرینی	״ ״	״	״	ص ۱۲۲
سنید و بوسانی	زوبی روحانی نظریۂ فن کا نقیب	״ ״	״	״	ص ۳۳
وزیر سدید، ڈاکٹر	آذر زوبی کی بازیافت	״ ״	״	״	ص ۳۷
رعنایت اللہ	زوبی ایک خالق ایک مخلوق	״ ״	״	״	ص ۱۰۹

بانو قدسیہ	زوبی شکوہ در شکوہ	〃	〃	〃	〃	ص ۹۰
بشیر موجد	زوبی ایک مطالعہ	〃	〃	〃	〃	ص ۱۲۸
جوگندر پال	ایک کھرا فن کار	〃	〃	〃	〃	ص ۱۳۵
جی۔ الانہ/احمد امام	آذر زوبی ایک مصور ایک ترجمان	〃	〃	〃	〃	ص ۵۰
حفیظ رومانی	ایک فطری آرٹسٹ زوبی	〃	〃	〃	〃	ص ۱۲۲
سحر انصاری	آذر زوبی کا فن	〃	〃	〃	〃	ص ۱۲۵
سعادت حسن منٹو	پاکستان کا ایک فن کار	〃	〃	〃	〃	ص ۰
شبنم رومانی	ایک تخلیقی فن کار	اقدار۔ نذرِ زوبی		اگست	۶۱۷ ،	ص ۱۳۲
صہبا انصاری	آیات کا تجسیم کار		〃	〃	〃	ص ۷۵
قرۃ العین حیدر	اشاریت کی نئی سمتیں اور زوبی	〃	〃	〃	〃	ص ۴۸
مجتبیٰ حسین پروفیسر	آذر زوبی	〃	〃	〃	〃	ص ۶۸
محمد علی صدیقی	آذر زوبی ایک دبستان ایک عہد	〃	〃	〃	〃	ص ۸۱
ممتاز مفتی	آذر زوبی	〃	〃	〃	〃	ص ۵۴
منیر الدین احمد، ڈاکٹر	زوبی کے ہاں منٹو سے ملاقات	〃	〃	〃	〃	ص ۱۴۶
میرزا ادیب	آذر بت تراش	〃	〃	〃	〃	ص ۷۱

ابوالکلام آزاد

رفعت رضوانہ	مولانا ابوالکلام کے بارے میں ایک تاریخی تحریر اور غیر مطبوعہ خط	کتاب نما	نئی دہلی	ستمبر	۱۹۸۹ء	ص ۳۳
سہیل صدیقی	کچھ حیات آزاد کی تحقیق کے سلسلے میں	ہماری زبان	دہلی	۸ / 〃	〃	ص ۳
شائستہ خاں	مولانا آزاد کے صحیح سالِ پیدائش کا انکشاف	کتاب نما	نئی دہلی	〃	〃	ص ۲۱

ابوالفضل صدیقی

ابو مسلم صدیقی	میرے بھائی صاحب	نیا دور	کراچی	شمارہ ۸۳، ۸۴	ص ۲۲۸
اسلم فرخی، ڈاکٹر	ابوالفضل صدیقی	〃	〃	〃 〃 〃	ص ۲۲۴

علامہ اقبال

اسلوب احمد انصاری	اقبال اور دانشِ حاضر	دائرے	کراچی	ستمبر	۱۹۸۹ء	ص ۱۲

باباۓ اردو مولوی عبدالحق

شید الدین	مولوی عبدالحق اور اورنگ آباد	ہماری زبان	دہلی	۱۵ اگست ۱۹۸۹ء	ص ۱
ان الحق حقی	مولوی عبدالحق کا استعفیٰ	دائرے	کراچی	ستمبر ء	ص ۵۴
ت تقوی، سید	مولوی عبدالحق کی لغت نگاری	قومی زبان	ء	اگست ء	ص ۲۹
ا رالدین احمد، ڈاکٹر	باباۓ اردو	ء	ء	ء ء	ص ۱۵
یدفیصر ندوی	باباۓ اردو	ء	ء	ء ء	ص ۳۴

یلہ ہاشمی

لار حسین	جمیلہ ہاشمی	نیا دور	کراچی	شمارہ ۸۳، ۸۴	ص ۲۴۰
جالبی۔ ڈاکٹر	تحفی جن سے گفتگو....	ء	ء	ء ء ء	ص ۲۵۰
شہ صدیقی	میری ماں	ء	ء	ء ء ء	ص ۲۴۶

یجہ مستور

زہرا حسین	دیکھیں کیا گزرے ہے؟	قومی زبان	کراچی	جولائی ۱۹۸۹ء	ص ۲۳
احمد خاں	خدیجہ مستور بہ حیثیت ناول نگار	ء	ء	ء ء	ص ۲۷
ہ مسرور	خدیجہ مستور	ء	ء	ء ء	ص ۱۵

ندی علامہ سید غلام رضا

جالبی، ڈاکٹر	تاثرات	دانش	اسلام آباد،	شمارہ ۱۷، ۱۸/۱۹۸۹ء	ص ۳۴۲
بط حسن رضوی، ڈاکٹر	یاد او بخیر باد	ء	ء	ء ء ء ء ء	ص ۳۶۰
لی رضا نقوی، ڈاکٹر	اقبال شناس سعدی	ء	ء	ء ء ء ء	ص ۳۷۵
راکرم اکرام، ڈاکٹر	ایران کا ایک عظیم اقبال شناس	ء	ء	ء ء ء ء	ص ۳۳۸
ن شیفتہ	غلام رضا سعیدی اور تفکرِ دین	ء	ء	ء ء ء ء	ص ۳۵۰

یار

م قاسمی	خواب کا در بند ہے	کتاب نما	نئی دہلی	اگست ۱۹۸۹ء	ص ۷۶
لم خاں، ڈاکٹر	شہریار	ء	ء	ء ء	ص ۶۱
حمد	شہریار کی نظم "وطن" ایک تجزیہ	ء	ء	ء ء	ص ۶۸
ندوائی	رات سے خواب تک	ء	ء	ء ء	ص ۱۷

ـبد القدوس ہاشمی ندوی

نہال احمد صدیقی ایک روشن دماغ تھا نہ رہا العلم کراچی جون ۱۹۸۹ء ص ۲۱
ـیر احمد عثمانی، پروفیسر حکیم — مولانا عبدالقدوس ہاشمی " " " " ص ۳۳
ـفار احمد رضوی، ڈاکٹر عبدالقدوس ہاشمی بحیثیت فقیہہ " " " " ص ۳۰

ـرزا غالب دہلوی

ـید معین الرحمٰن، ڈاکٹر غالب کا علمی سرمایہ قومی زبان کراچی ستمبر ۱۹۸۹ء ص ۳۷
ـلوی مقدم، ڈاکٹر غالب دانش اسلام آباد ۱۷، ۱۸/۱۹۸۹ء ص ۹

محسن احسان

ـشرف عدیل، ڈاکٹر محسن احسان، ایک نقاد ایک شاعر کتاب نما نئی دہلی ستمبر ۱۹۸۹ء ص ۷۰
ـروت محسن احسان ہم سخن ہم نفس " " " " ص ۷۷

محمد شیر افضل جعفری

انجم نیازی پیرِ جواں سال اوراق لاہور جون، جولائی ۱۹۸۹ء ص ۲۲
قادم رزمی شیر افضل جعفری کی موت پر " " " " " ص ۱۴
غلام الثقلین نقوی درویش علی مست " " " " " ص ۱۵

مرزا شوق لکھنوی

اکبر حیدری کاشمیری، ڈاکٹر — مرزا شوق لکھنوی اردو کراچی جون ۱۹۸۹ء ص ۲۳
اکبر حیدری کاشمیری، ڈاکٹر مرزا شوق لکھنوی ہماری زبان دہلی ۱۵ تا ۲۲ ستمبر " ص ۳

ممتاز مفتی

اصغر ندیم سید مفتی جی اوراق لاہور جون، جولائی ۱۹۸۹ء ص ۷۶
انور سدید، ڈاکٹر ققنس " " " " " ص ۶۱
منشا یاد ممتاز مفتی کا فنی سفر " " " " " ص ۶۷

ن۔م۔ راشد

آفتاب احمد، ڈاکٹر راشد کی یادیں نیا دور کراچی شمارہ ۸۳، ۸۴ ص ۲۶۰
آفتاب احمد، ڈاکٹر شاعروں کا شاعر " " " " ص ۲۷۵
ن۔م۔ راشد کے خطوط بنام ڈاکٹر آفتاب احمد " " " " ص ۲۹۸

دیگر علمی و ادبی شخصیات

آصف زمانی، ڈاکٹر قاضی عبدالودود، محقق نامور دانش اسلام آباد ۱۷، ۱۸/ ۱۹۸۹ء ص ۸۱

ندیم داری، ڈاکٹر	مولانا صائب تبریزی، شاعر حکمت و عرفان	دانش	اسلام آباد	۱۷، ۱۸/	۱۹۸۹ء	ص ۵۳
دیبہ بزمی	ابوسعید بزمی	العلم	کراچی	جون	,,	ص ۶۲
لم فرخی، ڈاکٹر	زائر فطرت باشو	ادب لطیف	لاہور	جولائی	,,	ص ۵
لم فرخی، ڈاکٹر	زائر فطرت باشو	ماہِ نو	,,	اگست	,,	ص ۶۴
رشیدی کاشمیری	علامہ سیماب اور مفتی محمد الدین فوق	شاعر	بمبئی	شمارہ ۱ جلد ۶۰	,,	ص ۴
وید اقبال، سید	اختر انصاری اکبرآبادی	دائرے	کراچی	جولائی	,,	ص ۸۶
کا صدیقی	مولانا عرشی	نیا دور	,,	شمارہ ۸۳، ۸۴		ص ۴۳، ۴۴
ی الدین ہاشمی، ڈاکٹر	سرسید، شبلی اور مغرب	معارف	اعظم گڑھ	جولائی	۱۹۸۹ء	ص ۳۵
لطان رشک	میرزا ادیب	نیرنگ خیال	راولپنڈی	ستمبر	,,	ص ۲۰
لطان رشک	سید عطا حسین کلیم	,,	,,	,,	,,	ص ۲۲
لیس فاطمہ	سید حامد علی جعفری	العلم	کراچی	جون	,,	ص ۴۲
زمعین الدین شاہ	ڈاکٹر فاخر حسین[۱]	دائرے	,,	ستمبر	,,	
ر تونسوی، ڈاکٹر	عرفان جنوں و آگہی کا شاعر۔ مجروح سلطان پوری	ادب لطیف	لاہور	جولائی	,,	ص ۱۳
ر سہیل	نسیم انہونوی	کتاب نما	نئی دہلی	اگست	,,	ص ۴۸
المغنی	پروفیسر سید حسین مرحوم	دائرے	کراچی	,,	,,	ص ۸۵
یم۔ لا انصاری	شیخ ایاز، شخص اور شاعر	ماہِ نو	لاہور	جولائی	,,	ص ۸۹
م سید، ڈاکٹر	سلطان العارفین، محمد سلطان باہو	دانش	اسلام آباد	۱۷، ۱۸/	,,	ص ۱۵۳
ر الصدیق، حافظ	استاذ محمد احمد دہمان[۲]	معارف	اعظم گڑھ	ستمبر	,,	ص ۲۲۷
ر الصدیق، حافظ	ڈاکٹر احمد عبدالستار الجواری[۳]	,,	,,	,,	,,	ص ۲۲۹
ر الصدیق، حافظ	ڈاکٹر	,,	,,	,,	,,	ص ۲۳۱
لدین احمد، پروفیسر ڈاکٹر	ڈاکٹر ضیاء الدین احمد کچھ یادیں کچھ باتیں	اردو	کراچی	جون	,,	ص ۱۴۹
حنفی، ڈاکٹر	شاد عارفی، ایک منفرد فن کار	دائرے	,,	جولائی	,,	ص ۳۰
م عزیز کاظمی	کلیم صاحب	کتاب نما	نئی دہلی	اگست	,,	ص ۲۶
لی خاں منظر	تذکرہ حضرت رئیس امروہوی کا	قومی زبان	کراچی	ستمبر	,,	ص ۹
ند خان	مرزا علی اظہر برلاس	العلم	,,	جون	,,	ص ۳۷

صغیر کے ایک ایسے شاعر، ادیب، استاد جو یورپ میں بیٹھ کر اردو زبان و ادب کی خدمت میں مصروف ہیں۔

ماہنامہ

قومی زبان

کراچی

مئی ۱۹۹۰
جلد : ۶۳
شمارہ : ۵

ادارۂ تحریر
جمیل الدین عالی
ادا جعفری
ڈاکٹر اسلم فرخی

مدیر
ادیب سہیل

بدل اشتراک
فی پرچہ ...... ۵ روپے
سالانہ ...... ۵۰ روپے
سالانہ رجسٹری سے ۱۰۰ روپے

بیرونِ ملک
فی پرچہ ...... ایک ڈالر
سالانہ ...... دس ڈالر
سالانہ رجسٹری سے پندرہ ڈالر

مضمون نما

انجمن ترقی اردو پاکستان
بابائے اردو روڈ، کراچی۔ فون: ۲۲۰۲۳

سرورق — ایس فرزانہ

قومی زبان کی قیمت میں اضافہ

کاغذ کی ہوشربا گرانی، طباعتی اجرت میں اضافے اور متعلقہ اشیا کی قیمتیں بڑھ جانے کی وجہ سے "قومی زبان" کی اشاعت روز بروز مشکل ہوتی جارہی ہے۔ ماہنامہ قومی زبان اردو میں شائع ہونے والا سب سے سستا رسالہ ہے جو نفع نقصان کے تصوّرات کے بجائے زبان و ادب کی خدمت کے جذبے سے شائع کیا جاتا ہے انجمن اس کی اشاعت کے سلسلے میں مسلسل نقصان برداشت کرتی آرہی ہے۔

قارئین اس امر سے آگاہ ہیں کہ اب تک "قومی زبان" میں عمدہ قسم کا کاغذ استعمال کیا جاتا تھا جو عام رسالوں کے کاغذ سے بہت بہتر اور بہت مہنگا ہوتا تھا۔ لیکن کاغذ کی قیمتیں جس انداز سے بڑھیں، اس اعتبار سے اعلیٰ سفید کاغذ پر رسالہ شائع کرنا ممکن نہیں رہا چنانچہ بادلِ ناخواستہ انجمن نے یہ فیصلہ کیا کہ "قومی زبان" کو عام قسم کے سفید کاغذ پر شائع کیا جائے اور یکم جولائی ۱۹۹۰ء سے پرچے کی قیمت پانچ روپے کے بجائے آٹھ روپے کر دی جائے۔ سالانہ چندہ پچاس روپے کے بجائے نوّے روپے ہوگا۔

جو لوگ فی الحال سالانہ خریدار ہیں، سالانہ چندہ کے اضافے کا اطلاق ان پر نہیں ہوگا۔

ہمیں یقین ہے کہ "قومی زبان" کے خریدار صاحبان اور زبان و ادب سے دلچسپی رکھنے والے اس ناگزیر اضافے کو قبول فرمائیں گے۔ انجمن آپ کے تعاون ہی سے اپنا اشاعتی پروگرام جاری رکھ سکتی ہے۔

اشرف صبوحی

ڈاکٹر اسلم فرّخی

اشرف صبوحی کی یاد میں

تین برس ہو گئے لیکن کل کی بات معلوم ہوتی ہے۔ انجمن نے اشرف صبوحی صاحب کے ساتھ ایک شام منائی تھی۔ لار حسین صاحب لاہور سے آئے تھے۔ شاہ جہانی دیگ کی کھرچن کے عنوان سے انھوں نے جو مضمون پڑھا تھا وہ سننے والوں ہمیشہ یاد رہے گا۔ صبوحی مرحوم واقعی شاہ جہانی دیگ کی کھرچن ہی تھے۔ دلّی کی دائی۔ دلّی کے عاشق۔ رسم و رواج۔ تیج تیوہار۔ ، ٹھیلے۔ رہن سہن۔ لباس۔ وضع۔ قطع۔ بولی ٹھولی۔ اہلِ دل۔ اہلِ حرفہ سب سے ان کی واقفیت اور شناسائی ماہرانہ ں محرمانہ تھی۔ بڑے آدمیوں کے تذکرے اور خاکے سبھی لکھتے ہیں۔ صبوحی مرحوم نے معاشرے کی نچلی سطح سے تعلق رکھنے والوں ناکوں پر زیادہ توجہ دی اور دلّی کے اہلِ حرفہ کے دلوں میں جھانک کر ان کی زندگی کی عظمت۔ اصول پرستی اور مستانہ روی ۔ے کمال سے اُجاگر کیا۔ گنجا نہاری والا۔ مٹھو بھٹیارا۔ گھمّی کبابی۔ ملّن نائی۔ ٹنّا پہلوان۔ دلوائی آپا، ان کے لکھے ہوئے

سوئے فردوس کر کے سب کو رنجور	ہوئے راہی بہ نورِ لیلۃ القدر
ولی اشرف صبوحی آیتِ نور ۱۴۱۰ھ	لکھی اسلم نے یہ تاریخِ رحلت

۲۷ رمضان المبارک ۱۴۱۰ھ

اشرف نژادِ اشرافِ دہلی	رفتہ بجنّت در لیلۃ القدر
فرزانۂ عصرے اشرف صبوحی ۱۴۱۰ھ	سالِ وفاتش بنوشت اسلم

، خاکے ہیں جن میں قیامِ پاکستان سے پہلے کی دلّی کا دل دھڑکتا ہوا محسوس ہوتا ہے۔ ان خاکوں میں وہ زندگی ابھرتی، ی اور بڑھتی ہوئی محسوس ہوتی ہے جس میں کوئی تکلّف اور تصنّع نہیں تھا۔ جس میں آج کا منافقانہ رویّہ اور دولت کی ہوس ئی شائبہ نہیں تھا۔ یہ چھوٹے چھوٹے لوگ جو معاشرے کو توانائی بخشتے ہیں۔ انسان دوستی اور رواداری کا سرچشمہ ہوتے

حقیقت اور سچائی تھے۔ صبوحی صاحب نے ان حقیقتوں اور سچائیوں کو اپنی تحریروں میں فن کارانہ سلیقے سے پیش کیا ہے
اردو خاکہ نگاری میں ان کا یہ کارنامہ ہمیشہ زندہ رہے گا۔

یوں تو صبوحی صاحب نے افسانے بھی لکھے۔ مضامین بھی لکھے۔ انگریزی سے ترجمے بھی کیے۔ ان کے ترجمے زبان و بیان کے اعتبار سے بڑی اہمیت رکھتے ہیں۔ لیکن ان کا دوسرا اہم کارنامہ بچّوں کی کہانیاں ہیں۔ انھوں نے کوئی سو، سوا سو کہانیاں بچّوں کے لیے لکھی ہوں گی۔ یہ بھی ایک المیہ ہے کہ بیشتر کہانیاں انھوں نے خود ہی شائع کیں۔ ناشروں نے ان کہانیوں کی طرف کوئی خاص التفات نہیں کیا۔ صبوحی صاحب نے اپنی تمام کہانیاں بچّہ بن کر اس طرح لکھی ہیں جس سے بچّوں کے احساس میں گدگدی ہوتی صبوحی صاحب نے ناصحِ مشفق کا روپ کہیں نہیں دھارا بلکہ ایک سچّے اور مخلص فن کار کی حیثیت سے بچّوں کے لیے خوشنما کھلونے تیار کیے ہیں جن سے ایک نئی۔ انوکھی اور خوبصورت دنیا کے امکانات روشن ہوتے ہیں۔ تہذیبی اور ثقافتی سطح پر بھی ان کہانیوں کی اہمیت اپنی جگہ ہے۔ ثقافتی بازیافت کے عمل میں اشرف صبوحی کی لکھی ہوئی کہانیاں روشن مینار کی حیثیت رکھتی ہیں

اشرف صبوحی مرحوم ایک عرصے سے کراچی میں مقیم تھے۔ ایک حادثے کی وجہ سے نقدِ بصارت سے محروم ہو چکے تھے۔ (آنکھوں کا آپریشن ہوا تھا۔ آنسو گیس کا گولہ پھٹا۔ سارا دھواں آنکھوں میں گیا۔ بینائی کی بحالی کے لیے آپریشن ہوا تھا وہی ختم ہو گئی) لیکن چشمِ دل روشن تھی۔ کبھی کبھار بیٹے کے ساتھ کہیں آجاتے تھے۔ شگفتگی اور زندہ دلی سے سبا ہنستے رہتے تھے۔ گفتگو کی حلاوت۔ برجستگی اور بات سے بات پیدا کرنے کا سلیقہ آخر تک برقرار رہا۔ بڑے دین دار اور اللہ والے بزرگ تھے۔ طبیعت میں غیر معمولی صبر و ضبط تھا۔ بینائی سے محرومی کا شکوہ ان کی زبان سے کبھی نہیں سنا گیا۔ ذکر آ بھی جاتا تو ہنس کر ٹال دیتے تھے۔ "ارے میاں آنکھیں روشن تھیں تو کون سا تیر مار لیا تھا۔ نہیں ہیں تو بے شمار گناہوں سے بچے ہوئے ہیں"۔ صبوحی صاحب کی اہلیہ کا ۱۹۸۵ء میں انتقال ہو گیا تھا۔ بڑا صدمہ ہوا مگر انھوں نے بڑی ہمّت اور استقلال سے اس صدمے کو بھی برداشت کر لیا۔ البتّہ ایک صدمہ ایسا تھا جس کا وہ برملا اظہار کرتے تھے۔ کہتے تھے، ایک صدمہ دلّی کا چھٹنا۔ اور دوسرا صدمہ لاہور کا چھوٹ جانا۔ لاہور سے انھیں بڑی محبّت تھی۔ ایک بار کہنے لگے 'میری آرزو ہے کہ لاہور کی خاک کا حصّہ بن جاؤں۔ میانی صاحب میں والد مرحوم کے پائنتی ٹھکانا مل جائے۔ مگر ان کی یہ خواہش بھی پوری نہ ہو سکی

صبوحی صاحب بڑے خوش نصیب بزرگ تھے۔ ان کے بیٹوں جاوید اشرف اور حبیب اشرف نے ان کی بڑی خدمت کی جاوید اور ان کی بیگم نے صبوحی صاحب کی نگہداشت میں جان لڑا دی۔ اپنے یہاں بڑی محبّت اور اہتمام سے رکھا۔ بڑی اچھی طرح خبر گیری کی۔ اللہ تعالیٰ ایسی سعادت مند اولاد سب کو عطا فرمائے۔

اچھوں کی ہر بات اچھی ہوتی ہے۔ صبوحی صاحب رخصت بھی ہوئے تو لیلۃ القدر میں۔ نمازِ جنازہ ہوئی تو لیلۃ القدر کی صبح نمازِ فجر میں جس میں ہزاروں بندگانِ خدا شریک تھے ؎

کیا دوانے نے موت پائی ہے

ڈاکٹر اسلم فرخی

گلیوں میں میری نعش کو کھینچے پھرو....

بیاد ڈاکٹر مشیر الحق

۴۷-۴۸ کے ہنگامی اور پُر آشوب دَور میں ایسی ایسی محبتیں اور دوستیاں قائم ہوئیں جو آج تک پوری زندگی کو اپنی گرفت میں لیے ہوئے ہیں۔ ناساعد حالات اور آزمائش کی گھڑی میں اُستوار ہونے والی دوستی ہمیشہ پائدار ہوتی ہے کیونکہ اس کی بنیاد خلوص اور اخوت پر اُستوار ہوتی ہے۔ ۴۷ء کے آخر یا ۴۸ء کے شروع میں دو بھائیوں سے ملاقات ہوئی۔ بھولے بھالے۔ نیک۔ شریف۔ زمانے کے شر۔ فساد۔ چھل بٹے سے بے خبر۔ سیدھے سادے اور مخلص۔ بڑے۔ ایک ملاقات کے بعد وطن واپس چلے گئے۔ سمندر میں خشکی کا راستہ پیدا ہو گیا تھا۔ خلقِ خدا جوق در جوق سرزمینِ موعود کی طرف دوڑ پڑی تھی۔ مگر مشیر الحق ظلم و استبداد کا نشانہ بننے "انشا اللہ آمین" پڑھتے سرزمینِ مصر میں واپس ہو گئے۔

بڑے میاں تو بڑے میاں چھوٹے میاں سبحان اللہ کی مثل کچھ اچھے معنوں میں استعمال نہیں ہوتی مگر میرے دونوں

> مشیر الحق ہوئے نذرِ تشدد
> قیامت دیکھ لی ہے زندگی میں
> گئے ماہِ اماں میں روئے فردوس
> شہادت کی قبائے سرمدی میں
> چراغِ راہ ہے تاریخ ہجری ۱۴۱۰ھ
> ہوئی ہے نشترِ غم عیسوی میں
> ۱۹۹۰ء

کے بمصداق چھوٹے بھائی بھی ترقی کرتے رہے اور بڑے بھائی بھی۔ خبریں اور اطلاعیں ملتی رہیں۔ بھائی جان نے پی ایچ ڈی لیا اب ایم اے کا آخری سال ہے۔ ان دنوں میک گل میں ہیں۔ آج کل علی گڑھ میں پڑھا رہے ہیں۔ اب علی گڑھ سے جامعہ ملیہ گئے ہیں۔ پروفیسر ہو گئے ہیں۔ سنتا رہتا اور خوش ہوتا رہتا۔ صرف خبریں اور اطلاعیں ہی سننے میں نہیں آتیں کیسی

نئی ہندوستانی کتاب کی ضرورت ہوتی تو فوراً آجاتی۔ عرشی صاحب کا مرتبہ دیوان غالب شائع ہوا۔ مشیر میاں کی مہربانی اور توجہ سے فوراً ہی پہنچ گیا۔ بہت مدت تک ملاقات کی نوبت نہیں آئی مگر وہ رعنائی خیال جو کسی شخص کے تصور سے ہوتی، موجود رہی۔ درمیانی رابطہ تھے شاہ محی الحق فاروقی جن کی رفاقت۔ دوستی۔ خوش بیانی اور بھائی کی محبت نے ۴۷ء تک کی زندگی کے واقعات تفصیلاً اور ۴۷ء کے بعد کے اجمالاً بڑی خوبی اور خوبصورتی سے اس طرح پیش کیے ہیں کہ وہ میرے وجود کا ایک حصہ بن گئے۔ مدتوں ملاقات نہ ہونے کے باوجود میں نے مشیر میاں سے ایک ذہنی اور روحانی قربت ہمیشہ محسوس کی۔ غالباً وہ بھی اس احساس سے بیگانہ نہیں تھے۔

پھر ایک دن یہ ہوا کہ مشیر میاں بے سان وگمان کراچی آگئے۔ بے سان وگمان یوں کہ مجھے کوئی اطلاع نہیں تھی۔ میرا قیام ان دنوں یونیورسٹی کیمپس میں تھا۔ ایک دوپہر مشیر میاں اور ان کی بیگم آپہنچے۔ میں نے انھیں دیکھا تو دیکھتا ہی رہ گیا۔ ۴۷ء کے مشیر میاں اور ان میں بڑا فرق تھا۔ چشم بد دور۔ لمبا قد۔ لمبا چہرہ۔ چہرے پر شرافت۔ حلم اور علم کے آثار۔ کشادہ پیشانی۔ روشن آنکھیں۔ بال قبل از وقت سپیدی کی جانب مائل۔ میرے ذہن میں جو حلیہ تھا اس سے بالکل مختلف۔ میرا خیال تھا کہ اپنے برادرِ خورد محی الحق کے مانند چہرے پر ڈاڑھی ضرور ہوگی۔ شیروانی پاجامے میں ملبوس ہوں گے مگر مشیر میاں کلین شیوڈ۔ نہایت عمدہ سوٹ پہنے۔ ملے تو اس طرح کہ ۴۷ء سے اس وقت تک کا جو بُعد جسمانی تھا ایک لمحے میں ختم ہوگیا۔ اور ہم دونوں نے یہ محسوس کیا کہ جیسے کوئی فاصلہ درمیان میں تھا ہی نہیں۔ نجانے کتنی دیر تک باتیں ہوتی رہیں یہاں تک کہ ساتھ آنے والے صاحب نے انھیں یاد دلایا کہ ایک دوسرا پروگرام بھی ان کا منتظر ہے۔ اور وہ اگلے دن کھانے آنے کا وعدہ کرکے رخصت ہوگئے۔

ان کے جانے کے بعد میں نے بڑی دیر تک ان کے بارے میں غور کیا۔ باوجودیکہ وہ ایک بڑی مشہور درس گاہ میں پروفیسر تھے مگر انداز میں نہ کوئی علمی پندار تھا نہ بڑائی کے اظہار کا شائبہ۔ باتیں بہت ٹھہر ٹھہر کر دھیمے لہجے میں کرتے۔ اپنی آواز بلند کرنا انھیں پسند نہ تھا۔ اپنی رائے پر قائم رہنے کا جذبہ تھا لیکن رائے کے اظہار میں نرمی اور انکسار تھا۔ معلومات بہت وسیع تھیں لیکن انھوں نے گفتگو میں کوئی ایسا حوالہ نہیں دیا جس سے ان کی کثرتِ معلومات کا رعب طاری ہو۔ سیدھے سادے آدمی۔ اپنے خیالات کی جنت میں مگن۔ اپنے کام سے کام۔ وہ جو ایک عام روش ان دنوں رائج ہوگئی ہے کہ کام کم سے کم باتیں زیادہ سے زیادہ۔ پی آر کرتے رہو۔ شخصیت سازی پر زور دیتے رہو۔ اپنا ڈھول خود ہی پیٹتے رہو۔ مشیر میاں اس ڈھب کے آدمی نہیں تھے۔ لکھنے پڑھنے میں لگے رہتے اور خوش رہتے۔

میرے یہاں آکر انھوں نے پروفیسر مُراد اور بیگم مُراد کے بارے میں بڑی محبت اور خلوص سے دریافت کیا۔ یہ دونوں میاں بیوی کراچی یونیورسٹی کے شعبۂ تاریخِ اسلام سے وابستہ تھے اور میک گل میں مشیر میاں کے ساتھ رہ چکے تھے۔ ان دنوں میرے مکان کے قریب ہی مقیم تھے چنانچہ انھیں بھی زحمت دی۔ اتفاق یہ کہ دونوں مکان پر موجود تھے تو آپہنچے اور بڑی پُرلطف ملاقات رہی

مشیر میاں کے اس دورے میں شریف المجاہد نے قائداعظم اکیڈمی میں ان کے ایک لیکچر کا اہتمام کیا۔ بعد

کی جانب سے ایک بڑے لیکچر کا اہتمام ہوا۔ دونوں لیکچر بہت پسند کیے گئے۔ مشیر میاں کے دھیمے لہجے نرم آواز اور عالمانہ متانت کو ہر سننے والے نے سراہا۔ چونکہ وہ اسلام اور تاریخ اسلام پر بڑی گہری نظر رکھتے تھے اس وجہ سے ان کے لیکچر بڑے معنی خیز اور معلومات افزا ہوتے تھے۔ انجمن ترقی اردو کے صدر جناب نورالحسن جعفری قرآن مجید کے تراجم کے بارے میں ان کا ایک لیکچر سن کر بڑے متاثر ہوئے۔ اگلے دن مجھ سے کہنے لگے۔ بڑا عمدہ لیکچر تھا۔ جعفری صاحب تعریف کے سلسلے میں جز رس تو نہیں لیکن غیرمعمولی محتاط اور لب بند ضرور ہیں۔ ان کا یہ کہنا کہ لیکچر بڑا عمدہ تھا، سو تعریفوں پر بھاری تھا۔

۷۴ء کے بعد ۷۸ء میں مجھے پہلی مرتبہ دلی جانے کا اتفاق ہوا۔ مقصد حضرت سلطان جیؒ کی زیارت تھا۔ پاکستانی زائرین کے قافلے کے ساتھ دلی پہنچا۔ بستی نظام الدینؒ کے قریب ہی ہیں اسکاوٹ کیمپ میں قیام ہوا۔ اس سفر میں برادرم معین الدین خاں، کہ اہلِ دل بھی ہیں اور دلی والے بھی اور برادرم راحت امین چغتائی بھی ساتھ تھے۔ دونوں مشیر میاں کے دلدادہ تھے چنانچہ اگلے ہی دن جامعہ ملیہ کا رُخ کیا گیا۔ معین خاں صاحب نے اس موقعے پر روایتی انداز اختیار کیا۔ جانے سے پہلے بستی کی ایک دکان سے مٹھائی خریدی۔ کہنے لگے۔ بچوں کے گھر میں خالی ہاتھ نہیں جانا چاہیے۔ جامعہ ملیہ پہنچے۔ مشیر میاں سے ملاقات ہوئی۔ جس چیز نے ہم سب کو متاثر کیا وہ ان کے گھر کی حیرت انگیز سادگی تھی۔ ہم لوگ شوکت و ثروت کے اتنے عادی اور دلدادہ ہو گئے ہیں کہ رہن سہن کے معمولی انداز کو خاطر میں نہیں لاتے۔ یہ ہمارا قومی شعار بن گیا ہے۔ اعلیٰ سے اعلیٰ کی طرف ایک دوڑ ہے کہ جاری ہے۔ اس دوڑ میں حرام۔ حلال، جائز، ناجائز سب کی تفریق مٹ گئی ہے۔ شاید اسی شعار نے ہمارا ذہنی اور روحانی سکون غارت کر دیا ہے۔ ہوس جیسے جیسے بڑھتی جاتی ہے انسانی ذہن پر دباؤ بھی بڑھتا جاتا ہے۔ اس عالم میں دماغ کی شریانیں نہ پھٹیں اور ہارٹ اٹیک نہ ہو تو پھر اور کیا ہو۔

مشیر میاں کے یہاں بڑے اہتمام سے دسترخوان بچھا۔ پلیٹیں چُنی گئیں۔ شاید دو تین صاحبان اور بھی تھے۔ ہم سب نے بڑے سکون اور اطمینان سے کھانا کھایا۔ کھانے میں بھی وہی سادگی تھی۔ تکلف اور اہتمام یا مصنوعی دھوم دھام نہیں تھی۔ سب نے بڑے اطمینان سے سیر ہو کر کھانا کھایا۔ علمی ادبی موضوعات پر گفتگو ہوتی رہی۔ مشیر میاں کی گفتگو میں بھی بڑا رکھ رکھاؤ اور سنجیدگی تھی۔ انھیں دیہاتی زندگی کے جملہ پہلوؤں کے بارے میں بھی بڑی مکمل معلومات حاصل تھیں۔ علمی پہلو وہ ان معلومات میں بھی تلاش کر لیتے تھے۔ عالم کا وصف یہی ہے کہ وہ خود کو کتابوں تک محدود نہ رکھے بلکہ اپنے اردگرد پھیلی ہوئی زندگی سے بھی اکتسابِ علم کرتا رہے اور اسے دوسروں تک پہنچاتا رہے۔

۷۸ء کے بعد سے یہ مستقل دستور ہو گیا کہ حضرت سلطان جیؒ کے عرس میں جانا ہوتا تو مشیر میاں کے یہاں ایک کھانا ضرور ہوتا۔ وہ حضرت سلطان جیؒ کے دلدادہ بھی تھے۔ بچوں کے لیے ایک چھوٹی سی کتاب حضرت سلطان جیؒ کے بارے میں لکھ چکے تھے۔ خواجہ حسن ثانی نظامی کے یہاں منعقد ہونے والے سیمینار میں بھی انھوں نے سلطان جیؒ کے حوالے سے دو تین مضمون پڑھے۔ تصوف کے سلسلے میں ان کا مطالعہ بڑا وسیع اور نظر بہت گہری تھی۔ جو مضمون بھی انھوں نے پڑھے بڑی محنت سے لکھے گئے تھے اور ہر ایک میں کسی نہ کسی نئے رُخ کی نشاندہی تھی۔ صوفیائے کرام کا طریقۂ رشد و ہدایت۔ صوفیائے کرام اور اصلاحِ معاشرت۔ صوفیائے کرام کی سیرت اور کردار کا معاشرے پر اثر۔ اس قسم کے موضوعات پر انھوں نے تفصیل سے لکھا اور

خوب لکھا۔ ایک تو یہ کہ اسلام اور تاریخِ اسلام ان کا موضوع۔ دوسرے یہ کہ انھیں اپنے موضوع سے والہانہ لگاؤ۔ تیسرے حضرت سلطان جیؒ کی مبارک شخصیت سے ان کا غیر معمولی شغف اور عقیدت۔ یہ مضامین اچھے کیوں نہ ہوتے۔ حضرت سلطان جیؒ سے عقیدت ہم دونوں کا باہمی رشتہ تھا۔ یہ رشتہ بڑا مضبوط اور جاندار ہوتا ہے۔

متیں میاں مضمون دھیمی آواز سے پڑھتے تھے ٹھہر ٹھہر کر پڑھتے تھے۔ کلاس روم والا انداز تو نہیں تھا لیکن جلسے والا انداز بھی نہیں تھا۔ سننے والے لطف اندوز ہوتے تھے۔ علمی مضامین بدرجۂ مجبوری سنے جاتے ہیں کیوں کہ ان مضامین کی سنجیدگی سنجیدہ مطالعے کی متقاضی ہوتی ہے۔ محض سماعت سے جس کے دوران سرگوشیاں بعض اوقات خوش گفتاری اور ... بے توجہی کے مظاہرے ہوتے رہتے ہیں مضمون کا لطف نہیں آتا۔ متیں میاں کا جو مضمون بھی میں نے سنا، لطف اندوز ہوا۔ آخری دفعہ جب وہ کراچی آئے تھے تو انجمن نے مضمون پڑھنے کے لیے مدعو کیا۔ متیں میاں نے وعدہ کر لیا۔ کتب خانۂ خاص میں چھوٹا سا جلسہ ہوا۔ زیادہ آدمی نہیں تھے۔ متیں میاں نے دلّی کے رسم و رواج پر مضمون پڑھنا شروع کیا۔ عنوان کی وضاحت کے بعد جب انھوں نے مضمون شروع کیا تو مجھے خیال ہوا کہ یہ مضمون رسم و رواج کی فہرست گنوانے میں تمام ہو جائے گا اور بہت طویل ہوگا سننے والوں کو کوئی لطف نہیں آئے گا۔ مگر متیں میاں نے نہ تو فہرست گنوائی۔ نہ رسم و رواج کی تشریح کی بلکہ ایسا تو بصورت جامع اور بھرپور مضمون پڑھا کہ ہم سب دنگ رہ گئے تھے۔ اس مضمون میں رسم و رواج کے حوالے سے دردمندی کے جو پہلو تھے اتنے معنی خیز اور واہم تھے کہ دل سے نکلی دل میں پہنچی والی بات ہوگئی۔ یہ مضمون "قومی زبان" میں شائع بھی ہو چکا ہے۔

متیں میاں پچھلے چند برسوں میں متعدد بار کراچی آئے۔ کسی کانفرنس میں شرکت کے لیے باہر کہیں گئے تو واپسی میں یہاں بھی ہوتے گئے۔ چھوٹے بھائی کی خاطر، دوست احباب اور اعزا کی خاطر۔ پھر انھیں ہمدرد سے بھی لگاؤ تھا جب آتے ہمدرد فاؤنڈیشن کے زیرِ انتظام ان کا ایک لیکچر ضرور ہوتا۔ میں جب تک یونیورسٹی میں رہا، یونیورسٹی میں بھی ان کے لیکچر کا اہتمام ہوتا۔ یہاں ان کے گرد ایک جمگھٹا رہتا۔ دوست احباب اعزا سب انھیں لیے پھرتے رہتے۔ مجھے احساس ہے کہ دن بھر اس طرح پابدست دگرے پھرتے میں انھیں تکلیف ہوتی ہوگی مگر وہ خندہ پیشانی سے ہر جگہ جاتے اور بددل نہ ہوتے۔

تین برس پہلے متیں میاں سری نگر یونیورسٹی کے وائس چانسلر مقرر ہو گئے۔ دلّی جاتا ہوا تو ان سے ملاقات نہ ہوئی مگر اس دوران وہ غالباً دو تین مرتبہ یہاں آئے۔ ایک دفعہ جب وہ واپس جا رہے تھے تو میں نے ان سے کہا۔ کتابوں کا ایک پیکٹ ہے۔ لیے جائیے۔ شاہد علی خاں کو دے دیجیے گا۔ متیں میاں وہ پیکٹ لے گئے۔ اگلی دفعہ آئے تو کہنے لگے۔ اس مرتبہ آپ پھر کتابوں کا پیکٹ بھیجیں گے۔ میں نے کہا۔ ہاں، ارادہ تو ہے۔ کہنے لگے۔ مگر شرط یہ ہے کتابیں ہی ہوں۔ کپڑا نہ ہو۔ اس کے باوجود کپڑے کا دوسرا پیکٹ بھی وہ ہنسی خوشی لے گئے۔

متیں میاں نے مولوی عبدالسلام قدوائی ندوی کے مضامین کا ایک مجموعہ "چند تصویرِ بتاں" کے عنوان سے مرتب کیا تھا۔ اس مجموعے میں دیباچے کے طور پر انھوں نے مولوی عبدالسلام قدوائی مرحوم کے بارے میں ایک طویل مضمون لکھا ہے۔ مجھے یہ مضمون اکثر یاد آتا ہے اور میں سوچتا ہوں کہ چند تصویرِ بتاں کی سب سے شاندار، وجیہہ اور پُر وقار تصویر متیں میاں خود تھے۔ ان کے کردار اور سیرت کی تشکیل میں دارالمصنفین، ندوۃ العلما، مسلم یونیورسٹی اور جامعہ ملیہ سب کو دخل ہے۔

ے ادارے برِصغیر کے مسلمانوں کی نشاۃ الثانیہ میں جس اہمیت کے حامل ہیں اس سے ہم سب بخوبی آگاہ ہیں۔ ان میں
ادارے کی انفرادیت اپنی جگہ ہے۔ اندازِ قدیم کی دلآویزی اور طرزِ نو کا بے ساختہ پن ان کے انفرادی انداز۔ سے
ہے۔ مشیر میاں کی شخصیت میں ان سارے اداروں کے اثرات بڑے گہرے اور ایک بڑے نفیس امتزاج کے حامل
ان کی وجہ سے مشیر میاں کا اندازِ فکر بڑا معتدل اور ہمہ جہت ہوگیا تھا۔ مغربی علما کے اثرات سے ان کے یہاں تجسس باقی
کار بھی ملتا ہے۔ میرا اپنا اندازہ یہ ہے کہ وہ کسی خیال کسی روایت۔ کسی بیان کسی نقطۂ نظر کو قبول یا رد کرنے سے پہلے
طرح غور کرتے تھے۔ تجزیہ کرتے تھے۔ تحقیق کرتے تھے پھر اس کے بعد اپنی رائے کا اظہار کرتے تھے جو بھرپور اور جامع ہوتی تھی۔

مشیر میاں درد مند مسلمان تھے۔ پابند صوم و صلوٰۃ تھے۔ مارچ ۸۷ء کی جس دوپہر کو ہم لوگوں نے ان کے یہاں کھانا
س دوران ظہر کا وقت ہوگیا۔ میں نے نماز پڑھنے کے لیے جائے نماز منگوائی۔ مشیر میاں نے ایک کے بجائے دو جا نمازیں
ر ہم دونوں نے نماز ساتھ پڑھی۔ خواجہ ہال بستی نظام الدینؒ میں منعقد ہونے والے سیمیناروں میں مغرب کی نماز بڑے
سے ادا کی جاتی ہے۔ میں نے ان کے شانہ بشانہ تین چار بار نماز ادا کی اور یہ محسوس کیا کہ ان کے یہاں استغراق دوسرے
کے مقابلے میں کچھ زیادہ ہے۔ دردمندی یوں کہ ملتِ اسلامیہ کے سلسلے میں جب ان سے گفتگو ہوتی، ان کے خیالات
نوں کو مسلمانوں کی زبوں حالی کے درد سے لبریز پایا۔ مزاج میں غیر معمولی مروت تھی۔ ایک دن ان کے یہاں میں نے ڈاکٹر
بدالسلام صاحب کی مرتب کردہ کتاب دیوان مرزا شوق کے دیکھنے کا اشتیاق ظاہر کیا۔ مشیر میاں اندر گئے۔ کتاب لے آئے۔
یکھتا رہا۔ بولے۔ آپ کے لیے لکھنؤ سے نسخہ منگوا دوں گا۔ پھر کچھ خیال آیا کہنے لگے۔ منگوانے اور بھجوانے میں نہ جانے کتنا
لگے۔ آپ یہ نسخہ لے لیجیے۔ میں نے لاکھ انکار کیا مگر وہ نہ مانے۔ کتاب مجھے قبول کرنا پڑی۔ مولف کا یہ دستخطی نسخہ جس پہ
ماموں جان کی خدمت میں،" لکھا ہوا ہے اب بھی میرے پاس ہے۔

مشیر میاں بڑے قاعدے قرینے اور رکھ رکھاؤ کے انسان تھے۔ جب وہ پروفیسر تھے اس وقت بھی ان سے متعدد ملاقاتیں
پھر وہ وائس چانسلر ہو گئے مگر انداز وہی رہا۔ وہی سادگی۔ لباس اور وضع قطع کا جو انداز تھا اس میں کوئی فرق نہیں آیا۔
وگ منصب کے زور پہ بڑے بن جاتے ہیں اور چاہتے ہیں کہ ان کے مصنوعی بڑے پن کو بے چون و چرا تسلیم کر لیا جائے۔
ر کے خیال سے شریف اور صلح کل آدمی کو عافیت اسی میں نظر آتی ہے کہ اس بزرگی بمال کو تو "قبول کر لے مشیر میاں
ں خفیف الحرکاتی کا شائبہ بھی نہیں تھا۔ مجھے تو یوں محسوس ہوتا ہے کہ منصب میں اضافے کے بعد ان کی فروتنی میں
اضافہ ہوگیا تھا۔ کیونکہ وائس چانسلر ہونے کے بعد جب وہ کراچی آئے تو ان کے انداز کی نرمی اور گفتگو میں انکسار کچھ زیادہ
ھا ہوا تھا۔ وہ اپنے رفقائے کار میں بڑے مقبول تھے۔ جامعہ میں مجھے ان کے شعبے کے اساتذہ سے ملنے کا اتفاق ہوا۔
شعبے کے علاوہ دوسرے شعبوں کے اساتذہ سے بھی ملاقات ہوئی سب نے محبت اور احترام سے مشیر میاں کا تذکرہ
ن کی علم دوستی اور سادگی کو سراہا اور ان کے خلوص کی تعریف کی۔

مشیر میاں کو اردو اور انجمن دونوں سے بڑی گہری دل چسپی تھی۔ جب بھی آتے انجمن کے کاموں کے بارے میں تفصیل
۔ وقت نکال کر انجمن آتے۔ سب سے ملتے جلتے۔ نئی مطبوعات دیکھتے۔ ان کے بارے میں اظہارِ خیال کرتے۔ نئے

پروگراموں اور منصوبوں کے بارے میں مشورے دیتے۔ انجمن کے اربابِ حل و عقد بھی ان کی بڑی قدر کرتے تھے۔ ان کے آخری پھیرے میں صدر انجمن جناب نور الحسن جعفری نے ان کے اعزاز میں سندھ کلب میں ظہرانے کا انتظام کیا تھا۔ بڑا اچھا وقت گزرا۔ جو بھی ان سے ملا۔ ان کی سادگی، شرافت اور علمی انکسار سے متاثر ہوا۔

بعض باتیں بڑی عجیب ہوتی ہیں۔ ان کی صحیح معنویت کا احساس بعد میں ہوتا ہے۔ رمضان سے چند دن پہلے مشیر میاں کے برادرِ خورد شاہ محی الحق فاروقی میرے یہاں بیٹھے تھے۔ میرے اور مشیر میاں کے درمیان شاہ صاحب رابطۂ قوی کی حیثیت رکھتے ہیں۔ اتفاق یہ کہ ایک اور غازی پوری پروفیسر علی محسن صدیقی بھی تشریف فرما تھے۔ محسن علم النساب کے بڑے ماہر ہیں۔ اِدھر آپ نے کسی شخص کا تذکرہ کیا اور اُدھر محسن نے اس کے خاندان کی تفصیل کا بیان بلکہ بکھان شروع کیا۔ خاندانی کوائف کے وہ نامعلوم گوشے جو کبھی منظرِ عام پر نہیں آتے محسن کے نوکِ زبان ہیں ایسی حیرت انگیز یادداشت اور معلومات کے لوگ بہت کم ہوتے ہیں۔ دو ہم وطن جہاں جمع ہو جائیں وہاں بات ماضی کی یادوں کی جانب ضرور لوٹتی ہے۔ غازی پور کا تذکرہ زور و شور سے جاری تھا۔ دونوں غازی پوری ایک غیر غازی پوری کے دل میں اس دیار کی عظمت کے نقوش اُجاگر کرنے میں سرگرم تھے۔ جس نے راہِ فرار اختیار کرتے ہوئے یہ کہہ کر پیچھا چھڑانا چاہا کہ حال ہی میں پٹنہ یونیورسٹی کے ایک استاد پروفیسر اقبال حسین کی خود نوشت شائع ہوئی ہے۔ ان کا بیان ہے کہ ان کے ضلعے نے ہائی کورٹ کے پانچ جج یکے بعد دیگرے پیدا کیے۔ جو سارے برِصغیر میں ایک ریکارڈ ہے۔ محسن صاحب نے اس چیلنج کو قبول کرتے ہوئے ہائی کورٹ کے ان ججوں کا تذکرہ چھیڑا جو پورب سے تعلق رکھتے تھے۔ برسبیلِ تذکرہ شاہ صاحب نے بے ساختہ کہا "بھائی جان بھی فخرِ غازی پور ہیں"۔ بڑا سیدھا اور حقیقت آمیز جملہ تھا۔ اس وقت کسے احساس تھا کہ اس فخرِ دیار و امصار کا وقت پورا ہو چکا ہے۔ نظر غیروں ہی کی نہیں اپنوں کی بھی لگتی ہے۔ بقول انیس ؎ عین الکمال سے مرے بچے خدا بچائے

اس گفتگو کے چند دن بعد ایک صبح اخبار اٹھایا ایک سرخی پر نظر پڑی اور نگاہ وہیں جم کر رہ گئی۔ یقین نہیں آیا۔ گھبرا کر شاہ صاحب کو فون کیا۔ کہنے لگے "رات ہی کو علم ہو گیا تھا۔ بی بی سی نے خبر نشر کی تھی۔ وقت کیسے گزرا ہے۔ کس طرح گزرا ہے۔ "از زمیں تا آسماں اک سوختن کا باب تھا" ہر صبح نئی امید کے ساتھ شروع ہو جاتی۔ ہر رات ظلمت کدے میں شبِ غم کا جوش بڑھ جاتا۔ کیسی خلش تھی۔ کیا تڑپ تھی۔ مجھے نہیں معلوم کہ بیگم مشیر۔ ان کی بچیوں اور دامادوں پر کیا گزری لیکن میں نے شاہ صاحب اور ان کے بچوں کی تڑپ دیکھی ہے۔ انسانی صبر۔ ضبط۔ تحمل اور برداشت کا مشاہدہ کیا ہے۔ توقع یہ تھی کہ مشیر میاں بخیر آزاد ہو جائیں گے مگر ان کے لہو سے تحریک آزادیٔ کشمیر کو گلنار ہونا تھا ؎ خونِ ناحق مرا سرخی ہے ہر افسانے کی۔ کاش یہ خونِ ناحق رائیگاں نہ جائے۔ یہاں تک لکھنے کے بعد مجھے معاً حضرت میرزا مظہر جانجاناںؒ کا دھیان آیا اور حضرتِ اقدسؒ کے حوالے سے یہ شعر ذہن میں اُبھرا ؎ بلوحِ تربتِ من یافتند از غیب تحریرے — کہ ایں مقتول را جز بے گناہی نیست تقصیرے

مشیر میاں کے حوالے سے بھی اس شعر کی بڑی اہمیت ہے مگر فی الحال غالب کا ہم نوا ہو کر یہ کہنا مناسب معلوم ہوتا ہے ؎

گلیوں میں میری نعش کو کھینچے پھرو کہ میں — جاں دادۂ ہوائے سرِ رہ گزار تھا

جوزف فرینک / سید نوری شاہ

جدید شعر و ادب میں مکانی ہیئت

("نقد و نظر" علی گڑھ ایک نہایت موقر تنقیدی ششماہی ہے۔ قومی زبان نے اس کے فاضل مرتب اسلوب احمد انصاری صاحب کی خاص اجازت سے اس کے بعض مضامین مستقل طور پر شائع کرنے کا فیصلہ کیا ہے۔ ادارہ اس اجازت کے لیے انصاری صاحب کا ممنون ہے۔
(مندرجہ ذیل مضمون شمارہ ۱ جلد ۱۱ جنوری ۱۹۸۹ء سے لیا گیا ہے۔)

جدید برطانوی اور امریکی شاعری نے جنگ عظیم اوّل سے چند سال قبل اور چند سال بعد کے زمانے میں مقبول تحریک پیکریت سے ابتدائی قوت اور فروغ حاصل کیا۔

تحریکِ پیکریت اس اعتبار سے اہم نہیں ہے کہ اس موقف کے ماننے والے شاعروں نے اس کے زیرِ اثر فی الواقعہ شاعری کی (اس لیے کہ ان دنوں شاید ہی کسی کے پاس کوئی صحیح تصوّر تھا کہ پیکر کو ماننے والا شاعر کس ڈھنگ کا ہوتا ہے) بلکہ یہ تحریک صرف اس بنا پر اہم ہے کہ اس نے وکٹورین جذباتی لفّاظی سے اپنا ناتا یک قلم توڑ کر مستقبل میں جدید شاعری کے فروغ کے لیے راستہ ہموار کیا۔

پیکریت کے مفکّر ایزرا پاؤنڈ کی تنقیدی تحریریں انتہائی باریک اور لطیف جمالیاتی احساسات کے درمیان بکھرے ہوئے نوعمروں کے سے شرارت آمیز جملوں سے کھچڑی سی بن گئی ہیں جن کا اصل مقصد بندھے ٹکے روایت پسند بورژوا ذہن کو جھٹکا دینا معلوم ہوتا ہے۔ لیکن پاؤنڈ نے پیکر کی جو تعریف پیش کی ہے اور جو شاید اس کے ادراک کا سب گہرا عمل ہے۔ وہ تعریف جدید ادبی ہیئت کی کسی بھی بحث کے لیے بنیادی اہمیت کی حامل ہے۔ پاؤنڈ لکھتا ہے "پیکر وقت کے کسی ایک لمحے میں ایک مخلوط ذہنی اور جذباتی پیچیدہ تعمیر پیش کرتا ہے۔" یہاں اس تعریف کے ضروری پہلو قابلِ غور ہیں، یعنی پاؤنڈ پیکر کو کسی چیز کی تصویر کی بجائے وقت کے ایک ۔۔ میں متضاد و مختلف خیالات اور جذبات کے اتصال کا ایک "تعمیر" کہتا ہے (یہاں تعمیر کے لفظ سے وسعتِ مکانی کا تصوّر وابستہ ہے) اس انداز کی تعمیر دلیل و ربط اور زبان

ید تقویت دینے کے لیے دوسرے پیراگراف میں لکھتا ہے کہ اس تعمیر کی یہی لمحاتی پیش کش "ہمیں یک لخت زمان و مکان
حدود سے آزادی کا احساس اور ایک رفعتِ ذہنی کا شائبہ دیتی ہے جس کا تجربہ ہمیں عظیم فنی شاہکاروں کے روبرو
تا ہے۔"

اس امر کے پیشِ نظر شروع سے جدید شاعری LESSING کے تجزیۂ زبان کے برعکس شعری طریق کار اپنانے کی طرفداری
ن ہے۔ اسی طرح اگر ہم پاؤنڈ کی بیان کردہ پیکر کی تعریف کا موازنہ ایلیٹ کے بتائے ہوئے (شعری تخلیق کے دوران) نفسیاتی
ل سے کریں تو ہم صاف محسوس کر سکتے ہیں کہ شاعری کی ماہیت کے متعلق نئی نسل کے تصورات ان نئے بیانات سے کتنے بنیادی
از میں متاثر ہوئے ہیں۔

ایلیٹ کے نزدیک شاعرانہ صلاحیت کی منفرد خاصیت بالکل نئے تخیلی مرکبات بنانے کا ذہنی کمال ہے۔ یعنی بظاہر
متضاد نظر آتے ہوئے تجربات اور کیفیات کو ایک آزاد زندہ اکائی میں ڈھال دینا۔ ایلیٹ لکھتا ہے کہ ایک عام آدمی عشق کرتا
ہے یا اسپائینوزا کی تصنیف پڑھتا ہے اور یہ دونوں تجربات ظاہر ہے کہ ایک دوسرے سے کوئی تعلق نہیں رکھتے اسی طرح
جیسے ان کا واسطہ ٹائپ رائٹر کی آواز اور کھانا پکنے کی مہک سے کچھ نہیں ہے، لیکن شاعر کے ذہن میں یہ تجربات مل کر
ب نئے پیکر کو جنم دیتے ہیں۔ دیکھیے پاؤنڈ نے پیکر کی تعریف اس کے جمالیاتی خواص سے مرتب کی جب کہ ایلیٹ اس جگہ
س کی نفسیاتی اصل کے بارے میں وضاحت کر رہا ہے۔ لیکن دونوں صورتوں میں نتیجہ تو ایک ہی برآمد ہوتا ہے۔

شاعری کی ماہیت کے متعلق اس قسم کے تصورات نے بہت سے مسائل کو ختم کر دیا لیکن کچھ نئے مسائل کو جنم دیا مثلاً
ظم میں ایک سے زیادہ پیکر کس طرح قبول کیے جائیں۔ اور یہ بھی کہ اگر پیکر کی خاصیت جذباتی اور ذہنی کیفیات کی بہ یک وقت
تجسیم کرنا ہے تو بہت سے پیکر علاحدہ علاحدہ یکے بعد دیگرے جوڑنے پر خود ان کی شدتِ تاثیر میں کمی آئے گی یا پھر یہ کہ کیا نظم
ذاتِ خود ایک وسیع پیکر ہے جس کے اجزا کو ایک ایک اکائی مانا جائے۔ اس کے لیے یہ ضروری ہوگا کہ زبان کے منطقی تسلسل
سے صرفِ نظر کیا جائے اور قاری ربط و تسلسل کی امید رد کرتے ہوئے نظم کے عناصر کو گذرتے ہوئے لمحوں کے ساتھ
ترتیب وار کھلتے ہوئے نہیں بلکہ وسعتِ مکانی میں پھیلے ہوئے بہ یک وقت و بہ یک نظر دیکھے۔

یہی بات ایلیٹ اور پاؤنڈ نے اپنی اہم شعری تخلیقات میں پیدا کرنے کی کوشش کی گو دونوں کے ہاں شروع کے
دور میں روایتی ساخت کا اثر موجود ہے۔ ان کی تخلیقات خاص طور پر ایسے فنی پہلوؤں جیسے بحر کے ڈھیلے ڈھالے پن اور
ہر شاعرانہ مضامین کی بنا پر جرأت مندانہ اور روایت سے منکرانہ گویا ایک اعتبار سے انقلابی کہلائیں۔

شاید ایلیٹ کے ہاں یہ چیز پاؤنڈ کے مقابلے میں کم تھی۔ خاص طور پر اس کی شروع کے دور کی پیچیدہ شاعری
جیسے کہ PRUFROCK - GERONTION وغیرہ میں لیکن ان میں بھی نظم کے چند حصے اگرچہ زبان کی نحوی منطق سے عاری
ظر آتے ہیں لیکن مجموعی طور پر کل ساخت میں ایک بیانیہ ڈھانچہ محسوس ہوتا ہے جیسے کہ نظم PRUFROCK کی پہلی سطر ہی قاری
و ایک دل کش بیانیہ لہجے میں اپنے ساتھ بہا لے جاتی ہے۔ آؤ ____ میں اور تم چلیں

یہ مصرعے پڑھتے ہوئے قاری PRUFROCK کے ساتھ آہستہ آہستہ ان دونوں کی منزلِ مقصود پر پہنچتا ہے تو وہاں ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔

۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ عظیم فن کار مائیکل اینجلو کی باتیں کر رہی ہیں
کمرے میں خواتین ــــــ
آ رہی ہیں، جا رہی ہیں ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔

اس جگہ پہنچ کر نظم الگ الگ ٹکڑوں میں بکھر جاتی ہے۔ ہر ٹکڑا PRUFROCK کی ایک الجھی ہوئی ذہنی کیفیت کو پیش کرتا ہے۔ پھر نظم کے ان سب ٹکڑوں کا رُخ ایک مخصوص صورتِ حال کی طرف مڑ جاتا ہے اور قاری ان ٹکڑوں کو اپنی اپنی جگہ مرکزی تقسیم میں پیوست کر کے محظوظ ہوتا ہے۔ یہی طریقۂ کار PORTRAIT OF A LADY میں بھی برتا گیا ہے۔ GERONTION میں قاری کو آگاہ کر دیا جاتا ہے کہ وہ "ایک خشک ذہن کے خیالات خشک موسم میں پڑھ رہا ہے۔" یعنی نظم میں یہ عبارت ایک بوڑھے آدمی کے شعور کی رو ہے جیسے ایک لڑکا کتاب پڑھ کر سنا رہا ہے۔ موسم بہت خشک ہے اور بوڑھا بارش کا منتظر ہے۔ دونوں نظموں میں ایک بنیادی ڈھانچے کو محسوس کیا جا سکتا ہے جس کے گرد ان نظموں کے بظاہر بے جوڑ ٹکڑوں کو مرتب کیا جانا چاہیے۔

یہ نیا اندازِ تحریر بھی ایک سبب تھا جس کی بنا پر پاؤنڈ کی MAUBERLEY اور ایلیٹ کی شروع کی شاعری ایک نئی شعری ہیئت کی پیش رو نہیں بلکہ بعد کے زمانے کی تفنن طبع کی شاعری سمجھی گئی جس میں دل چسپی، ذہانت کی چمک، خوابوں کی شکست اور ایک کھردری سی خوبصورتی تو تھی مگر وہ گہرائی اور سنجیدگی نہیں تھی کہ جسے میتھو آرنلڈ کی اعلیٰ شاعری کی کسوٹی کہہ کر بہت اچھالا تھا۔ ان نظموں میں نیا پن اس لیے محسوس کیا گیا کہ تفنن طبع کے لیے شعر گوئی کا رواج ختم ہو گیا تھا۔ چنانچہ انیسویں صدی کے بھاری بھر کم سنجیدہ اسٹائل کے مقابلے میں اسے ایک دلکش موڑ سمجھنے میں چنداں قباحت محسوس نہیں ہوئی۔

WASTE LAND اور CANTOS کی تصنیف کے بعد یہ محسوس کر لیا گیا ہوگا کہ شاعری کے جمالیاتی پیٹرن میں انقلابی تبدیلیاں پیدا ہوتی جا رہی ہیں، لیکن اس تبدیلی کا سب ناقدین نے محض سرسری طور پر ذکر کیا ہے R. P. BLACKMUR البتہ اس مسئلے کے بہت قریب آگیا ہے جب وہ پاؤنڈ کے انداز کو "جھٹکے بھرا طرزِ اظہار" کہتا ہے اور اس کا تجزیہ کرتا ہے۔ CANTOS کی اس مکانی ہیئت کے بارے میں BLACKMUR کہتا ہے کہ "جھٹکے کو ایک جگہ شروع کر کے پھر ایک دو جگہ اٹھایا جاتا ہے۔ اور اگر ختم کیا بھی جائے تو کہیں اور آگے جا کر ختم کیا جاتا ہے۔" یہ فن یعنی ایک چیز کی طرف بار بار توجہ دلانے کا اور اس کا عقدہ کھلنے سے ذرا پہلے ٹال جانے کا وہ طریق کار ہے جس سے پوری CANTOS ایک دوسرے سے بندھی ہوئی ہیں۔ جیسے ہی قاری کا ذہن نظم کے مفہوم کو گرفت میں لینا شروع کرتا ہے، پاؤنڈ اس کی گرفت عمداً ڈھیلی کر دیتا ہے اور وہ اس طرح کہ یا تو بالکل ہی نئی بات شروع کر دیتا ہے یا پھر شروع والی بات دہرانے لگتا ہے جو نظم کے اس حصے سے بالکل میل نہیں کھاتی۔ BLACKMUR کے یہ اشارے WASTE LAND پر بھی صادق آتے ہیں۔ یعنی ایک دوسرے سے مختلف لسانی تشکیلات

کو آگے پیچھے کر کے اپنی اپنی جگہ صحیح طور پر بٹھانے کے بعد ان سب کو بہ یک وقت ایک ساتھ دیکھنا پڑے گا۔ اس عمل کے بغیر تفہیم ممکن نہیں۔ اس لیے کہ زمانی اعتبار سے وہ بیشک ایک دوسرے کے بعد نمودار ہوتے ہیں لیکن ان کے معنی و مفہوم زمانی ترتیب سے تعلق نہیں رکھتے۔

ان نظموں کے سلسلے میں ایک مشکل کہ جس پر کوئی بھی شرح قابو نہیں پا سکتی، ان نظموں کا داخلی تصادم ہے جو زبان کی زمانی منطق اور جدید شاعری کی ماہیت کے نئے تصوّرات کی مکانی منطق کے درمیان موجود ہوتا ہے۔

گویا جدید شاعری کی جمالیاتی ہیئت مکانی منطق پر استوار ہے۔ اسی بنا پر یہ شاعری قاری سے شاعری کی قرأت کے لیے زبان کے سلسلے میں اپنا رویہ قطعی طور پر تبدیل کرنے کا مطالبہ کرتی ہے۔ چونکہ ایسی شاعری میں کسی بھی لسانی تشکیل کا خود نظم کے اندر ہوتا ہے اس لیے زبان جدید شاعری میں ایک مدوّر معنویت کا حامل استعمال رکھتی ہے۔ ایسی نظم میں مختلف بے جوڑ لسانی تشکیلات کو بہ یک وقت ارضِ خیال پر پھیلتے ہوئے دیکھنے پر ہی ان کے معنوی رشتے کھلتے ہیں۔ زمانی ترتیب پڑھنے سے ان کے درمیان بظاہر کوئی رشتہ نظر نہیں آئے گا۔ جدید شاعری کے قاری کو اپنے فطری انداز یعنی لسانی تشکیل اور الفاظ کو ان کے عام معنی میں لینا اور ان کی ظاہری ترتیب سے مفہوم مرتب کرنے کے رویّے کو عارضی طور پر منسوخ کرنا پڑے گا یہاں تک کہ نظم کے تمام داخلی اشاروں کا نظام آپ کے ذہن میں ایک اکائی بن کر اُبھرے اور آپ پر مفہوم آشکار ہو۔

غور کرتے پر پچھلے دور میں ملارمے کے ہاں بھی شعری ہیئت کے اس تصوّر کا پتا چلتا ہے اور وہ اس طرح کہ اس کی خواہش تھی کہ وہ ایک ایسی زبان تخلیق کرے کہ جو "موجود" کے بجائے غیر موجود کی طرف اشارہ کرتی ہو۔ یعنی جس میں لفظ معروض کی نفی کرتے ہوں نہ کہ نشاندہی۔ اس سلسلے میں ایلیٹ WASTE LAND پاؤنڈ کی CANTOS اور ملارمے کی UN COUP DE DES کی ہیئتی مماثلتوں کی طرف نظر جاتی ہے۔

ملارمے نے تو زبان کا زمانی تسلسل ایلیٹ اور پاؤنڈ کے مقابلے میں آخری حد تک توڑ دیا ہے اور اس کی مذکورہ تصنیف میں تو یہ تجربہ یہ احساس دلاتا ہے کہ جدید شاعری کی اس خواہش کی بھی آخر ایک حد ہونی چاہیے۔ اس لیے کہ اگر ملارمے کی سی غیر ذمہ داری سے کام لیا جائے تو بالآخر نتیجہ زبان کی مکمل نفی میں نمودار ہوگا اور نظم ایک دو غلی سی تصویر کی شکل کی کوئی چیز بن جائے گی جسے صرف ایک تاریخی عجوبہ کہہ سکیں گے۔

بہرحال شاعری کی جمالیاتی ہیئت کے مندرجہ بالا تصوّر نے جسے مدوّر معنوی اشاریت کا اصول کہنا چاہیے۔ جدید شاعری پر اپنا اثر چھوڑا اور یہی اصول نئی شاعری کے جمالیاتی فرار کو جدید ناول نگاری میں اس قسم کے تجربات سے ملانے والی کڑی ہے۔

نئی ناول نگاری میں جمالیاتی ہیئت کے مطالعے کے سلسلے میں فلابیئر کے ناول مادام بواری میں دیہاتی میلے کے ایک سین پر نظر جاتی ہے، جسے روایتی طرزِ نگارش سے انقطاع کا نکتہ کہا جا سکتا ہے۔ اس منظر میں بورژوا طبقے کی خود نمائی، بوڑھے ملازم کی قابلِ رحم بدحواسی اور RUDOLPH کی ایک جذباتی سی لڑکی EMMA کو رجھانے کے لیے رومانی لسّانی کی مضحکہ خیز تصویر کشی جسے اکثر تنقید میں سراہا گیا ہے۔ واقعی قابلِ تعریف ہے لیکن اس جگہ تو اس منظر کی

[illegible]نے کا طریقِ کار ہماری خاص توجہ کا مرکز ہے، اسے ایک طرح سے فلمی طریقۂ کار بھی کہہ سکتے ہیں۔ اس لیے کہ فوری طور پر [illegible]مماثلت ذہن کے سامنے آتی ہے۔

فلابیئر جب اس منظر کو ناول میں جماتا ہے تو بہ یک وقت تین سطحوں پر عمل جاری ہے اور ان تینوں سطحوں کی مادی [illegible]ان کے روحانی مدارج کا اشاریہ ہے۔ سب سے نچلی سطح پر ہنسی مذاق، شور و غل کرتا ہوا دیہاتی مجمع جو اس میلے میں [illegible]ہوئے مویشیوں میں گھل مل گیا ہے۔ دوسری سطح پر بازار سے ذرا اونچی جگہ پر پلیٹ فارم پر تقریر کرتے ہوئے مقامی [illegible]ان جو فرسودہ دلائل بڑے بھاری بھرکم انداز میں پیش کر رہے ہیں اور پھر سب سے اونچی سطح پر دریچے میں سے نیچے کا [illegible]ر دیکھتے ہوئے رڈالف اور ایما، فرسودہ روحانی جملوں میں، عشق و محبت کی باتوں میں مصروف پیش کیے جاتے ہیں۔

ALBERT THIBAUDE نے قرونِ وسطیٰ کے پُراسرار ڈرامے سے (جس میں اسٹیج کی تین سطحوں پر آپس میں تعلق رکھنے [illegible]ے تین مناظر بہ یک وقت ہوتے تھے) اس منظر کا موازنہ کیا ہے لیکن موازنہ فلابیئر کے عقیدے کی طرف اشارہ کرتا ہے [illegible]اس کے طریقِ کار کی طرف۔ فلابیئر نے اس سین کے بارے میں بعد میں لکھا ہے "ہر چیز کی آواز بہ یک وقت سنائی دینی [illegible]ہیے۔ مویشیوں کا ڈکارنا، افسران کی تقریر بازی اور محبت کرنے والوں کی سرگوشیاں"۔

ہم جانتے ہیں کہ زبان وقت کے سہارے آگے بڑھتی ہے اس لیے بغیر زمانی تسلسل کو توڑے۔ ہم متعدد و ہم وقتی [illegible]دراکات کے اظہار پر قابو نہیں پا سکتے۔ چنانچہ فلابیئر نے یہی طریقہ استعمال کیا۔ اس نے پورے منظر کے زمانی تسلسل کو [illegible]ذف کر کے عمل کی کئی سطحیں ایک ساتھ پیش کرتے ہوئے آہستہ آہستہ آگے بڑھائیں۔ یہاں تک کہ نقطۂ عروج پر رڈولف [illegible]کے پُرتصنع جملے قاری اسی وقت پڑھ رہا ہوتا ہے جس وقت ان دہقانوں کے نام کہ جنھیں بہترین سؤر پرورش کرنے کا [illegible]نعام دیا گیا ہے۔ فلابیئر اس جگہ بہ کمال احتیاط الفاظ کے دروبست سے طنز ابھارتا ہے گویا اسے یہ خوف ہو کہ ان [illegible]ونوں متضاد مناظر کے درمیان معنوی رشتہ کہیں زائل نہ ہو جائے۔

اس ناول کا یہ سین چھوٹے پیمانے پر اسی چیز کا مظہر ہے جسے ہم ناول کی ہیئت کا مکانی تصور کہتے ہیں کم از کم [illegible]س منظر کے دوران بیانیہ کا زمانی بہاؤ روک دیا گیا ہے اور پوری توجہ اس ٹھہرے ہوئے لمحے کے رقبے میں مختلف رشتوں [illegible]کے واسطوں پر جمی ہوئی ہے۔ یہ رشتے بیان کے منطقی بہاؤ سے آزاد ہو کر آگے پیچھے جڑے ہوئے ہیں۔ اس منظر کی پوری [illegible]اہمیت ان معنوی اکائیوں کے مدّ و رشتوں کے ادراک سے آشکار ہوتی ہے۔ فلابیئر کے اس سین میں یہ معنوی اکائی جدید شاعری [illegible]کی طرح ایک لسانی تشکیل یا جملے کا ایک ٹکڑا نہیں بلکہ ہر سطح کے عمل کو مجموعی طور پر ایک اکائی بنا دیا گیا ہے۔ یہ اکائی اتنی بڑی [illegible]ہے کہ بذاتِ خود ہر ایک کو ایک مکمل معنویت رکھنے والے بیانات کے دھوکے میں پڑھا جا سکتا ہے۔ اس بات سے بے خبر رہ کر [illegible]بھی جسے THIBAUDET مختلف سطحوں کی فرسودہ منطقی دلالت کی بافت کا نام دیتا ہے جو بالآخر ایک زبردست تخریبی طنز [illegible]کو جنم دیتی ہے۔

دوسرے الفاظ میں یہ کہہ سکتے ہیں کہ ایلیٹ اور پاؤنڈ کی شاعری میں مکانی ہیئت کے طریقِ اظہار کی بنا پر تسلسل [illegible]بندی سطروں کے بعد غائب ہو جاتا ہے، لیکن ناول کے اندر جس میں معنوی اکائی زیادہ وسیع ہوتی ہے۔ ترتیب اور

تسلسل کو باقی رکھا جاسکتا ہے صرف زمانی بہاؤ روک دیا جاتا ہے۔ اسی بنا پر جدید شاعری کے قاری کو تفہیم کے لیے مدوّر معنویت کو دھیان میں رکھ کر پڑھنا پڑتا ہے جب کہ NIGHT WOOD جیسے ناول کا قاری زبان کی ظاہری معنو کی بنا پر ایک جزو کے اندر اندر بیانیہ تسلسل کی امید کر سکتا ہے۔

اس بنا پر جدید شاعری کی جمالیاتی ہیئت اور فلابیئر کے ناول کے سین کی ہیئت کی متوازیت پر کوئی اثر نہ پڑتا۔ دونوں کی تفہیم اسی وقت ممکن ہے جب ان کی تمام معنوی اکائیوں کا ادراک مدوّر معنویت کے وسیلے سے ایک ہی میں ایک ساتھ کیا جائے۔

فلابیئر کا یہ منظر بذاتِ خود کافی دلچسپ ہے۔ لیکن پورے ناول میں کوئی خاص اہمیت نہیں رکھتا اور اپنا طنز ادا کر کے اسے ناول کے مرکزی دھارے میں بڑی خوبی سے پیوست کر دیا گیا ہے۔

فلابیئر کا یہ طریقۂ اظہار بعد میں JAMES JOYCE نے بڑے پیمانے پر یولیسس میں استعمال کیا۔ جوائس نے یہ ناول بے شمار حوالوں سے مرتّب کیا ہے جو بیانیہ کی ترتیب کے پابند نہیں ہیں اور اس سے آزاد ایک دوسرے سے رشتہ رکھتے ہیں۔ یہ تمام حوالے قاری کو اپنی کوشش سے جوڑنے پڑتے ہیں تب جاکر کتاب ایک بامعنی ڈیزائن معلوم ہو آخر میں اگر ہم STUART GILBERT کی بات کا یقین کریں تو حوالوں کا یہ نظام دنیا کی تقریباً ہر چیز کا مکمل نقـ پیش کرتا ہے۔ آدمی اور اس کی زندگی کے ادوار سے لے کر روشنی کے رنگوں تک لیکن HARRY LEVIN کے خیال کے مطا یہ ساختیے خود جوائس کے لیے بہت زیادہ اہم ہیں بہ مقابلہ قاری کے۔ قاری شاید و باید ہی ان کی اس اہمیت کے احـ تک پہنچ پائے جو مصنّف کا اپنا تھا۔

جوائس کے فن کا مطالعہ کرنے والوں نے اکثر اس کی علمیت اور لیاقت سے متاثر ہو کر اپنی تمام تر توجہ اس کی تشریحا پر صرف کی ہے، لیکن یہاں ہمارا مسئلہ صرف اس کے ناول کی ہیئت کا ادراک ہے۔

جوائس کا اپنے ناول یولیسس میں ڈبلن شہر کی زندگی کے تمام پہلوؤں کو بہ یک وقت دکھانے کے ارادـ قاری کو واضح احساس ہوتا ہے۔ جوائس اس شہر کا ایک دن وہاں کے مناظر، گلیاں، راستے، شور شرابا، وہاں کے بسنے سب کو ایک ساتھ کتاب کے صفحے پر زندہ کرنا چاہتا ہے۔ جس طرح فلابیئر نے اپنے ناول میں دیہاتی سوسائٹی کے ا سین کو کیا ہے۔ فلابیئر ہی کی طرح جوائس کا منتہائے نظر بھی مختلف جگہوں پر ہوتے ہوئے واقعات کا بہ یک وقـ احساس اور اس سے ایک متحدہ تاثر پیدا کرنے کا ارادہ معلوم ہوتا ہے۔ یہاں تک کہ جو ایک واقعے کو چھوڑ کر آگے بڑ ہے اور پھر وہیں واپس آجاتا ہے۔ گویا وہی طریقۂ اظہار استعمال کرتا ہے اور بالکل اسی نہج کا طنز یہ اثر پیدا کرنے لیے جیسا کہ فلابیئر نے کیا تھا۔ لیکن جوائس کو ایک بڑی دشواری یہ پیش آئی کہ اسے اس ڈھنگ سے ایک بہت بڑـ بھرے پرے زبردست شہر کی زندگی پیش کرنا پڑی اور اسے سیکڑوں صفحات تک نباہنا اور ابھارتے چلے جانا پڑ اس مشکل کام سے عہدہ برآ ہونے کے لیے اس نہج کی فن کاری میں اسے فلابیئر سے بہت آگے جانا پڑا۔ فلابیئر کے ناو سے لیے ایک پہلو کے باقی ایک صاف سیدھا سا تو ربط موجود ہے لیکن جوائس نے بیانیہ کو بالکل توڑ دیا اور اپنے ناو

ں کی مکمل تقلیب کر کے اسے اپنے جمالیاتی احساس کے اظہار کا آلۂ کار بنایا۔ جوائس نے یولی سس کو ایک جدید صورت میں سوچا تھا اور جیسا کہ PORTRAIT OF AN ARTIST میں DEDALUS کہتا ہے "فن کار کی شخصیت سوز پکار یا ایک دلکش لحن سے آہستہ آہستہ اظہار کے ایک سیال اور سبک تاب تور میں بدلتی ہوئی بہت لطیف انداز ہو کر تخلیق سے ماورا نکل جاتی ہے۔ گویا فن کار ایک خدا کی طرح یا تو اپنی تخلیق کی سرشت میں یا اس سے ماورا اور ں سے اوجھل بے نیاز متمکن ہوتا ہے۔"

چنانچہ رزمیہ جوائس کے نزدیک تخلیق کار کو فن پارے سے اپنی شخصیت سے بالکل معدوم کر دینے کی شرط رکھتا ہے۔ ج کی شدید غیر مفاہمت پسندی اور ان تھک ریاضت کے ساتھ جوائس نے خود اس شرط کو اس حد تک نبایا کہ ب میں اتنی جرأت کی اور کوئی مثال نہیں ہے۔

جوائس یہ سوچتا ہے کہ اس کے تمام قاری ڈبلن شہر کے رہنے والے ہیں (جو ظاہر ہے کہ ناممکن ہے) اور ڈبلن کی زندگی کے کرداروں سے بخوبی واقف ہیں۔ اسی بنا پر اسے ان کے بارے میں براہِ راست معلومات فراہم کرنے کی ضرورت ہے اور اسے تصنیف میں راوی کی موجودگی کو ڈھک لینے کا موقع مل جاتا ہے۔ جوائس صرف اپنے بیان کے عناصر ٹکڑوں سے لاتا ہے۔ جیسے کہ اسٹیفن اور اس کے خاندان کے تعلقات، بلوم اور اس کی بیوی کے تعلقات اور اسٹیفن، بلوم ڈیلیس خاندان کے تعلقات۔ یہ سب مختلف لوگوں کی بات چیت کے درمیان اور کچھ علاماتی حوالوں سے جگہ جگہ ناحت جہاں تہاں بکھرے ہوئے ہیں۔ یہی اشاراتی رمزیہ انداز ڈبلن کی زندگی اور تاریخ کے بارے میں اور ان میں لمحوں کے خارجی واقعات کے بارے میں (جس عرصے پر پورا ناول پھیلایا گیا ہے) اختیار کیا گیا ہے۔ عام ناولوں میں تفاصیل جو انھیں مربوط کرتی ہیں۔ اس ناول میں سیکڑوں صفحات پر آگے پیچھے بکھری ہوئی ہیں اور قاری کو ان ٹکڑوں کو کر کے اور جوڑ کر مکمل کرنا پڑتا ہے۔ چنانچہ یہ ناول قاری کو جدید شاعری کی قرأت کے انداز میں پڑھنا پڑتا ہے۔ بکھرے مدور ٹکڑوں کو مربوط کرنا اور چند چیزوں کو اس وقت تک ذہن میں محفوظ رکھنا جب تک کہ مدور معنویت کا عمل بروں کی تفہیم کو ممکن بنائے۔

دراصل جوائس اس طریقے سے پڑھنے والے کے ذہن میں ڈبلن شہر کو ایک ایسے مجموعی تصور کی طرح ابھارنا چاہتا ہے۔ ں تمام کرداروں کے باہمی تعلقات اور ان کے شعور پر گزرنے والی تمام کیفیات بہ یک وقت سامنے آئیں۔ پڑھنے والے ید کی جاتی ہے کہ وہ تمام حوالوں اور اشاروں کو ایک مکانی وسعت میں اپنی اپنی جگہ قائم کرے اور اس طرح آہستہ آہستہ روں کے تعلقاتی پیٹرن کو اپنے ذہن میں مرتب کر لے۔ نتیجے کے طور پر یہ کہا جا سکتا ہے کہ جوائس کی خواہش تھی کہ پڑھنے والا بلن کا باشندہ بن جائے۔ وہ چاہتا ہے کہ قاری ڈبلن کی زندگی اور ان لوگوں سے اتنا ہی واقف ہو جتنا کوئی ڈبلن کا ہنے والا جو اس شہر کو اپنے چاروں طرف پھیلے ہوئے ایک لمبے چوڑے جاندار کی طرح محسوس کرے کہ یہ تصور اس شہر کے ی کو پیدائشی حق کے طور پر حاصل ہوتا ہے۔ یہی حق ہے جس کی بنا پر ڈبلن کا ہر شہری وہاں کے ماضی اور حال کا پورا علم ہے۔ اسی انداز کی واقفیت قاری کے لیے بھی ضروری ہے تاکہ اس کی مدد سے وہ تمام حوالوں کو ناول میں اپنی صحیح جگہ پر

مرتب کر سکے۔ گویا جوائس کو آپ پڑھتے نہیں ہیں بلکہ دہراتے ہیں۔ اس کے کسی بھی جزو سے واقفیت کے لیے مکمل تخلیق سے
واقفیت ضروری ہے۔ چنانچہ اگر آپ ڈبلن کے رہنے والے نہیں ہیں تو پورا ناول پڑھتے اور تمام حوالوں کو ان کی مناسب جگہ
پیوست کر کے ہی اسے ایک اکائی کی طرح محسوس کر سکتے ہیں اور صرف اسی طرح پوری تخلیق سے واقفیت حاصل کر سکتے ہیں۔
قاری پر اس طرح مربوط کرتے اور سمجھنے کا بوجھ شاید ناقابلِ عبور مشکل معلوم ہو۔ لیکن اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جاسکتا
کہ جوائس نے اتنی زبردست محنت کر کے اس خاص انداز میں حوالوں کے ٹکڑوں کو پورے ناول میں اسی امید پر بکھیرا ہے کہ
اس تخلیق کا ایک متحدہ مکانی ادراک بالآخر ممکن ہو۔

جوائس اور فلابیئر کے مقابلے میں کہیں زیادہ لطیف انداز میں یہ طرزِ اظہار مارسل پروست کے ہاں ملتا ہے۔ اس
طرزِ اظہار کی بات پروست کے سلسلے میں کہنا لوگوں کو عجیب لگے گی۔ کیونکہ خود پروست کہتا ہے کہ اس نے اپنے ناول میں
یہ اہتمام کیا ہے کہ وقت کی چھاپ صاف نظر آئے (جو ادب میں موجود ہوتے ہوئے بھی اکثر محسوس نہیں ہوتی) اسی لیے
پروست کو تو اکثر "گزرتے وقت" کا بہترین عکاس مانا گیا ہے۔ برگساں کے "حقیقی وقت" والے تصور کا ادبی ترجمان۔ وہ تصور
جو ہماری حسیت کی دین ہے اور جو ترتیب وار ماہ و سال کے عقلی تصور سے بالکل مختلف چیز ہے۔ لیکن اس کے نکتے تک آکر رک
جانا شاید پروست کے کام کی اس جہت سے محروم رہ جانا ہے جسے خود پروست اپنی خاص صفت سمجھتا تھا۔ سیلِ وقت کے
آگے انسان کی بے بسی اور انسانی زندگی کی فنا پذیری کے احساس سے مغلوب اور دکھی پروست یکایک ایک دن لمحاتی طور
پر تصوف کے جیسے تجربات سے گزرا۔ جس کا ذکر تفصیل کے ساتھ اس نے اپنی کتاب LETENPS RETR کی آخری جلد
میں کیا ہے۔ اس طریقے نے اسے وہ روحانی طریقہ کار عطا کیا جس کے وسیلے سے وہ وقت سے ماورا نکل جائے اور وقت
کی قید سے آزاد ہو جائے۔ پروست کو یقین تھا کہ وقت کی گرفت سے آزاد ارتفاع کے یہ لمحات حقیقت ابدی پانے
کی راہ کھولتے ہیں اور اس کی یہ خواہش تھی کہ وہ ان لمحات کو ادب کی صورت میں ایک جمالیاتی ہیئت دے لیکن کوئی بھی
عام بیانیہ طرزِ اظہار اس لمحے کو من و عن پیش کرنے کا پورا حق ادا نہیں کر سکتا۔ کیونکہ پروست ناول کے معمول سے وہ بھرپور
تاثر جو اس نے خود محسوس کیا، قاری کو منتقل کرنا چاہتا تھا۔

تخلیقی اظہار کے اس انداز کو سمجھنے کے لیے جس سے یہ کارِ محال ممکن ہوا۔ ہمیں سب سے پہلے پروست کی کیفیت الہامی
کو سمجھنا پڑے گا۔ اس کے ہر اس قسم کے تجربے میں یہ احساس موجود تھا کہ ایسے لمحے میں چیزوں کی دائم اور قائم روح جو اکثر
ہماری نظر سے اوجھل رہتی ہے، آزاد ہو کر سامنے آجاتی ہے۔ ہماری اصل ذات جو عرصے سے مردہ محسوس ہوتی تھی لیکن وہ
مردہ نہیں تھی، جاگ اٹھتی ہے۔ نئی الوہی شعاعوں سے زندگی تازہ دم ہو اٹھتی ہے۔ کوئی خوشبو، کوئی آواز یا اور کوئی حواسی
محرک اس کا سبب ہوتا ہے جو ماضی سے واپس آکر ماضی اور حال میں بہ یک وقت محسوس ہوتا ہے[۴۸]

لیکن یہ لمحات کیوں اتنے اہم ہیں کہ پروست انھیں الوہی کہتا ہے۔ اس لیے کہ پروست کے خیال میں تخیل بالعموم
ماضی کے سلسلے میں عمل کرتا رہتا ہے۔ اس کا مواد کوئی فوری حواسی دباؤ نہیں رکھتا۔ کبھی کبھی ماضی کے کچھ مادی محرکات کو

سے دوچار ہوا ہے جو حال کی نہ ہونے کے باوجود بھی اس وقت موجود ہوتی ہے اور گو عینی ہے لیکن غیر مرئی نہیں۔ صرف ان لمحات میں اس کی گہری خواہش پوری ہوتی ہے کہ وہ بجلی کے ایک کوندے کے سے مختصر عرصے کے لیے "خاص وقت" کے ایک لمحے کو علیحدہ کر لے، منجمد کر لے، اپنے قبضے میں کر لے کہ اس لمحے کا ادراک اور کسی طرح ممکن نہیں۔ پروست کہتا ہے کہ اس لمحاتی تجربے سے گزرنے والے کو موت کا لفظ بھی بے معنی محسوس ہوتا ہے۔ ایسے شخص کے لیے "وقت سے ماورا پہنچ کر مستقبل سے خوف کا سوال ہی کیا"۔

اس تجربے کی اہمیت کی طرف خفیف سے اشارے گو اس کی پوری کتاب میں بکھرے ہوئے ہیں، لیکن آخری صفحات میں اس چیز کو بھرپور انداز میں، خاص طور پر سامنے لایا گیا ہے جس میں راوی کے PRINCESS DE GOURMANTES کے استقبالیہ میں شامل ہونے کا ذکر ہے اور جس کے بعد راوی فیصلہ کرتا ہے کہ وہ اپنی باقی ماندہ زندگی اپنے فن پارے کے صفحات پر اس تجربے کو دوبارہ زندہ کرنے میں صرف کر دے گا۔ یہ تخلیق اس اعتبار سے دوسری تخلیقات سے مختلف ہوگی کہ اس کی بنیاد ابدی حقیقت کے اس رویا پر ہوگی جس کا مشاہدہ وقت سے ماورا تناظر میں کیا جا رہا ہے۔ اس فیصلے کو نشاۃ ثانیہ کے ان خیالات سے کہ آرٹ لافانیت کا ضامن ہے اور انیسویں صدی کے موقف "فن برائے فن" سے علیحدہ رکھنا چاہیے۔ حالانکہ پروست کا جھکاؤ خود ان دونوں روایات کی طرف اور خاص طور پر آخری روایات کی طرف محسوس ہوتا ہے۔

پروست کا ایک پیمبرانہ مقصد کو پورا کرنے کا جذبہ اور انہماک صرف ایک فنی تخلیق کے لیے نہیں تھا بلکہ وہ یہ چاہتا تھا کہ یہ شاہکار گزرتے وقت پر اس کی ذاتی فتح کا مینارہ بن جائے۔ وہ چاہتا تھا کہ اس کا ناول بہ یک وقت اس کے رویا کے اظہار کا وسیلہ ہو اور (قاری کے لیے) اس وژن کا مکمل عملی تجربہ بھی۔ ایسی شکل میں کہ قاری اس تجربے سے گزرتے وقت ہی سب کچھ محسوس کرے جو پروست پر گزر رہا تھا۔ یہی طریقۂ اظہار اس وجدانی لمحے کے تجزیے کے سے انداز میں شہزادی GOURMANTES کے استقبالیہ کے سین کے بیان میں بھی برتا گیا ہے۔ راوی کئی سال سے سینی ٹوریم میں ہے اور اس کتاب کی پچھلی جلدوں میں جس فیشن ایبل سوسائٹی کا ذکر ہے۔ اس سے بہت دور اور بے خبر زندگی گزار رہا ہے۔ اب وہ اس گوشہ نشینی سے باہر آتا ہے اور استقبالیہ میں شریک ہوتا ہے اور اپنے پرانے دوستوں کے سماجی منصوبوں اور بالخصوص ان کے کردار اور شخصیت کی تبدیلیوں سے حیران رہ جاتا ہے۔ ان صفحات میں وہ فرانسیسی سوسائٹی پر اونچے لوٹر والطبقے کا غلبہ اور جنگِ عظیم اوّل کے نتیجے میں سماجی اور اخلاقی قدروں کی بتدریج تخریب اور پامالی کا لاجواب منظر کھینچتا ہے۔ لیکن جیسا کہ راوی خود ہمیں آگاہ کرتا ہے، یہ کتاب کے اس حصے کا اہم کیفیم نہیں ہے بلکہ خاص چیز یہ ہے کہ تبدیلی کے یہ مناظر ایک گھونسلے کی طرح اس کے شعور پر لگتے ہیں اور وقت کے گزرنے کا شدید احساس اس کے اندر پیدا کرتے ہیں۔ وہ بڑے دکھ کے ساتھ اپنے پرانے دوستوں کے چہروں کو پہچاننے کی کوشش کرتا ہے جن پر کئی سال کے اس عرصے نے نقاب چڑھا دیے ہیں۔ اور جب اس سے ایک نوجوان بجائے بے تکلفی کے تعظیم سے پیش آتا ہے تو اسے یکایک احساس ہوتا ہے کہ وہ اس چیز سے بے خبر ہے کہ اس نے بھی اپنے چہرے پر ایک نقاب اوڑھ لیا ہے ـــ ایک ذرا معمر شریف آدمی کا چہرہ۔

راوی کی سمجھ میں یہ بات آتی ہے کہ وقت کے گزرنے کے لیے اپنے روزمرہ کے ماحول سے چند

تھی اور دوسرے گزرے ہوئے وقت کی بنا پر بدلی ہوئی آج کی دنیا۔ جب یہ دونوں پیکر بہ یک نظر دیکھے جائیں تو اس خارجی منظر کی بنا پر وقت واضح طور پر گزرتا ہوا محسوس ہوتا ہے۔ روزانہ زندگی کی عادتیں ایک عالمگیر خواب آور معجون ہیں جن کے نشے میں گرفتار ہم لوگ وقت کے خاموشی سے گزرنے کو محسوس نہیں کر پاتے۔ اور بس انہی عادتوں میں الجھے ہوئے زندگی میں بہے چلے جاتے ہیں۔ کسی بھی لمحے میں تبدیلیاں اتنی خفیف ہوتی ہیں کہ یہ ہمیں محسوس نہیں ہوتیں۔ پروست کہتا ہے کہ "لوگ برابر ہم سے اپنا فاصلہ بدلتے رہتے ہیں۔ غیر محسوس طور پر آگے بڑھتی زندگی کے دوران ہم انہیں ایک لمحاتی نظر میں ساکت محسوس کرتے ہیں جب کہ یہ مدت بہت مختصر ہے اور ہم زندگی کے خاموش خفیف بہاؤ کو محسوس نہیں کر پاتے۔ تبدیلی کو محسوس کرنے کے لیے ہمیں ان کی مختلف اوقات کی دو ذہنی تصویریں اپنے تصور میں برابر برابر رکھ کر دیکھنی ہوں گی، جو اتنی خفیف تبدیلی کو پیش کر رہی ہوں گی۔ کہ شاید خود ان لوگوں کو بھی اس کا احساس نہ ہو۔ ان تصویروں سے ہم وہ فرق محسوس کر سکتے ہیں جو آہستہ آہستہ ہمارے اور ان کے درمیان آچکا ہے۔" وقت گزرنے کا حسیّ تجربہ بصری مظاہر کے وسیلے سے موازنہ کرنے پر ہو گا۔ اس بات کے علم نے قصّے کے راوی کو گویا ایک ایسا طریقہ عطا کر دیا کہ جو لمحہ وجدان میں "خالص وقت" کے ٹکڑوں کے بصری ادراک کا ایلیٹ کی اصطلاح میں معروضی تلازمہ کہا جا سکتا ہے۔

راوی نے جب وجدانی تجربے کی ترسیل کا یہ طریقۂ اظہار دریافت کر لیا تو اس نے فیصلہ کیا کہ وہ اسے ناول میں پیش کرے گا۔ لیکن ناول جو ابھی قاری نے ختم کیا ہے وہی تو راوی لکھنا چاہتا تھا اور اس کی ہیئت ناول کے آخری صفحات میں دیے ہوئے طریقے کے تابع ہے۔ بہ الفاظِ دیگر قاری کو خود راوی کی حیثیت دے کر مصنّف نے پورے ناول میں ایسی جگہ پہنچا دیا ہے جہاں شہزادی کے استقبالیہ کے تجربے سے راوی خود گزرا تھا۔ یہ سب کچھ کرداروں کو غیر مسلسل انداز میں پیش کرنے کے ڈھنگ سے حاصل ہو سکا جو ایک سیدھا سادا طریقہ ہے اور پروست کے ناول کی وسیع ہیئت کے فن کا اشاریہ ہے۔

ہر قاری بہت جلد محسوس کر لیتا ہے کہ پروست اپنے ناول میں اپنے کرداروں کے ساتھ مسلسل نہیں چلتا بلکہ کردار ناول کے دوران اپنی زندگی کے مختلف ادوار میں آتے اور پھر غائب ہو جاتے ہیں۔ اور پھر سیکڑوں صفحات کے بعد نمودار ہوتے ہیں۔ اور جو زمانہ اس دوران گزر گیا اس نے انہیں بہت بدل ڈالا ہے۔ ناول کے اس طرزِ تحریر کی بنا پر قاری کہانی کے گزرتے وقت کے ساتھ بہتے ہوئے کہانی کے کرداروں کی سلسلے وار تبدیلی کی بجائے ان کی زندگی کے مختلف ادوار کی ایک ایک لمحاتی تصویر دیکھتا ہے اور ان تصویروں کو ذہن میں اپنی اپنی جگہ بٹھا کر وقت کے گزرنے کے اسی احساس سے دوچار ہوتا ہے جس سے کہانی کا راوی خود گزرا تھا۔ چنانچہ جیسا کہ پروست نے شروع میں وعدہ کیا تھا واقعی اس نے اپنے ناول پر وقت کی صورت نقش کر دی ہے۔ لیکن اب ہم سمجھ سکتے ہیں کہ وہ اپنے اس انداز سے کیا چاہتا ہے۔ پروست نے یہ دریافت کیا تھا کہ وقت کے گزرنے کے احساس کے لیے ہمیں اس سے علیحدہ ہو کر ماضی اور حال کو بہ یک وقت دیکھنا پڑے گا "خالص وقت" کے ایک لمحے میں، لیکن "خالص وقت" ظاہر ہے کہ وقت ہے ہی نہیں۔ بلکہ وہ تو ادراک ہے، وقت کے ایک لمحے میں گویا وہ ایک وسعت ہے، ایک مکانی وجود ہے۔

[illegible] مختلف

ادوات میں ان کی مختلف تصویریں دکھایا ہے تاکہ قاری ایک ہی لمحے میں ان سب پیکروں کو ان کے وجود کی مکانی وسعت کے ساتھ دیکھ سکے اور خاموش سیل وقت کا براہِ راست ادراک کرے۔

RAMON FERNANDEZ نے پروست اور برگساں کے سلسلے میں اس نکتے پر خاص طور سے زور دیا ہے۔ وہ لکھتا ہے کہ "پروست کی تخلیقات کے سلسلے میں لکھتے ہوئے وقت کے بارے میں بہت کچھ کہا گیا ہے۔ لیکن شاید یہ بات اچھی طرح نہیں محسوس کی گئی کہ وہ وقت کو وسعت مکانی کے قدر و خواص سے محسوس کرتا ہے۔ اس لیے کہ وہ اس خیال سے متفق نظر آتا ہے کہ وقت کے مختلف ثانیے ایک دوسرے سے متفنا داور غیر متعلق رہتے ہیں ۔" اس کے علاوہ FERNANDEZ یہ بھی کہتا ہے کہ حالانکہ پروست کا اپنے منتہائے نظر تک پہنچنے کا طریق کار برگساں کے سے انداز کا ہے (یعنی ہویدا ہونا ماضی کی تفہیم کا حال سے) اس کی ذہانت کا اس کی حسیت پر ردِ عمل حواس کے کام کی راہ متعین کرتا ہے اسے وقت اور یادداشت کو ایک وسعتِ مکانی کی طرح دیکھنے کی طرف موڑ دیتا ہے۔

اس جگہ ہمیں پروست کی پسندیدگی کے امپریشنسٹ آرٹسٹ رنگوں کو اپنے طشتِ رنگ پر ملانے کی بجائے انھیں کینوس پر دھبوں میں باہم دگر جوڑتے تھے اور ان رنگوں کو تحلیل کر کے ملانے کا کام دیکھنے والے کی نظر پر چھوڑ دیتے تھے بالکل اسی طرح پروست بھی اپنے کرداروں کے علیحدہ علیحدہ بنیادی پیکر پیش کرتا ہے۔ ساکت پیکر، وقت کے ایک علیحدہ علیحدہ لمحے میں ان کی زندگی کے مختلف ادوار سے اور پھر قاری کے ادراک پر یہ چھوڑ دیتا ہے کہ وہ انھیں ایک اکائی میں مرتب کرے۔ ہر پیکر کا ادراک قاری کو ایک چھوٹی اکائی کی طرح کرنا چاہیے اور پروست کا منتہائے نظر اس وقت پورا ہوگا جب قاری ان سب معنوی اکائیوں کو ایک ہی لمحے میں مدور معنوی تلازمات کے ذریعے ان کے باہمی معنوی رشتوں میں منسلک کرلے۔ جوائس اور تمام جدید شعرا کی طرح مکانی ہیئت ہی پروست کے پُر پیچ شاہکار کی بنیاد ہے۔
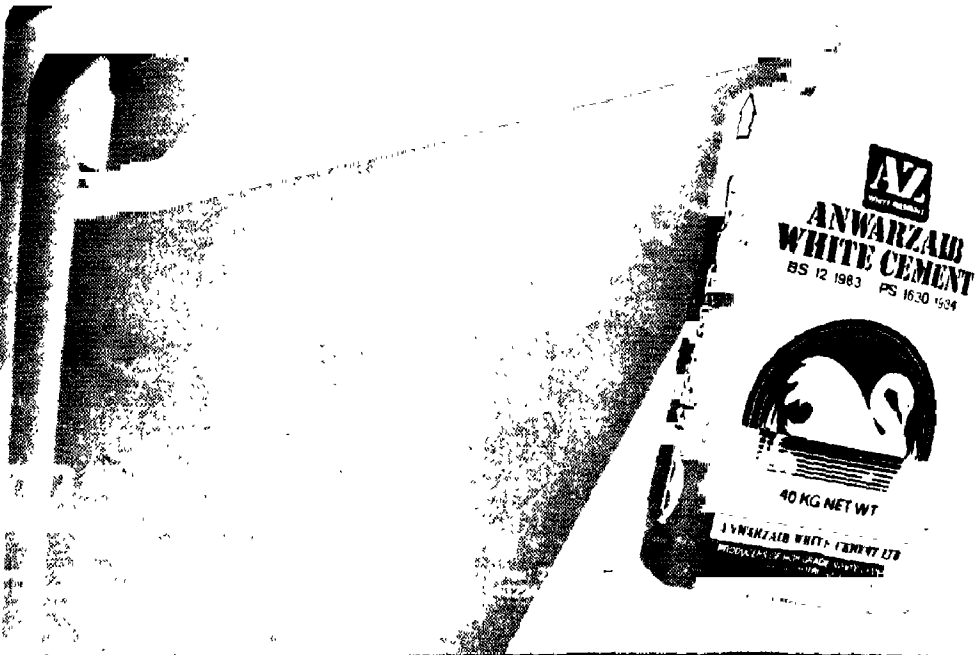
مجنوں گورکھپوری

اخناتون

مصر کا ایک نبی فرعون

ایک استفسار کا جواب

جناب محمد خلیل الرحمٰن صاحب
۱۷ بیلی روڈ۔ الٰہ آباد

معلوم ہوتا ہے کہ مصر میں حضرت موسیٰؑ سے پہلے ایک نبی مرسل گزرا ہے جس کا نام "اخن آتون" یا "اخناتون" تھا۔ اس کے ...ائد کیا تھے؟ اس کے عقائد کا کوئی اثر مصریوں پر ہوا یا نہیں؟ اس کے مرنے کے بعد مصریوں نے اس کے ساتھ کیا سلوک ...؟ "توتنخ امون" کا اس سے کیا رشتہ تھا؟ اخناتون کو اپنے عقائد میں کیوں نہیں کامیابی ہوئی؟ اگر توتنخ امون کا اخناتون ...وئی رشتہ تھا تو کیا توتنخ امون قرآن مجید کا فرعون ذات العماد تھا یا نہیں؟ اس کے موافق اور مخالف کیا دلائل ہیں؟

...ان"
اپ نے استفسار کو اتنا مخلوط اور پیچیدہ بنا رکھا ہے کہ اگر اس کا جواب پوری تحقیق و تفصیل کے ساتھ دیا جائے ...یک مبسوط مقالہ تیار ہو جائے لیکن نہ اس کی گنجائش ہے نہ فرصت، تاہم جہاں تک اختصار و اجمال کے ساتھ آپ ...سوالات کا جواب دیا جا سکتا ہے، یہ ہے:-

امن آوفیس یا امن حطیب چہارم امن حطیب سوم کا لڑکا تھا جو چودھویں صدی قبل مسیح میں اپنے باپ کی وفات ...بعد مصر کا فرعون ہوا۔ امن حطیب چہارم فراعنۂ مصر میں سب سے زیادہ ممتاز اور زبردست ہستی ہے۔ اوائل عمر میں وہ ...ربع دیوتا کا کاہن تھا اور ملک کے سب سے زیادہ مشہور و معروف اور مقبولِ عوام دیوتا امون کی پرستش کرتا تھا۔ ...زمانہ میں "امون پرستی" سارے مصر پر چھائی ہوئی تھی اور امون کے کاہنوں کا ہر جگہ بول بالا تھا۔ ان کاہنوں کا سلطنت ...ر میں اتنا ہی اثر تھا جتنا کہ ہندوستان میں برہمنوں کا یا ازمنۂ وسطیٰ میں یورپ میں کلیسائے روم کا تھا۔ وہ جو کچھ ... [illegible]

کو سلب کر لیا تھا اور رسوم و قیود نے مصر کو ایک دم مفلوج کر کے رکھ دیا تھا۔ سب سے پہلے مصر کی اس ذہنی غلامی کی طرف جس کی توجہ مبذول ہوئی وہ بیدار مغز ملکہ طئی تھی۔ وہ امن حطیب سوم کی بیوی تھی اور امن حطیب چہارم کی ماں تھی۔ ملکہ طئی بڑی فاضل عورت تھی اور علم و ادب اور فنونِ لطیفہ سے اس کو خاص دلچسپی تھی اور یہ خوبیاں اس کو باپ سے ترکہ میں ملی تھیں۔ اس کے مصاحبوں میں عالموں اور فاضلوں کو خاص رسوخ حاصل تھا۔ طئی، امون کے کاہنوں کو نفرت و حقارت کی نگاہ سے دیکھتی تھی جنھوں نے مصر کے لیے تنقید و تفحص اور اجتہاد کا دروازہ ایک دم بند کر رکھا تھا اور مصر کے امکانات ترقی کو روک دیا تھا۔

جس شخص نے ایسی ہوش مند اور دانا و بینا ماں کی گود میں پرورش پائی ہو وہ جس قدر بھی روشن خیال اور آزاد منش ہو کم ہے چنانچہ امن حطیب چہارم کو مصر کے کاہنوں سے خلقی نفرت تھی اور یہ نفرت امتدادِ عمر اور ترقی اقتدار کے ساتھ بڑھتی گئی یہاں تک کہ اس کو اصلاحِ مذہب و معاشرت . . . . . کا جنون ہو گیا۔

مؤرخوں کا خیال ہے کہ یہ مخلوط النسل ہونے کا نتیجہ تھا۔ اس کی ماں ملکہ طئی یوآ کی لڑکی تھی جو ایشیا کا رہنے والا تھا اور ایک شریف اور عالی خاندان سے تعلق رکھتا تھا۔ وہ خود بہت آزاد خیال اور عالی دماغ تھا۔ اس نے مصر میں آکر سکونت اختیار کر لی اور امن حطیب سوم نے اس کی لڑکی پہ عاشق ہو کر اس سے شادی کر لی۔ ملکہ طئی امن حطیب سوم کی صرف معشوقہ نہیں تھی بلکہ اپنے علم و فضل کی وجہ سے "امورِ سلطنت" میں بھی خاص دخل رکھتی تھی۔

جب امن حطیب چہارم تخت نشیں ہوا (تقریباً ۱۳۷۵ قبل مسیح میں) تو اس نے علی الاعلان مصر کے خرافات و اساطیر اور تمام دیوتاؤں سے انحراف کیا۔ اس نے صرف ایک دیوتا کی پرستش کی تبلیغ شروع کی اور وہ آتین یا آتون تھا۔ جو "قرص خورشید" کا دیوتا تھا۔ اس نے اپنا نام بجائے امن حطیب کے اخناتون رکھا اور تواریخ میں اسی نام سے مشہور ہوا۔ اس نے دوسرے دیوتاؤں کی پرستش کو ممنوع قرار دے دیا اور تمام معبدوں سے امون کے بت کو نکال دیا اور اس کے نام کو مٹا دیا۔ اخناتون کو امون سے اتنی نفرت بڑھی اور آتون کے ساتھ اس قدر غلو ہوا کہ اس نے تھیبز کے شہر کو چھوڑ دیا جو "امون کا شہر" تھا اور مصر کا دار السلطنت تھا۔ اس کی جگہ اس نے وہاں سے تین سو میل جنوب میں "طل العمرنا" کے نام سے ایک نیا شہر بسایا جس کو اس نے "آتون کا شہر" قرار دیا۔ اسی شہر کو اس نے اپنا پایۂ تخت بنایا۔

اخناتون ہمارے انگریزی شاعر شیلی سے سیرت و کردار میں بہت کچھ مشابہ ہے۔ وہ فطرتاً شاعر اور فلسفی تھا اور صاحبِ بصیرت تھا۔ وہ مروّجہ رسوم و قیود کو صفحۂ ہستی سے مٹا دینا چاہتا تھا۔

بچپن ہی سے اس کے اندر یہ جذبہ کام کر رہا تھا کہ کسی طرح خود غرضوں اور تنگ نظر پرستوں کے طبقہ کو شکست دے اور اس طبقہ کو وہ امون کے کاہنوں کا طبقہ سمجھتا تھا۔ شیلی کی طرح اس کو بھی یہی فکر تھی کہ دنیا سے تمام خرابیاں دور کر کے اور تمام تمدن اور معاشرت کو فطرتِ انسانی کے مطابق بنائے لیکن ایسے لوگ اپنے وقت سے صدیوں آگے ہوتے ہیں اور ان کو اپنے معیار میں اتنا غلو ہوتا ہے کہ وہ زمانہ کے ساتھ مطابقت نہیں پیدا کر سکتے۔ شیلی کی مایوسیوں کا یہی سبب تھا اور اخناتون کی ناکامی کا بھی یہی راز تھا۔

اخناتون شاید دنیا کا پہلا مؤحد ہے۔ اس نے سب سے پہلے ایک خدا اور ایک مذہب کی تعلیم دی اور یہ خدا آتون تھا

ی بخشنے وہ موت اور خون سے کبھی خوش نہیں ہوسکتا۔ آتون کی قربان گاہوں پر صرف پھول پھل کی بھینٹ چڑھائی
تھی اس سے زراعت کو بڑی ترقی ہوئی۔ اخناتون کے عہد حکومت میں تلوار سے زیادہ ہل کی قدر ہونے لگی تھی۔

آتون پرستی کا لازمی نتیجہ یہ تھا کہ جمالیات کو ترقی ہو۔ آتون کمال حسن تھا اور حسین چیزوں میں خصوصیت کے ساتھ
گر ہوتا تھا۔ اس لیے اس کے پوجنے والوں کا یہ فرض تھا کہ اپنی زندگی کو جہاں تک ممکن ہوسکے حسین و جمیل بنائیں چنانچہ
کے زمانے میں فنونِ لطیفہ کو جتنی ترقی ہوئی، کسی دوسرے فرعون کے زمانے میں نہیں ہوئی۔ اور اس کی اصل ملکہ طئی تھی
تا حسن پرست تھی۔ طل الامرنا کے نقش و نگار اس کی شہادت دیتے ہیں کہ اس شہر کا آباد کرنے والا کتنا صحیح اور پختہ
یاتی مذاق رکھتا تھا۔

اخناتون نے کسی معبد میں آتون کا بت نہیں نصب ہونے دیا اور بت پرستی کے رسوم کو مٹانے کی ہر ممکن کوشش
۔ سچ ہے کہ آتون سورج دیوتا تھا لیکن اخناتون اس کو مادی سورج نہیں سمجھتا تھا۔ وہ آتون کو علتِ اولیٰ مانتا تھا
سے سائر موجودات وجود میں آئے ہیں۔ اخناتون کے عقائد کو جاننے کا تنہا ذریعہ وہ مذہبی منظومات ہیں جو طل الامرنا
لے مقبرے سے نکالے گئے ہیں اور جو اخناتون سے منسوب کیے جاتے ہیں۔

اخناتون کے عقائد کا تفصیل کے ساتھ پتا نہیں چلتا۔ اتنا کہا جاسکتا ہے کہ وہ ایک خدا کا قائل تھا اور اسی کو
و آسمان کا پیدا کرنے والا سمجھتا تھا۔ یہ خدا سراپا حسن ہے اور جو چیز پیدا کرتا ہے وہ حسین ہوتی ہے، لیکن موت
شر کو اخناتون کیا سمجھتا تھا؟ اس سوال کا کوئی جواب نہیں ملتا۔ اس قدر اور معلوم ہوسکا ہے کہ اخناتون روح
رفانی مانتا تھا۔ لیکن مرنے کے بعد روح فردوس میں جا کر رہ جاتی ہے یا بذریعہ تناسخ حیوانات، نباتات اور
رے انسانوں کے قالب اختیار کر لیا کرتی ہے؟ اس مسئلہ سے شاید اخناتون نے کوئی بحث نہیں کی۔

اخناتون اپنی علمی، مذہبی اور تمدنی مصروفیتوں سے اتنی فرصت نہیں پاتا تھا کہ وہ ملک کی سیاسی ضرورتوں
رف توجہ کرتا۔ اس کا اثر یہ ہوا کہ مصر میں بہت جلد سیاسی انحطاط شروع ہوگیا اور جو خطرات امن حطیب سوم کے
نے میں پیدا ہو چلے تھے وہ زور پکڑتے گئے۔ یہاں تک کہ مصر کا اقتدار آدھا رہ گیا۔ شام اب تک مصر کی قلمرو میں
ل تھا۔ مرکزی حکومت کو غافل پاکر شام کی ریاستوں نے سر اٹھایا۔ اور دوسری طاقتوں نے شام پر حملے کرنا شروع
۔ شام کے حلیفوں نے اخناتون سے بار بار مدد مانگی لیکن اس کا کوئی اثر نہیں ہوا۔ ایک دفعہ جب کہ شام سے کمک
رسد طلب کی گئی تو کہا جاتا ہے کہ اخناتون نے آتون کی شان میں ایک حمد لکھ کر بھیج دی۔

اخناتون کو بہت کچھ برا بھلا کہا گیا ہے۔ بعض اس کو خیال پرست کہتے ہیں، بعض اس کو پاگل سمجھتے ہیں۔ لیکن
یاد رکھنا چاہیے کہ اخناتون حکمت و بصیرت میں اپنا جواب نہیں رکھتا تھا۔ وہ مصر کے لیے ایک خاص پیغام رکھتا
۔ وہ تہذیب اور اخوت کا مبلغ تھا۔ یہ سچ ہے کہ بحیثیت ایک فرعون کے وہ بری طرح ناکام رہا۔ مگر اس کا سبب
ہ کہ وہ ایک نبی تھا اور حکومت کرنے کے لیے نہیں بلکہ اخوت اور حریت کی تبلیغ کے لیے پیدا ہوا تھا اور اس کا پیغام
س کی اصل قدر و قیمت ہے۔

اخناتون اپنے وقت اور ماحول سے بہت آگے تھا اور دنیا کو بھی جلد سے جلد اتنا ہی آگے لے جانا چاہتا تھا۔ اور یہ محال تھا عوام ایسوں کے قدم بہ قدم نہیں چل سکتے۔

اخناتون نے اس دیوتا کی مخالفت کی جس کا مصر میں سب سے زیادہ اقتدار تھا۔ آمون سے زیادہ مصر میں کسی دیوتا کی پرستش نہیں ہوتی تھی۔ اخناتون نے اس کا کوئی لحاظ نہیں کیا۔ اس نے زبردستی لوگوں کو آتون پرستی پر مجبور کیا۔ لیکن لوگوں پر پشتہا پشت سے آمون کا جو رعب اور اثر تھا وہ دراصل کبھی گیا نہیں۔ کچھ دنوں کے لیے فرعون کے ڈر سے لوگوں نے آمون کا نام لینا چھوڑ ضرور دیا تھا۔

اخناتون کی ناکامیابی کا ایک سبب آمون کی عام مقبولیت تھی۔ دوسرا سبب یہ تھا کہ اخناتون نے جتنی مذہبی اور تمدنی اصلاحیں کیں وہ سب ایک ساتھ کیں اور سرعت کے ساتھ کیں۔ اس نے زمانہ اور ماحول کا کوئی لحاظ نہیں کیا۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اس کی کوئی بات عوام میں راسخ نہ ہو سکی۔

لیکن اخناتون کی ناکامیابی کا سبب ایک یہ بھی تھا کہ وہ اپنے تخیلی مذہب میں ایسا محو ہو گیا کہ ملک کی دنیوی فلاح و بہبود کا کوئی خیال نہیں رہا اور اپنے وقت کے سیاسی اور اقتصادی مطالبات کی طرف اس نے مطلق توجہ نہیں کی۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ملک کی حالت ابتر ہو گئی۔ لوگوں نے اس کو ایک لاابالی اور ناکارہ بادشاہ سمجھ رکھا تھا۔ اس لیے اس کی کسی بات کو خلوص اور سنجیدگی کے ساتھ اختیار نہیں کیا۔ ان تمام سیاسی ناکامیوں اور ملکی خساروں کے باوجود ہم اخناتون کے خلوصِ نیت اور صدقِ عمل سے انکار نہیں کر سکتے۔ اس کا ایمان یہ تھا کہ اگر سب نے اس کے پیغام کو سن لیا اور اس کے مطابق اپنی زندگی کو سدھار لیا تو دنیا فردوس ہو جائے گی۔

اخناتون اپنی حکومت کے سترہویں سال (تقریباً ۱۳۵۰ قبل مسیح) میں مر گیا۔ اس کے کوئی اولاد نرینہ نہیں تھی۔ لڑکیاں البتہ تھیں۔ اس کی موت کے بعد اس کا ایک داماد سمینخ کارع تخت نشیں ہوا لیکن کچھ دنوں بعد دوسرے داماد توتنخ آتون نے اس کو تخت سے اتار دیا اور خود فرعون بن بیٹھا۔ وہ اپنے خسر کی کمزوریوں سے واقف تھا اور عوام کے اصلی میلانات سے بھی کماحقہٗ خبردار تھا۔ اس نے بہت جلد کاہنوں سے صلح کر لی اور طل العمرنا کو چھوڑ کر پھر تھیبیز میں واپس آیا۔ اسی وقت اس نے اپنا نام توتنخ آتون سے توتنخ آمون کر دیا اور آمون پرستی کی پھر اجازت دے دی۔ توتنخ آمون کے بعد ایک اور فرعون تخت نشیں ہوا جس کا نام آئی تھا۔ اس کے زمانے میں ملک کے اندر بدنظمی اور بغاوت پھیلی اور کاہنوں نے متفق ہو کر حرماحیب کو تخت پر بٹھایا جو اخناتون کا سپہ سالار رہ چکا تھا۔ حرماحیب نے آتون کی پرستش سے سخت مخالفت کی اور ملک کے مقبول عوام دیوتا آمون کو پھر وہی اقتدار حاصل ہو گیا۔

حرماحیب کے زمانے میں تمام شورشیں فرو ہو گئیں اور بہت سی کھوئی ریاستیں پھر مصر کے ہاتھ آ گئیں۔

یہاں تک تو اخناتون اور اس کے عقائد سے بحث تھی۔ آپ کو یہ بھی معلوم ہو چکا ہے کہ توتنخ آمون اخناتون کا داماد تھا۔ اب آپ کا سوال ہے کہ توتنخ آمون قرآن مجید کا فرعون ذات العماد تھا یا نہیں؟ سو میں پہلے یہ پوچھتا ہوں کہ آپ نے "فرعون ذات العماد" کہاں لکھا ہوا دیکھا ہے؟ میں نے کل بیٹھے بیٹھے قرآن مجید میں ہر وہ مقام تلاش کر ڈالا جہاں اِدیا ہر

...رد و ثمود کا ذکر ہے۔ مجھے کہیں "فرعون ذات العماد" نہیں ملا۔ فرعون کے لیے "ذی الاوتاد" یا "ذوالاوتاد" آتا ہے "ذات العماد"
ے قوم عاد کا تعارف کرایا گیا ہے۔ اس وقت سورہ "الفجر" سے ذیل کا اقتباس درج کیا جاتا ہے:

أَلَمْ تَرَ كَيْفَ فَعَلَ رَبُّكَ بِعَادٍ ۝ إِرَمَ ذَاتِ الْعِمَادِ ۝ الَّتِي لَمْ يُخْلَقْ مِثْلُهَا
فِي الْبِلَادِ ۝ وَثَمُودَ الَّذِينَ جَابُوا الصَّخْرَ بِالْوَادِ ۝ وَفِرْعَوْنَ ذِي الْأَوْتَادِ ۝
الَّذِينَ طَغَوْا فِي الْبِلَادِ ۝ فَأَكْثَرُوا فِيهَا الْفَسَادَ ۝

ترجمہ: کیا تم نے نہیں دیکھا کہ تمہارے رب نے عادِ ارم کے ساتھ کیا کیا جو ایسے قدآور تھے (اگر "ذات العماد" کو عاد کی صفت سمجھا جائے تو اس کے معنی قدآور کے ہوتے ہیں اور اگر اس کو شہر ارم کی صفت مانا جائے تو اس کے معنی "ستون والے" کے ہوتے ہیں۔ شہر ارم میں ستون کثرت سے تھے) اور "ثمود" کے ساتھ (کیا کیا) جنھوں نے (اپنے رہنے کے لیے) وادی قری میں پہاڑوں کو کاٹ ڈالا تھا۔ اور فرعون کے ساتھ (کیا کیا) جو میخوں والا تھا۔ ان لوگوں نے شہروں میں سر اٹھا رکھا تھا اور ان میں بڑا فساد پھیلا دیا تھا۔"

فرعون کو "ذی الاوتاد" کیوں کہا گیا؟ اس کے متعلق رائیں مختلف ہیں۔ بعض کہتے ہیں کہ فرعون اپنے گھوڑے ...تے کی میخوں سے باندھتے تھے اس لیے ان کو "ذی الاوتاد" کہا گیا ہے۔ بعض کی رائے ہے کہ وہ بنی اسرائیل کو چومیخا کر کے ستاتے ...ے۔ اس رعایت سے ان کو "ذی الاوتاد" کہا گیا ہے۔ لیکن بیضاوی کی رائے زیادہ صحیح معلوم ہوتی ہے۔ "ذوالاوتاد" ...تعارتاً استعمال کیا گیا ہے اور اس کے معنی ہیں "قوی اور مستحکم سلطنت والا"۔

اگر فرعون "ذات العماد" سے آپ کی مراد "فرعون ذی الاوتاد" ہے تو وہ توتنخ آمون کیسے ہو سکتا ہے۔ قرآن مجید ...عموماً ان سرکشوں کا ذکر ہے جنھوں نے نبیوں کو جھٹلایا اور ایمان والوں کو ستایا۔

توتنخ آمون نے اخناتون کے مذہب کی تکذیب و تخریب ضرور کی لیکن میرے خیال میں کبھی قرآن مجید غیر سامی طبقے ...پیغمبروں کی طرف اشارہ نہیں کرتا۔ وہ صرف ان انبیا و رسل کے حوالے دیتا ہے جو عرب اور جوارِ عرب میں مبعوث ہوئے ...اس کے علاوہ توتنخ آمون نے ملک میں کوئی فتنہ و فساد نہیں پھیلایا۔ اس نے عوام کو خوش اور راضی رکھا۔

"فرعون ذی الاوتاد" سے مراد کوئی ایک فرعون نہیں ہے بلکہ وہ تمام فرعون ہیں جنھوں نے بنی اسرائیل کو ستایا اور ...ضرت موسیٰ کو ستایا۔ اور یہ تین فرعون ہیں۔ ایک تو رعمسیس ثانی، دوسرا منفتاح بن رعمسیس، تیسرا تحتمس اول۔ ان تینوں نے ...اسرائیل کو ستایا۔

اب رہ گیا یہ سوال کہ حضرت موسیٰؑ سے کس فرعون سے لڑائی ہوئی اور خروج کس کے عہد میں ہوا؟ سو اس باب میں ...یں مختلف ہیں۔ بعض اس کو رعمسیس ثانی کہتے ہیں، بعض منفتاح اور بعض تحتمس۔ حضرت موسیٰؑ نے رعمسیس ثانی کے عہدِ ...ومت میں تعلیم و تربیت پائی اور شاید اسی وقت سے ان کو اپنی قوم بنی اسرائیل کی حمایت کی سزائیں دی جانے لگیں۔ ...ن قیاس غالب ہے کہ خروج تحتمس اول کے زمانے میں ہوا جس کو سموسیس بھی کہتے ہیں۔ منفتاح کے زمانے میں خروج نہیں ہوا۔

یہ قطعی طور پر نہیں کہا جا سکتا کہ " فرعون ذی الاوتاد " سے مراد کون فرعون ہے۔ اگر خروج والے فرعون کی طرف اشارہ ہے تو وہ تحتمش اوّل ہے جو اٹھارہویں خاندان کی ابتدا میں مصر کا بادشاہ تھا۔ لیکن فرعون ذی الاوتاد " کہہ کر ممکن ہے ان تمام فرعونوں کی طرف اشارہ کیا گیا جنھوں نے بنی اسرائیل پر طرح طرح کے ظلم کیے۔ اور ان کے خدا کی توہین کی۔

قیاس کہتا ہے کہ جس طرح عاد سے قومِ عاد، اور ثمود سے قومِ ثمود مراد لی گئی ہے اسی طرح فرعون بھی " فراعنہ " کے معنی میں مستعمل ہوا ہے۔

ڈاکٹر قاضی عبدالقادر

میر تقی میر اور آج کا ذوقِ شعری

اس مضمون کا عنوان وہی ہے جو محب عارفی صاحب کی کتاب کا ہے۔ جس پر ہم گفتگو کر رہے ہیں۔ ۳۵۷/تین سو ستاون صفحات پر مشتمل اس کتاب کے وہ صفحات نکال لیے جائیں جن میں میر اور غالب کے منتخب اشعار درج ہیں اور میر کے اشعار کی تشریح دی گئی ہے تو یہ بتانے کے لیے کہ ذوقِ شعری ایک اضافی بات ہے اور یہ کہ میر بعض جہتوں میں غالب سے بہتر شاعر ہیں۔ محب عارفی صاحب کے پاس صرف ۵۹ صفحات باقی رہ جاتے ہیں۔ ان دو نتائج تک پہنچنے کے لیے شاید بہ صفحات کافی ہوتے لیکن ان نتائج کے مقدمات اور ان کے مضمرات کے لیے ناکافی ہیں۔ مجھے ذوقِ شعری کے بارے بس عارفی صاحب کے بیان یا نتیجۂ گفتگو یا غالب اور میر کے موازنے میں میر کو بہتر قرار دینے سے دل چسپی کم ہے۔ ن مقدمات اور مضمرات سے زیادہ ہے جن کا تعلق عارفی صاحب کے نتائجِ فکر سے ہے، لیکن ایک اور بات بھی ہے بس کی طرف میں توجہ دلانا چاہوں گا اور وہ فنونِ لطیفہ یا ادب کے سیاق میں قاری اور ناقد کا کردار ہے۔ یہ بات ہ ہے جس پر کتاب میں بحث نہیں کی گئی، صرف اس کی طرف اشارہ ہے۔

ہم گفتگو کا آغاز محب عارفی صاحب کے ذوقِ شعری کے بارے میں نتائج کے مقدمات سے کریں گے اور اس کے حد قاری اور ناقد کے کردار کی طرف توجہ دیں گے۔

یہ کہنا کہ ذوقِ شعری اضافی بات ہے، اس کے دو پہلو ہیں۔ ایک تو یہ کہ شعر گوئی کا ذوق اضافی ہے اور دوسرا یہ کہ شعر فہمی کا ذوق اضافی ہے اور ان نتائج تک پہنچنے کے لیے کسی فلسفیانہ مقدمہ کے بجائے اس تجربۂ عام کو سند بنایا جاسکتا ہے کہ شاعر اچھے بھی ہوتے ہیں اور بُرے بھی۔ اسی طرح بعض لوگ شعر فہم بھی ہوتے ہیں اور کور ذوق بھی۔ لیکن شعر فہم کوئی جامع طبقہ نہیں، یہ وہ طبقہ ہے جو جاندار شعر کی تشخیص کر سکے (۲) جاندار شعر عارفی صاحب کے خیال میں وہ شعر ہے جو آپ پر وہ قلبی کیفیات طاری کر دے جن سے شاعر دوچار ہوا تھا۔ یہ با اہلیت قارئین کا طبقہ ہے۔ لیکن ایک شعر کو جاندار شعر سمجھنا کوئی کلی اور منطقی بات نہیں۔ بیدل کے اشعار کے لیے غالب کے قبیل کے قارئین

جاندار ہوگا اور دوسرے کے لیے بے جان ہوگا۔ ایک با اہل قاری ایک شعر کو جاندار شعر کہے تو یہ درست ہوگا۔ برخلاف اس کے ایک دوسرا قاری اس شعر کو پسند نہ کرے تو وہ "نا اہل قاری" کہلائے گا۔ اور اس شعر کی حد تک اس قاری کی تنقید یا تبصرہ نا قابلِ اعتنا ہوگا۔ لیکن ضروری نہیں کہ یہ "نا اہل قاری" "مطلقاً" "نا اہل" ہو۔ کیونکہ کسی دوسرے شعر کے لیے وہ با اہلیت ثابت ہو سکتا ہے۔ یعنی ایک قاری بیک وقت با اہلیت بھی ہو سکتا ہے اور کور ذوق بھی۔ حاصلِ گفتگو یہ بات ہوئی کہ نہ کوئی شعر مطلقاً جاندار ہوگا نہ کوئی قاری مطلقاً با اہل ہوگا۔ یہ ایک انتہا درجہ کی اضافیت ہے لیکن اس پر میں تبصرہ نہیں کروں گا۔ صرف اس منطق کی طرف اشارہ کروں گا جو اس نتیجہ میں مضمر ہے اور وہ مختصراً یہ ہے:

جاندار شعر کی تشخیص با اہلیت قاری کرتا ہے اور با اہلیت قاری وہ ہے جو جاندار شعر کی شناخت کرتا ہے یہ ایک استدلال دوری ہے، لیکن عارفی صاحب اس "منطقِ فاسدہ" سے صرفِ نظر کرتے ہیں اور "ذوقِ شعری" کے اختلاف پر توجہ دیتے ہیں اور اس کے اسباب و علل کو نفسیاتِ عام کے ایک قدیم تصوّر "جبلّت" میں تلاش کرتے ہیں[4]

ہمیں علم ہے کہ انیسویں صدی کے وسط سے ڈارون اور بعد ازاں امریکی ولیم جیمس کی تحریروں سے نفسیات[4] میں پیچیدہ انسانی کرداری موقعوں کی تلاش ایک سنجیدہ علمی مشغلہ بن گیا تھا (۵)

اس صدی کے شروع میں انگلستان اور فرانس اور جرمنی میں تحقیقات کا آغاز ہوا۔ اس میں میکڈوگل،[۵] مارڈے سینڈ وغیرہ کے نام نمایاں ہیں۔ ولیم جیمس نے ۱۹۰۵ء میں جب یہ کہا کہ انسان کا جبلّی اثاثہ دوسرے حیوانوں کی نسبت کہیں زیادہ ہے تو وہ انیسویں صدی کے اس تصوّر کے خلاف بات کر رہا تھا کہ انسان میں عقل، انسانی جبلّتوں کا بدل ہے اور انسان کا انسان ہونا اس کے عقلی ورثہ پر مبنی ہے۔ ولیم جیمس کو ان تصوّرات سے اختلاف تھا اور وہ انسان اور حیوان میں ارتقائی اور عضویاتی تعلق کو قریب سے دیکھتا تھا۔ میکڈوگل نے اسی موقف کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے انسان کے اساس حیوانی ورثہ کی حیاتیاتی، سماجی اور ثقافتی عالم میں کارآوری اور اہمیت بتانے کی کوشش کی۔

میکڈوگل نے سات اساسی جبلّتوں کی تفصیل بتاتے ہوئے ایک اساسی جبلّت "تجسّس" کا بھی ذکر کیا جس سے بیک وقت "تحیر" اور "خوف" کے ہیجانات وابستہ ہوتے ہیں (۶)

تجسّس ایک مرحلۂ حیات میں عضویہ کی موت کا سبب بھی بن سکتا ہے اور دوسرے میں تحقیق و جستجو کی بنیاد فراہم کرتا ہے۔ ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ جس "جبلّتِ تحقیق" کا ذکر محب عارفی صاحب نے کیا ہے وہ میکڈوگل کی جبلّتِ تجسّس کی ایک توسیع ہے۔ لیکن یہاں سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ جمالیاتی مباحث اور تحسینِ فن میں سائنسی، نفسیاتی یا عضویاتی تصوّرات اور قوانین کس حد تک مناسب اور موزوں قرار دیے جا سکتے ہیں؟ (۷)

آپ کو داغ دہلوی کا واقعہ یاد ہوگا۔ جب دکن پہنچے تو ایک صاحب نے دریافت کیا کہ وہ شعر کیسے کہتے ہیں؟ داغ [illegible]

ہو جاتے ہیں، کبھی لوٹا سنبھالتے ہیں پھر کہیں جا کر ایک مصرع کہہ پاتے ہیں۔ داغ نے کہا آپ شعر کہتے نہیں جنتے ہیں۔ داغ کے اس تبصرہ سے یہ بات سامنے آتی ہے کہ تخلیقی عمل کی تحلیل ممکن نہیں۔ یہ ایک بے ہمہ مکمل عمل ہے اور اس کے مقدمات کا نہ ہی سراغ لگایا جاسکتا ہے اور نہ ہی اس سیاق میں علتوں، اسباب اور شرائط کا تذکرہ ہوسکتا ہے۔ اگر عضویاتی تبدیلیاں ہی شعر گوئی کو متضمن ہیں تو اس سے ایک قدم آگے جا کر یہ سوال کرنا ہوگا کہ ایک اچھا شعر کہنے کے لیے شاعر کو کتنی بار اٹھک بیٹھک کرنی ہوگی؟ اور یہ سوال بے محل اور لغو ہوگا۔ میں یہ عرض کرتا رہا ہوں کہ شعر گوئی ہی نہیں، کسی بھی تخلیقی عمل کے لیے عضویاتی تبدیلیاں اور نفسیاتی حیلے اس تخلیقی عمل اور تخلیق کی توجیہہ کے لیے غیر ضروری اور ناکافی ہوتے ہیں (۸)۔

تخلیقی عمل اور تخلیق کسی توجیہہ اور تفہیم کے لیے عضویاتی حیلوں کی اہمیت سے انکار میں ایک تصور کارفرما ہے کہ جمالیاتی سیاق میں علت و معلول کا دائرہ کار عالمِ اشیا ہے۔ اس میز، اس کرسی اور فلاں عمارت کے بارے میں گفتگو ہو تو ہم علت و معلول کو پیشِ نظر رکھ سکتے ہیں لیکن جب ہم فن پارہ کے لیے بھی یہی اصولِ توجیہہ بنالیں تو ہم فن پارہ کو شے میں تبدیل کر دیتے ہیں۔ لیکن کیا ایک شاعر ایک میز، کرسی یا عمارت کے قبیل کا ہے؟ کیا شاعر بھی ایک شے ہے؟

اس خیال کی وضاحت کی مثال ادب سے نہیں تو مصوری سے لی جاسکتی ہے۔ ایک تصویر، ایک اسٹل لائف جس میں ایک جگہ ایک گلاس اور چائے کی پیالی دکھائی گئی ہے۔ یہ تصویر تین اشیا کی ہے لیکن کیا یہ تصویر بھی اسی قسم کی شے ہے؟ سنگِ مرمر اور تراشیدہ مجسمہ کی بھی بات کی جاسکتی ہے۔ وہ کیا چیز ہے جو وینس ڈی میلو کو سنگِ مرمر سے تمیز کرتی ہے؟ سنگِ مرمر ایک شے ہے، کیا وینس ڈی میلو بھی ایک شے ہے لیکن ہم شے سے کیا سمجھیں؟ اس کا جواب ایک جملے میں یہ دیا جاسکتا ہے کہ شے کارآوری سے عبارت ہے۔ شے ہونا' قابلِ استعمال ہونا ہے فن پارہ ناقابلِ استعمال ہے۔

یہ صحیح ہے کہ اہلِ ثروت بڑی رقمیں خرچ کر کے تصویریں خریدتے ہیں اور اپنے گھر سجاتے ہیں۔ وہ تصویر اپنی دولت کی نمائش کے لیے استعمال کرتے ہیں۔ شاعر غزل کہتا ہے اور اشتہاری کمپنی اسے کاروباری مقاصد کے لیے استعمال کرتی ہے، لیکن تصویر کو تصویر ہونے کے لیے اور غزل کو غزل ہونے کے لیے ان کاروباری مراحل سے گزرنا ضروری نہیں۔ کاروباری سیاق سے فن کی تشہیر تو ہو جاتی ہے، زیادہ لوگ اس سے واقف ہو جاتے ہیں لیکن اس کے جمالیاتی وجود میں نہ کوئی اضافہ ہوتا ہے نہ کمی۔ لیکن جب فن پارہ اس حادثہ سے دوچار ہوتا ہے تو دوسرے مرحلے میں فن کار بھی شے بنتا ہے اور اس کے بھی دام لگتے ہیں۔ اور اس طرح اولاً معاشی اور پھر سیاسی استبداد کے دروازے کھل جاتے ہیں۔ جمالیاتی سیاق میں طبعی علوم کے اصولِ قوانین کا استعمال انسانی رشتوں کے ٹوٹنے کا شاخسانہ بن جاتا ہے۔

لیکن طبعی علوم کے ضابطوں میں ریاضیاتی پیمانوں کا بھی شمار ہوتا ہے۔ کیا ادبی تنقید میں شماریاتی اصولوں کی گنجائش ہے؟ کیا ووٹوں کی گنتی کی طرح اشعار کی گنتی تنقیدی ضابطہ بن سکتی ہے؟ حسابی اور شماریاتی طریقوں کی عمرانی علوم میں دخل اندازی کی ابتدا پچھلی صدی میں ہوئی پھر انسانیتی علوم۔ ادب، فلسفہ اور تاریخ میں اس رجحان نے عجیب

...انداز اختیار کیا۔ ریاضی قطعیت اور اختصار کی داعی ہے۔ اس کے اشارے، علامتیں اور مقادیر ایک ایسی زبان فراہم کرتے ہیں جس کی نمایاں خصوصیت کیف کے بجائے کم اور معنوی کشادگی کے بجائے معنوی تنگی ہوتی ہے اور اس سیاق میں ...منہاجی تکثیر کے بجائے "وحدتِ مفہوم" کا اصول کام کرتا ہے اور بیک وقت کئی باتیں کہنے کے جس سلیقہ کی طرف ...مادنتر نے اشارہ کیا تھا، ریاضی میں ایک علمی خطا ہو جاتی ہے۔ (۹)

اور اس کی یہ وجہ ہے کہ ریاضی ایک مصنوعی زبان ہے اور سماجی روایت کی پروردہ سماجی ابلاغ کی زبان ہے۔ ...یا ادب اور ریاضی میں ایک اساسی مغائرت ہے۔ عام سماجی رویوں میں ریاضی اور ریاضیاتی اصولوں کا استعمال مجرد ...قیت یا عمومیت حاصل کرتا ہے اور انفرادی معنوی گہرائی اور تنوع کو گفتگو سے خارج کرتا ہے جب کہ شعر انھیں باتوں سے ...عبارت ہے جو ریاضی اپنے سے دور رکھتی ہے اور اس سبب سے شعر و فن کی قدر آفرینی میں ریاضیاتی پیمانے موزوں نہیں رہتے۔

محب عارفی صاحب اعلیٰ شعر کے انتخاب کے لیے کوئی فارمولا دریافت نہیں کر سکے اور یہ ممکن بھی نہیں۔ اور اسی لیے انھوں نے اپنے ذوقِ سلیم کا سہارا لیا اور اس کے بعد دریافت کیا کہ یہ شعر انھیں اعلیٰ درجے کا شعر معلوم ہوا تو کیوں ہوا؟ ان کا خیال ہے کہ شاید یہ بے اصولا پن ہے۔ میری دانست میں یہ بے اصولا پن نہیں بلکہ وہی بات ہے جس کی جانب میں اشارہ کر رہا ہوں کہ ذوقِ شعری کی گفتگو اصلاً ریاضیاتی سیاق کی گفتگو نہیں۔ شعر فہمی ریاضی کا سوال نہیں اور اسی لیے اشعار کی گنتی کی بنیاد پر شعرا کا موازنہ برمحل معلوم نہیں ہوتا لیکن محب عارفی صاحب اپنے ذوقِ شاعری یا ذوقِ سلیم کو آزاد بھی چھوڑتے ہیں اور شعر اچھا لگنے پر یہ سوال بھی کرتے ہیں کہ یہ شعر اچھا کیوں ہے؟

اگر عارفی صاحب کو اس میں یا کسی اور کو بے اصولا پن نظر آتا ہے تو اس کی وجہ ہے، جس کی طرف میں اشارہ کرنا چاہوں گا لیکن بات صرف اشاروں تک محدود نہیں رہے گی، یہ بات تفصیل چاہتی ہے۔ یہ مسئلہ ادب میں قاری اور ناقد کے کردار کا ہے جس کی طرف مضمون کی ابتدا میں، میں نے توجہ دلائی تھی۔

زیرِ گفتگو کتاب ذوقِ شعری سے سروکار رکھتی ہے، لیکن ذوقِ شعری، جیسا کہ ہم کہہ آئے ہیں اس کے دو پہلو ہیں شعر فہمی اور شعر گوئی۔ عارفی صاحب نے حقیقتاً شعر فہمی کے حوالے سے اپنی بات جاری رکھی ہے۔

شعر فہمی کے بھی دو پہلو یا سیاق ہیں۔ ایک قاری کا سیاق اور دوسرا ناقد کا۔ عارفی صاحب قاری اور ناقد دونوں کا کردار ادا کرنا چاہتے ہیں۔ ہم یہ تو نہیں کہیں گے کہ عارفی صاحب بیک وقت قاری اور ناقد ہونا چاہتے ہیں کیونکہ وہ اس بات سے انکار کرتے ہیں ــــ وہ کہتے ہیں: "میرا طریق سخن سنجی یہ ہے کہ شعروں سے کیف اندوز ہونے کے لیے میں اپنے ذوقِ شعری کو آزاد چھوڑ دیتا ہوں۔ جس شعر میں اوّل درجے کی کیف انگیزی مجھے محسوس ہو گئی اس کے مختلف پہلوؤں پر میں بعد میں غور کرتا ہوں۔" (۱۰)

عارفی صاحب کو شعر اچھا پہلے لگتا ہے اور جاننا چاہتے ہیں کہ یہ شعر اچھا کیوں لگا؟ ایک شعر کو اچھا شعر ہونے کے لیے صرف شعر ہونے کے علاوہ اور کیا کیا ہونا چاہیے؟ گفتگو کا پہلا سیاق قاری کا اور دوسرا سیاق ناقد کا ہے۔ یہ مختلف سیاق ہیں

ری دالست میں یہ دونوں ایک دوسرے میں تحویل پذیر نہیں۔

اور اس کا سبب خود عارفی صاحب کے یہاں ملتا ہے۔ عارفی صاحب کے خیال میں شاعر اور با اہل قاری کی احساساتی ن" میں ایک گونہ مماثلت ہوتی ہے، جو اس پر بیتی ہے، اس پر طاری ہوتی ہے۔ (۱۱) گویا شاعر اور قاری دونوں ات روحانی" کی طرح ایک مشترک "واردات شعری" سے دوچار ہوتے ہیں۔ (۱۲) یہ ایک بے ہمہ کیف ہے۔

شعر پڑھتے یا سنتے وقت قاری شعر کی احساساتی معنویت سے بغیر قیل و قال بغیر تحقیق کے کیف اندوز ہوتا ہے۔ یہاں ذوق شعری کی لبطنیت میں دوئی یا غیریت نہیں ہوتی۔ بالفاظ دیگر کیف انگیزی اور کیف اندوزی میں کسی قسم کی دوری نہیں ہوتا، لیکن یہی بُعد یا دوری دراصل ناقد کے فن کی بنیاد بنتی ہے۔ اور اس کا سبب یہ ہے کہ قاری اور شاعر کا وجودیاتی اور ناقد کا علمیاتی ہوتا ہے۔

ناقد کے لیے شعر، نظم یا تصویر ایک معروض ہے۔ وہ معروض علم بھی ہے اور معروض تحلیل بھی۔ اس کے عناصر تشکیلی کی ان عناصر کے مابین اضافتوں کی جستجو اور اس کے بعد ان کو علمیاتی سیاق میں قابل فہم بنانا نقاد کا کام ہے۔ ناقد ایک یار کرتا ہے اور اس کی تفہیم کے لیے ایک نصاب تیار کرتا ہے اور اس متن کی توضیح اور تشریح کرتا ہے۔ سماجی سیاسی مختلف نقاط ہائے نظر سے دیکھتا اور پرکھتا ہے۔ تنقد اس سبب سے تناظر آفرینی ہے۔ ناقد یہی کام کرتا ہے۔

قاری اور ناقد کی مختلف فلسفیانہ حیثیتوں کے بارے میں گفتگو طویل ہو سکتی ہے جس کو میں کسی اور وقت کے لیے رکھتا ہوں لیکن اس مضمون کو چند سطور کے بعد ختم کرنا چاہوں گا۔ ناقد اور قاری کے فرق کو اس طرح بیان کیا ہے

" ہے عشق سے بتوں کے " مرا " مدعا کچھ اور " یہ ناقد کی آواز ہے۔ قاری اس کے بجائے کہے گا۔ " میں نے گویا یہ بھی میرے دل میں ہے " ناقد کی دنیا قیل و قال اور من و تو کی ہے قاری کی حال و حضوری کی ہے اور ہاؤں کو ایک دوسرے میں تحویل کرتے میں بڑی تباحتیں ہیں۔

حوالے

محب عارفی۔ میر تقی میر اور آج کا ذوق شعری
(کراچی، نفیس اکیڈمی ۱۹۸۹ء) مضمون میں اسی تحریر کے حوالے ہیں۔

. محب عارفی محولہ بالا ص ص ۳ ــ ۲، ۸

. عارفی محولہ بالا ص ۳ ــ

. عارفی محولہ بالا ص ص ۸ ــ ۱۹

. (۱) چارلس ڈاروِن THE EXPRESSION OF EMOTIONS IN MAN NAD ANIMALS (LONDON 1873)

(ب) ولیم جیمس THE PRINCIPLES OF PSYCHOLOGY (2VOLS) LONDON 1905

۶۔ ولیم میکڈوگل AN INTRODUCTION TO SOCIAL PSYCHOLOGY (LONDON METHWEN & CO 1908-1950) PP-49-50

۷۔ دراصل یہ اس طریقیات کی انسانیتی علوم میں توسیع تھی جو عمرانی علوم میں رواج پا چکے تھے اور اس سلسلے میں ہمپل اور نیورتھ وغیرہ کے نام نمایاں ہیں۔ مختصر کتابیات کے لیے ملاحظہ ہو میرا مضمون

۸۔ "شعری تجربہ" ایک فلسفیانہ تحلیل از: فنون ۴: ۲: ۱۹۶۶ء

۹۔ ژاں پال سارتر، اسیمو دبوا۔ گفتگو از آدیو (پنگوئین، ۱۹۸۴ء) ص ص ۲۱۴ - ۲۱۵

۱۰۔ عارفی محولہ ص ص ۲۹ - ۲۵۹

۱۱۔ عارفی ص ص ۱، ۳

۱۲۔ محولہ بالا مضمون "شعری تجربہ" میں اس بات سے اختلاف کیا ہے کہ ادبی یا شعری تنقید میں "شعری تجربہ" جیسی اصطلاح بامعنی ہے اور نفسیاتی تصورات کے بجائے جمالیاتی اصول پیش نظر رہنا چاہیے۔ عارفی صاحب کی کتاب کے حوالے سے قاری اور ناقد کی اس بحث میں "شعری واردات" کا تذکرہ عارفی صاحب کے خیالات کی وضاحت کے لیے کیا گیا ہے۔ میرا اب بھی خیال ہے کہ شعری تجربہ اور شعری واردات جیسی اصطلاحات سے بات سلجھتی نہیں۔ یہ مسئلہ مزید غور چاہتا ہے۔

غلام محمد

کہانیاں پرانی ـ باتیں نئی

کہانیوں کا مسئلہ مجھے بھی پریشان کیے ہوئے ہے ـ "دائرے" کا شمارہ اکتوبر ۱۹۸۹ء (آغاز فروری ۱۹۹۰ء میں موصول ہوا) میں اردو کہانی کی عمومی بے جہتی کے عنوان سے اقبال متین صاحب کا مضمون میں نے انتہائی دلچسپی کے ساتھ پڑھا ـ انھوں نے کہانیوں کے زوال اور اس کے اسباب و علل پر روشنی ڈالی ہے اور لکھنے والوں کے اس گروہ کو انھوں نے چپکے سے مخاطب کیا ہے جو لکھتے رہنے کے علاوہ سوچتا بھی ہے ـ میں ان سے قریب قریب متفق ہوں گو چونکہ کے چلن کے مطابق نہ کبھی ان سے میری ملاقات ہوئی نہ مراسلت کا سلسلہ ہمارے درمیان چلا ـ اس کے باوجود بڑی حد تک ان سے اتفاق رائے!

ان کا مضمون لائق مطالعہ ہے گفتگو آگے بڑھنی چاہیے ـ

ہوا یہ ہے کہ ترقی پسند تحریک کے بعد جدیدیت والے ترقی پسندوں ہی کے انداز میں پی۔آر و دیگر معاملات میں ان پر سبقت لے گئے ـ دوڑ بھاگ کے اس عمل میں بھلے اور برے کے درمیان تمیز اٹھ گئی اور معیار یہ قائم ہوا کہ دوستی یا دشمنی کی بنیاد پر کہانیاں لکھی بھی جائیں اور پرکھی بھی جائیں ـ مثلاً فلاں ـــــ فلاں پسند ہے تو دوستی کے ناتے اس کی حمایت کی جائے اور دشمنی ہو تو بخیے ادھیڑ دیے جائیں ـ اس کے فائدے سراسر نقادوں کے حصے میں آئے اور کہانیاں خسارے میں رہیں ـ نتیجتاً پڑھنے والا سوچ میں پڑ جاتا ہے ـ اس کے مطالعے میں جو کہانی آتی ہے وہ کیوں کر کہانی کہلائی اور کس معیار پر وہ کہانی ٹھہری ہے ـ یہیں سے نقادوں کی سرگرمیوں کا آغاز ہوتا ہے ـ

نقادوں کی تاویلوں سے پڑھنے والا کہانیوں کے معاملے میں اپنے تئیں نہایت کم فہم بلکہ بے وقوف تصور کرنے لگتا ہے اور وہ اس نتیجے پر پہنچتا ہے کہ کہانیوں کے مطالعہ کے بھی جدید ڈھنگ ہوتے ہیں ـ جن کے بغیر جدید کہانیاں عام پڑھنے والوں کے فہم و ادراک سے بالاتر ہوتی ہیں ـ ترقی پسندوں کا "اسٹنٹ" نہایت واضح تھا ـ اس کے مقابلے میں جدیدیوں کا "اسٹنٹ" غیر واضح اور اس قدر پیچیدہ کہ وہ بادی النظر میں اسٹنٹ ہی محسوس نہیں ہوتا ہے، بلکہ تاثر یہ ذہن پر پڑتا ہے کہ ادب لکھنا تو درکنار اس کا سمجھنا بھی ہر کس و ناکس کے بس کی بات نہیں ہے یہ پی۔آر اور احباب نوازی

اسٹیج ہے۔ یہیں سے شہرت تقسیم ہوتی ہے اپنوں میں۔

کہانیوں کے موضوع پر بات پرکھوں سے چلے تو بہتر کیونکہ انہی کے مبارک ہاتھوں سے پہلی اینٹ ٹیڑھی بڑی تھی۔ پہلے ان کے زمانے کا تعین کر لینا مناسب ہوگا جس زمانے میں وہ لوگ کہانیاں لکھ رہے تھے۔ دوسری جنگِ عظیم اپنے شباب پر تھی۔ ایٹمی دھماکے کی تباہ کاریاں پہلی بار بنی نوع انسان کے تجربے میں آئیں۔ برصغیر میں تحریکاتِ آزادی بھی آخری منزل پر تھیں۔ پورا برصغیر ہندو مسلم فسادات کی لپیٹ میں آچکا تھا۔ پھر برصغیر کی تقسیم اور تاریخ انسانی کی عظیم ترین نقل مکانی۔ ان واقعات کے حوالے سے اس زمانے کی کہانیوں کا تجزیہ کیا جائے تو کتنی کہانیاں ایسی ہمارے سامنے آئیں گی جن میں ہمارے پرکھوں نے اپنے عہد کے تقاضوں سے انصاف کیا۔ علم ریاضی کے قاعدے پر حساب کیا جائے تو حیران کن حدوں تک اعشاریے کے بعد چند ہندسے صفر سے شروع ہوتے نظر آئیں گے۔

برصغیر کے فسادات اور نقل مکانی بڑے مسائل تھے۔ ان کے تناسب کا ادب کہاں؟

یہاں ذکر بنگال کا چل پڑا ہے۔ لارڈ کلائیو نے نواب سراج الدولہ کا تختہ الٹ کر برٹش راج کا ہندوستان میں باقاعدہ آغاز کیا۔ کہا جاتا ہے کہ لارڈ کلائیو نے اپنی ماں کو ایک خط لکھا تھا جس میں اس نے ہندوستان سے اپنی ماں کو متعارف یا اس اختتامیہ کے ساتھ کہ ایسا ملک دنیا میں نہیں۔ یہاں کے باشندے چند سکّوں کے عوض اپنوں کا خون بہا دیتے ہیں اور بھائی اپنے بھائی کو قتل کرتا پھرتا ہے۔ حکمرانی کے نقطۂ نظر سے ہندوستان جیسا ملک نہیں ہوتا۔ یوں پلاسی سے جو سلسلہ چلا ہے وہ پاکستان تک پہنچا اور تقریباً تین صدیاں انگریزوں نے برصغیر پر حکومت کی۔ بنگال کی کہانی بڑی دردناک رہی ہے۔ پہلے یہ ہوا کہ مرشد آباد سے صوبائی دار الحکومت منتقل کر کے ہزار مسجدوں کے شہر ڈھاکا کو صاف نظر انداز کرتے ہوئے لندن کے انداز میں کلکتہ آباد کیا گیا جس کے متعلق شمیم حنفی صاحب "شہر خوں آشام" میں رقم طراز ہوتے ہیں :-

"کتابوں میں لکھا ہے : جس دن بھگوان شیو کی پتنی کالی نے پران تیاگے، شیو کی آتما دُکھ سے نڈھال بھی ہوئی اور جلتی جھلستی جوالا سمان کرودھ اور اَنیجنا سے لال بھی۔ کاندھے پر کالی کی بے جان کایا سنبھالے، وشولوک کے چاروں اُور شیو ناچتے پھرے۔ سمے جیسے جیسے بیتتا جاتا تھا ناچ کی گت تیز ہوتی جاتی تھی۔ اور رودِ ناش کے اس نرتیہ کی گت کے ساتھ ساتھ کرودھ کی جوالا تیز تر اُونچی اور اُونچی ہوتی گئی۔ تب دیوتاؤں کو دھیان آیا ــــ بھگوان شیو کے کاندھوں پر کالی کی کایا اگر اسی طرح رکھی رہی تو سنسار ان کے کرودھ کی آگنی میں بھسم ہو جائے گا۔ کتابوں میں لکھا ہے کہ تب وشنو بھگوان نے کٹار اٹھائی اور پوری شکتی کے ساتھ اسے کالی کی کایا کے اُور اچھال دیا۔ پھر وہ کایا باون ٹکڑوں میں بٹی اور یہ ٹکڑے ساری دھرتی پر جہاں تہاں بکھر گئے۔ بنگلہ بھومی کی ایک مہان ندی کے

اور وہاں سالی کے منتر کی استھاپنا کی۔ سو دھرتی کا وہ ٹکڑا "کالی کتہ" کہلایا اور
سارے جگت میں مہما کا سنکھ بجایا۔۔۔۔۔۔"

درمیانی (تقریباً) تین صدیوں کے واقعات ایک طرف ۱۹۴۷ء میں جب پاکستان وجود میں آیا اس کے قبل
ے بنگال میں کوئی تین ہزار زمیندار تھے۔ ان میں مسلمان بنگالی زمینداروں کی تعداد سات فیصد سے اوپر نہ جاتی
گرچہ بنگال میں مسلمانوں کی اکثریت رہی ہے۔ ۱۸۵۷ء کے بعد بنگال کے مسلمانوں پر جو گزری ہے۔ ناقابلِ بیان ہے۔
ل کے مسلمان کہیں کے نہ رہے۔ وہ کاشت کاری اور ماہی گیری پر مجبور کیے گئے۔ پروفیسر محترمہ لطیفہ آکھوند کے اعداد
یں آئندہ کے لیے محفوظ رکھتا ہوں۔ وہ پھر کبھی۔ تو منطقی طور پر بنگال کے مظلوم مسلمان جن کا خوفناک دوطرفہ
تحصال ہوتا رہا۔ وقتاً فوقتاً بغاوت کرتے رہے۔ "تی بھاگی" بنگال میں زمینداروں کے خلاف ایک نہایت منظم و
تحریک تھی جو دوسری جنگِ عظیم کے دوران شروع ہوئی۔ کیا ہندو کیا مسلمان وہ زمینداروں کے خلاف صف آرا
ئے۔ اس سے برٹش راج اور ان کے ایجنٹ زمینداروں کو زبردست خطرہ لاحق ہو گیا۔ کیونکہ تی بھاگ تحریک
مقصد استحصال پسند قوتوں کا سدِ باب تھا۔ مسلم لیگ کے ڈھاکے میں قیام کے علاوہ یہ نکتہ بھی قابلِ غور ہے کہ
دادِ پاکستان ایک بنگالی مسلمان نے لاہور میں پیش کی۔ نعرۂ پاکستان بنگال میں با آواز گونجا اور بنگال ہی میں
رو مسلم اتحاد ٹوٹ گیا۔

آگے چل کر یہ بھی دیکھنے میں آیا کہ ہولناک ہندو مسلم فسادات جن کی لپیٹ میں سارا برصغیر آیا۔ پہلے کلکتہ بعدہٗ
ھالی سے شروع ہوئے۔ بہار اور پنجاب کے فسادات بنگال کے فسادات ہی کے ردِ عمل کے طور پر وقوع پذیر ہوئے
و مسلم اتحاد جس کی بنیادیں کانگریس کے فرقہ وارانہ رویہ اور مسلم لیگ کے قیام سے لرز رہی تھیں پلک جھپکتے میں
ٹوٹ گیا کہ آج بھی بابری مسجد کا مسئلہ اٹھتا ہے۔ تسلیم شدہ تاریخی حقیقتوں پر انگلیاں اٹھتی ہی چلی جا رہی ہیں
ں ایک افریقی ناول نگار شینوا اشلبے (CHINUA ACHEBE) کی بات اٹھتی ہے۔ اس نے اپنے ناول بعنوان
ھینگس فال اپارٹ (THINGS FALL APART) میں لکھا ہے۔ اپنے وطنِ عزیز کے متعلق، کہ انگریز اپنے ساتھ
رف اپنا مذہب ہی لائے تھے بلکہ ساتھ ساتھ طرزِ حکومت اور تجارت بھی لیتے آئے تھے۔ شینوا نے اسی ناول میں
ہاں کے واقعات کا تجزیہ کرتے ہوئے لکھا ہے

HE (THE WHITE MAN) HAS PUT HIS KNIFE ON THINGS
THAT HELD US TOGETHER AND WE HAVE FALLEN APART"

ترجمہ: " اس نے (انگریز نے) وہیں پر چھرا چلا دیا جہاں ہم لوگ جڑے ہوئے تھے۔ نتیجتاً ہم لوگ

• شہر خون آشام۔ کلکتہ پر پچاس نظمیں۔ کل ۱۲۸ صفحات۔ تعارف۔ ترتیب۔ ترجمہ: شمیم حنفی۔
رو طابع: بلراج مین را۔ شعور پبلی کیشنز۔ نئی دہلی، بھارت۔

(ایک دوسرے سے منقطع ہو کر) پرے جا گرے۔"

تو کیا تین صدیوں کی منظم تیاریوں کے بعد وہی چھرا جس کا ذکر شینتوا نے کیا ہے، برصغیر کے ہندو مسلم اتحاد کے نازک ترین مقام پر نہیں چلا دیا گیا؟ ہمارے پرکھوں میں سے کسی کے تجربے میں برصغیر کا المیہ اس کے اپنے غیر جانب دار تاریخی تناظر میں نہیں آیا۔ سوال یہ اٹھتا ہے کہ کیوں نہیں آیا۔ ان میں سے کچھ اک چھپ کر کانگریس یا مسلم لیگ کے حمایتی تھے اور بھاری تعداد میں کھلم کھلا کمیونسٹ پارٹی کے طرفدار۔ مگر شینتوا جیسا تجربہ کسی نے نہیں کیا۔ یہی ہماری ابتدائی بدنصیبی ہے۔

سعادت حسن منٹو میں ایک ایسا ادیب تھا جس نے اردو ادب کے تقاضوں کو صحیح جانا اور نقادوں کے رویّے کو صحیح پہچانا۔ اور مرزا ہادی رسوا کی روایت سے اپنے تئیں وابستہ کیا اور طوائفوں کے موضوع پر کہانیاں لکھیں وہ اردو ادب میں لافانی۔ ادھر کچھ نقاد بیدی کا علم بلند کر کے یہ ثابت کرنے کی کوشش کر رہے ہیں کہ فن کے معاملے میں وہ منٹو سے عظیم تر تھا۔ یہاں لفظ فن اپنے انگریزی مفہوم میں استعمال ہوتا نظر آ رہا ہے۔ وہ فن کیا۔ کس کام کا اگر عہد کے تقاضے ہی گرفت اور مطالعے میں نہ آئیں۔

۱۹۷۱ء تک طرح طرح کی تحریکیں چلیں جن سے ہر پھر کے بدہضمی (INDIGESTION) کا اظہار ہوتا رہا ادیبوں نے کڑوے کسیلے اور ثقیل جتنے فلسفے ان کے دسترخوان پر آئے، نگل گئے۔ ۱۹۷۱ء میں کچھ نئے موضوعات ہاتھ لگے۔

۱۹۷۱ء میں تقریباً وہی ہوا جو ماضی میں ہو چکا تھا۔ اس کی الٹی تعبیریں بیان کی جا سکتی ہے کہ اگر ایسا نہیں تو کیا معرکہ حق و باطل میں ہمارے ادب میں حق کا معیار مفقود تھا؟ انتظار حسین صاحب نے ۱۹۷۱ء کے موضوع پر ایک مکمل ناول اور چند کہانیاں لکھیں۔ "شہر افسوس" میں ان کا ایک ضمنی کردار وہ کچھ کر گزرا جو ٹھنڈا گوشت کا نشانِ عظمت قرار پایا۔ شہر افسوس کی مدح سرائی بہت ہوئی۔ ناول بھی خاص و عام میں بہت مقبول ہوا۔ اب یہ سوال لازمی طور پر اٹھتا ہے کہ ۱۹۷۱ء کا المیہ انتظار حسین صاحب کے تجربے میں کس طرح آیا اور کراچی اور حیدرآباد کے واقعات کس طرح سے آ رہے ہیں؟

کراچی اور حیدرآباد کے واقعات پر شہر افسوس جیسی کتنی کہانیاں آئی ہیں؟

بابری مسجد ایک ISOLATED المیہ نہیں ہے۔ اس کا اپنا سیاق و سباق موجود ہے جس سے علیحدہ کر کے اسے دیکھا نہیں جا سکتا ہے۔ سابقہ مشرقی پاکستان میں بنگالی بہاری فسادات بھی تقسیم سے متعلقہ ایک مسئلہ کی حیثیت رکھتے ہیں۔ ۱۹۴۷ء کے بہت بخیے ادھیڑے گئے ہیں۔ مزید نہیں کس لیے، کہ نفسِ مضمون اس کی راہ میں مانع ہوتا۔ ۱۹۷۱ء کا جھگڑا اقتصادی نوعیت رکھتا تھا۔ اقتدار کا مسئلہ لازمی طور پر اٹھ کھڑا ہوا اور جو کچھ برق رفتاری سے گزرا اس کی تیاریاں پہلے سے کی جا چکی تھیں۔ ۱۹۷۰ء کے انتخابات میں نہ عوامی لیگ کے امیدوار سابقہ مغربی پاکستان ... مسلم لیگ کے امیدوار سابقہ مشرقی پاکستان سے۔ انتخابات کے فوراً بعد

بجائے واقعات عجیب وغریب دیکھنے میں آئے۔ ایک ہی مملکت میں دو اکثریتی پارٹیاں، پھر مملکت کی بقا کے
لیے سابقہ مشرقی پاکستان پر فوج کشی۔ عوام، جن کے نام پر سب کچھ ہوا واقعات سے لاعلم۔ وہی واقعات کی زد پر بھی
اور بہاری تعداد میں تباہ و برباد ہوئے۔ ۱۹۴۷ء کے بعد آگ اور خون کی ندیاں دوسری بار بہہ گئیں۔ اس المیہ کو کسی نے
انی المیہ قرار دیا اور کسی نے بنگالی المیہ اور کسی نے بہاری المیہ۔ ان تینوں المیوں میں سے مجھے کسی بھی المیے سے انکار
، مگر کوئی مجھے یہ بتائے کہ ہمارے عہد (۱۹۷۱ء) کا انسانی المیہ کہاں روپوش ہو گیا۔ اور اس وقت کی صورتحال
والے سے ادیبوں اور دانشوروں کے حلقوں میں یہ سوال زیر بحث کس لیے نہ آیا۔ انتظار حسین کے لیے واقعہ پاکستانی
کا درجہ رکھتا تھا اور کسی قدر بہاری المیے کا درجہ بھی۔ مسعود مفتی صاحب کی رپورتاژ (فنون، لاہور) سے بڑی حد تک
انی المیے کا اندازہ لگتا ہے۔ المیے کے تقریباً ۱۸ سال کے بعد سہی۔

افسوس اس بات پر ہوتا ہے کہ ماضی قریب (۱۹۷۱ء) کے ایک عظیم المیے کو بھی ہم نے مختلف خانوں میں تقسیم
ر رکھ دیا اور یوں اپنے عہد کے تقاضوں سے آنکھ چراتے کی روایت سے اپنے تئیں وابستہ کیا۔ اس سے یہ حقیقت بھی برآمد
ہے کہ اپنے عہد کے مسائل سے ناانصافی کرنا جائز بلکہ لائق ستائش بھی ہے اور ادب میں اس کی کھلی اجازت ہے۔

پورے بنگلہ دیش میں ۲۱ فروری یوم بھاشا اندولن کی حیثیت سے منائی جاتی ہے۔ ۱۹۵۲ء سے جب بنگلہ زبان
ایت میں سڑکوں پر نکلنے والوں پر اردو میں گولیاں چلا دی گئی تھیں، یہ سلسلہ چلا آ رہا ہے۔ وہ دن اردو والوں کے لیے
ٹھن ہوا کرتا ہے۔ لوگ عموماً اپنے اپنے گھروں میں رہتے ہیں۔ میں نے حوصلہ کر کے یہاں کے بنگالی ادیبوں اور دانشوروں
آگے ۱۹۷۱ء کا تجزیہ کیا اور یہ سوال اٹھایا کہ آخر کس کے مفاد میں ہمارے ادب کا المیہ پاکستانی المیہ، بنگالی المیہ یا
ی المیہ میں تقسیم ہو کر رہ گیا۔ ابتدائی ناکامیوں کے بعد آخر کار یہ سوال اپنی پوری شدت کے ساتھ بنگالی ادبی
قوں میں اٹھ کھڑا ہوا۔ اور نہ صرف ادیبوں اور دانشوروں نے بلکہ پڑھنے والوں نے بھی اپنے مثبت ردِ عمل کا
ہار کیا۔ اب کے ۲۱ فروری کے موقعے پر یہاں کے مقبول ترین ہفت روزہ "بچترا" کے بھاشا اندولن نمبر میں اردو ادیبوں
شاعروں کا انتہائی احترام سے ذکر آیا ہے۔ مذکورہ بالا بنگلہ ہفت روزہ کے تجزیے کے مطابق مفاد پرست حلقوں نے
ن کے مقابلے میں اردو کو کھڑا کیا تھا اور یوں انھوں نے اپنا الو سیدھا کیا۔ اردو کے سلسلے میں یہ بنگالی ادیبوں اور
شوروں کا کھلا اعتراف ہے کہ بنگلہ دیش میں سازشوں پر سازشیں چلیں اور ان کی زد پر اردو آتی رہی ہے۔ ان کا
عتراف بھی ہے کہ ہم لوگوں نے بھی یہاں کے اردو لکھنے والوں کے ساتھ انصاف نہیں کیا۔ ۲۱ فروری ۱۹۹۰ء کے قبل
ں کے ایک موقر بنگلہ جریدہ "پروتی پکھو" بنگلہ ہی میں اپنا اردو نمبر پیش کر چکا ہے۔ کیا پاکستان میں بھی اس نوعیت
کوئی بحث چلی ہے۔ کیا وہاں بھی اعترافات کیے گئے ہیں؟

خدا کا شکر ہے کہ محترم احمد ندیم قاسمی صاحب کی محبتوں کا سایہ ہمارے سر پر موجود ہے۔ محصورین پاکستانی جو
نگلہ دیش میں گزشتہ اٹھارہ سال سے مقیم ہیں اور پاکستان پہنچنے کی راہیں تلاش کر رہے ہیں۔ ان پر قاسمی صاحب
کی نظر سب سے پہلے پڑی تھی ۶۹۔ ۱۹۷۰ء کے "فنون" کے کسی اداریے میں انھوں نے یہ مسئلہ اٹھایا تھا۔ ان محصورین

پاکستان کے دکھ "شہرِ افسوس یا "بستی" کے کرداروں سے کئی گنا زیادہ ہیں۔ ان پر لوگوں کی نظر کس لیے نہیں پڑتی ہے۔
بنگلہ دیش کے ادبی حلقوں میں میرے متذکرہ بالا سوال پر بحث چلی اور خاطر خواہ نتائج بھی برآمد ہوئے۔ پاک کے ادبی حلقوں کی طرف سے اس کے برعکس مجھے اس موضوع پر اکثر یہ مشورہ ملتا رہتا ہے، بھائی جو کچھ ہوا، افسوسناک اسے بھول جانے کی کوشش کرو اور مستقبل پر نظر رکھو جو بے حد تابناک ہے۔ یہ کیا بات ہوئی، کیسی بات ہوئی کہ ماضی قریب (۱۹۷۱ء) کے بطن سے ایک تابناک مستقبل جنم لے رہا ہے۔ جہاں زمانۂ حال میں غلط بیانیاں سکۂ رائج الوقت کا درجہ رکھتی ہیں۔ میری کوشش یہ ہے کہ بس ریکارڈ ٹھیک ٹھاک کر لیے جائیں اور ادب و فن کی آڑ سے جھوٹ نہ بولا جائے ا شعبدہ بازی سے گریز کیا جائے کیونکہ مجموعی طور پر ایسی غیر ذمہ دارحرکتوں سے ادب کو گزند پہنچا ہے جیسا کہ کہانیوں کے سلسلے میں ہو رہا ہے۔ صداقت کا عنصر مفقود، صداقت کے مقام پر سیاست اور خیر کے مقام پر شر۔ ان پر فنی حسن کے لیے سے اصلیت آخر کہاں تک چھپ سکتی ہے یا چھپائی جا سکتی ہے۔

لوگ اپنے اپنے نقطہ ہائے نظر رکھیں۔ وہ انھیں مبارک، میں نہ ترقی پسند نہ جدیدیت پسند۔ میں نے کہا کے باب میں چند موٹی موٹی باتیں لکھی ہیں۔ کہانیوں کے تیزی کے ساتھ گرتے ہوئے معیار کی روشنی میں — شانِ نزول اقبا صاحب کا مضمون ہے۔

ادب برادری ایک ناقابلِ تقسیم اکائی ہے۔ ہر چند مقامی جغرافیہ اور تاریخ کے حوالے سے مگر مقامی جغرا اور تاریخ سے بلند تر ہو کر ہماری نظریں ان انسانی معاملات پر پڑنی چاہئیں جو ہمارے عہد میں بطور نہایت پریشان مسائل مختلف صورتوں میں وقتاً فوقتاً نمودار ہوتے رہتے ہیں بہ یک وقت اس حقیقت کو ملحوظ رکھتے ہوئے کہ ہم لو قرونِ وسطیٰ سے نکل کر ایک ایسے عہد میں داخل ہو چکے ہیں جس کی ابتدا بجلی، اسٹیم انجن، چھاپہ خانہ اور ہوائی جہ سے ہوئی اور انتہائی شدتِ رفتار سے ہمارا عہد کمپیوٹر تک آپہنچا ہے۔ ذمہ داریاں کہانی نگاروں پر نسبتاً زیادہ پڑ ہیں۔ کہانیاں بہر صورت کہانیاں ہوں۔ پڑھنے والا اس سے زیادہ کچھ مطالبہ نہیں کرتا۔

فن کا تقاضا اس سے زیادہ اور کیا ہو سکتا ہے کہ موضوعات و مسائل کچھ بھی ہوں، جھوٹ ہرگز نہ بولا جا اور کہانیوں کی تشکیل کسی بھی قیمت پر مسخ نہ ہونے پائے۔ اختلافِ رائے کی گنجائش نکلنی چاہیے۔ اس کی ضرورت تسلیم اہمیت ایسی کہ اس پر دو رائے ہو ہی نہیں سکتی ہے۔ بشرطیکہ ادیب و دانشور، وکیلوں کا رویہ اختیار نہ کر کے پی۔ آر احباب نوازی کے نئے بلکہ ہوش رُبا معیار قائم کریں۔

رؤف پاریکھ

سوانح عمری مولینا آزاد

(نواب سیّد محمد آزاد کی ایک نادر تصنیف)

اردو کے مشہور مزاحیہ جریدے "اودھ پنچ" (لکھنؤ) کے لکھنے والوں میں نمایاں ترین نام اس کے مدیر منشی سجاد حسین ۱۸۵۶ء - ۱۹۱۵ء) کے بعد غالباً نواب سیّد محمد آزاد ہی کا ہے۔ نواب سیّد محمد آزاد ۱۸۴۶ء میں ڈھاکا میں پیدا ہوئے۔ اردو اور فارسی کی تعلیم کے ساتھ انگریزی میں بھی استعداد پیدا کی۔ سرکاری ملازم تھے۔ ترقی کرتے کرتے اعلیٰ مناصب تک پہنچے۔ ۱۹۱۶ء میں وفات پائی۔[۴]

نواب آزاد نے پہلے پہل محمڈن لیٹریری سوسائٹی کے فارسی اخبار "دوربین" میں مضامین لکھنے شروع کیے۔ اس کے علاوہ "اودھ اخبار" (لکھنؤ)، "اکمل اخبار" (دہلی)، "آگرہ اخبار"، "سفیر" (لدھیانہ) اور "اخبارالاخبار" میں بھی لکھتے رہے[۵] لیکن صحیح معنوں میں شہرت "اودھ پنچ" سے ہی ہوئی۔ ان کے مضامین کا مجموعہ "خیالاتِ آزاد"[۶] اور ڈراما "نوابی دربار"[۷] کے نام سے ہے۔ اس کے علاوہ انھوں نے "اودھ پنچ" میں دو نہایت دل چسپ سلسلے بھی شروع کیے تھے۔ ایک مزاحیہ لغت کا سلسلہ تھا۔ یہ عبید زاکانی (م ۱۳۷۰ء) کی مزاحیہ لغت کا تتبع معلوم ہوتا ہے۔ اس کا نام تبدیل ہوتا رہتا تھا۔ مثلاً "نئی ڈکشنری"، "نئے سال کی نئی ڈکشنری"، "چودھویں صدی کی نئی ڈکشنری" "لوکل سلف گورنمنٹ کی نئی چمکتی ہوئی ڈکشنری" وغیرہ کے ناموں سے چھپی۔ اسی طرح دوسرا سلسلہ بھی جو لندن سے تحریر کیے گئے فرضی خطوط پر مشتمل تھا، مختلف ناموں سے چھپا۔ مثلاً "روشنی کا نامہ و پیام"، "پرانی روشنی کا نامہ و پیام" وغیرہ۔ یہ دونوں سلسلے بہت پرلطف اور طنزیہ تھے۔ ان کے بعض حصے "خیالاتِ آزاد" میں شامل ہیں۔ "نوابی دربار" بھی اودھ پنچ میں قسط وار شائع ہوا تھا۔

نواب آزاد کا اسلوب بنیادی طور پر طنز سے عبارت ہے۔ ان کا طنز بالعموم بالواسطہ اور رمزیہ (IRONICAL) ہوتا ہے۔ ان کے طنز میں گہرائی بھی ہے۔ گو ان کے ہاں کبھی کبھی تلخی بھی آگئی ہے لیکن عمومی طور پر ان کا طنز شگفتہ ہے۔ نواب آزاد کا طنز مقصدی ہے۔ وہ نثر میں وہی کام کرنا چاہتے تھے جو اکبر الٰہ آبادی (۱۸۴۵ء - ۱۹۲۱ء) نے نظم میں کیا تھا۔ آزاد نے مغرب زدگی، مغربی تہذیب اور انگریزوں کا مذاق اڑایا۔ ان پر گہرے طنز کیے۔ وہ مغرب کی کورانہ تقلید کے مخالف تھے۔ چنانچہ علی گڑھ اور سر سیّد احمد خاں (۱۸۱۷ء - ۱۸۹۸ء) بھی ان کے طنز کا نشانہ بنے۔

آزاد کا مقام نہ صرف اودھ پنچ کے مزاح نگاروں میں بلکہ بیسویں صدی کے اردو مزاح نگاروں میں بھی بلند ہے۔

زیرِ نظر مضمون میں نواب سید محمد آزاد کی ایک نادر تصنیف "سوانح عمری مولینا آزاد" کا تعارف مقصود ہے نیز اس تصنیف کے بارے میں چند ایسی باتوں کی وضاحت بھی مقصود ہے جو ہنوز اودھ پنچ کی بوسیدہ فائلوں میں دبی ہوئی ہیں۔ چند سال قبل بھارت سے ڈاکٹر سید مصباح الحسن قیصر کی کتاب "معاونینِ اودھ پنچ"[۹] شائع ہوئی ہے۔ اس میں "سوانح عمری مولینا آزاد" کے بارے میں لکھی گئی چند باتیں تحقیق طلب ہیں۔ مثلاً اودھ پنچ میں اس کی پہلی اور آخری قسط کی تاریخِ اشاعت۔

"سوانح عمری مولینا آزاد" دراصل نواب سید محمد آزاد کی مزاحیہ سوانح عمری ہے۔ لیکن یہ فرضی ہے۔ اس میں انھوں نے اپنے مخصوص طنزیہ اسلوب میں اپنی زندگی کے فرضی واقعات بیان کیے ہیں اور مغربیت، آزادیٔ نسواں کے مکر و فریب کا بُرا انجام دکھایا ہے۔ سوانح عمری کے پردے میں انھوں نے سید احمد خاں، علی گڑھ تحریک، مغربیت، پیری مریدی، نام نہاد "وفا رمروں" اور مولویوں کے لتّے لیے ہیں۔ یہ سوانح عمری مارچ ۱۸۹۱ء میں کتابی صورت میں شائع ہوئی تھی۔ اس کے بعد سے کم یاب ہے۔

سوانح عمری کی ابتدا اتنی سنجیدہ ہے کہ لگتا ہے نواب آزاد اپنی زندگی کے صحیح صحیح حالات بیان کرنے جا رہے ہیں۔ اور آگے چل کر بھی انھوں نے کہیں بھی وضاحت سے یہ نہیں لکھا کہ یہ ان کی زندگی کے خیالی واقعات ہیں یہ ان کا مخصوص انداز ہے۔ اسی انداز کی بنا پر سکینہ کو یہ دھوکا ہوا تھا کہ "نئی روشنی کا نامہ و پیام" کے زیرِ عنوان لندن سے لکھے گئے خطوط حقیقی ہیں[۱۰] حالانکہ آزاد کبھی لندن نہیں گئے۔

یہ سوانح عمری اودھ پنچ میں قسط وار چھپتی رہی۔ اس کے پندرہ حصے شائع ہوئے۔ بعض حصے دو ٹکڑوں میں ہیں۔ ایک حصے کے تو تین ٹکڑے ہیں۔ اس کے بعض اقساط کی اشاعت کے درمیان طویل وقفے بھی حائل رہے۔

ڈاکٹر مصباح الحسن قیصر "معاونینِ اودھ پنچ" میں لکھتے ہیں:

> "سوانح عمری مولینا آزاد" کا پہلا حصہ اودھ پنچ میں ۱۶ر جنوری ۱۸۹۰ء میں شائع ہوا۔ ۲۲ر مئی ۱۸۹۰ء تک کے کالموں میں سوانح عمری کے مختلف حصے موجود ہیں لیکن ۱۸۹۰ء کے پورے پرچے دستیاب نہ ہونے کی وجہ سے یقین سے نہیں کہا جا سکتا کہ سوانح عمری کی آخری قسط اودھ پنچ میں کب شائع ہوئی۔"[۱۱]

(پہلی سطر میں ۱۸۹۰ء کے بعد لفظ "میں" کی بجائے "کو" آنا چاہیے۔ غالباً سہوِ کاتب ہے)

اوّلاً، "سوانح عمری مولینا آزاد" کا پہلا حصہ اودھ پنچ میں ۱۶ر جنوری ۱۸۹۰ء کو شائع نہیں ہوا تھا۔ بلکہ ۱۶ر جنوری ۱۸۹۰ء کو اس سلسلے کی جو قسط شائع ہوئی اس پر صاف صاف "بقیہ سوانح عمری مولینا آزاد۔ نواں حصہ" تحریر ہے۔ نیز اس کے ساتھ ادارتی نوٹ بھی شائع ہوا ہے جس میں وضاحت کی گئی ہے کہ اودھ پنچ شمارہ ۴۲ مورخہ ۷ر اکتوبر ۱۸۸۹ء میں سوانح عمری کا جو حصہ شائع ہوا ہے وہ دراصل نصفِ دوم تھا اور نصفِ اوّل اب پیش کیا جا رہا ہے۔ اس طرح ڈاکٹر قیصر

یہ نتیجہ نکالنا کہ سوانح کی پہلی قسط ۱۶؍ جنوری ۱۸۹۰ء کو شائع ہوئی تھی، بعید از فہم ہے۔

ثانیاً، اگر یہ فرض کر لیا جائے کہ ڈاکٹر قیصر کی مُراد ۱۶؍ جنوری ۱۸۸۹ء ہے اور ۱۸۹۰ء سہوِ کاتب ہے تو بھی یہ اس لیے ست نہیں ہے کہ ۱۶؍ جنوری ۱۸۸۹ء کو اودھ پنچ کا کوئی شمارہ نکلا ہی نہیں۔

درحقیقت "سوانح عمری مولینا آزاد" کی پہلی قسط اودھ پنچ میں ۴؍ جنوری ۱۸۸۹ء میں شائع ہوئی تھی۔ اور اس کی سُرخی "سوانح عمری مولینا آزاد" کے ساتھ کسی قسم کی وضاحت نہیں ہے کہ یہ کوئی قسط وار سلسلہ ہے۔ البتہ اس کی دوسری قسط مطبوعہ ؍جنوری ۱۸۸۹ء کے ساتھ قوسین میں "دوسرا حصہ" کے الفاظ درج ہیں۔

اسی طرح سوانح عمری کی آخری قسط مطبوعہ ۲۲؍ مئی ۱۸۹۰ء کے بارے میں بھی ڈاکٹر قیصر کا تذبذب حیران کن ہے نکہ آزاد نے آخری قسط کا اختتام بالکل واضح انداز میں کر دیا ہے۔ بلکہ قسط کے آخری الفاظ "خدا حافظ" ہیں۔ ۲۲؍ مئی ۱۸۹۰ء بعد کے پرچوں میں سوانح عمری مولینا آزاد کی کوئی قسط موجود نہیں ہے۔ نیز آخری قسط کے سوا ہر قسط کے آخر میں "باقی آئندہ" "باقی دارد" لکھا گیا ہے۔ اس طرح شبہے کا کوئی جواز نہیں رہ جاتا۔

راقم الحروف کو اودھ پنچ کے ۱۸۸۹ء اور ۱۸۹۰ء کے فائل دیکھنے کا موقع ملا ہے۔ قارئین کی دل چسپی کے لیے "سوانح عمری مولینا آزاد" کی قسطوں کی تاریخ وار تفصیل دی جا رہی ہے۔

عنوان	تاریخِ اشاعت
سوانح عمری مولینا آزاد (؟)	۴؍ جنوری ۱۸۸۹ء
سوانح عمری مولینا آزاد (دوسرا حصہ)	۱۰؍ جنوری ۱۸۸۹ء
بقیہ سوانح عمری مولینا آزاد (دوسرا حصہ)	۱۷؍ جنوری ۱۸۸۹ء
سوانح عمری مولینا آزاد (تیسرا حصہ)	۳۱؍ جنوری ۱۸۸۹ء
سوانح عمری مولینا آزاد (چوتھا حصہ)	۲۸؍ فروری ۱۸۸۹ء
سوانح عمری مولینا آزاد (پانچواں حصہ) تتمۂ اودھ پنچ مطبوعہ ۲۱؍ مارچ ۱۸۸۹ء	۲۸؍ مارچ ۱۸۸۹ء
سوانح عمری مولینا آزاد (چھٹا حصہ)	۱۱؍ اپریل ۱۸۸۹ء
سوانح عمری مولینا آزاد (ساتواں حصہ)	۳۰؍ مئی ۱۸۸۹ء
سوانح عمری مولینا آزاد (آٹھواں حصہ)	۱۰؍ اکتوبر ۱۸۸۹ء
سوانح عمری مولینا آزاد (نواں حصہ)	۱۷؍ اکتوبر ۱۸۸۹ء
سوانح عمری مولینا آزاد (بقیہ نواں حصہ)	۲۴؍ اکتوبر ۱۸۸۹ء

(بقیہ سوانح عمری مولٰنا آزاد (نواں حصّہ)	۱۶ر جنوری ۱۸۹۰ء (۷ار اکتوبر ۱۸۸۹ء کو شائع شدہ حصّے کا نصف اوّل)	
(بقیہ) سوانح عمری مولٰنا آزاد دسواں حصّہ	۲۳ر جنوری	۱۸۹۰ء
(بقیہ) سوانح عمری مولٰنا آزاد (؟)	۳۰ر جنوری	۱۸۹۰ء
(بقیہ) سوانح عمری مولٰنا آزاد (گیارھواں حصّہ)	۶ر فروری	۱۸۹۰ء
(بقیہ) سوانح عمری مولٰنا آزاد (؟)	۱۳ر فروری	۱۸۹۰ء
سوانح عمری مولٰنا آزاد (بارھواں حصّہ)	۱۳ر مارچ	۱۸۹۰ء
سوانح عمری مولٰنا آزاد تیرھواں حصّہ	۲۷ر مارچ	۱۸۹۰ء
(بقیہ) اودھ کی بیگم (سُرخی لکھنے میں کتابت کی غلطی)	۳ر اپریل	۱۸۹۰ء
سوانح عمری مولٰنا آزاد (چودھواں حصّہ)	۱۰ر اپریل	۱۸۹۰ء
سوانح عمری مولٰنا آزاد پندرھواں حصّہ	۱۵ر مئی	۱۸۹۰ء
(بقیہ) سوانح عمری مولٰنا آزاد (؟)	۲۲ر مئی	۱۸۹۰ء

اس فہرست میں کہیں بقیہ لکھا گیا ہے اور کہیں نہیں لکھا گیا۔ کہیں توسین میں بقیہ لکھا گیا ہے۔ بعض حصّوں کو دو دفعہ شمار کیا گیا ہے اور کچھ حصّوں پر شمار (نمبر) لکھا گیا ہے۔ کچھ قسطیں دو ٹکڑوں میں ہیں لیکن وہ تسلسل میں ہیں۔ ایک تین ٹکڑوں میں ہے۔ دراصل ہم نے اس قسط وار تصنیف کی تفصیلات کو جوں کا توں درج کیا ہے۔ اودھ پنچ کے متعلقہ شماروں میں یہ تفصیلات اسی طرح درج ہیں۔ جن حصّوں کا نمبر (شمار) نہیں لکھا ہوا تھا وہاں البتہ توسین میں سوالیہ نشان لگا دیا گیا ہے۔ اس قسط کا نصف اوّل بعد میں چھپا اور نصف دوم پہلے، اس کی بھی نشاندہی کر دی گئی ہے۔

مندرجہ بالا فہرست میں ۳ر اپریل ۱۸۹۰ء کی قسط میں "اودھ کی بیگم" لکھا گیا ہے۔ متعلقہ شمارے میں اسی طرح لکھا ہوا ہے جو کہ دراصل کتابت کی غلطی ہے۔ جن دنوں اودھ پنچ میں "سوانح عمری مولٰنا آزاد" شائع ہو رہی تھی انہی دنوں ایک ناول "اودھ بیگم" بھی قسط وار اودھ پنچ میں شائع ہو رہا تھا۔ اس کے مصنّف کوئی "ہندی" نام کے صاحب تھے۔ سوانح عمری مولٰنا آزاد" کے تیرھویں حصّے کے دوسرے ٹکڑے پر جو ۳ر اپریل ۱۸۹۰ء کو شائع ہوا، کتابت یا تدوین کی غلطی سے "اودھ کی بیگم" کا عنوان لگ گیا تھا۔ (جس کی وضاحت اگلے شمارے میں نہیں کی گئی۔)

اب سوال یہ ہے کہ "ہندی" کون صاحب ہیں؟ اگرچہ یہ سوال ہمارے مطالعے سے بظاہر خارج ہے لیکن شہادت کی بنا پر شبہ کیا جا سکتا ہے کہ یہ آزاد ہی تھے۔ "سوانح عمری مولٰنا آزاد" کی جو قسط ۶ر فروری ۱۸۹۰ء کو چھپی ہے اس کے اختتام پر "راقم ... آزاد" ... (آزاد کتابت کی غلطی سے ...) اس سلسلے میں تحقیق کی ضرورت ہے۔ ممکن ہے کہ آزاد نے "اودھ کی بیگم"

ہندی کے نام سے تحریر کیا ہو۔

قارئین کی دل چسپی کے لیے یہاں اگر "سوانح عمری مولینا آزاد" سے کچھ پُرلطف اقتباسات دیے جائیں تو بے محل نہ ہوگا۔ یہ فرضی سوانح عمری جس سیاسی اور سماجی پس منظر میں لکھی گئی ہے اس کی تفصیل آزاد کی زبانی ہی بھلی معلوم ہوتی ہے۔ لکھتے ہیں:

"یہ وہ زمانہ تھا جب . . . تازہ تازہ اخلاقی ریویو اور مغربی گزٹ کے پرچے بہار کی ہوا میں اڑ اڑ کر مہذب اور شائستہ چیلوں کے طور پر آسمانِ خیالاتِ جدیدہ پر اِدہر (اِدھر) اودہر (اُدھر) منڈلا رہے تھے . . . . جب دلی زبان سے لا مذہبی اور الحاد کے بیان میں ایک خصوصیت اور عزت سمجہی (سمجھی) جاتی تہی (تھی) . . . . جب نسیم سحری ہر روز آنر ہمدردی، قومی آزادی اور رپالیسی کی بُو سے معطر ہوا کرتی تھی۔"[۱۲]

اردو ادب میں اخلاق اور شائستگی کے منافی بعض چیزوں پر اس طرح طنز کرتے ہیں:

"دو چار ہم سے اوذاتِ خاص میں ساتھ پورے اخلاص کے جان صاحب کی ستّی زقاف، جعفر زٹلی کے لطائف، نظیر کا ازاربند، رنگین کی ریختی، صاحبقران کا ریختہ، چرکین کی آخ تھو، سودا کی ہجویات، نواب مرزا کے معاملے، مومن خاں کے ولولے، میر حسن کی سحر البیان اور اسی قسم کے اور اردو رسالے مارل کلچر پر پڑھتے تھے اور اس کو ہم بہت غنیمت جانتے تھے اور اس کا کافی صلہ اپنے دل اور ایمان سے پاتے تھے۔"[۱۳]

سوانح عمری کی آڑ میں آزاد نے دراصل ایسے انسانوں پر طنز کیا ہے جو مصلح، واعظ، مدیر، سیاست داں اور نہ جانے کون کون سا بہروپ بھر کر اصلاح اور قومی مفاد کے نام پر اپنے ذاتی مفادات کے لیے ہر کام کرنے پر تیار ہو جاتے ہیں۔ حتیٰ کہ ان میں سے بعض مذہب کا لبادہ اوڑھ لیتے ہیں اور جب جمعہ کے وعظ کے لیے روانہ ہوتے ہیں تو بقولِ آزاد ان کا حال یہ ہوتا ہے۔

"ہم یہاں سے اپنے چیلوں اور معتقدوں کو ساتھ لے کر خراماں خراماں حرارتِ مذہبی کے جوش میں نیم رقصاں جانبِ مسجد روانہ ہوئے۔ ہمارا منہ پان سے شکار مارے ہوئے شیر کی طرح سُرخ تھا۔ اس ٹانک کو قوت اور تازگیٔ مزاج کے خیال سے ہم نے کسی قدر زیادہ استعمال کیا تھا۔ لب سے دو دو انچ نیچے تک پان کا سُرخ غلیظ عرق بھرا تھا جس کے پوچھنے (پونچھنے) کی بار بار ہم کو ضرورت ہوتی تھی . . . . . خطبہ ایک ایسی خاص قسم کی قرأت سے ہم نے پڑھا کہ جس کا اثر بہت دل رُبا اور بہت دل چسپ تھا۔ یہ قرأت کسی خاص اصول و قواعدِ قرأت سے وابستہ (نہ) ہونے کے سبب تکلفاتِ بے حاصل سے بالکلیہ بری تھی۔"[۱۴]

اس فرضی سوانح عمری میں ایک جگہ سید احمد خاں اور ان کے معترفین و معتقدین کے بارے میں لکھتے ہیں:

"ہم سید مغربی کی عبارت اور تصانیف کی بے انتہا تعریف کرتے تھے اور اونکو

(ان کو، بلاخیال اس کے کہ کوئی نسبت متبہ اور مشبہ بہ میں ہو یا نہو، بائرن، مکالے، ہملٹن (غالباً ملٹن) سروالٹر سے ۔ گولڈ اسمتھ غرض جس انگریز سے جی چاہتا تھا ملا دیتے تھے اور اس پر حاضرین جلسہ بغیر اس علم کے کہ یہ سارے انگریز مصنف و محرر تھے یا جنگلی جانور بلاتامل صاد کر دیتے تھے۔" (۱)

"سوانح عمری مولانا آزاد"، نواب سید محمد آزاد کی یادگار اور انتہائی دل چسپ تصانیف میں سے ہے۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ اس کا ایک جدید ایڈیشن جدید املا اور مبسوط مقدمے کے ساتھ شائع کیا جائے تاکہ اردو ادب کے شائقین آزاد کے اس شاہکار سے محظوظ ہو سکیں۔

حواشی

۱۔ تاریخ اجرا: ۱۶ر جنوری ۱۸۷۷ء

۲۔ چکبست، پنڈت برج نرائن "مضامین چکبست" (الہ آباد، ۱۹۵۴ء) ص: ۲۴۷ ـ ۲۴۸؛ نیز سکسینہ، ڈاکٹر رام بابو "تاریخ ادب اردو" (مترجم مرزا محمد عسکری، مرتب تبسم کاشمیری) (لاہور ۱۹۷۸ء) ص: ۷۰۴ ۳۔ ایضاً

۴۔ سکسینہ، حاشیہ ص: ۷۰۴ ـ ۵۔ چکبست نے اس کا نام مسلم لٹریری سوسائٹی لکھا ہے لیکن صحیح نام محمڈن لٹریری سوسائٹی ہے۔ سوسائٹی کے بارے میں تفصیلات کے لیے: انعام الحق "NAWAB BAHADUR ABDUL LATIF, HIS WRITINGS AND RELATED DOCUMENTS" (ڈھاکا، ۱۹۶۸ء) نیز عباسی، محمد یوسف "MUSLIM POLITICS AND LEADERSHIP IN SOUTH ASIA 1876-92" (اسلام آباد، ۱۹۸۱ء) ص: ۱۰۰ ـ ۱۱۸؛ احمد، صفیہ "MUSLIM COMMUNITY IN BENGAL 1884-1912" (ڈھاکہ، ۱۹۷۴ء) ص: ۱۸ ـ ۶۔ چکبست ص: ۲۴۸ ـ ۷۔ اسے ڈاکٹر غلام حسین ذوالفقار نے مرتب کر کے شائع کیا ہے۔ (لاہور، ۱۹۶۷ء) ۸۔ اسے ممتاز منگلوری نے مرتب کیا ہے (لاہور ۱۹۶۶ء)

۹۔ (لکھنؤ، ۱۹۸۴ء) ۱۰۔ "تاریخ ادب اردو" ص: ۷۰۴ ـ ۱۱۔ حاشیہ ص: ۹۲ ـ ۹۳

۱۲۔ "اودھ پنچ" مورخہ ۳۱ر جنوری ۱۸۸۹ء ص: ۱

۱۳۔ "اودھ پنچ" مورخہ ۷ر جنوری ۱۸۸۹ء ص: ۱

۱۴۔ "اودھ پنچ" مورخہ ۱۶ر جنوری ۱۸۹۰ء ص: ۲

۱۵۔ "اودھ پنچ" مورخہ ۲۸ر فروری ۱۸۸۹ء

PSO

یوسف امتیاز
(ٹورنٹو - کینیڈا)

مخدوم محیؔ الدین

سوگیا ساز پہ سر رکھ کے سحر سے پہلے۔

آبنوسی رنگ کا ایک نہایت وجیہہ نوجوان ۔ لمبے لمبے سیاہ بال ۔ چوڑی ناک ۔ یونانی دیوتاؤں کے سے ترشے ہوئے نقوش ۔
طِ حسن کا مخدوم محیؔ الدین ہے ۔ اور سردار جعفری کے لیے ۔ "بڑی بڑی چمکدار آنکھیں ، نظروں میں عقاب کی آنکھوں کی
،، آبنوسی چہرہ جیسے کسی نے اسے تراش دیا ہو ۔ چہرے پر سنگ تراش کی چھینی کے نشانات ، رخساروں کی ہڈیوں کا ہلکا
ھار بلند پیشانی ، زور دار ٹھوڑی اور بھنچے ہوئے ہونٹ ۔ صرف دو چیزیں مخدوم کی شخصیت میں لچک اور لطافت پیدا
ہیں ۔ ایک اس کا تبسم ، دوسری اس کی تیز نظروں میں کھلی ہوئی محبت ۔" دوستوں کے لیے مخدوم ۔ دوسروں کے لیے سرخ
کا شاعر ۔ اور حیدرآباد دکن کے لیے محبوب لیڈر ۔ ادیب ، شاعر ، استاد ، تلنگانہ تحریک کا روحِ رواں ۔ حیدرآباد نے
م کو اس کی زندگی ہی میں جی کھول کر سینے سے لگایا ، محبت دی ۔ پیار کیا ۔ غالباً بہادر یار جنگ کے بعد حیدرآباد نے صرف
م ہی کو ایمانداری سے چاہا ہے ۔ حیدرآباد میں مخدوم سے یا تو محبت کی جاتی ہے یا نفرت ۔ کیا دوست اور کیا دشمن سب ہی مخدوم
وص اور ایمانداری کے معترف ہیں ۔ حیدرآباد کمیونسٹ پارٹی کی عمارت "مخدوم بھون" کے نام سے منسوب ہوگئی ہے ۔

مخدوم ایک اہم ، خوش گو ، شعلہ نوا ترنم کے مالک اور سچے شاعر تھے جنھوں نے اپنے تصورات کے ساتھ ایماندارانہ زندگی
بسر کی ہے اور ان ہی کے مطابق ایک حد تک شاعری بھی کی ہے ۔ ترقی پسند تحریک کی ادبی خدمات میں مخدوم کا مختصر ادبی سرمایہ
، سویرا ، گلِ تر اور بساطِ رقص ایک حقیقی اور سچے شاعر کی شہادت دیتے ہیں ۔ سیاست نے مخدوم کے ادبی CONTRIBUTION
رود کر دیا ہے مگر روحانی کرب اور اضطراب کی بھٹی میں تپ کر نکلے ہوئے شعر دل میں چھپی ہوئی روشنی کو خوبصورتی کے ساتھ
رکر دیتے ہیں ۔ مخدوم نے اپنی کتاب "گلِ تر" میں لکھا ہے کہ "شعر میں ہم ماوراء کی حدوں کو چھوتے ہیں مگر شعر سماج سے ماورا
ہوتا ۔ کہا جاتا ہے کہ شعر بے کاری کی اولاد ہے مگر میں ایک محروم بے کاری انسان ہوں ۔ گلِ تر کی نظمیں ، غزلیں انتہائی
وقتوں میں لکھی گئی ہیں ۔ یوں محسوس ہوتا ہے کہ میں لکھنے پر مجبور کیا جا رہا ہوں ۔ سماجی تقاضے پر اسرار طریقے پر ہر شعر لکھواتے

نہ کی۔ ان کی سیاسی مصروفیتوں نے انھیں اتنا موقع نہیں دیا کہ اردو ادب کا دامن مخدوم کے نکھارے ہوئے پھولوں کی خوشبو سے مہک اٹھتا ؂

شہر باقی ہے محبت کا نشاں باقی ہے ‌ ‌ ‌ دلبری باقی ہے، دلداریِ جاں باقی ہے
سرِ فہرست نگارانِ جہاں باقی ہے ‌ ‌ ‌ تو نہیں ہے تری چشمِ نگراں باقی ہے

مخدوم بہ حیثیت شاعر محنت اور محبت سے بے حد متاثر نظر آتے ہیں جس میں انھوں نے ایک کے لیے دوسرے کا دامن ہاتھ نہیں چھوڑا۔ دونوں ایک دوسرے کے لیے لازم وملزوم ہیں۔ اپنے دور کی ترقی پسند تحریک کے ابتدائی زمانے کے شاعروں اور نظموں کی طرح عورت سے فرار نہیں حاصل کیا ہے۔ مخدوم نے کیفی کی طرح عورت کے ہاتھ میں تلوار نہیں دی ہے۔ فیض کی طرح بے چین ہو کر محبوب سے یہ نہیں کہتا " مجھ سے پہلی سی محبت مرے محبوب نہ مانگ " یا پھر عورت کو آنچل سے پرچم بنا لینے کا مطالبہ نہیں کیا ہے۔ یہ صحیح ہے کہ مخدوم کی ابتدائی رومانی شاعری میں معصوم فضا تو ہے مگر وہ اضطراب اور اضطرار نہیں ہے جس سے عشق عبارت ہے۔ اور جب شاعر کا شعور جاگا تو وہ انقلابی ہو چکا تھا۔ مخدوم سے جب پوچھا گیا کہ ان کے ابتدائی کلام میں sex کا دور دور تک پتا نہیں ہے لیکن بعد کی شاعری میں اس کا احساس شدت سے ہے، تو مخدوم نے نہایت بے باکی سے اعتراف کیا کہ "دراصل آج ہم اپنے احساسات کا بقایہ چکا رہے ہیں"۔ یہ حساب بڑی تیزی کے ساتھ آخری غزلوں اور نظموں میں چکایا گیا ہے۔ ان ابتدائی شاعری میں رومانس کا انداز کچھ اس طرح ہے ؂

ہر طرف پھیلی ہوئی ہے چاندنی ہی چاندنی ‌ ‌ ‌ جیسے وہ خود ساتھ ہیں ان کی جوانی ساتھ ہے

دلوں میں از دہامِ آرزو لب بند رہتے تھے ‌ ‌ ‌ نظر سے گفتگو ہوتی تھی دم الفت کا بھرتے تھے
نہ ماتھے پر شکن ہوتی نہ جب تیور بدلتے تھے ‌ ‌ ‌ خدا بھی مسکرا دیتا تھا جب ہم پیار کرتے تھے

کچھ لڑکیاں آنچل کو سمیٹے ہوئے بر میں ‌ ‌ ‌ گگری لیے سر پہ چلیں پانی کے بہانے
پانی میں لگی آگ پریشان ہے مچھلی ‌ ‌ ‌ کچھ شعلہ بدن اُترے ہیں پانی میں نہانے

پتیاں کھڑکیں تو سمجھا کہ لو آپ آ ہی گئے ‌ ‌ ‌ سجدے مسرور کہ مسجود کو ہم پا ہی گئے

شب کے جاگے ہوئے تاروں کو بھی نیند آنے لگی ‌ ‌ ‌ آپ کے آنے کی اک آس تھی اب جانے لگی

صبح نے سیج سے اٹھتے ہوئے لی انگڑائی ‌ ‌ ‌ اے صبا تو بھی جو آئی تو اکیلی آئی

اسی مخدوم نے جوانی کی پچھلی شاعری میں sex کی کمی کا قرض بہت تیزی کے ساتھ ذہنی طور پر قلاش ہوئے بغیر اس طرح ادا کیا ہے ؂

سازِ آہستہ دردا گردشِ جام آہستہ جانے کیا آئے نگاہوں کا پیام آہستہ

ہجومِ بادہ و گل میں ہجومِ یاراں میں کسی نگاہ نے جھک کر مرے سلام لیے
کسی خیال کی خوشبو کسی بدن کی مہک درِ قفس پہ کھڑی ہے صبا پیام لیے

جہاں بھی بیٹھے ہیں جس جا بھی رات مے پی ہے انہی کی آنکھ کے قصے انہی کے پیار کی بات

کوئی جلتا ہی نہیں کوئی پگھلتا ہی نہیں موم بن جاؤں پگھل جاؤں کہ کچھ رات کٹے

نظریں ملتی ہیں جام ملتے ہیں مل رہی ہے حیات پھولوں کی

آج تو تلخیٔ دوراں بھی بہت ہلکی ہے گھول دو ہجر کی راتوں کو بھی پیمانوں میں

چاند اُترا کہ اُتر آئے ستارے دل میں خواب میں ہونٹوں پہ آیا ترا نام آہستہ

شمیم پیرہنِ یار کیا نثار کریں تجھی کو دل سے لگالیں تجھی کو پیار کریں

مخدوم کی محبت کا سلسلہ بچوں سے جاملتا ہے جن سے انھیں ہمیشہ پیار رہا۔ انھوں نے میرے ایک cousin کو،
وہ بہت چاہتے تھے، سارے جہاں کی گالیاں سکھادی تھیں اور بلا کا نڈر اور بے باک بنادیا تھا۔ مخدوم کے ایک
ے پر اس کی زبان مشین گن کی طرح چلنے لگتی۔ ہمارے گھروں میں سبطِ حسن کا استقبال مخدوم کے اشارے پر گالیوں ہی
دا تھا۔ مگر بچوں کے اسی بے پناہ پیار نے مخدوم سے بچوں کے لیے کوئی نظمیں نہیں لکھوائیں۔ پر "پرسہ" جیسی دردناک
ز نظم ضرور لکھوائی ہے۔ یہ پرسہ باپ کی طرف سے ماں کے حضور میں ہے۔ اپنے کم عمر بچے آصف کی موت پر۔

نہ رو ہم نشیں یہ جہاں اور ہی ہے یہاں کی رہِ امتحاں اور ہی ہے
مُرادوں کو بر لانے والی دعائیں نہ تیری دعائیں نہ میری دعائیں
دعائیں بھی بے بس ہوائیں بھی بے بس تری اور مری التجائیں بھی بے بس
نہ وہ اور نہ میں اور نہ تُو جاودانی ازل کے مصوّر کا ہر نقش فانی

مخدوم نے اپنی تحریک کے مسائل کو شاعری سے زیادہ اہم قرار دیا ہے۔ مخدوم کی تخلیقات عوام سے قریب ہیں۔
کے دل کی دھڑکنیں سنتی ہیں۔ ان کو عوام کے دکھ درد اور خوشیوں کا پاس ہے

زندگی لطف بھی ہے زندگی آزار بھی ہے
ساز و آہنگ بھی زنجیر کی جھنکار بھی ہے

زہر بھی آبِ حیاتِ لب و خسار بھی ہے
زندگی دار بھی ہے زندگی دلدار بھی ہے
آج کی رات نہ جا

شاہ راہوں میں گلی کوچوں میں انسانوں کی بھیڑ
ان کے مصروف قدم
ان کے ماتھے پہ تردّد کے نشان
ان کی آنکھوں میں غمِ دوش اور اندیشۂ فردا کا خیال
سیکڑوں لاکھوں قدم
سیکڑوں لاکھوں عوام

سبطِ حسن نے مخدوم کے پہلے مجموعۂ کلام "سُرخ سویرا" میں مخدوم کے نام لکھے ہوئے خط میں انکشاف کیا ہے کہ مخدوم کی پہلی انقلابی نظم "جنگ" حبشہ پر مسولینی کے حملے کا ردِ عمل تھی ؎

نکلے دہانِ توپ سے بربادیوں کے راگ   باغِ جہاں میں پھیل گئی دوزخوں کی آگ

لیکن مخدوم کو سب سے زیادہ مقبول بنانے والی نظم "جنگِ آزادی" تھی۔ مزدور اور بائیں بازو کی تحریکوں کے جلسے کے شرکا یہ جانے بغیر کہ اس نظم کا خالق کون ہے، ایک آواز ہو کر گانے لگتے ؎

سُرخ سویرا آتا ہے   آزادی کا آزادی کا
گلنار ترانہ گاتا ہے   آزادی کا آزادی کا
دیکھو پرچم لہراتا ہے   آزادی کا آزادی کا

مخدوم کی شاعری میں ہر جگہ اس کے نظریات اور تفکر نے اپنی بہت گہری چھاپ چھوڑی ہے۔ اشتراکیت، محبّت، محنت، صوفیانہ تصوّر، رومانس، سب ہی کچھ شامل ہے۔ ڈاکٹر وحید اختر مجاز اور مخدوم کا تقابل کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ مجاز پر نراجیت حاوی ہے اور مخدوم تخریب کے ساتھ دہر کو معمور کرنے کا نسخہ بھی تجویز کرتے ہیں مثلاً ؎

اس زمیں موت پروردہ کو ڈھایا جائے گا   اک نئی جنّت نیا آدم بنایا جائے گا

ڈاکٹر وحید اختر نے مخدوم کی آخری دور والی شاعری کو فیض سے بھی زیادہ نئے مزاج کا ترجمان ٹھہرایا ہے۔ مخدوم کی نظم "سپاہی" ایک خوبصورت پُر اثر اور پُر سوز نظم ہے۔ سبطِ حسن کا خیال ہے کہ "سپاہی" میں سپاہیانہ شان نہیں ہے۔ نہ جنگجوئیت ہے اور نہ خود اعتمادی۔ الٹے افسردگی اور زندگی ہے ؎

کتنے سہمے ہوئے ہیں نظارے   کیسے ڈر ڈر کے چلتے ہیں تارے

مخدوم کی بہت ہی پُراثر اور کامیاب نظم "اندھیرا" ہے جس کو مرحوم بنّے بھائی سجاد ظہیر نے ترشا ہوا فنی نگینہ قرار دیا ہے۔ اس نظم کا شانِ نزول سٹی کالج کی درس گاہ ہے۔ اس نظم میں خندق، باڑھ کے تار میں اُلجھے ہوئے انسانوں کے جسم ان جسموں پر بیٹھے ہوئے گدھ سب ہی ایک ہولناک منظر کے کردار کی طرح اپنا تاثر چھوڑ جاتے ہیں ؎

رات کے ہاتھ میں اک کاسۂ دریوزہ گری		یہ چمکتے ہوئے تارے یہ دمکتا ہوا چاند
بھیک کے نور میں مانگے کے اجالے میں مگن		یہی ملبوسِ عروسی ہے یہی ان کا کفن
رات کے ماتھے پہ آزردہ ستاروں کا ہجوم		صرف خورشیدِ درخشاں کے نکلنے تک ہے
رات کے پاس اندھیرے کے سوا کچھ بھی نہیں		رات کے پاس اندھیرے کے سوا کچھ بھی نہیں

مخدوم نے غزل گوئی ۱۹۰۹ء میں شروع کی جس میں اردو کی روایتی غزل کا لہجہ، آہنگ اور داخلیت ملتی ہے۔ یہ غزلیں حسن و عشق اور واردانوں کے ساتھ سیاسی اور سماجی مسائل کا ایک خوبصورت امتزاج ہیں۔ اس لیے مخدوم کی شاعری چاہے اس کے دورِ اول کی ہو یا دورِ ثانی کی دونوں عالم خو تدمیری کی نظر میں ایسی ہے جس کا شعر نظریے کے وزن میں دبا نہیں۔ اس کی بہترین مثال چاند تاروں کا بن"، ہے جو ہر دَور اور ہر زمانے کی عکاسی کرتی ہے۔ اس میں ہندوستانی کی جنگِ آزادی اور بعد کی جدوجہد سے لے کر الجیریا افریقہ اور فلسطین کے عوام کی جدوجہد اور کشمکش کی تصویر صاف اُبھر کر آتی ہے۔ ایک تازہ پھول اور تازہ خوشبو۔

رات کی تلچھٹیں بھی ہیں اندھیرا بھی ہے
صبح کا کچھ کچھ اجالا بھی ہے

ہمدمو
ہاتھ میں ہاتھ دو
سوئے منزل چلو
منزلیں دار کی
کوئے دلدار کی منزلیں
دوش پر اپنی اپنی صلیبیں اٹھائے چلو

مخدوم کے بعد والے دَور میں لکھی گئی رومانی نظمیں رقص، بھاگ متی، آج کی رات نہ جا، جانِ غزل، سب ہی میں گہرائی ہے۔ نائیت ہے۔ وہ سرگوشی کی رات ہو یا لب و رخسار کی رات یا رات پھولوں کی۔ سب میں ایک تنوّع ہے، تقدّس کا پیرہن ہے ڈاکٹر جگہ کنول کے روپ میں اُبھر کر آجاتا ہے۔

وہ چاندنی کی نرم نرم آنچ میں تپی ہوئی
سمندروں کے جھاگ سے بنی ہوئی جوانیاں
ہری ہری روش پہ ہم قدم بھی ہم کلام بھی
بدن مہک مہک کے چل

کمر لچک لچک کے چل
قدم بہک بہک کے چل

میری جانِ غزل
خوابِ فردا کی دیوار کی چھاؤں میں
دو گھڑی بیٹھ کر
عشرتِ حال کے مئے پئیں
راستے منتظر، گل بداماں ہے ہر رہ گزر
دل کی سنسان گلیوں میں کچھ دیر، کچھ دور تک

آج تو ساتھ چل
پیار سے آنکھ بھر آئی ہے کنول کھلتے ہیں
جب کبھی لب پہ ترا نام وفا آتا ہے

ایک زمانے میں مخدوم نشر گاہ حیدر آباد میں مترجم کی حیثیت سے کام کرتے تھے۔ ایک بار محاسب نے وقت پر تنخواہ مخدوم کو نہیں دی۔ نشر گاہ کے ساتھی دوستوں کو خوب گالی گلوج کی اور دوسرے روز ایک خط کے ذریعے معافی نامہ کچھ اس طرح لکھا گیا تھا ؎

تو نے کس دل کو دکھایا ہے تجھے کیا معلوم — کس صنم خانے کو ڈھایا ہے تجھے کیا معلوم
ہم نے ہنس ہنس کے تری بزم میں اے پیکرِ ناز — کتنی آہوں کو چھپایا ہے تجھے کیا معلوم

مخدوم نے لکھا ہے کہ شاعر اپنی ایک عمر میں کئی عمریں گزارتا ہے۔ سماج کے بدلنے کے ساتھ ساتھ انسانی جذبات اور احساسات بھی بدل جاتے ہیں مگر جبلتیں برقرار رہتی ہیں۔ شاعر اپنے گرد و پیش کے خارجی عالم اور دل کے اندر کی دنیا میں مسلسل کشمکش اور تضاد پاتا ہے۔ یہی تضاد تخلیق کی قوتِ محرکہ بن جاتا ہے۔ مخدوم نے نہ صرف اپنی شاعرانہ عمر میں کئی عمریں کاٹی ہیں بلکہ ایک ڈراما نگار، ایک اداکار، ہدایت کار، معلّم، مترجم، مزدور لیڈر، دوست، باپ اور شوہر کی منزلیں بھی طے کی ہیں۔

مخدوم سے حیدر آباد کے عوام کا دیوانہ وار پیار اس وقت بھی تھا جب وہ صرف شاعر تھا۔ پھر اشتراکی، انقلابی بنا اور اس وقت بھی رہا جب وہ ٹریڈ یونین کا ایک قد آور لیڈر بن گیا۔ مخدوم نے لکھا تھا ؎

پھر بُلا بھیجا ہے پھولوں نے گلستانوں سے — تم بھی آجاؤ کہ باتیں کریں پیمانوں سے

اس نے شکایت کی ؎

شہر میں ایک قیامت تھی قیامت نہ رہی — حشر خاموش ہوا فتنۂ دوراں چپ ہے
کوئی آتا ہی نہیں کوئی نگہ [illegible] نہیں — [illegible] جاؤ کہ کچھ رات کٹے

ں کی اسی خواہش اور چاہ کو پورا کرنے کے لیے ایک دن قیامت جگائی گئی۔ رات کاٹی اور موم بن جلنے کی تیاریاں
درآباد نے جشنِ مخدوم کا اہتمام کیا۔ چنبیلی کا منڈوا تیار کیا گیا پھر لڑکیوں کو دیکھ کر اپنے لش شرٹ کا کالر ٹھیک کرتے والے
یلی کے منڈوے تلے بٹھایا گیا پھر ۔

یک چنبیلی کے منڈوے تلے / میکدے سے ذرا دور
س موڑ پر / دو بدن / پیار کی آگ میں جل گئے

وہ رات بہت خوبصورت تھی ایک جشن تھا پیار کا، خلوص کا، عقیدت کا۔ لوگ کہتے تھے

رات آئی ہے بہت راتوں کے بعد آئی ہے
دیر سے دور سے آئی ہے مگر آئی ہے

اور حیدرآباد والوں نے دیکھا ۔

وہ جو چھپ جاتے تھے کعبوں میں صنم خانوں میں ان کو لا لا کے بٹھایا گیا دیوانوں میں

نہ صرف یہی ہوا بلکہ ۔

یاد کے چاند دل میں اترتے رہے چاندنی جگمگاتی رہی رات بھر

اور جب محفل تمام ہوئی تو ۔

بجا رہا تھا کہیں دور کوئی شہنائی اٹھا ہوں آنکھ میں اک خواب ناتمام لیے

پھر ایک دور ایسا بھی آیا کہ مسجدوں کے میناروں، مندروں کے کواڑوں اور میکدے کی دیواروں نے نہ صرف
یہ دیکھا بلکہ ہر ایک سے سوال کیا ۔

نہ کسی آہ کی آواز نہ زنجیر کا شور آج کیا ہو گیا زنداں میں کہ زنداں چپ ہے

میت کو جب دلی سے حیدرآباد لایا گیا تو ۲۶ اگست ۱۹۶۹ء کی صبح سے ہر راستہ حیدرآباد کے بیگم پیٹ ایئرپورٹ
رواں دواں تھا۔ لوگ مخدوم کو لینے جا رہے تھے۔ حیدرآباد والوں نے تو اس بات پر اعتبار کر ہی لیا تھا کہ زندگی میں جشن
چاہت کا اظہار کر لو، اس سے زندگی اور بڑھ جاتی ہے۔ پھر چاہنے اور چاہت کے اظہار میں کسی قسم کی کمی نہیں کی
مخدوم کیوں رخصت ہو گیا۔ کسی نے کہا، شاید مخدوم کو نظر لگ گئی جشنِ مخدوم کی۔ چنبیلی کے منڈوے کی۔ اس کے
الوں کی اور اس کو چاہے جانے پر بھی ۔

تیرے دیوانے تری چشم و نظر سے پہلے — دار سے گزرے تری راہ گزر سے پہلے
کون جانے کہ ہو کیا رنگِ سحر رنگِ چمن — میکدہ رقص میں ہے پچھلے پہر سے پہلے
بزم سے دور وہ گاتا رہا تنہا تنہا — سو گیا ساز پہ سر رکھ کے سحر سے پہلے

حبیب بینک کی ایک اور خدمت
Habib Bank Limited
حبیب بینک ویزا ٹریولر چیکس
TWENTY U.S. DOLLARS
Habib Bank Limited
SPECIMEN
$20
VISA
SPECIMEN
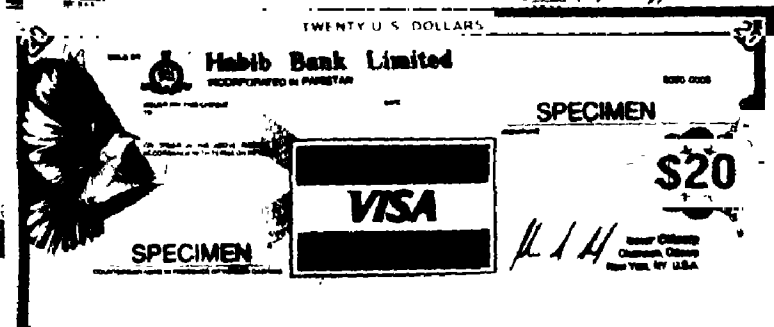
شاہ محی الحق فاروقی

مولانا سیفی ندوی

(دلِ دوستاں پر رہوں نقشِ دوام)

۴؍مارچ ۱۹۹۰ء کے ایک مقامی روزنامہ میں "محمد منصور خاں وسوگواران" کی جانب سے ایک مختصر سی اشتہاری اطلاع:

"یہ خبر تمام دینی وسیاسی حلقوں میں بڑے افسوس سے سنی جائے گی کہ مشہور و ممتاز عالمِ دین اور تحریکِ پاکستان کے نامور کارکن اور رفیقِ قائداعظم مولانا سیّد سیفی ندوی طویل علالت کے بعد بروز جمعہ ۲؍مارچ ۱۹۹۰ء انتقال فرما گئے۔ اِنّا للہِ وَاِنّا اِلَیہِ رَاجِعُونَ

مرحوم کی روح کو ایصالِ ثواب کے لیے مسجد آرام باغ میں بروز اتوار ۴؍مارچ ۱۹۹۰ء بعد نمازِ عصر قرآن خوانی و فاتحہ سوئم مقرر ہے۔"

اس اشتہاری اطلاع کے علاوہ میری نظر سے کسی اخبار میں مولانا سیفی ندوی کے انتقال کی کوئی معمولی سی خبر بھی نہ گزری۔ یہ انجام تھا اس شخص کا جس کے بیانات مختلف قومی و ملکی اور مذہبی معاملات پر ۱۹۵۰ء اور ۱۹۶۰ء کے عشروں میں کراچی کے اکثر اخبارات کی زینت بنتے رہتے تھے۔

ممکن ہے کہ مندرجہ بالا اشتہاری اطلاع میں مولانا کے لیے کوئی توصیفی لاحقہ عقیدت مندانہ مبالغہ پر مبنی ہو۔ اور تاریخی دستاویزات کی کسوٹی پر پورا نہ اترے لیکن اظہارِ عقیدت کے ضمن میں مدح وستائش کے ایسے کلمات بہت زیادہ قابلِ اعتراض بھی نہیں ہوتے۔ بہر حال اس میں کوئی شک نہیں کہ مولانا سیّد سیفی ندوی (اسلام الحقؒ) ایک مشہور اور ممتاز عالمِ دین اور تحریکِ پاکستان کے ایک نامور کارکن تھے۔

مولانا اس صدی کی ابتدا میں یوپی کے ضلع بلیا میں ایک مشہور قصبہ سکندرپور میں پیدا ہوئے۔ یہ وہی سکندرپور ہے جو مشہور صوفی شاعر حضرت آسی غازی پوری (صاحبِ عین المعارف) کا مولد تھا۔ مولانا سیفی ندوی نے ابتدائی تعلیم اپنے بزرگوں سے اور بطورِ خاص اپنے والد سے جو ایک صاحبِ علم انسان تھے، حاصل کی۔ اس کے بعد انھوں نے جون پور

میں مولانا شعیب فرنگی محلی مرحوم کے سامنے زانوئے تلمذ تہ کیا۔ مولانا شعیب کو علم منطق پر بڑا عبور حاصل تھا۔ مولانا سیفی نے ان سے پوری طرح استفادہ کیا، بلکہ صحیح معنوں میں ان کے مزاج کی اصل تشکیل یہیں ہوئی۔ ۱۹۲۰ء کے عشرہ میں انھوں نے مزید تعلیم ندوۃ العلما لکھنؤ میں حاصل کی۔

تعلیم سے فارغ ہو کر مولانا بمبئی گئے۔ عشرۂ ۱۹۲۰ء کے آخر میں علی برادران آل انڈیا نیشنل کانگریس سے برگشتہ اور علاحدہ ہو چکے تھے۔ ۱۹۳۱ء میں مولانا محمد علی کے انتقال کے بعد مولانا شوکت علی مرحوم کلیتاً مسلم لیگ کے ہو کر رہ گئے تھے غالباً یہی وہ دور تھا جب مولانا سیفی ندوی خلافت کمیٹی سے منسلک ہوئے اور روزنامہ "خلافت" بمبئی کے مدیر مقرر ہوئے۔ بدقسمتی سے مجھے صحیح سنہ یاد نہیں لیکن میں نے مولانا کے پاس روزنامہ خلافت کے ایسے شمارے دیکھے ہیں جن کی لوح پر ان کا نام بطور مدیر درج تھا۔ انھوں نے بمبئی میں کچھ وقت گزارا اور پھر یوپی واپس آگئے۔

یوپی میں مولانا سیفی ندوی نے صحافت اور مذہبی سیاست کا مشغلہ جاری رکھا۔ بہت دنوں تک ان کا مستقر اود کے ضلع فیض آباد میں رہا۔ یہاں "تاریخ" کے نام سے ایک ماہنامہ نکلتا تھا جس میں وہ مضامین لکھتے رہے۔ انہی دنوں اجودھیا کی بابری مسجد کے قضیے نے شدت اختیار کر رکھی تھی جس کے تدارک کے لیے مسلمانوں کی ایک انجمن قائم ہوئی جس کے روح رواں منشی فیاض علی مرحوم ایڈووکیٹ تھے جو بعد میں پاکستان کے ایڈووکیٹ جنرل (اب اٹارنی جنرل) رہے۔ اس انجمن نے "نصرت" کے نام سے ایک روزنامہ جاری کیا جو قضیہ ٹھنڈا پڑنے کے ساتھ ساتھ خود بھی ٹھنڈا ہوتا گیا اور روزنامہ سے ہفت روزہ ہو کر بند ہو گیا۔ مولانا سیفی ندوی "نصرت" کی ادارت میں شریک رہے اور اس حیثیت میں انھوں نے بابری مسجد کے لیے بھرپور قلمی جہاد کیا۔ ساتھ ساتھ ان کی تقریروں کا سلسلہ بھی جاری رہا۔

پاکستان کی تحریک اپنے عروج پر پہنچی تو مولانا سیفی ندوی نے بھی اپنی تقریر و تحریر کے ذریعے اسے تقویت بخشی۔ کانگریس کی حلیف جماعت جمعیۃ العلمائے ہند کے توڑ پر علامہ شبیر احمد عثمانی مرحوم کی صدارت میں جمعیۃ العلمائے اسلام قائم ہوئی تو کانگریس کے مخالف علما اس میں شریک ہو گئے۔ قارئین کو مولانا آزاد سبحانی یاد ہوں گے۔ کلکتہ میں عید کے سب سے بڑے اجتماع موروثی طور پر مولانا ابوالکلام آزاد مرحوم کرتے تھے۔ مولانا کے قوم پرستانہ رویّہ کو مسترد کرتے ہوئے کلکتہ کے مسلمانوں نے مولانا ابوالکلام آزاد کا مقاطعہ کیا اور الہلال و البلاغ کے مدیر کو عیدین کی امامت سے سبکدوش کر دیا۔ اس وقت اس فریضہ کی ادائیگی کے لیے مولانا آزاد سبحانی کا انتخاب عمل میں آیا جو جمعیۃ العلمائے اسلام کے ایک نمایاں رکن بن چکے تھے۔ مولانا آزاد سبحانی ایک ممتاز عالم دین کے علاوہ ایک شعلہ بیان خطیب بھی تھے۔ مولانا سیفی کے تعلقات مولانا آزاد سبحانی سے برادری کے تھے۔ بلکہ خود مولانا آزاد سبحانی کا تعلق بھی غالباً سکندر پور ہی سے تھا۔ مولانا آزاد سبحانی کی معیت میں مولانا سیفی ندوی جمعیۃ العلمائے اسلام کے لیے بڑا کام کیا۔ اس کے علاوہ وہ براہِ راست مسلم لیگ کے بھی ایک نمایاں کارکن تھے جہاں ان کی حیثیت اور مرتبہ کا مجھے بہت زیادہ علم نہیں۔ واقعات پر مولانا ظفر احمد انصاری اور مولانا حسن مثنیٰ ندوی غالباً زیادہ بہتر انداز میں روشنی ڈال سکتے ہیں۔

[illegible] اور یہاں بھی انھوں

جریدے کی ادارت کی۔ اسی دور میں انھیں علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں معارفِ اسلامیہ کے پروگرام میں تقریر کرنے کی دعوت دی گئی جہاں انھوں نے غالباً دو خطبے دیے جنھیں بہت سراہا گیا۔

پاکستان بنا تو مولانا سیفی ندوی کراچی آگئے۔ یہاں شروع شروع میں مختلف مذہبی جماعتوں میں ان کی بڑی آؤ بھگت ہوئی لیکن ان کا مزاج کچھ اس قسم کا تھا کہ وہ جہاں بھی رہتے 'بےہمہ و باہمہ' بن کر رہنا چاہتے تھے۔ مروّجہ مکاتبِ فکر میں کوئی مکتبِ فکر ایسا نہ تھا جس کے سرخیل علما کے ہر فیصلہ پر وہ آمنّا و صدقنا کہتے ہوں۔ ان علماے جو ۱۹۵۰ء اور ۱۹۶۰ء کے عشروں میں عوام کے لیے مرجعِ عقیدت بنے ہوتے تھے مولانا سیفی برابری کی بنیاد پر ملتے تھے اور ان کے بہت سے فیصلوں پر ان کے مواجہ میں تنقیدی گفتگو کرتے تھے۔ گروہی سیاست میں اس قسم کا رویّہ عموماً قابلِ قبول نہیں ہوتا۔ اس کا لازمی نتیجہ یہ ہوا کہ ان مخصوص محفلوں میں مولانا سیفی ندوی اپنی افتادِ طبع کی بنا پر ناپسندیدہ شخصیت (PERSONA NON GRATA) بنتے چلے گئے۔ دوسرے لفظوں میں یوں کہیے کہ وہ ایک فردِ دین کر رہ گئے۔

میرا تاثر یہ ہے کہ مولانا نے اس خاموش مقاطعہ کو بہت زیادہ اہمیت نہ دی۔ وہ اپنی زندگی، اپنی انفرادی صلاحیتوں کی بنیاد پر گزارنا چاہتے تھے 'تحسین باہمی' کی حکمتِ عملی ان کے مذہب میں روا نہ تھی۔ وہ ایک بہت اچھے مقرّر تھے۔ چنانچہ جن منتخب محفلوں میں وہ بلائے جاتے وہاں موضوع سے بھرپور انصاف کرتے اور اپنے استدلال طرزِ بیان سے اپنے سامعین کے دلوں پر اثرانداز ہوتے۔ روزمرہ کے قومی و تہذیبی مسائل پر اپنے خیالات اخباری بیانات کے ذریعے ظاہر کرنے کے علاوہ اپنے نظریات کی ترویج و اشاعت کے لیے وہ ایک زمانے تک "امام" کے نام سے کراچی سے ایک ماہنامہ نکالتے رہے۔ اس میں عموماً سیرتِ پاک کی روشنی میں بڑے پُرمغز مضامین شائع ہوئے۔ اس جریدہ کی ورق گردانی سے ہمیں اردو نثر و نظم کے بعض اچھے شہ پارے مل سکتے ہیں۔

مولانا سیفی ندوی ایک اچھے مقرر ہونے کے علاوہ ایک اچھے شاعر بھی تھے۔ انھوں نے بعض بہت عمدہ نعتیں اور غزلیں لکھیں کراچی کی ایک انجمن کے زیرِ اہتمام مخدوم سید اشرف جہانگیر سمنانی رحمۃ اللہ علیہ کے عرس کے موقعے پر کئی سال متواتر بڑی پُرمغز اور دل آویز تقریریں کیں۔ مخدوم کی مدح میں انھوں نے ایک معرکتہ الآرا نظم بھی لکھی جسے بے انتہا پسند کیا گیا۔

مولانا سیفی ندوی کی ذاتی زندگی تنہا تھی۔ غالباً ان کے کوئی اولاد نہ تھی۔ شادی ہوئی تھی لیکن اہلیہ ان کے ساتھ کراچی نہ آئیں اور ہندوستان ہی میں رہ گئیں۔ کراچی میں ان کے ایک چھوٹے بھائی ایک سرکاری کالج میں لکچرار تھے جو بہت دنوں بعد اپنے افرادِ خاندان کے ساتھ لندن منتقل ہوگئے اور وہیں سفرِ آخرت اختیار کی۔ یہ ایک المیہ تھا کہ کراچی میں بیس پچیس برس دونوں بھائی رہے لیکن مولانا اپنے چھوٹے بھائی سے ملنے کے روادار نہ تھے۔ ذاتی تعلقات کے باوجود اپنی افتادِ طبع کے پیشِ نظر میں نے اس موضوع پر کبھی ان سے گفتگو نہیں کی حالانکہ وہ راولپنڈی اور اسلام آباد میں کئی بار ہمارے یہاں مقیم رہے۔ انتقال سے چند ماہ پہلے ایک روز خود ہی کھل گئے۔ معلوم ہوا کہ ان کے چھوٹے بھائی کی تعلیم و تربیت میں مولانا نے بھرپور کردار ادا کیا تھا بدقسمتی سے وہ دہریت کی طرف مائل ہوگئے تھے۔ یہ تھا سبب قطع تعلق کا۔ جس وقت مولانا نے مجھے یہ بات بتائی تو ان کے لہجے میں بڑی دل سوزی تھی۔ تاہم اس گفتگو کے ایک

خوش گوار پہلو کے طور پر انھوں نے یہ بھی بتایا کہ لندن جانے کے بعد چھوٹے بھائی کے خیالات میں تبدیلی آئی اور دونوں بھائیوں میں کچھ خط و کتابت بھی ہوئی۔ اس کے بعد مولانا خود لندن گئے اور سات آٹھ مہینے وہاں رہے۔ بھائی کے بیوی بچے بھی ان سے بڑی محبّت اور احترام سے پیش آئے جس کا اثر ان پر آخری وقت تک طاری رہا۔ وہی افتادِ طبع کی ہے کہ ان بھائی کے علاوہ میں نے مولانا کی زبان سے ان کے کسی اور عزیز کا نام نہ سنا۔

کراچی میں جامع کلاتھ مارکیٹ کے عقب میں وہ ایک فلیٹ میں تنہا رہتے تھے۔ کبھی کبھار میں ان کے فلیٹ جاتا، کبھی وہ میری قیام گاہ پر آجاتے۔ یوں اکثر میری ان سے ملاقات سرِراہے یا بہت دنوں تک کتابوں کی ایا میں ہوتی رہی۔ صبح کو ناشتہ وغیرہ سے فارغ ہو کر غالباً "امام" کی انتظامی مصروفیات کے سلسلے میں کچھ تاجروں کے جایا کرتے تھے۔ اس کے علاوہ اگر انھوں نے کاروباری مفاد کا کوئی اور سلسلہ ان لوگوں سے رکھا ہو تو مجھے چنداں تعج نہ ہوگا۔ دوپہر کو فلیٹ پر واپس آتے۔ ظہر کی نماز پڑھ کر کچھ دیر آرام کرتے اور شام کو تقریباً تین بجے پیدل صدر کا چکّر لگاتے جہاں ایک مخصوص ہوٹل میں بیٹھ کر کچھ دیر اپنے احباب اور عقیدت مندوں سے خوش گپیاں کرتے اور پھ اپنے فلیٹ پر آجاتے۔

مولانا کی ایک خاص ادا ان کی سفید پوشی تھی۔ فلیٹ سے باہر نکلتے تو سر سے پیر تک سفید پوش ہوتے ایک ہاتھ کی چھڑی سفید نہ ہوتی ورنہ سفید فر کی جناح کیپ، سفید شیروانی، جس پر ایک بہت خوبصورت سفید زیبِ گلو ہوتی، سفید پاجامہ اور سفید ناگرہ جوتا مع سفید موزہ کے۔ کپڑوں کی صفائی اور سفیدی اور شکن شکنی کا بڑا خاص التزام کرتے۔ کھانے وغیرہ پکانے کا کوئی جھنجھٹ نہیں۔ فلیٹ کے سامنے ایک ہوٹل سے دونوں وقت کا اور ضرورت کے وقت چائے۔ بس کھڑکی پر کھڑے ہو کر آواز دینے کی ضرورت پڑتی تھی۔

فیلڈ مارشل ایوب خاں کے دورِ صدارت میں حکومت نے علما اور مشائخ کی ایک کانفرنس مری میں با جس میں مولانا سیفی ندوی بھی مدعو تھے۔ وہاں سے فارغ ہو کر میرے یہاں راولپنڈی میں مقیم رہے۔ نہ میں نے ا پوچھا اور نہ انھوں نے بتایا کہ کانفرنس میں کیا گزری۔ اس کے بعد بھی کئی بار ان کا آنا جانا رہا اور میرے ہی ساتھ راولپنڈی یا اسلام آباد میں ٹھہرتے رہے۔ ان کی ایک خصوصیت یہ تھی کہ وہ اپنے احباب اور ملنے والوں کے بچوں کے بھی پوری دل چسپی لیتے۔ سب کے نام اور تعلیمی مدارج معلوم کرتے اور خدا جانے کس طرح ان تمام کے نام یاد رکھتے کے بعد ملاقات ہوتی تو ایک ایک بچے کا نام لے لے کر اس کی خیر و عافیت دریافت کرتے اور ان کا یہ رویّہ میں نے کے ساتھ دیکھا۔ اچانک ملاقات ہوگئی، تپاک سے ملے اور ابتدائی بات چیت کے بعد نام لے لے کر اس کے ہر بچے کی خیریت معلوم کی۔ کسی ایسے شخص کے گھر جاتے جن کے بچوں کا تعارف ان سے پہلے سے ہوتا تو سب کو نام بنام سر پہ ہاتھ پھیرتے، ان کے مشاغل کے بارے میں ان سے سوال و جواب کرتے۔ بچوں کے معاملات میں دل چسپی کا نتیجہ تھا کہ جن گھروں میں ان کی آمد و رفت رہتی ان گھروں کے بچے بھی مولانا کے آنے پر کھل اٹھتے۔ اکثر وبیشتر چھوٹے بچوں کو ٹافیاں وغیرہ بھی دیتے۔

مولاناؒ کی طبیعت میں بڑی جولانی اور شگفتگی تھی۔ ایک بار وہ میرے یہاں اسلام آباد میں مقیم تھے۔ چھٹی کا دن تھا
م دونوں ڈرائنگ روم میں بیٹھے خوش گپیوں میں مصروف تھے۔ اچانک ایک سرحدی نوجوان پشاور سے میرے پاس
شریف لائے۔ ان کا ایک معاملا میرے دفتر میں زیرِ غور تھا۔ ایک حادثہ کی بنا پر ان کے پیر میں لنگ ہو گیا تھا اور وہ
بیساکھی کے سہارے یہ وقت چل رہے تھے۔ غالباً راولپنڈی صدر میں وہ پشاور کی بس سے اتر کر ایک ٹیکسی کے ذریعے میرے
گھر اسلام آباد آئے۔ گھنٹی بجی، میں باہر گیا۔ علیک سلیک اور ابتدائی تعارف کے بعد میں انھیں ڈرائنگ روم میں لایا
ان کے بیٹھنے کے چند لمحوں کے بعد ٹیکسی کا ڈرائیور اندر آیا اور ایک خاصا بڑا سردا اور ایک چھوٹا سا پیکٹ ان کی بغل
میں رکھ کر چلا گیا۔ میرے ذہن میں یہ بات تھی کہ غالباً انھوں نے ٹیکسی باہر روک رکھی ہوگی، لیکن جب وہ جانے لگے تو
معلوم ہوا کہ ایسا نہیں تھا بلکہ انھیں دوسری ٹیکسی لینی تھی جس کے لیے انھیں میرے گھر سے کوئی سو گز کے فاصلے پر سڑک
تک جانا تھا۔ ان سے کچھ دیر میری بات چیت ہوئی۔ میں نے چائے وغیرہ سے ان کی رسمی تواضع کی۔ جب وہ واپس جانے لگے
تو میں نے ان سے کہا۔ "آپ مجھ پر اتنی مہربانی اور کیجیے کہ یہ جو چیزیں آپ اپنے ساتھ لے آئے ہیں انھیں اپنے ساتھ ہی
واپس لیتے جائیے۔" انھوں نے کہا کہ "اس میں کوئی خاص چیز نہیں ہے۔ ایک یا دو غلاف تکیہ اور بچیوں کے لیے دو چوٹیاں
ہیں۔ اور یہ ہم لوگوں کا دستور ہے کہ جب ہم لوگ کسی سے ملنے پہلی بار جاتے ہیں تو خالی ہاتھ نہیں جاتے۔ آپ انھیں
واپس کر کے مجھے شرمندہ نہ کیجیے۔" میں نے ان سے کہا کہ "اس طرح کسی سے کوئی چیز قبول کرنا ہم لوگوں کے دستور کے
خلاف ہے لہٰذا آپ اصرار کر کے مجھے شرمندہ نہ کیجیے۔" کچھ دیر اصرار اور انکار کا یہ سلسلہ چلتا رہا۔ اچانک مولانا سیفی ندوی
نے گفتگو میں حصہ لیا اور مجھ سے مخاطب ہو کر کہا۔ "اگر تمھیں کوئی اعتراض نہ ہو تو میں بھی اپنی رائے دوں۔" میں نے کہا
"ضرور"۔ انھوں نے مجھ سے کہا "تم اسے رکھ لو میں بعد میں تم سے بات کروں گا۔" میں خاموش ہو گیا۔ چیزیں وہیں رہ گئیں۔
اور میں اس نوجوان کو سڑک تک رخصت کر آیا۔ جہاں اسے ٹیکسی مل گئی۔ ان کے جانے کے بعد مولانا نے مجھ سے کہا "اول
تو یہ بہت معمولی چیزیں ہیں اور جیسا کہ ان صاحب نے کہا کہ یہ ان کے معاشرے کا دستور ہے لہٰذا یہ اتنی زیادہ قابلِ اعتراض
بات نہیں ہے۔" پھر کچھ توقف کے بعد مولانا نے ہنستے ہوئے کہا۔ "سب سے بڑی بات یہ ہے جس کا تم نے احساس نہیں کیا۔
وہ اپنی جسمانی معذوری کی وجہ سے وہ بے چارہ خود ہی صحیح طریقے سے چل نہیں سکتا اب تم اس کی پیٹھ پر پانچ کلو کا سردا
رکھ دیتے تو وہ اسے کس طرح اٹھا کر لے جاتا۔ بس یہی ہو تا کہ وہ تمہارے دروازے پر پھینک جاتا۔ تمھیں اس بیچارے
پر ترس بھی نہیں آیا۔" مولانا کی اس دلیل کا میرے پاس کوئی جواب نہ تھا سوائے اس کے کہ میں بھی ان کے ساتھ ہنسی میں
شریک ہو گیا۔ پھر انھوں نے اسی شگفتگی کے ساتھ کہا کہ "اسے گھر میں بھیجو۔ کٹوا کر منگواؤ۔ پہلے میں کھاؤں گا پھر تم کھاؤ
اس طرح یہ پاک ہو جائے گا۔"

مولانا کی عمر اسّی سال سے کچھ اوپر ہی ہو گی۔ لیکن ان کی صحت بہت اچھی تھی۔ آج سے کوئی سال سوا سال پہلے صدر
کے علاقے میں ایک کھلے ہوئے گٹر میں ان کا پیر آ گیا جس سے ان کی ہڈی بری طرح متاثر ہوئی۔ بہت دنوں تک ادھر

سکتا رہا اپنی استطاعت کے مطابق انھیں کچھ معمولی سہولتیں بھی فراہم کرتا رہا۔ لیکن بے پناہ خواہش کے باوجود میں انھیں یہ رائے نہ دے سکا کہ وہ کسی معقول اسپتال میں داخل ہو کر اپنا علاج کرائیں۔ اس رائے کے نہ دینے کا ایک سبب تو میری وہی افتادِ طبع کہ میں دوسروں کے معاملات میں کم سے کم دخل اندازی کروں اور دوسری اہم بات یہ تھی کہ زندگی کے اس مرحلہ پر میں مولانا کی مالی حیثیت سے کماحقہٗ واقف نہ تھا۔ اسپتال میں داخل ہونے کا مطلب ایک صرفِ کثیر تھا۔ یہ رائے میں انھیں اسی وقت دے سکتا تھا اگر بصورتِ دیگر یہ ذمہ داری بھی میں اٹھا سکتا۔ بہرحال اسی طرح لشتم پشتم علاج ہوتا رہا۔ مرض بگڑتا گیا اور آخر ایک روز وہ ایک اسپتال میں داخل ہو گئے۔ وقتاً فوقتاً وہ تین چار اسپتالوں میں منتقل ہوتے رہے۔ دو ایک آپریشن بھی ہوئے لیکن مرض اس نہج پر پہنچ چکا تھا کہ ان کی حالت روز بروز سقیم سے سقیم تر ہوتی گئی اس دور میں ان کے ایک پڑوسی محمد منصور خاں نے جن کی جانب سے انتقال اور سوئم کا اشتہار چھپا ہے، خدمت اور تیمارداری کا حق ادا کر دیا۔ ایک اور "معمولی" انسان جو پیشہ کے اعتبار سے حجام ہیں، اپنا گھر بار چھوڑ کر رات دن مولانا کی خدمت کرتے رہے۔ غالباً مولانا سے ان کا تعلق ارادت کا تھا۔ منصور صاحب ہی کی زبانی مجھے معلوم ہوا کہ اسپتالوں میں مولانا کے علاج کے سلسلے میں کثیر اخراجات کراچی کے ایک مشہور صاحبِ ثروت نے برداشت کیے جو خود بھی مولانا کے قدر دانوں میں تھے۔ تاہم یہ وہ سوال ہے جو ہر دوسرے تیسرے دن اسپتال میں مولانا سے ملنے کے باوجود خود ان سے نہ کر سکا۔ بہرحال جس نے جو کچھ کیا اللہ تعالیٰ اس کو اس کا اجر دے۔ مولانا تو ۱۲ مارچ کو رخصت ہو گئے اور بعد نماز جمعہ ڈیفنس ہاؤسنگ سوسائٹی کی مسجد مصطفےٰ میں ان کی نمازِ جنازہ ہوئی اور وہیں گِذری کے قبرستان میں وہ قیامت تک کے لیے لیٹ گئے۔

میں مولانا کے کسی عزیز سے نہ ملا لیکن ان کے چند پڑوسیوں سے ضرور ملتا رہتا تھا اور ان کی آنکھوں میں مولانا کے لیے محبت اور احترام کے جو جذبات میں نے دیکھے اس سے ان کے بارے میں مری خوش گمانیوں میں بڑا اضافہ ہوا ——— مولانا کو احباب نے بھلا دیا۔ ان کے ہم عصروں، دوستوں اور مستقل ملنے جلنے والوں نے اپنی مصروفیات کی بنا پر انھیں نظر انداز کر دیا کیونکہ ان میں سے کوئی مجھے ان کے سرہانے کسی دن نظر نہ آیا۔ بہرحال دنیا یہی ہے ——— لیکن میرا ایمان ہے کہ جو لوگ ان سے بے لوث "دوستی" کی بنا پر ملتے رہے ان کی یادوں میں مولانا ہمیشہ زندہ رہیں گے جس کی پیش گوئی وہ خود اپنے ایک مقطع میں کر گئے ہیں ؎

بھلایا نہ جاؤں گا سیفیؔ کبھی
دلِ دوستاں پر ہوں نقشِ دوام

گل ہائے رنگ رنگ

سندھی کہانی

شیخ ایاز / غلام مصطفےٰ آفاق

شرابی

وہ پیتا تھا تو جیتا تھا ورنہ اس کی زندگی موت کی مانند خاموش تھی۔ زندگی! اس نے بارہا سوچا تھا کہ آدمی کی پیدائش کا مقصد کیا ہے؟ کیا صرف اسی لیے کہ مصائب، امراض اور موت کا شکار بنے۔ آدمی کو چھوڑیے، یہ کائنات ہی کیوں وجود میں آئی؟ کیا یہ پھول اسی لیے ظہور میں آتے ہیں کہ کھل کر مرجھا جائیں؟ یہ روز و شب، یہ برق و برسات، یہ چاند ستارے، یہ ساری چمک دمک۔ آخر یہ سارا کھڑاگ کس لیے ہے؟ کیا اسی لیے کہ دن کی روشنی رات کے اندھیرے میں تحلیل ہوجائے، چاند کو گرہن لگ جائے، ستارے ٹوٹ کر گم نام اندھیاروں میں کھوجائیں؟

سوچتے سوچتے وہ شراب کا جام بھرتا اور اسے بلند کرتے ہوئے کہتا "اس کے نام جس نے یہ دنیا تخلیق کی ہے۔" اس کے بعد وہ جام ہونٹوں سے لگالیتا اور کہتا "شراب نوشی بری ہے! مگر اس سے زیادہ یہ دنیا بری ہے، یہ نفرت، حسد، لالچ، اور خواہشوں کی دنیا۔ بدصورت اور بے ترتیب دنیا!" شراب اس کے بدن میں عجیب سا جوش بھر دیتی تھی۔ وہ اٹھ کر گھومتا، گاتا اور چٹکیاں بجاتا۔

وہ ہوش میں ہوتا تو اس کو شاعروں سے نفرت ہوتی تھی۔ جو الفاظ کی بازی گری میں عمر گنوا کر بے پرکی اڑائیں ان سے محبت کیسے ہوتی! شاعر، خود فریبی میں مبتلا مداری۔ مگر جب وہ پینے لگتا تو اسے نغمہ میں بے حد لطف آتا۔ اس کے رگ و پے رونئیں رونئیں میں راگ کی لہریں دوڑ جاتیں، انگ انگ بحر اور وزن پر جھومنے لگتا۔

ہوش مندی کے لمحوں میں اسے مصوروں سے بھی نفرت تھی۔ وہ آخر کیا رکھا ہے شفق کے رنگ میں۔ ہسپتال میں نرس نمونیہ کے مریضوں کی چھاتی پر جو سنہری پلستر لگاتی ہے اس سے شفق کا رنگ کس بنا پر فوقیت رکھتا ہے۔ کس لیے یہ بے وقوف کلاکار گھنٹوں آسمان کی وسعتوں میں کھو کر، کاغذ پہ رنگ تھوپ کر اپنے احساسات نقش کرتے ہیں؟ مگر جب وہ شراب کی چسکی لگاتا تو اس کا جی چاہتا کہ ساحلِ سمندر پہ جاکر دوڑنا شروع کردے، سورج کے آخری رنگوں کی جھلک چھین لے۔ لہروں کی جوانی اور مستی لوٹ لے۔ جھومے لہرائے اور ناچنا شروع کردے۔

وہ کہتا کہ دنیا کے سارے بڑے لوگ احمق ہیں۔ عام انسان ان سے محنت کرواکر ان کے کام کی تعریف کر دیتے

ہیں ۔ کتنے ذہین ہیں یہ عام انسان ۔ خود کبھی بھی ایسے کام نہیں کریں گے بلکہ دوسروں کے کام پر تعریفی کلمات نچھاور کر رہیں گے تاکہ وہ ساری عمر ان کے لیے گھلتے رہیں ۔ سیاست دان ، گیانی ، شاعر ، کلاکار ، یہ سارے احمق ہیں ۔ عام انسانوں تعریفی کلمات کی بنا پر انھیں کاٹھ کا الو بنا رکھا ہے ۔ وہ عقلمند تھا ۔ چنانچہ اس نے کبھی بھی بڑا آدمی بننے کی تمنا نہیں کی کرتا بھی تو آخر کس لیے ؟ خواب اور حقیقت میں فرق ہی کتنا ہے ۔ شراب کی مدہوشی میں وہ خود کو دنیا کا سب سے بڑا آدمی سمجھتا تھا ۔ کوئی بھی کام کیے بغیر بڑا آدمی ۔ دنیا کا پہلا ذہین بڑا آدمی ! جب خمار اترجاتا تو اسے اپنی حالت پر ذرہ بھر افسوس نہ ہوتا ۔ زندگی تو ایک خمار ہے ، یہ بڑائی بھی تو خمار کی ایک لہر ہے ۔ موت کے بعد تو کوئی بھی بڑا آدمی نہیں رہ انسانی بدن مادے کا بنا ہوا ہے اور مادے ہی میں مل جائے گا ۔ پھر یہ کیسے معلوم ہو سکے گا کہ مادے کا فلاں جز میرے بدن کی تعمیر میں صرف ہوا اور فلاں جز کسی بڑے آدمی کے بدن میں صرف ہوا ۔

وہ پیتا تھا اور جیتا تھا ۔ ہوش میں اسے عورتوں سے بھی شدید نفرت تھی ۔ آخر کیا رکھا ہے عورت کی چھاتی پر دو چربیلے ڈھیلے دیکھ کر مرد الو بن جاتے ہیں ۔ عورت جو بے وقوفی ، بکواس اور بیہودگی کا نمونہ ہے ، گھڑی بھر میں ذہین سے ذہین مرد کا سر بھی اپنے آگے جھکا دیتی ہے ۔ اس نے زندگی میں ایک بار عشق کیا تھا ۔

وہ گرمیوں کے دن تھے ، جب اس کی محبوبہ کو دوپہر میں نیند آگئی تھی ۔ ویسے تو وہ اسے بہت خوبصورت لگ تھی ۔ پتلے ہونٹ ، بادامی آنکھیں جن میں لگا ہوا کاجل تو اسے آپے سے باہر کر دیتا تھا ۔ مگر اس روز وہ بے خبر سو پڑی تھی ۔ اس کا منھ قدرے کھلا ہوا تھا جس پر مکھیاں بھنبھنا رہی تھیں ، آنکھوں کے گوشوں میں جمی ہوئی میل دکھا دے رہی تھی ۔ بغلوں سے پسینہ بہہ کر اس کی چولی کو خراب کر رہا تھا ۔ اس کے احساسِ حسن کو یہ سب کچھ دیکھ کر اتنا دھچ لگا کہ پھر کبھی بھی کسی عورت سے محبت نہ کر سکا ۔ مگر جب وہ نشے میں دھت ہوتا تو سیدھا کسی ویشیا کے کوٹھے کا رخ کرتا ، جس کے ناز و انداز ، ہار سنگار اسے اتنا بھاتے کہ اس کے پاس جو بھی رقم ہوتی وہ اس پر نچھاور کر دیتا ۔

وہ کہتا تھا ، زندگی مجھے فریب دے رہی ہے اور میں زندگی کو فریب دے رہا ہوں ۔ کل ، گزر چکی ہے ۔ آنے کل ، ابھی آئی نہیں ، شراب پی کر میں اس " ابھی " کے وجود کو مٹا سکا تو ساری زندگی کے ڈھونگ کو مٹا دیا ۔ قدرت پورے نظام کو شکست دے دی ۔ وہ کہتا تھا کہ وہ ہرگز شریف انسان نہیں ہے جس نے زندگی میں کبھی بھی خودکشی خیال نہ کیا ہو وہ خود شراب پی کر روزانہ آج کی زندگی کا خاتمہ کرتا تھا ۔

وہ کہتا تھا .... اب مزید کیا بتاؤں آپ کو ، مختصراً یہ کہ وہ بہت کچھ کہتا تھا ۔ اور جو کچھ کہتا تھا ویسے کرتا تھا ۔ کوئی بھی کام کاج نہیں تھا ۔ اس کا باپ جو تھوڑی بہت جائیداد چھوڑ گیا تھا اسی کی برائے نام آمدنی آتی تھی جسے وہ شراب خریداری میں صرف کر دیتا تھا ۔ پڑوسی اسے گالیاں دیتے تھے ، وہ پڑوسیوں کو گالیاں دیتا تھا ۔ زندگی اسے دھکا دیتی تھی وہ زندگی کو دھکا دیتا تھا ۔

ہر شخص اپنی محدود دنیا کا مرکز ہے جیسا بھی لولا لنگڑا ہو ، بدصورت ہو مگر اپنے جیون کے ناٹک کا ہیرو ہے ، اس کی چھوٹی سی دنیا میں کچھ بھی نہیں تھا شراب کی بوتل کے سوا ۔ شراب اس کے جگر ، جان اور معدے میں درس

چکی تھی۔ زندگی میں جو خلا تھا اسے وہ شراب سے پُر کرتا تھا۔ وہ تپائی پر ٹانگیں پھیلا کر سگریٹ سلگاتا اور اس کے دھوئیں میں ساری دنیا کو لپیٹتا ہوا محسوس کرتا۔ ایک روز وہ اسی طرح سگریٹ کے کش لگا رہا تھا اور اپنی بے معنی زندگی کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ سوچنے سے اسے شدید نفرت تھی۔ مگر جس قدر وہ سوچنے سے کتراتا تھا اتنا ہی زیادہ وہ سوچتا چلا جاتا تھا۔ اس کا خیال تھا کہ انسان ایک حقیر جرثومہ ہے۔ جانور، جسے کوئی سوجھ بوجھ نہیں ہوتی، مقابلتاً اس سے کئی گنا زیادہ افضل ہے۔

میاؤں...... میاؤں..... اچانک اس نے تپائی کے نیچے بلی کا ایک چھوٹا سا بچہ دیکھا۔ اس نے ہاتھ بڑھا کر اسے اٹھالیا اور تپائی پر بٹھا دیا۔ وہ جب بھی شراب پی کر گوشت ڈبل روٹی کھاتا تو بلی کا بچہ تپائی کے نیچے آکر میاؤں، میاؤں کیا کرتا مگر اس نے کبھی بھی اسے قابلِ توجہ نہ سمجھا۔ جیسے وہ گھڑیال کی ٹک ٹک کا عادی ہو چکا تھا۔ ویسے ہی یہ میاؤں میاؤں بھی اس کے خیالات میں دخل اندازی نہ کر پائی تھی۔ آج اس کا دھیان اچانک اس کی طرف مبذول ہو گیا اور وہ اسے تپائی پر بٹھا کر ہاتھ پھیرنے لگا اور ڈبل روٹی گوشت کے شوربے میں ڈبو کر اسے کھلانے لگا۔ اسے اس چھوٹے سے بلی کے بچے کی پشت پر ہاتھ پھیرتے ہوئے ایسی مسرت محسوس ہو رہی تھی جو اس سے قبل اسے کبھی نہیں ملی تھی۔

اب وہ روزانہ بلی کے بچے کو گوشت کھلانے لگا۔ بچے کے دودھ کے لیے ایک کٹورہ بھی الگ کر کے رکھ دیا تھا۔ جب بھی اسے ہوش آتا تو وہ بچے کے ساتھ کھیلنا شروع کر دیتا۔ وہ دو تین گیندیں بھی لے آیا تھا جو وہ بچے کے آگے رکھ دیتا اور اسے گیندوں پر اپنے چھوٹے چھوٹے نرم گدیلے پیر ٹکائے ہوئے دیکھا کرتا۔ اس وقت وہ دنیا کا بے معنی وجود، سماج کی بیہودگی اور انسانی کمینگی سب کچھ بھول جاتا تھا۔ اس وقت اسے اپنے دل میں نفرت کے کڑوے جذبے کی جگہ میٹھا میٹھا سا لطف محسوس ہونے لگتا۔ اس نے بلی کے بچے کی گردن میں گھنگھرو باندھ دیئے تھے جس کی چھم چھم میں اسے اتنا مزہ آتا کہ اس کی روح تک وجد میں آجاتی تھی۔

اب وہ جیتا تھا اور پیتا تھا۔ اس کی زندگی کا دارومدار شراب پر نہیں تھا۔ زندگی کے خلا کو دو چیزیں بھر رہی تھیں۔ شراب کی بوتل اور بلی کا بچہ۔ وہ ننھا خوبصورت سا بچہ اس کی زندگی کو معنی بخش رہا تھا۔ وہ پہلے سے زیادہ ہوش میں رہنے لگا تھا اور سارا وقت اس بے زبان جانور کے ساتھ گزارنے لگا۔ رفتہ رفتہ وہ شراب کی مقدار گھٹاتا چلا گیا۔ اب بوتل، چار جام، دو جام، ایک جام ـــ اس طرح اس نے اپنی عادت پر قابو پا لیا۔ اب اسے شعر، کلا، حسن، محبت اور دوستی سے بھی دلچسپی ہونے لگی۔ اس نے پہلی دوستی مجھ سے کی۔

ایک رات اس کی شکر ختم ہو گئی۔ وہ بلی کے بچے کو پھیکا دودھ پلانے پر خود کو قائل نہ کر سکا تو میرے دروازے پر آکر دستک دی۔ میری بیوی نے دروازہ کھولا اور اسے دیکھ تعجب میں پڑ گئی ــ اور مجھے آکر بتایا کہ وہ منحوس اس وقت نے کیسے آیا ہے؟ جب تک میں باہر نکلتا، وہ اندر گھس آیا اور کہا" معاف کیجیے، مجھے تھوڑی سی شکر چاہیے"

مجھے اس کے حلیہ پر تعجب بھی ہوتا تھا اور ہنسی بھی آتی تھی۔ مگر اس کی باتیں سن کر اس سے ہمدردی ہوتی تھی۔ میں نے اسے شکر دیتے ہوئے کہا۔

" اور بھی کچھ چاہیے ؟ "

"نہیں، شکریہ۔ مجھے اپنا تو خیال نہیں مگر اس معصوم جانور کو پھیکا دودھ پلانے پر دل مائل نہ ہو سکا تو آپ کے پاس آگیا۔ زحمت دینے کی معافی چاہتا ہوں"

مجھے یہ بات ایسی عجیب محسوس ہوئی کہ میں اس کا دوست بن گیا۔ وہ کافی سنبھل گیا تھا۔ زندگی کو سنوارنے کے بارے میں سوچتا۔ انسانوں سے نفرت بھی نہیں کرتا تھا مگر مجھے اس کی بلی کے بچّے کے ساتھ اتنی محبّت ایک آنکھ نہ بھائی۔ میں چاہتا تھا کہ وہ ایک مکمل انسان بن جائے اور یہ پاگل پنے کی حرکتیں چھوڑ دے۔

اس روز وہ میرے پاس آیا، کہنے لگا۔

"یار! بوتل تپائی پر رکھ کر آرہا ہوں، بس آخری جام بچا ہوا ہے۔ آج میں وہ آخری جام پی کر بوتل توڑ کے پھینک دوں گا اور پھر کبھی بھی شراب کو ہاتھ تک نہیں لگاؤں گا۔ تم میرے ساتھ چلو تاکہ میں تمہارے سامنے عہد کروں"

میں فوراً ہی اس کے ساتھ چل پڑا۔ ہم اندر داخل ہوئے ہی تھے کہ اس کے منھ سے چیخ نکل گئی۔ وہ فرش کو دیکھ رہا تھا بوتل فرش پر ٹکڑے ٹکڑے ہو کر پڑی تھی، بلّی کا بچہ لہو لہان ہو کر تڑپ رہا تھا۔ بلّی کے بچّے نے شاید تپائی کو ہلا دیا تھا اور بوتل گر پڑی تھی اور وہ خود کرچیوں سے زخمی ہو گیا تھا۔ اس نے بلی کے بچّے کو اٹھایا اور جیب سے رومال نکال کر خون پونچھنے لگا۔ دو تین روز اس نے بلی کے بچّے کی مرہم پٹّی کی مگر زخم دن بدن بڑھ کر خراب ہوتے چلے گئے۔ تین روز کے بعد وہ بچہ مر گیا۔ اس کے سارے بدن پر بھی زخم تھے اور آنکھوں سے گرتے ہوئے آنسو انگوری شراب کی مانند لگ رہے تھے۔

گل ہائے رنگ رنگ

مراٹھی کہانی

ڈی۔ وی۔ شرواڈکر کُسماگرج / یاور امان

بُدھ کا مجسّمہ

آخر شری راجندر کو انسانوں کی بستی نظر آ ہی گئی۔ اس سنسان، گھنے اور تاریک جنگل میں مدھم روشنی میں جلتا ہوا چراغ دیکھ کر زندگی کی امید عود کر آئی۔

اس سنسان جنگل میں راستہ تلاش کرتے ہوئے اسے اپنی زندگی کا اختتام نظر آنے لگا تھا۔ فوج کے ہر سپاہی کو کسی بھی لمحے موت کو قبول کرنے کے لیے تیار رہنا پڑتا ہے، مگر موت کو اتنے قریب دیکھ کر وہ گھبرا گیا تھا۔ آنکھوں کے سامنے سارے رشتہ داروں کے چہرے نظر آنے لگے تھے ــــ اور اس کا چھوٹا سا خاندان بھی تصوّر میں ابھر آیا تھا جسے وہ دُور دیس چھوڑ کر آیا تھا۔ اس دنیا کا سکھ چین اور حسن اس کی روح کو بے قرار کرنے لگا، بیوی کی میٹھی آواز کانوں میں گونجنے لگی، اور بچّوں کے ننھے کومل ہاتھ گلے میں جھولنے لگے۔ واپسی کے بعد سکھ اور اطمینان کی یہ زندگی وہ جینے والا تھا، اور یہی منظر اس کی نظروں کے آگے گھومنے لگا تو اس نے جینے کا مصمم ارادہ کر لیا۔

اور قدموں کے سہارے نہیں بلکہ اسی ارادے اور عزمِ صمیم کے سہارے وہ آگے چل پڑا۔ لباس تار تار ہو چکا تھا پاؤں زخمی ہو رہے تھے جنھیں اپنے ہی کپڑے پھاڑ کر باندھنے کی ناکام کوشش کی تھی اس نے۔ زخموں کے رسنے کا احساس اسے اب بھی ہو رہا تھا اور بھوک اور پیاس کی وجہ سے وہ نڈھال ہو رہا تھا۔

چھاؤنی کی سرحد جانے کہاں چھوٹ گئی تھی۔ سرحد کے پرے پرایا ملک، وہاں کا گھنا جنگل اور اُوپر سے کالی سیاہ رات۔ کہاں جا رہے ہیں، کتنی مسافت طے کر چکے ہیں کچھ پتا نہیں۔ وہ جانتا تھا کہ زندگی کے حصول کے لیے اسے موت کی راہ سے گزرنا ہے ــــ کم سے کم کوشش تو کرنی ہے۔

اس کی جیب میں ایک چھوٹی سی سنگِ مرمر کی مورتی تھی۔ گوتم بُدھ کا چھوٹا سا مجسمہ۔ ہمارے دیوتاؤں میں گوتم بدھؑ شامل ہیں یا نہیں، وہ صریحاً نہیں جانتا تھا لیکن اس وقت دیوتا جیسے نظر آنے والے کسی بھی مجسمے کو وہ دیوتا ماننے کے لیے تیار تھا۔ اس کے ذہن میں یہ سوال اٹھتا کہ جس شخص کے گلے سے اس نے مجسمہ بے رحمی سے کھینچا تھا اسے اس نے کیا دیا؟ اس کی حفاظت بھی نہیں کی۔

راجندر کے ہتھیار سے وہ زخمی ہوا ـــــ اس کے مرنے کے بعد راجندر کو معلوم ہوا کہ وہ شخص دشمنوں کا آدمی نہیں تھا ـــــ وہ صرف چرواہا تھا ـــــ ایک نہتّا چرواہا۔ راجندر بہت رنجیدہ ہوا تھا۔ پچھتایا بھی لیکن اپنی ہی زندگی کے لیے موت کا بیوپار کرنے والا سپاہی کتنی دیر پچھتاوے کی آگ میں جلتا؟ اس نے اس کے گلے سے وہ خوبصورت مجسّمہ کھینچا اور بندوق کندھے پر رکھ کر آگے بڑھ گیا۔ ایشور کے روپ والا مجسّمہ جو اس چرواہے کی حفاظت نہیں کر سکا، کیا وہ مجھے زندگی کی بھیک دے گا؟ کچھ کہتے نہیں بنتا۔

دور جھاڑیوں میں ٹمٹماتے چراغ کو دیکھ کر اس کا اعتماد بحال ہونے لگا۔ میلوں کی مسافت طے کرتے ہوئے انسانوں کی دنیا میں پہنچنے کی آس کبھی کی ٹوٹ چکی تھی مگر اب بستی کی دھندلی روشنی نے اس کے اعتماد اور عقیدے کی روشنی کو پھر سے اُجال دیا تھا۔ تبھی اس نے سوچا، یہ بستی دوست کی ہے یا دشمن کی؟ اس خوف کے ساتھ ہی انسان کی ذات کو دوست اور دشمن کے خانوں میں تقسیم کرنے والی لڑائی پر اسے گھن آنے لگی۔ لیکن تالیفِ کائنات میں تو دشمن نام کی ذات نہیں ـــــ وہ بھی تو انسان ہے۔

روشنی کی سمت بڑھتے ہوئے اسے ایک پگڈنڈی نظر آئی۔ اسی پگڈنڈی پر چلتے ہوئے وہ روشنی والے گھر کے دروازے پر جا کھڑا ہوا۔ گھر کی خستہ حالی عیاں تھی، باہر کا دروازہ کھلا تھا لیکن اس کا دل ہر طرح کے اندیشوں سے بھرا ہوا تھا۔ سامنے کمرے میں ایک چراغ جل رہا تھا ـــ کمرے میں کوئی بھی نہیں تھا۔ کونے میں ایک ٹوٹی ہوئی کھٹیا تھی۔ آس پاس کچھ کپڑے، گھر میں استعمال ہونے والی چیزیں اور ایک کونے میں کلہاڑی، ہنسوا اور دوسرے اوزار پڑے تھے۔

راجندر نے اس ملک کی زبان سیکھی تھی۔ تھوڑی بہت بول بھی لیتا تھا۔ اس نے آواز دی۔ "کوئی ہے؟"

دالان سے ایک بوڑھا آیا اور راجندر کی عجیب و غریب حالت کو دیکھا۔ وہ بوڑھا ضرور تھا مگر ہٹا کٹا اور طویل القامت تھا۔ پھر کونے میں رکھی ہوئی کلہاڑی اُٹھا کر وہ باہر آیا۔

"کون ہے؟ ..... کیا چاہیے تمہیں؟"

"جی ..... میں فوجی ہوں ..... ایک سپاہی۔"

"سپاہی؟، یہاں کیوں آئے ہو؟ لڑائی کرنے؟"

"مرکز سے بھٹک گیا ہوں ..... آسرا ڈھونڈ رہا ہوں۔ بھوک اور پیاس کی وجہ سے روح حلق تک آگئی ہے ـــ رات بھر کے لیے آسرا دیں گے تو بڑی مہربانی ہوگی۔"

"لیکن یہ سب سچ ہے ناں؟" بوڑھے نے شک کا اظہار کیا۔

"بھگوان قسم ..... سب سچ ہے۔"

"تو پھر آؤ۔" بوڑھے نے کلہاڑی پھر اسی جگہ پر رکھ دی۔

"آجاؤ ..... گھر تمہارا ہی ہے۔"

بوڑھے نے کھٹیا پہ دری بچھا دی۔ پھر راجندر سے بولا۔ "بیٹھو ....."

"کھانا تیار ہے۔ ہے تو غریب کی دال روٹی۔ اسی کو پکوان سمجھ کر کھا لینا۔"

تبھی اندر سے ایک زنانہ آواز نے پوچھا۔

"بیٹا آگیا ہے کیا؟"

"نہیں، ابھی نہیں آیا۔" بوڑھے نے کہا۔ "لیکن ایک مہمان ہیں۔"

"مہمان؟"

"ہاں، وہ کھانا کھائیں گے۔"

یہ سن کر عورت ایک دم باورچی خانے سے باہر آئی اور بے وقت آٹپکنے والے مہمان کو غور سے دیکھنے لگی۔

راجندر نے کہا۔ "معاف کیجیے۔ ۔ ۔ ۔ بے وقت آکر آپ کو تکلیف دے رہا ہوں۔"

"تکلیف کس بات کی۔" بوڑھے نے کراری آواز میں کہا۔ "ہمارا تو یہی عقیدہ ہے کہ مہمان کی شکل میں بھگوان ہی سامنے آتا ہے۔" اور پھر اپنی بیوی کی طرف مڑتے ہوئے اس نے کہا۔ "کھانا نکال دیا ہے ناں۔"

"نکال تو دیا ہے، لیکن وہ تو بیٹے کے لیے نکالا تھا۔" عورت نے کہا۔

"جیسے وہ بیٹا ہے اسی طرح یہ بھی ہے۔ ۔ ۔ ۔ اس کے آنے پر میں خود بناؤں گا کھانا اس کے لیے۔ ۔ ۔ جا کھانا لے کر آ۔"

عورت چپ چاپ اندر چلی گئی۔ راجندر بڑی شرمندگی محسوس کر رہا تھا۔ اس نے کہا۔

"میں نہیں چاہتا کہ میری وجہ سے آپ کو تکلیف ہو۔ مجھے صرف پانی دے دیں۔"

"صرف پانی کے لیے انسان کے گھر کی کیا ضرورت؟ پانی تو جھرنوں سے، ندی نالوں سے، کہیں بھی مل جاتا ہے۔ نہیں بھائی نہیں۔۔۔ یہاں صرف پانی نہیں ملے گا۔"

اور تبھی بوڑھے کا دھیان راجندر کے زخموں پر گیا۔ چراغ کی مدھم روشنی میں زخموں سے رستا ہوا خون اس نے دیکھا تو ایک دم اٹھا اور تقریباً چیخ پڑا۔ "تم زخمی ہو؟"

"جی!"

"پہلے کیوں نہیں بتایا؟"

بوڑھا اٹھا اور اندر گیا۔ پانی لے آیا۔ سامان میں سے دواؤں کا بٹوا نکالا۔ ایک باریک اور صاف کپڑے کی پٹیاں بنائیں۔ راجندر کو باہر لے گیا، اس کے زخموں کو دھویا اور مرہم پٹی کی۔ دونوں اندر گئے تو راجندر کے سامنے کھانے کی تھالی آگئی۔

کھاتے وقت راجندر نے برتنوں اور دوسرے سامان وغیرہ پر ایک طائرانہ نگاہ ڈالی۔ چھوٹے موٹے کام اور مزدوری محنت کر کے زندگی گزارنے والا خاندان لگ رہا تھا۔ اس جنگلی علاقے میں جگہ جگہ پر جھونپڑی نما گھر بنا کر اور بھی کئی خاندان ایسے تھے۔ جنگ کی دہشت سے کئی خاندان گھر چھوڑ کر محفوظ مقام پر آباد ہو گئے تھے۔ جنگلی جانوروں کا شکار کر کے یا ادھر ادھر محنت مزدوری کر کے اپنی زندگی گزارتے تھے۔ ایسی حالت میں گھر میں زیادہ سامان کیسے ہو سکتا ہے؟ میں نے تو

پیٹ بھر کھانا کھالیا۔ لیکن رات کو دیر سے لوٹنے والا بیٹا تو بھوکا ہی رہے گا۔ راجندر نے کھانے کے بعد سوچا۔

اس نے کھانا تذبذب میں گھرے ہوئے ہی کھایا تھا۔ لیکن کھانا کیا ملا جیسے جان ہی مل گئی۔ اس کا دل ہی نہیں بلکہ اس احساس، اس کا شعور بھی ممنونیت اور تشکر کے جذبے سے بھر آیا۔

وہ بوڑھے سے بولا۔ "زندگی کی آخری سانس تک آپ کا یہ احسان قرض کی صورت، میرے سر پہ رہے گا۔ آپ، سہارے نے مجھے نئی زندگی بخشی ہے ..... آپ نے تو اپنے بیٹے کا کھانا ہی میرے سامنے رکھ دیا۔"

"اس لیے کہ اب تم میرے بیٹے جیسے بن گئے ہو۔" بوڑھے نے کہا۔ "وہ بھی اگر ہوتا تو اس نے بھی یہی کیا ہوتا۔ لیکن بیٹا کیا بات ہے۔ اتنی رات ہو گئی وہ ابھی تک نہیں آیا۔ اتنی دیر تو وہ کبھی نہیں کرتا تھا اسی کے واسطے دروازے کے پاس چراغ جلا کر ہم اس کا انتظار کر رہے تھے۔ اکلوتا بیٹا ہے۔ ویسے فکر کی بات نہیں تھی اگر اس پار لڑائی نہ ہو رہی ہوتی۔ بڑا ڈر لگ رہا ہے۔ اس سے ہمارا تعلق نہ رہتے ہوئے بھی خطرناک جنگلوں میں رہنے والے ہم۔"

"بھگوان کرے آپ کا بیٹا صحیح سلامت لوٹے۔" راجندر نے کہا۔

تبھی اس نے جیب ٹٹولی۔ مبادا کوئی سگریٹ بچا ہوا ہو۔ لیکن اس کے ہاتھ نے سنگ مرمر کے اس چھوٹے سے مجسمے کا محسوس کیا۔ اور ایک خیال اس کے ذہن میں کوندگیا۔ ممنونیت کے اظہار کے لیے اگر یہ مجسمہ بوڑھے بابا کو دیدیں تو؟ اس کی جیب میں زیادہ پیسے نہیں تھے۔ پھر یہ بھی ممکن تھا بوڑھا پیسے ٹھکرا سکتا تھا۔ شاید یہ مجسمہ قبول کر لے اور اس ملک کے بدھ کی پرستش کرنے والے ....

"میں آپ کے احسانوں کا بدلہ چکا نہیں سکتا لیکن محبت کا ایک نذرانہ ..... خلوص کی نشانی دینا چاہتا ہو

"تحفہ قیمتی تو نہیں ہے؟"

"قیمتی ہے لیکن بازار سے نہیں خریدا گیا۔ آپ کو ضرور پسند آئے گا۔"

"کیا ہے؟"

"بدھ کا ایک مجسمہ۔"

"بدھ کا؟" بوڑھا رغبت بھرے لہجے میں بولا

"آپ کو پسند آئے گا۔"

"میں انکار نہیں کر سکتا۔" بوڑھا بولا۔ "جب ایشور خود ہی چل کر آئے ہیں تو انکار کیسے کر سکتا ہوں؟ میرے پاس بھی ایک خوبصورت مجسمہ ہے۔"

"اتنا خوبصورت نہیں ہوگا۔" راجندر بولا۔ پھر اپنی جیب سے وہ مجسمہ نکالا اور بوڑھے کے سامنے رکھ دیا۔ ایک دم اٹھا اور آنکھیں پھاڑ کر اسے دیکھنے لگا۔

"بالکل ایسا ہی ہے وہ۔ نہیں نہیں، یہی ہے وہ، یہی ہے۔"

"سچ مچ؟" راجندر بڑبڑایا۔ اور دوسرے ہی لمحہ اس کے کلیجے پہ ایک بہت بھاری پتھر آگیا۔ بوڑھے نے مجسمہ

اور بڑے غور سے اسے دیکھنے لگا ـــــ بولا

"میرے بیٹے کا ہے یہ مجسمہ۔ میں نے خود خریدا تھا شہر جا کر۔ کہاں ملا یہ تمہیں؟"

راجندر بُت بنا بیٹھا تھا، کیا بولے، سوچ رہا تھا۔ میرے ہاتھوں کتنا بڑا گناہ ہوا ہے۔ اور اس گناہ کی، اس خوفناک باپ کی یہ سزا؟ یہ مہمانی۔ ... یہ زندگی کی تیرات؟ آج تک کسی جرم کی اتنی بھیانک سزا کسی کو نہیں ملی تھی۔

وہ سوچنے لگا۔ "کیوں نہ جھوٹ بولوں ... اور اس مصیبت سے نجات پاؤں ... اور بوڑھے کو کیا خبر... اس کی اس بات کو وہ سچ ہی سمجھے گا۔ مگر دوسرے ہی پل اسے اپنے آپ سے نفرت سی ہونے لگی ـــــ اس انسان سے جھوٹ بولو گے؟ باپ کی شفقت کے ساتھ زخم دھونے والے، کھانا کھلا کر زندگی بخشنے والے اس انسان سے جھوٹ بولو گے؟ اسے دھوکا دو گے؟ جھوٹ اور فریب کے کئی لمحے زندگی میں آتے ہیں۔ یہ ایک معمولی اور عام سی بات ہے۔ لیکن زندگی میں ایمان داری کے، خلوص کے لمحات آتے ہیں تو ہمارا جھوٹ، ہمارا فریب بے نقاب ہو جاتا ہے۔ اگر ایسا نہیں ہوتا تو کیا انسان اپنے انسان ہونے کا دعویٰ کر سکتا؟"

"کہاں ملا یہ تمہیں؟" بوڑھے نے پھر پوچھا۔

"ایک لڑکے کے گلے میں تھا۔"

"میرا ہی تو بیٹا ہے وہ۔ کہاں ہے وہ؟"

"اب کیسے بتاؤں آپ کو......"

"کہاں ہے وہ..." بوڑھے نے غمزدہ لہجے میں دریافت کیا۔

"وہ، وہ، وہ...... زندہ نہیں ہے اب۔" ساری ہمت مجتمع کر کے راجندر نے جواب دیا۔

"زندہ نہیں ہے؟" بوڑھا اب زور سے چیخا۔ "سچ کہتے ہو۔"

"جی... جی، جی، ہاں۔"

"کس نے کس نے مارا اُسے؟" بوڑھے کی روح کا سارا درد، کرب اور تڑپ ایک ایک لفظ میں نمایاں تھا۔

"اُس حرامزادے کا ٹھور ٹھکانہ بتاؤ۔ ابھی اسی وقت کلہاڑی لے کر جاتا ہوں اور اس کے ٹکڑے ٹکڑے کرتا ہوں۔"

"وہ..... وہ حرامزادہ آپ کے سامنے بیٹھا ہے۔"

"تم!"

بوڑھا جیسے ایک خونخوار جانور بن گیا اور راجندر کی طرف بڑھا۔

"کوئی بھی سزا دیجیے، میں بھگتنے کے لیے تیار ہوں۔"

یہ سُن کر بوڑھا ایک پل رکا۔ اس کی ساری طاقت جیسے جاتی رہی، ایک دم بیٹھ گیا اور خود کلامی کے انداز میں بڑبڑایا۔

"خدا کی مرضی۔ میں تمہیں سزا نہیں دے سکتا۔ تم میرے مہمان ہو۔ تمہیں آسرا دیا ہے میں نے.... میرے بیٹے کی تھالی میں کھانا کھایا ہے تم نے۔" یہ کہتے ہوئے اس کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگا۔ اور آواز بھر آگئی۔

کچھ دیر بعد ... بولا۔ "لیکن ـــــ لیکن کیوں مارا تم نے اسے۔ کیا کیا تھا اس نے۔"

"غلطی سے مارا ۔ ۔ ۔ ۔ میں بھٹک گیا تھا۔ علاقہ دشمن کا، اور شام کی ملگجی روشنی میں مجھے لگا کہ یہ سپاہی ہی ہے۔ پھر میں نے اس پر گولی داغ دی۔"

"کہاں پر ہوا یہ ؟"

"یہاں سے تقریباً تین میل پر۔"

"مجھے جانا ہوگا۔"

"میں چلتا ہوں آپ کے ساتھ۔"

"نہیں، تم نہیں جاؤ گے۔ اور دوسری التجا یہ ہے کہ میں نے رات بھر کے لیے آسرا دیا تھا ۔ ۔ ۔ مگر تم نہ ہوگا۔ میں اپنے دل کو قابو میں نہیں رکھ سکوں گا۔ اور پھر بیٹے کی ماں جان لے گی تو معلوم نہیں وہ کیا کر بیٹھے۔"

"اکیلا نہیں جاؤں گا ۔ ۔ ۔ بستی والوں کو ساتھ لے کر جاؤں گا۔"

راجندر، بوڑھے کا یہ روپ یہ کیفیت دیکھ کر دنگ رہ گیا۔ اس کا دل ایسا بھر آیا کہ آگے بڑھ کر وہ ا پیروں پر گر گیا۔

"معافی ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ بابا ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ معاف کیجیے۔"

"معاف کرنے والا وہ ہے۔" زمین پر پڑے بدھ کے مجسمے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بوڑھے نے کہا۔

"جاؤ ــــ تمہارا بھلا ہو۔"

راجندر چل پڑا ــــ کافی دور نکل جانے کے بعد اس نے مڑ کر پیچھے دیکھا ــــ بوڑھا ہاتھ میں مشعل لیے ا میں چل پڑا تھا۔

نیل کنٹھ مہاجن / معین الدین عثمانی

سورج

میں نے اگر تم سے اس طرح کہا کہ
سورج کو سرکاری ہسپتال میں داخل کرایا گیا ہے
صبح سویرے نرس مصروف ہے اس کی تیمار داری میں
چاند بھی مایوس ہے ویٹنگ روم میں
بادلوں کو سمجھنا مشکل ہے
پرندے بھی درختوں سے بلک رہے ہیں
راہگیروں کو بس ایک ہی فکر لاحق ہے
سورج کو کچھ ہو گیا تو ______ ؟
آنگن آنگن عورتیں ماتم کناں ہیں
کہیں بھی کوئی نظم نہیں
کل رات ہی تاریکی سے سورج کی
ہو گئی تھی جھڑپ اس لیے
کرنا پڑا اسے ڈاکٹروں کے حوالے
کل اگر سورج اپنے کام پر آتا ہے
اس کا چہرہ چھپا ہوگا ابر کی پٹیوں سے
وہ لنگڑاتے ہوئے تمہارے در پر آئے گا کبھی
بھکاری سمجھ کر دھتکار دیئے گا مت

پلینر ڈاکٹر

کبھی کبھی لفظوں کو پکڑنے میں مصرعہ بھی چھوٹ جاتا ہے
اور اس کا چہرہ بھی یاد نہیں رہتا
دماغ میں بادلوں کے ساتھ
خیالات کی بھگدڑ شروع ہو جاتی۔
گھر میں ہوتے ہوئے بھی ہم آسمان میں پھرتے رہتے
جنگل جھاڑی وادی میں چرند پرند کے ہمراہ
ندی نالوں میں
سارے رستے سمٹ آتے ہیں دماغ میں
ہم گھر میں ہوتے ہیں مگر
مصرعہ کا پتا نہیں چلتا
بعد میں آس پاس دیکھو تو
محسوس ہوتا ہے ہم نفسیاتی دواخانے میں داخل ہیں
مریضوں کی بھیڑ میں
لگتا ہے ہر ایک کا مصرعہ چھوٹ گیا ہے۔
ڈاکٹر انجکشن گولیوں سے
اپنے آپ میں ہمیں ڈھکیلتے ہیں
پلینر ڈاکٹر وہ گم شدہ مصرعہ
کسی کیپسول میں دے دو

(تبصرے کے لیے دو جلدوں کا آنا ضروری ہے)

۔ ایک وارث کی سرگزشت ــــــــــ مصنف: کریم بخش خالد
صفحات: ۴۳۰ ـ قیمت: ۱۰۰ روپے

۱۔ آثار و افکار ــــــــــ مصنف: کریم بخش خالد
صفحات: ۳۸۴ ـ قیمت

پتا: پندرہویں صدی ہجری مطبوعات فلیٹ نمبر ۴/۱، بلاک سی جیکب لائنس
ہاؤسنگ کمپلیکس ـ کراچی، ۷۴۴۰۰

کریم بخش خالد صاحب حکومتِ سندھ کے ڈائرکٹر جنرل (تعلقاتِ عامہ) کی حیثیت سے ریٹائر ہوئے۔ سندھی ان کی مادری زبان ہے لیکن اردو میں بھی ان کی تحریروں کی پختگی اور سلاست کسی طور کم نہیں ہے۔ سندھی، اردو اور انگریزی میں انھوں نے متعدد کتابیں تصنیف کی ہیں جن میں سے بعض پر انھیں حکومتِ پاکستان سمیت مختلف اداروں کی جانب سے نقد انعامات، توصیفی اسناد اور طلائی تمغے وغیرہ ملے ہیں۔

زیرِ تبصرہ پہلی کتاب خالد صاحب کے ان مقالات پر مشتمل ہے جو انھوں نے مختلف کتابوں کی تعارفی تقاریب میں وقتاً فوقتاً پیش کیے۔ ان کا انداز بڑا برجستہ اور براہِ راست ہے اور طرزِ تحریر بڑا شگفتہ اور دل کش۔ وہ روایتی انداز کی ستائشی تقریروں کے قائل نہیں اور نہ اپنے خیالات کے اظہار میں کسی قسم کی رو رعایت سے کام لیتے ہیں۔ اسی لیے یہ مقالات عموماً بڑے فکر انگیز نکات پر مشتمل ہیں۔

دوسری کتاب کے بیشتر مضامین پاکستان اور سندھ کی تاریخ اور ثقافت سے متعلق ہیں۔ خالد صاحب کی سب سے بڑی صفت اسلام اور پاکستان سے ان کی دوستی ہے اور اس کسوٹی پر وہ تمام چیزوں کو پرکھتے ہیں۔ مشفق خواجہ کے الفاظ میں "پاکستان ان (خالد صاحب) کے لیے محض ایک جغرافیائی حد بندی کا نام نہیں بلکہ ایک اسلوبِ حیات ہے۔ ان کی رگوں میں دوڑنے والا خون، ان کے ذہن میں آنے والے خیالات، ان کی زبان سے نکلنے والے الفاظ اور ان کے قلم سے ٹپکنے والی روشنائی ـــ یہ سب ان کے پاکستانی ہونے کی اس طرح گواہی دیتے کہ ان کی شخصیت ایک مثالی پاکستانی کی شخصیت

ظاہر ...

جو لوگ فکر انگیز، معلومات آفریں اور دل چسپ مضامین پڑھنا چاہتے ہیں انھیں خالد صاحب کی دونوں کتابیں پڑھنے کا مشورہ دیتے ہیں۔

کاغذ، کتابت اور طباعت بہت عمدہ ہے۔ جلد نفیس اور گرد پوش مضبوط اور دل کش ہیں۔

(ابنِ منیر)

شارحینِ غالب کا تنقیدی مطالعہ ـــــ مصنف: ڈاکٹر محمد ایوب شاہد

جلد اوّل، دوم صفحات: ۷۶۰ ۔ قیمت: جلد اوّل ۱۲۵ روپے، جلد دوم ۹۰ روپے

پتا۔ مغربی پاکستان اردو اکیڈمی، لاہور

شارحینِ غالب کا تنقیدی مطالعہ" جیسا کہ نام سے ظاہر ہے۔ ایک محنت طلب کام تھا۔ پہلے غالب کے تمام شارحین معلومات یکجا کرنا، پھر ان کی تصنیفات تک رسائی حاصل کرنا اور بعد ازاں مطالعہ کے دوران جو ذہن میں تنقیدی رو بننی یا جو ناقدانہ گرہ پیدا ہوتی ہے، اس کو کاغذ پر منتقل کرتے جانا کہ مبادا اس کا سرا ہاتھ سے چھوٹ نہ جائے، یقینی ایک صبر آزما محنت طلب کام تھا۔ اس راہ میں ڈاکٹر صاحب پر ایسے مقام بھی آئے جب مرزا غالب کے کسی شعر کے قریبی یا حقیقی مفاہیم تک رسائی کے لیے مختلف شروح کے تقابلی مطالعے سے گزرنا پڑا ہوگا۔ ایک تو غالب کا شعر معنی کے اعتبار سے تہہ دار اور بعض اوقات نہایت سنجیدہ۔ اس پر مستزاد، شعر کے باطن تک پہنچنے کے لیے شارحین کے خیالات کی اپنے اپنے انداز سے اڑان کو نگاہ میں رکھ کر اختلافی نکات پر بحث کرنا اور اپنی ایک رائے قائم کرنا بہرحال ایک مشکل امر تھا۔ یہ دوگونہ عذاب کے مترادف تھا۔ لیکن خوشی اس بات کی ہے کہ ڈاکٹر ایوب شاہد اس عذاب کو ہنسی خوشی جھیل گئے۔ اور اس مہم سے بامراد لوٹے۔ اگر آپ کتاب مذکور سے سرسری گزر جائیں تو اور بات ہے لیکن ذرا رک کر اس کے مندرجات پر غور کریں اور پھر اس کے متون کا مطالعہ کریں تو اس منفرد کام اور اس کے لیے اس کے مصنف کی دقت طلبی اور پائے استقامت کی داد دینی پڑے گی۔

"مشکلاتِ کلامِ غالب"، اور دوسرے مندرجات کے مطالعے سے یہ بات بھی پایۂ ثبوت کو پہنچتی ہے کہ ڈاکٹر شاہد نے اس سفر میں تلاشِ بسیار کو اپنا موٹو بنایا ہے۔ اور ایسا کرتے ہوئے ذہن کا دروازہ ہر طرف سے کھلا رکھا ہے۔ اور کھلے دل و دماغ کے ساتھ تلاش و تفتیش کا کام جاری رکھا ہے۔ لکیر پیٹنے کی روایت سے حتی الامکان بچنے کی کوشش کی ہے۔

"شارحینِ غالب کا تنقیدی مطالعہ" کی اہمیت غالب کے باب میں یوں بڑھ جاتی ہے کہ یہ شرح غالب کے ساتھ ساتھ شارحینِ غالب کے اذہان کو پڑھنے کے مواقع فراہم کرتی ہے۔

مغربی پاکستان اکیڈمی اس کتاب کو چھاپنے کے لیے مبارک باد کی مستحق ہے۔ غالبیات کے ضمن میں ایک اہم اضافہ ہے

(و۔ س)

مولانا محمد علی جوہر ـ حیات اور تعلیمی نظریات ـــ مؤلفہ: ثناء الحق صدیقی ایم۔ اے (علیگ)

مولانا محمد علی جوہر کا نام آتے ہی برِ صغیر کی تحریکِ خلافت کی یاد ذہن میں تازہ ہونے لگتی ہے اور پھر یادوں کا ایک تسلسل قائم ہو جاتا ہے۔

بولیں اماں محمد علی کی جان بیٹا خلافت پہ دے دو

خالق دینا ہال کراچی میں تید فرہنگ کے دوران محمد علی اور شوکت علی پر مقدمہ چلایا جانا۔

ان کی ادارت میں شائع ہونے والا مشہور انگریزی اخبار "کامریڈ" اور اردو اخبار "ہمدرد"۔

ان کے ہاتھوں جامعہ ملیہ اسلامیہ کا قیام۔

ملتِ اسلامیہ اور برِ صغیر کی تحریکِ آزادی کے سلسلے میں مولانا محمد علی کی خدمات کا کوئی ایک حوالہ ہو تو انسان اس پر روشنی ڈالنے کی ہمت کرے، بے شمار حوالے ہیں اور سب ایک سے ایک اہم۔ اور ہر ایک حوالے پر بات کرنے کے لیے خاطر خواہ علم درکار ہے۔ مولانا کی سیاسی زندگی پر گفتگو مقصود ہو تو سیاسی بصیرت مطلوب ہے۔ ان کی شاعرانہ حیثیت پر نگاہ ڈالنے کے لیے ایک خاص ناقدانہ نظر کی ضرورت ہے، ان کی اسلامیانِ عالم سے ہمدردی اور برِ صغیر کی جدوجہدِ آزادی میں ان کے کردار پر بات کرنے کے لیے عالمانہ نگاہ اور دل گداز چاہیے۔ ظاہر ہے ایسی شخصیت کا ذکر خیر کوئی ایسا ہی جامع کمالات کر سکتا تھا۔ کتاب مذکور کے مؤلف ثناء الحق صدیقی صاحب بلاشبہ اس معیار پر پورے اترتے ہیں۔ اس کا کھلے دل سے اعتراف مشہور محقق پروفیسر محمد ایوب قادری (مرحوم) نے اپنے تعارفی نوٹ میں کیا ہے۔

جناب ثناء الحق کی تصنیفی و تالیفی سرگرمیاں بے شمار ہیں۔ ان کی تنقیدی تصنیف "میر و سودا کا دور"، لین پول کی مشہور کتاب "مورس ان اسپین"، کا ترجمہ، ان کا اپنے پرنانا مولانا شیخ محمد تھانوی کے فارسی رسالے "وحدت الوجود والشہود" پر ایک تفصیلی مقدمہ، شرح رباعیات خواجہ باقی باللہ اور حضرت مجدد الف ثانیؒ، شیخ عبدالحق محدث دہلویؒ کی فارسی کتاب "مرج البحرین"، کو اردو کا جامہ پہنانا ان کے جامع کمالات ہونے کا ثبوت فراہم کرتے ہیں۔

مختصر یہ کہ زیرِ بحث کتاب مولانا محمد علی جوہر پر ایک مبسوط تصنیف کا درجہ رکھتی ہے۔ پورے استناد کے ساتھ مولانا سے متعلق تمام باتیں یکجا کر دی گئی ہیں۔ ان کے تعلیمی نظریات سے بھی تفصیل کے ساتھ بحث کی گئی ہے

(ا۔س)

گلِ صد برگ

ترتیب و تالیف: سوزوکی تاکیسی، ترجمہ: محمد رئیس علوی

صفحات: ۲۵۶ ۔ قیمت: ۸۰۰ ین

پتا: دائدو لائف فاؤنڈیشن، اوساکا ۔ جاپان

محمد رئیس علوی کی ٹوکیو یونیورسٹی آف فارن اسٹڈیز میں تقرری اردو ادب کے حق میں نیک فال ثابت ہوئی۔ جاپان میں وہ صرف تدریس کے کام سے لگے نہیں رہے بلکہ جاپانی زبان کے پڑھنے کا سلسلہ بھی جاری رکھا اور اس زبان پر اس حد تک قابو پا لیا کہ جاپان کے کلاسیکی ادب تک ان کی رسائی آسان ہو گئی۔ چنانچہ انھوں نے تراجم کی شکل میں اردو ادب کو دو کتابیں ... ایک کتاب ... جاپانی شاعر سیئی گیو کی ایک سو ایک تنکا نظموں کا ترجمہ ہے جو اب سے پہلے منظرِ عام پر

آ چکی ہے اور دوسری زیرِ بحث کتاب "گلِ صد برگ" ہے جو جاپان کے قدیم شعری مجموعے "منیوشو" میں شامل تنکاؤں کا ترجمہ ہے۔ اس کا زمانہ چوتھی صدی عیسوی سے آٹھویں صدی عیسوی تک کا ہے۔ چند مثالیں ملاحظہ ہوں:

(۱)

میرے شوہر اب کہاں ہوں گے
سفر میں
سب کی نظروں سے چھپے
مثلِ نہالِ زیرِ آب
کوہِ نابارِی کو کرتے ہوں گے پار
(نا گیما لو ما ہیتو مارو لومے)

(۲)

مسافر
رات
میدانِ آکی میں کیسے سوئیں گے
کہ یادیں عمرِ رفتہ کی ستائیں گی
تو روئیں گے
(کاکی نو موتو نو ھیتو مارو)

گلِ صد برگ میں یہ اور ایسی بے شمار تنکائیں موجود ہیں جو پڑھنے سے تعلق رکھتی ہیں۔ غیر ملکی ادب کے تراجم اس لیے بھی پڑھنے چاہئیں کہ ان سے ہماری رسائی ان کی تاریخی، تہذیبی اور ثقافتی زندگی تک ہوتی ہے۔ جاپانی شاعری کی صنف ہائیکو ہو یا تنکا، بہ حیثیتِ مجموعی اس کی اساس جمالیات اور خوش آہنگی اور ترنم ریزی پر ہے۔ مختصر یہ کہ "گلِ صد برگ" کی شرکت اردو ادب میں تازہ ہوا کے جھونکے کی مانند ہے۔

(ا۔ س)

میرزا ادیب کے جائزے ——— مصنف: میرزا ادیب

صفحات: ۲۶۸۔ قیمت: ۶۰ روپے

پتا: مغربی پاکستان اردو اکیڈمی، لاہور

اس کتاب میں مختلف اوقات میں میرزا ادیب کے لکھے ہوئے بہر نوع جائزوں کو یکجا کر دیا گیا ہے جن میں کچھ علامہ اقبال کے شخصی اور فکری ارتقا پر روشنی ڈالتے اور اقبال فہمی میں مدد کرتے ہیں۔ کچھ کا تعلق "اردو اور قومی یک جہتی" سے ہے، کچھ تعارفی نوعیت کے ہیں جن سے مقتدرہ قومی زبان کی سرگرمیوں کو سمجھنے میں مدد ملتی ہے اور کچھ "علمی سرمایہ" کے زمرے میں آتے ہیں کہ ان میں علمی مباحث ہیں۔

اس کتاب میں ایک عنوان "ڈراما" کا بھی قائم کیا گیا ہے۔ اس عنوان کے تحت پانچ جائزے ہیں۔ یہاں میرزا ادیب کا اشہبِ قلم خاصا رواں ہو گیا ہے۔ دراصل میرزا صاحب عمر بھر اس دشت کی سیاحی کرتے رہے ہیں۔ ڈراما ان کا خاص الخاص موضوع ہے۔ بلکہ اگر یہ کہا جائے کہ ڈراما نگاری کے فن کی آبیاری میں میرزا صاحب کا نام نمایاں ترین ہے تو غلط نہ ہوگا۔ ایک آدھ ڈراما تو ذائقہ بدلنے کے لیے کسی نے بھی لکھا ہوگا لیکن جہاں تک میری معلومات کا تعلق ہے تسلسل اور وابستگی کے ساتھ ادبی ڈراما لکھنے والوں میں میرزا ادیب کا نام تا حال یکہ و تنہا ہے۔

ندہ نظمیں، ظہیر کاشمیری کا "آدمی نامہ" اور دوسرے بہت سے شعری مجموعے زیر بحث آتے ہیں۔ "دیگر اصناف"
ں ڈاکٹر سید عبداللہ اور ڈاکٹر وحید قریشی کے مقالات کا جائزہ لیا گیا ہے۔
ڈاکٹر وحید قریشی جس ادارے سے منسلک ہوتے ہیں وہاں کتابوں کی طباعت میں سُرعت پیدا ہو جاتی ہے۔ ان کے
سے تصنیف، تالیف و ترتیب کا کام تیز ہو جاتا ہے۔ میرزا ادیب کے جائزوں کی یکجائی اس کی ایک مثال ہے۔ یہ
ں نسل کے لیے بڑا سود مند ہوگا جس کے افراد کل کلاں کو میرزا ادیب کے ادبی کام کا اجمالی جائزہ لینا چاہیں گے۔
کتاب خوب صورت چھپی ہے۔ موحد کے موقلم نے اسے دلکش بنا دیا ہے۔

(ا-س)

ب کے انشائیے ـــــــ مصنف: سلیم آغا قزلباش

صفحات: ۱۲۵۔ قیمت: ۵۰ روپے

پتا: مکتبہ فکر و خیال ۲، اسٹیج بلاک اقبال ٹاؤن، لاہور

اردو ادب میں انشائیہ اب باضابطہ ایک صنف کی حیثیت اختیار کر چکا ہے۔ اس کے متعلق بجا طور پر یہ کہا جا سکتا ہے کہ وہ
نے قدم جمایا اور چھا تا چلا گیا۔ نتیجتاً کم عرصے میں انشائیوں کا ایک اچھا بڑا ذخیرہ جمع ہو گیا جس کی وجہ سے اس موضوع پر
ری کی گنجائش نکل آئی اور ڈاکٹر بشیر سیفی نے یہ کارِ خیر انجام بھی دے دیا۔
اس وقت ہم جس انشائیے کی بات کر رہے ہیں اس کی پرداخت میں سب سے نمایاں نام وزیر آغا کا ہے۔ لیکن نام لیے بغیر کام کے
نہیں رکھتا چنانچہ اس اعتبار سے بھی ڈاکٹر صاحب کی اہمیت مسلّم ہے۔ ڈاکٹر صاحب اردو ادب کو انشائیوں کے کئی اچھے مجموعے
ے ہیں۔ ان کے معاصرین میں انور سدید، نظیر صدیقی، جمیل آذر، مشکور حسین یاد اور مشتاق قمر (مرحوم) کی خدمات بھی قابلِ لحاظ و
ہیں۔ بعد کی نسل میں اس جانب لکھنے والوں کا ایک کارواں چل پڑا ہے۔ سب کے نام گنوانے کی یہاں گنجائش نہیں۔ ان کی خدمات
انے کے قابل ہیں۔ انھیں میں ایک معتبر نام سلیم آغا قزلباش کا ہے۔
سلیم آغا قزلباش نے انشائیے لکھنے کے ساتھ ساتھ مغرب میں لکھے گئے انشائیوں کے اعلیٰ نمونوں کے ترجمہ کرنے کا فرض بھی
یا ہے۔ ان کی زیرِ نظر کتاب "مغرب کے انشائیے"، اسی سلسلے کی کڑی ہے۔ اس میں یورپ کے مشہور انشائیہ نگار رابرٹ لنڈ،
سٹرٹن، جی بی پریسلے، آلڈس ہکسلے، پیکوائر، چارلس لیمب، ہنری تھورو اور جان رسکن کے انشائیے شامل کیے گئے ہیں۔
اردو انشائیہ نگاروں کو آئینہ دکھانے کے مترادف ہے۔ ہمارے انشائیہ نگار اس کے روبرو کھڑے ہو کر اپنے انشائیوں
قامت کا اندازہ کر سکتے ہیں۔ اس سے ان کے لیے سیکھنے سکھانے کی راہ نکل سکتی ہے اور وہ اپنے تجربات کو نئی سمت میں
نے اور اسے نئے تناظر عطا کرنے کے عمل سے بھی گزر سکتے ہیں۔ ظاہر ہے اس کا لازمی نتیجہ اردو انشائیہ نگاری کے
پھیلاؤ ہی ہو سکتا ہے
سلیم آغا کی یہ مساعی ستائش کے قابل ہیں اور انشائیے کے باب میں قطب نما کی حیثیت رکھتی ہیں۔
(ع۔ س۔ ا)

گردوپیش

نیشنل بُک کونسل کی جانب سے کتابوں کی نمائش

قراردادِ پاکستان کی پچاس سالہ تقریبات کو شایانِ شان طور پر منانے کے لیے نیشنل بُک کونسل آف پاکستان نے کوئٹہ، کراچی اور لاہور میں ۲۳ اور ۲۴ مارچ کو کتابوں کی نمائش کا اہتمام کیا۔ اس نمائشِ کتب میں خصوصی طور پر یومِ پاکستان کے حوالے سے جدوجہدِ آزادی، تحریکِ پاکستان، تاریخِ پاکستان، ہمارے اکابرین اور قومی رہنما، تہذیب و ثقافتِ پاکستان، قائدِاعظم محمد علی جناح اور علامہ اقبال پر کتابیں سجائی گئیں۔

کوئٹہ میں نمائشِ کتب کا افتتاح بلوچستان یونیورسٹی کے وائس چانسلر پروفیسر شکراللہ بلوچ نے کیا۔ نمائش کے سلسلے میں کونسل کے ساتھ ادارۂ ثقافتِ بلوچستان، پاکستان نیشنل سنٹر، پاکستان اکیڈمی آف لیٹرز، قلات پبلشرز اور دیگر کئی مقامی پبلشرز نے تعاون کیا۔

کراچی میں ۲۳ مارچ ۱۹۹۰ء کو کونسل کی جانب سے کی جانے والی کتب کی نمائش کا افتتاح پاکستان ٹیلی ویژن کارپوریشن کراچی کے جنرل منیجر عبدالکریم بلوچ نے کیا۔ نمائش کے سلسلے میں قائدِاعظم اکیڈمی، فیروزسنز لمیٹڈ کراچی، نیشنل بک فاؤنڈیشن کراچی، یونائٹڈ بک کارپوریشن کراچی، ڈیپارٹمنٹ آف ٹرانسلیشن، کمپائلیشن اینڈ کمپوزیشن کراچی یونیورسٹی، سندھ ادبی بورڈ جام شورو، ہمدرد فاؤنڈیشن کراچی، پاک امریکن کمرشل انکارپوریشن کراچی، انجمن ترقی اردو پاکستان کراچی، پاکستان انسٹی ٹیوٹ آف ڈیپارٹمنٹ آف اکنامکس اسلام آباد، آل ایجوکیشنل کانفرنس کراچی، ہجرہ کونسل اسلام آباد، انسٹی ٹیوٹ آف ہسٹاریکل اینڈ کلچرل ریسرچ، گورنمنٹ آف پاکستان اسلام آباد، مقتدرہ قومی زبان کراچی، قمر کتاب گھر اور کفایت اکیڈمی نے اپنی مطبوعات سے اسٹال سجائے۔

نیشنل بُک کونسل لاہور نے یومِ پاکستان کے موقعے پر ۲۳، ۲۴ مارچ کو ایک خوبصورت نمائش کا اہتمام کیا۔ اس نمائش میں مذکورہ موضوعات یعنی قراردادِ پاکستان، مطالعۂ پاکستان، جدوجہدِ آزادی، تاریخِ پاکستان، قائدِاعظم، علامہ اقبال اور دیگر اکابرینِ حریت پر تقریباً پانچ سو کتابیں نمائش کے لیے رکھی گئیں۔

اردو سائنس بورڈ کا کتاب میلہ

پہلا واقعہ تھا۔ اس نمائش میں ۱۸۴۰ء سے ۱۹۹۰ء تک کی کتابوں کو پیش کیا گیا جن کا تعلق سائنس کے موضوعات سے تھا۔

کتاب میلے میں کتابیں خاص ترجیحات اور درجہ بندی کے حوالے سے تین کمروں میں نمائش کے لیے رکھی گئیں۔ کمرہ نمبر ۱ میں بچوں کے موضوعات کے علاوہ ماڈلز کی نمائش کی گئی۔ یہ کتابیں متنوع موضوعات کی حامل تھیں۔ اور یہ موضوعات پریوں کی کہانیوں سے لے کر ایٹم کی داستان تک کا احاطہ کرتے تھے۔

کمرہ نمبر ۲ میں اردو سائنس بورڈ اور دیگر اداروں کی وہ مطبوعات جمع کی گئی تھیں جن کا تعلق سائنسی موضوعات سے اس کمرے میں رکھی گئی مطبوعات کے سلسلے میں یہ انتظام بھی تھا کہ میلے میں شریک ہونے والے حضرات انھیں خرید سکتے تھے۔ یہاں رکھے گئے پیچ جو جغرافیہ کے کام سے لے کر ایٹمی تحقیقات، طب اور ہومیوپیتھی سے متعلق تھے۔ علاوہ ازیں پوسٹ گریجویٹ نصاب کی میں منتقل کی ہوئی تمام تر سائنسی کتب بھی موجود تھیں۔

کمرہ نمبر ۳ میں وہ کلاسیکی اور قدیم کتابیں نمائش کے لیے رکھی گئی تھیں جو ۱۸۶۰ء سے ۱۹۹۰ء تک کا احاطہ کرتی تھیں جن سے اکثر کا شمار نوادر میں ہوتا ہے۔

اردو سائنس بورڈ لاہور کا یہ کتاب میلہ ۷ مارچ سے شروع ہو کر ۱۲ مارچ ۱۹۹۰ء تک جاری رہا۔

ڈاکٹر سید عبداللہ اردو کانفرنس سرگودھا

انجمن ترقی اردو سرگودھا نے اپنے ایک خصوصی اجلاس میں طے کیا ہے کہ امسال ڈاکٹر سید عبداللہ کی برسی پر ایک کل پاکستان "ڈاکٹر سید عبداللہ اردو کانفرنس سرگودھا" منعقد کی جائے جس میں ڈاکٹر صاحب کی ان پچاس سالہ عظیم خدمات کا تذکرہ کیا جائے جو انھوں نے اردو زبان کی علمی و ادبی تدریس و نفاذ کے سلسلے میں انجام دی ہیں۔ چنانچہ ایک ذیلی کمیٹی کی تشکیل کی گئی ہے جو پاکستان کے مشاہیر ادب کی فہرست مرتب کرے گی۔ کانفرنس کے انتظامات، تاریخ انعقاد اور دیگر ضروری امور کے بارے میں تجاویز انجمن کے آئندہ اجلاس میں برائے منظوری پیش کرے گی۔ اس کانفرنس میں ان ممتاز ادبائے کرام اور ناموران علم کو دعوت شرکت دی جائے گی جو ڈاکٹر صاحب مرحوم کی عظیم شخصیت اور فن کے بارے میں بخوبی معلومات رکھتے ہیں اور جنھوں نے ان کے ساتھ تحریک نفاذ اردو میں پورا پورا ساتھ دیا ہے۔ انجمن اس سے پہلے ڈاکٹر صاحب مرحوم کی زندگی میں دو کامیاب اور شاندار اردو کانفرنسیں ان کی سرپرستی میں کر چکی ہے۔

عظیم مشہود شاہد۔ ناظم انجمن ترقی اردو
(سرگودھا)

مظہر امام پر پی۔ ایچ۔ ڈی

باخبر ذرائع سے معلوم ہوا ہے کہ متھلا یونیورسٹی دربھنگہ (بہار) نے پروفیسر امام اعظم کو ان کے مقالے "مظہر امام کی تخلیقات کا تنقیدی مطالعہ" پر پی۔ ایچ۔ ڈی کی ڈگری تفویض کی ہے۔ اس مقالے کے نگراں ڈاکٹر محمد طیب صدیقی اور ممتحن بھاگلپور کے ڈاکٹر لطف الرحمٰن اور بھدرک (اڑیسہ) کے ڈاکٹر حفیظ اللہ نیولپوری تھے۔

منصور قیصر اللہ کو پیارے ہو گئے

ادبی حلقوں میں یہ خبر دکھ سے سنی جائے گی کہ پچھلے دنوں اردو کے معروف افسانہ نگار، صحافی اور کالم نگار منصور قیصر پنڈی میں انتقال کر گئے۔ مرحوم ایک عرصے سے بیمار اور صاحب فراش تھے۔ اب سے چند سال پہلے ان کا ایک افسانوی مجموعہ "بے چراغ بستی" شائع ہو کر مقبول ہو چکا ہے۔ ادارہ دعاگو ہے کہ اللہ تعالیٰ مرحوم کو اپنے جوارِ رحمت میں جگہ دے اور ان کے لواحقین کو صبرِ جمیل عطا فرمائے۔

پروفیسر مجتبیٰ حسین کی پہلی برسی

گزشتہ دنوں سراج الدولہ کالج میں مجتبیٰ حسین کی پہلی برسی منائی گئی۔ جلسے کی صدارت بیگم مجتبیٰ حسین نے کی۔ نظامت کے فرائض پروفیسر محمد رئیس علوی نے انجام دیے۔ پروفیسر حسنین کاظمی، پروفیسر سحر انصاری، جناب سرور جاوید اور بیگم سرور جاوید نے مجتبیٰ حسین کی شخصیت اور فن پر اظہارِ خیال کیا۔

اظہارِ تعزیت

انجمن ترقی اردو سرگودھا نے اپنے ایک تعزیتی اجلاس میں صوبہ سرحد کے دو ممتاز بہی خواہانِ اردو ڈاکٹر عبدالودود قمر سابق ناظم انجمن ترقی اردو صوبہ سرحد، معتمد اعلیٰ دائرۂ ادبیہ پشاور، بانی اباسین آرٹس کونسل صوبہ سرحد — اور روزنامہ "مشرق" پشاور کے مدیر اعلیٰ محمود انور شفقی کی وفات حسرت آیات پر اپنے گہرے اندوہ والم کا اظہار کیا ہے اور اللہ تعالیٰ سے دعا کی ہے کہ وہ دونوں مرحومین کو اپنے سایۂ رحمت میں اعلیٰ مقام سے نوازے اور ان کے پس ماندگان، اہلِ خانہ اور احباب کرام کو توفیقِ صبرِ جمیل عطا فرمائے۔ آمین

اجلاس میں الحاج حضرت اخگر سرحدی نے دونوں احباب کرام کی قومی زبان اردو سے وابستگی کا تذکرہ کیا۔ آخر میں دوبارہ دعائے مغفرت پر اجلاس اختتام پذیر ہوا۔

عظیم شہود شاہد۔ ناظم انجمن ترقی اردو
(سرگودھا)

سبطِ حسن کی چوتھی برسی

انجمن ترقی پسند مصنفین نے کراچی پریس کلب کی ادبی کمیٹی کے تعاون سے سبطِ حسن کی چوتھی برسی کے موقعے پر ایک جلسے کا اہتمام کیا جس کی صدارت خلیق ابراہیم خلیق نے کی جبکہ نظامت حسن عابدی نے انجام دی۔ اس موقعے پر حسن عابدی، وارث رضا، تاج بلوچ، زاہدہ حنا، سعید رضا سعید، نوشابہ زبیری، مصور علی امام، محمد علی صدیقی اور صاحبِ صدر خلیق ابراہیم خلیق نے مرحوم دانشور کی علمی و فکری خدمات پر روشنی ڈالی۔ قبل ازیں بابا نجمی نے منظوم خراجِ عقیدت پیش کیا اور تاج بلوچ نے مختلف قرار دادیں پیش کیں۔
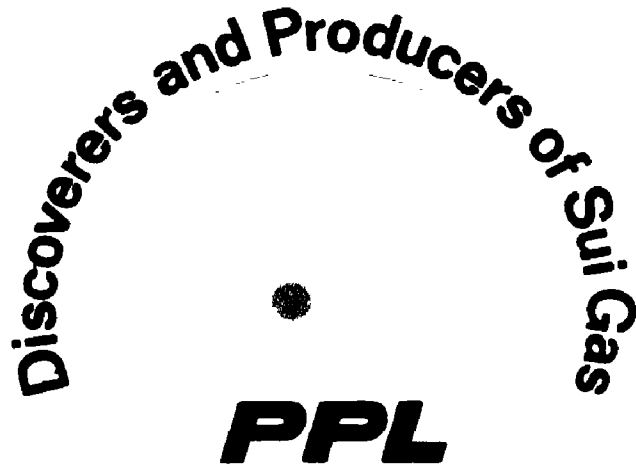
حروف تازہ

کتابیں

تند ہوا کے جشن میں — شاعری
مصنف: پیرزادہ قاسم
صفحات: ۲۴۶۔ قیمت: ۹۰ روپے
پتا: راشدہ قاسم ۱۵۔ اے، بلاک ایچ شمالی ناظم آباد، کراچی

مولانا محمد علی جوہر — حیات اور تعلیمی نظریات
مؤلف: ثناء الحق صدیقی ایم۔ اے (علیگ)
صفحات: ۳۱۲۔ قیمت: ۵۵ روپے
پتا: آل پاکستان ایجوکیشنل کانفرنس، کراچی

کچھ آپ بیتیاں کچھ جگ بیتیاں
مصنف: ہرمزی جلیل قدوائی
صفحات: ۱۱۲۔ قیمت: ۱۴ روپے
پتا: ادارۂ نگارش و مطبوعات، کراچی

اوراقِ گل — خطوط
مرتبہ: جلیل قدوائی
صفحات: ۱۵۹۔ قیمت: ۴۰ روپے
پتا: راس مسعود سوسائٹی۔ سی ۵، کوزی ہومز، گلشنِ اقبال، کراچی ۔۔۵۳۰۰ء

میرزا ادیب کے جائزے — مضامین
مصنف: میرزا ادیب
صفحات: ۲۶۸۔ قیمت: ۶۰ روپے
پتا: مغربی پاکستان اردو اکیڈمی، لاہور

کشکولِ وفا — شاعری
مصنف: حیرت الہ آبادی
صفحات: ۱۹۲۔ قیمت: ۴۵ روپے
پتا: بزمِ عبرت بی۔۶۲۲ بلاک نمبر ۱۳، گلستان فیڈرل بی ایریا، کراچی

موسم موسم — افسانے
مصنف: نورالہدیٰ سیّد
صفحات: ۱۸۶۔ قیمت: ۶۰ روپے
پتا: دبستانِ جدید، کراچی

دوسرا رُخ ——— مصنّف: شہزاد احمد
مضامین
صفحات: ۲۳۴۔ قیمت: ۹۰
پتا: سنگِ میل پبلی کیشنز لاہور

پاکستان میں ابلاغیات، ترقی اور مسائل ——— مصنف: مسکین حجازی
قومی مسائل
صفحات: ۱۵۸۔ قیمت: ۷۵ روپے
پتا: سنگِ میل پبلی کیشنز، لاہور

دل کی دھڑکن پاکستان ——— مصنّف: کیف بنارسی
نظمیں
صفحات: ۲۲۴۔ قیمت: ۹۰ روپے
پتا: پاک امریکن کمرشیل پرائیوٹ لمیٹڈ زیب النسا اسٹریٹ، کراچی

جریدے

ماہِ نو ——— مجلسِ ادارت: فرزانہ قریشی، پروین ملک، قائم نقوی، صفدر بلوچ
گولڈن جوبلی نمبر
صفحات: ۹۶۔ قیمت: ۵ روپے
پتا: ۳۲ اے۔ حبیب اللہ روڈ، لاہور

العلم" سہ ماہی ——— مدیر: سید مصطفےٰ بریلوی
صفحات: ۱۸۴۔ قیمت: ۱۵ روپے
پتا: آل پاکستان ایجوکیشنل کانفرنس، شارع الطاف علی بریلوی ناظم آباد کراچی

البلاغ ——— مدیر: تقی عثمانی
صفحات: ۶۴۔ قیمت: ۶ روپے
پتا: ماہنامہ البلاغ دار العلوم کراچی ۷۵۱۸۰

روحِ ادب" سہ ماہی ——— مدیر: محمد نظام الدین
جنوری تا جون ۱۹۸۹ء
صفحات: ۱۲۰۔ قیمت: ۵ روپے
پتا: روحِ ادب، ۱۷ ستدری موہن ایونیو کلکتہ ۔ ۷۰۰۰۱۴

نگارِ پاکستان" ماہنامہ ——— مدیر: ڈاکٹر فرمان فتح پوری
صفحات: ۳۸۴۔ قیمت: ۲۵ روپے
پتا: ۷۰ ورلی روڈ۔ گارڈن ایسٹ، کراچی

این فرینچ

ریشم سے بڑھ کر نرم ، ملائم سراپا

ریشمی لباس کی نرمی کا لطف تو نرم و ملائم سراپا ہی محسوس کرسکتا ہے۔ بلوغت کے بعد سب کے بازو اور زیر بازو بالوں سے پاک نہیں ہوتے۔ بدن پر بدنما روواں آپ کے قدرتی حسن کو گہنا سکتا ہے اور اس سے چھٹکارہ حاصل کرنا خاصا مشکل مسئلہ بن سکتا ہے اس لئے بدن سے بالوں کی صفائی جدید آرائش حسن کا ایک اہم جزو بن چکی ہے۔ خوش قسمتی سے اب یہ کام این فرینچ کی مدد سے ملائمت کے ساتھ ہو سکتا ہے۔

این فرینچ ہیئر ریموور کریم اور لوشن کی صورت میں دستیاب ہے۔ این فرینچ کا خصوصی اثر غیر ضروری بالوں کو جلد کی سطح کے نیچے سے گھلا دیتا ہے۔ اس طرح دوبارہ نمودار ہونے والا رواں شیونگ کے مقابلہ میں کہیں زیادہ نرم اور ملائم ہوتا ہے اور آپ کی جلد کو بے رنگی سے کھردرا نہیں بناتا۔ اس لئے ریشم زیب تن کرنے سے پہلے اپنے سراپا کو ریشم سا لمس دینا نہ بھولیئے۔

FACIAL QUALITY
Anne French
lotion
hair remover
CREAMS AWAY HAIR FROM FACE LEGS ARMS AND UNDERARMS

این فرینچ
آپ کے سراپا کے لئے
ریشم سا احساس

manhattan PAKISTAN

ڈاکٹر وفا راشدی

نئے خزانے

یہ اشاریہ حسبِ ذیل عنوانات کے تحت مرتب کیا گیا ہے

اس اشاریے کی ترتیب میں دسمبر ۱۹۸۸ء جولائی تا دسمبر ۱۹۸۹ء کے رسائل و جرائد سے استفادہ کیا گیا ہے صراحت حسب ذیل ہے

مجلّہ تحقیق اکتوبر ۸۹ء سندھ یونیورسٹی جام شورو
〃 جرنل خدا بخش لائبریری پٹنہ، شمارہ ۵۰/۸۹ء
〃 فنون لاہور جون جولائی ۸۹ء نومبر دسمبر ۸۹ء
〃 کائنات، اردو میں سائنسی تدریس نمبر ۸۹ء، وفاقی گورنمنٹ اردو سائنس کالج کراچی
〃 نقوش لاہور سا`·` مہ دسمبر ۸۸ء
شش ماہی غالب کراچی جولائی تا دسمبر ۸۸ء جنوری تا دسمبر ۸۹ء
〃 غالب نامہ دہلی جولائی ۸۹ء
سہ ماہی اردو کراچی جولائی تا ستمبر ۸۹ء اکتوبر تا دسمبر ۸۹ء
〃 العلم کراچی جولائی تا دسمبر ۸۹ء
〃 دانش اسلام آباد ۱۹/۸۹ء
〃 صحیفہ لاہور جولائی، دسمبر ۸۹ء
〃 فکر و نظر اسلام آباد جولائی تا ستمبر ۸۹ء، اکتوبر تا دسمبر ۸۹ء
ماہنامہ ادبِ لطیف لاہور اگست ۸۹ء اکتوبر ۸۹ء نومبر ۸۹ء
〃 افکار کراچی نومبر ۸۹ء دسمبر ۸۹ء
〃 دائرے کراچی اکتوبر ۸۹ء نومبر ۸۹ء دسمبر ۸۹ء
〃 سب رس کراچی جولائی ۸۹ء اگست ۸۹ء ستمبر ۸۹ء اکتوبر ۸۹ء
〃 شاعر بمبئی شمارہ ۳/۸۹ء ۴/۸۹ء
〃 صریر کراچی اگست ۸۹ء ستمبر ۸۹ء اکتوبر ۸۹ء نومبر ۸۹ء دسمبر ۸۹ء
〃 طلوع افکار کراچی اگست، ستمبر، اکتوبر، نومبر، دسمبر ۸۹ء
〃 قومی زبان کراچی اکتوبر، نومبر، دسمبر ۸۹ء
〃 کتاب نما نئی دہلی دسمبر ۸۹ء
〃 معارف اعظم گڑھ اکتوبر، نومبر ۸۹ء
〃 نگارِ پاکستان کراچی ستمبر، اکتوبر، نومبر ۸۹ء سالنامہ دسمبر ۸۹ء
〃 نیرنگِ خیال راولپنڈی نومبر ۸۹ء
ہفت روزہ ہماری زبان دہلی ۸ راکتوبر، ۱۵ راکتوبر، ۸ رنومبر، ۲۲ رنومبر، یکم دسمبر، ۸ ردسمبر، ۲۲ ردسمبر ۸۹ء

ارسی ادب، تاریخ و تحقیق

مصنف	عنوان	رسالہ	مقام	تاریخ	صفحہ
صفدر زمانی، ڈاکٹر	قومی یک جہتی میں فارسی کا حصہ۔ ایک جائزہ	دانش	اسلام آباد	۱۹/۸۹ء	ص ۲۴۱
م سلمی	عہدِ زریں ادبیات فارسی دردا کا	″	″	″ ″	ص ۱۳۲
الحق کوثر، پروفیسر ڈاکٹر	بابا فغانی شیرازی، حالاتِ زندگی	″	″	″ ″	ص ۱۸۵
احمد تیمید یزدانی، ڈاکٹر	شعر رومی میں طنز و مزاح	نقوش	لاہور	دسمبر ۸۸ء	ص ۹۱
یدہ افتخار، ڈاکٹر	ارزیابی قصاید عنصری	دانش	اسلام آباد	۱۹/۸۹ء	ص ۶۷
اجد اللہ تفہیمی، ڈاکٹر	یادآوری چند نکتہ در حافظ شناسی	″	″	″ ″	ص ۵
ید وحید اشرف، ڈاکٹر/ ترجمہ محسن مدیر شانہ چی	گذشتہ و حال زبان فارسی در تامیل نادو	دانش	اسلام آباد	۱۹/۸۹ء	ص ۵۹
اشرف صادقی، ڈاکٹر	فارسی قدیم و فارسی امروز	″	″	″ ″	ص ۱۹
استعلامی، ڈاکٹر / مہ: رئیس احمد نعمانی	موجودہ عہد کا ایرانی ادب	معارف	اعظم گڑھ	اکتوبر ۸۹ء	ص ۲۶۵
منور، پروفیسر	نگاہی بہ کلامِ حافظ	دانش	اسلام آباد	۱۹/۸۹ء	ص ۲۵
نور محمد خاں، ڈاکٹر	استاد سید غلام رضا سعیدی و خدماتِ فرہنگی و علمی او	دانش	اسلام آباد	۱۹/۸۹ء	ص ۱۱۲

ردو شاعری

مصنف	عنوان	رسالہ	مقام	تاریخ	صفحہ
ل احمد سرور، پروفیسر	نظم کی دنیا	نگار پاکستان	کراچی	سالنامہ ۸۹ء	ص ۹۵
ابواللیث صدیقی، ڈاکٹر	اردو قصیدہ و مثنوی کی تنقید پر ایک نظر	″	″	″ ″	ص ۱۷۱
ذ محمد سحر، ڈاکٹر	قصیدہ صنفِ سخن کی حیثیت سے	″	″	″ ″	ص ۱۵۰
نہر علی فاروقی	اردو گیت	″	″	″ ″	ص ۲۹۴
نفال جاوید	اردو میں پیروڈی	″	″	″ ″	ص ۳۲۶
یر احمد علوی	اردو کی مشہور مثنویاں	″	″	″ ″	ص ۱۲۳
م اعظمی	جدید نظم سے کیا مراد ہے؟	″	″	″ ″	ص ۱۱۷
ابس ایلیٹ، ڈاکٹر جمیل جالبی	منظوم ڈراما اور اس کا فن	″	″	″ ″	ص ۳۳۵

مصنف	عنوان	رسالہ	مقام	شمارہ	صفحہ
سلیم اختر	ریختی کا سماجی و تہذیبی پس منظر	نگار پاکستان	کراچی	سالنامہ ۸۹ء	ص ۲۵۷
سلیم جعفر	دوہا اور اس کی فنی خصوصیات	〃	〃	〃	ص ۳۷۴
سید احتشام حسین، پروفیسر	سانیٹ کیا ہے؟	〃	〃	〃	ص ۳۶۱
سید تمکین کاظمی	لکھنؤ اور دہلی اسکول کے ریختی گو شعرا	〃	〃	〃	ص ۲۶۶
سید شاہ ولی الرحمٰن ولی	اردو کا پہلا واسوخت	〃	〃	〃	ص ۲۳۳
سید صفدر حسین، ڈاکٹر	اردو مرثیہ عہد بہ عہد	〃	〃	〃	ص ۱۹۹
شعیب اعظمی	اردو واسوخت	〃	〃	〃	ص ۲۴۱
شمیم احمد	غزل اور غزل کے معاملات	〃	〃	〃	ص ۶۱
ضیاء الدین احمد بدایونی، ڈاکٹر	ایوان قصیدہ کے ارکان اربعہ	〃	〃	〃	ص ۱۵۶
عبدالقادر سروری، پروفیسر	شعر کیا ہے؟	〃	〃	〃	ص ۷
عزیز تمنائی، ڈاکٹر	سانیٹ اور اس کا فن	〃	〃	〃	ص ۳۵۸
فراق گورکھپوری، پروفیسر	غزل کی ماہیت و ہیئت	〃	〃	〃	ص ۱۱
فرمان فتح پوری، ڈاکٹر	سحر البیان کے پس منظر پر ایک نظر	〃	〃	〃	ص ۱۳۲
فرمان فتح پوری، ڈاکٹر	گلزار نسیم کی نمایاں خصوصیات	〃	〃	〃	ص ۱۳۸
فرمان فتح پوری، ڈاکٹر	اردو رباعی کا فن و تاریخی ارتقا	〃	〃	〃	ص ۲۱۹
فرمان فتح پوری، ڈاکٹر	قطعہ اور اس کے مماثل اصناف	〃	〃	〃	ص ۲۸۹
فرمان فتح پوری، ڈاکٹر	اردو کے منظوم افسانوی ڈرامے (انیسویں صدی میں)	〃	〃	〃	ص ۳۴۴
کوثر چاند پوری	ریختی اور اس کا فن	〃	〃	〃	ص ۲۷۶
گیان چند، ڈاکٹر	واسوخت امانت	〃	〃	〃	ص ۲۴۵
مجنوں گورکھپوری، ڈاکٹر	شعر اور غزل	〃	〃	〃	ص ۲۴
محمد احسن فاروقی، ڈاکٹر	اردو مرثیہ اور میر انیس	〃	〃	〃	ص ۱۸۶
محمد حسن، ڈاکٹر	معریٰ اور آزاد نظم کا ارتقا	〃	〃	〃	ص ۱۰۰
مسعود حسن رضوی، ادیب	شہر آشوب کا فن اور موضوع	〃	〃	〃	ص ۳۰۵
مسعود حسین خان، ڈاکٹر	غزل کا فن	〃	〃	〃	ص ۵۶
نور الحسن ہاشمی، ڈاکٹر	غزل کا نیا رنگ ترنم	〃	〃	〃	ص ۴۹
نیاز فتح پوری، علامہ	اردو غزل، ولی سے عہد حاضر تک	〃	〃	〃	ص ۷۹
[illegible]	[illegible]	[illegible]	[illegible]	[illegible]	ص ۱۳

وزیر آغا، ڈاکٹر	غزل اور نظم کا بنیادی فرق	نگارِ پاکستان	کراچی	سالنامہ ۸۹ء	ص ۱۱۲
یوسف جمال انصاری	فنی تقاضے اور انیس کی مرثیہ نگاری	نقوش	لاہور	ستمبر ۸۸ء	ص ۴۸

اردو میں سائنسی تحقیق و تعلیم

آفتاب حسن، مہتمم	اردو ذریعہ تعلیم اور اصطلاحات	مجلہ کائنات	کراچی	۸۹ء	ص ۲۴۰
الف۔ د۔ نسیم، ڈاکٹر	اردو زبان کی سائنسی تدریس کی صلاحیت	"	"	"	ص ۱۷۷
بابائے اردو مولوی عبدالحق	اردو زبان ذریعہ تعلیم سائنس	"	"	"	ص ۲۵
بابائے اردو مولوی عبدالحق	اکابرین سے سوال و جواب	"	"	"	ص ۲۹۹
ثمینہ رفیع	اردو میں سائنسی تدریس	"	"	"	ص ۲۱۱
جمال حیدر	اردو میں سائنسی تدریس	"	"	"	ص ۲۰۲
حفیظ الرحمٰن صدیقی، ڈاکٹر	اردو میں سائنسی اصطلاحات	"	"	"	ص ۲۵۹
راقب شکیب	ملک کی ترقی کے لیے سائنسی تعلیم	"	"	"	ص ۱۹۱
رضی الدین صدیقی، ڈاکٹر	اردو ہندسے علوم ریاضی کی علامتیں	"	"	"	ص ۲۳۲
سید اقبال عالم	اردو میں سائنس کی تدریس	"	"	"	ص ۱۸۸
شاہد اقبال	اردو میں سائنسی تدریس کے تقاضے	"	"	"	ص ۲۱۵
شہناز پروین	اردو زبان اور سائنسی تعلیم	"	"	"	ص ۲۲۱
عبدالرؤف نوشہروی، پروفیسر	قومی زبان میں سائنسی علوم کی تدریس	"	"	"	ص ۲۷۵
ارمان شاہ	اردو ذریعہ تعلیم سائنس کے لیے کیوں ممکن نہیں	"	"	"	ص ۱۹۸
علیم خالد علوی	اردو میں سائنسی علوم کی تعلیم	"	"	"	ص ۲۱۸
غازی عبدالقیوم انصاری	سائنسی تعلیم کے مسائل زبان کی سطح پر	"	"	"	ص ۲۰۵
ظہیر تاج	اردو میں سائنسی تدریس	"	"	"	ص ۱۸۵
فاروق زبیری، ڈاکٹر	ایک خواب ہے دکھانے کا	"	"	"	ص ۳۲۷

اردو میں سائنسی علوم

اکرام الرحمٰن، پروفیسر	اتحاد عالم اسلام اور جغرافیائی ربط	مجلہ کائنات	کراچی	۸۹ء	ص ۵۰۵
اکرام الرحمٰن، پروفیسر	عہدِ اسلامی میں اندلس کا معاشی جغرافیہ	"	"	"	ص ۵۳۳
اکرام الرحمٰن، پروفیسر	ابو محمد حامد خجندی علم ریاضی کا ماہر	"	"	"	ص ۵۰۰

اکرام الرحمٰن، پروفیسر	پاکستان کے شمالی علاقوں میں موجودہ اور امکانی معدنی ذخائر	مجلہ کائنات	کراچی	۸۹ء	ص ۵۳۸
ایس فاروق، ڈاکٹر	اردو زبان میں سائنسی کتب کی فہارس	مجلہ کائنات	کراچی	۸۹ء	ص ۲۳۹
اکرام الرحمٰن، پروفیسر	اسلامی دور کا نامور جغرافیہ داں ابوریحان محمد بن احمد البیرونی	مجلہ کائنات	کراچی	۸۹ء	ص ۵۴۶
اکرام الرحمٰن، پروفیسر	اسلامی دور کا ممتاز منجم اور ریاضی داں سند بن علی	مجلہ کائنات	کراچی	۸۹ء	ص ۵۶۴
ایس فاروق، ڈاکٹر	اردو زبان میں سائنسی کتب کا اجمالی جائزہ	"	"	"	ص ۳۳۲

اردو میں سائنسی ادب

انیس احمد ہمدانی	اردو میں سائنسی و فنی ادب	مجلہ کائنات	کراچی	۸۹ء	ص ۸۲
اے ایچ کوثر، ڈاکٹر	اردو میں علمی و سائنسی ادب کے فروغ میں دہلی کا حصہ	مجلہ کائنات	کراچی	۸۹ء	ص ۹۰
خواجہ حمیدالدین شاہد، پروفیسر	اردو میں سائنسی ادب کا اجمالی تذکرہ	مجلہ کائنات	کراچی	۸۹ء	ص ۸۰
محمد یوسف رمتوی	سائنس اردو کے آئینے میں	"	"	"	ص ۱۹۴

زبان — مسائل و مباحث

ارشاد احمد خاں آفریدی، ڈاکٹر	قومی زبان اور غیر ملکی زبان کے عیاں گوشے	مجلہ کائنات	کراچی		۸۹	ص ۵۵
جمیل جالبی، ڈاکٹر	ملک میں اسلام اور اردو کے نفاذ سے سیاسی زمین جل تھل ہوجائے گی	مجلہ کائنات	کراچی		۸۹	ص ۴۷
چندن مترا	ہندوستان میں اردو کو درپیش مسائل	قومی زبان	"	نومبر	"	ص ۵۹
سمر اللہ ری، پروفیسر	اردو بحیثیت متبادل زبان	مجلہ کائنات	"		"	ص ۲۰
سہیل بخاری، ڈاکٹر	اردو زبان کا مقدمہ	"	"		"	ص ۶۷
سید امداد علی بریلوی	قومی زبان اردو کی ہمہ گیری اور فاونیت	"	"		"	ص ۴۳

(جاری)

اھنامہ
قومی زبان
کراچی

جون ۱۹۹۰
جلد: ۶۲
شمارہ: ۶

مضمون نما

ادارۂ تحریر
جمیل الدین عالی
جعفری
ڈاکٹر اسلم فرخی

مدیر
ادیب سہیل

اشتراک
...... ۵ روپے
...... ۵۰ روپے
رجسٹری سے ۱۰۰ روپے

بیرونِ ملک
...... ایک ڈالر
...... دس ڈالر
رجسٹری سے پندرہ ڈالر

ترقی اردو پاکستان
روڈ، کراچی، فون: ۲۳...۷۲

قائم شدہ ۱۹۴۱
ہم
ان کے
درخشاں
مستقبل
کے خواہاں
ہیں!
حبیب بینک ایک ترقی پسند، متحرک،
جدید بینک ملک کے اندر ۱۸۰۰ سے زیادہ
اور بیرون ملک ۶۵ شاخوں، ۱۸۰۰ سے
زیادہ غیر ملکی نمائندوں، کمپیوٹر تنصیبات،
نت نئی اسکیموں اور سہولتوں کے ذریعے ملک
کے مستقبل کے لئے حتی المقدور کوشاں ہے۔
ہماری بچت کی اسکیمیں اور طالب علموں
کا خصوصی شعبہ بچوں اور طالب علموں میں
بچت کی عادت ڈالنے کے لئے ہمہ وقت
سرگرم عمل ہے۔
حبیب بینک ملک کی ترقی و خوشحالی کے لئے
نئی نسل کی سرپرستی کرتا ہے۔
حبیب بینک لمیٹڈ

کن نیندوں اب تُو سوتی ہے اے چشمِ گریہ ناک
مژگاں تو کھول شہر کو سیلاب لے گیا

میر تقی میر

کُرۂ ارض رُوح افزا کے حصار میں!

آئینہ دارِ ثقافت : مشروبِ مشرق و مغرب

اب تک اتنی تعداد میں بن چکا ہے کہ اس کی بوتلیں کُرۂ ارض کا احاطہ کرتی ہیں۔

ابوریحان محمد ابن احمد البیرونی نے تقریباً نو سو سال قبل جہلم کے نزدیک سید پہاڑ پر بیٹھ کر دنیا کا قطر ناپا تھا جو ۷۹۰۲ میل تھا۔ اس پیمائش کو بعد میں جدید سائنسی تحقیق نے درست قرار دیا۔ حکیم حافظ عبدالمجید نے دہلی میں جڑی بوٹیوں، نباتات، گل و گلاب اور فواکہات کے طبی خواص کے موجب ۱۹۰۶ء میں رُوح افزا کا عہد ساز فارمولا مرتب کیا۔

بے نادرِ روزگار مشروب رُوح افزا اس عرصہ میں اتنی تعداد میں تیار ہو کر فروخت ہو چکا ہے کہ اس کی بوتلیں اپنی تعداد کے لحاظ سے پورے کُرۂ ارض کا احاطہ کرتی ہیں اور اب رُوح افزا مشروبِ خلائق کا درجہ حاصل کر چکا ہے۔

شماریات کے مطابق صرف پاکستان میں ۱۹۴۸ء سے اب تک رُوح افزا کی اتنی بوتلیں تیار ہوئیں کہ ان سے تیار ہونے والے **دو ارب' دس کروڑ' اکانوے لاکھ' نواسی ہزار' چار سو چالیس گلاس** خلائق کی تسکین کا سامان کر چکے ہیں۔

پاکستان میں رُوح افزا کی تیاری پر اب تک استعمال ہونے والی خام اشیاء کا گوشوارہ:

- شکر
- ست لیموں

۷،۹۲،۵۲،۷۹۴ کلوگرام
سات کروڑ' بانوے لاکھ' باون ہزار' سات سو چورانوے کلوگرام

- عرقِ رُوح افزا*
- عرقِ گلاب
- عرقِ بہار
- عرقِ کیوڑا

۱،۰۶،۵۱،۴۰۷ لیٹر
ایک کروڑ' چھ لاکھ' اکاون ہزار' چار سو سات لیٹر

* عرقِ رُوح افزا میں مختلف جڑی بوٹیوں' سبزیوں' اور پھلوں کے عرقیات شامل ہیں۔

رُوح افزا کے لیے ۱۹۰۶ء سے ماہرینِ نباتات کاشت کر رہے ہیں۔ باغات میں گل و گلاب اُگا رہے ہیں اور ہزار ہا انسان فواکہات پیدا کرنے میں مصروف ہیں۔ لاکھوں من عرق اگایا جا رہا ہے۔ بے شمار انسان اور لاتعداد مشینیں شب و روز مصروفِ عمل ہیں اور نگران ماہرین عرق سازی سے تیاری تک اعلیٰ معیار برقرار رکھنے پر توجہ دے رہے ہیں' تب جا کر رُوح افزا تیار ہو کر شائقین تک پہنچتا ہے۔ اسی عرق ریزی کی وجہ سے تمام دنیا رُوح افزا کی قدردان ہے اور یہ مشروبِ خلائق ہے۔

مشروبِ مشرق

رنگ' خوشبو' ذائقے' تاثیر اور معیار میں بے مثال رُوح افزا

مشروبِ خلائق

تحقیق' رُوحِ تخلیق ہے

ADARTS HRA 1/90

ڈاکٹر اسلم فرخی

رفیق خاور

چراغِ رہ گزر

۱۴ مئی کی صبح کو رفیق خاور بھی رخصت ہو گئے۔ گزشتہ دو ہفتے سے ہسپتال میں تھے اور موت و زیست کی کشمکش میں مبتلا تھے
غ کی شریان پھٹ گئی تھی۔ سنتے آئے ہیں کہ مرضِ دل کا کوئی علاج نہیں۔ دماغ کی شریان مجروح ہونے کا بھی کوئی علاج نہیں، اور
ور مرحوم تو دل کے مریض بھی تھے۔

قیامِ پاکستان کے بعد دارالحکومت کی اسلام آباد منتقلی تک مرکزی حکومت کے دفاتر فریرروڈ کے نوتعمیر بارکوں میں تھے
ن بارکوں میں سے ایک میں وزارتِ محنت کے دفاتر تھے۔ محب مکرم راغب مرادآبادی کا اجلاس یہیں ہوتا تھا۔ راغب صاحب
ساتھ رفیق خاور بھی بیٹھتے تھے۔ راغب صاحب ہی کے ذریعے سے تعارف ہوا تھا۔ جب راغب صاحب سے ملنے جانا ہوتا تو خاور
حب سے بھی ملاقات ہوتی۔ لمبے۔ گورے۔ مزاج کے دھیمے۔ خوش اخلاق اور باوضع آدمی تھے۔ ملاقاتیں ہوئیں تو اندازہ ہوا کہ
ے پڑھے لکھے آدمی ہیں۔ اردو، فارسی اور انگریزی کا سارا ادب چاٹے بیٹھے ہیں۔ جس موضوع پر جب بھی بات ہوئی ان کی معلومات
ندیم و جدید کے خوش گوار امتزاج سے بھرپور پایا۔

رفیق خاور ایک اعلیٰ علمی خاندان سے تعلق رکھتے تھے۔ ان کے ایک بھائی ڈاکٹر محمد صادق گورنمنٹ کالج لاہور میں انگریزی
استاد تھے۔ محمد حسین آزاد پر ان کا کام قابلِ توجہ ہے۔ انھوں نے اردو ادب کی ایک تاریخ بھی انگریزی میں مرتب کی تھی۔ خاور
م کے دوسرے بھائی ڈاکٹر تصدق حسین خالد جدید اردو شاعری کی ایک معروف شخصیت ہیں۔

رفیق خاور نے اپنی پیشہ ورانہ زندگی کا آغاز اسلامیہ کالج لاہور میں استاد کی حیثیت سے کیا۔ اس زمانے میں انھوں نے
، چھوٹی سی کتاب استاد ذوق کے بارے میں شائع کی تھی جس میں ذوق کو اردو کا بہترین شاعر ثابت کیا گیا تھا۔ یہ کتاب اس لیے
ِ ذکر ہے کہ معروف غالب شناس جناب مالک رام نے اس کتاب کے جواب میں ایک مضمون لکھا تھا۔ نوجوانی میں نمایاں ہونے اور
نکا دینے والی بات کہنے کا شوق سب کو ہوتا ہے۔ غالباً خاور مرحوم نے بھی اسی جذبے کے تحت ذوق کے بارے میں کتاب مرتب کی تھی
ء وہ غالب شناس ہی نہیں غالب پرست بھی تھے۔ کیونکہ جب بھی شاعری کے سلسلے میں ان سے گفتگو ہوئی۔ میں نے انھیں غالب
ناعری بالخصوص فارسی شاعری کا غیر معمولی مداح پایا۔

وزارتِ محنت سے خاور صاحب وزارتِ اطلاعات میں گئے۔ ماہِ نو میں نائب مدیر رہے پھر مدیر ہو گئے۔ ڈپٹی ڈائرکٹر ہوئے۔ مگر یہ سب منصب ان کے درویشانہ مزاج پر اثر انداز نہیں ہوئے۔ بنیادی طور پر وہ عالم تھے۔ اہلِ علم میں گھلے ملے رہتے تھے۔ خلیق اور متواضع تھے۔ خود چائے سے پرہیز کرتے تھے لیکن یہ ممکن نہیں تھا کہ کوئی مہمان چائے پیے بغیر چلا جائے۔

لکھنے پڑھنے کے معاملے میں خاور مرحوم سچ مچ جن تھے۔ انھوں نے اردو، فارسی، انگریزی اور پنجابی میں خوب خوب لکھا کسی موضوع پر بند نہیں تھے۔ انگریزی اچھی لکھتے تھے اور ترجمہ بھی بہت اچھا کرتے تھے۔ انھوں نے انگریزی میں ہماری شاعری کے جو ترجمے کیے ہیں وہ بڑے قابلِ قدر اور اہم ہیں۔ ان کی آخری کتاب علامہ اقبال کی فارسی شاعری سے متعلق تھی۔ خاور مرحوم کا قلم ہمیشہ رواں دواں رہتا تھا۔ انھوں نے بہت کچھ لکھا۔ نجانے کتنے لکھنے والے ان کے فیض سے ادیب و شاعر بن گئے۔

سرکاری ملازمت سے سبکدوش ہونے کے بعد خاور مرحوم اردو ڈکشنری بورڈ سے منسلک ہو گئے تھے۔ یہاں بھی انھوں نے مفید خدمت انجام دی۔

رفیق خاور مرنجاں مرنج اور سیدھے سادے انسان تھے۔ نام و نمود سے دُور بھاگتے تھے۔ ساری زندگی ایک وضع میں گزار دی۔ لہجہ دھیما، مزاج میں نرمی، اعلیٰ اخلاق، نئے لکھنے والوں کا دل بڑھاتے، حوصلہ افزائی کرتے، دوستوں کی قدر کرتے اور اعلیٰ افہام و تفہیم میں رواداری اور کشادہ دل تھے۔ علم بڑا مستحضر۔ معلومات بڑی وسیع۔ محفلوں میں مذاکروں میں۔ دوستوں کے حلقے میں ہر جگہ ان کا رویہ یکساں رہا۔ ایک دفعہ ایک مذاکرے کے سلسلے میں سکھر جانے کا اتفاق ہوا۔ ان کی دل چسپ گفتگو سے سفر بڑا خوش گوار رہا۔ افسوس ہے کہ ایسے مرنجاں مرنج عالم بڑی تیزی سے رخصت ہو رہے ہیں۔ اہلِ علم کی محفل سونی ہوتی جا رہی ہے، مگر یہ تو ہوتا ہی ہے۔

اللہ تعالیٰ انھیں اپنے جوارِ رحمت میں جگہ عطا فرمائے۔ آمین۔

شان الحق حقی

قطعۂ تاریخ وفات

میاں رفیق حسین خاور مرحوم

کہ در اواخر ۱۴۱۰ھ وفات یافت

چہ مرداں از میاں برفتند چہ نحس ایں تیرہ سال بودہ
ز دست ایں گوہرے کہ رفتہ مپرس از ما چہ مال بودہ
گرفت او را بحدِّ کامل بہ حرف و نطق و خیال بودہ
ہمیں ست سالش "رفیق خاور ادیب صاحب کمال" بودہ

۱۴۱۰ھ

سرشار صدیقی

عبدالرؤف عروج

پیدائش:۔ ۱۹۳۲ء حیدرآباد دکن وفات:۔ مئی ۱۹۹۰ء کراچی

عبدالرؤف عروج ایسے نفسا نفسی کے دنوں میں ہم سے جدا ہو گئے ہیں کہ جب ہمارا شہر صبح و شام مرگِ انبوہ کے جشن منا رہا ہے۔ روج کا جنازہ ہمارے بے شمار بے گناہ اور معصوم لاشوں کے ہجوم میں گم ہو کر رہ گیا ہے۔ ان کی موت کے انفرادی غم پر اجتماعی تال کے صدمے حاوی ہو گئے ہیں اور ان کی قبر گنجِ شہیداں کے حصار میں کھو گئی ہے۔

ماتمِ یک شہرِ آرزو میں مبتلا عروج کے دوست آگ اور خون کی سفاک گرفت سے نکلیں۔ لمحۂ آئندہ کے اندیشوں ے آزاد ہوں تو شاید انھیں بقیدِ ہوش و حواس اس بات کا احساس ہو کہ وہ کیسی متاعِ گراں سے محروم ہو چکے ہیں؟

ایسی صورت حال میں عروج کی موت پر ابلاغِ عامہ کی خاموشی کو موردِ الزام قرار دینا یا شہر کے ادبی اداروں کے سکوت بے حسی سے تعبیر کرنا، اعتراض برائے اعتراض سے زیادہ اہمیت نہیں رکھتا یا پھر اس توقعات کو خود غرضانہ خوش فہمی کا نام ا جا سکتا ہے۔

عبدالرؤف عروج کی ساری زندگی گوشہ نشینی اور خاموش تخلیقی عبادت سے عبارت تھی۔ اور ان کی موت کی خبر بھی صحرا ں آوازِ اذان کی طرح سماعتوں سے بے نیاز رہی۔ یہی ان کے وجود و عدم کی تصدیق ہے۔

عبدالرؤف عروج کا شمار ادب کے مشاہیر میں نہیں ہوتا۔ شاید اس لیے کہ مشاہیر سازی کے ذمہ دار نقادوں، یا ذکرہ نویسوں نے اس طرف توجہ نہیں فرمائی۔ اس کی ایک وجہ یہ بھی ہو سکتی ہے کہ عروج کے پاس ایسا عوام پسند ادبی ذائقے واد ہی نہیں تھا جس کی چاشنی سہل انگار اور سہولت پسند اہلِ قلم کو اپنی جانب متوجہ کر سکتی۔

عروج کی شاعری، تحقیق اور تنقید اپنے معیار اور مقدار دونوں اعتبار سے اس امر کی متقاضی تھیں کہ انھیں سنجیدگی اور توجہ سے ھنے کے بعد رائے قائم کی جائے سو اس سنجیدگی اور توجہ کے لیے وقت چاہیے جو ہمارے ایسے ہنر مند نقادوں کے پاس کبھی نہیں نا۔ جو "کاتا اور لے دوڑی" کے قائل ہیں۔ بہرحال کسی کی جان سوزی اور جگر کاوی رائیگاں نہیں جاتی۔ عروج کے بارے کوئی نہ کوئی درد مند اور قدر شناس ضرور قلم اٹھائے گا۔ اور جب نیک نیتی سے قلم اٹھتا ہے تو شہرت اور گم نامی کے مفہوم ں جاتے ہیں۔

ہم لکھنے والوں میں خود فریبی کا مرض بہت عام ہے جو نوجوانی میں خوش فہمی کے جراثیم سے شروع ہو کر آخری عمر میں مایوسی اور محرومی کے سرطان پر ختم ہوتا ہے۔ تحسینِ باہمی پر یقین یا مربیانہ حوصلہ افزائی کو اعتراف عظمت پر محمول کرتے سے اکثر ذہین لکھنے والے بھی اپنی فطری صلاحیتوں سے محروم ہو جاتے ہیں۔ عروج اپنے محتاط حلقۂ احباب میں محدود رہ کر شہرت یا ناموری کا حلقہ تو وسیع نہ کر سکے لیکن خود فریبی سے محفوظ رہے بلکہ خود شناسی کی منزل تک پہنچ گئے۔ ان کے آخری دنوں کے احباب بھی اس بات کی تصدیق کریں گے کہ وہ اپنے بارے میں زیادہ سُننا پسند نہیں کرتے تھے۔

عبدالرؤف عروج کے نہ ہونے کے بعد ان کے ہونے کا احساس شدید ہو گیا ہے۔ انھیں طویل عمر نہیں ملی اور نہ ہی مسائل زندگی نے سکون کے لمحے اور فرصت کے اوقات دیے پھر بھی انھوں نے اس محدود اور تفکرات سے بھرپور زندگی میں ادب کی اتنی خدمت کر لی ہے جو دوسروں کے لیے مثال ہے۔ کاش یہ خاموش کارکن کچھ دن اور زندہ رہتا اور اپنے وہ کام بھی مکمل کر لیتا جن کا تصور ابھی اس کے ذہن میں پرورش پا رہا تھا اور اس طرح ایک فرد ایک ادارے کے طور پر ہمارے عہد کی علامت بن جاتا ہے۔

ذکر چھڑ ہی گیا ہے تو آئیے ان کی زندگی بھر کی کمائی پر ایک نظر ڈال لیں تاکہ دعوے کو دلیل میسر آ جائے۔

ترتیب و تدوین

۱۔ اردو مرثیے کے پانچ سو سال
۲۔ دیوان محمد علی جوہر

تحقیق و تصنیف

۱۔ فارسی، شعرائے اردو (تذکرہ)
۲۔ بزمِ غالب (معاصرین و مکتوب الیہم غالب)
۳۔ رجال اقبال (اقبال کی تحریروں کے حوالے سے ان کے معاصرین، احباب اور دیگر مذکورہ اشخاص کے حالات)
۴۔ اقبال اور حیدر آباد (دکن)
۵۔ بحر المحبت (میر و مصحفی کی مثنویوں کا موازنہ)
۶۔ خسرو اور عہدِ خسرو

زیرِ طبع

۱۔ شاعری اور سماجی ترکہ
۲۔ خاندانِ انیس کے مرثیہ نگار
۳۔ اقبال کے غیر مدوّن خطوط
۴۔ رجال اقبال (حصہ دوم)
۵۔ لہو لہو اُجالا (طبع زاد مراثی)

کم آمیزی عروج کی اختیاری صفت نہیں تھی۔ یہ ان کی فطرت تھی۔ ایسے تمام لوگ جو کسی بڑے کام کی تکمیل کے لیے
، جانے ہیں۔ عام طور پر کم سخن و کم آمیز ہی ہوتے ہیں۔ ظاہر ہے محفل سازی اور ریاضتِ فن میں ازلی رقابت ہے۔
یں ان کے قریبی احباب میں کبھی شامل نہیں رہا لیکن ہمیشہ ایک مخلص اور نیک اندیش دوست ہی پایا۔ پچاس کے ابتدائی
میں ان سے متعارف ہوا۔ تحسین سروری مرحوم پہلی ملاقات کا وسیلہ بنے۔ پھر عموماً ملاقاتیں ہوتی رہیں۔ کبھی کسی اوسط درجے
دران میں، کبھی مخصوص ادبی نشستوں میں اور کبھی یوں ہی سرِ راہے۔ زیادہ تر وہ مجھے تنہا ملے۔ بلکہ اکثر محفلوں میں بھی
نھیں تنہا محسوس کیا۔
ریڈیو پاکستان میں وہ اس وقت بھی نہایت پابندی کے ساتھ جاتے تھے جب اس کی عارضی نشرگاہ انٹیلی جنس اسکول
روڈ پر ہوا کرتی تھی۔ میں تازہ تازہ پاکستان آیا تھا اور میرا بھی زیادہ تر وقت اسی نشرگاہ کے کسی خیمے میں بیٹھے ہوئے معماران
کے ساتھ گزرتا تھا۔ شاہد احمد دہلوی، نصراللہ خاں، خالد حسن قادری، ابوالخیر کشفی، سلیم احمد وغیرہ سب ہی ایک بہت بڑی
ر دبوسیدہ اور غبار آلود کرسیوں پر بیٹھے اپنے اپنے موضوعات پر کاغذوں کی شکم پُری کر رہے ہوتے۔ اسی ماحول میں
ی دنیا سے بے نیاز لکھنے میں مصروف رہتے۔ وہ اس زمانے میں بھی SKETS مختصر ڈرامے، نظمیں اور دوسرے تحریری کام
ہوتے تھے۔ پھر وہیں انھوں نے اپنے شہرہ آفاق غنائیے لکھے اور نشری تحریروں کی ضرورت بن گئے۔
اسی زمانے میں انھیں خوش نویسوں کے جاری کردہ ایک ادبی ماہ نامے کی ادارت مل گئی۔ یہ تین دہائیوں سے زیادہ
بات ہے لیکن مجھے یاد پڑتا ہے کہ اس رسالے کا نام (شاید) "زینت" تھا۔ عروج کی وابستگی کی وجہ سے اس میں کراچی کے
قلم بھی لکھنے لگے اور دیکھتے ہی دیکھتے اس جریدے کو اعتبار حاصل ہوگیا۔ میں بھی اس کے حلقۂ تحریر میں شامل رہا۔
دوران عروج سے میری ملاقاتوں کا سلسلہ بھی مستقل صورت اختیار کر گیا۔ اسی زمانے میں ایک نام نہاد سیاسی جماعت
کے نام پر انتشار پھیلانے کا کارِ ثواب انجام دے رہی تھی، میری شاعری کا موضوع بنی۔ اس پس منظر میں میں نے
"اندیشہ" لکھی۔ عروج کو سنائی۔ اس نے اسے اپنے رسالے کے لیے منتخب کیا اور اگلے شمارے میں ایک تفصیلی نوٹ کے
بِ اشاعت کیا۔ اس ادارتی نوٹ میں عروج نے میری ذات اور میری شاعری کے بارے میں ایک اجمالی لیکن گہرا
تحریر کیا۔ پاکستان آنے کے بعد یہ پہلی سطریں تھیں جو میرے بارے میں لکھی گئیں۔ مجھے عروج کو یاد رکھنے کے لیے یہی
کافی ہے۔
جلد ہی مجھے ڈرگ کالونی کے نیم آباد اور نیم برباد بستی میں منتقل ہونا پڑا۔ شہر کی ہمہ وقتی مصروفیات خود بخود سمٹ گئیں۔
ضری کی حد تک شہر سے رابطہ رہ سکا۔ خدا کا شکر ہے کہ اسی بستی میں حمایت علی شاعر، اطہر نفیس مرحوم، تحسین سروری
قی امروہوی، مسلم ضیائی مرحوم کے علاوہ رحمان کیانی مرحوم، مختار حیات، حسین انور مرحوم اور کئی ایسے ساتھی مل گئے کہ
ن کی مصروفیات کا قرض بہ حسن و خوبی ادا ہوتا رہا۔ اسی محفل میں گاہ گاہ عروج بھی شریک ہو جاتے اور پھر ان کو جی بھر کر
نے مل جاتا۔ عروج کم بولتے اور بہت ہی کم شعر سناتے لیکن جب چند ہم مزاج اور ہم خیال لوگوں میں گھر جاتے اور اس
زگار پاتے تو پھر ان کا جھجکنا قابلِ دید ہوتا۔ اور شعر سُنانا قابلِ حیرت ہے! مجھے خوشی ہے کہ میں نے عروج جیسے کم سخن،

سے کھل کر باتیں کی ہیں اور بہت تفصیل کے ساتھ ان کی نظمیں اور غزلیں سنی ہیں۔

میں نے روزنامہ "حریت" کراچی میں کم و بیش دس سال تک مستقل ہفتہ وار کالم لکھے ہیں۔ اس پوری مدت میں مجھے عروج کو بہت قریب سے دیکھنے کے مواقع ملے۔ اپنے پروگرام کے مطابق میں ہر ہفتہ ایک مخصوص دن اپنا کالم لے کر خود پہنچتا۔ ہر چند کہ یہ ضروری نہیں تھا کسی اور کے ذریعے بھی کالم بھجوایا جا سکتا تھا لیکن میں نے حاضری کو فرض کی طرح اپنے اوپر عائد کر رکھا تھا کہ اس بہ اخبار کے دوستوں سے ملاقات کا سلسلہ قائم رہے۔ تعلقاتِ عامہ کے شعبے سے وابستگی کے پیشِ نظر یہ میرے فرائضِ منصبی کا حصہ بھی تھا اور میری دلی مسرت کا باعث بھی۔ "حریت" کے میگزین سیکشن میں عروج ادبی حصے کے انچارج بھی رہے تھے۔ ان ادبی وقائع نگاری اور ادب کے حالاتِ حاضرہ پر سیر حاصل گفتگو رہتی۔ ادبی منظرنامے موضوع بنتے اور تخلیقی رفتار کے حوالے سے شہر میں قابلِ ذکر لکھنے والوں پر بھی تبادلہ خیال رہتا۔ اور ان تمام باتوں سے یہ اندازہ ہوتا کہ بظاہر الگ تھلگ رہنے والے عروج کی نظریں ان تمام عوامل پر کتنی گہری اور کس قدر تیز ہیں۔

عروج کسی عالمی مشاعرے یا بین الاقوامی کانفرنس میں کبھی شریک نہیں ہوئے۔ حد یہ ہے کہ اکادمی ادبیاتِ پاکستان اسلام آباد کے منتظمین نے بھی غالباً ان کو کبھی یاد نہیں کیا۔ یہ اچھا ہی ہوا۔ یوں بھی تخلیقی قد ناپنے کے لیے مشاعرے، کانفرنسیں یا غیر ملکی سفر معتبر پیمانے نہیں۔

دنیا کے تمام فنونِ لطیفہ میں شعر و ادب لطیف ترین فن ہے۔ اسی لیے یہ توقع عین فطرت ہے کہ شاعر و ادیب کو نفیس ترین مخلوق ہونا چاہیے۔ لیکن حالات اور تجربات اس توقع کے برعکس ہیں۔ شاید اس لیے کہ اس پاکیزہ دنیا میں مختلف چور دروازوں سے ایسی مخلوق بھی داخل ہو گئی ہے جو ریاضتِ فن سے زیادہ تعلقاتِ عامہ کے ذریعے یا عہدے، اختیار اور غلط بخشی کے ذریعے حقیقی تخلیق کاروں پر غالب آ گئی ہے اور اقدار و معیار کا معاملہ خلط ملط ہو گیا ہے۔

شکست و ریخت کے اس تناظر میں عروج اور عروج جیسے دوسرے بہت سے اہلِ قلم قابلِ مبارک باد ہیں کہ ان کا شمار ایسے مشاہیر میں نہیں ہوتا۔ اسی تسلسل میں عروج کی اس ایک سطر پر میں اس تعزیت نامے کو ختم کرنا چاہتا ہوں جو انھوں نے اپنی کتاب "رجالِ اقبال" میں آصف گونڈوی کے فکری اور سماجی رویّے کے بارے میں لکھی تھی۔ دراصل یہ سطر، یہ چند قیمتی لفظ، یہ سچا فقرہ خود عروج پر بھی صادق آتا ہے۔

"دنیا کا ہر شریف فن ریاض اور رکھ رکھاؤ چاہتا ہے۔"
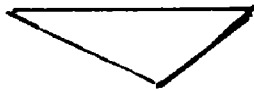
اسلوب احمد انصاری

حرفے چند

("نقد و نظر" علی گڑھ، ایک نہایت موقر تنقیدی ششماہی ہے "قومی زبان" نے اس کے فاضل مرتّب اسلوب احمد انصاری صاحب کی خاص اجازت سے اس کے بعض مضامین مستقل طور پر شائع کرنے کا فیصلہ کیا ہے۔ ادارہ اس اجازت کے لیے انصاری صاحب کا ممنون ہے)

(مندرجہ ذیل مضمون جلد نمبر ۸ شمارہ نمبر ۲ ۱۹۸۶ء سے لیا گیا ہے۔)

عرصۂ دراز کی بات ہے جب فرانسیسی علامتی شاعر ملارمے نے نظم کے خود مکتفی ہونے کا تصوّر پیش کیا تھا۔ اس کا خیال
ا نظم کوئی سیاق و سباق نہیں رکھتی۔ وہ ایک قائم بالذات اکائی ہے اور خارجی کائنات کے احوال و کوائف سے وہ اس درجے
ملق ہوتی ہے کہ اس کی طرف وہ کسی بھی طرح ہمارے ذہن کو منتقل نہیں ہونے دیتی۔ بہ الفاظِ دیگر وہ NON-MIMETIC
بھی ہوتی ہے اور SELF-CONTAINED بھی اور NON-REFERENTIAL بھی۔ نظم کی مثال موسیقی سے دی جاسکتی ہے جو
معنی نہیں رکھتی اور اپنا جواز آپ ہی ہوتی ہے۔ اس میں اگر کوئی معنی متعیّن کرنا چاہیں تو اسے ایک طرح کے جھنکار
نے والے معنی یعنی RESONANT MEANING سے تعبیر کیا جاسکتا ہے۔ امریکی شاعر پو POE نے اس سے ملتا جلتا یہ
پیش کیا تھا کہ طویل نظم ایک طرح کی تردیدِ خود کی حامل ہے۔ کیونکہ تجربے کی وہ تندی اور تیزی جو اسے وجود میں
ہے، زیادہ دیر تک برقرار نہیں رکھی جاسکتی۔ بعد میں ملارمے کو اس امر کا احساس ہوا کہ نظم کا اس کا یہ تصوّر محض ایک آئیڈیل
یثیت رکھتا ہے اور اگر اس پر مستقل اصرار کیا جائے تو یہ ادبی شہ کار کی تقلیل و تخفیف یعنی ATTENUATION کا
ث ہوسکتا ہے۔ اور لامعنویت یعنی MEANINGLESSNESS پر منتج ہوگا۔ امریکی نقاد ARCHIBALD MCLEISH
ی کم ویش اسی قسم کی رائے کا اظہار کیا تھا۔ جب اس نے کہا:

A POEM MUST NOT MEAN, BUT BE

مے نے جو بات کہی تھی، وہ علامتی شاعری کے پس منظر میں کہی تھی۔ اور جو بات ایک مخصوص قسم کی شاعری کے بارے میں
ہو، اس کا اطلاق بجنسہٖ اور لازمی طور پر شاعری پر بالعموم یعنی تمام اصنافِ سخن پر نہیں کیا جاسکتا کہ شاعری ایک بُتِ

ہزار شیوہ ہے اور اس کے شیوُن گوناگوں ہیں۔ اگر ملارمے اور پو کی بات من و عن اور کلیتہً تسلیم کر لی جائے تو رزمیہ شا
کے بارے میں آپ کیا کہیں گے ؟ اردو نقّاد جو انگریزی، فرانسیسی اور امریکی نقّادوں کے نظریات اور افکار کو لے دوڑ
ہیں وہ ان افکار و نظریات کے ترک کر دیے جانے یا ان میں قابلِ لحاظ ترمیم و تنسیخ ہو جانے کے بعد بھی ان کی تکرار کر
رہتے ہیں۔ ان کا اصرار اب تک اس امر پر ہے کہ ایک نظم یا شاعری کا عموماً اپنی کائنات سے باہر اور کسی شے سے ارتباط نہیں
اور نہ ہونا چاہیے۔ باوجودیکہ خالص شاعری یعنی PURE POETRY کا تصور کب کا ختم ہو چکا۔ ردِ عمل کے طور پر تو ا
رائے کا کچھ نہ کچھ جواز نکلتا ہے، مثلاً اس خیال کے ردِ عمل کے طور پر کہ شاعری کا مقصد براہِ راست کسی صحیفۂ اخلا
کی تعلیم دینا ہے، یا کسی معاشرتی، سیاسی یا فلسفیانہ نقطۂ نظر کا ابلاغ یا اس کی ترسیل ہے، یا طبقاتی کشمکش کا شعور
کرنا اور اسے منعکس کرنا ہے۔ اردو ادب میں ترقی پسند تحریک کے نام لیوا ادب کو اپنے سیاسی منشا یا پروگرام کی نشر
اور نشر و اشاعت کا موثر ترین وسیلہ جانتے ہیں۔ ان کے عقیدے کی بنیاد یہ مفروضہ ہے کہ فنی ادبی شہ کار ایک سماجی
ہے، الفاظ خود سماجی ضرورتوں کو پورا کرتے ہیں اور ادب کا مقصد اس سماجی حقیقت کو جسے پیداواری رشتے متعین کر
ہیں، منقلب کرتا ہے۔ یہ سماجی حقیقت چونکہ ان طبقات سے متعلق ہے جو سماجی سانچے کو ڈھالتے ہیں۔ اس لیے ان
مابین کشمکش اور سماجی ڈھانچے میں موجود وہ تضادات جو ایک خاص مرحلۂ ارتقا پر ظاہر ہوتے ہیں، ادب کی ہر لسانی
تنظیم میں ظاہر ہونے چاہئیں۔ اس طرح ادبی شہ کار کوئی قائم بالذّات اکائی نہیں، نہ کوئی تخلیقی تجربہ، بلکہ انسانی فطا
کے دوسرے اظہارات کی طرح یہ اس پہلو یا مرحلے کا عکس ہے جہاں تک پیداواری رشتے پہنچ چکے ہیں۔ یہ نظر
ادب کے بنیادی طریقِ کار سے عدم واقفیت پر دلالت کرتا ہے۔ لیکن اسی کے خلاف ردِ عمل کے طور پر یہ گمان کرنا کہ ادب
زندگی اور اس میں بصیرت کے اظہار سے قطعی لاتعلق ہوتا ہے، صحیح نقطۂ نظر سے انحراف اور ایک طرح کے غلو کے مترادف ہے
جب ہم یہ کہتے ہیں کہ الفاظ اپنی اندرونی توانائیاں رکھتے ہیں اور معنی تک رسائی انہی کے ذریعے ممکن ہے یا معانی کا انکشاف
الفاظ ہی کے ذریعے ہوتا ہے، تو ہم گویا یہ تسلیم کرتے ہیں کہ معنی تک پہنچنا بہرحال لازمی اور لابدی ہے۔ اس کے بعد ظاہر ہے
مسئلہ رہ جاتا ہے کہ معانی کے کیا معنی ہیں؟ یہ وہی سوال ہے جو آج سے برسوں پہلے مشہور نقّاد آئی۔ اے رچرڈس نے اپنی ا
موضوع پر کتاب میں اٹھایا تھا اور جس کے مختلف النوع جوابات اب تک دیے جاتے رہے ہیں۔ ان میں قابلِ ذکر ثنویت
یعنی POSITIVISM کے ماننے والے ہیں۔ اور STRUCTURALISM تحریک کے سوئسٹانی بانی SAUSSURE پراگ کے
TRUBETSKOY اور امریکی نمائندے ساپیر اور بلوم فیلڈ کہے جا سکتے ہیں۔ کیا شاعری کا مقصد مجرد خیال کا ابلاغ ہے یا کسی
نظریے کا جوں کا توں نظم کر دینا ہے؟ دونوں کا جواب یکساں طور پر نفی میں دینا ہوگا۔ خیال یا تصور یا نظریے کا مفہوم کیا
ہے؟ کیا خیال اور تصور کے مرکب میں جذبے اور احساس کو بھی شامل کیا جا سکتا ہے؟ اور کیا یہ مترادف ہے وقیع انسانی تجربات
میں بصیرت کے؟ اگر ایسا ہے تو اسے شاعری کی اقلیم سے کیسے دربدر کیا جا سکتا ہے؟ اور اگر نہیں کیا جا سکتا تو اس کے ابلاغ
کی صورت کیا ہو؟ کیا یہ ابلاغ براہِ راست ہوتا ہے یا حرف و صوت کی ایک محسوس اور پیچیدہ تنظیم کے ذریعے یا ایک ایسے
عضویاتی کل کے وجود میں آنے سے جس کے اجزا کو الگ الگ تصور نہیں کیا جا سکتا؟ یہاں جدید دور میں اس نظر کے منظرِ عام

نے کا ذکر بھی ضروری ہے جسے SEMIOTICS کہا جاتا ہے اور جسے آئی۔ اے رچرڈس ہی کے نظریۂ ترسیل کی ایک طور
سیع سمجھنا چاہیے۔ حرف وصوت اور معنی کا باہمی رشتہ جسم وجان کا سا ہے کہ انھیں ایک دوسرے سے منقطع نہیں کیا جا سکتا۔
س کرنا درست نہیں ہے کہ کسی نظم یا غزل یا تمام نظم کی وقعت کا انحصار محض مناسبات لفظی یا بہ الفاظ دیگر اس کے
وتی اور مقامی بناوٹ پر ہے۔ یہ صحیح ہے کہ کسی نظم کا عنوان موضوع یا اس کی تلخیص کو متبادل قرار نہیں دیا جا سکتا۔
ی اور زندگی کے مابین بقول اے۔ سی بریڈلے ایک تیرہ زمیں علاقہ ہوتا ہے لیکن اس کے باوجود مواد خارج سے اخذ
اتا ہے وہ شعری ڈھانچے میں داخل ہونے کے بعد اور اس میں ڈھل کر اپنا رنگ روپ بدل ڈالتا ہے۔ یعنی تجربہ علامت
بدیل ہو جاتا ہے جو نظم یعنی ORDER اس سانچے سے ابھرتا ہے اسے مرے کریگر نے ایک طرح کے سکونی نقطے یا
EKPHRASTIC FIX کا نام دیا ہے۔ خام مواد کی یہ منقلب شکل ہی پایان کار معتبر ٹھہرتی ہے، لیکن ہمیں یہ فراموش
کرنا چاہیے کہ ادبی فن پارہ عبارت ہے دو اجزا کے انضمام سے یعنی ایک جزو اس کی لسانیاتی تنظیم اس کا TEXTURE
وسری وہ قدر یعنی VALUE ہے، جسے اس ڈھانچے یا تنظیم میں متشکل کیا گیا ہے۔ یا جسے ہم سہارا دینے والی اکائی تصور کر سکتے
پیرایۂ بیان کو بدل کر ہم اسے آرٹ کے SEMIOTIC اور AXIOLOGICAL پہلوؤں سے تعبیر کر سکتے ہیں۔ ہر ادبی کارنامہ
بیں کسی نہ کسی بصیرت کی خارجی تجسیم کے ہم معنی ہے۔ یہ بصیرت خالص انفرادی اور ذاتی بھی ہو سکتی ہے اور ان اقدار کے
ف سے بھی عبارت ہو سکتی ہے جن کے لیے فن کار کا شعور ایک معمول یعنی MEDIUM کا وظیفہ انجام دیتا ہے۔ البتہ یہ ضرور
اس کا اظہار اس طور پر کیا جانا چاہیے۔ گویا وہ بصیرت اوپر سے مسلط نہیں کی گئی ہے بلکہ لسانیاتی ڈھانچے کے اندر پیوست
ہے اور اسی سے ابھر رہی ہے۔ بہ الفاظ دیگر دونوں کے مابین ارتباط کلی اور مطلق ہم آہنگی لازمی ہے۔ ہم یہ کہنے میں بالکل
بانب ہیں کہ شعر کی منطق سائنس کی منطق سے یکسر مختلف ہوتی ہے۔ جہاں سائنس کا سروکار امر واقعہ یا محسوس یعنی
PERCEPTI مواد سے ہوتا ہے، وہاں فن کا واسطہ غیر محسوس یعنی IMPERCEPTIBLE حقیقت سے ہوتا ہے جو
لذکر کی بنیاد پر ابھرتی ہے لیکن اس سے مختلف ہوتی ہے۔ فن کی ترصیع کا عمل علامات اور استعاروں کے ایک گتھے ہوئے
سے عبارت ہوتا ہے۔ یعنی الفاظ، محاکات، علامتیں اور استعارے یہ سب مل جل کر ایک ایسے تانے بانے کو وجود میں
یں جو شعری دقعتوں کی ترسیل کا ایک موثر وسیلہ بن جاتا ہے لیکن یہ تانا بانا مقصود بالذات نہیں ہوتا۔ تجسیم، ترسیل
ب طرح کا ENACTMENT یہ تینوں بنیادی طور پر باہم گر مربوط ہیں اور ایک وحدت کلی کے اجزائے ترکیبی، اور انھیں
قوت بخشتی یعنی ENERGIZE کرتی ہے وہ فن کار کا وژن ہے

ترقی پسند ادیب ایک طرح کی حقیقت نگاری میں یقین رکھتے ہیں اور خارجی حقیقتوں کے فنی کارنامے میں براہ راست
نشگاف طور پر انعکاس پر زور دیتے ہیں وہ اسے ایک آلۂ کار کے طور پر استعمال کرنا چاہتے ہیں لیکن فنی کارنامے کا
معاشرے کو بدلنا نہیں ہے نہ طبقاتی کشمکش کو تیز کرنا اور روشنی میں لانا، نہ بورژوا والی طبقے کی مذمت کرنا اور نہ
سیاسی، معاشرتی اور معاشی پروگرام اور لائحۂ عمل کا پرچار کرنا۔ یہ سب فنی تخلیق کے دائرے سے خارج ہیں۔ اس کا
ور آخری مقصد بنیادی ردعمل اور رویوں کی تہذیب کرنا اور حقیقت آخری کا غیر شعوری طور پر انکشاف ہے یہ تنقید نگار

کا مطمع نظر یہ ہونا چاہیے کہ وہ پہلے فنی کارنامے کو اپنی توجہ کا مرکز بنائے اور اس کے وسیلے سے خارجی حقیقتوں کا کھوج لگائے اور ان کی وقعت کا تعین کرے۔ یعنی ایک خود مکتفی کل سے بیرون کی طرف اپنے سفر کی سمت کو موڑے۔ ادبی کارنامے کے سلسلے میں جرمن فلسفی کانٹ نے بے شک منضبط تجربے یعنی PATTEREND EXPERIENCE کا ذکر کیا ہے لیکن اسی نے PURPOSIVENESS WITHUOT PURPOSE کی بلیغ اصطلاح بھی استعمال کی ہے۔ اسی کے پہلو بہ پہلو عظیم انگریز نقاد ایف۔ آر۔ لیوس نے LUDDITES OR THERE IS ONLYONE CULTURE میں بالصراحت کہا ہے کہ وہ ادبی قدروں میں یقین نہیں رکھتے، اور کوئی شخص انھیں ان کا ذکر کرتے ہوئے نہیں پائے گا۔ مزید یہ کہ ادبی نقاد جن محاکموں سے سروکار رکھتا ہے وہ زندگی ہی کے بارے میں ہوتے ہیں۔ اسی طرح خواجہ منظور حسین صاحب نے اپنی تخلیق "تحریک جدوجہد" بہ طور موضوع سخن میں اس رائے کا اظہار کیا ہے کہ کسی بھی ایسے فنی کارنامے کا چاہے وہ ڈراما ہی کیوں نہ ہو، تصور نہیں کیا جاسکتا جو کسی نہ کسی حد تک خارج میں موجود حقیقتوں سے ارتباط نہ رکھتا ہو۔ شیکسپیئر کے طربیے ڈرامے بھی جیسا کہ اہلِ نظر سے مخفی نہیں، محض تفننِ طبع کا ذریعہ نہیں ہیں بلکہ ان کے پس پشت اور ان کی تہہ میں ایک طرح کی اخلاقی بصیرت موجود ہے اور انسانی تعلقات کے تانے بانے کی پیچیدگیوں اور نزاکتوں پر ان کی بنیاد رکھی گئی ہے گو ایک طرح کی ترصیع کاری یعنی ARTIFICE بھی لازمی طور پر ان میں پیوستہ ہے۔ فنی کارنامے کا مسالہ بہرحال زندگی ہی سے اخذ کیا جاتا ہے اور محض حرف وصوت کی توانائیوں پر زور دینا کافی نہیں ہے۔ یہ کہنا صحیح ہے کہ شاعری میں جو کچھ منعکس کیا گیا ہے، یعنی اقدار، نظریے یا بصیرتیں انھیں دوسری جگہوں پر بھی ڈھونڈا جاسکتا ہے اور متعین کیا جاسکتا ہے مگر شاعری میں ان سب کی سمائی زیادہ کفایت، معنی خیزی اور حساسیت کے ساتھ عمل میں آتی ہے، لیکن یہ بھی اسی قدر صحیح ہے کہ شاعری میں خیالات اور ان کی جذباتی وابستگیاں بھی اپنا اہم مقام رکھتی ہیں۔ جس پیوستگی یعنی OHERENCE کا ذکر اس سلسلے میں کیا جاتا ہے وہ بھی بہر صورت ان دونوں کی تنظیم یافتہ صورت کے اردگرد ہی اپنا مقام رکھتی ہے۔ اس پر یہ اضافہ کرنا بھی ضروری کہ شاعری کی خطیبانہ یعنی RHETORICAL اور اظہاریت سے متصف ابعاد یعنی EXPRESSIVE DIMENSIONS کے باوجود اس کی بڑائی اور اہمیت کا انحصار پایانِ کار تجربے کے اس رقبے کی وسعت پر ہوتا ہے جو اس میں سمٹ آیا ہے۔

انور خان

قرۃ العین حیدر کے مختصر افسانے

بیدی نے انسان کو مرد و عورت کے ازلی ARCHE TYPAL رشتوں میں دیکھا۔ منٹو نے معمولی آدمیوں کو غیر معمولی حالات و مقامات میں اور قرۃ العین حیدر نے معاشروں اور تہذیبوں میں زندگی بسر کرتے انسانوں کو وقت کے ایک وسیع تناظر میں۔ یہ ان کی غیر معمولی بصیرت تھی جس نے ہمیں انسانوں کے مطالعے کے تین مختلف وژن دیے۔ یہ تینوں وژن ہمیں آئندہ بھی ملتے رہیں گے۔ یہ بھی ممکن ہے کہ کوئی ایک افسانہ نگار اپنے الگ الگ افسانوں میں ان تینوں وژنز کا استعمال کرے۔ تینوں ہی مشکل ہیں اور غیر معمولی مشاہدے اور مطالعے کا تقاضہ کرتے ہیں۔

انسان کو تاریخ اور معاشروں کی شکست و ریخت کے سیاق و سباق میں سمجھنے کی منزل تک پہنچنے میں قرۃ العین کو افسانہ نگاری میں کم از کم دس سال درکار ہوئے۔ ابتدا انھوں نے رومانی افسانوں سے کی۔ عہدِ شباب کی دوستیاں، آرزوئیں، خواب اور تصوّرات۔ "ستاروں سے آگے" اور "شیشے کے گھر" کے افسانوں کی وجہ سے انھیں ایک منفرد افسانہ نگار تو سمجھا گیا مگر اہم نہیں۔ ان افسانوں کے پیشِ نظر انھیں حجاب امتیاز علی اور شفیق الرحمان کے ساتھ جوڑ دیا گیا۔ بقول مجتبیٰ حسین حجاب کی بوڑھی زوناش، شفیق الرحمان کا کھلنڈرا ہیرو اور قرۃ العین حیدر کی ناول کی پڑھی ہوئی مغموم لڑکی۔ تینوں اپنے گرد و پیش کی زندگی سے الگ ہو کر جینا چاہتے ہیں۔ ان افسانوں سے نثر پر قرۃ العین کے قابو کا پتا ضرور چلتا ہے۔ رواں دواں بہتی ہوئی نثر لکھنے کا اپنا ایک انداز۔ لیکن افسانوں میں ایسی کوئی بات نہیں جو قاری کو پڑھنے پر مجبور کر سکے۔ ان دو مجموعوں میں صرف "جلا وطن" ایک ایسا افسانہ ہے جس کا شمار ہم آج بھی ان کے نمائندہ افسانوں میں کر سکتے ہیں۔ جلا وطن، شیشے کے گھر، مجموعے کا آخری افسانہ ہے اور اس افسانے کے ساتھ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ قرۃ العین نے اپنا موضوع بالآخر پا لیا۔ یعنی مشترکہ ہندوستانی تہذیب اور تقسیم، جس نے اس تہذیب کو ختم کر دیا۔

"جلا وطن" کا مرکزی کردار آفتاب رائے جس کا نام ہی ہندو مسلم مشترکہ تہذیب کی دین ہے انٹلکچوئیل آدمی ہیں اور سول لائنز کے شرفا سے الگ تھلگ رہتے ہیں۔ کنول کماری جین سے عشق کرتے ہیں، لیکن شادی کا فیصلہ نہیں کر پاتے ولایت چلے جاتے ہیں۔ وہاں انھیں پتا چلتا ہے کہ کنول کماری کی شادی ہو گئی۔ آفتاب رائے پندرہویں صدی کی بھگتی تحریک پر کتاب لکھنے کا ارادہ رکھتے ہیں لیکن انھیں ذہنی سکون میسر نہیں۔ پہلے تو کنول کماری کی محبت انھیں مضطرب رکھتی ہے۔

یہ معاشی دشواریاں ۔ ولایت سے واپس آکر وہ بنارس میں لیکچرار ہو جاتے ہیں جہاں دن رات ہندی اور ہندوستانی کے گن گائے جاتے ہیں۔

کہانی کا ایک مرکزی کردار کشوری (کشور آرا بیگم) کا ہے۔ کشوری ڈپٹی کلکٹر جعفر عباس کی لڑکی ہے۔ جعفر عباس ڈپٹی کلکٹر ہونے کے باوجود کٹر قوم پرست ہیں لیکن کشوری مسلم لیگی ہے جس کے نزدیک تقسیم کا مطالبہ ہندوستان کی ساری تاریخ کا فطری اور منطقی نتیجہ ہے۔ آفتاب رائے بنارس سے لکھنؤ آجاتے ہیں یہاں بھی سیاسی ہنگامے زوروں پر ہیں۔ آئے دن طلبہ کے جلوس نکلتے رہتے ہیں۔ ملک کی تقسیم ہو گی نہیں ہو گی۔ ایک دن ایک ہندو طالب علم کے یہ کہنے پر کہ آزادی کا مطلب مکمل سوراج ہے۔ ہند کی دھرتی کو پھر سے شدھ کرنا ہے۔ اچھا خاصا ہنگامہ ہو جاتا ہے۔ اگلے روز کشوری جلوس بنا کر آفتاب رائے کے پاس پہنچتی ہے اور ان سے اور رنگ زیب پر اپنے ریمارکس پر معافی کا تقاضہ کرتی ہے۔

آفتاب رائے حیرت سے کشوری کو دیکھتے ہیں۔ ان کے لیے تو وہ بس ڈپٹی جعفر عباس کی باؤلی سی بٹیا ہے۔ بہرحال وہ کسے ماحول میں ہیں۔ وہ متانت سے جواب دیتے ہیں کہ، معافی کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ تاریخ کے متعلق میرے چند نظریات اور اصول ہیں۔ میں، اور تمہاری دل آزاری کروں گا؟ کیا باتیں کرتے ہو؟

لڑکے راضی نہیں ہوتے اور اسٹرائیک کا اعلان کر دیتے ہیں۔

دن بدن ماحول بگڑتا جاتا ہے۔ ایک دن آفتاب رائے غائب ہو جاتے ہیں۔ پھر تقسیم کا ہنگامہ آتا ہے۔ کشوری کے بھائی پاکستان چلے جاتے ہیں لیکن کشوری اپنے والد کے ساتھ لکھنؤ میں رہ جاتی ہے۔ ملازمت کے حصول کے لیے سرگرداں رہتی ہے مگر ملازمت نہیں ملتی۔ آفتاب رائے کے بارے میں معلوم ہوتا ہے کہ بمبئی میں حکومت کے خلاف تقریر کرنے کے جرم میں ان کو احمد آباد جیل میں بند کر دیا گیا ہے۔ پھر معلوم ہوتا ہے انھیں رہا کر دیا گیا۔ کبھی افواہ پھیلتی ہے کہ وہ روس میں ہیں اور سمرقند ریڈیو سے اردو میں خبریں سناتے ہیں۔ پھر کوئی کہتا ہے کہ وہ کسی چھوٹے موٹے ملک کے سفیر بنا دیے گئے ہیں۔ کشوری کو ملازمت نہیں ملتی تو وہ اسکالرشپ لے کر لندن پہنچتی ہے۔ پاکستان میں اب اسے کوئی چارم نظر نہیں آتا۔ کشوری اور آفتاب رائے دونوں ایک ہی سے ماحول کے پروردہ ہیں اور تقسیم کے بعد مختلف مذہبوں سے تعلق رکھنے کے باعث تہذیبی سطح پر خود کو اب جلا وطن محسوس کرتے ہیں۔

اس کہانی میں قرۃ العین کا فن اپنے عروج پر ہے۔ روزمرہ کی آسان نثر، دلچسپی کی چھوٹی چھوٹی باتیں۔ اودھ کی تہذیب کی عکاسی جس میں ہندو محرم مناتے ہیں اور مسلم پردہ نشین عورتیں شادی بیاہ کے موقعوں پر "گگری موری ڈھ شام"، ڈھولک کی تھاپ پر گاتی ہیں۔ میوزک کانفرنسیں اور سیاسی جلسے۔ طلبہ کی ہڑبونگ۔ ایک بہت ہی اہم موضوع کو قرۃ العین حیدر نے بڑے سہج ڈھنگ سے لکھا ہے۔ بے تکلف بظاہر بے پروا، شگفتہ اسلوب۔ مصنف اس المیے میں پوری طرح شریک۔ لیکن جیسے کوئی ہنستے کھیلتے اپنی روداد غم سنا جائے۔ آفتاب رائے اور کشوری کے المیے بیان کر جاتا ہے۔ رومانیت یہاں موضوع میں ہے، اسلوب میں نہیں اس لیے تاثر دوبالا ہو جاتا ہے۔

یہی موضوع ۱۹۵۹ء میں انھوں نے اپنے ناول "آگ کا دریا" میں پورے تاریخی تناظر کے ساتھ پیش کیا —

"آگ کا دریا" اردو ادب کا ایک ایسا سنگ میل ہے جس کے بعد ادب کا سارا منظرنامہ بدل جاتا ہے۔ تہذیبی، ثقافتی عناصر، اساطیر اور ہندوستانی مظاہر سے استفادہ کرنے کا خیال جو ترقی پسند تحریک کے عروجی دور میں گناہ عظیم ہوتا۔ اسے ماضی کی طرف مراجعت، اجداد پرستی یا زوال پسندی کا نام دیا جاتا۔ نئے ادیبوں کو اپنے شعور سے نزدیک تر معلوم ہوا۔ یہ گویا ان کی سائیکی کا ایک حصہ تھا جسے وہ فراموش کیے ہوئے تھے۔ اب انہیں معلوم ہوا کہ مادیاتی جدلیات ایک معروضی اور اہم طریقۂ کار ہے۔ لیکن اپنے ماضی کو سمجھے اور برتے بنا آپ خود کو اس سے علاحدہ بھی نہیں کر سکتے۔ نہ ہی آگے بڑھ سکتے ہیں۔ بھوت کی طرح وہ آپ کا پیچھا کرتا رہتا ہے۔ ایک صداقت یہ بھی اب عام ہوئی ہے کہ ہمارے اساطیر، ملفوظات دراصل ماضی کا ایک ایسا خزانہ ہیں کہ اگر ہم ان کی خفیہ زبان (SECRET LANG) کو سمجھ لیں تو ایسے ازلی و ابدی حقائق ہم پر آئینہ ہو جائیں گے جو انسان کی صدہا سال کی خاندانی اور سماجی زندگی کا نچوڑ ہیں۔ انتظار حسین نے اس دوران "زرد کتا" اور "آخری آدمی" لکھ کر اساطیر و ملفوظات کو نئی عصری حیثیت کے ساتھ ادب میں پیش کرنے کی راہ سجھائی۔ بقول عبدالمغنی "تقسیم ہند کے المیے نے پوری ہندوستانی تاریخ کو سرحد کے دونوں طرف تعلیم یافتہ لوگوں کے لیے ایک سوالیہ نشان بنا دیا تھا۔ اور باشعور افراد اپنی جڑوں کی تلاش کرنے لگے تھے خاص کر نئی نسلوں کا دماغ سوالات سے بھرا ہوا تھا۔ ایک مشترکہ تہذیبی ورثے کے منقسم و منتشر ہونے کا احساس بھی شدید تھا۔ اسی عالم میں "آگ کا دریا" وقت کی ایک چیز بن کر اردو پڑھنے والوں کے لیے آیا اور لوگ اپنے پریشان کن ذہنی سوالات کا جواب تلاش کرنے کے لیے اس پر ٹوٹ پڑے۔ اس کیفیت میں تاریخ کے تناظر اور فلسفیانہ اندازِ بیان نے باخبر افراد کو بہت زیادہ پریشان کیا..... ناول پڑھ کر لوگ ایک گہری سوچ میں گم اور قصے کے کردار کے احساسات میں شریک ہو گئے۔

"آگ کا دریا" جیسے عہد ساز ناول کے بعد قرۃ العین کے چند بہت عمدہ افسانے سامنے آئے۔ جیسے "قلندر"، "ڈالن والا"، "یاد کی ایک دھنک جلے"۔ "پت جھڑ کی آواز" وغیرہ۔ رواں دواں، خوبصورت اور بے تکلف نثر تو ان کے یہاں پہلے سے تھی ہی "شیشے کے گھر" کے افسانوں سے ہی اس کا پتا چل جاتا ہے۔ ان افسانوں میں جو بعد میں یعنی ۱۹۶۷ء میں "پت جھڑ کی آواز" کے عنوان سے کتابی شکل میں شائع ہوئے۔ قرۃ العین نے بعض بڑے خوبصورت کردار پیش کیے۔ "قلندر" کا اقبال بخت اور سکینہ اردو افسانے کا ایک ایسا ہی ناقابلِ فراموش کردار ہے۔ کائستھ گھرانے کا ایک قلندر صفت شخص جس کی زندگی کی کہانی کے ایک چھوٹے سے قصبے سیتاپور سے شروع ہو کر لندن، پیرس، ماسکو اور فلاڈیلفیا میں بسر ہوتی ہوئی بمبئی تک پہنچی ہوتی ہے جہاں قصہ ختم ہو رہا ہے۔ ایک نیک انسان جو زندگی میں بہت سے غلط کام کرتا ہے لیکن پوری نیک نیتی کے ساتھ۔ جب ایک پاکستانی شیعہ لڑکی اسے مسلمان سمجھتی ہے تو اس کی تسلی کے لیے وہ شیعہ مسلمان بن جاتا ہے۔ جب اس کے پاکستانی دوست افسوس ظاہر کرتے ہیں کہ ماسکو میں دنیا کے مزدوروں کی کانفرنس میں پاکستان کی نمائندگی نہیں ہوگی تو وہ ان کی طرف سے ایک پاکستانی بن کر مزدور کانفرنس میں ان کا جھنڈا لہراتا ہے اور مطلبی فرید آبادی کا ایک گیت بھی گاتا ہے۔ جب وہ دیکھتا ہے کہ ایک امیر بیوہ سے کوئی بات تک نہیں کرتا اور وہ بالکل اکیلی ہے تو وہ اس کی غمگساری میں شریک ہو جاتا ہے۔ آخر میں مصنفہ کو وہ بمبئی میں نظر آتا ہے۔ ایک سوامی کے روپ میں جس کے چرن چھونے اور آشیرواد لینے پٹھان عورتیں جوق در جوق جا رہی ہیں۔ کہانی کا اختتام ان الفاظ پر ہوتا ہے:

"مجھے یقین تھا کہ اگر میں پوچھتی اقبال بھائی ــــ آپ نے اب کی بار اتنا لمبا چوڑا فراڈ کیوں کیا ؟ تو وہ جواب دیتے، دیکھو منّی ــــ دنیا شانتی کی تلاش میں دیوانی ہو گئی ہے ــــ اب اگر میں اس بھیس میں چند دکھی آتماؤں کو تھوڑی سی شانتی دے سکتا ہوں تو اس میں میرا کیا حرج ہے ؟

اور کیا معلوم اقبال بھائی خود بھی مُکتی کے راستے پر پہنچ گئے ہوں۔ اپنے دل کے بھید وہ خود جانتے دوسرے جاننے والے کون ؟"

ایک چھوٹے سے کردار کو اس بلندی تک پہنچانا قرۃ العین حیدر کے کرافٹ کا کمال ہے۔ یہ وسیع النظری، یہ وژن، یہ انسانی ہمدردی اور دردمندی کا یہ احساس اردو افسانے میں قرۃ العین حیدر کو دوام عطا کرتا ہے۔

کرافٹ پر ایسی قدرت ظاہر ہے نثر کے حسن کو قابو میں لائے بغیر ممکن نہیں۔ وہ لفظوں کو جس طرح چاہتی ہیں موڑ لیتی ہیں۔ کہیں بشاشت، کہیں شعریت، کہیں گہری جذباتیت اور کہیں طنز کا خارا شگاف استعمال اور پھر ایسا بے تکلف اسلوب جیسے قاری کو قصّہ سنا رہی ہوں۔ یہ اقتباس ملاحظہ ہو:

"چند روز بعد آفتاب رائے کے سر میں جانے کیا سمائی کہ استعفا دے دیا اور غائب ہو گئے ــــ سارے میں ڈھنڈیا مچ گئی مگر ڈاکٹر آفتاب رائے نہ اب ملتے ہیں نہ تب۔ لوگوں نے کہا ایک چول ہمیشہ سے ڈھیلی تھی، سنیاس لے لیا ہوگا۔ پھر تقسیم کا زمانہ آیا۔ اب کسے ہوش تھا کہ آفتاب رائے کی فکر کرتا۔ اپنی ہی جانوں کے لالے پڑے تھے۔"

قرۃ العین حیدر کی کہانیوں میں بڑے چھوٹے، اہم، غیر اہم، سارے کرداروں کا اپنا ایک مقام اور اہمیت ہوتی ہے۔ نوکر ہو، ماما ہو، بہشتی ہو، وہ سب کا ذکر بڑی اپنائیت سے کرتی ہیں۔ معلوم ہوتا ہے جیسے یہ کردار کہانی کے لیے مرکزی کرداروں سے کم اہم نہیں۔ بعض کہانیاں، جیسے "یاد کی ایک دھنک جلے"، "قلندر"، "ٹوٹو کراقر"، "نظارہ درمیاں ہے" تو ایسے ہی کرداروں پر ہیں۔ گریسی، جو آیا ہے یا دو غریب پارسی لڑکی پیرو جا دستور، ان کی افسانوی دنیا میں اتنے ہی اہم ہیں جتنے ان کے ناولوں اور افسانوں کے دوسرے کردار۔ ہر ایک کے ساتھ وہ بڑی INTIMATE معلوم ہوتی ہیں۔ ان فلسفی قسم کے کرداروں کے برعکس یہ کردار ان کے افسانوں کو ایک مضبوط زمین فراہم کرتے ہیں جس پر ان کے قدم مضبوطی سے ٹکے ہوئے ہیں۔ اس میں شک نہیں کہ ان میں زیادہ تر کردار عورتیں ہیں۔ اور یہ کردار ہیں محمود ہاشمی کی اس بات پر غور کرنے پر مجبور کرتے ہیں کہ قرۃ العین حیدر کا اصل تھیم زمان و تاریخ کے تناظر میں عورت کا مقدّر ہے (اردو افسانہ روایت و مسائل۔ ص۲۱)

"جلاوطن" کے مرکزی کردار کنول کماری کو لے کر انھوں نے ایک بہت اچھا سوال اٹھایا ہے۔ وہ کہتے ہیں:

"آفتاب رائے نے کنول کی بھینٹ دے کر اپنے آدرش کا تحفظ کیا اور زندگی بھر خود کو پانے کی سعی کرتے رہے۔ کیا کنول کماری کو خود یابی کا حق نہ تھا؟ وہ کیوں بے اختیارانہ ایک ایسی زندگی میں شامل کر دی گئی جو بے معنی تھی۔ کیا کنول کو خود تکمیلی و خود آگہی کا حق نہ تھا؟ کیا عورت کو آج بھی تعلیم حاصل کرنے، لمبی چوڑی ڈگریاں رکھنے، اونچے عہدے اور تنخواہ پانے کے باوجود ایک مستقل بالذّات وجود

سمجھا جاتا ہے؟ قرۃ العین حیدر کے کردار اس کی نفی کرتے ہیں اور وہ عورت کے اس المیے کی طرح طرح سے صورت گری کرتے ہیں۔" (ص ۴۶۳)

اس میں شک نہیں کہ "جلا وطن" اور "آگ کے دریا" سے لے کر "گردشِ رنگِ چمن" تک یہ موضوع مستقل HAUNT کرتا ہے۔ چمپا، کنول کشوری، گریسی، عندلیب، نورما ڈریک، جہاں آرا، دیپالی اور ایسے متعدد کردار بار بار ہمیں اس موضوع پر دعوتِ فکر دیتے ہیں۔

قرۃ العین کے افسانوں میں ایک موضوع اور ہے جو "شیشے کے گھر" کے افسانوں اور ناولوں کا ایک خاص موضوع ہے۔ اور وہ ہے وقت کا انسانی معاشرے میں ایک CATALIST کا رول۔ "آگ کا دریا" میں وہ ایک بہتی ہوئی رو ہے تو آخرِ شب کے ہم سفر اور روشنی کی رفتار افسانوں میں وہ بطور ایک تباہ کن طاقت کے ابھرتا ہے جو جمے جمائے معاشروں کو اکھاڑ دیتا ہے۔ امیروں کو فقیر اور نجیبوں کو میراثی اور دلال بنا کر رکھ دیتا ہے۔ "آگ کا دریا"، اور "آخرِ شب کا ہم سفر" میں اس کے لیے انھوں نے کالی ماتا کا استعارہ استعمال کیا ہے۔ وقت ملفوظاتِ بابا بیکتاشی، روشنی کی رفتار، حسب ونسب، فوٹوگرافر، اور دوسرے افسانوں میں اپنی پوری حشر سامانی کے ساتھ آتا ہے۔ ہر شخص ایک طرف تو اپنے وقت میں جینے کے لیے مجبور ہے۔ اسے اپنے ہی وقت کے دُکھ بھوگنے ہیں۔ دوسرے وقت میں جا کر بھی اسے سکون نہیں ملتا۔ وہ چیخ اٹھتا ہے کہ "میں اپنے وقت میں واپس جانا چاہتا ہوں۔" آدمی وقت کے ہاتھوں بے دست وپا ہے شاید اسی احساس نے انھیں تصوف کی طرف دھکیل دیا ہے۔

قرۃ العین کی کہانیوں میں بس ایک بات کھٹکتی ہے۔ ان کی گہری رومانی جذباتیت جو کبھی کبھی بری طرح چھلکنے لگتی ہے۔ جس طرح بیدی کی کہانیوں میں جنس کبھی کبھی بے ضرورت آجاتی ہے۔ اسی طرح قرۃ العین کے افسانوں میں جذباتیت کا وفور قاری کو پریشان کر دیتا ہے۔ شاید یہ ان کے شخصی اسلوب کی وجہ سے ہے لیکن بیشتر افسانہ نگاروں کے اسلوب شخصی ہی ہوتے ہیں۔ جب ہم بیدی کو سردار ہونے کے ناتے معاف کر سکتے ہیں تو عورت ہونے کے ناتے قرۃ العین کو کیوں نہیں معاف کر سکتے۔

"روشنی کی رفتار" کے افسانوں میں بہر حال یہ جذباتیت، کلبیت یا غصے میں بدل جاتی ہے جو ان کے افسانوں میں رومانیت کے احساس کو بھی کم کرتی ہے۔

"روشنی کی رفتار" کا یہ بیان دیکھیے:

"بتاؤں ــــ؟" اس نے رک کر کہا۔ "بات یہ ہے پدما! کہ مجھے اپنا وقت یاد آرہا ہے۔ میں اپنے وقت میں واپس جانا چاہتا ہوں۔"

"اپنے وقت میں ــــ؟" پدما نے حیرت سے دہرایا۔ "یہ زمانہ چھوڑ کر ــــ؟"

"یہ زمانہ ــــ!؟ اس میں کون سے سرخاب کے پر لگے ہیں ــــ؟" اس نے ہنسی سے کہا اور پھر ٹیلی ویژن کھولا ــــ نیوز ریل میں دنیا بھر میں بپا جنگوں اور نسلی اور مذہبی فسادوں کے مناظر دکھائے جا رہے تھے۔

"بتاؤ مجھ سے سوا تین ہزار سال بعد تم کتنی متمدن ہو ــــ؟ ہم ہی اسرائیل پر ظلم ڈھاتے تھے اور اشوریہ سے لڑتے تھے۔ تم سب ایک دوسرے کے ساتھ بے انتہا پیار محبت سے رہتے ہو۔ ہمارے فراعنہ ستم پیشہ تھے۔ تمہارے فرشتے ہیں۔ ہم موت سے ڈرتے تھے۔ تم موت کے خوف سے آزاد ہو چکے ہو۔ تم عالی شان مقبرے نہیں بناتے، مُردہ نہیں کرتے۔ نوحے نہیں لکھتے۔ شعر و شاعری بھی ترک کر چکے ہو۔

"تمہارے مذہب، فلسفے، اخلاقیات، نفسیات ـــ" وسکی کا گلاس میز پر پٹخ کر زور سے ہنسا۔ "تمہارے دیو نظریہ تثلیث، روحانیت، یہ، وہ، سب عین سائنٹیفک ہیں۔ تمہاری جنگیں ہیومنزم پر مبنی ہیں۔ تمہارا نیوکلیر خالص انسان دوستی ہے ــــ ہے نا ـــــ؟ تمہاری روشنی کی رفتار واقعی تیز ہے ـــ؟"

بعد کی کہانیوں میں ہمیں کچھ زیادہ ہی تلخی اور جھنجلاہٹ ملتی ہے اور افسانوں میں ایک انتشاری احساس ہوتا ہے۔ جنگیں، افراتفری، بے بسی تلخیاں، مایوسیاں اور یہ احساس کہ ہر شے اتھل پتھل میں ہے۔ کسی کو قرار نہیں ثبات ایک تغیر کو ہے زمانے میں۔

"روشنی کی رفتار" کے افسانوں میں سائنسی فکشن بھی ہے۔ "ملفوظاتِ بابا بیکتاستی" جیسا تجرباتی افسانہ بھی جس میں صدیوں پہلے کے کردار میوزیم سے نکل کر بیتے دنوں کا حال سناتے ہیں، زمانے کا حال چال دریافت کرتے اور پھر میوزیم میں جا کر بت بن جاتے ہیں۔ اور آخر میں کہانی صدیوں پیچھے جا کر مستقبل کی ایک کہانی کی شکل میں آتی۔

قرۃ العین آج بھی ہماری لیڈنگ ادیبہ ہیں۔ ان کا فن آج بھی تابندہ ہے۔ آج کا فن کار بے روح تجربوں سے پریشان ہو کر ایک بار پھر کہانی کے خوبصورت پیرایوں کی تلاش میں ہے اور اس میں یقیناً قرۃ العین حیدر سے بڑی مدد مل سکتی ہے۔

محمد رضا کاظمی

اردو میں حاشیہ نگاری

عام طور سے جو لوگ کتابوں کے شوقین ہوتے ہیں وہ بھی کتابوں میں حاشیے، حوالے اور تعلیقات کی کثرت سے بیزار رہتے ہیں۔ حاشیے عالمگیر سطح پر ہزل سنجی کا موضوع بنے ہیں۔ یعنی انگریزی میں سر ولیم وڈہاؤس اور اردو میں جناب غلام عباس نے حاشیہ نگاری اور حاشیہ آرائی سے تفنن طبع کا سامان بہم کیا ہے۔ اگر میں وڈہاؤس اور غلام عباس کی ان تحریروں تک آپ کی رہنمائی کرنا چاہوں تو مجھے بالترتیب مندرجہ ذیل معلومات فراہم کرنا ہوں گی۔ مصنّف کا وہ نام جو سرورق پر درج ہے، عنوان کتاب، مقامِ اشاعت، سالِ اشاعت اور صفحہ نمبر۔ بعض محتاط مصنّفین جو کتابیں خود پڑھتے ہیں اور کسی تیسری جگہ سے حوالہ نقل نہیں کرتے وہ اکثر عنوان کتاب اور جائے اشاعت کے درمیان ناشر کا نام بھی درج کرتے ہیں۔ لیکن یہ اندراج اب تک اختیاری ہے لازمی نہیں جس کی دو وجوہ سر دست میں سمجھ پایا ہوں ایک تو مصنّف اور ناشر کے درمیان سرد مہری کے تعلقات۔ دوسرے ایک ناشر اور دوسرے ناشر میں مسابقت کا جذبہ۔

خیر یہ تو میں بھی آپ کی تفریحِ طبع کا سامان کر رہا تھا لیکن چونکہ میں دو نہایت دل پذیر اور فرحت انگیز تحریروں کا سراغ دینے پر آمادہ نہیں ہوں۔ اس لیے شاید آپ مصنّف کی اس مجبوری کو ہمدردی کی نظر سے دیکھنا شروع کر دیں جس کے تحت وہ اپنی کتابوں کو حاشیے، حوالے اور تعلیقات سے زیرِ بار کرتا ہے۔ انگریزی میں تو ان حوالوں اور حاشیوں کے لیے علامتیں مقرر ہیں۔ اور کم و بیش ان کی ترتیب بھی، لیکن اردو میں اس کے لیے کوئی ایک قاعدہ یا آئین نہیں ہے۔ عام طور سے ان علامات سے واقفیت جامعات میں تحقیق کے دوران ہو جاتی ہے اگر اس سے قبل نہیں، لیکن اردو میں بعد تحقیق ان سے واقفیت کا اظہار نہیں ہوتا۔ ایک محقق نے حوالہ دیتے ہوئے سب سے پہلے صفحہ نمبر لکھ دیا۔ یہ ضمیر کو اسم سے پہلے لکھ دینے کے مترادف ہے۔ اکثر اوقات حوالے نامکمل ہوتے ہیں۔ کتاب کا نام ہے لیکن جائے اشاعت یا سالِ اشاعت ان میں سے کوئی ایک تفصیل درج ہونے سے رہ جاتی ہے۔ اکثر اوقات خود ناشر یہ معلومات فراہم کرنا ضروری یا مناسب نہیں سمجھتا جس کی وجہ سے محققین کو دقّت کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔

جب کوئی تازہ کتاب چھپ کر آتی ہے تو اس کے سالِ اشاعت کے درج کیے جانے کی ضرورت محسوس نہیں ہوتی۔ لیکن ایک مدّت کے بعد جب یہ تفصیل عمومی یادداشت سے محو ہونے لگتی ہے تو اس کی اہمیت کا احساس ہوتا ہے۔ جس زمانے میں کوئی کتاب یا رسالہ تصنیف ہوا اس وقت معلومات کی سطح کیا تھی، اس کا دائرہ کیا تھا یہ جاننا ضروری بن جاتا ہے۔ جس علم میں وہ کتاب لکھی گئی

ہے اس علم میں کتنی پیش رفت ہوئی تھی۔ اس کے علاوہ دو مصنّفین کے درمیان تقدیم و تاخیر کی بحثیں بھی ایسی معلومات سے طے کی جا سکتی ہیں۔ اسی طرح یہ بھی لازم ہے کہ کتاب اور حوالے میں اس شہر کا نام درج ہو جہاں سے وہ شائع ہوئی ہے۔ اردو کا ایک مقبول ادبی جریدہ ہے "نیا دور" یہ جریدہ اسی نام سے بنگلور سے نکلا کرتا تھا۔ یہ برطانوی عہد کی بات ہے۔ پاکستان بننے کے بعد یہ رسالہ کراچی سے نکلنے لگا۔ یہی نہیں، اسی نام کا ایک ادبی رسالہ ہندوستان میں لکھنؤ سے شائع ہوتا ہے۔ اب اگر میں کسی نظم، افسانہ یا مضمون کا اقتباس اپنی کسی تحریر میں پیش کروں اور حوالہ میں صرف "نیا دور" لکھ دوں تو کیا اصل عبارت تک آپ کی رسائی یقینی طور پر ہو جائے گی؟

اب رہا یہ سوال کہ اگر یہ معلومات اتنی اہم ہیں تو انھیں متن میں ہی کیوں نہیں درج کر دیا جاتا۔ ان امور پر ہمارے مصنّفین اظہار خیال کرتے رہے ہیں۔ "اخبار اردو" ایک ماہنامہ ہے جو اسلام آباد سے "مقتدرہ قومی زبان" کے زیرِ اہتمام شائع ہوتا ہے۔ اس کے شمارہ نمبر ۱ جلد نمبر ۳ مورخہ اکتوبر ۱۹۸۶ء (آپ نے دیکھا کہ متن کے درمیان ایک نامکمل حوالہ بھی آجائے تو کتنی بے ربطی ہوتی ہے) میں جناب عطش درانی اپنے مضمون "تدوینِ کتب اور طباعتی امور" میں رقم طراز ہیں:

> "متن میں حوالوں اور حواشی درج کرنے کا رجحان اب کم تر ہوتا جا رہا ہے۔ عام طور پر کتاب کے آخر میں ماخذ کی ایک فہرست بنائی جاتی ہے جسے کتابیات کہا جاتا ہے۔ متن کے اندر ہی ان کے سلسلہ نمبر کا حوالہ اور صفحہ نمبر قوسین میں درج کیا جاتا ہے۔ مثلاً (۱۳: ۲۷۵) یعنی حوالہ نمبر ۱۳ کا صفحہ نمبر ۲۷۵"

اس طریقۂ کار کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ کتابیات اور تعلیقات کو الگ الگ لکھنا نہیں پڑتا اور اگر حاشیے میں صرف کسی کتاب یا رسالے کا حوالہ دینا مقصود ہو تو اس سے بہتر کوئی طریقہ نہیں۔ لیکن اگر حاشیے میں کوئی تشریح یا وضاحت کی گئی ہے تو یہ طریقہ ناقابلِ عمل ہو جاتا ہے۔ دنیا میں تفسیر، تشریح اور تنقید کی ابتدا اسی حاشیہ کے پیرائے سے ہوئی ہے۔ ہاں مصنّف خود اپنی کتاب پر حاشیے کیوں لکھے، یہ ایک غور طلب سوال ہے۔ اس کی سب سے بڑی وجہ ہے تنقید کا خوف۔ اکثر اوقات کوئی ضمنی تشریح یا ذیلی وضاحت متن کے منطقی اور اسلوبی تسلسل میں رخنہ انداز ہوتی ہے۔ پھر بھی متن کو تائید کے بغیر پیش کرنا تصنیف کو کمزور کر دیتا ہے اس لیے اس کا اندراج بھی ضروری ہو جاتا ہے۔ ان دونوں مشکلات پر قابو پانے کے لیے حاشیہ کا طریقہ وضع ہوا ہے کہ ایک متوازی سلسلہ تحریر کا قائم رہے۔

جناب عطش درانی کا بیان کردہ طریقہ تشریح کے علاوہ ایسے مقامات کے لیے بھی ناکافی ہوتا ہے جہاں مصنّف کسی تحریر کا حوالہ تقابل کے لیے دیتا ہے، تائید کے لیے نہیں۔ انگریزی میں اس کی علامت CF یعنی CONFER ہے۔ حاشیہ جیسا کہ اس کے نام سے ظاہر ہے متن کے آخری سطر کے بعد شروع ہوتا ہے۔ اگر حاشیہ طویل ہو جائے تو صفحہ کی ہم آہنگی اور خوبصورتی متاثر ہوتی ہے۔ اس کے علاوہ کاتب اور کمپوزر کے لیے متن اور حاشیہ کے درمیان توازن قائم کرنا ایک آزمائشی مرحلہ ہو جاتا ہے۔ تحقیقی کتابوں اور مسوّدوں میں اس کی انتہائی شکل نظر آتی ہے۔ نگراں اور ممتحن حضرات کسی بات کو سند یا حوالے کے بغیر قبول نہیں کرتے اس لیے بسا اوقات ایک صفحہ میں دس دس جملے ایسے ہوتے ہیں جن کے آخر میں حاشیہ کا نشان یا شمار ہوتا ہے۔ اب کاتب یا کمپوزر ایک صفحے پر دس دس حوالوں کی گنجائش نکال سکتا ہے یا نہیں یہ اس کے تجربہ اور اس کی مشق پر منحصر ہے۔ تجربہ کار

ہو ذریہ اندازہ پہلے ہی کر لینا ضروری سمجھتے ہیں کہ آیا ایک صفحے پر دس کے دس حاشیے آسکیں گے اور آیا کہ ان کی تعداد میں ترمیم
ں تناسب سے ممکن ہے۔
اس زحمت سے بچنے کے لیے ایک طریقہ رائج ہے۔ یعنی جو عبارت اقتباس ہوئی ہو اس کی آخری سطر کے نیچے قوسین میں
ے درج کر دیے جائیں۔ لیکن یہ بھی اسی صورت میں قابلِ عمل ہے جب قوسین میں صرف کسی تحریر کا حوالہ دینا ہو۔ تشریح یا
احت کے لیے یہ طریقہ بہت محدود افادیت کا حامل ہے گرچہ اس کی مثالیں کم یاب نہیں۔ علمی یا فکشن کی کتابوں میں کوئی
وضاحت قوسین میں درج ہوتی ہے۔ اس تعطّل سے کبھی کبھی مصنّف تخلیقی اثر انگیزی بھی حاصل کر لیتا ہے مگر اس کا کثرت سے
عمال الجھن اور صرف الجھن کا باعث ہوتا ہے۔ قوسین کے باوجود عبارت تعقید کا شکار ہو جاتی ہے۔
زیادہ جدید طریقہ یہ ہے کہ حاشیے متن کے صفحے پر نہ دئے جائیں۔ حاشیہ کے شمار قوسین یا مسطر سے بلند تر درج کر دیتے
بعد باب یا مقالے کے آخر میں ترتیب وار جمع کر دیے جائیں۔ جہاں کتابیات دینا ضروری ہو وہاں یہ حوالے متن اور کتابیات
درمیان درج کیے جاتے ہیں، انھیں تعلیقات کہا جاتا ہے۔ سلیس انگریزی میں انھیں NOTES کہتے ہیں۔ اس میں صرف
قباحت ہے۔ یعنی اگر قاری کسی نکتے کی فوری وضاحت محسوس کرے تو صفحہ الٹنا پڑتا ہے۔ اور اگر بار بار ایسا کرنا ہو تو کتاب
بلد کمزور ہو جاتی ہے۔ لیکن دوسری سہولتوں کو دیکھتے ہوئے یہی سب سے بہتر طریقہ ہے۔
اب رہیں حواشی اور تعلیقات میں استعمال ہونے والی اصطلاحیں۔ یہ اصطلاحیں جو علامات کے ذریعے درج کی جاتی ہیں
صنّف اور قاری دونوں کو تکرار کی الجھن سے بچا لیتی ہیں جیسا کہ اکثر ہوتا ہے۔ ایک ہی کتاب سے کئی اقتباسات دینے کی
ورت ہو جاتی ہے۔ اگر انھیں یکے بعد دیگرے نقل کر دیا جائے تو ان کی صورت کچھ یوں بنے گی۔

۱؎ محمود فاروقی، میر حسن اور خاندان کے دوسرے شعرا، مکتبۂ جدید (لاہور، ۱۹۵۶ء) ص ۳۱

۲؎ محمود فاروقی، میر حسن اور خاندان کے دوسرے شعرا، مکتبۂ جدید (لاہور، ۱۹۵۶ء) ص ۳۲

علامت کے استعمال سے ۲؎ کی صورت یہ ہو جائے گی ۲؎ ایضاً ص ۳۲

اگر صفحہ نمبر نہیں بدلتا اور وہی رہتا ہے تو فقط ۲؎ ایضاً لکھنا کافی ہوگا۔ اردو میں ایضاً کی اصطلاح سب سے زیادہ عام ہے
ں تک کہ درمیانی جماعتوں کے طالب علم بھی اس سے واقف ہو جاتے ہیں۔ لیکن یہ اصطلاح اس وقت کام نہیں آتی جب ایک ہی
ب کے دو حوالے مسلسل نہیں ہوں بلکہ دونوں حوالوں کے درمیان ایک یا زیادہ کتابوں کے حوالے آچکے ہوں۔ ایسی صورت میں
نّف کا نام لکھنا ہوگا اور آگے ایک دوسری علامت استعمال ہوگی۔ اپنی مثال پر قائم رہتے ہوئے ہم کہہ سکتے ہیں کہ ۲؎ کی شکل اب
بنے گی۔

۲؎ محمود فاروقی ۔c/t . op ص ۳۲

صفحہ میں تبدیلی نہ ہو تو ایضاً کی طرح صرف صفحہ نمبر خارج کر دینا کافی نہیں رہتا۔ علامت بدل جاتی ہے ۲؎ محمود فاروقی LOC. CIT
یہ اصطلاحیں اصلاً انگریزی نہیں لاطینی ہیں اور اردو میں استعمال ہونے والی اصطلاحیں عربی ہیں۔ اگر ہر لاطینی اصطلاح
مارے پاس عربی بدل ہوتا تو کوئی دقّت نہ ہوتی، لیکن ایسا نہیں ہے۔ عربی سے ہمارے پاس دو ہی اصطلاحیں آئی ہیں جنھیں ہم

استعمال کرتے ہیں۔ یعنی ایضاً برائے Ibid اور (کذا) برائے (sic) ان کے بعد سب سے زیادہ استعمال ہونے والی اصطلاح OPERO CITATO ہے جس کی علامت OP - CIT ہے۔ مقتدرہ قومی زبان کے تحت اس کا ترجمہ حوالۂ ماسبق ہوا ہے۔ اکثر مصنفین اس کے لیے "تصنیف مذکورہ" یا "محولہ بالا" بھی استعمال کرتے ہیں۔ قریب تر ترجمہ ہے "کارِ محولہ"۔ اس کا پہلا جز "کار" ایک ایسا لفظ ہے جو تصنیف، تالیف اور ترجمہ تینوں کا احاطہ کر لیتا ہے۔ یعنی اگر آپ نے حوالۂ اوّل میں کتاب کی حیثیت واضح کر دی تو بعد کے علامتی حوالوں میں اسے دہرانے کی ضرورت نہیں رہتی۔ لیکن اس کا دوسرا جز "محولہ" مقتدرہ کی اصطلاح "ماسبق" سے بھی زیادہ ثقیل ہے۔ اگر سمجھوتہ کر لیا جائے تو "کارِ مذکورہ" زیادہ فصیح، رواں اور برمحل ہے۔

LOC - CIT کا ترجمہ اسی وزن پر جائے مذکورہ ممکن ہے لیکن CF یعنی CONFER کا ترجمہ ذرا مشکل ہے۔ اس کا انگریزی ترجمہ ہے COMPARE اس میں امر شامل ہے۔ اب ان دو انگریزی حرفوں کا ترجمہ ہوگا "مقابلہ کیجیے" یا "دیکھیے برائے تقابل"۔ یہاں شاید ترجمہ سے کام نہ چلے از خود ایک اصطلاح وضع کرنی پڑے۔ یہی حال PASCIM کا ہے۔ یہ اصطلاح اس وقت استعمال ہوتی ہے جب حوالہ میں صفحہ کا تعین ممکن نہ ہو۔ یعنی کسی خاص ضرورت سے مختلف صفحوں کی عبارتیں یکجا کر دی گئی ہوں۔

اس صورتِ حال کے پیشِ نظر آپ اتفاق کریں گے کہ ایسی اصطلاحوں کا ترجمہ ہی ضروری نہیں بلکہ ان کی معیار بندی بھی بہت ضروری ہے۔ میں جن اصطلاحوں کا یہاں ترجمہ کر سکا ہوں ان کی حیثیت ایک تجویز کی ہے۔ یہ کام دراصل انجمن ترقی اردو یا مقتدرہ قومی زبان کا ہے۔ کتب خانہ جات کی اصطلاحوں کا ترجمہ ہو چکا ہے مگر ان اصطلاحوں کا نہیں جو کتاب کے اندر استعمال ہوتی ہیں۔ اصطلاحوں کے نفاذ کے لیے ضروری ہے کہ انھیں اہلِ قلم تک انجمن ترقی اردو، انجمن مصنفینِ پاکستان اور ادارۂ ادبیاتِ پاکستان کے ذریعے پہنچایا جائے۔ اساتذہ اور محققین کو جامعات کے توسط سے اور ناشروں تک ان کی جو بھی پیشہ ورانہ انجمن ہو اس کے وسیلے سے۔

اس معیار بندی سے حواشی یا تعلیقات کی مقدار کو کم تو نہیں کیا جا سکے گا، لیکن انھیں مختصر، نفیس اور جاذبِ نظر بنایا جا سکے گا۔

ڈاکٹر محمد سلیم ملک

اقدار کا مزاج

ادب ہر زمانے میں سماجی مظاہر سے ہم رشتہ رہا ہے۔ اس کا ہمارے اعتقادی ڈھانچے، اخلاقی اقدار، سماجی تنظیم اور ثقافتی معیارات سے گہرا تعلق ہے۔ سماجی علوم میں بے محابا یلغار کرتے ہوئے نئے نظریات، علمی انکشافات اور سائنسی ایجادات نے ادب کو ہر زمانے میں از سرِ نو متعین کیا ہے۔ نئی علمی دریافتیں اپنی جگہ بنانے کے لیے پرانے نظامِ خیال میں ہلچل پیدا کر دیتی ہیں۔ کہنہ نظام کی معنویت کچھ عرصے کے لیے مشکوک بلکہ معطل سی ہو جاتی ہے اور پھر اس کی افادیت کا از سرِ نو تعیّن کیا جاتا ہے۔ اسی طرح سائنسی فتوحات پرانی صداقتوں کو روند ڈالتی ہیں اور اس خاکستر سے نئی عمارت کی تعمیر ہوتی ہے۔ ماضی کا علمی اثاثہ خام مواد کا کام دیتا ہے۔ اور معاصرانہ تقاضوں کو لبیک کہتی ہوئی نئی سائنسی دریافت ہمارے تمدّن کا ایک حصّہ بن کر ہماری زندگی میں راہ پا جاتی ہے۔ اسی طرح نت نئی مشینوں کی یلغار جہاں اس دنیا کو طلسم کدہ میں تبدیل کر رہی ہے اور ہمارا تمدّن اور معاشرت پیچیدہ تر ہوتے جا رہے ہیں یہ پُر پیچ، نازک اور حساس مشینیں ہماری شخصیت اور مزاج میں بھی اس طرح دخیل ہو رہی ہیں کہ یہ ہمارے طرزِ عمل کا ناگزیر حصّہ اور اندازِ زیست کا غیر مرئی شاخسانہ بن گئی ہیں۔ ہماری رفتار و گفتار مشینوں سے اس قدر مربوط بلکہ مشروط ہو گئی ہیں کہ یہ ہماری ذات کا ایک غالب حصّہ بن گئی ہیں۔ ہمارے رجحانات کی تاسیس میں مشینیں ہی دخیل ہیں، اور ہمارے تخیّل اور سوچ کی اڑان ان کے وجود سے عبارت ہونے لگی ہے۔ اس طرح گویا عہدِ حاضر کا انسان مشینوں کے دام میں اس طرح پھڑپھڑا رہا ہے کہ اس کے اندر کا خالص انسان اس سے بچھڑ گیا ہے۔ اندر کے سچ پر منافقانہ رویّوں کے نظر فریب پردے تان دیے گئے ہیں۔ وہ معلومات کا ایک بے حس کمپیوٹر بن جانا اپنی معراج سمجھتا ہے۔ ملازمت کے تقرر کے لیے بورڈ کے سامنے برجستہ جواب دینے والا بے وسیلہ سائل ہو۔ چند ثانیوں میں بیسیوں جواب نذر کرنے والا معروضی آزمائش میں مبتلا بے سہارا طالب علم ہو یا زندگی کے نیلام گھر میں دنیا جہان کی بے ترتیب معلومات کو اُگل کر مثل زکوٰۃ انعام پانے والا امیدوار ہو۔ معلومات کا بے تحاشا ملبہ اٹھائے یہ بے بس انسان کیرل چیپک کے بے حس روبوٹ ہی تو ہیں اور ان کی معلومات بھی اپنے سیاق و سباق سے کٹ چکی ہے، اپنی طبعی عمر پوری کر چکی ہے، اپنی معنویت گنوا چکی ہے۔ یہ نیم سچ معلومات اور کسی خاص زاویۂ نظر سے تراشی ہوئی نیم سوختہ اطلاعات ہمارے دامِ تمدّن کی وہ جلی ہوئی تیلیاں ہیں جنھیں آج کا انسان الگ الگ لیے پھرتا ہے۔ ان کی روشنی کا جوہر

وہ فاسفورس ہی باقی نہیں رہا تو حیات کی تیرہ و تار گھٹا میں روشنی کی ننھی سی کرن بھی کہاں سے طلوع ہو۔ ایسے میں کسی ا
شعلے، دیر پا چراغ یا منور شاہ راہ کا تصور کرنا بڑی خام خیالی ہو گی۔

ہم اس وقت اقدار کی شکست کے آخری سرے پر آپہنچے ہیں۔ ہماری معاشرتی اور ثقافتی زندگی میں توڑ پھوڑ کا یہ
جس قدر تیزی سے آج کل ہو رہا ہے، پہلے کبھی نہ ہوا تھا۔ گزشتہ چند عشروں میں ہم جس ہلچل اور اضطراب سے دوچار ہو
ہیں اور اجتماعی سطح پر جن تبدیلیوں اور تغیرات کو قبول کیا ہے اس سے بے چینی اور نفسا نفسی کا چلن کچھ اور بڑھ گیا ہے۔ تعص
اور تشدد کے مہیب کرولوں نے تحفظ کی چادر تار تار کر دی ہے۔ ایسے ہنگامۂ من و تو اور لایعنی ہاؤ ہو اس سے پیشتر نہ آنکھ
نے دیکھے نہ کانوں نے سُنے۔ اسی لیے زندگی مسائل کی صلیب پر لٹک رہی ہے۔

اگر دو دہائیوں میں آبادی کا ایک کثیر حصہ بیرون ممالک رزق کمانے کی غرض سے نکلا۔ صدیوں کی اقتصادی محرومی کو
ملا تو اس نے مشرقِ وسطیٰ کے ممالک فتح کر ڈالے۔ یورپ کی منڈیاں الٹ ڈالیں اور امریکہ کے شہروں کو روند ڈالا۔ مگر جب
معاشی مہم جو عرصۂ کار تمام کر کے پلٹے اور اپنے ساتھ جدید سہولتوں کا انبار بھی اٹھا لائے تو ملک نشیں لوگوں کی آنکھوں میں حرص کی
بڑھا دی اور زندگی کا شعلہ بجھتی آنکھوں والے بوڑھے، کثرتِ کار سے تیزی سے گرتی صحت کی شکستہ دیوار کو دونوں ہاتھوں
عمر رسیدہ لوگ اور سندوں اور صلاحیتوں کا ملبہ اٹھائے بے روزگار نوجوان اور معاشرے کے دوسرے استحصال شدہ ط
ذہنی افراتفری کا شکار ہو گئے اور پلٹ کر آنے والے بھی اپنے تموّل کی بنیاد پر معاشرتی منصب کا حق مانگنے لگے۔

اس معاشرتی خلفشار کے متوازی سماجی علوم کے متنوع نظریات نے اپنی تعداد اور مقدار اس قدر بڑھائی ہے کہ یہ اکتنا
اپنی اندھی اکثریت اور جزیاتی تفصیل کے باعث ہماری ذہنی استعداد کا استحصال کرنے کے درپے ہو گئے ہیں۔ اس لیے چہار طر
سے ہلّہ کر کے آنے والے ان علوم کی افراط سے گھبرا کر انسانی ذہن نے اس صدی میں تخصیص کار کی پناہ گاہیں بنا لی ہیں اور سار
عمر ایک شعبۂ علم کی گہرائی اور گیرائی ناپنے میں صرف کر ڈالی ہے۔ یوں انسان اپنے شعبے کی پاتال میں جتنا زینہ زینہ اُترتا جاتا ہے
دوسرے شعبہ ہائے حیات کے افق اس کی نظروں سے اوجھل ہوتے جاتے ہیں اور وہ خاص نکتے میں متخصص اور باقی امور سے بیگا
ہو جاتے ہیں۔ اصطلاحی لغت کا بے جا استعمال، علمی رعب ڈالنے کا شوق اور خود ساختہ عالمانہ معیار کی تنی رسّی پر کرتب دکھا
کا شوق، ان کی تفہیم کا دائرہ تنگ کرتا جاتا ہے۔ یہ سارے متخصص ریشم کے کیڑے کی طرح اپنا مدار خود ہی تنگ کرتے اور ا
قوت کے اسیر ہو جاتے ہیں اور انجام کار وہ معاشرے کی بے عمل اکائیاں، اجنبی آوازیں اور عسیر الفہم ٹکڑے بن کر رہ جاتے ہیں
اور ہر شخص ایک تاریک براعظم، ایک نامعلوم جزیرہ بن کر معاشرتی معمولات سے اکھڑا اکھڑا رہتا ہے۔

ہمارے تمدن کا سارا ماضی، وسائل کی افراط و تفریط سے عبارت ہے۔ وحشیوں کی چھینا جھپٹی، بادشاہوں کے رزمیا
کارنامے اور اب ترقی یافتہ قوموں کے استحصالی رویّے، وسائل کے حصول کی آویزش کی کہانی ہے۔ اس کے انداز اور طریقے ہر زمانے م
شکلیں بدلتے رہے ہیں لیکن ان کے مقاصد میں کبھی سرمو فرق نہیں آیا۔ اور آج استحصالی قوتوں نے اپنے عوامل اور مظاہر میں
اپنی ہیئت اور تکنیک میں ایسی تبدیلیاں کر لی ہیں کہ اس پردہ زرنگار کے اندر چھپے عفریت کو کوئی نہیں دیکھ سکتا۔ یہ دیو استح
نیلم پری کے روپ میں جلوہ گر ہے اور اس کے سحر سے مسحور ہو کر ہم اس کے ہاتھ پر بیعت کر رہے ہیں۔ استحصال کے ان مظاہر وا

بامقدر جان کر قبول کرتے اور انہیں اپنی ذات کے گرد لپیٹ لیتے ہیں اور اپنی امنگوں اور ارمانوں کو اس کے تابع رکھ کر اپنی خواہشوں والوں کے خدوخال مرتب کرتے ہیں۔

صنعتی ترقی نے ہمیں مادی اسائش کے جس کنارے پہ لا کھڑا کیا ہے اس کو نہ سمجھنا بڑی کم ظرفی کی بات ہوگی۔ آج کے تخلیق کار کو وقت کی غذا بہم پہنچانے میں اتنے تردد اور تفکر سے کام نہیں لینا پڑتا جس قدر مشقت اس کے پیشرو ادیب کا مقدر تھا۔ یہ اور بات ہے۔ ورنہ آج کے زیریں متوسط طبقے کو بھی وہ نعمتیں اور آسائشیں میسر ہیں جو پہلے دنوں میں رئیسوں اور جاگیرداروں کو حاصل نہ تھے۔ اب سوال یہ ہے کہ ان سہولتوں نے کہیں آج کے تخلیق کار کو تن آسان تو نہیں بنا دیا۔ یہ تن آسانی، اس کی سستی اور بے جواز کاہلی کو تو جنم نہیں دے رہی اور اسے لہو گرم رکھنے کے لیے ستیزہ کاری کے وہ مواقع میسر نہیں آرہے جو کے پیشرو ادیبوں کو فطرت اور معاشرت سے مسابقت کے باعث میسر آیا کرتے تھے۔ یا پھر آج کا ادیب سانحوں اور تبدیلیوں کو سہج سہج کر قبول نہیں کرتا۔ وہ سنگلاخ زمین پہ پاؤں دھرتا ہی نہیں جہاں محنت کے کانٹے چبھتے ہیں، جہاں مشقت کی کھو پڑیاں اگتی ہیں جہاں گہرے مطالعے کی طویل شب میں اداس راتوں کی بے رنگ تنہائی میں تحلیل ہو جاتی ہیں۔ جب تخلیق کار الکتاب کے سپاٹ، بغیر دل چسپ اور ریاضیاتی مراحل سے گزرتا ہی نہیں اور ریاضت و مشقت کے سنگین پاٹوں میں پستا ہی نہیں تو پھر ادب کا اس سے ظہور بے قیاس ہے۔ بلکہ مکافات عمل کے تسلسل میں اس سے ادھکچی ادھکچی تحریروں کا صدور قرین قیاس ہے۔ پھر معاشرتی سطح پر بھی فن لطیفہ کے بعض واسطوں کی دستبرد سے ہم محفوظ نہیں۔ اشتہاروں کی چکاچوند، فلموں کی آب و رنگ ٹی وی سکرین کے چمکتے رنگوں نے ہمیں بصری استحصال سے دوچار کر دیا ہے جس سے ہم کوتاہ بینی کا شکار ہو رہے ہیں اور میگا فون سرے، لاؤڈ اسپیکر کے اعلانات اور ٹیپ ریکارڈروں کے بلند بانگ نغمے ہماری سماعتوں کو مسموم کر رہے ہیں اس لیے ہم رنگوں کو چلاتی آوازوں کو ہی زندگی کا سب سے بڑا سچ ماننے لگے ہیں۔

ڈاکٹر مناظر عاشق ہرگانوی

ہم عصر ادبی مسائل

ہر عصر اور ہر دور کے اپنے تقاضے اور منفرد رجحانات ہوتے ہیں۔ یہ رجحانات اور تقاضے اپنے دور کے ادیبوں کی سوچ اور فکر پر اثر انداز ہوتے ہیں اور ان کے شہ پاروں میں بھرپور اظہار پاتے ہیں۔

ہم عصر ادب زندگی کے نشیب و فراز اور قدروں کی شکست و ریخت کے تابع ہوتا ہے اور اس کا رشتہ اشیا اور فرد سے براہ راست ہے اسی لیے مسائل پیدا ہوتے ہیں۔

اور چونکہ اشیا سے فرد کا رشتہ گویا طبعی کائنات سے اس کے رشتے کا امین ہے اس لیے اس کا اثر انسانی ذہن پر پڑتا ہے۔ کائنات کی تفہیم، ذات کی تلاش، فرد کے مقام کا تعین اور ماضی و حال کی روشنی میں ایک بہتر مستقبل کا خاکہ ترتیب دینے کی کوشش خالص کلچر کے تناظر میں ابھرنے والے ہم عصر ادبی مسائل کی بازیافت ہے جس کے تحت ٹوٹتے بکھرتے معاشرے کے بدل ایک پائیدار اور مستحکم انسانی معاشرے کا وجود ممکن ہو سکتا ہے۔

آج پھیلتی کائنات کا جو منظر نامہ ہمارے سامنے ہے اس سے تہذیبی اور سماجی مسائل پر غور و فکر کرنے کی تحریک ملتی اور یہ تحریک ادب کے راستے سے بھی ہمارے سامنے آتی ہے۔ لیکن تہذیب و ثقافت دراصل کسی قوم یا ملک کے تخلیقی اظہار کا عمل ہوتا ہے جس سے ادب ہی نہیں فلسفہ و معاشرتی علوم کے واسطے سے، کبھی موسیقی اور مصوری کے روپ میں، کبھی فن تعمیر اور کبھی دستکاریوں اور رہن سہن کے انداز سے مزاج کا تعین ہوتا ہے۔ مگر آج تہذیب کو سنوارنے یا بنانے والی قوتیں ایک انتشار اور تہذیب و ثقافت کے خالق ایک بے یقینی کے عالم میں ہیں۔ اس کا اثر ادب پر بھی پڑا ہے۔ ادب و فن اور اہلِ علم و فن ایک عجیب کسمپرسی کے عالم میں ہیں۔ ترجیحات اس طرح گڈمڈ ہو گئی ہیں کہ آگے کی چیزیں پیچھے اور پیچھے کی آگے چلی گئی ہیں۔ اس طرح ہم دیکھتے ہیں کہ آج ادب کے مسائل ایک طرف بڑے لطیف، باریک اور گریز پا ہیں تو دوسری طرف بڑے سنجیدہ اور تہ دار بھی ہو گئے ہیں۔ ادب کا تعلق دراصل زندگی سے ہے اور یہ تعلق بہت ہی گہرا اور اٹوٹ ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ ادب زندگی ہی عبارت ہے۔ ادب اور زندگی آپس میں اس قدر مربوط و مشروط ہیں کہ ایک کے بغیر دوسرے کا تصور ممکن نہیں ہے۔ اگر کہا جائے کہ ادب زندگی کی مقتضیات میں سے ہے تو بیجا نہ ہوگا۔ اور جب یہ دونوں لازم و ملزوم ٹھہرے تو بے شمار مسائل

کا سامنا کرنا لازمی ہے۔ آج کی زندگی زیادہ متنوع اور ہمہ گیر ہوگئی ہے۔ سماجی نظام میں پھیلاؤ پیدا ہوگیا ہے۔ معاشرے کی حدود وسعت پذیر ہوئی ہے۔ انسانی زندگی صرف عالمِ رنگ و بو پر ہی قانع نہیں رہی بلکہ اب اس کے سامنے آسماں اور بھی ہیں۔ ایسے میں بنیادی مسائل کا پیدا ہونا لازمی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ آج زندگی میں معاشرتی اور اخلاقی تصادم اور پیکار جاری ہے اور اجتماعی نظام اور شخصی کردار میں اندرونی تناقضات ٹھہرتے جارہے ہیں۔ ہم عصر ادیبوں کی زیادہ تعداد غیر واضح انتشار اور پراگندگی میں نظر آرہی ہے ان کے خیالات پریشان اور گڈمڈ ہیں۔ دراصل آج انسان، فرد موجود نہیں بلکہ شئے محض ہوگیا ہے۔ سماج کی تبدیلی کو سمجھنے کا یہ مابعد الطبیعیاتی نقطۂ نظر ہے جو سماج اور انسان اور سماج اور فن کے درمیان کشاکش کی نشاندہی کرتا ہے۔ یہ کشاکش موجود بالذات نہیں بلکہ دراصل خود آج کی سماجی کشاکش کا ہی ایک پہلو ہے۔ یعنی آج کا انسان سماجی کشاکش میں فن کو اور سماج سے حسن کو حقیقت سے ناآہنگ پاتا اور محسوس کرتا ہے۔ اور آج کا فن کار ہر قسم کی وابستگی سے آزاد ہوکر FORMALISM کا دعویٰ کرنے لگا ہے اور اس کی فکر میں زوال و انتشار اور قنوطیت اور کلبیت پیدا ہوگئی ہے۔ لیکن غور و فکر کی یہ خاص سطح مسائل سے نبرد آزما ہونے کے لیے ہے۔

فیوچر شاک کے حوالے سے راشد شاذ نے رشتوں کی تفہیم کا مسئلہ یوں بیان کیا ہے کہ ہمارا عہد PROCESS کی تکمیل، بلندیوں کے امکانات اور تیز رفتاری کی سطحوں پر ماضی سے قطعی مختلف ہے۔ معاشرے کی سطح پر ان امور کو زیادہ واضح طور پر محسوس کرسکتا ہے۔ ہمارے درمیان ایک اجنبی معاشرہ غیر محسوس طور پر پرورش پا رہا ہے۔ معاشرے اور کائنات کے علاوہ ذات کی سطح پر بھی اس عمل کو محسوس کیا جاتا ضروری ہے۔ اس لیے کہ اس کی تحقیق و تفتیش سے رازہائے معانی کے اپنے پردے اٹھائے جاسکتے ہیں جن پر عقلی دلائل کے ساتھ بات کرنا بھی ممکن نہیں AUTOMATION بذاتِ خود انسانی تاریخ میں بڑی تبدیلی کی علامت ہے۔ مسئلہ خواہ اس پیچیدہ کائنات کا ہو یا مخصوص معاشرے کا، اس حقیقت سے انکار شاید مشکل ہے کہ تبدیلیوں کی مختلف کیفیت ان کے پہلو بہ پہلو موجود ہے۔ اس حقیقت کے ادراک کے لیے یہ ضروری ہے کہ شئے میں محض شئے کا وجود ڈھونڈنے کے بجائے ہماری نگاہیں وجود کے مختلف زاویوں سے بھی آشنا ہوں۔ یہاں یہ بنیادی سوال بھی سامنے آتا ہے کہ واقعی تبدیلی ہے کیا؟ اس دوڑتی بھاگتی کائنات میں کسی سکونی لمحے کی دریافت کے بغیر اس حقیقت کا ادراک کیسے ممکن ہے؟

کمپیوٹر کی جدید تکنیک اور مختلف میدانوں میں اس کی بیش بہا کامیابیوں نے کائنات اور انسان کے درمیان پیدا شدہ رشتوں اور کائنات کے مختلف باب میں انسانی رویّوں کو بھی بُری طرح متاثر کیا ہے۔ کیا انسان بھی دوسری اشیا کی طرح اس وسیع کائنات کا محض حصّہ ہے؟ اس کی نفسیات، اس کی ساخت، اس کی یادداشت اور دوسرے طریقۂ کار کیا کسی مشین کی طرح بندھے ٹکے ہیں؟ یہ مفروضہ اور کائنات میں انسان کی حیثیت سے متعلق بنیادی سوالات بھی ابھی حل طلب ہیں۔

کرّۂ ارض پر رہنے والی مخلوق کے درمیان تقسیم CLASSIFICATION کا عمل صرف رنگ، نسل، قوم، مذہب یا نظریے کی بنیاد پر ہی نہیں کیا جاسکتا بلکہ ان کے درمیان انفرادی شناخت کے لیے مخصوص گروہ یا فرد کو اس کے سماجی اور تہذیبی پس منظر میں بھی دیکھا جاسکتا ہے۔ شناخت کا یہ طریقۂ کار اس لیے بھی اہم ہے کہ اس کے بغیر دو گروہوں کا تقابلی مطالعہ (صحیح معنوں میں تقابلی مطالعہ کہا جاسکے) ممکن نہیں۔ اس مسئلے کو "نئے فرد" کے تناظر میں بھی حل نہیں کیا جاسکتا۔ اس لیے کہ اس کے نزدیک زندگی کی اہمیت اور اس کی قدر و قیمت ایک ٹریڈ مارک سے زیادہ نہیں اور جسے بغیر سمجھے بوجھے استعمال کیے جانے کا رواج عام ہے۔

تغیر ہماری زندگی میں ایک نئے عمل کا علامیہ بن چکا ہے جس کے نتیجے میں ہمارے اندر غیر مستقلیت کا ایک نیا مزاج ابھرا ہے۔ بلاشبہ یہ حقیقت بہت پہلے تسلیم کر لی گئی تھی۔ دانشوروں، ادیبوں اور مذہبی رہنماؤں نے تغیر کو انسانی فطرت کا اساس بنایا تھا لیکن آج تغیر کا یہ عمل محسوس کی جانے والی مخصوص سطح سے بہت آگے جا چکا ہے۔ اس کے نتیجے میں ہمارا معاشرہ سکون سے خالی ہو گیا ہے۔ انفرادی شناخت کی عدم زندگی کا یہ عالم ہے کہ ہر ڈرائنگ روم اور ہر محفلِ رقص و سرود میں پائی جانے والی شخصیت ایک سی معلوم ہونے لگی ہے جو ہر لمحہ اپنے اردگرد کے نظامِ روحانی ارتقا پر شدت سے ضرب لگا رہی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ ہم غیر مستقلیت IMPERMANENCE کی ایک مخصوص فضا میں سانس لے رہے ہیں جہاں کسی بھی مسئلے پر اعتماد کے ساتھ گفت گو کرنا نہ صرف یہ کہ مشکل ہے بلکہ پیغمبرانہ بصیرت کے بغیر کوئی نتیجہ خیز گفتگو ممکن ہی نہیں!

ہم عصر ادبی مسائل کے چند اہم نکتے کی نشاندہی ہم یوں کر سکتے ہیں کہ:

خواہشوں میں فوری تبدیلی اور پسند و ناپسند میں ترجیح کے فوری اقدامات نے ہماری زندگی کے بنیادی طریقۂ کار کو بری طرح متاثر کیا ہے۔

ہم لاشعوری طور پر ایک ایسے معاشرے کا مقابلہ کر رہے ہیں جہاں اشیا سے ہمارا رشتہ چند لمحوں سے زیادہ نہیں رہ پاتا۔

ادب کا ایک بڑا حصہ سماجی اور نفسیاتی ہر دو اعتبار سے بیگانگی کی فلسفیانہ اساس تلاش کرنے میں مصروف ہے۔

زندگی کا بنیادی تصور راو جھل ہو گیا ہے۔ زندگی کی طرف فرد کا رویہ کسی گمراہ ذہن کا علامیہ بن گیا ہے۔

علامتی پیکروں کے ساتھ فرد کا تعلق عارضی ہوتا جا رہا ہے۔

معاشرے میں ہونے والی ہمہ وقتی تبدیلیاں، حقیقت اور مفروضے کے درمیان پائے جانے والے خلا میں مزید اضافہ کر رہی ہے۔

حقیقت کو محض ایک دھوکا قرار دینا، اس سے فرار کے لیے منشیات کا بے پناہ استعمال، علومِ نجوم کے لیے بے پناہ رغبت اور حقیقت کی تلاش کے لیے خطرناک سے خطرناک تجربات سے گزرنے کا عمل جاری ہے۔

نفی ابلاغ کا نعرہ بلند کر کے قاری کو مسترد کر دیا گیا ہے۔

نئی لسانی تشکیلات کے نام پر اسلوب میں اشکال کو فروغ دیا گیا ہے۔

اپنی ذات میں خود ہی انجمن بن کر معاشرے سے جذباتی رشتہ منقطع کرنے کا LT ML عام کیا گیا ہے۔

استعارہ اور علامت کو آرائشِ اسلوب کے درجے سے بلند کر کے انھیں موضوع کا منصب دیا گیا ہے۔

یہی وجہ ہے کہ آج رشتہ ایک دوسرے سے بے تعلق ہو کر تیلیوں کی طرح بکھرنے لگا ہے۔

اخلاق و فکر کی مروجہ اقدار میں بدلتے زمانے اور اس کے نئے تقاضوں کا ساتھ دینے کی قوت باقی نہیں رہی ہے۔

معاشرت کی خواہشات اور ضروریات اپنے قدیم تہذیبی اداروں سے متصادم ہونے لگی ہیں۔

اس صورتِ حال نے زندگی کی ہر سطح پر گہرے اثرات مرتب کیے ہیں جن کا تجزیہ کرتے ہوئے ڈاکٹر جمیل جالبی نے پتے کی باتیں کہی ہیں کہ آج زندگی کی ہر سطح پر ہم ایک تھکا دینے والے بحران سے گزر رہے ہیں۔ عدم تحفظ کے احساس،

بے یقینی اور احساس محرومی نے عام فرد کو خود غرضی، لالچ اور نفسا نفسی کی کیچڑ میں دھانس دیا ہے۔

یہ بحران ہمارے مذہب، ہمارے فلسفے، ہماری سیاست و معیشت، ہمارے اخلاق و معاشرت، ہمارے عادات اطوار، ہماری انفرادی و اجتماعی زندگی اور سارے تہذیبی اداروں میں پھیل رہا ہے اور ہمارے کلچر کی وحدت کا ڈھانچہ ٹوٹ رہا ہے زندگی میں ہم نے منزل اور معنویت کو گم کر دیا ہے اسی لیے نئی نسل سرگرداں و پریشان ہے اور سارا معاشرہ برسات کے پانی کی طرح نالیاں نہ ہونے کی وجہ سے سڑکوں پر مارا مارا پھر رہا ہے اور انھیں کاٹ کر، ادھیڑ کر جدھر راستہ ملتا ہے بہ نکلتا ہے اسی فکری بحران اور بے معنویت کے باعث ادب اور فنون لطیفہ کی تخلیقی قوتیں بجھ سی گئی ہیں۔ خوش مذاقی اور سنجیدگی جیسی اہم قدریں بے معنی ہو گئی ہیں۔ عام تعلیم یافتہ طبقہ قتل و غارت گری، جاسوسی کے جھوٹے سچے قصّے اور ہلکی پھلکی چیزیں پڑھ کر اپنی پیاس بجھا رہا ہے۔ دیو مالائی داستانیں اور رومانی قصّے اسی لیے اخباروں اور رسالوں میں شائع ہو رہے ہیں کہ وہ پڑھنے والے کو زندگی اور تلخ حقائق سے فرار اختیار کرنے میں مدد دیتے ہیں۔

اسی فکری بحران کی وجہ سے قاری اور ادیب کا پرانا رشتہ باقی نہیں رہا ہے۔ فکر اور سوچ کے راستوں میں اتنے گہرے گڑھے ہو گئے ہیں کہ قاری اور ادیب کے لیے ان پر ایک ساتھ چلنا ممکن نہیں رہا۔ دونوں کی فکر کے دائرے الگ الگ ہو گئے ہیں ردِ عمل کے بغیر لکھنے والے کے قلم کی روشنائی سوکھ جاتی ہے اور فکر کی سوچ کے راستے مسدود ہو جاتے ہیں۔ دوسری جنگِ عظیم کے زمانے میں جب نازیوں نے پیرس پر قبضہ کر کے اپنے مخالف ادیبوں، دانشوروں اور مفکروں کو گرفتار کر لیا تو ان کے لیے سزا یہ تجویز کی گئی کہ سب کو الگ الگ کوٹھریوں میں بند کر کے ہر کوٹھری میں ایک لاؤڈ اسپیکر لگا دیا گیا جس پر ان کے لیے خاص پروگرام نشر کیے جاتے تھے۔ ایسے پروگرام جن سے انھیں ذہنی اذیت پہنچے۔ وہ سُن سکتے تھے جواب نہیں دے سکتے تھے کچھ عرصے تک تو یہ پروگرام نشر ہوتے رہے لیکن جلد ہی ان پروگراموں کے لکھنے والے تھک گئے۔ اور انھوں نے اس کی وجہ یہ بتائی کہ سننے والوں کا ردِ عمل معلوم ہوئے بغیر ان کا قلم جواب دے گیا ہے۔ آخر گونگوں کے لیے کب تک اور کیسے لکھا جا سکتا ہے؟ سوچ ردِ عمل کی فضا میں آگے بڑھتی ہے اور جب یہ رشتہ کمزور پڑ جائے یا باقی نہ رہے تو سوچ کے دروازے بھی بند ہو جاتے ہیں۔

اسی بحران اور بے معنویت کے باعث فرد اور معاشرے کا رشتہ بھی انتہائی کمزور پڑ گیا ہے۔ معاشرے کے افراد کی بھاری اکثر خود غرضی، لالچ، غیر ذمہ داری اور خوف کے موذی مرض میں مبتلا ہے۔ اجتماعیت اور حب الوطنی جیسی بنیادی قدریں اسی لیے جاں کنی حالت میں نظر آ رہی ہیں۔ ایک طرف بے رحمی اور تشدد بڑھ گیا ہے اور دوسری طرف فرد میں قوت حاصل کرنے کی خواہش شدید ہو گئی ہے ہر صوبہ اپنے خول میں محصور ہے اور ایک دوسرے سے سوکنوں کی سی لڑائی لڑ رہا ہے۔ صلاحیت، کام، لگن، انہماک اور خلوص جیسی اعلیٰ و محترم قدریں فرد کے لیے بے معنی ہو کر رہ گئی ہیں۔ جنگ کی خواہش اندرونی و بیرونی سطح پر بڑھ گئی ہے۔ عقل و خرد کے بجائے جذبات سے مسائل کا حل تلاش کیا جا رہا ہے۔ ایسی آواز دل کو بھاتی ہے جو اس نوع کے جذبات کو آسودہ کرے۔

وہ افراد بھی عام طور پر جو قدیم تہذیبی اداروں کو باقی رکھنا چاہتے ہیں، مخلص نہیں ہیں بلکہ ان تہذیبی اداروں کو فائدے کے لیے ڈھال یا چھڑی کے طور پر استعمال کر رہے ہیں۔ اور وہ بھی جو نئے معاشرے کو جنم دینا چاہتے ہیں اسے طاقت حاصل کرنے کا موثر وسیلہ جان کر سیڑھی کے طور پر استعمال کر رہے تھے۔

فرد تضاد کا شکار ہے۔ وہ جو کہنا ہے کرتا نہیں ہے۔ اور جو کرتا ہے کہتا نہیں ہے۔ ہر ایک کے دل میں چور ہے۔ اسی لیے
فاظ" اور " اثر" کا رشتہ بھی ٹوٹ گیا ہے۔ مقرّروں اور محرّروں کے خوبصورت اور اچھے سے اچھے الفاظ بھی اب ہمیں متاثر
ں کرتے۔ لفظوں نے اپنے معنی کھو دیے ہیں۔ خلوص اور ایک دوسرے پر اعتماد کے فقدان نے ایک ایسی فضا پیدا کر دی ہے کہ یقین
ہیں آتا کہ واقعی جو بات وہ کہہ رہا ہے اس کا اس سے یہی مطلب ہے۔ اسی لیے سچ اور جھوٹ میں تمیز باقی نہیں رہی۔ جب سچ اور
ٹ مل جائیں تو لفظوں کی اثر آفرینی باقی نہیں رہتی۔ سارا معاشرہ یرقان کے مرض میں مبتلا ہے۔
تعلیمی، علمی و تحقیقی ادارے سیاسی اکھاڑے بن گئے ہیں اور استاد اور اہلِ علم فتح حاصل کرنے کے لیے جنگلی مرغوں کی طرح
اکھاڑوں میں اترتے ہوئے ایک دوسرے کو نئے نئے داؤ پیچ سے شکست دینے میں لگے ہوتے ہیں۔ یہاں بھی کُل اقتدار حاصل
نے کی خواہش یہ سب کھیل کھلا رہی ہے اور یہ لوگ تعلیم و علم کی روشنی پھیلانے کے بجائے ایک دوسرے کو کاٹنے اور رد کرنے میں
مروف ہیں۔

انسانی شعور ہر لمحہ رواں دواں ہے۔ یہ ایک بہتا ہوا دھارا ہے اور ہر لمحہ ارتقا پذیر ہے۔ یہی سبب ہے کہ آج انسانی
رگی کو متحرک اور معنی خیز بنانے کا مسئلہ سب سے بڑا مسئلہ ہے۔ آج کے عہد کا ایک بڑا سوال یہ بھی ہے کہ میں کون ہوں؟ اس سوال
جواب شکوک کی گہری تہوں تک پہنچا ہوا ہے جہاں انسانی ذہن ہستی اور نیستی کے مسائل سے دوچار ہے۔
آج ایسے قوانین اور نصب العین عنقا ہو چکے ہیں جو ایک انسان کو معنویت بخشتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ آج کے ادیب کا سب سے
مسئلہ یہ ہے کہ ایسی ذات کی تصویر کشی کس طرح کی جائے جس نے اپنی ہستی کو کھو دیا ہے۔
آج کے ہم عصر ادیب میں زیادہ زور انسان کی داخلی زندگی پر ہے مگر شخصیت کا ایک اندرونی مرکز بھی ہے اور جو اٹوٹ ہے۔
ر جو مشاہدات کو محفوظ کرتا ہے، تجربات کو پرکھتا ہے اور حیات و کائنات کی بے معنویت پر متفکر ہوتا ہے۔ انسانی شعور سے یہ غیر معمولی
ما بستگی اس خوف کا بھی ردِّ عمل ہے کہ جدید تکنیکی اور سرمایہ پرست تمدّن کہیں انسان کی داخلی زندگی کا خاتمہ نہ کر دے اور انسان
یک چلتی پھرتی مشین ہو کر نہ رہ جائے۔
آج سائنس نے افکار کی دنیا میں اتھل پتھل پیدا کر دی ہے اور پُرانے حقائق کو بھی رد کر دیا ہے جس کے نتیجے میں انسانی
ہن اس منزل پر آ کھڑا ہوا ہے کہ انسان اپنے علم سے زیادہ اپنی لاعلمی سے واقف ہو گیا ہے۔ ہم عصر ادیب کا یہ بھی ایک اہم مسئلہ ہے۔
اور آج کے ادب کا عظیم ترین مرحلہ لحہ بہ لمحہ بدلتے ہوئے افکار سے نبرد آزما ہونا بھی ہے، لیکن بقول نظام صدیقی، نیوکلیائی جنگ
براہِ راست نبرد آزما ہونے کا موقع بھی نصیب نہیں ہے کہ ہم کسی توسیع پسند کے زلف گرہ گیر کے اسیر ہو کر محاذ آرائی کر سکیں۔ اب
نسانی دردمندی اور انسانی جد و جہد کے سوا کوئی چارہ نہیں ہے جو عالمی نفرت سے بھری دنیا کے متبادل نئی دنیا کی تخلیق کا پیغام
ے سکے۔ یہ محبت آگیں پیغام یکسر نوا قداری بصیرت اور نئی جمالیاتی جاذبیت سے مملو ہے۔ ہم اپولی نیر APOLLINAIRE کی اس جدیدیت
سے کتنی دور ہٹ گئے ہیں جہاں انھوں نے لفظوں کی سرحد کی ایک انجانی دھرتی پر صداقت کی تلاش کی دعوت دی تھی جو حقیقی تخلیقیت
کا نقطۂ اوّل ہے۔ اس کے برخلاف ہم آج مجرمانہ حد تک ایک بالکل انوکھی مفاہمت پرست اور مصلحت یافتہ صورتِ حال میں اسیر
ہیں۔ جب اقتدار کے گھنے سایہ میں محفوظ دانشور، ناقد، ادیب اور شاعر پوشیدہ مفاد کے زیرِ اثر آسانی سے خود کو ایک سانس میں

فیشن گزیدہ جدید اور دوسری سائنس میں ادارہ پسند ترقی پسند بھی کہہ سکتے ہیں۔

ہم عصر ادب کے اس مسئلے کو ہم دیوانہ وار بھاگنے سے تشبیہ دے سکتے ہیں جس کے بارے میں وزیر آغا کا کہنا ہے کہ بیک وقت نہ صرف چاروں طرف دیوانہ وار بھاگ رہے ہیں بلکہ ہمہ وقت زیادہ سے زیادہ بولنے اور اپنی آواز کو بلند تر کرنے کی فکر میں بھی ہیں۔ لاؤڈ اسپیکر اور ریڈیو سے لے کر جیٹ ہوائی جہاز اور پھر جو سری بم تک آواز کے دائرے پھیلتے چلے گئے تغیر اور تبدیلی کی رفتار اس قدر تیز ہے کہ ہر شے چشم زدن میں پرانی دکھائی دینے لگتی ہے۔ چنانچہ ایک W AWAY CULTURE نمودار ہو رہا ہے جس میں فیشن گرگٹ کی طرح اپنے رنگ بدلتے ہیں۔ یہ تیز رفتاری بیک وقت تخریبی بھی ہے اور تعمیری بھی۔ تخریبی یوں کہ اس نے صدیوں پرانے سماجی اور مابعد الطبیعیاتی نظام کو لرزہ بہ اندام کر دیا ہے اور اس کی مرشد اور بے مایا بلند کے سامنے سسٹم اور پیٹرن تاش کے پتوں کی طرح بکھرنے لگے ہیں۔ تعمیری یوں کہ ذہن کی تیز رفتاری نے بہت سے پردوں کو کر پرے پھینک دیا ہے اور انسانی نظریں کائناتِ اکبر اور کائناتِ اصغر دونوں کا مطالعہ کر رہی ہیں۔ فلکیات نے کائنات اتنا وسیع کر دیا ہے کہ اس کا ادراک کرنے کی کوشش کریں تو تخیل کے بھی پر جل اٹھیں۔ حیاتیات کے مطالعہ نے خلیہ کی کوکھ میں کائناتِ اصغر کا منظر دکھایا ہے۔ بلکہ RECOMBINENT - D.N.A. یا GENS - SPLICING سے تخلیق کاری کا ایک باب کھول دیا ہے!

جدید ذہن بیک وقت پرانے جہان کے انہدام کا تماشائی بھی ہے اور ابھرتے ہوئے نئے جہان کا ناظر بھی، وہ اس سے لیس بھی ہے اور تغیر سے آشنا بھی۔ وہ انبوہ سے کٹ کر اپنی انفرادیت کو بھی نکھار رہا ہے اور تخلیقی طور پر فعال ہونے کے ساتھ اپنے اجتماعی روپ کو پہچاننے پر بھی قادر ہے۔

عصری ادب کے میلانات اور تخلیقی رجحانات کے جنم، نشوونما، عروج اور زوال یعنی مسائل کے تعلق سے سلیم اختر نے لکھا ہے کہ عصری تقاضے ایک خاص مدت تک کارفرمائی کے بعد معاشرے میں ایک خاص نوع کی صورتِ حال پیدا کر دیتے ہیں جس کے نتیجہ میں اس عہد کے اہلِ قلم کے پاس دو طریقے رہ جاتے ہیں، ایک مفاہمت کا اور دوسرا عمل کا!

اگر ہم چاہیں تو اس مفاہمت اور ردِ عمل کے تجزیاتی مطالعہ کی روشنی میں عصری آگہی، طرزِ احساس اور ادب میں متنوع رجحانات و میلانات و صورتِ حال کا مطالعہ کر کے نتائج کے لیے درست تناظر مہیا کر سکتے ہیں۔ مفاہمت اور ردِ عمل، عمل، بے عملی، مثبت اور منفی، روایت اور بغاوت، مسلمات اور تجربات۔ یہ سب مختلف اصطلاحات ہیں۔ مگر درحقیقت اس آویزش کی مظہر ہیں جو عصری تقاضوں اور اہلِ قلم کے تخلیقی شعور میں جاری رہتی ہے۔ اگر قلم کار میں تخلیقی وژن کمزور ہے طرزِ احساس میں توانائی نہ ہوگی اور سب سے بڑھ کر اس میں وہ جرأت نہ ہوگی جو ایک سچے تخلیقی فن کار کے لیے زرِ خالص تابندہ ہے تو وہ پھر زمانے کے ہاتھوں بے بس ہو جائے گا اور یوں محض وقت کے گنبد میں صدائے بازگشت بن کر رہ جائے گا لیکن اس کے پاس ایک توانا تخلیقی وژن ہو، شدت سے پُر طرزِ احساس ہو اور وہ آئینِ جواں مرداں حق گوئی و بے باکی، کی زندہ بھی ہو تو پھر وہ اپنے زمانے اور معاشرے سے عاجز نہیں آتا بلکہ تخلیق کے اسمِ اعظم سے ان سب پر حاوی ہو جاتا ہے۔ تو کا اپنے عصر یا معاشرے پر حاوی ہونا ان معنوں میں کہ وہ اپنے معاشرے کے داخلی تضادات اجاگر کرتا ہے، منافق

ے چاک کرتا ہے۔ حصولِ مقاصد اور ذرائع کی غیر اخلاقی بنیاد کی نشاندہی کرتا ہے۔
لیکن چونکہ کے آج کے عصر میں ہر قدر مشکوک ہو چکی ہے اس لیے اچھائی اور برائی میں کوئی حدِ فاصل باقی نہیں رہی۔
ویسے یہ سچائی روزِ روشن کی طرح عیاں ہے کہ عصری ادب میں تخلیقی توانائی کم ہو رہی ہے، ذاتی سوچ کے آفاق سمٹ
، اور نظر کے زاویے محدود ہو کر رہ گئے ہیں۔ پھر بھی آج علامت، استعارہ اور تجرید نے ایک کلیشے کی صورت اختیار کر لی
ے نتیجے میں نفیٔ ابلاغ کو پھر ایک مرتبہ T ـ ل ے کا درجہ ملتا جا رہا ہے۔ خواہ اسے تیسری دنیا کا نام دیں یا تیسری آواز کا
اکریں یا کچھ اور کہہ لیں۔ شعور کی جنگ ایک نئے دور میں داخل ہوتی جا رہی ہے کیونکہ انسانی وجود کی اہمیت کا مسئلہ یا
ور کائنات کے رشتے کا تعلق کوئی نیا مسئلہ نہیں ہے۔ آج کا انسان حق کی ابدی تلاش میں سرگرداں ہے او[illegible]گی کا
ر بامقصد ہونا اس کے لیے اہم ہے۔ آج کا ادیب، ادب کی تخلیق صرف تخلیقی کرب سے نجات پانے کے لیے نہیں بلکہ حال سے
ے لیے کر رہا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس کی تخلیق میں بنیادی مسائل اور بنیادی ضرورتوں کی کوکھ سے جنم لینے والی سچائیاں
لے رہی ہیں!

ڈاکٹر منظر کامرانی

خواجہ معین الدین ــــــ جدید ڈرامے کے بانی

اردو ادب میں اسٹیج ڈراموں کی طرف بہت کم توجہ دی گئی۔ اس صنفِ ادب کو سنوارنے میں ہمارے جن ادیبوں نے حصہ لیا ہے ان کے نام انگلیوں پر گنے جاتے ہیں۔ جن میں آغا حشر کاشمیری اور امتیاز علی تاج نمایاں حیثیت رکھتے ہیں۔ لیکن یہ دیکھ کر بڑی خوشی ہوتی ہے کہ قیامِ جامعہ کے بعد ہی طلبہ جامعۂ عثمانیہ حیدرآباد دکن نے جہاں دیگر اصنافِ اردو ادب کو نوازا ہے وہاں اردو ڈراما پر بھی خاص توجہ دی۔ چنانچہ "اردو ڈرامے اور جامعۂ عثمانیہ" کے باب میں جناب سبطِ حسن اپنی کتاب "شہر نگاراں" کے صفحہ ۲۱۱ پر لکھتے ہیں ــــــ

"جامعۂ عثمانیہ کے دو ممتاز طالب علموں میر حسن اور مخدوم محی الدین نے مل کر جارج برنارڈشا کے ڈرامے وڈوورز ہاؤزلیس کو اردو کا جامعہ پہنایا۔ یہ پہلا سماجی کھیل تھا جس میں دکنی معاشرے کی جھلکیاں نہایت حسن و خوبی کے ساتھ پیش کی گئی تھیں ــــــ"

یہاں سے جامعہ عثمانیہ میں اردو ڈرامے کی شروعات ہوئی۔ پھر اس صنفِ ادب کی طرف یحییٰ صدیقی، سید وقار احمد، بشیر احمد، مرزا ظفر الحسن، رشید قریشی، صمد رضوی اور ڈاکٹر رفیعہ سلطانہ متوجہ ہوئے۔

جب خواجہ معین الدین نے جامعہ عثمانیہ کے ڈرامائی ماحول میں قدم رکھا تو اپنے پیش رو ڈراما نویس طلبہ کی پیروی کرتے ہوئے انھوں نے بھی اپنے لیے ڈراموں ہی کا میدان منتخب کیا اور کئی ایک ڈرامے مثلاً سرکاری دکان (۱۹۴۱ء) آزاد شاعری (۱۹۴۶ء) سسرال اور پرانے محل (۱۹۴۸ء) لکھ کر اسٹیج کیے اور خراجِ تحسین حاصل کیا۔ ان کے یہ ڈرامے اتنے مقبول ہوئے کہ حیدرآباد کی ادبی دنیا کو یقین ہو گیا کہ وہ مستقبل کے ایک معیاری ڈراما نگار بننے والے ہیں۔ ساتھ ہی ساتھ خواجہ معین الدین نے فنکاروں کی ایک چاق و چوبند جماعت بھی تیار کر لی۔ بدقسمتی سے ان کے چوتھے ڈرامے "پرانے محل" کے اسٹیج ہونے کے بعد انڈین یونین کی حکومت نے حیدرآباد دکن پر چاروں طرف سے بھرپور حملہ کر دیا اور سلطنتِ آصفیہ زوال پذیر ہوئی۔ اب خواجہ معین الدین ہجرت کر کے حیدرآباد دکن سے پاکستان آگئے اور یہاں بھی انھوں نے ڈرامے لکھنے کا سلسلہ جاری رکھا اور اداکاروں کی ایک جماعت تیار کر کے اپنا پہلا ڈراما پاکستان میں "زوالِ حیدرآباد" کے نام سے اسٹیج کیا۔ پھر "نیا نشان"۔ "وادیٔ کشمیر" "لال قلعے سے لالو کھیت

"تعلیم بالغان" اور "مرزا غالب بندر روڈ پر" والے ڈرامے اپنے ساتھیوں ماجد مرحوم (ریڈیو پاکستان) محمود علی اور سبحانی باؤ کی مدد سے اسٹیج کیے۔ وہ نہ صرف مذکورہ ڈراموں کے مصنّف تھے بلکہ ہدایت کاری کے فرائض بھی خود انھوں نے ہی انجام دیے۔ اس طرح مسلسل بیس سال تک انھوں نے اردو ڈرامے کی خدمت انجام دی۔ خواجہ معین کے یہ ڈرامے ہمارے معاشرے کی صحیح طور پر عکاسی کرتے ہیں۔ انھوں نے اپنے ان ڈراموں میں جابجا ہماری سماجی زندگی کی بعض خرابیوں پر بھرپور طنز کیے ہیں جن سے ان کی نیک نیتی اور اصلاحی کاوشوں کا پتا چلتا ہے۔ وہ ایک دردمند مصلح کی حیثیت میں بگڑے ہوئے معاشرے کو سنوارنا چاہتے تھے۔ وہ قومی، وطنی یک جہتی کے دل سے خواہاں تھے۔ ان کے تمام ڈراموں میں یہ اوصاف وخوبیاں بدرجۂ اتم نظر آتی ہیں۔ ان کا ایک مشہور ڈراما ہے ـــ "مرزا غالب بندر روڈ پر"ــ اس میں کراچی کے ایک گھٹیا سے ہوٹل کا ذکر ہے۔ ہوٹل والا سیٹھ ہے تو جاہل، مگر بڑا دوراندیش، محتاط اور صاحبِ دل انسان ہے۔ اس نے ہوٹل کی دیوار پر گاہکوں کی ہدایت کے لیے ایک تختی لگا رکھی ہے۔ اس پر لکھا ہے ـــ "حکومت کا بات کرنا، تیسا کرنا اور سائری کرنا منا ہے"ــ اس لیے کہ حکومت کی بات کریں گا تو پولیس آجائیں گا۔ سائر کریں گا تو سائر جمع ہوجائیں گا اور رنسہ بازی تو خیر بڑے ہوٹلوں کا معاملہ ہے"۔

"مرزا غالب بندر روڈ پر" کہنے کو تو ایک ڈراما ہے لیکن اس ڈرامے کی تہہ میں بھی محبّت، قوم پرستی، شرافتِ نفس اور پاکستان دوستی کے رنگ جھلمل جھلمل کر رہے ہیں۔ پس منظر یہ ہے۔ کردار اچھے بُرے ہر طرح کے ہیں۔ وہ اپنے کردار کی زبان سے بڑی معنی خیز طنز کرتے ہیں۔ مثلاً دلی کے قبرستان کا سین ہے۔ وہاں ایک کردار کہتا ہے:

> "کان کھول کر سن لو ہم مسلمان ہیں۔ ہمیں کوئی ملیامیٹ نہیں کر سکتا۔ ہم اپنے ہاتھوں اپنے آپ کو ملیامیٹ کر لیتے ہیں ـــــ"

پولیس کے رویے پر چوٹ کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

> "جب حوالدار ہنستا ہے اور کتے روتے ہیں تو دنیا پر کوئی نہ کوئی مصیبت ضرور آتی ہے ـــ"

ایک لڑکا ہے بظاہر آوارہ، شرابی، نام ٹیپو ہے۔ ایک مسلمان باوردی سپاہی کو مخاطب کر کے کہتا ہے:

> "جب میں میسور کا بادشاہ تھا اور انگریزوں کو ہندوستان سے نکالنا چاہتا تھا۔ اس وقت بھی تو نے چند ٹکوں کے عوض ایسا ہی لباس پہن کر میرے سینے پر گولی چلائی تھی۔ یہ ٹیپو کا سینہ ہے۔ مسلمان کی تاریخ کا سینہ ـــــ"

یہ ہے بکاؤ غدّاروں پر خواجہ کا طنز۔ حوالدار اس کی شراب پر طنز کرتا ہے کہ جیسے خدا اسے اس حرکت پر معاف نہ کرے گا۔ وہ کڑک کر جواب دیتا ہے۔

> "خدا ضرور معاف کر دے گا کمبخت تو خدا کو بھی کوئی حوالدار سمجھتا ہے ـــــ"

خواجہ صاحب قادرالکلام تھے اور ان کی نگاہ گہری اور مشاہدہ وسیع تھا۔ وہ ہر طبقے کی نفسیات اور زبان پر قدرت رکھتے تھے۔ جیب کتروں، ہوٹل والوں اور بندر والوں کی زبان بھی وہ ایسی روانی سے لکھتے ہیں جیسے عالموں اور ادیبوں کی۔ اس سلسلے میں عجیب عجیب اور دلچسپ باتیں کہہ جاتے ہیں۔ زیرِ نظر تیکھا اور طنز و مزاح سے بھرپور سین بندر روڈ کا

جس سے ان کی قادر الکلامی اور وسعت بیانی کا پتا چلتا ہے ــــ قادر ایک غبارے والا اور زور آور ایک جیب کترا ہے۔ زور آور کہتا ہے کہ اب جیب کتری کے دھندے میں مزہ نہیں رہا۔ قادر جواب دیتا ہے ــ

"سالا پبلک ہوسیار ہو گیا۔ پن کی جور آور بھائی جتنا پبلک ہوسیار ہوئیں گا اتنا سالا اناج مہنگا ہوئیں گا ــ"

ان دونوں کو دھندے کے لیے مجمع لگانا ضروری ہے تاکہ لوگ ہوائی بندوق سے غبارے پھوڑیں اور ادھر جیب کترا جیبوں پر ہاتھ صاف کرے۔ اس غرض سے جھوٹ موٹ جھگڑا کرنا ضروری ہے۔ قادر کہتا ہے:

"یہ سالا پبلک بگیر جھگڑے کے تو مسلم لیگ میں کبھی جمع نہیں ہوتا۔ آبابا کچھ جھگڑا مگڑا کرے"

آپ نے دیکھا انسانی نفسیات اور طنز کا کیسا مطالعہ ہے۔ ایک جگہ خواجہ صاحب بین الاقوامی سیاست اور انگریزوں کی کائیاں پن کی طرف اشارہ کرتے ہیں ــ جس بندوق سے گاہک غبارے پھوڑنے کا کام لیتا ہے اس کی نال ٹیڑھی ہے۔ جب اس پر اعتراض کیا جاتا ہے تو قادر غبارے والا، کیا جواب دیتا ہے ــ

"ابی تم انگریج کو اپنا جیسا بے دکھوف سمجھتا ہے؟ ارے وہ سیدھی نال کا ٹیکو رکھیں گا ــ ابی موٹر ہو گا تو کسی ٹیم تم اس کی طرف ایم لیں گا تو گولی سالا کھو دتم کو لگیں گا۔ انگلس مال ہے بابا انگلس مال۔ ابی تم امریکا کی طرف ایم لیں گا تو گولی سالی رسیا کو لگیں گا"

آدمی اپنے احساسات میں سچا ہو تو اس کی سوچ اس کے ڈرائنگ روم تک محدود نہیں رہتی۔ متاعِ کارواں لٹتے دیکھ کر آخر ان سے ضبط نہ ہوا اور وہ اس عنصر پر نکل کھڑے ہوئے جو آخر کار ان کا مقصدِ زندگی بن گیا۔ وہ اب لوگوں تک پہنچ کر ان کے ماضی کے حوالے سے ان کا خیال سمجھنا چاہتے تھے لیکن اس طرح نہیں کہ لوگ سنیں ــ تالیاں بجائیں اور بھول جائیں اور وہ گلے میں پھولوں کے ہار ڈالے خدا حافظ کہہ کر اپنی کیڈیلاک میں بیٹھ جائیں۔ وہ تو اس تیر کے قائل تھے کہ جس کی خلش مدتوں ستاتی رہے اور پھر مدتوں وہ خلش چیخ بن کر دلوں میں گونجتی رہے۔ لوگ غور و تفکر پر مجبور ہو جائیں کہ یہ ہمارے ضمیر میں کون بول رہا ہے۔ یہ بڑا مشکل کام تھا اور ڈراما ہی لوگوں کے دلوں میں سرگوشی کر سکتا ہے ــــ اور ڈراما بھی کون سا؟ عوامی کرداروں کی زبان میں بولا جانے والا تفننِ طبع کا سامان لیکن درحقیقت سامانِ عبرت۔

خواجہ معین الدین کے مزاج میں ظرافت، طنز، شگفتگی اور بذلہ سنجی بدرجۂ اتم موجود تھی۔ ورنہ آپ ہی غور کیجیے کہ اس کے بغیر غالب کو عالمِ ارواح سے بندر روڈ تک کھینچ لانے اور گھنٹہ دو گھنٹہ ان کی میزبانی کا شرف ادا کرنے کا حوصلہ کون کر سکتا ہے۔ بہرحال مقصد کی سچائی نے ان کے نشتروں کو وہ کیفیت بخشی کہ لوگ خود کشاں کشاں ان کے کھیل دیکھنے جاتے۔ وہ "لال قلعے سے لالو کھیت" ہو یا "مرزا غالب بندر روڈ پر"۔ "وادیٔ کشمیر" ہو یا "تعلیم بالغاں"۔ نہ تو خواجہ صاحب کی ظرافت اور حسنِ سامانیوں میں فرق آیا اور نہ عوام کے ذوق و شوق میں بلکہ ان کی مقبولیت میں اضافہ ہی ہوتا گیا۔

خواجہ صاحب کے ڈراما نگاری کے موضوعات گنے چنے ہیں۔ مثلاً ملتِ اسلامیہ کا عروج و زوال اور اس کے اسباب، روزمرہ زندگی کے مسائل اور ان کی مظلومیت۔ اس لیے باتوں کی تکرار کا امکان اپنی جگہ موجود ہے لیکن ان کی ظرافت اتنے

پیراہن بدل کر سامنے آتی ہے کہ تماشائی ان ہی باتوں میں ہر دفعہ نئی حلاوت محسوس کرتا ہے۔ دراصل ان کی ظرافت ایک رنگ کے مضمون کو سوانگ سے باندھنے کا ہنر جانتی ہے۔

ڈرامے میں عام طور پر کہانی کا عنصر تماشائیوں کو الجھائے رکھتا ہے۔ دیکھنے والے اس ہیجان میں مبتلا رہتے ہیں کہ رقیب باتدبیر کیا چال چلتا ہے اور مظلوم ہیرو ہیروئن پر کیا آسمانی آفت نازل ہوتی ہے۔ کہانی کی اپنی طاقت اور جادو مسلّم ہے۔ ڈراما میں سسپنس کی ساری ذمہ داری کہانی پر ہوتی ہے۔ کہانی کے بہاؤ میں ڈراما نویس انٹری (ENTRY) ایگزٹ (EXIT) مکالمہ، کردار نگاری اور منطقی معاملات میں جگہ جگہ گدے کھاتے ہیں اور کہانی ایک مجازی کا کام کرتی رہتی ہے۔

بغیر کسی کہانی کے ڈرامے کی دیوار کھڑی کر دینا بہت مشکل کام ہے۔ ہمارے یہاں یہ حوصلہ بھی خواجہ معین الدین ہی کا ہے۔ ان کے ڈراموں میں کہانی کی حیثیت اضافی ہوتی ہے لیکن بعض ڈراموں میں تو ہوتی ہی نہیں لیکن وہ اپنے فقروں کی توانائی سے اتنی بڑی کمی کو اس طرح پورا کر لیتے ہیں کہ شاید ہی کوئی دوسرا کر سکے۔ اس کے لیے یوروڈائیس انیسکو (ENESCO) اور برنارڈشا کا کلیجہ چاہیے۔ کہانی کے سسپنس کی جگہ انھوں نے ایک اور قسم کے سسپنس سے کام لیا ہے۔ وہ ہے ڈائیلاگ کا سسپنس۔ اس کا پروسس یہ ہے کہ تماشائی ایک فقرے سے لطف اندوز ہو کر دوسرے آنے والے تیز فقرے کے انتظار میں رہتا ہے اور آخر تک یہ سلسلہ برقرار رہتا ہے۔ اس قسم کے سسپنس کے لیے ڈراما نویس کا تماشائیوں میں معتبر ہونا ضروری ہے کہ وہ یہ توقع قائم رکھیں کہ فقروں کی حلاوت اور ان کا یہ اختتام ڈراما تک یقینی ہے۔ خواجہ معین الدین نے اپنی ظرافت اور معیار کا یہ اعتبار قائم کر لیا تھا۔ مزاح میں یہ توانائی کسی کسی ہی کو نصیب ہوتی ہے۔ خواجہ معین الدین کے یہاں یہ اپنے کمال پر ہے۔

ہر اچھے مزاح نگار کی طرح وہ بھی انسانی نفسیات سے کھیلتے ہیں۔ ان کا فقرہ سن کر تماشائی پہلے تو انتہائی بے فکری سے قہقہہ لگاتا ہے۔ لیکن دوسرے ہی لمحہ اس فقرے میں اپنا بگڑا ہوا چہرہ دکھائی دیتا ہے۔ اور یہ سوچ کر بدحواس ہو جاتا ہے کہ میں تو اپنے ہی بگڑے ہوئے چہرے پر قہقہہ لگا رہا ہوں ___ یہی وہ عمل ہے جس کے ذریعے خواجہ معین الدین اپنے تماشائی کی روح میں داخل ہو کر اس سے سرگوشی کرتے ہیں اور اسے خود احتسابی کے عمل سے گزار کر اپنا مقصد پورا کرنا چاہتے ہیں۔ مثلاً طوائفوں کے کوٹھے کے بارے میں۔ یہی فقرہ کہ ___

"اصل کا من ولینتھ تو یہی رہے پیارے ___"

اتنی قسم کا عمل اور ردِ عمل اپنے اندر رکھتا ہے اور اس طرح کی بے شمار مثالیں ان کے ڈراموں میں مل سکتی ہیں۔

ظلم کے خلاف آواز بلند کرنا ان کا (خواجہ معین الدین) مسلک تھا۔ ظلم کہیں بھی ہو، کسی بھی صورت میں ہو وہ اسے برداشت نہیں کر سکتے تھے۔ حیدرآباد دکن کے عوام پر ظلم ہوا تو انھوں نے "پرانے محل" جیسا ڈراما تخلیق کیا۔ حیدرآباد پر بھارت کے قبضے کے بعد "زوال حیدرآباد" لکھا۔ کشمیر میں ہونے والے ظلم نے ان سے "وادیٔ کشمیر" جیسا ڈراما لکھوایا۔ انھوں نے کشمیر نہیں دیکھا تھا لیکن اس کے باوجود کشمیر پر ایسا خوبصورت ڈراما لکھا۔

کسی کی دل شکنی ان کے مسلک کے خلاف تھی کسی کی حق تلفی ان کی موجودگی میں نہیں ہو سکتی تھی۔ وہ ساری مصلحتیں بالائے طاق رکھ کر صرف حق کا ساتھ دیتے۔ یہی ان کا ایمان تھا۔

صاحب نواب بہادر یار جنگ مرحوم کی تصویر سے اسپائریشن حاصل کرتے تھے۔ ان کی زندگی میں نواب صاحب
سل تھی جو علامہ اقبال کی زندگی میں مولانا روم کو تھی
پنے ملک سے بے پناہ محبت کرتے تھے۔ جب کبھی سیاسی مصائب کا آغاز ہوتا تو وہ گھنٹوں فکر مند رہتے۔
الدین خاں یوزئی خواجہ صاحب کے عزیز ترین دوستوں میں سے ایک ہیں۔ دونوں دوست ایک جان دو قالب
اجہ صاحب کے بارے میں وحیدالدین خاں یوزئی فرماتے ہیں

"جب خواجہ صاحب پاکستان آئے تو بے سروسامانی کا عالم تھا۔ نہ رہنے کو گھر تھا اور نہ کھانے کا کوئی بندوبست۔ جیکب لائنز میں ایک چپراسی کے کوارٹر میں تین چار دوستوں نے ڈیرہ ڈال رکھا تھا۔ انھوں نے یہیں ڈراما "زوال حیدرآباد" تخلیق کیا۔ اس کے اسٹیج سے تیرہ ہزار روپے کی آمدنی ہوئی۔ اس زمانے کے تیرہ ہزار روپے آج کے تیرہ لاکھ سے زیادہ کی مالیت رکھتے تھے، لیکن انھوں نے یہ پوری رقم ایک اسکول کے قیام کے لیے دے دی۔ اس رقم سے بہادر یار جنگ اسکول قائم ہوا۔ اس اسکول میں انھوں نے اعزازی مدرسی اختیار کی اور ایک عرصہ تک پڑھاتے رہے۔"

بہ صاحب نام و نمود سے ہمیشہ دور بھاگتے تھے۔ جب ان کا ڈراما اختتام کو پہنچا تو آخر میں فن کاروں کے علاوہ
سب اسٹیج پر آکر اپنی رونمائی کرتے مگر لوگوں کی شدید خواہش کے باوجود وہ کبھی اسٹیج پر نہیں آتے تھے۔
بہ صاحب کے تعلقات بہت بڑے بڑے افسروں سے بھی تھے۔ اگر وہ چاہتے تو اس سے بڑے فائدے حاصل کر سکتے
ان سے کسی نے کہا:

"تمہاری صدر سے کمشنر تک پہنچ ہے مگر تم اس سے کوئی فائدہ نہیں اٹھاتے۔"

پر خواجہ صاحب نے جواب دیا، میں دو آدمیوں کی روٹی کھاتا ہوں۔ ایک بندہ نواز گیسو دراز کی اور دوسرے نواب
کی۔ میں ان کے عرس اور برسی کے موقع پر دریاں بچھاتا ہوں اور مجھے دوسرے دن میرا اللہ بے حد و حساب دیتا ہے۔
جہ صاحب فقرہ چست کرنے میں اپنا جواب نہیں رکھتے تھے۔ ایک دن ان کے ایک دوست ان سے کچھ قرض لینے کے
پہنچے مگر براہِ راست گفتگو کرنے کے بجائے ذرا گھما پھرا کر بات کرنے لگے۔ "تم ناظم آباد میں پلاٹ کیوں نہیں
سوسائٹی میں پلاٹ مل جائے تو وارے نیارے ہو سکتے ہیں۔" اس پر خواجہ صاحب نے پوچھا:

"یہ تو سب ٹھیک ہے مگر یہ بتائیے کہ آپ کیا پلاٹ بنا کے آئے ہیں۔"

جہ صاحب صرف اپنے دوست احباب کی محفلوں میں کھلتے تھے لیکن یہاں بھی ان کا یہ حال تھا کہ مرحوم ابراہیم جلیس
تے رہتے اور یہ ایک خاص انداز سے مسکراتے رہتے اور پھر وہ ایک بات ایسی کہہ دیتے کہ محفل میں ایک قہقہہ گونجتا
ین جلیس کا قہقہہ بھی شامل ہو جاتا۔ غرض کہ دوست احباب کی اس محفل کے باہر خواجہ معین الدین محبت وانکسار
ا تے ... کی سنتے اور ... غور سے سنتے۔ اچھی بھی سنتے بری بھی سنتے اور جواب میں وہی ایک زیرِ لب مسکراہٹ۔

ان کی آنکھیں اوران کے کان ہمیشہ کھلے رہتے لیکن ان کے ہونٹ کبھی کبھی کھلتے اور اسی انداز سے انھوں نے اپنی قوم کے عروج وزوال کا وہ ڈراما بھی دیکھا جو لال قلعے سے شروع ہو کر لالو کھیت میں اب بھی جاری ہے۔ لیکن اس ڈرامے کا یہ عظیم تماشائی اور یہ عظیم ڈراما نویس ہمارے درمیان سے اٹھ گیا۔ خدا ان کی روح پر اپنی رحمتیں نازل کرے۔ آمین۔

خواجہ معین الدین کے ڈرامے ہماری قومی زندگی کے عکاس ہیں۔ اس ڈرامے میں زندگی کے وہ گوشے بڑی اہمیت کے حامل ہیں جنھیں خواجہ معین نے اپنے ڈراموں میں واضح کیا ہے اور ان میں اپنے خون کا رنگ بھرا ہے۔ خواجہ معین الدین کے ڈرامے میں حالی کا مسدس بھی ہے اور اکبر کا طنز بھی۔ اور مقصد ان ڈراموں کا بھی کم و بیش وہی ہے جو حالی اور اکبر کا تھا۔

خواجہ معین الدین اسٹیج ڈرامے کی آبرو تھے۔ انھوں نے پاکستان میں اسٹیج کو ایک نئی زندگی دی۔ لاتعداد باصلاحیت اداکاروں کی صورت میں نیا خون دیا تھا۔ اپنی شبانہ روز جد و جہد، فرض شناسی، اپنے ملک سے وفاداری کی شکل میں فن کاروں کے درمیان حوصلہ اور خود اعتمادی کی جوت جگادی تھی۔ انھوں نے اپنی زندگی کے مختلف ادوار سے یہ بات ثابت کر دی تھی کہ شاندار فتح مستقل محنت میں پوشیدہ ہے۔

حالات کو آئینہ دکھانے والے مردِ جری خواجہ معین الدین ۹ نومبر ۱۹۷۱ء کی شام کو اس جہانِ فانی سے کوچ کر گئے عظمتِ رفتہ کے گیت گانے اور عہدِ حاضر پر طنزیہ مسکرانے والی باغ و بہار شخصیت چمن زندگی کی بہاریں دیکھے بغیر اپنے احباب و اقارب کو فسردہ دل اور رختہ سامان چھوڑ گئے۔

ڈاکٹر مبارک علی

سوروکن: تاریخ کے نظریات

پی تی رم سوروکن ۱۸۸۹ء میں روس میں پیدا ہوا۔ اور وہاں کی مشہور یونیورسٹی سینٹ پیٹرز برگ میں قانون اور سوشیالوجی کا پروفیسر تھا۔ ۱۹۲۵ء میں یہ امریکہ چلا آیا اور یہاں فی سوٹا اور ہارورڈ میں بحیثیت پروفیسر کے کام کیا۔ اس کی مشہور کتاب SOCIAL AND CULTURAL DYNAMICS ہے جس میں اس نے تاریخ کے بارے میں بنیادی نظریات کو پیش کیا ہے۔

تاریخ کے مفکرین کے لیے انسانی معاشرہ مطالعہ کے نئے نئے پہلو پیش کرتا ہے۔ ان کے لیے ان سوالوں کا جواب ڈھونڈنا مشکل معاشرے کیوں تبدیلیوں کے عمل سے گزرتے ہیں؟ یہ کیوں عروج و زوال کے مرحلوں کو طے کرتے ہیں؟ اور ایسا کیوں ہوتا ہے کہ ماشرے تبدیلیوں کو قبول کر لیتے ہیں اور کچھ اپنی جگہ منجمد رہتے ہیں؟

سوروکن نے ماہرِ عمرانیات اور مورخ کی حیثیت سے معاشروں میں تبدیلی کے عمل کو سمجھنے کی کوشش کی ہے۔ اس مقصد اس نے تبدیلی کے کچھ قوانین دریافت کرنے کی کوشش کی ہے تاکہ ان کے ذریعے تاریخ کو سمجھا جا سکے۔ اگر ایک مرتبہ تبدیلی کے عمل یا گیا اور اس کے قوانین کو دریافت کر لیا گیا تو پھر یہ ممکن ہو سکے گا کہ زوال کے عمل کو روکا جا سکے اور جب معاشرے میں کسی خرابی نظر آئیں تو اس کا علاج اس طرح سے کرایا جا سکے جیسے کہ ایک ڈاکٹر مرض کی تشخیص کے بعد بیماری کو دور کر کے مریض کو دوبارہ ستد بنا دیتا ہے اسی طرح سے مورخ کی حیثیت معاشرے میں ایک ڈاکٹر کی ہو جائے گی جو معاشرے کو مستقل طور پر صحت مند لگے گا۔

سوروکن نے اپنے نظریات کا اطلاق یورپی معاشرہ پر کیا ہے اس لحاظ سے اس کا دائرہ محدود ہے۔ اور اس نے اشپنگلر و ٹائن بی مشرق و مغرب کے تمدنوں کا تفصیل کے ساتھ تجزیہ نہیں کیا ہے، مگر اس نے یورپی معاشرے کا جو مطالعہ کیا ہے اس کی روشنی رقی تہذیب کا بھی جائزہ لیا جا سکتا ہے۔

سوروکن اگرچہ سائیکل یا ایک دائرہ میں گردش کے نظریہ کا قائل ہے اور اس لحاظ سے وہ ابن خلدون، ویکو، اشپنگلر

اور ٹائن بی کا ہم خیال ہے۔ مگر ساتھ ہی وہ ان کی طرح تمدنوں کے بیالوجیکل عمل کا قائل نہیں۔ معاشرہ اپنے زوال کو روک
ہے۔ اس کے لیے ضروری ہے کہ معاشرہ کے تمدن میں وحدت اور اکائی ہو اور اس کے مختلف عناصر باہم پیوست اور ہم آ
صرف اس صورت میں وہ ٹوٹ پھوٹ کو روک سکتا ہے۔ اگر اس میں یہ اکائی نہیں ہوگی تو وہ جاندار تمدن کی شکل اختی
کر سکے گا۔ تمدن بکھرے ہوئے عناصر کو جمع کر کے توانا اور طاقتور ہوتا ہے اور پھر اسے توڑنا مشکل ہوتا ہے، لیکن اگر وہ بکھ
اور اس کے کچھ حصے ترقی یافتہ ہوں اور کچھ پس ماندہ تو ایک ایسا تمدن ہمیشہ زوال کے عناصر کو اپنے اندر چھپائے رکھتا ہے۔

سوروکن تین کلچروں کی نشاندہی کرتا ہے کہ جن کے دائرہ میں معاشرہ گردش کرتا رہتا ہے

۱۔ (IDEATION) آئیڈیشن کلچر، جسے عقائد کا زمانہ کہا جاتا ہے۔
۲۔ (IDEALIST) آئیڈلسٹ کلچر، جو عقائد اور سائنس کا امتزاج ہوتا ہے
۳۔ (SENSATE) کلچر، یہ سائنس کا دور ہوتا ہے

پہلے کلچر یعنی عہد عقائد میں جو موضوعات معاشرہ کے لیے اہم ہوتے ہیں ان میں مابعد الطبیعیات اور مافوق الفطرت
خدا، شیطان، فرشتے، ارواح، روحانیت، نجات، گناہ، بخشش، دوبارہ زندگی، برزخ، جنت اور جہنم شامل ہیں۔ اس د
الہیات کا مضمون سب سے اہم ہوتا ہے اور باقی تمام علوم اس کے مددگار ہوتے ہیں۔ اگر کوئی چیز حواس اور تجرباتی طور پر حادثا
ہیں ظاہر ہو جائے تو اسے بھی اگلی دنیا کے سمجھنے کے لیے استعمال کیا جاتا ہے۔

اس کلچر میں سچائی کو پانے کے لیے مقدس کتابوں اور صحیفوں کو ذریعہ بنایا جاتا ہے اور اگر سچائی کو ثابت کیا جائے تو
لیے ان کا حوالہ دینا لازمی ہوتا ہے۔ نئی سچائی صرف خدا کی جانب سے وحی یا الہام کی صورت میں ظاہر ہوتی ہے۔ منطقی دلائل او
کی بنیاد پر شہادتیں صرف اس حد تک قبول کی جاتی ہیں کہ جس حد تک وہ عقائد کی حمایت میں ہوں۔ اگر وہ ان سے منحر
ہیں تو اس صورت میں انہیں شیطانی وسوسہ سمجھ کر رد کر دیا جاتا ہے اور ایسے خیالات کو ارتداد، کفر اور جادو قرار دیا جاتا ہے

آئیڈلسٹ کلچر میں موضوعات جزوی طور پر مافوق الفطرت ہوتے ہیں اور جزوی طور پر تجرباتی — لیکن اس میں
کے ذریعے جاننے والے علم کو زیادہ اہم نہیں سمجھا جاتا اور صرف اس حد تک اسے قبول کیا جاتا ہے کہ جس حد تک ضرورت اس کی اج
اس کلچر میں سچائی کو جاننے کے لیے منطقی دلائل اور حواس کے ذریعے جو تجربات ہوں انہیں دونوں کو استعمال کیا جا
اور ان کے ذریعے جو دلائل تشکیل ہوتے ہیں ان کی حمایت مقدس تحریروں اور وحی کے ذریعے کی جاتی ہے تاکہ اس طرح د
کو ملا کر ان میں ہم آہنگی پیدا کی جائے۔

سین سیٹ کلچر میں اشیا کو حواس کے ذریعے سمجھا اور پہچانا جاتا ہے۔ وہ تمام مواد کہ جسے حواس کے ذریعے نہیں سمجھا جا
جیسے کہ خیالات، احساسات، جذبات اور اقدار، تو ان کے ان پہلوؤں پر زور دیا جاتا ہے کہ جن کو حواس کے ذریعے جانا جا
جیسے (BEHAVIORISM) بی ہیویورازم۔ اس طرح ان کے غیر مادی پہلوؤں کو نظر انداز کر دیا جاتا ہے۔ اس سے ثبوتیت
(POSITIVISM) اور مذہب میں لاادریت (AGNOSTICISM) کے نظریات پیدا ہوتے ہیں۔ اس میں سائنس کے ذ
تمام مضامین کو سمجھا جاتا ہے۔

اس کلچر میں سچائی کو جاننے کے لیے حواس اور سائنسی آلات کی مدد لی جاتی ہے۔ جیسے مائکرو اسکوپ، ٹیلی اسکوپ، علم شماریات اور منطقی دلائل وغیرہ۔ اس میں تمام نتائج اس وقت تک مفروضے رہتے ہیں جب تک کہ تجرباتی طور پر انھیں ثابت نہیں کیا جائے۔ وہ تمام مفروضے جو حقائق سے متصادم ہوں انھیں رد کر دیا جاتا ہے۔ اس کلچر میں مقدس تحریریں، وحی، الہام اور عقائد پرست توہمات ہوتے ہیں اور انھیں نظر انداز کر دیا جاتا ہے۔

ان خصوصیات کے بعد سوروکن معاشرے کے اقتصادی، سماجی اور سیاسی پہلوؤں کا جائزہ لیتا ہے اور آرٹ، ادب اور تعمیر میں ان تینوں کلچروں کی خصوصیات کو تلاش کرتا ہے۔ مثلاً آئیڈیشن کلچر میں حکومتیں مذہبی ہوتی ہیں۔ اس کے لیے ضروری نہیں کہ حکمراں مذہبی راہنما ہوں، کیونکہ اس میں حکومت کا ڈھانچہ اور قوانین مذہبی ہوتے ہیں اور مذہبی عقائد کو حکومت کے ذریعے نافذ کیا جاتا ہے۔ اور مذہب کے خلاف کچھ بھی برداشت نہیں کیا جاتا۔

آئیڈلسٹ کلچر میں حکومت کا ڈھانچہ جزوی طور پر مذہبی اور جزوی طور پر سیکولر ہوتا ہے، لیکن اس میں مذہب کا غلبہ رہتا ہے۔ جبکہ سین سیٹ کلچر میں حکومت پر تاجر، سائنسداں اور مافیا کا قبضہ ہوتا ہے۔

اس طرح تینوں کلچروں میں علاحدہ علاحدہ طبقوں کا عروج ہوتا ہے اور اس کا زوال بھی اس خاص کلچر کے ساتھ ہوتا ہے جس کا یہ حصہ ہوتے ہیں۔ مثلاً سین سیٹ کلچر میں تاجر، بورژوا، بیوروکریسی، دانشور اور سائنسداں عروج پاتے ہیں۔ آئیڈیشن کلچر میں معاشرہ معاشی طور پر پس ماندہ ہوتا ہے۔ کیونکہ اس میں اس دنیا سے زیادہ دوسری دنیا کی فکر ہوتی ہے۔ جب آئیڈلسٹ کلچر آتا ہے تو اس میں اس دنیا سے دلچسپی بھی بڑھ جاتی ہے جس کے نتیجے میں خواہشات پیدا ہوتی ہیں اور ان کی تکمیل کے لیے انسان جدوجہد کرتا ہے اور اس سے معاشرے کی معاشی حالت بہتر ہوتی ہے۔ سین سیٹ کلچر میں تاجر اور بورژوا طبقے زیادہ دولت خود ہتھیا لیتے ہیں اور سماجی انصاف کا کوئی خیال نہیں کرتے۔ مگر اس دور میں سائنسی اور فنی ترقی کی وجہ سے معاشی ترقی بھی ہوتی ہے اور اس کے زوال کے نتیجے میں معاشی حالت بہت خراب ہوتی ہے۔ اور اس کی وجہ سے مزدور اور غریب مفلس ہو جاتا ہے۔

معاشرے میں جس قسم کا کلچر ہوتا ہے اس قسم کا ذہن اور شخصیت کے کردار کی تشکیل ہوتی ہے۔ کیونکہ فرد کو اس کے علاوہ اور کچھ دیکھنے اور سوچنے کو نہیں ملتا۔ آئیڈیشن کلچر میں ذہن مذہبی اور سخت متعصبانہ ہوتا ہے اور اس میں اس کی بھی اجازت ہوتی ہے کہ کافروں کو قتل کر دیا جائے۔ سین سیٹ کلچر سیکولر اور سائنسی ذہن بناتا ہے۔ کیونکہ یہ ذہن معاشرے کی ضروریات کو پورا کرتا ہے۔

سوروکن اس بات کی نشاندہی کرتا ہے کہ کسان اور مزدور ان تینوں کلچروں میں باعمل نہیں ہوتے کیونکہ ان کی ذہنی سطح اتنی بلند نہیں ہوتی کہ وہ خود کو صاحب اقتدار طبقوں میں ضم کر دیں۔ اس لیے ان لوگوں کی معاشی حالت میں بھی زیادہ فرق نہیں آتا۔ اسی وجہ سے کلچر صرف اقلیت پیدا کرتی ہے۔ اس کی مثال یہ ہے کہ اس سرزمین پر بلین کی تعداد میں لوگ رہتے ہیں مگر ان میں ۲۲ لاکھ ایسے ہیں جو تاریخ میں مشہور ہیں، غلام، قیدی اور غریب لوگ تاریخ نہیں بناتے بلکہ ان کے لیے تاریخ بنائی جاتی ہے۔ عوام یا مجمع تہذیب و تمدن کو ختم کر دیتے ہیں جیسے انقلاب فرانس میں عوامی مجمع نے فرانسیسی تہذیب کو ختم کر دیا۔ اور اس پر ایڈمنڈ برک نے اس طرح سے توجہ کی کہ اس انقلاب کے بعد قدیم روایات اور طریقۂ زندگی کا خاتمہ ہوا اور اس کی جگہ ان وحشیانہ نظریات نے لی کہ جو سرد دلوں اور کیچڑ بھرے ذہنوں سے پیدا ہوئے تھے۔ دورِ شجاعت ختم ہوا اور ان کی جگہ تاجر، بنیے اور سوفسطائی پیدا ہوئے

اس کے بعد سے یورپ کی عظمت ہمیشہ کے لیے ختم ہو گئی۔

سوروکن انسانی تاریخ کو سمجھنے کے لیے ان تینوں کلچروں کو ضروری سمجھتا ہے۔ جس کلچر کا معاشرے پر تسلط ہوتا ہے اس کی خصوصیات لوگوں میں آجاتی ہیں۔ وہ اس کا دعویٰ نہیں کرتا کہ سب معاشرے اس معیار پر پورے اترتے ہیں یا اس کے پیمانے بالکل صحیح ہیں۔ ان کلچروں کی روشنی میں یورپی معاشرے کے مطالعہ کے بعد وہ اس کے زوال کی پیش گوئی کرتا ہے۔ کیونکہ یورپی کلچر اپنی یک جہتی کو برقرار نہیں رکھ سکا۔ اس لیے اس کی بقا کی قوت ختم ہو گئی اور جب کسی کلچر کی اندرونی قوتیں کمزور ہو جاتی ہیں تو اس کا زوال لازمی ہوتا ہے۔

تبدیلی کا عمل:

تاریخ میں تبدیلی کا عمل کسی نہ کسی شکل میں جاری رہتا ہے۔ یہ تبدیلی خود بخود نہیں آتی بلکہ اسے لایا جاتا ہے۔ کیونکہ ہر کلچر اپنے وجود کو برقرار رکھنے کی جدوجہد میں تبدیلی کی ہر کوشش کو ناکام بناتا ہے۔ لیکن اندرونی اور بیرونی قوتیں تبدیلی کو لانے اور اسے تیز تر کرنے میں مصروف رہتی ہیں۔ تبدیلی اولین طور پر کسی کلچر کے اندر سے ہوتی ہے پھر خارجی اثرات اس عمل کو آگے بڑھاتے ہیں۔ جو تبدیلی اندرونی طور پر ہوتی ہے وہ زیادہ موثر ہوتی ہے اور جب معاشرے کا نیا ڈھانچہ تشکیل ہوتا ہے تو اس میں ان اندرونی قوتوں کا پوری طرح سے اظہار ہوتا ہے۔ اگر کسی کلچر میں یک جہتی ہو تو اس میں تبدیلی بھی مکمل آتی ہے۔ لیکن اگر اس کے پہلو مختلف اور بکھرے ہوئے ہوں تو اس صورت میں تبدیلی بھی علاحدہ علاحدہ آتی ہے اور آہستہ آہستہ یہ تکمیل پذیر ہوتی ہے۔

تاریخ میں تبدیلی کے عوامل کو کئی آہنگوں کے ساتھ بیان کیا جاتا ہے۔ اس میں دو لفظوں کا آہنگ دو تضادات کو ابھارتا ہے اور ان کو بیان کرتا ہے۔ جیسے جنگ و امن، امن و بدامنی، تباہی و تخلیق، نفرت و محبت، مذہب و سیکولرازم، انتشار و اتحاد، عروج و زوال، چیلنج و جواب، پیچھے ہٹنا اور واپس آنا، بکھرنا اور متحد ہونا اور باندھنا اور کھولنا۔ اس آہنگ سے تاریخی عمل کے کئی نکات واضح ہوتے ہیں اور معاشرے کے مختلف پہلوؤں کو اس آہنگ کی روشنی میں دیکھا جا سکتا ہے۔

دو لفظوں کے علاوہ تین لفظوں کا آہنگ بھی تبدیلی کے عنصر کی وضاحت کرتا ہے جیسے اتحاد، تقلید، مخالفت، پیدائش، شباب، ضعیفی، سماجی تحریکوں کو سمجھنے کے لیے ان کے تین درجے ہوتے ہیں۔ جیسے نظریاتی تنظیمی اور اقتدار، تہذیبوں کے زوال کو سمجھنے کے لیے ان کا ٹوٹنا، بکھرنا اور ختم ہو جانا۔ آرٹ کے لیے تعمیراتی، پلاسٹک، تصویری ادب کے لیے غنائیہ، دیو مالائی ڈرامہ، تاریخ کے لیے قدیم، عہد وسطیٰ اور جدید۔ مختلف مفکرین نے تہذیبوں کو تین ادوار میں تقسیم کیا ہے جیسے ویکو کے ہاں دیوتاؤں کا عہد، ہیروز کا عہد، انسانوں کا عہد، یا ہیگل کے درمیانی عمل میں دعویٰ، ضد دعویٰ، امتزاج۔

چار لفظوں کے آہنگ کو انسان نے موسم اور انسانی زندگی سے لیا ہے جیسے بچپن شباب، پختگی، ضعیفی یا صبح دوپہر شام، رات۔ کچھ مفکرین نے معاشرے میں نظاموں کی گردش کو چھ لفظوں کے آہنگ میں بیان کیا ہے جیسے پولی بیس کہتا ہے کہ انسانی معاشرہ بادشاہت، آمریت، ارسٹوکریسی، چند سری، جمہوریت، عوامی حکومت کے درمیان گردش میں رہتا ہے۔ اسی طرح ہفتہ کے ۷ دن اور سال کے ۱۲ مہینے اس آہنگ کا حصہ ہیں۔ ۳ — ۷ — ۹ — ۱۲ کے ہندسوں کی جادوئی حقیقت کا تعلق بھی تبدیلی کے آہنگ سے ہے۔

اس لیے انسانی زندگی میں جو اتار چڑھاؤ، زیر و بم اور نشیب فراز آتے ہیں انھیں اور ان کے تضادات کو تاریخ کے ذریعے سمجھا جاسکتا ہے۔ چونکہ یہ آہنگ انسانی زندگی میں ہے، اس کے معاشرے میں ہے اس لیے یہ تاریخ کا بھی حصہ ہے۔ تاریخ معاشرے کے ان تضادات کی وضاحت کر کے تبدیلی کے عمل کی نشاندہی کرتی ہے۔

سوروکن اس سوال کا بھی جواب دیتا ہے کہ سماجی تبدیلی میں وقت کی اہمیت کیا ہے؟ اور تبدیلی کے لیے کتنا وقت درکار ہوتا ہے۔ ایک نظریہ یہ ہے کہ جیسے جیسے وقت گزر رہا ہے سماجی تبدیلیاں بھی اسی قدر تیزی سے آرہی ہیں۔ مثلاً پتھر کا زمانہ ایک طویل عرصہ تک رہا۔ لوہے اور سونے کانسی کا زمانہ اس کے مقابلے میں کم عرصہ رہا۔ تبدیلی کے عمل میں اس لیے تیزی آئی کہ اس زمانے میں پتھر کے ساتھ لوہے اور کانسی دونوں کا استعمال بھی ہوا۔ اور ان تینوں نے مل کر تبدیلی کی رفتار کو تیز کر دیا۔ جیسے جیسے زمانہ آگے بڑھ رہا ہے اسی طرح سے تبدیلی کی رفتار بھی بڑھ رہی ہے۔

سوروکن کے نزدیک سماجی و ثقافتی واقعات بار بار دہرائے نہیں جاتے اور نہ ہی ترقی کا عمل سیدھی لائن میں ہوتا ہے۔ دیکھا جائے تو ہر نظام کی اپنی خصوصیات ہوتی ہیں اور اس میں لامتناہی جدتیں ہوتی ہیں۔ جب ایک نظام فرسودہ ہوجاتا ہے تو اس کی جگہ دوسرا نیا نظام آجاتا ہے۔ اس سے تاریخ میں رنگارنگی اور بوقلمونی پیدا ہوتی رہتی ہے۔ تاریخ اس لیے ایک نہ دہرانے والی رہتی ہے۔ اس میں اس قدر تخلیقی قوتیں ہیں کہ یہ کبھی تھکنے والی نہیں۔

معاشرہ اور آزادی:

آزادی پر اظہار رائے کرتے ہوئے سوروکن کہتا ہے کہ کسی معاشرے میں فرد کی آزادی کا تعلق اس کے سماجی تعلقات اور سیاسی نظام پر ہوتا ہے۔ اس کے علاوہ فرد کی اپنی فطرت اور کردار بھی اس کی آزادی کا تعین کرتے ہیں۔ اگر کسی شخص کی بہت سی خواہشات، آرزوئیں اور مقاصد ہوں اور وہ انھیں پورا کرنے کے لیے ماحول کو سازگار نہیں پاتے، اور معاشرہ، قانون اور رسم و رواج اس کے راستے میں حائل ہوں تو ایسا شخص خود کو آزاد نہیں پاتا۔ اس کے مقابلے میں ایک اور شخص کہ جس کی خواہشات زیادہ نہیں۔ وہ اپنی خواہشات کی تکمیل کے لیے معاشرے اور اس کے ذرائع کا شاکی نہیں ہوتا ہے۔ اس لیے اگر خواہشات کو کم کر دیا جائے تو اسی حساب سے آزادی بڑھ جائے گی۔ اس لیے آزادی ایک اضافی چیز ہے۔

جب معاشرے میں لوگوں کی ضروریات پوری نہیں ہوتیں تو وہ ان کے حصول کے لیے اوّل پرامن طور پر کوشش کرتے ہیں۔ اس کے بعد پرتشدد ذرائع کو اختیار کیا جاتا ہے۔ اور لڑائی جھگڑے، انقلاب اور ہنگاموں کے ذریعے وہ ہر چیز کو الٹ پلٹ کر دیتے ہیں۔ اگر اس سے بھی ان کی ضروریات پوری نہ ہوں تو لوٹ مار، ہجرت اور خودکشی کا راستہ اختیار کرتے ہیں۔

جنگ، انقلاب اور ہنگامہ:

سوروکن نے یورپ کی تاریخ میں جنگ، انقلاب اور ہنگامے کی اہمیت کا مطالعہ کیا۔ اس نے اس کی طرف نشاندہی کی کہ جب جنگوں کے بارے میں لکھا جاتا ہے تو صرف فوجیوں کی تعداد، مرنے والے اور زخمیوں کی تعداد اور جنگ کے دورانیہ کے بارے میں اطلاعات ہوتی ہیں۔ لیکن جنگ کے دوسرے اہم پہلوؤں کو نظر انداز کر دیا جاتا ہے جن میں جنگ کے اخراجات، بیماریاں، شہریوں کی اموات اور اس کے معاشی و سماجی اثرات، جب تک جنگ کی اذیت کا پوری طرح سے بیان نہیں ہوگا۔ اس وقت تک لوگ جنگ سے

نفرت نہیں کریں گے۔

اس طرح جب انقلاب یا ہنگامہ کا مطالعہ کیا جائے تو ان سوالوں کا جواب ڈھونڈنا ضروری ہے کہ ہنگامہ کس علاقہ میں ہوا، اس سے کتنے شہر، گاؤں اور قصبے متاثر ہوئے؟ کتنے لوگوں نے اس میں حصّہ لیا؟ اس کے حامی اور مخالف کتنے تھے؟ اس کا دورانیہ کیا تھا؟ اس میں تشدّد کتنا تھا؟ ان سوالات کے جواب سے انقلاب و ہنگامہ کی اہمیت و اثر کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔

سیاسی ہنگاموں کا مطالعہ کرنے سے پہلے ان کی نوعیت کا تعیّن کرنا چاہیے کہ کیا سیاسی ہنگامے کا مقصد حکومت کو بدلنا ہے؟ یا ہنگامہ سماجی و معاشی نوعیت کا ہے یا علاحدگی پسندوں کا پیدا کیا ہوا ہے، مذہبی ہے یا ذاتی نوعیت کا ہے۔ اس کا مقصد صرف ذاتی طور پر حکومت میں تبدیلی ہے یا کسی قانون اور ٹیکس کے خلاف ہے۔ ان ہنگاموں کی مثال بیماری کی طرح ہوتی ہے۔ جو چند ہفتوں میں ختم ہو جاتی ہے۔ وہ ہنگامے جن کا دورانیہ سال بھر کا ہو یا سال بھر سے زیادہ رہے ہوں۔ ایسے ہنگاموں کی تعداد تاریخ میں بہت کم ہے۔

سوروکین نے کلچر کی جن تین اقسام کا ذکر کیا ہے، تاریخ میں تبدیلی کے عمل، معاشرہ اور آزادی، جنگ، انقلاب و ہنگامہ کے بارے میں جن خیالات کا اظہار کیا ہے۔ اس کی روشنی میں ہم اپنے معاشرے اور اپنے سیاسی، معاشی، سماجی اور مذہبی رجحانات کو سمجھ سکتے ہیں، اس کی نشاندہی کر سکتے ہیں کہ ہمارا معاشرہ کس کلچر کے تسلّط میں ہے، اس کی خصوصیات کیا ہیں؟ کیا تبدیلی کا کوئی عمل ہے یا نہیں؟ ہمارے ہاں ہنگاموں کی نوعیت کیا ہے؟ اور کس حد تک یہ ہمارے معاشرے پر اثر انداز ہو رہے ہیں۔ ان کا جواب تاریخ کے ذریعے ڈھونڈا جا سکتا ہے

گل ہائے رنگ رنگ

بنگلہ ڈراما

رابندر ناتھ ٹیگور / جاوید دانش

چنڈالیکا

کردار

پراکریتی ــــــ ایک اچھوت ڈومن لڑکی
ماں ــــــ پراکریتی کی بوڑھی ماں
آنندا ــــــ گوتم بدھ کا مُرید، ایک جوگی

سین ــــ ایکٹ ون ــــ

ایک گاؤں کے جھونپڑے کا صحن، پردہ کھلنے پر پراکریتی کی ماں اس کے انتظار میں پریشان ہے اور ٹہل رہی ہے!

: (دروازے پر رک کر آواز دیتی ہے) پراکریتی او پراکریتی ــــ
(کوئی جواب نہ پاکر واپس ٹہلنے لگتی ہے اور زیرِ لب بولتی ہے) یہ گئی کہاں؟ اس لڑکی کا گھر میں تو دل لگتا ہی نہیں!

یتی: (دُور سے آواز آتی ہے) ماں ــ میں یہاں ہوں!

: کہاں ــــ کہاں ہے تو؟

یتی: یہاں ماں ــــ کنوئیں پر!

: اچھا اب گھر آ ــــ مجھے تجھ سے باتیں کرنی ہیں! (زیرِ لب بولتی ہے) اس وقت اور کنوئیں پر ــ حیرت ہے۔ زمین بھٹی کی طرح سُلگ رہی ہے اور دن کا پانی بھی گھر آچکا ہے پھر ــــ (پراکریتی اندر داخل ہوتی ہے) گاؤں کی ساری لڑکیاں اپنے اپنے کام سے لگ چکی ہیں اور تُو اس دھوپ میں بیٹھی پگھل رہی ہے۔ کیوں بھلا؟ کہیں تُو بھی اوما دیوی کی طرح کسی شیو جی جیسے کی محبت کے لیے جان دینے پر تو نہیں تُلی ہے؟

یتی: (خلا کو گھورتے ہوئے) ہاں ماں ــــ ایسا ہی کچھ ہے!

: (سنبھلتے ہوئے) پَرکیو رحم ــــ مگر وہ ہے کون؟

پراکریتی: وہی جس نے مجھے پکارا تھا!
ماں: (اُلجھتے ہوئے) مگر تجھے کس نے پکارا تھا؟
پراکریتی: اس کے بول ابھی تک میرے کانوں میں گھنٹیوں کی طرح بج رہے ہیں (کچھ سوچ کر مسکراتی ہے اور زیر لب کہتی ہے پلاؤ گی . . . . .
ماں: (حیرت سے جملہ دہراتی ہے) پانی پلاؤ گی ـــــ بھگوان بھلا کرے۔ ارے یہ کوئی ہماری ذات کے باہر کا تو نہیں تھا؟
پراکریتی: وہ تو کہہ رہا تھا وہ ہم لوگوں ہی میں سے ہے!
ماں: مگر کیا تُو نے اسے خبردار کیا تھا کہ تو ایک ڈوم چنڈالنی ہے؟
پراکریتی: ہاں کیوں نہیں ـــــ مگر وہ کہنے لگا ناموں سے خود کو دھوکا نہ دو ـــــ پھر کہنے لگا، اگر تم کالے بادلوں کو چنڈا کیا وہ بادل نہیں رہتے۔ کیا اس پانی کی اہمیت کم ہو جاتی ہے جو اُن بادلوں میں بارش کے روپ میں دھرتی کا سینہ ٹھ خود کو چھوٹا مت سمجھو کیونکہ خود کو اپنی نظر میں گرانا خودکشی سے بڑا گناہ ہے (ٹھنڈی سانس لیتی ہے) آہ ـــ اس کی ایک اب بھی میرے کانوں میں گونج رہی ہے۔ مجھ سے وہ کتنی اپنائیت سے باتیں کر رہا تھا ماں ـــــ!
ماں: (بیزار ہو کر) کیا بکواس کر رہی ہے ـــــ کیا تُو اپنے پچھلے جنم کی کوئی کہانی تو نہیں سنا رہی ہے؟
پراکریتی: (مسکراتے ہوئے) میں تو اپنے نئے جنم کی کہانی سنا رہی ہوں ماں!
ماں: تیرا نیا جنم (حیرت سے قریب آ کر گھورتی ہے) تُو ـــ میری بیٹی نہیں! پراکریتی ـــ بتا مجھے ـــ یہ سب کب ہوا
پراکریتی: اس دوپہر ـــ جب میں اپنے بن ماں کے بچھڑے کو کنوئیں پر نہلا رہی تھی ـ گیروا چادر لپیٹے ایک جوگی آیا اور میر کھڑا ہو گیا۔ کہنے لگا، مجھے پانی پلاؤ گی ـــــ میں جھٹ اٹھی اور کورنش بجا لائی۔ پھر اپنے حواس پر قابو رکھتے ہوئے ب ایک چنڈال لڑکی ہوں اور اس کنوئیں کا پانی اچھوت لوگوں کے استعمال سے ناپاک ہو گیا ہے ـ اس نے کہا "تم ا ایک ہی خاندان کے لوگ ہیں اور ہر وہ پانی جو پیاس بجھا دے اور لوگوں کے استعمال میں آ سکے، پاک ہے" میں نے ا پہلے کبھی نہ سنی تھیں، اور پھر نہ چاہتے ہوئے ان چنڈال ہاتھوں سے جو اس کے قدموں کی دھول چھونے کی ہمت نہ کر اسے پانی پلایا!
ماں: بیوقوف لڑکی ـــ ایسا کرنے کی ہمت تُو نے کیسے کی، کیا تُو بھول گئی تھی کہ تو ہے کون اور تیرا مقدر کیا ہے؟
پراکریتی: نہیں ماں ـــ میں یہ سب نہیں بھولی، مگر (فضا کو گھورتے ہوئے) پانی کا ڈول جیسے ہی اس نے میرے ہاتھوں سے اس بے جان ڈول سے ایک ساگر اُبل پڑا جس میں سات سمندروں کا پانی ساتھ بہہ رہا تھا ـــــ اس ساگر میں میری ذات، میرا مقدر سب ڈوبتا چلا گیا ـــ سب ڈوب گیا!
ماں: حیرت ہے، تو کیسی بہکی بہکی باتیں کر رہی ہے۔ تیری بولی تک بدل گئی ہے ـــ یہ تیری زبان نہیں، ضرور تجھ پر کوئی ہے ـــ (وقفہ) تو جو کچھ بول رہی ہے کیا تیری اپنی سمجھ میں کچھ آ رہا ہے؟
پراکریتی: (خود سے ہم کلام ہے) کیا اس گاؤں میں اور کہیں پانی نہ تھا۔ وہ خاص کر میرے کنوئیں پر کیوں آیا ـــــ کیوں وہ

شاید مجھے نئی زندگی کا آشرواد دینے ـــــ وہ ضرور اس کام کا بہانا ڈھونڈ رہا ہوگا ـــ ہاں وہ کہہ رہا تھا۔" جب سیتا بن باس کے لیے جنگل کو جا رہی تھی، اس نے بھی ایسے پانی سے غسل کیا تھا جو کسی "گوپک" چنڈال نے دیا تھا!

(فکرمند ہوکر) سُن میری بچی، مجھے یہ سب پسند نہیں ـــ یہ جوگی بیراگی اپنی باتوں سے لوگوں کی سوچ بدل دیتے ہیں۔ آج تیری باتیں میری سمجھ سے باہر ہے۔ کیا پتا کل تیری شکل بھی اجنبی لگنے لگے ـــ مجھے تو بڑا ڈر لگ رہا ہے پراکریتی!

ماں ـــ سچ پوچھو تو تم نے مجھے جانا ہی نہیں اگر وہ مجھے جانتا ہے ـــ (وقفہ) جب ساری لڑکیاں اپنے گھڑے بھر کر گھروں کو چلی جاتی ہیں ـــ میں روز کنوئیں پر اس کا انتظار کرتی ہوں!

(بیزار ہوکر) کس کا انتظار بھلا؟

اپنے جوگی کا!

بیمار لڑکی ـــ کون جوگی آئے گا بھلا؟

وہی ایک جوگی ماں، جس نے ایک لفظ کہے بغیر یہ کہہ دیا کہ وہ آئے گا (مگر اس نے اپنا وعدہ اب تک پورا کیوں نہیں کیا ـــ وہ آیا کیوں نہیں ـــ وہ آیا کیوں نہیں ـــ (رنجیدہ ہوکر) میرا دل جل کر راکھ ہو رہا ہے ـــ اب کوئی پانی میری پیاس بجھا نہیں سکتا ـــ میں تو روز اس کا انتظار کرتی ہوں، مگر وہ نہیں آتا ـــ مگر وہ کیوں نہیں آتا ماں؟

پراکریتی، تو ایسی بہکی بہکی باتیں کر رہی ہے جیسے کوئی نشے میں ہو ـــ اب چھوڑ یہ سب، گھر کے اندر آجا!

(ان سُنی ہوتے ہوئے) مجھے وہ چاہیے ـــ جو بنا بلائے آیا اور مجھے بتا گیا کہ میں بھی قابلِ قبول ہوں۔ اس نے مجھے مٹی سے اُٹھا کر دل میں جگہ دی ہے!

یہ مت بھولو پراکریتی کہ میٹھے بول ضروری نہیں سچ بھی ہوں! کسی انجانے گناہ کے سبب تُو ایسی ذات میں پیدا ہوئی ہے۔ جس کی بندشوں کو کوئی بھی نہیں توڑ سکتا۔ تُو اچھوت ہے اور یہ ایک ننگی حقیقت ہے اسے قبول کر اور یقین جان ـــ (وقفہ) لگتا ہے دھوپ نے تجھے بیمار کر دیا ہے ۔ میں کہتی ہوں اب اندر آجا!

(اپنی دُھن میں گاتی ہے) "میں مقدس ہوں ـــ
پھول کہتا ہے کیونکہ میرا تعلق مٹی سے ہے
میں ازل سے ہی تیری پرستش کرتا ہوں
مجھے یہ بھلا دے کہ میں مٹی سے پیدا ہوا ہوں، کیوں کہ میری روح آزاد ہے!"

(سوچتے ہوئے) میں اب کچھ کچھ تجھے سمجھ رہی ہوں، ٹھیک ہے جہاں تیری محبت ہے اسی کی پرستش کر اور وہیں اپنی آزادی حاصل کر ـــ شاید ذات پات کسی عورت کو قید نہیں رکھ سکتی۔ اگر قسمت کسی مرد کو اس کی ذات کے قرب میں اندھا کردے ـــ (وقفہ) (حیرت سے) مگر ایسی خوش قسمتی تو تیرے پاس پہلے بھی ایک بار آئی تھی پراکریتی، جب وہ بھٹکا ہوا شہزادہ اپنے ہرن کا پیچھا کرتے ہوئے یہاں آیا اور تیرا شکار ہوگیا تھا۔ وہی جو تجھے اپنے ساتھ لے جانا چاہتا تھا ـــ یاد ہے تجھے؟

ہاں ـــ مجھے اچھی طرح یاد ہے!

ماں: تب تُو نے اس کے ساتھ جانے سے انکار کیوں کر دیا تھا؟ وہ تو تیری محبت میں اندھا ہو رہا تھا۔ وہ تجھے اپنے ساتھ لے بھی جا
پراکریتی: اندھا ــــ ہاں، وہ میرے لیے اندھا ہی تھا۔ وہ ایک شکاری تھا اور صرف میرے اندر کے جالوں کو دیکھ سکتا تھا!
ماں: مان لیا وہ ایک شکاری تھا مگر اس نے تیری خوبصورتی بھی دیکھی تھی۔ مگر یہ جوگی ــــ تجھے کیسے پتا کہ اس نے تجھ میں ایک عورت کے علاوہ کچھ اور بھی دیکھا ہے؟
پراکریتی: ماں ــــ تم نہیں سمجھو گی ــــ کچھ نہیں سمجھو گی ــــ مجھے معلوم ہے، وہ پہلا آدمی ہے جس نے مجھے محبت سے دیکھا ہے، اور وہ ہے جس سے میں محبت کرتی ہوں اور ہمیشہ کروں گی۔ میں اپنی زندگی کی پوجا اس کے قدموں پر نچھاور کروں گی۔ اور میں فخر سے کہوں گی۔ کہ اگر مجھے ہر کسی کی نوکری میں چرنوں کی دھول نہیں بننا ہے تو مجھے کچھ پہ تیار ہو جانا چاہیے!
ماں: اس قدر جذباتی مت بن پراکریتی ــــ ہم لوگ پیدائشی خادم ہیں ــــ ہم قسمت کے لکھے کو نہیں مٹا سکتے!
پراکریتی: نہیں ماں نہیں ــــ خود کو اپنی نظر میں گرانے کی غلطی نہ کرو۔ ایک شہزادی ایک غلام بن سکتی ہے، ایک برہمن ایک چنڈا
میں پراکریتی ہوں، نہ غلام نہ چنڈال!
ماں: آج میں تجھ سے نہیں جیت سکتی، تیری تو زبان ہی بدلی ہوئی ہے۔ میں خود اس کے پاس جاؤں گی اور بنتی کروں گی کہ جس طرح دوسروں کے گھروں میں اناج کے لیے جاتا ہے ہمارے یہاں بھی ایک پیالا پانی کے لیے آئے!
پراکریتی: (ماں کی بات پر دھیان دیے بغیر خود سے ہم کلام ہے) نہیں میں اسے اپنی آواز سے نہیں بلاؤں گی۔ میں تو اسے اپنے دل کی آواز دوں گی۔ مجھے نہیں معلوم وہ گیا کہاں، اسے مجھے حاصل تو کرنا ہے۔ مگر یہ ملن ہو کیوں کر!
کیا میرا درد اس کے درد میں شامل ہو سکتا ہے جس طرح گنگا کا ملاپ جمنا سے ہوتا ہے!! ــــ (وقفہ) ــــ ماں جب دھرتی کا سینہ سوکھے سے پھٹ پڑتا ہے، ایک پیالا پانی سے کیا ہوتا ہے ــــ کیا اس پیاس سے بادل نہیں کھنچے چلے آتے اور بارش نہیں ہوتی سوکھی دھرتی پر! ایسا کیوں نہیں ہوتا ماں ــــ!
ماں: یہ باتیں فضول ہیں ــــ اگر بادل خود سے نہیں برستے اور کھیت سوکھے جاتے ہیں۔ تو سوائے بیکسی سے آسمان کو تکنے کے ہم کر ہی کیا سکتے ہیں!
پراکریتی: نہیں ــــ (کچھ سوچتے ہوئے) ماں مہربانی کر کے میری مدد کرو ــــ سنو۔ تم جادو کے فن سے واقف ہو۔ تم جادو ٹو سے اسے یہاں بلا سکتی ہو۔ کیوں؟
ماں: پراکریتی ــــ میرا جادو کھیل اور مذاق کے لیے نہیں ہے اور پھر یہ تو آگ سے کھیلنا ہوا ــــ یہ جوگی لوگ عام آدمی نہیں پاگل ــــ ان پر جادو کا خطرہ مول لینا اچھا نہیں ــــ تُو نے تو اپنی دیوانگی میں مجھے ڈرا ہی دیا!
پراکریتی: تم اور ڈر ــــ جو شہزادے پر جادو کرنے کی ہمت کر سکتی تھی۔
ماں: میں راجہ سے نہیں ڈرتی ــــ زیادہ سے زیادہ وہ مجھے پھانسی دے دے گا!
پراکریتی: میں بھی کسی چیز سے نہیں ڈرتی ــــ سوائے ایک کے۔ مر وہ پراکریتی کے جسم میں دوبارہ قید ہونا اور اپنی نئی پہچان کھو کر دوبارہ اندھیرے میں گم ہو جانے سے ــــ (وقفہ) ماں اسے یہاں کھینچ لاؤ، مجھے اسے ضرور حاصل کرنا ہے۔ کیا یہ میری خوا

بذاتِ خود ایک معجزہ نہیں (مسکراتے ہوئے) جب وہ میرے پہلو میں ہوگا تو اور بڑے معجزے ہوں گے!

ماں: میں ڈرتی ہوں ـــ میرے جادو سے اُسے اور پھر تجھے بھی نقصان پہنچ سکتا ہے، ہو سکتا ہے میں اسے یہاں حاضر کرنے میں کامیاب بھی ہو جاؤں مگر کیا تو اس صبر آزما اور سخت امتحان کے لیے تیار ہے ـــ یا پھر اس جوگی کی کوئی اور کرامت ہوگی اور تیرا سراپا نیست و نابود ہو جائے گا۔ اور پھر کچھ بھی نہیں بچے گا۔

پراکریتی: ہاں ـــ کچھ بھی نہیں بچنا چاہیے! یہ میری آخری خواہش ہے ـــ مجھے یہ موقع ملا ہے کہ میں خود کو ثابت کروں، پگھلا کر خود کو انڈیل دوں اور مکمل ہو جاؤں ـــ اسی تسکین اور انجام کی میں منتظر تھی۔ دنیا نے ساز باز کر کے مجھ سے یہ بھلا دیا تھا کہ میں بھی کچھ دے سکتی ہوں ـــ مگر مجھے معلوم ہے، میں بھی اب نذر کر دوں گی اپنا سب کچھ۔ میں اس کا انتظار کروں گی۔ ماں مہربانی کر کے اسے فوراً بلاؤ!

ماں: کیا تجھے بھگوان سے ڈر نہیں لگتا؟

پراکریتی: میں اس سے نہیں ڈرتی جو میری فکر نہ کرتا ہو ـــ وہ بھگوان جو ذلیل کرے، اُونچ نیچ کی اجازت دے اور اندھا ہو، بھگوان ہو ہی نہیں سکتا۔ لوگوں کی سازش نے میرے بھگوان کو ناکارہ بنا دیا ہے۔ (وقفہ) (سوچتے ہوئے) شروع کرو ماں اور جوگی کو میرے پہلو میں لاؤ ـــ میں اسے سرفراز کروں گی!

ماں: کیا تو کسی بددعا یا عذاب سے بھی نہیں ڈرتی؟

پراکریتی: اصل عذاب تو میری پیدائش سے میرے ساتھ چمٹا ہوا ہے۔ وہ جوگی تو مجھے اس ازلی عذاب سے نجات دلائے گا ماں! اب میں کچھ اور نہیں سنوں گی، دیر نہ کرو ماں اپنا کام شروع کرو!

ماں: (لڑکی کو گھور کر دیکھتی ہے) ٹھیک ہے میں تیری خاطر یہ کروں گی، اس کا نام بتا؟

پراکریتی: (جلدی سے) آنندا ـــ اس کا نام آنندا ہے ماں!

ماں: (حیرت سے) آنندا ـــ وہ تو گوتم بدھ کا قریبی ساتھی ہے!

پراکریتی: ہاں ـــ وہی ہے وہ جوگی!

ماں: (ہچکچاتے ہوئے) اس پر جادو ٹونا کرنا پاپ ہے!

پراکریتی: کیوں، پاپ کیوں ہے؟

ماں: مہاتما بدھ اور ان کے ساتھی اپنی نیکی اور پاک دامنی سے لوگوں کو اپنا گرویدہ بناتے ہیں ـــ جب میں جادو ٹونے کے زور سے ایک شکاری کی طرح چھپ کر وار . . . . نہیں، یہ تو جیسے کیچڑ سے مکھن نکالنے والی بات ہوئی۔

پراکریتی: نہ نکالو کیچڑ سے مکھن ـــ مگر یہ تو بتاؤ کہ اور کس طرح کیچڑ پاک اور پوتر ہو سکتی ہے۔

ماں: (جذباتی ہو کر) کیونکہ مجھے عزیز ہے پراکریتی۔ میں ـــ میں یہ پاپ بھی کروں گی صرف تیری خوشی کے لیے ـــ اوہ، آنندہ تو عظیم ہے، میرے گناہ کو معاف کر! میری بدی کی قوت سے زیادہ تجھ میں معاف کرنے کی شکتی، میری بندگی قبول کر کہ میں اب

پراکریتی: اتنا بھی نہ ڈرو ماں ـــــ دراصل میں تمہارے ذریعے جادو کر رہی ہوں، اپنی روحانی اذیت سے نجات کے لیے اسے کھینچ لانے کی خواہش اگر پاپ ہے تو یہ غلطی میں کر رہی ہوں۔

ماں: (لڑکی کو گھورتے ہوئے) تو واقعی دلیر اور من چلی ہے لڑکی۔

پراکریتی: (مسکرا کر) دلیر ـــ اس کی دلیری دیکھو ماں ـــ اس نے کتنی سادگی سے پانی مانگا تھا ـــ آج تک کسی نے ایسی جرأت نہیں کی ـــ ان بے جان لفظوں نے میری زندگی میں رنگ بھر دیے ہیں، مجھے جینے کی امنگ دی ہے۔ اگر تم نے اسے دیکھا ہوتا تو تمہیں اندازہ ہوتا کہ تمہارا ڈر فضول ہے! (وقفہ) (زیرِ لب، سوچتے ہوئے) اس نے شہر بھر کی بھیڑ ختم کر کے بنجر زمین پر چلتے ہوئے مرگھٹ کو پار کیا ہوگا۔ پھر دریا کے اس پار چبھتی ہوئی دھوپ میں چل کر میرے پاس آیا۔ صرف یہ کہنا "مجھے پانی پلاؤ گی" اپنی اپنائیت اور کرم کی بوچھار ایک بے کار بے مقصد جاندار ـــ ایک ڈوم پر! (مسکراتی ہے) "مجھے پانی پلاؤ گی" ـــ ہاں میرے جسم کے کنوئیں میں میٹھے پانی کا جھرنا اُبل پڑا ـــ "مجھے پانی پلاؤ گی" ہاں پلک جھپکتے مجھے احساس ہوا کہ مجھے اس کی پیاس بجھانی چاہیے ـــ اور پھر میں رات دن اس کو پکارتی رہتی ہوں ـــ مجھے اس کی پیاس بجھانی ہے ـــ ماں اپنا منتر تو جپنا، وہ ضرور سُنے گا۔ (دُور سے بھکشو لوگوں کے بھجن کی آواز سُنائی دیتی ہے)

ماں: دیکھ پراکریتی ـــ کچھ بھکشو شاید گاتے ہوئے جا رہے ہیں!

پراکریتی: (فضا میں گھورتے ہوئے) ہاں ں، دیکھو ماں، وہ دیکھو ـــ وہ جوگی ـــ میرا جوگی جلوس میں سب سے آگے ہے ـــ (دونوں کچھ دیر فضا کو گھور گھور کر دیکھتی ہیں۔ پھر پراکریتی رنجیدہ ہو جاتی ہے) مگر اس نے گھوم کر کنوئیں کی طرف نہیں دیکھا۔ اس نے اس طرف ایک بار بھی نہیں دیکھا ماں ـــ وہ آ کر کہہ سکتا تھا "مجھے پانی پلاؤ گی"۔ وہ اس طرح کیوں کر میرے پاس سے گزر سکتا ہے ـــ میں، جو اس کی اپنی تخلیق ہے ـــ (زمین پر گر کر رونے لگتی ہے) یہ زمین، یہ مٹی، یہ پستی ہی میرا مقدر ہے ـــ ایک لمحے کے لیے اس نے مجھے روشنی میں اٹھایا تھا، مگر کیوں ـــ یہ کیسا کرم ہے کہ مجھ بدبخت کو دوبارہ اسی کیچڑ، غلاظت میں گرنے کو چھوڑ دیا ـــ جہاں میں ہمیشہ ہر کسی کے قدموں تلے روندی جاؤں گی!

ماں: (دلاسہ دیتے ہوئے) چپ ہو جا میری بچی ـــ بھول جا اسے۔ اچھا ہے کہ تیرا لمحے بھر کا خیالی پیکر اور خواب جلدی ٹوٹ گیا۔ جسے جھیلنا مشکل ہو وہ جتنا جلدی غائب ہو جائے بہتر ہے۔

پراکریتی: (جھنجلا کر) تم اسے خیالی پیکر اور خواب کہتی ہو ـــ یہ روزانہ کا اشتیاق، یہ ہمیشہ کی بے عزتی، یہ تا عمر ایک پنجرے میں چڑیا کی طرح پھڑپھڑانا ـــ کیا تم اسے خواب کہتی ہو ـــ کیا تم اس قوت کو بھی جو میرے جسم کے ہر رگ کو کھینچے ڈال رہی ہے، خواب کہو گی ـــ وہ لوگ جن پر زمین کی کوئی کشش نہیں، کوئی غم، کوئی خوشی نہیں، جو بادلوں کی طرح بھٹکتے رہتے ہیں، کیا صرف وہی بغیر کسی خواب کے زندہ ہیں ـــ؟ نہیں ماں یہ سچ نہیں ـــ مجھے معلوم ہے میرے لیے صحیح اور سچ کیا ہے!

ماں: (پریشان ہو کر) میں اب تیری مصیبت اور تکلیف نہیں دیکھ سکتی۔ اٹھو اور اپنے بال سنوارو۔ میں اسے اپنے جادو کے زور سے یہاں کھینچ لاؤں گی۔ میں اس کی قسم توڑ دوں گی کہ "میں کسی چیز کی خواہش نہیں کروں گا"۔ میں اس کی وہ حالت کر دوں گی کہ وہ اپنی خواہش، اپنی خوشیوں کی فریاد کرے گا!

پراکریتی: مجھے معلوم ہے ماں تمہارا جادو زندگی کی طرح قدیم ہے۔ ان جوگیوں کے ہلکے پھلکے منتروں سے زیادہ قدیم۔ یہ تمہاری قوت کا مقابلہ نہیں کر سکتے!

ماں: اچھا یہ لوگ کہاں جا رہے ہیں؟

پراکریتی: کوئی خاص جگہ نہیں جا رہے ماں ۔ یہ لوگ برسات کے موسم میں برت رکھتے ہیں اور چار مہینے کے لیے نفس کشی کرتے ہیں اور پھر وہ نکل پڑتے ہیں کون جانے کہاں ۔ اسی کو وہ نروان حاصل کرنا کہتے ہیں!

ماں: پھر جادو ٹونا فضول ہے نادان لڑکی ۔ اگر وہ کہیں دور جا رہا ہے تو میں اسے واپس کیسے لا سکتی ہوں!

پراکریتی: تمہارا سحر دوری کو ختم کر سکتا ہے، اس نے مجھ پر رحم نہیں کیا، میں بھی کوئی رحم نہیں کروں گی ۔ اپنے جادو کا زور لگاؤ ماں ۔ او اسے ایسی کنڈلی میں لپیٹو کہ دوبارہ فرار نہ ہو سکے ۔

ماں: ٹھیک ہے، یہ آئینہ اپنے ہاتھ میں لو، اور رقص شروع کرو ۔ اس کی کیفیت کا عکس اس آئینے میں نظر آئے گا!

پراکریتی: (آئینے کو لمحہ بھر دیکھتی ہے پھر رقص شروع کرتی ہے) ماں، بادل جھم میں جمع ہونا شروع ہو گئے ہیں ۔ اب جادو کام کرے گا اس کی سوکھی تپسیا مرجھائے ہوئے پتوں کی طرح اڑ جائے گی ۔ اس کی قسم بھی ٹوٹے گی اور اس کی منزل میری طرف ہو گی ۔ وہ ایک زخمی چڑیا کی طرح پھڑ پھڑاتا یہاں میرے صحن میں گرے گا ۔ میں دیکھ رہی ہوں کہ بجلی کڑکنے لگی ہے اور سمندر بپھر رہا

ماں: (آنکھ بند کیے ہوئے) ابھی بھی دیر نہیں ہوئی پراکریتی، کہو تو میں رک جاؤں ۔ فیصلہ کرو ۔ کیا میں اپنا جادو جاری رکھوں کیا تم واقعی اسے برداشت کر پاؤ گی ۔ اب یہ جادو اس وقت تک نہیں روکا جا سکے گا جب تک اس کی تپسیا بھسم نہیں ہو جاتی ۔ اور پھر اس جادو کو توڑنے کی قیمت میری جان ہو گی ۔!

پراکریتی: اسے آزمائش کی آگ سے گزر جانے دو ماں ۔ میں اس کا انجام دیکھ رہی ہوں ۔ اور پھر ہمارا طوفانی ملاپ اس بربادی کو خوشیوں میں بدل دے گا ۔ وہ مجھے بچانے کے لیے خود کو میرے حوالے کر دے گا اور میں تمہیں بچا لوں گی ۔ ماں!

(دوسرا ایکٹ) چند روز بعد ـــــــ پراکریتی کا صحن

پراکریتی: (دھن میں ناچ رہی ہے) اب میں زیادہ دیر برداشت نہیں کر سکتی! (اس کے قدم لڑکھڑاتے ہیں) ماں میرا دم گھٹ رہا ہے اب مجھ سے آئینے میں دیکھا بھی نہیں جاتا ۔ اوہ! اس پارسا جوگی پر عجیب ذہنی کرب سوار ہے!

ماں: (بے خودی میں) مجھ سے بات کر پراکریتی، ابھی بھی زیادہ دیر نہیں ہوئی ۔ جادو کا زور توڑا جا سکتا ہے ۔ حالانکہ میری اپنی جان کو خطرہ ہے مگر اس پاک روح کو بخش دینے دے!

پراکریتی: (الجھن میں) ٹھیک ہے ماں، ختم کرو ـــــ روک دو یہ جادو! (کچھ سوچ کر روہانسی ہوتی ہے) نہیں، رکو نہیں ۔ کچھ دیر اور کوشش کر لو ۔ مجھے اسے کسی طرح حاصل کرنا ہے ۔ اسے تھوڑا اور قریب آ جانے دو ۔ اسے اس آزمائش سے گزر کر میرے پاس تو آنے دو ۔ جب وہ میرے گھر میں داخل ہو گا، میں اس کی ساری کلفتوں کو دھو ڈالوں گی ۔ خود کو سونپ کر میں اس کا مرہم بن جاؤں گی ۔ میرے اندر کی آگ اس کی لغزش کے اندھیروں کو اجالا بخشے گی ۔ میری جوانی کا چشمہ اس کی زخمی روح کو نہلائے گا، پھر تر و تازہ کر دے گا ۔ ایک بار پھر وہ کہے گا ۔ "مجھے پانی پلاؤ گی" اس وقت تک کے لیے جادو کو اپنا رنگ دکھانے

ماں: (پریشان ہو کر) اوہ ۔ اس میں تو بہت وقت لگ رہا ہے، کیوں؟ (اچانک بڑبڑا کر) رکو ۔ جادو رنگ دکھا رہا ہے ۔

ہاں پراکرتی۔ میرا خیال ہے ہم جیت گئے۔ (سینے پر ہاتھ رکھ کر) مگر میری سانس کیوں گھُٹ رہی ہے!

پراکرتی: (سنبھلتے ہوئے) بس ماں کچھ دیر اور ۔ چھوڑ ندامت ماں ۔ میں تمہاری منت کرتی ہوں ۔ بس تھوڑا اور . . . . . .

ماں: (سانس پر قابو پاتے ہوئے) ہاں ۔ برسات کا موسم آ رہا ہے اور ان کی برت شروع ہونے والی ہے!

پراکرتی: (جلدی سے) اور وہ لوگ ویشالی کے دھرم شالے میں گئے ہیں۔

ماں: (پریشان ہو کر) مگر وہ تو بہت دُور ہے پراکرتی ۔ بہت دُور ۔ تجھے ذرا بھی رحم نہیں لڑکی؟

پراکرتی: صرف سات روز کا سفر تو ہے ماں ۔ اور پھر پندرہ روز تو گزر ہی گئے ناں ۔ دیکھو اس کی تپسیا لرز رہی ہے ۔ وہ آ رہا ہے ماں۔ اور وہ سب کچھ جو مجھ سے لاکھوں میل دور تھا اس کے ساتھ آ رہا ہے!

ماں: پراکرتی، میں نے اپنے جادو کا آخری زور تک لگا دیا ہے۔ اپنی قوت سے تو بجلی کی دیوی اندرا بھی زمین پر آ جائے ۔ مگر وہ پھر بھی ابھی تک نہیں آیا۔ کیسی کشمکش ہے ۔ عجیب بے چینی ہے ۔ تم شاید آئینے کی پوری بات مجھے نہیں بتا رہی ہو، کیوں؟

پراکرتی: میں نے آسمانوں کو دُھند میں لپٹا دیکھا، کبھی کبھی بجلی کی کڑک ان میں شگاف پیدا کر رہی تھی۔ میں نے دیوتاؤں کو دیکھا جو شیطانوں سے لڑ کر نڈھال ہو رہے تھے ۔ پھر میں نے ہر طرف کالے بادل جمع ہوتے دیکھے۔ پھر زبردست بجلی کی کڑک اور اس کے بعد میں نے اپنے جیون داتا جوگی کو دیکھا۔ ایسا لگتا تھا، وہ آگ پر چل رہا ہو ۔ اس کے چاروں طرف سُرخ شعلے لپک رہے تھے۔ یہ دیکھتے ہی مجھ پر سکتہ طاری ہو گیا۔ پھر میں نے فوراً تمہیں جادو روکنے کا کہا مگر اس وقت تم پر بے ہوشی طاری تھی ۔ میں نے واپس آئینے میں دیکھا، اس پر جاں کنی کا عالم تھا۔ پھر میں کچھ نہ دیکھ سکی، بس!

ماں: (زیرِ لب) میں نے تمہیں نہیں مارا ۔ اس کی تکلیف مجھے جلا ڈالے گی۔ یہاں تک کہ مجھ سے یہ سب کچھ برداشت نہ ہو سکے گا، یہ تو نے کیا کیا پراکرتی!

پراکرتی: جو تکلیف میں نے دیکھی وہ ہم دونوں کی تکلیف تھی۔ میرا درد اس کے درد میں ایسے مل گیا ہے جیسے بھٹی میں تانبا اور سونا!

ماں: آخر کار تمہیں پتا چلا، ڈر کسے کہتے ہیں!

پراکرتی: ڈر سے کسی بڑی چیز کا مجھے پتا چلا ہے، مجھے ایسا لگا کہ میں کسی تخلیق کی گواہ ہوں ۔ کوئی شے جو برہما جی سے زیادہ طاقتور ہے ۔ یہ سب کچھ کسی خاص مقصد کے تحت لگتا ہے۔ یہ کیا زندگی ہے، یا موت۔ ایک طرح کی رہائی کا احساس ہوا مجھے اور میں خود کو سنبھال نہ سکی، میرا پورا وجود ایک جوشیلے شعلے کی طرح بھڑکنے لگا!

ماں: اور وہ جوگی؟

پراکرتی: وہ خلا میں گھور رہا تھا۔ وہ اپنی جگہ یوں ثابت قدم تھا جیسے نظامِ شمسی میں سورج!

ماں: کیا ایسا لگتا تھا کہ اسے تمہاری موجودگی کا احساس ہو؟

پراکرتی: یہ تو سوچ کر ہی میں کانپ جاتی ہوں، اس کی آنکھیں غصّے سے شعلہ ہو رہی تھیں۔ ایسا لگتا تھا کہ وہ بد دعا دینے ہی والا ہو۔ مگر وہ اپنے بھڑکتے ہوئے جذبات کو جھٹک کر ایک برچھی کی طرح دوبارہ اپنی روحانیت کے قلعے میں داخل ہوا اور ایک بار پھر پہاڑ کی طرح ثابت قدم ہو گیا!

ماں: اور تُو نے یہ سب برداشت کر لیا؟

پراکریتی: مجھے خود پر بڑی حیرت ہوتی، وہ جس کا کوئی مقام کہیں بھی نہیں ہے ــــ اب میرا اور اس کا درد ایک ہے۔

ماں: یہ ہیبت ناک منظر کتنی دیر چلتا رہے گا؟

پراکریتی: جب تک میرا درد میری الجھن ختم نہیں ہو جاتی ہے۔ وہ کس طرح آزاد ہو سکتا ہے ماں، جب میں اب بھی قید میں ہوں!

ماں: (پریشان ہو کر) تم نے آئینے میں آخری بار کب دیکھا تھا؟

پراکریتی: کل شام ــــ (وقفہ) پتا ہے کچھ روز قبل وہ اندھیرے میں ویشالی کے شیر والے صدر دروازے سے گزر رہا تھا۔ اس کے بعد میں نے اسے دریا پار کرتے، پہاڑوں سے گزرتے، کبھی رات میں تنہا جنگل میں بھٹکتے دیکھا۔ کبھی کبھی وہ ایک خواب میں مبتلا لگتا، جیسے ہر چیز کو بھولتے ہوئے اپنے اندر کی جدوجہد اور غصّے کو بھی ــــ مُردہ لگتا اس کا چہرہ، اس کی آنکھیں خلا کو گھورتیں اور اس کا جسم بوڑھا اور مرجھایا سا لگ رہا تھا!

ماں: وہ اب کہاں ہے؟

پراکریتی: کل شام سورج ڈھلے وہ اپالی ساگر والے پاتال گاؤں میں تھا۔ برسات کی وجہ سے ساگر اُبل رہا تھا۔ اس کے ساحل پر ایک بوڑھا پیپل کا درخت تھا جس پر جگنو جگمگ کر رہے تھے۔ ایک مقام پر پہنچ کر وہ ساکت ہو گیا، یہ وہی جگہ تھی جہاں گوتم بدھ نے راجہ بسپرا بھا اس کو بدھ مت کی تبلیغ کی تھی۔ اس نے اپنا چہرہ وہاں سے پھیر لیا جیسے شرمسار ہو۔ پھر میں لمحہ بھر سے زیادہ کچھ نہ دیکھ سکی۔ میں نے آئینہ پھینک دیا (پراکریتی رُک کر رات کے چوکیدار کی آواز سننے لگتی ہے جو اپنی لاٹھی زمین پر ٹھوکتا گزر رہا تھا) اب چوکیدار بھی آواز دے رہا ہے۔ رات آدھی سے زیادہ گزر چکی ہو گی۔ یہ رات بھی برباد ہو جائے گی ماں ــــ ہو سکتا ہے وہ قریب ہی ہو۔ جلدی کرو اور جادو کا زور بڑھاؤ۔ اسے مجھے کسی طرح ڈھونڈنا ہے!

ماں: اب میں اس قابل نہیں رہی پراکریتی ــــ میری تو قوت جواب دے رہی ہے!

پراکریتی: نہیں، تمہاری قوت جواب نہیں دے سکتی، ماں کوشش جاری رکھو۔ ہمت نہ ہارو ماں ــــ اگر وہ واپس لوٹ گیا تو میں اسے کبھی بھی حاصل نہ کر سکوں گی ــــ میں اب یہ برداشت نہیں کر سکتی۔ میری اچھی ماں اپنے ازلی سحر کا جاپ الاپ کرو اور میرے جوگی کی ثابت قدمی کو ہمیشہ کے لیے ختم کر ڈالو!

ماں: (تھکے ہوئے لہجے میں) کیا تم انجام کے لیے تیار ہو؟

پراکریتی: ہاں ــــ میں ہر آفت کے لیے تیار ہوں!

ماں: (ہمت یکجا کرتے ہوئے) ٹھیک ہے۔ جاؤ اپنا استقبالیہ رقص شروع کرو۔ میں اپنی آخری جاپ الاپ شروع کرتی ہوں ــــ (پراکریتی رقص شروع کرتی ہے) اپنا آئینہ اٹھا پراکریتی۔ اور اس میں دوبارہ دیکھ ــــ مجھے بتا تا جب ایک سایہ قربان گاہ پر اُترتا نظر آئے ــــ تم دیکھ رہی ہو ناں؟

پراکریتی: نہیں میں دیکھوں گی نہیں ــــ میں صرف سنوں گی اور انتظار کروں گی ــــ میں صرف اس وقت دیکھوں گی جب وہ میرے سامنے ہو گا!

ماں : اب مجھ سے کوئی زور نہیں لگ رہا — کوئی میری سانس روک رہا ہے — میں ....

پراکریتی : (بات کاٹ کر) بس چند لمحے اور — اسے میرے سامنے لاؤ — مجھے معلوم ہے وہ آئے گا۔ دیکھو طوفان اور بادل گر رہے ہیں۔ یہ اس کی آمد کا اعلان ہے۔ مجھے زمین لرزتی لگ رہی ہے۔

ماں : (جاں کنی میں) وہ تجھے بددعا دینے آ رہا ہے بدنصیب لڑکی۔ میری جان پر بنی ہے، میری رگیں کھنچ رہی ہیں۔ مجھ سے اب ..

پراکریتی : (خود کو سنبھالتے ہوئے) نہیں — ماں وہ بددعا دینے نہیں، میرا محبوب بجلیوں کی کڑک کے ساتھ موت کو شکست د آ رہا ہے تاکہ مجھ کو ایک نئی زندگی دے سکے۔ اندھیرا ختم ہو رہا ہے۔ میرے قید کی دیواریں ٹوٹ رہی ہیں۔ میری زندگی کا ختم ہو رہا ہے۔ میں خوف سے کانپ رہی ہوں مگر دل خوشی سے جھوم رہا ہے۔ او میرے نجات دہندہ تم آ گئے۔ میں تمہیں لذت کے تخت پر بٹھاؤں گی اور تمہارے تخت کو اپنی حیا، اپنے خوف اور اپنی خوشی سے سجاؤں گی !

ماں : (نڈھال ہو کر) پراکریتی، آئینے میں دیکھ جلدی — میرا وقت ختم ہوا !

پراکریتی : ماں مجھے ڈر لگ رہا ہے۔ اس کا راستہ ختم ہونے پر ہے۔ وہ مجھے کن نظروں سے دیکھے گا۔ کیا میں اس کی طویل ا کا بدل دے سکوں گی ؟

ماں : دیر مت کر پراکریتی۔ آئینے میں دیکھ۔ میں جاننا چاہتی ہوں۔ اب میں ذرا بھی برداشت نہیں کر سکتی !

پراکریتی : (آئینے میں دیکھ کر اسے سکتہ ہو جاتا ہے، آئینہ پھینک دیتی ہے) جادو کا اثر فوراً ختم کر و ماں — توڑ ڈالو اس واپس لو اپنا جادو — میری بھی کیا بدبختی تھی کہ اسے اس حالت میں کر دیا۔ اس کے چہرے کی وہ آسمانی چمک کہ گئی۔ وہ سر جھکائے آ رہا ہے۔ چہرہ پیلا، جسم روح کی شکست کا بوجھ اٹھائے، مرجھایا سا۔ میں نے اسے کیا کر دیا (وہ جادوئی آئے کو ٹھوکر مارتی ہے) میں ملعون ہوں — ایک چنڈالنی — اور کس طرح اپنے محبوب کی بے حرمتی کر سک (آنند داخل ہوتا ہے۔ پراکریتی اس کے قدموں پر گر پڑتی ہے) تم آ گئے میرے آقا — مجھے نجات دلانے۔ میں تمہیں بہت تکلیف دی ہے جس کی میں معافی چاہتی ہوں — معاف کر دو مجھے — میں تمہیں آسمان سے زمین پر گھسی لائی — مگر اس کے علاوہ تم مجھے اوپر بھی کیسے اُٹھاتے۔ اے پاک دامن، تمہارے قدموں کی دھول بھی پاک ہے۔ مقدس ہو !

ماں : (سر اُٹھا کر دوزانو ہوتے ہوئے) تم مقدس اور فاتح ہو — اے میرے آقا تمہارے قدموں پر میرے گنا اور میری زندگی دونوں ختم ہوتے ہیں (لڑکھڑا کر گرتی ہے اور مر جاتی ہے)

آنند : (اشلوک پڑھتے ہوئے) میں اس مہاتما کا احترام کرتا ہوں جو پاک اور رحم کا ساگر ہے، گوتم بدھ — جو مقدس اور اعلیٰ ادراک سے مزین ہے — جو اس دنیا کے تمام گناہ اور تکلیفوں کا خاتمہ کر دینے والا ہے ہم سبھوں کو نیکی کی راہ پر چلنا سکھا دے !! (عقیدت سے سر جھکا لیتا ہے)

— پردہ —

گل ہائے رنگ رنگ
(کشمیری کہانی)

اختر محی الدین / کرن سنگھ

بیل کا ساتھی ایک اور بیل

سویرے منھ اندھیرے ہی ماں نے مجھے جگاتے ہوئے کہا "بیٹا! اٹھو تو ..... بیچارے محمود تیلی کا انتقال ہو گیا ہے۔ صبح کی نیند سب کو پیاری ہوتی ہے۔ مجھے کچھ زیادہ ہی پیاری ہے۔ لہٰذا مجھے یہ بہت بُرا لگا۔ اور پھر ایسا کون سا بڑا آدمی مر گیا جو وہاں جانا نہایت ضروری تھا۔ بستر پر لیٹے لیٹے ہی میں نے ٹال مٹول کی لیکن اماں نے ایک نہ مانی۔ بالآخر مجبوراً مجھے اٹھنا ہی پڑا۔

محمود تیلی ہمارا پڑوسی تھا۔ ہمارا مکان اس کے مکان کے ساتھ ہی تھا۔ اپنے کولھو پر جب وہ "ہٹ ہٹ ورنہ کھال اُدھیڑتا ہوں"، کہتا ہوا بیل کو چھڑی سے ہانکتا تھا تو ہمارے گھر میں اس کی آواز صاف سنائی دیتی تھی۔ محمود تیلی کا کسی سے میل جول نہ تھا۔ صرف قریب کے دو چار پڑوسی ہی اسے جانتے تھے یا پھر ان کے گاہک۔ ان کے ساتھ بھی اس کا اٹھنا بیٹھنا نہ تھا اور نہ ہی دعا سلام۔ تیل لینے کے لیے جب کوئی گاہک اس کے گھر جاتا تو اسے بیل سے باتیں کرتے ہوئے پاتا۔ "لے گھاس کھالے، ..... کھالے ناں ..... آ ذرا تجھے کھجاؤں۔"

سوائے اپنے بیل کے محمود تیلی کسی سے بولتا چالتا نہ تھا۔ زیادہ سے زیادہ اگر کسی کے سامنے زبان کھلی بھی تو صرف اتنا ہی کہا۔ "اس بیل میں تو میری روح ہے۔ جب تک یہ چارہ نہیں کھا لیتا مجھے چین ہی نہیں آتا۔"

آج محمود تیلی مر گیا ..... کوئی بچہ یتیم نہ ہوا، کوئی عورت بیوہ نہ ہوئی کسی ماں کو بیٹے کی جدائی کا غم نہ سہنا پڑا۔ اور نہ ہی کسی عزیز رشتہ دار کو ماتمی کھانا بنانا پڑا۔ چپ چاپ بنا کسی شور شرابے کے محمود مر گیا۔ محلّے اور اریب قریب کے کچھ لوگ جمع ہوئے۔ میّت کو نہلا دھلا کر قبرستان میں دفنا آئے۔ فاتحہ اور نماز کے بعد میں گھر لوٹا۔ کھانا کھا کر اپنے کام پر چلا گیا۔

شام کو جب میں گھر لوٹا تو باہر والی گلی میں محمود تیلی کی کوٹھری کی طرف میری نظر پڑی، وہاں ایک دیا جل رہا تھا اور کچھ لوگ آپس میں کھسر پھسر کر رہے تھے۔ گھر پہنچنے پر ماں نے بتایا کہ محمود کے گھر آج پنچایت بیٹھی ہے۔

"کیسی پنچایت؟" میں نے پوچھا۔

"محمود تیلی کے رشتہ دار اس کی ملکیت میں سے اپنا اپنا حصہ لینے آئے ہیں۔"

"رشتہ دار؟" میں حیرت میں پڑ گیا، میں نے آج تک کبھی یہ نہیں سنا تھا کہ محمود تیلی کا کوئی رشتہ دار دنیا میں اس کا کوئی رشتہ دار ہو سکتا ہے، مجھے اس بات پر یقین نہیں آ رہا تھا۔ جب میں نے ہوش سنبھالا مح کے یہاں کبھی کسی مہمان کو آتے جاتے نہیں دیکھا اور نہ کبھی کسی کو یہ کہتے ہوئے سنا کہ محمود تیلی اپنے کسی رشتہ دار گیا ہوا ہے۔ میرے خیال میں اس کا ایک ہی رشتہ دار تھا اور وہ تھا "بدری" بیل۔

یہ دیکھنے کے لیے کہ بھلا محمود تیلی کے یہاں کون سے رشتہ دار آئے ہیں میں محمود کے گھر گیا۔ محمود تیلی کے یہاں کوٹھیں، ایک کوٹھری میں بیل کا تھان تھا۔ دوسری کوٹھی اس سے ملحقہ کچھ اوپر تھی۔ تھان والی کوٹھری میں محمود تیلی کا کولھو اور بیل تھا اٹھنا بیٹھنا اور گاہکوں سے لین دین اس اونچی والی کوٹھری ہی میں ہوتا تھا۔ اس کوٹھری میں پہنچنے کے لیے تھان والی کوٹھ ایک پائدان لگا ہوا تھا۔ میں نے جیسے ہی تھان والی کوٹھری میں قدم رکھا تو دیکھا کہ بدری بیل اندھیرے میں بیٹھا جگا ہے اور رہ رہ کر ٹھنڈی سانس لے رہا ہے۔ مجھے یوں محسوس ہوا جیسے بدری سمجھ گیا ہے کہ محمود مر گیا ہے اسی لیے وہ ٹھ بھر رہا ہے۔ یقیناً اس کی آنکھوں سے آنسو بھی بہہ رہے تھے لیکن اندھیرے میں کچھ واضح طور پر دکھائی نہ دیا۔ اچانک خیال آیا کہ آج بدری یتیم ہو گیا ہے۔ آج یہ بھی سوگ منا رہا ہے۔ اب اس سے کوئی باتیں نہ کرے گا۔ کوئی اس کہے گا "بدری، لے گھاس کھا لے..... کھا لے ناں..... آ تجھے ذرا کھجاؤں!"

بدری نے ایک اور لمبا سانس لیا اور اپنے سر کو زور سے جھٹکا دیا جس سے اس کے دونوں کان بج اٹھے اپنا سر پیٹ رہا ہو۔ مجھے اس پر رحم آنے لگا۔ دل میں آیا اس سے پوچھوں۔ "بدری! تو نے کچھ چارا وارا کھایا لیکن نہ جانے کیوں مجھے شرم سی محسوس ہوئی اور میں چپ ہی رہا شاید اس ڈر سے کہ کوئی سن لے گا۔ پھر لوگ مذ اڑائیں گے۔ سبھی مجھے محمود تیلی، محمود تیلی کہہ کر پکاریں گے۔ اس نام سے مجھے سخت نفرت تھی اور خود محمود تیلی سے بھ خود پسند، دنیا میں نہ کسی سے لینا نہ دینا، مثل جیسے لنگور کا، نہ کسی نے اپنی لڑکی اس سے بیاہی اور نہ ہی اس شادی کا ارادہ کیا۔ ساری دنیا سے الگ تھلگ بیل کا ساتھی ایک اور بیل!

مجھے یہ اس وقت اور بھی برا لگتا جب وہ کولھو سے جتتے ہوئے بیل کو چھڑی سے ہانکتا۔ "ہٹ ہٹ نہیں کھال ادھیڑ دوں گا۔" آنکھوں پر پٹی بندھا ہوا بیل تیز تیز چلنے لگتا۔ میں اکثر یہ سوچتا، بھلا یہ بھی کوئی زندگی ہے پر پٹی باندھے چھڑی کے اشارے پر چلتے رہو۔ محمود تیلی کی زندگی مجھے اسی لیے پسند نہ تھی کہ وہ بھی کولھو کے گرد اگرد پیچھے پیچھے چلتا رہتا تھا۔ بلاوجہ، بے مقصد۔ لیکن اس وقت مجھے بدری پر بہت ترس آ رہا تھا۔ دو چار مرتبہ میری زبان پر بھی آئے کہ "بدری تو نے چارا وارا بھی کھایا ہے؟" لیکن میں نے کہا نہیں۔

اوپر والی کوٹھری میں پہنچ کر میں نے محلے کے دو چار آدمیوں کو بیٹھے دیکھا۔ اور دو تین ایسے افراد کو بھی جن نہ تھا۔ میں سمجھ گیا کہ ہو نہ ہو یہی محمود تیلی کے رشتے دار ہیں۔

ان میں سے ایک شخص مجھ سے مخاطب ہو کر بولا "آئیے حضرت، ادھر تشریف لائیے"۔ دوسرا کہنے لگا"

صاحب، اب ضرور کوئی فیصلہ ہو جائے گا۔ اب تو ایک پڑھے لکھے صاحب ہمارے درمیان موجود ہیں۔"
دل ہی دل میں مجھے کچھ فخر محسوس ہونے لگا۔ مگر میں نے یہ ظاہر ہونے نہیں دیا۔ میں نے ان میں سے ایک سے پوچھا۔
"کیوں صاحب کیا معاملہ ہے؟"
"جی یہ محمود تیلی کے رشتے دار ہیں۔ یہ جو صافہ باندھے ہوئے ہیں، ان کے پھوپھا زاد بھائی کے سالے ہیں۔ اور یہ حضرت اس کے باپ کے ماموں زاد بھائی کے داماد ہیں اور یہ ہیں۔۔۔۔"
بتانے والا چپ ہو گیا کیونکہ اسے بھی یہ علم نہ تھا کہ یہ تیسرا شخص محمود تیلی کا کیا لگتا ہے۔ لہٰذا تیسرے حضرت خود ہی اپنا تعارف کرانے لگے۔ "جی میں ان کا قریبی عزیز ہوں۔ ہمارے آبا و اجداد ایک تھے۔ یوں سمجھیے کہ محمود کے دادا کے ایک بھائی تھے جو بے چارے بے اولاد ہی مر گئے۔ انھوں نے" یہ فلا" کے کسی رحمان ٹھار کو گود لیا تھا انھیں صاحبزادے کا میں فرزند ہوں۔"
تینوں کے تعارف کے بعد میں دل ہی دل میں سوچنے لگا کہ یہ لوگ بس یونہی برائے نام رشتہ دار ہیں۔ میں نے ان سے پوچھا۔ "صاحبان! آج تک میں نے آپ لوگوں کو کبھی یہاں دیکھا نہیں۔" جن دو افراد کی طرف میری نظر نہیں تھی وہ دونوں تو چپ رہے، مگر جس شخص کی طرف میں دیکھ رہا تھا اس نے صفائی پیش کی۔
"ارے صاحب کیا بتائیں۔۔۔۔ اپنی ہی جھنجھٹوں سے فرصت نہیں ملتی ورنہ کیا ہم یہاں آتے جاتے نہیں۔ بخدا میری گھر والی کو محمود بھائی کا اتنا خیال رہتا تھا۔۔۔۔ اتنا خیال رہتا تھا کہ روز مجھ سے کہا کرتی، جاؤ ان کا حال احوال تو پوچھ آؤ۔ مگر صاحب اتنی فرصت ہی کہاں۔۔۔۔؟
"تو حضرت آج کیسے فرصت مل گئی آپ کو؟"
"ماشاء اللہ! صاحب تین بجے کے قریب میں نے سنا کہ وہ جنتی چل بسا۔ سنتے ہی کیا بتاؤں کلیجے پر چھری چل گئی گھر والوں کو بھی خبر نہ کی۔ میں نے سوچا یہ افسوس ناک خبر سن کر ان کا بھی برا حال ہو جائے گا، میں خود ہی بھاگا بھاگا یہاں پہنچا ہوں۔ ہمارے ساتھ مرحوم کی خاص الفت تھی ناں۔۔۔۔"
"مرحوم کی آپ کے ساتھ خاص الفت ضرور رہی ہو گی۔ مگر حضرت آپ کو بھی اس سے الفت تھی؟"
اس کا اس نے کوئی جواب نہ دیا۔ اِدھر پنچ کچھ پریشان نظر آرہے تھے۔ شاید یہ سوچنے لگے کہ یہ اور کون سی مصیبت آگئی۔ ہم نے تو اب تک کب کا معاملہ نمٹا لیا ہوتا اور اپنے اپنے گھر روانہ ہو چکے ہوتے۔
اتنے میں سے ایک صاحب فرمانے لگے۔ "حضرت آپ تو ہمیں صرف یہ بتائیں کہ شریعت کے مطابق جائیداد کی وراثت میں کس کس کا کتنا حصّہ نکلتا ہے۔"
"شریعت کے بارے میں تو میں بالکل لاعلم ہوں۔ ویسے بھی یہ معاملے بڑے نازک ہوا کرتے ہیں۔ یہ تو عالم فاضل یا مفتی ہی بتا سکتا ہے۔۔۔۔ ہاں قانون معلوم ہے۔"
"تو پھر قانون کے مطابق ہی بتاؤ۔"
"قانون کے مطابق ان میں سے کسی کو بھی کچھ نہیں مل سکتا۔ کیونکہ آج تک محمود تیلی کے ساتھ ان کا کوئی تعلق

نہیں رہا۔ آج تک میں نے ان میں سے کسی کو بھی محمود تیلی کے پاس آتے جاتے نہیں دیکھا۔ آج یہ سب اس کی جائیداد ہتھیانے کے لیے اپنی رشتہ داری ظاہر کر رہے ہیں۔"

میری بات پر سبھی ہنس پڑے۔ محمود کے رشتہ داروں نے سمجھا، میں مذاق کر رہا ہوں۔ اور میرے پڑوسی پنچوں نے سمجھا، میں خود اس کی کوٹھی ہضم کرنا چاہتا ہوں۔ محمود کے رشتے داروں کی ہنسی کا مقصد تھا اور شاید وہ یہ کہنا بھی چاہ رہے تھے کہ صاحب اب اس کے حصے کر بھی دو تاکہ سب لوگ اپنے اپنے گھر جا کر آرام کریں۔۔۔۔ اور پڑوسیوں کے ہنسنے کا مقصد تھا کہ بچو! تم نے اگر ایک انچ بھی جگہ لی تو تمہیں ہضم کرنے نہیں دیں گے۔

بہر حال کافی بک جھک کے بعد میں نے اپنا فیصلہ سُنا دیا، لیکن محمود تیلی کے پھوپھا زاد بھائی کے سالے کو یہ فیصلہ منظور نہ تھا۔ اس کے خیال میں اس سے ناانصافی ہوئی تھی۔ تینوں میں سے ہر کوئی یہی چاہ رہا تھا کہ بیل اسے ملے۔ آدھی رات تک بحث چلتی رہی لیکن کوئی فیصلہ نہ ہو سکا۔ لہٰذا مزید غور و خوض کے لیے معاملہ دوسرے دن تک کے لیے ملتوی کر دیا گیا۔

وہاں سے اٹھ کر لکڑی کے پائیدان سے اُتر کر میں بیل کے تھان والی جگہ پر آیا۔ بدری نے پھر اپنا سر جھٹکا جس سے اس کے کان بجے، گویا وہ اپنا سر پیٹ رہا ہو۔ اسی لمحے وہ زور سے چلّایا جیسے وہ محمود تیلی کو رو رہا ہو۔ اور یقیناً ایسا ہی تھا میں اس سے کہنا چاہ رہا تھا۔ " بدری تو نے کچھ چارا وارا کھایا؟ محمود تجھے اکیلا ہی چھوڑ گیا ناں؟"، مگر میں نے کچھ کہا نہیں۔

رات کو میں گہری نیند سو رہا تھا۔ صبح ماں نے پھر جلدی جگا دیا۔ " ارے اٹھو بیٹا! وہ تمہیں کب سے بلا رہے ہیں۔ ان کا معاملہ نمٹا دو"۔ میں اٹھ کر محمود تیلی کے گھر گیا۔ دیکھا کہ میونسپل کمیٹی کے کچھ ملازم بیل کو ڈنڈوں پر اُٹھا رہے ہیں۔ بدری مر گیا تھا۔ اس کے ارد گرد محمود کے رشتے دار اور محلّے کے پنچ کھڑے تھے۔

"ہائے افسوس" میرے منہ سے نکل گیا۔ " اسے یہ کیا ہو گیا۔"

"جناب اسے نہ تو کھانے کو کچھ ملا اور نہ ہی پینے کو" ایک چمار بولا۔

" ارے پرسوں سے اسے کسی نے دانا پانی کچھ بھی نہیں دیا گیا؟" یہ کہہ کر میں محمود کے رشتے داروں کی طرف دیکھا وہ سب خاموش تھے۔ کچھ دیر بعد ایک پنچ نے کہا۔ " ارے صاحب! اس کو چارا ڈالتا کون؟ کسے پتا تھا کہ یہ بیل کس کے حصے میں آئے گا۔ دوسرا اسے دانا پانی کیوں دیتا؟"

میں چُپ ہو گیا۔ کہنے کے لیے رہ ہی کیا گیا تھا۔

گل ہائے رنگ رنگ

جرمن نظمیں

اُرسُلا کرے خل / منیرالدین احمد

کوہِ آلپس کی سیر

سوئٹزرلینڈ میں ایک سیر کے بعد

جہاں ہوا اتنی لطیف ہے کہ کاٹی نہیں جا سکتی
اور کسان اتنے غریب کہ زندہ نہیں رہ سکتے
اور اتنے چالاک کہ مر نہیں سکتے۔
جہاں پر بھیڑیں زیادہ خوبصورت لگتی ہیں
گنتی کے بچوں کے مقابلے میں
میں نے جان لیا ہے کہ
چھوٹی ندیاں بھی
گلیشیر کے نیچے رستہ بنا لیتی ہیں
دنیا کے کونے کونے میں
رنگین ٹی وی سیٹ پائے جاتے ہیں اور فٹ بال
نیچے وادی میں دھند بنگلوں کو اکثر چھپائے رکھتی ہے
اب تک پہاڑوں میں رہنے والے
صرف پہاڑوں سے ٹکر لیتے ہیں

فقدان

پرانی کتابوں میں
پیار کرنے والے
اکثر دیوانے ہو جاتے ہیں
ان کے بال سفید
ان کے سر خالی
ان کی جلد ڈھل جاتی ہے
محبت کے سبب میں پڑھتی ہوں

مگر کبھی کوئی شخص
جھلا نہیں ہوا
محبت کے فقدان کے سبب
جس کا اُسے سامنا کرنا پڑا
یہ بھی لکھا ہے
پرانی کتابوں میں

اس طرح ایک چیز کی کمی
کا بھی کوئی فائدہ نکلا

گل ہائے رنگ رنگ

جرمن نظمیں

اُرسُلا کرےخل / منیر الدین احمد

اب بھی

میں اب بھی کانپ جاتی ہوں
جب کوئی اپنا ہاتھ
میرے کندھے پر دھرتا ہے
میں اب بھی سوچتی ہوں کہ
ابھی وہ میرا گلا گھونٹ ڈالے گا
دو سہیلیوں کا اچانک
پچھلے پہر آنا
بلا مطلب نہیں ہو سکتا
کون سے اُلاہنے وہ مجھے
اب کے دیں گی؟
سڑک پر بہت سے مَرد
یوں لگتے ہیں، جیسے
میرے فلیٹ کا مالک
یا سویلین کپڑوں میں پولیس
اس لیے کچھ ایسا غلط نہیں ہے کہ
میں کانپ جاتی ہوں، تاہم قابلِ افسوس

اُمیدیں

شور بے والا سفید ڈونگا
جو کارنس پر دھرا ہے
جس کے ڈھکنے میں دراڑ پڑ چکی ہے
ماں کے گڑیوں والے سیٹ میں سے بچا ہے
احتیاط
ہم اس میں اپنی اُمیدیں سنبھال کر رکھتے ہیں

آفاق صدیقی

امر جلیل کی کہانیاں

"میری کہانیوں کی ابتدا دت اور محبت سے ہوئی تھی اس لیے میری کہانیوں کے موضوع میں ظاہری طرح یا باطنی طرح، سیدھی طرح
ٹی طرح موت اور محبت کا ذکر آتا ہے۔ عام رواجی محبت جیسی عام رواجی موت بھی مجھے متاثر نہیں کرتی ہے۔ میں غیر معمولی اور
نوع محبتوں کا شاہد ہوں۔ میں دفعتاً تشدد کرنے والی موت سے متاثر ہوتا ہوں۔ کسی مقصد کے لیے مرنا بے معنی زندگی کو وسیع
نی دیتا ہے۔ میری کہانیاں فقط ان کو پسند آتی ہیں جن کو موت اور محبت میں پر اسرار مفہوم نظر آتا ہے۔"

یہ اقتباس مشہور و معروف اور صاحب طرز سندھی افسانہ نگار امر جلیل کی کہانیوں کے ایک نئے مجموعے سے پیش کیا
جو "منھنجو ذس آسمان کا پیچو" کے نام سے دسمبر ۱۹۸۳ء میں منظر عام پر آیا تھا۔ اس وقت تک ان کی کہانیوں کے کئی مجموعے
لاً "دل جی دنیا، جڑھن مان نہ هوندس اور تاریخ جو کفن" شائع ہو چکے تھے۔

ان افسانوی مجموعوں میں موضوعات کا جو تنوع اور اسلوب بیاں کی اثر آفریں کیفیات پائی جاتی ہیں وہ جدید سندھی
سانہ نگاری کے ارتقا میں بڑی پرکشش اور مثالی حیثیت رکھتی ہیں۔

امر جلیل ۱۹۳۶ء میں پیدا ہوئے۔ حصولِ تعلیم کے سلسلے میں خاصا وقت کراچی میں گزارا۔ مطالعہ ادب اور لکھنے
ھنے کے ساتھ ساتھ کھیلوں سے بھی بڑی دلچسپی رہی۔ اسکول، کالج اور کراچی یونیورسٹی میں کرکٹ کے کیپٹن رہے۔
معاشیات میں ایم۔ اے کی ڈگری لی۔ کہانیاں لکھنے کا ذوق و شوق زمانۂ طالب علمی سے اب تک تازہ دم ہے۔ اس سلسلے میں کئی
امی مقابلوں کے اوّل انعامات اور اعلیٰ ایوارڈز حاصل کر چکے ہیں۔ آج کل علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی اسلام آباد سے وابستہ ہیں۔

سندھی کے علاوہ اردو انگریزی میں بھی لکھتے ہیں مگر سندھی میں بہت ہی خوبصورتی سے انھوں نے جو اعلیٰ درجے کی کہانیاں
ھی ہیں وہ جدید سندھی ادب میں مقبولیت کے لحاظ سے نقطۂ عروج پر پہنچی ہوئی ہیں اور ان میں سے کئی کہانیوں کے تراجم دوسری
بانوں میں بھی ہو چکے ہیں۔

پچھلے ۲۵ سال میں سندھی کے افسانوی ادب نے یونیورسٹیوں اور کالجوں کے طالب علموں کو بہت متاثر کیا ہے۔
ں اثر آفرینی میں امر جلیل کی کہانیوں کا حصہ نسبتاً یوں بھی زیادہ ہے کہ ان سے نئے لکھنے والوں کو ایسی کہانیاں لکھنے کی ترغیب

علمی جو طرزِ احساس، طرزِ فکر اور طرزِ اظہار کے لحاظ سے سندھ کے مظلوم، پسماندہ اور مفلوک الحال طبقات کی ذہنی بیداری بعض صورتوں میں جاگیردارانہ روایات سے عملی بغاوت کے نقیب ہیں۔

جدید افسانہ نگاروں میں امر جلیل کی کہانیوں کا گہرا اثر قبول کرنے والوں میں ایک نمایاں نام زیب سندھی کا ہے۔ اعتراف کرتے ہیں کہ "اسٹوڈنٹ لائف میں جب شروع شروع میں ادب پڑھنا چاہا تو اس وقت سب سے پہلے میں نے امر جلیل کی کتابیں پڑھی تھیں۔"

زیب سندھی نے اپنے زمانۂ طالب علمی کے حوالے سے جن کتابوں کا ذکر کیا ہے وہ امر جلیل کی افسانہ نگاری کے ابتدائی دور سے تعلق رکھتی ہیں۔ غالباً انھیں کتابوں کی کہانیاں پڑھ کر ڈاکٹر میمن عبدالمجید سندھی نے "سندھی ادب کی مختصر تاریخ" میں یہ لکھا ہے کہ "موجودہ نوجوان افسانہ نگاروں میں امر جلیل کے افسانے بہت مقبول ہیں۔ ان کے افسانوں کے دو مجموعے "دل جی دنیا" اور "جڈھن مان نہ هوندس" (جب ہم نہ ہوں گے) شائع ہوئے ہیں۔ وہ عموماً سندھ کے پیر اور زمیندار کو نوکِ قلم کا نشانہ بناتے ہیں، ان کے کردار کو منظرِ عام پر لاتے ہیں اور یہ تاثر دیتے ہیں کہ یہ رہزنوں اور ڈاکوؤں سے بھی زیادہ خطرناک ہیں۔"

یہ تبصرہ اس حد تک تو درست ہے کہ سندھ کی جاگیردارانہ دیہی معاشرت کے جبر و استبداد پر بھی امر جلیل نے چونکا دینے والی کہانیاں لکھی ہیں مگر ان کے فنی ارتقا کا سفر نئے اور پرانے خوابوں کی تعبیر تلاش کرنے کا سفر ہے۔ انھوں نے اُس پُر آشوب دور میں اپنے سفر کا آغاز کیا جب پاکستان کی سیاسی زندگی افراتفری اور ہوسِ اقتدار کے خلفشار میں مبتلا تھی جس کے نتیجے میں ۱۹۵۸ء کا مارشل لا رونما ہوا۔ سندھ کی صوبائی خود مختاری کے طرفدار اور خصوصاً طلبہ پہلے ہی 'ون یونٹ' کے خلاف تھے۔ مارشل لا کی سخت گیری اور جبریت نے ان کی ناراضگی اور برافروختگی میں کچھ اس لیے بھی اضافہ کیا کہ سندھی زبان و ادب پر حکومت نے کچھ ایسی پابندیاں عائد کر دی تھیں جنھیں بنیادی حق تلفیوں پر محمول کیا گیا۔ یہی دور تھا جب 'جیئے سندھ' کی تحریک نے زور پکڑا اور سندھی قومیت کا نعرہ بلند ہوا جس نے سندھی زبان و ادب، تہذیب و ثقافت کے انقلابی رجحانات کو ہوا دی۔

یہی زمانہ تھا جب امر جلیل کی کہانیاں شہرت و مقبولیت کے میدان میں اپنے جھنڈے گاڑنے لگیں۔ ۱۹۸۳ء کی ایک تحریر میں وہ بتاتے ہیں کہ:

> "میں پچھلے بائیس برسوں سے لگاتار لکھ رہا ہوں۔ میں نے شدت سے محسوس کیا ہے کہ ہمارا معاشرہ بڑی بیدردی سے ایک محور پر گھوم رہا ہے۔ سچ بولنے والوں نے اپنے لب سی لیے ہیں۔ منافقت کو ڈپلومیسی کا نیا نام مل گیا ہے۔ سولی کا سنگسار بننے والے وہی ہیں فقط جلاد بدل گئے ہیں۔ راہ اور راہی وہی ہیں فقط رہزن بدل گئے ہیں۔ خواب وہی ہیں تعبیریں تبدیل ہوئی ہیں۔ اپنی شناخت کے لیے آدمیوں نے چہروں پر اپنی اپنی پسند کے نقاب چڑھا لیے ہیں۔ اصل چہرے چھپ گئے ہیں نقلی چہرے تشخص کی علامت بن گئے ہیں۔ دن میں

چراغ لے کر گھومنے والوں کی تعداد اس لیے بڑھ گئی ہے کہ سورج پر ہمارا یقین اٹھ چکا ہے۔
نفسا نفسی کا دیو گھر گھر کی رکھوالی پر مامور ہے۔"

اسی تحریر میں اپنی افسانہ نگاری کی نوعیت پر روشنی ڈالتے ہوئے لکھتے ہیں:

"بائیس سال پہلے جس بچے نے جنم لیا تھا سو آج کڑیل جوان ہو گیا ہے۔ میں نے اپنی کہانیوں میں اس کے بائیس برسوں کو قلم بند کیا ہے۔ وہ میری پہچان ہے اور میں اس کی پہچان۔ میں نے اس بات کی کبھی بھی تردید نہیں کی ہے کہ میں فقط بچوں اور نوجوانوں کا قلم کار ہوں۔ عالمی ادب میں بچے آیندہ کی علامت اور نوجوان عمل کی علامت سمجھا جاتا ہے۔"

بچوں اور نوجوانوں کا ذکر آیا ہے تو امر جلیل کے پرستار اور ان کی کئی کتابوں کے ناشر زیب سندھی اور سگھند کتاب گھر کے حوالے سے یہ دلچسپ واقعہ بھی سناتا چلوں کہ بوسیدہ اور دریدہ سے لباس میں اپنے کاندھے پر بھاری پشتارہ لادے ان ہاری ننگے پاؤں سگھند کتاب گھر کے شوکیس میں سجی ہوئی کتابوں کی طرف راغب ہوا اور جھک جھک کر کتابوں کو دیکھنے اس نے ایک کتاب کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بڑے عاجزانہ اور منت بھرے لہجے میں دکھانے کو کہا۔ گمان غالب یہ تھا کہ وہ ہیں جانتا ہو گا مگر اس کی دلجوئی کے لیے وہ کتاب دکھائی گئی۔ اس نے ایک نظر اسے دیکھا اور رکھ دیا۔ پھر اس کو دو تین ور دکھائی گئیں۔ اور آخر میں امر جلیل کی ایک کتاب "رج" بھی اس کے سامنے لائی گئی جسے بڑے چاؤ سے تین روپیہ دے کر خرید لیا اور چلا گیا۔ پھر وہ نوجوان اکثر اُدھر سے گزرتے ہوئے امر جلیل کی نئی کتابوں کے بارے میں دریافت کرتا رہا۔ اور کی جو نئی کتاب بھی اسے ملی، بصد شوق خرید کر لے گیا۔

ہر تخلیقی ذہن رکھنے والے اچھے اور سچے ادیب کا قلم تازہ دم ہونے کے باوجود کبھی کبھی رک بھی جاتا ہے۔ ایسے مختصر وقفے کی افسانہ نگاری میں بھی آتے رہے ہیں جو ان کے دوستوں، مداحوں اور خصوصاً ان کی کہانیوں کو باقاعدگی سے پڑھنے والوں کو بہت کھلتے ہیں اور وہ سوال اُٹھاتے ہیں:

"لکھنا چھوڑ دیا ہے کیا؟" اس سوال کا جواب امر جلیل کے الفاظ میں یہ ہوتا ہے:

"میں بے مقصد اور بے معنی زندگی کو مفہوم دینے کے لیے لکھتا ہوں۔ اس کے سوا میرے لیے زندگی گزارنے کا کوئی دوسرا مناسب سبب نہیں ہے۔"

جیسا کہ اس مضمون کے شروع میں دیے گئے اقتباس سے واضح ہوتا ہے۔ موت اور محبت ان کے نزدیک دو ایسے محرکات ہیں جو انھیں نئی نئی کہانیاں لکھنے پر اکساتے ہیں۔ ماضی سے قطع نظر ان کی حالیہ تحریروں میں بھی موت کا تصور بڑا معنی خیز ہے۔ تے ہیں:

"زندگی کا دوسرا نام موت کا مسلسل انتظار ہے۔ کسی قدر بوڑھا ہو چکا ہوں لیکن میں زندگی کے لیے کوئی مقصد اور کوئی بھی معنی تلاش نہیں کر سکا ہوں۔ جس دن زندگی کے لیے کوئی معنی اور کوئی مقصد تلاش کر لوں گا اسی دن لکھنا چھوڑ دوں گا۔"

مجنوں اور چاہنتوں کی تہہ داریاں امر جلیل کی کہانیوں اور بالخصوص پچھلے دس بارہ سال کی کہانیوں میں قدرِ مشترک کی حیثیت رکھتی ہیں۔ اس سلسلے میں ان کا نقطۂ نظر یہ ہے کہ "میری کہانیوں میں فقط انھیں چاہتوں کا ذکر ہے جن کے نصیب میں وصل کا لفظ لکھا ہوا نہیں ہے۔ میں بنیادی طور پر، ذہنی طور پر اور جذباتی طور پر غیر معمولی مجنوں کا امین ہوں۔ کل جگ: عشق کا اوتار سچل سرمست میرا مرشد ہے۔"

سچل سائیں کا ذکر خیر آیا ہے تو اپنی آنکھوں دیکھا ایک واقعہ بیان کرتا چلوں۔ دو ڈھائی سال پہلے کی بات ہے میں سچل نیشنل سمینار کا انعقاد ہوا۔ اسلام آباد سے امر جلیل نے بھی شرکت کی۔ دو روزہ مقالاتی نشستوں کے بعد کا پروگرام مندوبین اور منتظمین کے ایک وفد کو دراز شریف جا کر حضرت سچل سرمست کے مزار پر حاضری دینی تھی۔ سندھ کے گورنر، چند وزرا اور اعلیٰ احکام بھی اس کاروانِ عقیدت میں شامل تھے۔ صبح کا سہانا وقت تھا۔ جب ہم لوگ کاروں کے جلوس میں پہنچے تو بڑے مسحور کن انداز سے درگاہ کے فقیروں کی ایک ٹولی نے وجد آفریں دھن میں عارفانہ کلام سُنا کر ہمارا خیر مقدم کیا پھولوں کی چادر چڑھائی۔ مزارات کی زیارت کرنے اور فاتحہ خوانی کی رسومات ادا کی گئیں۔ اس کے بعد درگاہ کے نزدیک خوبصورت شامیانے میں سچل سائیں کی کافیاں سننے کے لیے سب لوگ جمع ہوئے مگر امر جلیل بہت دیر سے غائب تھے۔ کار کی واپسی ہونے لگی تو میں نے درگاہ کے اندر جا کر ادھر اُدھر تلاش کیا۔ موصوف اپنی داڑھی اور چہرے کو عینک سمیت گھٹنوں کی اوٹ میں چھپائے عالمِ استغراق کی کیفیت طاری کیے ہوئے خدا جانے کس گیان دھیان میں بیٹھے تھے۔

چاہتوں اور محبتوں کے لیے حسن و جمال کی دید و شنید بھی ضروری ہوتی ہے۔ انسانی صورتوں کے علاوہ امر جلیل کو حسن سے بھی بڑا پیار ہے۔ مثلاً چاند اور چاندنی سے ان کے تعلقِ خاطر کا راز کچھ یوں ہے:

"چاند بہت ویران اور بے رونق ہے۔ یہ علم دنیا کے ہر آرمس اسٹرانگ کے لیے سانحہ ہے۔ مگر میرے لیے نہیں۔ چاند میرے لیے حسین ہے، خوبصورت ہے، من موہنا ہے کیونکہ میں نے کیپ کینیڈی کے راکٹ میں سوار ہو کر چاند کے لازوال حُسن پر دھاوا نہیں بولا ہے۔ میں نے چاند کو جدائی کے آسمانوں پر اپنے آپ سے اور اپنی پہنچ سے دُور چمکتے دیکھا ہے اس لیے چاند مجھے ہمیشہ اچھا لگتا ہے۔ یہ بات الگ ہے کہ چودھویں کی رات میں بہت اداس اور بیگانہ ہو جاتا ہوں اور سارا آسمان مجھے ریگستان کی طرح پُراسرار نظر آتا ہے۔"

امر جلیل جدت پسند ہونے ہوئے بھی ان روایات کو عزیز رکھتے ہیں جو حق و صداقت، خلوص و محبت اور حُسن و جمال سے تعلق رکھتی ہیں۔ وہ پوری تاریخ کو انسانی ذات کے تماشے کی دستاویز تصور کرتے ہیں۔ ہر نئی سوچ ان کے نزدیک کسی سوچ کی محتاج ہے اور تمام ایجادات مسلسل تجسس کا نتیجہ ہیں۔ لیکن وہ یہ بھی کہتے ہیں کہ موت کی اٹل موجودگی میں انسان مضحکہ خیز ہے۔ اپنی مضحکہ خیزی کو انسان نے مختلف روپ اور نام دے رکھے ہیں۔"

امر جلیل کی کہانیوں میں اس مضحکہ خیزی کے روپ اور بہروپ مختلف ناموں سے زندگی کا تماشا دیکھنے اور دکھانے ہیں۔ وہ خود بھی یہ تماشا دیکھتے دیکھتے معاشیات، تصوف، فلسفہ، تاریخ اور ادبیات کی وادیوں میں بھٹکتے ہوئے چشمِ ظاہر

ساتھ ساتھ مشاہدۂ باطن کی اس منزل پر پہنچ گئے ہیں جہاں دلِ بینا کی آنکھیں وہ کچھ دیکھ لیتی ہیں جو ماضی کے ماضی اور مستقبل کے مستقبل کی خبر لاتی ہے۔

"میں ہر مہینے ایک دو مرتبہ ٹیکسلا ضرور جاتا ہوں۔ ٹیکسلا میں بودھ مت کے دور کے قدیم آثار ملتے ہیں۔ پہاڑی کی چوٹی پہ بودھ مت کی عبادت گاہ، جولیان سب سے قدیم یونیورسٹی ہے۔ اس کے کھنڈروں میں گھومتے پھرتے ہوئے اپنے آپ کو اجنبی محسوس کرتا ہوں۔ مجھے لگتا ہے کہ میں یہاں آتا رہا ہوں اور اس کے کونوں کھدروں سے واقف ہوں۔ محبت اور موت کے بارے میں میرے احساس کی پرورش جولیان یونیورسٹی میں ہوئی ہے۔ اس جنم میں نہیں بلکہ گزرے جنم میں۔ میرا ہر جنم مسلسل سفر کی کڑی ہے۔ میں نے عالمِ ارواح میں ایک صورت دیکھی تھی اور اس کی آواز سنی تھی۔ مجھے اس صورت اور اس آواز کی تلاش ہے۔ ایک ادھورے سپنے کی تکمیل کے لیے بار بار مرنے اور جینے کے فلسفے کو میں پوری طرح رد نہیں کر سکا ہوں۔"

بار بار مرنے اور جینے کا فلسفہ امر جلیل کی کہانیوں میں چاہتوں اور محبتوں کے خمیر سے پیدا ہوا ہے۔ اس سلسلے میں ان کی کئی کہانیوں کا حوالہ دیا جاسکتا ہے مثلاً "برف میں تجھ سے ملوں گا" اور "عاشق شہید لوٹ آتے ہیں"

"تیون وجود" (تیسرا وجود) ان کی نئی کہانیوں کی کتاب (جو زیرِ اشاعت ہے) اپنے نام ہی سے یہ ظاہر کرتی ہے کہ اس میں کیا کچھ ہوگا۔

امر جلیل نے ایک جگہ یہ بھی لکھا ہے کہ "میری کہانیوں میں اقتصادی اور معاشی اصول نہیں دیے جاتے۔ مگر معاشرتی ناہمواریوں، طبقاتی کشمکش، معاشی لوٹ کھسوٹ، نمائشی عقائد کی منافقت و ریاکاری اور سیاسی تضادات و فسادات کی ظاہری و باطنی شکست و ریخت پر ان کی کہانیوں کے پلاٹ اور متعلقہ کرداروں کے فکر انگیز مکالمے یہ ظاہر کرتے ہیں کہ بقول اُن کے اس گھٹن اور کڑھن میں رہنے والا بالک جو وحشیوں، خونخواروں اور رہزنوں کے خوف سے سانس روک کر کہیں چھپ جاتا ہے۔ وہ انگلیوں کو خونِ دل میں ڈبو کر اپنے دور کے ہر ظلم و ستم اور جبر و استبداد کو تبصرہ پر لکھ چھوڑتا ہے۔ پھر جب حال، حال نہیں رہتا اور سب کچھ ماضی میں بدل جاتا ہے اس وقت وہ چھپ کر پناہ لینے والا بالک تاریخ کے صفحات پر اپنے دور کا سب سے بڑا شاہد بن کر اُبھرتا ہے۔ وہ محسوس کرتے ہیں کہ آج بھی "کہیں کوئی بالک خونِ دل میں انگلیاں ڈبو کر ہماری سماجی، اقتصادی اور سیاسی تاریخ لکھ رہا ہے۔"

امر جلیل کے خیال میں "رن کو راہی، عبادت گاہ کو عابد، درد کو دل، احساس کو سچائی کی روشنی اور ہر لکھے ہوئے لفظ کو پڑھنے اور پرکھنے والی آنکھ مل جاتی ہے۔ یہ قدرت کا اٹل قانون ہے۔"

اکثر وہ یہ بھی سوچتے ہیں کہ "ہمارا معاشرہ لکھنے کے لیے قطعی سازگار نہیں ہے۔ یہاں چوری، زوری، رشوت خوری اور چغل خوری سے سکھ کی زندگی گزاری جاسکتی ہے، مگر ضمیر، شعور اور سوچ کے مطابق لکھنے سے ہرگز نہیں۔ ہمارے معاشرے میں ادب کی بڑی سے بڑی اور آخری پارکھ نوکر شاہی ہے۔ کیا لکھیں اور کیا نہ لکھیں، کیا کہیں اور کیا نہ کہیں، جھوٹ کو جھوٹ

اندھیرے کو اندھیرا، ظلم کو ظلم نہ سمجھیں تو پھر کیا سمجھیں۔ زندگی پل صراط کا سفر بن گئی ہے۔"

یہ سب کچھ سوچنے سمجھنے اور محسوس کرنے کے باوصف امر جلیل کہانیاں لکھ رہے ہیں۔ یہ کہانیاں غیر و شر کے ان پہلوؤں پر ہیں بہت کچھ سوچنے سمجھنے اور محسوس کرنے کی دعوت دیتی ہیں جن کو وہ سچائی کی روشنی میں دیکھتے اور پرکھتے رہے ہیں۔

۱۹۸۳ء میں امر جلیل کی نئی اور منتخبہ کہانیوں کے دو مجموعے (تاریخ جو کفن اور منھنجو ذس آسمان کان پچو) منظرِ عام پر آچکے ہیں۔ اور تازہ بتازہ افسانوں کی کتابیں بھی زیرِ اشاعت ہیں۔ ان کی نمائندہ کہانیوں کو دیکھ کر یہ اندازہ ہوتا ہے کہ وہ افسانہ نگاری کے فن اور اپنی ذہانت اور حسیاتی گہرائی و گیرائی سے نکھارنے کا جو سلیقہ رکھتے ہیں وہ اپنے موضوعاتی تنوع، افسانوی ساختیت اور زبان و بیان کے لحاظ سے دلآویز بھی ہے اور فکر انگیز بھی۔

مٹی کے آدمی، صدیوں کا سودا، ایک دیسی عشق کی داستان، اسٹار سرکس کا جوکر، تیسری دنیا، بازگشت، وہ اور میں، دی موسٹ ڈینجرس مین ان پاکستان، تاریخ کا کفن، عاشق شہید لوٹ آتے ہیں، زندگی اور زہر، مرنے سے پہلے اور مرنے کے بعد، عشق، نہ تو ہے نہ میں ہوں، سفر سے سفر تک، آخری پہر کی بات اور میں برف میں تجھ سے ملوں گا۔ وہ عنوانات ہیں جن پر انھوں نے بڑی خوبصورت کہانیاں لکھی ہیں۔ ان کہانیوں میں مقامی رنگ آمیزی، عصری آگہی، شعوری رَو، علامتی اظہار، رومانی طرزِ احساس، طبقاتی کرب آگہی، برمحل طنز و مزاح اور حقیقت پسندانہ رجائیت کی وہ فن کارانہ جاذبیت موجود ہے جو بحیثیت افسانہ نگار ان کی شہرت و مقبولیت کی ضامن ہے۔

ڈاکٹر انور سدید

کچھ وقت ہندوستانی کتابوں کے ساتھ

اردو پر فارسی کے لسانی اثرات ـــــ ڈاکٹر عصمت جاوید

ڈاکٹر عصمت جاوید کی کتاب "اردو پر فارسی کے لسانی اثرات۔ تصوّف کے آئینے میں" دراصل ان کے پی ایچ ڈی کے مقالے کا تلخیص شدہ ایڈیشن ہے جو ۱۹۸۷ء میں ڈاکٹر صاحب نے خود اپنے اہتمام سے اورنگ آباد مہاراشٹر سے شائع کیا۔ ان کے اصل مقالے کا عنوان تھا۔ "اردو میں فارسی کے دخیل الفاظ میں تصوّف کا عمل" اور اس کی ضخامت چھ صد صفحات سے زائد تھی جس کے لیے اشاعتی سہولتیں نایاب تھیں۔ چنانچہ ۱۹۷۳ء میں اس مقالے پر ڈگری عطا کر دی گئی مگر یہ منظرِ عام پر نہ آسکا۔ ڈاکٹر صاحب نے اس مشکل کے پیشِ نظر اب اس کی تلخیص چھاپی ہے۔ اس کے باوجود کتاب کی جامعیت قائم ہے اور یہ خود کفیل نظر آتی ہے اور مباحث کے سیاق اور سباق کو نہ صرف روشن کر دیتی ہے بلکہ ٹیکنیکی قسم کے اس موضوع پر کام کرنے والوں کو روشنی بھی فراہم کرتی ہے۔

یہ کتاب چھ ابواب پر مشتمل ہے۔ پہلے باب میں زبانوں میں آپس کے لین دین اور "رعایت" کے عمل کو موضوع بنایا گیا ہے اور اس کی اساس تصوّف کے عمل پر رکھی گئی ہے جو لوگوں اور زبانوں کے آپس میں ملنے سے ضرورتاً پیدا ہوتا ہے۔ ڈاکٹر عصمت جاوید کا موقف یہ ہے کہ:

> "تصوّف غیر شعوری فطری عمل ہے۔ اس کا اثر ونفوذ ان لوگوں میں زیادہ ہوتا ہے جو "یونی لینگوال" یعنی یک زبانیے ہوتے ہیں اور اس مخرجی زبان (سورس لینگوایج) سے بالکل نابلد ہوتے ہیں جس سے نئے الفاظ ان کی شخصی بولیوں (ڈائیا لیکٹس) میں فرداً فرداً اپنے ہم زبانوں کے ذریعے داخل ہوتے ہیں اور پھر اس قدر عام ہو جاتے ہیں کہ ان کے لسانی گروہ کی زبان کا ـــ جو دراصل شخصی بولیوں کا اوسط ہوتی ہے ـــ حصّہ بن جاتے ہیں۔"

زیرِ نظر کتاب اس بنیادی نظریے کی تشخیص نہیں بلکہ اس اصول پر ڈاکٹر عصمت جاوید نے فارسی کے دخیل الفاظ کی تلاش کرنے کی کوشش کی ہے جو اردو کا نہ صرف حصّہ بن چکے ہیں بلکہ الفاظ کے خول میں نئے معانی کا عطر بھی ڈال چکے ہیں

اس تحقیقی عمل میں انھوں نے مولوی احمد دین (سرگزشتِ الفاظ)، سید مختار احمد و مولانا ذہین (قاموس الاغلاط) ادیب حیدر آبادی (تصرفاتِ اردو)۔ اور جگر بریلوی (صحتِ زبان) کی گراں قدر کتب کے علاوہ انشاؔ، آزادؔ، پنڈت کیفی، سید سلیمان ندوی، مولوی عبدالحق، اور ڈاکٹر گیان چند کے نظریاتِ تصرف سے بھی استفادہ کیا ہے۔ ڈاکٹر سہیل بخاری اور ڈاکٹر فرمان فتح پوری کے کام تک شاید ان کی رسائی نہیں ہوئی۔ اس لیے زیرِ نظر کتاب میں ان محققین کے آثارِ تحقیق نظر نہیں آتے۔ وجہ یہ بھی ہوسکتی ہے کہ ڈاکٹر عصمت جاوید نے اس کتاب میں تلخیص کی سہولت کے لیے مباحث مناسب حد تک کم کر دیے اور بحث کو تصرفِ لسانی تک محدود رکھا ہے۔ عربی کے بھی صرف وہ الفاظ لیے ہیں جو اردو میں فارسی کے وسیلے سے آئے ہیں۔ اس ضمن میں کتاب کے دوسرے باب میں "اردو میں مفرس عربی اور فارسی کے الفاظ کا پس منظر، اور تیسرے باب میں ان کا لفظی تجزیہ پیش کیا گیا ہے۔ اس کے ساتھ ہی دخیل الفاظ میں جو نئی تبدیلیاں مرورِ ایام کے ساتھ عمل میں آئیں ان کو بھی نظر انداز نہیں کیا گیا۔

"اس کتاب کے آخری تین ابواب میں صوتی تصرف، صرفی ونحوی تصرف اور معنوی تصرف پر تفصیل سے بحث کی ہے۔ اور اردو زبان کی حیرت انگیز تصرفی قوت کا اثبات کیا گیا ہے۔ خواہ وہ لفظ اردو ہو یا فارسی، ترکی ہو یا سریانی، پنجابی ہو یا پوربی، اصل کی رُو سے غلط ہو یا صحیح۔ اگر اصل کے مطابق مستعمل ہے تو بھی صحیح اور اگر اصل کے خلاف ہے تو بھی صحیح ہے۔ اس کی صحت اور غلطی اس کے اردو میں رواج پکڑنے پر منحصر ہے۔ کیونکہ جو چیز اردو کے خلاف ہے گو اصل میں صحیح ہو اور جو اردو کے موافق ہے وہی صحیح ہے۔ خواہ اصل میں صحیح نہ بھی ہو۔"

اس خیال کو تقویت دینے کے لیے ڈاکٹر صاحب نے کتاب میں الفاظ کا فرہنگ بھی شامل کیا ہے اور لفظ کے اصل معانی کے علاوہ اردو میں قبول کیے جانے والے معانی اور تلفظ کی نشاندہی بھی کی ہے۔ ان تمام زاویوں سے دیکھیں تو ڈاکٹر عصمت جاوید کا تحقیقی کام بے حد وقیع نظر آتا ہے۔ پاکستان میں یہ کتاب شاید چند لوگوں تک پہنچی ہے۔ اس لیے اس پر بحث اور گفتگو نہیں ہوئی۔ حالانکہ اس کے مباحث فکر انگیز اور موضوعات خیال خیز ہیں۔ ۳۳۶ صفحات کی یہ کتاب ۷۵ روپے میں پھول بن، کباڑی پورہ۔ اورنگ آباد (مہاراشٹر) انڈیا سے دستیاب ہے۔

آنکھوں دیکھی ——— ڈاکٹر مناظر عاشق ہرگانوی

ڈاکٹر مناظر عاشق ہرگانوی کی نئی کتاب "آنکھوں دیکھی" بظاہر بھاگلپور میں ہونے والے فسادات کا رپورتاژ ہے۔ بہ درحقیقت انھوں نے اس کتاب میں اس خوف کو مجتمع کرنے کی کوشش کی ہے جب موت اچانک سر پر منڈلانے لگتی ہے اور ملو اپنا دائرہ محدود اور گرفت مضبوط کرتی جاتی ہے۔ بھاگلپور کا خونیں ڈراما ایک جمہوریت پسند سیکولر حکومت کا عبرت ناک باب ہے۔ مناظر عاشق ہرگانوی آگ اور خون کے اس طوفان سے گزرے اور انھوں نے بلوائیوں کو امن تباہ کرتے، بے گناہوں کو قتل کرتے اور انسانوں کو انسانوں کے خون سے ہاتھ رنگتے دیکھا تھا۔ انھوں نے پولیس کی اندھا دھند فائرنگ بھی دیکھی جس میں بلوہ کرنے والے بچ گئے۔ معصوم شہری موت کے گھاٹ اتر گئے۔ اس کتاب کو پڑھنے کے بعد ۱۹۴۷ء کے فرقہ وارانہ

معمولی محسوس ہوتے ہیں۔ یہ ایک ایسا رپورتاژ ہے جس کا ہر لفظ خون میں ڈوبا ہوا ہے اور زخمی احساس کو کاغذ پہ ابھارتا ہے۔ لیکن "آنکھوں دیکھی" میں نفرت کے جذبے کو تقویت نہیں دی گئی، فرقہ وارانہ احساسات کو ہوا نہیں دی گئی۔ مناظر عاشق ہرگانوی تو انسان کے لیے جینے کا حق مانگتے ہیں، خوف و ہراس سے پاک سانس لینے کی مہلت مانگتے ہیں اور بچوں کے مستقبل کے تحفظ کے طلب گار ہیں۔ ایک نثری نظم سے مصنف کے احساس کی لگن یوں ظاہر ہے!

دور تک لمبی چوڑی سڑک پر / سفید دھلے اسکول کا لباس پہنے / بچوں کی لاشوں سے خون بہہ رہا ہے

بھاری بھاری جوتوں کے نشان سڑک پر / ایک قطار میں چھپے ہوئے ہیں

وہاں تک جہاں پہنچ کر / وہ گاؤں جل رہا ہے۔

اس کتاب کو پڑھ کر میں نے اپنی چشم تخیل میں اپنے شہر کراچی کو دیکھا جو نادیدہ دشمن کی زد میں ہے جہاں معصوم، غریب، بے بس اور بے گناہ لوگ کلاشنکوف کی باڑھ پر ہیں اور عقل ماؤف ہو جانے کے باوجود پوچھتی ہے کہ کیا بیسویں صدی کا انسان پاگل ہو گیا ہے؟

مناظر عاشق ہرگانوی ایک جرأت مند ادیب ہیں۔ انھوں نے اپنے خون رستے زخم ہمیں نہیں دکھائے، اس درد کو مجسّم کیا ہے جو بھاگل پور کے مسلمانوں کے جسم میں موت بنا کر سما گیا ہے۔ یہ کتاب ہندوستانی تاریخ کی ایک اہم دستاویز ہے۔ ڈاکٹر سیفی پریمی نے اس کتاب کو سچی وطن پرستی اور انسان دوستی کی کتاب شمار کیا ہے۔ صفحات ۱۲۵۔ قیمت ۲۵ روپے۔ ملنے کا پتا مکتبہ کوہسار، برہ پورہ، بھاگل پور۔ بہار۔

نفسِ مطلب ——— سید محمد حسنین

ہمارے ہاں ڈاکٹر سید محمد حسنین صاحب کا زیادہ تر انشائیے کی نظری بحث میں آتا ہے۔ اس دور میں جب انشائیہ کا چلن عام نہیں ہوا تھا، ڈاکٹر صاحب نے تدریسی ضرورتوں کے لیے شگفتہ مضامین کا ایک مجموعہ مرتّب کیا اور اس کے لیے ایک خیال افروز پیش لفظ لکھا جس میں فنِ انشائیہ کا مغربی تصوّر بطورِ خاص ابھارا۔ اب حال میں ان کے مضامین کی کتاب "نفسِ مطلب" کے عنوان سے چھپی ہے اور اس میں تنقید و تحقیق، تعلیم و تدریس، خطبات اور تبصرے کے عنوان سے کم و بیش بیس مقالات پیش کیے گئے ہیں۔ ڈاکٹر صاحب کی خوبی یہ ہے کہ انھوں نے اپنی عالمانہ تحریروں کو "مقالہ" کہنے میں تامّل کیا ہے اور فرمایا ہے کہ یہ اصلاً "پیپرز" یا "آرٹیکل" ہیں، جن کا واحد اور مترادف "مضمون" ہے۔ اس کے باوجود کہ ڈاکٹر صاحب نے اپنی فاضلانہ حیثیت کا ادراک یا اثبات کرانے کی کوشش نہیں کی حقیقت یہ ہے کہ ان مضامین میں ایک صائب الرّائے اور وسیع المطالعہ ادیب شائستگی اور سنجیدگی سے آپ سے ہم کلام نظر آتا ہے۔ وہ عصری اختلافات اور وقتی میلانات کا تجزیہ بھی کرتا ہے تو اختلاف کو اپنا حق سمجھنے کے باوجود دوسروں کے پندارِ احساس پر ضرب نہیں لگاتا اور اپنی بات اس خوبصورت انداز میں پیش کرتا ہے کہ اختلاف کے باوجود مخالفین کی زبان میلی نہیں ہوتی۔

ڈاکٹر سید محمد حسنین نے بالعموم ادب کے پورے منظر پر نظر دوڑانے کی کوشش کی ہے۔ اس عمل میں وہ نظریہ سازی

بھی کرتے ہیں اور اپنے تصورات کا اظہار بھی آزادی سے کرتے ہیں۔ مثال کے طور پر مقالہ "قلم کاری" میں خیال کو قلم پر اور کسی صنفِ ادب کی ہیئت اختیار کرنے کے عمل کا تجزیہ کیا ہے۔ "تدوینِ تاریخ ادب" میں تاریخ نگاری کے ساتھ اردو کی تاریخوں کا مطالعہ بھی شامل ہے۔ ظرافت کے نثری اسالیب، آزادی کے بعد سوانحی ادب، ناول کی حیات و ثبات، نئی ایک جائزہ میں بھی مجموعی جائزہ نگاری غالب نظر آتی ہے۔ یادوں کی برات، ریزہ مینا اور حدیثِ میر پر ان کے تیف تفصیلی مقالے ہیں۔ ڈاکٹر صاحب کی تنقید کے دو ماخذات ادب اور آدابِ حیات ہیں۔ اظہار کے لیے انھوں نے حسنِ اسلوب اختیار کیا ہے جو بزرِ درِ علم ہمنوا نہیں بناتا بلکہ پہلے مطالعے کو خوش وضع کرتا ہے اور پھر آپ کے خیالات پر مہمیز لگا سعی کرتا ہے۔ اس کتاب کے مضامین میں مصنف کا مقصد موجود ہے، لیکن ڈاکٹر صاحب مقصدی ادب کے قائل نہیں نزدیک مقصد کا غلبہ فن کی موت ہے اور اس سے انھوں نے اپنا دامن کمال خوبی سے بچایا ہے۔ ۲۰۸ صفحات، قیمت: ملنے کا پتا کتاب منزل، سبزی باغ۔ پٹنہ

اردو افسانے کی نئی تخلیقی فضا ——— رام لعل

افسانہ نگار۔ رام لعل کی کتاب "اردو افسانے کی نئی تخلیقی فضا" کی ابتدا اس غلط العام جملے سے ہوتی ہے یہاں افسانہ تو بہت لکھا گیا ہے لیکن افسانے پر اظہارِ خیال نسبتاً کم ہوا ہے۔" کچھ عرصہ قبل کہا جاتا تھا کہ اردو افسا تنقید سید وقار عظیم تک محدود ہے اور انھوں نے بھی ایک خاص دور کے افسانوں کو ہی نقد و نظر کے قابل سمجھا۔ لیکن صورتِ حال تبدیل ہونے لگی۔ اور شمس الرحمٰن فاروقی، شہزاد منظر، مہدی جعفر، مرزا حامد بیگ، ڈاکٹر صادق اور ا جیسے نقاد رونما ہوئے۔ جنھوں نے کتابیں لکھیں اور افسانے کے فنی رموز اور افسانہ نگاروں کی منفرد جہات دریافت ڈاکٹر گوپی چند نارنگ، وزیر آغا، صبا اکرام، ڈاکٹر وحید قریشی، باقر مہدی، وارث علوی اور محمود واجد کو یہ اہمیت ہے کہ انھوں نے مختلف موضوعاتِ افسانہ پر گراں قدر مضامین لکھے اور افسانہ نگاروں کو نئے راستے دکھائے۔ رام اس تمام منظر کے تماشائی بھی تھے اور تماشا بھی۔ چنانچہ انھوں نے تماشا دکھانے کے لیے افسانہ لکھا اور تماشائی کی حیثیت افسانے کی تنقید لکھی۔ دوسرے افسانہ نگاروں کے فن پر خامہ فرسائی کی۔ ان کی زیرِ نظر کتاب "اردو افسانے تخلیقی فضا" میں افسانے کی تنقید ہی نہیں، ادب میں اس صنف کے تشخص کا اثبات کرانے کی سعی بھی کی گئی ہے۔

بظاہر یہ کتاب سولہ متفرق مضامین کا مجموعہ ہے۔ لیکن یہ سب مضامین چونکہ ایک ہی شخصیت نے جس کا ہے، لکھے ہیں اس لیے اس کی سب کرنیں ایک ہی نقطے کی طرف منعطف ہوتی ہیں اور اس تاریخی سفر کو بازیافت کرتی جس سے رام لعل خود گزرے ہیں۔ اس کتاب کی ایک اور خوبی یہ ہے کہ اس میں نقاد اور مصنف کے علاوہ فنکار شخصیت اور اس کا نقطۂ نظر بھی موجود ہے۔ اور وہ تاثرات بھی اہمیت رکھتے ہیں جو رام لعل نے افسانے کے بارے ادبی محافل اور مذاکروں میں سُنے اور پھر ان پر ابنا ردِ عمل مرتب کیا۔ چنانچہ اس کتاب میں دعویٰ ہی پیش نہیں کیا جوابِ دعویٰ بھی حاضرِ خدمت کیا گیا ہے۔ البتہ میزانِ عدل قاری کے ہاتھ میں دے دی گئی ہے جو چاہے تو رام لعل سے ا

بھی کر سکتا ہے۔ چنانچہ ہمارے سامنے "اردو افسانے کا فن"۔ "اردو افسانے کی ایک نئی جہت" اور "اردو افسانے کے نئے فکری عناصر" جیسے مضامین میں افسانے کی فنی بحث پیش کی گئی ہے۔ "اردو کہانی پر تقسیمِ وطن کے اثرات"۔ "اردو افسانے کی تنقید میں دخترکشی کے رجحانات"۔ "اردو ادب کی تنقید میں دہشت پسندی" کے رجحانات کا احاطہ کیا گیا ہے۔ "اردو افسانے کی چھوٹی چھوٹی اور بڑی بڑی منزلیں"۔ "اردو افسانے کے آس پاس کچھ چہرے" میں شخصیات تاریخی تناظر میں سامنے آئی ہیں۔ پریم چند اور کرشن چندر پر مضامین میں فارسی کے روابط کو پیشِ نظر رکھا گیا ہے۔ "احساس کی یاترا" اردو افسانے کے ایک سمپوزیم کا رپورتاژ ہے۔ اس کتاب میں موضوعات کا یہ تنوع دیدنی ہے اور بعض موضوعات پر تو رام لعل نے ہی پہلی دفعہ قلم اٹھایا ہے۔ "میرا افسانوی تجربہ" اور "افسانے کا افسانہ" خود انکشافی کی نوعیت رکھتے ہیں، یہ تنقید چونکہ ایک افسانہ نگار نے لکھی ہے اس لیے اس میں تخلیقی رعنائی بھی ہے اور اسلوب کی رومانویت بھی۔ ضخامت ۲۴۶ صفحات، قیمت: ۵۰ روپے۔ ناشرین سیمانت پرکاش۔ دریا گنج، دہلی۔

نجیب محفوظ۔ اپنی نگارشات کے آئینے میں ـــــ ڈاکٹر بدرالدین الحافظ

زیرِ نظر کتاب "نجیب محفوظ ـــ اپنی نگارشات کے آئینے میں" اس مسلکِ گوہریں کی کڑی ہے جس کے تحت ڈاکٹر بدرالدین الحافظ عربی ادب نگاروں کو اردو داں طبقے سے متعارف کرا رہے ہیں۔ ان کی دو کتابیں "چند مصری ناول اور افسانے" اور "توفیق الحکیم کی ناول نگاری" اس سے قبل شائع ہو کر خراجِ تحسین حاصل کر چکی ہیں۔ زیرِ نظر کتاب نوبل انعام یافتہ نجیب محفوظ کا مطالعہ خاص ہے اور اس میں نجیب محفوظ کے تجزیے کے لیے جو پس منظر مرتب کیا گیا ہے اس میں مصر کی قدیم قومی اقدار، قصے میں فرعونی اقدار کا احیا اور فرعونی تہذیب کے احیا میں نجیب محفوظ کا حصہ بہت اہم ہے۔ ایک باب نجیب محفوظ کے حیات اور کارناموں پر مشتمل ہے۔ عبث الاقدار، القاہرۃ الجدیدہ اور بین القصرین (ثلثتہ نجیب محفوظ) کا تفصیلی تجزیہ کیا گیا ہے۔ نجیب محفوظ کا متنازعہ ناول "اولاد حارتنا" ہے۔ اسی پر نجیب محفوظ کو نوبل انعام دیا گیا تھا۔ اس ناول میں نجیب محفوظ مذہبی تصورات اسلامی فکر کی نفی کرتے ہیں۔ اس کا اسلوب اگرچہ رمزیہ ہے لیکن کرداروں کا عمل ظاہر کرتا ہے کہ جبلاوی کا کردار اللہ تعالیٰ کے مرادف ہے (نعوذ باللہ) پہلی کہانی میں ادریس درحقیقت شیطان کا مثیل ہے اور وہ شیطان ہی کے انداز میں بغاوت کرتا ہے۔ متعدد دوسرے کردار نامور اور مقدس ہستیوں کی شخصیات پر چُنے گئے ہیں۔ چنانچہ اس کتاب کے خلاف مصر میں شدید ردِ عمل ہوا۔ حتیٰ کہ نجیب محفوظ کے قتل کا فتویٰ بھی دیا گیا۔ ڈاکٹر صاحب نے اس باب کو تفصیل سے لکھا ہے۔ لیکن متنازعہ باتوں سے بڑی ہوشیاری سے پہلوتہی کی ہے۔ یہ کتاب مکتبہ جامعہ دہلی نے شائع کی ہے۔ ضخامت ۲۴۰ صفحات، قیمت: ۶۵ روپے۔

مضمون صاف، خوش خط اور صفحے کے ایک طرف لکھیں

(تبصرے کے لیے دو جلدوں کا آنا ضروری ہے)

خاطرِ معصوم ———— مصنّف : ضمیر الدین احمد

صفحات: ۱۵۲ ــ قیمت: ۵۰ روپے

پتا: احسن مطبوعات کراچی بی ۱۵۵/۵ گلشنِ اقبال، کراچی

ضمیر الدین احمد اردو کے جانے پہچانے افسانہ نگار ہیں۔ انھوں نے اپنے افسانوں میں منٹو، بیدی اور عصمت کی ر
کو آگے بڑھایا ہے۔ ان کے متعلق یہ کہنا مشکل ہے کہ افسانہ نگاری میں یہ ان تینوں میں سے کس افسانہ نگار کے زیادہ قریب ہیں
یہ آسانی سے کہا جاسکتا ہے کہ موضوع کے اعتبار سے ضمیر الدین احمد اس مثلث سے مَس تو کرتے ہیں لیکن موضوع کے ساتھ ا
TREAT MENT یکسر جداگانہ ہے۔

کتاب کے آغاز میں یہ شعر دیا گیا ہے، اور اسی کے دوسرے مصرعے سے اس کا نام چنا گیا ہے۔

مجھے یہ وہم رہا مدتوں کہ جراُتِ شوق   کہیں نہ خاطرِ معصوم پہ گراں گزرے

واقعی "جراُتِ شوق" کے کسی خاطرِ معصوم پہ گراں گزرنے کا خیال وہم سے زیادہ اہمیت نہیں رکھتا۔ "جراُتِ شوق" پر
"خاطرِ معصوم" کا ردِعمل اگر ناراضگی کی صورت میں بھی ظاہر ہوتا ہے تو بھی یہ حقیقت ہے کہ اس کی پاتال میں آمادگی و سپردگی کی خو
موجود ہوتی ہے۔ "خاطرِ معصوم" کے خالق ضمیر الدین احمد نے اسی نکتۂ دل رس کو پوری کتاب میں غزل، مثنوی اور گیت کے حوالوں
بیان کرنے کی کوشش کی ہے اور قمر جمیل نے اس نکتے کی تفہیم و توضیح کے لیے ایک بھرپور پیش لفظ لکھا ہے جس کا آغاز وہ بہاری لال
ان مصرعوں سے کرتے ہیں

میں دن بھر آئینہ لیے بیٹھی رہتی ہوں
اپنے لبوں کو کھولتی ہوں، چھوتی ہوں
اور پھر چھپا لیتی ہوں
کیونکہ
میرے سوامی نے رات بھر ان کو کاٹا ہے"

ابھی ابھی خاطرِ معصوم کی ناراضگی کی پاتال میں آمادگی و سپردگی کی خواہش کے موجود رہنے کی جو بات ہوئی تھی اس کو

بہت حد تک تصدیق بہاری لال کے مذکورہ مصرعوں سے بھی ہو جاتی ہے۔ یعنی یہ کہ لمحۂ وصال میں سوامی سے سرزد ہونے والے ذہنی افعال بھی عورت کے لیے احساس انبساط جواز بن جاتے ہیں اور لمحۂ وصال کے بعد کی ساعتوں میں تا دیر یہ افعال اس کے خیالات میں لذت کی پھولجھڑی بن کر چھوٹتے رہتے ہیں۔

اپنے پیش لفظ کے آخر میں قمر جمیل نے لکھا ہے۔ "حیرت ہے یہ کام ایک نقاد نے نہیں بلکہ ہمارے عہد کے ایک افسانہ نگار نے انجام دیا ہے۔"

اچھا ہوا جو اس کام کے کرنے کا بیڑا کسی نقاد نے نہیں اٹھایا ورنہ یہ خشک لوگ اس موضوع کو دنیا بھر کے جا و بے جا بدیسی حوالوں سے پہلے ریگ زار بناتے اور پھر اس میں بھاری بھرکم مترجم اصطلاحوں کا نخلستان اُگا کر خاموش ہو جاتے ــــ اور اس راہ کے بے چارے مسافر کے پلّے "ٹک ٹک دیدم دم نہ کشیدم" سے زیادہ کچھ نہ پڑتا۔

وہ جو کسی سیانے نے کہا ہے کہ جس کا کام اسی کو ساجے یا جس کی بندری وہی نچائے۔ تو اس چونچال بندری کو کوئی افسانہ نگار ہی نچا سکتا تھا اور افسانہ نگار بھی وہ جس کی عمر عزیز کا ایک بڑا حصہ جنسی موضوع کی نوک پلک سنوارنے میں گزرا ہو۔ ضمیر الدین احمد اس کام کے لیے صد فی صد موضوع آدمی تھے۔ ان کے ضمن میں یہ بات پورے وثوق سے کہی جا سکتی ہے کہ انھوں نے اس مشکل موضوع کو بہت زندہ دلی اور شگفتہ بیانی سے اپنی منزلِ مقصود تک پہنچایا ہے۔ اور شروع سے آخر تک تحریر میں از خود ایسی احتیاط جاری و ساری ہے کہ بیان کہیں مبتذل نہیں ہو پاتا۔ سچ تو یہ ہے کہ ضمیر الدین احمد کے طرزِ تحریر نے "خاطرِ معصوم" کو دو آتشہ بنا دیا ہے۔

ضمیر الدین احمد کی یہ کتاب تصنیف و تنقید کی دنیا میں تازہ ہوا کے جھونکے کی مثال ہے۔ شمس الرحمٰن فاروقی کا مختصر تعارف اور قمر جمیل کا بھرپور پیش لفظ لشکارے مارتے ہوئے نفسِ مضمون پر گوٹے کناری کا کام دے رہا ہے۔

احسن مطبوعات نے اس کتاب کو چھاپ کر اردو ادب کو ایک اور تازہ اور قابلِ مطالعہ کتاب دی ہے۔ محمد رضی کا بنایا ہوا سرورق سادہ، پُرکار اور جاذبِ نظر ہے۔ (و۔س)

ضوفشاں ــــــــــ مصنّف: محبّت خاں بنگش

صفحات: ۸۸ ــ قیمت: ۵۰ روپے
پتا: ادارہ علم و ادب پاکستان، کوہاٹ ڈویژن ــ صوبہ سرحد

محبّت خاں بنگش، سرحد کی فعّال ادبی شخصیت ہیں۔ اردو ادب سے ان کی وابستگی قابلِ رشک ہے۔ اشعار سے اخبار تک ہر وقت لکھنے پڑھنے کا شغل جاری ہے۔ ادارہ علم و ادب ان کی زیرِ نگرانی مختلف النوع کتابیں چھاپتا رہتا ہے۔

محبّت خاں بنگش نے پہلے پہل مدحتِ رسولؐ کے سلسلے میں ایک کتاب "شانِ محمدؐ" چھاپی تھی جس میں شعرائے کوہاٹ کے نعتیہ کلام شائع کیے گئے تھے۔ اس بار انھوں نے "ضوفشاں" کے نام سے اپنی نعتوں اور منقبتوں کا مجموعہ شائع کیا ہے۔

محبّت خاں بنگش کا دل عشقِ رسولؐ سے سرشار و گداز ہے۔ یہی باتیں ان کی منقبتوں کے سلسلے میں بھی کہی جا سکتی ہیں۔

دراصل نعت و منقبت کہنے کے لیے ایک خاص قسم کی سرشاری اور والہانہ پن درکار ہے۔ یہ سرشاری اور والہانہ پن ان کے نعتیہ کلام اور مناقب میں جابجا محسوس کیا جاسکتا ہے۔

کلام کون اچھا اور کون نسبتاً کمتر ہے، اس کی تخصیص نعت میں سوئے ادب کے مترادف ہے۔ اس بارے میں یہی کہا جاسکتا ہے کہ "ضوفشاں" میں شامل تمام تخلیقات رسالت مآبؐ اور ان کی آل کا حوالہ ہیں لہٰذا یہ سرآنکھوں پر رکھنے کے قابل ہیں۔

(ا-یس)

فریاد، جوابِ فریاد ــــــــــ مصنف: جمیل مظہری

صفحات ۴۴ ــ قیمت: درج نہیں

پتا: حلقۂ فکر و نظر، اے ۶۲ ــ بلاک ۲۰ فیڈرل بی ایریا، کراچی ۳۸

"فریاد، جوابِ فریاد" علامہ جمیل مظہری کی وہ معرکتہ الآرا تصنیف ہے جس کی شہرت بہت کچھ ہو چکی ہے اور بہت کچھ ہونا باقی ہے۔ علامہ نے یہ نظم ۱۹۵۵ء میں تحریر کی تھی۔ اور اس کے بعد یہ لال قلعہ دہلی کے ایک بین الصوبائی مشاعرے میں علامہ جمیل مظہری نے سُنائی تھی۔ یہ نظم پہلی بار "سوغات" دہلی میں چھپی تھی۔ سوغات ہی میں مولانا عبدالرزاق ملیح آبادی نے کچھ اس قسم کے الفاظ کے ساتھ تبصرہ کیا تھا ــ "علامہ اقبال اور علامہ جمیل مظہری، دونوں کا موضوع فلسفہ و حکمت اور مزاج فلسفیانہ تھا۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ فریاد، شکوہ کے انداز میں لکھی گئی ہے لیکن دونوں میں جو فرق ہے وہ یہ کہ علامہ کا "شکوہ" اللہ کے حضور ایک مسلمان کا شکوہ ہے۔ اور علامہ جمیل مظہری کی "فریاد" اللہ کے حضور ایک انسان کی فریاد ہے۔ یہاں علامہ جمیل مظہری اپنے مرشد اقبال سے یکسر مختلف نظر آتے ہیں . . . .

علامہ جمیل مظہری نے اپنی نظم "فریاد" کے بائیس برس بعد "جوابِ فریاد" تصنیف کی۔ "فریاد" میں ساٹھ بند اور "جوابِ فریاد" میں اڑتالیس بند شامل ہیں۔ ان دونوں نظموں کی یکجا اشاعت کا سہرا حضرت ثاقب مظفر پوری اور کتاب کے مرتب ڈاکٹر ہلال نقوی کے سر جاتا ہے جو ایک عرصے سے علامہ جمیل مظہری کی باقیات کو یکجا کر کے شائع کرنے میں لگے ہوئے ہیں۔ کتاب کی پشت پر علامہ نیاز فتح پوری، مجنوں گورکھپوری اور احتشام حسین کی آرا شامل کی گئی ہیں جو علامہ کے علم و فن کی تفہیم میں مدد پہنچاتی ہیں۔

ڈاکٹر ہلال نقوی نے مختصر مگر جامع "چند سطریں" لکھ کر علامہ جمیل مظہری کے فن و شخصیت کو اجاگر کرنے کی سعی کی ہے اور "فریاد و جوابِ فریاد" پر اپنی اس گراں قدر رائے کا اظہار کیا ہے جو کم الفاظ میں ان نظموں کا بڑا اچھا تعارف ہے ــ

> "فریاد و جوابِ فریاد" اقبال کے "شکوہ و جوابِ شکوہ" کے بعد اُسی بہاؤ، اُسی تیور اور اُسی گونج کی اردو میں دوسری بڑی نظم ہے۔ لیکن اپنے فکری رچاؤ، اپنی فلسفیانہ لہر اور اپنے باطنی کرب کے سبب یہ شکوہ و جوابِ شکوہ سے یکسر جداگانہ ہے۔"

علامہ جمیل مظہری کی اس نادر تصنیف "فریاد و جوابِ فریاد" کی جس قدر پذیرائی ہونی چاہیے تھی وہ نہ ہو سکی۔

اس کا ایک سبب حیات و کائنات کے فکری مسائل کے مطالعے میں گم شدگی کی حد تک علامہ کا انہماک و استغراق تھا۔ دوسرا سبب ان کا وہ مزاج جو ذرائع ابلاغ کے استعمال کے معاملے میں اپنے معاصرین کی طرح تیز طرار اور چوکس نہیں تھا، بالکل بے گانہ تھا بلکہ بے گانہ رہنے میں عافیت جانتا تھا

شورِ تحسین ناروا سے جمیل　　یہ خموشی بہ اغنیمت ہے

کتاب کی ضخامت کم ہے۔ اس کی ایک وجہ یہ ہے کہ ایک صفحے پر چار بند دینے کا اہتمام کیا گیا ہے۔ کتاب خوبصورت چھپی ہے۔ سرورق پہ علامہ جمیل مظہری کی تصویر ہے۔　(و۔س)

اردو شاعری میں تازہ گوئی کی تحریک ——— مصنف: ڈاکٹر ملک حسن اختر

صفحات: ۲۶۴۔ قیمت: ۱۵۰ روپے

پتا: پولیمر پبلی کیشنز، راحت مارکیٹ اردو بازار، لاہور

ادب مغرب کا ہو یا مشرق کا، اس کے ارتقا کے عمل کو جاری رکھنے کے لیے اس میں موضوع، زبان اور اسلوب کی سطح پر کوئی نہ کوئی تحریک رونما ہوتی رہتی ہے۔ جب تلاشِ نو بہ نو کا جذبہ انسانی فطرت میں داخل ہے اور انسان تادیر ایک مقام پر رک نہیں سکتا تو اس کا ادب کیسے عالم قرار و جمود میں رہ سکتا ہے؟

ڈاکٹر ملک حسن اختر جس ادبی تحریک کو تازہ گوئی کا نام دیتے ہیں وہ بہ قول ان کے دراصل اصلاحِ زبان کی تحریک تھی اور ایہام گوئی کے خلاف ردِ عمل کے طور پر وجود میں آئی تھی۔ ان کے مطابق ایہام گوئی نے اردو شاعری کو ایک تنگنائے میں داخل کر دیا تھا۔ جب کہ اس کی سرگرمی وسعت چاہتی تھی، ایک کھلے میدان کی متقاضی تھی اور اس کی ہر جہت کو آزمانے کا شوق رکھتی تھی۔ تبدیلی کی یہ خواہش اتنی شدید تھی کہ شاہ حاتم جو ایہام گوئی کے بانی کہے جاتے ہیں، یہ کہہ کر اس سے الگ ہونے کی ٹھانی کہ:

کہتا ہے صاف و شستہ سخن بس کہ بے تلاش　　حاتم کو اس سبب نہیں ایہام پر نگاہ

ڈاکٹر صاحب نے مرزا مظہر جانِ جاں کو ایہام گوئی کے خلاف تحریک چلانے والوں کا امام بتایا ہے۔ اس کا تعلق مغل بادشاہ محمد شاہ کے عہد سے قائم کیا ہے اور انعام اللہ خاں یقین، شاہ حاتم، میر تقی میر، سودا، میر درد، قائم چاند پوری، اشرف علی خاں فغاں، میر باقر حزیں، مکتاب رائے رسوا، قدوی لاہوری، دلدار، مرزا محمد علی فدوی، سراج اورنگ آبادی اور ولی سے لے کر مصطفی، شیدا اور غوثی وافضی تک ۸۰ شاعر و تازہ گو شعرا کی صف میں شامل کیا ہے۔ اتنے ڈھیر سارے شعرا کے ناموں اور ان کے کاموں تک رسائی اور ان کے باب میں سخن ولدوار نادرستگی کرنا اور اپنے حسب منشا مواد تلاش کرنا یقینی ایک وقت طلب کام تھا۔ ان کی زیر بحث تصنیف "اردو شاعری میں تازہ گوئی کی تحریک" ان وقت پر اپنی محنت و کاوش کی بدولت حاوی ہونے کا کھلا ثبوت ہے۔ صاحبِ کتاب اس میدان کے خاص آدمی متصور ہوتے ہیں۔ وہ اب تک انیس کتابیں تحقیق کے موضوع پر اردو ادب کو دے چکے ہیں "تازہ گوئی کی تحریک" اس سلسلے کی بیسویں کڑی ہے۔ اور یہ اردو تحقیق و تنقید کے باب میں ایک مفید اضافے کی حیثیت رکھتی ہے۔　(و۔س)

گرد و پیش

انجمن ترقی اردو میں تعزیتی جلسہ

انجمن ترقی اردو پاکستان کا ایک خصوصی تعزیتی اجلاس ہفتہ ۱۹ مئی کو انجمن کے دفتر میں منعقد ہوا۔ اجلاس میں ممتاز ادیب اور عالم جناب رفیق خاور اور معروف محقق، شاعر اور صحافی جناب عبدالرؤف عروج کی وفات پر گہرے رنج و غم کا اظہار کیا گیا۔ جناب شہزاد منظر، جناب ادیب سہیل، ڈاکٹر وفا راشدی اور جناب مختار اجمیری نے مرحوم رفیق خاور اور جناب عبدالرؤف عروج کی علمی اور ادبی خدمات کا جائزہ لیا۔

انجمن کے مشیر علمی و ادبی ڈاکٹر اسلم فرخی نے رفیق خاور مرحوم اور حضرت عروج کی ادبی خدمات اور علمی لگن کو سراہا اور انھیں خراجِ عقیدت پیش کیا۔ اجلاس میں ایک قرار دادِ تعزیت منظور کی گئی اور مرحوم کے ایصالِ ثواب کے لیے قرآن خوانی بھی کی گئی۔

مسقط میں سرسید ڈے

علی گڑھ اولڈ بوائز کی جانب سے مسقط میں سرسید ڈے ہر سال نہایت اہتمام سے منایا جاتا ہے۔ اس سال یہ تقریب سلطنتِ عمان کے قومی دن کی نسبت سے مشترکہ طور پر منائی گئی۔ تقریب کی صدارت بھارتی سفیر رنجیت گپتا نے فرمائی اور مہمانِ خصوصی سلطنتِ عمان کے وزیرِ تعلیم عزت مآب جناب یحییٰ محفوظ المنذری تھے۔ اس موقع پر ایک کل پاک و ہند مشاعرے کا اہتمام کیا گیا جس میں ہندوستان سے علی سردار جعفری، ملک زادہ منظور، کرشن بہاری نور کے علاوہ جواں سال شاعرہ نسیم نکہت، اور پاکستان سے صہبا اختر اور محترمہ شہناز نور نے شرکت کی۔ مقامی شعرا میں گوہر عائشہ، قمر عاشی، خالد نسیم، بیگم فرزانہ اعجاز، جاوید اقبال، عارف انوار الحق، شکیل کاظمی اور کیف حسینی نے حصہ لیا۔ اس مشاعرے میں متحدہ عرب امارات کی نمائندگی معروف شاعر ڈاکٹر زبیر فاروق نے کی۔

تقریب کے آغاز میں سلطنتِ عمان کا قومی ترانہ اور بعد میں علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کا ترانہ پڑھا گیا۔ بعد ازاں تقریب کا باقاعدہ آغاز تلاوتِ کلامِ پاک سے ہوا۔ اس موقع پر ہندوستان کے سفیر اور دوسرے مقررین نے حیات و خدماتِ سرسید احمد پر روشنی ڈالی۔

مشاعرے کا آغاز کرنے کے لیے اردو کے مشہور شاعر جناب علی سردار جعفری کو دعوت دی گئی۔ مشاعرے کی خاص بات یہ تھی

کہ سب سے پہلے معروف مسقطی شاعر بلال عامری نے عربی میں اپنا کلام سنایا۔ بعدازاں یہ سلسلہ مقامی اردو شعرا کے کلام سے چلتا رہا
ہندوستان کے شعرا کی فلائٹ لیٹ تھی لہٰذا وہ رات کے ساڑھے بارہ بجے مشاعرہ ہال میں آئے۔ ان کے آتے ہی نظامت
ملک زادہ منظور نے سیر دکی جو اس معاملے میں خاصی شہرت رکھتے ہیں۔ پاکستان کے معروف شاعر صہبا اختر اور شاعرہ شہناز
نور چونکہ مسقط کے مشاعرے میں پہلی بار شرکت کر رہے تھے۔ سامعین نے ان دونوں سے مکرر سنا۔ مشاعرے کا اختتام جناب
علی سردار جعفری کے کلام پر ہوا۔

دبئی میں ایک ادبی نشست

گزشتہ دنوں دبئی میں ایک ادبی نشست کا اہتمام کیا گیا، اس کے کرتا دھرتا مسلم انٹرنیشنل اسکول کے ڈاکٹر انور علا
اور جناب منور پاشا تھے۔ اس ادبی نشست میں شرکت کے لیے پاکستان سے جناب سحر انصاری اور جناب اعجاز رحمانی تشریف
لے گئے تھے۔ اور بھارت سے جناب حفیظ میرٹھی اور انتظار نعیم نے شرکت کی تھی۔ ادبی نشست میں مشاعرے کا انتظام بھی کیا گیا
تھا۔ مہمان شاعروں کے علاوہ مقامی شعرا میں عربی نثر او اردو شاعر ڈاکٹر زبیر فاروق، شفیق سلیمی، جاوید اکبر اور کئی دوسرے
شعرا نے اپنا اپنا کلام سنایا۔ محفل مشاعرہ رات گئے تک جاری رہ کر اختتام پذیر ہوئی۔

کلیم عاجز سعودی عرب میں

پچھلے دنوں بھارت کے مشہور شاعر جناب کلیم عاجز عمرہ کرنے کے لیے ارض مقدس تشریف لائے تھے۔ ریاض میں
مقیم اردو دوستوں نے موقع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے جناب کلیم عاجز کے اعزاز میں ایک محفل مشاعرہ برپا کر ڈالی۔ محفل کا انعقاد
جناب عبدالحفیظ قریشی کے مکان پر ہوا۔ اس کی صدارت ریاض کے معروف شاعر، ادیب اور بینکار سید ابوظفر نے
فرمائی۔ محفل مشاعرہ کا آغاز مقامی شعرا کے کلام سے ہوا۔ بعدازاں سامعین نے مہمان شاعر جناب کلیم عاجز کا کلام جی بھر کے
سُنا۔ دل کو چھونے والے کلام اور خوبصورت ترنم دونوں سامعین کا دامنِ دل کھینچتے ہیں۔

اے کاش کلیم آتا جی اپنا بہل جاتا — اک گیت سُنا جاتا، کم بخت کا کیا جاتا

اظہارِ تعزیت

انجمن ترقی اردو کا ایک تعزیتی اجلاس حضرت اخگر سرحدی کی زیرِ صدارت اردو منزل میں انعقاد پذیر ہوا۔
جس میں اردو علم و ادب اور صحافت کے بہی خواہ حافظ محمد سلیم تابانی کی مرگِ مفاجات پر گہرے دلی رنج و غم کا اظہار کیا
گیا۔ حافظ مرحوم روزنامہ نوائے وقت لاہور کے ادارے کے ممتاز صحافی تھے۔ ان کی زندگی کا بیشتر حصہ اسی وادی کی بادیہ
پیمائی میں گزرا، انھوں نے "نوائے وقت" کی پرخلوص خدمت کی، آجکل وہ "نوائے وقت" کے لیے قطعہ بھی لکھا کرتے تھے جو
حالاتِ حاضرہ کی ہو بہو تصویر ہوتا تھا۔ ان کی وفات صحافت و ادب کے لیے ایک نقصانِ عظیم ہے۔ یہ اجلاس ان کی

وفات حسرت آیات پر اپنے غم کے ساتھ دعائے مغفرت کرتا ہے اور ان کے اقارب و احباب کے لیے توفیق صبر جمیل کی دعا مانگتا ہے۔ اللہ تعالیٰ ان کو اپنے سایۂ رحمت میں اعلیٰ مقام مرحمت فرمائے۔ آمین۔ ثم آمین۔

منیر احمد شیخ رحلت کر گئے

ادبی حلقوں میں یہ خبر بڑے دکھ کے ساتھ سنی جائے گی کہ پچھلے دنوں پاکستان کے جانے پہچانے افسانہ نگار اور نقاد منیر احمد شیخ ہم سے جدا ہو گئے۔ مرحوم ایک عرصے سے دل کے مریض تھے اور کراچی انجیوگرافی کے لیے تشریف لائے تھے۔ یہیں دل کا انتقال ہو گیا۔ اسلام آباد میں سپرد خاک ہوئے۔ انتقال کے وقت ان کی عمر اٹھاون سال تھی وہ گوجرانوالہ میں پیدا ہوئے تھے۔

منیر احمد شیخ ادیب شہیر تھے۔ افسانہ نگاری میں طرز خاص رکھتے تھے۔ ان کا پہلا افسانوی مجموعہ "لمحوں کی بات" تھا اس کے بعد مضامین کا مجموعہ "قاف سے قلم تک" منظر عام پر آیا۔ پھر ان کی ایک کتاب "تہذیبی رویے" کے نام سے شائع ہوئی جو ان کے موسیقی اور مصوری پر لکھے گئے مضامین کا مجموعہ تھی۔ منیر احمد شیخ موسیقی سے گہری دلچسپی رکھتے تھے۔ موسیقی کے ناقد کی حیثیت سے بھی ان کی شخصیت محترم سمجھی جاتی تھی۔ ادب میں ان کا شمار ایک ذہین اور زیرک فرد کی حیثیت سے ہوتا ہے۔

حکومت پاکستان کے لیے مرحوم کی خدمات بھی کم نہیں۔ وہ وزارت اطلاعات کے محکمے سے وابستہ اور اہم عہدے پر فائز تھے۔ چند سال پیشتر وہ بھارت میں پریس اتاشی کی حیثیت سے تعینات تھے اور بڑے مقبول تھے۔ ان کی موجودگی میں پاک و ہند کے ادیبوں کو بالخصوص ایک دوسرے کے ملک میں سفر کرنے میں بڑی مدد فراہم ہوتی تھی۔

مرحوم انتقال کے وقت اسلام آباد میں حکومت کے کسی کلیدی عہدے پر فائز تھے۔ اور ملازمت سے ریٹائرمنٹ میں بھی کئی سال باقی تھے۔ ان کے ناوقت موت پر نہ صرف ان کے ورثا و لواحقین کو سوگوار کیا۔ بلکہ ان کا طویل حلقۂ احباب بھی غم زدہ ہے۔

ادارہ "قومی زبان" ان کے ورثا کے غم میں برابر کا شریک ہے اور خدائے تعالیٰ سے دعا کرتا ہے کہ مرحوم کو اپنے جوار رحمت میں جگہ عطا فرمائے اور لواحقین کو صبر جمیل کی توفیق دے۔

حروفِ تازہ

کتابیں

پیارے نبیؐ — مصنف: ڈاکٹر عبد[illegible]
سیرت
صفحات: ۱۷۵ ـ قیمت: ۶۰ روپے
پتا: فیروز سنز لمیٹڈ ـ لاہور، کراچی، راولپنڈی

پیوستۂ شجر — مصنف: شبیہہ [illegible]
افسانے
صفحات: ۲۲۸ ـ قیمت: ۷۵ روپے
پتا: ادبی معیار پبلی کیشنز کراچی، پوسٹ بکس نمبر ۲۲۰۲، کراچی

ظلمتِ نیم روز — مصنف: ممتاز شیریں
مضامین
صفحات: ۳۳۵ ـ قیمت: ۱۲۰ روپے
پتا: نفیس اکیڈمی اردو بازار کراچی

چار دیواری — مصنف: شوکت صدیقی
ناول
صفحات: ۶۷۸ ـ قیمت: ۲۰۰ روپے
پتا: رکتاب پبلی کیشنز پوسٹ بکس نمبر ۱۳۴۱۳، کراچی

جرس — مصنف: منفعت عباس رضوی
شاعری
صفحات: ۱۲۸ ـ قیمت: ۵۰ روپے
پتا: ماورا پبلشرز ۳ ـ بہاول پور روڈ، لاہور

فلسفۂ حسن — مصنف: ڈاکٹر نصیر احمد ناصر
تنقید
صفحات: ۲۸۱ ـ قیمت: ۱۵۰ روپے
پتا: فیروز سنز لمیٹڈ، لاہور، کراچی، راولپنڈی

منتخب مزاحیہ مضامین — مصنف: ضیا ساجد
طنز و مزاح
صفحات: ۳۹۶ ـ قیمت: ۱۰۰ روپے
پتا: مکتبہ القریش چوک اردو بازار، لاہور ۲

طنز و مزاح
مصنف: مظفر بخاری
صفحات: ۱۹۲۔ قیمت: ۸۰ روپے
پتا: مکتبہ القریش چوک اردو بازار لاہور ۲

ایک گرم موسم کی کہانی
ناول
مصنف: انیس ناگی
صفحات: ۱۹۰۔ قیمت: ۶۰ روپے
پتا: رہتاس بکس احمد چیمبرز ۵ ٹمپل روڈ، لاہور

غیر سیاسی باتیں
سیاست
مصنف: عبدالقادر حسن
صفحات: ۲۶۸۔ قیمت: ۷۵ روپے
پتا: ماورا پبلی کیشنز، لاہور

فن اور مطالعہ فن
فلسفۂ فن
مصنف: پروفیسر سعید احمد رفیق
صفحات: ۲۷۲۔ قیمت: ۴۰ روپے
پتا: قمر کتاب گھر اردو بازار، کراچی

آزادیٔ فکر و خیال اور اس کی تاریخ
مصنف: جان بگنل بیرے، مترجم: سعید احمد رفیق
صفحات: ۲۴۰۔ قیمت: ۶۰ روپے
پتا: قمر کتاب گھر اردو بازار، کراچی

لطیفیات
شاعری
مصنف: م۔ حسن لطیفی
صفحات: ۳۵۲۔ قیمت: ۲۰۰ روپے
پتا: ادارہ نقوش۔ لاہور

علامتی افسانے کے ابلاغ کا مسئلہ
تنقید
مصنف: شہزاد منظر
صفحات: ۲۷۲۔ قیمت: ۱۰۰ روپے
پتا: منظر پبلی کیشنز اے، ۳۶۔ واحد اسکوائر بلاک ۱۰ گلشن اقبال

رمزِ عشق
شاعری
مصنف: شاہد نجیب آبادی
صفحات: ۱۸۰۔ قیمت: درج نہیں
پتا: ادیب منزل یو۔ ۵۰، بلاک ۲۔ پی سی ایچ سوسائٹی

[illegible]
[illegible]
مصنف: [illegible]
صفحات: ۲۲۴۔ قیمت: ۶۰ روپے

ابجدِ القرآن — مصنف: ضیاء الدین صدیقی
اسلامیات
صفحات: ۳۲۶ ـ قیمت: ۶۰ روپے
پتہ: یونائیٹڈ بک کارپوریشن، ادب منزل، اردو بازار، کراچی

جریدے

ریسرچ گزٹ — مدیر: قاضی جاوید
کتابی سلسلہ ۲
صفحات: ۱۱۰ ـ قیمت: ۱۰ روپے
پتا: اسماعیل ایوانِ سائنس فیروزپور روڈ، لاہور

روحِ ادب — مدیر: نظام الدین
جنوری تا مارچ ۱۹۹۰ء
صفحات: ۱۶۰ ـ قیمت: ۵ روپے
پتہ: بنگال اردو اکادمی ۱۷ اسٹوری موہن ایونیو کلکتہ ۱۴ (بھارت)

رجحان — مدیر: طاہر نقوی
کتابی سلسلہ
صفحات: ۴۸۰ ـ قیمت: ۷۵ روپے
پتا: ادارہ ممتاز مطبوعات اے/۵۰ بلاک ۳ گلشن اقبال، کراچی

ابلاغ (اپریل ۱۹۹۰ء) — مرتبین: سیدہ حنا، نسرین سروش، حامد سروش
سہ ماہی
صفحات: ۹۶ ـ قیمت: ۱۵ روپے
پتا: احمد سلمان پبلی کیشنز، لکی ڈھیری روڈ، گلبہار نمبر ۳ ـ پشاور

دائرہ — مرتبین: حسنین کاظمی، ممتاز مرزا
صفحات: ۹۶ ـ قیمت: ۱۰ روپے
پتا: شاہین چیمبر ز ۱۴ کمرشل ایریا، بلاک ۷/۸ کے سی ایچ ایس، کراچی

کتاب — نگراں: فہمیدہ ریاض، مدیر: ستار طاہر
صفحات: ۵۶ ـ قیمت: ۵ روپے
پتا ۱۳۶ ـ ریواز گارڈن، لاہور

ڈاکٹر وفا راشدی

خزانے

(گزشتہ سے پیوستہ)

۔مسائل و مباحث

ـــ	اردو مسائل پر سہ روزہ کل ہند سمینار	ہماری زبان	دہلی	۸ اکتوبر	۸۹ء	ص ۳
...اللہ، ڈاکٹر	پاکستان میں اردو کا مستقبل	مجلہ کائنات	کراچی		〃	ص ۲۹
...ق بلوچ، پروفیسر	زبانوں کے چراغ	قومی زبان	〃	اکتوبر	〃	ص ۷
...ی دسنوی	مسئلہ مادری زبان اردو کا	کتاب نما	نئی دہلی	دسمبر	〃	ص ۳
...درانی	اردو میں فنِ ترجمہ اصول اور معیاری	مجلہ کائنات	کراچی		〃	ص ۲۶۸
...مد	قوم کی تشکیل میں زبان کی اہمیت	〃	〃		〃	ص ۱۶۴
...بین خاں	کچھ اردو کے بارے میں	ہماری زبان	دہلی	۱۵ اکتوبر	〃	ص ۸
...د زبیری	چیکوسلواکیہ میں اردو کی ترویج	قومی زبان	کراچی	دسمبر	〃	ص ۶۳
...ع پوری	قومی زبان منزل بہ منزل	مجلہ کائنات	〃		〃	ص ۶۶
...گا سکر، ڈاکٹر	محاورے اور ان کی اہمیت	قومی زبان	〃	اکتوبر	〃	ص ۴۱

۔مسائل و مباحث

...شرفی	حریمِ لفظ	ادبِ لطیف	لاہور	اگست	۸۹	ص ۱۳
...متین	اردو کہانی کی مجموعی بے جہتی	دائرے	کراچی	اکتوبر	〃	ص ۲۰
...شفقی، ڈاکٹر	اصنافِ سخن کا معاملہ	〃	〃	دسمبر	〃	ص ۲۶
...رید، ڈاکٹر / ...ری، ڈاکٹر	جدید ادب کیا ہے؟	صریر	〃	اگست	〃	ص ۹
...اطرک	ساختیات	〃	〃	نومبر	〃	ص ۱۴
...کامران	ادب، فکر اور مستقبل کا تصور	صحیفہ	لاہور	دسمبر	〃	ص ۱
...بدلیع	نئی شاعری کے پیچ و خم	شاعر	بمبئی ۳		〃	ص ۸
...رتوفیق	سباعی ایک صنفِ سخن	سب رس	کراچی	اگست	〃	ص ۱۵

مصنف	عنوان	رسالہ	مقام	ماہ	سال	صفحہ
عبدالمغنی	تشکیلِ افسانہ	نقوش	لاہور	دسمبر	۸۸ء	ص ۲۱
فضل الرحمٰن، بازی	جدید پشتو ادب میں ترقی پسند رجحانات	طلوعِ افکار	کراچی	اکتوبر	۱۹۸۹ء	ص ۳۱
فہیم اعظمی، ڈاکٹر	ادب، ادیب — حقوق و فرائض	صریر	″	″	″	ص ۵
فہیم اعظمی، ڈاکٹر	ادب اور ساہوکار	″	″	نومبر	″	ص ۵
فہیم اعظمی، ڈاکٹر	ساختیات اور جدیدیت	″	″	دسمبر	″	ص ۱۲
محمد علی صدیقی	اردو افسانہ اور پاکستانی معاشرہ	شاعر	بمبئی	۴/۱۹۸۹ء		ص ۹
محمود واجد	فکشن، ایک صورتِ حال	صریر	کراچی	اکتوبر	″	ص ۱۳
مرزا حامد بیگ، ڈاکٹر	مغرب سے ادبی اور علمی تراجم	نقوش	لاہور	دسمبر	۱۹۸۸ء	ص ۱۸۳
مناظر عاشق ہرگانوی	اردو ناول کا بیسمنٹ	صریر	کراچی	نومبر	۱۹۸۹ء	ص ۲۳
منیرالدین احمد، ڈاکٹر	نثرانے	افکار	″	دسمبر	″	ص ۴۳
مہدی جعفر	کہانی یا افسانہ	شاعر	بمبئی	شمارہ ۳	″	ص ۳۲

لسانیات

مصنف	عنوان	رسالہ	مقام	ماہ	سال	صفحہ
ایرکن ترکمان، ڈاکٹر	اردو میں ترکی الفاظ	جرنل خدا بخش لائبریری پٹنہ، شمارہ ۵۰			۱۹۸۹ء	ص ۳۳
خلیق انجم، ڈاکٹر	اردو املا، مسائل اور تجویزیں، قسط ۲	ہماری زبان	دہلی	۲۲ دسمبر	″	ص ۸
سید محمد محسن، ڈاکٹر	اردو پر ہندی کے اثرات	″	″	۸ نومبر	″	ص ۷
شان الحق حقی، ڈاکٹر	اردو اور سنسکرت	سب رس	کراچی	جولائی	″	ص ۴

تحقیق و تنقید

مصنف	عنوان	رسالہ	مقام	ماہ	سال	صفحہ
جیلانی کامران	حسن لطیفی (کی شاعری کا جائزہ)	ادبِ لطیف	لاہور	اکتوبر	۱۹۸۹ء	ص ۹
خالد اقبال یاسر	جدید پنجابی نظم کی تین آوازیں — نجم حسین سید، مشتاق صوفی، غلام حسین ساجد	فنون	لاہور	جون جولائی	۱۹۸۹ء	ص ۱۱۹
راج بہادر گوڑ، ڈاکٹر	سعید بن محمد نقش کی شاعری	سب رس	کراچی	جولائی	″	ص ۱۱
رشید ملک	انڈالوجی (۴) اساطیر (۱)	فنون	لاہور	نومبر دسمبر	″	ص ۱۹
زیب اذکار حسین	نعیم آروی اور نئی کہانی	دائرے	کراچی	اکتوبر	″	ص ۳۲
سجاد سرور نیازی / محمد اجمل نیازی	موسیقی، گائیکی اور شاعری کی تکون	فنون	لاہور	نومبر دسمبر	″	ص ۲۶۱

ختر، ڈاکٹر	جمیلہ ہاشمی، رومان سے تصوف تک	نقوش	لاہور	دسمبر	۱۹۸۸ء	ص ۷۷۸
احمد، ڈاکٹر	جمیلہ ہاشمی کی ناول نگاری	قومی زبان	کراچی	"	۱۹۸۹ء	ص ۵۵
رضا بلگرامی	دکن کا ایک صوفی منش غزل گو شاعر	"	"	نومبر	"	ص ۵۳
ررت نقوی	عاشور نامہ	اردو	"	جولائی	"	ص ۷۱
ین الرحمٰن، ڈاکٹر	اردو کا پہلا افسانہ نگار پریم چند؟ راشد الخیری؟ یلدرم؟	فنون	لاہور	نومبر/دسمبر	۱۹۸۹ء	ص ۵۳
اردو دلوی، ڈاکٹر	سانحۂ کربلا بطور شعری استعارہ	صریر	کراچی	اکتوبر	"	ص ۶۹
تہ خاں	پہلی طلسم ہوش رُبا کی دریافت	نقوش	لاہور	دسمبر	۱۹۸۸ء	ص ۶۲۷
نہ محمود	انگارے، ایک جائزہ	فنون	کراچی	جولائی	۱۹۸۹ء	ص ۷۰
الرحمٰن فاروقی	خواجہ حسن نظامی کا نثری اسلوب	قومی زبان	"	دسمبر	۱۹۸۹ء	ص ۳۳
سن	ہندوستان کے دو مزاح نگار	دائرے	"	"	"	ص ۹۳
فقار شکیل، پروفیسر	مثنوی شہادت جنگِ سلطانی، ایک تعارف	اردو	"	جولائی، ستمبر	"	ص ۱۲۹
حنفی	شعر و نغمہ توازن و تقابل کی ایک مشق	غالب	"	جون تا دسمبر	"	ص ۹
مصطفیٰ خاں، ڈاکٹر	کلام خسرو میں مقامی رنگ	تحقیق، سندھ یونیورسٹی جام شورو، اکتوبر			"	
عبدالقادر، ڈاکٹر	حالی کی شعریاتِ فن میں جھوٹ اور سچ	اردو	کراچی	جولائی، ستمبر	"	ص ۲۳
یل	کروچے کا نظریۂ فن	صریر	"	اکتوبر	"	ص ۹
عارفی	نیا عشق حقیقی	غالب	"	جنوری تا دسمبر	"	ص ۲۹
جمل نیازی، ڈاکٹر	تحقیقاتِ طلسم بکاؤلی کی کہانی	اردو	"	جولائی، ستمبر	"	ص ۱۱۷
جمل نیازی، ڈاکٹر	محمد الدین فوق کی ناول نگاری	نقوش	لاہور	دسمبر	۱۹۸۸ء	ص ۱۹۶
کرم سعید	مرزا ہرگوپال تفتہ اور ان کی شاعری	طلوع افکار	کراچی	نومبر	۱۹۸۹ء	ص ۳۷
شیرانی، حافظ	شہادتِ کلام	تحقیق، سندھ یونیورسٹی جام شورو		اکتوبر	"	ص ۳
اسلم بیگ	داستان تاریخِ اردو، ایک مطالعہ	"	"	"	"	ص ۱۴۸
یرآغا	فضا ابن فیضی کی کائناتِ شعر	ادبِ لطیف	لاہور	اگست	"	ص ۵
ف سرمست، ڈاکٹر	دکنی ادب کا اولین محقق، گارساں دتاسی	اردو	کراچی	جولائی، ستمبر	"	ص ۲۱

قید، فنِ تنقید

بلی اشرف، ڈاکٹر	میرزا ادیب کا ڈرامائی فن، لہو اور قالین کے حوالے سے	نقوش	لاہور	دسمبر	۱۹۸۸ء	ص ۸۵۴

...ئ کاشمیری، ڈاکٹر	ہیئتی تنقید	نگار پاکستان	کراچی	نومبر	۱۹۸۹ء	ص
حامدی کاشمیری، ڈاکٹر	اکتشافی تنقید کیا ہے	〃	〃	〃	〃	ص
شمس الرحمٰن فاروقی	داستان اور کلیم الدین احمد	صریر	〃	〃	〃	ص
شمیم حنفی، ڈاکٹر	نئی تنقید، ایک نئی اخلاقیات کی ضرورت	نگار پاکستان	〃	〃	〃	ص
شہزاد منظر	سا غتیاتی تنقید	صریر	〃	ستمبر	〃	ص
قمر رئیس، ڈاکٹر	مارکسی تنقید کا ہیئت اور منصب	نگار پاکستان	〃	نومبر	〃	ص
کرامت علی کرامت، ڈاکٹر	جدید تنقید اور بین العلومی مطالعہ	〃	〃	〃	〃	ص
گوپی چند نارنگ، ڈاکٹر	ساختیات اور ادبی تنقید قسط ۲	ہماری زبان	نئی دہلی	۸ر اکتوبر	〃	ص ۲
〃	〃 〃 〃 〃 ۳	〃	〃	۱۵ر 〃	〃	ص
〃	اسلوبیات اور ادبی تنقید	نگار پاکستان	کراچی	نومبر	〃	ص

تاریخ، فن تاریخ

الطاف احمد قریشی	اساس پاکستان	صحیفہ	لاہور	دسمبر	۱۹۸۹ء	ص ۱۲
انور رومان، پروفیسر	مکران ـ پاکستان کے سیاق وسباق میں	〃	〃	〃	〃	ص ۱۴
سراج منیر	پاکستان کیوں ٹوٹا، ایک تجزیاتی مطالعہ	نقوش	〃	〃	۱۹۸۸ء	ص ۵
سید محمد سلیم، پروفیسر	سندھ میں کون آیا اور کب آیا؟	العلم	کراچی	〃	۱۹۸۹ء	ص ۹۰
شیخ منظور الٰہی	موسیٰ بن نصیر	نقوش	لاہور	〃	۱۹۸۸ء	ص ۳۹
ظہیر علی صدیقی	مولانا محمد علی، کربلا اور ہندوستان کی آزادی	ہماری زبان	دہلی	۸ر دسمبر	〃	ص ۷
عارف لکھنوی	بہادر شاہ ظفر کے مزار پر	سب رس	کراچی	اگست	۱۹۸۹ء	ص ۶
عدنان عادل	آزادی کا اقتصادی پہلو	صحیفہ	لاہور	دسمبر	〃	ص ۱۲۱
مسعود مفتی	ہم نفس[1] ـ ۳	فنون	〃	نومبر، دسمبر	〃	ص ۳۲

تاریخ فن وادب

اشرف النساء شاکر	کتابت وحی اور فن خطاطی کی مختصر تاریخ	العلم	کراچی	دسمبر	۱۹۸۹ء	ص ۱۱۶
رالف رسل، پروفیسر / سحر انصاری	اردو ادب کی تاریخ کس طرح نہیں لکھنی چاہیے	قومی زبان	〃	نومبر	〃	ص ۳۹

---

[1] سلسلے کے لیے ملاحظہ ہو فنون جون، جولائی ۱۹۸۹ء

سعادت سعید، ڈاکٹر	اردو شاعری۔ آزادی اور اظہارِ ضمیر ابتدائی دور میں	صحیفہ	لاہور	دسمبر	۱۹۸۹ء	ص ۵۳
سلیم اختر، ڈاکٹر	پاکستانی شعروادب کے اکتالیس سال	"	"	"	"	ص ۳۳

مذہب و ثقافت

ابوالحق صدیقی	آثارِ قدیمہ	العلم	کراچی	دسمبر	۱۹۸۹ء	ص ۹۵
ن الدین احمد، ڈاکٹر	امیر خسرو کے عہد کا دہلی	سب رس	"	اکتوبر	"	ص ۲۷
ابوالخیر کشفی	رسولِ اکرمؐ اور اسلامی ثقافت	دائرے	"	"	"	ص ۱۰
ا نواز زبیدی	فنونِ لطیفہ کی تعلیم اور ثقافت	فنون	لاہور	نومبر، دسمبر	"	ص ۲۶۷

علوم اسلامیہ

ال احمد صدیقی	حضرت امام بخاری کی احادیثِ نبویؐ کی تحقیق	سب رس	کراچی	جولائی	۱۹۸۹ء	ص ۲۵
ال احمد صدیقی	رحمت اللعالمین کا پیامِ اخوت	"	"	اکتوبر	"	ص ۸
م الرحمٰن، پروفیسر	تعلیماتِ قرآنی کی روشنی میں تصورِ ریاست	مجلّہ کائنات	"		"	ص ۷۹
م الرحمٰن، پروفیسر	رحمت اللعالمین	"	"		"	ص ۵۱۸
ن کاظمی، پروفیسر	رسول اللہؐ بحیثیت مقنن	دائرے	"	اکتوبر	"	ص ۱۴
ن اسلام، پروفیسر	صوفیانہ ادب کے لیے ایک منہاجِ تحقیق کی ضرورت	فکر و نظر	اسلام آباد	ستمبر	۱۹۸۹ء	ص ۸۱
ن عسکری، پروفیسر	اسلام اور مسلمان عہدِ وسطیٰ کے بہار میں (انگریزی)	جنرل خدا بخش لائبریری، پٹنہ	شمارہ ۵۰		"	ص ۱-۱۳۵
نہ خاں	ترجمان القرآن کا اوّلین مصنف مولانا آزاد یا مولانا ظفر علی خاں	ہماری زبان	دہلی	یکم دسمبر	۱۹۸۹ء	ص ۱
مد صدیقی	واقدی[1]، احوال و آثار	نقوش	لاہور	دسمبر	۱۹۸۸ء	ص ۲۰۷
بخاری	قرآن	مجلّہ کائنات	کراچی		۱۹۸۹ء	ص ۱۸
رشید رحمت، ڈاکٹر	علامہ طیبی شارح مشکوٰۃ المصابیح	فکر و نظر	اسلام آباد	اکتوبر، دسمبر	"	ص ۳۷

علامہ ابوعبداللہ واقدی، نام محمد بن عمر بن واقدی۔ عہدِ مامون میں فنِ سیر و مغازی کے امام تھے۔ ولادت ۱۳۰ھ مدینہ منورہ، ۲۰۷ھ بغداد

مصنف	عنوان	رسالہ	ماہ	سال	صفحہ
عذرا صغیر عالم	حدیثِ پیامِ رسول ؐ	مجلہ کائنات کراچی		۱۹۸۹ء	ص ۲۰
علی اصغر چشتی	حدیثِ مرسل	فکر و نظر اسلام آباد	اکتوبر، دسمبر	،،	ص ۳
غلام اسحاق خان (صدر پاکستان)	افتتاحی خطاب تیرہویں سیرت کانفرنس [1]	قومی زبان کراچی	نومبر	۱۹۸۹ء	ص ۵
قاضی اطہر مبارک پوری	صحابہ کرام کے صحفِ احادیث	معارف، اعظم گڑھ	اکتوبر	،،	ص ۴۵
،،	،،	،، ،،	نومبر	،،	ص ۲۵
محمد عارف اعظمی عمری	ملا جیون امیٹھوی اور ان کی تفسیر احمدی	،، ،،	،،	،،	ص ۴۴۳
محمد میاں صدیقی	امام مالک بن انس اور ان کی کتاب المؤطا	فکر و نظر اسلام آباد	ستمبر	۱۹۸۹ء	ص ۲۳
نور الحسن راشدی کاندھلوی	قاضی محمد اعلیٰ تھانوی، مولف کشاف اصطلاحات الفنون ۔	فکر و نظر اسلام آباد	اکتوبر، دسمبر	۱۹۸۹ء	ص ۵۵

خود نوشت

مصنف	عنوان	رسالہ	شہر	ماہ	سال	صفحہ
ادا جعفری	روشنی کی لکیر قسط ۷	افکار	کراچی	نومبر	۱۹۸۹ء	ص ۳۰
ادا جعفری	سفر ہے شرط قسط ۸	،،	،،	دسمبر	،،	ص ۳۶
اقبال متین	کہانی کی کہانی	سب رس	،،	ستمبر	،،	ص ۲۲
انجم اعظمی	ایک ہی کہانی ـ زندگی کی کہانی	صریر	،،	دسمبر	،،	ص ۸
جوہر سعیدی	میرا ادبی سفر	دائرے	،،	اکتوبر	،،	ص ۴۹
رام لعل	کوچۂ قتل	ادب لطیف	لاہور	،،	،،	ص ۱۵
،،	،،	،،	،،	نومبر	،،	ص ۷
رام لعل	میرا ادبی سفر	دائرے	کراچی	دسمبر	،،	ص ۶۰
ژاں پال سارتر/قاضی قیصر الاسلام	الفاظ ۴	،،	،،	اکتوبر	،،	ص ۴۳
ژاں پال سارتر/قاضی قیصر الاسلام	الفاظ ۵	،،	،،	نومبر	،،	ص ۱۵
ژاں پال سارتر/قاضی قیصر الاسلام	الفاظ ۶	،،	،،	دسمبر	،،	ص ۵۶

(جاری)

---

[1] تاریخ انعقاد ۴ر اکتوبر ۱۹۸۹ء بمقام کراچی

ماہنامہ
قومی زبان
کراچی

ستمبر ۱۹۹۰
جلد: ۶۲
شمارہ: ۹

ادارۂ تحریر
جمیل الدین عالی
ادا جعفری
ڈاکٹر اسلم فرخی

مدیر
ادیب سہیل

بدلِ اشتراک
فی پرچہ ...... ۸ روپے
سالانہ علاوہ ڈاک خرچ ۹۰ روپے
سالانہ رجسٹری سے ۱۴۲ روپے
خصوصی شمارہ قیمت دس روپے
بیرونِ ملک
فی پرچہ ---- ایک ڈالر
سالانہ [illegible] ۱۵ ڈالر
سالانہ [illegible] ڈالر

انجمن ترقی اردو پاکستان
[illegible]

مضمون نما

ڈاکٹر سیّد عبداللہ

کی

یاد میں

خصوصی اشاعت

محترم مولوی عبدالحق صاحب اور ڈاکٹر سید عبداللہ کسی اردو کانفرنس کے موقعے پر۔
اورینٹل کالج پنجاب یونیورسٹی لاہور

ایران کے وزیرِ اعظم حکومتِ ایران کی جانب سے فارسی زبان و ادب کے لیے گراں قدر خدمات کے اعتراف میں نشانِ امتیاز پیش کر رہے ہیں

ڈاکٹر سید عبداللہ اپنی پرنسپل شپ کے زمانے میں اورینٹل کالج (پنجاب یونیورسٹی) کے اساتذہ کے ساتھ۔ ۲۵ نومبر ۱۹۵۸ء
یہ تصویر ایک اطالوی شاگرد بارتولیسنی نے کھینچی۔

کارکنان انجمن ترقی اردو سرگودھا ... عبداللہ کے ساتھ کل پاکستان قومی کانفرنس سرگودھا کے موقع پر (کرسیوں پر بیٹھے ہوئے بائیں طرف سے) اخگر سرحدی ... نظامی، ڈاکٹر سید عبداللہ اور وزیر آغا (کھڑے ہوئے بائیں طرف سے) اختر ... مرزا معمول انور، شبلی پانی پتی، ہارون الرشید، ڈاکٹر انور سدید، مشہود شاہد، یونس طاہر اور دوسرے۔

کل پاکستان اردو زبان کانفرنس کے موقع
قائد اردو ڈاکٹر سید عبداللہ انجمن ترقی اردو
سرگودھا کے صدر حضرت مولانا اخگر سرحدی اور
انجمن ترقی اردو سرگودھا کے کارکنان کے ساتھ
گروپ فوٹو۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

جمیل الدین عالی
معتمد اعزازی

ابتدائیہ

وہ ایک عجیب و غریب انسان تھے اور ہماری خوش قسمتی سے پاکستان میں
رہتے رہے......

ہماری اس اشاعت میں سید جمیل احمد رضوی صاحب کا ایک مقالہ شامل
س میں انھوں نے ڈاکٹر سید عبداللہ مرحوم کی "منتخب کتابیات" گنوائی ہیں....
دائرۂ معارفِ اسلامیہ کی بائیس جلدیں جن کی تدوین و نگرانی میں ڈاکٹر صاحب
کا بہت بڑا حصہ تھا، ایک علاحدہ اور نمایاں کارنامہ ہے۔ ڈاکٹر صاحب نے
تاریخِ ادبیات مسلمانانِ جنوبی ایشیا (پاک و ہند) کی تدوین میں بطور مدیر
بہت اہم کردار ادا کیا ہے۔ یہ مقدار بھی ایک حیرت انگیز لگن اور توانائی کی
سناتی ہے........

ساتھ ہی وہ پڑھنے کے بعد عمر بھر پڑھاتے رہے۔ اسے مجبوریٔ معاش کہہ
ان کے کارناموں سے علاحدہ نہیں کیا جاسکتا کیونکہ ان کے فرائضِ تدریس صر
رسمی تدریس تک محدود نہ تھے بلکہ انھوں نے اپنے بےشمار شاگردوں کی تربیت
بھی کی (ان شاگردوں میں سے بعض بڑے نامور مصنف اور اساتذہ بنے)

اس کے علاوہ یعنی اتنی مصروفیات کے باوجود، انھوں نے پاکستان میں نفاذِ
کی تحریک جس بےجگری اور تسلسل کے ساتھ چلائی وہ ان کے اور ہمارے حالا
دیکھتے ہوئے ایک مثالی جدوجہد ہے اور اس معاملے میں ان کا مرتبہ کسی بھی مہ
سے کسی طرح کم نہیں...... بابائے اردو ڈاکٹر مولوی عبدالحق کے بعد بلکہ قیامِ پاکستا
کے بعد تو ان کے ساتھ ساتھ ڈاکٹر سید عبداللہ مرحوم اردو کے سب سے بڑے

سپاہی کے طور پر ابھرتے ہیں ایک شخص بہ یک وقت ایک ذمہ دار، کماکر کھانے اور کھلانے والا سربراہِ خاندان، معروف استاد، محتاط اور محنتی محقق، بے تعصب صاحبِ نظر اور شگفتہ اظہار نقّاد ہو، یہی صفات ہمارے معاشرتی حالات میں ہی کہیں بھی ایک فرد یا ایک ادارے کو ایک بہت بڑی شخصیت کی حیثیت دے دیتی ہیں مگر ڈاکٹر صاحب مرحوم کی توانائی اور دردِ دل نے انھیں قومی زبان کے فروغ و نفاذ کے لیے ایک مسلسل نظری اور عملی جدوجہد .... کشمکش ... میں بھی مبتلا رکھا... منزل ملنا نہ ملنا اور بات ہے۔ یہ اتنا بڑا معرکہ جس میں سیکڑوں پیچیدہ سیاسی مسائل بھی در آئے ہیں اور جس میں شروع سے اب تک ملک کا اسٹیبلشمنٹ بھی ظاہر و خفی طور پر سخت معاندانہ رویّہ اختیار کیے ہوئے ہے، اکیلے ڈاکٹر صاحب سے سر نہیں ہوسکتا تھا لیکن یہ بھی سچ ہے کہ اس مہم کی جیسی فاضلانہ اور جرأت مندانہ قیادت انھوں نے کی اس کے بغیر بات اس حد تک بھی آگے نہیں بڑھ سکتی تھی جس حد تک بڑھی ہے۔

قیامِ پاکستان کے بعد سے انجمن میں بابائے اردو کے علاوہ نفاذِ اردو میں جو بزرگ رضاکارانہ طور پر مسلسل فعّال رہے ان میں ڈاکٹر سیّد عبداللہ، مولانا صلاح الدین احمد، مولانا عبدالقادر، پیر حسام الدین راشدی، ڈاکٹر حمید احمد خاں، ڈاکٹر ممتاز حسن، ڈاکٹر نذیر احمد، مسٹر جسٹس رحمان اور مسٹر جسٹس انعام اللہ خاں شامل ہیں.... بابائے اردو کے بعد ان حضرات کا بھرپور تعاون دوسرے صدر انجمن جناب اختر حسین کو بھی حاصل رہا۔ لیکن ڈاکٹر سیّد عبداللہ نے نہ صرف صدر دفتر انجمن کے ذریعے بلکہ لاہور شاخ کے توسط سے بھی ایک طویل مدّت تک انجمن کی خدمت انجام دی۔ (اس کے علاوہ اردو بورڈ لاہور، مقتدرہ قومی زبان اسلام آباد وغیرہ) اردو تحریک کے لیے جیسی جیسی لڑائیاں لڑی ہیں ان میں سے بعض کا راقم الحروف چشم دید گواہ ہے۔ (تفصیل ان کے خاکے میں) اور بیشتر کا علم تو سب اردو کارکنوں کو ہے .... اکثر اوقات یقین نہیں آتا تھا کہ ہم میں واقعی ایک ایسی جامع متحرک ور مخلص شخصیت موجود ہے .... اب کہ وہ ہم میں نہیں اور ایسی دوسری مثالیں لم میں نہیں آتیں ایک بڑی بےبسی کا عالم ہے......

انجمن نے مولانا صلاح الدین احمد مرحوم پر ایک مذاکرے کے بعد کتابی صورت ں ایک گلدستۂ عقیدت پیش کیا ہے جس میں مولانا مرحوم پر کئی مقالے اور

یادداشتیں شامل ہیں۔ (یہ کتاب اسی سال آئی ہے) اب ہم ڈاکٹر سید عبداللہ مرحوم پر ایک دو روزہ مذاکرہ بھی کرنے والے ہیں اور ان کے فن اور شخصیت پر ایک جامع کتاب کی تیاری بھی شروع ہے۔ کئی محترم لکھنے والوں سے تعاون کی درخواست کی جارہی ہے لیکن ہم نہایت ممنون ہوں گے اگر اس منصوبے سے اس تحریر کے ذریعے مطلع ہونے والے اصحاب بھی انجمن کو ڈاکٹر سید عبداللہ مرحوم کے بارے میں اپنے مقالے بھیج کر ممنون فرمائیں.... مجوزہ اشاعت انشاءاللہ ۱۹۹۱ء کے وسط تک سامنے آجانی چاہیے۔ اگر مقالے ہمیں جنوری کے اواخر تک مل جائیں تو ہم مزید ممنون ہوں گے.... اتنے بڑے آدمی کو اس کی خدمت کا خراج تو وقت ہی پیش کرتا رہے گا اور وہ اثرات بھی جو ان کی تحریروں اور علمی کاوشوں سے آہستہ آہستہ سہی اردو دنیا میں انشاءاللہ ضرور نمودار ہوتے رہیں گے لیکن ان کی عظمت اور جہدِ مسلسل کا ایک تفصیلی جائزہ ہم پر اور اردو دوستوں پر بھی فرض ہے کہ اپنی بساط کے مطابق اسے ادا ہی کرنا چاہیے۔

سید ہاشم رضا

تہنیت

جن بزرگوں نے بیسویں صدی میں اردو زبان کی ترقی و ترویج کے لیے اپنا تن من دھن نثار کر دیا، ان میں پہلا نام مولوی عبدالحق مرحوم اور دوسرا نام ڈاکٹر سید عبداللہ کا ہے۔ ۷ر نومبر ۱۹۷۷ء کو میرپور (آزاد کشمیر) میں ایک اردو کانفرنس منعقد ہوئی جس کی صدارت ڈاکٹر سید عبداللہ کر رہے تھے۔ میں نے بھی اس کانفرنس میں شرکت کی اور ان کی خدمات پر ایک نظم پڑھی۔ جس وقت میں نے یہ نظم پڑھی ڈاکٹر سید عبداللہ نے معانقہ کے بعد مجھ سے کہا کہ سید صاحب اس نظم کی شہرت میری زندگی میں نہیں ہوتی چاہیے کیونکہ اس ملک میں رشک و حسد بہت ہے — اب جب کہ وہ ہم میں موجود نہیں ہیں، میں نے اپنا فرض سمجھا کہ اس نظم کو شائع کروں ——— (سید ہاشم رضا)

ملا نصیب سے کیا تم کو نام عبداللہ
لبوں پہ آیا بصد احترام عبداللہ

جہاں پہ چھوڑ گئے اپنا کام عبدالحق
وہیں سے لے کے چلے خوش خرام عبداللہ

زبانِ اردو کو نقّارۂ خدا سمجھے
اسی لیے تو ہوئے خوش کلام عبداللہ

صلہ بھی ایسا ملا جس پہ خلق رشک کرے
دیارِ عشق میں پایا مقام عبداللہ

نظر نواز ہیں تیری وفا کی تحریریں
ہوں دلنواز ترے صبح و شام عبداللہ

کرے جو خدمتِ پیہم وہی بنے مخدوم
یہی رہا ہے جہاں کا نظام عبداللہ

ملا تو اردو کو قومی زبان کا رتبہ
مگر ہوئی نہ ابھی تک یہ عام عبداللہ

خدا کرے وہی اربابِ حل و عقد کریں
جو کہہ رہے ہیں یہاں کے عوام عبداللہ

پلا رہے ہو جو مدت سے تشنہ کاموں کو
کہاں سے لائے یہ مینا و جام عبداللہ

جگہ بنائی ہے خود اپنی تختِ اردو پہ
ہے سر پہ تاجِ بقائے دوام عبداللہ

اخگر سرحدی

قائدِ اردو ڈاکٹر سید عبداللہ

چل بسا وہ کہ جو تھا اوجِ نشانِ اردو
مدتوں شور مچائے گی زبانِ اردو
اٹھ گیا دیکھتے ہی دیکھتے ان آنکھوں سے
نہ رہا بزم میں وہ روحِ روانِ اردو
کون تھا اس کی طرح قومی زبان کا حامی
کون تھا اس کی طرح مرتبہ دانِ اردو
عمر بھر اس نے اسے اپنا فریضہ سمجھا
وہ بڑھاتا ہی رہا عظمت و شانِ اردو
اس نے تابندہ و پائندہ کیا اردو کو
جلوہ در جلوہ ہوئی تاب و توانِ اردو
وہ بڑے شوق سے ہر بزم میں آجاتا تھا
کتنا آباد تھا اس سے یہ جہانِ اردو
اس کی تقریر میں تھی قومی زباں کی تاثیر
اس کے خطبہ میں تھا اک لطفِ بیانِ اردو
صوفشاں دل میں وہ احساس کی لو رکھتا تھا
آشکارا اس پہ تھا سب حالِ نہانِ اردو
اب کسے فکر ستائے گی زباں اپنی ہو
کون سوچے گا بھلا سود و زیانِ اردو
ہر طرف کتنی اداسی ہے نمایاں اخگر
کتنے مغموم ہیں سب دیدہ ورانِ اردو

محبت خان بنگش (کوہاٹ)

نذرِ ڈاکٹر سید عبداللہ مرحوم

یہ کیا ہوا ہے کہ ہر سمت پھیلی ویرانی
ترے ہی دم سے تھی اردو کی ساری تابانی
ترے قلم نے ادب کو نکھار بخشا ہے
ترے قلم نے زباں کو وقار بخشا ہے
ترے قلم نے ہی اردو میں جان ڈالی ہے
ترے قلم نے جہاں میں جگہ بنا لی ہے
ترے قلم سے ادب میں بڑا اُجالا تھا
ترے قلم سے ہی اردو کا بول بالا تھا
ترے خلوص کا قائل تو اک زمانہ تھا
کہ تیرے پاس ادب کا بڑا خزانہ تھا
بکھرے ہوئے ترے دم سے ادب کے آنگن تھے
ترے ہی دم سے ادب کے چراغ روشن تھے
نڈھال دل ہے ہر اک غم سے آج کیا ہوگا
بچھڑ گیا ہے جو تُو ہم سے آج کیا ہوگا
جو زخم دل پہ لگے ہیں دکھا نہیں سکتے
کہ تیری موت کا صدمہ اُٹھا نہیں سکتے

ڈاکٹر سید عبداللہ
(ناظم انجمن ترقی اردو، لاہور)

خطبہ استقبال

(پاکستان کی اردو انجمنوں کی دسویں سالانہ مجلسِ مشاورت کے افتتاحی اجلاس منعقدہ ۲ نومبر ۱۹۷۳ء میں پڑھا)

خواتین و حضرات، میں پہلے صدرِ اجلاس ڈاکٹر خواجہ صلاح الدین کا پھر آپ کا شکریہ ادا کرتا ہوں۔ ڈاکٹر خواجہ صاحب ۔۔ کے ممتاز استاد، نامور سائنس داں اور اردو کے مخلص خادموں میں سے ہیں۔ انھوں نے یونیورسٹی کے حلقے میں سائنس اور ذریعۂ تعلیم کے لیے بہت کام کیا ہے۔ ان کے زیرِ اثر پنجاب یونیورسٹی کے بیشتر سائنس داں اردو میں تصنیف و تالیف کام کرنے پر آمادہ ہو گئے ہیں اور کتابیں لکھ رہے ہیں۔ خواجہ صاحب کی ان خدمات کو ہم کسی طرح فراموش نہیں کر سکتے۔ صدقِ دل سے اس کا اعتراف کرتے ہیں۔

آج کے اجلاس میں انجمنوں کی طرف سے جو نمائندے تشریف لائے ہیں وہ بھی ہمارے خاص شکریے کے مستحق ہیں۔ ہمارے لیے مزید موجبِ افتخار و امتنان ہے کہ مندوبین محترم نے ایثار اور قربانی کی واقعی ایک مثال قائم کر دی ہے کیونکہ یہ سب حضرات ہر سال اپنی گرہ سے خرچ کر کے یہاں پہنچتے ہیں اور لاہور کی انجمن ترقی اردو پر ان کی طرف سے کوئی ۔۔ نہیں پڑتا۔ آج کل کے زمانے میں اس خلوص اور حوصلے کی موجودگی ایک غیر معمولی روحانی کارنامہ ہے۔

بہرحال میں جملہ حاضرین کی محبت و شفقت کا معترف ہوں اور سب کو خوش آمدید کہتا ہوں۔

اردو انجمنوں کی اس دسویں سالانہ کانفرنس میں جن مسائل پر غور ہوگا وہ تقریباً وہی ہیں جو سالہا سال سے ہمارے سامنے ہیں ۔۔ ع وہی اندازِ جہانِ گزراں ہے کہ جو تھا

گزشتہ کانفرنس کے بعد ملک میں اردو کے سلسلے میں جو کچھ ہوا ہے وہ آپ کو خود معلوم ہے لہٰذا احتیاجِ تفصیل نہیں ۔۔ میں احباب میں پھیلے ہوئے ایک عام تاثر کا بطورِ خاص ذکر کرنا چاہتا ہوں، بہت سے لوگ یہ کہنے لگے ہیں کہ اب پاکستان میں اردو کا کوئی مستقبل نہیں، اور یہ بھی کہ یہاں بھی نیوزی لینڈ اور آسٹریلیا وغیرہ کی طرح انگریزی ہی کو قومی، ۔۔زی، مادری اور پدری زبان بنانے کی تیاریاں مکمل ہو چکی ہیں۔ اردو کے پُرجوش کارکن اب اپنے خطوط میں شدید ۔۔ کا اظہار کرنے لگے ہیں۔ اور ایک دوست نے تو یہاں تک کہہ دیا ہے کہ اب میں انگریزی ہی کو اپنی واحد قومی زبان

تسلیم کرتا ہوں۔ اور ساتھ ہی شاہجہانی دور کے فارسی شاعر کلیم کے کئی اشعار لکھے ہیں جن سے یاس و اضطراب کے معنی نکلتے ہیں۔

کچھ دوستوں نے لکھا ہے کہ پنجاب، صوبہ سرحد اور بلوچستان میں ایک سال کے اندر اندر اردو کو سرکاری زبان بنانے کے جو وعدے کیے گئے تھے وہ پورے نہیں ہوئے۔ ابھی تک دفتر کے کسی بڑے آدمی نے اردو کو منہ نہیں لگایا۔ اردو چٹھی کا بھی جواب انگریزی میں آتا ہے اور سرکاری دفتروں میں اردو کے معمولی نشانات بھی نہیں ملتے۔

ہر چند کہ ان شکایتوں میں خاصی سچائی ہے تاہم میں اپنے دوستوں اور کرم فرماؤں سے گزارش کروں گا کہ وہ مایوس نہ ہوں اور مایوس ہو کر بھی ایسی باتیں نہ کہیں جن سے انگریزی کے میلان کو تقویت ملتی ہو۔ یہ ایک تسلیم شدہ حقیقت ہے کہ ہر مسئلہ جد و جہد اور صبر و حوصلہ کا محتاج ہوتا ہے۔ زندگی کے ہر مہم میں نشیب و فراز آتے ہیں۔ راہرو کا فرض ہے کہ منزل کو فراموش نہ کرے، ہمت نہ ہارے اور قدم اٹھاتا ہی رہے۔ اور اگر راستے میں کوئی سنگِ گراں حائل ہو جائے تو تدبیر اور حوصلے سے اسے دور کرے۔ مایوسی تو کسی مشکل کا علاج نہیں۔

یہ دوستوں کے تاثرات کے ضمن میں لکھ رہا ہوں ورنہ میں تاریکیوں کے باوجود صورتِ حال سے مایوس نہیں ہوں۔ اور تجزیے سے یہ نتیجہ نکالنا مشکل نہیں کہ اردو اگر بعض شعبوں میں پیچھے ہٹی ہے تو بعض شعبوں میں آگے بھی بڑھ رہی ہے۔

حکومتی سطح پر بے دلی یا نیم دلی کی جو شکایت ہے اس کا بھی اگر تجزیہ کیا جائے تو اس پر بھی اتنی مایوسی کا کوئی جواز نہیں۔ ہاں یہ درست ہے کہ وہ ہمارے شوق و ذوق کے مطابق نہیں اور اسی سے ہمارے احباب (اپنی زیادہ توقعات کے باعث) شکستہ دل ہو جاتے ہیں۔

مجھے صوبہ سرحد اور بلوچستان کی صورتِ حال کا براہ راست علم نہیں لیکن جہاں تک میں جانتا ہوں ان حکومتوں نے بھی اردو سرکاری زبان کے متعلق اپنا وہ اعلان واپس نہیں لیا جو پچھلے سال کیا گیا تھا۔

جہاں تک پنجاب کا تعلق ہے حسنِ اتفاق سے میں حکومتِ پنجاب کی اس کمیٹی کا رکن ہوں جو اردو کو دفتروں میں رائج کرنے کے لیے بنائی گئی ہے۔ یہ کمیٹی بڑی تندہی سے کام کر رہی ہے۔ اس کے صدر جناب محمد حنیف رامے ذاتی طور سے اس کی سرگرمیوں میں مخلصانہ دلچسپی لیتے ہیں اور اردو کی ترقی کے لیے صدق دل سے کوشاں ہیں۔

یہ کمیٹی اس وقت دفتری الفاظ کی تیار شدہ لغات کو از سر نو مرتب کر رہی ہے۔ اس کے ہمراہ دفتری مراسلات کے نمونے بھی مرتب ہو رہے ہیں اور ماہرین کی ایک جماعت ماہ جولائی ۱۹۷۳ء سے ہر روز چار چار گھنٹے اس میں صرف کرتی ہے اور اب یہ کام قریب الاختتام ہے۔ اور دسمبر ۱۹۷۳ء کے آخر تک لغت کے طبع ہونے کی توقع ہے۔

سالِ رواں کے میزانیہ میں ساڑھے بارہ لاکھ روپے کی رقم صرف اردو ٹائپ رائٹر مشینیں خریدنے کے لیے مختص کی گئی ہے۔ اور مشینیں جب خریدی جائیں گی تو لاہور سے باہر کے اضلاع میں بھی تقسیم ہوں گی۔ بہ ٹائپ رائٹر مشینیں فوری طور سے تربیت کے مقصد سے خریدی جا رہی ہیں۔

سول سیکرٹریٹ میں اردو مختصر نویسی اور ٹائپ نویسی کی تربیت کا کام جاری ہو چکا ہے اور تجویز ہے کہ

دوسرے اضلاع میں بھی جلد اس کا انتظام کیا جائے۔ یہ بھی فیصلہ ہوا ہے کہ جو انگریزی مختصر نویس حکومت کے تربیتی نظام کے ذریعے تربیت حاصل کر کے مختصر نویسی میں ۸۰ الفاظ فی منٹ اور اردو ٹائپ نویسی میں ۳۰ الفاظ فی منٹ کی رفتار سے امتحان پاس کریں گے انھیں مبلغ ۲۰۰ روپے کا انعام دیا جائے گا۔ جو مختصر نویس اپنے طور سے تربیت حاصل کر کے امتحان میں مذکورہ رفتار دکھا سکیں گے ان کو ۳۰۰ روپے کی رقم بطور انعام دی جائے گی۔ جونیئر کلرکوں کو اس امتحان میں پاس ہونے پر سرکاری تربیت ۱۰۰ روپے اور پرائیویٹ ہونے کی صورت میں ۱۵۰ روپے کے انعام دینے کا فیصلہ ہوا ہے۔ یہ بھی طے ہوا ہے کہ محکمانہ سطح پر امتحانات لیے جائیں۔ اور مذکورہ بالا طریقے سے پاس شدہ اصحاب کو ترجیح دی جائے۔

آپ مجھ سے اتفاق کریں گے کہ یہ بھی خاصا کام ہے۔ لہٰذا آپ مایوسی کا شکار نہ ہوں۔ مجھے یقین ہے کہ اگر آپ کا مطالبہ جاری رہا تو پنجاب کے دفتروں کو انگریزی سے جلد چھٹکارا مل جانے کے پورے سامان اور امکانات موجود ہیں۔ اور جس دن پنجاب کی سرکاری زبان عملاً اردو ہو گئی تو صوبہ سرحد اور بلوچستان پر بلکہ سب صوبوں پر اس کا اثر پڑے گا۔ اور جب ملک کا ۷۰ فی صد سرکاری کاروبار اردو میں ہو گا تو مرکز کو بھی اردو کی طرف مجبوراً التفات کرنا پڑے گا۔

خوش قسمتی یہ ہے کہ مجلسی سطح پر اردو کا رواج روز بروز بڑھ رہا ہے ــــ اجتماعات و مجالس میں اردو کا استعمال اب عام ہے ــــ اور کاروبار میں بھی اردو کو بہتر ذریعۂ اشتہار سمجھا جا رہا ہے۔ سینما والوں نے اگرچہ تعارف نامے انگریزی میں بدل دیے ہیں لیکن اگر اس پر عوام نے احتجاج کیا تو ان کی زبان بھی بدلی جا سکتی ہے۔ یہ سب جزئیات میں نے اس لیے پیش کر دیا ہوں کہ آپ کی مایوسی دور ہو۔

اور میں کچھ یوں بھی سوچتا ہوں کہ اردو کی سست ترقی کا ایک باعث یہ بھی ہے کہ اردو کے کارکن اور خیر خواہ کبھی تو زیادہ سرگرم اور پرجوش نہیں ــــ ہم میں سے کتنے ہیں جنھوں نے اپنے ماحول میں یعنی نجی دائرے میں اردو کی ترویج کے لیے کوئی پروگرام بنایا اور مستقل مزاجی سے اس پر عمل کیا۔ کتنے ہیں جنھوں نے شکایتی خط لکھ کر اپنی کارپوریشن، اپنے دفتر، ضلع یونیورسٹی یا کسی اور ادارے کو اردو کی طرف متوجہ کیا؟ میرا ذاتی تاثر یہ ہے کہ یہ کام بہت کم احباب کرتے ہیں۔

ہمارے ملک میں ایک رجحان یہ بھی ہے کہ لوگ خود کچھ نہیں کرتے اور ہر شئے کی توقع حکومت سے کرتے ہیں ــــ ہم وہ بھی نہیں کرتے جو صرف ہمارے کرنے کی ہیں اور بہت آسان ہیں۔ اردو کے کارکنوں کو یہ معلوم ہے کہ ہمارے ملک میں سائنسی کے باوجود ایک خاص قسم کی سہل انگاری عام ہے جس کا دوسرا نام بے حسی ہے۔ جب حالت یہ ہو تو کارکنان اردو یہ توقع کیوں رکھتے ہیں کہ محض آپ کی مخفی آرزو کا پاس کرتے ہوئے انگریزی زدہ لوگ انگریزی کو چھوڑ دیں گے۔ یا عام آدمی اپنی کسی ضرورت کے دباؤ میں آ کر انگریزی کو اردو پر ترجیح نہ دے گا۔

میں کہنا یہ چاہتا ہوں کہ ہمارا کل مسئلہ حمیت، حوصلہ، تدبیر اور ذاتی جدوجہد پر منحصر ہے۔ اگر ہم نجی دائرے میں دوبہ اصرار کرتے رہیں گے تو سرکاری دائرے میں اردو کو کوئی بھی نہ روک سکے گا [illegible]

مشاعرے کیجیے، اجتماعات میں بے ضرورت انگریزی بولنے والے کو ادب و شرافت کے ساتھ ٹوک دیجیے۔ محلے کے تاجروں سے کہیے کہ تختی اردو میں لکھے۔ اپنی کسی ضرورت کے لیے چٹھی لکھنی ہو تو سرکاری محکموں کو اردو میں لکھیے۔ اگر چٹھی کا جواب اس وجہ سے نہ آئے کہ وہ انگریزی میں نہ تھی تو وہی چٹھی اخبار میں چھپوا دیجیے ــــ بلکہ مجھے دیجیے میں خود چھپوا دوں گا۔

یہ سب کچھ کرنے کے بجائے آپ حکومت کی طرف دیکھتے رہتے ہیں ــ بس یہیں سے ناکامی کا آغاز ہوتا ہے۔ میں بات ختم کرنے سے پہلے کراچی کے اخباروں کی ایک بحث کی طرف آپ کو متوجہ کرنا چاہتا ہوں۔ کراچی بھی عجیب شہر ہے۔ اس میں بعض مباحثے محض مشغلے کے لیے مگر بعض اغراض ...... کے تحت شروع کر دیے جاتے ہیں ــ کراچی کے ایک دانشور نے رومن رسم الخط کی ترویج کے لیے ایک تجویز پیش کی ہے کہ کاروبار کے لیے اردو کے بجائے رومن جاری کیا جائے اور ہر بچے کو دونوں خط سکھائے جائیں۔

عربوں کی پرانی ضرب المثل ہے: خیمے میں کسی اونٹ کا سر پہلے داخل کر دو پھر اونٹ اور اونٹ والا دونوں خود بخود داخل ہو جائیں گے۔ مذکورہ بالا تجویز کو بس اونٹ کا سر سمجھ لیجیے۔

میں کراچی کے ان بقراطوں سے جو اس بحث میں لگے ہوئے ہیں، بصد عجز و نیاز عرض کروں گا کہ ہم ان کی کاریگری کو خوب سمجھتے ہیں۔ . . . . ہم انھیں بتا دینا چاہتے ہیں کہ اردو کے لیے رومن رسم الخط کو کسی صورت میں برداشت نہیں کیا جائے گا۔

مجھے تسلیم ہے کہ ہر معاملے میں استثنا کا قانون رائج ہے مگر اس استثنا کا فیصلہ بھی ہم خود کریں گے اور اس طرح کریں گے کہ پیشِ نظر مقصد بھی پورا ہو جائے اور اردو خط کی سالمیت کو بھی گزند نہ پہنچے۔

بس میری معروضات یہی ہیں ــ مجھے امید ہے کہ آپ میری معمولی سی تلخ نوائی سے آزردہ نہ ہوں گے اور اردو کی ترقی و تحفظ کے لیے اپنے اپنے دائرے میں علمی کام کی رفتار تیز کرتے رہیں گے۔

آخر میں جناب صدر سے گزارش کرتا ہوں کہ وہ اپنے ارشادات سے ہمیں مستفید فرمائیں اور اپنے تجربات کی روشنی میں ہماری رہنمائی کریں تاکہ ہم ان کی ہدایات پر عمل کر کے اردو کی کچھ خدمت کر سکیں۔ اور اب اختتام پر میں ایک بار پھر سب حاضرین کا شکریہ ادا کرتا ہوں۔

ڈاکٹر سید عبداللہ
ناظم اعلیٰ انجمن ترقی اردو، لاہور

خطبۂ استقبال

(پاکستان کی اردو انجمنوں کی گیارہویں سالانہ کانفرنس میں بتاریخ ۲۶ اکتوبر ۱۹۷۴ء پڑھا گیا)

ن و حضرات!

ہمیشہ کی طرح آج بھی میں آپ کا ممنون ہوں کہ آپ مختلف علاقوں اور شہروں سے سفر کی تکلیف برداشت کر کے نجمنوں کی اس گیارہویں سالانہ کانفرنس میں شرکت کے لیے تشریف لائے ہیں۔ بالیقین یہ آپ کے جذبۂ قومی کی علامت ہمارے لیے سرمایۂ قوت و افتخار ہے۔ اور صدر محترم، آپ کے کرم و احسان کا شکریہ تو ادا ہو ہی نہیں سکتا۔ آپ سے عقیدت اتنی گہری اور اتنی زیادہ ہے کہ بتقریر درنیاید و بذوق تواں دریافت، اور پھر معاملہ یہ بھی ہے کہ آپ کے دینی ، اور علمی خدمات اتنی نمایاں ہیں کہ ان کا حساب و شمار محض تکلف معلوم ہوتا ہے۔ سچ یہ ہے کہ برق کے تعارف کی بھی کب ہے برق خود اپنی علامت ہے۔ اور ہمارا حوصلہ دیکھیے کہ ہم برق کو بے خطر اپنے کاشانے میں لے آئے ہیں۔ ہیں آج نور ہی کی نہیں، حرارت کی بھی ضرورت ہے۔ بقول نظیری:

ما جائے نور برق بکاشانہ بردہ ایم

یہ قصۂ شکر و سپاس کا ہر چند لذیذ ہے مگر اب اسے آپ کے ذوق و تخیل کے حوالے کر کے کانفرنس کے موضوع پر ، جس کے لیے آپ جمع ہوئے ہیں۔

پاکستان (یا مغربی پاکستان) کی اردو انجمنوں کی یہ گیارہویں سالانہ کانفرنس ہے۔ گزشتہ برسوں کی طرح اس بھی قومی زبان اردو کے مسائل و معاملات زیر بحث آئیں گے اور جناب صدر کی رہنمائی میں آپ سب حضرات سالِ گزشتہ کی ترقی و زوال کا جائزہ لے کر اور اسباب پر غور و فکر کر کے متاسب فیصلے کریں گے جنھیں آئندہ سال کے لیے کا درجہ حاصل ہوگا۔

جہاں تک میں دیکھ سکا ہوں مجھے یہ محسوس ہوا ہے کہ پاکستان میں اردو کے مستقبل کے بارے میں مایوسی روز بروز جا رہی ہے۔ جب تک مشرقی پاکستان موجود تھا، اردو کے خلاف یہ دلیل دی جاتی تھی کہ اردو کا چرچا نہ کرو بنگلہ والے ناراض ہو جائیں گے، پھر ہم نے اپنی آوازیں دھیمی کر لیں۔ اور جو کچھ کہا، دبی زبان سے کہا اور ہر بات

میں بنگلہ کا ذکر پہلے کیا۔

اس سے اردو کی حیثیت ثانوی ہو گئی۔ مگر ہم نے یہ گوارا کیا اس امید پر کہ اگر اردو اپنے تاریخی و قومی وجوہ کے باوصف اور قائداعظمؒ کے فرمان کے باوجود اپنی صحیح پوزیشن پر فائز نہیں رہ سکتی تو چلیے بنگلہ زبان کے سہارے ہی کچھ مقام حاصل کرتی رہے اور اس میں کچھ شبہ نہیں کہ اردو کو بنگلہ زبان کی وجہ سے ایک مقام ملتا رہا۔ کیونکہ بنگلہ کے حق میں جو گہرے جذبات موجود تھے۔ ان کا فائدہ اردو کو بھی پہنچتا رہا۔

چنانچہ ۱۹۶۹ء کے اوائل میں بنگلہ کے ساتھ ساتھ اردو کی پوزیشن یہ تھی کہ یونیورسٹی کی اعلیٰ سے اعلیٰ تعلیم تک اردو اور بنگلہ ذریعۂ تعلیم کا اصول تسلیم ہو کر مشرقی پاکستان کے علاوہ کراچی اور لاہور میں اس پر عمل کا آغاز ہو چکا تھا۔ ۱۹۶۸ء میں اس کے قطعی نفاذ کے لیے مرکزی حکومت نے ڈاکٹر ایم۔ او۔ غنی وائس چانسلر ڈھاکا یونیورسٹی کی سربراہی میں ایک کمیشن بٹھایا جس کے ایک شعبے کے سربراہ پروفیسر حمید احمد خاں تھے۔ میری ذاتی معلومات کے مطابق اس کمیشن نے ملک کے دونوں بازوؤں کا دورہ کر کے یہ قطعی فیصلہ کر دیا تھا کہ ۱۹۶۹ء میں جو نئے طلبہ یونیورسٹیوں میں سائنس اور آرٹس میں داخل ہوں وہ اردو اور بنگلہ میں تعلیم حاصل کریں۔ اور دو سال کے بعد انھیں زبانوں میں امتحان دیں۔ یہ بات ڈاکٹر ایم۔ او۔ غنی نے پنجاب یونیورسٹی کے سنڈیکیٹ روم میں اساتذہ کے ایک اجلاس میں خود فرمائی۔ اور ان کا قول یہ تھا کہ وہ لاہور سے واپس ہو کر اپنی یونیورسٹی میں اس کے انتظامات کا آغاز کر دیں گے کیونکہ صدرِ مملکت نے ان کی سفارشات قبول کر لی ہیں۔

اس کے فوراً بعد پاکستان ایک تحریک سے دوچار ہو گیا۔ اس لیے ڈاکٹر ایم۔ او۔ غنی کی سفارشات بھی "آں دفتر را گاؤ خورد و گاؤ را قصاب بُرد" کے مصداق نذرِ ہنگامہ ہو گئیں۔ اور کئی اور فیصلوں کے ساتھ حکومت کا یہ فیصلہ بھی ختم ہو گیا کہ ۱۹۷۲ء میں ایک لسانی کمیشن قائم ہو کر اردو اور بنگلہ کو ملک بھر کی سرکاری و دفتری و عدالتی زبان بنانے کا فیصلہ کرے گا۔

جب مذکورہ تحریک کے نتیجے میں فوجی حکومت آئی تو اس نے نور خاں کمیشن قائم کیا جس نے بالکل قومی توقعات کے مطابق انگریزی کی غاصبانہ حیثیت کو ختم کر کے اردو و بنگلہ کو صحیح معنوں میں بالادست قومی زبانیں بنانے کا فیصلہ کیا لیکن انگریزی کے کھلے اور چھپے حامیوں نے بہت جلد اس کمیشن کی کارروائی کو کالعدم کرا کر محمود الرحمن کمیشن کے نام سے ایک اور مجلس کی تشکیل کرا دی جس کی سفارشات نے پاکستان کی تاریخ میں پہلی مرتبہ اردو کو محض نمائشی حیثیت دے دی اور اردو سے متعلق قومی توقعات کی شکست کا یہ روزِ اوّل تھا۔

۱۹۷۰ء کے انتخابات کے نتیجے میں اور مشرقی پاکستان کی علیحدگی کے بعد ۱۹۷۱ء میں باقی ماندہ پاکستان میں نئی حکومت قائم ہو گئی تھوڑے ہی عرصے کے بعد پہلے بلوچستان میں، اس کے جلد بعد صوبہ سرحد اور پنجاب میں اردو کو صوبائی سطح پر سرکاری دفتری زبان بنا دینے کا فیصلہ ہوا۔ مگر مرکز میں قومی سطح پر اردو کو سرکاری حیثیت دینے کے بجائے پندرہ برس تک انگریزی کی بالادستی کو برقرار رکھنے کا فیصلہ ہو گیا۔ یہ بتائے بغیر کہ اس کے بعد کیا ہونا چاہیے۔

اس نئے فیصلے کے باعث بے یقینی کی فضا پھر عود کر آئی، حوصلے پست ہو گئے۔ اور مجھے اس امر کا برملا اعتراف ہے

ر اردو کی تحریک اب کسی روشن مستقبل سے مایوس نظر آتی ہے۔ ۶۵-۱۹۶۴ء میں اردو ذریعۂ امتحان کے حق میں جو لہر اٹھی تھی وہ اب سرد پڑ چکی ہے، کیونکہ طلبہ یہ سمجھ رہے ہیں کہ پاکستان میں معاش و کاروبار اور کلچر کی حد تک انگریزی ہی کا سکہ چلتا رہے گا۔

اس سلسلے میں ایک عجیب و غریب بلکہ مضحکہ خیز قدم پاکستان رائٹرز گلڈ نے یوں اٹھایا کہ انگریزی کو پاکستان کی ملکی زبانوں کے زمرے میں جگہ دے کر اپنے انتخابات میں اس کے لیے بھی نشست رکھ دی۔ اس کا مطلب بجز اس کے کیا ہے کہ کل اگر اس ملک کے اینگلو محمڈن لوگ انگریزی کو سارے ملک کی سرکاری (بلکہ قومی) زبان قرار دینا چاہیں تو اس کے لیے یہ قانونی حجت موجود ہوگی کہ گلڈ کی شریعت اسے ایک ملکی زبان قرار دے چکی ہے اور اس کے خلاف کوئی احتجاج نہیں ہوا اور چونکہ موجودہ مسلمانوں کی قدرِ اوّل ہے اس لیے اسے سرکاری زبان بنا دینے کے بعد فیہما منافع للناس کی گردان ہوگی اور سب سر اس کے سامنے جھک جائیں گے اور ہر زبان اس کی تعریف میں رطب اللسان ہو جائے گی۔

معلوم نہیں رائٹرز گلڈ کی اس حرکت کے خلاف آپ کا ردِّ عمل کیا ہوگا مگر میں اس پر شدید احتجاج کرتا ہوں۔

کاروبار میں بھی عمومی طور پر اردو کا رواج کم ہو رہا ہے۔ اشتہار کی زبان انگریزی بنتی جا رہی ہے، اردو کا دائرہ مجالس میں بھی سکڑتا جا رہا ہے۔ لوگ پھر انگریزی میں بات کر کے فخر محسوس کرنے لگے ہیں۔ بورژوائی طبقوں نے ڈیڈی، آنٹی، ممی، انکل، کزن کو پہلے سے زیادہ مقبول بنا دیا ہے۔ چنانچہ اب عوام کا وہ حصہ جو درمیانی طبقے میں شامل ہونے کی ہوس رکھتا ہے خصوصاً خواتین غلامی کے ان زیوروں کو استعمال کر کے اترانی پھرتی ہیں، سینما والے انگریزی میں منظرنامے لکھتے ہیں اور عوام کی خدمت ناحق ادا کرنے کا اعلان فرماتے ہیں، اور جناب یا مہربان کے بجائے اب تانگے والا بھی "سر" کہہ کر سواریوں کا دل خوش کرتا ہے۔ اور اسلام کی تبلیغ کے لیے تو یہ عذر واقعی ناقابلِ تردید ہے کہ انگریزی میں لکھنے اور بولنے میں پاکستان کے اندر بھی اسلام کی بہتر تبلیغ ہو سکتی ہے اور اس کا میں بھی قائل ہوں، کیونکہ میں جب کہیں ٹوٹی پھوٹی انگریزی میں بات کرتا ہوں تو یہاں کے سامعین اور عوام مجھے علم والا سمجھ کر مرعوب ہو جاتے ہیں۔

غرض اب پاکستان دوسرا کینیڈا یا نیوزی لینڈ یا آسٹریلیا بننا چاہتا ہے۔ اگرچہ یہ محض نقالی ہوگی۔ کیونکہ ابھی عزیزوں کو سڑک پر چلنے کے آداب بھی نہیں آتے، نہ بسوں پر سوار ہونے کا سلیقہ آیا ہے۔ اور یہ بھی ایک لحاظ سے اچھا ہے کہ بدتمیزی انگریزی میں ہوتی ہے مگر مجھے تو انگریزی کا یہ غلبہ بصورت بدتمیزی بھی گوارا نہیں۔

مجھے کوشش کے باوجود معلوم نہ ہو سکا کہ اس وقت بلوچستان اور صوبہ سرحد کے حکومتی دفتروں میں اردو کہاں تک استعمال ہوتی ہے یا سرکاری مجالس میں اس کی حیثیت کیا ہے؟ گمان غالب یہ ہے کہ ان صوبوں میں ایک سیاسی سٹریٹجی کی حد تک اردو کا نام ضرور لیا جاتا ہوگا لیکن اس سے آگے انگریزی ہی چلتی ہوگی۔ یا ممکن ہے کوئی من چلا یہ وائہ امان لے کر کبھی کبھار چند جملے اردو میں بھی لکھ لیتا ہو۔

ادھر پنجاب کی حالت یہ ہے کہ حکومت نے ایک سال کے اندر اندر مکمل طور پر دفتری زبان کی تبدیلی کا جو اعلان کیا تھا اس کے آثار دفتروں کی حد تک کہیں بھی نظر نہیں آتے۔ معمولی چھٹیوں کے جواب انگریزی میں آتے ہیں اور وہ سب

نے عذرات پھر دہرائے جا رہے ہیں جو ستائیس سال سے سننے میں آ رہے ہیں۔

آپ کو یاد ہوگا، دو سال قبل سابق وزیر اعلیٰ پنجاب ملک معراج خالد کے سامنے اسی جگہ اسی نوعیت کی سالانہ کانفرنس میں، میں نے ان عذرات کا خدشہ ظاہر کیا تھا جس کے جواب میں جناب ملک معراج خالد صاحب محترم نے فرمایا تھا۔ ہم بیوروکریسی کی سرگرمی نہ چلنے دیں گے۔ اور ایک سال کے اندر اندر ہر چھوٹے بڑے اہل کار کو مجبور کیا جائے گا کہ وہ خاص دائرے کو چھوڑ کر باقی کام اردو ہی میں کرے۔

پورے دو سال ہو چکے ہیں۔ عالی مقام گورنر صاحب پنجاب کا اردو کے بارے میں یہ فرمان گزٹ بھی ہو چکا ہے۔ اب سے یعنی ۷۲ء سے ایک سال کے اندر اندر حکومت پنجاب اور متعلقہ لوکل باڈیز کے دفاتر کی زبان حکماً اردو ہوگی۔ لیکن اب جو پوچھیے تو وہ سارے عذرات ایک ایک کر کے ہمارے منہ پر مارے جا رہے ہیں، اردو ٹائپ رائٹر میں موجود نہیں، ٹائپسٹ کم ہیں، اصطلاحات موجود نہیں، مرکز سے خط و کتابت اردو میں مشکل ہے، وغیرہ وغیرہ یہ پرانی لغویات ہیں جو ستائیس برس سے انگریزی کی محبت (اور بعض صورتوں میں) اردو کی دشمنی منہ سے اگلوا رہی ہے۔ اصل یہ ہے کہ انگریزی کا رعب دلوں کے اندر اس حد تک بیٹھ چکا ہے کہ اب اسے نفسیاتی بگاڑ کا درجہ حاصل ہے۔ اور عجز مایوسی یا عجز دعا کے کچھ نہیں رہا۔

اس ضمن میں، میں مجلس زبانِ دفتری پنجاب کا ذکر کیے بغیر نہیں رہ سکتا جس کے صدر جناب محمد حنیف رامے کی اردو کی سے خصوصی دلچسپی کا اعتراف کرنا میرا فرض ہے اور شاید اس تاریکی میں یہی ایک شعاعِ امید ہے جس سے کچھ اطمینان ہے ورنہ یہاں تو کُل تعریفیں واسطے انگریزی کے ہیں۔ ہمارا مرجع وہی اور مآب بھی وہی ہے۔ آپ صاحبوں کو معلوم ہے کہ زبانِ دفتری مدتوں سے موجود تھی مگر ۷۲ء میں حکومتِ پنجاب نے ایک اعلان کے ذریعے مجلسِ زبانِ دفتری کی تجدید کی۔ اس مجلس نے اس عرصے میں یہ اہم کام کیا ہے کہ دفتری اصطلاحات کی لغات پر نظر ثانی کر لی ہے اور اب چھپ کر دو تین ماہ کے اندر اندر سامنے آ جائے گی۔ مجلس نے کچھ اور سفارشات بھی کی ہیں جن کے تحت حکومتِ پنجاب لاہور میں اردو مختصر نویسوں اور ٹائپسٹوں کی حوصلہ افزائی کر رہی ہے۔ کچھ مشینیں بھی منگوائی گئی ہیں اور شاید تقسیم بھی ہو گئی ہیں لیکن امر واقعہ یہ ہے کہ بڑے افسروں نے ابھی تک اردو کو چھوا نا پسند نہیں کیا کیونکہ چٹھی کا جواب اردو میں آتا۔

ان تفصیلات سے یہ محسوس ہوتا ہے کہ حکومتِ پنجاب کا شعبۂ زبانِ دفتری بڑی سنجیدگی سے بنیادی کاموں کے طے کرنے میں ہوا ہے اور مستحق مبارک باد ہے۔ لیکن حکومتی سطح پر کوئی خاص آمادگی نظر نہیں آتی۔ اور ہر کوئی عبوری دَور کا تذکرہ کرتا ہے۔ ہم عبوری دَور کی اہمیت سے غافل نہیں، لیکن اس بات کی بہر حال ضرورت محسوس ہو رہی ہے کہ اس عبوری تیاری کے دَور کی کوئی حد ہونی چاہیے۔ اور سچ پوچھیے تو اسے عبوری دَور بھی اس لیے نہیں کہا جا سکتا ہے کہ عملی طور سے ابھی تک کام کا آغاز نہیں ہوا۔ جب آغاز ہی نہیں ہوا تو عبوری کن معنوں میں اسے کہہ سکتے ہیں۔ اکثر افسر اور اہل کار سمجھتے ہیں کہ انگریزی کبھی نہیں جائے گی لہٰذا عبوری کا آغاز بھی کبھی نہ ہوگا۔ میں نے دو سال قبل بھی عرض کیا تھا کہ جب تک

سیکشن آفیسروں کی سطح پر فوراً کام کا آغاز نہ ہوگا۔ دفتروں میں اردو کو کبھی جگہ نہیں ملے گی۔ اصطلاحات کا تو یونہی شو ہے۔ دفتروں میں ۸۰ فی صد کام غیر اصطلاحی ہے۔ اس کے لیے صرف انشا کی تربیت کی ضرورت ہے۔ لہٰذا حکومت اگر کچھ چاہتی ہے تو کسی مرحلے پر لازمی طور سے اردو کو نافذ کر دے۔ پھر قدرتی طور سے عبوری دور طے ہوتا رہے گا۔

عدالتوں کے بارے میں بھی رکاوٹ کوئی نہیں، لیکن وہی ذہن جو تعلیم اور دفتر میں سدِّ راہ ہے وہی عدالت میں بنا ہوا ہے۔ میں نے انڈونیشیا کے ایک جج سے دریافت کیا: کیا آپ اپنی زبان میں عدالتی کارروائی کرنے میں کوئی دقت محسوس کرتے ہیں؟ اس نے حیرت سے پوچھا، بھئی اپنی زبان میں دقت کیسی؟

میں نے سوچا، پاکستان میں تو دقّت ہر وقت سننے میں آتی رہتی ہے۔ میں نے بڑی تکلیف سے خود سے سوال کیا کیا پاکستانی واقعی کند ذہن قوم ہیں، یا اردو واقعی اتنی کم مایہ ہے کہ جادی، ملائی سے بھی گئی گزری ہے۔ افسوس کہ ان میں سے کوئی بات بھی درست نہیں۔ درست بات فقط یہ ہے کہ ہمارے حاکموں اور تعلیم یافتہ لوگوں کے دل ٹھیک نہیں۔ ایک بیماری ہے جسے جنونِ انگلش کہیے۔ جس کے باعث انھیں اپنی زبان حقیر بلکہ لغو معلوم ہوتی ہے۔ کچھ اسباب اور بھی ہیں جو دانشوری سے نکلتے ہیں۔ مگر میں دانشوروں سے کیا کہوں کہ یہ لوگ بہت نازک مزاج ہیں اور ملکی سالمیت کے بہت سے منصوبے انھوں نے ہاتھ میں لے رکھے ہیں۔

بعض لوگوں کو مجھ سے گلہ ہے کہ میں اب نرم اور ڈھیلا ہو گیا ہوں۔ مگر بزرگو، دوستو اور عزیزو، میں سعدیؒ کی نصیحتوں میں گہرا اعتقاد رکھتا ہوں۔ سعدی نے یہ دانش بتائی ہے: لقمان حکیم را پرسیدند حکمت از کہ آموختی، گفت از نابینایاں کہ تا جائے نہ بینند پاے نہ نہند۔ عزیزو اور دوستو ساری بات تو گنجائش کی ہے۔ جب کچھ کہنے کی گنجائش ہو تو میں اکڑ کر کیا کر لوں گا۔

مگر تعجب اس بات کا ہے کہ باقی ماندہ پاکستان کے کروڑوں آدمیوں میں کوئی ایک بھی ایسا نہیں نکلتا جو مجھے پیچھے چھوڑ جائے اور پرچم لے کر آگے بڑھ جائے تاکہ ان کوتاہیوں کی تلافی ہو جائے جو انجمن ترقی اردو سے سرزد ہو رہی ہیں۔

تو معلوم ہوا کہ قصّہ اب صرف باتوں تک یا گلے شکوے تک محدود ہے۔ دنیا میں ہر جگہ وراثت کا قانون جاری ہے۔ یعنی جب بوڑھے ڈھیلے پڑ جاتے ہیں تو نوجوان سامنے آیا کرتے ہیں۔ لیکن ہمارے ملک میں دولت کی وراثت کا قانون تو خوب چلتا ہے مگر فرض و خدمت کی وراثت کا سلسلہ بند ہے۔ پاکستان کے نوجوان شاید زیادہ اہم کاموں میں لگے ہوئے ہیں اور معاملہ گریڈ وغیرہ کا بھی ہے جس سے فرصت کسی کو نہیں۔ لیکن میں تو اسے محض سرد جذبات کہتا ہوں جس کے تحت سب لوگ دنیاداری میں لگ گئے ہیں۔ ورنہ اردو کا معاملہ ایسا تو نہ تھا کہ پاکستانی قوم اسے یوں نذرِ تغافل کر دیتی۔ سرسید سے لے کر قائداعظم تک سب کا متفقہ ارشاد یہی تھا کہ ہندو اردو کو بڑھنے نہیں دیتے۔ اب معلوم نہیں اس ملک میں ہندو پھر آ گئے ہیں کہ بڑھنے نہیں دیتے۔ یا ہمارے ذہن ہی ا[illegible] "ہندوائے"، گئے ہیں کہ ہمیں اردو سے کوئی دلچسپی نہیں رہی۔ بہرحال عزیزانِ من۔ مسئلۂ وراثت پر اچھی طرح غور کیجیے [illegible] اور کام [illegible]

سر کے دکھائیں۔

خواتین و حضرات! میری تلخ اور مایوسانہ گفتگو آپ کو پسند نہ آئے گی مگر میری درخواست ہے کہ آپ ٹھنڈے دل سے ان گزارشات پر غور کر کے کچھ ولولے کا اظہار کریں۔ یعنی گلہ کم کریں اور کام کے لیے آگے بڑھیں تب بات بنے گی۔ ورنہ آپ کی شکایت رنگین بھی ہو تو بے اثر ہی ہوگی۔ ان معروضات کے بعد میں ایک بار پھر سب حاضرین کرام کا شکریہ ادا کرتا ہوں اور جناب صدر صاحب سے خطاب کی درخواست کرتا ہوں۔

ڈاکٹر سید عبداللہ

جستجو اہلِ محبّت کی

(سرگودھا قومی زبان کانفرنس میں پڑھا گیا)

قومی زبان کانفرنس راولپنڈی میں صوبہ سرحد کے پختون نمائندوں نے اردو کے حق میں جس گرمجوشی سے آواز اٹھائی س سے میری ہمّت بڑھی اور میرے دل میں ولولہ پیدا ہوا کہ میں پاکستان کے باقی صوبوں اور علاقوں میں بھی اہلِ محبّت کی جستجو ردوں۔ ان اہلِ محبت کی، جو اس سلسلۂ مودّت کو مستحکم دیکھنا چاہتے ہیں جسے قیامِ پاکستان نے ایک خاص شکل دے کر ہماری نوبیت کی عمارت تعمیر کی ہے۔

اس جذبے سے میں نے بلوچستان، سندھ، پنجاب، سرحد اور آزاد کشمیر کے احباب سے طویل خط و کتابت کی۔

میں بڑے فخر اور جذبۂ مسرّت سے یہ اعلان کر رہا ہوں کہ میرے نیاز نامے کے جواب میں بالعموم محبت اور تودّد کے جذبات کا اظہار ہوا۔ یہ جواب نامے میری عزیز ترین متاع اور روحانی ورثہ ہیں۔ نہیں نہیں یہ پاکستانی قوم کی قلبی آوازیں ہیں جو صفحۂ قرطاس پر صدا بند ہو گئی ہیں۔ ان کا ہر ہر حرف شرافت کی تصویر اور ہر ہر لفظ نجابت کی تعبیر ہے۔

میں ان جواب ناموں کی سند پر یہ اعلان کرتا ہوں کہ پاکستان میں محبّت کرنے والے لوگوں کی اب بھی کثرت ہے۔ س ارضِ پاک میں لاتعداد لوگ ایسے موجود ہیں جنھیں محبّت کی زبان میں اگر پکارا جائے تو ان کے دل دھڑکتے ہیں۔ یہ نیک دل وگ ہر دعوت پر لبیک کہتے اور ہر تقاضے پر انا الموجود کی صدا دیتے ہیں۔

غرض میرے نیاز نامے کی بڑی پذیرائی ہوئی اور مجھے حوصلہ ہوا کہ میں محبّت کی تحریک کو اور آگے بڑھاؤں۔

قدرتاً آپ جاننا چاہیں گے کہ میں نے ان احباب کو کیا لکھا اور کیا کہا اور انھوں نے اس کے جواب میں کیا لکھا اور کیا کہا؟

مختصراً اتنی ہی بات ہے کہ میں نے دوستوں کو ایک روحانی ضرورت کی طرف متوجّہ کیا۔ میں نے کہا ہم مسلمان ہیں صدیوں پہلے کچھ لوگ باہر سے آئے، انھوں نے سوچنے کا ایک نیا اسلوب دیا۔ ان کی آواز پر مقامی لوگوں میں ایک روحانی تڑپ پیدا ہوئی۔ باہر سے آنے والوں اور ملک کے اندر جنم لینے والوں کے ملاپ سے ایک قوم وجود میں آئی جس کی سمت دوسروں سے جدا، جن کی غایتیں دوسروں سے مختلف تھیں۔ یہ نئی قوم خون اور رنگ و نسل کی رشتہ داری پر مبنی نہ تھی بلکہ اس کی

بنیادوں عقیدوں کی رشتہ داری پر تھی۔
تاریخ کے صدہا انقلابات کے بعد اب وہی قوم اپنی جد وجہد سے حاصل کیے ہوئے ملک پاکستان میں اپنی ہستی کو محفوظ کیے ہوئے ہے۔
ضرورت اس امر کی ہے کہ اس ہستی کو محفوظ رکھا جائے اور اس کی ہیئتِ اجتماعی کو بکھرنے نہ دیا جائے۔
اس ضرورت کو صرف محبّت پورا کر سکتی ہے جس کے ذریعے ہم رشتہ داری کے اس شعور کو زندہ رکھ سکتے ہیں جو صدیوں پہلے ہم میں پیدا ہوا تھا۔
اور غور کیجیے تو پاکستان بھی اسی شعور سے قائم ہوا تھا۔ اور آگے بھی اگر اس کے مقدّر میں تابانی اور روشنی ہے تو امکان اس کا اسی شعور کی بدولت ہے۔
میں نے احباب سے کہا آئیے ہم مل کر ان تنازعات کا تجزیہ کریں جو نفرتوں کی پیداوار اور مزید نفرتوں کا منبع ہیں۔
مل بیٹھنا اور مل کر سوچنا بکھر کر چلنے اور فاصلے اور خلیجیں حائل کرنے کے مقابلے میں زیادہ امید افزا طریقہ ہے۔ اور یہ تو ظاہر ہی ہے کہ محبّت نفرت کے مقابلے میں کچھ زیادہ صحت افزا سلسلۂ عمل ہے۔
ہم دیکھتے ہیں ہمارے ملک میں نفرتوں کی توسیع کے کئی کارخانے قائم ہیں جن میں وہ نعرے اور دلیلیں مینوفیکچر کی جاتی ہیں جن سے تفریق کی خلیجیں وسیع کی جاتی ہیں اور جدائی کرانے کے تعویذ تراشے جاتے ہیں۔ اس حد تک کہ اگر کسی کے بس میں ہو تو رنگِ گل سے بوئے گل کو جدا کر کے دکھا دے اور گوشت کے ناخن کو جدا کرنے کا عمل تو اس وقت بھی زوروں پر ہے۔
ان کئی کارخانوں میں ایک کارخانہ زبان کی اسٹیم سے چلتا ہے۔ بالکل سیدھا سادہ زبان کا مسئلہ سیاست اور مفادات کی خاطر پیچیدہ بنا دیا گیا ہے۔ اس پر اغراض سے منقطع کر کے کبھی غور نہیں کیا جاتا۔ میں نے احباب کو دعوت دی کہ وہ مجھے ان شکوک و مشکلات سے آگاہ کریں جو اردو۔ قومی زبان کی مقبولیت میں حارج ہیں یا رابطے کا یہ وسیلہ ان کی وجہ سے غیر موثر ہے۔
مجھے خوشی ہے کہ احباب نے قومی زبان سے اپنی محبت اور اس پر اپنے اعتماد کا کھل کر اظہار کیا۔ اگرچہ انھوں نے بعض گروہوں کے طرزِ عمل کا شکوہ بھی کیا جن کی روش سے اردو کے خلاف بدظنی و بے اعتمادی پیدا ہوتی ہے۔
میں نے ان پر واضح کیا کہ اردو کسی ایک گروہ یا فرقے کی زبان نہیں، یہ تو سب گروہوں اور سب خطّوں کی زبان ہے۔ اور یہی اس کی فضیلت یا ترجیح ہے۔
میں نے انھیں یہ بھی یاد دلایا کہ ملک میں سب سے بڑا لسانی مسئلہ یہ ہے کہ انگریزی زبان بلا جواز تمام کاروبارِ زندگی پر غالب ہے، یہ اس کا ناجائز غلبہ ہے جس نے ہمارے یہاں لسانی مسئلہ پیدا کیا ہوا ہے۔
ہوشیاری دیکھیے کہ حقوق کا غصب تو انگریزی نے کر رکھا ہے مگر پاکستانی زبانیں اپنی ناوانی سے آپس میں دست و گریباں ہیں۔
پاکستانی زبانوں کی سادگی دیکھیے کہ ان کے پلیٹ فارم سے آپس میں ایک دوسرے کے خلاف صدائے مخاصمت

بلند ہوتی رہتی ہے لیکن انگریزی کے متعلق چشم پوشی بلکہ قدرے الفت کا انداز ہے۔
میں نے عرض کیا پہلے انگریزی کی بے جا بالادستی کو مل کر ختم کریں۔ اس کے بعد آپ خود دیکھ لیں گے کہ پاکستانی زبانوں میں قابلِ رشک مفاہمت خود بخود پیدا ہو جائے گی۔ مجھے خوشی ہے کہ اکثر احباب نے اس خیال سے اتفاق کیا۔
میں یہاں یہ عرض کیے بغیر نہیں رہ سکتا کہ حکومتی سطح پر جتنی بھی لسانی کانفرنسیں ہوتی ہیں ان کے صرف دو مقصد ہوتے ہیں، اوّل یہ کہ پاکستانی زبانوں کو آپس میں لڑاؤ، دوم یہ کہ اس لڑائی کے سائے میں انگریزی کو محفوظ کرتے جاؤ۔
میں نے احباب سے عرض کیا، مناسب یہی ہے کہ یہ معاملہ صوبوں کی پاکستانی زبانوں والے اپنے ہاتھ میں لے لیں خود ہی فیصلہ کر دیں کہ وہ قومی زبان کو کیا مقام دینا چاہتے ہیں۔ اس کے دائرۂ استعمال کے متعلق بھی وہ خود ہی فیصلہ فرمائیں مگر یہ فیصلہ ایسا ہو جو قومی زبان کی شان کے شایاں اور مقاصد و مصالحِ ملکی کے مطابق ہو۔
ان دو شرطوں کے ساتھ جو فیصلہ بھی آپ کریں گے قومی زبان میں دلچسپی رکھنے والے اسے بخوشی منظور کر لیں گے۔
یہ تو ٹھیک نہیں کہ انگریزی کے خلاف تو ایک لفظ بھی نہ کہا جائے اور اردو کے خلاف بدگمانی کی فضا پیدا کرنے [illegible]
اس سلسلے میں حکومتی ذرائع کی طرف سے بعض مضحکہ خیز تجویزیں بھی دیکھنے میں آئی ہیں مثلاً:
کہا گیا ہے کہ اردو میں دوسری پاکستانی زبانوں کے الفاظ زبردستی داخل کرو۔
پہلے تو یہ زبانوں کے فطری قانون کے خلاف ہے۔ دنیا میں کبھی ایسا نہیں ہوا۔ لیکن چلیے، ہم اردو کی موجودہ یتیمی کے پیشِ نظر یہ مان بھی لیں تو اس ادخال کا طریقۂ کار کیا ہوگا؟ اگر یہ ادخال ہر صوبے میں ہوگا تو ظاہر ہے کہ اس کے لیے ہر کا کوٹہ مقرر کرنا ہوگا۔ فرض کیجیے، ہم سب زبانوں کے پچاس فی صد الفاظ اردو میں زبردستی داخل کرنے کا فیصلہ کر لیں تو بربنائے آبادی تناسب یوں ہوگا:

پنجابی	....	۲۵
بلوچی / براہوی	....	۱۰
سندھی	....	۱۰
پشتو	....	۵
		۵۰

اس تشکیل پر آپ خود ہی غور فرمائیے کہ کیا اس پر سب صوبوں کا اتفاق ہو سکے گا؟ برادرانِ عزیز، زبان کا اپنا ایک قانون ہے یہ منصوبوں اور سرکاری ہنر جمہروں کے فرامین سے تصرّف قبول نہیں کرتی بلکہ زندگی کے عمل، معاشی ضرورتوں اور میل جول کی صورتوں سے اثر پذیر ہوتی ہے۔
میں سرکاری لوگوں سے عرض کرتا ہوں، آپ بے صبری کیوں کرتے ہیں، اردو سب زبانوں کے الفاظ کو خود بخود قبول کرتی جائے گی۔ اگر مختلف صوبوں کے رہنے والے اس میں لکھتے رہیں گے اور اس کا استعمال کرتے رہیں گے تو ہر خطّے کے الفاظ

اور محاورے اور لہجے اس میں بے ساختہ آجائیں گے۔ یہی پہلے بھی ہوا تھا۔ چنانچہ دہلی، لکھنؤ، بہار، حیدرآباد، پنجاب، ہر جگہ کا الگ الگ محاورہ قائم ہو گیا اور زبان کے مشترک عنصر کو بھی گزند نہ پہنچا۔ یہی اب بھی ہوگا۔

یہ زبردستی ادخال والی بات تو بڑی حماقت ہے یا سنگین شرارت!

بھائی اگر کچھ داخل کرنا ہے تو انگریزی میں داخل کرو۔ باقی کو معاف کر دو۔ پھر یہ کیوں نہیں کہتے کہ پاکستانی میں سے ہر ایک میں اردو الفاظ و تراکیب کی ایک خاص تعداد داخل کرو تاکہ لسانی سطح پر اشتراک و وحدت کے امکا زیادہ ہو جائیں۔

لیکن میں اس پر زور اس لیے نہیں دیتا کہ اردو کسی شور و شغب کے بغیر ان زبانوں میں داخل ہو رہی ہے۔ او کوئی کہے کہ اردو کو زبردستی داخل کرو تو میں اس کی بھی مخالفت کروں گا۔ یہ تو ایک بے ساختہ عمل ہے جو خود بخود ہو رہا

مجھے یہاں کچھ انگریزی کے بارے میں بھی کہنا ہے۔ یہ اچھی طرح ذہن نشیں کر لیجیے کہ ہم لوگ انگریزی کے مطو اور اس کے جائز استعمال کے خصوصاً علوم میں ہرگز مخالف نہیں۔ ہم تو اس کی بالادستی کے مخالف ہیں۔ اس کے ذریعۂ تعلیم زبانِ دفتری بنانے کے مخالف ہیں۔ فقط۔ یا پھر اسے معاشرتی اوڑھنا بچھونا بنانے کے بھی، کہ یہ قومی انا کی توہین۔

اور ایک آدھ بات ان دوستوں اور عزیزوں کے لیے بھی لازمی ہے جو ماحول کی تبدیلی کے ساتھ محاورے کی تبدی قانونِ فطری سے ناآشنا ہیں۔

میں انھیں یہی مشورہ دوں گا کہ وہ اپنے رویّے میں لچک پیدا کریں اور فطرت کے اس قانون کا احترام کریں کہ مح بدلتا رہتا ہے۔ اگرچہ میں یہ بھی محسوس کرتا ہوں کہ یہ بھی انگریزی والوں کی طرف سے پھیلایا ہوا ایک وسوسہ ہے جو تو دلو دماغوں میں گھر کر جاتا ہے کیونکہ اس کا ایک سیاسی و مفاداتی پس منظر بھی ہے۔

میرے خیال میں مناسب یہی ہے کہ ہم اسے ایک نفسیاتی مسئلہ قرار دے کر اس کا علاج محبّت ہی سے کریں خ اور نفرت کا علاج خود پرستی اور نفرت سے نہیں ہو سکتا۔ تعجب یہ ہے کہ مسلک محبّت سے یہ روگردانی تعلیم یافتہ طبقو طرف سے ہو رہی ہے۔ اگر یہ ذہنی حالت جاہلوں کی ہوتی تو میں کچھ تجویز کرتا، لیکن جب اہلِ علم ہی بے خبر بن جائیں تو ع

مژدہ باد اے مرگ عیسیٰ آپ ہی بیمار ہے

میرا خیال ہے کہ میں ضرورت سے زیادہ کہہ چکا ہوں۔ میری درخواست اسی قدر ہے کہ اہلِ سیاست اور اہلِ مفادات اپنے میدان میں جو کچھ کرتا چاہیں کرتے رہیں۔ لیکن اے اہلِ علم، آپ ــ اے اہل علم، آپ ــ اپنے سب معاملات کا آغاز اور تودّد سے کیجیے تاکہ یہ ملک، یہ وطنِ عزیز نفرتوں کی آگ سے بچ جائے، محفوظ رہے!

میری رائے میں پاکستانی زبانوں کا مسئلہ چنداں مشکل نہیں۔ اس سلسلے میں میرے پاس مفاہمت کی بہت سی تج ہیں۔ لیکن یہ تجویزیں کہاں پیش کی جائیں، کس کو دکھائی جائیں! وہ لوگ جو از روئے عقیدہ علیحدگی کے قائل ہیں انھیں کی تجویزوں سے کیا دلچسپی ہو سکتی ہے؟ وہ لوگ جو اردو کو ایک غیر زبان کہتے ہیں ان سے یہ توقع کہ وہ اردو اور پا زبانوں کے روابط کے بارے میں انصاف سے کام لیں گے، خیال عبث ہے۔ وہ لوگ جو انگریزی پر مرمٹے ہیں وہ اس

خیر سگالی کو کیوں پسند کریں گے ؟

بہر حال مفاہمت کی ضرورت ہے ۔ اور اگر کچھ وطن دوست اور مخلص اہلِ محبت ہمت کر کے نفرت اور تفرقہ پسندی کے خلاف اٹھ کھڑے ہوں تو پاکستان کا لسانی مسئلہ ایک لمحے میں ختم ہو سکتا ہے ۔ میں بہر حال اس خدمت کے لیے حاضر ہوں ، صدق دل سے حاضر ہوں ۔

ڈاکٹر سید عبداللہ

عصری ادب میں یاس اور جھنجلاہٹ کیوں؟

(اوراق کے سوال کا جواب)

سوال کی طویل اور پیچیدہ عبارت میں اصل مسئلہ موجودہ اردو ادب کی قنوطیت کا ہے۔ سوال میں اس امر پر تعجب کا اظہار کیا گیا ہے کہ غزل گو بزرگوں کی یاسیت (= قنوطیت) پر اعتراض کرنے والی نئی نسل خود بھی خاص طور پر رجائیت پسند نہیں۔ اور اب صرف غیر ترقی پسند ہی قنوطی نہیں بلکہ وہ بھی قنوطی ہیں جو خود کو ترقی پسند یا رجائیت پسند کہتے ہیں۔ ہر چند کہ وہ اپنے بزرگوں کے تتبع میں نہیں کر رہے ہیں۔ تاہم مغربی یاسیت پسندوں کی پیروی میں قنوط ہی کا شکار ہیں۔

سائل کی نظر میں یہ یک طرفہ تماشا ہے کہ اپنے قنوط پسند بزرگوں کو تو برا بھلا کہا جاتا ہے لیکن وہی قنوط جب مغرب کے بازاروں سے آتی ہے تو شہد و شکر سمجھ لی جاتی ہے۔

اور سائل کا یہ تعجب کچھ بے جا بھی نہیں ــــ!

لیکن میں اس بحث میں پڑنے سے پہلے یہ فیصلہ کر لینا ضروری سمجھتا ہوں کہ غم کے متعلق ہمارے اوپر بزرگوں کے رویّے و قنوطیت کہا بھی جا سکتا ہے یا نہیں۔ کیونکہ کچھ دلیلیں اس مفروضے کے خلاف بھی ہیں۔

قنوطیت ایک فکر بھی ہے اور مزاج بھی۔ بہ حیثیت اندازِ فکر، یہ اس تصوّر یا عقیدے کا نام ہے کہ موجودہ دنیا بدترین ہے اور رہنے کے قابل نہیں، اس کی بنیاد شر پر رکھی گئی ہے اور انسان بھی بالطبع شر ہے اور اس سے خیر کی توقع نہیں۔ اس کے علاوہ انسان جس سکرات میں ہے کوئی ماورائی ہستی اس سے نجات دلانے والی نہیں۔ یہ تو رہا تصوّر، لیکن بعض انسانوں کے مزاج میں مختلف جسمانی اور موروثی اسباب کے زیرِ اثر یاس کا عنصر غالب ہوتا ہے جو زندگی کے تاریک رخ پر نظر رکھتا ہے۔ یہ یاس و قنوط کی کیفیت پیدا کرتا ہے۔ غم کی ایک عام کیفیت بھی ہے جس سے درجہ بدرجہ ہر فرد بشر متاثر ہوتا ہے۔ اس عام یاس کو ہم قنوطیت نہیں کہیں گے کیونکہ قنوطیت کی اصطلاح میں مزاج کے علاوہ عقیدہ یا تصوّر بھی شامل ہے۔

قنوطیت فکری طور پر تاریخ کے ہر دور میں رونمائی کرتی آتی ہے۔ لیکن اس منظم فلسفے کی حیثیت شوپن ہارے نے دی جس نے اپنی کتاب "THE WORLD AS WILL AND IDEA" میں انسانی زندگی میں شر کے ناگزیر عنصر کا مفصّل تجزیہ کیا ہے۔

جہاں تک میں اردو اور فارسی شاعری کا مطالعہ کر سکا ہوں، مجھے اس خیال کے قبول کرتے میں ہمیشہ تامل رہا ہے کہ ہمارے شعرا (خصوصاً غزل گو) ان مخصوص معنوں میں قنوطی تھے جن کا ذکر اوپر ہوا ہے۔

بلاشبہ ان میں بہت سوں کے کلام میں شدید غم کے ساتھ یاس کا احساس بھی مل جاتا ہے۔ لیکن فانی بدایونی کے سوا کسی اور بڑے شاعر کو قنوطیت پسند کہنے کو جی نہیں چاہتا کیونکہ ساری وقتی ناامیدی کے باوجود یہ سب شعرا بالآخر ایک ایسے "ماورائی سہارے" کو تسلیم کرتے لگتے ہیں جس کے دامن سے وابستہ ہو کر انھیں وہ اطمینان مل جاتا ہے جسے امید کا اطمینان کہنا چاہیے۔

بات یہ ہے کہ ہمارے شعرائے قدیم کی ناامیدی ناقابلِ تلافی نہ تھی، ان کے پاس اس کا مداوا تھا جس کی وجہ سے کسی نہ کسی مرحلے پر وہ امید کی پناہ گاہ میں پہنچ جاتے تھے اور زندگی کا استقامت کے ساتھ مقابلہ کرتے تھے۔ یہ ہو سکتا ہے کہ ان میں سے بعض نے یہ لکھا ہو کہ اس کائنات کی اساس شر پر رکھی گئی ہے۔ ممکن ہے بعض نے کسی خاص موڈ کے تحت یہ بھی کہا ہو کہ انسان کی فطرت بد ہے اور زندگی کا انجام بجز خسران کچھ نہیں۔ لیکن واقعہ یہ ہے کہ کوئی قابلِ ذکر شاعر اتنی دور نہیں گیا کہ "آخری سہارے" ہی کا انکار کر بیٹھا ہو۔ ہو سکتا ہے کہ دہر یا فلک یا سپہر واثر گون کے نام سے جور و ستم کا گلہ کیا ہو مگر دہر اور فلک کو قضا و قدر کے کارندے کی حیثیت سے دیکھ کر بھی آگے کی کسی برتر ہستی کا تصوّر کبھی اوجھل نہیں ہوا۔

پھر ان تصوّرات پر بھی نظر ڈالیے جن کے اندر زندگی کے ستم ہائے بے کراں سے بچنے کے لیے پناہ گاہیں موجود تھیں۔ تسلیم و رضا، وحدت الوجود، حکمت و رحمت، توبہ، مابعد الموت، جزا و سزا ــــ یہ سب تصوّرات قنوطیت کے خلاف سپر کا کام دیتے تھے۔

یہ صحیح ہے کہ جبریت کا تصوّر ہماری شاعری میں عام ہے مگر اس کے ساتھ ہی راضی بہ رضا ہونے کا تصوّر بھی ہے ــ ــ اور کون نہیں جانتا کہ یہ تصوّر اپنی حد تک حیات بخش ہی تھا، اس سے زندہ رہنے کا حوصلہ پیدا ہوتا تھا۔ میں اسے فرار یا گریز نہیں کہوں گا بلکہ مقاومتِ حیات کے لیے خود کو آمادہ رکھنے کی ایک حکمت کہوں گا۔ ہماری شاعری میں دنیا کی بے ثباتی کا غم بھی بہت ہے، مگر اس فنا کے ساتھ بقا کا پیوند تلافی ہی کی ایک صورت ہے۔

عربی شاعری کی عمومی لے توانا ہے۔ خصوصاً صوفیانہ شاعری میں۔ ابن العربی کی ترجمان الاشواق، اور ان کے معتقد ابن الفارض کا قصیدہ تائیہ عربی شاعری میں امید اور ذوق و شوق کا ایک مستقل سرچشمہ ہے۔ یہ چاشنی ایک حد تک حافظ، نظیری اور جامی، مغربی اور عراقی میں بھی ہے۔ بلکہ بیدل کا کلام بھی طلسم شکست کے باوجود اس آگاہی سے لبریز ہے کہ شکست تعمیر کے عمل کا ایک حصّہ ہے۔ اگر یہ نہ ہوتا تو بیدل کے کلام میں طاؤس کیسے موجِ رنگ اُبھارتا، اور میرزا غالب بیدل سے کیسے مانوس ہوتے؟

میر اور غالب اردو شاعری میں (فانی سے پہلے) غم کے سب سے بڑے ترجمان تھے۔ مگر یہ میر ہی تھا جس نے دنیا سے مایوس ہو کر بھی آخری سہارے کو فراموش نہیں کیا:

میر بندوں سے کام کب نکلا　　　　مانگنا ہے جو کچھ خدا سے مانگ

اور یہ غالب ہی تھا جس نے کہا تھا :

رحمت اگر قبول کرے کیا بعید ہے ۔۔۔ شرمندگی سے عذر نہ کرنا گناہ کا

خواجہ میر درد، مصحفی، آتش ۔۔۔، دکن کے شعرا، لکھنؤ کے شاعروں کی اکثریت، سب کے ہاں ایک نوائے اُمید سنائی دیتی ہے ۔ باقی رہی داستان و حکایت، سو ایسے ادب کی رومانیت اور بالعموم ایک نشیدِ نشاط ہی ہے ۔ سحر البیان ہو یا گلزارِ نسیم، ایک ہی رنگ میں ہیں ۔ البتہ زہرِ عشق ہے مگر وہ استثنا ہے ۔

غرض اردو شاعری میں عقل کی پاسبانی مسلسل نہ بھی رہی ہو رحمت کا سایہ ہمیشہ سر پر رہا ۔ جس کے نتیجے میں ہمارے شعرا اپنے آپ کو مجتمع رکھنے میں کامیاب ہوئے اور ذات کے تصادم کو قنوطیت کی شکل اختیار نہیں کرنے دی ۔

دراصل جدید اردو شاعری (ادب) میں مذکورہ بالا معنوں میں قنوطیت کی بیماری مغرب سے آئی ہے ۔ اور یہ نتیجہ ہے اس ذہن کا جو زندگی کو جزواً جزواً دیکھنے کا عادی ہو چکا ہے ۔ یہ ذہن کل پر نظر نہیں رکھتا جز پرست ہے، وہ کل کو ریزہ ریزہ کر کے ہر جز کو الگ سمجھ کر اور اسے مستقل حقیقت کہہ کر اسی کا ہو رہتا ہے اور سالم حقیقت کے باقی اجزا سے آنکھیں بند کر لیتا ہے یا خارجی اور باطنی حقیقتوں کے درمیان لڑائی کرا دیتا ہے ۔ چنانچہ مادہ و روح، حواس و وجدان، شعور و لاشعور جیسے حقائق مغربی مفکر کی نظر میں ایک مجتمع اور سالم حقیقت کے طور پر بہت کم آتے ہیں ۔ لہٰذا ان کے مابین ہر وقت معرکۂ کارزار گرم رہتا ہے ۔ اس سے تصادم، آویزش، داخلی کرب اور بالآخر قنوطیت اُبھرتی ہے ۔ مغرب کی اس جزویت پسندی اور یک طرفہ ذہنیت کا نقطۂ آغاز یہ تھا کہ انسان خود اپنے لیے کافی ہے اسے کسی سہارے کی ضرورت نہیں ۔ یہ انسان، خدا اور کائنات کے درمیان پہلی تفریق تھی ۔

اس تفریق کے تحت اعلان ہوا کہ وہ سارے نظام جو ماورائی سہاروں پر زور دیتے ہیں، باطل اور بیکار ہیں ۔۔۔ افسوس ہے کہ انسان کا یہ پندار دیر تک نہ چل سکا ۔ مغرب کی جزویت پسندی نے اسے اس قابل نہ چھوڑا کہ وہ سالم حقیقت پر غور کرتا ۔۔۔ ناک کی سیدھ میں من کی موج کے ساتھ بڑھتا رہا اور نارسائی کی چٹانوں سے ٹکرا کر بالکل مخالف سمت میں اسی زور سے بھاگنے لگا اور پہلی سمت کا بالکل منکر ہو کر کسی نئی چٹان سے جا ٹکرایا ۔۔۔، وہ نفسِ مطمئنہ کی رمز سے ناآشنا ہو کر بھٹکتا رہا اور اب تک بھٹک رہا ہے ۔ روز روز کی اس تبدیلی اور خود پسندی نے اسے کل حقیقت کا انکاری بنا دیا ۔

ڈارون نے حیاتیات کی اساس ارتقا پر رکھ کر ثابت کیا کہ انسان اصلاً حیوان ہے ۔۔۔، میکڈوگل کی نفسیات نے اس کی حیوانی جبلتوں پر زور دیا اور فرائیڈ کی جنسی نفسیات نے انسان کو حیوان سے بھی گرا دیا اور لاشعور کے نیم سائنسی حقائق کی بنا پر شعور کے خلاف بدظنی پیدا کر دی ۔ فرائیڈ نے انسان کو صاحبِ ارادہ فاعل مختار ثابت کرنے کے بجائے دبی ہوئی جنسی شورشوں کا غلام اور تابع مجبور بنا دیا ۔۔۔ اور آخر میں بے خدا وجودی آئے جن کی نظر میں وجود بے معنی لایعنی ٹھہرا ۔

دوسری طرف خارجیت پسندوں نے شورش اٹھائی اور کہا کہ مادہ ہی سب کچھ ہے ۔ حواس پسندوں نے شور مچایا

واس ہی وجود کا دوسرا نام ہے۔ انسان کا سب سے بڑا مسئلہ جسم ہے، اس کے سوا کچھ نہیں۔ اب زندگی جسمانی تسکین معاش کی جدوجہد بن گئی۔

اتنے میں مشین نے انسان کی جگہ لینی شروع کر دی۔ صنعتی عروج نے انسان اور مشین میں تصادم پیدا کیا اور کشمکش ایک نئی صورت پیدا ہو گئی جس نے پہلے بے اطمینانی و ناامیدی، اس کے بعد پیکار و کشاکش، اور اب آخر میں تخریب جنم دیا

صنعتی زندگی میں ہجوم نے فرد کو بے دخل کر دیا۔ اب فرد اپنی ذات کی تلاش میں ہے، خستہ و درماندہ۔ اس کے رکی دنیا شعور و لاشعور کی پیکار میں پس رہی ہے۔ اور باہر کی دنیا ہجوم میں گم، وہ پیٹ پر پتھر باندھے خراب حال ہے۔ اب ادب جھوٹے سہاروں سے اسے بہلا رہے ہیں۔ اب سب سے موثر مداوا جنس ہے، مگر عورت خود جنسی زندگی کے عمل میں پریشان ہے۔ تہذیب نے جنس کو کھلونا بنا کر، تجارتی اشتہار بنا کر رکھ دیا ہے اس طرح ہر مرد و زن پریشان حال ہے اور ادیب (بلکہ اہلِ فن بھی) اس کی پریشانیوں میں مزید اضافہ کر رہے ہیں۔ اس صورتِ حال کا نتیجہ وہ قنوطیت ہے جو یورپ و امریکہ کے ادیب میں عام ہے۔

اردو ادب نے یہ سب اثرات قبول کیے ہیں۔ یہ اثرات جملہ مغربی ادیبوں سے بالواسطہ یا براہِ راست آئے ہیں۔ انگریزی چونکہ رے ملک میں قریبی رابطے کا درجہ رکھتی تھی اس لیے اس سے یا اس کے ذریعے سے استفادہ ہوتا رہا۔ انگریزی ادب کی عقل پرستی فطرت پرستی نے ابتدا میں بہت متاثر کیا مگر رفتہ رفتہ انگریزی کے توسط سے دوسرے ادیبوں کی اہم تحریکیں اثر انداز ہوتی ں۔ اور سب سے زیادہ انیسویں صدی کے ربع آخر اور بیسویں صدی کے نصف اوّل کے فرانسیسی ادیب نے اردو کے یبوں کو مریضانہ رومانیت اور خود بیزاری کے راستے پر لگایا۔ حقیقت نگاری بھی آئی تو اپنے دعویٰ صداقت کے جود لغاوت اور بے قیدی پر مندر دیتی رہی جس کی انتہا یاس و افسردگی سے آملی۔ شاعری میں، ناول میں، افسانے ، ہر جگہ فرانسیسی ذوق غالب نظر آیا۔ یہاں تک کہ روسی حقیقت نگاری بھی اس کے سامنے دیر تک نہ چلی جس کے یجے میں ہر ماورائی سہارے کا انکار اور آخر میں خود سے اور ذات سے بیزاری اور ہر شے کی نفی ہمارے ادب میں آ داخل ہوئی۔

اثرات کی اس کہانی کو بودلیئر سے شروع کیجیے، جس کی کتاب "بدی کے پھول" میں بے اعتمادی کے کانٹے ہر طرف بکھرے ر آتے ہیں۔ میلارمے، ران بو، پال ولیری، آندرے ژید، پروست، بلکہ کامیو اور سارتر تک سبھی اپنی اپنی طاقت کے بالق قنوط، نامرادی اور محرومی کے دیوتا ثابت ہوتے ہیں۔ فرائیڈ (جو جرمن سائنسیت کا نمائندہ ہے) انسان شناسی ساتھ ساتھ حیوان آفرینی کا باعث ہوا۔ ان اثرات نے فرانسیسی ادب کی طرح اردو ادب کو بھی احساسِ محرومی و تنہائی یے مغلوب کیا۔ اور اس کے دیرپا اثرات اردو شعر و ادب اور ناول و افسانہ میں آ گئے۔

یہ درست ہے کہ ادب خصوصاً طالسطائے، دوستوفسکی، ترجنیف، گورکی اور چیخوف وغیرہ کی تحریروں نے اردو ب میں بلند تر اخلاقیت، انسانیت، حقیقت نگاری، جذبات کی صداقت اور زندگی کے یقین کی لہریں پیدا کیں، لیکن ترا کی سیاست نے جذبات پر مقصد کو مسلط کر کے اور صداقت کو انقلاب کے تابع بنا کر (اور اس کی بنیاد مارکس کی بے لاگ

مادیت پر رکھ کر) اُمید کے جملہ سہاروں کو منہدم کرنے میں خاص حصّہ لیا اور جب مارکسیت جنگ و جدل، انسانی فطرت سے بیزاری اور ہنگامہ، نفرت کی قائم مقام بن گئی تو اردو ادب میں بھی مارکسیت کے نیم تصوری آدرشوں کے بارے میں بے اطمینانی پیدا ہوگئی جس کے نتیجے میں پرانی فرانسیسی داخلیت اور قنوطیت کو پھر ابھرنے کا موقع مل گیا۔

یہ امر مدِ نظر رہے کہ شروع شروع میں ہمارے ملک کی ترقی پسند تحریک اپنے انتہا پسندانہ تصوّرات کو معتدل بنا کر آگے بڑھی۔ اس لیے آغاز میں اردو کے ترقی پسند ادیب میں ہلکی سی رومانیت اور دھیمی سی تصوّریت کا سہارا بھی لیا گیا۔ چنانچہ اس عبوری زمانے میں اسے کامیاب بنانے کے لیے پریم چند جیسے لوگوں سے فائدہ اٹھایا گیا، لیکن اس کے فوراً بعد یہ مصنوعی تصوّریت ختم ہوگئی اور ساتھ ہی تحریک بھی نیم جان ہو کر تقریباً مُردہ ہوگئی۔ اس لیے کہ یہ بھی یک رخ خارجیت پر زور دے کر داخلی تقاضوں کی منکر تھی۔ تاہم ترقی پسندی (اپنے منشور کی حد تک) ایک اثباتی تحریک تھی جس میں آئیڈیلزم کی ایک ہلکی سی لہر ضرور موجود تھی۔ کیونکہ یہ انسان کے کسی روشن مستقبل کی خوش خبری سناتی تھی اور ہرچند کہ اس میں کسی ماورائی سہارے کی گنجائش نہ تھی تاہم اسے اثبات پسند تحریک ہی کہا جا سکتا ہے۔ لیکن ہمارے ملک میں یہ دو وجہ سے کامیاب نہ ہو سکی۔ ایک اس وجہ سے کہ برِصغیر پاک و ہند کا سیاسی ماحول تبدیل ہوگیا جس کے باعث ان ممالک میں مارکسیت کے آدرشوں سے ملک کے سیاسی عقیدوں کا تصادم ہوگیا، دوسرا اس وجہ سے کہ تحریک کے بڑے نمائندے فعال ثابت نہ ہوئے ترمیم پسند یا عافیت پسند بن گئے۔ نتیجۃً کم عمر کے ادیبوں نے اعلانیہ سابقہ مسلک پر قائم رہنے کے بجائے پناہ گاہیں ڈھونڈ لیں۔ اب ان میں سے اکثر کسی دوسرے مسلک کی آڑ میں کچھ کہتے سنتے ہیں۔ براہ راست کچھ کہنے کا حوصلہ کسی میں نہیں۔

زیرِ بحث سوال میں یہ اشارہ موجود ہے کہ اب ترقی پسندی کے مدعی بھی مغرب کے قنوطیت زدہ ادیبوں کا سہارا لینے لگے ہیں۔ تو اس کا مطلب یہ ہے کہ بہت سے اشتراکی خیالات رکھنے والے لوگ علامت نگاری، وجودی داخلیت، فرانسیسی جدید رومانیت اور امریکہ کی شدید ترین تجربیت اور جنس زدگی کا سہارا لے رہے ہیں۔ حالانکہ یہ سہارے خالص اشتراکی تصوّراتِ ادب کی رو سے ناجائز ہیں ۔ ممکن ہے یہ وہ صورتِ حال ہو جسے انقلاب سے پہلے تیاری کا دَورِ حیلہ و تدبیر کہا جاتا ہے۔

میرا ذاتی تجزیہ یہ ہے کہ اردو کے بہت سے ادیبوں کے اظہارات (شاعری، ناول، افسانہ وغیرہ) جن کے ادبی مقام کا انکار نہیں کیا جا سکتا، پیروی مغرب کے تابع ہونے کی وجہ سے قوم و ملک کی سائیکی کو اپنے اندر پوری طرح جذب نہیں کر سکے۔ اگرچہ ملکی معاشرت کی عکاسی کرنے والے اور ملکی تہذیب کے مدّاح ادیب بھی پیدا ہوئے مگر ان کی تحریروں میں ماضی کے بارے میں کچھ تردد اور بے اطمینانی بھی ہے۔ ان کی نفسیات مشرق اور مغرب کے درمیان لٹکی ہوئی نظر آتی ہے۔ مغربی وہ بن نہیں سکتے اور مشرقی ہوتے ہیں انھیں ہچکچاہٹ ہے۔ نتیجہ یہ کہ ان کا ادب اپنی منفرد شخصیت پیدا کرنے میں ناکام رہتا ہے۔

میں اس امر کا انکار نہیں کرتا کہ ہمارے ملک میں بہت سے ادیب ایسے ہیں جن کا خلوص زرِ خالص کی مانند ہر داغ سے پاک ہے۔ اور ان کا فن بھی کمال کے معیاروں پر پورا اترتا نظر آتا ہے (اور اس میں شاعر، ناول نگار، افسانہ نگار،

سب شامل ہیں) لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ بہت سے ادیبوں کے ادب اور ملک کے قارئین کے مابین یک گونہ اجنبیت موجود ہے۔ تاہم اردو کے عمدہ ادب کے بارے میں مطمئن ہونے کے بھی کچھ اسباب ہیں، لیکن زیرِ بحث سوال میں سائل نے ایک خاص گروہ کا ذکر کیا ہے۔ میں نہیں کہہ سکتا کہ سائل کا مشارٌالیہ کون ہے۔ تاہم قرائن سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ اس کے مدِّنظر جدید تر اور جدید ترین نسل کے کچھ ادیب ہیں۔ لیکن مصیبت یہ ہے کہ مجھے ان ادیبوں کے ادب سے ہمیشہ ہمدردانہ دلچسپی رہی ہے جس کے باعث میں نے کبھی ان کے خلاف درشت الفاظ استعمال نہیں کیے۔ البتہ میرے دل میں یہ شکایت ضرور رہی ہے کہ ذاتی کرب کے وہ انداز جنھیں یہ لوگ اپنا رہے ہیں ان میں سے اکثر ان کے حقیقی ذاتی تجربے معلوم نہیں ہوتے محض اسالیبِ مغرب کا پرتو دکھائی دیتے ہیں ـــــ یا آپ اسے فیشن کہہ ڈالیے۔ وہ اسالیبِ فکر جو مغرب میں صنعتی عروج کے نتیجے میں پیدا ہوئے ہیں یہاں اس لیے کھوکھلے نظر آتے ہیں کہ ابھی ہمارا ملک صنعتی زندگی کو اپنا ہی نہیں سکا۔ لہٰذا اس ملک میں انسان کے یہ ذاتی تجربے نہیں بنے۔ بنا بریں، میں جدید ترین اردو شاعری کی موجودہ یاسیت کو محض سطح کی چیز سمجھتا ہوں۔ زیادہ سے زیادہ اسے ایک گروہ کی تبلیغی تحریروں کا درجہ حاصل ہے۔ ملک کے عام آدمی کے لیے یہ اندازِ فکر انوکھا اور ادیب اجنبی ہیں۔ میرا ذاتی خیال یہ ہے کہ ایسے چند ادیبوں کو چھوڑ کر اردو کا عام ادیب اجنبی سا ہو کر بھی اپنے اجتماعی لاشعور کے اعتبار سے اس تخصیت سے کاملاً منقطع نہیں ہوا جو اُمید کے ماورائی سہارے میں کامل یقین رکھتی تھی۔

میرے لیے یہ کہنا مشکل ہے کہ آپ کے مشارٌالیہ حلقۂ ادب کے یہ رجحانات مغربی "نیو نیچرلزم" کی نقل ہیں یا اس سرزمین کی قدیم اصنامی روح کی بیداری کا نتیجہ ہیں جو ایک ہزار سال کے بعد پھر جاگ اٹھی ہے، یا شاید اس مٹی کا اُبال ہے جس میں یہ ادیب بس رہے ہیں۔ اور چونکہ ماحول ابھی ان کے خیالات کی قدر نہیں کرتا اس لیے محرومی و تنہائی کا احساس ہمارے ان ادیبوں پر غالب ہے۔ بالکل ممکن ہے کہ ان میں سے بعض علامت نگاروں کا یہ شوق محض جدت طرازی ہو۔ ممکن ہے ڈرامائی طور پر خود کو محسوس کرانے کا شرارت بھرا ذوق بھی اس میں شامل ہو۔ اور یہ ایسی چھیڑ چھاڑ ہو جس کے ذریعے وہ پرانی نسل کو متوحش کرنا چاہتے ہوں۔

بہر حال ان جدید ترین ادیبوں کے بارے میں یہ سچ ہے کہ وہ ایک خاص قسم کی قنوطیت کے ترجمان ہیں جس کی اصل وجہ اپنے معاشرے سے ان کی بیزاری ہے۔

میں ذاتی طور پر اس گروہ سے خائف نہیں کیونکہ خواہ وہ اعتقاداً ترقی پسند ہوں یا غیر ترقی پسند، عوام کے لیے اجنبی ہیں بلکہ خود ادب کے تجربوں میں بھی وہ نقش نہیں بٹھا سکے جسے دیرپا کہا جا سکے۔

باقی رہا سائل کا یہ خدشہ کہ وہ اصلاً ترقی پسند ہیں اور غالباً کسی تدبیر کے تحت داخلیت پسندوں کا لبادہ اوڑھ رکھا ہے، سو اس میں ڈر کی کوئی بات نہیں کیونکہ اگر وہ سچے ترقی پسند ہیں تو ایک نہ ایک دن وہ مارکسیت کے انتہائی حصے کی طرف لوٹ آئیں گے۔ دراصل ہمارا ملک اب دیر تک تشکیکی اور قنوطی مسلکوں کا پابند نہیں رہ سکتا۔ کیونکہ خود امریکہ اور یورپ میں رجعت شروع ہو چکی ہے۔ مغربی انسان کا پندارِ خدائی ختم ہو گیا ہے۔ یورپ اب آئن اسٹائن اور میکس پلانک کی اضافیت اور ماورائی طبیعیات کی لپیٹ میں ہے ـــ اور اس کے زیرِ اثر اکثر تصورات زندگی بدل رہے ہیں۔ فرانس سے بڑھ کر لاشعور کا شناور اور خدا کا

منکر کون ہوگا، مگر وہاں مارسل جیسے مذہب پرست نے اپنی ماورائیت کے باوجود ایک مقام پیدا کرلیا ہے اور سارتر کی ساری وجودیت کے باوجود (بقول سائل) لوگ یبوست کی طرف پھر مائل ہو رہے ہیں۔ وہی امریکہ اور یورپ جو سائنسیت کا موطن تھا اب وہاں بھی پرانی سائنسیت سے بھاگ کر جدید نیچریت (NEO - NATURALISM) میں پناہ لے رہا ہے۔ تو کیا اس سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ اب ان بزعم خویش "ترقی یافتہ" مادی سائنسی معاشروں کو داخلی سہاروں کی ضرورت ستانے لگی ہے آڈن (AUDEN) نے اپنے مجموعہ THE AGE OF ANXIETY میں انھیں سہاروں کی ضرورت کا احساس دلایا ہے۔ اور آڈن کوئی پرانا آدمی نہیں، نیا ہی تو ہے۔

دراصل انسان ایک معجونِ مرکب ہے جس کی کل میں بہت سے اجزا ہیں۔ وہ صرف مادے سے زندہ نہیں رہ سکتا اسے عقل کی بھی ضرورت ہے۔ مگر صرف عقل بھی کافی نہیں، وجدان بھی درکار ہے جو ایک وسیع تر دنیا ہے جسے آپ MYTH کہہ ڈالیے۔ یہی MYTH مادی عوارض اور غیر متوقع حوادث میں غیر معمولی ماحول میں فرد کے شعور میں وسعت پیدا کر کے اسے مقاومت کا حوصلہ عطا کرتی ہے۔ میں ماورائی سہارے کو MYTH نہیں سمجھتا۔ تاہم MYTH ہو بھی انسانی تجربے میں کسی نہ کسی وقت ذریعۂ نجات و پیغامِ اُمید بن جاتی ہے۔ اور ماورائی سہارے تو میرے ایقان کے مطابق خلائی سفر سے بھی زیادہ یقینی ہے۔

اور آخر میں بیدلؔ کی مثنوی عرفان کا حوالہ دینا ضروری سمجھتا ہوں جس کی توانا فکر ہمیں یہ سمجھاتی ہے کہ ذرہ آفتاب تو نہیں مگر ذرے میں آفتاب کا ساطنطنہ ضرور ہے اور اس کی وجہ یہ ہے کہ ذرے اور آفتاب کے درمیان رحمت نے ایک پُل باندھ رکھا ہے ۔۔۔ زندگی کے لیے اس پُل کی واقعی ضرورت ہے!

QUALITY WHITE CEMENT FOR HIGH GRADE FINISHES

Depend on...

ANWARZAIB WHITE CEMENT
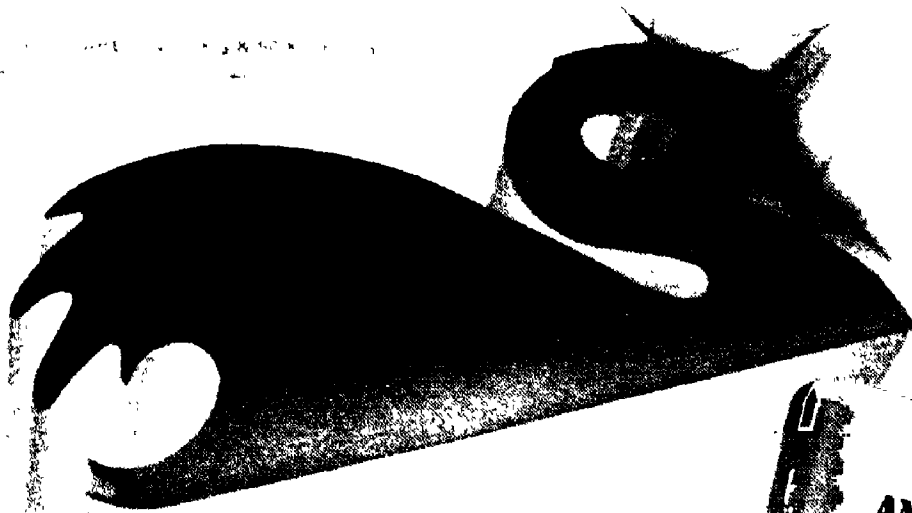
ڈاکٹر سید عبداللہ

ایک صدی کی ادبی تحریکیں

اردو میں نئی ادبی تحریکات کا آغاز سرسید کے زمانے سے ہوتا ہے۔ اس لیے شاید مناسب تر عنوان ہوتا "اردو کا نیا ادب"۔ مگر نیا ادب کی اصطلاح مقبولِ عام ہو جانے کے باوجود خود ایک تغیر پذیر اور کسی حد تک گمراہ کن اصطلاح ہے۔ اس لیے کہ نیا پن ایک ایسی سیالی کیفیت ہے جس کا ہر کل ہر آج سے مختلف ہو سکتا ہے۔ پس نیا پن کی یہ تماتی خصوصیت اس کو ناپائیدار اور عارضی بنائے رکھتی ہے۔ اس لیے نیا ادب اگر کچھ مفہوم رکھتا بھی ہو اور اس اصطلاح کو بعض مصلحتوں کی بنا پر گوارا کر بھی لیا جائے تب بھی اس کو اختیار کرنے میں بڑے بڑے خطرات کا سامنا کرنا پڑے گا تاہم اس کے قبولِ عام کے پیشِ نظر اس کے استعمال کے بغیر چارہ بھی نہیں۔

اردو میں سرسید کے بعد کا سارا ادب نیا ادب کہلاتا ہے اور یہ ادب اس لحاظ سے نیا ادب ہو بھی سکتا ہے کہ یہ ادب پرانے اور نئے زمانے میں ایک واضح خطِ فاصل کھینچتا ہے اور اس کو چند ایسی خصوصیات حاصل ہیں جن میں ایک خاص قسم کا نیا پن بھی پایا جاتا ہے۔ اگرچہ (جیسا کہ پہلے بیان ہوا) اس اصطلاح کے ابہام کا نتیجہ یہ نکلا ہے کہ نیا ادب کے بعد جدید ادب، جدید تر ادب اور جدید ترین ادب کی اصطلاحوں کی ضرورت بھی پڑ رہی ہے اور ایک وقت ایسا بھی آئے گا کہ یہ سب الفاظ بے کار اور مہمل ہو کر رہ جائیں گے۔ اور آج کا نیا ادب، کل کا پرانا ادب بن جائے گا۔ بہرحال میں اس اصطلاحی بحث سے احتراز کرتے ہوئے اس ادب کے شعور و ضمیر کا مختصر جائزہ لیتا ہوں جو سرسید کے زمانے سے لے کر آج تک پیدا ہو کر ذہن و فکر پر اثر انداز ہوتا رہا اور جس نے شعور کے واضح ترین نقوش اور غیر مبہم اور نمایاں راستے قائم کیے۔

کسی ادب میں جو شعور کارفرما ہوتا ہے اس کی تعین و تشخیص آسان بات نہیں۔ ادب کے باطن میں فکر و احساس کی جو روح جاری ہوتی ہے یہ اس تک پہنچنے کا سوال ہے۔ اور ظاہر ہے کہ یہ ایک ایسا ہمہ گیر سوال ہے جس کے حل کرنے میں ہیئت اور اسلوب، تکنیک اور لب و لہجہ، پیرایہ ہائے اظہار اور طریقہ ہائے بیان سے ہوتے ہوئے مزاج کی ان داخلی کیفیتوں تک پہنچنا پڑتا ہے جن کے مجموعی فعل و عمل سے کسی ادب کے ظاہری رنگ و روغن اور خارجی صحت مندی یا عدم صحت مندی کے نقوش قائم ہوتے ہیں۔

اور — پھر یہ بھی تو ہے کہ کسی ادب کی شعوری صحت مندی کی نشاندہی کے بھی تو کچھ اصول ہونے چاہئیں ورنہ ہر ادب

اپنی جگہ اپنی فکری اور شعوری صحت کا مدعی ہو سکتا ہے اور یہ کہہ سکتا ہے :

ع ہمشاد سایہ پرور ما از کہ کمتر است؟

یہ بحث بڑی پیچیدہ اور حوصلہ آزما ہے۔ مگر یہ تو واضح ہے کہ صحت مند ادب کی بڑی پہچان یہ ہے کہ اس کی فکری اور شعوری روح تندرست ہو اور اس کی تندرستی کی علامت یہ ہے کہ وہ انسانی زندگی کی پاکیزگی وطہارت اور اس تقویت و وسعت میں ممد ہو۔ ادب کا بہت بڑا امتحان یہ ہے کہ وہ زندگی کی ابدیت اور تازگی میں اعتقاد رکھتا ہے یا نہیں۔ اگر کوئی ادب زندگی کی تازگی اور اس کی ابدیت میں یقین نہیں رکھتا تو وہ گویا ایسی اقدار کا حامل ہے جن کی دنیا کو قطعاً کوئی ضرورت نہیں۔ ادب تو انسانی زندگی کا ایک ایسا سرچشمہ ہے جو اسی طرح انفرادی اور اجتماعی لحاظ سے انسان کی چند بنیادی ضرورتوں کی سیرابی کرتا ہے۔ جس طرح علومِ نافعہ اور فنونِ مفیدہ انسان اور اجتماع کے لیے چند عملی شعبہ ہائے زندگی میں حیات بخش ثابت ہوتے ہیں۔ ادب محض تخیّل کی بیکار جولانی کا نام نہیں بلکہ اس کا صحیح عمل انسانی شخصیت کی تکمیل اور انسانی اجتماع کی خدمت ہے۔ جو کام مثلاً صاف ہوا جسم انسانی اور روح نباتی کے نشو و ارتقا کے لیے کرتی ہے وہی کام ادب نفس انسانی کے لیے کرتا ہے۔ ادب کامل تو زندگی کی طلب پیدا ہی نہیں کرتا۔ اس کے لیے تیار بھی کرتا ہے۔ اور یہ خیال بھی غلط ہے کہ ادب صرف جبلتوں کے ارتقا اور تطہیر کا فرض انجام دیتا ہے۔ ادب تو ان بنیادی انفرادی جذبات سے ابھر کر اعلیٰ اجتماعی آرزوؤں کی ترجمانی بلکہ ان کی تکمیل بھی کرتا ہے جن تک پہنچ کر انسان ملکوتی صفات سے متصف ہو سکتا ہے۔ جو خود فرشتوں کی قسمت میں بھی نہیں۔ ادب انسان کے کامل تر شعور کا خالق بھی ہے اور اس کا مفسر اور نقاد بھی۔ ادب میں انسانیت کے "موڈ" منعکس ہوتے ہیں۔ اب جذبات اور تخیل کی زبان میں انسانیت کی روشن تفسیر اور تصویر پیش کرتا ہے۔ یہ تو ہوا ادب اور اس کی غایت۔ مگر یہ نیا ادب کیا ہے؟ نیا ادب وہ ہوگا جو انسان کی بدلتی ہوئی زندگی میں اس کے لیے "موڈوں" کی عکاسی کرے۔ ان نئے "موڈوں" کی جو زندگی کی متغیر کیفیتوں اور حالتوں نے پیدا کیے۔ مگر یہ یاد رہے کہ انسانیت اور اجتماع کے یہ نئے "موڈ" محض بے مقصد اور بے ساختہ "جذباتی انگڑائیوں" کے قائم مقام نہیں بلکہ ان میں ترقی و تکمیل کی وہ خواہشیں اور تمنائیں کارفرما ہوتی ہیں جس میں تخیل اور عقل و شعورِ انسانی برابر کے حصہ دار ہوتے ہیں۔ اس لیے لازماً ہر نیا ادب (اور صحیح معنوں میں نیا ادب) انسانیت اور اجتماع کے کامل تر شعورِ زندگی کی ترجمانی کرتا ہے۔ اور اس لیے شعور سے پیدا شدہ تمناؤں کا بیان ہی نہیں کرتا، ان سے نباہ کے طریقے بھی بتاتا ہے اور یہاں پہنچ کر پھر اس صراحت کی ضرورت محسوس ہوتی ہے کہ زمانی لحاظ سے ہر نیا ادب ضروری نہیں کہ معنوی جوہر کے لحاظ سے بھی نیا ہو۔ نیا تو وہی ہوگا جو ہمارے شعورِ زندگی میں کسی نئی بات کا اضافہ کرے گا یا تکمیلِ حیات کے لیے انسان کو نئی بصیرتوں سے آشنا کرے گا یا انسان کو ترقی، شرافت اور مسرت کے لیے، چمنستانوں اور عظمت کے لیے مرغزاروں کے راستے بتائے گا۔ ایک لحاظ سے نیا ادب نئے علمی انکشافات کا قائم مقام ہوتا ہے مگر یہ نئے انکشافات سائنسی انکشافات سے اس معنی میں ضرور مختلف ہوتے ہیں کہ سائنس کے برعکس ان کی تلاش و جستجو وجدان اور تخیل کے وسیلے سے ہوتی ہے اگرچہ اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ ان وجدانی انکشافات کی سچائی اور جھوٹ کا معیار پھر بھی عقلی ہوگا۔ اور معیار

یہی ہوگا کہ یہ اکتشافات انسانی زندگی کی تکمیل اور انسانی تقدیر کے روشن کرنے میں کہاں تک مفید اور مدد ہو سکتے ہیں۔

ادب اور نیا ادب کی اس مختصر تشریح کے بعد سرسید کے زمانے کے ادب کے نیا پن کی بحث سامنے آجاتی ہے۔ اور سوال پیدا ہوتا ہے کہ سرسید کا ادب نیا ہے بھی یا نہیں؟ اور اگر ہے تو کن معنوں میں اور کس حد تک نیا ہے؟ یہ تو ظاہر ہے کہ سرسید کی تحریک نے جو اردو ادب پیدا کیا وہ کئی لحاظ سے اس ادب سے مختلف ہے جو ان سے پہلے موجود تھا۔ مثلاً یہ مسلّم ہے کہ سرسید کے دور کے ادب میں انسان کی اجتماعی زندگی کا جو عقلی تصور اور اس کے متعلق مسائل کا جو عقلی حل پایا جاتا ہے وہ اردو کے ادب میں اس سے پہلے موجود نہ تھا۔ سرسید سے پہلے اردو ادب کی مؤثر نمائندگی شاعری میں ہوئی ہے ـــ اور اس سے انکار نہیں ہو سکتا کہ شاعری کے اس سرمائے میں عظیم شاعری کے عناصر بھی موجود ہیں۔ مگر اس شاعری کی روح اس روح سے بہت مختلف ہے جو سرسید کے زمانے کے ادب میں جاری و ساری ہے۔ ان دونوں ادبوں کا یہ فرق چند دوسری باتوں کے علاوہ اس بات میں بھی ہے کہ سرسید کے یہاں خطاب اجتماع سے ہے اور عام ادیبوں کی آواز اجتماع کے توسط سے افراد تک پہنچی ہے۔ پرانے ادب میں خطاب افراد سے تھا اور عام ادیبوں کی آواز یا تو افراد کے گوش و دل تک پہنچ کر ختم ہو جاتی تھی یا پھر افراد کے توسط سے اجتماع تک پہنچتی تھی۔ مگر اس سارے ادب کا خطاب اصولاً افراد ہی سے تھا۔ پرانے ادب میں عموماً تنہائی کا احساس ہی غالب ہے:

یک بیاباں برنگِ صوتِ جرس　　مجھ پہ ہے بے کسی و تنہائی　　میر

اردو کی شاعری میں ـــ تقریباً ساری شاعری میں ـــ غور سے پڑھنے والے کو بے کسی و تنہائی کی بے درد کی چیخ سنائی دیتی ہے۔ اس کی لے بڑی دردناک ہے اور اس میں وہ فریاد ہے کہ اس کے شور میں اجتماعی زندگی اور اجتماعی شعور کی لہریں (جہاں کہیں بھی) دب کر رہ جاتی ہیں۔ اردو کی پرانی شاعری میں شہر آشوب، مخمس اور قطعات اور غزلوں میں سماجی اور عمرانی مسائل سے متعلق متفرق اشارے، ہجویات و قطعات میں احتجاج و شکایت کی بعض صورتیں ضرور پائی جاتی ہیں اور ان میں کچھ اجتماعی شعور ضرور نظر آتا ہے مگر ان صورتوں میں بھی (انفراداً یا اشتمالاً) کسی اجتماعی تکلیف کا احساس زیادہ کارفرما نظر آتا ہے۔ اور اس حقیقت کی تردید نہیں ہو سکتی کہ پرانے ادب کی کوئی نظم ـــ کوئی ایک نظم بھی ـــ اس اجتماعی احساس اور اس عمرانی ادراک کی حامل نہیں جو مثلاً حالی کی مسدس یا شبلی کی بعض سیاسی نظموں میں پایا جاتا ہے۔ حالی اور شبلی کی شاعری میں اجتماعی بیانے بسوں کیسے ہوتے جذبات اور سوچے سمجھے ہوئے افکار پائے جاتے ہیں اور مسائلِ قومی کا بیان اور ان کا عقلی حل پایا جاتا ہے۔ اجتماعی شعور کی یہ شکل اس سے پہلے موجود نہ تھی۔ اس کا آغاز سرسید تحریک سے ہوتا ہے۔

اس میں کچھ شبہ نہیں کہ سرسید کے زمانے کے ادب میں ایک نئی آواز ہی نہیں، ایک نیا شعور بھی ملتا ہے۔ اس میں زندگی کی مادی ضرورتوں کو براہِ راست قابلِ توجہ خیال کیا گیا اور "این جہانی" زندگی کی ترقی و تکمیل کو اعلانیہ مطمحِ نظر قرار دیا ہے۔ اور یہ چیز سرسید سے پہلے کے سارے ادب میں (جس میں فارسی عربی ادب کو بھی شامل کرتا ہوں) موجود نہیں تھی۔ حالانکہ ان ادیبوں کا بنیادی تصور ہی مختلف تھا۔ مسلمانوں کے زمانۂ تسلط میں ادب کو یہ منصب شاید کبھی دیا ہی نہیں گیا کہ قومی اجتماعی مسائل میں دخل دے۔ ادب تو پرانے نظریے کے مطابق ایک ایسا آزاد ادارہ تھا جس کے دو بڑے مقصد تھے۔

اوّل، اس ذوقی اشتہا کی تسکین جس میں مادّی ضرورتوں کی شمولیت کم سے کم تھی۔ دوم، بیان و اظہار کے طریقوں پر قدرت حاصل کرنا اور اس غرض کے لیے شستہ اسالیب کا مہیا کرنا۔ پرانا تناسلا ادب ان دو ضرورتوں کے اندر محدود تھا۔ اجتماعی مسائل میں صرف بالواسطہ دخل دیتا تھا۔ بلا واسطہ اور با مقصد دخل کبھی نہیں دیا۔ اس کی حیثیت بالعموم تفریحی، ذوقی اور تربیتی رہی ہے۔ سرسیّد کے زمانے میں ادب افراد اور جماعتوں کی عملی زندگی کا ترجمان بلکہ کارندہ بن گیا۔

سرسیّد کے زمانے کے ادب کے چند اصول عقیدے شلاً موجودہ زندگی کے برحق ہونے کا یقین، عمل اور ترقی کی اہمیت، انسان اور اجتماع کا تمدنی اور معاشی رابطہ اور ان سب سے زیادہ عقل و دانش کی برتر بلکہ ہمہ گیر فوقیت، مادیات کی اہمیت وغیرہ وغیرہ۔ تحریکِ سرسیّد کا پیدا کردہ ادب علی العموم انہی عقائد کے گرد گھومتا ہے۔ اردو ادب نے سرسیّد کے زمانے میں پہلی دفعہ مادّی دنیا میں آنکھ کھولی اور مادی دنیا کو ایک زندہ اور ٹھوس نظام کے طور پر دیکھا۔ اس نے دنیا کو وہم و نمود اور سیمیا کی حیثیت سے نہیں بلکہ مستقل حقیقت کی حیثیت سے دیکھا۔ یوں تو پرانے ادب میں خودی اور خودشناسی کا ایک عرفانی تصور ہمیشہ موجود رہا ہے۔ مگر اب ذیلی معیاروں کی روشنی میں خود کو سمجھنے کی کوشش شروع ہوئی۔ پھر نیچر اور کائنات کو بھی انسانی نقطۂ نظر سے دیکھا جانے لگا۔ اس سے پہلے کارخانۂ عالم کو صرف خدا کی صنعت کے طور پر دیکھا جاتا تھا، اب اس کو انسانی جدوجہد کے میدان اور انسانی سعی و عمل کی جولانگاہ کی حیثیت سے دیکھا گیا۔ اب انسان اور کائنات کے مابین جو رابطہ پایا جاتا ہے اس کی عقلی تفسیر بھی ہونے لگی اور ان رشتوں کی جستجو ہوئی جن سے انسان اور کائنات کے روابط کو کامل تر زندگی کی کشود کے لیے استعمال کیا جا سکتا ہو۔

سرسیّد تحریک کے ادب نے فکری لحاظ سے بڑا فائدہ پہنچایا۔ اس ادب نے زندگی میں یقین پیدا کیا اور عمل کی برکات کا اعتقاد بڑھایا۔ عقل و فکر کی اہمیت (جو بڑی حد تک نظر انداز ہو گئی تھی) پھر سے واضح ہوئی اور تمدنی تعاون کا احساس ہوا۔ یہی وہ عناصر تھے جن کے سبب اس ادب میں نیا پن پیدا ہوا اور آنے والے ترقی پسندانہ نظریات کے لیے راستہ صاف ہوا۔ سرسیّد کی تحریروں نے عقل و دانش کی فوقیت ثابت کی۔ حالی، نذیر احمد اور شبلی نے اخلاقِ اجتماعی کا احساس ابھارا۔ حالی ایک انسان دوست ادیب تھے۔ شبلی کی حدیں حالی کی حدود سے اس معنی میں مختلف تھیں کہ جہاں حالی کا انسان پسند صلح پسند اور مفاہمت پسند اور معقول انسان تھا، وہاں شبلی کا انسان حق گو، آزادی پسند، حریت کیش، بے باک اور جنگ آزما فرد ہے۔ نذیر احمد نے معاملہ فہمی اور حسنِ انتظام کی صفات ابھاریں اور سرسیّد نے مہذّب، باقاعدہ، مستعد اور فرض شناس انسان کا سماجی کردار پیش کیا۔

بایں ہمہ یہ کہنا پڑتا ہے کہ سرسیّد کی ادبی تحریک نے جہاں پرانے ادب کے بہت سے خلا پُر کیے وہاں خود بہت سے نئے شگاف بھی پیدا کر دیے چونکہ ادب بہر حال بنیادی طور پر جذبات اور تخیل کا محتاج ہے لہٰذا اس کا عمل بھی یہی ہے کہ وہ جذبہ و تخیل کے توسط سے ہی مخاطب اور قاری کی ذہنیت اور نفسیت پر اثر انداز ہو۔ ادب کا یہ منصب نہیں کہ وہ محض عقلی اور راستہ فضایا کی تخلیق کرتا رہے۔ اس کا کام تو یہ ہے کہ وہ اثر آفرینی، مصوّری اور پیکر تراشی کے ذریعے حقیقتوں اور صداقتوں کو نقش انسانی پر منقش کرتا رہے۔ مگر سرسیّد کی ادبی تحریک کا لب لباب عقلیت محض کی فوقیت ہے، جس کے زیر اثر بسا اوقات انسان

جذباتی نفس گم ہو کر رہ جاتا ہے۔ یہ تو ظاہر ہے کہ اجتماعی سرگرمیوں کے اندر بھی انسان خود کے شعور اور خود کی تلاش سے غافل نہیں رہتا۔ انسان محض مادی ضرورتوں اور تقاضوں کا پیکر نہیں۔ ان سے ماورا بھی انسان ہے۔ کچھ نفسی تقاضے ہوتے ہیں جن کی خلش مادی ضرورتیں پورا ہو جانے پر بھی اس کو اکثر بے تاب رکھتی ہے۔ وہ انسانی ہجوم میں رہ کر اور اس میں گم ہو کر بھی اپنے آپ ہی کو ڈھونڈتا رہتا ہے۔ ذات کی یہ تلاش (جہاں تک میں سمجھا) حقیقی اور اصلی ہے۔ اور جو ادب اس سے غفلت برتتا ہے اور نفس کے ان تقاضے کو نظر انداز کرتا ہے وہ کچھ مدت کے بعد اپنا اثر کھو بیٹھتا ہے ـــ سرسید تحریک کے ادب میں ذات کی یہ جستجو بڑی دھیمی تھی۔ خصوصاً اس وقت جب اس زمانے کی ہمہ گیر عقلیت ادب کو منطق بنا کر پیش کرتی ہے اور ایسی منطق بنا کر پیش کرتی ہے کہ ادب کی کتابیں محض قضایا اور تصدیقات کی اشکال بن جاتی ہیں اور بعض اوقات تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ عقلیت حکمت و فلسفہ سے تخیل کی روادار ہوتی ـــ نذیر احمد کی تحریریں اگر کہانی کی صورت نہ اختیار کرتیں تو الیا غوجی کی طرح آج الماریوں کی زینت ہوتیں۔ سرسید کی تحریریں اگر خاص سیاسی دستور العمل کی رفیق نہ ہوتیں تو آج محض تحقیق کا مواد بن کر کتاب خانوں میں گم ہو جاتیں۔ رفقائے سرسید میں صرف شبلی ایسے شخص تھے جو مزاج کی شاعرانہ پرواز کی وجہ سے اپنی کتابوں میں ادیبانہ تاثر پیدا کرنے میں کچھ کامیابی حاصل کر سکے۔ اور ہاں، حالی بھی قلب انسانی کی ان خلشوں کی کچھ تسکین کر سکے جو جستجوئے ذات کی خاموش کوششوں میں ہر انسان کو بیکل اور بیتاب رکھتی ہیں۔

سرسید کے ادبی دور کی ایک بڑی خوش قسمتی یہ تھی کہ اس میں نفس انسانی کے جذباتی اور داخلی خلاؤں کو پُر کرنے کے بھی راستے نکل آئے۔ ان میں سے ایک تو خود سرسید ہی کی تحریک کا جوابی نتیجہ تھا اور دوسرا فضا کے آزاد تقاضوں کا آوردہ اور پیدا کردہ تھا۔ اوّل الذکر سے میری مراد ہے لکھنؤ کی جوابی تحریک۔ اکبر کی شاعری اور اودھ پنچ اور اس کے برگ وبار اور ثانی الذکر سے مراد ہیں محمد حسین آزاد کی ادبی تصنیفات جو اس لحاظ سے غیر معمولی عظمتوں کی حامل ہیں کہ ان کے قبولِ عام اور رجحیر مقدم میں کسی سیاسی تحریک یا کسی اجتماعی دستور العمل نے شرکت نہیں کی۔ آزاد کا ادب خالص ادبی خلوص کا نتیجہ تھا اور اسی لیے (کم از کم) میں آزاد کے برتر ادبی رتبے کا گہرا اعتقاد رکھتا ہوں اور ان کو اردو کا سب سے بڑا ادیب مانتا ہوں۔ آزاد کی شاعری جو شاعرانہ رسے کچھ زیادہ فاصلہ نہیں رکھتی۔ اگرچہ فکری اور عقلی عناصر سے بھی معمور ہے۔ مگر اس میں نفسِ انسانی کے خلاؤں کے پُر کرنے کا سامان موجود ہے۔ وہ اجتماعیت کے اس سخت سانچے سے بالکل مختلف ہے جو سرسید کی ادبی تحریک نے وضع کیا تھا کہ آزاد کی نثر میں تو تاثیر، مصوری اور پیکر آفرینی کے وہ سب انداز ہیں جو اکثر اوقات شاعری کی رفعتوں تک پہنچ جاتے ہیں اور ذوقِ سلیم ان امنگوں کی تشفی کرتے ہیں جن کی خلش روحِ انسانی کے باطن میں مرکوز و مضمر ہے۔

اودھ پنچ کی جوابی تحریک ایک خاص مجلسی احساس سے ابھری۔ اس کی بنیاد مثبت عقائد کی بجائے تردید و تنقیص کے جذبے پر رکھی گئی تھی۔ اسی سبب سے اس کے اکثر کارنامے مستقل حیثیت اختیار نہیں کر سکے۔ اور ان کی اہمیت جوابی اور تردیدی ظاہرہ کومائی سے زیادہ کچھ نہیں سمجھی جاتی۔ مگر اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ اس کو قبولِ عام (ایک خاص حد تک) حاصل ہوا۔ اس کا سبب یہی تھا کہ اس تحریک نے ان جذبات کی تسکین کی جو سرسید تحریک میں اکثر تشنہ و ناتمام رہ گئے تھے۔ سرسید تحریک نے جہاں خوف ناک متانت بلکہ خشکی و عبوست پیدا کی ـــ اور ایسی ہمہ گیر منطقیت اور استدلالیت کو رواج دیا کہ عام طبائع میں

بڑی افسردگی پیدا ہوگئی تھی۔ اودھ پنچ کی نیم سنجیدہ اور بعض اوقات بالکل غیر سنجیدہ فضا نے اس کمی کو پورا کیا۔ یہ اس معنی میں کہ ملک میں اردو پڑھنے والے عام لوگوں نے سرسید کی تحریروں کے ساتھ ساتھ اس گروہ کی تحریروں میں بھی دلچسپی لی۔ یہ انسانی زندگی کا عام قاعدہ ہے کہ جب بھی طبع انسان کے فطری تقاضوں کو سختی سے روکا جاتا ہے، اس کا ردّعمل بڑا خوفناک اور خطرناک ہوتا ہے۔ یہ تو ایک تاریخی حقیقت ہے کہ "محتسب تیز است" کی فضا کے بعد انسانی زندگی کے ہر دور میں "مے دلیر بنوش"، کا نعرہ بلند ہوتا ہی رہا۔ سرسید تحریک کی بے انتہا مقصدیت کے بعد اودھ پنچ اور اکبر الہ آبادی کا ظہور بالکل قدرتی اور نمایاں تھا۔ یہاں تک کہ خود پیروانِ سید کے یہاں سے شرر کی تاریخی ناول نگاری اور علی گڑھ کی رومانیت بے ساختہ طور پر ابھر آئی اور ان سے الگ اودھ پنچ کی پیدا کی ہوئی فضا میں سرشار اور ان کے فسانۂ آزاد کا ظہور بھی ہوا۔

میں سرسید کی ادبی تحریک کو اس کے باوجود ایک بہت بڑی تحریک مانتا ہوں کیونکہ اس نے ہمیں بہت کچھ دیا۔ اس سے کچھ نقصانات بھی ہوئے مگر اس نے فائدے بھی پہنچائے۔ اس تحریک نے جو ذہن تیار کیے اس کی بڑی کمزوری زندگی کی مادی اقدار سے ہمہ گیر عقیدت اور روحانی اقدار کے متعلق تشکیک تھی۔ نفسِ انسانی کے جذباتی عوامل سے بے خبری اور تسلسلِ حیات کے سلسلۂ عمل میں ماضی کے مؤثرات سے غفلت اور اس قسم کی دوسری کمزوریوں نے اس تحریک کی نافعیت کو بہت نقصان پہنچایا اور یہ نقصان آج تک ان تمام اظہاراتِ ذہنی و عملی پر اثر انداز ہو رہا ہے جو کسی طرح بھی سرسید تحریک کے ذہنی رجحانات سے متاثر ہیں۔ مگر سرسید تحریک سے جو فائدے ہوئے ان کا معنوی نفع اس خسارے کے مقابلے میں بدرجہا زیادہ ہے جس کا سطورِ بالا میں تذکرہ ہوا۔ اس کا بڑا فائدہ تو یہی ہوا کہ اس نے مل کر بیٹھنا اور مل کر سوچنا سکھایا جس کے بغیر کوئی قوم اور جماعت زندہ ہی نہیں رہ سکتی۔ زندگی کی کامیابی اور اس میں عقل کا تصرّف، اجتماعی عمل کی برکات اور جدوجہد کے ثمرات، علم اور سائنسی صداقتوں کا برحق ہونا اور علمی استفادے کے لیے چین و جاپان اور مشرق و مغرب میں پھیل جانا اور خدا کی زمین اور کائنات کی تسخیر کی ترغیب۔ غرض زندہ رہنے، بلکہ باعزت، باقاعدہ اور بھرپور زندگی بسر کرنے کے لیے جس تہذیب اور ذہن و شعور کی ضرورت تھی اس کی تعمیر میں سرسید تحریک نے نمایاں اور غیر معمولی حصّہ لیا اور آنے والی سب ادبی اور فکری تحریکیں اس کی رہینِ احسان ہیں۔

میں نے ابھی ابھی سرسید تحریک کی کمزوریوں کا ذکر کیا ہے، مگر غائر مطالعے سے یہ محسوس ہوتا ہے کہ اس تحریک کی کمزوریاں بھی ایک لحاظ سے مفید ہی ثابت ہوئیں۔ وہ اس طرح کہ اس تحریک کی کمزوریوں کے اندر سے ایک اور تہ دار اور خاصی طاقتور ادبی اور ذہنی تحریک نمودار ہوئی جس کی عمر اگرچہ کچھ زیادہ طویل نہیں، مگر معنوی قدر و قیمت کے لحاظ سے اس کی اہمیت سے انکار نہیں ہو سکتا۔ اجتماعی شعور پر اس تحریک کے اثرات سرسید تحریک کے اثرات سے کسی طرح کم نہیں۔ یہ تحریک پہلے نیم رومانی ادب کی صورت میں رونما ہوئی اور بعد میں پھر یلدرم روحانی تخلیقات کی شکل میں پھلی پھولی اور عام ذہن و فکر پر اثر انداز ہوتی رہی۔

۱ سطورِ بالا میں مَیں نے جس رومانی اور نیم رومانی ادب کی طرف اشارہ کیا ہے، اس کی مدت کم و بیش تیس سال ہوگی یعنی ۱۹۰۰ء سے ۱۹۳۰ء (یا ایک لحاظ سے ۱۹۳۵ء) تک اس میں لطیف ادبی رومانی رجحانات بھی تھے اور شدید جذباتی جوش بھی نظر آتا ہے۔ اس ادب کا ایک دھارا خالص ادبی اور دوسرا دھارا ادبی اور فکری تھا۔ اس سلسلے میں

سب سے پہلے سر عبدالقادر اور ان کے ادبی مجلہ "مخزن" کا نام آتا ہے جس سے اس زمانے کے سب ادیب متاثر ہوئے مگر ان کی تحریک پر بہت جلد ظفر علی خاں، ابوالکلام آزاد اور اقبال کے اثرات غالب آ گئے۔ اور جب یہ لہر کچھ تھمی تو حفیظ، اختر اور نیاز وغیرہ کی خالص ادبی رومانیت نے جنم لیا۔ اردو ادب میں "مخزن" کی اہمیت تو مسلم ہے۔ مگر میرا خیال ہے کہ "مخزن" کی حقیقی قدر و قیمت کا پورا اعتراف ابھی نہیں ہوا۔ "مخزن" محض ایک ادبی مجلہ ہی نہ تھا بلکہ خالص ادبی اقدار کا ایک موثر ادارہ بھی تھا اور میں اس کو بھی سرسید تحریک کی ہمہ گیر مادیت اور مقصدیت کے خلاف ایک خاموش مخلصانہ ردِ عمل ہی خیال کرتا ہوں۔ "مخزن" کے ادیبوں نے پہلی مرتبہ اردو ادب کے لہجے میں ملائمت پیدا کی اور زندگی کی ان لطافتوں اور شیرینیوں کا احساس دلایا جو کائنات میں چار سو پھیلی ہوئی ہیں۔ مگر ذوقی تربیت ہونے کے سبب لوگ ان سے لطف اندوز نہیں ہوئے۔ "مخزن" نے ان شیرینیوں تک پہنچنے کے لیے راستہ صاف کیا۔ "مخزن" ہی میں پہلی دفعہ انسان نے انسان کو ڈھونڈا اور انسان نے اپنے اندر کے انسان سے ملاقات کی اور زندگی کی ان شرافتوں کا احساس زندہ ہوا جن سے انسانوں کی بستی بسنے کے قابل ہوتی ہے۔ "مخزن" کی ادبی تحریک میں لطیف فکری لہر بھی پائی جاتی ہے اور اس میں علم اور سائنسی سچائیوں کی تلاش بھی ہے۔ اس میں انسانی زندگی اور ذہن کے تقریباً سبھی تقاضوں کے لیے رہبری اور رہنمائی کا سامان ملتا ہے۔ یہ ایک انسانیاتی تحریک تھی جس نے عقل اور فکری مفاہمت کے لیے مواقع پیدا کیے۔ اور نفسِ انسانی کے دواعی اور جبلتوں میں جو جنگ سرسید تحریک نے اٹھا رکھی تھی اس میں صلح و آشتی کی خوشگوار صورتیں پیدا کیں۔ سرسید تحریک میں خاموش سوچ بچار اور مناجات بڑی کمی تھی جس نے ادب کو تقریباً حکمتِ عملی اور صحافت بنا دیا تھا۔ "مخزن" نے ادب کی روح میں بڑی تبدیلی پیدا کی۔ "مخزن" نے ادیب خاموش سوچ بچار کے علمبردار تھے۔ اور اگر ملک کے سیاسی حالات، ملک میں قوانین ہیجان اور جذباتی جوش و خروش پیدا نہ کر دیتے تو یقیناً "مخزن" کی تحریک اردو ادب میں جذباتی سکون اور ادبی طہارت اور فکری توازن کے رجحانات کے لیے بڑی تقویت کا باعث ہوتی۔ سیاسی فضا روز بروز شدید جذباتی تہییج کی طلب گار ہوتی جاتی تھی اور مشرق و مغرب میں ایسے طوفان اٹھ رہے تھے کہ ان میں "مخزن" کی سبک سیر کشتی کا ہموار دیر جا رہنا مشکل ہی نہ تھا محال تھا۔ یہ تو ایسا دور تھا جس میں ظفر علی خاں اور ابوالکلام آزاد جیسے ادیب اور خطیب ہی ناخدائی کے فرائض انجام دے سکتے۔ اس میں "مخزن" کے لطیف اور سبک سیر ادیب کہاں تک زندہ رہتے۔ ہاں یہ صحیح ہے کہ "مخزن" کی ادبی روح لطیف پھر بھی کہیں کہیں باقی رہی۔ خصوصاً بدلے ہوئے علی گڑھ کے ماحول میں اور کچھ لکھنؤ کی فضا میں ۔۔۔ مگر ان ارواح کی مثال ان شمعوں کی ہے جو آندھیوں سے دور چند مخصوص شبستانوں کے محفوظ گوشوں ہی میں اپنی روشنی بکھیر رہی ہوں اور بس۔

اُس دَور کے نمایاں ترین اشخاص جن کا ادب پر گہرا نقش قائم ہوا۔ اور جن کے ادب نے اجتماعی شعور و بصیرت کو ایک خاص رنگ پر ڈھالنے میں مؤثر اور لازوال حصہ لیا وہ ابوالکلام آزاد اور اقبال ہیں جنھوں نے ایک مستقل شعور پیدا کیا۔ اور اپنی اپنی حدود میں الگ الگ ایک ایسے مکتبِ فکر کی بنیاد ڈالی جن کے اثرات سے اردو ادب کم سے کم ۲۰۰۰ء تک ضرور روشنی حاصل کرتا رہے گا۔

اردو ادب میں ابوالکلام آزاد اور اقبال دو ایسی ہستیاں ہیں جن کے فکر کے مقامات جتنے مشترک ہیں اتنے ہی ان کے

عمل کے مقامات مختلف ہیں۔ ان کی مثال روشنی کے دو میناروں کی ہے کہ ان میں سے کسی ایک سے بھی جہاز ان اکتسابِ نور کیے بغیر آگے گزر نہیں سکتا۔ ان دونوں ناموروں کے فکر کے مقاماتِ اشتراک کو دیکھ کر ان کے عملی موقف کے شدید اختلاف کی توجیہ بجز اس کے کچھ نہیں ہو سکتی کہ ان میں سے ایک میں جذباتیت، عملیت کے رجحان اس قدر زیادہ تھے کہ ان کا دوسرے کی جذباتیت فکریت کے رجحانات سے ملاپ تقریباً ناممکن تھا۔ بہر حال ابو الکلام اور اقبال کی پیدا کی ہوئی مخصوص ذہنیت سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔

ابو الکلام آزاد کو ایک لحاظ سے سر سید کی نری عقلیت کے خلاف جس نے ایک طرف وجدان اور جذبے کو خارج البلد کر دیا تھا اور دوسری طرف بعض متوسط درجے کی مادی اقدار سے مصالحت کر لی تھی، احتجاج کا ایک نقطۂ انتہا سمجھنا چاہیے۔ یہ وہ احتجاج تھا جس کی ابتدا ابو الکلام کے استاد شبلی نے کی۔ مگر اس احتجاج میں محسوس یا غیر محسوس طور پر ایک حد تک اقبال بھی شریک معلوم ہوتے ہیں۔ ملک کے سیاسی حالات نے ابو الکلام آزاد کے شعور کی اشاعت میں بڑی مدد دی اور اس شعور کے پیدا کرنے میں ابو الکلام کی ان لازوال خطیبانہ، عالمانہ اور ادیبانہ صلاحیتوں نے بڑا حصہ لیا جن کی تفصیل ہر خاص و عام کو معلوم ہے۔ میں ابو الکلام آزاد کی تحریک کو شبلی ابو الکلام تحریک کے نام سے یاد کرتا ہوں۔ شدید جذباتیت کے باوجود اس تحریک کی اپنی مخصوص عقلیات بھی تھیں جن کی مدد سے اس مکتبِ فکر کے مصنفوں نے سر سید کی عقلیات کا مؤثر مقابلہ کیا۔ شبلی ابو الکلام تحریک بنیادی طور پر قدیم روایات کے احیا کی تحریک تھی جس کے ذریعے ملک میں تاریخی شعور اور تہذیبی تسلسل کا احساس پیدا ہوا۔

محمد رضی الدین صدیقی

ڈاکٹر سید عبداللہ اور اردو اکیڈمی کا قیام

مجھے یہ معلوم کر کے بڑی مسرت ہوئی ہے کہ انجمن ترقی اردو پاکستان، ڈاکٹر سید عبداللہ مرحوم سے متعلق یادگاری
الات کا مجموعہ شائع کر رہی ہے۔ اس ضمن میں مجھ سے فرمائش کی گئی ہے کہ میں بھی اس مجموعہ کے لیے ایک مقالہ تحریر کروں۔
یوں تو میں ۱۹۳۲ء سے لے کر قیام پاکستان تک پنجاب یونیورسٹی کے معاملات کے سلسلے میں لاہور آیا کرتا تھا۔
ن سید صاحب سے ملاقات اس وقت ہوئی جب انھوں نے اردو اکیڈمی کا منصوبہ بنایا اور ڈاکٹر بشیر احمد مرحوم
ساتھ جو اس وقت پنجاب یونیورسٹی کے وائس چانسلر تھے۔ مجھے بھی اکیڈمی کی تاسیس میں شریک ہونے کی دعوت دی۔
اس زمانے میں میں پشاور یونیورسٹی کا وائس چانسلر تھا۔ اور اس کی تنظیم و تعمیر کے علاوہ نئی مملکت
ستان کے تعلیمی اور سائنسی اداروں کی منصوبہ بندی اور تشکیل و ترقی میں بھی کام کرنا پڑتا تھا۔ تاہم ڈاکٹر صاحب
اکیڈمی سے متعلق منصوبہ کی افادیت کے پیشِ نظر میں ان کے اور ڈاکٹر بشیر احمد کے ساتھ اکیڈمی کی تنظیم میں بھی
مل ہو گیا۔ کیونکہ مملکتِ پاکستان کے استحکام اور ترقی کے لیے یہ منصوبہ بہت اہم تھا۔
ان ابتدائی دنوں ہی میں میں نے محسوس کیا کہ وہ نہ صرف ادبیات کے ایک اچھے عالم تھے بلکہ عملی اعتبار سے بھی
یت مستعد اور منتظم کارکن تھے اور مجھے یقین تھا کہ ان کی معتمدی میں اردو اکیڈمی بھی بڑی سرعت کے ساتھ مستحکم
پر قائم ہو جائے گی۔ اور ترقی و توسیع کے مدارج طے کرے گی۔
تقریباً دو سال ڈاکٹر بشیر احمد کی صدارت اور ڈاکٹر سید عبداللہ کی معتمدی میں اکیڈمی کی بنیادی تنظیم و
کیل ہوئی اور باضابطہ کام کا آغاز ہوا لیکن افسوس ہے کہ ۱۹۵۷ء میں اکیڈمی کے پہلے صدر نشین ڈاکٹر بشیر احمد کا
ک انتقال ہو گیا۔ اس وقت ڈاکٹر سید عبداللہ نے اصرار کیا کہ اکیڈمی کی صدارت کا عہدہ میں سنبھال لوں۔
ان کی انتھک کوششوں سے اکیڈمی کا کام کافی آگے بڑھا اور چونکہ اکیڈمی کے مقاصد میں سائنسی علوم کو
ت اہمیت دی گئی تھی اس لیے سائنسی اصطلاحات کو معیاری بنانے اور شائع کرنے کے کام کو کافی اولیت دی گئی۔
طلاحوں کی اشاعت کے سلسلے میں اسلامیہ کالج پشاور کے پروفیسر اور پشاور یونیورسٹی کے سابق رجسٹرار پروفیسر

منہاج الدین مرحوم کی "قاموس اصطلاحات" خاص طور پر قابلِ ذکر ہے، جس کو اردو اکیڈمی نے کوئی پچیس سال قبل شائع کیا تھا۔

سب سے پہلے سید صاحب کو اکیڈمی کے اخراجات کے لیے رقم کی فراہمی کے سلسلے میں کافی تگ و دو کرنی پڑی چونکہ اس زمانے میں مغربی پاکستان کا صدر مقام لاہور تھا۔ اور قیام پاکستان سے قبل بھی لاہور اردو زبان کی اشاعت اور سرپرستی کے سلسلے میں کافی پیش پیش تھا۔ اس لیے اکیڈمی کے واسطے سالانہ رقم منظور کرانے کی کوشش بھی لاہور میں کرنی پڑی۔ حسنِ اتفاق یہ کہ اس وقت حکومت مغربی پاکستان کے محکمۂ تعلیمات کے معتمد پروفیسر سراج الدین مرحوم تھے جن کے ساتھ سید صاحب کے اور میرے دیرینہ مراسم تھے۔ ان کی تائید کے باوجود سید صاحب کو محکمہ کے دوسرے افسروں کے ساتھ کافی بحث مباحثہ کرنا پڑا اور انھیں سمجھانا پڑا کہ انجمن ترقی اردو کی موجودگی میں اردو کی ترویج و اشاعت کے لیے کسی دوسرے ادارے کی کیا ضرورت ہے۔ بہرحال یہ مرحلہ بھی طے ہوا اور حکومتِ مغربی پاکستان کی طرف سے اکیڈمی کو کچھ رقم ملنے لگی۔ اگرچہ اس میں اضافے کے لیے وقت بوقت جدوجہد کرنی پڑی۔

غرض یہ کہا جاسکتا ہے کہ سید صاحب کے جو مراسم اور تعلقات حکومت کے اربابِ مقتدر اور دوسرے اداروں سے تھے ان کے باعث اکیڈمی کے کسی اہم اور ضروری منصوبہ کو رقم کے فراہم نہ ہوسکنے کے باعث بالکل ترک کرنا نہیں پڑا بلکہ جلد یا بدیر اس پر عمل کیا گیا۔

البتہ ان کی اپنی خانگی زندگی میں ایک مرحلہ ایسا آیا تھا کہ جب ان کو پنجاب یونیورسٹی سے پنشن کی عمر ہوجانے پر سبکدوش ہونا پڑا تو اہل و عیال کے اخراجات کے سلسلے میں تنگی کا سامنا ہوا لیکن اس وقت انھوں نے یہ تکلیف ہنسی خوشی برداشت کی اور اپنا علمی کام اور اکیڈمی کا انتظامی کام جاری رکھا۔ یہاں تک کہ خود اربابِ مقتدر کو اس کا احساس ہوا اور ان کو یونیورسٹی کے کام پر دوبارہ لگا دیا گیا۔

زبانِ اردو کی علمی توسیع اور ترقی کے علاوہ اس کو بہ حیثیت قومی، دفتری اور تعلیمی زبان کے پاکستان میں رائج اور نافذ کرنے کے سلسلے میں بھی ان کی علمی جدوجہد قابلِ ذکر ہے۔ افراد اور دفاتر کو وہ ہر وقت تاکید کرتے رہتے تھے کہ اپنے کاروبار کے لیے انگریزی زبان کی بجائے اردو زبان استعمال کریں۔ اور اس شدت کے ساتھ ان کی تلقین کرتے تھے کہ انھیں فریقِ ثانی کے ناراض ہونے کا کوئی خیال نہیں آتا تھا۔ اس معاملے میں ان کی شدت اس قدر تھی کہ جب کوئی خط ان کے پاس ایسا پہنچتا تھا جس کے لفافہ پر پتا انگریزی زبان میں لکھا ہوتا تو اکثر اس خط کو کھولے بغیر واپس کر دیتے تھے۔

شہر لاہور کی بڑی شاہراہوں پر دکانوں کے مالکان کو ترغیب دینے کے لیے فرداً فرداً ہر دکان پر گئے اور مالکان کو سمجھایا کہ وہ دکان کے تختے پر نام اور تفصیلات انگریزی میں نہیں بلکہ اردو میں لکھیں۔

پھر انھوں نے اس کا اہتمام کیا کہ جدید سائنسی علوم کی اعلیٰ تعلیم اور تحقیق کے امکانات کو اہلِ ملک اور خصوصاً تعلیم یافتہ طبقہ پر واضح کرنے کے لیے عام جلسے منعقد کیے جائیں اور ان جلسوں میں ماہرینِ فن سے متعلقہ مضمون پر تو سیعی لکچر کروائے جائیں تاکہ سب کو یقین ہو جائے کہ ٹکنیکل مضامین کی اعلیٰ تعلیم اردو زبان کے ذریعے بھی بخوبی ہو سکتی ہے

تنی انگریزی زبان کے ذریعے مجھے بھی ایسے جلسوں میں شریک ہونے اور تقریریں کرنے کا موقع ملا تھا۔
جیسا کہ میں بتا چکا ہوں، اردو اکیڈمی کا ایک اہم مقصد یہ تھا کہ سائنس اور ٹکنالوجی کے جدید مضامین کو دو زبان کے ذریعے ملک میں رائج کیا جائے۔ چنانچہ اس سلسلے میں اکیڈمی نے متعدد کتابیں شائع کی ہیں۔
اس مضمون میں میں نے سید صاحب کے صرف ان کارناموں کا ذکر کیا ہے جو اردو زبان کی ترویج و اشاعت سے تعلق ہیں۔ ادبی، علمی اور تحقیقاتی نقطۂ نظر سے ان کے اہم کارناموں پر وہ اصحاب بہتر طریقے سے لکھ سکتے ہیں جو ان رناموں میں ان کے ساتھی اور رفیقِ کار تھے۔ مجھے یقین ہے کہ اس مجموعے میں ایسے بہت سے مضامین شامل ہوں گے۔
سید صاحب سے میری آخری ملاقات ان کی وفات سے صرف چند دن قبل ہوئی تھی جب میں طویل سفر کے بعد پس آیا تھا اور ان کی شدید علالت کی خبر سن کر لاہور میں ان کے مکان پر پہنچا۔ وہاں اطلاع ملی کہ ان پر فالج کا حملہ ہوا ہے۔ روالے مجھے ان کے کمرے میں لے گئے تو وہ مجھے دیکھتے ہی شدتِ جذبات سے مغلوب ہو گئے اور ان کی آنکھوں سے آنسو نے لگے۔ بہت دیر تک وہ مجھے دیکھتے رہے اور کچھ کہتے رہے لیکن چونکہ زبان پر بھی علالت کا اثر ہو چکا تھا اس لیے ان کی بات مجھ میں نہیں آ رہی تھی۔ بالآخر میں کمرے سے باہر آ گیا اور بیگم صاحبہ اور صاحبزادی سے سید صاحب کی بیماری اور علاج کی تفصیلات سنتا رہا۔ یہ بھی معلوم ہوا کہ اربابِ مقتدر نے محکمۂ صحت کے متعلقہ افسروں کو ہدایت کی ہے اور علاج معقول ہو رہا ہے۔ پھر چند دن بعد ہی اطلاع ملی کہ وہ اپنے خالقِ حقیقی سے جا ملے۔
انھوں نے خدمتِ خلق کے ذریعے اپنی مغفرت کا سامان کر لیا تھا۔ رب العالمین کی شانِ کریمی سے توقع ہے کہ سید صاحب نے قوم کی خدمت اور فلاح و بہبود کے لیے جو کوششیں کی تھیں وہ بارگاہِ ایزدی میں درجۂ قبولیت حاصل کر چکی ہوں گی۔ اور ان پر خداوندِ کریم کی رحمتیں نازل فرمائی گئی ہوں گی۔ اللہ تعالیٰ انھیں مغفرت نصیب کرے۔

ڈاکٹر عبدالسلام خورشید

ڈاکٹر سید عبداللہ مرحوم اپنی ذات میں ایک انجمن تھے

سید عبداللہ مرحوم اپنی ذات میں ایک انجمن تھے۔ یہ ایک رسمی بات نہیں ہے، ایک جیتی جاگتی حقیقت ہے، بلکہ شاید اس سے بھی بڑھ کر یہ کہا جا سکتا ہے کہ وہ اپنی ذات میں صرف ایک انجمن ہی نہیں، ایک تحریک بھی تھے اور پنجاب میں بابائے اردو مولوی عبدالحق مرحوم کے صحیح جانشین تھے۔ پنجاب میں اردو کی تحریک کا آغاز پنڈت برج موہن دتاتریہ کیفی، سرشانتی سروپ بھٹناگر اور "ہمایوں" کے مدیر میاں بشیر احمد سے ہوا۔ ان کے بعد "ادبی دنیا" کے بانی اور مدیر مولانا صلاح الدین احمد نے اردو کا غلغلہ بلند کیا اور تقریباً اس دور میں سید عبداللہ مرحوم کی شخصیت ابھری اور آناً فاناً انھوں نے اردو زبان کی پیش رفت کے لیے ایک تحریک شروع کر دی۔ انھوں نے بہت کانفرنسیں برپا کیں جن سے متعدد انجمنوں نے تعاون کیا۔ ان کانفرنسوں میں اردو زبان کے مسائل پر مقالے اور خطبے پڑھے گئے۔ چودھری نذیر احمد خاں، مسٹر جسٹس ایس۔ اے رحمٰن مرحوم اور مسٹر جسٹس سجاد احمد جان جیسے لوگ انھیں کی کوششوں سے اردو تحریک میں شامل ہو گئے۔ کانفرنسوں میں ہر سال کافی تحقیق کے بعد اردو زبان کو اس کا قومی مقام دلانے کے لیے تجاویز قرار دادوں کی صورتوں میں مرتب ہوتیں۔ اور ایک بار تو ڈاکٹر سید عبداللہ نے اردو کے لیے ایک جلوس بھی نکال دیا۔ انھیں شخصیات اور کارکنوں کو اکٹھے کرنے کا فن آتا تھا۔ جس شخصیت کو کسی اجتماع کی صدارت کے لیے بلایا، اس کا دل ایسے موہ لیا کہ وہ آنے والے سب اجتماعات میں شریک ہوتی تھی۔ چھوٹی چھوٹی انجمنوں کے کارکنوں کی وہ ایسے انداز میں حوصلہ افزائی کرتے تھے کہ جونہی وہ کسی کانفرنس کا بیڑہ اٹھاتے، سارے کارکن ان کے گرد جمع ہو جاتے۔ اس میں ان کی شخصیت کی ذاتی کشش کو بھی بہت دخل تھا۔ وہ ڈھیلے ڈھالے انداز سے خطاب کرتے۔ [illegible] بولتے چلے جاتے۔ اور بعض اوقات مقالے کے درمیان تحریر سے ہٹ کر بھی گفتگو کرتے اور مجمع اتنا مسحور ہو جاتا کہ وقت [illegible] کا پتا بھی نہ چلتا۔ اصل میں وہ اردو زبان کی تحریک کی ایک ایسی علامت بن گئے تھے کہ اردو کا ہر مسئلہ انھیں کے [illegible] لایا جاتا اور انھیں سے رائے لی جاتی۔

پھر یہ محض اردو کی علامت والی بات نہیں تھی۔ انھوں نے ایک عمر اردو ادب کی خدمت میں بسر کر دی۔ مغربی پاکستان اردو اکیڈمی کو آگے بڑھایا۔ انجمن ترقی اردو پنجاب کی قیادت فرمائی۔ دائرۃ المعارف اسلامیہ میں وہ

اسلام اور اردو زبان کی اتنی خدمت کر گئے کہ رہتی دنیا تک یاد رہے گی۔ اس لیے جب وہ سامنے آتے تو صرف صدر شعبۂ اردو پنجاب یونیورسٹی اور پرنسپل اورینٹل کالج کی حیثیت ہی سے نہیں بلکہ اپنے جلو میں بوقلموں اور رنگا رنگ علمی اور ادبی سرگرمیوں کی تصویر بھی لاتے۔ بھلا ایسی ہمہ جہتی شخصیت سے لوگ کیوں پیار نہ کرتے اور کیوں اس کی آواز پر کان نہ دھرتے۔ یہی وجہ ہے کہ پنجاب میں اردو کو آگے بڑھانے کی تحریک بہت زور شور سے چلتی رہی اور اس نے بہت سے طبقات کو متاثر کیا۔

پنجاب میں اردو کے قدم ماشاءاللہ مضبوط ہیں لیکن اردو زبان کو معاشرے کے بچے کھچے عناصر میں بھی رچانے بسانے کے لیے کسی ایسی تحریک کا وجود نہیں جس کا سیّد عبداللہ کی تحریک کی طرح خوب چرچا ہو۔

ڈاکٹر سید معین الرحمٰن

ڈاکٹر سید عبداللہ کے پانچ خط

ڈاکٹر سید عبداللہ (ولادت ۵ اپریل ۱۹۰۶ء، وفات ۱۴ اگست ۱۹۸۶ء) کے بہت سے خطوط میرے ذاتی ذخیرۂ نوادر کا حصہ ہیں ــــ یہ کم تر میرے نام اور زیادہ تر بعض دوسرے اصحاب کے نام ہیں۔ اس سے قطع نظر کہ یہ ڈاکٹر سید عبداللہ کے ہیں، ان خطوں کی اہمیت یا ندرت کے بعض دوسرے اسباب بھی ہیں۔

میرے ذخیرے میں سید صاحب کے جو خط محفوظ ہیں ان میں متعدد کوئی پچاس سے پچپن برس پہلے تک کے ہیں۔ بعض قلمی خط چار سے چھ صفحات تک کے پھیلاؤ کے ہیں ــــ اتنے قدیم اور اتنے طویل قلمی خط ڈاکٹر سید عبداللہ کے کم ہی کہیں اور ہوں گے۔

اس موقع پر ڈاکٹر سید عبداللہ کے پانچ خط پیش کیے جا رہے ہیں۔ پہلا خط ڈاکٹر ایس۔ ایم اکرام (ولادت اگست ستمبر ۱۹۰۸ء، وفات ۱۷ جنوری ۱۹۷۳ء) کے نام ہے اور اب سے پچاس برس پہلے کا ہے۔ دوسرا گرامی نامہ راقم السطور اور آخری تین خط شمیم احمد صاحب (سابق استاد شعبۂ اردو، جامعہ بلوچستان کوئٹہ، حال۔ شریک پروفیسر شعبۂ اردو، جامعہ کراچی) کے نام ہیں ــــ یہ خط آٹھ دس برس پہلے۔ یعنی سید صاحب کے زمانۂ آخر سے تعلق رکھتے ہیں ــــ ان خطوں سے سید صاحب کے ذہنی ارتقا، ان کے مزاج، طریقِ کار، اسلوبِ حیات، ان کے اہداف اور اسلوبِ تحریر یا بحیثیتِ مجموعی ان کی شخصیت کو سمجھنے میں بڑی مدد ملتی ہے ــــ اور اسی میں ان خطوں کی قدر و قیمت مضمر ہے۔ [ڈاکٹر سید معین الرحمٰن]

(۱)

اورینٹل کالج لاہور ۶ مئی ۱۹۳۹ء

منبعِ اکرام۔ سلامت باشند

السلام علیکم! سب سے پہلے آپ کے اکرام نامے کی رسید لکھتا ہوں، پھر اس حقیر کاغذ پر آپ کو خط لکھنے کی معذرت کر رہا ہوں[1]۔ حسرت کے محبوب نے تو خط نہ لکھنے کا یہ نیا عذر تراشا تھا کہ:

جنگِ یورپ میں وہ کہتے ہیں گراں ہے کاغذ

---

[1] بظاہر کسی امتحانی کاپی سے کاغذ تراش کر اس پر خط لکھا گیا ہے۔

لیکن میری ستم ظریفی ملاحظہ ہو کہ جنگِ یورپ نہ ہوتے اور عمدہ کاغذ کے گراں نہ ہونے کے باوجود یہ نیا کاغذ تراش رہا ہوں کہ "اچھا کاغذ میری سہل انگاری کی وجہ سے اس وقت گھر میں موجود نہیں"۔ اس کاغذ تراشی پر داد چاہتا ہوں اور معافی!

فرمائیے شبلی کے متعلق میری بے سروپا تحریروں پر نگاہِ غلط انداز ڈالنے کا موقعہ ملا یا نہیں؟ کیا اچھا ہوتا اگر آپ جلد اپنی رائے سے مفتخر فرماتے — میں نے ایک مختصر سی کتاب لکھی ہے جس کا موضوع "سرسید احمد خاں اور ان کے رفقا" ہے۔ زبان بعض مصلحتوں سے انگریزی اختیار کی ہے اور مبحث اردو زبان ہے۔ اس سلسلے میں شبلی خاص طور پر ممتاز جگہ پر ہیں۔ آپ کی قیمتی رائے معلوم ہو سکے تو میں کچھ ترمیم کر سکوں۔

آپ کو خدا نے جو سلجھا ہوا دماغ عطا فرمایا ہے، اس کا مجھ پر خاص اثر ہے اور میں دل سے معترف ہوں یہی وجہ ہے کہ میں آپ کی رائے کی بہت ضرورت محسوس کرتا ہوں۔ امید کہ جلد توجہ فرمائیں گے۔

اب کے اورینٹل کالج میگزین میں "غالب کے جدید تذکرے" پر لکھا ہے۔ اس میں آپ کی کتاب کا بہت ذکر آیا ہے[2]۔ یہ پرچہ اگست میں شائع ہوگا۔ لیکن ستمبر میں کالج کے دوبارہ کھلنے پر آپ کو ملے گا۔ پرنسپل شفیع[3] صاحب سے غالباً آپ کا تعارف ہوگا۔ آپ کی کتاب کے متعلق پہلے سے زیادہ معترف ہو رہے ہیں۔ بہر حال یہ میری عقیدت ہے جس کا میں ہر موقعے پر اظہار کر دیتا ہوں، آپ پر کوئی احسان نہیں۔

"غالب نامہ" کے پروفوں کے متعلق سابق خط میں لکھ چکا ہوں۔ میں انشاء اللہ ۱۶ رجون کو یہاں سے عازم وطن ہو جاؤں گا۔ میرا آئندہ پتہ (یعنی ۱۶ رجون کے بعد) مانسہرہ ضلع ہزارہ ہوگا۔

ایک مشورہ چاہتا ہوں۔ میری کتاب کا عنوان یہ ہے:

"The spirit and substance of Urdu prose under the influence of Sir Syyid"

مجھے خط کشیدہ الفاظ کے متعلق خلجان ہے۔ انگریزی میں Influence کا لفظ بہت گہرا مفہوم رکھتا ہے۔ کیا سرسید کے سلسلے میں اس کا استعمال جائز ہے؟ "اردو نثر" میں سید کو میں اتنا بڑا صاحبِ تصنیف نہیں مانتا کہ ان کا "سکول" قائم کر دوں، تاہم جذبۂ عمل انہی کا پیدا کردہ تھا جس نے حالی شبلی وغیرہ کو اتنا بڑا مصنف بنا دیا تھا۔ میری اس تصنیف میں سرسید کے رفقائے خاص ہی کا ذکر ہے۔

کیا اس کے لیے "Sir Syyid and his circle" کا لفظ استعمال کیا جا سکتا ہے؟

Spirit of Urdu Prose by Sir Sayyid and his circle

۲۔ ڈاکٹر ایس۔ ایم اکرام کی کتاب "غالب نامہ" (طبع اول ۱۹۳۶ء) کی طرف اشارہ ہے

۳۔ پروفیسر ڈاکٹر مولوی محمد شفیع (ولادت قصور ۱۸۸۳ء، وفات لاہور ۱۹۶۳ء)

اس عنوان کے متعلق کیا خیال ہے؟ غرض آپ میرے لیے کوئی اچھا سا عنوان جو میرے عنوان سے مماثل ہو تجویز فرمائیے۔ کیا آپ سے یہ توقع رکھی جاسکتی ہے کہ آپ میرے اس رسالے پر ایک دیباچہ لکھ دیں؟ پروفیسر محمد اقبال صاحب، اورینٹل کالج لاہور سے بھی کہہ رہا ہوں۔ فرمائیے "غالب نامہ" کس مرحلے پر ہے؟

والسلام، خاکسار

سید محمد عبداللہ

---

(۲)

صدر ادارہ، اردو دائرۂ معارفِ اسلامیہ

پنجاب یونیورسٹی، لاہور لاہور، ۸ نومبر ۱۹۷۶ء

مکرمی و محترمی ڈاکٹر معین الرحمٰن صاحب، السلام علیکم

مقالہ غالب (اسداللہ بیگ خاں، از: غلام رسول مہر) کی ایک نقل ارسالِ خدمت ہے۔ ازراہِ کرم اس پر نظرِ ثانی کر دیجیے۔ جہاں ترمیم و اضافے کی ضرورت ہو وہ بھی کر دیجیے۔

ادارہ اس سلسلے میں تھوڑا سا اعزازیہ بھی پیش کرے گا جو ایک سو الفاظ کے لیے ایک روپیہ مقرر ہے۔ یہ بھی قبول کیجیے۔ اگرچہ یہ اعزازیہ آپ کے مرتبہ و شان کے لحاظ سے فروتر ہے لیکن آپ کی علم دوستی سے پوری توقع ہے کہ آپ یہ قبول کر لیں گے۔

آخر میں یہ بھی گزارش ہے کہ مقالے کی طباعت کی باری قریب ہے، اس لیے اگر جلد کرم فرما سکیں تو ممنون ہوں گا۔ والسلام

نیازمند

سید عبداللہ

---

(۳)

صدر ادارہ: اردو دائرۂ معارفِ اسلامیہ

پنجاب یونیورسٹی، لاہور لاہور، ۱۳ جون ۱۹۷۹ء

شمیم صاحب عزیز و مکرم، السلام علیکم۔ مزاج شریف

آپ کا مفصّل اور فکر انگیز بلکہ ایمان پرور مکتوب ملا۔ انبساطِ خاطر کا سرچشمہ اور انشراحِ صدر کا منبع ثابت ہوا۔ میں نے جس قومی بیماری کا ذکر کیا تھا، آپ نے اس بیماری کی عملی صورتیں بیان فرما دی ہیں۔ یہ بیماری اگرچہ مرکب، گہری اور پیچ در پیچ ہے لیکن اس کا اگر کوئی مفرد نام ہو سکتا ہے تو وہ ہے "تقلیدِ افرنگ"۔

اپنی زندگی میں مَیں نے فرنگی تہذیب سے آغاز کیا۔ یہ ابتدا تھی، اب اس کے کافرانِ مطلق میں ہوں۔

۱۹۷ء میں پروفیسر و صدر شعبۂ اردو، گورنمنٹ کالج لائل پور، حال: پروفیسر و صدر شعبۂ اردو، گورنمنٹ کالج لاہور۔

یہ انتہا ہے۔ اس تہذیب کے کئی ادب بے خبر سہانے ہیں مگر یہی اس کے دامِ ہم رنگِ زمیں بھی ہیں۔ سرسید کا مقصود نہ سہی، یہ ان کی بھول ضرور تھی کہ وہ زہر کو تریاق سمجھے۔ اس وقت سب سے بڑا کام یہ ہے کہ لوگ زہر کو زہر سمجھنے لگیں۔ اس لیے وقت کی سب سے بڑی ضرورت مغرب کے علومِ معاشرتی پر حملہ کرنا ہے، ان کا رعب ختم کرنا ہے۔ جب تک یہ رعب ختم نہیں ہوتا اس وقت تک ہم اس کے زہرِ ہلاہل کو قند ہی کہتے رہیں گے۔

نظری و نظریاتی باتیں بہت ہیں مگر اس وقت عملی تدبیر کا اہتمام کرنا چاہیے۔ میری رائے میں اس کی صورت یہ ہے کہ مغربی معاشرتی علوم (نفسیات، سوشیو آلوجی، معاشیات، سیاسیات، تاریخ اور سائنسی فلسفہ) کے چند ایسے مقامی ماہرین کو ڈھونڈ نکالنا چاہیے جو مغربی تہذیب کی روح کے سراپا زہر ہونے پر یقین رکھتے ہوں اور اس کی تصدیق انھیں ان علموں کے مطالعے کے ذریعے حاصل ہوئی ہو۔ تین، پانچ، سات، زیادہ سے زیادہ دس۔ کیونکہ: ہر کس نہ شناسندہ راز است نہاں

یہ تین یا پانچ یا سات ..... افراد اپنے محاذِ جنگ کا جائزہ لیں اور جارحانہ اقدام کے مورچے تجویز اور متعین کریں۔

یہ سارا اقدام جارحانہ اس لیے ہو کہ مغربی ادب و تہذیب پر جارحانہ حملے کی گنجائش بھی ہے اور ضرورت بھی۔ اگر ہم مدافعانہ اقدام کرتے رہیں گے یا داخلی محاذ کھولیں گے (مثلاً سرسید احمد خاں وغیرہ کے خلاف) تو ہماری قوت بے مقصد ضائع ہو جائے گی۔ بے مقصد اس لیے کہ سرسید کا سیاسی و تہذیبی موقف اب خود ہی دم توڑ چکا ہے۔ ان کے ماننے والے بھی اب ان سے بہت آگے نکل گئے ہیں اور انھیں رجعت پسند نہ سہی، پرانا یا نیم ترقی پسند کہتے ہیں۔ اور ان کو نہ ماننے والے اب انھیں کوئی قوت خیال نہیں کرتے۔

بنابریں اخوان الصفا کا کام صرف مغرب کے معاشرتی فکر پر بم باری ہو، اندر کی دنیا اس قابل نہیں کہ اس سے منہ لگایا جائے اِلّا بقدرِ ضرورت۔ جدید مغربی ذہن کی تعمیر کرنے والی بڑی بڑی چند ادبی شخصیتیں، مثلاً مفکر نطشے کے بعد ناول نگار کافکا، ناول نگار دوستوفسکی، وجودی فلسفی کامیو اور سارتر اور برطانوی فلسفی برٹ رینڈ رسل، ہمارے مدِنظر رہیں تو مناسب ہوگا۔ فرائڈ، جیمز جوائس اور ڈی ایچ لارنس، ہیمنگوے وغیرہ کا کچھ اثر ہے مگر زوال پذیر۔ تاہم مغربی ذہنِ جدید کے اساطین یہی ہیں۔

اب غور فرمائیے کہ یہ حضرات اپنی قوم کو کس قسم کے انسان سے روشناس کراتے ہیں۔ پاگل، حد درجہ جذباتی، جنونی — لایعنی، احمق، وہم کے مارے ہوئے مریض، نیکی سے بیزار — تخریب کار، سچائی کا نام لے کر انسان سے دشمنی کرنے والے اور مغربی ادب کا فرزانہ گروہ خود اس حکمت پر شرمندہ ہے۔ سوشیو آلوجی کے ماہر ویبر، درخیم، سوروکن اور اب ڈینیل بیل وغیرہ پریشان ہیں کہ مغرب کا آدمی کدھر جا رہا ہے نفس کا غلام، بے یقینی، تشکی — خواہشات کا مریض اور امراض کا اشتہاری، بد باطن۔ لہٰذا کرب ہی کرب ہے۔ مغرب کا معاشی فکر اپنے تضادات کے ہاتھوں شکست و ریخت کا شکار ہے۔ مغرب کا سیاسی فکر انتشار میں مبتلا ہے۔ طرزِ ملک داری نہ جمہوری ہے، نہ فاشی صرف بد معاشی — مغرب کا شاہکار فن، ڈراما

اب اوان گارد کے وحشیانہ کھیلوں تک آپہنچا ہے۔ تعلیم کے اسکول تخریب و تشدد کی آماجگاہ ہیں اور سکون اور وقار جیسی نعمتیں نابود ہو چکی ہیں لیکن ہمارے ملک کا غلام ابنِ آزاد، اسی پر مٹا ہوا ہے۔ زیادہ کیا لکھوں۔ مغرب کا دیو زخمی ہو چکا ہے۔ اب کہاں ہیں اہلِ ایمان کہ ایک ضرب ید اللّٰہی سے اس کا خاتمہ کر دیں۔

اس حملے کے لیے غازیوں (مغرب کے کافرانِ مطلق) اور سچے عالموں کی ضرورت ہے جو مغرب سے مناظرہ کر سکیں اور علومِ مغرب سے مسلح ہوں۔ از رہِ کرم ایسے تین یا پانچ نام تجویز کیجیے۔ جب کم از کم تین آدمی ایسے جمع ہو جائیں تو پھر اس گروہ سے اجتماعی گفتگو ہو گی جس کا مقام لاہور یا کوئٹہ ہو گا۔ تدبیر کار میرے ذہن میں یہ ہے کہ:

(الف) ہم ملک بھر کے ادب کا مطالعہ کریں۔ تنقیدات کو دیکھیں، فنی رجحانات کا باقاعدہ مطالعہ کریں اور میلانات TRENDS کی ایک فہرست ماہانہ مرتب کریں۔

(ب) اس کے بعد اخوان الصفا میں عنوانات تقسیم کر دیے جائیں تاکہ وہ اپنے اپنے انداز میں تنقیدی مضامین لکھیں جنھیں الگ الگ یک جا شائع کرایا جائے۔ بہتر ہو گا کہ اشخاص سے زیادہ ہم رجحانات کو نشانۂ تنقید بنائیں۔

انداز ہر لکھنے والے کا جدا ہو سکتا ہے لیکن روح سب کی ایک ہو۔ اور آغازِ کار میں ایک "پرنسپیا" مرتب کیا جائے جو اخوان الصفا کی مشترک تحریر ہو (جس میں ہر صاحب اپنی جدا ترمیم یا جدا اضافہ بھی کر سکیں) — میرے خیال میں معاصر ادب کا مطالعہ اوّلین کام ہونا چاہیے۔ اور ادب سے مراد صرف تخیلی/تخلیقی ہی نہیں جملہ ذہنی مظاہر و نتائج مدِ نظر رہیں — بس یہ ہے خلاصہ میرے خیالات کا۔ آپ اس پر اظہارِ خیال کر کے ممنون فرمائیں — شکریہ۔

بس تے آپ کی کتاب "برشِ قلم"[۵] نہیں دیکھی — "تحریکِ پاکستان" بھی نہیں دیکھی، محرومی رہی۔ آپ نے بھی میری کتاب "پاکستان — تعبیر و تعمیر"[۶] نہیں دیکھی۔ تبادلہ مناسب ہو گا۔

مخلص
سید عبداللہ

---

(۴)

صدر ادارہ: اردو دائرۂ معارفِ اسلامیہ
پنجاب یونیورسٹی، لاہور

لاہور ۲۷ جون ۱۹۷۹ء

مکرم و محترم شمیم صاحب، سلام اہلِ اخلاص قبول باد

آپ کا مفصل اور معلومات افزا خط مجھے مل گیا ہے۔ آپ کے خیالات و میلانات سے آگاہی ہوئی۔ آپ کی تجاویز پر میں غور کر رہا ہوں۔ ان شاء اللہ تعالیٰ کسی نتیجے پر پہنچ کر آپ کو اپنے ردِ عمل سے آگاہ کر سکوں گا۔

۵۔ مطبوعہ مکتبۂ موج قلم، کوئٹہ، ۱۹۸۳ء ۶۔ مکتبہ خیابانِ ادب، لاہور، ۱۹۷۷ء

میری اور آپ کی منزل ایک ہے لیکن ایک دو معاملات میں، طریقِ پیش قدمی میں کچھ فاصلہ ہے۔ مثلاً جہاں میرا پروگرام کلیتاً یہ ہے کہ بنیادی طور پر مغرب کے ادارات و تصورات پر انھیں کے تصورات و مسلمات کے حوالے سے جرح کی جائے اور اپنے ادب یا معاصر ادب کا حوالہ محض ضمناً اور سرسری ہو ۔۔۔ وہاں آپ کا طریق اس کے بالکل برعکس یہ معلوم ہوتا ہے کہ اردو کے معاصر ادب اور ادیبوں پر جرح کی جائے اور مغربی ادب کا حوالہ ضمناً اور سرسری ہو۔

میرے خیال میں آپ کے طریق میں اندرونی جنگ ناگزیر ہے۔ اس کا سارا نتیجہ یہ نکلے گا کہ یہ بحث ذاتیاتی سمجھ لی جائے گی اور ساری محنت ضائع ہو جائے گی۔

اس کے علاوہ یہ بات میرے مزاج و مشرب کے بھی خلاف ہے ۔۔۔ میرا مسلک و مشرب ہر حال میں شفقت و محبت ہے۔ میں معنوی اور روحانی ہتھیاروں سے دوسروں کو مسخر کرنے کا قائل ہوں۔ شاید اس میں میری بزدلی اور کم ہمتی کا بھی دخل ہے:

دھمکی میں مرگیا جو نہ بابِ نبرد تھا

یا بقول میر:

ہم خستہ تن ہیں تجھ سے بھی نازک مزاج تر
تیوری چڑھائی تو نے تو یاں جی نکل گیا

لیکن میں اسے بزدلی سمجھتے ہوئے بھی بطورِ مسلک اپنانے کی کوشش کرتا ہوں ۔۔۔ یہ ہے مسلکِ دردمندی و شفقت۔ یہ میں نے میر سے سیکھا ہے یا ان صوفیا سے جو: دلِ دشمناں ہم نہ کردند تنگ

بہرحال ایک فاصلہ تو یہ ہے ۔۔۔ دوسرا فاصلہ یہ ہے کہ آپ نے احباب کی جو طویل فہرست مجھے دی ہے وہ سب میرے مکرم ہیں۔ مگر ایک دو کو چھوڑ کر باقی سبھی مغرب سے خوف زدہ لوگ ہیں۔ میرا خیال ہے کہ آپ نے انھیں سرسری دیکھا ہے ۔۔۔ جو مغرب سے ذرا بھی ڈرتا ہے، وہ میرے کام کا آدمی نہیں ۔۔۔ ہمیں ایسے لوگوں کی ضرورت ہے جو مغربی علوم پڑھ کر مغرب پر سخت ہلّہ بول سکیں۔

قدرتی طور سے آپ سوال کریں گے، وہ خوش قسمت لوگ کون ہیں جنھیں میں نے معیاری قرار دیا ہے، تو لیجیے سُنیے: ایک نام تو وہی ہے جسے لوگ شمیم احمد کہتے ہیں اور دوسرا آدھا سراج منیر ہے ۔۔۔ آدھا اس لیے کہ لڑکا ہے اور مغرب پسندوں میں بیٹھتا اٹھتا ہے۔ اسی لیے تو میں نے آغاز میں قید لگادی تھی کہ اس کام کے لیے زیادہ سے زیادہ تین یا پانچ یا سات آدمی مل سکیں گے ورنہ یہاں بقول غالب:

جو ہے سو موجِ رنگ کے دھوکے میں مر گیا!

مغرب کی عروسِ ہزار داماد نے کسی کو اسیرِ زلف بنا رکھا ہے بلکہ ہم ہوئے تم ہوئے کہ میر ہوئے والا معاملہ ہے ۔۔۔ خیر: میں آپ کے مکتوب کے مندرجات پر غور کروں گا اور مفصل جواب بعد میں لکھوں گا۔ باقی احوال بدستور۔ آپ کا ارسال کردہ مقالہ پاکستان ابھی مجھے ملا ہے۔ شکریہ۔ میری کتاب عنقریب آپ کو مل جائے گی۔

نیاز مند سید عبداللہ

---

(۵)

مسلہ وادارہ: اردو دائرۂ معارفِ اسلامیہ
پنجاب یونیورسٹی، لاہور

لاہور ۴ جولائی ۱۹۷۹ء

شمیم صاحب محترم، اسلام اخلاص قبول باد

آپ کے دو گرامی نامے آچکے ہیں۔ دونوں ہی بڑے بصیرت افروز اور فکر انگیز معلوم ہوتے۔ میں نے اپنے سابق خط میں آپ کے اور اپنے موقف کے مابین جس فاصلے کا ذکر کیا تھا وہ تو محض باریک سی وضاحت تھی، ورنہ میری اور آپ کی ہم خیالی اب تو ایک تسلیم شدہ حقیقت بن چکی ہے۔

آپ کی کتاب "۲+۲ = ۵" * پڑھنے کے بعد آپ کے اکثر مضامین میں اپنا ہی ذہنی عکس نظر آیا۔ فرق صرف اتنا ہے کہ آپ کو خداوند تعالیٰ نے جراٴتِ گفتار عطا کی ہے اور پیرایۂ بیان بھی کاٹ دار ہوتا ہے، مگر میں ان دونوں اوصاف سے خالی ہوں۔ عقیدوں میں پکا مگر لہجے میں ملائمت پسند اور مصالحت پسند ہوں۔ اس لیے یوں سمجھیے آپ کے یہاں جو چیز شعاعِ مہر درخشاں ہے وہ میرے یہاں پہنچ کر قطرۂ شبنم بن جاتی ہے مگر تعلق باہمی اور نسبت قائم رہتی ہے۔

میرے خیال میں اب موضوع پر گفتگو کافی ہو چکی ہے، اب میں ایک منشور تیار کروں گا جس میں طریقِ کار اور لائحۂ عمل ہوگا۔ اس کے بعد دیکھیے کیا ہوتا ہے۔ اس اثنا میں اعجاز فاروقی صاحب سے بھی ملاقات ہوئی، کافی ہم خیالی نظر آئی۔ اگر ضروری ہوا تو انھیں مشورے میں شریک کر لیا جائے گا.......

آپ کا مقالہ "تحریکِ پاکستان" نظر سے گزرا۔ آپ نے بہت محنت کی ہے۔ یہ مقالہ تو اس قابل تھا کہ کتابی صورت میں اچھی طرح ایڈٹ ہو کر شائع ہوتا۔ خیر پھر بھی سوغات ہے۔

والسلام، نیازمند
سید عبداللہ

قلات پبلیشرز، کوئٹہ ۔ ۱۹۷۷ء

* یہ مقالہ ۷۶-۱۹۷۷ء میں سید قاسم محمود نے "شاہکار" کے تحت بڑے سائز پر بیس ہزار کی تعداد میں شائع کیا، اب آسانی سے دستیاب نہیں۔ (ڈاکٹر سید معین الرحمٰن)

نئی کارمینہ

نظامِ ہضم کی اصلاح کے لیے زیادہ پُرتاثیر

ہمدرد کی تجربہ گاہوں میں ایک مدت سے عالمی شہرت یافتہ کارمینا کو زیادہ مؤثر بنانے کے لیے تحقیق جاری تھی تاکہ اسے دورِ جدید کے انسان کی ضروریات سے ہم آہنگ رکھا جائے۔ نئی کارمینا اسی تحقیق عمل کا ماحصل ہے۔ پودینے کے جوہر اور دیگر مفید اجزا کی شمولیت نے نئی کارمینا کو زیادہ قوی اور مؤثر بنا دیا ہے۔

نئی کارمینا نظامِ ہضم کو درست رکھنے میں اب پہلے سے زیادہ مفید و معاون ہے۔ خرابی ہضم کی شکایات مثلاً بدہضمی، قبض، گیس، دردِ شکم اور بھوک کی کمی وغیرہ کے لیے اس کی افادیت میں اضافہ ہوگیا ہے۔

نئی کارمینا [illegible] پیدا کرنے، [illegible] آنتوں کے فعل کو منظم [illegible] رکھنے میں زیادہ کارگر ہے۔

- دردِ شکم میں نئی کارمینا کی دو ٹکیاں نیم گرم پانی کے ساتھ استعمال کریں۔
- بدہضمی، قے یا متلی کی شکایت میں نئی کارمینا کی دو ٹکیاں چوسیں۔
- نئی کارمینا کی دو سے چار ٹکیاں باقاعدگی کے ساتھ رات کو سوتے وقت نیم گرم پانی سے استعمال کی جائیں تو دائمی قبض سے نجات مل جاتی ہے۔
- بھوک کی کمی کی شکایت میں صبح ناشتے سے پہلے، دوپہر اور رات کے کھانے سے قبل نئی کارمینا کی دو ٹکیاں چوسیے۔
- بچوں کو حسبِ عمر آدھی یا ایک ٹکیہ نئی کارمینا دیجیے۔

خوش ذائقہ **نئی کارمینا**

ہر گھر کی اہم ضرورت

ہم خدمتِ خلق کرتے ہیں

تحقیق، رُوحِ تخلیق ہے

Adarts

CAR - 5/88

میاں حیات بخش۔ تمغۂ قائداعظم
صدر انجمن فیض الاسلام، راولپنڈی

ڈاکٹر عبداللہ

کیا بھروسہ ہے زندگانی کا — آدمی بلبلا ہے پانی کا

۱۔ ڈاکٹر سید عبداللہ مرحوم، جن کو مرحوم کہتے ہوئے بڑی جھجک محسوس ہوتی ہے، ایک ایسے انسان تھے جو صدیوں میں ب پیدا ہوتے ہیں۔ ڈاکٹر صاحب دیکھنے میں نہایت سیدھے سادے انسان تھے مگر ان گنت خوبیوں کے مالک تھے۔ سب سے بڑی خوبی ان میں یہ تھی کہ وہ ملک و ملت کے سچے بہی خواہ تھے۔ جس قدر طالب علموں کو ان کی شاگردی کا شرف اصل ہوا، میں سمجھتا ہوں کہ وہ سب خوش قسمت تھے۔ مجھے ان کی شاگردی کا شرف تو حاصل نہیں ہوا لیکن ایک طویل رصہ یعنی چالیس سال کے قریب ان سے سلام دعا، دوستی اور واقفیت کا شرف حاصل ہوا۔ ان کی خوبیاں لاتعداد اور زوال تھیں۔ سب سے بڑی خوبی ان کی یہ تھی کہ وہ انتہائی دیانت دار، ایمان دار، ملک و ملت کے خیر خواہ اور جو کچھ ہ کہتے تھے۔ وہی کچھ کرتے تھے۔

۲۔ ہمارا منصب نہیں ہے کہ ہم انسانوں کو مدارج میں تقسیم کریں۔ اگر ہمیں کوئی اختیار ہوتا تو میں سید عبداللہ مرحوم او اولیاء اللہ میں شمار کرتا۔ انھوں نے ہر وقت اور ہر زمانے میں مسلمانوں کی اور خصوصاً مسلمان طلبہ کی صحیح رہنمائی فرمائی۔

۳۔ ترقی زبانِ اردو کے سلسلے میں وہ جنون کی حد تک پہنچے ہوئے تھے۔ انھوں نے زندگی بھر اردو کی ترویج و ترقی کے لیے بن من دھن لگا دیا۔ ملک بھر، خصوصاً پنجاب کے ہر بڑے شہر میں انھوں نے اردو کانفرنسیں منعقد کیں اور جہاں تک ھے یاد ہے انھوں نے اس سلسلے میں چندے کی کوئی مہم جاری نہ کی بلکہ دوستوں، ملنے والوں اور مداحوں کی تھوڑی بہت مداد سے ہی کام لیا۔

۴۔ ڈاکٹر سید عبداللہ واقعی جانشین بابائے اردو کہلانے کے مستحق تھے۔ نہ صرف جلوس اور جلسوں کے ذریعے اپنے اس مقصد صل کرنے کی کوشش کی بلکہ اس کے متعلق طویل اور بسیط مضامین تحریر کیے جن کو پڑھنے کا مجھے اکثر موقع ملا۔ میں یہ کہہ سکتا ہوں اردو کے متعلق ڈاکٹر صاحب کے مضامین کا ایک ایک لفظ ایسا تھا جس کی جگہ دوسرا لفظ رکھا نہیں جا سکتا۔

۵۔ میں نے چالیس سال تک ڈاکٹر صاحب کی کوششوں کو قریب سے اور عمیق نظروں سے دیکھا۔ اور مجھے یہ کہنے میں باک

ں کہ اس سلسلے میں ڈاکٹر صاحب کا کوئی ثانی نہیں تھا۔ ڈاکٹر صاحب کی تمام اچھے انسانوں میں اتنی قدر و منزلت تھی
ایک عام انسان ہوتے ہوئے فخر و مباہات سے ان کی گردن اکڑی ہوئی ہوتی۔ مگر وہ شریف انسان ویسے کا ویسا ہی
سیدھا سادہ اور مسکین مزاج رہا۔ میں نے ان کو جلسے جلوسوں میں بھی۔ بچوں کو پڑھاتے ہوئے بھی اور لائبریری میں
مطالعہ کرتے ہوئے بھی دیکھا تو انھیں ایک مسکین طالب علم کی شکل میں ہی دیکھا۔ ان کی زندگی کے چند چھوٹے چھوٹے واقعات
ہی اگر بیان کیے جائیں تو ایک شاندار عمارت نظر آتی ہے۔

۶۔ ڈاکٹر صاحب کی ابھی ہمیں بہت ضرورت تھی۔ اور مجھے ذاتی طور پر ان کے چلے جانے سے بے حد صدمہ ہوا۔ اللہ تعالیٰ
انہیں غریقِ رحمت کرے۔ اور زبانِ اردو کے طالب علموں۔ بہی خواہوں اور عاشقوں کو توفیق دے کہ وہ ان کے لگائے ہوئے
پودے کی آبیاری کرتے رہیں اور اس زبان کو اعلیٰ سے اعلیٰ مقام پر پہنچائیں۔

۷۔ یہ چند سطور میں ایسے وقت میں لکھ رہا ہوں، جب میں دو سال سے بیمار ہوں۔ اور زیادہ محنت جسمانی ہو یا دماغی
اس سے قاصر ہوں۔ اللہ تعالیٰ مرحوم کو جوارِ رحمت میں جگہ دے اور ہم سب کو ان کے نقشِ قدم پر چلنے کی توفیق عطا فرمائے
آمین۔ ثم آمین۔

اخگر سرحدی

ڈاکٹر سیّد عبداللہ

وہ زبان جسے قومی زبان کی حیثیت سے پاکستان کی ہر حکومت نے تسلیم کیا اور آئین میں اس کا باقاعدہ اندراج کیا۔ لیکن کوئی حکومت بھی اس کے نفاذ میں سرگرم عمل نہ ہو سکی۔ اس کی وجوہ صاف ظاہر ہیں کہ انگریزوں نے برصغیر سے جانے سے قبل لارڈ میکالے کی تجویز کے مطابق انگریزی زبان کے دلدادہ ایسے لوگ یہاں پیدا کر گئے جنھوں نے اقتدار میں آ کر اردو زبان کی ترویج و ترقی اور اس کے نفاذ کی ہر تجویز کو سبوتاژ کیا۔ یہاں تک کہ جنرل ضیاء الحق مرحوم کو بھی اردو زبان کے نفاذ میں کامیاب نہ ہونے دیا حالانکہ جنرل موصوف اردو دوستی کے ایسے سربراہ حکومت تھے جو دل سے ملک میں قومی زبان کے پرزور حامی تھے۔ ایسے دور میں قائدِ اردو ڈاکٹر سیّد عبداللہ کی ذاتِ گرامی اردو زبان کے نفاذ کے سلسلے میں بسا غنیمت تھی انھیں بھی اللہ تعالیٰ نے ۱۴ راگست ۱۹۸۶ء کو اپنے دامانِ رحمت میں لے لیا۔

میری ذاتی رائے ہے کہ خدائے بزرگ و برتر اہلِ پاکستان کے رویے سے ناراض معلوم ہوتے ہیں۔ اس لیے کہ وہ دونوں بنیادیں ہم نے اکھاڑ کر رکھ دیں جن کے لیے یہ پاکستان بنا تھا یعنی اسلام اور اردو زبان۔ اور ملک کو ایسے راستہ پر ڈال دیا کہ جس سے یہاں کے ہر باشندہ کو مایوسی و ناکامی کے تاریک ماحول میں اپنی زندگی کے دن گزارنے مشکل ہو رہے ہیں۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ وہ "فیضانِ نظر" پاکستان میں مفقود ہوتا جا رہا ہے۔ جس سے یہ خطۂ پاک وجود میں آیا تھا۔

ڈاکٹر سیّد عبداللہ آج سے چار سال پہلے ہم سے روٹھ گئے اور گلشنِ اقبال لاہور میں اپنا نیا "مامن" بنا لیا۔ بابائے اردو کے طویل تذکرۂ حیات کی طرح قائدِ اردو کے حالاتِ زندگی بھی طوالتِ واقعات کے مرہونِ منت ہیں۔ میں یہاں ان کی ساٹھ سالہ خدمات کا ذکر ان کے ان خطبات کے مختصر اقتباسات سے کروں گا جو انھوں نے وقتاً فوقتاً اردو زبان کی ترویج اور اس کے نفاذ کے بارے میں پاکستان کے چاروں صوبوں میں مختلف اوقات میں اردو کانفرنسوں، جلسوں اور جلوسوں میں کیے۔

ڈاکٹر سیّد عبداللہ مرحوم انجمن ترقی اردو لاہور کے ناظمِ اعلیٰ تھے اور اس حیثیت سے انھوں نے نفاذِ اردو کی سرگرمیاں جاری رکھیں۔ وہ ہر سال پاکستان کی اردو انجمنوں کے مندوبین اور اربابِ علم و ادب کو دعوتِ مشاورت

دیتے اور ایک کانفرنس کی صورت میں اردو کے بارے میں حکام و عوام کے رویّہ سے شرکاء مجلسِ مشاورت سے آگاہ کرتے اور قراردادیں منظور کر کے اربابِ حکومت کو بھجواتے اور اخبارات وجرائد میں شائع کرواتے۔

لاہور کی انجمن ترقی اردو کو حکومت سے کوئی مالی امداد نہیں ملتی تھی۔ وہ ہر سال مغربی پاکستان اردو اکادمی کے اجلاس کے ساتھ مذکورہ مجلسِ مشاورت کا بھی اہتمام کر لیا کرتے تھے۔ پہلا اجلاس پاکستان کی کسی اہم شخصیت کی صدارت میں کانٹی نینٹل ہوٹل میں ہوتا تھا جس میں خطبۂ استقبالیہ خطبۂ صدارت اور متعدد اردو علمی و ادبی مقالے پڑھے جاتے۔ دوسرے اجلاسوں میں مندوبین اپنے اپنے علاقوں میں اردو زبان کی ترویج و نفاذ کے بارے میں اپنی رپورٹیں پیش کرتے اور پھر قراردادیں منظور کی جاتی تھیں۔ علاوہ ازیں جب بھی حکومت یا اس کے کسی وزیر مشیر کی طرف سے کوئی ایسا بیان اخبارات میں شائع ہوتا جس سے اردو کی قومی حیثیت پر زد پڑتی نظر آتی تو ڈاکٹر سیّد عبداللہ فوراً اس کا جواب مدلّل طریقے پر نرم لہجے میں دیتے۔

ڈاکٹر صاحب مرحوم نے پنجاب، صوبہ سرحد، بلوچستان اور صوبہ سندھ میں متعدد اردو کانفرنسوں میں شرکت فرمائی اور اردو کی حمایت میں وقیع رہنمائی کے فرائض انجام دیے اور اپنے خیالات سے حکومت و عوام پر واشگاف الفاظ میں واضح کر گئے کہ جب تک انگریزی زبان کی بالادستی ملک میں قائم رہے گی، ملک اور قوم انتشار کا شکار رہیں گے۔ مختلف صوبوں میں اتحاد و سالمیت کی صرف ایک ہی صورت ہے کہ اردو کو قومی زبان کی حیثیت میں آئین کے مطابق ملک کے مرکز اور ہر صوبے کے شعبۂ حیات میں جلد از جلد رائج کر دیا جائے۔

انھوں نے مقتدرہ قومی زبان اور اکادمی ادبیاتِ پاکستان کے قیام کے کچھ دنوں بعد ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی، ڈاکٹر جمیل جالبی، میجر آفتاب حسن اور دوسرے اکابرینِ اردو کے ساتھ مل کر ملک میں اردو زبان رائج کرنے کی تدریجی رپورٹ مرتب کر کے حکومت کو پیش کی جس پر ضیا حکومت نے تھوڑا بہت عمل کیا۔ اور پھر سرد خانے میں ڈال دیا گیا۔ جس کا نتیجہ ہے کہ ملک آج بھی انگریزی زبان کی بالادستی کی چکی میں پس رہا ہے اور اردو زبان اور اہلِ پاکستان استحکامِ ملک کی نعمتِ عظمیٰ سے محروم چلے آرہے ہیں۔

اب میں ڈاکٹر سیّد عبداللہ کے چند خطبات و خطوط کے مختصر اقتباسات ذیل میں پیش کر رہا ہوں جس پر آپ ان کے آئینۂ افکار میں اردو زبان کی اہمیت و ضرورت کی تجاویزی صورت ملاحظہ کرسکیں گے۔

اقتباسات

خطبۂ استقبال ۲ر نومبر ۱۹۷۳ء جو پاکستان کی اردو انجمنوں کے دسویں سالانہ مجلسِ مشاورت میں پڑھا گیا

۱۔ "گزشتہ کانفرنس کے بعد ملک میں اردو کے سلسلے میں جو کچھ ہوا ہے وہ آپ کو خود معلوم ہے لہٰذا محتاجِ تفصیل نہیں۔ البتہ میں احباب میں پھیلے ہوئے ایک عام تاثر کا بطورِ خاص ذکر کرنا چاہتا ہوں۔ بہت سے لوگ یہ کہنے لگے ہیں کہ اب پاکستان میں اردو کا کوئی مستقبل نہیں۔ اور یہ بھی کہ یہاں بھی نیوزی لینڈ اور آسٹریلیا وغیرہ کی طرح انگریزی ہی کو قومی زبان، سرکاری زبان، مادری زبان اور پیدائشی زبان

بنانے کی تیاریاں مکمل ہو چکی ہیں۔ اردو کے پُرجوش کارکن اب اپنے خطوط میں شدید مایوسی کا اظہار کرنے لگے ہیں۔ کچھ دوستوں نے لکھا ہے کہ پنجاب، صوبہ سرحد اور بلوچستان میں ایک سال کے اندر اندر اردو کو سرکاری زبان بنانے کے جو وعدے کیے گئے تھے وہ پورے نہیں ہوئے۔ ہر چند کہ ان کی شکایتوں میں خاصی سچائی پائی جاتی ہے، تاہم میں اپنے کرم فرماؤں سے کہوں گا کہ وہ مایوس نہ ہوں۔ ایسی باتیں نہ کہیں جن سے انگریزی کے میلان کو تقویت پہنچتی ہو۔"

۲۔ یہ خطبہ ڈاکٹر صاحب نے ۲۶ر اکتوبر ۱۹۷۴ء میں پاکستان کی اردو انجمنوں کی گیارہویں سالانہ کانفرنس میں پڑھا۔

"۱۹۷۰ء کے انتخاب کے نتیجے میں اور مشرقی پاکستان کی علاحدگی کے بعد ۱۹۷۱ء میں باقی ماندہ پاکستان میں نئی حکومت قائم ہو گئی۔ تھوڑے عرصے کے بعد پہلے بلوچستان میں اس کے بعد صوبہ سرحد اور پنجاب میں اردو کو صوبائی سطح پر سرکاری دفتری زبان بنا دینے کا فیصلہ ہوا مگر مرکز میں قومی سطح پر اردو کو سرکاری حیثیت دینے کے بجائے پندرہ برس تک انگریزی کی بالادستی کو برقرار رکھنے کا فیصلہ ہو گیا۔ یہ بتائے بغیر کہ اس کے بعد کیا ہونا چاہیے۔ اس نئے فیصلے کے باعث بے یقینی کی فضا پھر عود کر آئی۔ حوصلے پست ہو گئے اور مجھے اس امر کا برملا اعتراف ہے کہ اردو کی تحریک اب کسی روشن مستقبل سے مایوس نظر آتی ہے۔"

۳۔ یہ خطبہ سرگودھا قومی کانفرنس منعقدہ ۲ر نومبر ۱۹۷۵ء میں پڑھا گیا۔

"میں نے ہمیشہ یہ بات واضح طور پر کہی ہے کہ اردو کسی ایک گروہ یا فرقے کی زبان نہیں، یہ تو سب گروہوں اور سب خطوں کی زبان ہے۔ اور یہی اس کی فضیلت اور ترجیح ہے۔ میں نے قوم کو ہمیشہ یاد دلایا کہ ملک میں سب سے بڑا لسانی مسئلہ یہ ہے کہ انگریزی زبان بلاجواز تمام کاروبارِ زندگی پر غالب ہے، یہ اس کا ناجائز غلبہ ہے جس نے ہمارے یہاں لسانی مسئلہ پیدا کیا ہوا ہے۔ ہوشیاری تو دیکھیے کہ حقوق کا غصب تو انگریزی نے کر رکھا ہے مگر پاکستانی زبانیں اپنی نادانی سے آپس میں دست و گریباں ہیں۔ لیکن انگریزی کے متعلق چشم پوشی بلکہ قدرے الفت کا انداز ہے۔ میں کہتا ہوں کہ پہلے انگریزی کی بے جا بالادستی کو مل کر ختم کریں اس کے بعد پاکستانی زبانوں کا قابلِ رشک معاہدہ خود بخود ہو جائے گا۔"

۲ر نومبر ۱۹۷۵ء

۴۔ ایک خط جو اختر سرحدی صدر انجمن ترقی اردو سرگودھا کے نام لکھا گیا۔

"اس وقت پاکستان نفرتوں کے طوفان کی زد میں ہے۔ یہ نفرت ہندو مسلم قسم کی نفرت نہیں، یہ مسلم کی مسلم سے، پاکستانی کی پاکستانی سے نفرت ہے۔ اور سخت خطرناک ہے۔ میرا ایمان ہے کہ یہ اس ملک کی تباہی کا سامان ہے۔ لہٰذا ہر پاکستانی کا فرض ہے کہ یہ لسانی سطح پر اور اردو کے پلیٹ فارم سے یک جہتی کا پیغام عام کیا جائے۔"

۵۔ یہ خطبہ انھوں نے ۹ر نومبر ۱۹۷۷ء میں علامہ اقبال اردو کانفرنس لاہور میں پڑھا۔

"ہماری قوم کے بڑے طبقے کے خیال میں کسی سچے پاکستانی کی پہچان انگریزی بولنے، غلط انگریزی لکھنے، انگریزی کھانے پینے کے سوا ممکن ہی نہیں۔ تو گویا ملّتِ بیضا کے فرزند آخر کار یہاں پہنچے کہ اپنے گھر کا ہر دیا بجھا دیا۔ اور غیروں کے گھر کے چراغ اپنی سفیدگی کے روغن سے روشن کر دیے۔ بہرحال قوم ہو تو ایسی، دانشوری ہو تو ایسی، غلامی ہو تو ایسی کہ اپنی خودی کا ہر نشان مٹ جائے اور نامردانہ موت مرنے پر وصیت یہی کی جائے کہ ہمارا خون بہا بھی جلاد کو دیا جائے۔ ایسا لگتا ہے کہ یہ کوئی فرنگی جزیرہ ہے جس کی ہر بات فرنگیانہ ہے۔ اور لطف کی بات یہ ہے کہ ان کی زبانوں پر علامہ اقبال کی خودی کے اشعار بھی جاری ہیں۔ اب فرمائیے کہ خودی اور خودکشی کا یہ امتزاج علامہ مرحوم کو کس طرح خوش آئے گا۔ بہرحال ہم ان کی چالوں کو بخوبی سمجھنے لگے ہیں کہ گوالمنڈی اور چنگڑ محلہ اسکول کے پڑھنے والے چپراسی بننے جائیں اور ان صاحبوں کی اولاد شروع ہی سے انگریزی کلچر میں ڈوب کر شانِ فخفوری کے ساتھ آقا اور حاکم بننے کی سند حاصل کرتی رہے۔ لیکن یہ چالاکی اب دیر تک نہیں چلے گی۔ کیونکہ عام لوگ انگریزی اردو کے قضیئے کو سمجھ چکے ہیں۔

۶۔ یہ خطبۂ استقبالیہ ڈاکٹر صاحب مرحوم نے اردو انجمن کی ۸ویں سالانہ کانفرنس میں بتاریخ ۲۷ نومبر ۱۹۸۰ء میں پڑھا

"اِدھر ایک نیا گل اور کھل رہا ہے۔ یعنی ایک تازہ مہم یہ چلی ہے کہ اردو مشکل زبان ہے۔ گویا اس سے عربی فارسی کے الفاظ نکال دو۔ غرض یہ سب اردو کو برباد کرنے کی مہمات ہیں۔ انشاء اللہ کامیاب نہ ہوں گی۔ اس ملک میں اگر انگریزی نے بالکل نڈھال نہ کر دیا تو اردو ہی چلے گی۔ یہی وہ اردو ہے جس کو سرسید احمد خاں، ڈاکٹر اقبال، حضرت قائداعظم، مولانا محمد علی جوہر اور ظفر علی خاں نے قومی زبان تسلیم کیا ہے اور اسی میں اظہارِ خیال کیا ہے۔"

۷۔ ڈاکٹر صاحب نے اپنے ایک خط محررہ ۸۱/۸/۲۲ میں اخگر سرحدی کو بتلایا۔

"پنجاب یونیورسٹی آغاز میں علوم مشرقیہ اور علوم مغربیہ بذریعہ اردو کے لیے قائم ہوئی تھی۔ نوابوں، اور راجوں، مہاراجوں نے اسی غرض سے بڑی بڑی رقمیں دی تھیں۔ پھر "میکالے ازم" غالب آتا گیا اور میکالے کی اولاد نے ایک ایک کر کے اردو اور مشرقیات کا نقش مٹا دیا۔ اور اب وہ سلسلہ اور بھی بڑھ رہا ہے۔ ہماری یونیورسٹی پٹیالہ یونیورسٹی بنتی جا رہی ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ پنجاب یونیورسٹی کو اردو یونیورسٹی بنانے کا نعرہ تنظیم سے بلند کیا جائے۔ میرے خیال میں اس کے لیے تاریخی تہذیبی اور عقلی جواز موجود ہے۔

ڈاکٹر انور سدید

ڈاکٹر سید عبداللہ ـــــ یادیں اور باتیں

صابر لودھی صاحب نے ۱۵؍ اگست کی صبح کو سیر کے دوران کہا "جلدی سے تیار ہو جائیں جنازہ آٹھ بجے اٹھالیا جائے گا!"
میں نے حیرت سے پوچھا "لودھی صاحب! کس کا جنازہ؟"
اب انھوں نے حیران ہو کر مجھے دیکھا اور کہا "آپ کو معین الرحمٰن صاحب نے اطلاع نہیں دی؟ ـــ ڈاکٹر سید عبداللہ کل رات فوت ہو گئے۔ ان کا جنازہ "المامن" سے آٹھ بجے اٹھے گا۔ لیکن ابھی تک یہ فیصلہ نہیں ہو سکا کہ تدفین ان کے آبائی گاؤں منگلورہ میں ہو گی یا لاہور میں۔"

میرا دل دھک سے رہ گیا۔ لیکن یہ خبر تو کئی دنوں سے مرتب ہو رہی تھی، ڈاکٹر صاحب کئی دنوں سے موت اور حیات کی کشمکش میں مبتلا تھے۔ تین دن پہلے ڈاکٹر وزیر آغا اور میں ان کی عیادت کے لیے گئے تو بیگم صاحبہ نے بڑے ضبط و تحمل سے اپنے آنسوؤں کو روک رکھا تھا۔ ان کی بیٹی عطیہ سید ان کے پاس خاموش بیٹھی تھیں۔ جیسے ایک فعال اور طغیان انگیز زندگی کو آسودۂ ساحل ہوتے ہوئے حسرت سے دیکھ رہی تھیں۔ سید صاحب پلنگ پر آنکھیں بند کیے لیٹے تھے۔ ساتھ کی میز پر ان کی ٹوپی پڑی تھی، فرش پر ان کے بوٹ رکھے تھے جن پر تازہ پالش کی گئی تھی۔ یوں لگتا تھا کہ سید صاحب کی آنکھ لگ گئی ہے۔ ابھی اٹھیں گے اور ادارہ معارفِ اسلامیہ میں اپنے فرائض منصبی کی ادائیگی کے لیے چل دیں گے۔ وزیر آغا کو بھی چپ لگ گئی۔ میرے گلے میں بھی ہوا کا گولا سا اٹک گیا۔ ہم سب ایک دوسرے کی کیفیت کو محسوس کر رہے تھے، لیکن آج ہم میں سے کسی کو گویائی پر قدرت حاصل نہیں تھی۔ ہم دیر تک اسی طرح گم صم بیٹھے رہے ـــ چلنے لگے تو بیگم صاحبہ نے کہا "کئی دنوں سے یہی حالت ہے۔ پہلے گویائی ختم ہوئی، پھر پہچان جاتی رہی، اب آنکھیں بھی نہیں کھولتے" اور یہ کہتے کہتے ان کی آواز رندھ گئی۔ آغا صاحب نے بولنے کی کوشش کی لیکن وہ بول نہ سکے۔ میں نے بے بسی سے آسمان کی طرف دیکھا اور دل ہی دل میں سید صاحب کی صحت کے لیے دعا کی۔ لیکن شاید قبولِ دعا کا لمحہ گزر چکا تھا۔ صابر لودھی صاحب نے بہتر گھنٹے بعد اطلاع دی کہ سید صاحب کا پیمانۂ عمر خالی ہو گیا تھا۔ مولوی عبدالحق اور مولانا صلاح الدین احمد کے بعد اردو زبان و ادب کا ایک اور مخلص رہنما دنیا سے رخصت ہو گیا تھا۔ ایک شفیق استاد، ایک ممتاز محقق، ایک کشادہ نظر نقاد اور ایک عظیم انسان نے عالمِ بالا کا سفر اختیار کر لیا تھا۔ انھیں

زیرِ لحد اتارنے والوں کی آنکھوں میں آنسو بھی تھے اور ان کی زندگی کی خوش گوار یادوں کے ستارے بھی تھے جو کبھی چمکنے لگتے اور کبھی پن جھالروں میں ڈوب جاتے۔ کبھی اوس کے دانے بن جاتے، کبھی سفید پھول نظر آنے لگتے۔

ڈاکٹر سید عبداللہ سے یہ میری آخری ملاقات تھی۔ میرا ذاتی دکھ یہ تھا کہ اب میں سیّد صاحب کو کبھی مل نہیں سکوں گا۔ انھیں کبھی گل فشاں نہیں دیکھ سکوں گا۔ ادب کے ایک معمولی طالب علم کی حیثیت سے ان کے ساتھ میں نے اپنی زندگی کی آدھی صدی گزاری تھی۔ ان کی میر پسندی کا مشاہدہ کیا تھا۔ ان کی غالب دوستی کا نظارہ کیا تھا۔ اقبال سے ان کی محبت اور عقیدت کو روز افزوں بڑھتا ہوا دیکھا تھا۔ اسلام اور پاکستان سے ان کی گہری وابستگی اور اردو سے ان کے عشقِ صادق کے نقوشِ عمل دیکھے تھے۔ ان کے فیض کے چشمے تاعمر جاری رہے اور ان سے ہر شخص نے اپنے ذوق و ظرف کے مطابق پیاس بجھائی۔ انھوں نے ہزاروں طالب علموں کا رزقِ حیات اردو کے ساتھ وابستہ کیا۔ انھیں زبان و ادب کی تہذیب سکھائی۔ لکھنے کا ذوق و شعور عطا کیا۔ لیکن آج اس سرچشمۂ جود و سخا سے ہم سب کا واسطہ ٹوٹ گیا تھا۔ سب اس حادثے پر ملول تھے۔ سب ان کی رحلت پر دکھی تھے۔

ڈاکٹر سید عبداللہ نے اپنی زندگی کا بیشتر حصّہ لاہور میں گزارا۔ لیکن وہ لاہوری نہیں تھے۔ وہ ضلع ہزارہ کے ایک غیر معروف گاؤں منگلور میں ۱۹۰۷ء میں پیدا ہوئے۔ چند سال قبل میں پنجاب ٹورازم ڈیپارٹمنٹ کی بس میں سوات جا رہا تھا تو راستے میں سڑک کے کنارے ایک مقام پر نیلے رنگ کے بورڈ پر سفید حروف میں منگلور لکھا ہوا دیکھا تو بے اختیار میرا ذہن سیّد صاحب کی طرف گیا اور میں نے اس گاؤں کے سامنے عقیدت سے سر جھکا دیا کہ اس کی خاکِ مقدس پر سیّد عبداللہ صاحب پیدا ہوئے تھے۔ لیکن بعد میں ایبٹ آباد کے قریب ایک گاؤں قلندر آباد میں چند ایّام گزارنے کا موقع ملا اور وہاں ڈاکٹر صابر کلوروی صاحب سے ملاقات ہوئی تو انھوں نے مغرب کی جانب ایک اونچی پہاڑی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بتایا۔ "وہ سامنے سیّد صاحب کا مولدِ گرامی ہے۔" میں نے ایک دفعہ پھر سیّد صاحب کو یاد کیا اور اس گاؤں کے سامنے سرِ عقیدت خم کر دیا۔ یوں محسوس ہوا کہ صابر کلوروی صاحب کے ذکر ہی میں نہیں، پوری فضا میں سیّد صاحب کی خوشبو پھیلی ہوئی تھی۔

سید صاحب کے والد اس علاقے کے ایک ممتاز عالمِ دین اور فقیہہ تھے، انھیں کی وساطت سے سیّد صاحب عربی اور فارسی زبان سے متعارف ہوئے۔ گھر کے مدرسے میں تعلیم پائی، ذوقِ ادب پروان چڑھایا۔ اور جب علم کی تشنگی بڑھ گئی اور منگلور محدود نظر آنے لگا تو سیّد صاحب لاہور آ گئے جو علم کا گہوارہ اور سیاست کا جھگواڑا تھا۔ یہاں سیّد صاحب کے جملہ اوصاف کو نکھرنے اور اپنا جوہر دکھانے کا موقع ملا۔ انگریز دشمنی کا مزاج وہ اپنے گاؤں سے لے کر آئے تھے۔ سیّد احمد شہید کی تحریک کا رزم ان کے آبائی وطن کے قرب و جوار میں آراستہ ہوا تھا۔ اس تحریک کے جاں فروشوں کے قصّے انھوں نے اپنے بچپن میں سُنے تھے۔ اس دور کی تحریکی سیاست نے انھیں سب سے پہلے اور سب سے زیادہ متاثر کیا۔ تعلیم ترک کر کے علی گڑھ جامعہ ملّیہ میں چلے گئے۔ سیاسی کاموں میں حصّہ لینے لگے۔ دل میں آزادی کی آتش سوزاں تھی، اس کی آسودگی کے لیے محمد علی جوہر کو اپنا رہنما کیا اور تحریکِ خلافت میں بڑھ چڑھ کر حصّہ لیا۔ تحریکِ خلافت کا شیرازہ بکھرا تو عملی سیاست پر علم کی طلب غالب آ گئی۔ لاہور کی مساجد میں عربی کی تعلیم حاصل کی۔ اورینٹل کالج میں مولانا تا میمن سے فیض اٹھایا۔ یہاں انھیں حافظ محمود شیرانی اور ڈاکٹر مولوی محمد شفیع اور پروفیسر اقبال کی صحبت نصیب ہوئی۔

عرب ہوٹل میں ان کے ہم جلیس مولانا صلاح الدین احمد، مولانا چراغ حسن حسرت، باری علیگ اور عبداللہ بٹ جیسے لوگ تھے جو حوادثِ زمانہ اور حالاتِ سیاست پر نظر رکھتے تھے۔ لیکن سیاست کو ادبب کی خنک مزاجی پر غالب نہیں آنے دیتے تھے۔ یہ اہلِ علم کی محفل تھی جس میں کتاب اور خیال زیادہ زیرِ بحث آتا۔ شاعری کی بحث، زندگی کے کھردرے زاویوں کو ہموار کردیتی ہے۔ میرزا ادیب نے درست لکھا ہے کہ:

"اگر اس زمانے میں سید صاحب کو حافظ شیرانی اور ڈاکٹر مولوی محمد شفیع کی صحبت نصیب نہ ہوتی تو یونیورسٹی لائبریری کے بجائے جیل ان کا ٹھکانا ہوتی۔"

لائبریری میں سید صاحب کا تعلق نہ صرف علمی تھا بلکہ لائبریری ان کی زندگی کی کفیل بھی تھی۔ وہ ۱۹۳۴ء میں شعبۂ عربی فارسی اور اردو میں مہتمم کے طور پر ملازم ہو گئے تھے اور اس کے ساتھ ہی تحقیقِ ادب کا کام بھی کرتے تھے۔ اس ملازمت سے ان کا جی خوش نہیں تھا لیکن وہ اس بات کا اعتراف بھی برملا کرتے تھے کہ "مجھے اس سے بے حد علمی فائدہ ہوا۔ کتابوں کا علم وسیع ہو گیا اور یہ میری آئندہ زندگی میں نہ صرف میرا معاون بنا بلکہ اس سے مجھے بہت فائدہ بھی پہنچا۔"

سید صاحب کو اس بات پر بھی ناز تھا کہ آزادی کے بعد جب پنجاب یونیورسٹی لائبریری کا ہندو عملہ نقل مکانی کر کے بھارت چلا گیا اور لاہور میں کتابوں کی لوٹ عام ہو گئی تو انھوں نے صرف چار آدمیوں کے ساتھ کتب خانے کو محفوظ رکھا۔ اسے بند نہ ہونے دیا اور اسے مزید ترقی دی۔ سید صاحب اس وقت اعزازی چیف لائبریرین تھے۔ انھیں اس بات پر فخر تھا کہ اس پُرآشوب دور میں انھوں نے کتاب اور کتاب خانے کی خدمت کی[۱]۔ اس خدمت کو دلِ دردمند اور شوقِ بے نہایت سے سرانجام دیا۔ کتابوں کی ایک مکمل لائبریری کا حصول ان کی زندگی کے چند عظیم مقاصد میں سے تھا۔ قدرت نے انھیں یہ انعام دیا کہ ایک بڑے کتب خانے کو ان کی تحویل میں دے دیا۔ یہاں وہ دوسرے ادیبوں کے لیے تحقیق کرتے اور انھیں مزید کام کرنے کے لیے مصدقہ مواد فراہم کرتے۔ ان کے تحقیقی مقالات میں سے "شہر آشوب کی تاریخ"۔ "اردو کی ترقی میں خانِ آرزو کا حصّہ"۔ "عہدِ اسلامی کے پرانے آثار"۔ "اردو کا قدیم ترین شاعر"۔ "تذکروں کی اہمیت تنقید کے نقطۂ نظر سے"۔ "کیا غزل نیم وحشی صنفِ ادب ہے؟" "فارسی کے زیرِ سایہ زبانِ اردو کی تدریجی ترقی"۔ "تخلص کی رسم اور اس کی تاریخ"۔ "قدیم عربی تصانیف میں ہندی الفاظ" اس دور کے چند اہم مقالات ہیں جب وہ نمود و نمائش سے بے نیاز ہو کر خالصتاً ادب کی خدمت کے لیے زندگی وقف کر چکے تھے۔ اور بقولِ خود "اپنے اساتذۂ کبار کے زیرِ اثر لسانی، تاریخی اور سوانحی تحقیق میں دلچسپی لے رہے تھے۔"

---

[۱] سید عبداللہ صاحب کی اس خدمت کو ڈاکٹر عمر حیات ملک نے بہت سراہا۔ لیکن جب میاں افضل حسین وائس چانسلر ہو کر آئے تو انھوں نے ڈاکٹر سید عبداللہ کی بے قدری کی۔ چنانچہ ڈاکٹر صاحب لائبریری کی اعزازی خدمت سے مستعفی ہو کر صرف اورینٹل کالج لاہور کے ہو رہے۔ اورینٹل کالج میں بھی میاں افضل حسین کا سید صاحب سے رویّہ معاندانہ رہا۔ چنانچہ جب سید صاحب ان کے سامنے لیکچرر شپ کے لیے پیش ہوئے تو زبان و ادب پر سوال کرنے کے بجائے دریافت کیا "آپ کو سائیکل چلانی آتی ہے؟" سید صاحب نے جواب دیا "جی نہیں، میں پیدل چلتا ہوں۔ کتاب پڑھتا ہوں اور قلم چلاتا ہوں۔"

بظاہر یوں معلوم ہوتا ہے کہ تحقیق ادب، کتاب اور کتب خانے کے تعلق نے ان کے لیے معلّمی کی راہ ہموار کی لیکن سیّد صاحب نے خود لکھا ہے کہ:

"تدریس میرے بزرگوں کا مشغلہ رہا ہے۔ میری طبیعت بھی تدریس ہی کو اپنے لیے موزوں سمجھتی تھی"

چنانچہ انھوں نے اورینٹل کالج میں پہلے منشی فاضل کے طلبہ کو پڑھایا۔ پھر ایم۔اے فارسی کے نصاب کی تدریس کرنے لگے۔ آزادی کے بعد اورینٹل کالج میں اردو کے ریڈر مقرر ہوئے۔ صدر شعبۂ اردو بنے۔ پرنسپل کے عہدے پر تعینات کیے گئے اور فروری ۱۹۶۵ء کو جب وہ اورینٹل کالج کو اورینٹل یونیورسٹی بنانے کا خواب دیکھ رہے تھے تو رضاکارانہ ریٹائرمنٹ اختیار کرلی۔ یہ فیصلہ اتنا حیران کن تھا کہ سب لوگ انگشت بدنداں رہ گئے۔ ڈاکٹر ممتاز منگلوری نے اس واقعے کا تذکرہ یوں کیا ہے:

"۲۵ جنوری ۱۹۶۵ء کی دوپہر کو استاد محترم ڈاکٹر سیّد عبداللہ اورینٹل کالج میں اپنے دفتر میں بیٹھے ہوئے اساتذہ کے ساتھ مصروف گفتگو تھے کہ انھوں نے بڑی خاموشی سے اپنے ذاتی کاغذات میں سے ایک کاغذ نکال کر لفافے میں بند کر کے یونیورسٹی کے دفتر کو بھیج دیا۔ میں اس کاغذ کی نوعیت سے باخبر تھا۔ پاسِ ادب دل میں امنڈتے ہوئے طوفان کے اظہار میں مانع تھا۔ اس محفل میں موجود اصحاب کو اس بات کا وہم و گمان بھی نہ تھا کہ اس سکون کے ساتھ جو لفافہ بھجوایا گیا ہے اس میں قبلہ سیّد صاحب نے اورینٹل کالج اور پنجاب یونیورسٹی سے اپنی چالیس برس کی وابستگی کو منقطع کرنے کا فیصلہ کیا ہے ... بالآخر ۱۳ فروری کی شام کو لاہور ریڈیو نے اپنی مقامی خبروں میں ... تصدیق کر دی ... سنڈیکیٹ نے استادِ محترم کو قبل از وقت ریٹائر ہو جانے کی اجازت دے دی تھی"[۱]

یونیورسٹی سے سیّد صاحب کی ریٹائرمنٹ درحقیقت انسائیکلوپیڈیا آف اسلام کے منصوبے کی تکمیل کے لیے ان کی ضرورت کا شاخسانہ تھی۔ چنانچہ اس منصوبے کی تکمیل کا اعزاز انھیں کو حاصل ہوا۔ اہم بات یہ ہے کہ وہ ریٹائرمنٹ کے بعد تقریباً پندرہ برس زندہ رہے، یہ پندرہ برس بھی ان کی سابقہ زندگی ہی کی طرح بے حد فعال اور بہت زرخیز ثابت ہوئے۔ انھیں ایک علمی ادیب تسلیم کیا گیا۔ اردو کے مقاصد کے حصول کے لیے انھوں نے متعدد کانفرنسیں کیں، جلوس نکالے، قراردادیں پاس کروائیں اور مختلف اداروں، انجمنوں اور تنظیموں کو اردو کے لیے کام کرنے کی ترغیب دی اور ان کی سرپرستی کر کے نوجوان کارکنوں کے شوق و ولولہ کو تازہ رکھا۔ شمیم احمد نے ان کی زندگی میں انھیں خراجِ تحسین ادا کیا اور لکھا کہ:

"ڈاکٹر سیّد عبداللہ ہمارے اقدار سے تہی اور نصب العین سے خالی معاشرے میں خود ایک قدر اور ایک نصب العین کا درجہ رکھتے ہیں۔ خلوص، محنت، لگن اور بے غرضی مگر تمام نمود کی خواہش سے عاری ایسی شخصیت ہمارے لیے باعثِ طمانیت بھی ہے اور طمانیت کا سبب بھی"

---

[۱] "میں نے جس ذہنی اور روحانی تکلیف سے اپنے کالج کو چھوڑا اس کا اندازہ ہمدردوں کے شہر کے باسی نہیں لگا سکتے" (ڈاکٹر سیّد عبداللہ)

سیّد صاحب منگلور سے نکلے تو بالکل گمنام تھے۔ لیکن ان کا شعار دیانتدارانہ محنت، عمل پیہم اور جہدِ مسلسل تھا۔ ان کا ایقان تھا کہ:

"زندگی بغیر کسی نصب العین کے بیکار ہے۔ زندگی جس قدر وقیع اور بلند ہوگی نصب العین بھی اسی قدر ارفع اور اعلیٰ ہوگا۔ مجھے ان لوگوں پر افسوس ہوتا ہے جو کسی آئیڈیل کے بغیر زندگی بسر کر کے مر جاتے ہیں۔ جب کوئی اعلیٰ نصب العین پیشِ نظر نہ ہو تو انسان کے سینے میں وہ حرارت پیدا ہی نہیں ہو سکتی جو اسے مسلسل مصائب برداشت کرنے کا حوصلہ عطا کرتی ہے۔ علم حاصل کرنا اور اس میں وقیع درجہ حاصل کرنا بھی ایک بہت بڑا نصب العین ہے۔"

اس ایقان کے تحت ہی انھوں نے ہمیشہ آگے کی طرف دیکھا اور عظمت و ناموری حاصل کی۔ بیاضِ ادب پر نقشِ دوام پیدا کیا۔ ہنگاموں میں شرکت کی لیکن ہنگامے کو نصب العین پہ غالب آنے کی اجازت نہ دی۔ ان کی عادت تھی کہ عین ہنگامِ وغا میں صلح کا سفید پھریرا لہرا دیتے۔ الفاظ کی توپوں کے دہانوں کو بند کرا دیتے۔ سیّد صاحب کہا کرتے تھے

" اصل مقصد خاموشی کے ساتھ کام کرنا ہے۔ دروازہ بند کر کے کام کرو۔ ایک اسکالر کا یہی فرض ہے اور یہی فرض ہونا چاہیے۔"

مجھے یاد ہے کہ ایک محترم ادیب کے ساتھ ادب میں ارضیت کے مسئلے پر ان کا اختلاف پیدا ہو گیا۔ ادیب مذکور نے دھرتی کو زرخیزی اور نمو کی علامت بنا کر اردو شاعری کا مزاج متعین کرنے کی کاوش کی تھی۔ سیّد صاحب کا خیال تھا کہ اس سے اسلامی مملکت میں زمین کو آورش بنائے جانے کا خطرہ ہے جس سے آسمان کی اہمیت کم ہو جاتی ہے۔ چنانچہ انھوں نے ایک مقامی رسالے میں اپنا موقف تیز و تند الفاظ میں بیان کیا اور ان خطرات کی نشاندہی بھی کی جو متذکرہ کتاب کے مطالعے سے ان کے بطونِ دل میں پرورش پانے لگے تھے۔ دوسری جانب سے بھی مدلّل جواب مقالے کی صورت میں پیش کیا گیا اور ثابت کیا گیا کہ سیّد صاحب کے خدشات موہوم ہیں اور اردو کی بیشتر شاعری ارضی مزاج ہی کی حامل ہے اور ایسے اشعار سے بھری ہوئی ہے۔ سیّد صاحب نے جوابی مضمون پڑھا تو معاملے کی نوعیت کو بھانپ گئے اور بحث کو آگے بڑھنے سے روک دیا۔ پھر اس پر اکتفا نہیں کیا بلکہ ایک کانفرنس کے سلسلے میں جب وہ ادیب مذکور کے شہر میں گئے تو انھیں لاہور سے خط لکھ دیا کہ وہ کانفرنس میں مقالہ پڑھیں گے۔ لیکن قیام ان کے ہاں کریں گے اور کھانا بھی ان کے ساتھ کھائیں گے۔ اب اس بات کا میں عینی شاہد ہوں کہ سیّد صاحب تشریف لائے تو نہ صرف متذکرہ موضوع پر کھل کر بحث کی بلکہ جہاں تک وہ فریقِ ثانی کے نقطۂ نظر کو اپنے خیالات سے ہم آہنگ سمجھتے تھے اس کی داد بھی دی۔ اس کے بعد جو رشتۂ محبت پیدا ہوا وہ سیّد صاحب کے دمِ آخر تک قائم رہا۔ میرزا ادیب نے لکھا ہے کہ سیّد صاحب دردمندی کو ادب کا سرچشمہ خیال کرتے تھے۔ ان کا خیال تھا کہ "جب تک سینے کی گہرائیوں میں درد پیدا نہ ہو، احساسات میں خلوص پیدا ہو ہی نہیں سکتا۔ خلوص ہی ادب کی جان ہے۔ دوسروں کے جذبات کو سمجھنا اور ہمدردی کے ساتھ سمجھنا ہمدردی ہی کا نتیجہ ہے۔ ایک ادیب کو سب سے پہلے ایک دلِ دردمند ہونا چاہیے۔" خود انھیں مبدءِ فیاض نے دلِ دردمند عطا کیا تھا اور وہ "دل بدست آور کہ

مجمع اکبراست" کے زیر اثر ذاتی اور ادبی اختلاف کو ڈھیل نہیں دیتے تھے۔ زندگی میں انھیں دردمندی کی کہیں ذرا سی رمق بھی نظر آجاتی تو اسے قدر کی نگہ سے دیکھتے اور اسے خیر کثیر کی تقسیم کا عمل سمجھتے ہوئے اس کا تذکرہ بار بار کرتے ان کی زندگی اور مزاج پر جن واقعات نے گہرا اثر ڈالا ان میں سے ایک کا تذکرہ خود سید صاحب نے ان الفاظ میں کیا ہے۔

> "میں ایف۔ اے کا امتحان دے رہا تھا۔ لاہور کے بڑے کالجوں کے پرنسپلوں میں سے کوئی شخص پرائیویٹ طلبہ کے فارموں پر دستخط کرنے کے لیے آمادہ نہ ہوجاتا تھا۔ مجھ سے کسی نے کہا کہ لالہ رگھبیر دیال پرنسپل سناتن دھرم کالج سے ملو۔ میں گیا۔ اپنی باری پر بلایا گیا۔ کرسی پر سے ایک شخص اٹھا۔ دو دفعہ دست بستہ نمستے کہا۔ بٹھایا۔ فارم لیا۔ دستخط کیے اور کہا "کاکا جی! جب بھی کوئی کام ہو بے تکلف آجایا کرو"
>
> پھر بڑے انکسار سے دوبارہ نمستے کہا اور رخصت کیا ــــ میں جو کہ پندرہ روز سے بڑے بڑے پرنسپلوں کے دفتروں کے سامنے دھکے کھاتا رہا تھا حیرت زدہ ہوا اور سوچنے لگا یا اللہ شائستگی ہو تو منصب اور انکسار کا اجتماع ممکن ہے"

یہ واقعہ بے حد معمولی ہے لیکن سید صاحب نے اسے نہ صرف ساری عمر یاد رکھا بلکہ انکسار اور دردمندی کو اپنی شخصیت کا جزو بھی بنا لیا۔ وہ سیمابی بے چینی سے زندگی بھر دوڑتے بھاگتے رہے۔ تحمل اور بردباری کو اس طرح گلے لگایا کہ ان کا پیغام پیغام محبت بن گیا۔ جسے سننے کے لیے لوگ گوش بر آواز رہتے تھے۔ ان کے مخاطبین میں ادب، تعلیم، سیاست اور دین کے لوگ شامل تھے ــــ وہ بات کرنے لگتے تو بات طول کھینچ جاتی۔ یوں لگتا کہ سید صاحب کے باطن سے خیالات کا دھارا اُبل رہا ہے اور ہر خیال کو لب سید پر آنے کی جلدی ہے۔ چنانچہ وہ تقریر کو دلچسپ مقولوں اور لطیفوں سے سجانے لگتے اور سامع کی توجہ کو اپنی گرفت سے باہر نکلنے نہ دیتے۔ وہ اکثر کہا کرتے تھے کہ "طول کلام عاشقانہ عادت ہے" اور سامعین کی اس نفسیات سے بھی آشنا تھے ــــ وہ مشکل موضوعاتی مقالات سے اکتا جاتے ہیں۔ سید صاحب کی باری چونکہ تقریب کے آخر میں آتی تھی اور لوگ اس وقت تک تھک چکے ہوتے تھے اس لیے وہ بالعموم یہ حربہ آزماتے تھے کہ "میں لکھا ہوا مقالہ نہیں پڑھوں گا" یہ کہہ کر وہ سامعین کو لکھا ہوا مقالہ دکھاتے اور اسے سامنے میز پر رکھ دیتے۔ زبانی تقریر شروع کرتے اور یہ بالعموم قہقہہ بار لطیفوں سے مرصع ہوتی۔ جب محفل کا رنگ بدل جاتا اور سامعین کی تھکن اتر جاتی تو جزواً جزواً سارا مقالہ بھی پڑھ ڈالتے۔ سید صاحب اسے اپنی کاریگری شمار کرتے تھے۔ اس کی ضرورت انھیں معلمی کے ابتدائی ایام میں پڑی تھی۔ وہ دیکھتے کہ طلبہ مسلسل نوٹ لکھنے سے تھک گئے ہیں تو سید صاحب بالعموم وہ نسخہ آزماتے جو انھوں نے اپنے زمانۂ طالب علمی میں "مواعظ اشرفیہ" میں پڑھا تھا۔ مولانا اشرف علی تھانوی کے وعظوں میں مطالب و معارف، لطائف و اشعار سے اس طرح شیر و شکر ہیں کہ ہر وعظ شاخ شکر بن گیا ہے۔ اشعار کو اشعار کی مدد سے پڑھانے کا طریقہ انھوں نے پروفیسر ایم۔ اے غنی اور صوفی غلام مصطفٰے تبسم سے سیکھا تھا۔ چنانچہ طلبہ نہ صرف ان سے محبت کرتے تھے بلکہ ان کی کلاس سے کبھی غیر حاضر نہ ہوتے اور ان کی غیر حاضری میں بھی ان کی تولف کرتے تھے۔

سیّد صاحب کی تدریس کا ذکر آیا ہے تو یہ عرض کرنا ضروری ہے کہ وہ تدریس کے کسی پیشہ ورانہ ادارے کے تربیت یافتہ نہیں تھے۔ ان کی ابتدائی تعلیم مسجد کے مدرسے میں ہوئی تھی۔ ان کے آئیڈیل استاد مثلاً حافظ محمود شیرانی، ڈاکٹر مولوی محمد اقبال اور مولوی محمد شفیع صاحب بھی تعلیم کے مشرقی دبستان ہی کے نمائندہ تھے۔ سیّد صاحب نے ایم۔ اے اردو کی کلاسیں جاری کیں تو یہ ان کے لیے ایک کڑا امتحان تھا۔ ڈاکٹر عمر حیات ملک نے انھیں تلقین کی تھی کہ ایم۔ اے اردو کی تدریس کا معیار انگریزی معیار سے بھی بلند رکھنا۔ موضوعات پر لیکچر دینا ان کے لیے ایک نیا مگر دشوار تجربہ تھا۔ اس تجربے کی دشواری میں مزید اضافہ یوں ہو گیا کہ ان کے ابتدائی شاگردوں میں قیوم نظر، یوسف ظفر جیسے شاعر اور ملک بشیر الرحمٰن جیسے صاحبِ ذوق اصحاب شامل تھے۔ سیّد صاحب فرماتے تھے کہ "میں ان کی موجودگی میں خائف رہتا تھا" لیکن پھر انھوں نے راستہ خود بنا لیا

"انھیں مخصوص ماحول کی وجہ سے تھوڑی سی کاری گری بھی کرنی پڑی"

ان "کاری گری" کا ایک پہلو یہ تھا کہ وہ اپنے کلاس لیکچر کے اشارات کی تائید کے لیے اپنے مطالعات کا فائل اور بہت سی متعلقہ کتابیں کلاس میں اپنے ساتھ لے جایا کرتے تھے[1] اور حسبِ ضرورت اقتباسات سُنا دیا کرتے۔ جس سے ان کی محنت کا رعب پڑتا۔ ان کی دوسری کاری گری یہ تھی کہ لیکچر کے دوران اپنی بات کو سند بنانے کے لیے ممتاز اردو اور انگریزی نقادوں کی آرا کے حوالے دیتے چلے جاتے جن کی ثقاہت مسلّم تھی۔ اس عمل میں سیّد صاحب بقول خود طلبہ کے نفسیات پر نظر رکھتے تھے اور مطالب کی باتیں ان کے اشارات میں پہلے سے موجود ہوتی تھیں۔

ایم۔ اے اردو کی کلاس کا اجرا کیا تو انھیں مناسب اسٹاف دستیاب نہیں تھا۔ سیّد صاحب تعلیم اردو کے اس تجربے کو ناکامی سے دوچار کرنا نہیں چاہتے تھے۔ اردو کی تدریس کے لیے انھیں مقامی کالجوں سے اساتذہ کی معاونت بھی حاصل نہ تھی۔ چنانچہ ساتوں پرچوں کی تدریس کا انتظام انھیں خود کرنا تھا۔ یہاں بھی سیّد صاحب نے اپنی کاری گری کا جوہر دکھایا اور ملک کے نامور ادبا مثلاً سر شیخ عبدالقادر، مولانا صلاح الدین احمد، مولوی محمد یحییٰ تنہا کو مختلف موضوعات پر اعزازی لیکچر دینے پر آمادہ کیا۔ یہ اصحاب بھی چاہتے تھے کہ ایم۔ اے اردو کا تجربہ یونیورسٹی میں ہو اور کامیاب ہو۔ چنانچہ سر شیخ عبدالقادر دیوانِ غالب پڑھاتے۔ مولانا صلاح الدین احمد اردو ناول اور افسانہ کے ارتقا پر لیکچر دیتے۔ یحییٰ تنہا صاحب تاریخِ ادب کا درس دیتے۔ اس نجی انتظام کے تحت سیّد صاحب نے جو ٹائم ٹیبل تیار کیا وہ بڑا رعب دار تھا۔ اسے دیکھ کر ڈاکٹر عمر حیات (وائس چانسلر) بہت خوش ہوئے اور باقاعدہ اساتذہ کے تقرر میں ان کی عملی مدد بھی کی۔

ڈاکٹر سیّد عبداللہ نے اپنی زندگی خود بنائی تھی۔ وہ ٹاٹ کے مدرسے سے شروع ہوئے اور علومِ شرقیہ کی شہرۂ آفاق درس گاہ اورینٹل کالج لاہور کے پرنسپل کے عہدے پر پہنچے۔ ان کی مدرسانہ زندگی کا تمام زمانہ بے حد روشن نظر آتا ہے۔ ان کا

---

[1] ڈاکٹر عبادت بریلوی نے لکھا ہے کہ "لیکچر سے قبل ان کا چپراسی کل محمد کتابیں، نوٹس اور رجسٹر وغیرہ لے کر پہلے کلاس روم میں میز پر رکھ دیتا۔ یہ گویا اس بات کا اعلان ہوتا کہ سیّد صاحب لیکچر دینے کے لیے آ رہے ہیں۔" (یارانِ دیرینہ)

گراف بلند سے بلند تر ہوتا گیا۔ لیکن یہ تمام کامیابیاں انھیں مشکلات و موانع کے بغیر حاصل نہیں ہوئیں۔ سیّد صاحب مشکلات و موانع کے سامنے سینہ سپر ہو جاتے۔ تائیدِ الٰہی ان کی یاوری کرتی اور مشکل نہ صرف خود بہ خود رفع ہو جاتی بلکہ ان کی کامیابی کا راستہ بھی ہموار ہو جاتا۔ اس قسم کا ایک واقعہ انھیں اس وقت پیش آیا جب پنجاب یونیورسٹی میں ان کی ریڈر شپ زیرِ غور آئی۔ سیّد صاحب خلیفہ شجاع الدین اور مکند لال پوری گروپ کے نمائندہ تھے۔ دوسرے مخالف گروہ میں وائس چانسلر جسٹس عبدالرحمٰن اور ہندو مہاسبھائی ذہن کے مالک جسٹس بخش ٹیک چند شامل تھے۔ وائس چانسلر کے حلقۂ احباب میں مولانا تاجور نجیب آبادی تھے جنھیں پروفیسر مولوی محمد شفیع سے شدید عناد تھا۔ چنانچہ سیّد صاحب بھی گروہی سیاست کی لپیٹ میں آگئے۔ لیکن پھر خدا کا کرنا یہ ہوا کہ بخش ٹیک چند نے مخالفانہ رویّہ ترک دیا۔ سیّد صاحب کے لیے مولوی عبدالحق نے اپنے حلقۂ اثر میں کام کیا۔ سنڈیکیٹ کے ایک اور رکن جسٹس دین محمد نے علالت کے باوجود اور طبّی مشورے کے خلاف جلسے میں شرکت کی۔ چنانچہ جب مسئلہ پیش ہوا تو سر عبدالرحمٰن بالکل تنہا تھے۔ سیّد صاحب کو خدا نے کامیابی سے سرفراز کیا۔

اردو کی پروفیسر شپ کا مرحلہ آیا تو اس اسامی کے امیدواروں میں سیّد صاحب کے دو ماتحت استاد بھی شامل ہو گئے۔ اب سیّد صاحب کے لیے تشویش کا باعث یہ تھا کہ اگر وہ ناکام، اور ان دو اصحاب میں سے کوئی ایک کامیاب ہو جاتا ہے تو ان کے لیے ملازمت سے مستعفی ہو جانے کے سوا اور کوئی چارہ نہیں تھا۔ سیّد صاحب بے حد پریشان تھے لیکن یہاں بھی تائیدِ الٰہی نے ان کی یاوری کی اور آخری فیصلہ ان کے حق ہی میں ہوا۔ سیّد صاحب نے اس واقعے پر روشنی ڈالتے ہوئے اپنے اس انوکھے تجربے کا اظہار بھی کیا ہے کہ:

"مجھے سب سے زیادہ مدد عبدالستّار صدّیقی مرحوم (پروفیسر الٰہ آباد یونیورسٹی)۔ ڈاکٹر زبید احمد ریڈر شعبۂ عربی الٰہ آباد یونیورسٹی اور ڈاکٹر اعجاز حسین ریڈر شعبۂ اردو الٰہ آباد یونیورسٹی سے ملی اور عجیب ماجرا یہ ہوا کہ جن بزرگوں سے مجھے سب سے زیادہ توقع تھی انھوں نے مجھے اپنی تائید سے محروم رکھا..... میاں بشیر احمد (قائدِ تحریکِ اردو اور مدیر "ہمایون") نے مجھے اس لیے اس عہدے کے قابل نہ سمجھا کہ میں ثقلِ سماعت میں مبتلا ہوں۔"

سیّد صاحب جب کبھی یہ واقعہ سناتے تو ان پر بہجت کی ایک خاص کیفیت طاری ہو جاتی۔ وہ پورے ایمانِ محکم سے کہتے کہ "آزمائش کی دنیا بڑی آزمائش میں مبتلا رکھتی ہے لیکن درگزر اور بے خودی کا جذبہ موجود ہو تو بڑی سے بڑی آزمائش آسان ہو جاتی ہے۔" چنانچہ وہ مخالفوں کا ذکر بھی محبّت سے کرتے۔ ان کی مخالفت کو انسانی کمزوری شمار کرتے اور تعلقات پر حرف نہ آنے دیتے۔ دل خراش ذاتی قصوں کو کوتاہ کر دیتے۔ اس معاملے میں ان کا مسلک یہ تھا کہ "نیکی کی حکایت جتنی دراز ہو مناسب ہے۔ اور رنجش کی کہانی جتنی مختصر ہو بہتر ہے۔ رنجش کی باتوں کو پھیلانا یا زیادہ دیر تک یاد رکھنا آئینِ درویشی کے خلاف ہے۔" پطرس بخاری اور ڈاکٹر تاثیر کے بارے میں ان کا خیال تھا کہ ان کی راہ میں روڑے اٹکانے والوں میں سے تھے، وہ انھیں اورینٹل کالج میں ان کے حق سے محروم رکھنا چاہتے تھے۔ لیکن جب ان کے بارے میں اظہارِ رائے کیا تو فرمایا کہ:

"بخاری کے لیے میرے دل میں بڑی عزت تھی۔ وہ مشہور استاد، نامور ادیب اور غضب کے مجلس آرا تھے۔

ڈاکٹر تاثیر ایک نابغہ شخص تھے۔ خوش بیان، خوش گفتار، فن شناس، ادیب گر، شاعر، مقرر، اور مجلس آرا۔ ان سے میرے کچھ مراسم بھی تھے۔ میاں بشیر احمد مدیر "ہمایوں" کی مخالفت کے باوجود کہا کہ اردو کے سلسلے میں وہ میرے محبوب راہنما ہیں۔[1]

دل چسپ بات یہ ہے کہ ان کے ماتحت جن دو اساتذہ نے پروفیسر شپ میں ان کا مقابلہ کیا تھا ان کا نام سیّد صاحب ے اپنی خود نوشت میں درج نہیں کیا۔ ان کا ذکر آیا تو یہ کہہ کر آگے گزر گئے کہ "میرے یہ دونوں دوست بقیدِ حیات ہیں اور مجھ سے ان کے اسم بھی ہیں۔"

سیّد صاحب اپنے کسی ہم عصر کی تنقیص کرنے سے گریز کرتے تھے۔ تاہم یہ بات بھی نہیں تھی کہ وہ تیر کھا کر اور کمین گاہ میں دوستوں ـ دیکھ کر کرب کی کیفیت سے نہیں گزرتے تھے۔ وہ اپنے یارانِ نامور کے علم کا اعتراف کرتے، ان کے فن کے قائل ہو جاتے لیکن ِ کھا کر گھائل بھی ہو جاتے اور اپنے آپ کو تنہا اور اداس محسوس کرنے لگتے۔ اپنی کس مپرسی پر خود انھیں رحم آجاتا۔ لیکن پھر شعر ان کا قِ تنہائی بن جاتا۔ وہ میر، حافظ اور اقبال کو گنگنانے لگتے۔ اپنے سب سے بڑے ندیم آسمانی دوست (خدا) سے ہم کلامی کرتے۔ دں پر حرفِ دعا آجاتا تو انھیں بڑی تسکین ملتی۔ ایک دفعہ تنہائی کے کسی بیکراں دشت سے گزر رہے تھے۔ حالات کچھ یوں تھے۔

صد بیاباں برنگِ صوتِ جرس   ان پہ تھی بے کسی و تنہائی

سیّد صاحب نے حافظ شیراز کی طرف رجوع کیا۔ آواز آئی:

درطریقت پیشِ سالک ہرچہ آید خیر اوست   در صراطِ مستقیم اے دل کسے گمراہ نیست

آواز کے آتے ہی سیّد صاحب نے شیوۂ تسلیم و رضا اختیار کر لیا اور کھوئی ہوئی طمانیت حاصل کر لی۔ بے کسی اور تنہائی کا احساس چھٹ گیا۔

دوسری طرف تعریف و تحسین کا باب کھلتا تو سیّد صاحب کا قلم گل افشانیِ اظہار باندازِ دگر کرتا۔ تحقیق میں وہ جتنے جابر اور ںت تھے، تنقید میں وہ اتنے ہی کشادہ نظر اور وسیع الظرف تھے۔ اظہارِ اختلاف کا موقع آجاتا تو وہ گریز اختیار نہ کرتے لیکن اپنے نہ میں پھول کا قلم تھام لیتے اور اختلاف اس شائستہ انداز میں کرتے کہ جملہ خوشبو دینے لگتا۔ اس کی ایک عمدہ مثال مولانا محمد حسین آزاد ، ان کا اختلاف ہے، ملاحظہ کیجیے:

"مجھے اعتراف ہے کہ میں نے جب بھی میر کے متعلق آزاد کا تبصرہ "آبِ حیات" پڑھا، مجھے اکثر دکھ ہوا۔ دکھ اس لیے نہیں کہ میر مجروح ہوئے بلکہ اس بات کا دکھ ہے کہ میر پر یہ زیادتی میرے محبوب مصنف آزاد سے کیوں ہوئی؟"[11]

سیّد صاحب تنقید میں بظاہر غیر جانب دار نظر آتے ہیں لیکن درحقیقت وہ ایک ایسے وکیل ہیں جو استغاثہ کے تمام الزام رد ںنے کے درپے ہے اور اس کے پاس دلائل کے علاوہ دستاویزی شہادتیں بھی موجود ہیں۔ مثال کے طور پر ظفر علی خاں کی شاعری میں

---

[1] سیّد صاحب نے میاں بشیر احمد کی شاعری پر ایک خیال انگیز مقالہ بھی لکھا ہے جو ان کی کتاب "سخن ور نئے اور پرانے" میں شامل ہے۔ (انور سدید)

غم کے نقدان کا سوال اٹھایا گیا تو انھوں نے ظفر علی خاں کا دفاع کیا اور غم کا سراغ ان کی زندگی میں لگایا جو زیادہ آسودہ نہیں تھی۔ انھیں قید و بند کی صعوبتیں۔ اخبار "زمیندار" پر جرمانے اور پے در پے ضبطیاں، اپنوں کی بے مہریاں، دوستوں کی رقابتیں، معاصرین کی منافقتیں، سب کا سامنا تھا۔ حتیٰ کہ فرزند عزیز بھی ان کے لیے آسودگی کا باعث نہ تھے۔ وہ نہ نوجوانی میں ان کے لیے سیف بنے نہ پیری میں ان کے لیے عصا ثابت ہوئے۔" اس قسم کے حالات میں ظفر علی خاں جیسا فطری شاعر احساس غم سے کیسے عاری ہو سکتا تھا۔ سیّد صاحب نے فرمایا "ظفر علی خاں غم سے بے نصیب تھے۔ ان پر بھی حوادث کا اثر ہوتا تھا۔ فرق صرف یہ ہے کہ غم کے تجربات و واردات سے ان کے نباہ کا طریقہ مختلف تھا۔ انھوں نے اس کے اظہار کے لیے اپنی طبیعت و تربیت کے مطابق خاص صورتیں اختیار کیں۔ اور ان کو ایسی شکل دی کہ غم غم نہ رہا، ایک اور طرح کا تجربہ بن گیا۔ جس میں غم کی ظاہری صورت مٹ گئی لیکن غور سے پڑھنے والے پر یہ منکشف ہو ہی جاتا کہ ظفر علی خاں کے اندر غم کے جذبے ہمیشہ سلگتے رہے۔"

اس مدلّل وکالت کے بعد سید صاحب نے اس نظم کا حوالہ دیا جس میں مولانا ظفر علی خاں نے جیل سے اپنے پوتے منصور سے خطاب کیا ہے۔ چند اشعار حسب ذیل ہیں:

مجھ سے ملنے کس لیے زنداں میں منصور آگیا ڈھونڈتی تھیں جس کو آنکھیں چشم بد دور آگیا
جس مکاں میں تھا اندھیرا اس میں پھیلی روشنی چیر کر ظلمت کے پردے آنکھ میں نور آگیا
جانِ بابا! اس سیہ خانے میں تم کیوں آگئے میں تو ہو کر اپنی اس عادت سے مجبور آگیا
اس کا رونا، اس کا ہنسنا، اس کی شوخی اس کی ضد مجھ کو یاد اختر ترے بچپن کا دستور آگیا

سیّد صاحب نے لکھا کہ "اس نظم میں واقعی ظفر علی خاں کے دل کا کرب بول رہا ہے مگر یہ بالکل غیر معمولی ہے۔ ایسا شخصی غم ان کی نظموں میں بہت کم ہے۔" اس قسم کی ایک اور مثال وہ نظم ہے جو انھوں نے مہر و سالک کی "زمیندار" سے علاحدگی پر لکھی اور دوستوں کی بے مہری کا غم نمایاں کیا:

انقلاب زمانہ دیکھیے گا کل جو تھے دوست آج ہیں دشمن
جھک گئی تھی جو بار احساں سے اب ہے اکڑی ہوئی وہی گردن
میرے دامن نے دی پناہ جنھیں ہاتھ ان کا ہے اور مرا دامن

سیّد صاحب نے شخصی غم کے بجائے ظفر علی خاں کے ہاں اجتماعی غم کا زاویہ دریافت کیا جو شعور ضدیت کی پیداوار تھا اور جس میں احتجاج کی صورت بھی منتقل ہو گئی تھی۔ ظفر علی خاں کا غم بقول سیّد صاحب "دبے ہوئے شخص کے ردّعمل کی ایک برتر صورت تھی۔" اور اس کے دستاویزی ثبوت کے لیے انھوں نے مولانا کے متعدد اشعار کا حوالہ دیا۔ حتیٰ کہ ان کی نعت کو بھی ان کے اظہارِ غم ہی کا زاویہ قرار دیا۔ چند اشعار حسب ذیل ہیں۔

جو کام ہو نہ سکا و لیم اور کرسن سے محمدِ عربی کے غلام کر لیں گے
قدم ڈگمگایا نہیں لاجپت کا مگر پائے جوہر رہ پھٹنے لگا
ان کی حکمت لندنی او رپیش پا افتادہ ہے میری حکمت یثربی اور سیزدہ صد سالہ ہے

غلامی کی شکایت کرنے والے یہ تو فرمائیں　　　کہاں میں آج تک کتنے بھگت سنگھ اور دت نکلے

سید صاحب کی تنقید کا یہ پہلو ان کے ان عمومی رویے کو سامنے لاتا ہے جس کے تحت وہ غلط العام لیکن قبولِ عوام بات کی نفی کرتے تھے اور حقیقت کا زاویہ اپنے نقطۂ نظر سے روشن کر دیتے تھے۔ تنقید میں اس قسم کا رویہ خاصہ کمیاب ہے۔

سید صاحب کی تنقید کی ایک اور خوبی یہ تھی کہ وہ معاصرین ادب کے لیے نرم گوشہ رکھنے کے باوجود مقطع میں سخن گسترانہ بات بھی کہہ جاتے تھے۔ اور یہ سخن گسترانہ بات تنقید کا توازن برقرار رکھنے کے لیے نہیں ہوتی تھی۔ اکثر اوقات تو یوں لگتا ہے کہ سید صاحب کا بنیادی نقطہ بھی تھا کہ جسے پیش کرنے کے لیے انھوں نے طویل شکر چڑھی تمہید لکھی ہے۔ اس قسم کے مواقع پر وہ ضبط کا دامن تھام لیتے اور قدرے معذرت خواہانہ رویہ اختیار کرتے کہ خیالِ خاطرِ احباب قائم رہے اور کسی آبگینے میں ٹھیس نہ لگے۔ ان کے ہاں تعریف و تحسین کی کمی نہیں تھی اور معاصر ادبا کے لیے تو وہ تعریف و تحسین کچھاور کرنا اتنا ہی ضروری سمجھتے تھے جتنا زندگی کے لیے آکسیجن ضروری ہے۔ لیکن وہ ہر شخص کے مرتبہ آشنا تھے، اس کے فن کی قدر و قیمت کو پہچانتے تھے اور ایسے مواقع پر ایک آدھ جملے سے "مجبوری" کا اظہار بھی کر دیتے تھے۔ مثال کے طور پر ان کا مقالہ "وہ کہ شاعر بھی ہے ....." اس جملے سے شروع ہوتا ہے۔

"یہ مختصر سی تحریر محض اظہارِ عقیدت کے لیے لکھ رہا ہوں"

ان کی کتاب "سخنور — نئے اور پرانے" میں متعدد مقالات کے آخر میں سید صاحب نے وضاحت کر دی ہے کہ یہ تحریر دیباچے کے طور پر لکھی گئی تھی۔ جس کا صاف مطلب یہ ہے کہ اس میں تعریفی اور تحسینی پہلو غالب ہے۔ تاہم میرا خیال ہے کہ وہ تعریف و تحسین کی فراوانی میں بھی حق بات بالعموم بالواسطہ کہہ جاتے تھے .... مثال کے طور پر ایک بہت بڑے غزل نگار کے بارے میں فرمایا کہ،

"حفیظ ہوشیارپوری غزل گوئی کی اس روایت کے شاعر ہیں جس کی بہار حسرت موہانی، جگر مرادآبادی، فانی بدایونی اور اصغر گونڈوی کے دیوانِ شعر میں ملتی ہے۔ ان میں سے حسرت اور اصغر کا رنگ ہوشیارپوری کے کلام میں ذرا زیادہ نمایاں ہے...... گویا حفیظ کی غزل ان کے منفرد شخصی رنگِ طبیعت کے باوجود زبان و بیان (اور ایک حد تک) روحِ مطالب کے لحاظ سے مذکورہ شعرائے کبار کے سلسلے کی چیز ہے اور یہ امر قدرتی اس لیے ہے کہ حفیظ کے زمانے میں اور ان کے سامنے انھیں غزل گویوں کے کلام کے مقبول نمونے موجود تھے۔ حفیظ نے غزل کا وہ اسلوب اختیار کیا جو وقت کا مقبول ترین اسلوب تھا اور یہ اسلوب مذکورہ بالا شعرا ہی کا تھا"

سید صاحب کی ایک معروف عادت یہ تھی کہ انھیں کوئی تحریر، مضمون یا کتاب پسند آجاتی تو وہ مصنف کو اپنی گراں قدر رائے لکھ کر بھیجتے تھے، ان کا مقصد حوصلہ افزائی کرنا بھی ہوتا تھا لیکن اس عمل سے وہ یہ ظاہر کرتے تھے کہ نئے لکھنے والے کو سینئر ادبا پڑھ رہے ہیں اور وہ اس کے بارے میں مثبت رائے رکھتے ہیں۔ اس کا دوسرا مقصد سید صاحب یہ بیان کرتے تھے کہ نیا لکھنے والا تخلیقِ فن کا کام جاری رکھے، اور عدمِ تحسین سے گھبرا کر ابتدا ہی میں کہیں ادب کا میدان چھوڑ نہ دے۔ وہ نئے چراغوں کو بجھتا

ہمیشہ فراوانی سے نچھاور کی۔ مجھے یاد ہے کہ ۱۹۷۵ء کی ایک شام جب میں ۵۸ سول لائنز سرگودھا میں بسر کرنے کے لیے حسب معمول پہنچا تو ڈاکٹر وزیر آغا نے خاکستری رنگ کا ایک بڑا لفافہ جس پر سبز روشنائی سے "اوراق" کا پتا درج تھا، میری طرف بڑھایا۔ میں نے لفافہ چاک کیا تو اس میں سے "اختلافات" پر سید صاحب کا مضمون برآمد ہوا۔ میرے لیے یہ مضمون اس لیے اہم تھا کہ یہ ایک نووارد تنقید کی کتاب پر ایک ایسے فاضلِ ادب کا مقالہ تھا جس سے مجھے اپنی نیازمندی کے اظہار کا موقع نہیں ملا تھا اور ملاقات تھی تو وہ بھی تقریباتی نوعیت کی اور بالکل واجبی سی ــــ سید صاحب نے جس ڈرامائی انداز میں حوصلہ افزائی کی تھی اس کی ابتدا دیدنی ہے۔ انھوں نے لکھا :

> "یہ کتاب (اختلافات) خاصہ عرصہ میرے پاس پڑی رہی۔ میں پہلے اس کے مطالعہ کے بعد اس پر اظہارِ رائے سے ڈرتا رہا۔ یہ عاجز اختلافوں کی دنیا سے گھبرا کر ایک گوشۂ عافیت میں پناہ گزیں ہے اور جنگِ ہفتاد و ملت سے دور ــــ "از ماجز حکایتِ مہر و وفا مپرس" کہتا ہوا "ہمہ را ینکی یاد کردن" کے طریقۂ راسخۂ قدما پر عمل کرتا ہوا ایک خاص مسلک اختیار کر چکا ہے۔ اس لیے پڑھے بغیر ہی سمجھ لیا کہ کتاب کا نام "اختلافات ہے" تو اس میں کچھ جھگڑے ہی کی باتیں ہوں گی۔ لہٰذا اس کے مطالعے کو ٹالتا رہا۔ تاآں کہ مجھے دو موضوعات کے بارے میں مواد کی ضرورت پڑ گئی۔ ایک موضوع تھا ــــ "جدیدیت کیا ہے ؟" اور دوسرا مبحث تھا ــــ "انشائیہ کی پہچان" یہ دو مضمون ضرورت نے زبردستی پڑھوائے اور جب میں پڑھ چکا تو میں نے محسوس کیا کہ کتاب کے متعلق میرا تعصب بے جا تھا۔"

سید صاحب نے جب یہ لکھا کہ "اس کتاب کے ہر مضمون میں تنقیدی بصیرت اور علمیت کے چراغ روشن ہیں" تو ڈاکٹر وزیر آغا نے اپنی کرسی سے اٹھ کر مجھے مبارک باد دی اور کہا "انور سدید! اب تم مستند نقاد بن گئے ہو ــــ" لیکن میں مسرت محسوس کرنے کے باوجود ان سے یہ کہے بغیر نہ رہ سکا کہ

> "آغا صاحب! یہ ایک بزرگ نقاد کا اظہارِ مروت ہے جس نے مجھے مستقبل کے ایک کڑے امتحان سے دوچار کر دیا ہے۔"

اعترافِ حقیقت کے طور پر عرض کرتا ہوں کہ اس کے بعد میں نے جب بھی قلم اٹھایا۔ سید صاحب کے متذکرہ مقالے کا آخری پیراگراف تنقید کی عملی بوطیقا کے طور پر ہمیشہ میرے پیشِ نظر رہا۔ انھوں نے فرمایا تھا کہ

> "ڈاکٹر وزیر آغا خوش ہوتے ہیں کہ انور سدید نے روایت کو آگے بڑھایا ہے مگر میں انور سدید سے اس لیے خوش ہوں کہ انھوں نے بےباک صاف گوئی کے باوجود اپنے مضامین کو ذاتی عناد کی آلودگی سے بچایا ہے۔
>
> سچ بولنا اچھا ہے لیکن سچ بولتے وقت اپنے وقار کو ضائع نہ کرنا اس سے بھی اچھا ہے۔"

سید صاحب کا یہ مقالہ ان سے میرے ذاتی تعلقات کی ابتدا تھی۔ میں انھیں اپنا محسن، بزرگ اور مربی شمار کرتا تھا۔

چنانچہ اسی جذبے کی شہ پر میں نے سیّد صاحب سے اپنی ایک نئی کتاب۔ "میر انیس کی اقلیمِ سخن" پر دیباچہ لکھنے کی درخواست کی تو وہ اسے بلطائفِ حیل ٹال گئے اور واپسی ڈاک سے مسودہ مجھے لوٹا دیا۔ دوسری طرف دل چسپ بات یہ ہوئی کہ چند روز کے بعد ان کا ملفوفِ گرامی موصول ہوا تو اس میں میری مطبوعہ کتاب "اقبال کے کلاسیکی نقوش" پر انھوں نے اپنا مقالہ ارسال فرمایا تھا۔ جس میں انھوں نے حسبِ معمول مجھ پر شفقت اور مروّت کا اظہار کیا گیا تھا۔ گویا مجھے ایک اور امتحان کی صلیب پر کھڑا کر دیا تھا۔

مجھے یہاں اپنے اس خصوصی اعزاز کا ذکر بھی کرنا ہے کہ ڈاکٹر سیّد عبداللہ میرے پی۔ ایچ۔ ڈی کے مقالے کے اکسٹرنل ممتحن تھے۔ جب "اردو ادب کی تحریکیں" پر دوسرے ممتحن ڈاکٹر شمس الدین صدیقی کی رائے پنجاب یونیورسٹی کو موصول ہوگئی تو سیّد صاحب ہی کو میرا زبانی امتحان (وائی وا) لینے پر بھی مقرر کیا گیا۔ جس میں ڈاکٹر وزیر آغا کو مقالے کے نگراں اور راہنما کی حیثیت میں شرکت کرنی تھی۔ سیّد صاحب کی سہولت کے پیشِ نظر یہ امتحان دائرہ معارفِ اسلامیہ کے دفتر میں لیا گیا۔ وزیر آغا صاحب نے ابتدا ہی میں سوالات کی عنان ڈاکٹر سیّد عبداللہ کے ہاتھ میں پکڑا دی اور مجھے کہا کہ "سیّد صاحب کے سوالات کے جواب دیجیے، ان کی تشفی کرائیے۔" اب جو سوالات کا سلسلہ شروع ہوا تو ابتدا ہی میں اختلاف پیدا ہو گیا۔ اس مقالے میں میرا موقف یہ تھا کہ ادبی تحریک بالعموم ایک انوکھے سوال کے بیج سے جنم لیتی ہے۔ اس سوال سے نیا رجحان پیدا ہوتا ہے جسے قبولِ عام حاصل ہو جائے تو تحریک کی صورت اختیار کر جاتا ہے۔ میرا خیال تھا کہ ادبی تحریک میں بالعموم سیاسی تحریکوں کی طرح کسی راہنما کی ضرورت نہیں پڑتی بلکہ خود رو کی طرح پیدا ہوتی، بڑھتی اور پھیلتی ہے۔ اور اس کے لیے کسی تحریری مینوفسٹو کی ضرورت بھی نہیں ہوتی۔

سیّد صاحب علی گڑھ تحریک سے متاثر تھے۔ ان کی نظر میں ترقی پسند ادب کی تحریک کا منظر اور پس منظر بھی تھا۔ جس میں باقاعدہ ایک دستور بنایا گیا تھا اور سیّد سجاّد ظہیر کو اس تحریک کے راہنما کی حیثیت حاصل تھی۔ چنانچہ انھوں نے اس زاویے سے میرے موقف سے اتفاق نہ کیا۔ میں نے ان دونوں تحریکوں پر مدلّل بحث کی تھی اور اسے استثنائی حیثیت دی تھی۔ میں نے اپنے اس موقف پر اصرار کیا اور بحث پھیلنے لگی تو دو تین گھنٹوں میں بھی سمیٹی نہ جا سکی۔ اس دوران میں سیّد صاحب ضخیم ٹائپ شدہ مقالہ کھولتے اور میں دیکھتا کہ انھوں نے جگہ جگہ اسے نشان زد کر رکھا تھا۔ سیّد صاحب نے امتحان لینے سے پہلے اس مقالے کا ایک ایک لفظ پڑھ رکھا تھا۔ آخر سیّد صاحب بولے:

"اچھا باقی باتیں بعد میں کر لیں گے۔" پھر آغا صاحب کی طرف روئے سخن کرتے ہوئے کہا۔ "اب آپ کو کچھ پوچھنا ہو تو پوچھیے۔" آغا صاحب کی رگِ مزاح پھڑکی۔ انھوں نے سیّد صاحب کی طرف مسکرا کر دیکھا اور کہا۔ "میں تو یہی پوچھ سکتا ہوں کہ کیا یہ مقالہ آپ نے ہی لکھا ہے؟" سیّد صاحب سوال سن کر چونکے، آلۂ گوش کا سمعی حصّہ آغا صاحب کے قریب کرتے ہوئے پوچھا ــ "کیا کہا؟" ــ وزیر آغا صاحب نے پھر مزاح کا سہارا لیا اور کہا۔

"ڈاکٹر صاحب، آپ کے پیشِ نظر جو مقالہ ہے وہ تو ٹائپسٹ کا لکھا ہوا ہے۔ انور سدید تو ٹائپ کرنا جانتا ہی نہیں ہے۔"

سیّد صاحب یہ جواب سن کر کھلکھلا کر ہنسے، اٹھ کر مجھے گلے لگالیا۔ مبارک باد دی اور کہا۔ "لو تم ...

یہ منظر میرے سامنے آج بھی زندہ ہے۔ میں ان کے معانقے کی گرمی آج بھی محسوس کر رہا ہوں۔
کچھ عرصے کے بعد انجمن ترقی اردو پاکستان نے "اردو ادب کی تحریکیں" کتابی صورت میں شائع کر دی تو سیّد صاحب
ایک "فخریہ" مجھے داد آفریں خط لکھا:

"مشرق اور مغرب کی جملہ ادبی تحریکوں کا احاطہ کس خوبی سے ڈاکٹر انور سدید نے کیا ہے کہ سب ضروری مطالب اس مقالے میں آ گئے ہیں لیکن ایجاز و اختصار کی خوبی کو کچھ نقصان نہیں پہنچا۔ انور سدید نے کوزے میں جو دریا بند کر دیا ہے اس کا جواب نہیں۔"

میرے لیے سیّد صاحب کا یہ مکتوبِ گرامی وہ تمغۂ ادب ہے جو بہت سے سرکاری نوعیت کے اعزازات پر بھاری ہے میں اسے جب بھی دیکھتا ہوں مزید کام کرنے کا ولولہ پیدا ہو جاتا اور حوصلہ بڑھ جاتا ہے۔
مجھے سیّد صاحب کے ساتھ ایک طویل عرصے تک مراسلت کا شرف بھی حاصل رہا۔ ادبی معاشرے کا کوئی مسئلہ پیدا ہوتا اور میں لاہور میں رہنے کے باوجود ان تک نہ پہنچ پاتا تو راہنمائی حاصل کرنے کے لیے انھیں خط لکھ دیتا۔ سیّد صاحب بالعموم ٹائپ شدہ خط بھیجتے لیکن بعض اوقات وہ سبز روشنائی میں اپنے ہاتھ سے بھی مکتوب ارسال کرتے تھے۔ میرے ذخیرہ خطوط میں ان کا آخری خط ۲۸ جنوری کا ہے اور یہ ان کے اپنے ہاتھ کا لکھا ہوا ہے۔ میرے پاس یہ ان کی آخری یادگار ہے اسے یہاں پیش کرتا ہوں:

۲۸-۱-۸۶

محب محترم ڈاکٹر انور سدید صاحب، سلام اخلاص

آپ کا کرم نامہ ملا۔ میں آپ کے جذباتِ محبّت کا قدردان اور شکر گزار ہوں۔ ورنہ اس دورِ بے سپاسی و ناسپاسی میں کون کسی کو پہچانتا ہے۔ میں نے زندگی میں کچھ کام کیے، اور خدا شاہد ہے جہاں تک مجھے معلوم ہو سکا (نفسِ خفی کا حال اللّٰہ کو معلوم ہے) سب بے غرضی سے کیے۔ میرے اساتذہ کی شفقت (اللّٰہ پاک کی رحمتِ پاک کے طفیل) میرے حال پر رہی۔ میں بے سوچے سمجھے کچھ کرتا گیا۔ اور کچھ کر گزرا۔ یہ آپ کی پاک طینتی ہے کہ آپ یاد فرماتے ہیں۔ یاد کرتے ہیں اور یاد رکھتے ہیں۔

آپ فرماتے ہیں، "تحقیق و تنقید کی روایت بالکل ختم ہو رہی ہے۔ لاریب آپ کا خیال درست ہے مجھے تو کچھ اب نظر آتا ہے کہ خود ستائی اور خود نمائی کی گرم بازاری ہے کسی حد تک مجھے عہدِ محمد شاہی کی جھلک نظر آ رہی ہے۔ داستان گوئی کا فن اور رازاں نگاری کا ہنر عام ہے۔ کسی محنت کی ضرورت نہیں۔ محنت کے عادی لوگ گوشوں میں چھپتے جاتے ہیں اور عزلت کے دن گزار رہے ہیں۔ اب اس پر کسی "شہر آشوب" کی ضرورت ہے، مگر اس کی جرأت کون کر سکتا ہے۔

والسّلام
نیازمند
سیّد عبداللّٰہ

ڈاکٹر سید عبداللہ کا یہ مکتوبِ گرامی مرقعِ عبرت بھی ہے۔ ان کے آخری سال کے تصورات کا عکاس بھی۔ اور یہ اس عہد کے
یبوں، شاعروں اور صورت گروں کو اپنے فکر و عمل پر غور کرنے کی دعوت بھی دیتا ہے۔ افسوس کہ ۱۹۸۶ء کے اوائل ہی میں جب
اردو دائرہ معارفِ اسلامیہ لاہور میں مصروفِ کار تھے ان پر فالج کا حملہ ہوا اور چند ماہ کی علالت کے بعد وہ اس جہانِ فانی سے
صت ہو گئے۔ ان کی تدفین ان کے شہرِ عمل لاہور میں ہوئی۔

اب ان کے دیکھنے کو آنکھیں ترستیاں ہیں

سرور انبالوی

اردو کا شیدائی

ڈاکٹر سید عبداللہ کا شمار ان بہی خواہانِ اردو میں ہوتا ہے جنھوں نے اردو زبان کے فروغ کے لیے اپنی زندگیاں وقف کر دیں اور اردو کو ہی اپنا اوڑھنا بچھونا بنا لیا۔ انھیں اردو زبان سے والہانہ عشق تھا اور وہ اس کی ترویج و ترقی کے لیے دن رات کوشاں رہتے تھے اور ان کا یہ ذوق و شوق جنون کی حد تک بڑھا ہوا تھا۔ وہ پاکستان میں اردو زبان کو اس کا جائز مقام دلانے کے لیے نئی نئی اسکیمیں سوچتے رہتے تھے۔ کبھی وہ کُل پاکستان اردو کانفرنس منعقد کر رہے ہیں کبھی محبّانِ اردو کا جلوس لے کر شہر کی سڑکوں پر گشت کر رہے ہیں، کبھی وہ دکانوں اور موٹر گاڑیوں کے سائن بورڈ اور نمبر پلیٹیں اردو میں لکھنے کی تحریک چلا رہے ہیں، کبھی وہ اس کام کو آگے بڑھانے اور اپنے رفقائے کار کا حوصلہ بڑھانے کے لیے پشاور جا رہے ہیں، کبھی راولپنڈی، سرگودھا، فیصل آباد، ملتان، حیدرآباد اور کراچی جا رہے ہیں۔ اس سلسلے میں انھوں نے اپنا چین اور آرام تج دیا تھا۔ اور وہ پیرانہ سالی میں بھی نوجوانوں کے سے دم خم کے ساتھ محاذِ اردو پر برسرِ پیکار تھے۔

ڈاکٹر سید عبداللہ نے اردو کے فروغ اور اس کی ترویج و ترقی کا سارا کام کسی قسم کی سرکاری امداد اور سرپرستی کے بغیر کیا۔ وہ نہ تو خود کوئی بڑے سرمایہ دار تھے اور نہ ہی ان کو کسی سرمایہ دار ادارے کی اعانت اور سرپرستی حاصل تھی۔ ایک جوش، ایک جذبہ، ایک لگن اور ایک تڑپ تھی جو انھیں ہر وقت آبلہ پا رکھتی تھی۔ وہ بڑے سے بڑا کام اور بڑی سے بڑی کانفرنس کی داغ بیل بغیر کسی سرمایہ اور بغیر کسی سر و سامان کے ڈال دیتے تھے۔ چونکہ ان کا جذبہ صادق ہوتا تھا اس لیے بہی خواہانِ اردو ان کی پکار پر لبیک کہتے ہوئے ان کے کاموں میں والہانہ شرکت کرتے تھے اور ان کی تحریک اور ان کی اردو کانفرنسیں بھرپور انداز میں کامیابی سے ہمکنار ہوتی تھیں۔ ۱۹۷۵ء میں انھوں نے راولپنڈی میں بلائی جانے والی کانفرنس کے متعلق البحر المعانی عصری کو ایک مکتوب میں تحریر فرمایا:

"میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ ہماری مجلسِ استقبالیہ اپنی بساط کے مطابق آپ کی خاطر داری اور آرام کا ضرور خیال رکھے گی۔ اس میں کچھ شبہ نہیں کہ یہ کانفرنس سرکاری قسم کے اہتمامات

کی متحمل نہیں ہو سکتی اور اپنی ساری سعی کے باوجود اس کی شکل وہی ہوگی جو کسی غیر سرکاری
کم وسائل اجتماع کی ہو سکتی ہے، مگر آپ دیکھیں گے کہ ہمارا خلوص اور ہماری نیازمندی آپ کو
ہماری کمزوریوں کی طرف متوجہ نہ ہونے دے گی۔ اور ہمارے وسائل کو ملحوظ رکھتے ہوئے
آپ ہمارے سادہ اور عاجزانہ انتظام کو (اردو کے مقاصد کی خاطر) جیسا بھی ہوگا قبول
فرمائیں گے۔ انشاء اللہ آپ کا بابرکت وجود ہماری بے مائیگی کی پردہ پوشی کرے گا۔ یہ
کانفرنس انجمن ترقی اردو لاہور اور اس سے رابطہ رکھنے والی اردو انجمنوں کی تحریک پر ہو رہی
ہے مگر اس کا بوجھ راولپنڈی کے نیک دل شہری اٹھا رہے ہیں جن کی یہ دیرینہ آرزو تھی
کہ اگر سرکاری سطح پر اردو کے لیے اس شہر میں کچھ نہیں ہو سکتا تو غیر سرکاری سطح پر ہی کچھ
کر دینا چاہیے کیونکہ بالآخر قومی زبان کو ملک کے عوام ہی سہارا دیں گے۔ اس کانفرنس
میں کراچی اور کوئٹہ سے پشاور اور مانسہرہ تک کے تین چار سو اہلِ علم اور اساتذہ شرکت
کر رہے ہیں۔ انھوں نے جس جوش سے اس کانفرنس کا خیر مقدم کیا ہے وہ اس امر کا ثبوت
ہے کہ قومی جذبہ اردو کے حق میں ہے۔" (مکتوباتِ دوستاں، صفحہ ۲۳، ۲۴)

وہ اردو کانفرنسوں میں شریک مندوبین سے نہایت خوش اخلاقی اور ذوق و شوق سے ملتے۔ اردو کی ترویج و ترقی کے لیے
چھوٹی سے چھوٹی بات اور معمولی سے معمولی تجویز کو بڑے غور سے سنتے اور پھر بحث و تمحیص کے بعد ہر معقول تجویز کو شرفِ قبولیت
بخشتے۔ حقیقت تو یہ ہے کہ انھوں نے اردو زبان اور اس کے فروغ کو اپنی زندگی کا مقصدِ اولین قرار دے لیا تھا اور وہ اس
مقصد کے حصول کے لیے دن رات کوشاں رہتے تھے۔ وہ اردو زبان کو پاکستانی عوام کی تاریخی، تہذیبی اور عوامی زندگی
کا ترجمان سمجھتے تھے۔ "اردو اپنے نئے ماحول میں" کے عنوان سے انھوں نے ماہنامہ "ہمایوں" کے ۱۹۴۹ء کے سالنامہ میں ایک
دلچسپ مضمون لکھا جس میں وہ ایک جگہ یوں اظہارِ خیال کرتے ہیں:

"جس طرح اردو کو گزشتہ تاریخ اور تہذیبِ اسلامی کا مظہر بنانا ضروری ہے۔ اسی طرح
یہ بھی ضروری ہے کہ اردو کو سندھ، پنجاب، سرحد اور بلوچستان کی تاریخ، تہذیب اور
عوامی زندگی کا بھی ترجمان بنایا جائے۔ یہ کام ہمارے شاعر اور افسانہ نگار باحسن وجوہ انجام
دے سکتے ہیں۔ جب تک ہماری دیہاتی آبادیاں اردو کے ساتھ وہ سچی وابستگی پیدا نہ کریں
جو انھیں فی الحال اپنی اپنی مقامی زبانوں کے ساتھ ہے اس وقت تک اردو محض خواص اور
تعلیم یافتہ طبقہ کی زبان بنی رہے گی۔ پنجاب، سندھ اور سرحد کے مقبول عام قصوں، روایتوں
اور داستانوں کو خوبصورت ترین اور آسان ترین اسلوب میں "موزوں" کرنا چاہیے تاکہ
ایک دیہاتی اپنی زندگی کے دلکش مناظر کو جب اس زبان میں پڑھے تو یہ اس کے لیے کشش
کا باعث ہو۔ ہیر رانجھا، سسی پنوں، مرزا صاحبان کے علاوہ لوک گیتوں اور نظموں کو

اردو میں منتقل کرنا چاہیے۔ عبدالرحمٰن بابا، شاہ لطیف اور دوسرے شعرا کی زندگی
اور شاعری پر کتابیں لکھی جائیں تاکہ زبان اور شعری تصویریں اس طرح کھینچی جائیں کہ
اہلِ خطہ متاثر ہوں اور اس ادب و شعر کے ساتھ محبت کرنے لگیں۔"

(سالنامہ "ہمایوں" ۱۹۴۹ء)

ڈاکٹر سید عبداللہ تمام عمر درس و تدریس سے وابستہ رہے۔ انھوں نے اپنے ہزاروں شاگردوں میں اردو زبان سے
الہانہ لگاؤ پیدا کیا اور پھر اس زبان کے حوالے سے ان میں حُبّ الوطنی کا جذبہ پیدا کیا۔ انھوں نے بہی متعدد تصانیف، کتابچوں
شتہاروں، مکتوبات، تقریروں اور استقبالیہ خطبوں کے ذریعے اردو زبان کی اہمیت اور اس کی ترویج و ترقی پر زور دیا
ر پاکستانی عوام کے ایک بڑے طبقے کے دلوں میں اردو کی محبت پیدا کر دی جو آج بھی ان کے مشن کو آگے بڑھانے میں دن رات
وشاں ہیں۔ حقیقت تو یہ ہے کہ مولوی عبدالحق اور ڈاکٹر سید عبداللہ نے اپنے خونِ جگر سے جو چراغ ایوانِ اردو کے کنگروں
ر روشن کیے تھے انھیں حوادث کی آندھیاں بھی گُل نہ کر سکیں۔ اور ان چراغوں کی روشنی آنے والی نسلوں کی تاریکیوں میں
راہِ مستقیم کی طرف رہنمائی کرتی رہیں گی۔ وہ ایک نابغۂ روزگار شخصیت تھے اور ایسی شخصیتیں قوموں میں صدیوں بعد پیدا
ہوتی ہیں ؂

عمرہا در کعبہ و بُت خانہ می نالد حیات　　تا ز بزمِ عشق یک دانائے راز آید بروں

ڈاکٹر سید عبداللہ منگلور تحصیل مانسہرہ ضلع ہزارہ میں ۱۹۰۶ء میں پیدا ہوئے۔ میٹرک تک تعلیم ایبٹ آباد میں
حاصل کی۔ اس کے بعد تحریکِ خلافت سے وابستگی کی بنا پر وہ لاہور چلے آئے اور وہاں مولانا احمد علی کے حلقۂ درس میں شریک
ہو گئے اور پھر عرصہ بعد علی گڑھ اور جامعہ ملیہ میں تعلیم حاصل کرتے رہے۔ وہاں مولانا محمد علی جوہر اور ڈاکٹر ذاکر حسین سے
استفادہ کیا۔ مولانا سورتی سے عربی پڑھی پھر واپس لاہور آ گئے اور اورینٹل کالج میں داخل ہوئے ۱۹۲۲ء میں پنجاب
یونیورسٹی سے منشی فاضل کا امتحان پاس کیا۔ ۱۹۲۵ء میں ایم۔اے فارسی کا امتحان پاس کیا۔ ۱۹۲۶ء سے ۱۹۲۸ء تک پنجاب
یونیورسٹی لائبریری میں کیٹیلاگر کی حیثیت سے کام کیا۔ ۳۲ـ۱۹۲۸ء میں فارسی ریسرچ اسکالر کی حیثیت سے "ادبیاتِ فارسی
میں ہندوؤں کا حصہ" کے موضوع پر کام کرتے رہے۔ ۱۹۳۵ء میں پنجاب یونیورسٹی سے ڈی لٹ کی ڈگری حاصل کی۔ اس کے بعد
یونیورسٹی میں تدریس کے فرائض سرانجام دیتے رہے۔ پہلے عربی اسسٹنٹ ہوئے، پھر صیغۂ فارسی کے صدر مدرس مقرر ہوئے
پھر اردو شعبہ میں لیکچرار، ریڈر اور پروفیسر مقرر ہوئے۔ ۱۹۵۴ء میں اورینٹل کالج کے پرنسپل ہو گئے اور شعبۂ اردو کے اعزازی
صدر بھی رہے۔ ڈاکٹر سید عبداللہ کے علمی، ادبی اور لسانی کارناموں کا احاطہ اس مختصر سے مضمون میں از حد مشکل ہے۔ شاید ایسی ہی
نابغۂ روزگار شخصیتوں کے متعلق کہا گیا ہے کہ ؂

ہرگز نمیرد آنکہ دلش زندہ شد بعشق　　ثبت است بر جریدۂ عالم دوامِ ما

شخصیت سے متعلق ڈاکٹر سید عبداللہ آپ بیتی میں خود یوں رقم طراز ہیں:

"میری آرزوؤں کی دنیا بہت محدود ہے۔ ان آرزوؤں میں ایک یہ ہے کہ خدا مجھے ایسا قلم

جوڑ سکیں۔ میری دوسری آرزو یہ ہے کہ تہذیبِ اسلامی کی روح کے آئینہ معصفا پر سے غلط فہمیوں کی گرد کو دور کر سکوں اور نئی زبان میں بات کہہ کر اپنے مخاطبوں کے لیے قابلِ فہم بن سکوں۔ میری تیسری آرزو یہ ہے کہ میں انسانی ضمیر کو کچھ اس طرح جگاؤں کہ انسان کا دل انسان کے لیے شفقت سے بھر جائے اور انسان دکھ درد کی سطح پر پھر ایک ہو جائیں۔ میری ایک آرزو یہ بھی ہے کہ میں اپنے ملک میں ایسی علمی روح پیدا کروں جس کی ترجمانی کا فرض اردو زبان اختیار کر سکے۔ میں ان مقاصد کی پیشِ خدمت میں لگا رہتا ہوں اور مدرّسی کے وقت کو چھوڑ کر (جو میرے لیے نشاطِ زیست کا وقت ہے) باقی ہر لمحہ اپنی آرزوؤں کی تکمیل طلبی میں گزار دیتا ہوں اور ایسے زمانے میں بھی جب میرا دل بھیانک خلا محسوس کرتا ہے اور مجھے یوں لگتا ہے گویا میری ہستی راکھ کا ڈھیر ہے، میں مقاصد کی لگن سے اس راکھ کو آتشِ خاموش کی مانند پُر سوز بنانے میں کامیاب ہو جاتا ہوں۔ اور خوش ہوں کہ یہ راکھ ابھی بالکل مُردہ نہیں ہوئی۔"

("سوغات"، صفحہ ۸۷ - ۹)

ی چنگاری انھیں سوز و سازِ زندگی کا سامان بخشتی تھی اور وہ تمام عمر اپنے ان مقاصد کے حصول کے لیے سرگرمِ عمل رہے اور بھی حقیقت ہے کہ وہ اپنی مستقل مزاجی کی بدولت اپنے مشن میں کافی حد تک کامیاب و کامران رہے۔ ڈاکٹر سید عبداللہ کی ندگی سراپا عمل اور جد و جہد سے عبارت ہے۔ وہ خاموش بیٹھنا جانتے ہی نہ تھے اور نہ ہی کبھی ناساعد حالات سے بددل ہوتے تھے۔ وہ طوفانوں سے ٹکراتا اور تند و تیز آندھیوں میں چراغ جلانا اور حوادث سے ٹکرانا لہو گرم رکھنے کا اک بہانہ سمجھتے تھے۔ ان کی زندگی کے شب و روز کو دیکھ کر نوجوانوں کو رشک آتا تھا۔

عمر ہا باید کشیدن انتظارِ بے شمار — تا کہ یک جوفِ صدف بارانِ شود دُرِّ عدن

ڈاکٹر سید عبداللہ نہایت متواضع اور بااخلاق شخصیت کے مالک تھے۔ وہ اپنے مخالفین سے بھی نہایت خندہ پیشانی سے ملتے تھے اور انسانی اقدار کو کسی نہج بھی پامال نہیں ہونے دیتے تھے۔ ادبی مباحثوں میں جہاں اختلافی مسائل زیرِ بحث تے، انھوں نے وہاں بھی اخلاق کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوڑا بلکہ اپنے ناقدین اور مخالفین کے نظریات کو نہایت تحمل سے سنا اور جو بات معقول ہوئی اسے ماننے میں بخل سے کام نہ لیا، اور جہاں اختلاف ہوا وہاں مدِّمقابل کو دلائل سے قائل کرنے کی کوشش کی۔ ان کی عالی ظرفی اور بلند حوصلگی سے متعلق ڈاکٹر وزیر آغا لکھتے ہیں کہ ۶۶ - ۱۹۶۵ء میں ان کی کتاب "اردو شاعری کا مزاج" شائع ہوئی جس پہ ڈاکٹر سید عبداللہ نے ایک مضمون لکھا جس میں اس کتاب پر کچھ اعتراضات کیے گئے تھے مضمون لاہور کے ایک انگریزی اخبار میں شائع ہوا تھا اور پھر دوسرا مضمون "فنون" میں چھپا جس کا جواب ڈاکٹر وزیر آغا نے "اردو زبان" میں دیا جس کا لہجہ کافی تیز تھا۔ اور یوں ان دونوں کے درمیان ایک دیوار کھڑی ہوگئی اور ملنا جُلنا اور خط و کتابت بھی بند ہوگئی۔ اب آگے ڈاکٹر سید عبداللہ کی وسیع القلبی سے متعلق خود ڈاکٹر وزیر آغا کی زبانی سنیے:

کلب میں ان کے اعزاز میں ڈنر تھا۔ ڈنر میں میں بھی موجود تھا۔ لیکن خلقِ خدا سے ہٹ کر ایک طرف کھڑا تھا۔ ڈاکٹر صاحب (سید عبداللہ) نے دُور سے مجھے دیکھا تو لپک کر مجھ تک پہنچے اور پھر مجھ سے بغل گیر ہوگئے۔ بس اس درخشاں لمحے میں ڈاکٹر صاحب نے ساری کدورت اور رنج میرے دل سے کھُرچ ڈالا۔ میں نے ڈاکٹر صاحب سے کہا کہ وہ میرے ساتھ چائے پئیں۔ انھوں نے میری دعوت قبول کرلی۔ دوسرے روز میرے یہاں آئے "اردو شاعری کا مزاج" کا ذکر تک نہ آیا۔ مطلع صاف ہوگیا تھا۔ بزرگ ادبا کا یہی امتیازی وصف ہونا چاہیے۔" ("شام کی منڈیر سے" صفحہ ۱۶۰)

[سید] عبداللہ کے یہی اوصاف تھے جن کی بنا پر وہ آج بھی زندہ ہیں اور بہی خواہانِ اردو کی فہرست میں ان کا نام [ہمیشہ] [ق]ائم رہے گا۔
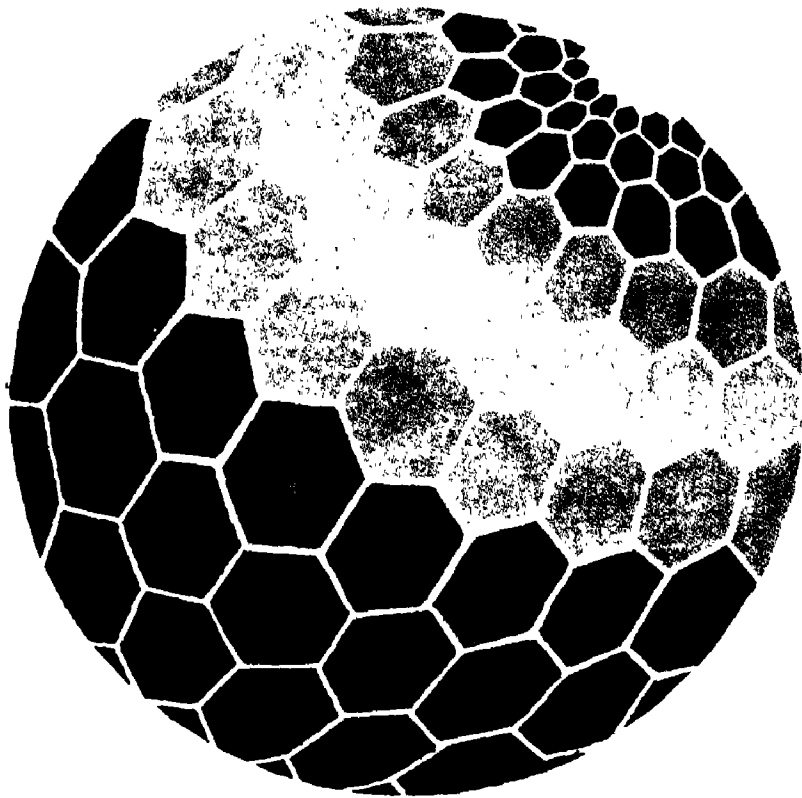
پروفیسر ہارون الرشید تبسم

ڈاکٹر سیّد عبداللہ مرحوم

پاکستان اسلام اور اردو کے نام پر حاصل کیا گیا۔ قیامِ پاکستان کے بعد جن لوگوں نے زبان کے فروغ اور ملک میں
کے نفاذ کے لیے گراں قدر خدمات انجام دی ہیں ان لوگوں میں سیّد عبداللہ مرحوم کا نام سرِ فہرست ہے۔ بابائے اردو مولوی
الحق کے بعد آپ کو "بابائے اردو"، "محسنِ اردو" اور "قائدِ اردو" کے نام سے یاد کیا جانے لگا۔ آج وہ ہم میں نہیں لیکن گلزارِ
وہیں انھوں نے اپنی محنتِ شاقہ سے جو پھول اُگائے تھے اس کی خوشبو سے بہی خواہانِ اردو کے اذہان معطر ہیں اور ملک
در و بام سے سیّد عبداللہ مرحوم کی خدماتِ جلیلہ فضاؤں میں محوِ پرواز ہیں۔

ڈاکٹر سیّد عبداللہ ۱۹۰۶ء میں ہزارہ ڈویژن صوبہ سرحد کی تحصیل اور ضلع مانسہرہ کے ایک گاؤں منگور میں پیدا
ئے۔ ابتدائی تعلیم انھوں نے اپنے والدِ بزرگوار سے حاصل کی۔ ان کے والدِ گرامی اپنے دور کے ایک نامور عالمِ دین،
رِ علومِ دینیہ اور حکیم تھے۔ ان کے والد کی خواہش تھی کہ یہ بچہ بڑا ہو کر ملک و ملّت کی خدمت کرے اور قوم کا قابلِ فخر
ند بنے۔ ربِّ کائنات نے ان کی دعا کو قبول فرمایا اور آج سیّد صاحب کی ذاتِ گرامی دلدادگانِ ادب کے لیے روشنی کا مینار ہے۔

مانسہرہ اور ایبٹ آباد میں تعلیم سے فارغ ہو کر سیّد صاحب لاہور آ گئے مولانا احمد علی خطیب جامع مسجد شیراں والا
شخصیت نے انھیں بہت متاثر کیا۔ سیّد صاحب اکثر درس سنتے اور اہم باتوں کو تحریر کر لیتے سیّد صاحب ان کے درسِ
ن حکیم سے بہت متاثر ہوتے تھے۔ کچھ عرصے کے بعد سیّد صاحب علی گڑھ چلے گئے۔ اس وقت جامعہ ملّیہ اسلامیہ
گڑھ ہی میں تھا۔ یہاں سیّد عبداللہ کو مولانا محمد علی جوہر کی صحبت میسّر آ گئی۔ مولانا محمد علی جوہر بے باک مقرر، شعلہ بیان
عر اور نڈر صحافی تھے۔ اس بطلِ حرّیت نے سیّد صاحب کی بھرپور رہنمائی کی۔ ان کے علاوہ انھوں نے ڈاکٹر ذاکر حسین
نا سورتی اور مولانا جے راج پوری سے بھی فیض حاصل کیا۔ سیّد صاحب نے اپنے حالاتِ زندگی تحریر کرتے وقت
لانا سورتی کا خصوصی طور پر ذکر کیا ہے اور اس بات کا اعتراف کیا ہے کہ مولانا سورتی نے ان کا نظریۂ حیات تشکیل کرنے
بڑا اہم حصّہ لیا تھا۔ یہ وہ زمانہ تھا جب آپ کیوں، کیونکر، کیسے اور تجزیہ کرنے کی فکری منزلیں طے کر رہے تھے۔
علی گڑھ سے آپ لاہور چلے گئے اور اورینٹل کالج لاہور میں داخلہ لے لیا۔ ۱۹۲۲ء میں منشی فاضل کی ڈگری

حاصل کی۔ ۱۹۲۵ء میں فارسی میں ایم۔اے کیا۔ اس کے بعد پنجاب یونیورسٹی لائبریری میں بطور فہرست ساز کے ملازم ہو گئے۔ اس دوران عربی اور فارسی کے تمام نسخہ جات کو از سر نو ترتیب دیا اور یہ اتنا بڑا کام تھا جس پر جتنا بھی فخر کیا جائے کم ہے۔ ان کے اس کارہائے نمایاں سے قیمتی مسودات ضائع ہونے سے بچ گئے۔

یونیورسٹی کی لائبریری میں خدمات انجام دینے کے ساتھ ساتھ انھوں نے تنقید و تحقیق کا سلسلہ بھی شروع کیا۔ یہاں انھیں کتابوں سے بھرپور استفادہ حاصل کرنے کا موقع ملا۔

۱۹۳۲ء میں ایم۔اے عربی مکمل کیا اور ۱۹۳۵ء میں ڈی لٹ جو کسی علم کی تدریسی سطح پر سب سے بڑی ڈگری ہے، حاصل کی پھر اپنی ان خداداد صلاحیتوں کے بل بوتے پر آپ اورینٹل کالج میں لیکچرار ہو گئے۔ سید صاحب کی ذاتی کوششوں کی بنا پر ۴۸ ۱۹ء میں پہلی مرتبہ اردو کلاسز کا اجرا ہوا۔

ملک کے نامور ادیبوں اور شاعروں نے اس ادارے سے ایم اے کی ڈگریاں حاصل کیں۔ ڈاکٹر وحید قریشی، پروفیسر مرزا محمد منور، امجد الطاف، قیوم نظر، یوسف ظفر، ریاض احمد، ڈاکٹر ممتاز منگلوری، امجد اسلام امجد اور عطا الحق قاسمی ایسی شخصیات نے ڈاکٹر سید عبداللہ صاحب سے علم و ادب حاصل کیا۔

سید صاحب بہت خوش قسمت انسان تھے کہ انھوں نے بہت سے عظیم شاگرد پیدا کیے جو دنیائے علم و ادب میں سید صاحب کی پہچان ہیں۔ اور ڈاکٹر سید عبداللہ کو خود بھی مولوی محمد شفیع، ڈاکٹر محمد اقبال اور پروفیسر حافظ شیرانی جیسی عظیم شخصیات کی شاگردی کا شرف حاصل ہوا۔

سید عبداللہ اپنے اساتذہ کرام کی بہت زیادہ عزت کیا کرتے تھے۔ اور تحقیق و تنقید کے میدان میں انھوں نے اپنے اساتذہ کرام سے بہت کچھ سیکھا اور پھر تمام عمر اس پر عمل کرتے رہے۔ اساتذہ اور شاگرد کا مقدس رشتہ سمجھنے کے لیے سید صاحب کی ذاتِ گرامی مشعلِ راہ ہے۔ وہ فرمایا کرتے تھے کہ "اچھا استاد ہمیشہ اچھا شاگرد رہتا ہے۔" ان سے جب بات ہوتی تو وہ ہمیشہ یہ فرمایا کرتے تھے کہ "جب میں طالب علم تھا اور اب بھی طالب علم ہوں، محنت کیا کرتا تھا۔" سید صاحب اپنی تمام تر کامیابیوں میں اپنے اساتذہ کا دل سے احترام کرتے تھے، بلکہ یہ کہنا بجا ہوگا کہ انھوں نے فی الواقع ایک طالب علمانہ زندگی گزاری۔ وہ مسجد کی خدمت ہو یا اسسٹنٹ لائبریرین کی ذمہ داریاں، اورینٹل کالج میں لیکچررشپ کا عرصہ ہو یا اسی کالج کے پرنسپل کی حیثیت سے گزارہ ہوا زمانہ ڈاکٹر سید عبداللہ اپنی شعوری زندگی کے آغاز سے لے کر اردو دائرہ معارفِ اسلامیہ کے صدر کی حیثیت سے وفات تک ایک طالب علم رہے اور علم کی اعلیٰ ترین منزلوں پر پہنچ کر بھی عالمانہ کبر و نخوت سے حتی الوسع اجتناب کیا۔ بس یوں سمجھیے کہ حصولِ علم ہی ان کا اوڑھنا بچھونا تھا جب بھی ان سے ملاقات ہوتی تو وہ لکھتے پڑھتے یا تقریر کرتے پائے جاتے۔

۱۹۶۴ء میں سید عبداللہ نے اورینٹل کالج کی صدارت سے ریٹائرمنٹ لے لی اگرچہ ابھی ان کی ملازمت ختم ہونے کا وقت نہیں آیا تھا۔ وہ اس کالج سے بطور پرنسپل ریٹائر ہوئے۔ ریٹائر ہونے کے بعد وہ اردو دائرہ معارفِ اسلامیہ سے منسلک ہو گئے اور وفات تک وہاں خدمات انجام دیتے رہے۔ انسائیکلوپیڈیا آف اسلام کا سارا کام انھوں نے خود

کیا۔ ابھی کچھ تھوڑا ہی کام باقی تھا کہ وہ اللہ کو پیارے ہو گئے۔ ان کی تصانیف کی تعداد بہت زیادہ ہے۔ شائع شدہ تصانیف میں تنقیدِ میر، فارسی ادب میں ہندوؤں کا حصہ، اردو نثر ملا وجہی سے عبدالحق تک، اردو شاعری ولی سے اقبال تک، مباحث، اطرافِ غالب، اشاراتِ تنقید، مسائلِ اقبال، مقاصدِ اقبال، معارفِ اقبال، متعلقاتِ اقبال، خطباتِ اقبال، سہلِ اقبال، پاکستان میں اردو کا مسئلہ، اردو ادب، طیفِ غزل، تعلیمی خطبات، پاکستان تعبیر و تعمیر اور کلچر کا مسئلہ۔ کم و بیش چودہ مسودات مکمل صورت میں یا کسی حد تک نامکمل حالت میں منتظرِ اشاعت ہیں۔ اردو ادب میں یہ مسودات خاص اہمیت رکھتے ہیں، ان کے نام یہ ہیں۔ عزیز و محترم، قلمیات و نظریات، ادب و فن، جدیدیت کے چند رخ، پاکستانیت، اسلام سوشلزم اور سوانحی خاکہ اردو ادب میں بڑی اہمیت کے حامل ہیں۔ اپنی ان گراں قدر تخلیقات پر آپ نے کبھی فخر نہیں کیا۔

آپ کو بہت سے اعزازات سے نوازا گیا۔ آپ نے ملک کی تمام بڑی ادبی تنظیموں میں شامل ہو کر کارہائے نمایاں انجام دیے۔ سید صاحب اکادمی ادبیاتِ پاکستان کے بنیادی رکن تھے۔ مجلسِ ترقی ادب کے رکن اور انجمن ترقی اردو کے خصوصی ناظم تھے۔ ۱۹۵۹ء حسنِ کارکردگی کا صدارتی تمغہ ملا اور اسی سال ایران کی حکومت نے انھیں نشانِ سپاس دیا۔ مغربی پاکستان اردو اکادمی کے جنرل سکریٹری رہے۔ مقتدرہ قومی زبان لاہور شاخ کے مشیر تھے۔

ڈاکٹر سید عبداللہ کی پوری زندگی اصولوں کے گرد گھومتی رہی۔ وہ اپنے افکار و خیالات کے اعتبار سے بھی نہایت متوازن اور معتدل شخصیت کے مالک تھے۔ وہ اردو زبان کو پاکستان کے اتحاد کی ضامن قرار دیتے تھے۔ انھوں نے قومی زبان کو قومی زندگی میں رائج کرنے کی ضرورت پر بہت زور دیے۔ اپنی بصیرت اور فہم و فراست سے ان رجحانات کا سدِّباب کرنا چاہتے تھے جو ملک کو نقصان پہنچانے کی کوشش میں تھے۔ انھوں نے کبھی دولت اور نام و نمود کے لیے کام نہیں کیا۔ انھوں نے تقریبات کی صدارت اور کتابوں کی رونمائی میں مضامین پڑھنے سے گریز کیا۔ لیکن ہر لکھنے والے کی حوصلہ افزائی کے لیے انھوں نے اپنی تحریری رائے کا اظہار ضرور کیا۔

انھوں نے اپنی ساری زندگی ادب کی بے لوث خدمت میں گزاری۔ اردو سے ان کا عشق سب پر آشکار تھا۔ وہ ساری عمر اردو کے لیے افسر شاہی سے لڑتے رہے۔ وہ عام گفتگو بھی اردو میں کیا کرتے تھے۔ انھوں نے اردو کو اس کا جائز حق دلوانے کے لیے متعدد مضامین لکھے، بڑی بڑی کانفرنسوں کا انعقاد کروایا۔ ملک کے طول و عرض میں انجمن ترقی اردو کے کارکنوں نے ان کی آواز پر لبیک کہتے ہوئے اردو کے لیے بھرپور کام کیا۔ قومی سطح پر یہ ایک بڑا کام تھا۔ وہ اردو کو اپنی زندگی کا حصہ سمجھتے تھے اور باہر آنے والے مہمان سے پہلا سوال یہ کرتے تھے کہ "آپ کے شہر میں اردو کا کیا حال ہے"۔

بے لوث اور درویشانہ خصوصیات رکھنے والے سید صاحب نے کبھی اپنا ادبی گروپ بنانے کی کوشش نہیں کی۔ اور نہ ہی وہ خود کسی ادبی گروپ سے تعلق رکھتے تھے۔ ڈاکٹر صاحب نے ہر حال میں اپنے مشن کو جاری و ساری رکھا۔ یہ بات قابلِ ذکر ہے کہ جب ۱۹۸۷ء کے شروع میں ان پر فالج کا حملہ ہوا اور اس حملہ کی زد میں آپ کی زبان بھی آئی تھی۔ ڈاکٹروں کی ہدایت کے مطابق آپ کو ہسپتال میں داخل کروا دیا گیا تھا لیکن آپ فالج کے باوجود اپنے دفتری امور انجام دیتے رہے۔

اپنے رفقائے کار سے گفتگو لکھ کر کرتے رہے۔ کسی شخص کی اس سے بڑھ کر عظمت اور عزم کی پختگی کیا ہوگی کہ اس کا آدھا دھڑ مفلوج ہے، خوراک ایک نالی کے ذریعے ناک کے راستے معدے میں پہنچائی جارہی ہے اور زبان کام کرنے سے انکار کررہی ہے اور ان کے چہرے کی شگفتگی اور طبیعت کی مٹھاس اسی طرح برقرار ہے۔

جب بھی کوئی ان کی عیادت کے لیے جاتا وہ ملاقاتی کا ہاتھ چومتے اور پھر مسکراتے ہوئے "وکٹری" کے نشان کے طور پر اپنا ہاتھ فضا میں بلند کردیتے اور کئی دوستوں سے کاغذ اور قلم کی وساطت سے لمبی گفتگو بھی کرلیتے۔

عالمانہ غرور سے اجتناب، طالب علموں جیسی محبت اور اپنے سے چھوٹوں کی حوصلہ افزائی ڈاکٹر صاحب کی شخصی عظمت کے مینار ہیں۔ وہ محبت بانٹتے تھے اور نفرتوں کے خلاف تھے۔ انکی محبت سب کے لیے تھی اور نفرت کسی کے لیے بھی نہیں تھی۔ ان کا اصلاح کرنے کا انداز بہت ہی مثبت تھا۔ انھوں نے کسی کی انا کو مجروح نہیں کیا اور نہ ہی اپنا قد بلند کرنے کے لیے کسی کی حیثیت کو کم کرنے کی کوشش کی۔

آپ کی شخصی عظمت کا اعتراف تمام مکاتبِ فکر کی طرف سے ہوا۔ اس بات کا اندازہ اس سے لگایا جاسکتا ہے کہ جب ۱۴ راگست ۱۹۸۶ء کو آپ کا انتقال ہوا اس روز کسی اخبار میں ان کی وفات کی خبر شائع نہ ہوئی کیوں کہ اس روز اخبارات کی چھٹی تھی لیکن اس کے باوجود ان کے چاہنے والوں کی ایک بہت بڑی تعداد نے ان کے نمازِ جنازہ میں شرکت کی۔ بعد ازاں انھیں گلشنِ راوی قبرستان میں سپردِ خاک کر دیا گیا۔ ان کے نمازِ جنازہ میں دیگر شخصیات کے علاوہ لاہور ہائی کورٹ کے چیف جسٹس جاوید اقبال، جماعتِ اسلامی کے امیر میاں طفیل محمد، ڈائریکٹر اقبال اکادمی مرزا محمد منور نے شرکت کی۔

۲۵۔ اردو نگر اردو منزل، نزد سمن آباد موڑ لاہور، آپ کی اقامت گاہ پر آپ کے چاہنے والوں کا ایک جمِ غفیر تھا جو آپ کے انتقال پر ملک کے تمام علاقوں سے اظہارِ تعزیت کے لیے جمع تھا۔ صدرِ پاکستان جنرل محمد ضیا الحق، وزیرِ اعلیٰ پنجاب میاں نواز شریف، گورنر پنجاب سید سجاد حسین قریشی اور دیگر احباب ڈاکٹر صاحب کی اقامت گاہ پر گئے اور پسماندگان سے اظہارِ افسوس کیا۔

خطوط ڈاکٹر سید محمد عبداللہ

انجمن ترقی اردو، لاہور

۱۷۔ اردو نگر، ملتان روڈ، لاہور

۲۵ ر نومبر ۱۹۷۸ء

مکرمی اسلام علیکم

آپ کا خط اور اخبار کا تراشہ ملا۔ آپ کا مضمون قومی زبان کے بارے میں پڑھا بہت پسند آیا۔ اگر اس طرح گاہے گاہے اردو کے حق میں ملک کے ہر کونے سے آواز اٹھتی رہے تو مجھے امید ہے کہ انشا اللہ قومی زبان اپنا مقام حاصل کرلے گی۔ آپ کی کرم فرمائی کا شکر گزار ہوں۔

اردو کانفرنس ۷ اور ۸ ر دسمبر ۱۹۷۸ء کو لاہور میں منعقد ہو رہی ہے۔ اس کا اطلاع نامہ ہمراہ ارسال ہے

دوسرا اطلاع نامہ آپ کو بعد میں بھیجا جائے گا۔ آپ نے تقریر کے بارے میں لکھا ہے، اس بار مقالات نہیں پڑھے جائیں گے۔ البتہ آخری اجلاس میں جو ۸ دسمبر ۱۹۷۸ء کو انجمن کے دفتر میں ہوگا، میں قرار دادیں پیش ہوں گی۔ اس موقع پر کوئی چار پانچ منٹ کی تقریر کرنا چاہے تو کر سکے گا۔ ویسے مقالات کے لیے کوئی الگ پروگرام نہیں ہے

بخدمت شریف جناب ہارون الرشید تبسم صاحب
گل والی روڈ، کوٹ فرید سرگودھا

مخلص
سید عبداللہ

پنجاب یونیورسٹی (شارع قائداعظم) لاہور — اردو دائرۂ معارفِ اسلامیہ

۹ رجنوری ۱۹۷۹ء

مکرم و محترم جناب تبسم صاحب، السلام علیکم
خط ملا، آپ لوگ سرگودھا میں ۲۳ فروری کو جو کانفرنس کر رہے ہیں اس نے مزید کوائف سے مجھے آگاہ کریں۔ اس کے بعد میں فیصلہ کر سکوں گا کہ میں آپ کی کانفرنس میں شرکت کر سکتا ہوں یا نہیں
امید ہے آپ خیریت سے ہوں گے۔ والسلام

نیاز مند
سید عبداللہ

بخدمت شریف جناب ہارون الرشید تبسم صاحب
ناظم انجمن ترقی اردو کوٹ فرید، سرگودھا۔

پنجاب یونیورسٹی (شارع قائداعظم) لاہور — اردو دائرۂ معارفِ اسلامیہ

۱۵ اپریل ۱۹۷۹ء

عزیزم تبسم صاحب اسلام علیکم
آپ کا پیغام مجھے ملا۔ معلوم کر کے خوشی ہوئی کہ آپ ۲۷ اپریل ۱۹۷۹ء بروز جمعہ ڈاکٹر جسٹس ایس۔ اے رحمٰن مرحوم کے سلسلے میں ایک تقریب منعقد کرا رہے ہیں۔ گزارش ہے کہ ۲۷ اپریل کو چونکہ چھٹی (جمعہ) کا دن ہے اس لیے تقریب صبح کے وقت تقریباً دس بجے کے قریب منعقد ہونا چاہیے تاکہ میں اسی دن واپس لاہور آ سکوں۔
میں سرگودھا رات نہیں ٹھہروں گا۔ اپنے احباب گرامی کو سلام کہیے۔ والسلام

مخلص
سید عبداللہ

عزیزم ہارون الرشید تبسم صاحب
اردو منزل، انجمن ترقی اردو
بالمقابل شمع سینما کچہری روڈ، سرگودھا۔

پنجاب یونیورسٹی (شارع قائداعظم) لاہور اردو دائرۂ معارف اسلامیہ

۲۵ اپریل ۱۹۷۹ء

مکرم و محترم تبسم صاحب السلام علیکم

اکادمی ادبیات پاکستان کے اعتراف کے سلسلے میں آپ کے مخلصانہ جذبات کا شکریہ ادا کرتا ہوں۔
۲۷ اپریل کو جسٹس رحمٰن مرحوم کی تعزیتی تقریب میں شرکت کا وعدہ میں کر چکا ہوں۔ تقریب کا وقت
ساڑھے نو بجے مقرر ہو چکا ہے۔ میں ان شاء اللہ چار بجے واپس لاہور کے لیے روانہ ہو جاؤں گا۔ سب احباب
کو سلام کہیے۔ والسلام

مخلص
سید عبداللہ

بخدمت شریف جناب ہارون الرشید تبسم صاحب
ناظم اعلیٰ انجمن ترقی اردو کوٹ فرید، سرگودھا۔

۱۷۔ اردو نگر، ملتان روڈ لاہور انجمن ترقی اردو، لاہور

یکم اپریل ۱۹۸۱ء

مکرمی السلام علیکم

قومی زبان اردو کے لیے معمّر پاکستان اور بانی پاکستان کے ارشادات پر مشتمل آپ کا مرتّب کردہ اشتہار
ملا۔ اردو کے نفاذ کے سلسلے میں آپ کی سعی قابلِ تعریف ہے۔ اللہ تعالیٰ آپ کو اس نیک کام کے لیے مزید توفیق دے۔
مقتدرہ قومی زبان کراچی کی نامزد کردہ ذیلی مجلس دفتری زبان نے دفتروں میں اردو کے استعمال کا جائزہ
لینے کے لیے التماس نامہ نمبر ۲ شائع کیا ہے۔ اس کے ۲۵ نسخے ارسالِ خدمت ہیں۔ آپ یہ سرگودھا اور ضلع سرگودھا
کے افسران کو ان کے نام اور پتے پر بذریعہ ڈاک یا دستی، جس طرح آپ کو سہولت ہو بھجوا دیں۔ التماس نامہ الگ
بھیجا جا رہا ہے۔ والسلام۔ ہم آپ کے تعاون کے شکر گزار ہوں گے۔

جناب اخگر سرحدی صاحب کا [illegible]

سید عبداللہ

بخدمت شریف جناب پروفیسر ہارون الرشید تبسم صاحب
ناظم اعلیٰ انجمن ترقی اردو کوٹ فرید، سرگودھا۔

پنجاب یونیورسٹی (شارع قائداعظم) لاہور اردو دائرۂ معارف اسلامیہ

۲ ستمبر ۱۹۷۹ء

عزیز مکرم السلام علیکم

ہم نے ایک جلسہ کر کے دو قرار دادیں کرما گرم منظور کی تھیں۔ حسب ذیل۔

۱۔ انگریزی ذریعۂ تعلیم کے مقاطعہ کی تحریک چلائی جائے۔

۲۔ دفتری زبان کے سلسلے میں گورنر پنجاب جنرل سوار خان کے حکم نامہ (بسلسلہ تبدیلی زبان) پر عمل کرایا جائے اور نگران اور خبرگیر کمیٹیاں قائم کی جائیں تاکہ یہ معلوم ہوتا رہے کہ گورنر صاحب کے حکم پر عمل کہاں تک ہوتا ہے۔ اس اثنا میں کالج بند ہو گئے۔ گرمی نے اپنی بہار دکھائی۔ اور یہ عاجز بھی گرمی زدہ ہونے کے علاوہ کچھ غم زدہ رہا۔ اس لیے مذکورہ بالا قرار دادوں پر عمل کی کوئی تدبیر نہ ہو سکی۔

اس کے علاوہ "یارانِ یک دل" کی سستیِ رفتار و عزم کی وجہ سے ایسی زور دار تحریکوں کو چلانے کے لیے جس اتحاد و رفاقت کی ضرورت ہوتی ہے وہ بھی مفقود تھی..... اور اب تک مفقود ہے۔ بڑے غور و فکر کے بعد میں نے فیصلہ کیا کہ آپ کو اور آپ کے مرشد اور اپنے رفیقِ خاص اخگر سرحدی صاحب کو مخاطب کروں۔

میری تجویز یہ ہے کہ انگریزی ذریعۂ تعلیم کے مقاطعہ کی تحریک کا آغاز سرگودھا سے کیا جائے اور اس کے لیے باقاعدہ ایک افتتاحی تقریب منعقد ہو۔ آپ جناب اخگر سرحدی صاحب سے مل کر تجویز کی تدابیر کے متعلق مجھے مشورہ دیں کہ اس کی صورت کیا ہو؟ کیا کچھ طلبہ مل سکیں گے جو افتتاح کے وقت مقاطعہ کا اعلان کریں۔ کیا ان کے علاوہ طلبہ کو کسی جگہ آپ جمع کر سکیں گے وغیرہ وغیرہ۔ از راہِ کرم اپنی تدابیر کے بارے میں آپ جلد مطلع کریں تاکہ اخباری اعلان کیا جا سکے۔ اخگر صاحب کو سلام خط کی نقل انھیں ارسال کر رہا ہوں۔

مخلص

سید عبداللہ

عزیزم ہارون رشید صاحب، معرفت اخگر سرحدی صاحب

صدر انجمن ترقی اردو، سرگودھا۔

انجمن ترقی اردو، لاہور

۱۷۔ اردو نگر، ملتان روڈ، لاہور

۱۲ را پریل ۱۹۸۱ء

مکرمی۔ السّلام علیکم

آپ کا ۶ را پریل ۱۹۸۱ء کا مراسلہ موصول ہوا۔ آپ نے پمفلٹ افسرانِ بالا کو بھجوا دیے ہیں اس کے لیے ہم تشکر گزار ہیں۔ فی الحال لاہور میں اردو کانفرنس منعقد کرنے کا کوئی ارادہ نہیں ہے جب کوئی پروگرام بنا تو آپ کو شرکت کی دعوت دی جائے گی۔ ایک بار پھر شکریہ۔

مخلص

سید عبداللہ

بخدمت شریف جناب پروفیسر ہارون الرشید صاحب ایم۔اے

ناظم اعلیٰ انجمن ترقی اردو کوٹ فرید، سرگودھا۔

پنجاب یونیورسٹی (شارع قائداعظم) لاہور　　　　اردو دائرۂ معارف اسلامیہ

۳۱ر دسمبر ۱۹۸۱ء

عزیز مکرم تبسم صاحب۔ سلام مسنون۔ آپ کا خط اور اطلاع نامے مل گئے ہیں شکریہ ادا کرتا ہوں۔ سرگودھا کانفرنس کے سلسلے میں کل ہی اخگر سرحدی صاحب کو مفصل خط لکھا ہے۔ اس میں میں نے کانفرنس کے متعلق ایک نظام تجویز کیا ہے۔ آپ سب صاحبان اس پر غور کریں۔ اس کے بعد مناسب اقدام ہو سکے گا۔ مجلس استقبالیہ وسیع ترین ہو۔ اس کے اندر سے مجلس عاملہ مختصر ہو جس میں عہدیدار اور کارکن اور مشیر شامل ہوں۔ اور سب گروپوں کو نمائندگی دی جائے۔ باقی اخگر صاحب کے خط میں ملاحظہ کیجیے

بھائی آپ کا یہ گلہ غلط ہے کہ میں نے آپ کے خطوں کا جواب نہیں دیا۔ میں نے ہر جواب طلب خط کا جواب دیا۔ حالانکہ میں اس سال بیمار رہا اور کچھ مکروہات کا شکار بھی۔ خط کا جواب نہ دینا میری عادت میں شامل نہیں۔ ہاں کچھ مجبوری ہو گئی ہو تو اور بات ہے۔ باقی پھر انشاء اللہ تعالیٰ

مخلص
سید عبداللہ

۱۷۔ اردو نگر ملتان روڈ، لاہور　　　　انجمن ترقی اردو، لاہور

۱۹ر اپریل ۱۹۸۲ء

محترم و مکرم تبسم صاحب۔ السلام علیکم۔ خیریت جانبین مطلوب ہے۔ چند روز ہوئے آپ کا فون آیا تھا۔ آج آپ کا خط (مع تراشہ مغربی پاکستان متعلقہ روداد اجلاس سرگودھا۔ و کارٹون) موصول ہوا۔ شکریہ ادا کرتا ہوں اور آپ کی ہمت کی داد دیتا ہوں۔ دراصل محب محترم اخگر سرحدی صاحب کی تربیت اور رہنمائی کا نتیجہ ہے کہ آپ صاحبوں میں آئندہ کی تحریک کا بوجھ اٹھانے کی صلاحیت پیدا ہوتی جا رہی ہے۔ آپ ان کے طریقے پر ہی ضبط و تحمل اور آئینی انداز پر قائم رہیں گے تو تحریک کو فائدہ ہوگا۔ جوش کے ساتھ ہوش کا رہنا لازم ہے۔ اس کے علاوہ میرا بنیادی اصول یہ ہے کہ اس تحریک میں حکومت کے اچھے اقدامات کی پرزور تحسین ہونی چاہیے کیونکہ حکومت اپنی ہے اور اس کی اپنی کچھ مجبوریاں ہیں جن سے ہم اختلاف کر سکتے ہیں مگر ان کو نظر انداز نہیں کر سکتے۔ یہ بڑا باریک کام ہے۔ اس کے علاوہ ہماری اردو تحریک میں ذاتیاتی گروہ بندی بالکل نہیں ہونی چاہیے۔ یہ سب باتیں اس لیے لکھ رہا ہوں کہ آپ کی ہمت مردانہ و جوانانہ سے میں خوش ہوا ہوں۔ بس ایک بات لازمی ہے کہ محب مکرم اخگر سرحدی صاحب کے تدبر اور تدبیر کی روشنی میں کام کرتے رہیں۔ اور حکومت کے متعلق رویہ حد درجہ آئینی اور دانشمندانہ ہونا چاہیے۔ موجودہ صدر مملکت پر کامل اعتماد رکھیں انشاء اللہ کچھ نہ کچھ کریں گے لیکن ان کی مجبوریوں

کو کبھی نظر انداز نہ کریں۔ چند روز میں میرا ایک گردشی خط آپ کو ملے گا جس میں درخواست ہوگی کہ شعبے میں کام کو اوّلیت دیں۔ دکانداروں سے محبت آمیز طریق سے التماس کرتی ہوگی کہ اپنے بورڈ اردو زبان میں لکھیں۔ اس مہم کے بھی کچھ آداب ہوں گے۔ مثلاً محبت، رواداری، بردباری وغیرہ وغیرہ۔ محترم انگر صاحب کی خدمت میں سلام۔

میانوالی کی کانفرنس ابھی زیرِ غور ہے۔ میں لاہور میں مصروف ہوں۔ والسلام

مخلص
سید عبداللہ

۱۷۔ اردو نگر، ملتان روڈ۔ لاہور — انجمن ترقی اردو، لاہور

۲ر اگست ۱۹۸۲ء

مکرمی و محترمی۔ السلام علیکم

آپ کی اطلاع کے لیے عرض ہے کہ میں نے اردو تحریک کو تیز کرنے کے لیے ایک اعلان جاری کیا ہے۔ ان میں آپ کا نام بھی شامل کیا ہے۔

بیان کی نقل ارسالِ خدمت ہے ملاحظہ فرمایئے۔

منسلک: بیان کی نقل

نیازمند
سید عبداللہ

بخدمت شریف۔ جناب شیخ محمد شریف انگر سرحدی صاحب
صدر انجمن ترقی اردو، اردو منزل، بلاک نمبر ۶ سرگودھا۔

۱۴ر اگست کو آپ اپنی انجمن میں اجتماعی نماز کا اہتمام کریں
مراسلہ اور پروگرام الگ ارسال ہو رہا ہے۔

سید عبداللہ

۔ پنجاب یونیورسٹی (شارع قائداعظم) لاہور — اردو دائرۂ معارفِ اسلامیہ

۸ر مئی ۱۹۸۳ء

مکرم و محترم تبسم صاحب۔ السلام علیکم۔ مزاج شریف۔ آپ لاہور میں مجھ سے ملے تھے اس کے بعد حسب وعدہ آپ کا خط بھی آ گیا ہے۔

انگر صاحب کی خدمات کی تقریب قابلِ ستائش ہے اور وقت کی اہم ضرورت۔ ایسی تقریب بہت پہلے ہونی لازم تھی۔ خیر نیک کام جب بھی ہو مناسب ہے۔

میں آپ سے جس دن ملا تھا اس کے دوسرے دن ناسازیٔ طبیعت کا شکار ہو کر اب بیماری [illegible]

طبیعت کب بحال ہوگی۔ اس لیے ازراہِ کرم مجھے صدارت سے وابستہ نہ کریں۔ صدرکسی اور کو بنا لیجیے اگر ۲۷ر تک طبیعت چست اور آمادہ ہوگئی تو شرکت کے لیے حاضر ہو جاؤں گا ورنہ مناسب پیغام ارسال کروں گا۔

میں اس خط کی ایک نقل اخگر صاحب کو بھی بھجوا رہا ہوں تاکہ انھیں میرے خیالات کا صحیح علم ہو جائے۔

آپ بڑے باہمت آدمی ہیں۔ حوصلہ مندی کے کام کرتے رہتے ہیں۔ خدا تعالیٰ آپ کو مقاصد میں کامیاب کرے۔ والسّلام۔

مخلص
سید عبداللہ

۷ا۔ اردو نگر، ملتان روڈ۔ لاہور — انجمن ترقی اردو، لاہور

۱۹ر جولائی ۱۹۸۳ء

مکرمی و محترمی السلام علیکم

جناب اخگر سرحدی صاحب کے اعزاز میں انجمن ترقی اردو سرگودھا جس تقریب کا اہتمام کر رہی ہے اس سے خوشی ہوئی ہے۔ کیوں کہ اردو کے لیے اخگر سرحدی صاحب کی بہت خدمات ہیں ان کا اعتراف شاندار طریقے سے کیا جانا چاہیے۔ اس کامیابی کے لیے دعا گو ہوں۔ والسّلام

مخلص
سید عبداللہ

بخدمت شریف۔ جناب ہارون الرشید تبسّم صاحب
کوٹ فرید، سرگودھا۔

پنجاب یونیورسٹی (شارع قائداعظم) لاہور — اردو دائرۂ معارفِ اسلامیہ

۲ر نومبر ۱۹۸۳ء

مکرمی ہارون الرشید تبسّم صاحب۔ السلام علیکم

آپ کا عنایت نامہ ملا شکریہ ہے۔ آپ کی تقریب بسلسلہ جناب اخگر سرحدی بہت عمدہ تھی۔ آپ نے اچھی محنت کی ہے۔

پیغام بسلسلہ یوم اقبال: علاّمہ اقبال کی شاعری، کسی قافلہ بیدار کے لیے بانگ درا کا درجہ رکھتی ہے۔ ان کے افکار، خیالاتِ فاسدہ کے سلسلے میں وہی حکم رکھتے ہیں جو زخم کے لیے مرہم اور زہر کے لیے تریاق۔ بالیقین علاّمہ اقبال نے قوم کو بیدار کیا اور شکوک و اوہام میں مبتلا قوم کو یقین سے مالا مال کیا۔ ان کے تصورِ خودی نے ملت کو جگایا اور پاکستان تک پہنچایا۔ ان کے کلام میں قرآنی روح کارفرما ہے اور عشقِ رسول اس میں جاری و ساری ہے۔ لازم ہے کہ قوم اس دولت سے فائدہ اٹھاتی رہے۔ والسلام علیکم

سید عبداللہ

سید جمیل احمد رضوی

پروفیسر ڈاکٹر سیّد عبداللہ مرحوم

منتخب کتابیات

ڈاکٹر سید عبداللہ مرحوم (۵ اپریل ۱۹۰۶ء۔ ۱۴ اگست ۱۹۸۶ء) کی وفات سے علم و ادب کی دنیا میں ایسا خلا پیدا ہوا ہے جس کا پُر ہونا آسان نہیں۔ انھوں نے مختلف حیثیتوں سے علم و فضل کی دنیا میں نمایاں خدمات سر انجام دیں۔ ان کی کتابوں اور مقالات کی فہرست بہت طویل ہے۔ اس کا ذکر انھوں نے اپنے شخصی کوائف نامہ (شائع کردہ ادارہ خیابانِ ادب، چیمبر لین روڈ، لاہور۔ ۱۹۸۲ء) میں کیا ہے۔ اس کے مطابق اردو میں لکھے گئے مقالات کی تعداد تین سو سے زیادہ بنتی ہے مگر انگریزی مضامین اور مقالات کی تعداد ایک سو دو ہے۔

زیرِ نظر منتخب کتابیات میں ان کی مطبوعہ کتب (بشمول پمفلٹ) کی تعداد ۴۶ ہے۔ ان کا عظیم کارنامہ اردو دائرۂ معارف اسلامیہ کی اشاعت ہے جس کی بیس جلدیں اب تک شائع ہو چکی ہیں۔ مزید دو جلدیں زیرِ طبع ہیں۔ اس کا اشاریہ بھی طباعت کے مراحل میں ہے۔ انھوں نے تاریخِ ادبیات مسلمانانِ ہند و پاک کی تدوین و تصنیف میں مدیر کی حیثیت سے کام لیا۔ سیّد عبداللہ مرحوم نے اپنے شخصی کوائف نامے میں غیر مطبوعہ مسوّدات کا اندراج بھی کیا ہے۔ مقالات و مضامین کی موضوع وار تقسیم کر کے کتاب کا نام درج کیا ہے۔ مسوّدات کے نام ذیل میں لکھے جاتے ہیں۔

۱۔ عزیز و محترم (بزرگوں، دوستوں اور عزیزوں سے متعلق شخصی تاثرات۔ ان کی تعداد ۵۰ ہے۔)
۲۔ تعلیم کے نئے زاویے (۱۹ مقالات کا مجموعہ ہے)
۳۔ فکریات دینی و تہذیبی بشمول سیرت (۱۸ مقالات)
۴۔ فکر و نظریات (فکری و تہذیبی مسائل) ۳۴ مقالات پر مشتمل ہے۔
۵۔ مطالعۂ اقبال۔ نئی پیش رفت (اس میں ۱۲
۶۔ ادب و فن۔ نئی بحث نئی نظر (اس میں ۳۴ مقالات ہیں۔)
۷۔ جدیدیت کے چند رخ (مغرب کے حوالے سے) ۱۵ مقالات پر مشتمل ہے۔
۸۔ پاکستانیات (فکری اور تہذیبی منظر) ۱۰ مقالات۔
۹۔ اقبالیات۔ تازہ تر (نقد و نظر) ۱۳ مقالات
۱۰۔ اسلام اور سوشلزم۔ اس میں وہ مقالات شامل

ہیں احمد کبیر کے نام سے لکھے گئے۔

۱۱۔ تبصرے، دیباچے، شذرے (ان کی تعداد ۵۸ ہے)

۱۲۔ شخصی خود نوشت اور انٹرویو

۱۳۔ متفرق (ان کی تعداد ۲۲ ہے۔

ان کے علاوہ سید صاحب نے اردو دائرۂ معارفِ اسلامیہ میں ۴۸ کے قریب مقالات لکھے یا ان میں شریک مصنف کی حیثیت سے کام کیا۔

اس کتابیات میں ان کی مطبوعہ کتب کے علاوہ مقالات درج کیے ہیں۔ اس بنا پر اس کو منتخب کتابیات کا نام دیا گیا ہے۔ ایک جامع کتابیاتِ سید کی ضرورت ہے، اس پر کام کیا جا رہا ہے۔ اس کتابیات کی تیاری میں مختلف کتب کے حوالے سے استفادہ کیا گیا ہے۔ ان میں فہارس اور ینٹل کالج میگزین (ڈاکٹر محمد بشیر حسین مرحوم) فکر و نظر کے پندرہ سال (جولائی ۱۹۶۳ء ۔ جون ۱۹۷۸ء) ایک تفصیلی اشاریہ (مرتبہ احمد خاں) اشاریہ ماہنامہ "ہمایوں" لاہور از ۱۹۲۲ء تا ۱۹۵۸ء (مرتبہ ڈاکٹر نسرین اختر) مطبوعہ اورینٹل کالج میگزین جلد ۵۹، شمارہ ۲، ۳ بطور خاص قابلِ ذکر ہیں۔ چند ادبی رسائل کی وضاحتی فہرستوں سے بھی استفادہ کیا گیا ہے جو پنجاب یونیورسٹی لائبریری میں غیر مطبوعہ مقالات (THESIS) کی صورت میں محفوظ ہیں۔ ان میں ادبی دنیا، صحیفہ اور فنون کے فہارس کے نام زیادہ معروف ہیں۔ اس کتابیات کے بنیادی طور پر دو حصے ہیں، کتب اور مقالات ان دونوں حصوں کے اندراجات کی ترتیب الفبائی ہے۔

کتب (بشمول پمفلٹ)

۱۔ ادبیاتِ فارسی میں ہندوؤں کا حصہ

۲۔ اردو ادب ۱۸۵۷ء تا ۱۹۶۶ء

۳۔ اردو ادب جنگِ عظیم کے بعد

۴۔ اردو ذریعۂ تعلیم اور نفاذِ اردو

۵۔ ارمغانِ علمی (بخدمت پروفیسر ڈاکٹر محمد شفیع)

۶۔ اشاراتِ تنقید

۷۔ اطرافِ غالب

۸۔ اعلیٰ تعلیم میں اردو کی حیثیت

۹۔ اقبال اور قومیت

۱۰۔ بحث و نظر

۱۱۔ پاکستان ۔ تعبیر و تعمیر

۱۲۔ پاکستان میں اردو کا مسئلہ

۱۳۔ تعلیم کے مقاصد (ترجمہ)

۱۴۔ خطبۂ استقبال جو مغربی پاکستان اردو اکیڈمی کے سالانہ تقسیم انعامات منعقدہ ۱۰ مئی ۱۹۶۹ء کو پڑھا گیا۔

۱۵۔ دفتری زبان اور نصابِ تعلیم

۱۶۔ سہل اقبال

۱۷۔ شعرائے اردو کے تذکرے اور تذکرہ نگاری کا فن

۱۸۔ منتخباتِ نثر اردو (برائے بی۔اے و بی۔ایس سی

۱۹۔ تعلیمی خطبات اور دوسرے مضامین

۲۰۔ چند نئے اور پرانے شذرات

۲۱۔ درخت اور دریچے

۲۲۔ سخن در (نئے اور پرانے)

۲۳۔ سر سید احمد خاں اور ان کے نامور رفقا کی نثر کا فکری اور فنی جائزہ

۲۴۔ شعرائے اردو کے تذکرے اور تذکرہ نگاری کا فن

۲۵ طرفہ غزل (میر، درد، مصحفی اور آتش کی شاعری اور فن)

۲۶۔ لطیف نثر (وجہی سے دورِ جدید تک اسالیب نثر اردو کے ارتقا کے کلاس لیکچروں کا مجموعہ)
۲۷۔ فارسی زبان و ادب (مجموعۂ مقالات)
۲۸۔ متعلقاتِ خطباتِ اقبال
۲۹۔ مسائلِ اقبال
۳۰۔ کلچر کا مسئلہ
۳۱۔ کیا اقبال اشتراکی تھے؟
۳۲۔ مباحث
۳۳۔ مثنوی نل دمن (احمد سراوی)
۳۴۔ مقاصدِ اقبال (طبع ثانی)
۳۵۔ مقاماتِ اقبال
۳۶۔ میر امن سے عبدالحق تک
۳۷۔ نقدِ میر
۳۸۔ نوادر الالفاظ مع غرائب اللغات (عبدالواسع ہانسوی) بہ تصحیح و تحشیہ و مقدمہ
۳۹۔ وجہی سے عبدالحق تک
۴۰۔ وضع و استنادِ اصطلاحات
۴۱۔ ولی سے اقبال تک
۴۲۔ ولی سے اقبال تک (طبع ثانی)
۴۳۔ A DESCRIPTIVE CATALOGUE OF THE PERSIAN URDU AND ARABIC MANUSCRIPTS IN THE PANJAB UNIVERSITY LIBRARY, LAHORE, UNIVERSITY OF THE PUNJAB, 1942-48 (V.1. FASC I HISTORY, FASC II PERSIAN POETRY)
۴۴۔ تذکرہ مردم دیدہ (عبدالحکیم حاکم لاہوری) تصحیح و ترتیب
۴۵۔ معجم مصادرِ اسلامی

مقالات

۱۔ آپ بیتی "نقوش" لاہور
۲۔ انندرام مخلص۔ اورینٹل کالج میگزین
۳۔ ادارۂ معارفِ اسلامیہ کے افتتاحی اجلاس کے سلسلے میں قلمیات و مسکوکات کی ایک شاندار نمائش۔" اورینٹل کالج میگزین"۔ لاہور
۴۔ ادب، اخلاق اور آزادی۔ "ہمایوں"۔ لاہور
۵۔ اردو اپنے نئے ماحول میں۔ "ہمایوں"۔ لاہور
۶۔ اردو ادب کی مختصر ترین تاریخ (سلیم اختر) تبصرہ "نقوش" لاہور
۷۔ اردو ادب میں پاکستانیت کا مسئلہ "سرسیدین" راولپنڈی۔ پاکستانی ادب
۸۔ اردو خطوط نگاری "نقوش"۔ لاہور
۹۔ اردو کو رائج کرنے کے لیے آرڈیننس جاری کیا جائے۔ "چٹان"۔ لاہور
۱۰۔ اردو رسم الخط کی فلسفیانہ بنیادیں "قومی زبان" کراچی
۱۱۔ اردو کا ایک جرمن شاعر فرانسو "اورینٹل کالج میگزین" لاہور
۱۲۔ اردو کی تعمیر میں خان آرزو کا حصہ "اورینٹل کالج میگزین" لاہور
۱۳۔ اردو کے موجودہ اہم مسائل "قومی زبان" کراچی
۱۴۔ اردو میں سائنسی ادب "فنون"۔ لاہور
۱۵۔ ارمغانِ علمی بخدمت پروفیسر ڈاکٹر محمد شفیع (دیباچہ)
۱۶۔ اسلام اور ماڈرنزم "فکر و نظر" اسلام آباد
۱۷۔ اقبال اور ابنِ خلدون "اورینٹل کالج میگزین" لاہور
۱۸۔ اقبال اور حافظ کے ذہنی فاصلے "صحیفہ"۔ لاہور
۱۹۔ اقبال اور سیاسیات۔ "ہمایوں" لاہور "معارف" اعظم گڑھ

- اقبال اور معراج النبیؐ "فکر و نظر" اسلام آباد
- اقبال اور وجودیت "اورینٹل کالج میگزین" لاہور
۲- اقبال کا تصورِ پیکار۔ "ضیا بار" سرگودھا
۲- اقبال کی زبان۔ "ماہِ نو" کراچی
۲- اقبال صاحب۔ "مجلہ تحقیق" لاہور
۲- انگلرودو۔ پاکستان کی نئی زبان۔ "چٹان" لاہور
۲- ایسٹ انڈیا کمپنی کے ماتحت فارسی زبان کی حالت۔ "اورینٹل کالج میگزین" لاہور
۲- ایک خرد افروز کتاب (تاریخ اور کائنات۔ میرا نظریہ) تبصرہ "فنون" لاہور
۲۱- پاکستان میں اردو کا مستقبل۔ "ہمایوں" لاہور
۲۰- پاکستان میں اردو کی بپتا۔ "چٹان" لاہور
۳۰- پاکستان میں ایک نئی جناتی زبان۔ "اخبار اردو" کراچی
۳- پاکستان میں عربی فارسی کی تعلیم کا مستقبل "اورینٹل کالج میگزین" لاہور
۳۲- بیرونی سوسائٹی میں شاعر کا مجلسی مقام۔ "ہمایوں" لاہور
۳۳- پروفیسر محمود شیرانی۔ "نقوش" لاہور
۳۴- پنجاب کا ایک اور ریختہ گو۔ پیر قلندر شاہ "اورینٹل کالج میگزین" لاہور
۳۵- تاریخ لاہور پر مزید دھندلی سی روشنی۔ "مجلہ تحقیق" لاہور
۳۶- تحریکِ پاکستان کے ثقافتی محرکات۔ "سر سیدین" راولپنڈی۔ پاکستانی ادب
۳۷- تزک عالم طاش کبری زادہ کے تعلیمی تصورات "مجلہ تحقیق" لاہور
۳۸- تزکاتِ تیموری۔ "اورینٹل کالج میگزین" لاہور
۳۹- تنقیدی دبستان (سلیم اختر) تبصرہ "نقوش" لاہور
۴۰- تنقید کیا ہے۔ "سر سیدین" راولپنڈی، پاکستانی ادب۔ تنقید، پانچویں جلد
۴۱- ثنائے خواجہ (نعتیہ کلام) تبصرہ "فنون" لاہور
۴۲- چندر بھان برہمن۔ "اورینٹل کالج میگزین" لاہور
۴۳- حافظ لدھیانوی کے قطعات۔ تبصرہ "نقوش" لاہور
۴۴- حالی کی قطعہ نگاری۔ "نقوش" لاہور
۴۵- خزائن مخطوطات پنجاب یونیورسٹی لائبریری "اورینٹل کالج میگزین" لاہور
۴۶- خط کی کہانی مخطوطات کی زبانی "نذر رحمن" لاہور
۴۷- دنیائے اردو جنگِ عظیم کے بعد اورینٹل کالج میگزین لا
۴۸- ماجد نریندر ناتھ کا ایک اور مکتوب۔ "ادبی دنیا" لاہور
۴۹- رحمن صاحب۔ ایک تاثر۔ نذر رحمن لاہور
۵۰- سر سید کے زیرِ اثر ادبی تنقید کی ابتدا۔ "اورینٹل کالج میگزین" لاہور
۵۱- سر سید کے ہم خیال علما کے دینی نظریے۔ "اورینٹل کالج میگزین" لاہور
۵۲- سیرتِ طیبہ، حضورؐ کے اسما و القاب کے آئینے میں "نقوش" لاہور۔ رسولؐ نمبر
۵۳- سیرت النبیؐ (شبلی) "اورینٹل کالج میگزین" لاہور
۵۴- سیرتِ نبویؐ کا پیغام عصرِ حاضر کے نام "نقوش" لاہور
۵۵- شبلی فکرِ جدید سے کیوں کر روشناس ہوئے "اورینٹل کالج میگزین" لاہور
۵۶- شعرائے اردو کے جلسے "ہمایوں" لاہور
۵۷- صنائع و بدائع کی تقسیم جمالیاتی نقطۂ نظر سے "اورینٹل کالج میگزین" لاہور
۵۸- علامہ اقبال کی خدمت میں حاضری کے چند

موقعے "ادبی دنیا" لاہور

۵۹۔ عہدِ اکبری۔ ہندوؤں میں فارسی دانی کا آغاز۔ "اورینٹل کالج میگزین" لاہور

۶۰۔ عہدِ محمد تغلق کے مصنفین۔ اورینٹل کالج میگزین لاہور

۶۱۔ غالب کا نارسیدہ کلام۔ "نقوش"، لاہور

۶۲۔ غالب کے جدید تذکروں پر ایک نظر۔ اورینٹل کالج میگزین"، لاہور

۶۳۔ غرائب اللغات میر عبدالواسع ہانسوی۔ "اورینٹل کالج میگزین" لاہور

۶۴۔ غزل، غزلیت اور تغزل۔ "صحیفہ" لاہور

۶۵۔ فارسی شاعری اور مسائلِ حیات۔ اورینٹل کالج میگزین" لاہور

۶۶۔ فارسی شاعری میں گل و گلزار کی حقیقت۔ "اورینٹل کالج میگزین"، لاہور

۶۷۔ فنِ سیرت نگاری پر ایک نظر۔ "فکر و نظر" اسلام آباد

۶۸۔ قدیم عربی تصانیف میں ہندوستانی الفاظ۔ "اورینٹل کالج میگزین" لاہور

۶۹۔ کتاب خانہ شیرانی کے نوادر۔ "اورینٹل کالج میگزین" لاہور

۷۰۔ کلامِ اقبال کی دقتیں اور ان کی تشریح کی ضرورت۔ "معارف" اعظم گڑھ

۷۱۔ کلامِ اقبال کی دقتیں اور ان کی تشریح کی ضرورت۔ "پیغامِ حق" لاہور

۷۲۔ گرو نانک کی فارسی تعلیم کہاں تک تھی۔ "اورینٹل کالج میگزین" لاہور

۷۳۔ لطائف نامہ فخری۔ "اورینٹل کالج میگزین" لاہور

۷۴۔ مثنوی رغو راگ "اورینٹل کالج میگزین" لاہور

۷۵۔ محاکمات الشعرا محمد حسن۔ "اورینٹل کالج میگزین" لاہور

۷۶۔ محسن الملک "نقوش" لاہور

۷۷۔ مسلمانوں کے ادب میں مزاح کے تنوعات۔ "نقوش" لاہور

۷۸۔ مشکل اور آسان زبان کا مسئلہ۔ "اخبارِ اردو" اسلام آباد

۷۹۔ معجم مصادر اسلامی، ایک علمی منصوبہ۔ "فکر و نظر" اسلام آباد

۸۰۔ مطالعۂ رومی کی تاریخ میں اقبال کا مقام۔ ماہِ نو کراچی

۸۱۔ مغرب کا انتساب اردو پر (عبدالقادر) "اورینٹل کالج میگزین" لاہور

۸۲۔ میر اور ذہنِ جدید۔ "صحیفہ" لاہور

۸۳۔ میر علی شیر کی بزمِ شعر و سخن۔ "اورینٹل کالج میگزین" لاہور

۸۴۔ میر کا رنگِ طبیعت "نقوش" لاہور

۸۵۔ نذیر احمد کی انفرادیت۔ "نقوش" لاہور

۸۶۔ نذیر احمد کے قصے۔ "اورینٹل کالج میگزین" لاہور

۸۷۔ نظام الملک ثانی یعنی میر علی شیر نوائی۔ "اورینٹل کالج میگزین" لاہور

۸۸ نل دمن احمد سرادی اور اس کی زبان "اورینٹل کالج میگزین" لاہور

۸۹۔ نور خاں کی تعلیمی تجاویز۔ "اخبارِ اردو" اسلام آباد

۹۰۔ وارداتِ سرمد "نقوش" لاہور

۹۱۔ ہماری درسیات میں اقبال کی نمائندگی۔ "ستارہ"، لاہور

۹۲۔ ہمارے پرانے شاعروں کی علمی استعداد۔ "اورینٹل کالج میگزین" لاہور
۹۳۔ ہندوؤں کا فارسی لٹریچر" اورینٹل کالج میگزین"، لاہور
۹۴۔ ہندوؤں کے فارسی لٹریچر پر ایک نظر بازگشت" اورینٹل کالج میگزین" لاہور
۹۵۔ یک چمن گل (گلدستۂ انتخاب) "نذیر رحمن" لاہور

عطیہ سید

آجی[1]

مجھے معلوم نہیں کہ اوائل عمر میں ان پر کیا گزری۔ جو کچھ سنا حدیث تھی، حکایت تھی۔ جب مجھے شعور ہوا تو ان کی زندگی دوپہر ڈھل رہی تھی، اور سہ پہر کے سائے ان کی جانب بڑھ رہے تھے، لیکن ان کے نازک وجود کا ہلکا سا ارتعاش غماز تھا کہ وہ وقت کے جھگڑوں سے گزر چکے ہیں، اور ان کے خوبصورت — تقریباً نسائی ہاتھوں کی ابھری ہوئی پتلی رگوں میں خود اعتمادی کا فولاد رچ چکا ہے جو صرف بادِ مخالف کے تھپیڑوں سے نبرد آزما ہونے والوں کا نصیب ہوتا ہے۔

انسان ابھی تک اس ٹائم مشین کو ایجاد نہیں کرسکا جس کا فسانہ مدتوں پہلے ایچ۔ جی ویلز نے رقم کیا تھا۔ سو تجسیماتی طور پر وقت کی مختلف جہتوں میں سفر کرنا ممکن نہیں، لیکن ذہنی طور پر یادِ ماضی کی جانب اور تخیل مستقبل کی سمت پرواز کی سکت رکھتا ہے۔ ڈاکٹر سید عبداللہ بھی ماضی بن چکے ہیں۔ لہٰذا ان کی شخصیت کی تصویر کشی یادداشت ہی کے وسیلے سے ممکن ہے اور یہ یادداشت دریافت سے کم نہیں۔ ڈاکٹر سید عبداللہ اب موجود نہیں، لیکن عدم وجود سے انکشافِ وجود کی جانب سفر ممکن ہے۔ تو آئیے ماضی کی سمت دریافت کے عمل کا آغاز کرتے ہیں۔

جوئے شعور کے دھاروں کے ساتھ ساتھ اگر یاد کی کشتیاں رواں ہوں تو بہت سی تصویریں فراموشی کی دھند سے ابھرتی ہیں۔ میں اس وقت ان بہت سی تصویروں کے البم سے صرف چند ایک کا عکس پیش کروں گی۔

ایک شبیہ ابھرتی ہے۔ ایک مکان اور اس میں ایک وسیع کمرہ جس میں ایک چار پٹوں والا دریچہ جو ایک بیری کے پرانے گھنے جنگل نما سر پر کھلتا ہے، جس میں بے شمار چڑیوں کے گھونسلے ہیں۔ اور ان کے چہچہانے کی آواز اس وقت بھی میرے کانوں میں آرہی ہے۔ کمرے میں بچھے بہت پرانے انداز کے پلنگ پر ایک شخص، خالص مشرقی انداز میں لوئی کو اپنے گرد لپیٹے، اونی ٹوپی پہنے، تفکر میں سرتاپا غرق، بیری کی جانب نگاہیں جمائے، کتابوں کے انبار میں گھرا بیٹھا ہے۔ کبھی کبھی تخیل کی شعبدہ بازی سے وہ مصورِ مشرق عبدالرحمٰن چغتائی کی تصویروں میں گڈمڈ ہو جاتا ہے، جو سراسر مشرقی جبّے پہنے اپنی حیرت زدہ آنکھوں سے ماضی کے

---

[1] اس مضمون کی مصنفہ محترمہ عطیہ سید صاحبہ، ڈاکٹر سید عبداللہ مرحوم کی صاحبزادی ہیں۔ گھر میں وہ اپنے ابا جی کو "آجی" کہتی تھیں — ادارہ

جہانِ گم گشتہ کو ڈھونڈ رہی ہیں۔ پھر اسی شخص کی تفکر میں ڈوبی آنکھیں میری توتلی زبان سے "آجی" کا لفظ سن کر فرطِ مسرت سے مسکراتی ہیں اور دور خلاؤں کے سفر سے لوٹ آتی ہیں۔

یہ شبیہہ جوئے شعور کے سیلِ رواں سے کیوں اُبھرتی ہے؟ شاید اس لیے کہ یہ تصویر ان کی ذات کے بہت سے رویوں کی علامت ہے۔ ان کی لوئی (جو وہ سردیوں میں اپنے گرد یوں لپیٹتے تھے کہ وہ ان کے جسم کو سر سے پاؤں تک مکمل طور پر ڈھانپ دیتی تھی) ان کے کئی رجحانات کی نشاندہی کرتی ہے۔ یہ لوئی مشرقیت سے گہرا اُنس اور بے پناہ محبت ہے مصورِ مشرق عبدالرحمن چغتائی کی تصویروں کی طرح ان کی روح بھی مشرقی تھی اور مشرق کی اس کھوئی ہوئی تہذیب کو تلاش کرتی رہی جس کے خدوخال مسلمانوں کے تہذیبی عروج سے نکھرے تھے۔

یہ شخص جو تصویر میں نظر آتا ہے گھٹنے موڑ کر خالص مشرقی انداز میں پلنگ پر بیٹھا ہے کہ "آجی" کو اس انداز سے بیٹھنا بہت مرغوب تھا۔ جب وہ لکھتے تھے، پڑھتے تھے، سوچتے تھے یا محض خاموش سکون کے لمحوں سے گزرتے تھے تو اسی انداز میں بیٹھنا انھیں محبوب تھا۔ اس انداز کو ہم درویشانہ POSTURE بھی کہہ سکتے ہیں۔ بدھ صوفیوں کا عقیدہ تھا کہ طریقت کے مختلف مقامات کا اظہار صوفی کے اندازِ نشست سے ہوتا ہے۔ یہ عقیدہ بڑی حد تک حقائق پر مبنی ہے۔ کیونکہ اس میں شک نہیں کہ ہمارا خارجی جسمانی اندازِ نشست ہمارے داخلی اندازِ فکر کا عکاس ہوتا ہے۔ اگر ایسا ہے تو پلنگ پر بیٹھے شخص کے روحانی نقوش میں سے ایک واضح نقش درویشی کا ہے "آجی" اوّل تا آخر درویش تھے اور رہے۔ ان کی غیر دنیا داری سے لوگ آشنا ہوں یا نہ ہوں، گھر والے یقیناً واقف تھے۔ فقر اُن کا مسلک اور درویشی روشِ حیات تھی۔ وہ اگرچہ دنیا میں رہے معاشرتی مسائل کے بارے میں سوچا، اعلیٰ منصبوں پر نہ صرف فائز رہے بلکہ ان کے فرائض پوری تندہی سے سرانجام دیے، تحریکیں چلائیں، جلسے کیے، جلوس نکالے، مگر ان کی روح کے نہاں خانے میں کوئی حجرہ، کوئی خانقاہ ضرور تھی جس میں دنیا کی ہاؤ ہو، گہما گہمی اور نفسا نفسی سے گریز کی سرسراہٹ سنائی دیتی تھی، جیسے کوئی رات کو پُر ہجوم شہر سے نکل کر صحرا کی بسیط وسعتوں میں واقع کسی خانقاہ میں چپکے سے دیا جلا کر اکیلا جا بیٹھے۔ "آجی"، اکثر اپنے باطن کی اسی خانقاہ میں اُتر جاتے تھے۔ شاید اپنے روحانی زرہ بکتر کی مرمت کے لیے۔ دنیا کو انھوں نے کبھی ترک نہیں کیا لیکن اسے کبھی اپنی سوچ اور اپنے ضمیر پر حاوی بھی نہیں ہونے دیا۔

کتابِ ماضی کے ورق الٹنے سے ایک اور گہری گمبھیر ظاہری کردار کی تہہ سے سنولائی ہوئی تصویر اُبھرتی ڈوبتی نظر آتی ہے۔ لوئی لپیٹے، اونی ٹوپی پہنے کتابوں کے انبار میں گھرا، بیری کی جانب نگاہیں مرکوز کیے، پرانے انداز کے پلنگ پر گاؤ تکیے پر ٹیک لگائے جو شخص بیٹھا ہے وہ اچانک اٹھ کھڑا ہوتا ہے اور ایک سرو قد، نازک، دُبلی پتلی خاتون کی شکل میں ڈھل جاتا ہے، جس کی آنکھوں میں مہر و محبت کی وہ مسکراہٹ ابھرتی ہے جو تلخیٔ حیات کا ثمر ہے اور صدیوں کی محروم عورت کا ارتفاع (SUBLIMATION) ہے۔

یہ خاتون "آجی" کی والدہ ہیں جو ہری پور ہزارہ کے گرم میدانوں سے بیاہ کر شمال کے دور دراز بلند پہاڑوں اور تند سرد ہواؤں کی زد میں واقع ایک ننھے سے گاؤں میں اپنے لرزتے دل اور خواب ناک آنکھوں سمیت آبستی ہے جو ہری پور ہزارہ کے روشن مہربان دنوں کو یاد کرتی ہے اور دیے کی مدھم لو میں نم آنکھوں سے کھدر پہ ریشم کے پھولوں کا جال بچھاتے ہوئے حافظ اور سعدی کے اشعار کا ہولے ہولے ورد کرتی ہے۔ یہ خاتون اپنی دو بیٹیوں اور ایک ہمزاد بیٹے کو جنم دینے کے بعد اس جہانِ فانی سے رخصت

تی ہے۔ یہی وہ خاتون ہے جس کی تلاش آپا جی کو شاید ہمیشہ رہی، جسے پاکر بہت جلد انھوں نے کھو دیا۔ برسوں بعد ..
ن پر یہ منکشف ہوا کہ یہ خاتون خود ان کے باطن میں موجود ہے۔ جدائی کا وہ کرب جس کی رگیں ان کے وجود کے طول و عرض
ھڑکتی تھیں، اس مثبت مہم کو پیدا کرنے کا سبب بنا جس کا پھل انسانوں اور خاص طور پر بے مہری زمانہ سے کملائے لوگوں
ایک ان مٹ محبت کی شکل میں ظاہر ہوا۔ اور ان کی آنکھوں میں وہ شمعیں دمکنے لگیں جو اصل حیات کو پانے سے کو بکڑتی اور
یں۔ ان کی زندگی کے ابتدائی ایام کے درد ہی سے وہ شجر سایہ دار پھوٹا جو بہت سوں کے لیے کڑی دھوپ میں مہربان
بان تھا۔ ان کی روحانی قوت کا راز اس اعتماد میں پوشیدہ تھا کہ بے بس جابر سے اور صبر جبر سے عظیم تر ہے کہ ان میں برداشت
نت ہے۔

انھیں اپنی والدہ کی نہ صرف دراز قامت، سفید رنگ، خوبصورت ہاتھ اور نفیس انگلیاں ہی (جو سر جنوں اور مصوروں
رہیں) واصل ہوئیں۔ بلکہ ان کا شعری ذوق بھی (GENES) کے ساتھ یوں منتقل ہوا کہ زندگی اور ادب کی لطافتوں کا
آپا جی کے رگ و پے میں مکمل طور پر رچ بس گیا۔ عربی سے لگاؤ بے شک انھیں اپنے والد سے حاصل ہوا، مگر فارسی
ارسی شعر کے حسن کا احساس انھیں اپنی والدہ ہی سے ورثہ میں ملا۔ والدہ سے بچپن ہی میں جدائی اور اس عہد کے
ی پدری رعب نے ان کی حساس طبیعت کو شدید طور پر متاثر کیا۔ یوں ان پر یہ منکشف ہوا کہ دکھ انسانی زندگی
بنیادی حقیقت ہے۔ یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ انسانی دکھ ہی وہ بیج ہے جس سے بڑی حد تک تمام شاعری کی کونپل
تی ہے اور تناور درخت کی شکل اختیار کرتی ہے۔ اپنی زندگی کے ابتدائی ایام ہی میں دکھ سے آشنائی نے آپا جی کی طبیعت
و ادب کی جانب یوں مائل کیا کہ شعروں کے حسن سے دنوں تک ان پر رقت طاری رہتی تھی۔ خوبصورت اشعار
دکرنا ان کا معمول تھا اور وہ اسے عبادت کا درجہ دیتی تھیں۔ اُن کی یہ فریفتگی مرتے دم تک قائم رہی۔ اسی فریفتگی نے
نھیں مختلف زبانوں کے شعری اور نثری ادب کے مطالعے پر اکسایا اور پھر انھیں فارسی اور اردو ادب کے نقاد
دب میں اجاگر کیا۔

انسان اور فطرت کے حسن کا احساس، ادب کی طرف جھکاؤ، شخصیت کی نرمی، محبت کی چاشنی، انسانی رشتوں کو
کی جذباتی بنیادوں پر استوار کرنے کا رجحان، زندگی کے موسموں کے تند کی جانب قبولیت کا رویہ، بے بسی اور بے کسی
تدس اور جبر کے بجائے روحانی تسخیر پر اعتقاد، شخصیت میں اصولِ تانیث یعنی FEMININE PRINCIPLE کو نمایاں
ہے۔ ان کی شخصیت میں یہ غالب رنگ اسی روحانی پس منظر سے ابھرتا ہے جس کا حوالہ پہلے دیا جا چکا ہے۔ اسی بنا پر
کے وجود کی تہوں میں جذباتیت کی ایک دھار بڑی خاموشی سے کاریز کی طرح رواں تھی جو کبھی کبھی منطقیت کی ٹھوس
ا سے باہر نکل آتی۔ جذباتیت اور منطقیت کے اسی تناقص سے انھیں یہ وجدان حاصل ہوا کہ جذبات کی اپنی منطق
ہے اور اس منطق کو انھوں نے اپنی زندگی میں، اپنی تحریروں اور تقریروں میں جابجا استعمال بھی کیا۔

فلسفیانہ رجحانات میں بھی ان کا التفات تصوف اور مثالیت (IDEALISM) کی جانب تھا۔ وہ ارسطو کا
احترام کرتے تھے، لیکن اصل یگانگت افلاطون ہی سے رکھتے تھے — افلاطون جو تصوف اور مثالیت کے افکار

کا علمبردار تھا اور جس کی اپنی شخصیت میں اصولِ تانیث کا غلبہ تھا۔ اردو شعرا میں بھی غالب کی پُر شکوہ شخصیت کو تسلیم کرنے کے باوجود انھیں دلی لگاؤ نمناک آنکھوں والے میر ہی سے تھا جس کی شخصیت اور شاعری میں اصولِ تانیث کی جھلک بہت نمایاں ہے۔

شاید قارئین کے لیے یہ بات باعثِ حیرت ہو کہ آجی بھی اپنے عہد، اپنے زمانے اور اپنے طریق سے ایک ... تھے۔ صدیوں سے دبی ہوئی باورچی خانے میں میکانکی، تواتر سے ایک مزدور کی طرح کام کرتی ہوئی، سلائی کی مشین پر جھکی ہوئی۔ نمناک آنکھوں والی عورت کی نارسائی سے وہ خوب واقف تھے۔ اور اس کی اذیت کا انھیں شدید احساس تھا، گرچہ انھوں نے کبھی اس کا اظہار جدید مغربی محاورے میں نہیں کیا اسی لیے اجنبیوں کے نزدیک ان کا ظاہری رویہ بڑی حد تک روایتی نظر آتا تھا، لیکن عورت کی مظلومیت اور بطور انسان اس کی مساوات کا احساس ان کے باطن کی اندرونی تہوں میں ان کے رگ و پے میں خون کی طرح رواں دواں تھا۔

اگرچہ "آجی" کی شخصیت کے تانے بانے میں اصولِ تانیث، تانے کا درجہ رکھتا تھا، لیکن اصولِ مذکر کا بانا بھی موجود تھا۔ آجی کی طبیعت میں اصولِ مذکر کا عکس ان کے والد کی موجودگی کو ظاہر کرتا ہے۔ ان کے والد کے آبا و اجداد مشہدی سیّد تھے۔ ہندوستان میں اسی راستے سے داخل ہوئے جس سے بابر وارد ہوا تھا۔ پنجاب میں چکوال کے علاقے میں آباد ہوئے۔ آجی کے جدِ امجد کے پانچ بھائی تھے جن میں ایک کی گمشدگی کی روایت ہے، باقی تین پنجاب میں ہی رہے لیکن آجی کے جدِ امجد سکھوں کے خلاف جہاد کی غرض سے شمال کی جانب روانہ ہوئے اور بعد میں شمالی جنگلوں میں ہی ہمیشہ کے لیے جا بسے۔ آجی کے والد عالمِ دین بھی تھے اور طبیب بھی، مگر اپنی حکمت کو انھوں نے کبھی روپیہ کمانے کا ذریعہ نہیں بنایا۔ تنول کے وسیع علاقے میں دور دور تک خود جاتے اور لوگوں کا مفت علاج کرتے۔ اسی لیے وہ "شاہ صاحب" (جو سیّدوں کو عام طور پر کہا جاتا ہے) کے علاوہ "طبیب میاں" کے نام سے بھی مشہور تھے۔ انھیں عربی فارسی پر بھی دسترس حاصل تھی۔ وہ ہمیشہ سفید رنگ خلقے[1] اور کالی رنگ کی پگڑی باندھتے تھے۔ ان کے نقوش بڑے متناسب، رنگ سرخ و سفید اور جلد پیاز کی جھلّی کی طرح نفیس تھی۔ ان کے سراپے میں جسمانی جمال اور روحانی جلال بڑا واضح تھا۔ اس کا اظہار ان کی چمکیلی آنکھوں کی گرفت تھی جب بھی میں ان کی آنکھوں کا تصور کرتی ہوں تو مجھے یوں محسوس ہوتا ہے کہ ان میں جھانکتے ہی ان کا قد تیزی سے بڑھتا ... جاتا اور دیکھتے ہی دیکھتے ان کا سر چھت کو چھونے لگتا۔ میں، آجی اور باقی سب لوگ اس ایک ستون والے برآمدے میں (جس میں وہ عموماً چارپائی پر گاؤ تکیے سے ٹیک لگا کر بیٹھتے تھے) بہت چھوٹے ننھے منے لگنے لگتے۔ ان کے جلال میں ایک شل کر دینے والی قوت تھی جس نے ہمیشہ ان کے خاندان کے سب افراد کو ان کے سامنے سر جھکانے پر مجبور کیا۔ وہ اپنے عہد کی روایات کے پابند ہونے کے ناتے سخت نظم و ضبط کے قائل تھے۔ ان کے اصول و ضوابط ایسے کڑے تھے کہ ان میں انسانی کمزوری اور استثنا کے لیے بال برابر لچک بھی موجود نہیں تھی۔ اگر کانٹ کے اخلاقی قانون[2] CATEGORICAL IMPERATIVE کی تجسیم

---

[1] وہ ڈھیلا قمیص نما لباس جو اب بھی عرب اور ایرانی عبا کے نیچے پہنتے ہیں۔

[2] کانٹ کا اخلاقی قانون کے بارے میں تصور جس کے مطابق اس کی نوعیت غیر مشروط حاکمانہ ہے۔

مَیں ہوتی ۔۔ وہ دا داجی کی شکل میں ظاہر ہوتا۔

آجی کی شخصیت میں اصولِ مذکر کا نظم و ضبط اور CATEGORICAL IMPERATVE منتقل ہوا مگر وہ اپنی ے زخم خوردہ تھے۔ لہٰذا انھوں نے اس کا توڑ بھی تلاش کر نا تھا۔ یہ توڑ انھیں ان کی شخصیت میں موجود اصولِ تانیث کی بدولت اصل ہوا۔ اسی بنا پر وہ نظم و ضبط کو اہم تصوّر کرنے کے باوجود انسان اور اس کی کوتاہیوں سے محبّت کرتے تھے اور اس کی زوریوں اور خطاؤں سے درگزر کا رجحان رکھتے تھے۔ وہ CATEGORICAL IMPERATIVE کی اخلاقیات کو قبول رتے ہوئے بھی کبھی سقراطی معقولیت اور کبھی صوفیانہ ڈھیل کے رویّے کو اپناتے تھے۔

اصولِ تانیث اور اصولِ مذکر، نظم و ضبط اور مشفق لچک، کانٹین اخلاقیات کے ساتھ ساتھ سقراطی معقولیت اور صوفیانہ رگزر کے تضادات ان میں موجود تھے، لیکن ان کی موجودگی ان کی شخصیت میں انتشار اور ٹکراؤ کے بیج بونے کا سبب نہیں ن سکی۔ شاید وہ عنفوانِ شباب میں ان کیفیات سے گزرے ہوں کہ عنفوانِ شباب کشمکش کا دور ہوتا ہے، مگر جب میں نے نھیں دیکھا تو ان جنگجو تضادات کے گھوڑوں کی ٹاپوں سے اٹھنے والی گرد بیٹھ چکی تھی۔ شاید وہ برسوں کی صعوبت کے بعد دو انتہاؤں (جو خود ان کے اندر موجود تھیں) کے درمیانی نقطے کو ــــ سنہری میانہ روی، تناسب اور توازن کو (جیسے یونانی ندگی کی عظیم قدر تصوّر کرتے رہے) ــــ دریافت کر چکے تھے۔ اسی لیے زندگی کی باریک دھار پر چلتے ہوئے وہ اپنی سوچ کو متوازن رکھنے میں یوں کامیاب رہے جس طرح ایک نٹ پتلی رسّی پر اپنے ڈولتے وجود کے توازن کو برقرار رکھنے میں کامیاب رہتا ہے۔ اگرچہ اسے یہ کمال برسوں کی مشقّت اور ریاضت سے حاصل ہوتا ہے۔ وہ اسٹیل مل کی بھٹّی کی طرح اسکریپ و اسٹیل میں، مثبت کو منفی میں ڈھالنے کا ڈھنگ جانتے اور محرومیوں کے ارتفاع کا سلیقہ رکھتے تھے۔ یہی وہ فن تھا نوان کے نازک وجود کی بے پناہ روحانی قوت کا راز تھا۔

جوئے شعور کے بہتے پانیوں کی تہہ سے ایک اور عکس ابھرتا ہے۔ ایک دھند میں ڈوبی دنیا کا، چاندنی میں نہال کوہ و منت، خاموش برساتی نالے، کنواری ندیاں جنھیں انسانی ہاتھوں نے نہیں چھوا تھا، گھرے گمبھیر جنگل، مٹّی کے صاف شفاف لیپے پوتے گھر، پتلی و دشوار پہاڑی پگڈنڈیاں۔ ستمبر کی تر و تازہ خوشبودار جھاڑیاں[1] ــــ اور ان کے درمیان ایک قافلہ رواں دواں ــــ ایک دو گھڑسوار، چند پیدل، کچھ خچر سامان بردار۔

یہ وہ دنیا ہے جہاں آجی نے اپنی زندگی کے ابتدائی سات آٹھ برس گزارے یہیں وہ گاؤں ہے جو خالص پتھر کی بلند و بالا چٹانوں کے عین کنارے پر یوں واقع ہے کہ ہر لمحے طوفانی ہواؤں کے قہر سے اس کے نیچے گرنے کا اندیشہ رہتا ہے۔ یہ سنگلاخ چٹانیں کئی سو فٹ بلند ہیں اور عمودا نیچے ایک تنگ وادی اور پُرشور پہاڑی ندی میں جا اُترتی ہیں۔ چھیاسی برس قبل یعنی آجی کی زندگی کے ابتدائی ایام میں یہاں کوئی سڑک موجود نہیں تھی۔ البتّہ پتلی خطرناک پگڈنڈیوں کا جال ان اونچے پہاڑوں کے سینے پر پھیلا ہوا تھا۔ اب سے پندرہ برس پہلے بھی آجی کے گاؤں تک پہنچنے کے لیے پیدل یا گھوڑے پر سفر

---

[1] ایک خاص جھاڑی جو صرف پاکستان کے شمالی علاقوں میں پائی جاتی ہے۔

کیا جاتا تھا۔

آجی چودہ برس کی عمر میں لاہور آ گئے اور ہمیشہ کے لیے لاہوری ہو گئے۔ لیکن وہ سال میں ایک مرتبہ ضرور دادا جی سے ملنے کے لیے گاؤں جاتے تھے۔ یہ سلسلہ برسوں تک جاری رہا حتیٰ کہ میری پیدائش کے چند سال بعد تک بھی یعنی دادا جی کی وفات تک۔ اس ملاقات کے لیے بڑا اہتمام کیا جاتا تھا۔ امی کے لیے زنانہ سواریوں کی عادی گھوڑی حاصل کی جاتی۔ آجی خود پیدل چلنا پسند کرتے تھے۔ ایک دو ملازم ساتھ لیے جاتے اور کچھ عزیزوں کو اکٹھا کیا جاتا۔ پھر آدھی رات کے بعد یہ قافلہ مانسہرہ سے روانہ ہو جاتا اور ہنستا کھیلتا، خوش گپیاں کرتا چاند کے ساتھ ساتھ چلتا رہتا تاکہ صبح کے سورج اور اس کی دھوپ سے پہلے منزلِ مقصود پر جا پہنچے۔ رستے میں کہیں کہیں گاؤں تھے جن کی پتھریلی گلیوں سے گزرتے ہوئے اس قافلے والوں کے پاؤں کی چاپ اور گھوڑوں کے سموں کی آواز اچانک رات کی خوابیدہ خاموشی میں گونجتی۔

اب بھی مجھے یاد کی آنکھ میں یہ قافلہ رواں دکھائی دیتا ہے۔ کسی سوئے ہوئے گاؤں کی گلیوں سے تیزی سے نکلتے ہوئے گھوڑے کے سموں اور بے خواب گیدڑوں کی آوازیں سنائی دیتی ہیں ـــــ مگر دور بہت دور ـــــ! یہ قافلہ شاید وقت کا ہے جو گزر گیا۔ یہ دنیا آجی کی اوائل عمر کی ہے جہاں انھوں نے ہوش سنبھالا۔ یہ دنیا جہاں زمانہ وسطیٰ مدتوں ٹھہرا رہا۔ اب تیزی سے بدل رہی ہے۔ خطرناک تنگ پگڈنڈیوں کی جگہ بڑی بڑی چمکتی تارکول کی سڑک نے لے لی ہے۔ جس پر ویگنیں شور مچاتی، دندناتی دوڑی جا رہی ہیں۔ وہ قافلہ اور اس میں شامل اکثر لوگ بھی رخصت ہو گئے۔ اب صرف ان کے نقوشِ پا ہیں جو یادوں کی شکل میں محفوظ ہیں۔

ڈاکٹر ملک حسن اختر

ڈاکٹر سیّد عبداللہ ــ شخصیت اور ادبی خدمات

ملک کے ممتاز ادیب، محقق اور نقاد ڈاکٹر سیّد عبداللہ ایک طویل بیماری کے بعد ۱۴ اگست ۱۹۸۶ء کی شام انتقال کر گئے۔
ا کی وفات ادبی دنیا کے لیے ایک عظیم نقصان ثابت ہوئی۔ سیّد عبداللہ موضع منگلور ضلع ہزارہ میں ۱۹۰۶ء میں پیدا ہوئے۔
د کا نام سیّد نور احمد شاہ ہے۔ مانسہرہ، ایبٹ آباد، علی گڑھ اور لاہور میں تعلیم حاصل کی۔ کچھ باقاعدہ اور کچھ پرائیوٹ۔ پہلے
اب یونیورسٹی لائبریری میں ملازم ہوئے پھر اورینٹل کالج لاہور میں استاد مقرر ہوئے جہاں ترقی کر کے صدر شعبۂ اردو اور
پل کے عہدہ تک پہنچے۔ پرنسپل کے عہدے سے ریٹائر ہونے کے بعد دائرۂ معارفِ اسلامیہ کے چیئرمین مقرر ہوئے۔ اسی
ے پر کام کرتے ہوئے وفات پائی۔ ان کی تعلیمی اور ادبی خدمات کے پیشِ نظر انھیں پروفیسر ایمریٹس کا اعزاز دیا گیا۔ لکھنے کا
لہ پندرہ برس کی عمر سے شروع ہوا اور وفات سے چند ماہ قبل تک جاری رہا۔ "ادبیاتِ فارسی میں ہندوؤں کا حصہ" کے عنوان
تحقیقی مقالہ لکھ کر ڈی لٹ کی ڈگری حاصل کی۔ ان کی مطبوعہ تصانیف کے نام یہ ہیں:

(۱) بحث و نظر (۲) مباحث (۳) ولی سے اقبال تک (۴) نقد میر (۵) وجہی سے عبدالحق تک (۶) اطرافِ غالب
) نحن ور (۸) اشاراتِ تنقید (۹) سہن اقبال (۱۰) متعلقاتِ خطباتِ اقبال (۱۱) مسائلِ اقبال (۱۲) تعلیمی خطبات اور
رے مضامین (۱۳) پاکستان تعبیر و تغیر (۱۴) کلچر کا مسئلہ (۱۵) شعرائے اردو کے تذکرے اور تذکرہ نگاری (۱۶) پاکستان میں
کا مسئلہ (۱۷) نل دمن (۱۸) اردو ادب کی ایک صدی (۱۹) سرسیّد احمد خاں اور ان کے رفقائے کار کی نثر کا فکری اور فنی جائزہ
) ادبیاتِ فارسی میں ہندوؤں کا حصہ (۲۱) مقاصدِ اقبال (۲۲) فارسی زبان و ادب (۲۳) اردو پر وزانڈر سرسیّد (انگریزی)
۲) ارمغانِ علمی (ترتیب) (۲۵) نذرِ رحمٰن (ترتیب) (۲۶) مطالعۂ اقبال کے نئے رخ (۲۷) ادب و فن۔ ان کے علاوہ کئی
ین مختلف رسائل میں طبع ہوئے اور کئی کتب مسودات کی صورت میں پڑی ہیں۔ غیر مطبوعہ کتب میں سے کچھ کے نام
ذیل ہیں۔

(۱) عزیز و محترم (۲) تعلیم کے نئے زاویے (۳) فکریات۔ دینی اور تہذیبی (۴) فکریات و نظریات (۵) جدیدیت
بند رخ (۶) پاکستانیات (۷) اسلام اور سوشلزم (۸) تبصرے دیباچے شذرے (۹) شخصی۔ در مدحِ خود۔

انھیں ان کی خدمات کے صلے میں حکومتِ ایران نے نشانِ سپاس اور حکومتِ پاکستان نے تمغہ اور انعام عنایت کیا۔
ڈاکٹر سید عبداللہ اپنے بارے میں رقم طراز ہیں:

"سچ پوچھیے تو دعا اور تلاوتِ شعر میری سب سے بڑی عبادت ہے۔ میں شعر سے راحت بھی حاصل کرتا ہوں اور شعر ہی سے اپنا دستورِ حیات مرتّب کرتا ہوں۔ زندگی کے ہر مشکل مرحلے میں شعروں نے میری امداد کی۔ حافظ، میر، غالب، اقبال اور دوسرے شعرائے اردو فارسی میرے سب سے بڑے محسن ہیں۔ خصوصاً حافظ، کہ ان کے اشعار نے مجھے پست نہ ہونے دیا۔ اور میر جو میری زندگی کی المیہ حقیقت کو مانوس بنا کر مطمئن کرتے رہے۔"

ڈاکٹر سید عبداللہ کا قد لمبا تھا۔ وہ دبلے پتلے نہیں تھے مگر انھیں بھاری بھرکم بھی نہیں کہا جا سکتا۔ آنکھیں چھوٹی اور اندر دھنسی ہوئی تھیں۔ رنگ سرخ و سفید کے قریب کہا جا سکتا ہے۔ سر پر بال کم اور چہرہ کتابی۔ آہستہ بولتے مگر اونچا سنتے تھے۔ کہا جاتا ہے کہ اونچا سننے والے اونچی آواز میں گفتگو کرتے ہیں مگر سید صاحب کے بارے میں یہ بات درست نہ تھی۔ آلۂ مکبرالصوت ہمیشہ جیب میں ہوتا تھا۔ جب ضرورت ہوتی اسے استعمال کرتے لیکن جب ضرورت نہ ہو، اسے کانوں سے دور رکھتے تھے۔ کلاس میں آلۂ مکبرالصوت کو استعمال نہیں کرتے تھے۔ وہاں وہ سُننے کی بجائے بولنے کو ترجیح دیتے تھے۔ ان کا لیکچر ٹھیک ایک گھنٹے کا ہوتا تھا۔ نہ کم نہ زیادہ۔ ایک بار سید صاحب کا لیکچر ذرا طویل ہو گیا۔ کسی طالبہ نے کہا وقت ختم ہو گیا ہے۔ سید صاحب تو سنتے نہ تھے۔ انھوں نے اندازہ لگایا کہ کوئی بات ہے۔ چنانچہ پوچھا، کیا بات ہے؟ ایک لڑکے نے گھڑی سامنے کرکے اشارہ کیا کہ وقت ختم ہو چکا ہے۔ سید صاحب سمجھ گئے۔ سخت ناراض ہوئے اور کہا، شاید میرا لیکچر بور ہو گیا ہے۔ آپ لوگ مجھے پسند نہیں کرتے لہٰذا میں آئندہ آپ لوگوں کا کلاس نہیں لوں گا۔ یہ کہا اور چلے گئے پھر کوئی چھ سات ماہ لیکچر نہیں دیا۔ اس دوران ہم کئی بار گئے اور اس شعر کی زبان میں کہتے رہے ؎

بیا جاناں منوّر کن تو رویت محفلِ ما را　　　کہ در بہشت غزل خوانیم و در پایت سر اندازیم

مگر سید صاحب نہ مانے اور ہماری محفل ان کے روئے منوّر سے روشن نہ ہو سکی۔ وہ یہ انداز دلبرانہ اس لیے اختیار کرتے کہ طلبہ ان کے لیکچر کے دلدادہ تھے۔ ان کا لیکچر سُننے کے لیے وہ دو دو تین تین گھنٹے انتظار کرتے۔ سید صاحب کا لیکچر دلچسپ اور مسحور کن ہوتا تھا۔ ایک تو ٹھہر ٹھہر کر بولتے کہ طلبہ سارا لیکچر نوٹ کر سکتے تھے۔ دوسرے لیکچر کے دوران لطائف بھی سناتے تھے۔ ان کی دلچسپ باتوں سے لیکچر پُرلطف ہو جاتا۔ سید صاحب میر کے عاشق تھے اور اپنے آپ کو "میری" کہتے تھے۔ ایک بار میر پڑھاتے ہوئے ناسخ کا یہ مصرع پڑھا: آپ بے بہرہ ہے جو معتقدِ میر نہیں

"آپ بے بہرہ ہے جو معتقدِ میر نہیں" اور پھر کہا، جو میر کا معتقد ہے وہ بہرہ ہے۔ اشارا اپنی طرف تھا۔ سید صاحب اچھے استاد تھے تو اچھے منتظم بھی تھے۔ ان کے زمانے میں کالج میں کبھی گڑبڑ نہیں ہوئی۔ اگرچہ انھوں نے اورینٹل کالج کو، اردو زبان کو دفتری زبان بنانے کی تحریک کا مرکز بنا رکھا تھا۔ ان کے ساتھ ہی ان کا یہ کام بھی ختم ہو گیا۔

وہ عرصے تک اورینٹل کالج کے پرنسپل رہے۔ ان کے کمرے کے باہر چپراسی بیٹھا رہتا۔ ان سے ملنے کے لیے اجازت حاصل

کرنا پڑتی تھی۔ ایک بار ہمارے ایک ساتھی سیّد صاحب سے ملنے آئے۔ انھوں نے اندر چٹ بھجوائی۔ چٹ واپس آگئی۔ اس پر لکھا تھا، کام؟ انھوں نے دوبارہ چٹ بھجوائی کہ سلام کرنے حاضر ہوا تھا۔ سیّد صاحب نے اسی چٹ پر لکھ بھیجا ؏ سلام روستائی بے غرض نیست
بہرحال سیّد صاحب سے ملنے کے لیے تھوڑی سی دقت ہوتی تھی۔ وہ مصروف ہوتے تو چٹ پر لکھ دیتے "انتظار کیجیے"۔ اور جب ہم انتظار نہ کرتے تو ناراض ہوتے کہ تم استاد سے ملنے کے لیے تھوڑا سا انتظار بھی نہیں کر سکتے۔

سیّد صاحب کی شخصیت کی تعمیر نرمی اور آہستگی سے ہوئی تھی۔ وہ کسی کام میں تندی اور تیزی نہ دکھاتے تھے۔ وہ پہاڑوں میں بہتی ہوئی تند و تیز ندی کی طرح نہ تھے بلکہ میدانوں میں بہنے والے آہستہ خرام دریا کی طرح تھے۔ وہ جوش و خروش کے قائل نہ تھے۔ اور آہستہ روی اور نرمی پسند کرتے تھے۔ ہمیشہ آہستہ آہستہ قدم اٹھاتے۔ انھیں ان کی چال سے ہی پہچانا جا سکتا تھا۔ تیزی ان کے مزاج کے خلاف تھی۔ رفتار، گفتار اور کردار ہر چیز میں خستگی پائی جاتی تھی۔ وہ دشمنوں کے خلاف بھی سخت قدم اٹھانا پسند نہ کرتے تھے۔ ان کی ناراضگی میں سرد مہری پائی جاتی تھی۔ وہ جب بھی ہم سے ناراض ہوتے، سزا دینے کی بجائے ترکِ گفتگو کا حربہ استعمال کرتے۔ وہ کالج کے پرنسپل تھے اور بڑی آسانی سے اپنے فیصلے منوا سکتے تھے، حکم کی تعمیل کروا سکتے تھے اور حکم عدولی پر سزا بھی دے سکتے تھے لیکن وہ محبوب کی طرح روٹھ جایا کرتے تھے۔

لڑکوں میں مشہور تھا کہ سیّد صاحب اختلافِ رائے پسند نہیں کرتے اور ہمیشہ اپنی بات منواتے ہیں، مگر میں نے ان سے کئی مواقع پر اختلاف کیا اور اپنی بات منوا کر دم لیا۔ کبھی وہ ناراض ہوتے، کبھی ناراض ہوئے بغیر ہی بات مان گئے۔ دراصل طلبہ میں اختلاف کی جرأت نہ تھی اور وہ اپنی خامی کو سیّد صاحب کے سر منڈھ دیتے تھے۔ اکثر استاد بھی سیّد صاحب سے اختلاف کی جرأت نہ کرتے تھے۔
ایک بار ایک جلسہ کے انتظامات کے سلسلے میں ہمارے انچارج استاد نے سیّد صاحب سے مشورہ کیا اور بعد میں ہمیں بتایا کہ جلسہ کے بعد بسکٹ اور چائے سے حاضرین کی تواضع کی جائے گی۔ انھوں نے ہمیں جلسے کا بجٹ بھی بتایا جو وہ سیّد صاحب سے منظور کروا لائے تھے۔ میں نے اختلاف کیا اور کہا کہ اتنے پیسوں میں ہم مختلف قسم کی مٹھائی لا سکتے ہیں مگر ہمارے انچارج نہ مانے اور کہا کہ سیّد صاحب اس کی منظوری دے چکے ہیں اور اس میں کسی قسم کی کوئی تبدیلی نہیں ہو سکتی۔ میں نے کہا، میں سیّد صاحب کے پاس جاتا ہوں۔ چنانچہ میں سیّد صاحب کے پاس گیا اور انھوں نے فوراً ہی میرے پروگرام کی منظوری دے دی۔ مگر ایسا بھی ہوا کہ سیّد صاحب کا مشورہ قبول نہ کرنے پر وہ ناراض ہو گئے۔ ہم تفریحی سفر پر کہیں جانا چاہتے تھے۔ سیّد صاحب کا خیال تھا کہ ہم مری چلے جائیں۔ دسمبر کے دن تھے اور میں اس کے حق میں نہ تھا۔ اتفاق سے کوئی استاد بھی مری جانے پر تیار نہ ہوئے بلکہ ہر استاد نے معذرت کی کہ وہ کہیں بھی ہمارے ساتھ جانے کو تیار نہیں۔ صرف سیّد وقار عظیم راضی ہوئے اور وہ اس شرط پر کہ اگر ہم کراچی جائیں تو وہ ساتھ جائیں گے۔ مجبوراً سیّد صاحب کو ہمیں کراچی جانے کی اجازت دینا پڑی۔ واپس آئے تو میں سیّد صاحب سے ملنے گیا۔ سلام کیا تو کہا، آپ کون ہیں؟ میں آپ کو نہیں جانتا۔ اس طرح دو تین ماہ ناراض رہے۔ اور پھر ایک جلسہ کروانے کے لیے میری ضرورت پڑی تو مجھے بلوایا اور کہا کہ تم مجھ سے ناراض ہو۔ میں نے عرض کیا، بھلا شاگرد بھی استاد سے ناراض ہو سکتا ہے۔ خوش ہو گئے۔ اور پھر اس ناراضی کا سارا اثر جاتا رہا۔

سیّد صاحب اپنے شاگردوں کی تعریف کرنے میں بھی بخل سے کام نہ لیتے تھے۔ ایک دفعہ انجمن ترقی اردو اور مقتدرہ قومی زبان کے سربراہ آئے ہوئے تھے۔ ان کے اعزاز میں ایک محفل منعقد کی۔ اگرچہ اس کا موقع نہیں تھا لیکن انھوں نے میری کتاب "تاریخ ادب اردو"

کی تعریف کی۔ اور یہ بھی کہا کہ وہ اس تقریب کو اس کتاب کی رونمائی کی تقریب قرار دینا پسند کریں گے۔ ان کی اس محبت اور شفقت
کی وجہ سے ان کے اکثر شاگرد ان کے دلدادہ ہیں۔

بیماری سے قبل میری ان سے ملاقات ہوئی تو سید صاحب نے فرمایا کہ وہ مجلسِ تحقیق قائم کرنا چاہتے ہیں۔ مجھ سے کہ
کہ میں اس سلسلے میں ابتدائی کام کروں مگر افسوس ان پر فالج کا حملہ ہوا اور یہ منصوبہ پایۂ تکمیل کو نہ پہنچ سکا۔

سید صاحب محقق، نقاد اور ایک اچھے نثر نگار کی حیثیت سے قابلِ ذکر ہیں۔ وہ بتایا کرتے تھے کہ ان کے زمانے میں
تحقیق کے میدان میں داخل ہونے سے پہلے فہرست سازی کرنا پڑتی تھی اس سے محقق کو بہت سی کتابوں کا علم ہو جاتا تھا۔ خو
سید صاحب نے تحقیق کے میدان میں اچھا کام کیا ہے۔ اگرچہ ان کی تمام تحریروں میں تھوڑی بہت تحقیق موجود ہوتی ہے مگر سیا
شعرائے اردو کے تذکرے اور تذکرہ نگاری، نقدِ میر اور ادبیاتِ فارسی میں ہندوؤں کا حصہ میں ان کا تحقیقی مزاج پوری آب و
سے ظاہر ہوا ہے۔ ان سے تحقیق کے دوران غلطیاں بھی سرزد ہوئی ہیں۔ اور ایسا ہونا ممکن ہے کیونکہ تحقیق کا قدم ہمیشہ آگے
بڑھتا رہتا ہے لیکن مجموعی اعتبار سے انھوں نے اردو ادب کے طالب علموں کو بہت کچھ دیا ہے۔ محقق سے بڑی ان کی حیثیت نقاد کی
ہے۔ میر پر ان کا تحقیقی کارنامہ بے مثال ہے۔ اسی طرح سرسید اور ان کے رفقائے کار کی نثر کا تنقیدی جائزہ جس بصیرت
کاوش سے انھوں نے لیا ہے وہ کسی اور کے بس کی بات نہیں۔ ان کے یہ کام اب بھی دوسروں کے لیے مشعلِ راہ ہیں۔ سید صاح
کسی بھی مصنف کے فن پارے کا جائزہ لیتے ہوئے مختلف علوم سے مدد لیتے ہیں۔ انھوں نے انگریزی، فارسی، عربی اور اردو کے ا
شہ پاروں کا گہرا مطالعہ کیا تھا۔ وہ اردو کے ادیبوں کا دوسری زبان کے ادیبوں سے مقابلہ کرتے رہتے تھے۔ وہ پہلے دوسر
نقادوں کے نظریات کو پیش کرتے ہیں پھر اپنا نظریہ بیان کرتے ہیں۔ ان کی تحریروں میں مبالغہ نہیں پایا جاتا اور نہ دو
بات کو طول دیتے ہیں۔ ان کی تحریروں میں زائد عنصر بہت کم ہوتا ہے اور وہ ہمیشہ علمی انداز اختیار کیے رہتے ہیں۔ انھوں
اردو نثر کا تجزیہ سائنسی اور علمی انداز میں کیا ہے۔ وہ نثر کا تجزیہ کرتے ہوئے جملوں کی ساخت، فقروں کی ترتیب اور مقا
زیرِ بحث کے مخصوص الفاظ پر توجہ دیتے ہیں۔ اور ایک نثر نگار کے اسلوب کو دوسرے سے ممیز کر کے پیش کرتے ہیں۔ وہ نثر
لہجے کی پہچان پر بڑا زور دیتے ہیں اور ان اجزا کو الگ الگ کر کے بیان کرتے ہیں جن سے لہجے کی تعمیر ہوتی ہے۔ اردو نثر کا
سائنسی اور علمی جائزہ انھیں دوسرے نقادوں سے ممتاز کرتا ہے اور ان کے سر پر اعلیٰ نقاد کا تاج رکھنے میں مدد ثابت ہو

سید صاحب اردو زبان کے مایہ ناز ادیب تھے۔ انھوں نے اردو کو اس کا جائز مقام دلانے کے لیے بڑی کوشش
اس سلسلے میں انھوں نے کئی جلسوں کا اہتمام کیا۔ اردو زبان سے انھیں عشق تھا۔ اور یہ ناممکن ہے کہ اردو کا ذکر آئے اور سید صاح
کا نام نہ لیا جائے۔ بابائے اردو کے بعد انھوں نے ہی اردو کو سیاست کے میدان میں آگے بڑھانے کا کام کیا۔ ایک بار سید ص
نے بی۔ این۔ آر میں اردو کی حمایت میں ایک جلسے کا اہتمام کیا۔ اس میں شورش کاشمیری بھی موجود تھے۔ بعد میں سید صاحب، شو
اور ہم چند طلبہ کے ساتھ چائنیز میں آبیٹھے۔ سید صاحب نے شورش سے کہا، یہ لڑکے اردو کے لیے کام کرتے رہتے ہیں او
ممکن ہے کہ انھیں کچھ ہو نہ جائے۔ آپ بھی اردو کے لیے کچھ کریں۔ شورش نے کہا، مجھے تو میری بیٹیوں نے زنجیریں پہنا دی ہیں

دفتروں میں آئے گی۔ آپ مجھے پچاس لڑکے دے دیں اور باقی مجھ پر چھوڑ دیں۔ وہ ہنگامہ کروں گا کہ حکومت کو ہماری بات ماننی ہی پڑے گی۔ سید صاحب یہ خطرہ کہاں مول لے سکتے تھے ہوں ہاں کر کے رخصت ہو گئے۔ شورش کی تیزی سے وہ گھبراتے تھے۔ ایک بار کالج میں مشاعرہ تھا۔ مختلف شعرا کو بلایا گیا تھا۔ میں نے تجویز پیش کی کہ شورش کاشمیری کو بھی بلایا جائے، سید صاحب گھبرا گئے کہنے لگے، عزیزم شورش کا کچھ پتا نہیں وہ کیا کہہ جائے اور ہم مصیبت میں گرفتار ہو جائیں۔ اس احتیاط کے باوجود انھوں نے اپنا مشن مستقل مزاجی سے جاری رکھا۔ سید صاحب جو جلسوں اور انجمنوں کے آدمی تھے آخری زمانے میں خاموشی سے خانہ نشیں ہو گئے۔

پیدا کہاں ہیں ایسے پراگندہ طبع لوگ — افسوس تم کو میر سے صحبت نہیں رہی

ڈاکٹر مسکین علی حجازی

متبحر عالم ــ ملک و قوم کے مخلص کارکن

ڈاکٹر سید محمد عبداللہ کی شخصیت کئی لحاظ سے منفرد تھی۔ ان کی مثال اس سمندر کی تھی جس میں کڑوے، نمکین، شیریں، ہر طرح کے پانی آکر جمع ہو جاتے ہیں۔ مختلف مکاتب فکر اور جدا جدا دبستانوں کے لوگ ان کا یکساں احترام کرتے تھے۔ صلح کل اور تمام انسانوں کے ساتھ دو طرفہ بنیاد پر تعلقات ان کا مسلک تھا۔ یہ کام آسان نہیں مگر سید صاحب فطرتاً مشکل پسند انسان تھے۔ اپنے لیے مشکلات کا انتخاب اور دوسروں میں آسانیاں تقسیم کرنا زندگی بھر ان کا معمول رہا۔ پورا نام ڈاکٹر سید محمد عبداللہ وہی لوگ پکارتے اور لکھتے تھے جو پابند رسوم و قیود تھے۔ اپنے احباب، شاگردوں اور عقیدت مندوں کے وسیع حلقے میں صرف سید صاحب کہلاتے تھے۔ سید نذیر نیازی مرحوم اور سید کرامت حسین مرحوم حیات تھے تو خاص حلقے میں انھیں "سیدان ثلاثہ" کہا جاتا تھا۔ لیکن وہ فرداً فرداً نیازی صاحب اور جعفری صاحب ہی پکارے جاتے تھے۔ "سید صاحب" ڈاکٹر محمد عبداللہ ہی کو کہا جاتا تھا۔

معاصرت ایک تلخ حقیقت ہے۔ سید صاحب کے لیے بے شمار دلوں میں بے پناہ احترام تھا۔ سادہ سے درویش منش انسان جہاں بھی جاتے جبیں ہائے عقیدت جھکتی چلی جاتیں۔ اس حقیقی عزت سے محروم بعض لوگ حسد کرتے تھے۔ سید صاحب ایسے کئی لوگوں کے دلوں کا حال جانتے ہوئے قومی اور ملی کاموں میں ان سے مدد لیتے تھے۔ وہ اکثر کہا کرتے تھے کہ "اگر میرا کسی شخص کے ساتھ سو میں ننانوے باتوں میں اختلاف مگر ایک بات میں اتفاق ہو تو میں اس کے ساتھ مل کر کام کر سکتا ہوں۔ بلکہ کرتا ہوں۔ لیکن کیسے؟ اختلافات اپنے آپ تک محدود رکھو۔ دوسروں سے صرف اس بات کے حوالہ سے سروکار رکھو۔ جس پر وہ متفق ہوں" جہاں سو باتوں میں سے ننانوے پر اتفاق اور ایک پر اختلاف کو مکمل اختلاف بنانے کی رسم موجود ہو۔ جہاں صرف اپنی ذات اور انا کے باعث اختلاف سازی سب سے بڑا کاروبار ہو، وہاں سید صاحب کا مسلک وہی لوگ اختیار کر سکتے ہیں جنھیں مقاصد اپنی ذات اور انا سے زیادہ عزیز ہوں۔ ایسے لوگ روز روز پیدا نہیں ہوتے۔

سید صاحب مرحوم اسلامی اور مشرقی علوم کا سنگم تھے۔ اردو، عربی، فارسی، پنجابی اور ادبیات و لسانیات

کے پہلو پر ان کی گہری نظر تھی۔ عرصے تک بہ یک وقت اردو، عربی اور فارسی کی کلاسیں پڑھاتے رہے اور تینوں مضامین میں پی۔ ایچ۔ ڈی کے کام کی راہنمائی کرتے رہے۔ انگریزی میں بھی کچھ کتابیں اور مضامین لکھے۔ ان کی تصنیفات کا صرف اجمالی جائزہ پیش کرنے کے لیے کئی دفتر درکار ہیں۔ تحقیقی و فکریاتی کتابوں کی تعداد بیالیس اور مقالات و مضامین کی تعداد ہزاروں میں ہے۔ ولی سے اقبال تک کہنے کو ایک کتاب ہے۔ لیکن حقیقت میں یہ ایک تحقیقی کاوش سیکڑوں پر بھاری ہے۔ اسی طرح اردو ادب کی ایک صدی "کلچر کا مسئلہ"۔ "پاکستان تعبیر و تعمیر" اور "مقاصدِ اقبال" بس یہ ایک ایک کتاب ہے۔ وہ سب کچھ صحیح اور ارفع صورت میں موجود ہے جو ان موضوعات پر لکھی گئی بعض دوسری کتابوں میں بھی ناپید ہے۔

سرسید احمد خاں نے تو یہ کہا تھا کہ قیامت کے دن نامۂ اعمال طلب کیا جائے گا تو میں کہوں گا کہ حالی سے مسدس لکھوائی تھی۔۔۔۔۔ سید مرحوم کے نامہ اعمال میں ان گنت ایسے کام درج ہیں جو انھوں نے خود انجام دیئے۔ ان میں سب سے بڑا کام اردو دائرہ معارف اسلام ہے۔ اس منصوبہ کا تخیل انھوں نے فاضل اجل ڈاکٹر مولوی محمد شفیع کے ایما پر ۱۹۴۰ء میں اس وقت پیش کیا جب مسلمانانِ برِصغیر نے اپنے مستقبل کا لائحۂ عمل متعین کیا تھا۔
۱۹۴۸ء میں حصولِ آزادی کے بعد انھوں نے یہ تخیل ایک منصوبہ کی صورت میں پیش کیا۔ کیونکہ یہ کام مملکت خداداد کی ضرورت بن گیا تھا۔ یہ عظیم کام تو ڈاکٹر مولوی محمد شفیع نے شروع کیا لیکن اسے معتدبہ طور پر آگے بڑھانے کا اعزاز سید صاحب کو حاصل ہوا۔ انھوں نے ۱۹۶۶ء میں اس عظیم وراثت کو سنبھالا اور اس وقت تک کام میں جتے رہے جب تک مرض الموت نے ان کے ہاتھ سے قلم نہ چھین لیا۔
ڈچ رائل کمپنی لائیڈن کا انسائیکلوپیڈیا آف اسلام انگریزی میں اسلام پر ایک وقیع کام تصور ہوتا تھا۔ لیکن اردو دائرہ معارف اسلامیہ اس کا صرف ترجمہ نہیں بلکہ اس میں بہت ضروری اور انتہائی قابلِ قدر اضافہ ہے۔ اردو انسائیکلوپیڈیا میں جو اسلامی روح موجود ہے وہ انگریزی انسائیکلوپیڈیا میں مفقود ہے۔ آسٹریا، جاپان، امریکہ اور متعدد ممالک کے انتہائی معتبر فاضل حضرات نے اردو دائرہ معارف اسلامیہ کو لائیڈن کے کام سے بدرجہا بہتر قرار دیا ہے۔ اس کی بائیس جلدیں شائع ہو چکی ہیں۔

سید صاحب مرحوم جیسے صابر و شاکر انسان بہت کم دیکھے ہیں۔ جو لوگ علم میں ان کے پاسنگ بھی نہیں تھے، اپنے درجات کی ترقی میں بعض اوقات ان کو سنگِ گراں تصور کرتے اور اپنا راستہ صاف کرنے کے لیے مختلف حربے اختیار کرتے۔ ایک وائس چانسلر کی سید صاحب سے اس لیے ٹھن گئی کہ وہ جدت پسند تھے۔ اور اورنٹیل کالج ہی کو ختم کر دینا چاہتے تھے۔ سید صاحب نتائج کی پروا کیے بغیر ڈٹ گئے۔ ڈاکٹر مولوی محمد شفیع بھی ان کی حمایت پر تل گئے اور یہ انھوں نے اورنٹیل کالج بچا لیا۔ ایک اور وائس چانسلر کی انا سید صاحب کی درویشی سے ٹکرا گئی۔ سید صاحب نے ریٹائرمنٹ سے ایک سال قبل استعفیٰ دے دیا۔ مگر ان وائس چانسلر صاحب کو معلوم نہیں تھا کہ حقیقی اہلِ علم کبھی ریٹائر نہیں ہوتے۔ سید صاحب یونیورسٹی میں زیادہ باوقار انداز میں زیادہ بلند پایہ علمی خدمات دیر تک انجام دیتے رہے۔ ان کی زبان سے

بھی گلے شکوے کا ایک لفظ بھی ادا ہوتے نہیں سنا۔ اپنی ذات کے لیے تو وہ شاید سوچتے ہی نہیں تھے۔ مگر مقاصد ان کو جان سے عزیز تھے۔ ایک بار پیغام بھیج کر بلوایا۔ حسبِ معمول شفقت سے کندھا تھپتھپایا۔ پھر بغیر کسی تمہید کے فرمایا: «کیا وائس چانسلر صاحب یہ توقع رکھتے ہیں کہ میں ان کی خدمت میں حاضر ہو کر درخواست کروں معاہدہ کی معیاد ختم ہوئے دو ماہ ہو گئے ہیں، زبانی طور پر مجھے فارغ ہو کر گھر جانے سے روک لیا گیا، لیکن تحریراً اب تک کچھ نہیں ہوا۔ یہ درویش تو اپنے خیال میں ایک خدمت انجام دے رہا ہے۔ اسے نوکری کی ضرورت نہیں۔" میں نے ابھی اپنی معلومات کی بنا پر عرض کیا۔ «وائس چانسلر صاحب بھلے آدمی ہیں۔ آپ کا ذکر بڑے احترام سے کرتے ہیں۔ ہو سکتا ہے کام کی زیادتی یا ان گنت الجھنوں نے مصروف رکھا ہو۔ میں کل حاضرِ خدمت ہو کر حقیقت حال گوش گزار کروں گا۔" وائس چانسلر صاحب کو تلاش کیا اور بلا تمہید کہا، دنیا کی کوئی بھی جامعہ سید صاحب جیسی شخصیت کی وابستگی کو اپنے لیے باعثِ اعزاز تصور کرے گی۔ ان کا معاملہ معلق کیوں ہے؟ وائس چانسلر صاحب اسی وقت اٹھ کر سید صاحب کے پاس گئے۔ یہ وضاحت کی کہ فائل حکامِ بالا کے پاس ہے۔ بہر حال انھوں نے ذاتی کوششوں سے دو دن میں فائل نکلوائی پھر سید صاحب کے پاس گئے۔ منصوبے کے بارے میں بات چیت کی اور یہ کوشش کی کہ وہ حسبِ معمول پوری آمادگی کے ساتھ کام کریں۔

ایک روز بلا کر فرمایا، «تمہیں انجمن ترویجِ اردو کا سکریٹری منتخب کر لیا گیا ہے۔" پھر قومی زبان کی ترویج کی ضرورت واضح کی۔ حقیقت یہ ہے کہ سید صاحب نے ترویجِ اردو کے لیے ہمہ جہت کوششیں شروع کر رکھی تھیں۔ مختلف ناموں سے کئی انجمنیں ایک ہی مقصد کے لیے کام کرتی تھیں۔ اور وہ سب کی سرپرستی کرتے تھے۔ نفاذِ اردو مہم نے کئی حلقوں میں ان کے مخالف پیدا کر دیے تھے۔ مقتدر طبقہ کو انگریزی کی بالادستی کا خاتمہ منظور نہیں تھا۔ قومیتوں اور علاقائی زبانوں کے علمبردار ان کو اپنے راستے کی رکاوٹ سمجھتے تھے۔ نظریاتی اور فکری انتشار پیدا کرنے پر مامور افراد بھی ان کو اپنے لیے خطرہ سمجھتے تھے۔ علمی، ادبی اور فکری سطحوں پر یہ سب عناصر ان کے سامنے بے بس تھے۔ چنانچہ وہ حاکموں اور با اختیار لوگوں سے ان کو بدظن کرنے کی کوشش کرتے۔ علمی اور انتظامی صلاحیتوں کے لحاظ سے ان سے بہت کمتر کئی افراد ان کے «افسرِ اعلیٰ" بنے، مگر آفرین ہے سید صاحب پر کہ انھوں نے دفتری امور میں ہمیشہ دفتری قواعد کی پابندی کی۔ کبھی حرفِ شکایت زبان پر نہ لائے۔ اور رسوم آداب کا دامن کبھی ہاتھ سے نہ چھوڑا۔

اردو زبان کو سرکاری زبان کی حیثیت دلانے میں سید صاحب نے طویل عرصہ تک ان تھک جدوجہد کی۔ دو کانفرنسیں، مذاکرے، خطبے، مقالات، قرار دادیں۔ ۱۹۶۲ء میں نیا دستور ہونے کو تھا۔ یہ تاثر پھیل گیا کہ قومی زبان کے نفاذ کا معاملہ طویل مدت کے لیے موخر کیا جا رہا ہے۔ سید صاحب نے اردو انجمنوں اور ادبی تنظیموں کے عہدیداران کا اجلاس بلایا اور شاہراہ قائداعظم لاہور پر مظاہروں کا سلسلہ شروع کرنے کا فیصلہ کیا۔ وقفوں کے بعد نفاذِ اردو کے لیے مظاہرہ ہوتا۔ بڑی بڑی شخصیتیں بینر اٹھائے جلوس میں شریک ہوئیں۔ چودھری نذیر احمد مرحوم، ڈاکٹر خدیجہ فیروزالدین، مولانا حامد علی خاں، میاں بشیر احمد مرحوم اور متعدد دوسرے ممتاز افراد مظاہروں میں شرکت کرتے رہے۔

ایک بار سید صاحب نے شورش کاشمیری مرحوم کو جلوس میں شامل کرنا چاہا۔ انھوں نے کہا۔ "سید صاحب! اپنے ملک میں اپنی زبان کے نفاذ کے لیے قدو یا نہ گزارشیں مجھے گوارا نہیں اس مقصد کے لیے لڑنا ہے تو میں حاضر ہوں "۔ انجام کار وہ یہ کہہ کر جلوس میں شامل ہو گئے۔ "مجھے آپ کے علمی مرتبہ کا احترام ہے ......" لڑائی سید صاحب کے مسلک کے خلاف تھی۔ وہ اپنے انداز میں اپنا کام کرتے رہنے پر یقین رکھتے تھے۔ شاہراہِ قائدِ اعظم کے تاجروں اور دکانداروں کے پاس بار بار جا کر یہ کہنا۔ "آپ اپنے بورڈ اردو میں بھی لکھوائیے ......" جلوس اس طرح سے منظم کرتا کہ ٹریفک میں رکاوٹ پیدا نہ ہو۔ اس وقت فضا ایسی تھی کہ لوگ ایسے کاموں کو ناممکن سمجھ کر ہنستے تھے۔ لیکن بے لوث قومی کام کرنے والوں کو ہر دور میں "دیوانے" ہی سمجھا گیا ہے۔ فرزانے نہیں۔

الفاظ کو لمبے کھینچ کر اور ٹھہر ٹھہر کر بولنا بظاہر ان کی طبیعت کے دھیما پن، مگر اصل میں ناقابلِ شکست عزم کا آئینہ دار تھا۔ گفتگو اور چال میں دھیما پن، تحریر میں ناقابلِ یقین روانی، مقصد سے ناقابلِ شکست وابستگی اور تکمیل مقصد کے سعی پیہم ان کی شخصیت کے نمایاں اوصاف تھے۔ متبحر عالم مگر عجز و انکسار کا مجسمہ، اس درخت کی مانند جو زیادہ پھل لگنے سے زیادہ جھک گیا ہو۔ اگرچہ زندگی میں بہت سے کام کیے مگر ملک میں نفاذ اردو کے کام اور اردو دائرہ معارف اسلامیہ کے کام سے تو گویا عشق تھا۔ ان کی صاحبزادی عطیہ سید بتاتی ہیں کہ بیماری کے باوجود بعض اوقات تیار ہو جاتے اور دفتر جانے پر اصرار کرتے۔ مرض کا حملہ شدت اختیار کرتا اور گھر والے پریشان ہو جاتے تو کہتے "فکر نہ کرو، میں انسائیکلوپیڈیا کا کام مکمل کیے بغیر نہیں مروں گا۔"

سید صاحب بڑے بزلہ سنج انسان تھے۔ اردو، فارسی اور عربی کے ہزاروں اشعار اور اقوال ازبر تھے۔ اور بسا اوقات ان کے برمحل استعمال سے مزاح پیدا کرتے تھے۔ ہنسی مذاق کے وقت عموماً واحد الفاظ کے بجائے جمع استعمال کرتے۔ "آپ سے گفتگوئیں کرنی ہیں، گھریا دفتر آ جیے، کیا گفتگوئیں ہو رہی ہیں؟، گفتگوئیں ہوئے دیر ہو گئی ہے، کسی وقت آ نا" یہ جملے ان کی زبان سے بکثرت ادا ہوتے۔ ایک بار ایک محفل میں انگریزی کا معیار گرانے کا ذکر ہو رہا تھا۔ سید صاحب خاموش تھے۔ آخر ایک دوست نے کہہ دیا۔ "سید صاحب آپ نے کچھ نہیں فرمایا" برجستہ فرمایا۔ "تم انگریزی کا رونا اس لیے رو رہے ہو کہ تمھیں عربیوں اور فارسیوں والوں کا حال معلوم نہیں"۔ اخلاقی، سماجی اور انسانی فرائض میں کوتاہی کا عذر عموماً "مصروفیت" ہوتا ہے۔ جسے "مکروہاتِ زندگی" سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ سید صاحب کے نیاز مندوں اور شاگردوں کو اگر ان سے ملے دیر ہو جاتی تو وہ تاخیر پر شرمندگی محسوس کرتے۔ "مکروہاتِ زندگی سب کے ساتھ ہوتی ہیں۔ میرے ساتھ بھی ہیں" یا پھر کوئی لطیفہ یا شعر سنا کر ماحول کو خوشگوار بنا دیتے۔

سید صاحب ایک "فری لانس" صحافی تھے اور انھوں نے بہت سے صحافیوں سے زیادہ لکھا۔ عموماً علمی، ادبی، تنقیدی، تہذیبی اور تمدنی مسائل پر لکھتے تھے۔

قیام پاکستان سے قبل "کوہستانی" کے قلمی نام سے "احسان"، "انقلاب" اور "زمیندار" میں بہت سے مضامین لکھے قیام پاکستان کے بعد اگرچہ ملک کے ہر اخبار اور جریدہ میں ان کی کوئی نہ کوئی تحریر شائع ہوئی لیکن روزنامہ نوائے وقت

ہفت روزہ "چٹان" میں سب سے زیادہ لکھا۔ ہر اخبار یا جریدہ ان سے درخواست کر کے مضمون حاصل کر سکتا
۔ انکار ان کی سرشت ہی میں نہیں تھا۔ بعض مواقع پر وہ ملی، قومی یا لسانی موضوعات پر لکھنے کی ضرورت محسوس
ے اور چھ سات قلمی ناموں سے بیک وقت کئی اخبارات وجرائد میں لکھتے۔ صبح کو ایک مضمون اردو اخبار کے لیے بھیجا
م کو انگریزی اخبار کے لیے ایک اور مضمون تیار ہوتا۔ ایوب خاں کے زوال کے بعد "بہ مصطفیٰ برساں خویش را
ب ہمہ اوست" کہنے والے علامہ اقبال کی تعلیمات پر سوشلزم کی چھاپ لگانے کی مہم زور وشور سے شروع ہوئی۔ نظریۂ
ان کی نئی توجیہات ہونے لگیں۔ پھر بعض ممکہ بند دانشور اور ادیب آدھے پاکستان کو "نیا پاکستان" قرار
کر جغرافیائی سرحدوں کی اہمیت گھٹانے میں مصروف ہو گئے۔ اس دور میں سید صاحب بے حد مضطرب
۔ ایک طرف "چٹان" میں "اقبالیات" پر چھیاسٹھ مقالات لکھنے کا اعلان کر دیا، دوسری طرف نظریاتی اور
ی امور پر "نوائے وقت" اور بعض دوسرے اخبارات میں لکھنے لگے۔۔ ۱۹۷۱ء ہی میں ان کے کچھ نیازمندوں نے
نیا اخبار "جاوداں" جاری کیا تو ان کے اصرار پر "اردو صحافت تاثرات کے آئینہ میں" کے عنوان سے مقالات
ے سلسلہ شروع کر دیا۔ محسوس ہوتا تھا کہ اردو صحافت کے ظاہر و باطن کا کوئی گوشہ ان کی نگاہوں سے مخفی
ہے۔ یہ کام وہ معمول کے دفتری کاموں کے ساتھ ساتھ کرتے تھے۔

آخری چند سالوں میں کانفرنسوں، مذاکروں اور جلسوں میں شرکت بہت کم کر دی تھی۔ اس کی ایک وجہ
ن کی حد سے زیادہ مصروفیت تھی، لیکن دوسری وجہ سامعین کے ذوق اور منتظمین کی ضرورت میں تبدیلی
خود انھوں نے ہزاروں کانفرنسیں اور مذاکرے منعقد کیے۔ "صدارت" کے لیے ہمیشہ اہلِ علم اور غیر سرکاری
کا انتخاب کیا۔ تقریبات، کالج یونیورسٹی یا اردو اکیڈمی کے احاطے میں کیں۔ ایک موقع پر سیرت کانفرنس میں
لہ پڑھنے کی درخواست کی گئی۔ استفسار کیا۔ "کہاں انتظام کیا ہے" عرض کیا، فیصل ہال ہے۔ مان گئے۔ فرمایا، ہوٹلوں
ریبات میں لوگ سننے کے لیے نہیں ضیافت میں جاتے ہیں، جہاں ضیافت کا اہتمام نہ ہو، اور صدر یا مہمانِ خصوصی کا
ار دربار سے تعلق یا واسطہ نہ ہو وہاں وہی لوگ آتے ہیں جو کچھ سننا اور جاننا چاہتے ہیں۔ پھر فرمایا، غالب نے
نہیں کہا تھا ۔

طاعت میں تا رہے نہ مے و انگبیں کی لاگ
دوزخ میں ڈال دے کوئی لے کر بہشت کو

کتابیں، مقالات، انسائیکلوپیڈیا، کانفرنسیں، جلسے، تقریریں۔ بہر حال نظر آنے والے ہیں۔ سید صاحب
بینفی احترام کا باعث ان کے غیر مرئی کام تھے ۔۔۔۔۔ ہزاروں نادار طلبہ کی حوصلہ افزائی کی، وظائف دے
نھیں اعلیٰ تعلیم دلوا کر ان کی زندگیاں بنا دیں۔ بہت سوں کی اس طرح حوصلہ افزائی کی کہ وہ اہلِ قلم بن گئے۔
اوقات ان کی خدمت میں حاضر ہوتے دیر ہو جاتی اور وہ کسی تقریب میں اچانک مل جاتے تو اپنی

اہی زندگی ہے۔ پھر پیار سے کندھا تھپتھپاتے۔

اکبرالہ آبادی نے اپنے دور کے سید صاحب کے بارے میں جو کچھ کہا تھا، اس کا اطلاق ہمارے صاحب پر بھی ہوتا ہے ؎

ہماری باتیں ہی باتیں ہیں سید کام کرتا تھا
خدا بخشے بہت سی خوبیاں تھیں مرنے والے میں

زاہد منیر عامر

ڈاکٹر سید عبداللہ کے نام خطوطِ مشاہیر کا ذخیرہ

ڈاکٹر سید عبداللہ مرحوم کا نام اردو ادب و تحقیق کا ایک ناگزیر حوالہ ہے جسے نظر انداز کر کے اردو ادب کا کوئی قاری
ے نہیں بڑھ سکتا۔ ادبِ اردو سے سید صاحب کی دل چسپی کا آغاز لگ بھگ ۱۹۲۵ء میں ہوا جب وہ پنجاب
ورینٹل کالج لاہور میں ملازم تھے۔ یونیورسٹی اورینٹل کالج کی ملازمت سے اردو دائرہ معارفِ اسلامیہ کی
تک قریباً پچاس برس سید صاحب نے اردو ادب کی مختلف جہات میں گراں قدر اضافے کیے، اپنی طویل علمی و
ں میں اردو ادب کے ایک طالب علم، محقق اور ناقد ہونے کی حیثیت سے اور پھر یونیورسٹی کے شعبۂ اردو کے استاد
نیورسٹی اورینٹل کالج اور آخر میں اردو دائرہ معارفِ اسلامیہ کی صدارت کے مناصب پر فائز رہنے کے
بغیر پاک و ہند اور دیگر ممالکِ مشرق و مغرب کے فضلا سے سید صاحب کے گہرے روابط رہے جن میں بارہا
لمت کی ضرورت بھی پیش آئی۔

دبِ اردو کے حوالے سے سید صاحب کی ہمہ پہلو شخصیت، ان کے علمی مقام و مرتبے اور احترام کو پیشِ نظر رکھا جائے
کا اندازہ کرنا چنداں مشکل نہیں کہ ان کے نام کیسے اصحابِ علم و فضل کے خطوط ہوں گے اور ان میں کیا کیا
زیرِ بحث آئے ہوں گے۔

وش قسمتی سے سید صاحب اپنی تحریروں، کاغذات اور جملہ دستاویزات کو بہت اہتمام سے محفوظ رکھنے کے
ان کی اسی عادت کے باعث مختلف اصحاب کے ساتھ ان کی مراسلتوں کے فائل بھی موجود ہیں جن کا ذخیرہ
غربی پاکستان اردو اکیڈمی لاہور (سید صاحب جس کے بانی اور سکریٹری تھے) میں ڈاکٹر وحید قریشی جیسے
ادر قدر شناس بزرگ کی نگرانی میں محفوظ ہے۔

کٹر سید عبداللہ کی شخصیت کا مطالعہ کرنے کے لیے یہ خطوط نہایت درجہ اہم ماخذ کی حیثیت رکھتے ہیں اور
ہیں۔ ان سے برِ صغیر پاک و ہند کی مختلف علمی شخصیات کے افکار، اسالیب، مراسلت اور ان کی تحقیقوں

ڈاکٹر سید عبداللہ مرحوم کے نام مختلف مشاہیر کے ان خطوط کو مرتب کرنے کے سلسلے میں راقم الحروف کو اس ذخیرے کے بالتفصیل مشاہدے کی سعادت حاصل ہے۔ سید صاحب کے دیگر فائلوں اور کاغذات کا تذکرہ چھوڑتے ہوئے یہاں صرف خطوط مشاہیر سے متعلق ذخیرے کا مختصر تعارف کرانا چاہتا ہوں:

ذخیرے کا تعارف

خطوط کا یہ ذخیرہ ۲۰ فائلوں پر مشتمل ہے جن میں آٹھ فائل خطوط کے ہیں پانچ فائل ذاتی کاغذات اور مراسلات مشتمل ہیں جب کہ سات فائلوں میں متفرق خطوط اور ان کے جوابات شامل ہیں۔

ضخامت کے اعتبار سے بعض فائل بہت مختصر یعنی پچاس ساٹھ کاغذات پر مشتمل ہیں۔ جب کہ تین فائل ایسے ہیں جن میں سے ہر ایک تقریباً سات سات سو کاغذات پر مشتمل ہے۔ باقی فائل اوسط درجے کی ضخامت کے حامل ہیں۔

ان فائلوں میں بالعموم ہر طرح کے کاغذات و مراسلات ملے جلے ہیں۔ البتہ تین فائل ایسے بھی ہیں جن پر باقاعدہ موضوع کا اندراج ہے اور ان میں انہی موضوعات سے متعلق کاغذات ہیں۔ ایسے فائل درج ذیل ہیں۔

۱۔ معتمدِ عمومی کی ذاتی خط و کتابت

اس کا آغاز جولائی ۱۹۷۳ء سے ہوتا ہے اور اوسط ضخامت کا فائل ہے۔ یہ وہ خط و کتابت ہے جو ڈاکٹر سید عبداللہ نے مغربی پاکستان اردو اکیڈمی کے سکرٹیری کی حیثیت سے کی۔

۲۔ ذاتی کاغذات

یہ ضخیم فائل ہے جس پر تاریخ کا اندراج نہیں ہے۔ لیکن اس میں محفوظ کاغذات کا آغاز فروری ۱۹۶۸ء سے ہوتا ہے۔

۳۔ فائل از ۱۵ اگست ۱۹۷۶ء

اس میں متفرق کاغذات ہیں اور اوسط ضخامت کا فائل ہے۔

فائل مرتب کرنے کا اسلوب

ڈاکٹر سید عبداللہ کا ریکارڈ گو بہ کمال و تمام محفوظ ہے لیکن اس ریکارڈ کا تحفظ کسی ایک خاص اسلوب کے تحت نہیں ہے۔ زیرِ بحث فائل بھی کسی خاص طریقے سے مرتب نہیں کیے گئے۔ مختلف فائلوں کی ترتیب (یا بے ترتیبی) مختلف صورتوں روا رکھی گئی ہے۔

بعض فائل ایسے ہیں جن میں صرف آمدہ ڈاک ہے اور اس پر سید صاحب کے مختلف ریمارکس موجود ہیں۔ ایسے فائل زیادہ پرانے ہیں۔

بعض فائلوں میں ہر خط کے ساتھ سید صاحب کے جوابی خط کی کاربن کاپی بھی منسلک ہے اور اصل خط پر سید صاحب کے ریمارکس بھی درج ہیں۔ یہ ان کی آخری عمر کی مراسلت کے فائل ہیں۔ جب وہ اردو دائرہ معارفِ اسلامیہ کے صدر تھے

بعض فائلوں میں ملے جلے کاغذات ہیں۔ یعنی ان میں خطوط بھی ہیں، مضامین بھی، اخباری تراشے بھی (جو انھیں

بان

بعض فائل خاص موضوعات سے متعلق ہیں۔ مثلاً ایک پورا فائل اس خط و کتابت پر مشتمل ہے جو انھوں نے اپنی
ادتی عطیہ سید صاحبہ کے کسی مغربی ملک کی یونیورسٹی میں داخلے کے سلسلے میں کی۔ اس میں بیرونی ممالک کی بعض یونیورسٹیوں
وہ پاکستان کی بعض شخصیات کے خطوط بھی شامل ہیں۔ ایسے اصحاب میں ڈاکٹر اجمل، حکیم محمد سعید، جمیل الدین عالی اور
دیگر حضرات کے خطوط ہیں۔ بیرونی فضلا میں ڈاکٹر این مری شمل کا نام زیادہ نمایاں ہے۔

ب نگاری کا طریق کار

سید صاحب مرحوم سے راقم الحروف کو بھی مراسلت و ملاقات کا شرف حاصل رہا ہے۔ اس دوران میں نے ان کا
ب نگاری کا جو طریقہ دیکھا تھا اس ذخیرہ کے ملاحظے سے اس کی مزید تائید و تصدیق ہوتی ہے کہ سید صاحب بالعموم چار
ں سے خطوں کے جواب دیا کرتے تھے۔

اول، یہ کہ جو خط آتا اس پر مختصراً جواب لکھ دیتے جسے ان کا سکریٹری ٹائپ کر کے ان سے دستخط کروا کر ارسال کر دیتا۔
دوم، آمدہ خط پر محض اشارۃً بعض الفاظ درج کر دیتے۔ مثلاً "شکریہ ادا کر دیں" "اچھا سا خط لکھ دیں" وغیرہ
خاص جواب طلب بات ہوتی اس کے نیچے لائن لگا کر حاشیے پر اس کا مختصر جواب لکھ دیتے جس کے بعد ان کے سکریٹری
خط کے مضمون کی شکل دے دیتے تھے۔

سوم، بعض خاص احباب اور عزیزوں کو وہ اپنے ہاتھ سے بھی خط لکھتے جن کا کوئی ریکارڈ غالباً نہیں رکھا جاتا تھا۔
اس ذخیرے میں ان کے ہاتھ کے لکھے ہوئے خطوط کے عکس یا نقول موجود نہیں ہیں۔
چہارم، بعض خاص احباب یا بزرگوں کو ہاتھ سے پورا خط لکھ کر اسے ٹائپ کر والیا کرتے تھے۔ ایسے خطوط کی نقول
ذخیرے میں موجود ہیں۔

نوٹ لکھنے کا طریق کار

مختلف خطوط پر سید صاحب جو جوابی نوٹ لکھتے تھے ان کا طریق کار کچھ یوں تھا کہ خط کے بالائی حصے کی خالی جگہ
خط کے آخر میں کچھ جگہ خالی ہو تو وہاں اپنے قلم سے خط کے مطابق مختصراً اس انداز کے جملے لکھ دیا کرتے تھے کہ "جواب
نہیں — سید عبداللہ" یا جیسے ایک عقیدت مند کے خط کے بالائی حصے پر لکھا ہے:

"اسلم قریشی صاحب (سید صاحب کے سکریٹری)! یہ پتوں کے رجسٹر میں درج کر لیں۔ سید عبداللہ"

مولانا عبدالماجد دریابادی کے ایک خط کے نیچے لکھا ہے:

"مودبانہ خط — اب نتیجہ شائع ہوا ہے۔ قاعدے کی رو سے معاوضہ نتیجہ شائع
ہونے کے بعد ملا کرتا ہے۔ میں کوشش کروں گا کہ جلد مل جائے۔"

"مودبانہ خط"، کے الفاظ ہدایت ہیں کہ اس خط کا جواب مودبانہ انداز میں لکھا جائے اور باقی عبارت خط کے
نا کے لیے ہے
اگر خط میں کوئی تحقیق طلب بات ہوتی تو اس کا نوٹ سکریٹری صاحب کے لیے الگ لکھا کرتے تھے۔ مثلاً

مولانا دریابادی کے اس خط پر ایک الگ لائن لگا کر لکھا ہے۔

"جمیل! مرزا صاحب کے ذریعے پھر ان کے چیک کا پتا چلائیے"

بعض خطوط جو ان کے شاگرد، قاری یا عقیدت مند انھیں لکھتے ان پر انگریزی میں فقط "FILE" کے الفاظ درج فرما دیتے

ایسے بہت سے خطوط اس ذخیرے میں موجود ہیں۔ FILE کا مطلب تھا کہ اس خط کے جواب کی ضرورت نہیں۔

بعض خطوط ایسے بھی ہیں جن پر کوئی نوٹ درج نہیں البتہ ان کی پیشانی پر لفظ "جواب" جواب دیے جانے کی تاریخ کے ساتھ لکھا ہوا ہے۔

کچھ خط ایسے بھی ہیں جن پر کوئی نوٹ یا نشان نہیں لگایا گیا۔ ایسے خطوں کی بابت خیال ہے کہ وہ جواب سے محروم خطوط ہیں

راقم الحروف نے سید صاحب سے اپنی ابتدائی ملاقاتوں میں جب ایک بار یہ پوچھا کہ آپ خط کا جواب دیتے ہیں؟

تو انھوں نے فرمایا تھا کہ "ہاں میں خط کا جواب ضرور دیتا ہوں۔ میرے پاس اس کی سہولت موجود ہے"

پھر مجھے اس بات کا تجربہ بھی ہوا کہ ان کی طرف سے خط کا جواب فی الفور ملا کرتا تھا۔ اس کی وجہ شاید یہی تھی کہ وہ روزانہ اپنی ڈاک دیکھتے تھے اور خط پڑھ کر اس پر جوابی ریمارکس لکھ دیتے تھے جن کے مطابق ان کا عملہ خط کا مضمون ٹائپ کر کے ان کے دستخطوں کے ساتھ ارسال کر دیتا تھا۔ البتہ ایسے خطوط جو وہ اپنے ہاتھ سے لکھتے تھے ان کے بارے میں کچھ کہنا مشکل ہے کہ خط ملنے کے کے روز بعد ان کا جواب لکھا جاتا تھا؟ اغلب ہے کہ ایسے خطوط کا جواب دینے میں بھی وہ زیادہ تاخیر نہیں کرتے تھے۔ کیونکہ اپنے احباب، جنھیں وہ خصوصی تعلق کی بنا پر اپنے دست و قلم سے خط لکھنے کے ساتھ ان کی مراسلت کے تسلسل سے یہ اندازہ کرنا دشوار نہیں کہ وہ خط کا جواب جلد از جلد دیا کرتے تھے۔ اور یہ وہ خوبی ہے جو اب ہمارے معاشرے میں روز بروز کم ہوتی جا رہی ہے۔

خطوطِ مشاہیر کی نوعیت

اس ذخیرے میں سید صاحب کے نام مختلف مشاہیر و احباب کے جو خطوط ہیں وہ مختلف نوعیتوں کے ہیں۔ ان میں علمی، ادبی، انتظامی، تحقیقی، غرض مختلف النوع مباحث شامل ہیں۔

خطوط کی ایک بڑی تعداد سید صاحب سے مضامین کی فرمائش کے حامل خطوط پر مبنی ہے جن کے مکتوب نگاروں میں مختلف رسالوں کے مدیر اور ان کے معاونین شامل ہیں۔

یونیورسٹی اور اورینٹل کالج سے وابستگی کے دور کے خطوط میں یونیورسٹی کے مسائل و معاملات سے متعلق بحثیں ہیں۔

بیرونِ ملک سے آنے والے خطوں میں پاکستان کی یونیورسٹیوں، علی الخصوص پنجاب یونیورسٹی سے متعلق استفسارات و مسائل پر گفتگو ہے۔ بعض مصنفین کے اپنی کتابیں ارسال کرتے ہوئے، ان کے ساتھ لکھے ہوئے خطوط ہیں۔ کتابوں پر سید صاحب کے تبصرے پر مصنفین کے شکریہ کے خطوط ہیں۔

بعض نیاز مندوں کے بلا سبب محض جوشِ عقیدت سے لکھے گئے خطوط ہیں

بعض خطوط سید صاحب کی آرا سے بحث کرنے کے لیے لکھے گئے ہیں۔ بعض خطوط میں کچھ علمی استفسارات ہیں۔

غرضیکہ اس نادر ذخیرہ میں بوقلموں شخصیات کے متنوع موضوعات پر رنگا رنگ خطوط موجود ہیں جو صرف سید عبداللہ یا ان کے مکتوب نگاروں کی ہی نہیں بلکہ ہمارے ادبی تناظر میں پورے معاشرے کی سوچ کا عکس مرتب کرتے ہیں۔

چند نادر خطوط

ذیل میں سید عبداللہ صاحب کے نام مختلف مشاہیر کے چند خطوط "مشتے نمونہ از خروارے"، کے طور پر پیش کیے جا رہے ہیں جن سے اس ذخیرے میں موجودہ خطوط کے موضوعات اور اس کی افادیت کا کچھ اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔

مولانا امتیاز علی خان عرشی

رضا لائبریری رامپور (انڈیا)

۱۷ر جولائی ۱۹۶۶ء

صدیق مکرم و محترم تسلیم مع التکریم

"نذر رحمٰن" کا ایک نسخہ ہدیتہً ملا۔ اس لطف و کرم کا تہ دل سے ممنون ہوں۔ ماشاء اللہ کیسی خوبصورت اور دلآویز کتاب آپ نے مرتب کرا کے پیش کی ہے۔ ظاہر بھی تحفۂ لالہ و گل ہے اور باطن بھی۔ خداوند علیم آپ کو اس سے بھی بہتر علمی کاموں کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین

یوں تو کتاب کے سارے مقالے مفید اور دلچسپ ہیں مگر مجھے خصوصیت کے ساتھ آپ کا مقالہ خط کی کہانی اور صدیقی ڈاکٹر وزیر الحسن عابدی صاحب کا مقالہ "تلفظ ایرانی اور اشعار امیر خسرو"، بہت پسند آئے۔

چسٹر بیٹی کے نسخے کا انداز خط دیکھ کر تعجب ہوا کہ تیسری صدی ہجری میں خط کوفی اتنا صاف ستھرا کیسے ہو گیا تھا۔ نیز قرآن پاک کو "جامع" کہنا اور ترقیمۂ فارسی میں لکھنا بھی عجیب سی بات نظر آئی۔

تختی نمبر ۵ کے ترقیمہ میں ۲۱۳ھ ہجری درج ہے۔ آپ نے شاید از راہ سہو ۲۲۳ھ لکھ دیا ہے۔ تختی نمبر ۷ کو آپ نے ۷۶۸ھ کا مکتوب تحریر فرمایا ہے حالانکہ اس کا خط اور گلکاری دونوں عہد اکبر کی معلوم ہوتی ہیں۔ میں نے غور کر کے دیکھا تو اس تختی کی نچلی بیل میں "درعمل مادر الزماں"، لکھا بھی ہے۔ جہاں تک مجھے یاد پڑتا ہے یہ فن کار اکبر (جہانگیری) کے زمانے کا آدمی ہے۔ آپ بھی مزید تحقیق فرمائیے اور مجھے نتیجے سے اطلاع دیجیے۔ تختی نمبر ۱۱ کو آپ نے ۶۷۷ھ کا نوشتہ بتایا ہے۔ حالانکہ اس تختی (کے) صفحہ کے اوپر "اسلطان ناصر الدین شاہ قاچار" لکھا ہے اور جہاں متن ختم ہوتا ہے وہاں سنہ سبع و سبعین والمائتین الالف یعنی ۱۲۷۷ھ تاریخ موجود ہے علاوہ ازیں خود شانِ خط اور گلکاری بھی تیرہویں صدی کی غمازی کرتی ہے۔ جہاں تک میرا خیال ہے۔ آپ نے مہدی بیانی کے بیان پر اعتماد فرما لیا ہے۔ یہ

امید ہے کہ مزاج گرامی قرین عافیت ہوگا۔

والسلام مع الاکرام
مخلص عرشی

۲

رام پور رضا لائبریری
قلعہ رام پور (انڈیا)

۴؍ستمبر ۱۹۶۶ء

مکرمی و محترمی، تسلیم مع التکریم

مکرمت نامے نے سرفراز کیا۔ میں ۱۴؍اگست کو کابل چلا گیا تھا۔ وہاں سے ۳۰؍ کو واپس آیا تو آپ کا خط پایا، الحمدللہ کہ اب بالکل اچھا ہوں۔ ابھی حال میں فہرست مخطوطاتِ عربیہ کی دوسری جلد چھپ کر تیار ہوئی ہے تیسری کی تیاری جاری ہے اور مخطوطات کی فہرست کے تقریباً تین سو صفحے طبع ہو چکے ہیں۔ ان کے علاوہ امام سفیان ثوریؒ کی تفسیر بھی چھاپی ہے۔ اس کا وحید نسخہ ہمارے یہاں محفوظ تھا۔

آج کل دیوانِ جریر (مع شرح ابن حبیب بغدادی) کی تصحیح میں لگا ہوا ہوں۔ اس کے علاوہ الغراء کی کتاب المفقند کا ایک نسخہ ہاتھ لگ گیا تھا۔ مقابلے کے لیے بمبئی کی جامع مسجد میں دوسرا نسخہ مل گیا۔ ان دونوں کی مدد [سے] ایک متن تیار کر رہا ہوں۔ ضروری حواشی بھی لکھتا جاتا ہوں۔ امید ہے کہ یہ ابنِ جریر کے دیوان سے پہلے تیار ہو جائے گا۔

نشوان بن سعید حمیدی صاحب شمس . . . . . . کی کتابیں تقریباً ایڈٹ کر لی ہیں۔ ان کے حاشیے صاف کرنا باقی ہیں۔ ایک کتاب علمِ عروض و قوافی پر ہے اور دوسرے الوہیت اور امامت میں اختلاف آرا پر ہے۔

دعا فرمائیے کہ یہ سارے ادھورے کام پورے کر لوں۔

والسلام مع الاکرام
مخلص عرشی

سید امتیاز علی تاج

مجلس ترقی ادب — ۲ کلب روڈ لاہور

یکم مارچ ۱۹۶۶ء

مکرمی محترمی سید صاحب۔ تسلیم، خلیل الرحمٰن داؤدی صاحب کے ہاں حیدرآباد دکن سے نایاب کتابوں کا ایک ذخیرہ آیا تھا۔ میرے کہنے پر انھوں نے یہ ذخیرہ کسی اور ادارہ کو ابھی نہیں دیا۔ بجٹ منظور ہونے پر میں نے کتابوں کی فہرست منگوا کر پہلے ڈاکٹر وحید قریشی صاحب کی

یہ فہرست واپس آگئی۔ کل شام کے عصرانے میں آپ نے وعدہ فرمایا تھا کہ آپ اسے جلد دیکھ دیں گے۔ ازراہِ نوازش اپنی اولین فرصت میں نشان لگا کر احسان مندی کا موقع بخشیں۔ یہ بات ملاحظہ رہے کہ بجٹ میں لائبریری کتب کی خرید کے لیے پانچ ہزار روپیہ منظور کیا گیا ہے۔ امید [ہے] کہ آپ بخیریت ہوں گے۔

والسلام

خاکسار

امتیاز علی تاج۔ ناظم

مجلس ترقی اردو

۲۔ کلب روڈ، لاہور

۲۹ ستمبر ۱۹۶۶ء

مکرمی محترمی سید صاحب! تسلیم۔ کتابوں کی ایک فہرست اس سے پیشتر ارسالِ خدمت کر چکا ہوں۔ آج داؤدی صاحب کی طرف سے یہ فہرست موصول ہوئی ہے۔ اسی فہرست کی ایک کاپی آپ کی خدمت میں بھیج رہا ہوں۔ ایک ڈاکٹر وحید قریشی صاحب کی خدمت میں۔ یہ اس لیے کہ دونوں حضرات آزادانہ کتابوں کے انتخاب کر سکیں اور ایک دوسرے کی رائے سے متاثر نہ ہوں۔ ازراہِ نوازش کتابوں کی فہرستیں اپنی اولین فرصت میں ملاحظہ کر کے دفتر میں اطلاع دے دیں کہ میں چپراسی بھیج کر منگوالوں۔ امید [ہے] کہ آپ بخیریت ہوں گے۔ والسلام

خاکسار

سید امتیاز علی تاج

مولانا عبدالماجد دریابادی

بسم اللہ

صدق ہفتہ وار

دریاباد ضلع بارہ بنکی

۶ جون ۱۹۵۹ء

کرم گستر۔ السلام علیکم ورحمۃ اللہ

آپ سے نیاز کُل ایک بار حاصل ہوا ہے۔ لاہور میں کسی صاحب کے ہاں سہ پہر کی چائے پر، اور اسے بھی اب ایک مدت دراز ہو گئی۔ سن غالباً ۱۹۴۲ء تھا۔

اخیر ۱۹۵۶ء میں مجھ سے آپ کی یونیورسٹی کی طرف سے فرمائش پی۔ ایچ۔ ڈی (اردو) میں ممتحنی کی ہوئی۔ مقالہ آیا۔ دیکھا۔ تو اپنی نگاہِ ناقص میں اس میں کچھ کچھ کسر نظر آئی۔ مقالہ، مقالہ نویس کو واپس کیا گیا۔ اب آخر ۵۸ء میں بیچارے نے دوبارہ لکھ کر پیش کیا، اب کی جانچ اور اپنی رپورٹ لکھ کر ۱۳ جنوری کو رجسٹرار صاحب کی خدمت میں رجسٹری سے بھیج دیا۔

چند ہفتوں کے بعد یعنی اخیر فروری سے توقع رقم میں ...... کی شروع ہوئی۔ یہاں تک کہ اب جون کا پہلا دہا ختم ہو رہا ہے۔ دفتروں کی انتظامی حالت یہاں ناگفتہ بہ ہے یہی حال

وہاں بھی ہوگا۔

یاددہانی کا تقاضا کرتے سخت حجاب آرہا ہے لیکن پھر خیال آیا کہ ممتحنی میں تقرر یقیناً آپ ہی کی تحریک پر ہوا ہوگا۔ اس لیے آپ کو مطلع کر دینے میں چنداں مضائقہ بھی نہیں۔ خدا کرے آپ ہر طرح بہ خیر و عافیت ہوں۔

والسّلام دعاگو عبدالماجد

اس خط پر مندرجہ ذیل عبارت درج ہیں:

۱۔ سیّد عبداللہ صاحب کے ریمارکس

"مودّبانہ خط۔ اب نتیجہ شائع ہوا ہے۔ قاعدے کی رو سے معاوضہ نتیجہ شائع ہونے کے بعد ملا کرتا ہے۔ میں کوشش کرتا ہوں کہ جلد مل جائے۔"

(ii) جمیل! مرزا صاحب کے ذریعے پھر ان کے چیک کا پتہ چلائیے۔

سکریٹری کے ریمارکس

(i) 26.5.59، 1909/A3 سٹیٹ بنک پاکستان کو PERMISSION کے لیے لکھا گیا ابھی تک وہاں سے اجازت نہیں آئی۔ آنے پر بنک ڈرافٹ -/200 کا بھیجا جائے گا۔

(ii) جواب ارسال کر دیا گیا ہے جمیل 17/6/59

ڈاکٹر وزیر آغا

۵۸۔ سول لائنز سرگودھا

۹/ دسمبر ۶۵ء

محترمی ڈاکٹر صاحب

تسلیم و نیاز امید ہے آپ بخیر و عافیت ہوں گے

میں نے ابھی ابھی پاکستان ریویو میں اپنی کتاب پر آپ کا تبصرہ پڑھا ہے۔ میں آپ کا ممنون ہوں کہ آپ نے غائر نظر سے کتاب کا مطالعہ کر کے اس کے بارے میں اپنی رائے کا اظہار کیا ہے۔ اس تبصرے میں آپ نے میری اس حقیر تصنیف کی تعریف میں جو ایک آدھ جملہ لکھا ہے میں اس کی قدر کرتا ہوں یہ آپ کی کشادہ دلی پر دال ہے۔

میری اس کتاب کے مرکزی نقطۂ نظر سے آپ متفق نہیں مجھے اس سے حیرت نہیں ہوئی کیونکہ پچھلے چند ماہ سے آپ کے مضامین کے عام لہجے کو دیکھتے ہوئے میں اس "ردعمل" کے لیے ذہنی طور پر تیار تھا۔ پھر بھی چند غلط فہمیوں کے ازالے کے لیے چند سطور لکھنا ضروری خیال کرتا ہوں۔

گیت کے سلسلے میں آپ نے فرمایا ہے کہ وہ دور جس میں ہندی گیت نے فروغ حاصل کیا تھا۔

اردو شاعری کے ارتقا میں کوئی مرحلہ ہی نہیں مجھے یہ پڑھ کر سخت حیرت ہوئی کیونکہ امیر خسرو کے کلام کے واضح نمونوں کے علاوہ خود حافظ محمود شیرانی کا وہ سارا کام آپ کے سامنے تھا جو اردو شاعری کے ابتدائی ادوار کے سلسلے میں انھوں نے سرانجام دیا ہے۔ پھر خود دکنی شاعری کا زمانہ بھی ملحوظ رہے اور یہ بھی خیال رہے کہ اس شاعری میں گیت کے عناصر کی فراوانی تھی تو آپ کے موقف کو سمجھنا مشکل ہو جاتا ہے۔

آپ کا دوسرا اعتراض یہ ہے کہ ہندوستان پر مسلمانوں کے حملے کے بعد (میری نقطۂ نظر کے مطابق) گیت کا فروغ نہیں ہونا چاہیے تھا جب کہ حقیقت میں ایسا ہی ہوا۔ آپ کا یہ اعتراض محض ایک غلط فہمی کی پیداوار ہے۔ آپ اگر کتاب کو بغور پڑھیں تو آپ یہ دیکھیں گے کہ میں نے گیت اور گیت نما شاعری کو (جو سنسکرت، پالی اور جنوبی ہند کی شاعری پر مشتمل تھی) دراوڑوں اور آریائی تہذیب کے تصادم کی پیداوار قرار دیا ہے۔ جب مسلمانوں نے ہندوستان پر حملہ کیا اور آویزش اور انضمام کی فضا نے دیسی بھاشاؤں (جن میں اردو بھی شامل تھی) کو جنم دیا تو ان میں ایک قدرتی اور ثقافتی تسلسل کے تحت گیت کی پرانی روایت از خود منتقل ہوتی چلی آئی۔ مسلمانوں کی آمد پر جو ثقافتی تصادم ہوا اس نے گیت کو نہیں بلکہ غزل کو پیدا کیا، اس کا یہ مطلب نہیں کہ گیت ختم ہو گیا۔ بعینہٖ جیسے یہ کہنا کہ جب بعد ازاں نظم کو فروغ ملا تو غزل ختم ہو گئی، ایک بالکل غلط بات ہوگی۔ ثقافتی پس منظر میں جو چیز ایک بار جڑیں پکڑ لیتی ہے پھر کبھی ضائع نہیں ہوتی۔ گیت، غزل اور نظم۔ یہ تینوں اصناف اسی لیے اردو شاعری میں ابھی تک زندہ ہیں۔ میرا نظریہ یہ ہے کہ گیت، غزل اور نظم نہ صرف انسانی سائیکی کے تدریجی ارتقا میں تین اہم مراحل ہیں، بلکہ یہ مراحل برصغیر کے ثقافتی پس منظر کی تین تہوں کو بھی پیش کرتے ہیں۔ ہم میں سے ہر شخص ان تینوں فنون کو ورثے میں حاصل کرتا ہے اور جب شعر کہتا ہے تو اس کا مزاج اس تہہ کے خاص مزاج سے متاثر ہوتا ہے جس کے قریب کھڑے ہو کر اس نے اظہارِ ذات کیا ہے۔

غزل کے سلسلے میں میرا نظریہ بھی یہ ہے کہ اردو غزل ایرانی اور ہندی تہذیبوں کے انضمام پر وجود میں آئی۔ میں نے اس سلسلے میں تصوف کی روایت اور ایران کے ثقافتی اور جغرافیائی پس منظر کا بطورِ خاص ذکر کیا ہے۔ حیرت ہے کہ آپ نے درخورِ اعتنا نہیں سمجھا۔ آپ غالباً اردو ادب کے صرف اسلامی پس منظر سے سروکار رکھنے کے خواہش مند ہیں۔ مجھے افسوس ہے کہ یہ نظریہ میرے لیے قابلِ قبول نہیں تھا کیونکہ میری تحقیق کے مطابق اردو غزل درآمد کی ہوئی شے تو ہے لیکن اس کا مزاج ایرانی اور ہندی ثقافت کے میل جول سے مرتب ہوا ہے۔ چنانچہ خود اردو غزل میں یہاں کی زمین اور اس کے مظاہر نے ایک نمایاں کردار سرانجام دیا ہے۔

آپ نے ایک یہ اعتراض بھی فرمایا ہے کہ میرا نقطۂ نظر اس نظریے کی ایک شاخ ہے جو اس برصغیر کے ماضی بعید کو ابھ[illegible] اسلامی اثرات کی اہمیت کو کم کیا جائے۔

نیت کا حال تو خدا ہی بہتر جانتا ہے لیکن کوئی پُرخلوص محقق کبھی اس نیت کے ساتھ تحقیق کے میدان میں نہیں اُترتا کہ وہ ایک پہلے سے تیار کردہ تخریبی پروگرام کو عملی جامہ پہنائے گا۔ اگر ایسا ہو تو تحقیق کا سارا مقصد ہی فوت ہو جائے۔ جب کوئی تحقیق پر اس قسم کی قدغن لگائے تو تحقیق کرنے والا پلٹ کر یہ بھی سوال کر سکتا ہے کہ "جناب آپ نے جو ادب اور ثقافت کو ایک خاص عینک سے دیکھنے کا طریق اختیار کیا ہے اور اسے ایک نیم مذہبی تنگنائے سے گزارنے کی سعی فرمائی ہے، کہیں اس سے تحقیق کا سارا رنگ محل تو دھڑام سے نیچے نہیں آ رہے گا؟" آپ خود ایک محقق ہیں اور آپ جانتے ہیں کہ تحقیق آزاد فضا میں ہو سکتی ہے۔ اگر آپ بھی تحقیق کرنے والوں کی نیت پر شبہ کریں گے اور انھیں ایسی تنگنائے میں خود کو محدود کرنے کی تلقین فرمائیں گے جو اتفاق سے ان دنوں بہت مقبول ہے اور عوام کی حمایت حاصل کر چکی ہے تو پھر اردو تحقیق، بلکہ اردو ادب کا خدا ہی حافظ ہے۔ ممکن ہے آپ اپنے تبصرے کے آخری جملے کی طرف اشارہ کریں جس میں آپ نے مجھ پر نظر کرم فرمائی ہے، تو گزارش ہے کہ وہ جملے تو ADDING PAIN TO INSULT کے مترادف ہے۔ اس کا ذکر بھی غیر ضروری ہے۔

میں نے یہ کتاب رواداری میں نہیں لکھی۔ اس میں اپنا خونِ جگر شامل کیا ہے۔ کاش آج پطرس، تاثیر یا مولانا صلاح الدین احمد ہوتے تو مجھے اپنے کام کی داد ملتی، لیکن آج تو یہ محسوس ہوتا ہے کہ ہمارے بزرگ بھی ادب میں نعرہ بازی کو پسند کرنے لگے ہیں۔ اگر زمانے کی ہوا کو دیکھ کر اپنا موقف ترتیب دینے کا یہی نظریہ مسلط ہونے والا ہے، تو میں سوچتا ہوں کہ کیا یہ مناسب نہیں کہ آزاد فضا میں تحقیق اور تنقید کا کام کرنے والے اسے چھوڑ کر کوئی اور دھندا اختیار کر لیں؟ ع آج کچھ درد مرے دل میں سوا ہوتا ہے

آپ کے خط کا منتظر ہوں! والسلام مخلص

وزیر آغا[1]

احمد ندیم قاسمی

رسالہ فنون

۱۷۰۔ انارکلی لاہور، مغربی پاکستان ۱۲ر فروری ۶۶ء

مخدوم گرامی، آداب

عنایت نامہ مل گیا تھا۔ ایک بار فون کیا مگر یا آپ کا فون خراب تھا یا میرے ہی فون میں نقص تھا۔ رابطہ قائم کرنے میں ناکام رہا۔ اس کے بعد "فنون" کی ترسیل کا مرحلہ درپیش رہا۔ اس سے فارغ ہوا ہوں تو یہ عریضہ لکھ رہا ہوں۔

---

[1] اس خط میں زیر بحث کتاب "اردو شاعری کا مزاج" ہے اور خط کی پیشانی پر جواب ارسال کیے جانے کی تاریخ ۱۱ر دسمبر ۱۹۶۵ء درج ہے۔

آئندہ نمبر اپریل کے پہلے ہفتے میں پیش کرنے کا ارادہ ہے، سو اگر آپ مارچ کے وسط تک بھی مضمون عنایت فرمائیں تو میں اسے باآسانی آئندہ نمبر میں شائع کرنے کی سعادت حاصل کر سکوں گا۔

عزت افزائی کا تہِ دل سے ممنون ہوں

دعا ہے آپ بخیریت ہوں گے۔

مخلص
ندیم

اردو نگر کے پتے پر تازہ شمارہ بذریعہ رجسٹری

بھجوا چکا ہوں، امید ہے اب تک مل چکا ہو گا۔ ندیم

محمد طفیل (نقوش)

ادارہ فروغِ اردو، انارکلی لاہور

قبلہ، اگر آپ کی کوئی تحریر ہمارے حصے میں بھی آجائے تو میں خوش ہو جاؤں گا۔ جتنا کہ دوسرے ادبی رسالوں والے معاوضہ دیتے ہوں گے اتنا تو میں بھی دے سکوں گا۔

ان دنوں سالنامہ چھاپ رہا ہوں۔ اگر آپ کی طرف سے کچھ مل گیا تو ایک گونہ اطمینان ہو گا۔ نقوش میری کوئی ذاتی چیز نہیں، سب کا پرچہ ہے۔ میرا کمال صرف اتنا ہے کہ میں جیسے تیسے یہ کام کیے جا رہا ہوں۔

امید کہ آپ اچھے ہوں گے۔

آپ کا
محمد طفیل

ڈاکٹر حمید اللہ (فرانس)

بسم اللہ

اسلام آباد

چہارشنبہ ۱۸ ربیع الانور ۱۴۰۰ھ

مخدوم و محترم زاد فیضکم

السّلام علیکم و رحمۃ اللہ و برکاتہٗ۔ توقع ہے میرا جوابی عریضہ مل گیا ہو گا۔ میں یہاں گزشتہ جمعہ کو آیا تھا اور آئندہ جمعہ کو ایک ہفتے کے قیام کے بعد واپس جا رہا ہوں۔ پاکستانی پریس اتاشی (پیرسیس) سے معلوم ہوا کہ فرانسیسی حکومت عموماً ہر سال چند تعلیمی وظیفے پاکستانی طلبہ کو دیتی ہے اور یہ پاکستانی وزارتِ تعلیم سے متعلق ہے۔ کبھی پارسیس کے سفارت خانے سے اور کبھی اسلام آباد کے فرانسیسی سفارت خانے سے یہ بابتی کا کام لیا جاتا ہے۔

ترجیح ان طلبہ کو دی جاتی ہے جو بعد میں فرانسیسی زبان کے معلم بننا چاہتے ہیں اور کبھی کبھار استثنائی طور پر دیگر علوم کے لیے بھی کسی کو لیا جاتا۔۔۔

ان سرکاری وظائف کے سوا میرے علم میں وہاں فی الوقت کوئی اور ایسی چیز نہیں ہے

جو طلبہ کے گزراوقات کا انتظام کرتی ہو۔

نیازمند
محمد حمید اللہ

ڈاکٹر محمد اجمل

بسم اللہ الرحمن الرحیم

ہائیڈل برگ، ۸ فروری ۱۹۸۰ء

مکرمی و محترمی ڈاکٹر صاحب!

آپ کا نوازش نامہ ملا، اپنے وطن سے کوئی خط اور وہ بھی بالخصوص آپ کا خط اس سرد مہر فضا میں محبّت کی حرارت بن کر آیا ہے۔ ممنون ہوں کہ آپ نے مجھے یاد کیا۔

ہاں ہاں، آپ کی دختر فرخندہ اختر مس عطیہ سیّد مجھے خوب یاد ہیں۔ بہت ذہین اور قابل ہیں۔ فلسفے سے فطری شغف ہے۔ ایسے طالب علموں کو میں کہاں بھولتا ہوں۔ استاد کی زندگی کا سرمایہ یہی تو جوان تو ہیں۔

میں جنوب ایشیا انسٹی ٹیوٹ میں گاہے گاہے لیکچر دیتا ہوں اقبال پر اور متعلقہ مضامین پر۔ اگر عطیہ اقبال کے فلسفے کے کسی پہلو پر کام کرنا چاہتی ہوں تو میں کوشش کروں گا کہ داخلہ اسی انسٹی ٹیوٹ میں ہو جائے اور اگر وہ جرمن فلسفہ پڑھنا چاہتی ہیں تو ان کا داخلہ فلسفے کے ڈیپارٹمنٹ میں ہو سکتا ہے۔ اگر انھیں پی ایچ ڈی کرنا ہے تو میرا خیال ہے کہ اقبال یا اسلامی فلسفے کے کسی پہلو پر کام کریں تو اچھا ہے۔

یہاں کے طالب علموں کے لیے جرمن زبان جاننا بہت ضروری ہے۔ اس لیے میرا مشورہ ہے کہ وہ ابھی سے گوئٹے انسٹی ٹیوٹ میں داخل ہو جائیں۔ یہاں آکر بھی پہلے تین مہینے جرمن ہی پڑھائیں گے۔

داخلے کے فارم پاکستان میں جرمن سفارت خانے سے مل جائیں گے اور ساتھ ہی اگر وہ ..... کے وظیفے کے لیے بھی درخواست دے دیں اور اگر وہ وظیفہ مل جائے تو اس سے یہاں جرمنی میں مختلف یونیورسٹیوں کی سیر اور ان کا مطالعہ کرنے کا موقع بھی مل جائے گا۔

میں چند دنوں کے لیے امریکہ گیا ہوا تھا اس لیے خط کے جواب میں تاخیر ہوئی امید ہے کہ آپ معاف فرمائیں گے

کیا یہ ممکن ہے کہ آپ یونیورسٹی کی اجازت سے انسائیکلوپیڈیا کی مطبوعہ جلدیں SULA SIEN INSTITUTE. کو تحفے کے طور پر بھیج سکیں۔ یہاں اردو کی کتابیں بہت کم ہیں اور میں کوشش کر رہا ہوں کہ یہاں کے کتب خانے میں اردو کی کتابوں میں اضافہ ہو اور اس کے ساتھ ہی اردو اکیڈمی کی مطبوعات بھی آجائیں تو یہ ایک بیش بہا اضافہ ہوگا۔

اگر اس کے علاوہ معلومات (عطیہ کے داخلے کے بارے میں) مجھے میسر آئیں تو میں اگلے خط میں لکھ دوں گا۔

امید ہے کہ آپ اور آپ کی بیگم خیریت سے ہوں گے۔ عطیہ کو بھی سلام کہیے گا۔

مخلص اور نیازمند
محمد اجمل

ایک دلچسپ خط

ذیل میں سیّد صاحب کی ایسی تحریر درج کی جارہی ہے جو ہمیں سیّد صاحب کے مزاج کی شگفتگی کا پتا دیتی ہے۔ تحریر پروفیسر غلام جیلانی مخدوم کی اس تحریر کا جواب ہے جو انھوں نے معجم مصادرِ اسلامی کے منصوبے کے ابتدائی خاکے کی ری کے سلسلے میں لکھی تھی۔ پروفیسر غلام جیلانی مخدوم نے یہ تحریر جس مغلق اور معرّب انداز میں لکھی سیّد صاحب نے اسی اور اسلوب میں اس کا جواب لکھا۔

معجم مصادرِ اسلامی کا ابتدائی خاکہ

ذہنی غمود اور عرفی خمول کے صحرائے ناپیداکنار کے عین وسط میں ایک کھجور کا درخت لگایا گیا ہے. جیسے نخلِ باسق بناکر رطب جینا کے حصول کی تمام تر کفالت اس داہب العطایا سرد شکیتمان اور ذوالجلالِ والاکرام سردانتریامی کے ذمے ہے جو قلال شاہقہ پہ طبا لقیبدہ لب کو آب اور اعماق بحور میں جتان جسیمہ کو ہوا اور خیایای ارض میں ثعابین عظمیہ کو خاک اور نار مؤصدہ میں سمندر آسا حشرات کو نار مہیا فرماتا ہے یقین واثق ہے۔ وہی خیر [illegible] قین کھجور کے درخت کی نشو و نما کے لیے غیث وابل اور ابرِ ہاطل بھی مہیا فرمائے گا۔

غلام جیلانی مخدوم
ایم۔اے (فارسی۔عربی۔ اسلامیات) بی۔ ٹی

لٹر سید عبداللہ کی جوابی تحریر

تمیقہ انیقہ طریم القناقیع کے مضمرات واکینّہ کی کُنہ کی معرفت کے بعد عمالیقِ علم کے اجتماع ذوالارتجاع کے محاکمات و مصادرات کے نتائج باردہ یا نافعہ کے بعد نخلِ علم کے ثمرات و منافع کا ادراک یعنی اس کے قضایا و تصدیقات کا صحیح تصوّر نفسِ ناطقہ پر مرتسم ہو سکے گا۔

واللہ علیٰ ما اقول شہید

والسّلام

(تبصرے کے لیے دو جلدوں کا آنا ضروری ہے)

تذکرۂ بے مثلِ راجگانِ راجور ——— مصنّف: کلیم اللّٰہ خاں پی۔ سی۔ ایس

صفحات: ۱۲۰ علاوہ شجرہ ہائے نسب۔ قیمت: ۵۰ روپے

پتا: درج نہیں

یہ کتاب کلانور اور پھر راجور (ہندوستان) کے راجاؤں کے خاندان کے تذکروں پر مشتمل ہے جن کی ایک کثیر تعداد اب لاہور، وزیر آباد اور گجرات وغیرہ میں مقیم ہے۔ پہلی بار ۱۹۰۷ء میں مرزا ظفر اللّٰہ خاں نے جو پنجاب میں اسسٹنٹ جوڈیشل کمشنر تھے۔ دو جلدوں میں یہ کتاب شائع کی تھی۔ اور اب کچھ تلخیص اور تکمیل کے بعد ان کے پوتے کلیم اللّٰہ خاں پی۔ سی۔ ایس (ریٹائرڈ) نے جو محکمہ اوقاف لاہور میں ملازم تھے، دوبارہ اسے ایک جلد میں شائع کیا ہے۔

تذکرۂ بے مثل قبل از مسیح کے ہندو دور سے شروع ہوتا ہے اور اس خاندان کا اجمالی تذکرہ کورو پانڈوں کے ضمن میں کیا گیا ہے۔ سلطان شہاب الدین غوری نے جب لاہور پر حملہ کیا (۱۱۷۹ء) تو اسی زمانے میں اس خاندان کے راجا نے جن کا دارالحکومت اس وقت کلانور میں تھا، اسلام قبول کیا۔ اس خاندان کی ایک صاحبزادی اورنگ زیب کے حبالۂ عقد میں آئیں جن کے بطن سے شاہ عالم پیدا ہوئے۔ ۱۸۴۶ء تک یہ خاندان راجور میں حکمرانی کرتا رہا اور آخر ۱۸۴۷ء میں عہد نامۂ امرتسر کے تحت یہ لوگ حکومت سے دست بردار ہوگئے۔

کتاب میں خاندان کے تاریخی احوال بیان کرنے کے علاوہ مختلف معاشرتی رسم و رواج اور اس کی اصلاح کا بھی تفصیلی بیان کیا گیا ہے۔ کتاب کے آخر میں خاندان کے تمام قابلِ ذکر لوگوں کا اجمالی تذکرہ بھی موجود ہے۔ دس صفحوں میں خاندان کی مختلف شاخوں کے شجرے درج ہیں۔

ایسی تمام کتابیں جن میں ذیلی برِاعظم کے مختلف خاندانوں کے سیاسی اور معاشرتی حالات بیان کیے جائیں اپنی تاریخی اہمیت کے اعتبار سے پذیرائی کے قابل ہیں اور تذکرۂ بے مثل بھی ایسی کتابوں میں ہے۔ (ابنِ منیر)

گل ہائے رنگ رنگ ——— تالیف: محمد شمس الحق

صفحات: ۴۵۱۔ قیمت: ۱۰۰ روپیہ

پتا: نیشنل بک فاؤنڈیشن اسلام آباد، لاہور، کراچی

محمد شمس الحق کو شروع سے باغبانی اور شعر و شاعری سے دلچسپی رہی۔ باغبانی میں انھیں کئی انعامات ملے اور ان کے اشعار کے پچاس سالہ مطالعہ کا نتیجہ زیرِ تبصرہ کتاب ہے۔

اس کتاب میں غزلوں کے متحد المضامین اشعار کو مختلف سرخیوں کے تحت شاعر کے زمانی تقدم و تاخر کے لحاظ سے درج کیا گیا ہے۔ تقریباً ساٹھ عنوانات اور ایک ہزار سے زیادہ ذیلی عنوانات کے تحت گیارہ سو سے زائد شعرا کے تقریباً بارہ ہزار منتخب اشعار اس کتاب کی زینت ہیں۔ اگرچہ اس کاوش کو اس بنا پر اولیت کا درجہ نہیں دیا جا سکتا کہ اس قسم کے کچھ اور مجموعے پہلے بھی شائع ہو چکے ہیں لیکن یہ اپنے پیش رو مجموعوں سے اس لحاظ سے مختلف ہے کہ پرانے مجموعوں کے مؤلفوں نے یہ انداز اختیار کیا تھا کہ انھوں نے پہلے عنوانات قائم کیے اور پھر تلاش و جستجو کے بعد ان عنوانات کے تحت موزوں اشعار درج کر دیے۔ اس طرح حوالہ جاتی افادیت کے باوجود ان مجموعوں میں طبعی دلکشی کی جگہ ایک مشینی رنگ آ گیا اس کے برعکس شمس الحق صاحب نے اس قسم کا کوئی التزام نہیں کیا بلکہ انھیں اپنے مطالعے کے دوران میں جو اشعار اچھے لگے وہ انھیں اپنی بیاض میں درج کرتے رہے اور اس طرح کوئی پچاس سال کے بعد انھوں نے ان منتخب اشعار کو مختلف عنوانوں کے تحت درج کر کے قارئین کی ضیافتِ طبع کا سامان مہیا کر دیا۔

اشعار زیادہ تر غزلوں سے لیے گئے ہیں اور حمد و نعت کے علاوہ کائنات اور انسان کے مختلف اعضا اور کیفیات سے متعلق ہیں۔ عنوانات کی ہمہ گیری کا اندازہ اس سے لگایا جا سکتا ہے کہ مثلاً "تلاشِ منزل" ایک عنوان ہے جس کے تحت ذیلی عنوانات ہیں۔ آبلہ پا، افتادگی، بگولہ، تلاشِ منزل، جرسِ کارواں، دُوریٔ منزل، رہبر و رہزن، رہبر و رہنما، رہزن، سفر، شکستہ پائی، غبارِ راہ، قافلہ، کارواں، گمرہی، مسافر اور منزل۔

کتاب کے شروع میں ڈاکٹر جمیل جالبی اور پروفیسر نظیر صدیقی کے تعارفی مضامین ہیں۔ پھر خود مؤلف کا اپنا ایک مقدمہ ہے جس میں انھوں نے اردو شاعری کے مختلف ادوار پر تبصرہ کرنے کے علاوہ اس مجموعے کے مختلف پہلوؤں پر روشنی ڈالی ہے۔ مقدمہ بھی مفید معلومات پر مبنی ہے۔ آخر میں شاعروں کے لحاظ سے اشاریہ ہے۔ نیشنل بک فاؤنڈیشن نے اس مجموعے کو خوبصورت انداز میں شائع کیا ہے۔ کاغذ، کتابت اور مجموعی شکل و صورت قابلِ تعریف ہیں۔

ایک خاص مقصد سے شاعری کا مطالعہ کرنے والوں کے لیے یہ ایک مفید کتاب ہے اور مؤلف نے بجا طور پر یہ خیال ظاہر کیا ہے کہ "اس مجموعے کی حیثیت اردو غزل گوئی میں کتاب حوالہ جات (REFRENCE BOOK) کی ہو گی۔"

(ابنِ منیر)

امروز ——— مصنف: تابش دہلوی

صفحات: ۳۲۰۔ قیمت: ۷۵ روپے

پتا: ادب گاہ، بلاک ۲۔ اے ۶/۹ ناظم آباد، کراچی

غزل کا کلچر قدیم ہے۔ اس کی اپنی خاص تہذیب اور خاص مزاج ہے جس کی آبیاری صدیوں سے ہوتی آ رہی ہے۔ ... نے غزل میں محبوب کے غم کے حوالے سے جس نازک خیالی کا مظاہرہ کیا، وہ انھیں کا وصفِ خاص کہلایا۔ غالب نے غمِ محبوب

کو غم کائنات تک پھیلا کر دیکھا، اس طرح غزل میں بہت سی جہات پیدا ہوگئیں لیکن اس انداز سے کہ نہ غزل مجروح ہوا نہ اس کا مخصوص مزاج۔ غالب کے بعد کے ادوار میں بھی غزل میں کئی نام نمایاں ہوئے جن میں داغ، اصغر، فانی، جگر اور حسرت کے نام لیے جاسکتے ہیں۔

تابش دہلوی کا نام بھی اسی روایت شعری میں لیا جاسکتا ہے۔ غزل کے ناقدین کی نظر میں تابش دہلوی کا ذکر کیا جاتا ہے، یہ تو ان کا مسئلہ ہے، عام صورت حال یہ ہے کہ جب بھی معتبر شعرائے غزل کا ذکر کہیں چھڑتا ہے تو تابش دہلوی کا نام بھی ابھر کر سامنے آتا ہے۔ یہی شعرائے غزل کے ہجوم میں تابش دہلوی کے نمایاں ہونے کی دلیل ہے۔ دہلی وطن ہونے کے ناتے تابش دہلوی کو جو شعری روایت ملی ہے اس میں جذبہ وخیال کو اہمیت دی جاتی ہے۔ جذبہ، احساس اور خیال غزل کے خام مواد کے طور پر ہر شاعر استعمال کرتا ہے۔ اس مثلث سے کسی شاعر کو مفر نہیں۔ تابش دہلوی کی شاعری کی اساس بھی یہی ہے۔ لیکن ان کے ہاں ان کی طبیعت کی شائستگی بھی شامل ہوگئی ہے جس سے ان کی غزلیں چیزے دیگرے کا لطف فراہم کرتی ہیں اور نرم روی اور متانت گفتار کا معیار قائم کرتی ہیں۔ بلاشبہ غزل کی اس روایت کے تابندہ مثال ہیں جس کا ذکر اوپر کیا گیا ہے۔

"نیم روز" تابش صاحب کا پہلا شعری مجموعہ ہے جو ۱۹۸۸ء میں دوبارہ شائع ہوا ہے۔ اس کے بعد تین اور مجموعے منظر عام پر آچکے ہیں۔ ان کا فن چراغ صحرا میں بہت دور نکل آیا ہے۔ آپ اسے ان کے فن کا کمال بھی کہہ سکتے ہیں۔

ڈاکٹر وفا راشدی

نئے خزانے

گزشتہ سے پیوستہ ـــ رسائل و جرائد بابت دسمبر ۱۹۸۸ء ـ جولائی تا دسمبر ۱۹۸۹ء کے موضوع وار اشاریے

دیگر علمی و ادبی شخصیات

آفتاب احمد، ڈاکٹر	خواجہ منظور حسین اور محمد حسن عسکری	غالب	کراچی	جنوری تا دسمبر	۱۹۸۹ء	ص ۴۱۸
ابو سعید قریشی	ن۔م۔ راشد	"	"	"	"	ص ۲۸۸
اخگر سرحدی	بیاد ڈاکٹر سید عبد اللہ	قومی زبان	"	اکتوبر	"	ص ۲۹
ادارہ	ڈاکٹر صوفی محمد ضیا الحق (اردو زبان و ادب کے مایہ ناز استاد)	فکر و نظر	اسلام آباد	دسمبر	۱۹۸۹ء	ص ۱۱۳
اسلم فرخی، ڈاکٹر	ڈاکٹر سید معین الحق	قومی زبان	کراچی	نومبر	"	ص ۱۹
اعجاز صدیقی	سائل دہلوی	شاعر	بمبئی	۴ / ۱۹۸۹ء		ص ۱
اکبر حیدری کاشمیری پروفیسر	لالہ سری رام	سب رس	کراچی	اکتوبر	"	ص ۱۵
انتظار حسین	شیخ صاحب	غالب	"	جنوری تا دسمبر	"	ص ۳۰۰
انیس خورشید، ڈاکٹر	حکیم اسرار احمد کریوی	دائرے	"	نومبر	"	ص ۲۳
برج پریمی، ڈاکٹر	سعادت حسن منٹو اور روسی ادب	فنون	لاہور	نومبر دسمبر	"	ص ۷۸
جمیل جالبی، ڈاکٹر	ابراہیم جلیس کے بارے میں	سب رس	کراچی	جولائی	"	ص ۹
خالد حسن قادری	اے۔ ٹی۔ چودھری	غالب	"	جنوری تا دسمبر	"	ص ۳۰۹
خلیق انجم، ڈاکٹر	دیوان بریندر ناتھ ظفر پیامی	ہماری زبان	دہلی	۲۲ دسمبر	"	ص ۳
دوارکا داس شعلہ	پنڈت ہری چند اختر	غالب	کراچی	جنوری تا دسمبر	"	ص ۲۹۴
رفعت جمال، ڈاکٹر	مولوی ذکاء اللہ اور تعلیم	العلم	"	دسمبر	"	ص ۶۴
سحاب قزلباش	محمود نظامی	غالب	"	جنوری تا دسمبر	"	ص ۳۲۰
سید حرمت الاکرام	ڈاکٹر زور، شخصی اور ادبی زندگی	سب رس	"	ستمبر	"	ص ۸

مصنف	عنوان	رسالہ	مقام	ماہ	سال	صفحہ
سرشار صدیقی	زخم ہنر[1] کو تازہ رکھیے	دائرے	کراچی	نومبر	۱۹۸۹ء	ص ۲۱
سید معین الرحمٰن، ڈاکٹر	پطرس بخاری اور خواجہ منظور حسین	فنون	لاہور	جولائی	”	ص ۵۱
شاہ بلیغ الدین	بزرگ تہجد گزار پروفیسر عبدالقدیر حسرت	سب رس	کراچی	اگست	”	ص ۴
شاہ بلیغ الدین	پروفیسر سروری کی یادیں	”	”	اکتوبر	”	ص ۲۰
صبا اکبر آبادی	جوش ملیح آبادی	غالب	”	جنوری تا دسمبر	”	ص ۲۷۹
صفی الدین صدیقی، ڈاکٹر	نیاز حیدر	کتاب نما	نئی دہلی	دسمبر	”	ص ۲۸
غلام رسول	پروفیسر محمد عثمان	نقوش	لاہور	”	”	ص ۲۶۸
غلام سرور راکرتل	ڈاکٹر جمیل جالبی اپنی تحریروں کے آئینے میں	دائرے	کراچی	”	”	ص ۳۴
قمر جمیل	اودھ کا آخری درویش، سلیم احمد	قومی زبان	”	اکتوبر	”	ص ۳۵
محبت خان بنگش	قارع رضا، عظمتوں کے چراغ	”	”	”	”	ص ۲۵
محمد حسین خان شفا حکیم	جوہر سہا اور جوہری مصر	العلم	”	دسمبر	”	ص ۷۰
محمد حمزہ فاروقی	پروفیسر یوسف سلیم چشتی	غالب	”	جنوری تا دسمبر	”	ص ۳۲۶
مختار زمن	لفظوں کا جادوگر ـ جوش	افکار	”	دسمبر	”	ص ۲۸
مصطفٰی علی بریلوی	ڈاکٹر معین الحق (علیگ)	العلم	”	”	”	ص ۲۶
مصطفٰی علی بریلوی	میجر شمس الدین محمد	”	”	”	”	ص ۵۹
مناظر عاشق ہرگانوی، ڈاکٹر	نسیم انہونوی یادیں، باتیں	سب رس	”	اگست	”	ص ۸
منیر احمد شیخ	صادقین ـ ایک محبوبۂ روزگار	طلوعِ افکار	”	”	”	ص ۱۷
میاں حیات بخش	ڈاکٹر سید عبداللہ، ایک عظیم شخصیت	قومی زبان	”	اکتوبر	”	ص ۳۳
نسیم نلیتوفوز	۱۹۸۹ء کا نوبل انعام یافتہ ادیب سامیلو سیلا	قومی زبان	کراچی	دسمبر	۱۹۸۹ء	ص ۵۹
وحید الزور	اردو ادب کے سرداجی، راجندر سنگھ بیدی	نقوش	لاہور	”	۱۹۸۸ء	ص ۷۲۱
ہلال نقوی، ڈاکٹر	مجتبیٰ حسین کا فن ـ ایک تجزیہ	صریر	کراچی	اکتوبر	۱۹۸۹ء	ص ۷۲
یوسف سرمست	پریم چند، ترقی پسند تحریک اور جدیدیت	قومی زبان	کراچی	اکتوبر	۱۹۸۹ء	ص ۵۱
یوسف ناظم	ادب کی ملکۂ معظمہ عصمت چغتائی	کتاب نما	نئی دہلی	دسمبر	”	ص ۲۴

---

[1] شاد لکھنوی۔ ان کے مجموعۂ کلام زخمِ ہنر کے حوالے سے۔

سوانح و تذکرے

ری	سید مہدی علی ذکی	قومی زبان کراچی		نومبر	۱۹۸۹ء	ص ۳۵
ں	دریچے میں رکھے ہوئے چراغ	طلوع افکار "		اگست	"	ص ۹
محمد نعمانی	سخن وران فارسی ہند بعد از دکتر اقبال	جرنل خدا بخش لائبریری پٹنہ شمارہ ۵۰/۱۹۸۹ء ص ۱۶۰				
الدین	کرشن بھگتی کے دو مسلمان شاعر (شاہ کاظم قلندر، شاہ تراب قلندر)	شاعر	بمبئی		۴/۱۹۸۹ء	ص ۲۸
ل ازہر	مولانا عبدالمجید سالک[1]	نقوش	لاہور	دسمبر	۱۹۸۸ء	ص ۱۱۴
د البشر	ثلاثۂ غسالہ[2] ـ ایک تعارف	العلم	کراچی	"	۱۹۸۹ء	ص ۱۰۴
تر، ڈاکٹر	کتابیات وجہی	سب رس	"	جولائی	"	ص ۱۷
ا	مشاہیر بھاولپور پر ایک نظر	فنون	لاہور	نومبر، دسمبر	"	ص ۳۶
ین ناصر	آغا عبدالرحیم عرشی گوالیاری	العلم	کراچی	دسمبر	"	ص ۱۱۰
، ڈاکٹر	شفاء الدولہ کی سرگزشت	اردو	"	"	"	ص ۱۰۷

تدریس ــ مسائل و مباحث

	روزنامہ جنگ کراچی ـــ ذریعۂ تعلیم کا مسئلہ	مجلہ کائنات کراچی			۱۹۸۹ء	ص ۱۰۲
یسن قریشی	قومی زبان ذریعہ تعلیم	"	"		"	ص ۳۸
ہیم	اردو ہی ذریعۂ تعلیم کیوں؟	"	"		"	ص ۱۶۸
زالحسن	سائنٹیفک، پرائمر اور سہل ترین طریقہ ہائے تعلیم کی تلاش	ہماری زبان دہلی		۸ر نومبر	۱۹۸۹ء	ص ۱
د اکبر	اردو تعلیم بذریعہ غیر رسمی تعلیم	"	"	۲۲ر نومبر	"	ص ۱۳
باری، ڈاکٹر	اترپردیش میں اردو تعلیم کے مسائل	"	"	" "	"	ص ۷
ن بھٹاچاریہ	اردو والوں کے لیے اردو کلاس	"	"	۸ر اکتوبر	"	ص ۸
ین دسنوی	اردو تعلیم کی اہمیت	"	"	۸ر نومبر	"	ص ۱۲

---

[1] مقالے میں عبدالمجید سالک کے علاوہ ان کے دیگر ہم عصر اکابر ادب کے تذکرے بھی شامل ہیں۔
[2] کے فارسی، اردو اور عربی تذکروں کی فہرست

شہاب الدین دسنوی　اردو داں طبقے کے لیے ذریعۂ تعلیم کا مسئلہ　ہماری زبان دہلی　۲۲ر نومبر ۱۹۸۹ء　ص ۱۶

شیر محمد زماں، ڈاکٹر　خواندگی کا مسئلہ اسلامی تناظر میں　فکر و نظر اسلام آباد　اکتوبر، دسمبر ”　ص ۲۷

صدیقی شبلی، ڈاکٹر　اردو بطور ذریعۂ تعلیم　مجلہ کائنات کراچی　”　ص ۱۱۵

عبدالمغنی، پروفیسر　اردو کی ابتدائی و ثانوی تعلیم کے مسائل　ہماری زبان دہلی　۲۲ر نومبر ۱۹۸۹ء　ص ۵

عمران موسیٰ　نظامِ تعلیم کی تشکیلِ نو　مجلہ کائنات　”　ص ۱۴۶

محمد انعام الحق (علیگ)　پاکستان میں تکنکی تعلیم کا ارتقا　العلم کراچی　دسمبر　”　ص ۴۴

محمد خلیل اللہ، پروفیسر　اردو زبان ذریعۂ تعلیم　مجلہ کائنات　”　”　ص ۱۰۵

مصطفیٰ علی بریلوی　اردو ہماری تعلیمی اور دفتری زبان　العلم　”　دسمبر　”　ص ۳۶

مقبول احمد صدیقی، ڈاکٹر　پاکستان میں فنی تعلیم کا ارتقا　”　”　”　”　ص ۵۱

مہرافشاں عثمانی　دیکھو قومی زبان ذریعۂ تعلیم نہ بننے پائے　مجلہ کائنات کراچی　۱۹۸۹ء　ص ۱۵۹

مرزا میر، پروفیسر　ذریعۂ تعلیم کا مسئلہ　”　”　”　ص ۱۱۹

(جاری)

ماہنامہ
قومی زبان
کراچی

اکتوبر ۱۹۹۰
جلد : ۶۲
شمارہ : ۱۰

مضمون نما

ادارۂ تحریر

جمیل الدین عالی
ادا جعفری
ڈاکٹر اسلم فرخی

مدیر

ادیب سہیل

بدل اشتراک
فی پرچہ ...... ۸ روپے
سالانہ عام ڈاک سے ۹۰ روپے
سالانہ رجسٹری سے ۱۶۲ روپے

بیرونِ ملک
فی پرچہ ...... ایک ڈالر
سالانہ عام ۱۰ پونڈ ۱۵ ڈالر
سالانہ ہوائی ڈاک سے ۱۵ پونڈ ۲۵ ڈالر

انجمن ترقی اردو پاکستان

الحمدللہ
ہماری ۶۶ ویں بیرون ملک برانچ
اوراب کولمبو میں دوسری برانچ کھل گئی ہے۔
سری لنکا
برانچیں:
• نیشنل ڈیولپمنٹ بینک بلڈنگ
۴۰ نادم ماواتھا، کولمبو۔ ۲
• ۱۴۰-۱۴۲ سیکنڈ کراس اسٹریٹ،
پوسٹ بکس، ۱۰۸۸، کولمبو۔ ۱۱
ٹیلیکس۔ ۲۱۲۵۸ ٹیلیفون۔ ۲۸۷۱۳-۵۴۷۸۲۷
توسیع کی سمت گامزن
حبیب بینک لمیٹڈ
ہیڈ آفس: حبیب بینک پلازا، کراچی۔ ۷۵۶۵۰
manhattan

یہ اداریہ جس وقت آپ کی نظر سے گزرے گا، انتخابات ختم ہو چکے ہوں گے مگر اس کی تحریر کے وقت
طرف انتخابات ہی کی گہما گہمی۔ رونق اور چہل پہل ہے۔ شہر۔ قصبے۔ گاؤں۔ دیہات، سب انتخابی
الوں پوسٹروں بینروں اور طرح طرح کے نعروں سے سجے ہوئے ہیں۔ سارا ملک انتخابات میں
گرم عمل ہے۔

ہمیں اس پورے عمل میں جو بات قابلِ ذکر نظر آئی وہ قومی زبان کی ہمہ گیری، ہمہ جہتی، افادیت
بے تعصبی ہے۔ کیماڑی سے پشاور تک انتخابات کی ساری کارروائی قومی زبان میں ہو رہی ہے۔
ے سیاسی رہنما۔ ان کا تعلق کسی بھی جماعت سے ہو قومی زبان میں خطاب کر رہے ہیں۔
ے بڑے جلسے ہو رہے ہیں۔ سندھ۔ پنجاب۔ سرحد۔ بلوچستان ہر صوبے میں جلسے ہو رہے ہیں۔
س نکل رہے ہیں مگر تقریریں بھی قومی زبان میں اور نعرے بھی قومی زبان میں۔ وہی قومی زبان
قومی زبان کا سرکاری منصب دینے میں ہر حکومت نے پہلو تہی کی ہے۔ غفلت برتی
اور طرح طرح کی پابندیاں عائد کی ہیں تاکہ انگریزی کی بالادستی برقرار رہے۔ مگر سرکاری
ناپسند عوامی مزاج اور قومی افادیت پر غالب نہیں آسکتی۔

عوام سے بات کرنا ہو تو قومی زبان میں خطاب ضروری ہے۔ پاکستان کے عوام
زبان ہی کو قومی کاموں کے لیے استعمال کرتے ہیں۔ اربابِ اقتدار اس مسئلہ حقیقت
تسلیم کرنے سے کیوں گریزاں ہیں۔ زبانیں محض سرکاری سرپرستی اور پسند و ناپسند سے ترقی
کرتیں۔ ان کی جگہ عوام کے دل میں ہوتی ہے۔ عوامی سرپرستی زبان کی بقا کی ضامن
ہے بحمداللہ ہماری قومی زبان اردو کو یہ سرپرستی حاصل ہے اور یہی اس زبان
بقا۔ استحکام اور وسعت کا روشن ثبوت ہے۔

نئی کارمینا

نظامِ ہضم کی اصلاح کے لیے زیادہ پُرتاثیر

ہمدرد کی تجربہ گاہوں میں ایک مدت سے عالمی شہرت یافتہ کارمینا کو زیادہ مؤثر بنانے کے لیے تحقیق جاری تھی تاکہ اسے دورِ جدید کے انسان کی ضروریات سے ہم آہنگ رکھا جائے۔ نئی کارمینا اسی تحقیقی عمل کا ماحصل ہے۔ پودینے کے جوہر اور دیگر مفید اجزا کی شمولیت نے نئی کارمینا کو زیادہ قوی اور زود اثر بنادیا ہے۔

نئی کارمینا نظامِ ہضم کو درست رکھنے میں اب پہلے سے زیادہ مفید و معاون ہے۔ خرابیٔ ہضم کی شکایات مثلاً بدہضمی، قبض، گیس، دردِ شکم اور بھوک کی کمی وغیرہ کے لیے اس کی افادیت میں اضافہ ہوگیا ہے۔

نئی کارمینا ... پیدا کرنے ... ہضم درست رکھنے میں ... ہے۔

- دردِ شکم میں نئی کارمینا کی دو ٹکیاں نیم گرم پانی کے ساتھ استعمال کریں۔
- بدہضمی، قے یا متلی کی شکایت میں نئی کارمینا کی دو ٹکیاں چوسیں۔
- نئی کارمینا کی دو سے چار ٹکیاں باقاعدگی کے ساتھ رات کو سوتے وقت نیم گرم پانی سے استعمال کی جائیں تو دائمی قبض سے نجات مل جاتی ہے۔
- بھوک کی کمی کی شکایت میں صبح ناشتے سے پہلے، دوپہر اور رات کے کھانے سے قبل نئی کارمینا کی دو ٹکیاں چوسیے۔
- بچوں کو حسبِ عمر آدھی یا ایک ٹکیہ نئی کارمینا دیجیے۔

خوش ذائقہ نئی کارمینا

ہر گھر کی اہم ضرورت

ہم خدمتِ خلق کرتے ہیں

تحقیق، رُوحِ تخلیق ہے

Adarts

CAR- 5/88

ڈاکٹر اسلم فرخی

نوادر کتب خانۂ خاص

سرگزشت نیپولین بونا پارٹ

جس کو
منشی محمد مشتاق حسین صاحب نے بہ اعانت منشی گلزاری لال صاحب و
بابو گنگا پرشاد صاحب کے کتاب انگریزی مسمیٰ بہ فرنچ ریولوشن
اینڈ نیپولین سے بغرض تائیدِ مقاصدین ٹیفک سوسائٹی علی گڑھ
اردو میں ترجمہ کیا

منشی محمد مشتاق حسین نواب وقار الملک (۱۸۳۹ء - ۱۹۱۷ء) سر سید احمد خاں کے مخلص دوستوں ساتھیوں
گڑھ تحریک کے نامور رہنماؤں میں تھے۔ نواب صاحب کی قومی۔ علمی۔ تعلیمی اور سیاسی خدمات ہماری قومی تاریخ
شان باب ہیں۔ انھوں نے انگریزی حکومت میں معلمی۔ سررشتہ داری۔ منصرمی اور تحصیل داری کے فرائض
دیے۔ حیدر آباد دکن میں ایک طویل عرصے تک خدمات انجام دیں۔ پہلی دفعہ چار سال رہے دوسری دفعہ دس
سال مسلسل خدمت کی۔ ملازمت سے سبکدوش ہونے کے بعد پوری توجہ اور تندہی سے قومی کاموں میں مصروف
مسلم لیگ کے قیام میں نواب صاحب نے نمایاں حصہ لیا اور وہی اس کے پہلے سکریٹری بھی قرار پائے تھے۔ نواب وقار الملک
کے پکے۔ حوصلے اور ارادے کے مضبوط۔ بے خوف اور نڈر۔ بے ریا اور سادہ مزاج انسان تھے۔ جو دل میں وہی زبان
دل کی بات زبان پر لانے میں وہ کسی قسم کی جھجک محسوس نہیں کرتے تھے۔ جس بات کو حق سمجھتے اسے برملا کہتے اور
مخالفت کی پروا نہ کرتے۔

نواب وقار الملک کو علم و ادب سے بھی دلچسپی تھی۔ "تہذیب الاخلاق" میں ان کے مضامین شائع ہوتے رہتے
اپنے عہد کے دوسرے بزرگوں کی طرح وہ بھی علم و ادب کے نئے رجحانات کا فروغ چاہتے تھے۔ روشن خیالی۔
ترقی اور سیاسی بیداری۔ تعلیمی ترقی ان سب کا مقصد تھا۔ اسی مقصد کے لیے یہ بزرگ ساری زندگی کوشاں رہے

سرسید کے عہد میں نثر کے سادہ اور سلیس اسلوب کا رواج اور ترقی انھیں مقاصد کے حصول کا ایک ذریعہ تھی۔

اگرچہ نواب وقارالملک نے مضامین تو بہت لکھے لیکن کوئی مستقل تصنیف ان کی یادگار نہیں ہے۔ صرف "سرگزشت نپولین بوناپارٹ" ایک ترجمہ ہے جو کتاب کے زمرے میں آتا ہے۔ اس ترجمے میں بھی نواب صاحب کی حیثیت ثانوی ہے۔ یہ ترجمہ کیسے وجود میں آیا اور اس کی حیثیت ثانوی کیوں ہے۔ اس کی روداد تو خود نواب صاحب کی زبانی یوں ہے:

"مجھ کو یہ بیان کرنا فرض ہے کہ میں انگریزی سے بالکل ناواقف ہوں اور اس لیے یہ کام بالکل خدا کے فضل اور میرے انگریزی خواں دوستوں کی عنایت سے اختتام کو پہنچا منشی گلزاری لال صاحب اہلکار دفتر ڈپٹی انسپکٹر مدارس علی گڑھ نے ابتدا اس کو انگریزی سے ترجمہ کر لیا اور اس میں ایسی سرگرمی اور محنت ظاہر کی کہ اس کتاب کو انھیں کے شوق اور محنت کا نتیجہ کہنا مناسب ہے۔ بابو گنگا رام پرشاد صاحب رئیس دہلی و سر دفتر انگریزی عدالت ججی علی گڑھ نے جو ایک تاریخ دوست آدمی ہیں اس کتاب کو ترجمے کے لیے منتخب کیا تھا اور پھر انھوں نے ہی اس کے ترجمے کا مقابلہ اور اس کی اصلاح کرائی۔ میں انصاف سے یہ بات کہنے پر مجبور ہوں کہ انھوں نے جو توجہ اس کام پر کی وہ ایسی ضروری تھی کہ اس کے بغیر اس ترجمے کے اوراق ایک کتاب ہو جانے کی قابلیت حاصل نہیں کر سکتے تھے اور چونکہ ہم تینوں شخص اپنے اپنے عہدوں کا کام انجام دینے کے سبب سے اس کام میں اپنا وقت صرف نہیں کر سکتے تھے۔ اس کتاب کا ترجمہ اکثر نو بجے اور گیارہ بجے کے درمیان ایسی گرم راتوں میں ہوا جن میں چراغ کی صورت ناگوار معلوم ہوتی تھی۔ پس جس طرح یہ کتاب مرتب ہوئی اس سے بھی دو نہایت عمدہ نصیحتیں صاحب فکر لوگوں کے واسطے پیدا ہوتی ہیں۔ اول یہ کہ جو کام ایک آدمی کی قدرت سے باہر ہوتا ہے اس کو کئی آدمی مل کر بہت آسانی سے پورا کر سکتے ہیں۔ دوسرے یہ کہ جب انسان اپنے وقتوں کی پوری پوری حفاظت کرے اور ان کو مفید کاموں میں صرف کرنا چاہے تو باوجود نہایت عدیم الفرصتی کے بھی وہ سب کچھ کر سکتا ہے۔"

نواب وقارالملک کا یہ بیان بہت اہم ہے۔ انھوں نے ترجمے کا سہرا اپنے سر باندھنے کی کوشش نہیں کی۔ اپنے دونوں معاونین کے نام بھی سر ورق پر درج کیے اور ان کی اعانت کا بجا طور پر اعتراف بھی کیا۔ ان کا یہ کہنا بھی بالکل درست ہے کہ جو کام تنہا آدمی نہیں کر سکتا وہ مل جل کر TEAM WORK کی طرح بڑی خوش اسلوبی سے انجام پاتے ہیں۔ آج کی علمی دنیا میں سائنسی تحقیق میں یہی رجحان کارفرما ہے۔ علمی اور تحقیقی مقالے کئی کئی عالم مل جل کر مرتب کرتے ہیں۔ مقالے پر سب کے نام ہوتے ہیں اور سب اس تحقیق میں شامل سمجھے جاتے ہیں۔

نواب صاحب کی رائے کا دوسرا حصہ بھی قابل غور ہے۔ انسان نیک نیتی اور خلوص سے جو کام کرنا چاہتا ہے اس کے لیے وقت

نکال لیتا ہے۔ یہ عذر کہ وقت نہیں ہے مصروفیت بہت زیادہ ہے۔ ذمہ داری بہت ہے محض حیلے ہیں۔ مفید کام اپنا وقت خود تلاش کر لیتے ہیں۔
یہ ترجمہ ۱۳ مئی ۱۸۷۰ء کو علی گڑھ میں شروع ہوا تھا۔ نواب صاحب ان دنوں علی گڑھ میں منصرم تھے۔ اس زمانے میں نپولین سوم فرانس کا شہنشاہ تھا۔ ترجمہ جاری تھا کہ ۱۵ جولائی ۱۸۷۰ء کو فرانس اور جرمنی میں جنگ شروع ہوئی۔ ۱۳ اگست ۱۸۷۰ء کو ترجمہ ختم ہوا اور ستمبر ۱۸۷۰ء میں نپولین سوم کے اقتدار کا خاتمہ ہو گیا۔ اور ۱۸۷۱ء میں جرمنی کی فتح مند فوجیں پیرس میں داخل ہو گئیں۔ یہ ترجمہ پہلی مرتبہ ۱۸۷۱ء میں نول کشور پریس لکھنؤ سے شائع ہوا۔ اکتوبر ۱۸۹۷ء میں اس کی دوسری اشاعت ہوئی۔ یہی دوسری اشاعت کتب خانۂ خاص میں موجود ہے۔

سرگزشت نپولین بوناپارٹ سائنٹفک سوسائٹی علی گڑھ کے لیے ترجمہ کی گئی تھی۔ نواب صاحب نے دیباچے کی ابتدا میں نپولین سے اپنی دلچسپی کا اظہار کیا ہے اور عام پڑھنے والوں کے لیے نپولین کی زندگی اور کارناموں سے کچھ سیکھنے اور حاصل کرنے پر زور دیا ہے۔ ان کے بقول "اس کتاب سے ہمت۔ استقلال اور دانائی حاصل ہوتی ہے"۔
نواب صاحب کے عہد میں قدیم و جدید کی کشمکش بڑھتی جا رہی تھی۔ مسلمان اپنی دینی اور علمی روایت سے بے بہرہ ہو رہے تھے۔ نواب صاحب نے دیباچے میں بہت واضح انداز سے لکھا ہے:

> "یہ بات اس کتاب کی گویا ہر مقام سے ثابت ہے کہ بچپن میں بچوں کو مذہبی تعلیم سے محروم رکھنا ان کے لیے سم قاتل ہے۔ یہ بات بھی اس کتاب سے بہت اچھی طرح ثابت ہوتی ہے کہ ماؤں کے تعلیم یافتہ اور مہذب ہونے سے اولاد کی تعلیم بہت خوبی اور آسانی سے ہوتی ہے۔"[۱۹]

یہ دونوں نکتے آج بھی قابلِ غور ہیں۔ آج مذہبی تعلیم کا تو شور بہت ہے لیکن حقیقی مذہبی تعلیم نایاب ہے۔ مائیں تعلیم یافتہ اور مہذب ہو گئی ہیں مگر اب تعلیم یافتہ اور مہذب مائیں بہ نفسِ نفیس اولاد کی پرورش اور نگہداشت نہیں کرتیں۔ یہ سارے کام اجرت پر ہوتے ہیں۔[۲۰]
نواب وقار الملک نے ترجمے کی زبان و بیان پر بڑی محنت کی ہے۔ یہی ان کا اصل کارنامہ ہے۔ ترجمے کو ایک سو بیس برس گزر گئے لیکن زبان و بیان اتنا صاف اور سلیس ہے کہ قدامت کا کوئی احساس نہیں ہوتا۔ نواب صاحب نے کتاب میں لکھا ہے "نپولین کے حالاتِ زندگی سے ایک طور پر ہم کو یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ دنیا کے کاروبار میں جب مذہبی پابندی کا دخل نہیں ہوتا تو ان کاموں کا انجام نہایت خراب ہوتا ہے جیسا نپولین کا ہوا۔ اس کو خداوند تعالیٰ نے اگرچہ نہایت عمدہ و اعلیٰ لیاقتیں عطا فرمائیں اور بہت بڑے بڑے موقعے اس کو خدا کے فضل و برکت کے شکر ادا کرنے کے حاصل ہوئے اور خدا نے ان کو اس قابل کیا کہ انسانوں کی آسائش اور خوشی کو طرح طرح سے ترقی دے سکے لیکن افسوس ہے کہ اس نے اس عمدہ بخشش کو بالکل ضائع کر دیا اور بہت خود غرضی اور دوں ہمتی کو کام میں لایا اور تمام تر اپنی بے بہا زندگی کو اسی دنیائے دوں کے حاصل کرنے میں برباد کیا اور اسی قسم کے سب لوگوں کو اپنے ان اعمال کا بدلہ جلد یا بدیر مل جاتا ہے۔ نپولین کو بھی وہی روزِ سیاہ پیش آیا۔"
کیا یہ بیان ہم سب کے لیے لمحۂ فکریہ نہیں ؟

مختار زمن

ابوالفضل صدّیقی کے ناول "ترنگ"

ریاض خیرآبادی کا کلیات اٹھا کر دیکھیے تو ورق ورق پر جام و مینا سجے نظر آئے۔ شراب کے موضوع پر شاید کسی شاعر نے اتنے
تعدد، متنوع اور پر لطف شعر کہے جتنے ریاض نے کہے ہیں۔ مگر لطف یہ ہے کہ موصوف نے کبھی ایک قطرہ بھی نہ چکھی۔ بے پیے ہی مخمور رہے۔
ف تخیل کا زور مشاہدے کی قوت اور قلم کی طاقت تھی جس نے ان سے ایسے شعر کہلوائے کہ پڑھ کر نشہ ہو جائے۔ کچھ اسی طرح کا
ن ابوالفضل صدّیقی مرحوم کا ہے کہ انھوں نے اپنی ۷۸ سالہ زندگی میں کوئی نشہ نہیں کیا لیکن منشیات اور اس کے اثرات کے بارے
ں ایسا ناول لکھ گئے جو لاجواب ہے۔ اکثر کہانیوں اور ناولوں میں شرابیوں کے کردار تو نظر آئیں گے لیکن میں نے اردو میں
ئی ایسا ناول نہیں پڑھا جس کا موضوع ہی منشیات ہو۔

ناول کا نام "ترنگ" بھی بڑا بلیغ اور معنی خیز ہے۔ ترنگ جس میں کیف و سرخوشی کے ساتھ ساتھ بے خودی اور بدمستی
پہلو بھی نکلتا ہے ــــ صدیقی صاحب نے یہ ناول غالباً بیس پچیس برس پہلے لکھنا شروع کیا تھا۔ اکثر وہ اس کا ذکر کیا کرتے
تھے۔ ان کی زندگی ہی میں اس کی چند قسطیں "نیا دور" میں شائع بھی ہوئی تھیں لیکن پورا ناول اب ان کے انتقال کے بعد شائع
ا ہے ــــ میں نے ایک دفعہ مرحوم سے پوچھا کہ نہ آپ نے کبھی شراب پی، نہ افیم کھائی، نہ چرس اور گانجے سے آشنائی رہی اس لیے
ن مسائل پر آپ جو کچھ لکھیں گے وہ محض شنیدہ ہوگا اور شنیدہ کے بود مانند دیدہ ؟

کہنے لگے "بس میاں، دیکھو ابھی تو شروعات ہے، لکھ چکے تو پھر دیکھنا۔ میں نے نشہ نہیں کیا۔ نشہ باز تو دیکھے ہیں۔ بس۔"

ان کے کرم ہائے بے پایاں نے مجھے گستاخ کی حد تک بے تکلف بنا دیا تھا۔ میں نے پوچھا "اچھا آج سچ مچ بتائیے کبھی
لڑکی بیٹھی سے یاد اللہ رہی ہے؟" ــــ اپنے مخصوص مشفقانہ اور بزرگانہ انداز سے مسکرائے اور بولے "لاحول ولا قوۃ"
یاں کیا کہہ رہے ہو؟ شراب کو کبھی منہ نہیں لگایا" پھر قدرے توقف کے بعد بولے۔ "ہاں ایک دفعہ انجانے میں ٹھنڈائی
لی لی تھی" میں چونکا۔ تفصیل پوچھی تو بتایا کہ وہ اپنے کسی دوست کے ساتھ بریلی گئے تھے۔ وہ حضرت شوقین اور قدرے
رے آدمی تھے۔ گرمی کا زمانہ تھا۔ انھوں نے کہا کہ چلو شربت کا ایک گلاس پئیں۔ مذاق ہی مذاق میں انھوں نے دکاندار کو اشارہ
کے صدّیقی صاحب کے گلاس میں تھوڑی سی بھنگ ملوا دی ــــ ایک ہی دو گھونٹ پیے ہوں گے کہ بقول نظیر اکبرآبادی یہ حالت

ہوگئی ـــ پی عاشقوں میں جاکر دو بنگ کے پیالے جوایک دم میں تیرا گھر گھومے چھپر یا لے

صدیقی صاحب پر اصلیت کھلی تو بہت ناراض ہوئے۔ قے کی۔ الائچی ڈال پان کھایا تب کہیں جاکر طبیعت سنبھلی اور نشہ کی لت سے جو جبلّی نفرت تھی وہ دوچند ہوگئی ـــ افیم سے ان کا تعلق اس قدر تھا کہ یوپی گورنمنٹ کی طرف سے اور زمینداروں کی طرح انھیں بھی ایک نپے تلے محدود علاقے میں افیون کی کاشت کی اجازت ملی ہوئی تھی۔ سرکاری "اوپیم افسر" اس کی باقاعدہ جانچ پڑتال کرتے تھے ـــ صدیقی صاحب کہا کرتے تھے کہ پوست کے پودوں پر پھول کھلتے ہیں تو بڑی بھینی بھینی خوشبو نکلتی ہے۔ اکثر وہ صبح صبح کھیت کے کنارے کسی درخت کے نیچے چارپائی ڈلوا کر بیٹھ جاتے۔ وہاں صورت یہ تھی کہ ع ہے ہوا میں شراب کی تاثیر۔ کچھ دیر بعد غنودگی طاری ہونے لگتی ـــ کہتے تھے کہ اگر رات کو کوئی بھولا بھٹکا ہرن پوست کے کھیت میں چرنے آجاتا تو صبح تک "دانشا غفیل" ہو کر جھومنے لگتا اور بلا تگ ودو ہاتھ لگ جاتا ـــ ناول میں اس معاملے کی طرف اشارات ہیں ـــ

صدیقی صاحب کی اکثر کہانیاں واقعات پر مبنی ہوتی ہیں۔ اس لیے عین ممکن ہے، بلکہ گمان غالب ہے کہ "ترنگ" میں ناول کے پیرائے میں جو کچھ بیان کیا گیا ہے اس کا ڈھانچہ اصل زندگی سے لیا گیا ہے۔ گو انھوں نے خود کوئی نشہ نہیں کیا لیکن اپنی خورد بینی اور دوربینی نگاہوں سے نشہ بازوں کو دیکھا۔ افراد اور سماج پر نشہ کے اثرات کا تجزیہ کیا۔ نشہ کی تباہ کاریوں کو پرکھا ـــ یہ تو رہا ناول کا ڈھانچہ اور اس پر ان کے تخیّل کے رنگ، زندگی کے تجربے، کرداروں کے گہرے مطالعے اور جاندار بولتے ہوئے قلم نے گوشت پوست چڑھا کر ناول کو زندہ، چلتے پھرتے آدمیوں کا مجمع بنا دیا۔

مختصراً "ترنگ" کا قصّہ یہ ہے کہ روہیل کھنڈ کے گاؤں چوہان گڑھ میں شیوراج سنگھ چوہان ایک بڑا، موروثی دخیل کار کاشتکار رہتا ہے۔ اگرچہ وہ کاشتکار کہلاتا ہے لیکن قانون کی رو سے زمیندار اسے زمین سے عام حالات میں بے دخل نہیں کرسکتا۔ لگان بہت کم ہے۔ اس لیے وہ خود ہی تقریباً زمیندار کی حیثیت رکھتا ہے۔ محنتی اور منتظم آدمی ہے۔ گھر میں اناج کی کوٹھیاں بھری ہوئی ہیں۔ دروازے پر گھوڑے اور گائے بیل بندھے ہوتے ہیں۔ اس کا اکلوتا بیٹا ہرپال سنگھ ہے۔ جوان رعنا، کسرتی بدن، مضبوط کاٹھی، بے حد محنتی، نہایت سعادت مند، باپ کا مضبوط دست راست نہایت عمدہ شہسوار، پورے علاقے میں اپنی قوت، پہلوانی اور شہسواری کے لیے مشہور ـــ شیوراج سنگھ کے یہاں استاد شہامت خاں چابک سوار ملازم ہے۔ وہ گھڑسواری سکھانے، گھوڑوں کو سدھانے، نکالنے اور ان کی دوا دارو کا ماہر ہے۔ اس نے ہرپال سنگھ کو شہسواری میں طاق کیا ہے ـــ مگر اسے کوکین کھانے کی عادت ہے۔ ایک دن نوجوان ہرپال اسے شیشی سے نکال کر ایک سفید سفوف پان میں ڈال کر کھاتے ہوئے دیکھ لیتا ہے۔ ضد کر کے چابک سوار سے خود بھی تھوڑا سا لے کر کھاتا ہے۔ پھر رفتہ رفتہ اسے کوکین کی عادت پڑ جاتی ہے۔ غالباً شہامت خاں چاہتا بھی یہی تھا گو بظاہر وہ "نانا" کرتا رہا مگر دراصل وہ خفیہ فروشی کرتا ہے ـــ ہرپال کو جب کوکین کا چسکا پڑ جاتا ہے تو شہامت خاں اسے تاما عدہ کوکین سپلائی کرنے لگتا ہے، اور اس طرح ایک کے چار بناتا ہے۔ اس عادت سے ہرپال کے پورے کردار پر منفی اثرات مرتب ہونے شروع ہو جاتے ہیں۔ نشہ بازی کی خاطر وہ چوری تک کرنے ڈالتا ہے۔ ایک رات اپنی بیوی

ی) چرا لیتا ہے۔ ایک طرف تو اس کا بلند کردار گرتا چلا جاتا ہے۔ دوسری طرف کوکین اس کے جسم کو
ع کر دیتی ہے۔ باپ کو بیٹے کی حالت دیکھ کر پریشانی لاحق ہوتی ہے۔ ایک دیہاتی وید جو دیہات کا چکر لگایا
راج کو بتاتا ہے کہ اس کے بیٹے کو کوکین کی لت پڑ چکی ہے، چنانچہ ٹھاکر غصے میں آکر شہامت خاں کو یہ یک
ں نکال دیتا ہے۔ وید جی جو خود شیطان کے چیلے ہیں، دوا کے پردے میں ہرپال کو افیون کی گولیاں دینے
سے افیون کی لت میں پھنسا کر پیسہ بنانے لگتے ہیں۔ مگر پولیس ان کے پیچھے لگی ہوئی ہے ــــ وہ آج کل کی
ہیں۔ بری تو تھی مگر کچھ نہ کچھ فرائض بھی انجام دیتی تھی ــــ وید جی پکڑے جاتے ہیں اور پولیس ہرپال سنگھ
ں دیتی ہے۔ مگر افیون اسے بالکل ناکارہ کر دیتی ہے ــــ اسی اثنا میں ایک سادھو جی گاؤں میں آ نکلتے ہیں
معاشوں کے ایک بین الاقوامی گروہ کے رکن ہیں۔ اپنے تقدس کا رعب جما کر عورتوں کے گنڈے ٹونے کرنے کے بہانے
ـــ لیتے ہیں اور بھیک منگوا کر چھوڑتے ہیں۔ وہ عورتوں کو بھگانے کا بیشہ بھی کرتے ہیں۔ گاؤں کی دو جوان
ے ہتھے چڑھ جاتی ہیں جن میں سے ایک شیوراج سنگھ کی بہو یعنی ہرپال سنگھ کی بیوی بھی ہے۔ پولیس سادھو جی
وئی ہے مگر ہرپال ہر شئے سے بے پروا اپنے ہی نشے کی فکر میں ہے۔ اس کی ملاقات و بے تکلفی اس دوران
ری لال پٹواری سے ہوتی ہے۔ منشی جی کے ذریعے اس کا تعارف شراب سے ہوتا ہے۔ قصہ مختصر یہ کہ نشہ بازی
ہ حاصل کرنے کے لیے غلے کی چوری، پولیس کا نرغہ، صحت کا زوال، ہرپال سنگھ کو گراوٹ کی آخری حدوں
اہے۔ اس کے گردے خراب ہو جاتے ہیں۔ وہ جیل میں بند کر دیا جاتا ہے۔ اس کا باپ شیوراج سنگھ ان
وڑی کوڑی کا محتاج ہو جاتا ہے ــــ اور آخر کار بیٹا جیل میں گردوں کی خرابی کے باعث مر جاتا ہے۔
سیکڑوں میں کھیلتا تھا، بڑھاپے میں کھیت مزدور بننے پر مجبور ہو جاتا ہے ــــ اور پھر وہ بھی ختم ہو جاتا
رشوہر کی موت کے بعد ہرپال کی جوان بیوہ اپنے بچے کی خاطر سلائی کا کام شروع کر دیتی ہے۔ اس کا گھر تو
ھا۔ وہ ایک چھوٹی سی کوٹھری میں منتقل ہو جاتی ہے۔ پھر ایک دن بڑے زور و شور سے طوفان آتا ہے تو
ں ڈھے جاتی ہے۔ چاروں طرف پانی ہی پانی ہے۔ اس سیلاب میں ہرپال سنگھ کی بیوہ آخری دم تک اپنے بچے
بچانے کے لیے پانی کے ریلوں سے لڑتی رہتی ہے ــــ وہ خود ختم ہو جاتی ہے مگر لڑکا بچ جاتا ہے ــــ آخر ہرپال کا
ایت اعلیٰ کردار کا دوست اسے اپنی پناہ میں لے لیتا ہے۔ نشہ بازی، مفلسی، جرائم، بے چارگی ــــ اور
پھر ان سب کے بعد یہ بچہ نئی زندگی کا نقیب بنتا ہے۔

ہر یہ کہانی سیدھی سادی ڈگر پر چلتی نظر آتی ہے لیکن یہ ڈگر بڑی پُرپیچ اور گڈھب ہے۔ معاشرے کا کوئی پہلو
رسے نہیں بچا۔ ناول میں کیا نہیں ہے؟ تاریخ کا پس منظر ہے، زمین سے متعلق قوانین ہیں، کسان، زمیندار،
کارندے، دکھ اور ان کے عمل و ردعمل کی روئیداد ہے۔ چوہان اور ٹھاکر کون ہیں؟ ان کی کیا خصوصیات
، سے ان کا کیا تعلق تھا؟ حافظ رحمت خاں کے خاندان نے خود ہمارے علاقہ سوات سے جا کر روہیل کھنڈ میں
کی۔ اس سلطنت کی اقدار کیا تھیں؟ کیا وجہ تھی کہ ہندوؤں نے حافظ جی کی مورتیاں گھروں میں سجا رکھی تھیں؟

صدّیقی صاحب مرحوم نے خود مجھ سے یہ واقعہ بیان کیا تھا کہ ایک دن وہ اپنے ایک ٹھاکر دوست کے یہاں گئے۔ وہاں دیوی دیوتاؤں کی کئی مورتیاں رکھی تھیں۔ ایک مورتی کسی ڈاڑھی دار آدمی کی تھی۔ صدیقی صاحب نے پوچھا "ٹھاکر یہ کون سا دیوتا ہے ڈاڑھی والا" اس نے کہا "ارے انھیں نہیں پہچانتے؟ یہ ہمارے حاجی جی ہیں"۔ ہندو یا متھالوجی یا علم الاصنام سے صدیقی صاحب کو کافی واقفیت تھی۔ اس کتاب میں یہ پہلو بھی نظر آئے گا۔۔۔ گھڑسواری اور گھوڑوں کے بھی ماہر تھے۔ شہامت خاں چابک سوار کی زبانی گھوڑوں کی اقسام و عادات کا ایسا تفصیلی ذکر ہے جو رفیق حسین مصنف "آئینۂ حیرت" کے علاوہ شاید ہی کوئی اور اردو کا مصنف لکھ سکتا ہے۔ ہندو معاشرے میں ذات پات کے نظام کا حال تو سرسری طور پر سب ہی جانتے ہیں لیکن شودروں میں ذیلی ذات بھی ہوتی ہے جو برہما کے میل اور پسینے سے پیدا ہوئی۔ ناول کا کردار دھرم داس گھیا اسی ذات سے تعلق رکھتا ہے۔ اس کا کردار بھی اسی قدر میلا ہے۔ وہ کوڑیوں کے مول سُور کی چربی خریدتا ہے اور گھی میں ملاوٹ کر کے سیکڑوں روپے بناتا ہے ــــ یہ تو ہم سنتے آئے ہیں کہ سُنار زیور گڑھتے وقت سونا چُرا لیتے ہیں لیکن دھونکنی اور پھُنکنی کے بل پر سونا کس طرح اُڑایا جاتا ہے یہ ترکیب آپ کو اس ناول سے معلوم ہوگی۔ وکیلوں اور قانون سازوں کو یہ جان کر دلچسپی ہوگی کہ صدّیقی صاحب ان کے سب گر جانتے تھے۔ وہ بتاتے ہیں کہ کتابوں میں قانون تو لکھا ہوتا ہے لیکن روزمرّہ کی زندگی میں اس کی کس طرح گت بنتی ہے اور کیا کیا چالاکیاں کی جاتی ہیں۔ میں نے یہ اشارے اس لیے کیے ہیں کہ ان سے معاشرے کے متعلق صدّیقی صاحب کے وسیع علم اور انسانی فطرت کے گہرے مطالعے کا پتا چلتا ہے۔ وہ ان معاملات کو قصّے میں اس چابک دستی سے پروتے ہیں کہ کہانی بالکل حقیقت معلوم ہونے لگتی ہے۔ ان کے کردار ان کے ہاتھ میں کٹھ پتلیاں نہیں ہیں، نہ وہ انھیں چلاتے پھراتے دوڑاتے ہیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ کردار خود ہی اصل زندگی کی طرح چلتے پھرتے، ناچتے گاتے، لڑتے بھڑتے، مارتے مرتے، نیکیاں بدیاں محبت و نفرت کرتے ہیں۔ اس لیے ہر عمل اور اس کا ردِّ عمل، موقع محل اور کردار کو دیکھتے ہوئے وہی ہوتا ہے جو عام زندگی میں ہوا کرتا ہے۔ یہ کہنا مبالغہ نہیں ہوگا کہ ناول کے کردار انھوں نے نہیں خود قدرت نے تخلیق کیے ہیں۔ انھوں نے تو کرداروں کی کارگزاریوں یا کرتوتوں کی فلم بنا کر آپ کو دکھلا دی ــــ

ابوالفضل مرحوم کا طرزِ بیان منفرد، خالصتاً ان کا اپنا اور آج کے عام پڑھنے والوں کے لیے قدرے مشکل ہے ایک تو یہ کہ وہ بات کو پھیلا کر بیان کرنے کے عادی ہیں۔ تحریر میں جملہ ہائے معترضہ، سیاق و سباق کا مفصّل پس منظر اور ان کے اردگرد بولے جانے والے مقامی الفاظ اور محاوروں کے کلی پھندنے لگے ہوتے ہیں۔ وہ دریا کو کوزے میں بند نہیں کرتے بلکہ دریا سے کوزے بھر بھر کر بار بار چھلکاتے رہتے ہیں۔ جس طرح سیاہ کافی، بکّے گانے، باجرے کی روٹی اور سرسوں کے ساگ کا اصل مزہ حاصل کرنے کے لیے ان چیزوں کا مذاق پیدا کرنا پڑتا ہے، اسی طرح صدّیقی صاحب کی نثر کا صحیح لطف اٹھانے کے لیے قاری کی گرہ میں ان کے بیان کردہ معاشرے اور زبان کا کچھ نہ کچھ علم ہونا ضروری ہے۔ اسی وقت ان کی بلاغت کا راز کھلتا ہے ــــ ناول روہیل کھنڈ کے اس ماحول کا عکاس ہے جو انگریزی راج میں چالیس برس پہلے تک وہاں نظر آتا تھا۔ یقیناً پچھلے برسوں میں، خصوصاً آزادی کے بعد وہاں بھی کچھ تبدیلیاں آئی ہوں گی ــــ

لیکن انسانی فطرت میں تو شاید اتنی جلد کوئی تبدیلی نہیں ہو سکتی ــــ صدیقی صاحب سے ایک دفعہ میں نے پوچھا کہ بعض لوگ آپ پر یہ اعتراض کرتے ہیں کہ پاکستان میں بیٹھ کر بھی آپ ہمیشہ اسی ماحول کی کہانیاں لکھتے ہیں جو پاکستان کے اکثر قاریوں نے دیکھا تک نہیں۔ انھوں نے کہا "دیکھو میاں، میں اسی ماحول کو اچھی طرح سمجھتا ہوں جہاں میری آدھی عمر گزری، میرا علم اس کے متعلق فرسٹ ہینڈ ہے ــــ بس ــــ"۔ میں یہ بھی سمجھتا ہوں کہ یہ اعتراض پھُس پھُسا اور سخت بے زار دینا ہے۔ پیرس میں بیٹھ کر پیئر لوئی نے قدیم مصر کے بارے میں لکھا جسے کسی نے نہیں دیکھا۔ شیکسپیر نے اٹلی اور یورپ کے بارے میں تمثیلیں لکھیں۔ یہ سب فطرتِ انسانی کے نباض تھے ــــ لیکن ایمل زولا نے جب کان کنوں کے بارے میں ناول لکھا تو چھ ماہ تک کان کنوں کے ساتھ رہ کر مزدوری کی ــــ یہ حقیقت پسندی کا دور تھا۔ اکثر ناول نگاروں نے اسی معاشرے، ماحول، اور کرداروں کے متعلق لکھا جنھیں آپ نہ جانیں وہ ضرور جانتے تھے۔ آج آپ امریکہ، روس انگلستان کے بارے میں کہانیاں پڑھتے ہیں تو آپ روہیل کھنڈ کے متعلق کیوں نہیں پڑھ سکتے؟ بلکہ یہ کہنا غلط نہیں ہوگا کہ ابوالفضل صدیقی کو اپنے فن سے خلوص تھا۔ اسی لیے وہ صرف ان چیزوں کے متعلق لکھتے تھے جن کے بارے میں ان کا علم وسیع اور رشتہ بدرہ گہرا تھا ــــ ان کا رویہ عبدالحلیم شرر کا سا نہیں تھا جو اسپین نہیں گئے مگر اس کے بارے میں ناول لکھ دیا۔ میں تو یہ کہنے کی بھی جرأت کروں گا کہ کسی کو ادیب سے یہ کہنے کا حق نہیں کہ فلاں چیز پر لکھو فلاں پر نہ لکھو۔ اسے مکمل آزادیٔ اظہار دیجیے۔ پھر دیکھیے کہ اظہار کس ڈھب کا ہوا۔ اگر پسند آئے تو پڑھیے ورنہ چھوڑ دیجیے۔ ان کے یہاں بہت سے الفاظ مقامی ہیں۔ مگر وہ لکھے گئے اور اب وہ ہمارا سرمایہ اور دولت ہیں، انھیں ضائع کیوں ہونے دیں؟

صدیقی صاحب اپنے ماحول کے پروردہ تھے۔ وہ تشبیہیں بھی ماحول اور موقع کی مناسبت سے لاتے ہیں۔ مثلاً "بلا سے سونے کی تنگڑی (ایک زیور) گئی، سونا سی گھوڑی گئی، چڑھی ہوئی تربینی سی ماں اور ہمالہ بندھیاچل سا باپ گیا، گلاب سا بیٹا اور جوگی سی بیوی گئی، اور ہاتھی سا ڈیل ڈول اور تندرستی اور چیتے کی سی پھرتی اور طراری کس شمار قطار میں تھی" ــــ وہ دیہات کے ماحول کے عاشق ہیں۔ ان کے یہاں "ابنوس سی بھینسیں اور صندل سی گائیں ہوتی ہیں، اور بجلی کی طرح گھوڑیاں اور گھوڑے لہرایا ٹھنٹھنایا کرتے ہیں۔"

صدیقی صاحب کے یہاں ایک ملیح طنز اور زندگی پر تنقید و تبصرہ بھی ملے گا اور آپ کو اندازہ ہو جائے گا کہ وہ کن اقدار کے حق میں ہیں اور کس امر کے نکتہ چیں ہیں ــــ لیکن وہ چیختے، دھاڑتے، قلم سے خون ٹپکاتے، منھ سے کف اڑاتے، جذباتی، نعرہ باز افسانہ نگار نہیں ہیں ــــ "ترنگ" میں انھوں نے بڑی چابک دستی سے نشہ بازی کی جس طرح مذمت کی ہے کہ لاکھوں الفاظ کے سرکاری پمفلٹ اور تقریریں بھی اس طرح نہیں کر سکتیں۔ ان کی طنز کی کاٹ کا پتا کرداروں کے حلیے کے بیان سے بھی چل جاتا ہے۔ مثلاً "پنڈت گیان چند" قطعاً انگوٹھا ٹیک برہمن" جس وقت ڈھیلی ڈھالی سفید براق دھوتی، لٹکی ہوئی دپھتوئیں، پہن کر ... اپنی مرگلی ٹٹیا پر سوار ہو کر جاتے تو جیسے معلوم ہوتا کہ سرسوتی دیوی نے پنڈت جی کے شریر میں روپ دھار لیا ہے!" ــــ اسی طرح دھنتر وید جن کا کٹھ واتیل ملا ہوا سیاہ تاریک رنگ تھا اور گول مٹول چہرہ تھا جس پر کنپٹیاں، جبڑے، ناک سب ایک لیول میں تھے۔

اور ناک کا پتا بیچوں بیچ بیں دو سوراخوں سے چلتا تھا۔" یہ صاحب "کنکر ہضم، پتھر ہضم، لوہا بھسم" دوائیں بیچتے تھے ۔۔۔ ناول ایک دنیا ایسی ہوئی ہے۔ میرے پاس وقت نہیں کہ میں پٹواری، زمیندار کے کارندوں، پولیس والوں کے ہتھکنڈوں، ذات کی اونچ نیچ پر بحث کروں اور چوپالوں کی روایتی لاگ ڈانٹ۔ اچھوتوں کے ذہنی اور معاشرتی رویوں کا تذکرہ کروں۔ صرف اتنا عرض کروں گا کہ بنیادی طور پر اس ناول کا مقصد منشیات کی تباہ کاریاں دکھلانا ہے۔ نشہ نہ صرف ایک جوان سال، محنتی، طاقت ور اور چست و چالاک نوجوان کو ہڈیوں کا پنجر بنا کر موت کی نیند سلا دیتا ہے، بلکہ اس کالو کردار بدل کر رکھ دیتا ہے۔ خاندانی اعلیٰ اقدار کو نشہ کی لت رفتہ رفتہ ملیا میٹ کر ڈالتی ہے اور ایک بھرا پرا خوش و خر گھرانا ختم ہو جاتا ہے ۔۔۔ جب یہ ناول لکھا گیا تھا اس وقت آج کل کی قاتل ہیروئین موجود نہیں تھی۔ صدیقی صاحب نے جن روایتی نشوں کو بیان کیا ہے وہ تو اب پرانے فیشن کے معمولی نشے ہو گئے۔ غور کیجیے کہ حشیش و ہیروئین کا یہ دور کتنا بھیانک اور لرزہ بر اندام کر دینے والا سامان بربادی لیے ہوئے ہے۔ مگر پچاس سال پہلے کا نقشہ آج بھی سبق آمو ہے۔ یہ ناول، نارکوٹک کنٹرول ڈپارٹمنٹ کے سارے لٹریچر پر بھاری پڑتا ہے اور اس کا مصنف بعد از مرگ انعام کا مستحق ہے۔

محمد سلیم الرحمٰن

ممتاز شیریں کے خطوط
محمد سلیم الرحمٰن کے نام

ممتاز شیریں صاحبہ سے خط وکتابت کا سلسلہ صرف ۱۹۶۳ء تک محدود ہے۔ جہاں تک یاد پڑتا ہے ان کا ایک خط اور بھی تھا۔ میں نے ان کے مضامین کے مجموعے "معیار" پر "پاکستان ٹائمز" میں تبصرہ کیا تھا۔ تبصرے کے حوالے سے دو ایک باتوں کی وضاحت کے لیے انھوں نے مجھے خط لکھا تھا۔ اب جو تلاش کرنا چاہا تو نہیں ملا، شاید کبھی مل جائے۔

خطوط کے متن کو جوں کا توں پیش کیا گیا ہے۔ نہ تو شیریں صاحبہ کی اوقاف نگاری کو چھیڑا ہے نہ ہجوں کو۔ اسی لیے ان خطوں میں کہیں "میانشن" اور "بیاسنرناک" لکھا نظر آئے گا۔ اور کہیں "مینشن" اور "پاسترناک"۔ البتہ جہاں انھوں نے دو لفظوں کو ملا کر لکھ دیا تھا جیسے "آپکو" انھیں الگ لکھا گیا ہے۔ یہ خطوط نقل کرتے ہا تھا تو خیال آیا کہ ہماری ادبی شخصیات کے نہ جانے کتنے مکاتیب ابھی غیر مطبوعہ موجود ہوں گے۔ اگر ادھر ادھر کے تنقیدی مضامین اور معمولی ترجموں کے بجائے ان خطوط کو حاصل کر کے ہر ماہ بالالتزام چھاپا جائے تو بدرجہا بہتر ہو۔

م۔ س

۸۔ ایف گپتا میانشن
نیو ڈیپلازا، کراچی ۳

۲؍ فروری ۱۹۶۳ء

مکرمی سلام مسنون

آپ کا خط مل گیا تھا "میگھ ملہار" کا پیپر بیک ایڈیشن ابھی ابھی آیا ہے۔ خاص ایڈیشن ختم ہو گیا۔ جیسے ہی پبلشرز سے مجھے پیپر بیکز کی کاپیاں ملیں، میں نے آپ کو دو کاپیاں بھجوادی ہیں، امید کہ اب تک مل گئی ہوں گی۔ یہ میں نے آپ کے مکتبۂ جدید کے پتے پر بھجوائی ہیں۔ اگر یہ کاپیاں پاکستان ٹائمز کو دینی ہیں تو اندراو کرم دے دیجیے گا۔ یا ایک جلد آپ رکھیں اور ایک پاکستان ٹائمز کے دفتر میں پیش کر دیں۔ عنایت ہوگی۔ میں نے آپ کو براہِ راست کتاب اس لیے بھیجی ہے کہ شاید پاکستان ٹائمز کے توسط پہنچنے میں دیر ہو جائے۔

آپ کے تبصرے کی منتظر رہوں گی۔

میں نے "دن اور داستان" پر آپ کا تبصرہ پاکستان ٹائمز میں پڑھا تھا۔ پسند آیا تھا خصوصیت سے "دن" کے بارے میں آپ نے جو باتیں کہی ہیں وہی مجھے بھی سوجھی تھیں۔ اس کا APPRECIATION بالکل صحیح ہے البتہ "جل گرجے" کے بارے میں مجھے آپ سے اختلاف ہے۔ داستان کی طرف واپسی کے سلسلے میں انتظار حسین صاحب نے جتنی بھی کوششیں کی ہیں۔ میں سمجھتی ہوں کہ "جل گرجے" ان میں سب سے کامیاب کوشش ہے۔ پہلی دفعہ "جل گرجے" پڑھ کر مجھ پر عجیب اثر ہوا تھا۔ یہ ۱۹۵۷ء کی بات تھی۔ اس زمانے میں غدر (جنگ آزادی) کے بارے میں پڑھنے کا جنون سا ہو چلا تھا اور میں نے اس موضوع پر بہت کچھ پڑھا تھا۔ تاریخی اور نیم تاریخی کتابیں، لیکن اس سلسلے میں "جل گرجے" کی خالص فن اور تخلیقی کاوش کا تاثر کچھ اور ہی تھا۔ اس افسانے میں انتظار حسین نے تو واقعی جادو جگایا ہے۔ پرانی داستان کو اپنے غدر سے ملایا ہے اور نئے معنی پیدا کیے ہیں۔

میں نے "نصرت" کے لیے بھی "میگھ ملہار" کی ایک جلد بھیجی ہے۔ اس سے پہلے بھی حنیف رامے صاحب کے نام ایک جلد بھیجی تھی اور تبصرے کے لیے انھوں نے غالباً یہ جلد مظفر علی سید صاحب کو بھجوائی ہے۔ اگر کسی وجہ سے مظفر صاحب تبصرہ نہ کر سکیں یا انھیں وقت نہ ملے تو ازراہ کرم "نصرت" میں بھی "میگھ ملہار" پر تبصرہ آپ ہی کر دیجیے گا۔

امید آپ مع الخیر ہوں گے

نیاز کیش

ممتاز شیریں

---

3 "GULFISHAN"

BAYLEY ROAD،

DACCA-2

27TH MARCH 1963

مکرمی سلیم الرحمٰن صاحب، آداب

بہت دن ہوئے آپ کا خط آیا تھا کہ میں آپ کے نام "میگھ ملہار" کی دو جلدیں بھیجوں، آپ اس پر پاکستان ٹائمز میں ریویو کریں گے۔ آپ نے یہ بھی لکھا تھا کہ تبصرہ مارچ کے پہلے ہفتے میں آئے گا۔ اگر میگھ ملہار آپ کو جلد مل جائے سو میں نے اسی وقت "میگھ ملہار" کی دو جلدیں آپ کے نام مکتبۂ جدید کی معرفت بھجوا دی تھیں۔ خط بھی لکھا تھا۔ آپ کی جانب سے رسید کی اطلاع نہیں ملی لیکن کتابیں آپ کو یقیناً مل گئی ہوں گی، چونکہ رجسٹری سے بھجوائی تھیں۔

ادھر میں ڈھاکا چلی آئی۔ شاہین کی یہاں عارضی تبدیلی ہوئی تھی۔ سارا مارچ یہیں گزرا۔ اور اس دوران میں میں پاکستان ٹائمز کے پرچے دیکھتی رہی لیکن تبصرہ نظر سے نہیں گزرا۔ ہو سکتا ہے وہ خاص پرچہ

جس میں آپ نے ریویو کیا ہو، مجھے نہ ملا ہو۔ اگر تبصرہ "پاکستان ٹائمز" میں شائع ہو چکا ہے تو ازراہِ کرم اس کا تراشہ بھجوا دیں، ممنون ہوں گی۔ یا تبصرہ ابھی چھپا نہ ہو اور آئندہ کسی پرچے میں آ رہا ہو تو مطلع کریں کہ کس ہفتے شائع ہونے والا ہے۔ یا جب بھی چھپے آپ ہی اس کا تراشہ بھیج سکیں تو بڑی عنایت ہو گی۔

امید آپ مع الخیر ہوں گے نیاز کیش

ممتاز شیریں

۸۔ ایف گیتا میانشن نزد پلازا

کراچی ۳

۹ مئی ۱۹۶۳ء

مکرمی سلیم الرحمٰن صاحب، سلام مسنون

ابھی چند دن ہوئے ہم کراچی واپس آ گئے ہیں۔ یہاں آ کر میں نے دریافت کیا کہ آپ کے نام عید سے پہلے (یعنی عید الفطر) بھیجی گئی کتابیں کیوں نہیں ملیں؟ میں ڈھاکا جانے سے پہلے اپنے ہاتھ سے INSCRIBE کر کے آپ کے نام دو جلدیں، ایک ذاتی آپ کے لیے اور ایک پاکستان ٹائمز کے لیے پیک کروا کے اور اڈریس بھی اپنے ہاتھ سے لکھ کر ٹامز اینڈ ٹامز (ہماری کتابوں کی دکان) میں چھوڑ گئی تھی کہ رجسٹری کروا دیں۔ ساتھ ہی حنیف رامے صاحب کے نام بھی ایک جلد الگ تھی۔ یہ تینوں کے تینوں پیکٹ مکتبۂ جدید کے پتے پر تھے۔ اس کے علاوہ میری کتاب کے دو تین اور پیکٹ تھے جو مبیوا اور بنگلور بھیجنے کے لیے ان کے سپرد کیے تھے۔ اور آپ سے اور دوسروں سے مجھے یہ معلوم ہوا کہ ان میں سے کسی کو کتابیں بھیجی نہیں گئی ہیں۔

اب آ کر میں نے رسیدیں دیکھیں تو معلوم ہوا کہ یہ سارے پیکٹ جو فروری میں سپرد کیے گئے تھے، انھوں نے ۲ اپریل کو بھجوائے ہیں۔ کتابیں کہیں رکھ کر بھول گئے تھے اور جب میں نے ڈھاکے سے انھیں زوردار خط لکھا کہ آخر بات کیا ہے کسی کو کتابیں نہیں ملیں تو اس وقت ڈھونڈ ڈھانڈ کر پیکٹ رجسٹر کروائے گئے۔

بہرحال اتنی تاخیر سے ہی سہی، آپ کو جلدیں اپریل کے وسط تک مل گئی ہوں گی (اور غالباً حنیف رامے کو بھی ان کے نام بھیجی گئی کتاب مل گئی ہو گی۔ آپ ازراہِ کرم انھیں بھی بتا دیں کہ کتاب کیسے دیر سے پہنچی) ان میں سے ایک جلد آپ پاکستان ٹائمز کو دے دیں اور ایک آپ رکھیں۔ آپ کے تبصرے کا انتظار رہے گا۔ ہم نے پاکستان ٹائمز کے پچھلے شماروں میں آپ کے وہ تبصرے دیکھے جن کے بارے میں آپ نے لکھا تھا کہ عرصے سے روک لیے گئے تھے

جس پورچگیز ناول (غالباً پورچگیز ہی تھا، میں بھول رہی ہوں، اور آپ کا خط کہیں کھو گیا ہے) کا آپ نے ذکر کیا تھا [illegible]

امید کہ آپ مع الخیر ہوں گے۔

نیاز کیش
ممتاز شیریں۔

۸۔ گپتا مینشن۔ نیو ویلانزا
کراچی۔ ۶؍ جون ۱۹۶۳ء

مکرمی سلیم الرحمٰن صاحب، آداب

آپ کا خط اور ریویو کا تراشہ مل گیا تھا۔ بہت ممنون ہوں۔ جواب میں تاخیر ہوئی کہ ہم پنڈی جانے کی تیاریوں میں لگے ہوتے تھے۔ ہماری تبدیلی پنڈی ہو گئی ہے۔ شاہین چلے بھی گئے۔ میں کچھ دیر اور یہاں ہوں۔

آپ کا تبصرہ مجھے پسند آیا۔ خصوصیت سے "کفّارہ" کی آپ نے بڑی اچھی تحویل کی ہے۔ البتّہ وہ POETIC PASSAGES جن کا آپ نے ذکر کیا ہے، میرے اپنے نہیں ہیں بلکہ "اینگ کور" کے اصل INSCRIPTIONS ہیں۔ ترجمہ در ترجمہ ہوتے ہوتے ان کا یہ حال ہو گیا۔ یعنی اصل کھمبوج زبان سے ان کا ترجمہ فرانسیسی میں ہوا۔ پھر اس سے انگریزی میں اور "کفّارہ" میں انگریزی سے اردو میں۔ ویسے یہ اور اینگ کور کی دوسری کندہ تحریریں بڑی پُرمعنی اور حسین ہیں اگر آپ یہ اصل افسانہ، جو میں نے انگریزی میں لکھا تھا، پڑھتے تو آپ کو اندازہ ہو جاتا کہ یہ PASSAGES اینگ کور کے اصل INSCRIPTIONS ہیں۔ اور "کفّارہ" میں دو ایک جگہ T. S. ELIOT کے اصل اشعار بھی نقل کیے گئے ہیں۔ اصل انگریزی افسانے میں یہ افسانے کے جسم میں یوں گھل گئے ہیں کہ الگ نہیں معلوم ہوتے۔ ویسے اس سارے افسانے ہی کو اہلِ ذوق نے PROSE POEM اور SHEER POETIC CREATION کہا ہے!

"کفّارہ"، چونکہ اردو ترجمہ ہے، اس میں غالباً وہ بات نہیں آنے پائی۔ اصل افسانہ "THE ATAOEMENT" اب حال ہی میں "SCINTILLA" کے سالنامے میں شائع ہوا ہے۔ یہ پرچہ میں حنیف رامے صاحب کو بھیجنے والی ہوں۔ چونکہ اس کا تعلق لٹریچر سے زیادہ مصوّری سے ہے۔ آپ ضرور ان سے یہ پرچہ لے کر "THE ATONEMENT" پڑھیے گا۔

آپ نے بالکل ٹھیک لکھا ہے کہ "میگھ ملہار" میں میرے فن کی سب سے نمائندہ، بہترین اور اصل تخلیق "کفّارہ" ہی ہے۔ "کفّارہ"، "میگھ ملہار" کی طرح صرف ادبی تجربہ نہیں ہے، بلکہ ایک سچّا تجربہ ہے۔ ایک روح کا تجربہ۔ ویسے "میگھ ملہار" بھی میں نے COLDBLOODEDLY اور CALCULATINGLY نہیں لکھا۔ میں نے اسے بھی ایک کیف اور سرشاری میں ڈوب کر لکھا تھا۔ البتہ اس افسانے میں آگے چل کر جیسا کہ آپ نے لکھا ہے، LEARNING اور CREATIVITY میں توازن قائم کرنا مشکل ہو گیا "دیپک راگ" بھی

میں نے اس احساس کے ساتھ نہیں لکھا کہ مجھے "نثر" پر لکھنا چاہیے۔ یہ افسانہ تقسیم سے چند مہینے پہلے لکھا گیا تھا جب میں اکیس بائیس سال کی تھی۔ اس وقت نثر کا کوئی واضح تصور میرے ذہن میں نہیں تھا۔ یہ احساس تو بہت بعد میں پیدا ہوا تھا کہ نثر کے گہرے تصور کے بغیر کوئی گہرا ادب پیدا نہیں ہو سکتا۔ جب میں منٹو پر کام کرنے لگی تھی اور اس سلسلے میں بہت سی کتابیں اور تنقیدی مضامین پڑھے تھے، اور وہ بات کہ میں نثر کو چھوتے ہوئے ڈرتی تھی، ہمارے فرانسیسی دوست نے بنکاک میں ۱۹۶۰ء میں کہی تھی! لہٰذا ان سب باتوں کا اثر تو اس وقت تھا ہی نہیں جب میں نے "دیپک راگ" لکھا تھا۔ یہ سب باتیں مجھے اِس وقت سوجھتی ہیں جب میں اپنے افسانوں کا جائزہ لینے بیٹھی ہوں۔ افسانہ لکھتے وقت شعوری طور پر میں سب کچھ پلان کر کے نہیں لکھتی۔

نادم ہونے کی بھی آپ نے ایک ہی کہی۔ جب آپ نے یہ سب کچھ سچائی سے محسوس کر کے لکھا ہے تو اس میں نادم ہونے کی کیا بات ہے؟ ویسے میں زود حس قسم کے ادیبوں میں سے نہیں ہوں جو ذرا سی بھی تنقید کا برا مان جاتے ہیں۔ جب میں خود ہی نقاد ہوں تو اپنی تحریروں پر دوسروں کی تنقید کو بھی برداشت کر سکتی ہوں۔

"اجنبی" کا یا کسی اور کتاب کا ترجمہ میں نہیں کر رہی۔ جن دنوں میں "اجنبی" کا ترجمہ کر رہی تھی مجھے یہ معلوم ہوا کہ ایک اور مکتبے والے کسی اور صاحب سے اس کا ترجمہ پہلے ہی کرا چکے ہیں۔

امید آپ مع الخیر ہوں گے نیاز کیش

ممتاز شیریں

مکرر: آپ سے ایک درخواست کرنی تھی۔ "فنون" کے لیے احمد ندیم قاسمی صاحب کو میں نے پیاسترناک پر ایک مضمون بھیجا ہے۔ یہ مضمون جو پیاسترناک پر کتابچے کا ایک حصہ ہے، انگریزی میں ہے۔ ندیم صاحب نے لکھا ہے کہ وہاں کون اچھا ترجمہ کر سکیں گے۔ میں نے آپ کا نام تجویز کیا کہ آپ کا انگریزی EXPRESSION بھی بہت اچھا ہے اور آپ ترجمہ بھی بہت اچھا کرتے ہیں۔ ویسے یہ زیادتی ہے کہ میں آپ کو اپنے مضمون کے ترجمے کے لیے کہوں۔ لیکن اگر فرصت ہو تو ازراہِ کرم ادھر توجہ فرمائیے گا۔ ویسے اب میں نے تہیہ کر لیا ہے کہ انگریزی میں نہیں لکھوں گی۔

۸۔ الف گپتا مینشن، نزد پلازا

کراچی ۳ — ۲ر اگست ۱۹۶۳ء

مکرمی سلیم الرحمٰن صاحب، آداب

کل ہی مجھے "فنون" ملا۔ اس میں آپ کا ترجمہ پڑھا۔ ترجمہ واقعی بہت اچھا ہوا ہے۔ بالکل ترجمہ نہیں معلوم ہوتا۔ پاسترناک والے مضمون میں کافی مشکل الفاظ اور EXPRESSIONS تھے، جنھیں آپ نے بڑی سلاست سے اردو میں منتقل کر دیا ہے۔

اس ترجمے کے لیے میں ذاتی طور پر آپ کی ممنون ہوں۔ جب میں نے آپ سے گزارش کی تھی تو مجھے پوری امید نہ تھی کہ آپ ترجمہ کرنا قبول کریں گے۔

میں نے محمد سلیم الرحمٰن اور سلیم الرحمٰن دو نام دیکھے ہیں اور دونوں شاعر ہیں۔ اس سے بڑا CONFUSION ہوتا ہے۔ میں پہلے یہ سمجھتی رہی تھی کہ یہ آپ ہی ہیں اور کبھی کبھی اپنے نام کے آگے سے محمد نکال دیتے ہیں۔ پھر معلوم ہوا کہ اسی نام کے دو آدمی ہیں۔

آپ کی عنایت کے لیے مکرر شکریہ۔

امید کہ آپ مع الخیر ہوں گے۔

نیاز کیش

ممتاز شیریں

۸۔ ایف گپتا مینشن، تنزویلا زا

کراچی ۳۔ ۷ ستمبر ۱۹۶۳ء

مکرمی سلیم الرحمٰن صاحب، آداب

آپ کا خط مل گیا تھا، شکریہ۔

کاش مجھے پہلے ہی علم ہوتا کہ آپ ترجمہ کریں گے۔ ترجمے کے سلسلے میں میرا پیاسٹرناک والا آدھا کتابچہ گم ہوگیا۔ میں پیاسٹرناک کے مطالعے کے مختلف حصے "سویرا" یا "نصرت" کو بھیجنا چاہتی تھی، لیکن ان دنوں مجھے علم نہ تھا کہ اس کا ترجمہ کون کرے گا۔ میں نے بنکاک سے حنیف رامے صاحب کو اس سلسلے میں خط بھی لکھا تھا۔ چونکہ ان سے کوئی جواب نہیں ملا، میں نے سوچا شاید ترجمے کے سلسلے میں دقت ہو۔ پاکستان واپس آئی تو ایک مدیر صاحب مجھ سے یہ کہہ کر مضامین لے گئے کہ وہ ان کا ترجمہ کرا کے SERIES میں اپنے رسالے میں شائع کریں گے۔ یہ مضامین ٹائپ نہیں ہوئے تھے اور میری تحریر میں تھے۔ اس پر مستزاد انھیں میں نے فیئر تک نہیں کیا تھا۔ یونہی فرسٹ ڈرافٹ اٹھا کر دے دیے تھے۔ یہ میں نے سخت غلطی کی۔ اب انھوں نے مضامین مختلف لوگوں کو ترجمے کے لیے دیے۔ لیکن نہ وہ مضامین ہی چھپے نہ مجھے واپس کیے گئے۔ عرصے بعد پتا چلا کہ مضامین کھو گئے ہیں۔

اس طرح پاسٹرناک پر سارا کتابچہ ہی بیکار ــــــ اور اب دوبارہ لکھنے کی ہمت نہیں۔ بس یہ ایک حصہ میرے پاس رہ گیا تھا جسے ٹائپ کروا لیا تھا خصوصیت سے ایک CHAPTER کھو جانے کا مجھے بہت ہی افسوس ہے جو ڈاکٹر ژواگو کی ہیروئن لارا (لاریسا) سے متعلق تھا۔ بیس صفحات کا مضمون تھا "LARISSA AS MARY MAGDALENE OR THE FEMININE PRINCIPLE" فرسٹ ڈرافٹ کسی کے حوالے کرنے کی غلطی جو کی تھی اس کا یہ خمیازہ بھگتنا پڑا۔ اب اس کا اور بھی زیادہ افسوس ہوا ہے کہ میں نے CHAPTER ٹائپ کروا لیے ہوتے تو ایک ایک کر کے ان کا ترجمہ کرنے پر شاید آپ رضامند ہو جاتے۔

SCINTILLA کا سالنامہ جس میں میرا افسانہ "THE ATONEMENT" شامل ہے، عرصہ ہوا حنیف رامے صاحب کو بھجوا چکی ہوں، آپ ان سے لے کر پڑھ لیں۔ PASTERNAK والا یہ مضمون بھی اسی رسالے

کے تازہ پرچے میں شائع ہوا ہے لیکن اس میں سے انھوں نے نوبل پرائز CONTROVERSY والا حصہ کاٹ دیا ہے۔
میں پندرہ کو پنڈی جا رہی ہوں۔ شاہین کی وہاں تبدیلی ہو گئی ہے اور وہ کوئی چار ماہ سے وہیں ہیں۔
لہٰذا اس کا جواب جلد دیجیے گا، تاکہ مجھے پنڈی جانے سے پہلے یہیں مل جائے۔

امید آپ مع الخیر ہوں گے

نیاز کیش

ممتاز شیریں

چند حواشی

ٹھیک یاد نہیں کہ کس پرتگالی ناول کے بارے میں دریافت کیا تھا۔ اغلب یہی ہے کہ برازیل کے یوکلی دیس داکُن یا کے ناول OS SERTOES کا پتا کیا ہوگا۔

"اجنبی" کا ترجمہ اگر ممتاز شیریں کرتیں تو خوب ہوتا۔ جیسا کہ خط سے ظاہر ہے۔ یہ معلوم ہونے پر کہ کوئی اور صاحب، (غالباً شبیر چشتی) ناول کا پہلے ہی ترجمہ کر چکے ہیں، انھوں نے اپنا کام ادھورا چھوڑ دیا۔ نامکمل ترجمے کا مسودہ شاید ان کے کاغذات میں موجود ہو۔

پتا نہیں کون ستم ظریف مدیر تھے جنھوں نے پاسترناک پر کتنی بچے کے ساتھ یہ ظالمانہ سلوک کیا! — م۔س

احمد ہمدانی

خودی

علامہ اقبال علم و ہنر کے ایک ایسے روشن چراغ ہیں جسے ہم برِّصغیر میں دانشوری کی نئی روایت کا نقطۂ عروج کہہ سکتے ہیں۔ دانشوروں کی اس نئی روایت کا آغاز مسلمانوں میں سرسید تحریک سے ہوتا ہے۔ سرسیّد سے پہلے ہماری نظر منقولات پر جمی ہوئی تھی۔ ہمارا فکری رویہ تقلید کا پابند اور تجربہ کار رسا تھا۔ ہم اپنے تصوّر روایت میں لکیر کے فقیر تھے۔ اطراف میں چلنے والی ہواؤں سے خوف زدہ، آفتابِ تازہ کی کرنوں سے آنکھیں چرائے ماضی کے اندھیروں میں بے علمی کی چادریں اوڑھے گہری نیند سونا ہمارا شعار ہو کر رہ گیا تھا۔ سرسیّد نے ہمیں اس خواب سے چونکانے کی کوشش کی تو ہم نے آنکھیں مل کر اسے دیکھا لیکن خواب کی لذّت ہمیں اس قدر عزیز تھی کہ ہم سوچنے لگے کہ کسی کے کہنے میں آکر ہم خواب کی مسرتوں کے عوض بیداری کی مصیبت کیوں مول لیں۔ لیکن بیداری کا یہ نقیب بھی کوئی کچی گولیاں نہیں کھیلا تھا۔ وہ اپنی دُھن کا پکّا اور کام کا سچّا تھا۔ ہر طرف خرّاٹوں کی مکروہ آواز سُنتا رہا اور چیخ چیخ کر لوگوں کو جگاتا رہا۔ اس چیخ پکار سے لوگوں کی نیند اچٹی تو ضرور لیکن وہ پوری طرح بیدار نہ ہو سکے۔ آخر یہ نیند بھی تو کوئی ایسی ویسی نیند نہیں تھی۔ برسوں کی لوریوں کے بعد یہ نیند آئی تھی۔ چنانچہ اس سے بیدار ہونے کے لیے بھی ایک مدّت درکار تھی۔ یہ مدّت علامہ کی ولادت تک جا کر کچھ پوری ہوتی محسوس ہوئی۔ علامہ اقبال ذہن رسا اور دل پُر گداز لے کر پیدا ہوئے تھے۔ انھوں نے اپنی قوم کی بدحالی کو دیکھا اور اس کے اسباب دریافت کرنے میں پورے انہماک سے کام لیا۔ انھوں نے دیکھا کہ قوم منقولات پہ اس طرح دل و جان سے لہلوٹ ہے کہ اسے سرسیّد کی بتائی ہوئی عقلیت بالکل روکھی پھیکی نظر آتی ہے۔

علامہ نے منقولات و معقولات دونوں کی طرف پوری توجہ مبذول کی۔ اور علم کے ان دونوں دبستانوں کا طویل سفر طے کیا۔ اس طویل سفر میں انھوں نے مشرقی اور مغربی افکار سے بھرپور آگاہی حاصل کرنے کے بعد ایک ایسے فلسفے کی بنیاد ڈالی جو منقولات کی اہمیت کو تسلیم کرنے کے باوجود معقولات کا دامن پوری طرح تھامے رکھے۔ انھوں نے کائنات کے بارے میں غور کرنے اور اشیا و مناظر کی حقیقت کو سمجھنے پر زور دیا جو عقلیت کی اہمیت کو تسلیم کرنے اور معقولات کے دروازوں کو کھولے رکھنے کے مترادف ہے۔ ہم اسے سائنسی یا تجزیاتی رویّہ بھی کہہ سکتے ہیں۔ تجزیاتی انداز اور استقرائی منطق اس کے طریقۂ کار ہیں۔ مگر قدیم یونانی تجریدی انداز اور استخراجی منطق اس کی ضد ہیں۔ علامہ نے محسوس کیا کہ مسلمانوں کی سوچ کا انداز اسلامی تعلیمات

سے قریب تر کرنے کی کوشش کی۔ لیکن یہاں ضروری معلوم ہوتا ہے کہ میں ایک غلط فہمی دور کرتا چلوں۔ اور وہ یہ کہ مسلمانوں کو اسلامی تعلیمات سے آشنا کرنے کا یہ مطلب ہرگز نہیں ہے کہ علامہ کو غیر مسلموں سے کوئی دل چسپی ہی نہیں تھی۔ کیونکہ اسلامی تعلیمات تو خود پوری نوعِ انسانی کے لیے ہیں۔ چنانچہ علامہ نے جس نظریۂ علم کی ترویج کی وہ ہمہ گیر اور عالم گیر اہمیت کا حامل نظریہ ہے۔ البتہ انھوں نے اس نظریہ کو مسلمانوں کے حوالے اور ان کی وساطت سے عام کرنے کی کوشش کی ہے۔

اس مختصر سی تمہید کے بعد ہم اپنے اصل موضوع، یعنی علامہ کے فلسفۂ خودی کی طرف آتے ہیں۔ علامہ کہتے ہیں:

این گنبدِ مینائی این پستی و بالائی — در شد بہ دلِ عاشق با این ہمہ پہنائی
اسرارِ ازل جوئی بر خود نظرے وا کن — یکتائی و لبسیاری پنہائی و پیدائی

تصورِ خودی علامہ کے فلسفہ کی بنیاد ہے۔ حرکت و تغیر، سعی و عمل، زمان و مکان، عقل و شعور اور حسن و عشق غرضیکہ ان کے تمام تصورات اپنی نوعیت میں تصورِ خودی ہی سے پھوٹتے اور بیک وقت اس سے تقویت بھی حاصل کرتے اور اسے استحکام بھی فراہم کرتے نظر آتے ہیں۔ ایسی صورت میں ضروری ہے کہ فلسفۂ اقبال کو سمجھنے کے لیے سب سے پہلے ہم یہ سمجھنے کی کوشش کریں کہ خودی سے علامہ کی مراد کیا ہے۔ وہ بتاتے ہیں کہ خودی تجربہ کا مرکز اور اس دنیا کی بنیادی حقیقت ہے۔ اور یہ بنیادی حقیقت ہیگل کے خیالِ مطلق اور بریڈلے کے حسی شعور SENSE PERCEPTION کے برخلاف جذبہ کی شدت کے ساتھ پوری شخصیت کا حوالہ اور اس پوری کائنات کی حقیقت اصلی ہے۔

پیکرِ ہستی ز آثارِ خودی است — ہر چہ می بینی ز اسرارِ خودی است

بہ الفاظِ دیگر انسان کی شخصیت یا اس کی فردیت ہی کا نام خودی ہے جو نہ صرف ماضی کے مرتب کردہ تاثرات کے ساتھ حال کی زندگی میں خارجی محرکات پر اپنے ردِ عمل کا اظہار کرتی ہے بلکہ اس کا یہ ردِ عمل ماضی کے تاثرات میں ایک اضافہ ہوتا ہے۔ یہ جذبہ کی شدت کے ساتھ تازہ محرکات سے ہمکنار ہوتی اور تعبیر نو سے کام لیتی ہے تاکہ اپنے طور پر مناسب عمل کا انتخاب کرے۔ ظاہر ہے کہ یہ رویہ تقلیدِ محض کی ضد ہے۔

علامہ اقبال کی بیان کردہ خودی کی اس تعریف سے کئی باتیں ذہن میں ابھرتی ہیں۔ اول یہ کہ انسان اپنے خیال اور عمل میں آزاد ہے۔ اور دوم یہ کہ وہ اپنے تجربہ، مشاہدہ اور تعبیر نو کے ذریعے شعورِ انسانی میں مسلسل اضافہ کرتا رہتا ہے۔ گویا خودی عملی ارتقا سے مسلسل گزرتی رہتی ہے۔ وہ کسی نقطہ پر ٹھہر کر نہیں رہ جاتی۔ اس کے ارتقا کا کوئی انت نہیں۔ اس کی مثال ندی کی سی ہے جو راستے کی تمام رکاوٹوں کو ہٹاتی ہوئی مسلسل رواں رہتی ہے۔

وہ جوئے کہستاں اچکتی ہوئی — اٹکتی، لچکتی، سرکتی ہوئی
اچھلتی پھسلتی سنبھلتی ہوئی — بڑے پیچ کھا کر نکلتی ہوئی
رکے جب تو سِل چیر دیتی ہے یہ — پہاڑوں کے دل چیر دیتی ہے یہ
ذرا دیکھ اے ساقیِ لالہ فام — سناتی ہے یہ زندگی کا پیام

خیال و عمل کی آزادی کے سلسلے میں کچھ لوگ یہ اعتراض کریں گے کہ ایسی دنیا میں جو اسباب و علل کے بندھنوں

...بندھی ہوئی ہے وہاں خودی کے لیے خیال و عمل کی آزادی کس طرح ممکن ہو سکتی ہے۔ اس ضمن میں کانٹ کا یہ خیال ہے کہ ...ہم خالص احساسِ فرض کے تحت کوئی اعلیٰ اخلاقی کام انجام دیتے ہیں تو ہم ظاہری دنیا سے الگ ہو کر حقیقی دنیا کا حصہ بن جاتے ہیں۔
...اقبال کانٹ کے اس خیال سے اتفاق کرتے ہیں لیکن اس کے ساتھ ہی یہ اضافہ بھی کرتے ہیں کہ ہمارے اخلاقی کاموں کی صلاحیت کو ارتقا پذیر خودی کی تہذیب کے ...سنوارنا ضروری ہے۔ گویا خالص احساسِ فرض کے تحت اور ارتقا پذیر خودی کی تہذیب کے ساتھ انجام پانے والے اعلیٰ اخلاقی کاموں کی صلاحیت انسان کو دنیائے ...وعلل سے بلند کر دیتی ہے اور اس کا رشتہ اشیا و مناظر کی دنیا سے ہٹا کر حقیقت اشیا و مناظر سے جوڑ دیتی ہے۔ ہم اسے بصیرت کا عمل بھی ...لے ہیں۔ مثال کے طور پر ہمارے معاشرے میں جو کچھ ہو رہا ہے اس کی ایک نوعیت تو اس کا ہونا یا اس کی واقعیت ہے ...دوسری نوعیت اس واقعیت کے پسِ پردہ کارفرما حقیقت ہے۔ آج کل ہمارے معاشرے میں تشدد کا بڑھتا ہوا رجحان ...واقعیت ہے لیکن اس واقعیت کی حقیقت یہ نہیں ہے کہ لوگ بے رحم اور سفاک ہو گئے ہیں اور قتل و غارت گری ان کی ...تقاضہ بن گیا ہے، بلکہ اس تشدد اور قتل و غارت گری کے پسِ پردہ وہ جاگیرداری نظام اور مراعات یافتہ طبقہ کے ...مفادات ہیں جن کو محفوظ رکھنے کے لیے یہ مراعات یافتہ طبقہ ایسے حالات پیدا کرتا رہتا ہے جن کا لازمی نتیجہ تشدد کی ...شکل میں ظاہر ہوتا ہے۔ علّامہ اقبال کی پیش کردہ ارتقا پذیر خودی کے نزدیک یہ واقعات لوگوں کے بے رحم اور سفّاک ...ہونے کا نتیجہ نہیں ہیں بلکہ ان واقعات کے پسِ پردہ مراعات یافتہ طبقہ کے مفادات ہیں۔ اس تشدد کے رجحان سے نجات ...حاصل کرنے کے لیے ضروری ہے کہ مراعات یافتہ طبقے سے چھٹکارا حاصل کیا جائے۔ سیدھے سادے الفاظ میں خودی کا وظیفہ ...واقعات کے پسِ پردہ حقیقت کو دیکھنا اور مناسب راہِ عمل اختیار کرنا ہے۔ اس طرح خودی اسباب و علل کی دنیا میں رہتے ...ہوئے اسباب و علل کی ظاہری دنیا سے ماورا و عملی ارتقا میں مصروف رہتی اور اپنے طور پر خیال و عمل کی آزادی سے بہرہ ور ...ہوتی ہے۔ اعلیٰ اقدار کے لیے جان دینے والوں کے کارناموں سے تاریخ بھری پڑی ہے جو یقیناً اسباب و علل کی دنیا میں رہتے ...ہوئے اسباب و علل کی ظاہری دنیا سے بلند ہو جانے کا بیّن ثبوت ہے۔

خودی ایک ایسا جوہر ہے جو انسان کو قدرت کی طرف سے ودیعت ہوتا ہے لیکن اس سے آگاہی اسے مفت میں حاصل نہیں ہوتی۔ اس کے لیے اسے محنت، کوشش اور عمل کی ضرورت ہوتی ہے۔ ہر چند انسان کی خودی اس کی حقیقت اصلی ہے جب وہ مادی دنیا میں اس طرح ملوث ہو جائے کہ اس کی جسمانی خواہشات اس کے جوہر اصلی پر غالب آ جائیں تو وہ اپنی حقیقت ...سے دوچار ہو جاتا ہے۔ وہ خود کو کھو کر غیر خود پر نظریں جمائے رکھتا ہے جس کی وجہ سے وہ خود اعتمادی اور عزتِ نفس سے محروم ...ہو کر انسانیت کے اعلیٰ و ارفع مرتبہ سے گر کر حیوانی سطح پر آ جاتا ہے۔ اس کے برعکس اگر انسان اپنے جسمانی تقاضوں کے ساتھ ...جوہر اصلی کا دامن بھی تھامے رکھے تو وہ عزتِ نفس، خود اعتمادی اور تحفظِ ذات کے ادراک سے بہرہ ور ہوتا ہے — یہ ...اس کے عرفانِ خودی کا عطیہ ہے۔ اس سلسلے میں علّامہ ارشاد باری تعالیٰ کا حوالہ دیتے ہوئے کہتے ہیں کہ یہ کائنات انسان ...کے لیے تخلیق کی گئی ہے اور اسے زمین پر اللہ کا خلیفہ بنا کر بھیجا گیا ہے۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ انسان کے مقابلے میں کائنات کی ...حیثیت ثانوی ہے۔ کیونکہ کائنات کو انسان کے لیے پیدا کیا گیا ہے۔ انسان کو کائنات کے لیے نہیں بنایا گیا۔ دوسرے یہ کہ ...اللہ نے انسان کو زمین پر اپنا خلیفہ بنا کر بھیجا ہے جس کا یہ مطلب ہوا کہ انسان کو یہ حق دیا گیا ہے کہ وہ کائنات کو مسخر کرے

اور اس سے پورا پورا فائدہ اٹھائے۔ کائنات کی تسخیر کے لیے ضروری ہے کہ انسان قوانینِ فطرت کی آگہی حاصل کرے۔ وہ اس آگہی کے بل بوتے پر قوانینِ فطرت کو قوانینِ فطرت ہی کے اتباع میں اپنا محکوم بنا کر ان پر حکمرانی کرے۔ جدید سائنس کا کارنامہ انسان کی اسی صلاحیت کا ثمرہ ہے۔ البتّہ جدید سائنس کے حوالے سے ہم یہ ضرور محسوس کرتے ہیں کہ سائنسی معلومات حقیقت کے نصف وقوف تک محدود ہیں کیونکہ جدید سائنس میں انسان اپنے امکانات کائنات کے رشتے سے تو بروئے کار لاتا ہے لیکن اپنے امکانات کو اپنے اپنے حوالے سے دیکھنے پر توجّہ نہیں دیتا جس کی وجہ سے کبھی کبھی سائنس کی برکتیں فساد کے دروازے بھی کھول دیتی ہیں اور انسان کو ناگاساکی اور ہیروشیما کی ہولناک بربادیوں سے بھی دوچار ہونا پڑتا ہے۔ علاوہ ازیں جب وہ اپنی روزمرہ زندگی میں ان مشینوں کی بالادستی دیکھتا ہے جو خود اس کی اپنی ایجادیں ہیں تو دل مسوس کر رہ جاتا ہے۔ ان مشینوں کی موجودگی میں خود اس کی اپنی حیثیت بھی مشین کے ایک پرزے کی ہو کر رہ جاتی ہے جس کی وجہ سے وہ سخت ٹوٹ پھوٹ اور بے رنگی کے جان لیوا عذاب سے گزر کر اجنبیت اور تنہائی کے اندھیرے اور مہیب غاروں میں اتر جاتا ہے۔ یہ سب کچھ دراصل مشینوں کی ایجاد کے سبب نہیں بلکہ خودی سے محرومی اور حقیقت کے جزوی وقوف کا نتیجہ ہے۔ علّامہ کے نزدیک خودی کی پہچان اور معرفت اسی وقت ممکن ہے جب انسان اپنے اختیارات کے ساتھ ان ذمّہ داریوں کا بھی خیال رکھے جو اسے سونپی گئی ہیں۔ مغرب میں سائنسی ترقی لائقِ تحسین کارنامہ ہے لیکن یہ کارنامہ انسان کی اصل عظمت کے عرفان سے عاری ہے۔ چنانچہ یہ جذباتی ہیجان کا سبب بن گیا ہے۔ بقول علّامہ

> ہے دل کے لیے موت مشینوں کی حکومت
> احساسِ مروّت کو کچل دیتے ہیں آلات

گویا دل کے لیے موت مشین نہیں بلکہ مشینوں کی حکومت ہے۔ علّامہ نے تاریخ کے مطالعہ سے یہ حقیقت دریافت کی ہے کہ جدید سائنس کی بنیادیں عربوں نے استوار کی تھیں اور اس کائنات میں سائنسی اور تجرباتی رویّے سے کام لینا اسلامی تعلیمات کے عین مطابق ہے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ اپنے شعر و فلسفہ میں بتاتے ہیں کہ سائنسی رجحانات کو زیادہ سے زیادہ عام کیا جائے اور کائنات کی تمام اشیا و مناظر کی حقیقت دریافت کی جائے کیونکہ یہ سب کچھ انسان ہی کے لیے تخلیق کیا گیا ہے اور زمین پر خدا کا خلیفہ ہونے کی حیثیت سے اس کا یہ فرض ہے کہ وہ ان کی حقیقت دریافت کر کے ان پر غلبہ حاصل کرے۔ کائنات پر اس کی برتری ایک عطیۂ خداوندی ہے جس کا شکر ادا کرنے کی یہی صورت ہے کہ وہ عملی طور پر اپنی بڑائی کا اظہار کرے۔ انسان کی برتری اور حیثیت کے بارے میں خداوند تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ اس نے انسان کو اپنی مثال پر تخلیق کیا ہے اور اس کے بدن میں اپنی روح پھونکی ہے۔

خودی کی وضاحت کرتے ہوئے علّامہ کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے انسان کو بے شمار امکانات کے ساتھ پیدا کیا ہے۔ ان امکانات کی معرفت خودی ہے اور یہ امکانات ہی اس کی تقدیر ہیں۔ وہ ان امکانات کو بروئے کار لا کر اپنی تقدیر آپ بناتا ہے۔ علّامہ کا یہ نظریہ افلاطون کے فلسفہ اعیان کی بالکل ضد ہے۔ کیونکہ فلسفہ اعیان کے تحت انسان کی تقدیر پہلے سے مقرر ہے۔ اس فلسفہ کے تحت انسان کسی ایک مخصوص عین ثابتہ کا عکس ہوتا ہے اور وہ اپنے عین ثابتہ کے مطابق زندگی بسر کرنے پر مجبور ہے۔ اس فلسفہ کے تحت انسان کا فعال کردار ختم ہو جاتا ہے اور وہ یکسر جبریت کا شکار نظر آتا ہے۔ افلاطون کا یہ نظریہ

مسلمانوں کے تصوف پر اثر انداز ہوا جس سے مسلمانوں میں بے عملی اور تقدیر پرستی کے رجحانات پیدا ہوئے۔ علامہ جبریت اور تقدیر پرستی کے ان رجحانات کو غیر اسلامی بتاتے ہیں اور انسان کے فعال کردار کو اجاگر کرتے ہیں۔

عمل سے زندگی بنتی ہے جنت بھی جہنم بھی ۔۔۔ یہ خاکی اپنی فطرت میں نہ نوری ہے نہ ناری ہے

خودی کو کر بلند اتنا کہ ہر تقدیر سے پہلے ۔۔۔ خدا بندے سے خود پوچھے بتا تیری رضا کیا ہے

انسان کا اپنے امکانات سے آگاہ ہونا ہی عرفانِ خودی ہے۔ علامہ نے انسان کے ان امکانات یعنی حقیقتِ خودی کی وضاحت رسول پاک کی حدیث کے حوالے سے اس طرح کی ہے کہ "جس انسان کو اپنے خلیفۃ اللہ ہونے کی فضیلت کا عرفان ہو گیا اسے کوئی شکست نہیں دے سکتا" اسی طرح حضرت علیؓ کا ایک مشہور قول ہے "جس نے اپنے نفس کو پہچانا اس نے اپنے رب کو پہچانا"
علامہ نے حدیثِ رسولؐ اور قولِ علیؓ کے ان رموز کو اپنے اشعار میں کچھ اس طرح پیش کیا ہے ؎

زمن گو صوفیانِ با صفا را ۔۔۔ خدا جویانِ معنی آشنا را
غلامِ ہمتِ آں خود پرستم ۔۔۔ کہ با نورِ خودی بیند خدا را

کرا جوئی؟ چرا در پیچ و تابی؟ ۔۔۔ کہ او پیداست تو زیرِ نقابی
تلاشِ او کنی جز خود نہ بینی ۔۔۔ تلاشِ خود کنی جز او نیابی

خودی کی معرفت کے ساتھ ساتھ علامہ خودی کے استحکام اور اس کے مسلسل ارتقا پر حد درجہ زور دیتے ہیں۔ ان کے نزدیک یقین، عمل اور محبت تعمیرِ خودی کے لازمی اجزا ہیں چنانچہ فرماتے ہیں:

یقیں محکم، عمل پیہم، محبت فاتحِ عالم ۔۔۔ جہادِ زندگانی میں ہیں یہ مردوں کی شمشیریں

ان لازمی اجزا کے امتزاج سے ایک انفرادیت وجود میں آتی ہے جو تلاش و جستجو اور تسخیرِ فطرت کے عمل میں ہر دم تازہ رہتی ہے۔ مستحکم خودی کی حامل یہ انفرادیت اپنی مساعی میں پوری انسانیت سے اپنا رشتہ استوار رکھتی ہے اور کسی لمحہ بھی نیابتِ الٰہی کے فریضہ سے غافل نہیں ہوتی جس کی وجہ سے وہ ذاتی خواہشات و مفادات، رنگ، نسل، قومیت، غرضیکہ تمام حدود و امتیازات سے ماورا خیرِ کل کا مظہر بن جاتی ہے۔ خیرِ کل کا اس طرح مظہر بن جانا دراصل نیابتِ الٰہی کے فرائض کی انجام دہی کی ایک صورت ہے۔ اپنے فرائض کی انجام دہی میں یہ انفرادیت انسانیت کے امکانات کے نقطۂ عروج کو چھو لیتی ہے۔ علامہ نے انسان کے اس نقطۂ عروج کی تصویر کشی کچھ اس طرح کی ہے۔

خودی را پیکرِ خاکی حجاب است ۔۔۔ طلوعِ او مثالِ آفتاب است

شکستن ایں طلسم بحر و بر را ۔۔۔ ز انگشتے شگافیدن قمر را

یہ موجِ نفس کیا ہے تلوار ہے — خودی کیا ہے تلوار کی دھار ہے
خودی کیا ہے رازِ درونِ حیات — خودی کیا ہے بیداریِ کائنات
خودی جلوہ بدمست و خلوت پسند — سمندر ہے اک بوند پانی میں بند
اندھیرے اجالے میں ہے تابناک — من و تو میں پیدا من و تو سے پاک
خودی کا نشیمن ترے دل میں ہے — فلک جس طرح آنکھ کے تل میں ہے

یا پھر ان کا یہ قطعہ :

خودی کی جلوتوں میں مصطفائی — خودی کی خلوتوں میں کبریائی
زمین و آسمان و کرسی و عرش — خودی کی زد میں ہے ساری خدائی

عرفانِ خودی کی یہ منزل انسان کو جبریت کی زنجیروں سے آزاد کرتی ہے اور وہ یکسر عمل بن جاتا ہے۔ قدیم یونانی فکر کے مطابق اصول اوّل سکون ہے لیکن علامہ نے عمل و حرکت کو زندگی کا اصولِ اوّل قرار دیا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ یہ دنیا دار العمل ہے جس میں تغیّر و حرکت کا سلسلہ برابر جاری رہتا ہے۔ خارجی دنیا کے تغیّرات باطنی عالم میں بھی تبدیلیوں کے متقاضی ہوتے ہیں۔ جس کی وجہ سے انسان کے طرزِ احساس میں مسلسل تبدیلیاں آتی رہتی ہیں۔ خارجی تغیّرات اور حسّی تبدیلیاں مروّجہ فکری نظام و تصوّرات کی نئی تعبیر و تشریح کی طالب ہوتی ہیں۔ اسلام نے اس اصول کے پیشِ نظر اجتہاد کو اپنے نظامِ فکر کی بنیاد ٹھہرایا ہے۔ لیکن دنیائے اسلام میں جب بے عملی کا دَور دَورہ شروع ہوا تو اجتہاد کے دروازے بند کر کے تقلید کی رسم ڈالی گئی۔ علامہ اس رسم کو تعلیماتِ اسلامی کے منافی قرار دیتے ہیں۔ اور اُمّتِ مسلمہ کی وساطت سے پوری انسانیت کو تغیّرات جہاں پر غور و فکر کے ساتھ عمل پیہم کا پیغام دیتے ہیں۔ علامہ کے نزدیک قرآنِ پاک نے ہدایت کے لیے اصول فراہم کیے ہیں جو تغیّرات کے ہر موڑ پر انسان کو راہِ عمل متعیّن کرنے میں مدد دیتے ہیں۔ عہدِ حاضر میں ہونے والی لمحہ بہ لمحہ تبدیلیوں سے ہم آہنگ رہنے کے لیے ہمیں اصولِ اجتہاد کو برتنے کی ضرورت ہے۔ یہ کائنات اپنی اصل میں حرکی ہے اور اجتہاد حرکی انداز کا ترجمان ہے۔ چنانچہ علامہ عہدِ جدید کی خصوصیات کو واضح کرتے ہوئے فرماتے ہیں :

"یہ ہے وہ حیرت انگیز تغیّر جو زمانۂ حال کو زمانۂ ماضی سے متمیّز کرتا ہے۔ اور جس کی حقیقت اس امر کی متقاضی ہے کہ تمام قومیں جدید روحانی اور جسمانی ضروریات کے پیدا ہو جانے کی وجہ سے اپنی زندگی کے لیے نئے سامان بہم پہنچائیں۔"

علامہ نئے سامان بہم پہنچانے کے سلسلے کو عام رسم و رواج کے بندھنوں سے لے کر علم و شعور کی اعلیٰ ترین سطحوں تک پھیلا دیتے ہیں اور زور دیتے ہیں کہ ہمیں اپنی کہنہ و فرسودہ رسومات سے نجات حاصل کر کے زندگی سے ہم آہنگ تازہ تر اسلوبِ حیات کی بنیاد ڈالنی چاہیے۔ اس اسلوبِ حیات میں تعلیم کا فروغ، حقیقت کی جستجو اور ماضی کا بامعنی ادراک شامل ہے۔ وہ روایات میں کھوئی ہوئی اُمّت کو بتاتے ہیں کہ وہ بجائے فرسودہ روایات کے حقیقت سے اپنا رشتہ جوڑے اور خرافات سے نجات حاصل کرے۔ خرافات سے نجات حاصل کرنا انسانیت کی فتح اور عرفانِ خودی کا لازمی حصّہ ہے۔

جیسا کہ ہم نے عرض کیا کہ خودی اس کائنات کی بنیادی حقیقت ہے جس کو ہم ذہن و شعور سے بھی تعبیر کر سکتے ہیں۔ چونکہ ہم دیکھتے ہیں کہ جہاں جہاں ذہن یا شعور موجود ہوتا ہے وہاں وہاں زندگی موجود ہوتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ علامہ نے خودی کے لیے حیات یا زندگی کا لفظ بھی استعمال کیا ہے۔ البتہ اس ضمن میں وہ فرق ضرور ذہن نشیں رہنا چاہیے، جو انسانوں اور حیوانوں کے درمیان ہوتا ہے۔ کچھ جاننے اور محسوس کرنے کی صلاحیت انسانوں اور حیوانوں میں مشترک ہے لیکن حیوان یہ نہیں جانتے کہ وہ کچھ جانتے ہیں، جب کہ انسان کو اپنے شعور اور اپنے احساس کا علم بھی ہوتا ہے۔ یعنی وہ خود آگاہ بھی ہوتا ہے جب کہ حیوان خود آگہی سے محروم ہوتے ہیں۔ اقبال نے اسی خود آگہی کی خصوصیت کو خودی سے تعبیر کیا ہے۔ دوسرے الفاظ میں وہ انسان جو خود آگہی سے محروم ہیں علامہ کے نزدیک درجۂ انسانیت سے گر کر حیوانوں کی صف کے قریب ہو جاتے ہیں۔

علامہ نے ایک طرف خودی کے عرفان کی تعلیم دی ہے تو دوسری طرف اجتہاد سے کام لیتے ہوئے عمل پیہم کی تلقین کی ہے جو ارتقا و استحکامِ خودی کی لازمی شرط ہے۔ ان کے تصورِ خودی سے یہ بات کھل کر سامنے آتی ہے کہ انسان خود کو کائنات پر مقدم سمجھے اور اس پر حکمرانی کو اپنا جائز حق جانے۔ یہ شعور کی وہ سطح ہے جہاں کائنات کی تمام اشیا انسان کی خودی کے آگے ہیچ ہیں لیکن جب انسان اپنی حقیقتِ خودی کو فراموش کر دیتا ہے تو کائنات کی اشیا اس کی حاکم بن جاتی ہیں۔ اور وہ ان کے حصول میں خود کو گنوانے پر مجبور ہو جاتا ہے۔ کوئی دولت کے پیچھے بھاگتا ہے اور کوئی اقتدار کی چمک کا دیوانہ بن جاتا ہے اور وہ بھول جاتا ہے کہ یہ سب کچھ اس کی خودی کی عظمتوں کی پرچھائیوں سے زیادہ کوئی اہمیت نہیں رکھتیں۔ ہم خودی کی عظمتوں کی پرچھائیوں سے افلاطون کے وہ تصورِ حقیقت ہرگز مراد نہیں جس کی رو سے یہ ساری کائنات غیر حقیقی ہے اور اس کی حیثیت حقیقت کی پرچھائیں جیسی ہے۔ علامہ اس کائنات کے حقیقی اور اس کے قائم بالحق ہونے کے قائل ہیں۔ لیکن وہ اسے خودی پر غالب کرنے کے قائل نہیں۔ بہ قول ان کے:

کافر کی یہ پہچان کہ آفاق میں گم ہے مومن کی یہ پہچان کہ گم اس میں ہے آفاق

بلکہ وہ عظمتِ انسان اور انسانی امکانات کی آگہی کے حصول کے بعد عمل پیہم کو تمام حدود و امتیازات سے ماورا و خودی کی رفعتوں سے ہمکنار کرنے کی تلقین کرتے ہیں۔ خودی سے ہمکنار عمل پیہم زمان و مکان کی حدود سے آزاد ابدی سرشاری اور لامتناہی ارتقا کا آئینہ دار ہوتا ہے۔ علامہ کا تصورِ خودی اسی ابدی سرشاری اور لامتناہی ارتقا کی نوید جاں فزا ہے۔

سحر انصاری

۱۹۹۰ء کا نوبل ادبی انعام پانے والا ادیب و شاعر

اوکتاویو پاز
(OCTAVIO PAZ)

عالمی ادب کے مطالعے کے دوران اکثر یہ خیال آتا ہے کہ بعض ادبی انعامات و اعزازات کسی کو ساری زندگی یا زندگی کے ایک خاص مرحلے تک کیوں نہیں ملتے ؟ کیا تاریخِ ادب میں دوام حاصل کرنے کے لیے اس قسم کے اعزازات کی شرط ضروری ہے ؟ اور یہ کہ ہمارے ہی دور میں گنتر گراس، اوکتاویو پاز اور عربی زبان کے شاعروں میں سمیع القاسم، محمود درویش اور البیاتی ان سے کیوں محروم ہیں ؟ ان سوالوں کے بہت سے جوابات ہو سکتے ہیں۔ اور ایک یہ بھی ہے کہ

"رموزِ مملکتِ خویش خسرواں دانند"

اس سال اوکتاویو پاز کو ادب کا نوبل انعام برائے ۱۹۹۰ء ملا تو محسوس ہوا کہ ایک سچے اور حقیقی ادیب و شاعر نے جیسے اپنا حق حاصل کر لیا۔ اوکتاویو پاز ہمارے ادبی حلقوں میں بھی بالکل اجنبی نہیں ہیں۔ جو لوگ عالمی ادب اور خاص طور پر ہسپانوی زبان میں لکھنے والوں سے واقف ہیں انھوں نے جستہ جستہ ہی سہی اوکتاویو پاز کو ضرور پڑھا ہوگا۔

چلی کے مشہور شاعر پابلو نیرودا سے انتہائی دلچسپی اور شغف کے نتیجے میں مجھے روبن داریو (RUBEN DARIO) سیزر ویلیخو (CESAR VALLEJO) اور وانسنٹ ہیو ڈوبورو (VICENT HUIDOBORO) اور اوکتاویو پاز جیسے شعرا سے واقفیت حاصل ہوئی۔ پابلو نیرودا نے اپنی یادداشتوں (MEMORIS) میں لکھا ہے کہ اسپین کی خانہ جنگی کے دوران میڈرڈ میں جب انٹرنیشنل بریگیڈ کی ایک کانفرنس منعقد ہوئی تو نارو ے، اٹلی اور ارجنٹائن کے ادیبوں کے ساتھ اس نے شاعر اوکتاویو پاز (OCTAIVO PAZ) کو بھی مدعو کیا جو میکسیکو سے آیا تھا۔ اس وقت تک اس کی ایک ہی کتاب شائع ہوئی تھی جو اس نے کانفرنس سے دو ماہ قبل ہی نیرودا کو بھیجی تھی۔ اس کتاب کے بارے میں نیرودا کی رائے یہ تھی کہ "اس میں آئندہ ترقی کا ایک سچا

امکان موجود ہے۔"

نوبل انعام یافتہ شاعر اوکتا ویو پاز ۳۱ مارچ ۱۹۱۴ء کو میکسیکو میں پیدا ہوئے۔ ان کی شاعری ابتدا میں اپنی زبان کے بعض اہم شعرا کے زیر اثر رہی لیکن پھر عالمی کانفرنسوں میں مختلف ادیبوں اور شاعروں کی قربت اور ملاقاتوں نے ان کے اندر کچھ اہم تخلیقی جہات پیدا ہوئیں۔ وہ شروع ہی سے بائیں بازو کی جانب مائل رہے لیکن سرریئلزم سے ان کی وابستگی بہت نمایاں نظر آتی ہے۔ اوکتا ویو پاز کے کئی شعری مجموعے اور نثر کی کتابیں شائع ہو چکی ہیں۔ وہ میکسیکو کے قدیم کلچر پر بھی گراں قدر مقالات لکھ چکے ہیں۔ ان کا مجموعہ "سنگِ آفتاب" ازتیک (AZTEC) کی سنگی تقویم کو بطور علامت پیش کرتا ہے۔

اوکتا ویو پاز اپنے ملک کی جانب سے کئی سفارتی عہدوں پر فائز رہے۔ وہ برّصغیر پاک و ہند کی تہذیب اور مشرقی روایات سے ایک دانشورانہ آگہی رکھتے ہیں۔ وہ کیمبرج سمیت کئی یونیورسٹیوں میں کلچر، شاعری اور تقابلی ادب کے موضوعات پر لیکچر بھی دے چکے ہیں۔ وہ ۱۹۶۲ء میں ہندوستان میں میکسیکو کے سفیر مقرر ہوئے۔ یہاں انھیں مشرقی فن و فلسفے سے گہری دل چسپی ہو گئی۔ انھوں نے ہندومت، بدھ مت، اسلامی تصوّف اور عجمی روایات کا خصوصیت کے ساتھ مطالعہ کیا۔ اس پس منظر کی جھلک پاز کی اکثر تحریروں اور تخلیقی نظموں میں نظر آتی ہے۔

اوکتا ویو پاز ایک ترقی یافتہ ثقافتی اور تنقیدی شعور رکھتے ہیں انھوں نے اپنے علاقے کی ثقافت کی بازیافت سے گہری دل چسپی لی۔ آثارِ قدیمہ کی روشنی میں ایسے نتائج اخذ کیے جو جدید انسانی معاشروں سے ربط و ہم آہنگی کی فضا پیدا کر کے ایک تاریخی تسلسل کی بنیاد ڈالتے ہیں۔ انھوں نے ہسپانوی زبان کے بعض اہم شاعروں کی طرح اپنی روایتی بوطیقا کے ساتھ جدید اسالیبِ تخلیق پر بھی منفرد پیرائے میں لکھا ہے۔ ان کا ایک اہم کارنامہ میکسیکو کے شاعروں کا ایک انتخاب ہے جو (AN ANTHOLOGY OF MEXICAN POETRY) کے نام سے مرتّب کیا گیا۔ انگریزی میں اس کا ترجمہ مشہور ادیب سموئیل بیکٹ (SAMUEL BECKETT) نے کیا اور اس کا مقدمہ سی۔ ایم۔ بورا (C.M. BOWRA) نے لکھا ہے۔ اس انتخاب کو پاز نے ۱۵۲۱ سے ۱۹۱۰ء تک محدود رکھا ہے۔ کیونکہ میکسیکو کی شاعری کی اس مدت کو سمیٹنا خاصا مشکل کام تھا۔ اوکتا ویو پاز نے اس مجموعے پر ایک تعارف بھی لکھا ہے جس کا تعلق میکسیکن شاعری کی تاریخ سے ہے۔

اوکتا ویو پاز ایک عالمی ذہن کے مالک ہیں۔ وہ پوری انسانیت کے لیے سوچتے اور لکھتے ہیں۔ ہیئت کے تجربے ان کی تخلیق کا خاص حصّہ ہیں۔ روایتی اسالیب سے لے کر نثری نظم تک وہ ہر پیراہن کو اختیار کر لیتے ہیں۔ مقامی علامات کے ساتھ ساتھ وہ دوسرے معاشروں اور تہذیبوں، دیو مالاؤں اور حکایات و اساطیر کو بھی اپنی تخلیقی فضا کے لیے اجنبی نہیں سمجھتے۔ ان کی مختصر نظمیں اپنا ایک جداگانہ مزاج اور آہنگ رکھتی ہیں۔ طویل نظمیں بجائے خود ایک روایت قائم کرتی ہیں۔ ان کے تخلیقی مقام اور سرمائے کے حجم و معیار کو دیکھ کر پورے وثوق سے کہا جا سکتا ہے کہ وہ اس وقت میکسیکو بلکہ ہسپانوی زبان کے سب سے بڑے شاعر ہیں۔

اوکتا ویو پاز کی چند نظموں کے ترجمے پیشِ خدمت ہیں:

اوکتاویو پاز کی چند نظمیں

صبح

پھر تیلے ہات
ایک کر کے جلدی جلدی،
ہرے کی ساری پٹیاں اتار لیتے ہیں
اپنی آنکھیں کھول دیتا ہوں
تازہ زخم
بیچوں بیچ
کبھی تک زندہ ہوں

یہاں

ے قدموں کی چاپ اس سڑک پر
رہی ہے
ایک اور سڑک پر
س سڑک سے گزرتے ہوئے
دموں کی آہٹیں سنتا ہوں
صرف کہر ہی ایک حقیقی شے ہے

محبت

ظار کی ساعت ہے
پھر
کی روشنی اپنی زلفیں بکھیر رہی ہے
نے اپنا دریچہ بند کر لیا
یہاں کوئی نہیں ہے۔
بے نام موجودگی مجھے گھیرے ہوئے ہے

یقین

پ سے نکلتی ہوئی سفید روشنی
حقیقی ہے
کیا لکھا ہوا ہات حقیقی ہے
اور جو کچھ میں لکھ رہا ہوں اُسے
دیکھتی ہوئی آنکھیں حقیقی ہیں؟
ایک لفظ سے دوسرے لفظ تک
جو کچھ میں کہتا ہوں مٹ جاتا ہے
مجھے معلوم ہے کہ میں
دو معترضہ جملوں کے مابین زندہ ہوں

ایک تاثر

اگر آدمی خاک ہے
تو میدان میں بکھرے ہوئے ذرّے
آدمی ہی ہوں گے

دوسرا

اس نے اپنے لیے ایک چہرہ تخلیق کیا
اس کی نسبت سے
وہ زندہ رہا، مر گیا اور پھر زندہ ہوا۔
آج اس کے چہرے پر
اُسی چہرے کی جھرّیاں ہیں
اور جھرّیوں کے پاس کوئی نیا چہرہ نہیں۔

یکم جنوری

سال کے دروازے
الفاظ کے دروازوں کی طرح
نامعلوم کی سمت کھلے ہیں
کل رات تم نے مجھ سے کہا تھا:

کل

ہم شبیہیں تلاش کریں گے
منظر کی تصویر کشی کریں گے
اور دن اور کاغذ کے دوسرے صفحے پر
ایک نقشہ تیار کریں گے
کل ہمیں ایک بار پھر
اس دنیا کی اصلیت کو ایجاد کرنا ہوگا
میں نے دیر سے آنکھیں کھولیں
ایک لمحے کے لمحے میں
میں نے بالکل ایسا ہی محسوس کیا
جیسا "ازتیک" نے محسوس کیا ہوگا
پہاڑ کی چوٹی پر لیٹے لیٹے
وقت کی بے یقین واپسی کا انتظار
جیسے وقت افق میں شگاف ڈال کر
اس طرف چلا آئے گا۔
لیکن دیکھو سال تو لوٹ آیا
اس نے اپنے وجود سے سارا کمرہ بھر دیا
اور میں اپنی نگاہوں سے اسے جیسے چھو رہا ہوں
وقت نے ہماری مدد کے بغیر ہی
کل کی طرح آج بھی اسی ترتیب کے ساتھ
خالی گلیوں میں مکانات رکھ دیئے ہیں
مکانوں پر برف

اور برف پر خاموشی رکھ دی ہے
تم میرے برابر
ملفوف محوِ خواب تھیں
دن نے تمہیں تخلیق کر لیا تھا
لیکن تم نے یہ تسلیم کرنے سے انکار کر دیا
کہ دن نے تمہیں تخلیق کیا ہے
— اور یہ بھی کہ میں بھی دن کی تخلیق نہیں ہوں۔
تم ایک اور دن میں تھیں
تم میرے برابر ہی لیٹی تھیں
میں نے تمہیں دیکھا،
جیسے برف نظاروں کے درمیان خوابیدہ ہو
وقت ہماری مدد کے بغیر ہی،
مکانات، گلیاں، درخت
اور خوابیدہ عورتیں تخلیق کر لیتا ہے
جب تم جاگ اٹھو گی
تو ہم ایک بار پھر
ساعتوں اور ان کی تخلیقات کے درمیان
گھومیں پھریں گے
ہم نظاروں کے درمیان سیر کریں گے
اور وقت اور اس کے متعلقات کی گواہی دیں گے
شاید ہم وقت کے دروازے کھول سکیں
اور نامعلوم کی سرحدوں میں داخل ہو جائیں

اُمِّ سلمیٰ
شعبۂ اردو و فارسی ڈھاکہ یونیورسٹی

نواب سیّد محمد آزاد کی اردو خدمات

نواب سیّد محمد آزاد کا تعلق ڈھاکہ (بنگلہ دیش) سے تھا۔ انیسویں صدی میں وہ نہ صرف بنگال بلکہ پورے برِّصغیر کی ادبی دنیا میں ممتاز مقام کے حامل تھے۔ ان کا شمار "اودھ پنچ" لکھنؤ کے مشہور لکھنے والوں میں سے تھا۔ "اودھ پنچ" کا اجرا منشی سیّد سجّاد حسین کی زیرِ ادارت ۱۸۷۷ء میں ہوا۔" اودھ پنچ کے لکھنے والوں میں علاوہ منشی سجّاد حسین کے مرزا مچھو بیگ ستم ظریف، احمد علی شوقؔ، پنڈت تربھون ناتھ ہجرؔ، بالو جوالا پرشاد برقؔ، منشی احمد علی کسمنڈوی، اکبر حسین اکبر اور نواب سیّد محمد آزاد کے نام خصوصی طور پر وابستہ ہیں۔ مگر اودھ پنچ کے ان سب معاونین میں نواب سیّد محمد آزاد تحریروں کو نسبتہً زیادہ اہمیت حاصل ہے۔ دراصل اودھ پنچ کے اس دور میں اگر کسی شخص کو صحیح طور پر طنز نگار کہا جا سکتا ہے تو وہ نواب آزاد ہیں۔ اور اگرچہ بعض مقامات پر ان کی طنز کا انداز بالواسطہ ہے اور انھوں نے ایک تیز اور درشت لہجہ بھی اختیار کیا ہے۔ تاہم بہ حیثیت مجموعی ان کے ہاں زہرناکی اور کینہ پروری کے عناصر بہت کم ہیں۔ اپنے مضامین میں آزاد نے مغربی تہذیب کے علاوہ اپنی تہذیب کو بھی ہدفِ طنز بنایا ہے۔ جہاں ان کے خطوط میں مغربی تہذیب کا خاکہ اڑایا گیا ہے وہاں ان کے ناول "نوابی دربار" میں اودھ کی نوابی زندگی پر طنز کی گئی ہے[1]۔ آزاد کا قلم نواب زادوں کی بے فکری اور عیش پسندی کا خاکہ کھینچنے میں مشتاق تھا[2]۔ علاوہ ازیں انھوں نے عبید زاکانی کی تعریفات کے انداز میں ایک ڈکشنری بھی لکھی جس میں انتہائی ظریفانہ انداز سے بعض تلمیحات کے معنی بتائے ہیں[3]۔

نواب سیّد محمد آزاد ۱۸۴۶ء میں ڈھاکہ (بنگلہ دیش) میں پیدا ہوئے۔ ڈھاکہ کے رئیس خان بہادر سیّد علی مہدی ان کے دادا اور سیّد اسدالدین حیدر ان کے والد تھے۔ نواب صاحب کے پردادا میر اشرف علی ایران سے ہجرت کر کے ڈھاکے آئے تھے۔ اس طرح یہ خاندان ڈھاکہ میں آباد ہو گیا۔ سیّد محمد آزاد کے بڑے بھائی سیّد محمود آزاد اپنے زمانے میں اردو و فارسی کے ممتاز شعرا میں شمار ہوتے تھے اور آزاد تخلص فرماتے تھے۔ سیّد محمد آزاد نے شاعری کو نہیں البتہ نثر میں شاعری ضرور فرمائی اور قلمی نام کے طور پر انھوں نے بھی "آزاد" ہی کو پسند کیا۔ سیّد محمد آزاد نے ابتدائی تعلیم ڈھاکہ میں پائی۔ مسلمان شرفا کے دستور کے مطابق گھر پر دینی اور دنیوی تعلیم کے ابتدائی مراحل طے کیے۔ فارسی اور اردو کی تعلیم اس زمانے کے نامی

استاد آغا احمد علی اصفہانی سے حاصل کی۔ اگرچہ انگریزی تعلیم حاصل کرنا اس زمانے میں معیوب سمجھا جاتا تھا[۴] خصوصاً مسلمان انگریزی سے سخت نفرت کرتے تھے کیونکہ ان کے خیال میں انگریزی تعلیم حاصل کرنے کا مطلب ان کو عیسائیت کی مرغوب کرتا تھا۔ پھر صدیوں سے مسلمانوں کا ذریعہ تعلیم عربی اور فارسی زبان رہی۔ اپنی تہذیب و تمدن کی نمائندہ اس زبان کو چھوڑ کر انگریزی تعلیم حاصل کرنا وہ اپنی شان کے خلاف سمجھتے تھے۔ ان حالات کے باوجود انھوں نے اپنے روشن خیال والد سید اسدالدین حیدر کے ایما پر ۱۸۳۵ء میں ڈھاکہ میں ڈاکٹر جیمز ٹیلر کے قائم کردہ انگلش اسکول سے تعلیم حاصل کی[۵]۔ اپنے ایک خط میں اپنی انگریزی خوانی کا ذکر کرتے ہوئے کہتے ہیں:

"انگریزی میں مجھے انٹرنس فیل ہونے کی عزت بھی حاصل نہیں ہے۔ ہمارے وقت میں ہمارے شہر کے مسلمانوں کو انگریزی تعلیم سے مطلق رغبت نہ تھی۔ میں نے تفنناً چند روز انگریزی پڑھی تھی اور ۳ سال کالج بھی گیا تھا۔ اس کے بعد پھر اپنے خسر معظم نواب عبداللطیف صاحب بہادر مرحوم کی صحبت بابرکت میں کلکتہ میں رہ کر کتب بینی سے کسی قدر انگریزی حاصل کی اور پھر نوکری اختیار کرنے کے بعد بہ شرط ضرورت اپنی انگریزی کی تکمیل کرتا رہا[۶]"

سید محمد آزاد نے انگریزی میں آہستہ آہستہ کافی استعداد حاصل کر لی اور اپنی انگریزی دانی کی بدولت انھوں نے انگریزی زبان میں بھی مضامین نگاری کی اچھی مشق حاصل کی۔ وہ اخبار "رئیس و رعیت" میں اکثر ایڈیٹوریل مضامین لکھا کرتے تھے[۷]۔ بہرحال رسمی تعلیم کی تکمیل کے بعد وہ کلکتہ چلے آئے جہاں ان کی شادی نواب عبداللطیف کی صاحبزادی سے ہوگئی۔ نواب عبداللطیف نے اپنے داماد کی ملازمت کے لیے سرکاری سطح پر کوششیں شروع کر دیں[۸] جس کے نتیجے میں ۲ دسمبر ۱۸۷۳ء میں سرکار انگریزی کی ملازمت حاصل ہوگئی اور بہار میں سرنیہ کے اسپیشل سب رجسٹرار مقرر ہوئے۔ ۲۴ مارچ ۱۸۷۴ء میں اسی عہدے کی حیثیت سے ان کا تبادلہ مظفرپور ہوگیا۔ ستمبر ۱۸۷۶ء میں اس کے ساتھ آنریری مجسٹریٹ کے عہدے پر بھی متعین کیے گئے۔ جنوری ۱۸۷۸ء میں اپنی پرانی ذمہ داریوں کے ساتھ مظفرپور میں میونسپل کمشنر کے فرائض بھی انجام دینے لگے۔ ۱۸۷۹ء میں وہ مظفرپور ضلع اسکول کمیٹی کے سکریٹری مقرر ہوئے۔ فروری ۱۸۸۰ء میں وہ مظفرپور کے ڈپٹی مجسٹریٹ اور ڈپٹی کلکٹر کے عہدے پر فائز ہوئے اور ساتھ میں سب رجسٹرار، تعلیمی کمیٹی کے سکریٹری اور آنریری مجسٹریٹ کے فرائض بھی انجام دیتے رہے۔ اکتوبر ۱۸۹۲ء میں مظفرپور میونسپلٹی کے وائس چیئرمین بھی منتخب ہوئے۔ مظفرپور میں اتنے عرصے مختلف عہدوں پر فائز رہنے کے بعد جون ۱۸۹۴ء میں وہ ہگلی میں بہ حیثیت مجسٹریٹ اور ڈپٹی کلکٹر کے منتقل ہوگئے۔ یہاں تقریباً ۲ سال قیام کے بعد پٹنہ میں خصوصی محمڈن آفیسر کی حیثیت سے متعین ہوئے اور تقریباً پندرہ برس یہاں قیام فرما۔ پٹنہ میں قیام کے دوران دو دفعہ بنگال کونسل میں سرکاری ممبر منتخب ہوئے[۹]۔ ۱۹۰۲ء میں انھیں "خان بہادر" کا خطاب دیا گیا۔ اس عہد میں بہ حیثیت سرکاری آفیسر کے ایک ساتھ کسی کو "خان بہادر" کا خطاب اور بنگال کونسل میں سرکاری ممبر نامزد نہیں کیا گیا۔ یہ سید محمد آزاد کے لیے بڑا اعزاز تھا۔ ۱۹۰۶ء۔۱۹۰۵ء کے لگ بھگ وہ کلکتہ میں پریسیڈنسی مجسٹریٹ مقرر ہوگئے۔ اپنی ذاتی قابلیت کے بل پر ترقی کے بلند مدارج طے کرتے ہوئے آخر دسمبر ۱۹۰۶ء میں بنگال کے انسپکٹر جنرل آ

ریڈیشن ہوئے [۱۰] اس عہد میں اتنا عہدہ سید محمد آزاد کے لیے ہی نہیں بلکہ تمام مسلمانوں کے لیے ایک قابلِ فخر عمل تھا۔
سید محمد آزاد ۱۸۷۳ء سے ۱۹۰۷ء تک مختلف سرکاری عہدوں پر فائز رہے۔ چنانچہ ۳۶ برس کے طویل عرصے کے بعد وہ اپنے بڑے بھائی سید محمود آزاد سے ملاقات کی غرض سے اپنے وطن ڈھاکہ واپس آئے۔ ان کی ڈھاکہ آمد کے موقع پر نواب سر سلیم اللہ نے ۱۰ر جنوری ۱۹۰۷ء کو احسن منزل میں ایک استقبالیہ کا انتظام کیا جس میں ڈھاکہ کے چیدہ چیدہ لوگوں نے شرکت کی [۱۱] ۱۹۰۹ء میں آزاد کو نواب اور اس کے بعد آئی۔سی۔ او (امپیریل سروس آرڈر) کے خطاب سے نوازا گیا [۱۲] نواب کا خطاب حاصل ہونے پر بنگال کے لفٹیننٹ گورنر سر ایڈورڈ نارمن بیکر نے اپنی خوشی کا اظہار ان الفاظ میں کیا:

> BY CULTRE, ATTAINMENTS, FAMILY DESCENT, AND OFFICIAL RANK, YOU HAVE DESERVEDLY ACHIEVED A LEADING POSITION AMONG THE MUHAMMADAN COMMUNITY OF BENGAL; AND I HAVE REASON TO BELIEVE THAT THE CONFERMENT UPON YOU OF THE TITLE OF NAWAB WAS THE CAUSE OF GENERAL SATISFACTION AMONG YOUR CO-RELIGIONISTS. [۱۳]

آزاد ۱۹۱۲ء میں پنشن لے کر ملازمت سے سبک دوش ہوئے۔ سبک دوش ہونے کے بعد کلکتے میں ہی قیام رہا۔ ۱۲ر دسمبر ۱۹۱۶ء کو وفات پائی۔ اکبر الہ آبادی اسی روز ایک خط میں خواجہ حسن نظامی کے نام لکھتے ہیں۔

> "...... نواب سید محمد خان آف کلکتہ انتقال کر گئے۔ ابھی تار آیا۔ نہایت افسوس ہوا میرے بڑے دوست اور قدردان تھے۔"

سید محمد آزاد "اودھ پنچ" میں تو باقاعدہ لکھا ہی کرتے تھے۔ لیکن انھوں نے سب سے پہلے فارسی اخبار "دوربین" میں جو محمڈن لٹریری سوسائٹی کا پرچہ تھا، مضمون لکھنے شروع کیے۔ وہ کلکتہ محمڈن لٹریری سوسائٹی کے وائس پریذیڈنٹ بھی تھے۔ نواب آزاد انیسویں صدی میں بہترین اردو لکھنے والوں میں سے تھے۔ ان کے مضامین اودھ پنچ لکھنؤ کے علاوہ آگرہ اخبار آگرہ، "مشیر قیصر لکھنؤ"، "اکمل الاخبار" دہلی اور کلکتہ کے انگریزی اخبار "رئیس اینڈ رعیت" میں شائع ہوتے تھے۔ [۱۴]
"خیالاتِ آزاد" نواب آزاد کی پہلی تصنیف ہے۔ یہ ان مضامین کا مجموعہ ہے جو وقتاً فوقتاً "اودھ پنچ" لکھنؤ میں چھپا کرتے تھے۔ "خیالاتِ آزاد" تین بار شائع ہوئی۔ اس کا پہلا ایڈیشن ۱۸۸۷ء میں قومی پریس لکھنؤ سے شائع ہوا۔ اس کا دیباچہ سید محمد عبدالغفور شہباز نے لکھا تھا۔ اسے انھیں نے مدوّن کیا اور انھیں کے اہتمام سے چھپا تھا۔ اس مجموعے میں مندرجہ ذیل مضامین شامل تھے۔ (۱) مولانا آزاد کی ڈکشنری (۲) مولانا آزاد کا خمارستان کا ڈبہ (۳) مولانا آزاد کا

نامہ و پیام (۴) مولانا آزاد کا ولایت کا شوق (۵) مولانا آزاد کا سفر نامہ (۶) مولانا آزاد کا اشتہار مسرت بار (۷) مولانا آزاد کی تسائنس یکچر۔

"خیالاتِ آزاد" کے پہلے ایڈیشن کے بارے میں محمد عبد المجید حمید کہتے ہیں:

"خیالاتِ آزاد جو مولانا آزاد کی پہلی تصنیف ہے اس کو ایسی مقبولیت حاصل ہوئی شاید اردو زبان میں اس طرزِ جدید اور اندازِ غریب کی کوئی کتاب چھپی ہو جس کو ایسی عالمگیر شہرت اور خداداد مقبولیت حاصل ہوئی اور جیسے ایسے ذوق و شوق سے اردو لٹریچر کے شائقین و ماہرین نے اس کثرت سے پڑھا ہو اور پبلک نے جس کی اس قدر قدر کی ہو۔ حصہ اول مطبوعہ ۱۸۸۷ء کی تمام جلدیں عرصۂ قلیل میں فروخت ہو گئیں اور وہ کتاب نایاب ہو گئی۔ مگر اس کی خریداری کا جوش اور اس کے مطالعہ کا شوق زمانۂ دراز تک ملک کے قابل اور قدرداں لوگوں میں بدستور باقی رہا۔"[۱۵]

لوگوں کے اسی اصرار پر ۱۹۰۸ء میں "خیالاتِ آزاد" کا دوسرا ایڈیشن شائع کیا گیا۔ اس میں وہ مضامین بھی شامل کر دیے گئے جو ۱۸۷۸ء سے ۱۹۰۳ء تک اخبار اودھ پنچ میں شامل ہوئے اور جو عوام میں بہت مقبول ہوئے۔ دوسرے ایڈیشن میں مندرجہ ذیل مضامین کا اضافہ کیا گیا:

(۱) لوکل سیلف گورنمنٹ کی نئی چمکتی ہوئی ڈکشنری (۲) نئے سال کی نئی روشنی کی نئی ڈکشنری (۳) پرانی اسکول کی نئی اسکول ڈکشنری (۴) چودھویں صدی کی پرانی روشنی کی ڈکشنری (۵) حسرت انجام نامہ و پیام (۶) حسرت فرجام نامہ پیام (۷) بادشاہ نسب امراض (۸) حسن کا مالیخولیا (۹) روئیداد اجلاس جنجال کونسل (۱۰) گرماگرم تار کی خبریں۔

"خیالاتِ آزاد" تیسری بار ۱۹۷۶ء میں مکتبۂ خیابانِ ادب لاہور سے شائع ہوئی جسے ڈاکٹر غلام حسین ذوالفقار نے ترتیب دیا اور انھوں نے اس کا مقدمہ بھی لکھا۔ اس میں صفحات کی تعداد تین سو ہے۔

"خیالاتِ آزاد" میں شامل مختلف مضامین آزاد نے اپنے قلمی نام "آزاد" کے علاوہ موضوع و مضمون کے لحاظ سے دیگر قلمی ناموں، جیسے کوئی نہیں، نئی روشنی کا ہستی سوز چراغ، تمدنی سویٹر، سعید ازلی، تیغ بے نیام، لیلیٰ خروس، صوفیہ، سی سالہ مجردِ فطرت، محمد بصیر اللہ خاں، ادیٹر رور، خاص رپورٹر اودھ پنچ وغیرہ جیسے قلمی ناموں کا بھی استعمال کیا ہے۔

"خیالاتِ آزاد" میں آزاد نے اول ڈکشنری کا انداز اختیار کیا ہے۔ اس سلسلے میں آزاد ہر سال نئی تہذیب سے متعلق چند الفاظ کا انتخاب کر لیتے تھے اور ان کے گوناگوں مطالب کو انوکھے انداز میں پیش کرتے تھے۔ اور تلخ حقائق کو اس طرح خوش مذاقی کا جامہ پہناتے تھے کہ عقل دنگ رہ جاتی ہے۔ آزاد مغربی تہذیب اور انگریزی تعلیم کے ان اثرات کے ایک دم مخالف تھے جنھوں نے ہندوستان کی نئی نسل کو اسلام سے بیگانہ، مشرقی تہذیب و تمدن کی اچھی اقدار سے نفرت اور مغربیت کی بے جا نقالی کو قابلِ فخر سمجھنا سکھایا۔ وہ بھی اپنے دور کے لکھنے والوں کی طرح مشرق کے دلدادہ اور مغربیت کے مخالف ہیں۔ انھوں نے اپنے دور میں نثر نگاری میں ویسی ہی شہرت حاصل کی جیسی اکبر نے نظم میں حاصل کی۔ ان کی طنز کی تان بھی

یاست اور معاشرت پر ٹوٹتی ہے[16] اور اس غرض کے لیے انھوں نے ڈکشنری کا انداز بھی اختیار کیا اور ساتھ میں اپنی
زنِ طبع اور بلندیِ تخیل کا ثبوت پیش کیا۔ انھوں نے ڈکشنری میں الفاظ کے معنے ایسے نئے اور اچھوتے انداز میں پیش کیے
جن اصل مطلب سے دور کا بھی واسطہ نہیں۔ یہاں ان کی بلند تخیل عجیب تانیں لگاتی ہے۔ ڈکشنری میں جو الفاظ استعمال
ہے گئے ہیں ان میں سے چند یہ ہیں: آنر، انٹرسٹ (حقوق)، پارٹی فیلنگ، پولیسی سویلیزیشن، فیمیل ایڈوکیشن،
۔۔ شپ، کون شینس، تھیبنکس، پارلیمنٹ، یورپین، کنسرٹ، سائنٹفک فرانیٹر، اولڈ پاپا، مہذب لی بی وغیرہ۔

اب بطور مثال چند الفاظ اور ان کی توضیح کے کچھ حصے پیش کیے جاتے ہیں۔

پولیسی (حکمتِ عملی) خیالی پلاؤ، مفت کرم داشتن، لہو لگا کے شہیدوں میں نام، بانگ بے ہنگام، خود ستائی،
دغرضی، وعدہ فراموشی، آشنا فراموشی، گیدڑ بھبکی، ہوائی بندوق کی آواز.......

آنر (عزت) مفہوم خیالی، جی خوش کرنے کے لیے ایک موثر لفظ۔ لندن کے اخبار نویسوں کی خامہ فرسائی کے لیے
۔نفیس تختۂ مشق، پھوٹی ہوئی ہانڈی۔ نقارخانے میں طوطی کی آواز عنقا.......

پارٹی فیلنگ (پاسداری جماعت) مرغ بے ہنگام کی طرح چلانا۔ غول بیابانی کا قائم مقام بن کر اپنے ہم جماعتوں
رہ راست سے بہکانا۔ بے ہودہ شکایت۔ ناجائز تہمت۔ ناحق پسندی کا کوٹ جاکٹ پہن کر ایمان پرستی کا ذوق....

سویلیزیشن (تہذیب) اپنے ہم وطن کو نیم وحشی بنانا۔ اپنے بزرگوں کو اولڈ گوس کہنا۔ جاکٹ پتلون پہننا۔
سڑک پر چلتے وقت سیٹی بجانا۔ چھڑی ہلا کر بوٹ پٹکنا۔ آلو کھانے کا شوق۔ شراب پینے کا ذوق۔ گردن مروڑی مرغی حلال۔

فیمیل ایڈوکیشن (تعلیم نسواں) عام جلسوں میں اپنی بہو بیٹیوں کو لے جانا۔ اپنی میم کا ناچنے کے جلسے میں ایک وقت
لیے دوسری میم سے مبادلہ کرنا.......

پارلیمنٹ (جلسہ مدبرانِ ملکی) مدبروں کا آشیانہ۔ فصحا اور بلغا کی پرورش کا زچہ خانہ۔ کسی ملک کے قابل لوگوں
قوتِ گویائی کے تماشا دکھانے کا تھیٹر۔ وہ پالی جہاں کا اصیل اور ٹینی دونوں کٹڑ۔ زبانی لڑائی کا میدان۔ خیالی پلاؤ
پنے والوں کی دکان.......

"خیالاتِ آزاد" میں ڈکشنری کے بعد مولانا آزاد کا "نامہ و پیام" ہے۔ یہ پندرہ کی تعداد میں خطوط ہیں۔
میں ایک بیوی کے نام۔ تین باپ، تین دوستوں کے نام۔ اس کے بعد پانچ خطوط "تیغ بے نیام" کی طرف سے مولانا
کو لکھے گئے ہیں۔ ان خطوط میں مغربی تہذیب و معاشرت پر ناقدانہ نظر ڈالی گئی ہے۔ تین خطوط ایک ولایتی میم صوفیہ
طرف سے ہیں جو اپنے دیسی شوہر کے ساتھ ہندوستان کی سیاحت کو آئی ہوئی ہے۔ یہ تینوں خط اس نے سیلینا کے نام
ے ہیں۔ ان خطوط کے بارے میں ایک غلط فہمی پیدا ہوئی۔ تاریخ ادب اردو کے مصنف رام بابو سکسینہ لکھتے ہیں: "آپ
لستان بھی گئے تھے اور وہاں سے جو خطوط بھیجے ہیں وہ نہایت دل چسپ ہیں"[17] ڈاکٹر وزیر آغا "اردو ادب میں طنز و مزاح"
لکھتے ہیں: "ان کے خطوط میں جو انھوں نے لندن سے تحریر کیے، مغربی تہذیب کا خاکہ اڑایا گیا ہے"[18] "حالانکہ نہ سید
آزاد بہ نفس نفیس کبھی انگلستان گئے تھے اور نہ واقعی انھوں نے یہ خط انگلستان سے ہندوستان بھیجے تھے، بلکہ یہ سارا

کھیل تخیل کا ہے۔ آزاد کی ذہانت و ذکاوت کی داد دینی چاہیے کہ انھوں نے اس طور پر یہ سارا کھیل کھیلا ہے اور حالات و کوائف کو اس طرح پیش کیا ہے کہ دید و شنید میں کوئی فرق نہیں رہا اور دیکھنے والوں کو نقل پر اصل کا ایسا دھوکا ہوا کہ وہ اسے حقیقی و واقعی سمجھ بیٹھے۔ ان خطوط میں آزاد نے مغرب کی تہذیب کا دل چسپ خاکہ اُتارا ہے۔ ایک مغرب زدہ نوجوان انگلستان سے اپنے دوست کو لکھتا ہے:

"آپ کو حیرت ہوئی ہوگی کہ ابھی تو مجھے یہاں آئے مہینے دو مہینے ہی ہوئے ہیں اور اسی عرصے میں، میں قلم ہاتھ میں لے کر یہاں کے حالات اور خیالات اور رسم و رواج اور طریقِ معاشرت و تمدن وغیرہ وغیرہ پر رائے دینے بیٹھ گیا اور "کَے آمدی و کَے پیر شدی" کا مصداق بن بیٹھا۔ مگر نہیں، مجھے اس تھوڑے عرصے میں یہاں کے لوگوں کے اندرونی و بیرونی حالات کے دیکھنے اور جانچنے کا جو موقع ملا ہے ایسا شاید کسی کو سالہا سال میں نہیں ملے گا۔ کیونکہ میری رسائی کا حلقہ بہت بڑا ہے اور میرا گزر ایسے مقامات میں ہوتا ہے جہاں فرشتوں کے بھی پر جلتے ہیں۔ یہاں کے لوگ گویا آزادی کے عاشق ہیں اور نقشِ آزادی گویا ان کے دلوں پر کندہ ہے۔ ان کو دولت، حشمت اور ریاست، کسی چیز کی پروا نہیں۔ مگر جہاں ان کی آزادی کو کسی نے انگلی دکھائی، فوراً خون بہانے کو موجود ہیں۔ آزادی کے نشے میں انگلستانی لوگ کچھ ایسے مدہوش ہیں کہ اس کی ترنگ میں انھوں نے اپنے سب قسم کے حقوق کو عورتوں میں بانٹ لیا ہے اور مرد و عورت کی حالت میں کوئی فرق نہیں۔ معاذ اللہ یہاں عورتیں گھوڑا دوڑاتی ہیں۔ ناچتی ہیں۔ غیر مردوں کے ساتھ پھرتے جاتی ہیں۔ دوکانوں میں بیٹھتی ہیں اور خدا جانے اور کتنے دھندے کرتی ہیں۔ ہمارے عفت آباد ہندوستان کی عورتوں سے اگر یہاں کی عورتوں کی بے پردگی اور بے شرمی اور دلیری کی کیفیت بیان کی جائے تو ان کو فوراً شرم اور خوف اور غصے سے اس قسم کی حارتپ آجائے جو مثل شاخ چنار ان کو جلا دے۔ یہاں کے مکانات، سواریاں سب بے پردہ ہیں۔[19]"

ان خطوط کے ضمن میں کہیں کہیں ہندوستانی معاشرے کی بُرائیوں کی بھی نشاندہی کی ہے۔ جیسا کہ ایک خط کے اس حصے میں:

"عورت اور مرد دونوں بندۂ خدا ہیں۔ پھر کیا وجہ کہ انصاف برابر نہ کیا جائے۔ مرد عمر بھر بدمعاشی کریں، شراب پئیں، دو دو سو خاص عورتیں ان کی خدمت میں حاضر رہیں مگر عزت و عظمت میں کوئی فرق نہیں۔ بڈھے بدمعاش اور لچے جن کو دنیا میں اور کوئی امید باقی نہیں رہتی، نماز پڑھنے لگتے، تسبیح لٹکاتے، پیشانی پر گھٹے بناتے اور خوش اخلاق بھلے مانس بن جاتے ہیں۔ پھر کیا وجہ کہ ایک عورت جس نے مذاق دنیوی کے خیال سے

ایک آدھ مرتبہ بے اعتدالی کی ہو، بعد اپنی خصلت درست کرنے کے قابل معافی نہ ہو۔
عورت کے واسطے تو ع شیشۂ بشکستہ را پیوند کردن مشکل است ہے۔ لیکن مرد
کی خصلت کا شیشہ نہیں معلوم کس طلسم کا بنا ہوا ہے کہ اس کو کچھ آفت نہیں۔"[۲۰]

خطوط کے بعد مختلف موضوعات پر "نو" مضامین ہیں۔ ہر مضمون اسلوب نگاری کا ایک بہترین نمونہ ہے۔ مگر ...سب سے قابلِ ذکر "مولانا آزاد کی ستائشِ نیچر" ہے۔ اس مضمون میں مصنف تخیل کے سہارے آگے بڑھتے ہیں اور اپنی ...معمولی تخلیقی قوت اور طباعی کا ثبوت دیتے ہیں۔ نثر میں شعریت کا احساس اس مضمون کی خصوصیت ہے۔ اس مضمون سے ...سطریں ملاحظہ فرمائیے:

"او بحر و بر کے خالق! شجر و ثمر کے خالق! خورشید و قمر کے خالق! اخگر و شرر کے خالق! نار و نور کے خالق! تاڑ اور کھجور کے خالق! نیل اور جھیل کے خالق! کوثر اور سلسبیل کے خالق! بہمن و دے کے خالق! ہر چیز اور ہر شے کے خالق! تو ہی کہیں آئینہ گہر ریز ہے۔ کہیں عمان دُرخیز، کہیں گلفامِ شفق، کہیں حکما کا وقت انگیز سبق، کہیں برفِ آسمانی، کہیں باڑھ کہیں طغیانی، کہیں زمردیں رنگ بصیرت نواز سبزہ زار، کہیں جیحون، کہیں فرات، کہیں برقِ آتش بار، کہیں رفیع الشان اور برف پوش سلسلۂ جبال، کہیں غضب نشان، عافیت سوز اور ہستی مالا مال بھونچال، کہیں نحوسب بار ستارہ دنبالہ دار۔"[۲۱]

"خیالاتِ آزاد" پر تبصرہ کرتے ہوئے عبدالغفور شہباز لکھتے ہیں:

"یہ اس شخص کے خیالات ہیں جس کا قلم آزاد و رقم زمانِ دراز تک اخبار نویسی اور وقائع نگاری کی عمارت کا ایک محکم اور استوار ستون رہا ہے۔ عالمِ انشا پردازی پر اس شخص کا اس قدر بڑا احسان ہے کہ فرنگستان میں شاید مکالے، کارلائل اور گولڈ سمتھ کا ہو۔ اس شخص نے اپنی وسعتِ خیالات کے مطابق بزورِ ذہانت و ذکاوت اردو کی انشا پردازی کے تنگ کوزے میں وہ گنجائش نکالی کہ دریا کیا، دیکھتے ہی دیکھتے سمندر کی سمائی نظر آئی۔"[۲۲]

"سوانح عمری مولانا آزاد" ان کی دوسری تصنیف ہے۔ یہ کتاب صبح صادق پریس عظیم آباد سے ۱۸۹۱ء میں چھپی اس کا ...ہ سید محمد عبدالغفور شہباز نے لکھا۔ صفحات کی تعداد ۱۶۸ ہے۔ اس کتاب کو انھوں نے پندرہ حصوں میں منقسم کیا ہے۔ ان کی دیگر کتابوں کی مانند یہ بھی قسط وار "اودھ پنچ" لکھنؤ میں چھپا کرتی تھی۔

"سوانح عمری مولانا آزاد" آزاد کے چالیس سالہ تجربات کا نچوڑ ہے اور مختلف پیشوں اور مشغلوں کے اسٹیج پر ایک ...اور خیالی شخص آزاد سے اس لطف کے ساتھ مختلف مشکل پارٹ کامیاب طور پر ادا کرانا انہی کا کام ہے۔ مصنف نے ...نا آزاد کی آڑ میں نئی روشنی کے چلتے پرزوں کے خوب پرزے اڑائے ہیں۔ سوانح عمری کا آغاز مولانا آزاد کی سات سالہ ...لی سے ہوتا ہے۔ ان کا مولد اور وطن صوبہ بہار کے ایک شہر میں تھا۔ جہاں انھوں نے اوّل اردو مکتب اور بعد ازاں

انگریزی اسکول میں داخلہ لیا۔ چودھویں برس انٹرنس پاس کر لیا۔ اب ملا کافی باشعور ہو چکے تھے اور یہ سمجھنے لگے کہ موجودہ زمانے کے اصول تمدن اور قواعدِ ناموری کے مطابق کوئی نیک نیت، ایماندار اور سچا آدمی بڑا شخص نہیں بن سکتا۔ اور ایسے دنیا میں معصوم نہ کہ ہر طرح کا عیش و آرام کبھی نصیب نہیں ہو سکتا۔ اس لیے مولانا آزاد نے لوگوں کو دھوکا دینے کے لیے موحد یا دری بننے کا شغل کر دیا۔ لیکن جب مسلمانوں اور ہندوؤں کی مخالفت کا سامنا ہوا تو اپنی کینچل بدلی اور ایک اسکول میں ماسٹر ہو گئے اور اپنی انگریزی دانی کی دھاک لوگوں کے دلوں پر خوب بٹھا دی۔ انگریزی اخبار منگواتے، ان کا مطالعہ کرتے، جو جی میں آتا تھا ہر ایک کے حسب مذاق و ضرورت سمجھا دیا کرتے پھر ہر مضمون پر ایک اپنی رائے بھی جوڑ دیتے۔ کسی انگریزی اخبار کی رائے کو اپنی رائے کہہ کر بھی خوب داد لیتے۔ اس کے بعد عورتوں کی اصلاح کا بیڑہ اٹھایا۔ اس سے کچھ فرصت ملتے ہی انھوں نے ایک عمدہ اخبار نکالنے کا ارادہ کیا، لیکن یہ تجربہ زیادہ کامیاب نہ رہا کہ انھوں نے اس کے ذریعے مذہبی اصلاح کا بیڑہ اٹھایا۔ پیری مریدی کے معرکہ آرا میدان میں اپنی بدقسمتی اور دشمنوں کی فتنہ پردازی سے شکست فاش کھا کر بہ ہزار خرابی اپنے وطن مالوف کو لوٹے لیکن ہمت نہ ہاری اور اب وکیل بننے کا ارادہ کیا۔ چونکہ کسی قدر انگریزی جانتے تھے اس لیے وکیل بننے کی خواہش پوری کر لی۔ اس پیشے میں ان کے اصلی جوہر اس عمدگی سے کھلے کہ ناموری حاصل کی۔ ناموری حاصل کرنے کے بعد لوکل سیلف گورنمنٹ میں میونسپل کمشنر، آنریری مجسٹریٹ اور تعلیمی کمیٹی کے ممبر مقرر ہو گئے اور ان کا نام سرکاری گزٹ میں بھی چھپنے لگا۔ اب ان کے دل میں خیال پیدا ہوا کہ کلکتہ جا کر کسی دولت مند خاتون سے شادی کی جائے کیونکہ ان کے خیال میں شادی کے ذریعے سے ہزاروں آدمی ولایت اور ہندوستان میں امیر بن چکے ہیں۔ چنانچہ انھوں نے کلکتہ کے ایک علم دوست ملک التجار کی اکلوتی نواسی سے عقد کر لیا۔ یہ خاتون بہت آزاد خیال تھیں۔ ایک گھر میں رہنے کے باوجود تسکین سے گھنٹے دو گھنٹے بھی مولانا آزاد سے ملاقات نہیں رہتی تھی۔ ان کو اپنے نوجوان مرد احباب کے ساتھ گنجفہ اور بلیرڈ کھیلنے اور ہارمونیم بجانے سے کہاں فرصت تھی۔

ایک دن صبح کو مولانا آزاد نے اپنے محفوظ صندوق کو جوان کے خاص کمرے میں رہتا تھا، ٹوٹا ہوا پایا اور اس میں سے بیش قیمت اور ضروری اسناد کا بکس غائب نظر آیا۔ مولانا آزاد نے کاغذات اور اسنادِ مسروقہ کے متعلق اپنی بیوی کے خلاف قانونی کارروائی کرنے کا ارادہ کیا لیکن ان کی اہلیہ نے الٹا ان پر پولیس کورٹ میں دغا و فریب کی نالش دائر کر دی اور مولانا آزاد کو ایک زمانہ معتدبہ تک جیل میں رہنا پڑا۔ جیل میں ان کی ملاقات سیکڑوں ایسے لوگوں سے ہوئی جو ان کی طرح مکار اور پُر فریب عورتوں کے ستائے ہوئے تھے۔ اور بیسیوں ایسے بھی تھے جو پولیس کی شرارت سے پھنس کر ناحق وہاں مہمان بنائے گئے تھے۔

"سوانح عمری مولانا آزاد" حقیقت میں ایک ہزار غرفہ قصر رفیع الشان ہے جس کے ہر غرفے سے ایک نئی مصلحت اور نئے خیال کا آدمی آزادانہ جھانک رہا ہے۔

"نوابی دربار" ان کی ایک دوسری تصنیف کا نام ہے۔ یہ ایک نثری ڈراما ہے۔ اس سے پہلے امانت کی اندرسبھا (۱۸۵۳ء) طرز کے ڈرامے جن میں گانوں کی آمیزش ہوتی تھی، اردو میں مقبول تھے۔ جنھیں "اوپیرا" کہنا زیادہ مناسب معلوم

ہوتا ہے۔ مگر "نوابی دربار" میں گانوں کے بغیر ہم خالص نثری مکالمے دیکھتے ہیں۔ نوابی دربار پہلے کب شائع ہوئی، کچھ وثوق سے نہیں کہا جا سکتا۔ اس کا دوسرا ایڈیشن ۱۹۰۱ء کا طبع شدہ ہے۔ جس کے مرتب سید محمد عبدالغفور شہباز تھے۔ تیسری مرتبہ ممتاز منگلوری نے نومبر ۱۹۶۶ء میں مکتبۂ خیابانِ ادب لاہور سے شائع کرایا، اس کا مقدمہ بھی انھیں نے تحریر کیا۔ صفحات کی تعداد ۱۰۴ ہے۔

یہ ڈراما اودھ پنچ میں ۱۲ راپریل ۱۸۷۸ء سے چھپنا شروع ہوا اور پورے چار مہینے تک چھپتا رہا کیونکہ ۱۲ ہی جولائی کو ختم ہوا۔ اس اثنا میں ناظرین اودھ پنچ کے شوق کی برابر یہ کیفیت رہی کہ گویا واقعی کسی اعلیٰ درجے کے تھیٹر میں بیٹھے ہیں۔ عمدہ سے عمدہ تماشا ہو رہا ہے۔ ٹکٹکی بندھی ہے نظارہ پلک جھپکانے کی اجازت نہیں دیتا۔[۲۳]

"نوابی دربار" کی سب سے بڑی خوبی اس کا پلاٹ ہے جس کا تعلق حقیقت و صداقت سے خوب گہرا ہے۔ وہ ہماری زندگی کے ایک گوشے کا ترجمان ہے۔ کوئی واقعہ بھی ایسا نہیں جس میں تصنّع، بناوٹ اور غلط کاری کا اہتمام برتا گیا ہو۔ انھوں نے سماج کے جس گوشے کو ڈرامائی انداز میں پیش کیا اس کو اسی انداز میں پیش کیا جیسا کہ عموماً وقوع پذیر ہوا کرتا ہے۔ یہ ڈراما ہندوستان کے امیر مسلمان خاندانوں کی تصویر کشی ہے جہاں خوشامدی درباری اپنے امیروں کو الو بنا کر ان سے روپیہ اینٹھنے کے منصوبے بناتے رہتے تھے۔ بھولے بھالے نواب اپنے درباریوں اور مصاحبوں کو فرشتوں جیسا پاک باز سمجھ کر ان کی باتوں میں آجاتے جس کی وجہ سے درباریوں کے ذریعے ان عقل کے اندھوں سے روپیہ بٹورنا آسان ہو جاتا۔ اس غرض کے لیے اگر لوگوں کے خلاف جھوٹا مقدمہ دائر کرنے کا منصوبہ بنانا ہوتا تو بھی اب کر گزرتے۔

"نوابی دربار" میں نواب صاحب کے علاوہ دیگر اہم کرداروں لوٹ مار خاں، میرزا مانہ ساز، میرزا خورشید بیگ، میرزا غضنفر بیگ، میر حاتی، میر سعید، غفور کوچبان اور گوورداس مہاجن کے کردار قابلِ ذکر ہیں۔ نسوانی کرداروں میں نجمنہ بیگم خانم صاحب، امام باندی، نوروزی جان، بی جاری، چمن اور مجیدن کے کردار ہیں۔

"نوابی دربار" کے تمام کردار اپنی سطح اور اپنی ذہنیت کے مطابق گفتگو کرتے ہیں۔ بیان میں سادگی اور روانی ہے۔ محاورے اور بول چال کا لطف کہیں ہاتھ سے نہیں جاتا۔ عربی، فارسی اور انگریزی الفاظ کا تلفظ بھی دیا ہے جیسے متعلقہ کردار ادا کر سکتا ہے۔

"نوابی دربار" کے علاوہ آزاد نے بہت سے ڈرامے اخلاقی مضامین پر لکھے جو اب متروک النظر ہیں۔ عبدالغفور شہباز نے نوابی دربار کے مقدمے میں ان کے ایک نا تمام ڈرامے "نوابی کھیل" کا ذکر کیا ہے۔ اور سوانح عمری مولانا آزاد کی ابتدا میں "کتب زیرِ ترتیب" کے اشتہار میں بھی "نوابی کھیل" کا ذکر یوں درج ہے: "نوابی کھیل" کلکتے کے ہر حلقے کے چلتے پرزوں کی خوش فعلیوں کی ایک موثر اور دل کش تصویر۔ پیرایۂ ظرافت۔" بعد میں یہ ڈراما منظرِ عام پر آیا کہ نہیں معلوم نہ ہو سکا۔ اسی اشتہار میں "خیالاتِ آزاد" کے دوسرے حصّے کا بھی بیان ہے۔ مگر یہ دوسرا حصّہ بھی عدم الوجود ہے۔

الغرض سید محمد آزاد نہ صرف بنگال بلکہ پورے برِصغیر کی اردو دنیا کے لیے باعثِ فخر تھے۔ ان کی ادیبانہ

صلاحیتوں کا ذکر کرتے ہوئے اخبار "پائونیر" لکھتا ہے:

SYED MAHOMED IS ALSO A NOTED PERSIAN SCHOLAR, A BORN ORATOR AND PERHAPS THE MOST ORIGINAL AND GIFTED OF CONTEMPORARY URDU WRITERS. HE IS THE MASTER OF A CHASTE AND ELEGANT STYLE N URDU

حواشی

[1] وزیر آغا "اردو ادب میں طنز و مزاح (لاہور اکادمی پنجاب ۱۹۵۸ء) صفحہ ۱۲۵۔ [2] "نقوش" (طنز و مزاح نمبر) (لاہور: ادارہ فروغِ اردو ۱۹۵۹ء) ص: ۲۵۵۔ [3] "اردو ادب میں طنز و مزاح" ص: ۱۲۵۔ [4] مقدمہ "خیالاتِ آزاد" ص: ۱۸۔

[5] AZIMUSSHAN HAIDER (ED) A CITY AND ITS CIVIC – BOBY DACCA, 1966 P.15

[6] پنڈت کشن پرشاد کول (مرتب) گلدستۂ پنج (لکھنؤ ہندوستانی پریس ۱۹۱۵ء) ص: ۱۰۷۔ [7] ایضاً ص: ۸

[8] THE PIONEER, 8TH FEBRUARY, 1907

[9] THE ENGLISH MAN 4TH DECEMBER, 1906

[10] THE ENGLISHMAN 14TH JANUARY, 1907

[11] وقار راشدی "مشرقی بنگال میں اردو" ص: ۸۳

[12] CONGRATULALIONS ON THE TITLE OF "NAWAB" CONFERRED ON NAWAB SYUD MAHOMED KHAN BAHADUR, INSPECTOR – GENERAL OF REGISTRATION, (CALCUTTA, BENGAL – FARE PRESS 1912) P. 1

[13] گلدستۂ پنج۔ ص: ۱۰۸۔ [14] مقدمہ "خیالاتِ آزاد ص: ۸

[15] غلام احمد فرقت کاکوروی، "اردو ادب میں طنز و مزاح (لکھنؤ ادارہ فروغِ اردو، ۱۹۵۷ء) ص: ۱۲۳۔ [16] مرزا محمد عسکری (ترجمہ) "تاریخِ ادب اردو" (لکھنؤ مطبع منشی نول کشور، ۱۹۲۹ء) ص: ۱۰۶۔ [17] "اردو ادب میں طنز و مزاح" ص: ۷۵

[18] "خیالاتِ آزاد" ۔ص: ۱۲۱۔ [19] ایضاً ص: ۱۱۸۔ [20] ایضاً ص: ۲۳۶

[21] مقدمہ "خیالاتِ آزاد" ص: ۳۔ [22] دیباچہ "نوابی دربار" ص: ۱

[23] THE PIONEER 8TH FEBRUARY 1907

جمیل زبیری

اردو کا ایک جواں مرگ شاعر

اشعر ملیح آبادی

بڑی بڑی خوبصورت آنکھیں، روشن چہرہ، لانبی گردن، باریک ہونٹ، چہرے پر عموماً سنجیدگی اور متانت، میں ایک وقار، باتوں میں بڑی شائستگی، دبلا پتلا جسم اور کمال خوبصورت آواز اور لحن۔

یہ تھا اشعر ملیح آبادی۔ میرا ہم جماعت، میرا دوست، میرا ہم راز

اشعر ملیح آبادی سے میری پہلی ملاقات اس وقت ہوئی جب میں نے اٹاوہ انٹر کالج میں داخلہ لیا۔ ہم دونوں کے مین ایک تھے اور ذوق بھی۔ اس لیے ہم بہت جلد بہت قریب ہو گئے۔ ہم دونوں کی رہائش بھی قریب قریب تھی۔ رات دن اتھ اکٹھا بیٹھنا تھا۔ اس طرح ہماری دوستی کی بنیادیں مضبوط ہوتی گئیں۔

مجھے علم نہیں کہ اس نے شعر کہنا کب اور کس عمر سے شروع کیے، مگر وہ اس زمانے میں بھی اچھے شعر کہہ رہا تھا۔ جب کوئی یہ نظم مکمل ہو جاتی تھی تو وہ سب سے پہلے مجھے ہی سنایا کرتا تھا۔ اگر وہ مجھے بہت پسند آتی تھی تو وہ لکھ کر مجھے دے دیا تھ۔ اس کے ہاتھ کی لکھی ہوئی چند غزلیں اور نظمیں جو میں ہندوستان سے ہجرت کرتے وقت اپنے ساتھ لے آیا تھا آج بھی ے پاس محفوظ ہیں۔ اس زمانے کی ایک نظم کے چند بند۔

اے شاہدِ رعنا یہ تری مانگ کی افشاں
امبر پہ جھلک مارتے ہوں جیسے ستارے
یا سینۂ ظلمت سے بھڑکتے ہوں شرارے
یا رات کے دریا میں رواں نور کے دھارے

اے شاہدِ رعنا یہ تری مانگ کی افشاں
جس طرح کہ پگھلا ہوا بہتا ہوا لاوا
یا کفر کے بادل میں ہو ایماں کا نظارا
یا نہرِ لبن کا یہ جھلکتا ہے کنارا

اے شاہدِ رعنا یہ تری مانگ کی افشاں
جس طرح پگھل جاتی ہوں تاروں کی شعاعیں
جس طرح جھلک جاتی ہوں راتوں کو فضائیں
لو دیتی ہوں جس طرح ہوائی کی ادائیں
اے شاہدِ رعنا یہ تری مانگ کی افشاں

دو سال تک ہم لوگ ساتھ ساتھ پڑھتے رہے۔ شعر و شاعری ہوتی رہی۔ ان دنوں مجھے بھی شعر کہنے کا شوق تھا۔ بس یونہی سا۔ دراصل مجھے نثر سے زیادہ لگاؤ تھا۔ ہم دونوں کو تصویر کشی کا بھی شوق تھا۔ اشعر پنسل اسکیچ بہت اچھے بناتا تھا۔ میں زیادہ تر واٹر کلر استعمال کرتا تھا۔ جب بھی ہم کوئی تصویر بناتے تو فوراً ایک دوسرے کو دکھاتے اور پھر کھل کر بات ہوتی۔ جب کبھی کالج یا شہر میں کہیں کوئی مشاعرہ ہوتا تو اشعر کو ضرور مدعو کیا جاتا۔ میں ہمیشہ اس کے ساتھ جاتا اور جب وہ اپنی خوبصورت آواز میں غزل یا نظم پڑھتا تو محفل میں سناٹا چھا جاتا۔

اٹاوہ سے انٹر پاس کرنے کے بعد وہ علی گڑھ یونیورسٹی چلا گیا اور ہوسٹل میں رہنے لگا۔ میں نے سینٹ جانس کالج آگرے میں داخلہ لے لیا مگر ہماری خط و کتابت جاری رہی۔ اگر کبھی میرا علی گڑھ جانا ہو جاتا تو میں اس کے ہوسٹل میں اس سے ملنے ضرور جاتا۔ اس کے ساتھ اس کے کمرے میں ایک طالب علم اور رہتا تھا، افسوس مجھے اس کا نام یاد نہیں رہا۔ اس کے آس پاس پلنگ پر کتابیں پھیلی ہوتیں۔ قریب ہی رکھی ہوئی چھوٹی سی میز پر کاغذ قلم دوات، چائے کی پیالی اور سگریٹ کی ڈبیا اور ماچس رکھی ہوتی۔ اس زمانے میں اس کی ایک نظم چھپی جس کا بہت چرچا ہوا۔ اس کے چند بند :

آثارِ سحر کے پیدا ہیں مہتاب کا ہالہ ڈوب گیا
وہ صبح کا دھندلا تارا بھی لے کے سنبھالا ڈوب گیا
شبنم کی مصفّا بوندوں میں لالے کا پیالہ ڈوب گیا
یہ صبحِ چمن، یہ دورِ طرب افسوس کہ تم سے دور ہوں میں

مشرق سے عیاں خورشید ہوا اک خنجرِ خوں آشام لیے
مرغانِ چمن نے شور کیا، ذرّوں نے خدا کے نام لیے
کانٹوں نے جنونِ الفت میں پھولوں کے گریباں تھام لیے
یہ صبحِ چمن، یہ دورِ طرب افسوس کہ تم سے دور ہوں میں

افلاک سے کرنیں اتری ہیں گلزار میں شبنم پینے کو
کانٹوں نے بڑھا دی ہیں نوکیں پھولوں کا گریباں سینے کو
یہ موسمِ گل اور تنہائی کیا جی چاہے بھلا جینے کو
یہ صبحِ چمن، یہ دورِ طرب افسوس کہ تم سے دور ہوں میں

سینٹ جان کالج آگرہ میں اس زمانے میں اردو ڈیپارٹمنٹ کے انچارج اردو کے مشہور مصنّف، نقّاد، شاعر اور ...ہوئے عالم و استاد پروفیسر حامد حسن قادری تھے (جو تقریباً ۳۰ علمی اور ادبی کتابوں کے مصنّف ہیں) ان کی سربراہی میں کالج ...ایک اردو ادبی کمیٹی تھی۔ انھوں نے مجھے اس ادبی کمیٹی کا سکریٹری مقرر کر دیا تھا۔ ہم نے کالج میں ایک مشاعرہ منعقد کیا اور ...صاحب سے اجازت لے کر علی گڑھ سے اشعر ملیح آبادی کو مدعو کیا۔ اس کی شرکت سے اس مشاعرے میں جان پڑ گئی۔ اس نے ...اپنی غزل پڑھی تو لوگ متحیّر ہو گئے۔ معلوم ہوتا تھا کسی نے جادو کر دیا ہے۔ اس غزل کے کچھ اشعار مجھے ابھی تک یاد ہیں۔

اٹھ ساقیٔ نوجواں سبو لے — تاروں کے کنول ہیں پھولے پھولے
ہم دونوں خموش کیا رہیں گے — رگ رگ میں ہیں شوق کے بگولے
ہاں، ہم نہ بھلا سکے ہیں تم کو — لیکن کبھی تم بھی ہم کو بھولے
مطرب کوئی گیت اور غمگیں — جو دکھتے دلوں کے تار چھو لے

اس سے کئی غزلیں اور سُنی گئیں اور بہت داد ملی۔ جب تک اشعر میرے پاس رہا بڑا اچھا وقت گزرا۔ اس کے ...نے کے بعد اگلے روز میں حسبِ دستور شام کو قادری صاحب کے گھر حاضر ہوا۔ وہ بڑے محبّت والے اور بڑے ہی مشفق ...اد تھے۔ اور مجھ پر ہمیشہ ان کی خاص عنایات رہا کرتی تھیں۔ ان کی طبیعت میں ظرافت بہت تھی اور وہ جب کوئی ...یا فقرہ جس میں مزاح کا کوئی پہلو ہو، کہنا چاہتے تو ان کی آنکھیں پہلے سے ہنسنے لگتی تھیں۔ اس روز مجھ سے کہنے لگے۔

"زبیری، آج صبح جب میں حسبِ عادت سیر کو گیا تو وہ مشاعرہ اور خاص طور پر اشعر کی غزل ذہن میں گھومتی رہی۔ اچھی غزل تھی، یہ ایک بات ہے۔"

میں نے دیکھا ان کی آنکھیں ہنسنے لگی تھیں۔ اور میں سمجھ گیا کہ وہ اب کوئی دل چسپ بات کہنے والے ہیں۔ انھوں نے ...سلۂ کلام جاری رکھتے ہوئے کہا:

"میں اشعر کے استعمال کیے ہوئے تمام قافیوں پر غور کرتا رہا۔ اس نے سب ہی قافیے استعمال کر ڈالے۔ سبو لے، پھولے پھولے، بگولے، وغیرہ وغیرہ۔ پھر بھی ایک قافیہ چھوٹ گیا۔"

میں نے پوچھا۔ "کونسا؟"

وہ ہنس کر کہنے لگے "لبسولے"

میں بھی ہنسنے لگا۔ پھر اِدھر اُدھر کی باتیں اور مشاعرے کا تذکرہ ہوتا رہا۔ یہ وہی زمانہ تھا جب وہ "تاریخِ ...و ادب" تحریر کر رہے تھے۔ انھوں نے مجھے بتایا کہ روز صبح کاتب آ کر سر پر کھڑا ہو جاتا ہے کہ اگلا حصّہ دیجیے۔ میں ...ت میں لکھتا ہوں۔ اصل مسودہ اس کے حوالے کر دیتا ہوں۔ صرف آخری لائن اپنی یادداشت کے لیے اپنے پاس رکھ لیتا ہوں ...اللہ کیا حافظہ تھا ان کا۔

اشعر ملیح آبادی کے انتقال کو ۴۲ سال ہو گئے مگر افسوس کہ اس پر آج تک کچھ بھی نہیں لکھا گیا اور وہ ماضی کے ...ھیروں میں اس طرح چھپ گیا جیسے کبھی تھا ہی نہیں۔ اس کا دیوان "دکھتے شانے" کے نام سے بمبئی سے شائع ہو گیا تھا۔

اشعر میں بڑی صلاحیتیں تھیں۔ مگر بیشتر اس کے کہ وہ ان کا بھرپور اظہار کر سکتا اجل اسے ہم سے چھین لے گئی۔ اس کے دل میں سوراخ تھا۔ اور اس زمانے تک پاکستان و ہندوستان میں اوپن ہارٹ سرجری شروع نہیں ہوئی تھی۔ آخری دنوں میں بہت تکلیف میں مبتلا رہا جیسا کہ اس کے ایک خط سے پتا چلتا ہے۔ جو اس نے مجھے بھسا دل سے ۲۱ اکتوبر ۱۹۴۸ء کو لکھا تھا

"ڈیئر جمیل

مدّتوں بعد تمہارا خط پا کر بہت خوشی ہوئی مگر بے بسی کا یہ عالم ہے کہ اپنے ہاتھ سے تمہیں خط بھی نہیں لکھ سکتا۔ بیس روز سے شدید علیل ہوں۔ اور شاید مجھے اپنے ہاتھ سے خط لکھنے کے لیے ایک مہینہ درکار ہوگا۔ میں اچھا ہونے کے بعد تمہیں تفصیل سے خط لکھوں گا۔ فقط برائے اشعر ملیح آبادی"

مگر صد حیف کہ اسے تفصیل سے خط لکھنے کا پھر کبھی موقع ہی نہ ملا۔ وہ ان دنوں بھسا دل سے نکلنے والے ماہنامے "ساحل" کا مدیر تھا۔ شاید اس خط کے لکھوانے کے چند ہی روز بعد اس کا انتقال ہو گیا تھا۔ مگر مجھے یہ بتانے والا کوئی نہ تھا کہ وہ کب ہمیشہ کے لیے ہمیں چھوڑ کر چلا گیا۔ یہ تک پتا نہ چل سکا کہ وہ دفن کہاں ہوا۔ کاش کوئی مجھے اس کی قبر کا نشان بتا سکتا۔ میں نے متعدد اس کا مجموعۂ کلام "دُکھتے شانے" حاصل کرنے کی کوشش کی۔ بمبئی سے آنے جانے والے ادیبوں سے درخواست کی کہ تلاش کریں آخر یہ کام ہماری جانی پہچانی افسانہ نگار قدسیہ انصاری نے کیا۔ وہ بمبئی سے "دُکھتے شانے" اور دیگر بہت سی کتابیں جمع کر کے لائیں۔ مگر میری بدقسمتی دیکھیے کہ ان کی کتابوں کا وہ پورا بیگ کراچی ایئرپورٹ پر کسی ظالم نے نہ معلوم کیا سمجھ کر چوری کر لیا و اس طرح میری یہ آرزو پھر ادھوری رہ گئی۔ اب میں نے جیلانی بانو اور بھائی معظم کو لکھا ہے کہ وہ آئندہ جب پاکستان آئیں تو بمبئی میں ایک مرتبہ پھر تلاش کریں شاید اس دفعہ میری قسمت یاوری کرے۔

جس زمانے میں وہ علی گڑھ میں تعلیم حاصل کر رہا تھا تو ایک لڑکی کی محبت میں گرفتار ہو گیا۔ اس لڑکی کا باپ بہت بڑے عہدے پر فائز تھا۔ یہ محبت دو طرفہ تھی مگر اس کی شادی اس سے نہ ہو سکی کیونکہ اس کے دل کی بیماری اس کی راہ میں حائل ہو گئی۔ محبت میں اس ناکامی کا اس کے دل پر بہت اثر ہوا۔ اور شاید اس کے ہم سے اس قدر جلد رخصت ہو جانے کی وجوہ میں سب سے بڑی وجہ یہی تھی۔

اسی زمانے میں اس لڑکی کی شادی کسی اور جگہ ہو گئی۔ اس وقت اشعر نے ایک نظم "لمحۂ رخصت" لکھی تھی جو کہ بھیج دی تھی۔ اس کے چند بند:

مطربِ شام کے جلوؤں کا یہ جادو کے حُسن
اب سکوتِ غمِ ماضی میں بدل جائے گا
کارواں چاند ستاروں کا ٹھٹک گام سہی
میری نظروں سے بہت دُور نکل جائے گا
میرا ہر گیت تری نکہت سے مہکا ہوا گیت
ایک خاموش سی فریاد میں ڈھل جائے گا

سازِ شکستہ سے بس ایک صدا آئے گی
تو کہیں دُور بہت دُور چلی جائے گی

بجھے جاتے ہیں امید اور تمنّا کے چراغ
ڈوبتی جاتی ہے خاموش ٹھٹھرتی ہوئی رات
سوچتا ہوں کہ ترا لمحۂ رخصت ہے قریب
کس کو معلوم مرا درد مرے دل کی بات
تیری راہوں میں ہنوز آہنی دیواریں ہیں
اور مجھ کو بھی میسّر نہیں زنداں سے نجات
تیرے دیدار کو ترسی ہوئی آنکھیں ہیں اداس
اور شاید یہ اداسی نہ مٹے تا بہ حیات
یہ جدائی ہے کبھی جس کا تصوّر بھی نہ تھا
نہ کوئی عہد، نہ پیماں، نہ کوئی پیار کی بات

بے بسی میری محبّت کی اُڑاتی ہے ہنسی
تو کہیں دُور بہت دُور چلی جائے گی

اشعر ملیح آبادی، فراق گورکھپوری کا شاگرد تھا اور اپنے کلام پر ان سے اصلاح لیتا تھا۔ ان سے شرفِ ملاقات ہے کئی مرتبہ اس نے الٰہ آباد کا سفر بھی کیا۔ اس نے اس وقت کے رواج کے مطابق بہت اچھی نظمیں کہی ہیں۔ اس کا نظم کے لیے بہت موزوں تھا۔ دراصل شاعر معاشرے کے حسّاس ترین افراد میں سے ہوتا ہے۔ لہٰذا زندگی کے ل و مطالبات اور عصری تقاضوں کو وہ دوسروں سے کہیں زیادہ شدّت سے محسوس کرتا ہے۔ وہ زندگی میں حُسن و جمال کرتا ہے۔ وہ بھی زندگی بھر اسی جستجو میں رہا۔ اس کی شاعری میں اس کا اپنا لہجہ تھا، اپنا ڈکشن، اپنی سوچ، اس کی ب اسلوب اور بندشیں بھی اپنی تھیں۔ اس کا آہنگ انوکھا تھا۔ اس کے یہاں حرارت بھی ہے حُسن بھی اور توانائی بھی۔ ی شخصیت اور شاعری دونوں ایک دوسرے کا پرتو ہیں۔

مجھے یاد ہے وہ کبھی کھویا کھویا سا نظر آتا تھا۔ مگر مجھے اب احساس ہوتا ہے کہ وہ اور کہیں نہیں بلکہ صرف اپنی ذات دیا ہوتا تھا۔ یہ کیفیت محبت میں ناکامی کے بعد اور بھی بڑھ گئی تھی۔

کاش اس کی زندگی نے وفا کی ہوتی تو آج اردو شاعری کا وہ ایک چمکتا ستارہ ہوتا اور ہم سب اس کے بارے بہت کچھ لکھ سکتے تھے۔

اے بسا آرزو کہ خاک شدہ

خالد وہاب

"آوارگی"

محمد عمر میمن کے منتخب تراجم کا ایک جائزہ

محمد عمر میمن کا نام ادبی حلقوں کے لیے غیر معروف نہیں ہے سنہ ساٹھ کے عشرے میں انھیں ایک اچھے افسانہ نگار کی حیثیت سے پہچانا جاتا تھا۔ مگر جب وہ اعلیٰ تعلیم کے لیے امریکہ چلے گئے تو وہیں کے ہو رہے۔ اور بظاہر انھوں نے افسانوی تخلیقات سے ناتا توڑ لیا۔ البتہ ایک مترجم کی حیثیت سے ان کی ادبی کاوشوں نے ان کا تعلق اردو کے ادبی حلقوں سے استوار رکھا۔ ھوں نے نہ صرف مغربی زبانوں کے بعض اہم شہ پاروں کو اردو زبان میں منتقل کرتے ہوئے ترجمہ نگاری کے فن پر اپنی دسترس کو ابت کیا بلکہ اردو زبان کے بعض افسانوں کا انگریزی زبان میں ترجمہ کر کے انھیں مغربی دنیا میں متعارف کرنے کا قابلِ سین کام بھی انجام دیا۔ ان کے اردو زبان میں بعض منتخب تراجم کا مجموعہ "آوارگی" کے نام سے حال ہی میں شائع ہوا ہے۔ یسے انھوں نے "بے وطنی" کے نام سے منسوب کیا ہے۔ یہ "بے وطنی" ان کے لیے ذاتی طور پر جن ذہنی عذابوں کا باعث بنی ہوگی۔ ن کا اندازہ تو نہیں لگایا جا سکتا لیکن اس بے وطنی نے جس "آشوبِ آگہی" سے انھیں دوچار کیا وہ محض ان کی ذات تک دود نہیں رہا بلکہ ان کی تحریروں اور ترجموں کے ذریعے اردو ادب سے دلچسپی رکھنے والوں تک بھی اس کی رسائی ہو گئی۔ آوارگی" کی اشاعت اس کا ایک ثبوت ہے۔ اور یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ ان کی 'داماندگیِ شوق' نے جو پناہیں تراشی یں وہ اردو ادب کے قارئین کے ذہنی سفر کے لیے سوغات کی حیثیت رکھتی ہیں۔ اس مجموعہ کو انھوں نے "آوارگی" کا عنوان س لیے دیا ہے کہ وہ اس لفظ کو ذہنی سفر کا استعارہ سمجھتے ہیں۔ ایسا ذہنی سفر "جس پر نکلنے کا کوئی وقت مقرر نہ ہو، کسی خاص منزل ر پہنچنے کی قید نہ ہو، نہ راستے کا نقشہ ساتھ ہو۔ حتیٰ کہ اپنے گھر کی چہار دیواری چھوڑنے کی شرط بھی نہ ہو۔"

محمد عمر میمن کی کتاب "آوارگی" اردو زبان میں آج کل شائع ہونے والی سنجیدہ تصانیف سے خاصی مختلف ہے۔ یونکہ اس کو سمجھنے کے لیے اپنے ذہن ودماغ پر ضرورت سے زیادہ زور نہیں ڈالنا پڑتا۔ پیچیدہ جملوں کے مفہوم تک رسائی حاصل رنے کے لیے جد وجہد نہیں کرنی پڑتی اور مشکل عبارت کو پڑھنے کے بعد یہ نتیجہ بھی نہیں نکلتا کہ انتہائی ذہنی آزمائش سے گزرنے کے باوجود بھی کسی فکر انگیز خیال سے آگاہی نہیں ہوئی بلکہ یہ احساس ایک خوش گوار تاثر میں ڈھلنے لگتا ہے کہ صاحبِ کتاب نے

پنے ذہنی سفر میں قاری کو بڑے خلوص کے ساتھ شریک کر لیا ہے جو صحت مند تشکیک اور جا ندار تجسس کے ساتھ ابھی تک
رہی ہے۔
کتاب کا پیش لفظ 'واماندگیِ شوق' کے عنوان سے محمد عمر میمن نے اپنے منفرد اور پُر اثر انداز میں تحریر کیا ہے۔ اسے
ھ کر نہ صرف ادب اور زندگی کے بارے میں ان کے مخصوص نقطۂ نظر سے آگاہی ہو جاتی ہے بلکہ کتاب میں شامل
ضامین کی وجہِ جواز بھی سمجھ میں آجاتی ہے۔ عمر میمن کے اندازِ تحریر کو منفرد اس لیے بھی کہا جا سکتا ہے کہ انھوں نے بڑے
یدھے سادے مگر تیکھے انداز میں بعض ایسے پُر معنی جملے لکھ دیے ہیں جو پڑھنے والے کو نہ صرف یاد رہ جاتے ہیں بلکہ
ان میں چھُپے ہوئے مفہوم پر غور کرنے کے لیے بھی خود کو آمادہ پاتا ہے۔ مثلاً "ہمیں آدرشوں کی خاطر سر کٹانے کا درس
اجاتا ہے۔ لیکن کسی آدرش پر جرح کرنے کی آزادی نہیں۔ ہمارا کام موروثی اقدار کی پاسبانی رہ گیا ہے۔" آگے
ل کر وہ لکھتے ہیں۔ "سر وہ کٹائے جسے اس کی عمل پذیری پر اعتماد ہو۔" یہ فقرے موجودہ عہد کے بیشتر نوجوانوں کے
ہن اور سوچ کی تصویر کشی کرتے ہیں۔ کیونکہ جب آدرش محض موروثی اقدار کی پاسبانی تک محدود ہو جائیں اور فکر و اظہار
ی آزادی کو سلب کرنے لگیں تو ظاہر ہے کوئی بھی باشعور اور باہمت شخص ان کی اسیری کو گوارہ نہ کرے گا۔ مگر انھوں نے
س سلسلے میں مزید یہ بھی تحریر کیا ہے کہ "گھر کی تمنّا وہ کرے جسے چہار دیواری کی راحت عزیز ہو۔" یہاں گھر کی تمنّا
سے انحراف اور چہار دیواری کی راحت سے گریز والی بات ہمیں سوچنے پر مجبور کر دیتی ہے کہ کیا واقعی فرسودہ روایات
بے جان اقدار اور جامد نظریات سے بغاوت انسان کو گھر کی آسائشوں سے بھی منحرف کر دیتی ہے۔ اس کا جواب عمر میمن
ی کی ایک عبارت سے دیا جا سکتا ہے۔ وہ لکھتے ہیں "مجھے زندگی میں ضبط و نظم کے محض خیال ہی سے وحشت ہونے
تی ہے۔ اس کی نفسیاتی وجہ شاید یہ ہو کہ میری زندگی خود بڑے جان لیوا نظم و ضبط کی پابند ہے جس سے سرِ مو انحراف
ے بڑے خوفناک نتائج نکلتے ہیں۔ میرے لیے بھی اور مجھ سے وابستہ دوسروں کے لیے بھی۔" یہ ضبط و نظم کی پابندی اور
ہ داری کا شدید احساس اپنے گھر کے پُر مسرت ماحول کو قائم رکھنے کے لیے ہی ہو سکتا ہے۔
"آوارگی" کا ایک بڑا حصہ چیک مصنف میلان کنڈیرا کی ذات و شخصیت اور اس کے تخلیقی و تنقیدی کارناموں
ی تصویر کشی کے لیے مخصوص ہے۔ اسے پڑھ کر کنڈیرا کی ادبی و فنی عظمت کے ساتھ اس کی سیاسی اہمیت بھی سمجھ میں آجاتی
ہے۔ اور وہ سیاسی و سماجی پس منظر بھی اچھی طرح واضح ہو جاتا ہے جو کنڈیرا کے خیالات و نظریات کی تشکیل کا اصل
سبب ہے۔ کنڈیرا نے فلپ راتھ کو دیے گئے اپنے ایک انٹرویو میں ایک بڑی قابلِ غور بات بیان کی ہے۔ اس کا کہنا ہے۔
انسان کا اہم ترین خاص الخاص ذاتی مسئلہ موت یعنی اتلافِ ذات ہے لیکن خود یہ ذات کیا بلا ہے؟ یہ ان تمام باتوں
اصل جمع ہے جو ہم یاد کرتے ہیں۔ چنانچہ موت کے بارے میں جو چیز ہمیں دہشت زدہ کرتی ہے وہ مستقبل کا تلف ہو جانا
ہیں بلکہ ماضی کا کھو جانا ہے۔" یہ بیان اگرچہ اپنے اندر کشش رکھتا ہے لیکن اس کی صداقت پر انتہائی ترقی یافتہ اور سرمایہ دارانہ
نظام کا پروردہ ایسا شخص ہی ایمان لا سکتا ہے جو بے گانگی کا شدید احساس رکھتا ہو۔ اور نہ صرف اجتماعی زندگی ہی سے بے گانہ ہو بلکہ خاندانی
رشتوں سے بھی کوئی علاقہ نہ رکھتا ہو۔ کیونکہ تیسری دنیا کے پس ماندہ اور ترقی پذیر ملکوں کے پس منظر سے تعلق رکھنے والے لوگوں کے لیے

ن کا خوف ان ذمہ داریوں کے ادھورا رہ جانے سے عبارت ہوتا ہے جو انفرادی اور اجتماعی دونوں میدانوں سے وابستہ ہوتی
۔ ہمارے یہاں ایک فرد کی موت اس کے ماضی کے اتلاف سے زیادہ اس کے متعلقین کے لیے تباہی و بربادی کا پیش خیمہ ثابت
ی ہے اس لیے موت کے بارے میں جو چیز ہمیں دہشت زدہ کرتی ہے وہ ماضی کے اتلاف سے زیادہ مستقبل کی فکر و تشویش
پنے اندر چھپائے ہوئے ہوتی ہے۔ میلان کنڈیرا کے بارے میں یہ معمولی سی تنقید تو محض اس کے ایک ایسے بیان سے تعلق رکھتی
جسے عمر میمن نے اپنی "وضاحت" میں بھی نقل کیا ہے۔ لیکن یہ ایک حقیقت ہے کہ کنڈیرا کی ناول نگاری کی اہم خصوصیات،
کے فن کو نئی جہتیں عطا کرتے ہیں اس کی کامیابی اور ناول کو تجریدی و تمثیلی بنانے سے اس کا شعوری گریز وہ صفات ہیں
یں میلان کنڈیرا کی طرف متوجہ بھی کرتی ہیں اور اس کی تصانیف کا مطالعہ کرنے کی طرف راغب بھی۔ خاص طور پر ناول نگاری
بارے میں کنڈیرا کے خیالات پڑھنے اور سمجھنے کے لائق ہیں۔ اس نے "ناول اور یورپ"، "ایک ویری ایشن کا تعارف" اور
ب بنتا بناتا" کے عنوانات سے جو مضامین لکھے ہیں ان کے مندرجہ ذیل اقتباسات اردو زبان میں ناول لکھنے اور ناول
بیدگی سے مطالعہ کرنے کا ذوق رکھنے والوں کے لیے نہ صرف دل چسپی و توجہ کا باعث ہیں بلکہ اپنے اندر گہری معنویت
رکھتے ہیں "میں اکثر سنتا رہتا ہوں کہ ناول اپنے سارے امکانات ختم کر چکا ہے۔ میری رائے اس کے بالکل الٹ ہے
چار سو سالہ تاریخ میں ناول نے اپنے کئی ایک امکانات کو ضائع بھی کیا ہے۔ بعض بڑے اہم اور عظیم امکانات کی سرے سے
تفتیش ہی نہیں کی بہت سی راہوں کو فراموش کیا ہے اور بہت سی قلبی صداؤں کو سنا ہی نہیں ہے۔" "ناول انسانی وجود
دوسرے چھان بین کا نام ہے۔" "ناول کا مطلب اسی وقت نکلتا ہے جب وہ انسانی وجود کے کسی نامعلوم پہلو کی نقاب کشائی
ے۔" "ناول ایک دانش ورانہ مرکب (SYNTHESIS) کی نمائندگی کرتا ہے۔ زندگی کے تجربات اور رطبیۂ تخیل کے علاوہ
ی علمیت کا متقاضی بھی ہوتا ہے۔" "ناول ایک ایسی فنی ہیئت ہے جو بآسانی وقت میں حرکت کرنے کی اہلیت رکھتی ہے۔"
ن کی تشکیل موسیقی کے ایک پارے کی ترتیب کی طرح عمل میں آتی ہے۔ یعنی ایک موضوع اور اس کی ویری ایشن یعنی اس
ع کی جملہ تفصیلات کو اپنی انتہا تک پہنچانے کے اصول پر۔" "ناول کا جوہر تواتر اور تسلسل بھی ہے۔ ہر نگارش اپنے سے
انے والی نگارشات کا جواب ہوتی ہے۔" "پیچیدگی ناول کا جوہر ہے۔ ہر ناول قاری سے کہتا ہے کہ اشیا اتنی آسان
جتنی تم سمجھتے ہو۔ یہی ناول کی لازوال صداقت ہے۔ اگر ناول کا مقصد حیات ہی یہی ہے کہ مادی دنیا کو ہمہ وقت ہمارے
ے میں رکھے اور ہمیں وجود کی فراموشی سے محفوظ رکھے تو کیا ناول کا زندہ رہنا آج پہلے سے زیادہ ضروری نہیں۔۔۔؟"
نے اردو ادب کے قارئین کو میلان کنڈیرا سے متعارف کرا کے قابلِ قدر کارنامہ انجام دیا ہے۔"

"آوارگی" میں تراجم کے علاوہ عمر میمن کے تحریر کیے ہوئے دو طبع زاد مضامین بھی شامل ہیں ان میں سے ایک،
ا اور تاریخ۔ چند تضادات" بڑی محنت سے لکھا گیا ہے، اور محنت سے زیادہ اہم بات یہ ہے کہ اس میں مصنف نے
معمولی تنقیدی شعور کو اجاگر کرنے میں کامیابی حاصل کی ہے۔ انھوں نے انتہائی غیر جانبدارانہ انداز میں کنڈیرا کے
الات کو بے نقاب کیا ہے جو اس نے اپنے خیالات و احساسات کو چیکوسلوویکیہ پر سنہ ۱۹۶۸ میں ہونے والی روس کی
مداخلت سے متاثر ہو کر بیان کرنے میں روا رکھے ہیں۔ اس مضمون کو پڑھ کر یہ نتیجہ نکالنا مشکل نہیں رہتا کہ عمر میمن کا سیاسی و

سماجی تاریخ کا مطالعہ وسیع ہے اور وہ دیانت داری کے ساتھ اس کا استعمال بھی جانتے ہیں۔ یہاں عمر میمن کے اس اقتبا
نقل کرنا مناسب ہوگا کہ "کنڈیرا سے میرا لگاؤ کورانہ نہیں، میرے خیال میں کسی فن کار کی صحیح قدر و قیمت کا تعیّن کر
نظر محض اس کے کارناموں ہی پر نہیں ہونی چاہیے بلکہ اس کی خطاؤں اور جفاؤں پر بھی۔ اگر ناول کردار کی شخصیت کے بند
تناقضات اور تضادات کو اپنے میں جگہ دینے کی صلاحیت رکھتا ہے تو ان تناقضات و تضادات کا اجتماع خود فرد کی لیج
کی ذات میں بطور اولیٰ ہونا چاہیے۔" عمر میمن کا یہ مضمون ہمارے نوجوان تنقید نگاروں کو خاص طور پر پڑھنا چاہیے کہ
اس حقیقت کا سراغ مل سکتا ہے کہ اپنی رائے کو وقیع بنانے کے لیے مغربی دانشوروں کے نام گنانے اور بات کو گھما پھر
انداز میں بیان کر کے پڑھنے والے کو مرعوب کرنے کی کوشش سے زیادہ ضروری بات سادگی کو اختیار کرنا اور سنجیدگی و خلو
ساتھ اپنے مطالعہ کو وسعت دینا ہے۔

"آوارگی" کا مطالعہ اس امر کی بھی نشاندہی کرتا ہے کہ عمر میمن ترجمہ کرنے کی اعلیٰ صلاحیت رکھتے ہیں۔ اگرچہ
مضامین کے علاوہ باقی کتاب تراجم پر مشتمل ہے لیکن پڑھتے وقت قاری کو کہیں بھی یہ احساس نہیں ہوتا کہ وہ کسی د
زبان میں تحریر کیے ہوئے مضامین کا مطالعہ کر رہا ہے۔ کسی زبان کے ادب پاروں اور تنقیدی مضامین کو اس ط
زبان میں منتقل کرنا کہ اجنبیت کا احساس تک نہ ابھرے، ایک بڑی بات ہے۔ جس کے پیش نظر یہ کہنا کہ عمر میمن کو ترجم
کے فن پر مکمل عبور حاصل ہے، نامناسب نہ ہوگا۔

"آوارگی" کا مطالعہ کر کے یوں لگتا ہے جیسے ذہن و دماغ میں نئے خیالات و تجربات کے علاوہ فکر کے نئے د
روشن ہو گئے ہوں جو پڑھنے والے کو ذہنی تسکین بھی عطا کرتے ہیں اور سوچنے سمجھنے اور غور کرنے کی امنگ بھی۔ اس
"آوارگی" کی اشاعت اردو زبان کی کتابوں میں ایک اضافہ قرار دی جا سکتی ہے۔

ادیب سہیل

خوش درخشید ولے شعلۂ مستعجل بود

...یں عیدگاہ سے نکل رہا تھا۔ سامنے مولانا متین ہاشمی نظر آ گئے۔ ان کے ساتھ علی گڑھ پاجامے اور شیروانی میں
... دو پیارے پیارے بچے تھے۔ میں پہلے مولانا سے گلے ملا بعد ازاں جھک کر دونوں بچوں کو گلے لگایا۔
پھر ایک عرصے کے بعد انھیں بچوں میں سے ایک کو کتاب منزل کے کاؤنٹر کے بائیں سرے پر کوئی ضخیم ادبی پرچے
...لعے میں منہمک دیکھا۔ اب اس کی مسیں بھیگ چکی تھیں۔ کتاب منزل پر میرا بھی ہر روز کا اٹھنا بیٹھنا تھا۔ اس لیے
...کاؤنٹر پر اسی انہماک سے مجھ کا اکثر نظر آجاتا تھا۔ یہی لڑکا بعد میں سراج منیر کے نام سے آسمانِ ادب پر چمکا۔
لیکن ٹھہریے، یہاں اپنے دوست قاضی زبیر بیخود کا ذکر ضروری ہے اس کے ذکر کے بغیر سراج منیر کی طالب علمی
...ر کا تذکرہ مکمل نہیں ہو سکتا۔ مولانا متین نے اپنے اس ہونہار بچے کو چھٹی جماعت ہی سے قاضی زبیر بیخود کے ساتھ
...دیا تھا۔ قاضی اگرچہ شاعر تھے۔ لیکن شہر میں ان کی شہرت انگریزی کے ایک بہت ہی اچھے ٹیوٹر کی حیثیت سے تھی۔
...اپنے بچے کو قاضی سے پڑھوانا چاہتا تھا) قاضی زبیر کے انگریزی پڑھانے کا فائدہ یہ ضرور ہوا تھا کہ سراج منیر کی
...ی کی صلاحیت دو تین کلاس آگے کی ہو گئی تھی۔ اس کا اعتراف اس کے استاد بھی کرتے ہوئے سُنے جاتے تھے۔
سراج منیر اپنے کلاس میں اوّل تو آتا ہی تھا لیکن مولانا متین ہاشمی اور قاضی بیخود کا سارا زور اس بات پر تھا کہ
...ی بورڈ میں اس کو پوزیشن لانا چاہیے۔ اور دو سال بعد میٹرک کا نتیجہ نکلا تو سراج منیر اپنے پاپا، اپنے ٹیوٹر اور
...کول کے اساتذہ کی توقعات پر صد فی صد پورا اُترا تھا۔ اس نے بورڈ میں اعلیٰ پوزیشن حاصل کی تھی۔ قاضی زبیر
...ا متین ہاشمی بے حد خوش تھے۔ ہم سب بھی خوش تھے۔ کیونکہ قصباتی آبادی میں ایک کی خوشی سب کی خوشی ہوتی ہے۔
...گے چل کر سراج منیر نے انٹر میں بھی اپنی اعلیٰ پوزیشن بحال رکھی۔
کالج میں داخلے کے بعد سراج منیر کا شرمیلا پن ختم ہو چکا تھا اور آنکھیں کھل چکی تھیں۔ اس کا بہت سا مطالعہ
...کرنا چاہتا تھا اور وہ ادب کے نئے مزاج کو سمجھنا چاہتا تھا۔ اسے ایک ایسا آدمی درکار تھا جس سے وہ ہم کلام
...ے۔ افسانس معاملے میں مدد حاصل کر سکے۔ سراج منیر کو یہ اندازہ تھا کہ لاہور، کراچی اور دیگر شہروں سے شائع

ہونے والے سہ ماہی اور ماہنامے مثلاً "فنون"، "اوراق"، "نیا دور"، "سیپ" "افکار"، "ادبِ لطیف" اور دوسرے بہت سے رسائل وجرائد میرے پاس ہی آسانی سے مل سکتے ہیں۔ لہٰذا وہ ہر دوسرے تیسرے میرے گھر آکر اپنے مطلب کے جرائد وکتب لے جاتا اور پھر واپس کر جاتا تھا۔ یہ سلسلہ کوئی دو ڈھائی برس تک جاری رہا۔ غالباً یہ زمانہ ۷۰ ـ ۱۹۶۹ء کا تھا۔ مجھے اعتراف ہے کہ اتنے بہت سے رسائل وکتب کو بالاستیعاب پڑھنے کا موقع کم کم ہی ملتا تھا، پھر یہ کمی سراج منیر نے پوری کر دی۔ اس کا اندازہ میں نے یوں لگایا کہ جب بھی وہ کوئی سہ ماہی پرچہ یا کتاب پڑھ کر واپس کرنے آتا تو گھنٹے آدھ گھنٹے اس کے مندرجات پر باتیں کرتا، اپنی باخبری کا ثبوت فراہم کرتا، ناقدانہ خیال آرائی کرتا اور سب سے بڑھ کر یہ کہ میرے علم میں اضافہ کرتا۔ آخر کسی بات کی آگاہی پڑھ کے اور سُن کے بھی تو حاصل کی جاتی ہے۔ انھیں دنوں ڈاکٹر حنیف فوق کی تنقیدی کتاب "مثبت قدریں" آئی تھی۔ سراج منیر اسے لے گیا۔ کئی دنوں بعد لے کر آیا تو اس پر تبادلۂ خیال کیا۔ مجھے "ضرور پڑھیے" کا مشورہ دیا۔ اور دورانِ گفتگو اس کے متون کے کچھ حصّوں کے حوالے ایسے فر فر دیے جیسے ازبر ہو۔ اللہ نے اس کو بلا کا حافظہ عطا کیا تھا۔

میں نے اپنے گھر میں کہہ رکھا تھا کہ سراج منیر جو بھی کتاب و رسالہ لے جانا چاہے دے دیا کرو۔ مجھے روزِ اوّل سے سراج منیر میں ایک جوہرِ قابل نظر آرہا تھا۔ میں چاہتا تھا کہ وہ جس FANATICISM کے ماحول میں سانس لے رہا ہے اس میں کسی طرح عصری بصیرت کے دو چار دراڑ کھل جائیں، باقی فرض بصیرت خود سنبھال لے گی۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے ایک دن سراج منیر نے مجھ سے کہا تھا۔ "چچا! آپ پاپا کو سمجھاتے کیوں نہیں کہ وہ سیاست میں خود کو اتنا INVOLVE نہ کریں۔" پتا نہیں کس بات کا ردِ عمل تھا جو اس کے منہ سے یہ الفاظ نکل گیے۔ میں جواب میں کیا کہتا، بس مسکرا کے رہ گیا۔

کالج کی چھٹیوں کے دن تھے۔ سراج منیر نے اپنے ہم عمروں کی مدد سے ایک مشاعرے کا اہتمام کیا تھا۔ اس میں تمام مقامی شعرا شریک ہوئے تھے۔ یہاں مجھ پر سراج منیر کا ایک اور جوہر کھلا، وہ یہ کہ وہ بہت اچھی کمپیئرنگ کر سکتا تھا۔ اپنے بہت بزرگ شعرا کا ان کے مدارج کے لحاظ سے تعارف کرانا کچھ آسان نہ تھا۔

سید پور میں سراج منیر سے میری آخری ملاقات ۲۳ مارچ ۱۹۷۱ء کو سویرے سویرے ہوئی جب وہ میرے گھر آیا۔ وہ کچھ سراسیمہ سا الگ رہا تھا۔ میں نے اس کی وجہ دریافت کی تو بولا ـــ "پاپا کہہ رہے ہیں کہ اب یہاں سکون نہیں رہ سکتا ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ اور پھر اس نے وہ پوسٹر دکھایا جو گزشتہ رات شہر کی دیواروں پر جا بہ جا چسپاں کیا گیا تھا جس میں سقوطِ ڈھاکہ اور اس کے بعد چاٹگام میں ہونے والے فرقہ وارانہ فسادات میں "بہاریوں" کے ساتھ جو زیادتیاں ہوئی تھیں ان کو اشتعال انگیز انداز میں بیان کیا گیا تھا۔ پوسٹر کی نفیس کتابت اور چھپائی اس بات کی غمازی کرتی تھی کہ یہ مشرقی پاکستان سے باہر کہیں چھپا ہے۔

۲۳ مارچ کو عوامی لیگ کی طرف سے احتجاج کا دن منانے کا اعلان کیا گیا تھا۔ اس کی وجہ سے سارے مشرقی پاکستان میں لاقانونیت کا فتنہ بھڑک اٹھا۔ آپ اس دن کو سقوطِ مشرقی پاکستان کی پہلی خشت بھی کہہ سکتے ہیں۔ نتیجتاً تعلیمی ادارے تقریباً معطل ہو کر رہ گئے تھے۔ چنانچہ سراج کو تعلیم جاری رکھنے کے لیے مغربی پاکستان سدھارنا پڑا۔ پھر میں سراج منیر سے بالکل بے خبر ہو گیا۔ یہ بے خبری ۱۹۷۳ء تک قائم رہی

۲۹ جنوری ۱۹۷۴ء کو جب میں اپنے خاندان کے ساتھ کراچی پہنچا تو سراج منیر کے بارے میں جانکاری ہونے لگی۔ پھر جب جولائی ۱۹۷۴ء میں میری پوسٹنگ پنڈی ہوئی تو وہاں کے ادبی حلقے میں سراج منیر کا غلغلہ سنا۔ اس کی نسل کے نوجوانوں سے اس کی تعریفیں اور اس کی ذہانت کا چرچا سُنا، پھر جب مختلف موقر جریدوں میں اس کی تحریریں دیکھنے کو ملیں تو میرا جی بڑا خوش ہوا۔ فارسی کا یہ مقولہ بڑے تفاخر کے ساتھ میری زبان پر آیا: "اگر پدر نتواند پسر تمام کند"۔

اور پھر ایک روز کراچی میں سراج منیر اپنی شادی کا دعوت نامہ لے کر میرے گھر آیا۔ اب وہ ادب کا گبھرو جوان تھا۔ اس کی باتوں میں ہونہار بروے کے چکنے چکنے پات نظر آنے لگے تھے۔ میں اس کی شادی اور ولیمہ دونوں میں شریک ہوا۔ سراج منیر کے والد مولانا متین ہاشمی سے بہت دنوں کے بعد ملاقات ہوئی۔ گلے ملے، مبارک باد دی۔ ویسے بھی سید پور جیسے بیسیوں کالونی قسم کے شہر میں قصباتی فضا کا لطف آتا تھا اور ہم سب ایک خاندان کے افراد ہی تو لگتے تھے۔

سراج منیر کی ادبی شخصیت کی تعمیر میں بلاشبہ لاہور کا بہت بڑا حصہ ہے۔ لاہور جیسے قدیم ادبی مرکز میں آناً فاناً اس کا اس قدر نمایاں ہو جانا اس بات کی دلیل تو ہے کہ سراج منیر میں غیر معمولی لیاقت و صلاحیت موجود تھی لیکن اس بات کا بھی ثبوت فراہم ہوتا ہے کہ لاہور سراج منیر کے لیے اسی طرح چھتر چھاؤں بنا جس طرح گزرے زمانے میں حافظ محمود شیرانی اور حال کے زمانے میں انتظار حسین کے لیے۔

سراج منیر سے میری ملاقات پھر نہیں ہوئی وہ ادبی جریدوں اور خبروں میں ملتا رہا۔ اسے ٹی۔ وی کے مباحثے میں ناہے گاہے دیکھ کر گھر بھر خوش ہوتے۔ صدر ضیاء الحق کا دور اس کے حق میں نیک فال ثابت ہوا۔ ۱۹۸۵ء میں یہ خوش آئند خبر سننے میں آئی کہ وہ ادارۂ ثقافتِ اسلامیہ لاہور میں ڈائرکٹر کے عہدے پر فائز ہو گیا۔ پروفیسر جیدلی کامرن کا حالیہ انگریزی مضمون "سراج منیر کی یاد میں" جو اس کے انتقال پر لکھا گیا ہے، اس سے ان باتوں کا انکشاف ہوتا ہے کہ ادارۂ ثقافتِ اسلامیہ اگرچہ ۱۹۵۲ء سے قائم تھا لیکن سراج منیر نے اپنے دور میں اس ادارہ کو جتنا فعال اور متحرک بنا دیا تھا، وہاں ایسی صورت پہلے کبھی دیکھنے میں نہیں آئی۔ واقعی سراج منیر کی شمولیت سے اس ادارہ کی فعالیت میں روز افزوں ترقی ہوئی تھی۔ ایک طرف اسلامی آرٹ، فلسفہ اور تعمیرات پر تصنیف و تالیف کا کام تیزی سے آگے بڑھا۔ دوسری طرف اسلامی ممالک کے اسکالروں سے رابطے قائم ہوئے۔ دراصل سراج منیر مسلم آرٹ و کلچر کی سطح پر اسلامی ممالک کے رابطے کا خواہاں تھا اور اس کا احیا چاہتا تھا۔ غالباً وہ علامہ اقبال کی جدید الٰہیات سے متاثر تھا۔

۱۹۸۵ء سے ۱۹۸۸ء کے اواخر تک اس کی ادبی سرگرمیاں عروج پر رہیں۔ کہا جاتا ہے کہ ۱۹۸۸ء کے انتخاب کے بعد پنجاب میں مرکز اور صوبے میں کشمکش ہوئی اس کے بلا واسطہ یا بالواسطہ اثرات اس پر بھی پڑے۔ واللہ اعلم بالصواب! پھر اس کی ذات سے منسوب وحشت ناک خبریں ملنے لگیں۔ میرا جی ڈرنے لگا، خدا خیر کرے۔ اور مجھے سراج منیر کا ۶۹۔۱۹۶۷ء میں کہا ہوا وہ جملہ اس وقت یاد آیا جو اس پر خود صادق آتا تھا۔ "چچا! پاپا کو آپ کہتے کیوں نہیں کہ وہ سیاست میں اتنا INVOLVE نہ ہوں۔"

دراصل سراج منیر کے مزاج میں عجلت پسندی بہت تھی۔ زبان زد خلائق یہ ہے کہ جو کام اپنے وقت پر ہوتا ہے

وہ سود مند ہوتا ہے۔ اور سراج منیر کی مشکل یہ تھی کہ وہ ہر کام وقت سے پہلے کر ڈالنا چاہتا تھا۔ اس کی جذباتیت SECOND THOUGHT کی قائل شاید نہیں تھی۔ ایسے طبیعت کا فرد ہر بات میں جلد فیصلے چاہتا ہے اور اکثر جلد فیصلے اپنے پیچھے ناموافق نتائج پوشیدہ رکھتے ہیں۔

اور اب جب ۲۵ ستمبر ۹۰ء کو وہ ہم سے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے صرف اڑتیس برس کی عمر پا کر جدا ہو گیا ہے تو اس کی عجلت پسندی مثبت لگنے لگی ہے۔ اگر وہ عجلت نہ کرتا تو اپنا کامیاب ادبی سفر اڑتیس برس میں کیسے طے کر سکتا تھا۔ جس کے لیے خاص حالت میں بھی کسی شخص کو نصف صدی سے زیادہ کا عرصہ درکار ہوتا ہے۔

سراج منیر کی رحلت سے پاک و ہند کے ادبی حلقے کو دکھ اس بات کا ہے کہ وہ بڑا بے وقت داغِ مفارقت دے گیا ہے۔ لیکن ہم اہلِ سید پور کا غم یہ ہے کہ وہ بے وقت داغِ مفارقت تو دے ہی گیا لیکن اس کے ساتھ ہمارے فخر کا سرمایہ بھی لے گیا۔

رَدِّ عمل

جمیل قدوائی
گلشن اقبال۔ کراچی

[جناب جلیل قدوائی کا یہ مراسلہ "قومی زبان" میں شائع شدہ ایک مضمون کے جواب میں ہے جسے ہم ناظرین کی دلچسپی اور معلومات کے لیے شائع کر رہے ہیں۔]

میں نے "قومی زبان" بابت ماہ جنوری ۱۹۹۰ء میں پڑھا کہ "ایک زمانے میں سید سجاد حیدر یلدرم نے ایک نظم لکھی تھی جس کا عنوان تھا "مرزا پھویا" یہ مرزا پھویا بچوں کا جانا پہچانا کردار بن گیا تھا۔ یہ معلومات مرزا ادیب نے اپنے مضمون "بچوں کا ادب ــ ایک تجزیاتی مطالعہ" میں فراہم کی ہیں۔ میں موصوف سے معلوم کرنا چاہوں گا کہ یہ کس زمانے کی بات ہے اور کیا وہ نظم اب بھی دستیاب ہوتی ہے؟

ہماری زبان میں بچوں کے ادب کی کمی کی عام شکایت ہے اور بچوں کے لیے اتنی اچھی نظم وہ بھی اردو کے ایک ایسے بلند پایہ ادیب کی لکھی ہوئی یقیناً آنکھوں سے لگانے کے قابل ہوگی۔

جہاں تک میں سمجھتا ہوں اردو ادب کے مخصوص قارئین اور علی گڑھ والوں کو سجاد صاحب کی ایک نظم "مرزا پھویا علی گڑھ کالج میں" کا علم ہے۔ میرے دوستوں کو میرے اور سجاد صاحب کے قریبی تعلقات کا بھی علم ہے۔ میں نے ان کی صرف "مرزا پھویا" کے عنوان کی کوئی نظم وہ بھی بچوں کے لیے لکھی ہوئی خود ان سے یا کسی اور سے بھی نہیں سنی۔ سچ پوچھیے تو وہ شاعری زیادہ تر شوقیہ کرتے تھے۔ "پگڈنڈی" امرتسر نے کم و بیش چالیس بیالیس سال پہلے یلدرم نمبر نکالا تھا۔ اس کے لیے میں نے، نذر سجاد نے اور علی نے ایک رات ساتھ بیٹھ کر مسالا جمع کر کے کراچی سے مدیر صاحب کو بھیجا تھا۔ میری بیاضوں میں بہت سی چیزیں تھیں جن کا علی اور نذر سجاد کو بھی علم نہ تھا۔ نذر سجاد سے میں نے "ماہ نو" کے لیے جس کا ایک زمانے میں میں نگراں تھا۔ ان کی سجاد صاحب کے ساتھ شادی سے پہلے کے حالات لکھوائے اور "ماہ نو" میں چھپوائے تھے۔ بیبی چلے جانے کے بعد نذر سجاد نے اس مضمون کی ایک اور قسط لکھی تھی۔ یہ سارا بھی مشترکہ نمبر میں اور اس سے پہلے "قومی زبان" میں چھپوایا تھا۔ مگر "مرزا پھویا علی گڑھ کالج میں" کے علاوہ علاحدہ "مرزا پھویا" کے نام سے بچوں کے لیے ان کی کوئی نظم ہم تینوں میں سے کسی کے ہاتھ نہ لگی۔ چنانچہ "پگڈنڈی" کے یلدرم نمبر میں بھی ایسی کوئی نظم نہ چھپی۔ پھر یہ بچوں والی نظم مرزا پھویا کی اور کون سی تھی؟ اور کہاں تھی؟ یا اب ہے؟

یہ دراصل مولانا حسرت موہانی کی شان میں سجاد صاحب نے لکھی تھی۔ اور ایک مزاحیہ نظم تھی جس میں حسرت کی اس ہیئت کذائی کا ذکر ہے جو مرحوم ایم۔اے۔او کالج میں داخلے کے وقت ان کی پہچان تھی۔ یہ کوئی ڈھکی چھپی نظم نہیں تھی اور وہاں کے کم و بیش ہر طالب علم کی زبان پر چڑھ گئی تھی۔ یہ بچوں کے لیے تو نہیں تھی۔

سجاد صاحب کی اس نظم کے بعض اشعار یہ ہیں۔

ہو وطن سے کبھی جدا نہ کوئی — گھر سے بے گھر ہو اے خدا نہ کوئی
دردِ غربت سہا نہیں جاتا — رنجِ فرقت کہا نہیں جاتا
یاد احباب کی جو آتی ہے ــــــ دل میں اک درد سا اٹھاتی ہے
گھر سے نکلے نہ تھے وہ ساری عمر — گویا بھوترے ہی میں گزاری عمر
اپنے ماں باپ کے دُلارے تھے — اور عزیزوں کے بھی وہ پیارے تھے
خیر سے تھا ابھی شباب شروع — عمر کا بیسواں تھا باب شروع
رات دن کھیلتے مگر پھرتے ــــــ سارے گھر والے "بچہ" کہتے تھے
جب ہوئے ان کے دوست سارے بجد — تب تو مرزا کے والدِ ماجد
ایک دم یہ تہیہ کر بیٹھے — بس علی گڑھ میں مرزا جا کے پڑھے
اشک برسا کے دیدۂ تر سے — کیا کہوں مرزا چل دیے گھر سے
مختصر یہ پہنچ گئے وہ یہاں — آہ بر لب، درونِ سینہ فغاں
ایک ہفتہ تو کاٹا رو دھو کر — بعدہٗ ہر طرح سے زچ ہو کر
اک عریضہ کی یوں بنا ڈالی — قبلہ امّی مدظلہا العالی!
یاں کے لڑکوں کا حال ہی ہے جدا — ایسا دیکھا کبھی، کبھی نہ سنا
جنس ہر اک نئی، دکان نئی — اور تو اور ہے زبان نئی
ایک دال، ایک گوشت کہتے ہیں[1] — جانے کس دیس میں یہ رہتے ہیں
کورنش، مجرا، بندگی، آداب — سب کی یاں ہو گئی ہے مٹی خراب
ان کے بدلے ہے بس سلام علیک ــــــ گویا لے ڈھیلا کھینچ مارا ایک
یاں کی آزادی ہے بہت محدود — شہر جانا بھی ہو گیا مسدود
اس لیے عرض ہے کہ یہ چیزیں — لکھنؤ سے روانہ آپ کریں
ایک ڈبیا دیا سلائی کی — پڑیا اک نیلی روشنائی کی
دو گھڑے، اک صراحی، پیالے چار — اور ممکن ہو گر تو تھوڑا اچار

علی گڑھ میں مشہور تھا کہ مولانا نے علی گڑھ میں داخلہ لیا پردہ دار انگرکھے، غرارہ دار پاجامے اور دوپلی ٹوپی میں ملفوف تھے۔ ساتھ میں ایک پاندان بھی تھا۔

---

[1] ڈائننگ ہال میں شور مچتا تھا۔ ایک دال لانا، ایک گوشت لانا۔ یعنی دال کی ایک پلیٹ، گوشت کی ایک پلیٹ۔

گل ہائے رنگ رنگ

نئی کہانی

عزیزہ نسرین / کرنل مسعود اختر شیخ

دو ٹکڑے روٹی کی خاطر

سپرنٹنڈنٹ حسن صاحب ظاہراً تو میز پر پڑے فائلوں کے انبار سے نپٹ رہے تھے مگر ان کا سلسلۂ خیال یوں چل رہا تھا:
”کمینہ نہ ہو تو۔۔۔ اوروں کو اخلاق اور ناموس کا درس دیتا پھرتا ہے اور خود بلیک کرتا ہے۔۔۔۔ اُوپر سے مجھے
دانہ کرتوتوں میں آلۂ کار بنانا چاہتا ہے۔۔۔ نہیں، کبھی نہیں۔ اب تو میری بھی آنکھیں کھل چکی ہیں۔ بس جی بس، بہت ہو چکی۔
جب چاہتا ہے فون پر النقرہ کا نمبر گھما کر بولنے لگتا ہے، جناب شکور صاحب! ہمت تیری بھی اور تیرے شکور صاحب کی بھی
ہر بار فون کر کے بیس تیس ہزار ہتھیا لیتا ہے۔ ذلیل کہیں کا۔۔۔ بے ایمان، تمہارا خیال ہے میں نہیں جانتا تمہاری چالیں
ے فراڈ۔۔۔۔ انسان ہر روز کلب جا کر چند معززین کے ساتھ تاش کھیلنے سے آدمی تو نہیں بن جاتا کتے۔۔۔۔ مجھے یقین ہے
ے میں کوئی شخص بھی ایسا نہیں ہو گا جسے تو ہاتھ نہ لگا چکا ہو۔۔۔۔ اور احمق کہیں کے تم سوچتے ہو گے کہ تم نے حکومت
نے کو جس طرح لوٹا ہے اس کا مجھے علم نہیں ہے۔ بچو، مسکین بن کر سستے داموں کوٹے کا مال ہتھیا کر چور بازاری کرتے ہو،
اموں پر بیچ دیتے ہو۔ ٹھہر جاؤ ذرا، تمہارے یہ کرتوت تمہارے سامنے ایک ایک کر کے نہ گنواتے تو کہنا۔ اب تو یہ
چلّا چلّا کر کہہ دوں گا تب ہی مجھے چین آئے گا۔ ہر بات اتنے سالوں سے اپنے سینے میں چھپائے بیٹھا تھا۔ اب مجھے کہنا ہی پڑے گا
نہ کہوں۔ کہہ دیا تو میرا کیا کر لو گے۔ میں تم جیسے بے غیرت سے ڈرتا تھوڑے ہوں۔۔۔۔۔۔۔۔ اور اگر تم نے آگے سے
تو پھر دیکھنا، تمہارے سارے کرتوتوں کے تحریری ثبوت میرے پاس محفوظ ہیں۔ آخر یہ سب کالے کرتوت کرواتے تو
ے ہی ذریعے تھے نا۔ کتنے چالاک ہو تم کمینے۔۔۔۔ تم جیسا بدمعاش اس دنیا میں اور کہیں پیدا ہی نہیں ہوا۔ تھو ہے تم پر
ہارے منہ پر نہ تھوکوں تو۔۔۔۔۔“

یہ کہا اور پنسل اپنے زور سے فائل پر ماری کہ اس کا سکّہ ٹوٹ گیا۔ اتنے میں شیشے کی پارٹیشن کی دوسری جانب بیٹھے مالک کی آواز سنائی دی۔

”حسین صاحب۔۔۔!“

حسین صاحب ایک دم چونکے۔ کوٹ کے بٹن بند کرتے، ٹائی درست کرتے مالک کے کمرے میں داخل ہوئے۔

"فرمائیے جناب عالی۔"

"کسٹم سے بلٹی چھڑالی ہے کیا؟"

"جناب ......"

"کیا جناب؟ میں پوچھ رہا ہوں بلٹی چھڑالی ہے یا نہیں؟"

"حضور والا، اگر آپ اجازت دیں تو ......"

"میاں میں نے تمہیں کہا نہیں تھا کہ جست کے مال کی بلٹی چھڑا کر یوسف صاحب کو پہنچانی ہے؟ تمہیں کوئی بات سمجھ میں نہیں آتی؟ میں تنگ آگیا ہوں تم سے۔ لگتا ہے تم میری جان لے کر دم لو گے۔"

"حضور، آپ ناراض نہ ہوں۔ بے شک آپ نے یہی حکم دیا تھا لیکن ......"

"لیکن ویکن کچھ نہیں چلے گا مسٹر، یہاں وہی ہوگا جو میں کہتا ہوں۔"

"آپ کا حکم سر آنکھوں پر حضور، لیکن یوسف صاحب صرف تیس فیصد منافع دینے پر راضی ہوئے تھے جب کہ میں نے پینتیس فیصد منافع دینے والی ایک اسامی ڈھونڈلی ہے۔"

"اچھا؟ ...... تو پھر مجھے پہلے کیوں نہیں بتادیا؟"

"میں تو عرض کرنے والا تھا حضور، مگر آپ ......"

"اچھا ٹھیک ہے۔ اگر یہ بات ہے تو کچھ اور انتظار کرلو۔ ہوسکتا ہے کوئی اس سے بھی اچھا گاہک مل جائے۔"

"بندہ بھی یہی سوچ رہا تھا، جناب والا۔"

× × × × × × × × × × ×

حسین صاحب اپنے دفتر میں بیٹھے چند فارم پُر کر رہے تھے۔ اندر ہی اندر خود کلامی میں مصروف تھے:

"یہ سمجھتا ہے میں اس کی تمام بے غیرتانہ حرکتیں صبر سے برداشت کرتا رہوں گا ..... ارے گیدی، میں بھی کوئی گدھا ہوں؟ ..... انسان گدھے کو بھی چارہ پانی دیتا رہتا ہے، اس کی مالش والش کرتا رہتا ہے کہ زیادہ بوجھ اٹھا سکے۔ رذیل؟ کمبخت مُردہ ضمیر۔ انسان، انسان کا اس قدر استحصال کرسکتا ہے، کوئی سوچ بھی نہیں سکتا۔ بیس برس سے زیادہ کا عرصہ گیا مجھے تیرے ساتھ کام کرتے۔ آج سمجھ جائے گا، کل سمجھ جائے گا کہتے کہتے صبر کرتا رہا۔ برسہا برس تمہارا غضب سہتا رہا مگر ایسے ذلیل ہو کہ انسانیت کا ایک ذرہ بھی تمہارے اندر داخل نہیں ہوا۔ واہ بھئی واہ۔ کام ہم کریں اور پیٹ میں یہ ٹھونستا رہے۔ ابھی جاتا ہوں اس کے پاس۔ میں کوئی اس سے ڈرتا تھوڑے ہوں۔ ڈرنے کی بھی کیا بات ہے۔ کھا تو نہیں جائے گا۔ ہر مرتبہ اگر میں نے سارا کچا چٹھا اس کے منہ پر نہ دے مارا تو مجھے آدمی نہ کہنا۔ میں صاف صاف کہہ دوں گا: نامراد تم نے ... بیوقوف سمجھ رکھا ہے کیا۔ اب تمہیں ہم اپنا حق مارنے کی ہرگز اجازت نہیں دیں گے۔ اگر اب تک منہ نہیں کھولا تو یہ اپنی شرافت ہے ... چا شاید تمہیں عقل آجائے۔ لیکن تمہاری اس کھوپڑی میں عقل کا کیا کام۔ تم چور ہو جو ہر شخص کا حق مارتے ہو۔ ہمارا گاڑھا پسینہ ... خون، ہماری ہڈیوں کا گودا، سب نچوڑ کر چٹ کر جاتے ہو۔ [illegible]

ر بنوا دیا ہے۔ کمبخت تمہیں یہ کہتے شرم بھی نہ آئی۔ تمہارے بیٹے کو تم نے نہیں، ہم نے تعلیم دلوائی ہے۔ خود اپنے بچوں کو تعلیم
دلوائی تمہارے بچے کو امریکہ بھجوایا ہے۔ ہمارا حق مارے بغیر بیٹے کو تعلیم دلوانے تو دیکھتے، گدھے کہیں کے..... (یہ کہہ کر
ن صاحب نے زور سے مکا میز پر مارا اور یہ کہتے ہوئے اٹھ کھڑے ہوئے) "لو اب میں جا رہا ہوں۔ اب میں آنکھیں
ر لوں گا اور نہ زبان کو چلنے دوں گا۔........ چور، حق خور...."

اتنے میں دوسرے کمرے سے مالک کی آواز گرجی: "حسین صاحب...." حسین صاحب جلدی سے لپکے چلتے چلتے
کے بٹن بند کیے۔ بالوں کو ہاتھ کی انگلیوں سے کنگھی کی۔ قمیض کا کالر سیدھا کیا اور مالک کے دروازے پر ٹک ٹک کر کے
اخل ہو گئے: "فرمائیے حضور...."

"حسین صاحب! آپ تو جانتے ہیں ان دنوں کمپنی کی پوزیشن ذرا اچھی نہیں ہے...."

"جی حضور۔ گزشتہ سالوں کی نسبت اچھی نہیں ہے۔ پچھلے سال کے مقابلے میں اس سال منافع بیس ہزار کم رہا ہے۔"

"دیکھا آپ نے، منافع بڑھنے کی بجائے کم ہو گیا ہے۔ کیا تدبیر سوچی ہے آپ نے؟"

"حضور، بندہ تو..... اگر آپ مناسب سمجھیں تو..... تھوڑا سا ہاتھ کھینچنے کا مشورہ دے گا۔"

"بالکل درست...."

"دوسرے، تھوڑی چھانٹی کی بھی ضرورت ہے جناب والا۔ مثلاً نورانی صاحب اپنے کام کے علاوہ مرتضیٰ صاحب
بی بآسانی کر سکتے ہیں۔ اگر آپ چاہیں تو ساتھ ہی ٹیلیفون ایکسچینج بھی وہی آپریٹ کر سکتے ہیں۔ بلکہ میں تو کہوں گا کہ ٹائپنگ
کا موٹا سا کام بھی انھیں کے ذمے لگا دیا جا سکتا ہے۔"

"اور کچھ؟"

"اور کچھ..... حضورِ والا اصل اہم بات تو کمپنی کا مفاد ہے۔ اگر مناسب سمجھیں تو اخراجات میں کمی، مثلاً تنخواہوں میں.."

"بات تو ٹھیک ہے حسین صاحب، مگر مجھے اس سے بے حد دکھ ہو گا۔ اتنا دکھ کہ آپ اندازہ نہیں کر سکتے۔"

"آپ دل برا نہ کریں حضور، میں آپ کے لیے عطر کی بوتل لاتا ہوں، تھوڑا سا لگا لیجیے طبیعت سنبھل جائے گی۔"

"نہیں، میرے لیے ایک قہوے کی پیالی منگوا دیجیے۔"

"جو حکم حضور۔"

"ذرا ٹھہریں، میرا خیال ہے اکاؤنٹ برانچ سے بھی دو آدمی فارغ کر دیں۔ ان کا کام آپ سنبھال لیجیے۔"

"بالکل بجا ہے حضور۔"

"اور یہ نجمی صاحب تو خواہ مخواہ کی تنخواہ لے رہے ہیں۔ ان کا کام بھی آپ...."

"بندہ وہ بھی کرے گا جنابِ عالی۔"

"آپ کی تنخواہ میں سے بھی کٹوتی..... یقین جانیے مجھے بڑا دکھ ہے اس بات کا۔ بیس فی صد کٹوتی کی جائے گی۔ باقی
لوں کو نذار [illegible]

"سمجھا دوں گا حضور، میں کہہ دوں گا کہ کمپنی کے مفاد کا یہی تقاضا ہے۔ آپ بے فکر رہیے جناب۔"
"شکریہ۔"
"اللہ تعالیٰ آپ کو لمبی عمر دے، بندہ پرور۔"

× × × × × × × ×

اکاؤنٹ کی کتابیں چیک کرتے کرتے حسین صاحب پر خود کلامی کا ایک دورہ پھر پڑا:
"یہ کمینہ ہر وقت میری بے عزتی کرتا رہتا ہے۔ میرے ساتھ کتّوں جیسا سلوک کرتا ہے۔ کتّا بھی چاہتا ہے کہ کوئی اس کی بیٹھ پر ہاتھ پھیرے، اسے پیار کرے، بے غیرت انسان، آخر تم چیز کیا ہو؟ تمہیں کسی کو گالی دینے کا کیا حق ہے؟ اگر تنخواہ دیتے ہو تو مفت میں تو نہیں دیتے۔ دن رات گاڑھا پسینہ بہاتے ہیں، آنکھوں کا تور لٹاتے ہیں۔ خدا کی قسم میں یہ سب کچھ ایک لقمہ روٹی کی خاطر نہیں سہتا۔ روٹی کے دو ٹکڑے تو جہاں اتنی محنت کروں گا وہیں سے مل جائیں گے۔ گدھا بن کر دن رات کام ہی کام کرنا ہے تو جو بھی بیٹھ پر بوجھ لادے گا، چارہ بھی کھلا ہی دے گا۔ یہ تو میرا حق بنتا ہے۔ انسان دنیا میں محض پیٹ کی خاطر جیتا ہے۔ اپنی حیثیت کی خاطر جان مارتا ہے۔ اب میں تمہیں ہرگز اجازت نہیں دوں گا کہ میری عزت جب چاہو پاؤں تلے روند ڈالو۔ سمجھے؟ احمق نہ ہو تو .... میں ابھی آکر تمہیں درس دیتا ہوں۔ کمینے، بے غیرت! گالیاں کیے بغیر اس بار میں بھی تمہارے منھ پر تمہیں خر ابنِ خر کہہ کر چھوڑوں گا، کیوں نہ کہوں، پورے بیس سال سے بے عزتی برداشت کر رہا ہوں۔ اگر منھ نہیں کھولا تو محض تمہاری بزرگی کی خاطر۔ مجھ سے پورے دو سال بڑے ہو تم ..... اب تو میں تمہاری میز پر مکّا مار کر تمہیں علی الاعلان گالیاں دوں گا۔ کمبخت دھوکہ باز ..... کرسی اٹھا کر تمہارے سر پر نہ ماری تو ..... اور تھوکوں گا بھی تمہارے منھ پر چہرے کے عین درمیان ......"
ساتھ والے کمرے سے مالک کی آواز بلند ہوئی۔ "حیوان، کمبخت۔"
"فرمائیے حضور" کہتے ہوئے حسین صاحب نے اپنے آپ کو سنبھالا۔ کالر اور کوٹ درست کرتے ہوئے بھاگم بھاگ صاحب کے کمرے میں داخل ہوئے۔
"جی حضور، فرمائیے۔"
"ارے حسین، تمہاری یہ کھوپڑی ہے یا کیا ہے؟"
"کیا پھر کوئی غلطی سرزد ہو گئی بندے سے حضور والا؟"
"اور کیا کر سکتے ہو تم؟ یہ گدھا پن نہیں چاہیے مجھے۔ نہیں چاہیے یہ گدھا پن۔"
"آپ درست فرما رہے ہیں حضور، معاف کر دیجیے میری خطا۔"
"کتنی بار معاف کر دوں تمہیں؟ تم نے تو گدھے پن سے اس کمپنی کو چڑیا گھر بنا ڈالا ہے۔ آخر یہ کیا جانوروں کی سی حرکت کی ہے تم نے؟"
"حضور معاف کر دیجیے، آپ کا غلام ...."

" بکواس بند کرو، پھر بولتے جا رہے ہو تم؟ شرم تو آتی ہی نہیں تمہیں۔ تم ضرور میری جان لینے پر تُلے ہوئے ہو۔ ای قسم ٹھیک کہہ رہا ہوں۔"

" غصہ نہ کیجیے سرکار۔ آپ کی بلڈ پریشر کی دوائی لاؤں؟ یا تھوڑا لیموں کا عرق؟"

" واللہ تم مجھے جان سے مار ڈالو گے۔ دفع ہو جاؤ یہاں سے ___ اچھا ٹھہرو ذرا۔ میری گاڑی کہاں ہے؟ گاڑی لگواؤ۔ راور کوٹ کہاں ہے؟ مجھے پہناؤ۔ وہ بریف کیس مجھے پکڑاؤ۔ یہ پیکٹ پکڑو۔ شام کو میرے گھر پہنچا دینا یاد سے۔"

حسن صاحب مالک کے پیچھے پیچھے سیڑھیاں اُترے۔ باہر جا کر گاڑی کا دروازہ کھولا۔ صاحب گاڑی میں بیٹھ گئے۔ ز چینے پھر جھڑکا۔

" میں تم سب سے تنگ آ گیا ہوں، بیزار ہو چکا ہوں۔"

" خدا حافظ، حضورِ والا۔ اللہ نگہبان۔"

گل ہائے رنگ رنگ

امریکی کہانی

جوناتھن بامباچ / نسیم سنترکھی

زندگی، وقت اور کہانی

(۱)

بچپن میں وہ کہانی کا کوئی بڑا قاری نہ تھا۔ جب وہ بیس سال کا ہوا تو مشکل سے کسی کتاب کو پڑھ پاتا تھا۔ یہ ایک کہانی تھی جو مجھے اس نے سنائی۔ اس نے دوسرے لوگوں کو دوسری کہانیاں سنائیں جو ان کے پیشے اور ان کے حالات کے مطابق تھیں۔ ایک مرتبہ اس نے کچھ کتابیں تلاش کیں۔ اس نے مجھے بڑے یقین سے بتایا کہ وہ اس کے لیے کافی نہ تھیں جتنا وہ چاہتا تھا۔ ارنی (ERNIE) اکثر کہا کرتا تھا کہ مجھے سیمو (SAMOA) کی عمر تک پہنچنے دو۔ دراصل قصہ یہ تھا کہ وہ جنگ کوریا کے آخری ایام میں بحیثیت سپلائی سارجنٹ جاپان میں مقیم تھا وہیں اس نے کچھ کتابیں تلاش کی تھیں۔ اسے حیرت تھی کہ یہ سب کی سب اس کی زندگی کی عکاس ہیں۔ آخر اتنے دنوں وہ ان کتابوں سے کیوں دور رہا۔ اس کو یہ کتابیں ایک ایسا معلوم ہوئیں جس کا زیادہ سے زیادہ لوگوں سے متعارف ہونا ازبس ضروری ہے۔ اور جس کی شہرت دور دور تک پھیلنی چاہیے میرے دوست جیک (JACK) نے ارنی کے بارے میں بتایا کہ اسے جو کچھ ہاتھ لگتا، بڑے غور سے پڑھتا۔ بار بار پڑھتا۔ جب بھی جہاں کہیں اسے موقع ملتا وہ یہی باتیں کیا کرتا تھا کہ کس کس نے پڑھ لیا ہے اور کون کون پڑھے گا۔ لوگ ارنی کو لفاظ سمجھتے تھے لیکن یقین تھا کہ وہ اداکاری کرتا ہے۔ ورنہ ان باتوں کی تہہ میں خلوص اور حساسیت موجود ہے۔

(۲)

پہلی بار اس نے تعریفی خط ایک کتاب کے مصنف کو لکھا جس میں کتاب کے بارے میں اپنے احساسات کو کاغذ پر منتقل کیا۔ مصنف کے جواب نے اسے پریشان کیا۔ اس کے الفاظ یوں تھے "ستائش کی قابلِ رحم کوشش" اس کے باوجود شک و شبہات قائم رہے۔ اس نے اپنا خط پوسٹ تو کر دیا لیکن اصل مسودہ کو نکال لیا۔ بعد میں اس نے سوچا۔ یہ ایک مذاق ہے۔ میں ایک احمق ہوں۔ مجھے اس شخص کی کتابوں سے محبت تھی۔ غیر احترامی تاثر جو میرے ذہن پر مسلط ہوا تھا اس کو بیان کرنا چاہتا تھا۔ جیک نے مجھے بتایا کہ آرنی نے دو رائٹرز کو تعریفی خطوط ایک ہی وقت میں بھیجے تھے۔ جن میں ہر ایک کو

تعریف کی گئی تھی۔ لیکن کسی رائٹر نے نہ تو پہلی بار جواب دیا اور نہ کچھ خیر خبر لی بلکہ خاموش رہے۔ یہ ایک عجیب تجربہ تھا۔ جس نے آرنی کو اداس کر دیا۔ لیکن اس نے ان کے جوابات خود ہی تلاش کر لیے۔ ارنی نے ہم لوگوں کو بتایا کہ کچھ لوگ مجھے بہت پسند کرتے ہیں۔ انھوں نے مجھے محبت بھرے خطوط لکھے تھے۔

(۳)

اب یہاں ایک کہانی ملتی ہے جو ہم میں سے کچھ لوگوں کے لیے کار آمد ہے۔ اس وقت آرنی کیا تھا؟ جب وہ سروس میں تھا ایک انگریز نرس سے اس کے تعلقات کافی بڑھ گئے۔ یہ دونوں ایک دوسرے کے سلسلے میں بڑے جذباتی تھے۔ ہم نے یہ سُنا تھا۔ لیکن مختلف رکاوٹیں بھی تھیں۔ ان میں آپس میں کوئی جنگ نہ تھی جو انھیں الگ کر دیتی۔ ان کی رومانی شدت نے اپنی گرفت مضبوط کی۔ یہ دونوں کئی ماہ تک پُر مسرّت طور پر ایک ساتھ رہے۔ پھر نرس حاملہ ہو گئی۔ بچّے کی امید سے آرنی بہت خوش تھا۔ کیونکہ یہ اس کا اپنا بچہ ہوگا۔ بحیثیت باپ اپنی زندگی اس خاتون کے ساتھ گزارنی ہے۔ پھر یک بیک بہت ہی تکلیف دہ واقعات رونما ہوئے۔ بچے کی پیدائش کے وقت ایسی انجانی پیچیدگی پیدا ہو گئی جس کے سبب زچّہ و بچّہ دونوں کی زندگیاں ختم ہو گئیں۔ اس ناگہانی حادثے کی خبر آرنی تک پہنچی تو اس نے کوئی ردّ عمل ظاہر نہ کیا۔ بارش میں وہ پیدل چل کر وہاں پہنچا اور سوچنے لگا کہ ہزاروں چھوٹے چھوٹے بکھرے ہوئے ٹکڑے سریش لگا کر جوڑ دیے گئے ہیں۔

(۴)

آرنی نے دوسری اور تیسری بار رائٹروں کو خطوط لکھے جن کی آٹھ سال کے دوران کوئی کتاب شائع نہیں ہوتی تھی۔ تیسرے خط کا جواب اس طرح دیا گیا تھا جیسے کوئی ریمانڈ نوٹس ہو "اگر میری کتابیں ہیں تو بہتر اگر نہیں ہیں تو بھی بہتر" نیچے جو دستخط تھے وہ اتنے پیچیدہ تھے کہ پڑھنا مشکل تھا۔ لیکن خوبصورت ہینڈ رائیٹنگ کسی ادیب کی نشاندہی کر رہی تھی۔ آرنی نے اس خط پر پلاسٹک کور چڑھا کر البم میں رکھ لیا۔ یادگار چیزوں کو محفوظ کرنے کے سلسلے میں وہ ابھی تک بے خبر تھا۔ یہ ابتدا تھی۔ آرنی مختلف رائٹروں کو توصیفی خطوط لکھتا رہا۔ ایک ماہ بعد بہت سوں کے جوابات موصول ہوئے ان میں سے ایک کے جواب نے اسے سوچنے پر مجبور کر دیا۔ جواب دینے والے نے اس کی کوئی مدد نہ کی تھی۔ بلکہ آرنی کی آنکھوں میں آنسو امڈ آئے تھے۔ اس نے اس وقت یہ کہا تھا کہ اگر میں یہ غم تسلیم کر لوں تو دوسرے بھی تسلیم کر لیں گے اور میں دیوارِ قہقہہ بن جاؤں گا۔ برائے مہربانی یہ باتیں کسی دوسرے سے مت کہنا۔ آرنی نے ہمیں تاکید کرتے ہوئے کہا تھا۔

(۵)

کچھ عرصہ بعد وہ ایک دوسری خاتون کے ساتھ رہنے لگا جو ایک رائٹر تھی جس کے اب تک دو ناول شائع ہو چکے تھے۔ لیکن اب اس نے کئی سالوں سے کچھ نہیں کیا تھا۔ وہ ایک ایسے مقام پر پہنچ گئی تھی جہاں ایک جملہ لکھنے کے بعد وہ سوچنے لگتی کہ میں تو دنیا کو جھٹلا رہی ہوں۔ آرنی اس کو ایک الگ کمرے میں ایک ٹائپ رائٹر کے ساتھ دن میں چار گھنٹے کے لیے روزانہ بند کر دیتا تھا۔ اس کا نام زو (ZOE) تھا۔ وہ اسے زو۔ زو (20 - 20) پکارتا تھا، جو اس کے منھ سے نکلی آواز سوسو (SOSO) معلوم ہوتی۔ کبھی کبھی خاتون ایک جملے کو چار گھنٹے میں لکھتی۔ آرنی اس کے قریب جا کر زو زو زو سے شور مچاتا

لیکن اس نے کبھی برا نہ مانا۔ اس زیادتی پر وہ ہنس کر رہ جاتی۔ ایک دن وہ اپنے کمرے سے باہر آئی۔ اس کے ہاتھ میں مکمل اسٹوری تھی۔ ارنی نے غیر جانبدارانہ طور پر محتاط انداز میں اسے پڑھا۔ اختتام پر معمولی سا شبہ ہوا۔ "اگر تم پسند کرو، تو میں اس کی ایک یا دو سطروں میں کچھ تبدیلی کر دوں لیکن میں اس حالت میں بہت خوش ہوں وہ اب ہیں۔" ارنی نے دل ہی دل میں سوچا۔ یہ تو نسلی خواہش ہے جس سے میرا تعلق ہے۔

(۶)

اب ارنی ایک اور خاتون کی محبت میں گرفتار ہو گئے جسے وہ ہر صبح سڑک پر اپنے کتے کے ساتھ ٹہلتے ہوئے دیکھا کرتا تھا۔ کبھی ان دونوں کے ساتھ ہو جایا کرتا تھا۔ کتے کے تیور یہ ظاہر کرتے کہ وہ آرنی سے خفا ہے۔ اس خاتون کا اپنے شوہر سے ... جیسا تھا۔ کبھی ان دونوں میں اختلاف ہوتا، کبھی ملاپ۔ کبھی کبھی ان کے لمحات نہایت مایوس کن ہوتے جن سے عجیب خدشہ بڑھ جاتا۔ ارنی اور یہ خاتون عموماً ایک دوسرے سے بہت ہی کم ملتے تھے۔ لیکن ملاقاتوں میں زیادتی ہوئی۔ ایک افواہ پھیلی کہ اس خاتون نے ٹرین کے نیچے آکر اپنے آپ کو ہلاک کر لیا ہے۔ کوئی یہ کہتا کہ خواب آور گولیاں کھا کر اس نے ... ختم کر لیا ہے۔ مجھے اس پر شبہ ہوا کہ یہ سچ نہیں ہے اور اس امر کا متلاشی تھا کہ اسٹوری کا فیصلہ کن انجام ملے۔

(۷)

اپنی مقبولیت اور بہتر حالت سے قبل ارنی کے لیے ذریعہ معاش ایک پریشان کن مسئلہ تھا۔ اس نے مارکیٹ الموتیم بیچنا شروع کیا۔ پھر وہ ریڈیو کا صداکار بنا۔ بعد میں بوسٹن کی ایک فرم میں کتب فروشی بھی کرتا رہا جس کی سے کچھ عرصہ وہ گھر سے دور رہا۔ یہ کام اسے پسند تھا۔ لیکن اسے یہ بھی پریشانی تھی کہ اس کی غیر موجودگی میں ... کمرہ چھوڑ کر چلی جائے گی۔ ریفریجریٹر سے پھل اور کھانے کی دوسری اشیا نکال لے گی۔ اسے اپنی حریصانہ فطرت پر قابو کرنا مشکل ہو جائے گا۔

جہاں تک ارنی کی ملازمت اور اس کے کاموں کی دلچسپی کا تعلق ہے اس میں رائٹروں سے ملاقاتیں شامل جن کی کتابوں سے وہ متاثر ہوا تھا۔ کچھ ملاقاتوں میں اس نے اپنا بہت زیادہ وقت صرف کیا تھا جس سے وہ بہت خوش ہوا تھا۔ خصوصاً وہ ایسے رائٹروں سے ملا جنھوں نے اس کے خط و کتابت کا جواب دیا تھا۔ میامی یونیورسٹی کا دورہ کرنے کے بعد اس نے تہیہ کیا تھا کہ JASON HONEYCUT جیسن ہانی کٹ سے ضرور ملوں گا جو میامی اور نیو ہمپشائر کی سرحد کے قریب کہیں رہتا تھا۔ اس تنہائی پسند ناول نگار کے یہاں فون نہیں تھا۔ آرنی نے ان کا انتظار جنرل اسٹور کے باہر کیا جہاں ہانی کٹ موجود تھا۔ جب وہ باہر آیا تو آرنی نے اپنا تعارف خود کرایا۔ اشیائے صرف کے بیگ اس کے ہاتھوں میں ... ارنی نے مدد کرنے کی خواہش ظاہر کی۔ ہانی کٹ نے غیر شعوری طور پر اپنے سامان کا شمار کیا۔ اور دور کھڑی اسٹیشن ویگن کی جانب چل پڑے۔ چلتے چلتے ارنی نے کہا۔

"میں تمہاری گوشہ نشینی کا مطلب سمجھتا ہوں۔"

"اس کے عمل درآمد کا تم پر کوئی ارادہ نہیں۔" ہانی کٹ نے کہا۔

"تمہاری کتابیں میرے لیے بہت اہم ہیں۔" ارنی نے آہستہ سے کہا۔
اب وہ دونوں ہالی کٹ کے فارم ہاؤس کے سامنے کھڑے تھے۔ دونوں کے درمیان اشیائے صرف کا بکس تھا۔
ارنی پھر مخاطب ہوا۔
"بس صرف یہ کہنا چاہتا ہوں کہ دوسروں کے تمام ادبی سرمائے کی بہ نسبت آپ کی صرف ایک سطر زیادہ متاثر کرتی ہے۔"
"ٹھیک ہے۔ ٹھیک ہے۔" بے اطمینانی سے ایک گہرا سانس لیتے ہوئے ہالی کٹ نے کہا۔
ارنی اس دورے کے بعد واپس آگیا۔ ہالی کٹ سے دوستی ہوگئی۔ اس کے ناول کے پہلے اڈیشن کے چھاپنے کا معاہدہ بھی طے پاگیا۔ اس کے علاوہ ہالی کٹ کی دوسری کہانیاں بھی ارنی نے حاصل کرلیں۔ بن بلائے مہمان بن کر ارنی نے دوسرے بہت سے رائٹروں کا پیچھا کیا۔ ارنی کا کہنا تھا کہ اس نے کسی اہم رائٹر کو نظر انداز نہیں کیا۔ وہ یہ بھی کہتا تھا کہ یہ سب میرے لیے بڑے مزاج دل تھے۔ اور کبھی یہ کہتے ہوئے بھی سنا گیا "ادبی مساوات کا قائل بھی ہوسکتا ہوں جس کو کم لوگ جانتے ہیں۔"

(۸)

ارنی جذباتی طور پر اپنی ماں سے بہت قریب تھا۔ اس کا باپ سخت جسمانی مشقت کیا کرتا تھا۔ وہ اکثر نشے میں دھت رہتا۔ بہت کم تہوار اس نے اپنے خاندان کے ساتھ منائے۔ کبھی کبھی وہ تلخ کلامی پر بھی اتر آتا۔ اس نے اپنی بیوی کو بڑی حد تک مایوس کیا۔ ارنی کی ماں جو ایک اچھی مصورہ تھی ارنی کی جانب راغب ہوئی تاکہ تسلی و تشفی دے سکے۔ ارنی نے اپنی ماں کے اس سہارے کو قبول کیا۔ ماں کی تربیت کے زیر اثر ارنی نے کم عمری میں مصوری میں اپنی ذہانت دکھائی۔ بعد میں اپنے بل بوتے پر اس کو فروغ دیا۔ کچھ تجربات کے بعد اسے محسوس ہوا کہ زندگی گزارنے کے لیے ماں کو چھوڑ دینا چاہیے۔ جب وہ بڑا ہوا۔ اس نے اپنے باپ کے طور طریقوں کو اپنایا جن میں سختی، لفاظی وغیرہ شامل تھی، ان پر قائم بھی رہا۔ ماں کے انتقال کے بعد یہ بھی ضروری تھا کہ وہ اس پر بھی قائم رہے کہ وہ اپنی ماں کا بیٹا تھا۔

(۹)

جب ارنی ایک ادبی پرچے کا اڈیٹر بنا اس نے اپنی ذاتی پبلشنگ کمپنی قائم کی۔ کارو نیٹر اینڈ سنز۔ رائٹروں کی ایک بڑی تعداد کو اس میں شامل کیا۔ اب ارنی ایک مشہور و معروف شخصیت بن گیا تھا۔ اس کی تصویر پبلشرز میگزین کے سرورق پر نمایاں طور پر چھپی۔ اس کے تمام رائٹروں نے اس کو سراہا۔ ارنی نے اسے اپنی کامیابی سمجھا۔ اس نے یہ کہنا پسند کیا کہ یہ ایسوسی ایشن کی کامیابی ہے۔ میں وہی کچھ کرتا جو میرے اختیار میں ہے۔ ارنی کے مصنفین نے اپنی کتابوں کی تشہیر کے لیے دوسرے اضلاع کے دورے نہیں کیے تھے۔ اس نے سوچا کہ ایک ایسی مشق جو سنجیدہ فن کاروں کی حیثیت کو کم کر دیتی ہے اسے جاری رہنا چاہیے۔ چنانچہ وہ اپنے مصنفین کو ساتھ لے کر گفتگو کی نشستیں منعقد کیں۔ بک اسٹالوں میں پڑھنے والی پبلک کو مدعو کیا۔ بہت سرعت کے ساتھ اس نے دیگر مقامات کو چھان ڈالا۔ اس نے اپنی ساکھ کو تیزی سے بڑھائی، یہ کہتے ہوئے کہ یہ بہت پُر اثر خیالات ہیں جو میرے دماغ میں آئے۔ یہ صورت اس وقت کی تھی جب وہ ایک مشہور پبلشر تھا۔ دو سال بعد تیسرے سال اس کی پبلشنگ ماند پڑگئی۔ اس کے بعد ایک ایسا مسئلہ کھڑا ہوگیا۔ ان کے تمام حلقہ بگوش مصنفین ساتھیوں نے اس کا ساتھ چھوڑ دیا۔

اور وہ تنہا ہو گیا۔ نہ جانے کیا غلطی ہو گئی تھی اس سے کہ اس کے ساتھی مصنّفین سب اس سے کنارہ کش ہو گئے۔
سب کے سامنے یکساں طور پر ایک ہی سوال تھا۔ زیادہ جشن منانے، زیادہ پروپیگنڈہ کرنے سے ارنی کی شخصیت ابھری۔
اس سے فائدے سے کہیں زیادہ نقصان ہوا ہے۔ جیک نے مجھے بتایا کہ ارنی نے اپنے آپ کو اس طرح برباد کیا کہ وہ قارئین کو جس ذریعے
تعلیم و تربیت دینا چاہتا تھا وہ ذریعہ خود اس کی بربادی کا سبب بنا۔

(۱۰)

کتابوں پر تنقید کے باوجود کارو ہیٹیز اینڈ سنز نے دو حصّے داروں کی شراکت سے مالکانہ حقوق حاصل کر لیے۔
ایک حصّے دار کے ذریعے آرنی کو آگاہ کیا گیا کہ وہ اپنے مصنّفین کے ذریعے کمپنی کی آمدنی میں اضافہ کرے۔ ارنی نے ہمیں بتایا کہ
اس نے ہمیشہ یہ کوشش کی لیکن اسے یہ اچھا نہیں سمجھتا تھا۔ اس کے ایک حصّے دار نے مجھ سے کہا کہ پہلے چھ ماہ کے بعد ارنی کو منافع
سے ہاتھ دھونا پڑا کیونکہ اس کی زیادہ توجہ اپنی شہرت اور اپنے پروپیگنڈے پر تھی اور حصّے دار نے مزید بتایا کہ بزنس میں جو
ابتدائی سرمایہ لگایا گیا تھا اسی پر انحصار رہے۔ دوسری جانب آرنی اپنے حصّے داروں کو کچھ کہہ نہیں سکتا تھا جنھیں وہ بیسل
اور جیسکل کہتا تھا۔ بیسکل کچھ پڑھ نہیں سکتا تھا، جیسکل تھوڑا بہت پڑھ لیتا تھا۔ وہ بھی نہ ہونے کے برابر۔

(۱۱)

ہم تھوڑی دیر کے لیے پیچھے پلٹتے ہیں۔ آرنی ایک روشن ستارے کی مانند آسمان پر چمک رہا تھا۔ اس کے مخطوطات کا
مجموعہ "ہیروز اینڈ ہیرو ئینز" شائع ہونے کے قریب تھا۔ جیسے ہی معاہدے پر دستخط کے لیے کہا گیا، ارنی نے معذرت کرلی اور کہا
"میں عوام کے ہجوم میں گھرا ہوں۔ کتاب ابھی نامکمل ہے، اس میں کچھ عالمی شخصیات کے خطوط مزید شامل ہوں گے۔ پھر اشاعت
کی تاریخ کا اعلان ہوگا۔ اسی لمحے اسے ٹالسٹائی کے خط کا تصور ابھرا جو ایک سہ ماہی ادبی میگزین میں شائع کیا گیا تھا۔ انٹرویو
لینے والے نے اس سے دریافت کیا۔

"میرے خیال میں ٹالسٹائی کا خط تم نے اپنے ہاتھ سے لکھ دیا۔"

میں نے کبھی کچھ نہیں لکھا۔ میں نے معمولی سی بھی ذہانت لکھنے میں نہیں دکھائی۔ تم اوپر دیکھ سکتے ہو یہ جو حرف c ہے میرے
قریبی میں انگلش سے یاد کر لیا تھا جو پنسلوانیہ یونیورسٹی کے استاد کی فیاضی تھی۔ حقیقت یہ ہے کہ میں قطعاً نہیں جانتا کہ ٹالسٹائی
کا خط میرے پاس کس طرح پہنچا۔ اتنا یاد ہے کہ جب یہ میرے پاس آیا اس وقت روشنی تھی۔ اب یہ سوال پیدا ہوتا کہ اس کا ذریعہ
کیا تھا، بے معنی ہوگا۔

سوفوکیلز (SOPHOCLES) کا بھی ایک خط دستیاب ہو چکا تھا جو ابھی اشاعت کے لیے جاری نہیں کیا گیا تھا۔
اس کے اصل ہونے کے بارے میں ارنی نے خود ہی بتایا کہ اس شخص نے عبارت لکھوائی تھی۔ حقیقت یہ ہے کہ میرے پاس بہت سے
یونانی تھے۔

(۱۲)

ارنی کا ... دوست ماہر نفسیات تھا۔ وہ ایک تجرباتی کلینک سے کچھ دنوں کے لیے بھاگ آیا تھا۔ وہ کلینک ایسی تھی

جہاں لاعلاج مریضوں کا علاج کیا جاتا تھا۔ ان ہی لاعلاج مریضوں میں ایک سترہ سالہ خوبصورت لڑکی بھی تھی۔ جب آرنی اپنے دوست کو دیکھنے کیلیفورنیا کی کلینک میں گیا تو وہ اس لڑکی کی ذہانت اور ہمت دیکھ کر بہت متاثر ہوا۔ اس کے ساتھ بیٹھ کر کچھ دیر باتیں کیں۔ بعد میں ان دونوں کے درمیان خط و کتابت ہوتی رہی۔ لڑکی کے خطوط ذہانت اور معقولیت کے آئینہ دار تھے۔ ارنی کے دل میں خواہش پیدا ہوئی کہ اس سے دوبارہ ملا جائے۔ اور وہ ملتا رہا۔ آرنی کی دوستی سے وہ صحت مند ہونے لگی۔ ڈاکٹر نے ارنی کو آگاہ کیا کہ لڑکی اس قابل نہیں ہے کہ اس کی صحت معمول پر آجائے لہٰذا اس میں زیادہ دل چسپی نہ لی جائے۔ کچھ دنوں کے بعد لڑکی حیرت ناک طور پر صحت یاب ہوگئی۔ پھر اس نے آرنی کو اس شخص کے مقابلے میں مسترد کر دیا جو اس کی نظر میں ارنی سے زیادہ معتبر تھا۔ اب ارنی تنہائی پسند ہوگیا۔ شراب میں زیادتی ہوئی۔ اکثر دھینگا مستی کی نوبت آجاتی۔ آخر کار تجربے نے اسے اپنی ضروریات پر پھر سے توجہ دینے پر مائل کیا۔

(۱۳)

زو (ZOE) کی ملاقات آرنی سے پھر ایک جگہ ہوئی۔ یہ ایک پارٹی تھی جہاں ارنی ایک مشہور رقاصہ سے محوِ گفتگو تھا جانے کس بات پر زو اور آرنی لڑ پڑے۔ جو باتیں اندر ہوئیں وہ باہر آگئیں۔ زو کی جانب سے ایک دھماکہ ہوا "جس کے ساتھ تم نے بارہ سال کے شب و روز گزارے۔ اس سے اس طرح کا برتاؤ کرتے ہوئے" واقعتہ کچھ بھی ہوا ہو، لیکن زو جلدی سے برسرِ عمل آئی۔ اپنے بچے کو اٹھایا۔ ارنی کو موردِ الزام ٹھہرا کر بچے کے اخراجات کا مطالبہ کیا اور دعویٰ دائر کیا کہ موجودہ آمدنی سے ونہائی رقم اسے دلوائی جائے۔

جیک کے مطابق، ارنی نے زو کی بہت خوشامد کی تھی جب وہ اپارٹمنٹ چھوڑ رہی تھی تو وہ اس کے پیروں پر گر پڑا تھا۔ دوبارہ واپس بلانے کی کوشش میں اس نے تمام ذرائع استعمال کیے۔ جیک نے مزید کہا کہ ادھر زو، یہ کہتی تھی کہ دوسری عورتوں کی بہ نسبت وہ ایک چیز سے سخت نفرت کرتا تھا۔ وہ اپنا راستہ تلاش نہیں کرسکتا۔ اگرچہ وہ کہا کرتا تھا کہ یہ اس کی پسندیدہ سطریں ہیں۔ لیکن ان ہی سطروں سے اس نے انکار کر دیا تھا۔ وہ اپنی ذات کے لیے کچھ سننا نہیں چاہتا تھا۔ اس کے پاس کوئی روزگار نہ تھا۔ میں نے بارہا کہا کہ میرے زیورات فروخت کر دو۔ جب اس نے مجھے آزاد کر دیا۔ مجھے کوئی صدمہ نہ ہوا۔ میں چھوڑ کر چلی آئی۔

"کیا تم نے اسے تھپڑ نہیں مارا جیسا کہ اس نے احتجاج کیا ہے"

"تھپڑ۔ تھپڑ" یہ سوال زو کے لیے باعثِ دل چسپی تھا۔ اگر وہ یہ کہتا ہے۔ یہ وہ کہے گا جو کہا جا رہا ہے اس میں میری کوئی خواہش نہ تھی، کہ میں اس نالائق کو تھپڑ ماروں۔ جب میں نے اس کے ہونٹوں سے خون نکلتے دیکھا تھا، مجھ پر خوف طاری ہوگیا تھا۔ میں ہر بات کو بھول جانے پر تیار ہوگئی تھی۔ اور اس پر بھی تیار تھی کہ اس کی دیکھ بھال کے لیے میری ضرورت جب تک درکار ہو۔ میں آرنی کے اس سانحے کو یاد کرتی ہوں۔ میں صرف یہ بتانا چاہتی ہوں کہ جو کچھ ہوا سو ہوا، آرنی اور میں ہمیشہ دوست رہیں گے۔

"کیا زو نے واقعی یہ کہا تھا" ارنی نے بھولے پن سے دریافت کیا۔ پھر کہا۔۔۔

"یہ ناقابلِ یقین ہے۔ اس خاتون کا تعلق ایک عجیب طبقے سے ہے۔"

(۱۴)

ایک دن میں نے ارنی کی فرم میں ٹیلی فون کیا۔ مجھے دس منٹ تک انتظار کرنا پڑا۔ پھر مجھے محسوس ہوا کہ جس ٹیلی فون سے میں نے رابطہ قائم کیا ہے وہ بند ہے لیکن آس پاس سے دوسری جگہ سے آوازیں آ رہی تھیں کہ نل فکشن، کرنل فکشن۔ اس طرح میں اس کو کبھی کبھی پکار رہی تھی۔ دوسری مرتبہ میں نے فون کیا تو مجھے بتایا گیا کہ ارنی اب کاروبنیٹیرز کا ملازم نہیں رہا۔ مجھے خیال آیا کہ یہ عجیب بات ہے کہ کمپنی اب اپنے مالک کے بارے میں یہ کہہ رہی ہے۔ میں نے کوشش کی کہ اس کے کسی حصے دار سے بات کی جائے۔ دونوں حصے دار کانفرنس میں مصروف تھے۔ مجھے بتایا گیا کہ ان کے پاس سر دست اتنا وقت نہیں ہے کہ فون پر آ کر بات کریں۔ کچھ دنوں کے بعد میں نے ارنی کے اپارٹمنٹ پر فون کیا تو پتا چلا کہ فون کاٹ دیا گیا ہے۔ پھر مجھے جیک نے بتایا کہ ارنی کہیں چلا گیا ہے۔ کوئی نہیں جانتا کہ وہ کہاں گیا۔ اس کی تلاش جاری ہے۔

(۱۵)

وقت گزرتا رہا۔ ہم ارنی کا انتظار کرتے رہے۔ اس عرصے میں زو کا ایک ناول شائع ہوا۔ اس کا مرکزی کردار ارنی تھا۔ یہ ارنی ناول میں ہاورڈ سولفٹ کہلایا جو بہت بڑا شرابی اور عورتوں کا دلدادہ تھا۔ یہ کردار اپنی خواہشات کو قابو میں رکھنے کا اہل نہ تھا۔ جب یہ ناول منظرِ عام پر آیا اس وقت زو کی شادی اس کے نفسیاتی معالج سے ہو گئی تھی۔ ناول کا زیادہ حصہ ہیرو کی بے ہمدردی پر مبنی تھا۔ اور اس کی رہائی مقصود تھی۔ ناول کا مرکزی کردار کوئی اچھا پورٹریٹ نہ تھا۔ یہ اس شخص کا بھی پورٹریٹ نہ تھا جسے ہم سب جانتے اور سمجھتے تھے۔ ہاورڈ سولفٹ۔ ایک نائٹ کلب کا مسخرہ ہے جو ایک تقریب میں میزبان ہوتا ہے جسے بے رحم اور مہم جو دکھایا گیا ہے۔ نفسیاتی خواہشات کے تحت آئے دن نئی کامیابی کی جانب بڑھ رہا ہے۔

"شاید ارنی ایسا نہیں تھا" جیک نے کہا۔

"ہاورڈ سولفٹ کا کردار حقیقت پر مبنی نہیں تھا بلکہ برعکس تھا۔ یہ تو صرف کلیشے تھا" میں نے کہا۔

کچھ دنوں کے بعد میں نے زو کو ایک طویل خط لکھا جس میں اس کے ناول کے کردار ارنی پر سخت احتجاج کیا تھا۔ بدقسمتی سے وہ خط میرے دوسرے کاغذات میں مل کر کہیں گم ہو گیا۔ یا پھر غیر شعوری طور پر میں نے اسے ردی کی ٹوکری میں پھاڑ کر پھینک دیا ہو۔

ایک داستان گشت کر رہی تھی جو دوسری افواہوں کی طرح ایک افواہ تھی کہ ارنی نے اپنے آپ کو پرانے دوستوں سے الگ تھلگ کر لیا ہے تاکہ وہ اس کا پیچھا نہ کریں۔ ارنی کی اصل تحریر جو بوسیدہ صفحات پر تھی وہ میرے ذہن پر مسلط ہو کر میری آنکھوں کے سامنے آ گئی۔ میں پورا دن اور رات بھر اس کے بارے میں سوچتا رہا۔ بار بار اٹھ کر کمرے میں ٹہلتا رہا۔ کیا پھر ہم اس کی آواز سن سکیں گے۔ اس نے ہم سب سے چھپ کر بہت سے ایسے کام کر دیے جن کا ہم میں سے بہتوں کو علم نہیں۔ اس کے غائبانہ کیریئر میں ہم شریک ہوتے ہیں۔ ہمارے اجتماعی تصور میں ارنی ایک اہم کردار تھا۔

رفتارِ ادب

دیوانِ عام ———— مصنف: محمد ذاکر علی خاں

صفحات: ۳۴۸۔ قیمت: ۱۲۵ روپے

پتا: علی گڑھ مسلم یونیورسٹی اولڈ بوائز ایسوسی ایشن۔ پاکستان، کراچی

خوشی کی بات ہے کہ محمد ذاکر علی خاں صاحب دیوانِ خاص سے گزر کر دیوانِ عام میں آگئے ہیں۔ دیوانِ عام سے پہلے ان کی جو کتابیں اشاعت پذیر ہوئیں ان کے موضوعات خاص بلکہ خالخاص تھے۔ دیوانِ عام ایک نگار خانہ ہے جس میں عام و خاص سبھی کی رنگا رنگ تصویریں ہیں۔ ہر تصویر بھرپور، چوکھی اور زندگی سے معمور ہے۔ محمد ذاکر علی دلِ بیدار اور دیدہ بینا کے حامل ہیں۔ دوستوں اور دشمنوں دونوں میں چاہت اور محبت کے ایسے پہلو ڈھونڈ لیتے ہیں جو عام نگاہوں سے اوجھل رہتے ہیں۔ انھوں نے انسانوں کا مطالعہ ایک دوست نواز اور سب سے محبت کرنے والے شوخ انسان کی حیثیت سے کیا ہے۔ اس مطالعے میں علی گڑھ اور ان کے وطن رام پور کو بنیادی حیثیت حاصل ہے۔

محمد ذاکر علی خاں کا نثری اسلوب بڑا شگفتہ، جاندار اور معنی خیز ہے۔ انھیں الفاظ کے برمحل اور دلآویز استعمال میں کمال حاصل ہے۔ بات بڑے سلیقے سے کہتے ہیں اور بڑے بھرپور انداز میں کہتے ہیں۔ ان کے شگفتہ اسلوب کی وجہ سے دیوانِ عام کے خاکوں میں بڑی جاذبیت اور توانائی پیدا ہوگئی ہے۔

"دیوانِ عام" محمد ذاکر علی خاں کے انیس خاکوں پر مشتمل ہے۔ ان میں سے ہر خاکہ اپنی جگہ ایک یادگار حیثیت رکھتا ہے۔ معاشرتی پس منظر، مرکزیت، زندگی کے شوخ اور گہرے رنگ، تنوع۔ ان خاکوں سے ادبی لطف کے ساتھ ساتھ بصیرت بھی حاصل ہوتی ہے۔ دیوانِ عام کے توسط سے محمد ذاکر علی خاں ہمارے عہد کی خاکہ نگاری میں ممتاز حیثیت کے حامل ہیں۔ ان کی ہر کتاب بڑے دیدہ زیب اور شایانِ شان انداز میں شائع ہوئی ہے۔

ریگِ رواں ———— مصنف: حکیم محمد سعید

صفحات ۴۴۸۔ قیمت: ۱۲۵ روپے

پتا: ہمدرد فاؤنڈیشن پریس، ناظم آباد، کراچی - ۷۴۶۰۰

ماوراءُالبحار ______ مصنّف: حکیم محمد سعید

صفحات: ۲۵۲ — قیمت: ۱۰۰ روپے

پتا: ہمدرد فاؤنڈیشن پریس، ناظم آباد، کراچی ۴۰۰۔۔

یہ دونوں کتابیں حکیم محمد سعید صاحب کے سفرناموں پر مشتمل ہیں۔ "ریگِ رواں" ۵ اپریل سے ۲۹ مئی ۱۹۸۷ء تک یونان، جنوبی افریقہ اور لندن کے سفر پر محیط ہے۔ "ماوراءُ البحار" میں ۳۰ مئی سے ۲۵ جون ۱۹۸۸ء روس، امریکہ، انگلینڈ اور جرمنی کی سیاحت کی تفصیل قلم بند ہے۔

حکیم صاحب گاہے بگاہے بیرونِ پاکستان کے سفر پر جاتے رہتے ہیں۔ اور واپسی پر وہ اپنی قلمی یادداشتوں کے ذریعے ان جگہوں کا سفر نامہ پاکستانیوں کی ضیافتِ طبع اور سبق آموزی کے لیے پیش کر دیتے ہیں۔ زیرِ تبصرہ سفرنامو سے پہلے وہ یورپ، روس اور کوریا وغیرہ کے آٹھ سفرنامے لکھ چکے ہیں۔ گویا اب ان کے سفرناموں کی تعداد دس ہوگئی ہے۔ زیادہ تر ثقافت اور طب سے متعلق عالمی کانفرنسوں میں شرکت کی غرض سے کیے گئے ہیں۔

حکیم صاحب کا طرزِ تحریر بڑی دل چسپ نوعیت کا حامل ہے۔ وہ نہ تو ایک مقام سے دوسرے مقام تک کے سفر مقامی تفصیلات خشک انداز میں بہ شکل روزنامچہ بیان کر کے اپنے سفرنامے کو جغرافیہ کی کوئی کتاب بناتے ہیں اور نہ محفلوں اور چہل قدمی کے دوران میں پیش آنے والے معمولی رومانی واقعات کو زیبِ داستان کے لیے رنگین عبارت کے ساتھ چٹخارے لے لے کر بیان کر کے عام ذہن کے قاری کے لیے لطف و کشش کا سامان مہیّا کرتے ہیں۔ اس کے بجائے حکیم صاحب کے سفرناموں میں سب کچھ ہوتا ہے: تاریخ بھی اور جغرافیہ بھی، ثقافت بھی اور سیاست و معیشت بھی جستہ جستہ دل چسپ انداز میں طب اور زندگی کے مسائل بھی۔ وہ معمولی واقعات سے اہم نتائج اخذ کرتے ہیں۔ ضرورت ہوتی ہے وہاں ہلکے پھلکے چٹکلے بھی بیان کر کے کتاب کو بوجھل ہونے سے بچاتے رہتے ہیں۔

علامہ اقبال کو سوادِ رومتہ الکبریٰ میں دلّی یاد آتی رہی۔ حکیم صاحب کا معاملہ یہ ہے کہ وہ جہاں کہیں ہوتے پاکستان اور خصوصاً شہر کراچی انھیں سب سے زیادہ یاد رہتا ہے۔ وہ کہیں اگر کوئی اچھی چیز دیکھتے ہیں تو انھیں اپنے ملک زبوں حالی ستاتی ہے۔ وہ اگر کسی شہر میں طلبہ کو حصولِ علم میں ہمہ وقت مشغول پاتے ہیں تو اپنے ہم وطن اور ہم مذہب طلبہ بے راہ روی ان کے لیے ذہنی اذیت کا سبب بنتی ہے۔ وہ دوسرے شہروں میں جب سیر و تفریح کے لیے لہلہاتے باغ بچوں کے کھیل کود کے لیے وسیع و عریض میدان اور تفریح گاہیں دیکھتے ہیں تو انھیں یاد آتا ہے کہ خود ان کے اپنے شہر باغوں اور میدانوں کے لیے مختص قطعہ ہائے زمین کس طرح غصب کر کے رہائشی عمارتوں کے لیے استعمال کر لیے گئے جس نتیجہ لوگوں کی ذہنی افراتفری اور خصوصاً بچوں کی بے راہ روی کی شکل میں ظاہر ہو رہا ہے۔ وہ دوسروں کو کمپیوٹر کی سے فائدہ اٹھاتے اور اس کے ذریعے مختلف شعبوں میں اپنی زندگی کو سہل تر بناتے دیکھتے ہیں تو انھیں اپنے ملک کمپیوٹر کی طرف سے عدم توجہی اور لاعلمی ستاتی ہے۔ وہ سوچتے ہیں کہ مشرق و مغرب کے درمیان جو فاصلہ کبھی تین برس وہ آج مغرب والوں کی تیز گامی اور ہماری سست قدمی کی بدولت بڑھ کر تین سو برس تک پہنچ چکا ہے اور وہ گھڑی

بلک اس فاصلے میں اضافہ کیے جا رہی ہے۔

وہ ایتھنز کا سفر کرتے ہیں تو از منہ قبل از مسیح سے اب تک کی تاریخ ایک مختصر انداز میں بیان کرتے ہیں ۔
کہانیاں بھی اس مرقع میں رنگ بھرتی ہیں۔ پھر ترکوں کی تاریخ کے سلسلے میں وہ یورپی عوام کی ریشہ دوانیوں
شوں کا ذکر کرتے ہیں۔ جنوبی افریقہ جاتے ہیں تو سیاہ فام اکثریت کے مصائب انھیں لرزہ براندام کر دیتے ہیں۔
کے تبلیغی اجتماعات ان پر گہرے نقوش چھوڑتے ہیں لیکن ساتھ ہی ساتھ مسلمانوں کی فرقہ وارانہ آویزش کے
ان کے دل و دماغ کو جھنجوڑتے بھی رہتے ہیں۔ جب وہ اپنوں کی غلط کاریوں کے طفیل لندن کی مسجدوں
لگتے ہوئے دیکھتے ہیں تو سوچتے ہیں کہ اس میں دوسروں کا کیا قصور؟ انھیں:

من از بیگانگاں ہرگز نہ نالم — کہ با من ہر چہ کرد آں آشنا کرد

ہر وقت مضطرب اور بے قرار رکھتی ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ حکیم صاحب کے سفر نامے دل و دماغ کی گہرائیوں میں ڈوب کر پڑھنے کی چیز ہیں۔ یہ ایک ایسے
دل کی آواز ہے جو خود اپنی زندگی قول سے زیادہ فعل پر گزارتا ہے۔ مدینۃ الحکمۃ بنانے والے ہی کو زیب دیتا
جب کبھی ممالکِ غیر میں کوئی علمی یا ثقافتی کارِ نمایاں وقوع پذیر ہوتے ہوئے دیکھے تو اپنے ابنائے وطن کو خاموشی
آئینہ دکھا دے۔

یہ سفر نامے خشک مواعظ کا مجموعہ نہیں بلکہ ان میں بڑوں سے لے کر بچّوں تک کی دل چسپیوں کی داستانیں رقم ہیں
جب سطحِ زمین سے ہزاروں فٹ گہری کانوں میں جا کر سونے کی کھدائی کا عمل بچشمِ خود دیکھتے ہیں اور اس کی تفصیلات
دل چسپ انداز میں بیان کر کے اپنے قاری کو اس منظر میں پوری طرح شریک کر لیتے ہیں۔ وہ ڈزنی لینڈ کا سفر
تو پاکستانی بچوں کو اس کی تاریخ و تفصیل سنانے کے علاوہ یہ بتاتے ہیں کہ ڈزنی لینڈ کی تعمیر و تشکیل میں وہاں
حکومتوں اور اداروں کا تعاون کس کس طرح قدم قدم پر شامل رہا اور اس کے برعکس پاکستان میں جب کوئی بندۂ خدا
ہی کام کرنے کے لیے قدم اٹھاتا ہے تو اس کام کی اہمیت سے قطع نظر اسے کن کن مصائب بلکہ ذلت آمیز سلوک کا
نا پڑتا ہے۔ حکیم صاحب کسی پارک میں لوگوں کو بطخوں کے آگے کھانے کی چیزیں ڈالتے ہوئے دیکھتے ہیں تو نہ صرف
س دل چسپ عمل میں گم ہو جاتے ہیں بلکہ انھیں یہ بھی یاد آتا ہے کہ ایک بار انھوں نے کراچی کے چڑیا گھر میں چند بچّوں
رح غلیل چلا کر زخمی کرتے ہوئے دیکھا تھا!

دونوں کتابیں انتہائی خوبصورت انداز میں چھپی ہیں۔ "ماوراءُ البحار" کی کتابت ٹائپ میں ہے لیکن ٹائیپ
وف بہت دل کش ہیں۔ مختلف رنگین تصاویر نے ان سفر ناموں کی قدر و قیمت میں بڑا خوش گوار اضافہ کر دیا ہے۔

بھی بہت مضبوط اور دیدہ زیب ہیں۔

ہمیں یقین ہے کہ حکیم محمد سعید صاحب کے یہ سفر نامے اردو زبان میں گراں قدر اضافہ سمجھے جائیں گے۔

(ابنِ منیر)

مقالات تحقیق ـــــــــــ مصنف: ڈاکٹر وحید قریشی

صفحات: ۲۷۲ ـ قیمت: ۷۵ روپے

پتا: مغربی پاکستان اردو اکیڈمی، لاہور

ڈاکٹر وحید قریشی نے اپنی گراں قدر تصنیف "مقالات تحقیق" میں باقاعدہ طور پر اردو تحقیق کی روایت کا رشتہ پہلی جنگِ عظیم کے زمانے سے جوڑا ہے اور اس سلسلے میں جن اکابر کے نام لیے ہیں ان میں ڈاکٹر زور، عبدالسلام ندوی، سیّد سلیمان ندوی، مولانا عبدالحیٔ، ڈاکٹر عبدالستّار صدیقی، ڈاکٹر مولوی عبدالحق، حافظ محمود شیرانی، پروفیسر محمد اقبال اور ڈاکٹر مولوی محمد شفیع کے نام نامی ہیں۔ آگے چل کر انھوں نے تحقیق کے سلسلے میں تین ابتدائی دبستانوں کا ذکر کیا ہے۔ ان دبستانوں میں حیدرآباد دکن، اعظم گڑھ اور لاہور کا شمار کیا ہے۔ بعدازاں اس میں دو اور دبستانوں پٹنہ اور رام پور کا اضافہ کیا ہے۔ پٹنہ کے دبستان میں قاضی عبدالودود، ڈاکٹر اختر اورینوی اور ڈاکٹر مختارالدین آرزو کا، اور رام پور کے دبستان تحقیق میں مولانا امتیاز علی عرشی کا ذکر کیا ہے۔ اس کے ساتھ ہی الگ الگ ان دبستانوں کی خصوصیات پر روشنی ڈالی ہے۔

جہاں تک اس کتاب کے مقالات اور ڈاکٹر صاحب کے دوسرے مقالات و مضامین کو پڑھ کر میں نے اندازہ لگایا ہے وہ یہ کہ ڈاکٹر صاحب کی تحقیق آنکھیں ملا کر بات کرنے کو ترجیح دیتی ہے۔ چشم پوشی اس کے ہاں روا نہیں۔ وہ جو بات جہاں کہنے کی ہوتی، بروقت کہہ دیتے ہیں۔ جو چیز کھٹکتی ہے اس کی نشاندہی بھی کر دیتے ہیں۔ اس طرح ان کی تحقیق تنقید کے شانہ بشانہ چلتی ہے۔ کتاب کے تمام مقالات گہرے مطالعے کا نتیجہ ہیں اور صاحبِ نظر کی تحقیق معلوم ہوتے ہیں، تو ازن کی کیفیت رکھتے ہیں۔ سرسری گزرنے والی بات کہیں دکھائی نہیں دیتی۔ یہ صورت شاید اس لیے ہے کہ ڈاکٹر صاحب تحقیق کو اس کے PERSPECTIVE میں دیکھنے دکھانے کے قائل ہیں اور کسی بات کے لیے اسناد کے آخری اور حتمی ذرائع تک رسائی کو مناسب جانتے ہیں کہ اس کے بغیر تحقیق کا مطمح و منصب پورا نہیں ہو سکتا۔

ڈاکٹر صاحب نے اپنے مقالوں میں جا بجا متن کی تصحیح پر زور دیا ہے۔ ان مقالوں کو پڑھ کر آدمی متن کی تصحیح کی اہمیت اور اس کے طریقۂ کار اور اس کی باریکیوں سے آشنا ہوتا ہے۔ اس بارے میں جو سب سے اہم بات کہنے کی ہے وہ یہ کہ ڈاکٹر صاحب کا پیرایۂ بیان ٹھس نہیں۔ زبان میں تحقیق و تنقید کی گنگا جمنی نے ہر مقالے کو پڑھنے کے لائق بنا دیا ہے۔

کتاب ٹائپ میں چھپی ہے لیکن نظر کو گراں نہیں گزرتی۔ (ا۔ س)

زندہ پانی سچا ـــــــــــ مصنف: ساقی فاروقی

صفحات: ۲۷۹ ـ قیمت: ۱۰۰ روپے

پتا: مکتبہ ہم زبان ـ پوسٹ بکس نمبر ۱۱۵۳۳، کراچی ـ ۷۴۸۰۰

"زندہ پانی سچا" ساقی فاروقی کی کلیات ہے۔ اس میں تین شعری مجموعے "پیاس کا صحرا"، "رادار"، "بہرام کی واپسی" کے ساتھ ۲۰ نئی غزلوں کا اضافہ بھی کیا گیا ہے۔ اس جدید طرز کی کلیات کی روایت فیض احمد فیض کی کتاب "سارے سخن ہمارے" سے شروع ہوتی ہے جو انگلینڈ سے چھپی تھی۔ بعدازاں اس کی اشاعت پاکستان سے بھی "نسخہ ہائے وفا" کے

م سے ہوئی۔ کسی شاعر کے تمام مطبوعہ کلام کو یکجا کر کے چھاپنے کا یہ سلسلہ مفید یوں ہے کہ قارئین اس شاعر کی تمام تصنیفات یکجا دیکھنے کے قابل ہو جاتے ہیں اور کچھ عرصہ گزر جانے کے بعد ایک شاعر کے شعری مجموعوں کی تلاش میں آدمی در در کی خاک چھاننے سے بچ جاتا ہے۔

ساقی فاروقی کی کتاب "زندہ پانی سچا" کے فلیپ پر "ہدایت نامہ شاعر" سے جو بات سامنے آتی ہے وہ یہ کہ ان کی شاعری آدمی سے انسان کا سفر ہے۔ اور اس سفر میں ان کا رہنما غالب کا یہ مصرعہ ہے ؎

آدمی کو بھی میسّر نہیں انساں ہونا

اس سے آگے انھوں نے شعری سفر کے لیے تین کلیدی اشارے "زمانے کے ادراک"، "ذات کے اظہار" اور "زبان کی لیاقت" پیش کیے ہیں۔ گویا ساقی فاروقی "دل و دنیا" کے شاعر ہیں۔ اس اختصاص کے ساتھ کہ دنیا کی طرف وہ دل سے گزرتے ہیں اور افکار و تصوّرات کی سطح پر جو تجربے حاصل کر کے شعری قالب میں ڈھالتے ہیں اس کے ہر عالم میں دنیا موجود رہتی ہے۔

ساقی فاروقی جدید نسل کے شاعر ہیں۔ ان کی جدیدیت اس حقیقت سے آگاہ ہے کہ یہ کوئی معلق شے نہیں اس کے پیچھے بھی کچھ ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ساقی فاروقی کی شاعری میں قدما کی وہ روایت کہ مصرعے چست ہوں، ڈھیلے ڈھالے نہ ہوں، میں جو الفاظ استعمال کیے جائیں ان میں پھول اور پتھر کا تفاوت نہ ہو اور ایک خاندان کے معلوم ہوں۔ ساقی فاروقی کے زبان کی دریافت کا عمل بھی جسم و جان کے رشتے معلوم ہوتا ہے۔ نظم کے موضوعات بیشتر نئے ہیں اور ہیئت میں اجتہاد ہے اور ان کی جدیدیت میں روایت کے گہرے شعور کی وجہ سے ایک توازن کا احساس ہوتا ہے اور آخری لفظیہ کہ ان کی ... کے لیے لفظ "خوبصورت" استعمال کرنے کو جی چاہتا ہے۔

کتاب شمس الرحمٰن فاروقی اور شفق خواجہ کے نام معنون کی گئی ہے جو حق بہ حق دار رسید کے مصداق ہے۔

(ا۔س)

ڈاکٹر انور سدید

کچھ وقت ہندوستانی کتابوں کے ساتھ

انتخاب سجاد حیدر یلدرم / مرتبہ پروفیسر ثریا حسین

سید سجاد حیدر یلدرم کا سالِ ولادت ۱۸۸۰ء ہے۔ اور یہ تحریر ۱۹۹۰ء میں لکھی جا رہی ہے۔ جب راقم اپنی زندگی کا ساٹھواں برس عبور کر رہا ہے اور اس اعتراف میں مسرت محسوس کرتا ہے کہ اس نے یلدرم کا نام اپنے زمانۂ طالب علمی میں سنا اور ان کا مضمون "مجھے میرے دوستوں سے بچاؤ" پڑھا تو ان کا نقش دل پر مستحکم ہو گیا۔ اور اس تمام عرصے میں یلدرم کی شہرت کو جوان کی ایک مختصر سی کتاب "خیالستان" پر استوار ہوئی پھلتے، پھولتے اور پھیلتے ہوئے دیکھا۔ مولانا صلاح الدین احمد نے انھیں اردو افسانے کے نامور پیشروؤں میں شمار کیا۔ وقار عظیم نے ان کی افسانہ نگاری کا تجزیہ اپنی مشہور تصنیف "داستان سے افسانے تک" میں کیا۔ ڈاکٹر سید معین الرحمٰن نے نصابی ضرورتوں کے لیے "مطالعۂ یلدرم" مرتب کی تو اس کے لیے ایک فاضلانہ مقدمہ بھی لکھا۔ ان کی تحقیق نے بعض سابقہ نتائج کی کایا پلٹ دی۔ انھوں نے یلدرم کو اردو افسانے میں رومانیت کی تحریک کی بنیاد ڈالنے والا ادیب شمار کیا اور پریم چند کے بجائے یلدرم کو اردو کا پہلا افسانہ نگار قرار دیا۔ یہ دعویٰ اتنا انقلابی تھا کہ اب تک زیرِ بحث ہے لیکن دلچسپ بات یہ ہے کہ اولیت کے اس مسئلے میں نہ پریم چند کی کمر دارکشی کی جاتی ہے اور نہ یلدرم کی مخالفت میں ان کی اہانت کی جاتی ہے۔ "مطالعۂ یلدرم" ہی کے سلسلے میں رسالہ "پگڈنڈی" نے یلدرم نمبر شائع کیا۔ یہ رسالہ اب داستانِ پارینہ بن چکا ہے لیکن تاریخِ ادب میں اس لیے زندہ ہے کہ اس کی ایک اشاعت یلدرم سے موسوم ہوئی تھی۔ اسی سلسلے کا ایک اور کام سید مبارزالدین رفعت نے کیا۔ انھوں نے وہ تمام تحریریں کتابی صورت میں پیش کر دیں جو اس وقت تک چھپ چکی تھیں۔ چنانچہ یہ کہنا درست ہوگا کہ یلدرم کے نام کا ڈنکا اس وقت سے بج رہا ہے جب انھوں نے اپنا پہلا مضمون لکھا جو اردو کی طبع زاد زبان کا قابلِ قدر نمونہ تھا۔ میری مراد "مجھے میرے دوستوں سے بچاؤ" سے ہے جو رسالہ "معارف" کے شمارہ اگست ۱۹۰۰ء میں شائع ہوا تھا۔ انھیں افسانے کا ہی نہیں، اردو زبان و ادب کا محسن تسلیم کیا گیا۔ اور ان کی عظمت چونکہ مستحکم بنیادوں پر قائم تھی اس لیے اس میں روزافزوں اضافہ ہوتا گیا۔

اس سب کے باوجود یہ بات تسلیم کرنے میں کوئی حرج نہیں کہ یلدرم کے مطالعے میں اردو تنقید کے نئے دبستانوں نے

کچھ زیادہ دلچسپی نہیں لی۔ ڈاکٹر محمود الہٰی نے بھی اس طرف توجہ دلائی ہے اور لکھا ہے کہ " دراصل اسالیب کے مخلصانہ اور ان کی شناخت کا عمل ہماری درسی اور تنقیدی زندگی سے کچھ زیادہ قریب نہیں رہا۔" چنانچہ ۱۹۸۱ء میں مسلم یونیورسٹی علی گڑھ میں یلدرم سیمینار منعقد کیا گیا اور یلدرم کو تنقید کے نئے پیمانوں پر پرکھنے کی کاوش کی گئی۔ نیز یہ ضرورت بھی محسوس کی گئی کہ یلدرم کے وسیع تر مطالعے کے لیے ان کی تحریروں کا ایک جامع انتخاب بھی مرتب ہونا اور چھپنا چاہیے۔ پروفیسر ثریا حسین زیر نظر کتاب " انتخاب سجاد حیدر یلدرم" اسی ضرورت کو پورا کرنے کے لیے اتر پردیش اکادمی نے شائع کی ہے۔

یہ کتاب تین حصوں میں منقسم ہے۔ پہلے حصے میں پیش لفظ ڈاکٹر محمود الہٰی نے اپنے مخصوص فیصلہ کن انداز میں لکھا ہے۔ قول فیصل یہ ہے کہ:

> " یلدرم کی نثر ترجموں میں ڈھل کر نکلی ہو یا ان کے ذاتی تجربات اور افکار کا آئینہ بن کر سامنے آئی ہو، ایک نئے اسلوب کی حامل ہے۔ اس سے جہاں ایک طرف ادب لطیف کے سوتے پھوٹتے ہیں وہاں دوسری طرف اس نے ایک ایسی منزل کی نشاندہی کی ہے جہاں اردو عالمی ادبیات کا ایک حصہ بن جاتی ہے۔"

ڈاکٹر ثریا حسین کے مقدمہ کا عنوان " یلدرم اور اردو افسانہ" ہے۔ انھوں نے یلدرم کی نثری تحریروں کا سراغ لگا کر اور یلدرم کے افسانوں کو متعارف کرانے کی عمدہ کاوش کی ہے۔ اور رشید احمد صدیقی، مولانا صلاح الدین احمد، پطرس بخاری، سید وقار عظیم اور سید معین الرحمٰن کی آرا سے اپنی دلائل کو روشن کیا ہے۔ انھوں نے شمس الرحمٰن فاروقی کی اس رائے کو " یلدرم کی نثر پلپلی ہے" رشید احمد صدیقی کے حوالے سے رد کیا ہے کہ " یلدرم اردو کے گہوارے میں نہیں پلے تھے، اردو یلدرم کے گہوارے میں پلی تھی۔" اس حصے کا تیسرا اہم مضمون محترمہ قرۃ العین حیدر کا " داستان عہد گل" ہے۔ جس میں یلدرم کی ان کے تہذیبی، سیاسی اور ادبی عہد میں حیات نو دی گئی ہے۔ کتاب کا دوسرا حصہ یلدرم کے ۱۹۰۰ء سے لے کر ۱۹۲۳ء تک مضامین پر، اور تیسرا حصہ ۱۹۱۸ء تا ۱۹۳۰ء تک کے ترکی تراجم کے انتخاب پر مشتمل ہے۔ یہ کتاب یلدرم کی افسانہ نگاری اور اسلوب کے مطالعے میں بہترین معاون ثابت ہو سکتی ہے۔ ۶۱۸ صفحات کی اس کتاب کی قیمت صرف ۲۳ روپے ہے جو حیرت انگیز طور

جدید اردو تنقید پر مغربی تنقید کے اثرات / ڈاکٹر خورشید جہاں

زیر نظر کتاب " جدید اردو تنقید پر مغربی تنقید کے اثرات" میں ڈاکٹر خورشید جہاں نے " آغاز" میں لکھا ہے کہ:

> " اردو ادب مغربی ادبیات سے مسلسل فیض اٹھا رہا ہے۔ کسی بھی معیاری زبان کے لیے ضروری ہوتا ہے کہ وہ مہذب اور ترقی یافتہ ادبیات سے مسلسل استفادہ کرے۔ اس سے تقابلی مطالعے کی راہ بھی کھلتی ہے اور ادبیات عالم میں نت نئے تجربات سے آگاہی بھی ہوتی ہے۔ نتیجے کے طور پر پڑھنے والوں کا ذہنی افق ترفع سے ہمکنار ہوتا ہے۔"

اس خیال کے پیش نظر انھوں نے پی۔ ایچ۔ ڈی کے مقالے کے لیے متذکرہ بالا موضوع منتخب کیا اور اپنی تحقیق

...ٹر وہاب اشرفی صاحب کی نگرانی میں مکمل کی۔ زیر نظر کتاب بقول مصنفہ اس مقالے کے ضروری اجزا پر مشتمل ہے۔ ابتدا میں
...رب میں تنقید اور اس کے ارتقا کا جائزہ لیا گیا ہے۔ دوسرے پانچ صفحات کے مختصر باب میں تنقید کے مختلف دبستان اور
...ی کے بنیادی اصول درج کیے گئے ہیں۔ اگلے تین ابواب جو کم و بیش چالیس صفحات پر مشتمل ہیں رومانی، نفسیاتی، تاریخی، مارکسی
...علمی تنقید کے لیے وقف ہیں۔ آخری دو ابواب میں اردو تنقید پر مغربی تنقید کے اثرات کا جائزہ لیا گیا۔ اس طرح حرف آخر
...کتابیات سمیت یہ اہم موضوع صرف ۲۰۴ صفحات میں سمیٹ لیا گیا ہے۔

اس کتاب کا موضوع نیا نہیں۔ پاکستان میں اس موضوع کے بنیادی مواد پر ریاض احمد، ڈاکٹر وزیر آغا، ڈاکٹر جمیل جالبی،
...د باقر رضوی، محمد علی صدیقی، ڈاکٹر محمد اجمل نے قابل قدر کام کیا ہے۔ لیکن مصنفہ کی ان مصنفین تک شاید رسائی نہیں ہوئی۔
...تابیات سے اندازہ ہوتا ہے کہ انھوں نے بالعموم ان مضامین پر انحصار کیا ہے جو موضوع کے ساتھ براہ راست مطابقت رکھتے
...۔ لیکن مقالہ نگاروں کی اہم کتابوں کو نظر انداز کر دیا گیا ہے۔ علمی تنقید میں انھوں نے متعدد نام گنوائے ہیں لیکن مغرب کے
...رت تلاش کرنے کی کاوش بہت کم کی ہے اور اپنی رائے کا اظہار کیا ہے تو اس میں عمومیت در آئی ہے۔ اور بات وضاحت طلب
ہو جاتی ہے۔ مثال کے طور پر ممتاز نقاد شمیم حنفی کے بارے میں ڈاکٹر صاحبہ نے جو ایک پیراگراف لکھا ہے ملاحظہ کیجیے:

> "شمیم حنفی جدیدیت کے نقاد ہیں۔ انھوں نے جدیدیت کی تفہیم کے سلسلے میں باضابطہ کتابیں
> لکھی ہیں، یہاں بھی نئے نقادوں کا کچھ نہ کچھ تیور ان کے یہاں ملتا ہے۔ لیکن جدیدیت کی تفہیم
> کے مطالبات نئی تنقید کے مطالبات سے بہت مختلف ہیں۔ ایسی صورت میں ان کی تنقید کھری
> تنقید نہیں کہلا سکتی۔ یہاں بھی میں وہی جملہ دہراؤں گی کہ نئی تنقید کا سخت گیر نقاد انھیں اس
> خانے میں رکھنا یقیناً پسند کرے گا۔"

اسے پڑھنے کے بعد شمیم حنفی صاحب سے ہمدردی کا اظہار کرنے کو جی چاہتا ہے۔ کتابیات میں اور فٹ نوٹ میں چونکہ شمیم حنفی
...ی کتاب یا مقالے کا حوالہ درج نہیں اس لیے یہ جاننا بھی مشکل ہو جاتا ہے کہ محترمہ ڈاکٹر خورشید جہاں کی ذاتی رائے کی اساس
...ہے؟ ــ کچھ اس قسم کا عمل محمود ہاشمی، کرامت علی کرامت، وارث علوی، ڈاکٹر ابن فرید، ڈاکٹر احمد سجاد، ڈاکٹر عبدالمغنی، محمود ہاشمی کے ساتھ
...ہوا ہے جو "جدید اردو تنقید پر امریکی تنقید کے اثرات" کے باب میں زیر بحث لائے گئے ہیں۔ یہ کتاب منشا پبلی کیشنز، حسن آرا منزل
...ل ہزاری باغ (بھارت) سے ۶۰ روپے میں دستیاب ہے۔

...ید اردو تنقید ــ اصول و نظریات / ڈاکٹر شارب ردولوی

ڈاکٹر شارب ردولوی کی کتاب "جدید اردو تنقید ــ اصول و نظریات" پہلی دفعہ ۱۹۸۱ء میں شائع ہوئی تھی۔ زیر نظر کتاب
...کا چوتھا ایڈیشن ہے جو مناسب ترمیم و اضافے سے پیش کیا گیا ہے۔ لیکن حیرت کی بات ہے کہ اس کتاب کی بازگشت پاکستان کے ادبی
...لوں میں بہت کم سنی گئی اور اب ہندوستانی کتابوں کے سلسلے میں اس کا ذکر کرتے ہوئے یوں محسوس ہو رہا ہے جیسے کسی نئی کتاب

ڈاکٹر شارب ردولوی اردو کے ایک اہم نقاد ہیں۔ وہ اپنے مطالعے کو نئے علوم کی روشنی میں ہمیشہ آگے بڑھاتے رہتے ہیں ہر چند ان کا جھکاؤ سائنٹفک تنقید کی طرف زیادہ ہے لیکن انھوں نے عملی تنقید کو کسی مخصوص سانچے تک محدود نہیں رکھا اور اصول و نظریات کی تلاش میں انھوں نے ادب کے متعدد دبستانوں اور تنقید کے متعدد دبستانوں کی سیاحت کشادہ نظری اور روشن خیالی سے کی ہے۔ اس کے تابندہ نقوش ان کی زیرِ نظر کتاب "جدید اردو تنقید" میں نسبتاً زیادہ نمایاں ہیں۔ چنانچہ انھوں نے جدید ترین مغربی رجحانات مثلاً نئی تنقید، اسلوبیات، ساختیات، تنقید کا شکاگو اسکول، ردِ تعمیر (ڈی کنسٹرکشن) کا بھی تعارف کرایا ہے اور انھیں مثالوں سے واضح بھی کیا ہے لیکن یہ ان کی کتاب کا آخری باب ہے جو قدرے مختصر ہے اور تشنگی کا احساس دلاتا ہے ابتدائی چھ ابواب میں انھوں نے اردو تنقید کی مختلف جہات، مثلاً تذکروں کی تنقید، رومانی، نفسیاتی، جمالیاتی، تاثراتی، تاریخی اور مارکسی تنقید کا جائزہ تفصیل اور جامعیت کے ساتھ لیا ہے۔ اور مختلف نقادوں کی تنقید کی خصوصی جہت کا تذکرہ کرتے وقت اپنی رائے اور مصنف کی ادبی عطا کو "گول مول" اور غیر واضح صورت میں پیش نہیں کیا۔

ڈاکٹر شارب ردولوی نے خیال ظاہر کیا ہے کہ تنقیدی اصول اور مسائل پر حالی کے بعد کسی نے باقاعدگی سے کام نہیں کیا اور جتنا بھی کام ہوا ہے وہ زیادہ تر عملی تنقید سے متعلق ہے۔ میرے خیال میں اردو ادب میں تنقیدی اصول اور مسائل پر زیادہ اہم مولانا حالی کے بعد ہی ہوا ہے۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو تنقید حالی سے آگے نہ بڑھتی۔ تاہم ان کی یہ بات درست ہے کہ یہ کام باقاعدگی سے نہیں کیا گیا اور ممتاز ناقدین کے متفرق مضامین میں بکھرا پڑا ہے۔ چنانچہ میں سمجھتا ہوں کہ سید احتشام حسین، آلِ احمد سرور، سید وقار عظیم، ڈاکٹر سید عبداللہ، ڈاکٹر وحید قریشی اور حسن عسکری جیسے بڑے نقاد یہ کام کر سکتے تھے۔ اور مناسب ضخامت کی کتاب پیش کر کے تنقیدی مسائل و افکار کی بحث کو مزید آگے بڑھا سکتے تھے۔ ان سب نے اردو تنقید کو مائل بہ ارتقا کرنے کا گراں قدر کام کیا لیکن اس موضوع پر "مقدمہ شعر و شاعری" جیسی کتاب پیش نہیں کی۔ یونیورسٹی طلبہ کی ضرورت پیدا ہوئی تو مغربی تنقیدی افکار جمع کرنے کی کاوش بھی کی گئی۔ اور بعض نامور نقادوں کو اردو میں تراجم کے ذریعے متعارف کرانے کی کاوش کی گئی۔ (یہاں ڈاکٹر جمیل جالبی اور سجاد باقر رضوی کے اس نوع کے قابلِ قدر کام کا حوالہ دیا جا سکتا ہے) ڈاکٹر شارب ردولوی صاحب کو اس بات کا کریڈٹ ملنا چاہیے کہ انھوں نے اس موضوع کو پی۔ ایچ۔ ڈی کے مقالے کے لیے منتخب کیا۔ اور پھر اس پر یہ کام کیا۔ اور اس کی تکمیل کے لیے پروفیسر سید احتشام حسین کی راہنمائی حاصل کی۔ یہاں اس بات کا ذکر بھی ضروری ہے کہ ڈاکٹر شارب صاحب نے جہاں اس کتاب کا اختتام کیا ہے (ساختیات اور ردِ تعمیر (ڈی کنسٹرکشن) کے نظریاتِ تنقید پر) وہاں سے اردو تنقید مزید آگے جا رہی ہے۔ اس ضمن میں ڈاکٹر گوپی چند نارنگ کی کتاب "ادبی تنقید اور اسلوبیات" اور ڈاکٹر وزیر آغا کی کتاب "تنقید اور جدید اردو تنقید" (جسے انجمن ترقی اردو نے پاکستان سے اور مکتبہ جامعہ دہلی نے بھارت سے شائع کیا ہے) کا حوالہ دیا جا سکتا ہے جس سے نظری، اصولی اور مسائلی تنقید کو ارتقا کی نئی کروٹ مل گئی ہے۔

یہاں مجھے ڈاکٹر شارب ردولوی کی خنک مزاجی اور تہذیبی شخصیت کا ذکر بھی کرنا ہے۔ ان کے اسلوب میں خاص نوع کا مدارانہ انکسار اور طالبِ علم کا جستجویانہ انداز ہے۔ انھوں نے اپنی رائے کا بے لاگ اظہار کیا ہے لیکن نہ اپنی انا کو نمایاں ہونے دیا اور نہ دوسروں کی انا کو مجروح کرنے کی کاوش کی ہے۔ یہ کتاب اتر پردیش اردو اکادمی، بلہرا ہاؤس قیصر باغ لکھنؤ سے

شائع ہوئی ہے۔ ضخامت ۵۴۲ صفحات ہے۔ اور آپ یہ جان کر حیران ہوں گے کہ قیمت صرف تیس روپے ہے۔

عبدالحلیم شرر بحیثیت شاعر / ڈاکٹر مناظر عاشق ہرگانوی

ڈاکٹر مناظر عاشق ہرگانوی کا نام لیں تو ایک ایسی شخصیت کا سراپا ذہن میں متوّر ہو جاتا ہے جس نے اپنی پوری زندگی ادب پڑھنے، ادب تخلیق کرنے اور ادب کی اشاعت کے لیے وقف کر رکھی ہے۔ پچھلے دنوں ڈاکٹر ایس حسن (ارمان نجمی) صاحب جیبزان سے بلند جاتے ہوئے ۴۸ گھنٹوں کے لیے لاہور تشریف لائے تو معلوم ہوا کہ وہ بہار کے بیشتر ادبا کے معاصراوران کے ادبی کارناموں کے آشنا ہیں۔ انھوں نے کئی ادبا کے نئے کام کا ذکر کیا، لیکن جب ہرگانوی صاحب کا ذکر آیا تو ان کی طالب علمی کے زمانے سے لے کر آج کے زمانے تک جب وہ متعدد طلبہ کو پی۔ ایچ۔ ڈی کروا رہے ہیں، ان کی مسلسل جدوجہد رشک آمیز تذکرہ بجز طویل ہیں کیا۔ دو ایک ماہ قبل مجھے ان کی تین نئی کتابیں ملی تھیں۔ چند روز کے بعد ان کی ایک اور ضخیم کتاب "عبدالحلیم شرر بحیثیت شاعر" ملی جو انھوں نے ۱۹۸۱ء میں پی۔ ایچ۔ ڈی کی ڈگری کے لیے لکھی تھی۔ اور ۱۹۹۰ء میں شائع ہوئی ہے اور شرر کی ادبی شخصیت کے اس زاویے کو روشن کرتی ہے جو ان کی ناول نگاری سے دب سا گیا ہے۔ ڈاکٹر ہرگانوی نے اس زاویے کو اہمیت دے کر شرر کو صرف شعرا کی صف میں نمایاں جگہ دی ہے بلکہ ان کی وہ خدمات گنوائی ہیں جو انھوں نے نظمِ جدید کے فروغ کے سلسلے میں سرانجام دیں۔

یہ کتاب پانچ ابواب پر مشتمل ہے۔ ابتدائی باب میں شرر کا ادبی پس منظر اور دوسرے باب میں فنِ شاعری، نظمِ آزاد و نظمِ معرّیٰ پر بحث کی گئی ہے۔ تیسرا اور چوتھا باب شاعری کے سلسلے میں شرر کے تجربات اور اسلوبِ سخن کا مطالعہ پیش کیا گیا ہے۔ آخری باب میں جدید شاعری میں شرر کا مقام متعین کرنے کی کاوش کی گئی ہے۔ ڈاکٹر ہرگانوی نے اُس شرر کو دریافت کیا ہے جس نے واجد شاہی عہد میں بچپن گزارا تھا۔ ان کی پرورش مشرقی ماحول میں ہوئی تھی لیکن ان کا ذہن مغرب آشنا رہا۔ انھوں نے شرر کی شاعرانہ حیثیت کو مستحکم کرنے کے لیے ان کا مطالعہ گہرائی اور گیرائی سے کیا ہے۔ اور تحقیق کے عمل میں معروضیت قائم رکھی ہے۔ یہ کتاب پریم گوپال متّل نے موڈرن پبلشنگ دہلی سے بے حد خوبصورت انداز اور ۲۷۰ صفحات کی ضخامت میں پیش کیا ہے۔ قیمت: ۱۴۰ روپے ہے

گرد و پیش

رعنا اقبال

کرّار نوری کے انتقال پر تعزیتی جلسہ

معروف شاعر کرّار نوری کا گزشتہ دنوں کراچی میں انتقال ہوگیا۔ کراچی آرٹس کونسل کی ادبی کمیٹی نے ان کی یاد میں ایک تعزیتی جلسہ منعقد کیا۔ کرّار نوری کا اصل نام سیّد کرّار میرزا تھا۔ آبائی طور پر وہ دہلی کے رہنے والے تھے۔ تقسیم ہند کے بعد وہ پاکستان آئے اور کراچی میں مستقل سکونت اختیار کر کے ریڈیو پاکستان سے وابستہ ہو گئے۔ ان کا تعلق ایک علمی و ادبی خانوادے سے تھا۔ ان کے دادا آگاہ دہلوی مرزا غالب کے ارشد تلامذہ میں تھے۔ ۱۹۸۱ء میں کرّار نوری کی غزلوں کا مجموعہ "میری غزل" کے نام سے شائع ہوا تھا جس کی تقریبِ اجرا کی صدارت فیض احمد فیض مرحوم نے فرمائی تھی۔ کرّار نوری نے شعر گوئی کا آغاز ۱۹۳۲ء میں کیا تھا۔ ان کی پہلی غزل کے صرف تین شعر دستیاب ہو سکے ہیں جو غیر مطبوعہ ہیں۔

ایک دن وہ تھا کہ آدم بھی پشیماں نکلا — ایک یہ شب ہے کہ تعظیم کو رضواں نکلا
وقت آخر ہے مرے جسم سے مہماں نکلا — مجھ کو لینا کوئی آ کر کہ یہ ارماں نکلا
ہم تو سمجھے تھے کہ عاشق ہے محمدؐ کا مگر — زاہدِ تنگ نظر حور کا خواہاں نکلا

کرّار نوری کی یاد میں منعقد ہونے والے تعزیتی جلسے کی صدارت ڈاکٹر فرمان فتح پوری نے کی جب کہ حمایت علی شاعر، صہبا اختر، پروفیسر آفاق صدیقی، جاذب قریشی، نقاش کاظمی اور پروفیسر انیس زیدی نے مرحوم شاعر کی حیات اور شاعری کے مختلف پہلوؤں پر روشنی ڈالی۔

قطر میں عرب نژاد اردو شاعر کے ساتھ ایک شام

پاکستان آرٹس سوسائٹی قطر کی جانب سے دبئی کے عرب نژاد اردو شاعر ڈاکٹر زبیر فاروق کے ساتھ ایک شام منائی گئی جس کی صدارت عتیق الرحمٰن اور ان کے بعد جناب شاہنواز نے فرمائی۔ نظامت کے فرائض بھی دو اشخاص یعنی عدیل اکبر اور خوشنود بخاری نے ادا کیے۔ سوسائٹی کے قائم مقام صدر محمد صدّیق کے استقبالیہ کلمات کے بعد مبشر علی، محمد ممتاز راشد اور خوشنود بخاری نے ڈاکٹر زبیر فاروق کی شخصیت اور شاعری پر روشنی ڈالی۔ بعد ازاں ڈاکٹر زبیر فاروق نے اپنی غزلیں نذرِ

اور کچھ متفرق اشعار پیش کیے

"نگارِ حرم" کی تقریبِ رونمائی

کراچی میں دبستانِ ممتاز کے زیرِ اہتمام ممتاز بجنوری کے حمدیہ و نعتیہ مجموعۂ کلام "نگارِ حرم" کی تقریبِ رونمائی ہوئی جس کے صدر ایس۔ ایچ ہاشمی اور مہمانِ خصوصی حکیم محمد سعید تھے۔ اس موقع پر پروفیسر حسنین کاظمی، ڈاکٹر وقار احمد رضوی، مختار زمن، حاذب قریشی، اقبال فریدی اور قاری حبیب اللہ نے ممتاز بجنوری کی نعت گوئی کے حوالے سے اظہارِ خیال کیا۔ صدرِ تقریب ایس۔ ایچ ہاشمی نے اعلان کیا کہ وہ اپنے والد مولانا عبدالقدوس ہاشمی مرحوم کے نام پر قائم ہونے والے ٹرسٹ کی جانب سے ممتاز بجنوری کو عمرہ پر بھیجنے کا انتظام کریں گے۔

ٹورانٹو میں رائٹرز فورم کی نشست

ٹورانٹو، کینیڈا میں رائٹرز فورم کے زیرِ اہتمام مختلف حصوں سے آئے ہوئے ادیبوں کے اعزاز میں ایک ادبی نشست منعقد ہوئی۔ جس کی صدارت ناروے سے آئی ہوئی معروف ادیبہ پورنیما چاؤلہ اور نظامت جوش مندوزئی نے انجام دی۔ سب سے پہلے رائٹرز فورم کے صدر اطہر رضوی نے تعارفی کلمات ادا کیے۔ اس کے بعد عبدالرحیم انجان نے "کھلونے"۔ خالد سہیل نے "آزادی کے ہائی وے سے یوٹرن" اور ہرچرن چاؤلہ نے "گھوڑے کا کرب" کے عنوان سے افسانے پیش کیے۔ وقفے کے بعد شعری دور کا آغاز ہوا جس میں تسنیم سیّد، تسلیم الٰہی زلفی اور رحمیلہ بانو وغیرہ نے اپنا کلام پیش کیا۔

"سچائیاں" کی تقریبِ اجرا

گزشتہ دنوں بیناساعت گاہ میں نگہت مرزا حنا کی سچی کہانیوں کے مجموعے "سچائیاں" کی تقریب رونمائی منعقد ہوئی۔ اس تقریب کا اہتمام کراچی پبلک ایجوکیشن سوسائٹی اور تخلیق ادبی و ثقافتی انجمن کے اشتراک سے کیا گیا تھا۔ تقریب کی صدارت جناب شان الحق حقی کر رہے تھے اور میئر کراچی جناب فاروق ستار مہمانِ خصوصی تھے۔ ڈاکٹر خورشید خاور امروہوی، مولانا قاضی مرزا حبیب بیگ، پروفیسر حمیدالدین شاہد، جناب احمد ہمدانی کے علاوہ حقی صاحب اور میئر کراچی نے بھی نثر کا ء سے خطاب کیا۔ جب کہ ناظمِ تقریب نقاش کاظمی نے فخرالدین جی ابراہیم کا اور سیّد معراج جامی نے ڈاکٹر نظر کامرانی کا مضمون پیش کیا۔

کراچی جیم خانہ میں شامِ افسانہ

یوم آزادی کے سلسلے میں کراچی جیم خانہ کی ادبی کمیٹی کی جانب سے شامِ افسانہ کا اہتمام کیا گیا۔ تقریب کے مہمان خصوصی جامعہ کراچی کے شعبۂ فلسفہ کے ڈاکٹر منظور احمد تھے۔ مذکورہ شامِ افسانہ میں راقم الحروف کے علاوہ مہ جبیں قیصر، پروفیسر علی حیدر ملک، شکیلہ رفیق، انوار الہدیٰ سیّد اور جمیل زبیری نے اپنے افسانے پیش کیے۔ جب کہ امراؤ طارق نے شام افسانہ پیش کیا۔ آخر میں ڈاکٹر صاحب

نے اپنے پُرمغز خیالات کا اظہار کیا۔ انھوں نے یہ انکشاف بھی کیا کہ ابتدائی دور میں کچھ افسانے تحریر کیے تھے لیکن اب جو لیس ر
سے وہ اپنا رشتہ افسانوں سے توڑ بیٹھے ہیں۔

"گرقبولِ افتد" کی تقریبِ رونمائی

معروف طنز و مزاح نگار جناب صبیح محسن کے طنزیہ و مزاحیہ مضامین اور تمثیلچوں کے مجموعے "گرقبول افتد" کی تقریب
گزشتہ دنوں نیپا سماعت گاہ میں منعقد کی گئی جس کا اہتمام دلبینہ ایسوسی ایشن کی جانب سے کیا گیا تھا۔ تقریب کی صدارت مم
شاعر اور دانشور جناب جمیل الدین عالی فرما رہے تھے جب کہ مہمان خصوصی پاکستان ایڈورٹائزنگ ایسوسی ایشن کے سابق چیئر
جناب طاہر اے خان تھے۔ نظامت معروف شاعر جناب اختر لکھنوی کے سپرد تھی۔ قاری غلام رسول کی تلاوت کے
بعد مصباح دلبینوی صاحب نے اظہار خیال کیا جب کہ جناب شہزاد منظر کا مضمون راقم الحروف نے حاضرین کی خدمت میں پیش کیا
تقریب سے جناب منظر علی خاں، جناب انور عنایت اللہ، جناب رضی اختر شوق، کتاب کے مصنف صبیح محسن اور مہمان خصوصی نے بھی
خطاب کیا۔ اپنے خطبۂ صدارت میں جناب جمیل الدین عالی نے "گرقبول افتد" کو سراہتے ہوئے یہ بھی کہا کہ صبیح محسن ایک پڑھے لکھے
اور باخبر آدمی ہیں اس لیے ان کو اور زیادہ لکھنا چاہیے اور بعض پوشیدہ گوشوں کو بھی عیاں کرنا چاہیے۔ اس تقریب میں مصنف کی
کے تحریر کردہ خاکے "بات سے بات" کا ایک منظر مشہور فن کاروں قاضی واجد اور محمود علی نے اپنے مخصوص انداز میں پیش کیا جسے
سامعین نے پسند کیا۔

صدرِ مملکت کی طرف سے تمغۂ حسنِ کارکردگی

گزشتہ سال کی طرح اس سال بھی یوم آزادی کے موقعے پر مختلف شعبوں میں نمایاں خدمات انجام دینے پر متعدد
لوگوں کے لیے صدرِ مملکت کی طرف سے سول اور فوجی ایوارڈز دینے کا اعلان کیا گیا۔ اس سال تمغۂ حسنِ کارکردگی حاصل کرنے والے
فن کاروں میں افتخار عارف (شاعر مقیم لندن) اور پروین شاکر (شاعرہ مقیم اسلام آباد) کے نام بھی شامل ہیں۔

شعراء و ادباء کی پاکستان آمد

گزشتہ دنوں ہندوستان سے پروفیسر شاہ عطاء الرحمن عطا کاکوی اور ڈاکٹر سید محمد حسنین، انگلینڈ سے ساقی فاروقی
سعودی عرب سے ارمان نجمی اور دبئی سے نجم الحسن رضوی مختصر دورے پر پاکستان آئے اور چند دنوں قیام کے بعد واپس چلے گئے۔
امریکہ سے رضیہ فصیح احمد بھی پاکستان آئی ہوئی تھیں۔

انجمن میں تشریف آوری

گزشتہ دنوں مسلم یونیورسٹی علی گڑھ سے ڈاکٹر انجمن آرا بیگم انجمن ترقی اردو (پاکستان) کے دفتر میں تشریف لائیں۔

یہاں انھوں نے کتب خانۂ خاص میں کتابیں دیکھیں اور انجمن کے اسکالروں اور عہدیداروں سے مختلف علمی و ادبی مسائل پر تبادلۂ خیال کیا۔

ڈاکٹر انجمن آرا مسلم یونیورسٹی کے شعبۂ اردو میں استاد ہیں اور انھوں نے آغا حشر پر مقالہ لکھ کر پی۔ ایچ۔ ڈی کی ڈگری حاصل کی ہے۔

پاکستانی ادیبوں کی ڈائریکٹری

ایک بڑا امریکن ناشر پاکستانی ادیبوں کی ایک جامع ڈائریکٹری ترتیب دے رہا ہے۔ اس ناشر کی خصوصیت یہ ہے کہ اس نے اب تک صرف افریقی اور ایشیائی ملکوں ہی کی ادبی کتابیں اور ان کے ترجمے شائع کیے ہیں۔

اس مجوزہ ڈائریکٹری میں ہر ادیب کی تصویر اور حالاتِ زندگی کے ساتھ ساتھ اس کے فن کا مختصر جائزہ بھی شامل ہوگا جو پاکستانی ادیب اس منصوبے میں مفت شریک ہونا چاہیں ان سے درخواست ہے کہ وہ مزید تفصیلات کے لیے ڈائریکٹری کے مدیر انور عنایت اللہ صاحب سے رابطہ قائم کریں۔

پتا یہ ہے :- الف ۔۱۹۔ بلاک نمبر ۶ پی۔ ای۔ سی۔ ایچ سوسائٹی، کراچی ۔ ۷۵۴۰۰

تصنیف مرثیے

کراچی میں ہر سال کی طرح اس سال بھی محرم الحرام میں نوتصنیف مرثیوں کی مجالس منعقد ہوئیں۔ شہر کی مختلف مجالس میں ...ہلال نقوی، امید فاضلی، اسیر فیض آبادی، احمد نوید، عارف امام، تصویر فاطمہ اور دیگر مرثیہ نگاروں نے اپنے تازہ مرثیے پیش کیے۔

بیاد بابائے اردو مولوی عبدالحق مرحوم

جمعہ ۷ ار اگست، بوقت چار بجے شام سوسائٹی کلب خواتین میں ایک جلسہ بسلسلۂ برسی مولوی عبدالحق مرحوم، بصدارت بیگم شریف صاحبہ اُم الاردو منعقد ہوا۔ اراکینِ انجمن کے علاوہ دیگر خواتین نے بھی شرکت فرما کر بابائے اردو اور ...ِ اردو سے عقیدت و محبت کا اظہار فرمایا۔

تلاوتِ کلام پاک اور نعتِ رسولِ مقبول فاطمہ صاحبہ نے پیش کی۔ اس کے بعد بیگم نصیر صاحبہ، بیگم رحیم صاحبہ، بیگم سیدہ عثمانی ...اور مس کوثر صاحبہ نے بابائے اردو کے کارنامے اور اردو کی ترویج و ترقی کے لیے ان کی کوششوں پر نہایت تفصیل سے روشنی ... اور کہا کہ بابائے اردو کی کوششوں کو خراجِ عقیدت پیش کرنے کا اس سے بہتر اور کوئی طریقہ نہیں کہ ہم سب اردو زبان کی حفاظت ... اور اس کی ترقی کے لیے کوشش کریں۔

ان کے بعد صدرِ جلسہ نے تقریر کی جس میں انھوں نے فرمایا کہ انھوں نے بابائے اردو کے شانہ بشانہ شہر شہر جا کر اردو کی

دی گئی ہے۔ لیکن یہ ہماری منزل نہیں ہے۔ ہم اردو کو دنیا کی ترقی یافتہ زبانوں کی صف میں لانا چاہتے ہیں۔ اور اس کی بے پناہ وسعتوں سے خواہاں ہیں۔ پاکستان کا ذریعۂ تعلیم بھی اردو ہونا چاہیے۔ اس کی ایک کامیاب مثال اردو سائنس کالج ہے جہاں کے طلبہ مضمون میں نہایت کامیاب رہے ہیں۔ کیونکہ ہم اپنی زبان میں زیادہ بہتر طور پر اظہارِ خیال کر سکتے ہیں۔ آخر میں بیگم رحیم صاحب کی دعا پر جلسے کا اختتام ہوا۔

بے موسم وحشت" کی رونمائی

گزشتہ دنوں آرٹس کونسل کی ادبی کمیٹی کے زیرِ اہتمام خالد معین کے پہلے مجموعۂ کلام بے موسم وحشت کی تقریبِ رونمائی ہوئی۔ تقریب کی صدارت جناب عزیز حامد مدنی کر رہے تھے۔ جب کہ مشہور و معروف شاعر جناب جون ایلیا مہمانِ خصوصی تھے۔ نیوز کاسٹر جناب شہاب الدین شہاب نے نظامت کے فرائض انجام دیے۔ معروف شاعر نقاش کاظمی کے علاوہ دیگر مقررین میں شفیق الدین شارق، واجد رضی حیدر، کلیم حیدری، راشد نور اور فیاض وغیرہ شامل تھے۔

پروفیسر نظیر صدیقی بیجنگ یونیورسٹی میں

اردو کے مشہور نقاد اور علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی اسلام آباد میں شعبۂ اردو کے صدر پروفیسر نظیر صدیقی گزشتہ دنوں عوامی جمہوریہ چین روانہ ہو گئے جہاں وہ بیجنگ یونیورسٹی کے شعبۂ اردو میں تدریس کے فرائض انجام دیں گے۔

جگن ناتھ آزاد کا نعتیہ کلام فرانسیسی میں

اردو کے نامور شاعر جگن ناتھ آزاد کے نعتیہ کلام کا فرانسیسی ترجمہ کتابی صورت میں پیرس سے شائع ہو چکا ہے۔ یہ ترجمہ ممتاز عالم ڈاکٹر محمد حمید اللہ نے کیا ہے۔

رئیس امروہوی کی دوسری برسی

اردو کے مشہور و معروف شاعر، ادیب اور صحافی جناب رئیس امروہوی کی دوسری برسی آرٹس کونسل میں انجام پذیر ہوئی۔ برسی کا اہتمام آرٹس کونسل ادبی کمیٹی، انجمن ترقی اردو، رئیس امروہوی میموریل ٹرسٹ اور رئیس اکیڈمی کراچی کے اشتراک سے کیا گیا تھا۔ اجتماع کی صدارت جناب جسٹس صلاح الدین مرزا نے فرمائی جب کہ مہمانِ خصوصی جناب جسٹس (ریٹائرڈ) ایس اے نصرت تھے۔ رئیس صاحب کے فن و شخصیت پر جناب سید محمد تقی، ڈاکٹر حنیف فوق، جناب ... الحق حقی، جناب جمیل الدین عالی، جناب محمد علی صدیقی، جناب منظر علی خاں، جناب جاذب قریشی اور محترمہ وضاحت نسیم نے اظہارِ خیال کیا۔

ابوالفضل صدیقی کی تیسری برسی

صاحب طرز افسانہ نگار اور ناول نویس ابوالفضل صدیقی کی تیسری برسی ادارۂ ... اور انجمن ترقی اردو

کے اشتراک سے غالب لائبریری میں انجام پذیر ہوئی۔ تقریب کی صدارت ڈاکٹر جمیل جالبی اور نظامت ڈاکٹر اسلم قریشی نے کی۔ مقررین میں ڈاکٹر اسلم قریشی، مختار زمن اور سحر انصاری شامل تھے جب کہ ڈاکٹر جمیل جالبی نے اپنے صدارتی خطبے میں مرحوم کے فن اور شخصیت پر تفصیل سے روشنی ڈالتے ہوئے انھیں اپنے عہد کا قطعی مختلف اور منفرد افسانہ نگار و ناول نویس قرار دیا۔ قبل ازیں نصر اللہ خاں کا مضمون نذر الحسن صدیقی نے حاضرین کو پڑھ کر سنایا۔

شہاب دہلوی وفات پا گئے

ملک کے ممتاز ادیب و شاعر، معروف مورخ ہفت روزہ "الہام" اور سہ ماہی "الزبیر" بہاولپور کے مالک و مدیر سید مسعود حسن شہاب دہلوی طویل علالت کے بعد انتقال کر گئے۔ مرحوم نے ساری عمر شعر و ادب کی خدمت کی اور علمی و تحقیقی کاموں میں صرف کر دی۔ ان کی شعری و نثری تصانیف کی تعداد ایک درجن کے لگ بھگ ہے۔ وائس چانسلر اسلامیہ یونیورسٹی ڈاکٹر مصباح العین خاں اور کمشنر بہاولپور ڈویژن جناب مرتضیٰ برلاس نے پس ماندگان سے اظہارِ تعزیت کرتے ہوئے مرحوم کی علمی و ادبی خدمات کو خراجِ عقیدت پیش کیا ہے۔ اردو مجلس کراچی کا ایک تعزیتی اجلاس جناب خواجہ حمید الدین شاہد مدیر اعلیٰ "سب رس" کی زیر صدارت منعقد کیا گیا اور مرحوم کے ایصالِ ثواب کے لیے دعا کی گئی۔

میاں سید رسول رسا انتقال کر گئے

گزشتہ دنوں پشتو کی ممتاز شخصیت اور مشہور شاعر میاں سید رسول رسا انتقال کر گئے۔ انتقال کے وقت ان کی عمر اٹھتر برس تھی۔ پشتو ادب میں ان کی خدمات مثالی ہیں۔ انھیں جدید پشتو ادب کا بانی کہا جاتا ہے۔ انھوں نے پشتو شاعری کے ساتھ پشتو نثر نگاری کے فروغ میں بھی نمایاں حصہ لیا۔ میاں سید رسول رسا پشتو زبان و ادب کی ایسی توانا آواز تھے کہ دیر تک انھیں یاد رکھا جائے گا۔

ادارہ "قومی زبان" ان کی رحلت کو ایک ناقابلِ تلافی نقصان سمجھتا ہے اور دعا گو ہے کہ اللہ تعالیٰ مرحوم کو اپنے جوارِ رحمت میں جگہ دے اور لواحقین کو صبر کی توفیق عطا فرمائے۔

ذکی آذر کا انتقال پُر ملال

یکم اکتوبر ۹۰ء کو معروف شاعر اور ادیب پروفیسر ذکی آذر کا کراچی میں انتقال ہو گیا۔ مرحوم ایک عرصے سے علیل تھے۔ وہ اسلام آباد کے ایک کالج میں استاد تھے۔ وہ معروف استاد اور نقاد پروفیسر نظیر صدیقی کے چھوٹے بھائی تھے۔

حروفِ تازہ

ائیں

یدو فرد فریدؒ ——— مصنف: ڈاکٹر اسلم فرخی
روحانی سفر کی روداد
صفحات: ۱۱۲ ـ قیمت: ۴۰ روپے
پتا: احسن مطبوعات ۵/۵۵ گلشنِ اقبال، کراچی

ائیہ کے خدوخال ——— مصنف: وزیر آغا
مضامین
صفحات: ۱۱۰ ـ قیمت: ۵۰ روپے
پتا: مکتبہ فکر وخیال ۲۷۱ ـ ستلج بلاک ـ اقبال ٹاؤن، لاہور

کتنا انوکھی ——— مصنف: وزیر آغا
شاعری
صفحات: ۹۶ ـ قیمت: ۴۰ روپے
پتا: مکتبہ فکر وخیال ۲۷۱ ـ ستلج بلاک ـ اقبال ٹاؤن، لاہور

نوں سے بندھے ہاتھ ——— مصنف: میرزا ادیب
افسانے
صفحات: ۱۵۲ ـ قیمت: ۹۰ روپے
پتا، مقبول اکیڈمی شاہراہِ قائداعظم، لاہور

ں کے ویرانے ——— مصنف: اُم عمارہ
افسانے
صفحات: ۲۲۲ ـ قیمت: ۵۸ روپے
پتا مقبول اکیڈمی ـ ۱۰ دیال سنگھ مینشن شاہراہِ قائداعظم، لاہور

د روشن ہے ——— مصنف: اُم عمارہ
افسانے
صفحات: ۱۸۴ ـ قیمت: ۵۰ روپے
پتا: مقبول اکیڈمی ـ ۱۰ دیال سنگھ مینشن شاہراہِ قائداعظم، لاہور

ول بن ——— مرتب: سکندر نامی
شاعری
صفحات ۳۰۴ ـ قیمت: ۱۰۰ روپے
پتا: مکتبہ دانشوراں ۵-۲۷ سیکٹر ۵ ایف، نیو کراچی

ہوا فیصلہ کرے ——— مصنف: ڈاکٹر اورنگ زیب احساس

شاعری

صفحات: ۱۶۰۔ قیمت: ۴۵ روپے

پتا: بزمِ احساسِ ادب، تھانہ روڈ، اٹوب

فکرِ انور ——— مصنف: سیّد احمد علی شاہ انورؔ عمر کوٹی

شاعری

صفحات: ۱۲۸۔ قیمت: ۲۵ روپے

پتا: سیّد احمد علی شاہ انورؔ اکیڈمی A-۴/۳-F/۱۷ نزد ماپتی ڈیل اسکول ناظم آباد

وصیؔ فیض آبادی کا ایک مرثیہ دوستی ——— مرتّب: علی حیدر اسیرؔ فیض آبادی

مرثیہ

صفحات: ۴۰۔ قیمت: درج نہیں

پتا: ادارۂ اشاعت ۱۱سی ملہ، آر ۲۱۶۔ سرسیّد ٹاؤن، نارتھ کراچی

سارک ایک مطالعہ ——— مصنّف: سیّد وسیم الدین

تعارف

صفحات: ۸۰۔ قیمت: ۱۸ روپے

پتا: جنرل نالج اکیڈمی ۵۔ ڈی ۸/۱ ناظم آباد، کراچی

مقالاتِ حلقۂ اربابِ ذوق ——— مرتّب: سہیل احمد

مقالات

صفحات: ۳۷۱۔ قیمت: ۱۰۰ روپے

پتا: پولیمر پبلی کیشنز، لاہور

گلہائے رنگ رنگ ——— مرتّب: محمد شمس الحق

شاعری کا انتخاب

صفحات: ۴۵۱۔ قیمت: ۱۰۰ روپے

پتا: نیشنل بک فاؤنڈیشن، کراچی

ترجمانِ اسرارِ خودی ——— مصنّف: پروفیسر غلام دستگیر شہاب

اقبالیات

صفحات: ۲۳۱۔ قیمت: ۴۰ روپے

پتا: سلیقہ کتاب گھر ۲۹/۱۵۲۰ جان محمد اسٹریٹ، پونہ ۴۱۱۰۰۱ (بھارت)

رحمتِ عالم ——— ———

نعت

صفحات: ۱۷۴۔ ہدیہ: ۸۰ روپے

پتا: بزمِ ادب نیشنل بینک آف پاکستان

دہلی زیارت و آثار ——— مصنّف: سردار علی احمد خاں

تاریخ

صفحات: ۱۸۴۔ قیمت: ۴۰ روپے

پتا: انجمن فلاح و بہبود زائرین پاکستان، لاہور

ڈاکٹر وفا راشدی

نئے افق

گزشتہ سے پیوستہ — رسائل و جرائد بابت دسمبر ۸۸ء، جولائی تا دسمبر ۱۹۸۹ء کے موضوع وار اشاریے

علمی، تعلیمی، ثقافتی ادارے اور تحریکیں

اوج کمال	دوسری عالمی اردو کانفرنس نئی دہلی	طلوع افکار	کراچی	نومبر	۱۹۸۹ء	ص ۳۹
باقر رضوی	ترقی پسند تحریک کا ایک احتسابی جائزہ	"	"	ستمبر	"	ص ۱۶
راج بہادر گوڑ	روشنی کی، ترقی پسند ادبی تحریک	"	"	اکتوبر	"	ص ۹
رضا ہمدانی	انجمن سے انجمن تک۔ کچھ یادیں کچھ باتیں	قومی زبان	"	"	"	ص ۲۱
محمد رئیس، ڈاکٹر	کراچی میں ترقی پسند تحریک کا جشن زریں	طلوع افکار	"	ستمبر	"	ص ۲۲
محمد اجمل نیازی، ڈاکٹر	تحریک حریت کشمیر میں محمد الدین فوق کی خدمات	صحیفہ	لاہور	دسمبر	"	ص ۹۴

سیاست، صحافت امورِ مملکت

احمد ندیم قاسمی	حب وطن کی تفہیم	صحیفہ	لاہور	دسمبر	۱۹۸۹ء	ص ۱۲۷
خواجہ معز الدین احمد فاروقی، پروفیسر	جمہوریہ ترکی میں سیاسی جماعتوں کا ارتقا	العلم	کراچی	"	"	ص ۱۳۱
عذرا اصغر علی	عہد عباسیہ میں منصب وزارت	فکر و نظر	اسلام آباد	"	"	ص ۳

مخطوطات و نوادرات

اسد فرخی، ڈاکٹر	نوادر کتب خانۂ خاص، اصول علم ہندسہ[1]	قومی زبان	کراچی	دسمبر	۱۹۸۹ء	ص ۷
اکبر حیدری کاشمیری	دیوان میر کا قدیم ترین مخطوطہ	ہماری زبان	دہلی	۸ دسمبر	"	ص ۱
امیر خسرو	مثنوی قرآن السعدین	شاعر	بمبئی	شمارہ ۳ / ۱۹۸۹ء		ص ۵

---

[1] بہاری لال۔ دوم نیٹو ماسٹر مدرسہ رڑکی چھاپہ خانہ مدرسہ رڑکی میں چھاپا گیا ۱۸۵۶ء

بابائے اردو مولوی عبدالحق۔ سائنٹفک سوسائٹی علی گڑھ[۱]		اردو	کراچی	جولائی، ستمبر	۱۹۸۹ء	ص ۷
راشد برہان پوری	مخطوطات ذخیرہ راشد برہان پوری[۲]	تحقیق سندھ یونیورسٹی جامشورو		اکتوبر	"	ص ۹
سرفراز احمد اصلاحی	کفایت المنتھی، ایک نادر و نایاب مخطوطہ[۳]	معارف	اعظم گڑھ	"	"	ص ۳۰۱
سید جاوید اقبال	افاداتِ امیر[۴]	تحقیق سندھ یونیورسٹی جامشورو		"	"	ص ۳۶۹
سید عارف نوشاہی	پاکستان میں مخطوطات	"	"	"	"	ص ۴۰۶
ظفر اقبال، ڈاکٹر	ناسخ کا غیر مطبوعہ کلام	"	"	"	"	ص ۴۱۳
عتیق الرحمٰن، ڈاکٹر	خدابخش لائبریری کے چند اہم مخطوطات	جرنل خدابخش لائبریری پٹنہ۔ شمارہ ۵۰/۱۹۸۹ء				
نجم الاسلام، ڈاکٹر	قدیم اردو کے چند نوادر	تحقیق سندھ یونیورسٹی جامشورو		اکتوبر	"	ص ۱۲۱
نجم الاسلام، ڈاکٹر	کلیاتِ شائق[۵]	"	"	"	"	ص ۱۴۰

مطالعۂ کتب

آفاق صدیقی	مہران نقش پر ایک نظر[۶]	سب رس	کراچی	اکتوبر	۱۹۸۹ء	ص ۴۹
ادارہ	قومی زبان، ایک جہتی، نفاذ اردو و مسائل[۷]	اردو	"	جولائی ستمبر	"	ص ۱۴۱
ادارہ	تحقیق شمارہ ۳[۸]	"	"	"	"	ص ۱۴۳
افتخار اجمل شاہین	شب آہنگ[۹]	صریر	"	اگست	"	ص ۷۹
افتخار اجمل شاہین	راہِ مضمون تازہ بند نہیں[۱۰]	"	"	اکتوبر	"	ص ۸۰

---

[۱] یکے از مطبوعاتِ انجمن ترقی اردو، رسالہ اردو کے قدیم علمی ذخیرے سے

[۲] مخزونہ مرکزی کتاب خانہ جامعہ سندھ

[۳] یہ مخطوطہ مدرستہ الاصلاح سرائے میر اعظم گڑھ کے کتب خانہ "المکتبۃ المرکزیہ" میں محفوظ ہے

[۴] مکتوباتِ امیر مینائی کا ایک غیر مطبوعہ ذخیرہ اور اس کے افادات

[۵] تیرھویں صدی ہجری کے ابتدائی نصف کا فارسی شاعر میر غلام حسین شائق۔ بحوالہ فارسی دیوان کلیاتِ شائق (قلمی) مملوکہ انڈیا آفس لائبریری سندھ

[۶] مصنفہ ڈاکٹر وفا راشدی مطبوعہ مکتبہ اشاعتِ اردو کراچی

[۷] مصنف ڈاکٹر جمیل جالبی۔ ناشر مقتدرہ قومی زبان اسلام آباد

[۸] شعبہ جاتی تحقیقی مجلہ شعبۂ اردو جامعہ سندھ جامشورو مدیر ڈاکٹر نجم الاسلام

[۹] مجموعۂ منظومات، مہتاب حیدر

[۱۰] رفیع الدین راز کا پہلا شعری مجموعہ دیدۂ خوش خواب

انور سدید، ڈاکٹر	کچھ وقت ہندوستانی کتابوں کے ساتھ[1]	قومی زبان	کراچی	اکتوبر	۱۹۸۹ء	ص ۱۷
انور سدید، ڈاکٹر	" " " "[2]	"	"	نومبر	"	ص ۴۳
انور سدید، ڈاکٹر	بہادر شاہ ظفر/ڈاکٹر اسلم پرویز	ہماری زبان	دہلی	یکم دسمبر	"	ص ۷
حسن نعیم	پردہ سخن کا[3]	دائرے	کراچی	دسمبر	"	ص ۹۰
خواجہ حمید الدین شاہد	قرآن مجید اور اردو[4]	سب رس	"	جولائی	"	ص ۳۶
خورشید احمد	شہر گماں نئی اردو شاعری کا سمت نما[5]	صریر	"	ستمبر	"	ص ۴۷
رام لعل نابھوی	عربی، فارسی اور اردو رامائن	معارف	اعظم گڑھ	اکتوبر	"	ص ۲۸۵
رام لعل نابھوی	" " "	"	"	نومبر	"	ص ۳۷۱
رفیعہ سلطانہ، ڈاکٹر	جامع اردو، انگریزی لغت کی تدوین مرتبہ یعقوب میراں مجتہدی	سب رس	کراچی	اکتوبر	۱۹۸۹ء	ص ۴۴
سید ابوالاعلیٰ مودودی	پنڈت مدن موہن مالویہ، حالات زندگی[6]	جنرل خدا بخش لائبریری، پٹنہ	شمارہ ۵۰	/	"	ص ۱
سید انیس اشرف، ڈاکٹر	تماشا طلب آزاد[7]، ایک مطالعہ	دائرے	کراچی	اکتوبر	"	ص ۹۴
سید داؤد اشرف، ڈاکٹر	مولانا ظفر علی خاں کے قیام حیدرآباد کی ایک یادگار کتاب[8]	سب رس	"	ستمبر	"	ص ۱۵

---

[1] ادبی تنقید اور اسلوبیات / ڈاکٹر گوپی چند نارنگ

[2] پچھلے موسم کا پھول / مظہر امام
کچھ ابوالکلام آزاد کے بارے میں / مالک رام
انشائیہ پچیسی / ڈاکٹر جاوید وششٹ
یاترہ / ساحل احمد

[3] ڈاکٹر مظفر حنفی کا مجموعۂ کلام

[4] مقتدرہ قومی زبان کا شائع کردہ کتابچہ

[5] آشفتہ چنگیزی کا شعری مجموعہ

[6] سید ابوالاعلیٰ مودودی کی پہلی تصنیف مطبوعہ اشتراکی پریس دہلی ۱۳۳۷ھ/۱۹۱۹ء

[7] مجموعۂ منظومات قمر ہاشمی

[8] "خیابان فارس" وائسرائے ہند لارڈ کرزن کی انگریزی کتاب "پرشیا اینڈ دی پرشین کوسچن" PERSIA AND THE PERSIAN QUESTION کی جلد اول کا اردو ترجمہ ہے۔

سیدہ نزہت فاطمہ زیدی، ڈاکٹر	محمد حسین آزاد؛ ایک جائزہ[1]	العلم	کراچی	دسمبر	۱۹۸۹ء	ص ۷۴
شان الحق حقی	ارتھ شاستر کا ایک باب[2]	دائرے	"	"	"	ص ۵۷
شفیق احمد شفیق	خزاں کی آخری شام[3]	"	"	نومبر	"	ص ۷۷
ضیا الحسن	غزل نما[4]	ادب لطیف	لاہور	"	"	ص ۳۰
عبدالصدیق دریابادی ندوی	مطالعۂ تصوف	معارف	اعظم گڑھ	اکتوبر	"	ص ۸-۳
فرمان فتحپوری، ڈاکٹر	رباعیاتِ سرمد مع منظوم اردو ترجمہ[5]	نگار پاکستان	کراچی	ستمبر، اکتوبر	"	ص ۱ تا ۱۷
مانک ٹالہ	سوزِ وطن کی ضبطی[6]	قومی زبان	"	دسمبر	"	ص ۴۰
مسلم شمیم	اردو میں واسوخت نگاری	طلوعِ افکار	"	ستمبر	"	ص ۱۳
مظہر جمیل	مٹھی بھر ہوا[7]	"	"	نومبر	"	ص ۷۵
میرزا ادیب	شہر اندر شہر[8] کے افسانہ نگار کے ساتھ چند لمحے	نقوش	لاہور	دسمبر	۱۹۸۸ء	ص ۷۵
نصیر احمد ناصر، ڈاکٹر (مرتب)	ارمغانِ خالد[9]	"	"	"	"	ص ۰-۷
وفا راشدی، ڈاکٹر	مسلمانانِ سندھ کی تعلیم[10]	العلم	کراچی	"	۱۹۸۹ء	ص ۵۰
یوسف حسن	اردو اور صوفی ازم[11]	طلوعِ افکار	"	اگست	"	ص ۳۴
یوسف سرمست	چائے کا باغ[12]	کتاب نما	نئی دہلی	دسمبر	"	ص ۸

۱۔ مصنفہ آغا سلمان باقر مطبوعہ سنگ میل پبلی کیشنز لاہور

۲۔ اردو میں پہلا ترجمہ۔ چوتھی صدی قبل مسیح کے ہندی مصنف آچاریہ کوٹلیہ چانکیہ کی کتاب "ارتھ شاستر" مشرقی ادب کی اہم تصنیف ہے۔

۳۔ سرشار صدیقی کا مجموعۂ منظومات

۴۔ محترمہ ادا جعفری کے تحقیقی و تنقیدی مقالات کا مجموعہ مطبوعہ انجمن ترقی اردو پاکستان کراچی۔ غزل نما قدیم شعرا کے تعارف اور انتخاب پر مشتمل ہے۔

۵۔ منشی سید نواب علی صولت لکھنوی تلمیذ قوی امروہوی کا منظوم ترجمہ موسوم بہ "جواہر منظوم" مع مقدمہ مولانا ابوالکلام آزاد، منشی قربان علی بسمل نے ۱۳۴۷ھ/۱۹۲۸ء میں شاہجہاں پریس دہلی سے شائع کیا۔

۶۔ سوزِ وطن پریم چند کی پہلی پانچ کہانیوں کا مجموعہ ۷۔ کوکب جمیل کا ناول ۸۔ شہر اندر شہر، صادق حسین کے افسانوں کا دوسرا مجموعہ

۹۔ ارمغانِ خالد (۱۱۰۰ صفحات) میں عبدالعزیز خالد کے افکار اور فن کا تفصیلی جائزہ اور ناقدینِ خالد کی آرا شامل ہیں۔

۱۰۔ مصنفہ سید مصطفیٰ علی بریلوی مطبوعہ آل پاکستان ایجوکیشنل کانفرنس کراچی۔

۱۱۔ تالیف ڈاکٹر مرزا حامد بیگ مطبوعہ مقتدرہ قومی زبان اسلام آباد۔

قرۃ العین حیدر کا ناول۔

ماھنامہ

قومی زبان

کراچی

نومبر ۱۹۹۰
جلد : ۶۲
شمارہ : ۱۱

مضمون نما

ادارۂ تحریر
جمیل الدین عالی
ادا جعفری
ڈاکٹر اسلم فرخی

مدیر
ادیب سہیل

بدل اشتراک
فی پرچہ .... ۸ روپے
سالانہ عام ڈاک سے ۹۰ روپے
سالانہ رجسٹری سے ۱۴۲ روپے

بیرونِ ملک
فی پرچہ ...... ایک ڈالر
سالانہ عام ۱۰ پونڈ ۱۵ ڈالر
سالانہ ہوائی ڈاک سے ۱۵ پونڈ ۲۵ ڈالر

انجمن ترقی اردو پاکستان
بابائے اردو روڈ، کراچی۔ فون: [illegible]

۲۱ ستمبر ۱۹۹۰ء کو حلقۂ اربابِ ذوق راولپنڈی کی جانب سے پاکستان نیشنل سنٹر میں ایک خصوصی جلسہ منعقد ہوا۔ س جلسے میں "قرار دادِ اردو" کے نام سے ایک قرارداد منظور کی گئی جس میں صدر اسلامی جمہوریہ پاکستان جناب غلام اسحاق خا ے پر زور مطالبہ کیا گیا ہے کہ ۱۹۷۳ء کے آئین کی دفعہ ۲۵۱ کی رو سے ملک بھر میں قومی زبان اردو کو انگریزی کی جگہ فوری طور پر واحد سرکاری زبان کی حیثیت سے نافذ کیا جائے۔ حلقۂ اربابِ ذوق پنڈی کی جانب سے قومی زبان ردو کے نفاذ کا فی الفور مطالبہ آئین کے عین مطابق ہے۔ ۱۹۷۳ء بلکہ قیامِ پاکستان کے فوراً بعد سے اب تک ملک کے تمام سنجیدہ حلقوں کی جانب سے یہ مطالبہ وقتاً فوقتاً دہرایا جاتا رہا ہے۔ حکومت پاکستان کی جانب سے قومی زبان اردو کے مکمل نفاذ کا جو آخری ہدف مقرر کیا گیا تھا۔ وہ اگست ۱۹۸۸ء کا مہینہ تھا۔ اس ہدف کو گزرے ہوئے بھی تقریباً ڈھائی سال ہونے کو آئے ہیں لیکن معاملہ ٹلتا رہتا ہے۔ بیچ بیچ میں قومی زبان کے نفاذ کے کام میں تیزی بھی دیکھی گئی جس کے نتیجے میں سرکاری و نیم سرکاری دفاتر میں کچھ پیش رفت بھی ہوئی ہے لیکن پھر وہی تساہل و تغافل کی کیفیت۔ جب ۱۹۷۳ء کے آئین میں قومی زبان کے اس حق کو تسلیم کر لیا گیا ہے تو اربابِ حل و عقد کی طرف سے اس سلسلے میں نیم دلی کے اسباب سمجھ میں نہیں آتے۔ ہم سب جانتے ہیں کہ قومی زبان، قومی یکجہتی اتحاد اور یگانگت میں خصوصی کردار کی حامل ہے۔ ہم نے اس سے کوئی فائدہ نہیں اٹھایا۔

بہرحال ہم اس صورتِ حال سے زیادہ مایوس نہیں، اس لیے کہ اس کا ایک مثبت رخ یہ ہے کہ اربابِ حل و عقد کی نظر میں "قومی زبان" کی حیثیت تسلیم شدہ ہے۔ حال ہی میں اس کا مظاہرہ سرحد اور دیگر صوبائی اسمبلیوں کے ممبران کی حلف برداری کے موقعے پر دیکھا گیا۔ بالخصوص سرحد و پنجاب و بلوچستان میں حلف بردا کی تمام تر کارروائیاں قومی زبان میں ہوئیں۔ لیکن ضرورت اس امر کی ہے کہ وفاقی حکومت اپنی آئینی ذمہ داری پوری کرتے ہوئے اردو کو دفتری زبان کی حیثیت سے فوری طور پر رائج کر دے۔

ڈاکٹر اسلم فرخی

نوادر کتب خانۂ خاص

"سدا سہاگ"

مصنفہ میرزا نصیر الدین محمد تحصیلدار نجیب آباد ضلع بجنور

۱۲۸۷ھ

مطبوعہ گورنمنٹ پریس۔ الہ آباد

۱۸۶۸ء میں صوبہ شمال مغربی (حالیہ اُتر پردیش) کے ناظم تعلیمات کیمپسن نے لیفٹیننٹ گورنر سر ولیم میور کے ایما سے ایک انعامی اشتہار جاری کیا جس کا مقصد ومنشا مصنفوں کو نئے انداز کی کتابیں مرتب کرنے پر آمادہ کرنا تھا۔ حکومت یہ چاہتی تھی کہ ایسی کتابیں لکھی جائیں جن سے تعلیم کے فروغ میں مدد ملے۔ عام آگاہی پیدا ہو اور انھیں نصابی ضروریات کے تحت بھی استعمال کیا جا سکے۔ اس اشتہار کے جواب سے جو کتابیں حکومت کے سامنے پیش ہوئیں ان میں ڈپٹی نذیر احمد کی مرآۃ العروس سب سے زیادہ اہم ہے۔ حکومت نے ڈپٹی صاحب کو اس کتاب پر مبلغ ایک ہزار روپے بطور انعام عطا کیے تھے۔

میرزا نصیر الدین محمد تحصیلدار نجیب آباد ضلع بجنور کی مختصر کتاب "سدا سہاگ" بھی انعامی کتابوں کے سلسلے کی ایک کڑی ہے۔ یہ کتاب تعلیم نسواں کے فروغ اور خواتین میں آگاہی پیدا کرنے کی غرض سے تصنیف کی گئی تھی۔ حکومت نے اسے بھی انعام کا مستحق گردانا اور مصنف کو انعام عطا کیا اور پانسو نسخے مدارس نسواں کے لیے خریدے۔

"سدا سہاگ" ۹۲ صفحات کی ایک چھوٹی سی کتاب ہے جو تین اجزا پر مشتمل ہے۔ پہلے جز میں ایک قصہ بیان کیا گیا ہے۔ ایک چھوٹا سا خاندان باپ ماں۔ دو بیٹیوں اور ایک بیٹے پر مشتمل۔ ماں اور بڑی بیٹی تعلیم سے بے بہرہ۔ چھوٹی کو تعلیم سے شغف۔ ایک دن ماں چھوٹی بیٹی کو پڑھنے لکھنے پر لعنت ملامت کرتی ہے تو وہ ماں کو تعلیم کے فوائد بڑی خوبی سے سمجھاتی ہے اور بتاتی ہے کہ میں نے صرف خود ہی تعلیم حاصل نہیں کی بلکہ کنبے اور محلّے کی بعض لڑکیوں کو بھی لکھنا پڑھنا سکھایا ہے۔ اس ضمن میں ان لڑکیوں کا احوال بھی بیان ہوا ہے۔ ماں بیٹی کی اس گفتگو سے بڑی خوش ہوئی اور بڑی بیٹی بھی لکھنے پڑھنے کی طرف مائل ہو گئی۔ چھوٹی لڑکی کی [illegible] سے شادی کرلی اور اس کی زندگی بڑی آسانی

ڈاکٹر سید فرخی

نوادر کتب خانۂ خاص

"سدا سہاگ"

مصنفہ میرزا نصیر الدین محمد تحصیل دار نجیب آباد ضلع بجنور

۱۲۹۸ھ

مطبوعہ گورنمنٹ پریس۔ الہ آباد

۱۸۶۸ء میں صوبہ شمال مغربی (حالیہ اتر پردیش) کے ناظم تعلیمات کیمپسن نے لیفٹیننٹ گورنر سر ولیم میور کے ایما سے ایک عام اشتہار جاری کیا جس کا مقصد دمنت مصنفوں کو نئے انداز کی کتابیں مرتب کرنے پر آمادہ کرنا تھا۔ حکومت یہ چاہتی تھی کہ ایسی کتابیں لکھی جائیں جن سے تعلیم کے فروغ میں مدد ملے۔ عام آگاہی پیدا ہو اور انھیں نصابی ضروریات کے تحت بھی استعمال کیا جاسکے۔ اس اشتہار کے حوالے سے جو کتابیں حکومت کے سامنے پیش ہوئیں ان میں ڈپٹی نذیر احمد کی مرآۃ العروس سب سے زیادہ اہم ہے۔ حکومت نے ڈپٹی صاحب کو اس کتاب پر مبلغ ایک ہزار روپے بطور انعام عطا کیے تھے۔

میرزا نصیر الدین محمد تحصیل دار نجیب آباد ضلع بجنور کی مختصر کتاب "سدا سہاگ" بھی انعامی کتابوں کے سلسلے کی ایک کڑی ہے۔ یہ کتاب تعلیم نسواں کے فروغ اور خواتین میں آگاہی پیدا کرنے کی غرض سے تصنیف کی گئی تھی۔ حکومت نے اسے بھی انعام کا مستحق گردانا اور مصنف کو انعام عطا کیا اور پانچ سو نسخے مدارس نسواں کے لیے خریدے۔

"سدا سہاگ" ۹۲ صفحات کی ایک چھوٹی سی کتاب ہے جو تین اجزا پر مشتمل ہے۔ پہلے جز میں ایک قصہ بیان کیا گیا ہے۔ ایک چھوٹا سا خاندان باپ ماں۔ دو بیٹیوں اور ایک بیٹے پر مشتمل۔ ماں اور بڑی بیٹی تعلیم سے بے بہرہ۔ چھوٹی کو تعلیم سے شغف۔ ایک دن ماں چھوٹی بیٹی کو پڑھنے لکھنے پر لعنت ملامت کرتی ہے تو وہ ماں کو تعلیم کے فوائد بڑی خوبی سے سمجھاتی ہے اور بتاتی ہے کہ میں نے صرف خود ہی تعلیم حاصل نہیں کی بلکہ کنبے اور محلے کی بعض لڑکیوں کو بھی لکھنا پڑھنا سکھایا ہے۔ اس ضمن میں ان لڑکیوں کا احوال بھی بیان ہوا ہے۔ ماں بیٹی کی اس گفتگو سے بڑی خوش ہوئی اور بڑی بیٹی بھی لکھنے پڑھنے کی طرف مائل ہو گئی۔ چھوٹی لڑکی کی لیاقت اور ہنرمندی کا ایسا شہرا ہوا کہ ایک راجہ کے نائب نے اس سے شادی کرلی اور اس کی زندگی بڑی آسائش

یہ ایک بہت چھوٹا قصّہ ہے جس میں کوئی دل چسپی یا کشش نہیں سیدھی سادی باتیں ہیں جو اس زمانے کے اعتبار سے مناسب تھیں۔ میرزا نصیر الدین محمد غالبؔ دلی سے تعلق رکھتے تھے اس وجہ سے قصّے کا معاشرتی پس منظر دہلی کا ہے۔ دوسرے حصّے میں بارہ خط ہیں۔ بقول مصنف "ہر خط افادہ علمی اور رسوم خانہ داری کی دستاویز ہے" اگرچہ یہ بیان کسی قدر مبالغہ آمیز ہے تاہم یہ صحیح ہے کہ ان خطوں میں لڑکیوں کو عام زندگی کے اصول سے آشنا کیا گیا ہے اور ان میں تعلیمی آگاہی کو فروغ دینے کی کوشش کی گئی ہے۔ بعض خطوں میں بیان اور زبان کا پیرایہ بہت دل چسپ ہے۔ مثلاً بھائی کے نام کے خط میں بے تکلفی۔ سادگی اور شگفتگی کا یہ انداز بڑا پُر لطف ہے:

"برادر بجان برابر بلکہ از جان بہتر و از جہان خوش تر۔ مرزا محمد ایوب زندہ رکھے تم کو اللہ اور زیادہ کرے مرتبہ تمہارا۔ آج کئی دن سے میری بائیں آنکھ پھڑکتی تھی۔ مثل ہے کہ آنکھ پھڑکے بائیں یا بیر ملے یا سائیں۔ اور انتظار تمہارے خط کا تھا۔ کوّا ابھی کوٹھے پر بول رہا تھا کہ تمہارا آدمی ابراہیم معہ چار بہنگی آم ولایتی اور ایک بہنگی شیر بنی کے آیا اور تمہارا خط دیا۔ میں نے آنکھوں سے لگایا اور نصف الملاقات کا پورا لطف اٹھایا۔ خوشی کی وجہ سے چہرہ سرخ تھا۔ اور محبت کے مارے آنکھوں میں آنسو بھرے ہوئے خط کو پڑھتی تھی۔ تمہاری خیر و عافیت سن کر جان میں جان آگئی۔ روح قالب میں سما گئی۔ سجدۂ شکر ادا کیا۔ میرے لیے جو تم نے آم بھیجے یہ تمہاری خاص محبت کا باعث ہے۔ اور بچوں کے واسطے جو شیرینی بھیجی کچھ ان کی میٹھی باتیں تم کو پسند آئی ہوں گی"

اس خط سے میرزا نصیر الدین محمد کی تحریری صلاحیت کا اندازہ ہوتا ہے۔ اگرچہ ان کے بیان کردہ قصّے میں کوئی ندرت نہیں اور خطوط میں بھی کم و بیش یہی انداز ملتا ہے۔ لیکن اس خط سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ وہ خوبصورت۔ سلیس اور شگفتہ نثر لکھنے پر قادر تھے۔ سوا سو برس پہلے کا یہ اسلوب آج کے عہد میں بھی سلیس اور دلکش معلوم ہوتا ہے۔ اس میں بے تکلفی کا ایک شرارہ موجود ہے۔

"سدا سہاگ" کا تیسرا حصّہ منظوم ہے۔ اس میں مناجات۔ قصّے کا خلاصہ بطرز مثنوی اور تین دعائیں شامل ہیں۔ پہلی دعا عمومی۔ دوسری ملکہ وکٹوریا اور تیسری سر ولیم میور کے لیے ہے۔ میرزا نصیر الدین محمد کی شاعری میں کوئی قابلِ توجہ بات نہیں۔ اسے محض کلامِ منظوم کی حیثیت حاصل ہے

"سدا سہاگ" دراصل ملک میں عام آگاہی پیدا کرنے۔ خواتین کو تعلیم کی طرف راغب کرنے۔ جہالت اور مذموم رسم و رواج کا خاتمہ کرنے کی کوششوں کا ایک حصّہ ہے۔ اگرچہ بظاہر اس تصنیف کا مقصد انعام حاصل کرنا تھا لیکن محض انعام کا حصول نصیر الدین محمد کا مقصد نہیں تھا۔ اس عہد کے دوسرے مخلص اور سمجھ دار آدمیوں کی طرح وہ بھی اپنی قوم کی خدمت کرنا چاہتے تھے اور خدمت کے لیے انھوں نے یہ پیرایہ اختیار کیا جس میں ہم خرما و ہم ثواب دونوں پہلو تھے۔

گورنمنٹ عالیہ نے واسطے مدارس نسواں کے خرید فرمائیں۔ دوسرا ایڈیشن جو کتب خانہ خاص کی زینت ہے گورنمنٹ الہ آباد کا شائع کردہ ہے مگر اس پر کوئی تاریخ درج نہیں ہے۔ کتاب کے تاریخی نام "قسمت کا ستارہ" سے ۱۲۸۷ھ برآمد ہوتے ہیں جو ۱۸۷۰ء سے مطابق ہیں۔ دوسرا ایڈیشن شاید اس کے بعد ہی شائع ہوا ہوگا۔ بہرحال ملک میں تعلیم عام کی یہ کوشش اب بھی قابلِ توجہ ہے۔

ڈاکٹر جمیل جالبی

نئے عالمی تناظر میں ادب کا کردار

(ایک بحث)

بعض موضوعات ایسے ہیں جن پر بار بار سوچنے اور لکھنے کی ضرورت ہوتی ہے "عصرِ حاضر میں ادب کا کردار" ایک ایسا ہی موضوع ہے۔ پچھلے دنوں مظفر علی سید صاحب نے "حلقۂ اربابِ ذوق" لاہور کے سالانہ جلسے میں جو خطبۂ صدارت پیش کیا وہ بھی اسی موضوع پر تھا جس میں انھوں نے تخلیقِ ادب کے تعلق سے چند مفید باتیں کیں۔ اتفاق دیکھیے کہ محترم صفدر میر صاحب کو ان باتوں میں قرونِ وسطیٰ کے شعوری ڈھانچے کو عصرِ حاضر میں کھپانے کی نہ صرف فرسودہ کوشش نظر آئی بلکہ ایک مضحک سے سوانگ کا بھی احساس ہوا۔ اصل میں یہ ساری گڑبڑ اس بات سے پیدا ہوئی کہ صفدر میر صاحب نے اس ساری بحث کو ادب برائے ادب اور ادب برائے زندگی کی بحث میں الجھا دیا جس کا نہ موقع محل تھا اور نہ ضرورت تھی۔ یہ بحث، جیسا کہ سب کو معلوم ہے۔ قرونِ وسطیٰ کے شعوری ڈھانچے کی طرح اب نہ فرسودہ بلکہ متبذل ہو چکی ہے۔ اسی کے ساتھ انھوں نے اس بحث کو ایک ہی سانس میں "ترقی پسندی" اور "جدیدیت کے چکّے پر لپیٹ دیا۔ جناب زینو (محترم صفدر میر صاحب) نے لکھا کہ "ایسے نقاد بھی تھے جو سرے سے اس خیال ہی کے مخالف تھے کہ ادب کا معاشرے کی زندگی سے بھی کوئی رشتہ ہونا چاہیے۔ ان نقادوں کی رائے تھی کہ ادب اور معاشرتی حقائق کے درمیان کوئی رشتہ قائم کرنے سے ادب میں سیاست کا عمل دخل شروع ہو جاتا ہے۔ چنانچہ اسے پروپیگنڈا ٹھہراتے ہوئے اس پر قدغن لگانا ضروری ہے۔ ان نقّادوں کے نزدیک ادب کو معاشرے کے کسی فرد کی عکاسی کرنے کے بجائے انسانی تجربے کی ایسی ارفع سطحوں کا آئینہ ہونا چاہیے جن کا روزمرّہ زندگی کے تضادات اور آویزشوں سے کوئی واسطہ نہ ہو۔ یہ آخر الذکر ادب سیاسی پروپیگنڈے اور ہنگامی تخلیقات کی حدود میں آتا ہے جب کہ ادبِ عالیہ کا تعلق ادبی اور جاودانی تصوّرات کی لطیف دنیا سے ہے۔" زینو صاحب نے یہ بات لکھتے ہوئے کسی ادیب کا نام نہیں لیا۔ اس لیے کہا نہیں جا سکتا کہ یہ کس نقّاد کے خیالات انھوں نے کہاں سے پیش کیے ہیں؟ میرا خیال ہے کہ وہ ادب کے تعلق سے گزشتہ پچاس سال کی ادبی تنقید سے کسی ایسے قابلِ ذکر نقّاد کا حوالہ نہیں دے سکتے جس نے ادب کے سلسلے میں یہ بات کہی ہو۔ یہ کیسے ممکن ہے کہ عہدِ حاضر کا کوئی نقّاد یہ بات کہے کہ "ادب کا روزمرّہ زندگی کے تضادات اور آویزشوں" سے کوئی تعلق نہیں ہونا چاہیے۔ اور یہ کہ "ادبِ عالیہ کا تعلق ادبی اور جاودانی تصوّرات کی لطیف دنیا سے ہے"

جیسا کہ آپ سب جانتے ہیں کہ کم و بیش سارے ادیب ابتدا میں "ترقی پسندی" سے ہو کر گزرے یا نکلے ہیں۔ ۱۹۳۶ء کی ترقی پسند تحریک سے ادب کو دورِ قدیم سے نکال کر جدید دور میں داخل کیا ہے اور ادب کو زندگی کے مسائل سے وابستہ کر کے ادب و فکر کو ایک نیا شعور اور ایک نیا رنگ دیا ہے۔ لیکن جب ترقی پسند تحریک کمیونسٹ پارٹی کی ذیلی شاخ بن گئی اور ادیبوں کو پارٹی لائن کے مطابق ہانکا جانے لگا تو بہت سے بلکہ اکثر ادیب اس سے الگ ہو گئے اور ۱۹۵۰ء تک اس تحریک کی فعالیت ختم ہو گئی۔ ترقی پسند ادیب پارٹی کی ہدایات کے مطابق عام طور پر ان بین الاقوامی مسائل پر اپنا نقطۂ نظر پیش کرتے جو روسی حکمتِ عملی کے مطابق یا اس کی حمایت میں ہوتا۔ ویٹ نام اور کیوبا کی حمایت کی مثالیں ہمارے سامنے ہیں۔ ہنگری کے مسئلوں میں ہمارے ترقی پسندوں نے کوئی آواز نہیں اٹھائی۔ اسی طرح افغانستان میں خود روس براہِ راست ملوث تھا اور کشمیر پر ماسکو کے عزیزوں نے اقوامِ متحدہ کی قرار دادوں کو نظر انداز کر کے قبضہ اور کشمیریوں کو حقِ خود ارادی سے محروم کر رکھا تھا۔ مظفر علی سیّد صاحب نے اپنے خطبے میں اسی صورتِ حال کی طرف توجہ دلائی تھی۔ اور دوسری باتوں کے ساتھ ساتھ راجندر سنگھ بیدی کے افسانے اور استعفیٰ دینے کا ذکر کیا تھا اور بالواسطہ یہ سوال اٹھایا تھا کہ اگر ویٹ نام کی حمایت میں نظمیں لکھی جا سکتی ہیں، قرار دادیں منظور کی جا سکتی ہیں۔ لاہور، کراچی میں جلوس نکالے جا سکتے ہیں تو آخر افغانستان اور کشمیر کے سلسلے میں یہ کیوں نہیں ہوا؟ ظلم تو آخر ظلم ہے خواہ وہ کوئی بھی کرے۔ زیبو صاحب نے صرف یہ کہا (اور اس کی وضاحت بھی نہیں کی) کہ جس حقیقت کے ادراک سے مظفر علی سیّد صاحب عاری نظر آتے ہیں وہ یہ ہے کہ آخر کن اسباب کی بنا پر یہ دو مسائل ہمارے ادیبوں کے تخلیقی شعور سے خارج رہے ہیں۔" اگر وہ ان اسباب پر بھی روشنی ڈال دیتے تو بھر بات کے سمجھنے میں آسانی ہوتی۔ ویٹ نام میں امریکی ظالموں نے سفاکی و بربریت کی انتہا کر دی تھی اور دونوں کو عوامی قوت کے سامنے ہتھیار ڈال کر بھاگنا پڑا تھا۔ افغانستان میں دس لاکھ مرنے والے تعداد کے اعتبار سے اتنے کم تو نہیں تھے کہ حیوانِ ناطق کی انسانی روح مرتعش نہ ہو۔ اسی طرح ہزاروں کشمیریوں کا قتلِ عام، گھروں کی آتش سوزی اور ظلم و جبر ایسا مستحسن فعل تو نہیں ہے جس پر خاموشی اختیار کر لی جائے۔ اگر پاکستان یہ کام کرتا تو میں بہ حیثیت ایک ادیب، ایک دانشور اس کے خلاف بھی آواز اٹھاتا۔ اصل مسئلہ انسان اور انسانیت کا ہے، اور انسان تیتر بٹیر نہیں ہیں جن کے شکار کی کھلے موسم میں اجازت دے دی جائے۔ انسان جہاں بھی ہیں، خواہ وہ گورے ہوں یا کالے، انسان ہیں اور ان کا دکھ درد پارٹی لائن سے الگ ہٹ کر، یقیناً ہمارا دکھ درد ہے۔ یہ شعور ہر ادیب اور ہر دانشور کے اندر ہونا چاہیے — جب تک یہ واقعات خارج سے باطن میں سرایت نہیں کرتے، ادیب کا شعور بے آب، بنجر اور خشک رہتا ہے۔ ادب میں اسے آنا چاہیے۔ یہ کب اور کیسے اور کس طرح ادیب بنتا ہے۔ اس کا پتا ہر صاحبِ شعور ادیب کو ہوتا ہے۔ آزادی کے ساتھ پھوٹنے والے ہندو مسلم فسادات کے بارے میں جو کچھ لکھا گیا اس میں کرشن چندر کا افسانہ "پشاور ایکسپریس" بھی تھا اور شاہد احمد دہلوی کی "دلّی کی بپتا"، منٹو کے "سیاہ حاشیے" اور قدرت اللہ شہاب کا "یا خدا" بھی تھے۔ "دلّی کی بپتا"، "سیاہ حاشیے" اور "یا خدا" آج بھی ادب ہیں جب کہ "پشاور ایکسپریس" کو اب پڑھنا بھی مشکل ہے۔

مظفر علی سیّد صاحب نے اپنے خطبے میں جن امور کی طرف اشارہ کیا تھا ان کا تعلق بنیادی طور پر ادب اور تخلیقی ادب کے مسائل سے تھا۔ مثلاً انھوں نے کہا کہ "جماعتی سیاسی مفادات، ادب کو ایک آلۂ کار کے طور پر استعمال کرنے کی طرف راغب ہوتے ہیں۔" ادب کو

ں سطح پر اس طور سے استعمال کر کے یقیناً ادب تخلیق نہیں کیا جا سکتا۔ یہ صحافت ہے۔ اور اگر ادیب صحافت کر رہا ہے تو ضرور کرے
ں میں کوئی مضائقہ نہیں ہے لیکن اسے ادب نہیں سمجھنا چاہیے۔ ساری گڑبڑ یہیں سے شروع ہوتی ہے۔ جب ہم صحافت کو ادب
مجھنے لگتے ہیں۔ دونوں کے حدود، دونوں کے دائرۂ کار الگ الگ ہیں اور دونوں کی اپنی اپنی جگہ اہمیت ہے۔ ژاں پال سارتر
ب فلسفی، ادیب، دانشور بھی تھا اور ایک "عمل کار" (ACTIVIST) بھی۔ اپنے آدرشی نظریات کا اظہار اس نے اکثر
بارہ مضامین اداریوں اور بیانات میں کیا ہے۔ الجزائر کی آزادی کی جنگ فرانس کے خلاف فرانس میں لڑی ہے۔ فرانسیسی
ن کنوں کی وفات پر جلسے جلوس نکالے ہیں LA CAUSE DU PEUPLE میں مضامین لکھ کر اپنا مخصوص نقطۂ نظر پیش
ہے اور ان اخباروں کو پولیس کی نظروں سے بچا کر پر ہجوم بازاروں میں خود فروخت کیا ہے۔ لیکن ان تحریروں کو اس نے
ی ادب نہیں کہا۔ ۱۹۷۰ء میں جب وہ جنگجویانہ (MILITANT) سرگرمیوں میں مصروف تھا اسی زمانے میں وہ فلابیئر
ے بارے میں اپنی تیسری جلد پر کام کر رہا تھا جو بعد میں "دی فیملی ایڈیٹ" کے نام سے شائع ہوئی۔ اس کے ماؤسٹ (MAOIST)
تھی اس نوع کے ادبی کام کے خلاف تھے۔ وہ چاہتے تھے کہ سارتر ایسے مقالے لکھے جن سے یہ جنگجویانہ سرگرمیاں تیز ہوں یا پھر
وام کے لیے ناول لکھے۔ سارتر نے اس دباؤ کو قبول نہیں کیا اور کہا کہ "جو طریقِ کار (METHOD) میں نے اس کتاب میں
یار کیا ہے اس سے میں خود کو لمحۂ موجود (IMMEDIATE PRESENT) میں محسوس کرتا ہوں" سارتر ان جنگجویانہ اور
سرگرمیوں سے دانشور اور عوام کو ایک اکائی بنا دینا چاہتا تھا۔ اسی سال جب پیرس کی پولیس نے جیسمار (GEISMAR)
کو گرفتار کر لیا تو سارتر نہ صرف احتجاجی جلوس میں شریک تھا۔ بلکہ رینالٹ کمپنی کے باہر ایک پیپے پر کھڑے ہو کر اس نے تقریر
کرتے ہوئے کہا کہ "اس کا فیصلہ تو آپ خود کریں کہ جیسمار (GEISMAR) کا طریقِ کار صحیح تھا یا غلط تھا؟ میں جو کچھ کر رہا
ہتا ہوں وہ یہ ہے کہ سڑک پر کھڑے ہو کر اس بات کی گواہی دوں کیوں کہ میں ایک دانشور ہوں اور میں سمجھتا ہوں کہ وہ رشتہ
انیسویں صدی میں عوام اور دانشوروں کے درمیان قائم تھا۔ یہ رشتہ ہمیشہ موجود نہیں رہا ہے لیکن جب بھی قائم ہوا
اس کے بہت اچھے نتائج برآمد ہوئے ہیں۔ اس کی آج تجدید کی جائے۔ کوئی پچاس سال تک عوام اور دانشور ایک دوسرے
الگ رہے ہیں۔ اب انھیں ایک دوسرے سے جڑ جانا چاہیے۔ اب انھیں مل کر ایک اکائی بنانی چاہیے۔" اس پر فرانس
بولسٹ پارٹی نے کہا کہ "دانشوروں اور عوام کے درمیان رشتہ یقینی طور پر پہلے سے موجود ہے۔ اور وہ اس طرح موجود ہے
انشوروں کی ایک بڑی تعداد خود "پارٹی" کی ممبر ہے۔ یہی وہ زاویۂ نظر ہے جس نے ادیب کو پارٹی سے برگشتہ کیا ہے۔ اور
بات کو مظفر علی سید صاحب نے اپنے انداز میں ان الفاظ میں کہا ہے کہ "جماعتی سیاسی مفادات ادب کو ایک آلۂ کار کے
طور پر استعمال کرنے کی طرف راغب ہوتے ہیں۔" پارٹی کا رکن ہو کر سیاسی رشتہ تو قائم ہو سکتا ہے لیکن دانشور اور عوام کا
ہ اسی وقت قائم ہو سکتا ہے جب وہ مل کر ایک وحدت، ایک اکائی بن جائیں۔ یہی وہ حقیقی رشتہ ہے جو بڑے ادب کی تخلیق کا موجب
ہے۔

ادب کو پارٹی کی حوالات میں محصور نہیں کیا جا سکتا۔ حقیقی ادب تو ہمیشہ ہی حکومت و اقتدار کے بائیں طرف ہوتا ہے۔ بلکہ بائیں
ت کے بھی بائیں طرف ہوتا ہے اور اسی رویے کی وجہ سے مظفر علی سید صاحب نے اپنے خطبے میں کہا ہے کہ: "زندگی کے کسی مرحلے

ہیں ادیب کو کسی نہ کسی پارٹی سے تھوڑی بہت مشروط ہمدردی ہو سکتی ہے۔ لیکن غیر مشروط غلامی کسی سیاسی، نیم سیاسی جماعت
ہو یا ترقیاتی وسائل کی، کسی ادیب کے شایانِ شان نہیں۔ وہ تو پہلے ہی سے ایک ایسے معاشرتی نظام کی اسیری کے خلاف
جدوجہد میں مصروف ہوتا ہے جو اس کے چوگرد محیط ہے اور جس میں رہتے ہوئے اس کا دائمی منصب یہ ہے کہ اس معاشرے
قید خانے سے اپنے تخیل کی مدد سے باہر نکلے اور باہر کی دنیا کا منظر سب کو دکھاتا رہے۔" میرا خیال ہے کہ محترم صفدر
صاحب اس بات سے اتفاق کریں گے کہ مظفر علی سید صاحب نے کہیں بھی ادب کا رشتہ روزمرّہ کی زندگی سے، زندگی کے تا
اور آویزشوں سے منقطع نہیں کیا بلکہ تبلیغانی صحافت اور تخلیقی ادب کے بنیادی فرق کو واضح کر کے آج کے ادب کے
کے پیشِ نظر یہ بنیادی سوال اٹھایا ہے کہ "کیا ہمارا اجتماعی تصوّرِ حیات کافی حد تک وسیع نہیں یا ہم اپنے تجربات
کو اپنی شخصیت میں جذب نہیں کر پاتے۔ آخر کوئی وجہ تو ہو گی کہ ایک طرف ہمارا ادب زندگی سے بیگانہ ہے اور دوسری
ہمارا معاشرہ ادب سے بیگانہ ہے۔"

اب جب کہ روس میں جناب میخائیل گورباچوف کے زیرِ اثر روس کے نظامِ حیات کی قلب ماہیت ہو رہی ہے۔
اب جب کہ مشرقی یورپ، روس سے الگ ہو کر اس کیمونسٹ نظام کو مسترد کر چکا ہے جسے وہ دوسری جنگِ عظیم کے بعد
اوڑھے ہوئے تھا، وہاں بھی آزادی کی فضا میں نئے نئے سوالات اٹھ رہے ہیں۔ اب روس اور مشرقی یورپ میں آزادی
اور نئے حالات میں دانشور، ادب وفن کے کردار کے بارے میں نئی نئی باتیں ہو رہی ہیں اور وہ باتیں کی جا رہی ہیں جن
سے پہلے بات کرنا رجعت پسندی یا کفر کے مترادف تھا۔ کیا برِّصغیر کے ترقی پسند اب بھی اسی طرح پرانی لکیر کو پیٹتے رہیں گے او
کہتے رہیں گے کہ "سوشلزم بہ حیثیت ایک نظریہ اور سیاسی معاشی نظام کے ختم نہیں ہو رہا ہے بلکہ سوسائٹی سوشلسٹ حق
کے حوالے سے اپنا چولا بدل رہی ہے۔" حقیقت یہ ہے کہ یہ نظام اندر سے ٹوٹ چکا ہے۔ یہ نظام بدلتی زندگی کا ساتھ دینے سے معذ
ہو گیا ہے۔ اسے جو کچھ کرنا تھا وہ کر چکا ہے اور اب غلط یا صحیح وہ اس آزاد نظام کی طرف جا رہا ہے جو مغربی یورپ اور امریکہ
پھل پھول رہا ہے۔ خود سرمایہ دارانہ، باطل استحصالی نظام نے سوشلسٹ نظام سے نہ صرف بہت کچھ حاصل کیا بلکہ آزادی کے
میں اس کے بنیادی عناصر نے جذب کر کے فلاحی ریاست کے تصوّر کو اپنا لیا۔ سوشلسٹ نظام میں نجی ملکیت کے تصوّر کی نفی بھی
تھی۔ آورشی نظریات کے فروغ کے لیے آزادیٔ رائے پر پابندی ایک غیر فطری بات تھی جس نے معاشرتی شعور کو محصور و مجبو
کر دیا تھا اور اس کے منفی اثرات جلد یا بدیر سامنے آنے تھے جو خروشچیف کے دَور سے شروع ہو کر گورباچوف کے دَور تک وا
ہو گئے۔ اب تیسری دنیا والوں اور بالخصوص برِّصغیر کے دانشوروں کو سوچنا چاہیے کہ اب انھیں کون سا راستہ اختیار کرنا چاہیے؟
جناب صفدر میر نے اپنے ایک اور مضمون میں پروفیسر ملن لیوکس (MILAN LUKES) کے جو اقتباسات نقل کیے ہیں وہ اد
اور فن کے حوالے سے ان نئے رجحانات اور سوالات کی ترجمانی کر رہے ہیں جو وہاں پوچھے اور اٹھائے جا رہے ہیں۔ حال ہی میں پروفیسر ملن لیوکس نے

"کلچر، اقدار و خیالات کے کھلے نظام میں کام کرتا ہے جسے مسلسل پروان چڑھانے اور اس میں اضافہ کرنے کی ضرورت پڑتی
ہے جب کہ آئیڈیالوجی (آدرش) پارٹی کے عہدے داروں کے مطابق منصوبوں اور مسلّمات کا ایک ایسا جامد نظام
سمجھا جاتا ہے۔ جس میں تجدید کی گنجائش نہیں ہوتی ... لہٰذا میں سمجھتا ہوں کہ کلچر کی تطہیر اور اس کا تزکیہ وقت کی پکار ہے۔"

پروفیسر صاحب نے مزید کہا کہ:

"آگے بڑھنے اور ترقی کرنے کے لیے ہمیں آ[..] نئی روشنی اور راہ لیتے بدلتے غیر مستقل آدرشی ملاحظات سے بچایا جانا چاہیے۔ فن کارانہ اظہار کی آزادی کے اخلاقی و قانونی حدود تو ہو سکتے ہیں۔ لیکن ان کے علاوہ کوئی اور پابندی عائد نہیں کی جا سکتی۔"

اور پھر یہ بھی کہا کہ:

"میں نے عرصہ ہوا سمجھ لیا تھا کہ پارٹی وفاداریوں کو ہماری سوسائٹی یا افراد کی زندگی کے مستقبل کی تشکیل و ترقی میں کوئی بہت اہم کردار ادا نہیں کرنا چاہیے۔"

صفدر میر صاحب کے مطابق یہ وہ نیا اندازِ نظر ہے جو سوشلسٹ ممالک میں "نوسوشلزم" اور "نو مارکسزم" کے ثقافتی آدرشوں کے تعلق سے سامنے آ رہا ہے۔ یہ ہمارے۔ نئے بدلے ہوئے عالمی پس منظر اور پروفیسر ہلن لیوسس کے خیالات کی روشنی میں اگر آج ہم ان تحریروں کو توجہ سے پڑھیں جو برِ صغیر میں "ترقی پسندی" سے منسوب کی جاتی رہی ہیں تو وہ آج ہمیں بنیادی طور پر بے اثر و بے معنی سی نظر آئیں گی۔ اب ضرورت اس بات کی ہے کہ ان تحریروں کو دوبارہ توجہ سے پڑھا جائے جنھیں پارٹی لائن کے مطابق ہم "ترقی پسندی" کے خلاف سمجھتے رہے ہیں۔ اور جو ادب کے تعلق سے گزشتہ پچاس سال میں لکھی گئی ہیں۔ یہ تحریریں نئے عالمی پس منظر میں آج زیادہ بامعنی نظر آتی ہیں۔ اور یوں معلوم ہوتا ہے کہ اب پاکستانی ادب میں نو سوشلزم (NEO SOCIALISM) کا سورج انھیں تحریروں کے حوالے سے شروع ہو گا۔

یہ سطور میں نے نہ تو مظفر علی سید صاحب کی حمایت میں لکھی ہیں اور نہ محترم صفدر میر صاحب کی مخالفت میں جن کی تحریریں میں گزشتہ چالیس سال سے دل چسپی سے پڑھ رہا ہوں۔ ان سطور کا مقصد صرف و محض یہ ہے کہ اس بدلتے ہوئے عالمی منظر میں ادب، کلچر اور اس کے مسائل کا دوبارہ جائزہ لیا جائے۔ میں نے خود کو "اصطلاحی معنی" میں نہیں بلکہ "لغوی معنی" میں ہمیشہ پروگریسو (PROGRESSIVE) سمجھا ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ کوئی بھی سچا ادیب پروگریسو (PROGRESSIVE) کے علاوہ کچھ اور نہیں ہو سکتا۔ اور میرے نزدیک پروگریسو کے معنی ہیں زندگی کو آگے بڑھانے والا، جامد زندگی کو متحرک کرنے والا، آزادیِ اظہار کی حمایت کرنے والا، معاشی و سماجی مساوات کا حامی، جبر و استحصال، دولت کے ارتکاز اور استعماریت کا دشمن۔ ادب اسی لیے زندگی کو آگے بڑھاتا ہے، شعورِ انسانی کو پروان چڑھاتا ہے، تاریخی دھاروں کو اجاگر کرتا ہے، نئے خواب دیکھتا اور دکھاتا ہے۔ زندگی میں نئے معنی کی تلاش کرتا ہے، عوام اور زندگی سے رشتہ استوار کر کے نہ صرف معاشرے کو بدلتا ہے بلکہ اس کی تشکیل نو بھی کرتا ہے۔ کسی پارٹی کو یہ اختیار نہیں دیتا کہ وہ اس کی سوچ اور اس کے اندازِ فکر کا راستہ متعین کرے۔ جب ادیب پارٹی کی دلدل میں دھنس جاتا ہے تو پھر وہ ادب سے کٹ جاتا ہے۔ روس میں ادب کے ساتھ یہی ہوا۔ اور بورس پاسترنک اسی لیے روس میں ہائیر، بازو کا دانشور ہو کر امر ہو گیا۔
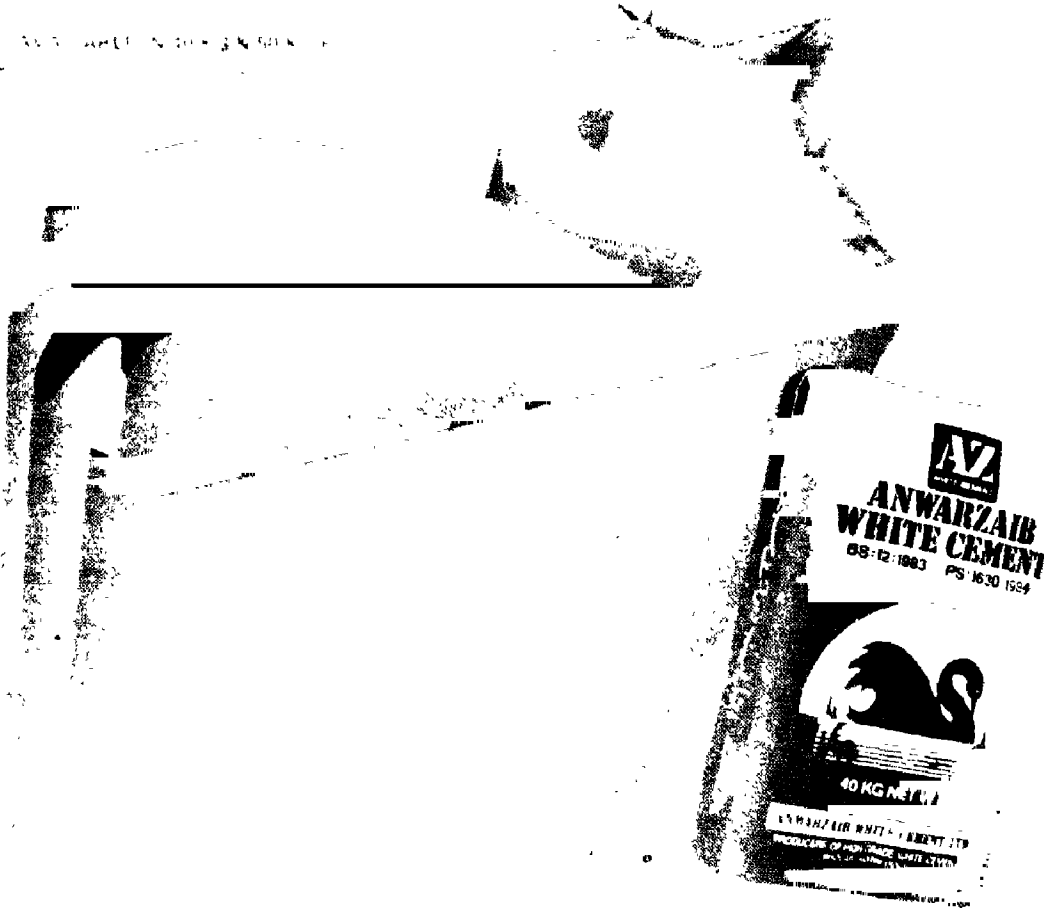
پروفیسر اسلوب احمد انصاری

اقبال کی شاعری میں لالہ کی علامت

انتقادی بصیرت اور بے لاگ پن کا لازمی اقتضا ہے کہ یہ امر بلا تذبذب اور بغیر ذہنی پس و پیش کے تسلیم کر لیا جائے، کہ اقبال کے ہاں شعری ابلاغ اور ترسیل کی دونوں سطحیں موجود ہیں یعنی ان کے ہاں بیان کی شاعری بھی ہے جو اپنی جگہ حسن و خوبی، خطیبانہ رنگ اور فنی استحکام و انصرام بھی رکھتی ہے، اور ایک طرح کی بدیہیت یعنی EXPLICITNESS بھی؛ اور وہ بھی جسے بالعموم POETIC STATEMENT کہا جا سکتا ہے جو رمز و ایمائیت سے متصف ہے اور اسی کی بدولت وجود میں آتی ہے۔ پہلی قسم کی شاعری میں بندھے ٹکے عقیدوں اور نظریاتی وابستگی کا انعکاس ملتا ہے۔ کہیں انتہائی براہِ راست انداز میں اور بے تکلفی اور سپاٹ پن کے ساتھ، جیسے شروع کی دو فارسی مثنویوں "اسرارِ خودی" اور "رموزِ بے خودی" جو زیادہ سے زیادہ ایک قسم کا نظریاتی چوکٹھا یعنی IDEATIONAL FRAME WORK فراہم کرتی ہیں اور جنھیں اچھی شاعری کے زمرے میں بمشکل ہی لایا جا سکتا ہے کہ ان میں بس کہیں کہیں شاعری کی جوت جگائی گئی ہے۔ اور کہیں کسی قدر معنی آفرینی اور متوازن لب و لہجے کے ساتھ۔ دوسری جانب ایسی نظموں کی تعداد بھی کم نہیں جن کے سلسلے میں عقیدے اور علم کا سوال بنیادی اور اہم نہیں ہے۔ بلکہ جن میں ایک طرح کا اسطوری رنگ جھلکتا ہے۔ بہ الفاظِ دیگر یہ اس فنی شعور اور بصیرت کی آفریدہ ہیں جس پر ابھی تجربے اور تفلسف کی پرچھائیاں نہیں پڑی ہیں۔ انسانی فکر کے دورِ آغاز میں شعریات کے سلسلے میں حکیم ارسطو نے اس رائے کا اظہار کیا تھا کہ کسی بھی اہم اور ممتاز شاعری کی پہچان اور شناخت کا سب سے بڑا وسیلہ اس کے ہاں استعارے کا عمل ہے۔ اور یہی ہمارے تنقیدی فیصلے کو بڑی حد تک متعیّن کرتا ہے۔ استعارہ، تشبیہہ، رمز بلیغ، تمثیل اور مجازیہ ان سب کی جڑیں موازنے کے عمل میں پیوست ہیں۔ اور یہ سب ایک وسیع استعاراتی رقبے میں سلسلے وار ایسے دائرے بناتے ہیں جو ایک دوسرے کو محیط بھی ہیں اور ایک دوسرے سے نقطۂ انقطاع بھی رکھتے ہیں۔ علامت ایک لحاظ سے ان سب سے بڑھ کر ہے۔ اس کی جامع و مانع تعریف یہ ہے کہ اس میں موجود یعنی GIVEN ہمارا نقطۂ آغاز ہوتا ہے۔ لیکن ہم اس سے گزر کر زیادہ واقعی دنیا میں رسائی حاصل کر لیتے ہیں۔ جب کہ اس کے برعکس مجازیہ میں ہم جہاں تک پہنچنا چاہتے ہیں۔ اس پر لفظ حقیقت کا اطلاق نہیں کیا جا سکتا۔ علائم کے استعمال کے دوران مدرکات میں ٹھہراؤ اور انجماد بھی ہوتا ہے اور ایک طرح کی

نمایت بھی مفروضے کے طور پر موجود رہتی ہے۔ انھیں بروئے کار لانے کا جواز بظاہر کفایت یعنی ECONOMY کا حصول ہے لیکن س کے توسط سے دراصل ہم ان کیفیات کا ادراک اور احاطہ کر سکتے ہیں جو اطلاع، علم، تجربے اور تفتیش کی سرحدوں سے ورا ہیں اور اس لیے ان کی گرفت میں نہیں آسکتیں۔ اس سے قبل یہ کہا گیا تھا کہ اقبال کی بعض نظمیں ایک اسطوری فضا بن سانس لیتی ہیں۔ اس بیان میں یہ اضافہ شاید غیر ضروری نہ سمجھا جائے کہ اس ڈھانچے کے اندر یہ علائم ایک تنظیمی اصول کا وظیفہ ادا کرتے ہیں۔ شاعری کی بعض اصناف کا سروکار 'واقعہ' سے بھی ہوتا ہے۔ لیکن ایک اہم اور کھرے شاعر کا واسطہ 'واقعہ' سے اتنا نہیں جتنا اس حسِ معنویت SENSE OF SIGNIFICANCE سے ہوتا ہے جیسے اس کی دور رس نگاہ وقوعات کے سلسلے کے پس پشت متعین اور منکشف کرتی ہیں۔ اس لیے کہ یہاں سارا معاملہ بظاہر متضاد اشیا اور عناصر کے مابین مشابہتوں کی تلاش نہیں ہے بلکہ امکان یعنی POSSIBLE کا ادراک کرنا اور ان موجودات یعنی PRESENCES اور ان توانائیوں یعنی POTENCIES کی نشاندہی کرنا جو آغازِ کار میں پیشِ نظر تھیں اور جنھیں ممیز کرنا متشکل وصورت در ہیولے عطا کرنا اور ان کے توسط سے اہم حقیقتوں سے ارتباط قائم کرنا شاعری کا ایک قابلِ لحاظ تفاعل ہے۔

اقبال نے اپنی شاعری میں جن علامتوں سے کام لے کر معانی اور مفاہیم کی تبلیغ اور ترسیل کا حصول مدنظر رکھا ہے ان میں ایک اہم علامت یا کلیدی نشان "لالہ" ہے جس کی تکرار مختلف سیاق وسباق میں ملتی ہے۔ لالہ وگل ہمارے شعری روایت کے جانے پہچانے، مانوس، معروف اور مقبول نشان رہے ہیں۔ زیادہ تر ان سے مظاہرِ قدرت کی شادابی اور دل فریبی، تنوع اور گوناگونی اور نمو اور بالیدگی کے عمل کو ظاہر کرنے کا کام لیا گیا ہے یا پھر غزل کی شاعری میں خصوصاً اور متواتر محبوب کے جمال و زیبائی کو متشکل کرنے اور نمایاں کرنے کے لیے بھی انھیں تسلسل کے ساتھ برتا گیا ہے تاکہ حسن و عشق کے پُر پیچ روابط اور کیفیات کی صد رنگ نقش گری کا حق ادا کیا جا سکے لیکن لالہ پر نظر اس طور پر مرکوز نہیں کی گئی جیسا ہمیں اقبال کے ہاں نظر آتا ہے۔ ان کے ہاں یہ گہری رمزیت کا حامل معلوم ہوتا ہے خصوصاً بعد کی شاعری میں اور اس کے استعمال میں ایک ذو معنویت پنہاں ہے۔ سب سے پہلے تو اسے اقبال نے اپنے ہی لیے بطور ایک PERSONA کے استعمال کیا ہے۔ چنانچہ اسرارِ خودی کے آخر آخر میں یہ اشعار ملاحظہ کیجیے:

من مثالِ لالۂ صحرا استم — درمیانِ محفلے تنہا استم
خواہم از لطفِ تو یارے ہمدمے — از رموزِ فطرتِ من محرمے
ہمدمے دیوانۂ فرزانۂ — از خیالِ این و آں بیگانۂ

یہاں اس امر کی صراحت ضروری نہیں کہ 'لالہ' تنہائی اور بیگانگی کی کیفیت کو ابھارتا ہے اور اس کا آئینہ دار ہے۔ اولین نظموں میں سے شمع و شاعر میں جہاں مقصود اپنے نجی اور انفرادی احساسات کو معروضیت بخشنا اور ان میں تنوع پیدا کرنا ہے۔ شاعر کے افسانوی کردار کا یہ خطاب توجہ طلب ہے:

درجہاں مثلِ چراغِ لالۂ صحرا استم — نے نصیبِ محفلے نے قسمتِ کاشانۂ

مدتے مانندِ تو ہم نفس می سوختم　　در طوافِ ام بالے نہ زد پروانۂ
می طپید صد جلوہ در جانِ امل فرسودِ من　　بر نمی خیزد ازیں محفلِ دلِ دیوانۂ

سی کے بالمقابل شمع کے ططنے میں یہ شعر بھی انہی اشعار سے منسلک معلوم ہوتا ہے:

یوں تو روشن ہے مگر سوزِ دروں رکھتا نہیں　　شعلہ ہے مثلِ چراغِ لالۂ صحرا ترا

اقتباس میں 'چراغِ لالۂ صحرا' کی علامت کے استعمال سے ایک دہرا استعارہ پیدا ہو گیا ہے جو برابر نئے نئے معنی کا انکشاف تا ہے۔ 'لالۂ صحرا' کے عنوان سے جو نظم "بالِ جبریل" میں ملتی ہے اس میں اس علامت کی فلسفیانہ ابعاد بہت گہری اور وسیع ئے ہیں۔ غیر شخصی رنگ کی ایک جھلک ہمیں ان اشعار میں بھی ملتی ہے جو "رموزِ بے خودی" کے آغاز میں ملتِ اسلامیہ سے طب ہو کر کہے گئے ہیں:

سوختن چوں لالہ پیہم تا کجا　　از سحر دریوزۂ شبنم تا کجا
عشق را داغے مثالِ لالہ بس　　در گریبانش گلِ یک لالہ بس
من ہمیں گل بد سنارت ترنم　　محشرے بر خوابِ سرشارت زنم
تا ز خاکت لالہ زار آید پدید　　از دمت بادِ بہار آید پدید

ں یہ اضافہ کرنا شاید غیر ضروری نہ سمجھا جائے کہ اولین اردو مجموعۂ کلام "بانگِ درا" میں جس میں اقبال کے بیشتر اہم محرکاتِ ری کی سن گن ملتی ہے۔ لالہ کی علامت ایک طرح کی بدیہی معنویت کی حامل نظر آتی ہے اور ان کی شاعری کے پیلک تفہیم سے کا گہرا علاقہ ہے۔ مجموعی طور پر لالہ علامت ہے شخصیت کی تب و تاب کا اور اس سے رنگ و نور، وحدت و حرارت، روشنی تابت کی کے حسی تلازمات اقبال کے ہاں تقریباً ہر جگہ وابستہ نظر آتے ہیں۔ 'لالہ' کے ساتھ 'چراغ' کا اتصال جو مختلف قعے پر سامنے آتا ہے، قابلِ غور ہے۔ مثلاً نظم "طلوعِ اسلام" کے اس شعر میں "ضمیرِ لالہ میں روشن چراغِ آرزو کر دے چن کے ذرے ذرے کو شہیدِ آرزو کر دے" اسی طرح "بالِ جبریل" کی ایک غزل جو اس شعر سے شروع ہوتی ہے:

پھر چراغِ لالہ سے روشن ہوئے کوہ و دمن / مجھ کو پھر نغموں پہ اکسانے لگا مرغِ چمن" نہ صرف اعلان ہے تبائی کائنات کی سولی اور اس کے رنگ و نور سے شرابور ہونے کا۔ بلکہ اس سے یہ بھی پتا چلتا ہے کہ اقبال کی شاعرانہ حسیت رنگ و بو ہیں بڑھ کر روشنی اور حرارت سے اثر پذیر ہوتی ہے۔ اور یہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ روشنی رنگ سے زیادہ حواس طاقت پر دلالت کرتی ہے۔ یہاں اس غزل میں ہم رفتہ رفتہ رنگ و نور کی اس کائنات سے اندرونی دنیا کے عوامض سرار کی طرف بڑھتے لگتے ہیں۔ "اسرار و رموز" کے بعد "بانگِ درا" کی شاعری میں لالہ کی علامت ایک معروضی منشا تو ر رکھتی ہے لیکن اس میں بہت سی تہیں نہیں ہیں۔ "بالِ جبریل" کی مشہور نظم "طارق کی دعا" کے ان دو مصرعوں میں

خیاباں میں ہے منتظر لالہ کب سے　　قبا چاہیے اس کو خونِ عرب سے

"پیامِ مشرق" کی غزل کے اس شعر کی گونج سنائی دیتی ہے:

عرب از سرشکِ خونم ہمہ لالہ زار بادا عجم رمیدہ بو را نفسم بہار بادا

لالہ محض فرد کی ذات ہی کا نہیں، بلکہ ایک پوری قوم کی تاریخ اور اس کے وجودِ معنوی کی علامت بن کر ابھرتا ہے۔ اشاریت کی یہ تہ اس بے مثل قطعے میں بھی جھلکتی ہے جو اقبال نے حالی کے بارے میں لکھا تھا جس میں مسلمانوں کے ملی وجود کو حرارت و توانائی سے سرشار کرنے میں سرسید اور حالی کے کارناموں کی طرف بلیغ اشارہ کیا گیا ہے:

آں لالۂ صحرا کہ خزاں دیدہ و بیفسرد
سید ادوا نے از اشکِ سحر داد
حالی ز نواہائے جگر سوز نیاسود
تا لالۂ شبنم زدہ را داغِ جگر داد

بہ الفاظِ دیگر لالہ اس خونِ ناب کا مظہر بن جاتا ہے جو فرد ہی کے لیے نہیں، بلکہ ملی شخصیت کے ارتفاع اور برانگیختگی، اس کے نمو اور پرداخت کے لیے ضروری ہے۔ لیکن نظم "ساقی نامہ" میں یہ مصرعِ "شہیدِ ازل لالۂ خونیں کفن" علامت اور استعارے سے بڑھ کر اسطور کا درجہ حاصل کر لیتا ہے۔ کیوں کہ یہاں لالۂ زندگی کے سوز و ساز پر مستزاد ایک طرح کی آفاقیت کا حامل بن جاتا ہے۔ اور انسان کے نفس میں مستتر توانائیوں کی طرف ذہن کو منتقل کر دیتا ہے جو پامال ہونے کے باوجود از سر نو زندہ ہوتی رہتی ہیں۔

"لالہ" کی علامت کی شعلہ سے نسبت "پیامِ مشرق" میں انگریزی شاعر بائرن کے بارے میں اس شعر میں نمایاں کی گئی ہے: "مثالِ لالہ و گل شعلہ از زمیں روید / اگر بخاکِ گلستاں تراود از جامش" لالہ کے سینے میں جو داغ ہے وہ برابر شاعروں کی توجہ اپنی جانب کھینچتا رہا ہے۔ عموماً اسے حرماں نصیبی اور دل گرفتگی کا ایک نقطۂ استشارہ سمجھا جاتا رہا ہے۔ اقبال اسے جذبی زندگی یعنی PASSIONAL LIFE کا مرکز تصور کرتے ہیں۔ پیرایۂ بیان کو بدل کر ہم کہہ سکتے ہیں کہ "لالہ" کے خارجی حسن سے اس کے آتشیں قلب کی طرف ذہنی سفر ایک معنی میں رنگینی و رعنائی سے گزر کر جذبی زندگی کی تندی اور سرشاری سے سروکار رکھنے کے مترادف ہے۔ چنانچہ "زبورِ عجم" کی ایک غزل میں یہ مفہوم اس طرح مترشح ہوتا ہے:

داغے بہ سینہ سوز کہ اندر شبِ وجود خود را شناختن نتواں جز بہ ایں چراغ
اے موجِ شعلہ سینہ بہ بادِ صبا کشا شبنم مجو کہ می دہد از سوختن فراغ

جیسا کہ اس سے پہلے بھی کہا گیا "لالہ" کے لیے دو لفظی مناسبات "چراغ" اور "شعلہ" اقبال برابر لاتے ہیں۔ ہم انھیں سہولت کی خاطر COGNATE اشارے کہہ سکتے ہیں۔ "بانگِ درا" میں مشمولہ نظم "آفتاب" (ترجمہ گایتری) کے مندرجہ ذیل اشعار اسی شاعرانہ رویے کا مظہر ہیں:

وہ آفتاب جس سے زمانے میں نور ہے دل ہے، خرد ہے، روحِ رواں ہے، شعور ہے
اے آفتاب ہم کو ضیائے شعور دے چشمِ خرد کو اپنی تجلی سے نور دے
ہر چیز کی حیات کا پروردگار تو! زائیدگانِ نور کا ہے تاجدار تو

بہت ابتدائی کلام میں ملتی ہے اور اردو ترجمہ ہے سنسکرت کی نظم کا لیکن اس سے یہ ضرور آشکار ہوتا ہے کہ نور کے
ں میں اقبال کے لیے کشش ان کے شعری مزاج کا ایک قابلِ لحاظ عنصر ہے اور یہ آخری وقت تک باقی رہی "ضربِ کلیم"
ظم "شعاعِ امید" جو ایک علامتی نظم ہے۔ اس امر کا بیّن ثبوت فراہم کرتی ہے۔ نہ صرف یہ امر لائقِ توجّہ ہے کہ مندرجہ بالا
اشعار میں "نور" کا لفظ برابر مستعمل ہوا ہے۔ بلکہ یہ بھی کہ یہاں صرف نور سے سروکار مدّنظر نہیں ہے بلکہ اس سے بڑھ کر
ں پر منتشر او ضیائے شعور بھی۔

یہ نور اور شعلہ آفرینی ایک تکوینی قوت ہے، جو کائنات کے رگ و پے میں سمائی ہوئی ہے اور یہ ایک ایسی توانائی یعنی
ENERGY ہے جو نہ صرف ازل سے موجود ہے، بلکہ جیسے دوسری توانائیوں پر اوّلیت اور فوقیت حاصل ہے۔ چنانچہ "پیامِ مشرق"
لالہ، میں اس کا اظہار اس طرح کیا گیا ہے:

آں شعلہ ام کہ صبحِ ازل در کنارِ عشق ... پیش از نمودِ بلبل و پروانہ می تپید

افزوں ترم ز مہر و مہ ہر ذرّہ تن ز نم ... گردوں شرارِ خویش ز تابِ من آفرید

لالہ کا رشتہ عشق کی حرارت سے، جو بلبل اور پروانے کے درمیان مشترک رہی ہے، جوڑا گیا ہے اور شرارے گردوں پر
سے ایک زمانی سبقت حاصل ہے کہ اس توانائی اور مخزنِ نور سے اس نے بھی اکتسابِ فیض کیا ہے لیکن یہ عنصری
جس کا لالہ ایک خارجی پیکر یا طبعی معروض ہے، محض خلا میں معلّق نہیں رہتی۔ فطری کائنات میں اس کا ھبوط یعنی
DESCENT عمل، تخلیق کا ایک لازمی جزو ہے اور اس ھبوط کا ایک منطقی طور پر ایک لازمی نتیجہ اس کی شعلہ سامانی میں ایک
لی کی شکل میں نمودار ہوتا ہے:

در سینۂ چمن چوں نفس کردم آشیاں ... یک شاخ نازک از تہ خاکم چو نم کشید

سوزم ربود و گفت یکے در برم ہائیت ... بیکن دلِ ستم زدۂ من تپا آرمید

وبو کی کائنات میں لالہ کا ھبوط دوگونہ عمل کا سزاوار ٹھہرتا ہے۔ جس ماحول سے اسے سابقہ پڑتا ہے اسے
ارانی زبان میں "نِنگنائے شاخ" سے تعبیر کیا گیا ہے۔ لالہ میں جو توانائی مستتر ہے اسے بہرکیف ایک خارجی ہیئت
ل اختیار کرنا ہے۔ مادی عالم کے معروض اس ہیئت کو ہاتھوں ہاتھ لیتے اور اس کا پرجوش استقبال اور اس کی
ری کرتے ہیں۔ شبنم اس پہ گہرآبدار نچھاور کرتی ہے۔ صبح کی تازگی اور شادابی اس کے لیے اپنا آغوش وا کرتی ہے۔
صبا اس کے اردگرد پروانہ وار رقص کرتی ہے تاکہ یہ عنصری توانائی جو بہ شکلِ لالہ عالمِ آب و گل میں در آئی ہے اس کا
جزو لاینفک بن جائے۔ اور اس ماحول میں اجنبی نہ رہے۔ عناصر کی کائنات میں اس کے ورود سے جو چہل پہل
ھی یک لخت پیدا ہو گئی ہے اسے حسّی طور پر اس طرح متشکل کیا گیا ہے:

تنگنائے شاخ سے پیچ و تاب خورد ... تا جوہرم بہ جلوہ گہِ رنگ و بو رسید

شبنم براہ من گہر آب دار ریخت ... خندید صبح و بادِ صبا گردِ من وزید

لیکن اس هبوط کا ایک لازمی اور ناگزیر نتیجہ اندرونِ سوز و ساز اور دفور و وارفتگی میں کمی کا پیدا ہو جاتا ہے "رجامۂ
ہستی" کی خریداری لالہ کے لیے قاصی گراں اور مہنگی پڑتی ہے "بلبلِ ز گل شنید کہ سوزم ربودہ اند/ نالید و جامۂ ہستی گراں خرید"۔
ب وگل کی کائنات میں ایک بار مقید ہو جانے کے بعد اب اس کے سوا چارہ کار نہیں کہ لالہ خورشید سے اپنا تعلق اور رشتہ
متوار کرے اور اس سے اکتسابِ نور کرتا رہے ۔ تاکہ ازلی اور ابدی توانائی کی جس کا وہ ایک آفاقی مظہر ہے، تجدید ہوتی
ہے۔ اور وہ سوز و حرارت، جس کی کشید اس میں پائی جاتی ہے۔ اس کا تسلسل قائم اور باقی رہ سکے۔ "اگر دہ سینۂ منتِ خورشید کم
آیا بود یا نہ پر انگیزد آتشم" یہ امید کا مظہر بھی ہے اور امکان کی طرف بھی اشارہ کرتا ہے۔ اسی سے مماثل نظم "شبنم" (پیام مشرق)
شروع میں: از خود نہ رمیدم/ تا آفاق پریدم/ برلالہ چکیدم
لالہ مادی کائنات کی رنگا رنگی اور دلفریبی و دلکشی کی ایک روشن علامت ہے لیکن نظم کے آخر آخر میں اقبال
اس محبوب شعری علامت میں ایک انتقال یعنی SHIFT کا تاثر بھی ملتا ہے۔

برخیز و دل از صحبتِ دیرینہ بپرداز

با لالۂ خورشیدِ جہاں تاب نظر باز

نی یہ شخصیت کی تب و تاب کا رمز بن گیا ہے اور برخیز کے فعل میں یہ نکتہ مضمر ہے کہ اب روح صعود یعنی ASCENT کی طرف
و دبھی مائل ہے اور گل کو بھی اس طرف لبھا رہی ہے۔
اس نظم لالہ کو پڑھ کر معاً انگریزی شاعر اینڈریو مارول کی مشہور نظم ON A DROP OF DEW حافظے میں
زہ ہو جاتی ہے۔ جہاں قطرۂ شبنم انسانی روح کے ایک بلیغ اور دبیز اشارے کا حکم رکھتا ہے۔ اس نظم میں انسانی روح
عالمِ بالا میں نمود اور سکونت پھر آب وگل کی کائنات میں اس کا هبوط اور بالآخر اپنے اصلی مستقر اور نقطۂ نمود کی
رف اس کی بازگشت یا مراجعت ایک حلقے میں گردش کی صورت میں دکھائے گئے ہیں اور پوری نظم هبوط / صعود
DESCENT / ASCEN کے مرکز کے گرد و پیش حرکت کرتی نظر آتی ہے۔ انسانی جسم کے لیے جن کے زندان میں روح
عارضی طور پر مقید نظر آتی ہے۔ نارنجی پھول PURPLE FLOWER اور نادمیدہ کلی BLOSSOM GREEN کی
شعری علامات استعمال کی گئی ہیں۔ اقبال نے اپنی نظم میں جس کا کسی قدر تجزیہ سطورِ بالا میں کیا گیا ان دونوں کا متبادل
نگنائے شاخ تجویز کیا ہے۔ یہ فرق بہر کیف پیشِ نظر رکھنا چاہیے کہ مارول کی نظم کے پسِ پشت چونکہ نو افلاطونی تصورات
اس کا شغف ایک شاعرانہ مفروضے کے طور پر موجود ہے اور مارول ان تصورات میں ڈوبا ہوا ہے۔ لہٰذا روح کے لیے
س هبوط کے بعد کائناتِ ازلی و ابدی کی طرف لوٹنا گویا اس کا مقدر ہے جس سے کوئی مفر نہیں۔ اس نظم میں اس امر
بھی زور دیا گیا ہے کہ جسم کے زنداں میں پابستہ رہنا ایک طرح کی اذیت ناک سزا ہے اور اسی لیے قطرۂ شبنم مڑ مڑ کر
عالمِ بالا کی طرف دیکھتا رہتا ہے اور اولین نقطۂ نمود سے تجدیدِ اتصال کا خواہاں رہتا ہے۔ بالآخر سورج کی شعاعیں آسے
نی آغوش میں لے کر اس کا رشتہ ایک بار پھر عالمِ جاودانی سے استوار کرنے کی سعی کرتی ہیں۔ بعینہٖ اس خواہش کا اظہار
قبال کی نظم کے آخری شعر میں بھی کچھ کچھ نمایاں ہوتا ہے۔ اسی کے مثل انگریزی شاعر ولیم بلیک کی نظم بہ عنوان

AH! SUN FLOWE ہے جس میں سورج مکھی کے پھول کو انسان کا استعارہ قرار دیا گیا ہے جو وقت کی حدود میں مقید
ہے اور برابر اس سے چھٹکارا حاصل کرنے کی آس بھی لگائے بیٹھا رہتا ہے۔ سورج مکھی کا پھول عام مشاہدے کے
ابق سورج کی گردش کی مثال مشرق سے مغرب کی طرف اپنا رخ تبدیل کرتا رہتا ہے۔ اور وقت کے قدموں کی چاپ
ان دھرے رکھتا ہے۔ وہ مقامِ آب و گل میں پیوست بھی ہے کہ اس سے قوت نمو حاصل کرتا ہے اور اسی طرح
ان کا اسیر ہے لیکن ٹکٹکی باندھے سورج کی کرنوں کو بھی دیکھتا رہتا ہے اور اس کی یاد ہے۔ وہ ریت کا جویا و
شی ہے۔ بلیک کے اسطوری نظام میں مغرب آزادی، سالمیت اور طمانیت کے احساس کا جغرافیائی نشان ہے۔ اس کے
چاروں سمتیں بڑی معنویت کی حامل ہیں۔ چنانچہ مغرب کی طرف سفر کی نیت دراصل وقت کے بندھنوں سے گلوخلاصی
شاندہی اور ضمانت کرتی ہے۔ آزادی کی اس اقلیم کو بلیک نے 'SWEET GOLDEN CLIME' کا نام دیا جو ازل
ابد اور وقت کی بندشوں کے درمیان معلق انسان کا آخری مامن و مسکن ہے۔

"بالِ جبریل" میں ایک بہت اہم نظم 'لالۂ صحرا' کے عنوان سے ملتی ہے۔ اس میں جس تجربے کی تجسیم و تشکیل کی گئی
وہ کئی لحاظ سے وجودی تجربے کے مماثل اور ہم رنگ ہے اور یہی اس کی تفہیم کے لیے بنیادی تلمیح فراہم کرتا ہے۔ اس
بے میں حیرانی، استعجاب اور ان دونوں سے بڑھ کر اور نمایاں طور پر دہشت، غالب عناصر ہیں۔ یہ وہی 'دہشت'
جس کا احساس اور ادراک فرانسیسی مفکر پاسکل کو مظہرِ محض یعنی PURE PHENOMENA سے اس کے سارے
و جلال اور سیرت کے ساتھ متصادم ہونے پر ہوا تھا۔ اس کا دور دور کوئی تعلق حسی یا جسمانی ڈر اور خوف سے نہیں
۔ بلکہ یہ اس ردِ عمل کی جانب اشارہ کرتا ہے جو انسان کو ماورائیت سے مس سے لازمی طور پر ہوتا ہے اور جس کے
کے طور پر اس کی روح کے سارے تار جھنجھنا اٹھتے ہیں۔ جب لالۂ صحرا کو ایک معروضی ذہنی تصور کرتے ہوئے اقبال
کی زبان سے یہ کہلواتے ہیں: "مجھ کو تو ڈراتی ہے اس دشت کی پہنائی" تو وہ دراصل انسانی سرشت میں پیوست
حس سے اپیل کر رہے ہیں جو انسان کے اندرون میں ایک ہمہ گیر، محیط اور ماورائے حواس حقیقت سے دوچار
نے پر بیدار ہوتی ہے۔ دوسرے شعر میں لالہ یک لخت انسانی روح کی ایک شفاف اور معنی خیز علامت بن جاتا
۔ یعنی جس طرح ماروِل کی نظم میں قطرۂ شبنم یہ رتبہ اور منزلت حاصل کر لیتا ہے۔ اور ذہن برابر اور ہمہ وقت دو
استعاری جہتوں کے درمیان سفر کرتا رہتا ہے۔" چنانچہ اگلے ہی شعر: 'بھٹکا ہوا راہی میں، بھٹکا ہوا راہی تو
منزل ہے کہاں تیری اے لالۂ صحرائی' ایک استعجاب انگیز تاثر سے ہمیں ہم کنار کر دیتا ہے۔ یہ راہ گم کردہ مسافر وہی
جس کا رشتہ ازلی و ابدی کائنات سے یکسر منقطع ہو چکا ہے اور اب زمان و مکان کی حد بندیوں کے باہر وہ اپنی منزل کا
متلاشی ہے۔ یہاں یہ کہنا ضروری معلوم ہوتا ہے کہ یہ احساسِ دہشت مستقبل سے مربوط ہے۔ 'بھٹکا ہوا راہی' کی ترکیب
وجودِ مختلف یعنی THE WHOLLY OTHER سے ہمارے افتراق کے احساس کو تازہ کرتی ہے جس سے ہمارا رشتہ
غیر متناہی تناؤ سے عبارت ہے۔ منزل کے غیر متعین ہونے اور رشتے کے انقطاع سے وہ کیفیت پیدا ہوتی ہے۔
تشویش یعنی ANGUISH، اجنبیت یعنی ESTRANGEMENT اور بے خانگی یعنی HOMELESS NESS کے

سب سے تعبیر کیا جا سکتا ہے۔ اسی طرح اس نظم کے سیاق و سباق میں دہشت یعنی DREAD، عدم وجود یعنی NOTHING
ما ورائیت یعنی TRANSCENDENCE بھی باہم دگر مربوط اور منسلک ہیں۔ استعاری معروض لالہ کی نسبت سے
بے الدیار ہونے اور روح کو کچلنے والی ہولناکی یعنی DREARINESS کا یہ وہی احساس ہے جو انگریزی رومانی شاعر
ورڈزورتھ کے ہاں خصوصاً اس کی عظیم نظم THE PRELUDE میں اکثر مقامات پہ اور دوسری نظموں میں بھی پایا جاتا ہے
اس وجود یعنی EXISTENZ کی طرف جو انسان کی تمام تر آرزوؤں اور تمناؤں کا مرجع اور مورد ہے۔ اس نے اپنے
درون میں ڈوب کر اس طرح اشارہ کیا ہے: OUR DESTINY, OUR NATURE. AND OUR HOME
IS WITH INFINITUDE. AND ONLY THERE.
اس نظم کے تیسرے شعر میں لالہ کے ساتھ شعلے کا لفظ منسلک کیا گیا ہے اور اس کی طرف شروع میں بھی اشارہ کیا جا چکا ہے۔
لیکن یہاں یہ محض شعلہ نہیں بلکہ "شعلۂ سینائی" ہے جو خود متکلم نے بھی اپنی تمنا خستہ کے تعین کے لیے شعلۂ سینائی
کی ترکیب استعمال کی ہے۔ شعلۂ سینائی، جذبۂ پیدائی اور لذتِ یکتائی، تینوں میں لطیف اشارہ مظہریت کے شدید
جذبے یعنی PASSION FOR MANIFESTATION کی طرف مخفی ہے یعنی حقیقت مطلقہ سے اپنے آپ کو ممیز کرنے کا جذبہ، جو اپنی تندی اور
شدت اور بے محابہ ہونے کے اعتبار سے مثل ایک شعلے کے ہے لیکن اس خواہش کی تکمیل اس سلسلے میں جو الی تا تمہ پاتے کی
امید کسی سمت نظر نہیں آتی "پیامِ مشرق" کی نظم "لالہ" میں "تنگنائے شاخ" کی ترکیب لائی گئی تھی۔ جو مادی کائنات کا ایک
غیر مبہم نشان ہے۔ یہاں شاخ سے ٹوٹنا، اپنی انفرادیت کو نمایاں کرنے کی خاطر مطمحِ نظر کی حیثیت رکھتا ہے۔ مظہریت کا
اقتضا یہی ہے کہ محدود وجود اپنے اثبات پر اصرار کرے لیکن غیر ممیز وجود یا ماہیت سے علاحدگی کے باوصف انسان اس
وجود سے ملول بھی ہے AMBIVALENT کیفیت کا استعارہ ہے۔ ہر قطرۂ دریا میں دریا کی ہے گہرائی، اور جو معروض ہم آہنگی کی خواہش سے
کلیتہً مستغنی ہو جائے یا اسے دل سے نکال دے اور تج دے وہ اپنے آپ سے شرمسار نظر آتا ہے۔ اور اسے اپنے آپ میں ایک
نوع کی خوشی یا محرومی کا احساس ہوتا رہتا ہے۔" اس موج کے ماتم میں روتی ہے بھنور کی آنکھ / دریا سے اٹھی لیکن ساحل سے نہ ٹکرائی"
اس منزل پر پہنچ کر یہ گمان ہوتے لگتا ہے کہ اب لالہ کی شعری علامت جو در ماندہ انسان کے لیے استعمال کی جاتی رہی ہے
ایک نوع کی شفافیت حاصل کر چکی ہے یعنی اب استعارے اور مستعار الیہ کے درمیان کوئی تفریق اور بُعد باقی نہیں رہا۔ اب
انسان مرکزِ کائنات بلکہ خلاصۂ کائنات نظر آنے لگتا ہے۔ اور فطری کائنات کے موجودات کی حیثیت ان سیاروں کی سی
رہ جاتی ہے جو سورج کے گرد و پیش رقصاں دکھائی نظر آتے ہیں۔ "ہے گرمیِ آدم سے ہنگامۂ عالم گرم / سورج بھی تماشائی تارے بھی تماشائی"
جو چیز اس نظم کے پراسرار جدلیاتی ارتقا کے دوران شدت کے ساتھ ابھر کر سامنے آتی ہے خالص ہست یعنی ISNESS اور
اس سے بھی زیادہ ماورائے ہست یعنی TRANDENCE سے گہری دلچسپی اور اس میں مکمل انہماک اور یہاں نفس محدود کا علامتی
اظہار لالے کی شکل میں کیا گیا ہے۔ یہاں یہ اضافہ کرنا ضروری معلوم ہوتا ہے کہ اگرچہ مجموعی طور پر اقبال کی شعری کائنات
خدا مرکز یعنی GOD CENTRIC نظر آتی ہے لیکن ان کی اسطوری نظموں میں اس کا مرکزِ ثقل بدل جاتا ہے۔ اور یہ انسان مرکز
یعنی HOMO CENTRIC ہو جاتی ہے۔ اور وہ بنیادی توانائیاں جو اس کے پس پشت موجود ہیں۔ بہت سے دوسرے

ڈاکٹر صدیق جاوید

اقبال اور اقتدار اعلیٰ کا عمرانی زاویہ

اقتدار اعلیٰ ریاست کے عناصر میں نہایت اہم عنصر ہے۔"کیونکہ سیاست میں بنیادی سوال اقتدار اعلیٰ ہی کا ہے۔ باقی تمام اور اسی محور کے گرد گھومتے ہیں۔"[۱] اور اسی لیے یہ فلسفہ سیاست کے حوالے سے ایک عمرانی سوال بھی ہے۔ سیاسیات کے مفکرین نے اقتدار اعلیٰ کی مختلف تعریفیں کی ہیں۔ ژان بودین (۱۵۳۰ - ۱۵۹۶) کو جدید زمانے میں اقتدار اعلیٰ کے نظریے کا پہلا ترجمان کہا جاتا ہے۔[۲] اس کے نزدیک بقول سی۔ ایم۔ جوڈ اقتدار اعلیٰ ایک ایسی برتر قوت ہے جو کسی اور سے اختیار حاصل نہیں کرتی بلکہ خود قانون اور اختیار کا منبع ہے۔[۳] بعد میں ہابز، جان لاک اور روسو نے مختلف عمرانی زاویوں سے اقتدار اعلیٰ کا نظریہ پیش کیا۔" ہابز (۱۵۸۸ - ۱۶۵۱ء) نے سماجی تعلقات کی روشنی میں ایک ایسے اقتدار اعلیٰ کی حمایت کی ہے جو مضبوط و مستحکم اور کسی کے تابع نہ ہو۔[۴] ..." اس کے نزدیک حاکم وقت با اختیار اور اخلاقی نکتہ چینی سے باہر ہوتا ہے۔[۵] لاک (۱۶۳۲-۱۷۰۴ء) نے اپنے دور اور خصوصاً ۱۶۸۸ء کے انگلستان کے حالات کی روشنی میں اقتدار اعلیٰ کا نظریہ پیش کیا۔[۶]" اس کا خیال ہے کہ اقتدار اعلیٰ افراد کی اکثریت کے پاس ہونا چاہیے۔[۷]" روسو (۱۷۱۲ - ۱۷۷۸ء)[۸] نے دستور اساسی کے جو اصول مقرر کیے ہیں ان میں

۱۔ پرویز "انسان نے کیا سوچا"، طبع دوم، ص ۲۱۲

۲۔ Ahmad Ilyas, Sovereignty, Islamic and Modern, Karachi-Hyder Abad 1965, p. 64

۳۔ Joad, op. cit., p. 513-14

۴۔ کرینسٹن، مارس، مرتبہ "مغرب کے سیاسی فلسفی" فیروز سنز، لاہور ۱۹۶۹ء فٹ نوٹ از ترجمہ، ص ۱۰۹

۵۔ کرینسٹن، مارس، محولہ بالا، ص ۱۲۵

۶۔ احمد الیاس (انگریزی) محولہ بالا

۷۔ پرویز، محولہ بالا، ص ۲۱۲ ۸۔ کرینسٹن محولہ بالا، ص ۱۵۳

اقتدارِ اعلیٰ اور حکومت (قوتِ عاملہ) کا فرق خاص اہمیت رکھتا ہے۔ اقتدارِ اعلیٰ کی مالک پوری جماعت ہے۔ برخلاف اس کے حاکم یا سلطان یا عامل وہ فرد ہے یا افراد کا مجموعہ جسے پوری جماعت کی طرف سے یہ خدمت تفویض ہوتی ہے کہ وہ ارادۂ اجتماعی کو جس کا اظہار قانون کی شکل میں ہوتا ہے، عمل کا جامہ پہنائے۔[۹]

اقتدارِ اعلیٰ کے باب میں مغرب کے سیاسی مفکرین کا تصور آسٹن کے مندرجہ ذیل قول میں سمٹ آیا ہے۔ وہ کہتا ہے:

[۱۰] " If a determinate human superior, not in the habit of obedience to a like superior, receives habitual obedience from the bulk of a given society, that determinate superior is sovereign in that society, and the society (including the superior) is a society, political and independent".

ترجمہ: "اگر ایک خاص اعلیٰ و افضل فرد جو اپنے جیسے اعلیٰ اور برتر کی اطاعت کا عادی نہ ہو اور معاشرے کی اکثریت اس کی اطاعت گزار ہو تو وہ اعلیٰ فرد اس معاشرے میں مقتدرِ اعلیٰ ہے اور وہ معاشرہ (اس فردِ اعلیٰ سمیت) ایک آزاد سیاسی معاشرہ ہے"۔

پروفیسر الیاس احمد نے اقتدارِ اعلیٰ کے جدید تصور کو تدریجی ارتقا کا نتیجہ قرار دیتے ہوئے اسے ایک ساختہ نظریہ (laboured theory) قرار دیا ہے جس کی بہت سی کڑیاں غائب ہیں۔ کیونکہ اس سلسلے میں اسلام اور اس کی تہذیب کو نظر انداز کر دیا گیا ہے۔ وہ کہتے ہیں اقتدارِ اعلیٰ کے نظریہ پر قرآن کریم پہلی کتاب ہے اور مسلم مفکرین نے اس کی روح کو گرفت میں لے کر بودان اور ہابز کی پیدائش سے بہت پہلے بیان کر دیا تھا۔[۱۱]

قرآن کی تعلیمات کے مطابق توحید، اسلام کا بنیادی عقیدہ ہے جس کی رو سے اللہ تعالیٰ کی ذات لاشریک، لاثانی اور خالقِ کل ہے۔ اس کے علاوہ دوسرے اسمائے الٰہی سے جو صفاتِ الٰہی ظاہر ہوتی ہیں وہ بھی اللہ تعالیٰ کی حاکمیت یا اقتدارِ اعلیٰ کی خصوصیت کی دلیل ہیں۔[۱۲] مولانا ابوالاعلیٰ مودودی کے مطابق:

---

۹ روسو، معاہدہ عمرانی، مقدمہ از مترجم محمود حسین، کراچی ۱۹۶۴ء ص ۳۲

۱۰ Cited in Sovereignty: Islamic and Modern, p. 43

۱۱ Ahmed Ilyas, op. cit., p. 4,7-8.

۱۲ Ahmad Ilyas, op. cit., pp. 9-42, and see the Political of Iqbal by Parveen Feroze Hassan, Lahore, I Edition, p. 175.

"... قرآن بار بار کہتا ہے کہ فی الواقع حاکمیت کا حامل صرف ایک خدا ہے وہی مختارِ مطلق ہے۔ (فعّال لما یرید) وہی غیر مسئول اور غیر جواب دہ ہے (لا یسئل عما یفعل) وہی تمام اقتدار کا مالک ہے (بیدہٖ ملکوت کل شیٔ) وہی ایک ہستی ہے جس کے اختیارات کو محدود کرنے والی کوئی طاقت نہیں ہے (وھو یجیر ولا یجار علیہ) اور اسی کی ذات منزہ عن الخطا ہے۔ (الملک القدوس السلام)"[13]

اسی طرح مولانا حامد انصاری قرآن اور اقتدارِ اعلیٰ کے ذیل میں لکھتے ہیں:

"اقتدارِ اعلیٰ کے لفظ کا جو مفہوم ہے، قرآن اس کو ملکوت قرار دیتا ہے۔ قرآن نے جس طرح حکومت و خلافت اور امانت کے الفاظ سے اپنے رجحانِ حکومت کو ظاہر کیا ہے وہاں ملکوت کا لفظ بھی اس رجحان کے غلبہ کو ظاہر کرتا ہے۔ چونکہ اسلامی حکومت کا مقتدرِ اعلیٰ قرآن ہے اور وہ اپنی خدائی کے عرش سے اپنے اقتدار کا مظاہرہ کرتا ہے۔ اس لیے قرآن میں ملکوت کا لفظ خداوند تعالیٰ کے نام سے خاص طور پر مربوط رہتا ہے۔"[14]

مولانا امین اصلاحی نے اسلام میں حاکمیت (اقتدارِ اعلیٰ) کے تصور کی بہت صاف اور واضح تشریح کی ہے، وہ لکھتے ہیں:

"زمین میں اصل حاکمیت اللہ تعالیٰ کے لیے ہے۔ یہی بنیادی حقیقت ہے جس پر ایک اسلامی ریاست قائم ہوتی ہے...... خدا کی تکوینی حاکمیت بہ حیثیت ایک حقیقت کے ہر جگہ موجود ہے.... اسلام میں حاکمیت کے اقرار کے لیے یہ ضروری شرط ہے کہ اس کی تکوینی حکومت کے ساتھ ساتھ اس کی تشریعی حکومت کا بھی اقرار کیا جائے۔ ایک طرف اس بات کا اقرار کیا جائے کہ وہی تنہا اس کائنات کا خالق و مالک اور حاکم ہے اور دوسری طرف اس بات کا بھی اقرار کیا جائے کہ تنہا اسی کو یہ حق پہنچتا ہے کہ اپنے بندوں کے لیے نظامِ زندگی تجویز کرے اور ان کے لیے قانون بنائے۔ چنانچہ یہی وجہ ہے کہ ہمارے لیے خدا کی توحید کے اقرار کے ساتھ ساتھ محمد رسول اللہ صلعم کی رسالت کا اقرار ضروری ٹھہرا...."[15]

اقبال کو قرآنی تعلیمات اور اسلامی نظریات نے جو نورِ بصیرت عطا کیا تھا اس کی بدولت وہ مغرب کے خیرہ کن سیاسی فلسفہ سے متاثر نہ ہوئے۔ لہٰذا فطری طور پر اقتدارِ اعلیٰ کے باب میں بھی اقبال نے ہابز، لاک اور روسو وغیرہ کے مقابلے میں اسلامی نظریہ کو ہی قبول کیا۔ مولانا اصلاحی کے متذکرہ اقتباس سے ثابت ہے کہ توحید اور رسالت کا اقرار

---

[13] مودودی، ابوالاعلیٰ، اسلامی ریاست، لاہور جولائی ۱۹۵۸ء ص ۳۱۵

[14] انصاری، مولانا محمد حامد، اسلام کا نظامِ حکومت، الفیصل پبلشنگ، لاہور ص: ۱۵۹

[15] اصلاحی، مولانا امین احسن، اسلامی ریاست، لاہور جولائی ۱۹۷۷ء ص: ۱۹

کرنے والا خدا کے سوا کسی مقتدرِ اعلیٰ کو تسلیم نہیں کر سکتا۔ اقبال ایک پیدائشی مسلمان تھے اس لیے اپنے مذہبی کے مطابق توحید و رسالت کے عقیدوں پر ان کا ایمان تھا۔ اس لیے وہ خدا کی ذات کو اپنے شعور، تحت الشعور لاشعور میں لاشریک، لامحدود اور قادر و عادل خیال کرتے تھے۔ مگر ان کے ہاں علمی و فکری سطح پر مسئلۂ توحید پہلی مبحث پہلی بار اس انگریزی مضمون میں سامنے آتا ہے جو انھوں نے عبدالکریم جیلی کا نظریۂ توحیدِ مطلق" کے عنوان سے ستمبر ۱۹۰۰ رسالے "انڈین اینٹی کیوری" میں شائع کرایا۔[16] اس میں تصوف اور مابعد الطبیعات کے حوالے سے توحید کے رموز پر غور و ہے۔ گزشتہ اوراق میں مختلف مقامات پر اس پہلو کی طرف توجہ دلائی جا چکی ہے کہ اقبال کے دل و دماغ میں مابعد الطبیعہ کی جگہ بتدریج سیاسی، سماجی، تمدنی اور عمرانی مسائل اور حقائق کی اہمیت واضح ہوتی چلی گئی۔ اقبال ۱۹۰۸ء کے مہ "خلافتِ اسلامیہ" میں توحید کے سیاسی اور عمرانی مضمرات دریافت کرتے ہیں۔ اس مضمون میں اگرچہ انھوں نے کے موضوع پر باقاعدہ اظہارِ خیال نہیں کیا تاہم ایک دو اشاروں سے واضح ہو جاتا ہے کہ اقبال کے نزدیک اسلا اقتدارِ اعلیٰ کا منبع اور سرچشمہ اللہ تعالیٰ کی ذات ہے۔ وہ مذہب و سیاست میں تفریق پر گفتگو کے اختتام پر کہ

"۔۔۔ غرض کہ شخصی حکومت کا مفہوم اسلام کی حقیقی اسپرٹ کے خلاف ہے۔ پیغمبرِ عربؐ فداہ ابی و امی نے عربوں جیسی پوری قوم کی قوم کو اطاعت و اقتدار کی زنجیروں میں جکڑ دیا لیکن خود اپنے ذاتی اقتدار و حکومت کی مخالفت تمام دنیا سے بڑھ کر خود آپؐ نے کی۔"[17]

اپنے اس بیان کی تائید کے ضمن میں انھوں نے ایک حدیث نقل کرتے ہوئے لکھا ہے کہ:

"ایک دفعہ کسی روحانی جذبہ کے زیرِ اثر آپؐ نے اپنے اصحابؓ میں سے ایک کو فرمایا، "جاؤ اور لوگوں سے کہہ دو کہ جس شخص نے ایک دفعہ بھی زندگی میں اپنی زبان سے لا الہ الا اللہ کہہ دیا وہ سمجھ لے کہ میں جنت میں داخل ہو گیا۔"

رسالت مآبؐ نے کلمۂ توحید کے دوسرے جزو یعنی محمد رسول اللہ کو جس کے اقرار کے بغیر مسلمان مسلمان نہیں ہو سکتا، دانستہ ذکر نہ فرمایا اور اقرارِ توحید ہی کو کافی سمجھا۔ اور یہ جانتے ہوئے کہ کیوں ایسا کیا، محض اس لیے کہ دوسرے جزو میں اپنی ذاتِ اقدس کا ذکر تھا۔ رسولِ خداؐ کے اس عمل کی اخلاقی اہمیت کچھ وہی لوگ سمجھ سکتے ہیں جو اس پاک ہستی کے اوصاف و خصائل سے واقف ہیں۔"[18]

مقتدرِ اعلیٰ کی ایک بنیادی خصوصیت یہ ہے کہ اس کی ذات قانون کا ماخذ ہوتی ہے۔

اقبال نے ۱۹۲۸ء کے ایک مضمون "Divine Right & Rule" میں اقتدار اور حکومت

---

[16] شروانی (انگریزی)، محولہ بالا، ص: ۶۹

[17] مقالاتِ اقبال، ص: ۹۲ [18] ...

ہونے کے لیے بادشاہوں کے پرویزی حیلوں کا ذکر کیا ہے۔ اس کے مقابلے میں رسولِ اکرمؐ کی اس کاوش کی طرف ہے جو آپؐ ہمیشہ اپنی بشریت لوگوں کے ذہن نشین کرانے کے لیے کرتے رہے۔ بقول اقبال:

[19] "Rather than make up any attempt to hypnotise people into superstitious adoration of himself, the Prophet did everything in his power to dispel any possible doubt on that point....unlike earthly kings who left no stone unturned to hoodwink their people into the belief as to their superhuman status. Prophet tried every method to impress upon his people that he was just human and no more than human."

دوسرے لفظوں میں قانون سازی مقتدرِ اعلیٰ کا وظیفہ ہے۔ اسلام میں قرآنی احکام اللہ تعالیٰ کا قانون ہے۔

اقبال: "... شریعتِ اسلامیہ کے اصولوں کے متعلق ہمارا ایمان ہے کہ وہ قطعی ہیں اور وحی ربانی پر مبنی ہیں۔ باقی فروعات ہیں سو چونکہ ان کو زمانے کی رفتار کے مطابق کم و بیش تمام دنیاوی امور پر حاوی ہونا ہوتا ہے اس لیے ان کی تشریح و تفریح فقہائے ملت کے سپرد کر دی گئی ہے"[20]

قانون الٰہی کی مطلق فضیلت کو اپنے ۱۹۰۹ء کے ایک مضمون[21] Islam As A Moral and Political Idea میں بیان کرتے ہوئے لکھا ہے:

[22] " The law of God is absolutely supreme. Authority except as an interpreter of the law, has no place the social structure of Islam".

شروانی (انگریزی) محولہ بالا، ص: ۱۳۱ [20] معینی، مقالاتِ اقبال، ص: ۹۳

یہ مضمون ہندوستان ریویو الہ آباد کے دو شماروں بابت جولائی، اگست ۱۹۰۹ء میں شائع ہوا تھا۔ دیکھیے فٹ نوٹ (شروانی (انگریزی) محولہ بالا، ص: ۸۵)

[22] شروانی (انگریزی) محولہ بالا، ص: ۱۰۱

اقبال نے اپنے خطبہ الاجتہاد فی الاسلام میں ظہورِ اسلام کی عمرانی ضرورت پر گفتگو کرتے ہوئے اصول کو جہاں اجتہادِ عالم کی اساس قرار دیا ہے وہیں ملوک وسلاطین کے مقابلے میں اللہ تعالیٰ کی حاکمیت کو اس اصول کا تقاضا قرار دیا ہے اور اللہ تعالیٰ کی اطاعت کا روحانی مفہوم اور اس کی حقیقت واضح کی ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

"۔۔۔۔اس نئی تہذیب (اسلام) نے اتحادِ عالم کی بنا توحید پر رکھی۔ لہٰذا بطورِ اساسِ ریاست اسلام ہی وہ عملی ذریعہ ہے جس سے ہم اس مقصد میں کہ توحید کا یہ اصول ہماری حیاتِ عقلی اور جذباتی میں ایک زندہ عنصر کی حیثیت اختیار کرلے، کامیاب ہوسکتے ہیں اس اصول کا تقاضا ہے کہ ہم صرف اللہ کی اطاعت کریں، نہ کہ ملوک وسلاطین کی۔ پھر چونکہ ذاتِ الٰہیہ ہی فی الحقیقت روحانی اساس ہے زندگی کی۔ لہٰذا اللہ کی اطاعت فطرتِ صحیحہ کی اطاعت ہے[۲۳]۔"

اقبال نے خضرِ راہ میں بھی توحید اور حاکمیت کے ربط پر اظہارِ خیال کیا ہے اور صرف اللہ تعالیٰ کو اقتدار کا مالک ٹھہرایا ہے۔ اس کے بعد حکومت اور اقتدار کے دوسرے سیکولر تصوّرات کی کوئی حیثیت باقی نہیں رہتی۔ گو حکمرانی کا ہر دنیاوی انداز بالفاظِ دیگر طرزِ حکومت باطل ہے۔ خضر رموزِ سلطنت پر اظہارِ خیال کرتے ہوئے کہتا ہے:

سروری زیبا فقط اس ذاتِ بے ہمتا کو ہے　　حکمراں ہے اک وہی باقی بُتانِ آذری

چونکہ جدید فلسفۂ سیاست میں اقتدارِ اعلیٰ کے تصوّرات منفی بنیادوں پر استوار ہوئے ہیں اس لیے بہت سے اختلافات بھی ان سے جنم لیتے ہیں۔ جدید زمانے کے بہت سے تہذیبی، تمدّنی اور عمرانی وسیاسی مسائل میں جو الجھن اور انتشار نظر آتا ہے وہ اقتدارِ اعلیٰ کے غیر فطری تصوّر ہی کا مرہونِ منت ہے۔ اس سلسلے میں اقبال نے "جاوید نامہ" میں فلک عطارد پر افغانی کی زبانی "محکماتِ عالمِ قرآنی" کے باب میں "حکومتِ الٰہی" کا جو تصوّر پیش کیا ہے وہ نہایت اہم اور توجہ طلب ہے

بندۂ حق مردِ آزاد است و بس　　ملک و آئینش خداداد است و بس
رسم و راہ و دین و آئینش ز حق　　زشت و خوب و تلخ و نوشینش ز حق
عقل خود بیں غافل از بہبودِ غیر　　سود خود بیند نہ بیند سودِ غیر
وحیِ حق بینندۂ سودِ ہمہ　　در نگاہش سود و بہبودِ ہمہ
غیرِ حق چوں ناہی و آمر شود　　زورور بر ناتواں قاہر شود
زیرِ گردوں آمری از قاہری است　　آمری از ماسوا اللہ کافری است

اقبال نے اپنی نظم ونثر میں یہ واضح کرنے کے لیے کوئی دقیقہ اٹھا نہیں رکھا کہ اقتدارِ اعلیٰ صرف اللہ تعالیٰ کو

۲۳۔ نیازی، تشکیل جدید الٰہیات اسلامیہ، لاہور، ص: ۲۲۷

حاصل ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ وہ اس ممکنہ غلط فہمی کا بھی ازالہ کرتے رہے ہیں کہ اسلامی ریاست کو مغربی اصطلاح تھیوکریسی کے مترادف خیال نہ کرنا چاہیے۔ قرآنی احکام کی روشنی میں حکومت اور ریاست کے انتظامی امور خلیفہ کی ذمہ داری ہے۔ اقبال نے مختلف مضامین میں بار بار اس بات کی صراحت کی ہے۔ مثلاً ۱۹۰۸ء میں لکھتے ہیں کہ:

"۔۔۔۔ یہ لابد نہیں کہ خلیفۃ المسلمین اسلام کو افضل ترین مذہبی پیشوا سمجھا جائے۔ سطح دنیا پر اس کی نائب خدا کی حیثیت نہیں، وہ معصوم نہیں بشر ہے[۲۴]۔۔۔۔"

۱۹۰۹ء میں اپنے ایک دوسرے مضمون میں کہتے ہیں:

" The Caliph of Islam is not an infallible being; like other Muslims he is subject to the same law; he is elected by the people and is disposed by them if he goes contrary to the law".[۲۵]

علامہ اقبال نے اپنے مشہور خطبہ الاجتہاد فی الاسلام میں حکومتِ الٰہی اور خلیفۃ اللہ فی الارض کے تصور کو مندرجہ ذیل الفاظ میں نہایت اختصار کے ساتھ بیان کر دیا ہے:

"۔۔۔۔ بہ حیثیت ایک اصولِ عمل توحید اساس ہے حریت، مساوات اور حفظ نوع انسان کی۔ اب اگر اس لحاظ سے دیکھا جائے تو از روئے اسلام ریاست کا مطلب ہوگا ہماری یہ کوشش کہ یہ عظیم اور مثالی اصول زمان و مکان (مادی احوال و ظروف) کی دنیا میں ایک قوت بن کر ظاہر ہوں (یعنی فی الحقیقت سیاسی، اجتماعی عوامل کی حیثیت اختیار کریں) وہ گویا ایک آرزو ان اصولوں کو ایک مخصوص جمعیتِ بشری (سیاسی اور مذہبی اعتبار سے جیسے مثلاً قوم کا وجود ہے) میں متشہود دیکھنے کی۔ لہٰذا اسلامی ریاست کو حکومتِ الٰہیہ[۲۶] سے تعبیر کیا جاتا ہے تو انہی معنوں میں، ان معنوں میں نہیں کہ ہم اس کی زمامِ اقتدار کسی ایسے خلیفۃ اللہ فی الارض کے ہاتھ میں دے دیں جو اپنی مفروضہ معصومیت کے عذر میں اپنے جور و استبداد پر ہمیشہ ایک پردہ سا ڈال رکھے۔"[۲۷]

اقبال نے اصولِ توحید کی روشنی میں ہی ایک اور جدید سیاسی تصور کے منفی پہلو اجاگر کیے ہیں۔ سیاسی اصطلاح میں اس تصور کو وطنیت یا قوم پرستی کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے جو اقبال کے فکر میں ایک نہایت اہم مبحث ہے۔

---

۲۴ مقالات اقبال، ص: ۹۲ ۲۵ شروانی (انگریزی) محولہ بالا ص: ۱۰۱ ۲۶ اقبال نے تھیوکریسی کا لفظ استعمال کیا ہے۔ مولانا مودودی کے مطابق مغربی اصطلاح میں مذہبی حکومت (THEOCRACY) دو بنیادی تصورات کا مجموعہ ہے۔ ۱ـ خدا کی بادشاہی قانونی حاکمیت (LEGAL SOVEREIGNTY) کے معنی میں اور ۲ـ پادریوں اور مذہبی پیشواؤں کا ایک طبقہ جو خدا کا نمائندہ اور ترجمان بن کر اس بادشاہی کو قانونی اور سیاسی حیثیت سے عملاً نافذ کرے۔ اسلامی ریاست جولائی ۱۹۸۵ء ص: ۴۸۰

۲۷ [illegible] تشکیل [illegible] ص: ۲۳۸

حسن سوز

"ترقی پسند تحریک، فیض اور پاکستان"

ہر زبان کے شعر و ادب نے اپنی ابتدائے آفرینش ہی سے شعوری، نیم شعوری یا غیر شعوری طور پر معاشرتی زندگی کے
نشیب و فراز پر روشنی ڈالنے کا کردار، کسی نہ کسی حد تک ضرور ادا کیا ہے۔ دیو مالائی داستانیں ہوں یا الف لیلوی کہانیاں،
الی داس اور شیکسپئر کے منظوم ڈرامے ہوں یا امیر خسرو کی کہہ مکرنیاں ـــ سب کے سوتے بہرحال معاشرتی زندگی ہی سے
ھوٹتے ہیں۔ ان تمام فن پاروں کو پوری توجہ اور ادبی بصیرت کے ساتھ پڑھیے تو انسانی سماج کے لالہ و گل اور خس و خار خود بخود
پ کو اپنی جانب متوجہ کریں گے۔ یعنی ایک گہرے تاریخی و سماجی شعور کی لہریں آپ کے اندر پیدا ہونا شروع ہو جائیں گی۔ دراصل
ی تاریخی و سماجی شعور ہمیں انسانی ذہن کے بتدریج ارتقا کا احساس دلاتے ہوئے خود آگہی کی منزل تک پہنچاتا ہے۔ جہاں
ہنچ کر ہم اپنی ذات کے حوالے سے تہذیبی و اخلاقی اور جمالیاتی و روحانی اقدار کا جائزہ لیتے اور دور بہ دور بدلتی ہوئی زندگی
ادراک حاصل کرتے ہیں۔ دوسری طرف ماضی اور حال کے حوالے سے خود اپنی ذات اور اپنے کردار پر بھی ہماری نگاہیں بار بار
ٹھتی رہتی ہیں۔ اس کے بعد قدرتی طور پر ہماری فکر کا دائرہ کچھ اور پھیلتا ہے۔ اور ہم اپنے مستقبل کی صورت گری کے خواب
یکھنے لگتے ہیں۔ یہ عمل کبھی کبھی رکا ہوا سا ضرور محسوس ہوتا ہے۔ اس کے ختم یا روبہ زوال ہو جانے کا کوئی سوال پیدا نہیں
وتا کیوں کہ یہی پُراسرار اور قدرتی عمل تخلیقِ فن کا باعث ہے جو ہماری قوتِ اظہار کو بیدار اور متحرک رکھتا ہے۔

اردو شعر و ادب کی قوسِ قزح کو عالمی ادب کے افق پر طلوع ہوئے کچھ زیادہ عرصہ نہیں گزرا۔ یا یوں سمجھ لیجیے کہ اردو
نعر و ادب کے فروغ و ارتقا کے نتیجے میں جو تہذیب و تمدن برِصغیر میں رونما ہوا اس کی تاریخ بہت پُرانی نہیں ہے۔ ولی
ے میر اور نظیر تک اور غالب سے سرسید، حالی، شبلی، اکبر اور اقبال تک جتنے بھی رنگ ابھرے، سب کے سب وقت کے
مرے کی آنکھ نے محفوظ کر لیے اور اب وہ عالمی تاریخِ ادب کا ایک لازمی جزو ہیں۔ اس پوری مدت میں اردو نظم و نثر کی
یہ تاز اور تیز رفتار ترقی کے باوجود اردو ادب، عالمی ادب کی ہم روشی و ہم قدمی کا دعویدار نہیں ہو سکتا تھا۔ سرسید تحریک،
ومانی تحریک اور پھر بعد میں ترقی پسند تحریک اور جدیدیت کی تحریک کے نتیجے میں اردو ادب عالمی معیار کی تخلیقات پیش
رنے میں روز بہ روز کامیاب ہوتا گیا۔ یہاں تک کہ آج ہم فخر و مسرت کے ساتھ اس کو عالمی ادب کا ہم پلہ قرار دینے میں کوئی

بک محسوس نہیں کرتے۔ لیکن اس ترقی و فتحیابی میں اہم ترین کردار ترقی پسند تحریک ہی کا رہا۔ اس کے ذریعے تمام
ار اور روایات کا از سرِ نو جائزہ لینے کے بعد تخلیقِ ادب میں پہلی مرتبہ غور و فکر اور اظہار کا سائنٹفک رویہ اختیار کیا گیا۔
ن کو ہم دوسرے الفاظ میں ترقی پسند رویّہ بھی کہتے ہیں۔ ترقی پسند تحریک اپنے صحیح وقت پر نہ چلتی تو ہمیں سوچنے سمجھنے اور
ھنے پرکھنے کے نئے اور موزوں ترین زاویے خدا جانے کب تک میسّر نہ آتے۔ ہمارے طرزِ احساس و فکر میں وہ خوش آئند
نلاب شاید مدّتوں پیدا نہ ہو پاتا جو صرف دس پندرہ برس کی قلیل مدّت میں پیدا ہوا۔

تاریخ کے اوراق شاہد ہیں کہ ۱۹۳۶ء میں جب ترقی پسند تحریک کا آغاز کیا گیا تو اقبال، ٹیگور، پریم چند، مولوی عبدالحق،
یاز، جوش، مجنوں، فراق اور پھر مولانا حسرت موہانی جیسے تمام بڑے شاعروں، ادیبوں کی تائید و حمایت اور دعائیں اس کے
اتھ تھیں۔ تحریک کے لیے راہ ہموار اور فضا سازگار تھی۔ غالب اپنی غزل اور اپنے خطوط کے ذریعے جدید اسلوبِ اظہار کی
بنیاد رکھ چکے تھے۔ لہٰذا ۱۸۵۷ء کے بعد جو ادب تخلیق ہوا وہ ہر اعتبار سے جدید تھا۔ انسان دوستی، حب الوطنی اور آزادی
ے جذبات اس کی شریانوں میں تازہ خون کی طرح جوش مارتے ہوئے آج بھی محسوس کیے جا سکتے ہیں۔ یہ ایک علاحدہ موضوعِ
غور و فکر ہے کہ وہ آگے چل کر کچھ مصلحتوں کا شکار ہو گیا اور اس کی انسان دوستی و حب الوطنی پر ماضی پرستی اور مذہبی یبوست
کے سائے گہرے ہوتے چلے گئے۔ بہرکیف ۱۸۵۷ء کے بعد اور ۱۹۳۶ء سے پہلے کے پورے دور میں جو ادب تخلیق ہو چکا تھا وہ
ترقی پسند مصنفین کے لیے مشعلِ راہ ضرور ثابت ہوا۔ آزاد، سرسیّد، حالی، اکبر اور اس کے بعد شبلی، اقبال، فانی، حسرت، یگانہ
صغر، جگر، پریم چند، علی عباس حسینی، قاضی عبدالغفار، فراق، جوش، نیاز، مجنوں اور ان کے بہت سے ہم عصر اپنی تحریروں
کے ذریعے ایک جدید اور ترقی پسند ادبی شعور برِّصغیر میں پروان چڑھا چکے تھے۔ ترقی پسند تحریک نے ورثے میں ملنے والے
صحت مند رجحانات و میلانات اور زندگی کی تمام تر حُسن کے ساتھ سچی ترجمانی کرنے والی تخلیقات کو تہِ دل سے قبول کیا۔
ذاتی اقتدار اور نجی ملکیت کی خاطر ظلم و ستم اور استحصال پر مبنی معاشرے کو جائز ثابت کرنے والے ادب و فن کو یکسر مسترد
کر دیا۔ ہر نئے دور کا اچھا اور سچّا ادب ماضی کے ترقی پسند رجحانات و میلانات کو باقی رکھتا اور آگے بڑھاتا ہے۔ ہر عہد میں
کچھ ایسی ادبی تخلیقات ہوتی ہیں جو اپنے ماحول اور زمانے کی حدوں کو پار کر جاتی ہیں۔ ایسی تخلیقات ابدی صداقت اور انسان دوستی
کے جذبات کی تصویر کشی ایک گہرے فن کارانہ خلوص کے ساتھ کرتی ہیں۔ انھیں نظر انداز کر کے آگے قدم بڑھانا ممکن نہیں ہوتا۔

ترقی پسند تحریک نے دیکھتے ہی دیکھتے پورے برِّصغیر کو اپنے دائرۂ اثر میں لے لیا۔ نہ صرف یہ کہ بڑے شاعروں، ادیبوں نے
اس کا خیر مقدم کیا بلکہ اس کے اعلان نامے پر باقاعدہ دستخط بھی کیے۔ مجنوں گورکھپوری کے تنقیدی مضامین کی بدولت تحریک
شہرت و مقبولیت کے زینے تیزی کے ساتھ طے کرتی چلی گئی۔ مجنوں صاحب نے ترقی پسند ادب پر عائد کیے جانے والے تمام الزامات
کا جواب مدلّل اور تشفی بخش انداز میں دیا اور خود تحریک کو بھی غلط روی سے بچانے کی بھرپور کوشش کی۔ آگے چل کر نوجوان ادیبوں
اور شاعروں نے معیاری تخلیقات پیش کر کے ثابت کر دیا کہ اب قدامت پسندی اور فرسودہ روی کی ادب میں کوئی گنجائش نہیں
ہے۔ نئے دور کے بین الاقوامی رجحانات و میلانات اور قومی و سماجی تقاضوں کو سمجھے بغیر اب کوئی قدم آگے کی جانب اٹھانا
ممکن نہیں۔ زندگی کی نئی قدروں سے رشتہ قائم نہ ہونے کی صورت میں جو کچھ بھی لکھا جائے گا وہ بے جان اور بے کار ادب ہو گا۔

یبوں اور شاعروں کی یہ نئی کھیپ جو کرشن چندر، فیض، مجاز، جاں نثار اختر، سجاد ظہیر، رشید جہاں، خواجہ احمد عباس، سردار جعفری، سعادت حسن منٹو، عصمت چغتائی، احتشام حسین، راجندر سنگھ بیدی، آل احمد سرور، ظ۔ انصاری، ن الایمان، جذبی، کیفی اعظمی، اختر حسین رائے پوری، پروفیسر ممتاز حسین، حیات اللہ انصاری، سلام مچھلی شہری، مخدوم محی الدین، ندیم قاسمی، ابراہیم جلیس اور ساحر لدھیانوی وغیرہ پر مشتمل تھی۔ ایک طویل عرصے تک اردو ادب کی فضا پر چھائی رہی۔ اس ان ترقی پسند ادب پر مختلف النوع الزامات عائد کیے گئے۔ ادبی رسائل و جرائد سے لے کر سیاسی و نیم سیاسی ہفت روزوں اخباروں تک میں اس موضوع پر بہت کچھ لکھا جا چکا ہے۔ ترقی پسندی کی دھن میں ادیبوں، شاعروں سے جو لغزشیں سرزد ں ان پر بھی خاصی بحث ہو چکی ہے لہٰذا ان تمام باتوں کو دوہرانا کارِ لاحاصل ہے۔

ہاں، ایک اہم پہلو کی جانب توجہ مبذول کرانا ضروری محسوس ہوتا ہے۔ وہ یہ کہ ترقی پسند تحریک نے معاشرے میں ود مسائل و میلانات کی نشاندہی کر کے جو ایک صحتمند سیاسی و سماجی شعور پیدا کیا اور جس نئی شعری و ادبی بصیرت کو فروغ اس سے استفادہ کر کے ادب تخلیق کرنے والے بہت سے شاعروں، ادیبوں ہی نے اس تحریک کو ہمیشہ نقصان پہنچانے دشش کی۔ لیکن اس سے بھی زیادہ افسوسناک حقیقت یہ ہے کہ ایسے ادیبوں اور شاعروں کی تعداد میں بھی روز بروز انہ ہوتا چلا گیا جو خود کو ترقی پسند کہتے ہوئے بھی مجھوتے بازی اور موقع پرستی کے مسلک سے وابستگی اختیار کیے رہے۔ آزادی بعد پاکستان میں بالخصوص یہ صورت شدت اختیار کر گئی۔ اس وقت نئی نسل کو ذہنی انتشار اور بے راہ روی سے بچانے نے کے لیے ہمارے سامنے صرف فیض ہی کی شخصیت اور شاعری اپنی تمام تر رعنائیوں اور توانائیوں کے ساتھ ایک مثال لتی تھی۔ ممکن ہے اس حقیقت کے پیشِ نظر فیض کے خلاف پروپیگنڈہ مہم شروع کی گئی ہو اور اس کی شخصیت اور شاعری سے نئی کو متنفر کرنے کا فریضہ سنبھالا گیا ہو!

یہ ایک تابندہ و پائندہ حقیقت ہے کہ فیض ایک سچا ترقی پسند شخص اور شاعر ہے۔ اس کی شخصیت اور شاعری زندگی کے کسی موڑ پر باہم متصادم نہیں ہوتیں۔ ان میں کسی قسم کا کوئی تضاد شروع ہی سے موجود نہیں ہے۔ فیض نے ایک وقار اور متانت کے ساتھ تخلیقی سفر دمِ آخر تک جاری رکھا۔ انقلاب کا ایک ایسا صالح اور صحت مند شعور اس کے فکر و فن کی روح میں موجود ہے۔ اس نے شعر و ادب کے سرمائے میں ایک مایہ ناز اور گراں قدر اضافہ کیا ہے۔ زندگی اور ادب کو نئی توانائی اور ہمہ گیر معاشرتی و اخلاقی ار سے آشنا کر کے شاہ راہِ ترقی پر ڈالنے میں اہم ترین کردار ادا کیا ہے۔ فیض کے انقلابی شعور کی متحرک و ناطق تصویریں بنے کے لیے اس کا مطالعہ فکر و تامل اور خلوص کے ساتھ کرنے کی ضرورت ہے۔ فیض کے یہاں تمام تر حسن اور فن کاری کے تھ شاعری کو زندگی سے قریب تر کر دینے کا جو ایک پُراسرار عمل جاری ہے اس کو سمجھے بغیر ہم اس کی دلآویز ترقی پسند شخصیت میدنہیں پاسکتے۔ وہ موضوعات جو ایک زمانے میں ناشائستہ خیال کیے جاتے تھے، فیض کی تخلیقی رو سے مس ہو کر انتہائی لستہ ہو گئے ہیں۔ اس کے جادو اثر دائرۂ فن میں آ کر حزن و ملال، درد و الم، ہجر و فراق، انتظار و تنہائی، غمِ جانان اور دوراں، فصلِ گل اور موسم خزاں۔ غرض حیات و کائنات کی تمام کیفیات نے ایک نیا جنم لیا ہے۔ محبت کی آغوش سے ان دوستی کی وادی تک کے اس تمام سفر میں فیض کے فن کی تابناکی و سحر انگیزی ہمیں نئی نئی حیرتوں میں مبتلا کرتی رہی ہے۔

ہم اس کے فن پاروں کا مطالعہ کرتے ہوئے بے شمار نئے جہانوں سے روشناس ہوتے ہیں:

غمِ جاناں کی چند مثالیں :۔

رات یوں دل میں تری کھوئی ہوئی یاد آئی
جیسے ویرانے میں چپکے سے بہار آجائے
جیسے صحراؤں میں ہولے سے چلے بادِ نسیم
جیسے بیمار کو بے وجہ قرار آجائے

وقفِ حرمان و یاس رہتا ہے
دل ہے ، اکثر اداس رہتا ہے
تم تو غم دے کے بھول جاتے ہو
مجھ کو احساں کا پاس رہتا ہے

سو رہی ہے گھنے درختوں پر
چاندنی کی تھکی ہوئی آواز
کہکشاں نیم وا نگاہوں سے
کہہ رہی ہے حدیثِ شوقِ نیاز
سازِ دل کے خموش تاروں سے
چھن رہا ہے خمارِ کیف آگیں
آرزو ، خواب ، تیرا روئے حسیں !		"سرودِ شبانہ"

دشتِ تنہائی میں اے جانِ جہاں لرزاں ہیں
تیری آواز کے سائے ترے ہونٹوں کے سراب
دشتِ تنہائی میں دوری کے خس و خاک تلے
کھل رہے ہیں تیرے پہلو کے سمن اور گلاب		"یادیں"

بہارِ حسن پہ پابندیٔ جفا کب تک ؟
یہ آزمائشِ صبرِ گریز پا کب تک ؟

قسم تمہاری بہت غم اٹھا چکا ہوں میں
غلط تھا دعویٔ صبر و شکیب آجاؤ
قرارِ خاطرِ بیتاب تھک گیا ہوں میں		"انتظار"

پھر کوئی آیا دلِ زار ! نہیں ، کوئی نہیں !
راہرو ہوگا ، کہیں اور چلا جائے گا
ڈھل چکی رات ، بکھرنے لگا تاروں کا غبار
لڑکھڑانے لگے ایوانوں میں خوابیدہ چراغ
سو گئی راستہ تک تک کے ہر اک راہ گزار
اجنبی خاک نے دھندلا دیے قدموں کے سراغ
گل کرو شمعیں ، بڑھا دو مے و مینا و ایاغ
اپنے بے خواب کواڑوں کو مقفل کر لو
اب یہاں کوئی نہیں ، کوئی نہیں آئے گا !		"تنہائی"

اور اب غمِ دوراں کے بھی کچھ رنگ :۔

گو سب کو بہم ساغر و بادہ تو نہیں تھا
یہ شہر اداس اتنا زیادہ تو نہیں تھا
گلیوں میں پھرا کرتے تھے دو چار دوانے
ہر شخص کا صد چاک لبادہ تو نہیں تھا
تھک کر یونہی پل بھر کے لیے آنکھ لگی تھی
سو کر ہی نہ اٹھیں یہ ارادہ تو نہیں تھا

یہ مظلوم مخلوق گر سر اٹھائے
تو انسان سب سرکشی بھول جائے
یہ چاہیں تو دنیا کو اپنا بنا لیں

آقاؤں کی ہڈیاں تک چبا لیں
کوئی ان کو احساسِ ذلت دلا دے
کوئی ان کی سوئی ہوئی دُم ہلا دے
"کتّے"

جسم پر قید ہے جذبات پہ زنجیریں ہیں
فکر محبوس ہے گفتار پہ تعزیریں ہیں
اپنی ہمت ہے کہ ہم پھر بھی جیے جاتے ہیں
زندگی کیا کسی مفلس کی قبا ہے جس میں
ہر گھڑی درد کے پیوند لگے جاتے ہیں
"چند روز اور مری جان"

متاعِ لوح و قلم چھن گئی تو کیا غم ہے
کہ خونِ دل میں ڈبو لی ہیں انگلیاں میں نے
زباں پہ مہر لگی ہے تو کیا کہ رکھ دی ہے
ہر ایک حلقۂ زنجیر میں زباں میں نے

ابھی گرانیِ شب میں کمی نہیں آئی
نجاتِ دیدہ و دل کی گھڑی نہیں آئی
چلے چلو کہ وہ منزل ابھی نہیں آئی
"صبحِ آزادی"

دیدۂ تر پہ وہاں کون نظر کرتا ہے
کاسۂ چشم میں خوں نابِ جگر لے کے چلو
اب اگر جاؤ پئے عرض و طلب ان کے حضور
دست و کشکول نہیں کاسۂ سر لے کے چلو

نظموں کے علاوہ غزلوں میں بھی فیض کے یہاں تخلیقی سفر کی یہی فضا اور یہی کیفیت قائم رہتی ہے۔ لیکن غزلوں میں آ کے غمِ محبت اور غمِ زمانہ باہم ایسے پیوست ہو گئے ہیں کہ انھیں خانوں میں تقسیم کرنا ممکن نہیں رہتا۔ غمِ جاناں سے غمِ دوراں یا غمِ محبت سے غمِ انسانیت تک ایک حسن کا دریا ہے جو اپنی کچھ ٹھہری اور کچھ مضطرب موجوں کے ساتھ بہہ رہا ہے۔ ساحل سے نظارہ کرنے میں ایک خاص لطف سہی لیکن موجوں سے ہمکنار ہوئے بغیر اس فضا اور اس کیفیت کا بھرپور لطف اٹھانا مشکل ہے۔ اس فضا اور کیفیت کو اپنا کر بعد میں آنے والے شعرا نے اردو شاعری کے افق پر کچھ نئے نقش ابھارے لیکن بات کچھ زیادہ بنی نہیں۔ فیض کی شاعری کے ذریعے جو میلانات و رجحانات سامنے آئے ان کو ترقی کے ساتھ فروغ دینے کی ضرورت کا احساس نئی نسل میں شاید پیدا نہیں ہو سکا۔

فیض کی شہرت و مقبولیت بھی تمام تر مخالفتوں کے باوجود ہمیشہ حیران کر دینے والی رہی ہے۔ وہ عوام اور خواص میں بہ یک وقت اور یکساں پسند کیا جاتا ہے۔ اس معاملے میں بھی اس کا مدِ مقابل کوئی نہیں ہے۔ بہت سے اداکار چھوٹے اسکرین پر کامیاب رہتے ہیں، بڑے اسکرین پر جا کر فیل ہو جاتے ہیں۔ یا پھر بڑے اسکرین کی کامیابی چھوٹے اسکرین پر ناکامی کا منہ دیکھتی ہے۔ ایسا فن کار شاذ ہی سامنے آتا ہے جو بہ یک وقت دونوں پردوں پر اپنی پرفارمنس کے زاویے درست رکھ سکے۔ فیض ایسا ہی فن کار ہے۔ وہ رومانی بھی ہے، انقلابی بھی اور اردو شعر و ادب کی اعلیٰ روایات و اقدار کا سچا وارث بھی۔ تخلیقِ شعر کے سفر میں کسی مقام اور کسی موڑ پر اس کے قدم نہیں ڈگمگاتے!

رہی وطن سے محبت کی بات! تو فیض کی شخصیت اور شاعری، دونوں ہی اس سے سرشار ہیں۔ حکومتِ وقت پر تنقید [illegible] سے اختلاف وطن دشمنی کی علامت نہیں۔ ایک باشعور شہری کی حب الوطنی کا واضح ترین ثبوت ہے۔

اس کا مطلب سوائے اس کے اور کچھ نہیں کہ وہ ایک دردمند دل کا مالک ہے۔ اپنے وطن اور اہلِ وطن کے مسائل و معاملات کے بارے میں سوچے بغیر نہیں رہ سکتا۔ اقتصادی عدل اور سماجی انصاف کا آرزومند اور عوام دوست شاعر سب سے پہلے محبِ وطن ہوتا ہے بعد میں کچھ اور! جب بھی ہم فیض کی شاہکار نظم "نثار میں تری گلیوں پہ اے وطن کہ جہاں" سے رجوع کرتے ہیں تو حب الوطنی کی شعاعیں خود ہمارے اپنے اندر سے پھوٹنے لگتی ہیں۔ اور فیض ہمیں کچھ اور عزیز ہو جاتے ہیں۔ ان کی پیاری شخصیت پر اور زیادہ پیار آنے لگتا ہے۔

نظم کا تیسرا اور آخری بند پڑھیے اور خود اپنے اندر حب الوطنی کے جذبات انگڑائیاں لیتے ہوئے محسوس کیجیے۔

	آخری بند:
بجھا جو روزنِ زنداں تو دل یہ سمجھا ہے	گر آج تجھ سے جدا ہیں تو کل بہم ہوں گے
کہ تیری مانگ ستاروں سے بھر گئی ہوگی	یہ رات بھر کی جدائی تو کوئی بات نہیں
چمک اٹھے ہیں سلاسل تو ہم نے جانا ہے	گر آج اوج پہ ہے طالعِ رقیب تو کیا
کہ اب سحر ترے رُخ پر بکھر گئی ہوگی	یہ چار دن کی خدائی تو کوئی بات نہیں
غرض تصورِ شام و سحر میں جیتے ہیں	جو تجھ سے عہدِ وفا استوار رکھتے ہیں
گرفتِ سایۂ دیوار و در میں جیتے ہیں	علاجِ گردشِ لیل و نہار رکھتے ہیں

پروفیسر مجنوں گورکھپوری کا کہنا ہے کہ:

"کامیاب ترین ادب وہ ہے جو حال کا آئینہ دار اور مستقبل کا اشاریہ ہو۔ جس میں واقعیت اور تخیلیت، افادیت اور جمالیت ایک آہنگ ہو کر ظاہر ہوں، جس میں اجتماعیت اور انفرادیت دونوں مل کر ایک مزاج بن جائیں جو ہمارے ذوقِ حسن اور ذوقِ عمل دونوں کو ایک ساتھ آسودہ کر سکے۔ اب تک ادب جو کچھ بھی رہا ہو، لیکن اب اس کو یہی ہونا ہے۔"

حقیقت تو یہ ہے کہ فیض کی یہ شاعری اس معیار پر حرف بہ حرف پوری اترتی ہے۔ جب بیشتر ترقی پسند شاعر اور ادیب انتہا پسندی کا شکار ہو کر ادب کو پروپیگنڈے کی حدود تک لے آئے تھے اور عوامی ادب تخلیق کرنے کی دھن میں سطحیت و خارجیت سے ہم کنار ہو رہے تھے اس وقت فیض نے اپنی شاعری اور اپنے تنقیدی مضامین کے ذریعے صحیح معنوں میں ترقی پسند ہونے کا ثبوت فراہم کیا۔ اس کی تخلیقاتِ نظم و نثر نے ایک ایسی شعری و ادبی روایت کو استوار کیا جو بہ یک وقت فن کے ارتقا اور سماجی شعور کے فروغ کی ضامن ہے۔

جان لیوس / عبدالرحیم قدوائی

مارکسی ادبی تنقید کیا ہے؟

["نقد و نظر" علی گڑھ ایک نہایت موقر تنقیدی شش ماہی ہے۔ "قومی زبان" نے اس کے
فاضل مرتب اسلوب احمد انصاری صاحب کی خاص اجازت سے اس کے بعض مضامین مستقل
طور پر شائع کرنے کا فیصلہ کیا ہے۔ ادارہ اس کی اجازت کے لیے انصاری صاحب کا ممنون ہے۔
مندرجہ ذیل مضمون جلد ۸ شمارہ ۲ ۱۹۸۶ء سے لیا گیا]

ادب کسی بھی سماج کے حالات کا ایک حساس اشاریہ مہیا کرتا ہے۔ ترقی و زوال کے عوامل کی سیاسی طور پر تجزیہ نگاری
ے برعکس ادب بڑے لطیف پیرائے میں افراد کی ذاتی زندگی میں ان عوامل کو ان کی اصل روحانی شکل میں آشکار کرتا ہے۔ ادب
یک وقت حیاتِ انسانی کے انتہائی ذاتی / شخصی پہلوؤں اور اس دور کے مختلف نفسیاتی میلانات سے علاقہ رکھتا ہے۔

مارکسی ادبی تنقید ایسے رجحانات اور ان بتدریج تبدیلیوں کا تجزیہ کرتی ہے جو کسی طبقے کے برسرِ اقتدار آنے اور
زوال پذیر ہونے پر واقع ہوتی ہیں یا ان تضادات کا جو منظرِ عام پر آنے کے بعد تحلیل ہو جاتے ہیں یا ان رجحانات کا
ادت یا مایوسی کے زیرِ اثر پیدا ہونے کے بعد فنا یا تقلیب کا شکار ہو جاتے ہیں۔ البتہ مارکسی تنقید کا دائرۂ عمل صرف
ن حدود تک محدود نہیں ہے۔ ادب معاشرتی کوائف کا معلول محض ہی نہیں بلکہ علت بھی ہے۔ تاریخی ارتقا غیر ذاتی
توں کے زیرِ اثر وقوع پذیر نہیں ہوتا ہے اور اس میں نظریات کی حیثیت محض ضمنی نہیں ہوتی ہے۔ تاریخ فرد اور نظریات
دونوں کے تعامل سے وجود میں آتی ہے۔ ادب، فلسفہ، افکارِ سیاسی اور اصولِ اخلاقیات تاریخی ارتقا کے موثر / قوی عوامل
وتے ہیں۔ مارکسیت اس امر کی تفتیش کی کوشش کرتا ہے کہ یہ عوامل سماجی تبدیلیوں کا مسبب بننے سے قبل کس طرح
نظرِ عام پر آتے ہیں۔

سماجی تبدیلیوں کی زد میں آنے والے گروہوں اور طبقات کو ایسے نظریات سے تقویت ملتی ہے اور وہ ان کی
دت مزاحمت میں ممد ثابت ہوتے ہیں۔ بہ الفاظِ دیگر ان گروہوں اور طبقات کو مزاحمانہ رول ادا کرنے میں سہولت
ولی ہے۔ مختلف حالات میں ایسے گروہ اور طبقات مفلوج کر دینے والی شکست پسندی کو فروغ دے سکتے ہیں۔ گو عموماً

...زوال طبقات ہی اس کیفیت سے دوچار ہوتے ہیں۔ لیکن ان کے زیرِ اثر سماج کے صالح عناصر تک متاثر ہو جاتے ہیں اور ...کے کسی رول کو تقویت ملتی ہے۔ البتہ نظریات کے باعث سماجی تبدیلیوں کی زد میں آنے والے گروہوں اور طبقات میں ...ور بیدار ہوتا ہے اور ان کی قوتِ عمل میں اضافہ ہوتا ہے جس کی مدد سے وہ تاریخ میں اپنا تعمیری رول ادا کرتے ہیں۔ ...لیے تنقید کو عصری ادب کی سطحیات سے بلند ہو کر بنیادی/کلیدی امور کے حوالے سے ادب کا محاسبہ کرنا چاہیے۔

مارکسی تنقید اس غلطی کا شکار نہیں ہوتی کہ وہ ادب کو بورژوا اور غیر معیاری، یا انقلابی اور معیاری جیسے خانوں ...تقسیم کرے۔ بورژوا کے دورِ عروج میں جب جاگیرداری اور قرونِ وسطیٰ کی باقی ماندہ بندشوں کے خلاف جد و جہد ...ری تھی شیکسپیئر، گوئٹے، شلر اور ہین/ہائن کا ادب اپنی ارفع ترین شکل میں منظرِ عام پر آیا۔ اس کے بعد کے دور ...میں ٹرلوپ جیسے ادیبوں کے ہاں اپنے طبقے کی مدح سرائی یا اس کے لیے محض سامانِ تفریح مہیا کرنے سے سروکار ملتا ہے۔ بالزاک اور ڈکنز جیسے مصنفین کے ہاں اپنے طبقے پر جرأت مندانہ تنقید کا انداز پایا جاتا ہے۔ البتہ ان کی تنقید سے یہ ...شہ نہیں تھا کہ اس سے سماج کی بنیادیں ہل جائیں گی۔ مارکسی تنقید ادیبوں سے یہ مطالبہ ہرگز نہیں کرتی کہ وہ اپنے ...سوص تاریخی حالات سے آنکھیں بند کر کے ہر حال میں انقلابی رویہ ہی اختیار کریں۔ اسی باعث اینجلز نے بالزاک ...ایک عظیم ترین ناول نگار سے تعبیر کیا۔ البتہ اس کے ساتھ ساتھ اینجلز نے سماج سے متعلق بالزاک کے ...امت پرستانہ تصورات اور اس کے ایک فنا پذیر طبقے سے گہری وابستگی کی جانب بھی اشارہ کیا۔ اس امر کی توجیہ یہ ہے بالزاک کے ہاں معاشرے کی حقیقی عکاسی کے پسِ پشت غیر متعصبانہ انصاف کا جذبہ کارفرما ہے۔ لیکن ایک نقاد کو اس ...تب بھی اشارہ کرنا چاہیے کہ کسی ادیب کے ہاں خلوص کا یہ جذبہ اس صورت میں کس طرح بے سود ثابت ہوتا ہے جب ...اج کی بنیادیں منہدم ہو رہی ہوتی ہیں اور بالآخر وہ سماج ہی فنا ہو جاتا ہے۔ ایک روایتی بورژوا ادیب میں اپنے دور ...مسائل سے آنکھیں چار کرنے کی جرأت نہیں ہوتی اور وہ حالات کے تقاضوں کے برخلاف ذہنی آزادی کے حصول ...کی کوشش کے لیے بھی آمادہ نظر نہیں آتا۔ اس کی مثال بورژوا دورِ عروج میں ردِ عمل کے بعض مخالف ادیبوں ...ہاں ملتی ہے۔ اس قسم کے ادیب عیسائیت یا یوگا میں پناہ ڈھونڈتے ہیں۔ عقل و دانش اور سائنس کی تحقیر میں ...غول رہتے ہیں۔ یا اپنے قارئین کو رضا بالقضا اور ترکِ تعلق جیسے تصورات میں فرار حاصل کرنے کی تلقین کرتے ہیں۔ ...یزر (DREISER) نے اپنے قبل از انقلابی دور ہی میں یہ بات کہی تھی جو بیشتر ادیب انقلاب سے مراجعت کے بعد کہتے ہیں:

...میں نے جو کچھ دیکھا ہے اس میں مجھے کوئی معنویت نظر نہیں آئی۔ میری زندگی دہشت اور خوف سے عبارت ہے۔"

نقاد کو صرف نمایاں اور ظاہری معاشرتی رجحانات سے سروکار نہیں رکھنا چاہیے بلکہ اسے ناول اور شاعری ...ے پیش کردہ کسی مخصوص صورتِ حال سے متعلق شعور کے گہرے اور پائیدار معیارات پر اپنی نگاہیں مرکوز رکھنا ...چاہیے۔ ادب ہم عصر سیاسی فلسفیانہ افکار کی توضیح و تشریح کرتا ہے۔ ڈیفو کی ROBINSON CRUSOE بطور ادبی ...شہ پارہ ان رجحانات کی آئینہ دار ہے جن کے زیرِ اثر لیبنٹز (LEIBNITZ) کا فلسفۂ جوہرِ واحد اور آدم اسمتھ کا فلسفۂ انفرادیت ظہور میں آیا۔ البتہ یہ امر بہرکیف اپنی جگہ پر ہے اور جس کی جانب پروفیسر لیرڈ (LAIRD) نے

اپنے مضمون THE PHILOSOPHY OF ROBINSON CRUSOE میں اشارہ بھی کیا ہے کہ اٹھارویں صدی کی نمائندہ اس پُرلطف ادبی پیش کش میں دیگر عصری فلسفیانہ اور مذہبی رجحانات بھی جلوہ گر نظر آتے ہیں۔ CERVANTES کی DON QUIXOTE سولہویں صدی کے اسپین میں عقلیت اور وہمیات کے مابین کشمکش کو آشکار کرتی ہے۔ البتہ اس عظیم تصنیف کا دائرۂ عمل محض اس مرکزی نکتے ہی تک محدود نہیں۔ صنعتی انقلاب کے ابتدائی دور میں تیرہ و تاریک شیطانی ملوں کے ہاتھوں ہزیمت اٹھانے والے عام کاریگروں کا ردِ عمل بلیک کے ہاں ملتا ہے۔ لیکن اس ردِ عمل کے اظہار میں بلیک دراصل اس مخصوص معاملے سے کہیں بلند ہو کر انسان کے انسانی اوصاف سے محروم ہونے کے سنگین مسئلے پر اظہارِ خیال کرتا ہوا نظر آتا ہے۔ یہ مسئلہ مارکس کی تصانیف میں بھی کلیدی اہمیت کا حامل ہے۔

سماجی ترقی کے دور میں بورژوا ادب تخلیقی اور مثبت ہوتا ہے اور وہ صرف ایک ترقی پذیر طبقے کے احساسات اور آرزوؤں کی عکاسی نہیں کرتا بلکہ اس صورت میں ادب پورے سماج کی قیادت کا فریضہ انجام دیتا ہے۔ اگر مارکسی فکر میں تہذیب و تمدن کے ضمن میں بورژوا طبقے کی خدمات کے جائزے کی صلاحیت خود بورژوا طبقے سے بہتر ہو تو مارکسی ادبی تنقید میں سرمایہ دارانہ سماج کی روحانی ترقیات کی تحسین آفرینی ان بورژوا رومانیت پرست ادیبوں کی بہ نسبت کہیں بہتر انداز میں ملے گی جو اسے صرف ادنیٰ کاروباریت سے تعبیر کرتے ہیں۔

مارکسیت تاریخ ماضی اور غیر سوشلسٹ سماج کی تمام شکلوں کے وجود کی منکر نہیں بلکہ ان کے ناگزیر ہونے اور سماجی ورثے میں ان کے رول کی قائل ہے۔ اسی طرح مارکسی ادبی تنقید ایسے نظریے کی قدر و قیمت اور کارکردگی کی تفہیم و تشریح کرتی ہے جس کے زیرِ اثر مختلف سماجی نظام منظرِ عام پر آتے ہیں۔

لیکن مارکسیت میں ایسے نظریات اور نظام کے کھوکھلے انجام کا ذکر بھی ملتا ہے۔ اسی باعث عبوری دور کے ادب پر مارکسی تنقید خصوصی اہمیت کا حامل ہے۔ اس کی ایک جھلک پشکن (PUSHKIN)، لیرمونتوف (LERMONTOV) اور ان کے انیسویں صدی کے پس منظر اور گوگول (GOGOL) ترگنیف (TURGENIEF) چیخوف اور ٹالسٹائی کے ان کے بعد کے دور سے تعلق جیسے موضوعات پر عصری روسی تنقید میں ملتی ہے۔

یہ متصور کرنا غلط ہوگا کہ کسی دور کے ادب میں مارکسیت صرف سماجی حالات ہی کے بالواسطہ اور بلاواسطہ اثرات کا مطالعہ کرتا ہے۔ اوّلاً وسیع تر معاشرتی رجحانات ایک ایسی پختہ تجسیم کی شکل میں ظاہر ہوتے ہیں جو فی نفسہٖ کلی طور پر منفرد ہوتے ہیں۔ کیونکہ افراد ہی معاشرتی رجحانات کے علمبردار ہوتے ہیں۔ البتہ یہ عین ممکن ہے کہ ان افراد کو اس امر کا احساس ہی نہ ہو۔ اس سے یہ مراد نہیں ہے کہ افراد محض کٹھ پتلی ہوتے ہیں یا غیر ذاتی قوتوں کے آلۂ کار ہوتے ہیں۔ ایک طرف دورِ نشاۃ ثانیہ کا فرد، دوسری طرف صاحبِ جائداد شخص اپنی اصل شکل میں اپنے سماجی رتبے کی حقیقی عکاسی کرتے ہیں۔ زندگی کی بہ نسبت ادب میں یہ عکاسی زیادہ نمایاں ہوتی ہے۔ کیونکہ ایک فن کار کی بصیرت کسی شخص کو خود اس سے کہیں بہتر انداز میں آشکار کرتی ہے۔ آرٹسٹ کا فریضہ معاشرتی اور منفرد ذاتی پہلوؤں کو کلی شکل میں پیش کرنا ہے۔ نقاد کا یہ فرض ہے کہ وہ غیر منقسم پہلوؤں کی شناخت کرے۔ مثال کے طور پر چیخوف پر تنقید کی بہترین شکل یہ ہے کہ وہ اس نکتے

جاگر کرے کہ چیخوف کے ہاں کردار کس طرح ایک انحطاط پذیر طبقے کی نشاندہی کرتے ہیں اور ان کے ذریعے کس طرح ان کے
پورے عہد کے فنا کا تصوّر سامنے آتا ہے۔

تسہیل پسندی اور غلط فہمی کے باعث بعض مغالطے پیدا ہو گئے ہیں لیکن ان کے قطعاً برخلاف مارکسیت ادب
متعلق ایک اور تصوّر کا بھی حامل ہے۔ یہ تصوّر انکشاف سے عبارت ہے۔ ایسا انکشاف جو فی الواقع شخصیت کی بنیادی
یم میں پنہاں ہو۔ اس انکشاف کا تعلق حتی الوسع انسانی اقدار اور کوائف سے بھی ہے اور انکشاف کا عمل کسی مخصوص
قے یا دور سے ماوراء ہونے کے باعث خصوصی اہمیت کا حامل ہوتا ہے۔ مارکس نے جا بجا انسانیت کی اصل شکل پر زور
ہے۔ اس کے خیال میں سرمایہ داری کے ہاتھوں استحصال کی ہر ممکنہ شکل نے انسانیت کو داغدار اور مجروح کر دیا ہے۔
ف سوشلزم انسانیت کو آزادی اور اطمینان بالذات سے ہمکنار کر سکتا ہے۔

روسی تنقید میں شیکسپیئر کے کسی ڈرامے میں صرف پیش کش کردہ رجحانات کے انتہائی ذاتی انکشاف ہی نہیں بلکہ
میں لافانی انسانیت دوستی کے تصوّر کی تفتیش کا پہلو بھی ملتا ہے۔ انسانیت دوستی کا تصوّر ہر دور کے آرٹ میں
جاتا رہا ہے۔ اس سے قطع نظر کہ ہر دور کے خصوصی حالات اور مسائل کے باعث اس تصوّر کی پیش کش میں تبدیلیاں
قع ہوتی رہی ہیں۔ اپنے مقالے بہ عنوان "شیکسپیئر" مشمولہ SELECTED WORKS (۱۹۳۹ء) میں سمرنوو SMERNOV
شیکسپیئر کا مطالعہ نشاۃ ثانیہ عہد کے انسانیت دوست کے طور پر کیا ہے۔ وہ شیکسپیئر کو صرف اپنے طبقے کا نمائندہ
صوّر نہیں کرتا۔ طبقے کی نمائندگی کا تصوّر ۱۹۲۰ء میں بہت مقبول تھا۔ اپنی تصنیف "شیکسپیئر" (۱۹۳۶ء) میں
CONSTANTINE DERZLAR نے عالمی تہذیبی ورثے میں شیکسپیئر کی دین، اس کی نفسِ انسانی کی گہری بصیرت
ڈرامے کی شکل میں جیتے جاگتے پیکروں کی مدد سے انسانی مسائل کو حل کرنے کی صلاحیت کا بطورِ خاص ذکر کیا ہے۔
کا قول ہے کہ: "شیکسپیئر اس کے جری ذہن، زندگی کے پُربصیرت ادراک، بنی نوع انسان سے بے پایاں محبّت
حقیقت پسندانہ عبقریت، بصیرت افروز اور گہرے خیالات، صدق گوئی اور اصل زندگی کی عکاسی کے باعث
ر برتر ہے۔"[۵]

اس تصنیف میں شیکسپیئر پر مختلف مضامین سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ مارکسی نقطۂ نگاہ سے مختلف النوع صورتوں پر
شیکسپیئر کا مطالعہ کیا جا سکتا ہے۔

البتہ ہمارے اپنے دور میں جب کہ ہم انقلاب کی زد پر ہیں۔ ایک انحطاط پذیر طبقے کا ادب زیادہ توجہ اور
یت کا متقاضی ہے۔ تنقید کو بھی اسی ادب سے سروکار رکھنا چاہیے۔ یہ ادب ایک طرف ترکِ دنیا، لیت ولعل او
ت اور دوسری طرف خود مختارانہ افعال کے باعث ابطالِ حقیقت جیسے موضوعات سے متعلق ہے۔ ہمارے دور کے
م بورژوا فلسفے اور ادب کے پس پشت غیر منطقیت / غیر معقولیت کارفرما نظر آتی ہے کیونکہ واقعات پر مطلق
ہونا ہی بورژوا پن کی علامت ہے یا تو حقیقت فی نفسہٖ غیر منطقی / غیر معقول ہے یا پھر عقل اس کا ادراک کرنے
قاصر ہے۔ فی الحال سماج بہ یک وقت فنا، تشکیلِ نو اور معاشرتی تقلیب کے لیے فکرِ انسانی کی پختگی میں مصروف

ہے۔ یہ ناگزیریت ایسے حضرات کے لیے بہت گراں ہے جو ۱۹۲۰ء کے استحکام کی بحالی کے خواہش مند ہیں یا ان افراد کے لیے جو فنا پذیر معاشرے کے بھیانک پہلوؤں کے مقابلے میں کسی بھی تبدیلی سے خائف ہیں۔ اگر موجودہ نظام کا استحکام مقصود ہے تو اس کے لیے ہر ممکنہ شکل میں عقلِ انسانی کی برتری کے تصور کو پاش پاش کرنا ازحد ضروری ہے۔ آج ہر فکر، منطق اور سائنس کو اس لیے خطرناک متصور کیا جاتا ہے کہ یہ سرمایہ دارانہ نظام کی بقا کے لیے خطرہ ہے۔ آج تمدنِ انسانی جس بے عملی اور بے مقصدیت کا شکار ہے اس سے نجات حاصل کرنے کی صرف ایک صورت ہے۔ البتہ اس کے لیے بورژوا مفکرین کی خاصی بڑی اکثریت کو بہت مہنگی قیمت ادا کرنا ہوگی۔" وہ اس امر کا بیّن ثبوت فراہم کرتے ہیں کہ وہ اولاً / بنیادی طور پر بورژوا ہیں اور مفکرین بعد میں۔ اسی دن سے یہ امر ناگزیر ہو جائے گا کہ تمدنِ انسانی دو شاخوں میں تقسیم ہو جائے۔ قدامت پرست بورژوا تمدن لاادریت کی شکل اختیار کرنے کے بعد اب انتہائی تیزی سے رجعت پسندانہ تصوّف میں ضم ہو رہا ہے۔ دوسری شاخ یعنی مارکسی تنقید نے فکرِ انسانی کی حریت اور قوت کو اس طرح محفوظ رکھا کہ اس نے سرمایہ دارانہ نظام میں پنہاں تضادات کی دھجیاں بکھیر دیں اور بانگ دہل اس نظام کو نیست و نابود کر دینے کا مطالبہ کیا۔"

غرضیکہ مارکسیت اب روایتی تمدن کا وارث ہونے کا مدعی ہے اور فکرِ انسانی کے مثبت ارتقا کا آئینہ دار ہے۔ جب کہ جدید بورژوا تمدن کا روایت سے تعلق منقطع ہو چکا ہے اور روز بروز محدود تر ہوتا جا رہا ہے (پروست) سماج کے ایک ذیلی طبقے سے غیر متعلق ہر شئے کی جانب بے توجہی کا رویّہ عام ہے۔ اس سے یہ مراد نہیں کہ دورِ انحطاط کے ادیب مثلاً پروست سے لے کر ژاں پال سارتر تک اور لارنس سے لے کر کوئسلر (KOESTLER) اور آلڈس ہکسلے تک اہم فن کار نہیں ہیں۔ دورِ انحطاط کی اپنی صفات ہوتی ہیں۔ ایک بے حس و حرکت چشمے میں بھی جلوۂ صد رنگ کی کیفیت پائی جاتی ہے۔ انحطاط کے باعث ہمارے عہد میں تجرباتی ذہانت اور حساسیت کی خصوصیات اس درجے عود کر آئی ہیں کہ ان کی نظیر اس سے قبل نہیں ملتی لیکن ان فن کاروں کی عبقریت میں کوئی نہ کوئی تبدیلی ضرور واقع ہوئی ہے۔ ان کی تصانیف میں کچھ نہ کچھ حیرت انگیز اور عجیب عنصر ضرور شامل ہوا ہے۔ یہ فن کار اپنی ذات اور نظام میں اس بری طرح گرفتار ہیں کہ یہ اس سے بلند ہو کر اپنی ذات اور اپنے نظام کو تنقیدی نگاہ سے نہیں دیکھ سکتے۔ یہ بے اختیاری اور غیر شعوری طور پر انتہائی وفاداری کے ساتھ اپنے عہد کو آئینہ دکھاتے ہیں۔

پلیخنوف (PLEKHANOV) نے اس امر کی جانب اشارہ کیا ہے کہ اپنی تصنیف ART AND SOCIETY میں انیسویں صدی کے رومانیت پسند فن کار بورژوا سماج کی حسیّت، تنگ دلی اور اس کی کاروباریت سے بخوبی واقف تھے بلکہ اس کے خلاف انھوں نے بار بار صدائے احتجاج بھی بلند کی لیکن ان کی تنقید سے بورژوا معاشرے کو ذرّہ برابر بھی خطرہ نہیں تھا۔ یہ فن کار انقلاب برپا کرنے کے قطعاً خواہش مند نہیں تھے۔ وہ بورژوا سماج کو صرف بورژوا خواہشات کی بندش سے آزاد دیکھنا چاہتے تھے۔ آج جب کہ آرٹ تنقید کا فریضہ انجام دینے کے علاوہ سماجی جدوجہد میں بھی اہم رول ادا کرتا ہے اس لیے یہ اب حقیقت پسندانہ اور پُر قوّت ہو گیا ہے۔ لیکن جب فن کار اور اس کے سماج

ماحول میں افسوسناک حد تک تضاد ہو اور انقلاب کا خدشہ ہو تو آرٹ خلا میں گم ہونے کی طرف رجحان رکھتا ہے اور ان
بورژوا اقدار کی مدافعت کرنے لگتا ہے جنھیں وہ اس سے قبل رد کر چکا ہوتا ہے۔ اور سماجی تبدیلیوں کے خلاف
پشتہ بندیوں کا کام انجام دیتا ہے یا پھر ایسی عینیت کی تشکیل کی کوشش کرتا ہے جس کا واقعتاً کوئی وجود ہی نہیں ہو
کیوں کہ حقیقی زندگی کی موجودگی میں شاعر اپنی خیالی دنیا آباد کرنے پر مجبور ہوتا ہے۔ یہ محض زندگی کے تئیں ردّ عمل نہ
ہوتا بلکہ اس کا منبع بورژوا فطرت پرستی کا وہ بے معنی پن ہوتا ہے جس کو حیات آفریں/حیات بخش تحریکوں ا
ذمہ داریوں سے فرار حاصل کرنے والے بے طبقہ اور تنہا افراد کی بے معنی تفصیلات سے سروکار رہتا ہے۔ جوکس
اس طرز فکر کی مذمت کی ہے۔ ایک اور ادبی ردّ عمل ایسے افراد کا ہوتا ہے جو طبقہ وارانہ رشتوں میں انقلاب کے
اس شرط پر تیار ہوتے ہیں کہ اس سے بورژوا طرز زندگی اور سرمایہ دارانہ اخلاقیات کو کوئی گزند نہ پہنچے۔ ان کی تر
ایسے افراد کی سی ہے جو انڈے توڑے بغیر آملیٹ/خاگینہ بنانے کی خواہش رکھتے ہیں۔ ان افراد کو مقصد تو عزیز
ہوتا ہے لیکن وہ وسائل استعمال کرنے پر رضامند نہیں ہوتے۔ یہ افراد بخوبی جانتے ہیں کہ ان کا سماج روبہ زوال
لیکن زوال سے آنکھیں چرانے کے لیے یہ ناممکنات میں پناہ ڈھونڈتے ہیں۔ یہ حکمراں طبقے کی بے عملی سے مایوس
ہوتے ہیں لیکن مزدور طبقے کو حقارت کی نظر سے بھی دیکھتے ہیں۔ سماج کی تشکیلِ نو کی خواہش رکھنے کے باوجود یہ افرا
اقتدار کو شر سمجھتے ہیں۔ قطع نظر اس امر کے کہ اقتدار کن ہاتھوں میں ہے اور کس مقصد کے لیے استعمال ہو رہا ہے۔

متوسط طبقے کا وجود ہی نظامِ وقت کے خلاف بغاوت کرنے کا سبب بنا لیکن اس کے ساتھ ہی اس طبقے
یہ احساس بھی تھا کہ وہ بغاوت کرنے والے گروہ یعنی مزدوروں کے ساتھ اپنے آپ کو مکمل طور پر ہم آہنگ نہیں کر
اسی باعث یورپ میں فاشسزم کی تحریک کو پھلنے پھولنے کا موقع ملا اور آج بھی اسی کے زیرِ اثر ان رجحانات کو فر
ملتا ہے۔ کوئی مصنف جب اس صورتِ حال سے دوچار ہوتا ہے کہ وہ تصوف اور بے معنی اخلاقیات کو رد کرنے کی قد
نہیں رکھتا ہے اور اس کے ساتھ ہی وہ سوشلزم کی مطلوبہ ذمہ داریوں اور قربانیوں سے بھی خائف ہوتا ہے تو اس کا فیصہ
اس جملے پر مشتمل ہوتا ہے۔ I CHOOSE BLIMP۔ ایک آخری امکان وہ ہے جسے ہم وجودیت کی اصطلاح میں حتمی فنا اور تنہ
سے تعبیر کرتے ہیں۔ اس تصنیف کے آخری مقالات وجودیت کی تشخیص و تعریف کے طور پر کرتے ہیں کہ یہ ایسے افراد کے اح
جُرم کا نام ہے جو کسی ایک فریق کی حمایت کرنے سے قاصر ہوتے ہیں یا ایسے افراد کے احساسِ بے بسی کا نام ہے جو مزدور طبقے
تاریخی مشن کا اعتراف کرنے سے انکار کرتے ہیں۔

اگر ادب اس انکار پر مشتمل ہو تو اس کا پیغام کیا ہوگا؟ پلیخنوف (PLEKHANOV) کے الفاظ میں "جس رفتار سے
حکمراں طبقہ فنا ہوتا ہے اسی رفتار سے اس کے نظریات بھی اپنی قدر و قیمت کھو بیٹھتے ہیں اور اسی رفتار سے اس طبقے کے حس
مزاج ادب بھی معدوم ہو جاتا ہے" فلسفیانہ محاورۂ بیان میں ہم ان افراد کی شدید قنوطیت سے واقف ہیں جو کائنا
میں منتقل انسانی مخمصے کا ذکر کرتے ہیں۔ چونکہ وہ اس نکتے سے باخبر ہوتے ہیں کہ ان کی عائد کردہ شرائط کے حدود کے اندر
معاشرے کو زوال سے محفوظ رکھنے کا کوئی طریقہ نہیں اس لیے وہ انقلاب کے امکان سے اپنے تئیں خائف اور بدحواس محسو

تے ہیں اور یہ خیال پیش کرتے ہیں کہ کائنات انسانی آرزوؤں کی انتہائی سنگدل اور بے رحم دشمن ہے اور اپنی حالت کو
بہتر بنانے کے لیے انسان کی کوشش زبردست قسم کی سوءِ عقیدت ہے۔ اسی احساسِ بے بسی کے زیرِ اثر اور زندگی کی غیر معقولیت
اور بے رحمی کے سادیت پسند اثبات کا جذبہ پیدا ہوتا ہے۔ جو ہمیں سارتر کے ہاں ملتا ہے اور تمام تقابلوں اور مفاہمت کو
رد کرنے اور تسلط کے انداز میں محض قوت پر اصرار کرنے کا جذبہ پیدا ہوتا ہے اور بغیر کسی باک کے انسان اور ترقی کے ہر ممکن
وسیلے کو تباہ و برباد کرنے کا تصور وجود میں آتا ہے۔ ایسے افراد جو آگے بڑھنے، پیچھے ہٹنے یا قدم اٹھانے کسی شئے پر بھی قادر نہیں
ہونے وہ انتہائی تاسف کے عالم میں لفظاً اس سے زیادہ کچھ اور نہیں کہہ سکتے کہ "باقی خاموشی ہے۔"

ادبی اور فلسفیانہ تنقید کے ہاتھوں ہم عصر نظریات کی ظلمت پسندی اور ان کی غیر معقولیت کا پردہ چاک ہوتے
کی صورت ہی میں جدید ذہن زندہ رہ سکتا ہے اور نمو پا سکتا ہے۔ گو مذکورہ مقالے مارکسی تنقید کے اس اہم فریضے کو ادا
نہیں کرتے البتہ وہ اس سمت میں راہ ضرور ہموار کرتے ہیں اور اس جانب اشارے بھی کرتے ہیں۔ مختلف میدانوں میں اس
تنقید کے اطلاق سے قبل ہمیں اپنے تنقیدی آلۂ کار کی جانب توجہ دینا چاہیے اور انھیں استعمال کرنے کا فن سیکھنا چاہیے۔
اولین ترین کام یہ ہے کہ ہمیں قبل از سرمایہ داری سولھویں صدی کے ادب کی ابتدا سے لے کر مختلف ادوار اور خود اپنے
عہد یعنی شیکسپئر سے لے کر ایچ۔ جی ویلز تک کے ادبی سرمایہ کو مارکسی نقطۂ نظر سے پرکھنا چاہیے۔

ڈاکٹر داؤد رہبر

جوش ملیح آبادی کا ایک خط

سردار دیوان سنگھ مفتون کے نام

۱۹۷۰ء میں بابا نانک کی پانچ سو سالہ برسی ہندوستان میں منائی گئی، بانیانِ مذاہب میں ان کے علاوہ اور کوئی ایسا بزرگ نہیں جو شاعر بھی ہو۔ بابا صاحب مستثنیٰ ہیں۔ ایک بانی مصوّر البتہ ہوا ہے۔ یعنی مانی۔

برسی کے سلسلے میں بابا صاحب کے پیروؤں نے طے کیا کہ ایک ستھری کتاب سیرتِ گرو نانک کے بیان کو انگریزی میں لکھی جانی اور شائع ہونی چاہیے۔ اس کام کے لیے ملّت کی نظرِ انتخاب پنجابی یونیورسٹی (چنڈی گڑھ) کے پروفیسر ہربنس سنگھ صاحب پر پڑی۔ آپ کو اس تصنیف کے لیے یکسوئی درکار تھی۔ انتظام ہوا کہ آپ ہارورڈ یونیورسٹی میں آ کر ایک سال قیام فرمائیں گے اور خلل سے محفوظ ہو کر اس میں مشغول رہیں گے۔ اس کتاب کا لکھنا آپ کے لیے چنداں دشوار نہ تھا۔ عمر بھر کی لگن اور تحصیل نے انھیں اس کام کے لیے تیار کر رکھا تھا۔ آپ کا قلم سطور کے ہار پروتا چلا گیا۔ دیکھتے دیکھتے یہ کتاب یہاں لکھی گئی۔ کچھ عرصہ بعد چھپی تو آپ نے ایک نسخے کا عطیہ مجھ کو بھیجا۔

آپ کی یہ تصنیف پڑھتے ہوئے میری تسکین اسی طرح ہوئی جیسے پہاڑی چشمے کا شفاف پانی پیاس بجھاتا ہے۔ بابا صاحب کی سادہ حیات کی کہانی جیسی زبان میں بیان ہونی چاہیے تھی ویسی طرزِ ادا انگریزی میں پروفیسر ہربنس سنگھ صاحب کو مبدءِ فیاض سے عطا ہوئی ہے۔ بے خطا انگریزی محاورہ اور اسلوب ایسا کہ اس میں پنجابی کی سی سادگی بے ساختگی اور خلوص کی جھلک ہر ہر جملے میں برقرار ہے۔ اس اسلوب کے لیے پاکیزہ بہترین لفظ ہے۔

میری خوش نصیبی ہے کہ ۱۹۷۰ء میں پروفیسر صاحب اپنی بیگم اور اولاد کی معیت میں بوسٹن کے پاس مقیم تھے اکثر ان سے ملاقات رہی۔ شیریں گفتگو سے پروفیسر صاحب نے موہ لیا۔ نرم مزاج، ہنس مکھ، مہمان نواز، خود دار یا حمیّ

سکھوں کی تاریخ اور گوروؤں کی سیرت پر پروفیسر صاحب کی دس سے زیادہ کتابیں انگریزی میں شائع ہو چکی ہیں۔
تین بیس برس سے وہ سکھ مت کے انسائیکلوپیڈیا کی تدوین میں مصروف ہیں، پنجابی افسانوں کے انگریزی
جمے بھی انھوں نے کیے۔ اس کی ایک جلد انھوں نے اپنے دستخط کے ساتھ مجھ کو عنایت فرمائی۔
باتوں باتوں میں معلوم ہوا کہ آپ اوائلِ زندگی میں ولی عہد ریاست فرید کوٹ کے اتالیق تھے۔ یہ سُن کر
مجھے سردار دیوان سنگھ مفتون کا خیال آیا۔ میں نے پروفیسر صاحب سے پوچھا کہ آپ کا ان سے بھی رابطہ رہا یا نہیں۔
ھوں کی چمک کے ساتھ بولے، ہاں ہاں مفتون سے میری خوب دوستی ہے۔ ڈیرہ دون میں مفتون مجھ سے ملنے اکثر
رہے۔
۱۹۷۴ء کی گرمیوں میں پروفیسر صاحب ہارورڈ کا قیام پورا کر کے ہندوستان کو روانہ ہو گئے۔ ان کے
زند نریندر سنگھ صاحب اور بیٹی (جس کو گھر میں نکی کہتے ہیں) امریکہ ہی میں مقیم رہے۔ تعلیم پوری کر کے ہماری طرح
بیں ٹک گئے۔ یوں بالواسطہ پروفیسر صاحب سے رابطہ قائم رہا۔
پچھلے سال گرمیوں میں ایک روز ہمارے ٹیلی فون کی گھنٹی بولی۔ اٹھا کر کان لگایا تو ایک صاحب پنجابی میں
مرسے بولے "پروفیسر صاحب ہچھاتیا؟"* محبت کا جادو کام کر گیا۔ میں نے اِدھر سے پوچھا "پروفیسر ہربنس سنگھ
حب ہیں؟" فرطِ مسرت سے بولے "کمال کر دیا، بیس برس بعد آواز پہچان لی!" فون کی گفتگو سے معلوم ہوا
. آنکھوں کے آپریشن کے لیے امریکہ آ کر اپنے فرزند ڈاکٹر نریندر سنگھ صاحب کے ہاں ٹھہرے ہوئے ہیں۔ مجبوری
رہی کہ اب کے وہ یہاں بوسٹن نہ آسکے۔ دونوں جانب سے خط لکھے گئے۔ اور انھوں نے مجھے اپنی ایک تازہ کتاب
سل کر کے بھیجی جس میں اُن کے کیے ہوئے پنجابی افسانوں کے انگریزی ترجمے ہیں۔
فون پر انھوں نے بتایا کہ وہ مفتون کی زندگی کے آخری ایام میں ان سے ملنے ڈیرہ دون گئے۔ مہاراجہ نابھ
یاں ڈیرہ دون میں گزارا کرتے تھے۔ اور مفتون کی پہلی ملاقات اپنے اس آقا سے یہیں ہوئی تھی۔ مہاراجہ
دلی کے فوراً بعد کچھ مدت ڈیرہ دون ہی میں رہے۔ مفتون نے مہاراجہ سے ہمدردی اور وفا کا سلوک رکھا۔
ڈیرہ دون میں حاضری دیتے رہے۔ چنانچہ اس کوہستان سے مفتون کی پرانی وابستگی تھی۔ ریٹائر ہو کر انھوں نے
ں گھر بنایا۔ کہاں دلی میں "ریاست" اخبار کی ایڈیٹری کے وہ گہما گہمی والے ایام اور کہاں ڈیرہ دون کی یہ گوشہ گیری
یہاں اُن کے گرویدگان گاہے گاہے اطرافِ ملک سے ان کے درشن کو پہنچ ہی جاتے۔
پروفیسر ہربنس سنگھ صاحب سے ان کا بہت محبت کا تعلق تھا۔ ڈیرہ دون میں ملتے تو باتوں کا سلسلہ
نہ ہوتا۔ ایک روز جوش ملیح آبادی کی صحبتوں کو یاد کرتے ہوئے سردار صاحب اٹھ کر اندر گئے۔ جوش کے خط
ن کے نام تھے اندر سے نکال کر لائے اور پروفیسر ہربنس سنگھ صاحب کو دے دیے۔
ٹیلی فون پر پروفیسر صاحب نے مجھ سے ان خطوط کا ذکر پچھلے سال کیا تو میں نے درخواست کی کہ ان خطوں

* یعنی "پہچانا؟"

کے فوٹو مجھ کو عنایت ہوں تو میں ان کو ایک نوٹ کے ساتھ "قومی زبان" (کراچی) میں اشاعت کے لیے بھیج دوں
پورے ایک سال بعد پروفیسر صاحب نے وعدہ پورا یوں کیا کہ ان پانچ خطوں میں سے جو ان کے پاس ہیں ایک خط
کی فوٹو کاپی مجھے بھیج دی۔ اس کے ساتھ ہی پانچوں خطوں کے انگریزی ترجمے بھی بھیجے۔ یہ اطلاع بھی دی کہ مفتون پر
ایک مضمون کے ہمراہ یہ ترجمے ILLUSTRATED WEEKLY OF INDIA میں شائع کر دیے ہیں۔ ترجمے
پڑھ کر مجھ کو اندازہ ہوا کہ جوش کے جس خط کا فوٹو مجھ تک پہنچا ہے، پانچوں خطوں میں بھرپور خط وہی ہے۔ اس خط
کی عبارت درج ذیل ہے:

ترقی اردو بورڈ

کراچی ۱۹/۶/۷۱

پیارے آپ کو خط لکھنا کوئی آسان مرحلہ نہیں، اوروں کو تو دو سطروں پر ٹرخا دیا جا سکتا ہے۔
لیکن آپ کو خط لکھتے وقت کاغذ پہ رکھ دیا ہے کلیجہ نکال کر" کے مرحلے سے گزرنا پڑتا ہے۔[1]
کئی روز سے چاہ رہا تھا کہ آپ کو خط لکھوں لیکن یہ عرض کروں کہ کس قدر ہولناک طور پر مصروف رہتا ہوں۔
۳ یا کبھی کبھی چار بجے صبح کو بیدار ہو کر دو ڈھائی گھنٹے تک اگر طبیعت رو براہ ہوتی ہے تو شعر
کہتا ہوں۔ شعر کی جانب دماغ رجوع نہ ہو تو مطالعہ کرتا یا کوئی مضمون لکھتا یا اپنے سوانحِ زندگی کو مرتب
کرتا یا اپنی نظموں پر نظر ثانی کر کے ان کو صاف کرتا ہوں تاکہ پانچ چھ برس میں جو کچھ کہا ہے اسے
چھپوا دوں۔
جب آفتاب طلوع کے قریب ہوتا ہے، ٹہلنے چلا جاتا ہوں۔ وہاں سے واپس آ کر خط بناتا،
ناشتہ کرتا، کپڑے پہنتا اور دفتر چلا جاتا ہوں۔ دفتر میں سر جھکا کر لغت کا کام لگاتار کرتا رہتا
ہوں۔ جب ڈھائی بج جاتے ہیں تو جھکائے دماغ کو سکون دینے کہ اسے دوبارہ کام میں لگا دینے کی
خاطر دفتر ہی میں تخت پر لیٹ جاتا ہوں۔ آدھے گھنٹے یا ۴۵ منٹ آرام کر کے وہیں دفتر میں غسل
کرتا ہوں۔ اور پھر ساڑھے تین یا چار بجے دوبارہ کام کرنے لگتا ہوں، یا چار بجے گھر آ کر یہیں
وہی کام انجام دیتا ہوں۔
اور اس وقت تک کام کرتا رہتا ہوں جب تک آفتاب غروب نہ ہو جائے۔
آفتاب کے غروب ہوتے ہی . . . . ڈرنک شروع کر دیتا ہوں۔ گھڑی سامنے
رکھ کر ہر پیگ کو کبھی بیس اور کبھی پچیس منٹ میں ختم کرتا ہوں۔

---

[1] اس پہلے پیراگراف میں بعض حروف پر زبر زیر لگائے گئے ہیں۔ اصل خط کی ہو بہو نقل کی رو سے لگا دیے گئے ہیں تاکہ شاعر کی اس طرفہ عادت کی جھلک کا لطف اٹھایا جا سکے۔ جوش نے اس خط میں شروع سے آخر تک یہ طریقہ برقرار رکھا ہے۔

آپ جانتے ہیں کہ میں کبھی چار پیگ سے زیادہ نہیں پیتا۔ یہ چار پیگ ڈیڑھ یا پونے دو گھنٹے میں ختم ہو جاتے ہیں۔ پیگوں کے ختم ہوتے ہی فوراً کھانا کھاتا ہوں۔ کھانا کھا کر کچھ دیر جاگتا ہوں اور پھر نو اور دس بجے رات کو سو جاتا ہوں۔

آپ خود ملاحظہ فرمائیں کہ اس مشین کی سی زندگی بسر کرنے والا اپنے دوستوں کو تفصیلی خط کیوں کر لکھ سکتا ہے۔

آج دفتر سے آکر وہ کام کیا ہے جسے "کام چوری" اور "حرام خوری" کہا جاتا ہے اور اسی بنا پر وقت نکال کر آپ کو خط لکھ رہا ہوں۔

آپ کی یاد میرے دل میں چٹکیاں لیتی رہتی ہے۔ دہلی جب گیا تھا دل سے یہ سوچ کر خون کی بوندیں ٹپکنے لگی تھیں کہ ہائے دیوان سنگھ اب اس نگری میں نہیں رہتے ہیں۔

آپ ڈیرہ دون میں شاید احساس تنہائی اور آلام بے کاری میں گرفتار رہیں گے۔ وہاں آپ کا جی نہیں لگ رہا ہوگا۔ موسم بیشک وہاں اچھا رہتا ہے مگر خالی موسم تو نہیں چلا سکتا۔

میرا مشورہ ہے کہ وہاں آپ تصنیف و تالیف یا کسی ادبی ماہنامے کا کام شروع کر دیں ورنہ آپ کا دل بجھ کر رہ جائے گا۔

لیکن سوال یہ ہے کہ سرمایہ کہاں سے آئے گا؟ کاش ہندوستان آپ کے سے جوہر قابل پہچاننے کی صلاحیت رکھتا۔

اگر آپ کا سا انسان کسی زندہ قوم میں پیدا ہوتا تو وہ آج پُج رہا ہوتا۔ دولت اس کے قدم چومتی اور قوم اس کے گرد گھومتی۔ مجھے یقین ہے کہ آئندہ نسلیں آپ کے نام کو اُجاگر کریں گی۔ آپ کے کارناموں کی گونج دُور دُور پہنچے گی۔ آپ کے مجسمے تراشے جائیں گے، مگر اس سے آپ کا کیا بھلا ہوگا۔

ہمیں کیا جو تربت پہ میلے رہے

میرا دل آم کی فصل میں ہندوستان جانے کے لیے میرے سینے میں مچل رہا ہے۔ لیکن کیا عرض کروں۔ زمین سخت ہے، آسمان دور ہے، تین چار ہزار روپے ہوں تو بیوی بچوں سمیت سفر کروں۔ جانتا ہوں تین چار ہزار روپے کی کوئی حقیقت نہیں ہے۔ میں تو ایک ایک رات میں دس دس ہزار روپے اڑا چکا ہوں لیکن اب تین ہزار رُپلیوں کی سی حقیر پونجی بھی نہیں کہ دل کا ارمان اور اپنے ہی دل کا نہیں، بے چاری بیوی کے دل کا ارمان نکال سکوں۔

ہائے بے کسی، ہائے بے چارگی

آپ اے میرے محبوب دوست یقین مانیں کہ اس پورے کرۂ ارض پر اپنی فوری موت کا متمنی مجھ سے زیادہ کوئی نہیں ہے۔ اور جب میں قبرستانوں کی طرف سے گزرتا ہوں تو مجھے قبروں میں

سونے والوں کی آسودگی دیکھ کر ان پر ایسا ہی رشک آتا ہے جس طرح کوئی گدائے راہ نشیں قصر شاہی کی شان و شوکت دیکھ کر کڑھنے لگتا ہے۔

صرف ایک طارق ہی نہیں۔ میرے ہندوستان و پاکستان میں لاکھوں دشمن ہیں، ان بے شمار دشمنوں کے دل میں "اللہ" یہ بات کیوں نہیں ڈال دیتا کہ وہ مجھے مار ڈالیں اور مار ڈالنے کے بعد میری لاش کو پھونک دیں اور پھر اس راکھ پر گھوڑے دوڑا دیں۔ ہے میرے دشمنوں میں کوئی ایسا مائی کا لال جو مجھے اس خونی زندگی کی کال کوٹھری سے رہائی دے کر ثواب دارین حاصل کرے۔

معاف کرنا میرے پیارے دوست، میں نہ جانے کس موڈ میں آکر آپ کو اس کرگیا اور آپ کے وقت کی بربادی کی پروا نہیں کی لیکن اپنا دردِ دل آپ سے نہ کہوں تو کس سے کہوں۔

میری بیگم کا آداب قبول ہو۔ بےچاری بیگم، کاش وہ شاعر کی بیوی نہ ہوتی۔

روتی کیوں ہو بیگم، اللہ ہم دونوں کو بہت جلد ایک ہی وقت میں اٹھائے گا۔

اچھا سلام،

جوش مرحوم

عبدالعزیز ساحر

حسام لاہوری ــــ ایک قدیم غزل گو

پروفیسر زاہد حسن فاروقی[۱] نے "مشعل"[۲] میں سید حسام الدین حسام لاہوری کی ایک غزل شائع کر کے اہلِ تحقیق کے لیے نئے راستے کی نشاندہی فرمائی ہے۔ حسام لاہوری کون تھے؟ انھوں نے زندگی کیسے بسر کی؟ کتنی عمر پائی اور کہاں مدفون ہیں؟ ہمیں کچھ معلوم نہیں کیونکہ فارسی اور اردو کے اکثر تذکرے اور تاریخیں ان کے ذکر سے خالی ہیں البتہ میر علی شیر ٹھٹھوی نے اپنی تالیف "مقالات الشعرا" میں ان کے متعلق چند جملے تحریر کیے ہیں۔

"سید حسام الدین لاہوری، حسام تخلص، بانواب خلیل خان واحمد یار خان یکتا نسبت عزیزی از طرف والدہ دارد۔ فقر اختیاری ورزیدہ درزی فقرا بسیار وازچندی در بلدہ است۔ قادر بخش لقب دارد وکلامش برطبق احوالش خالی از حالتی نیست۔ کبت ودھرہ وریختہ واقسامِ شعر بسیار گفتہ"[۳]

"تاریخ ادب اردو" میں ڈاکٹر جمیل جالبی نے "مقالاتِ الشعرا کے حوالے سے حسام الدین کی اردو گوئی کا ذکر کیا ہے"[۴]

تاریخِ ادب کے مطالعے سے پتا چلتا ہے کہ ابھی تک ان کے متعلق میر علی شیر قانع سے زیادہ معلومات کسی تذکرہ نویس م نہیں پہنچا ئیں اور نہ کسی نے ان کا کوئی اردو شعر بطور نمونۂ کلام پیش کیا ہے۔ میں اپنے مطالعے کی روشنی میں (اگرچہ پنی علمی کم مائیگی کا احساس ہے) پورے اعتماد کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ حسام لاہوری کے اردو کلام کو سب سے نظرِ عام پر لانے کا سہرا پروفیسر فاروقی کے سر بندھتا ہے۔ انھیں یہ غزل نذر صابری[۵] کے توسط سے ملی ہے جیسا کہ ں نے خود اپنے مضمون میں تحریر کیا ہے:

"تاریخِ ادب کی خوش نصیبی کہ گزشتہ دنوں اٹک کی معروف علمی شخصیت اور مجلسِ نوادراتِ علمیہ اٹک کے سکریٹری جنرل محترم غلام محمد نذر صاحب کے کریمانہ توسط سے دارالعلوم حمیدیہ سلطان پور ضلع اٹک میں موجود ایک قلمی بیاض تک احقر کی رسائی

ہوئی۔ صاحبِ بیاض نے سید حسام الدین حسام کی ایک مکمل غزل قلمبند کی ہے۔"

غزل بیاض کے ورق نمبر ۱۱۴ ب پر درج ہے۔ مطلع اور مقطع سمیت گیارہ اشعار ہیں۔ غزل نثر کے انداز میں چودہ سطروں پر تحریر کی گئی ہے (عکسِ بیاض ملاحظہ ہو) ان کے یہ تمام اشعار عارفانہ اور صوفیانہ رنگِ سخن کے غماز ہیں۔ ان کی فکر وحدت اور تسلسل کی آئینہ دار ہے۔ دنیا مقامِ فنا ہے۔ اس سے دل لگانا وبالِ جان ہے۔ اصل زندگی خدائے ذوالجلال کی معرفت و آگہی ہے۔ تخلیقِ کائنات کا مقصد و محور انسان ہے۔ انسان کی بعثت اور عبادتِ الٰہیہ لازم و ملزوم ہیں۔ رشد۔ خدائے قدوس تک پہنچنے کا زینہ ہے، جیسے مضامین اس غزل میں بیان ہوئے ہیں۔ غزل کی ردیف "عبث" بھی دنیا سے بیزاری اور بے نیازی کا عنوان لیے ہوئے ہے۔ پھر اس پر کھوتا، رکھنا، رہنا اور جپنا کے قوافی مستزاد ہیں۔

پوری غزل میں پنجابی زبان کا اثر نمایاں ہے۔ پنجابی چونکہ شاعر کی مادری زبان ہے۔ اس لیے اکثر لفظ پنجابی لہجے اور تلفظ کے آئینہ دار ہیں۔ اس پس منظر کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے ہم غزل کا مطالعہ کرتے ہیں اور دیکھتے ہیں کہ شاعر نے کس طرح اپنے جذبات و احساسات کو الفاظ کا جامہ پہنایا ہے۔

(۱) ؎ دل بیچ یو آیا وہم دنیا ہیں دل پاتاں عبث
اوس یادِ رب کی یاد بن ای دل تجی رہنا عبث

یو = یہ
پاتاں = پاتا، باندھنا، لگانا، پروتا
اوس = اس
ای = اے
تجی = تجھے
اس شعر میں "وُہم" کو "وَہم" باندھا گیا ہے۔

(۲) ؎ مرشد نے بتلایا تجی ہر دم شغل اللہ کا
ہر حال میں مشغول ہو ضائع عمر کھونا عبث
اس شعر میں "عُمر" کو "عُمَر" باندھا گیا ہے۔
ورنہ اردو میں عُمر مستعمل ہے۔
؎ رو میں ہے رخشِ عمر کہاں دیکھیے تھمے
نے ہاتھ باگ پر ہے نہ پا ہے رکاب میں (غالب)

(۳) ؎ انکیوں کوں تیری موند کر لکھ دہیاں وان دلکی اوپر
جز یادِ حق کی یاد بن دوسرا وہم رکھنا عبث

انکیوں = آنکھیں
کوں = کو
موند = مونڈ
دہیاں = دھیاں
دلکی = دل کے
وان = وہاں
اس شعر میں "وُہم" کو "وَہم" اور "اوپر" کو "اُپَر" باندھا گیا ہے۔
ولی دکنی اور اس سے بعد میں آنے والے شعرا بھی کافی عرصے تک آنکھوں کو "انکھیاں" اور "اکھیاں" کہتے رہے ہیں۔
تجھ یاد میں جل جل کر کاجل کی لیا صورت
یہ روشنی افزا ہے انکھیاں کوں لگاتی جا (ولی دکنی)

(۴) ؎ دل کی ورق اوپر توں لکھ ہر دم اسم اللہ کا
ای عاشق مولا تجی دفتر ورق لکھنا عبث
کی = کے

لِکھ = لکھ

لِکنا = لکھنا

وَرَق اردو اور پنجابی دونوں میں ایک ہی طرح سے مستعمل ہے۔

ورق تمام ہوا اور مدح باقی ہے
سفینہ چاہیے اس بحرِ بیکراں کے لیے (غالب)

(۵) سے پہرتا پہراتا چہور کر رکھ یاد اسمِ ذات کوں
عاشق کوں اوس کی نام بن دوجا حرف جپنا عبث

پہرنا = پھرنا

پہراتا = پھراتا

چہور = چھوڑ

کوں = کو

اوس = اس

کی = کے

دوجا = دوسرا

اردو میں حَرْف مستعمل ہے۔ لیکن اس شعر میں حَرَف استعمال ہوا ہے

زبس عمر کی اس کہانی ہیں صرف
تب ایسے یہ موتی سے نکلے ہیں حرف (میر حسن)

(۶) سے حرص و ہوا کوں دور کر طالب ہو رب کی تو رکا
ای عاشق راہی خدا ظلمت میں رہنا عبث

کوں = کو

کی = کے

ای = اے

راہی = راہ

میں = میں

(۷) سے مال و متاع فرزند میں روزِ قیامت نہیں لفع۔
جیسی نفع آخر نہیں اوس بیچ دل باتاں عبث

سیں = سے

نہیں = نئیں (نہیں)

جیسی = جس سے

اوس = اس

باتاں = باندھنا، لگاتا

لفظ نفع یہاں "نَفَعْ" باندھا گیا ہے جبکہ اردو میں نَفْعْ مستعمل ہے۔

(۸) سے حق نیں تجی دنیا میں بھیجا عبادت واسطی
اس کی عبادت بن تجی دنیا میں رہنا عبث

نیں = نے

تجی = تجھے

میں = میں

بھیجا = بھیجا

واسطی = واسطے

کی = کی

(۹) سے حق نے محبت سیں تجی عرفاں بَدَل پیدا کیا
رب کی محبت بن تجی دنیا میں رہنا عبث

کی = کی

تجی = تجھے، تجھکو

بَدَل = عوض، بدلہ، معاوضہ، واسطے، خاطر، کے لیے وغیرہ

(۱۰) سے دل توں لگا اوس کی اوپر کو جھوٹی قالبی کدھوں
جو چیز کی باقی نہیں اوس کو یہ دل دینا عبث

توں = تو

لگا = لگا

قانی = فانی

تھوئی = نہ ہو

اوس = اس

کدھوں = کبھی، کب

نہیں = نئیں (نہیں)

اُوپر ــ اس شعر میں "اپرۂ" باندھا گیا ہے۔

ــہ اب تو حسام ہو جا قنا مرشد کی صورت میں سدا

سالک کوں وصلِ حق بناں دوجی جگی ترنا عبث

بناں = بِنا، بغیر، سوا

دوجی = دوسری

جگی = جگہ

ترنا = ٹھہرنا

"ٹھہرنا" اس مصرع میں "ٹھرنا" استعمال ہوا ہے "ٹھرنا" ویسے پنجابی کا لفظ ہے جس کے معنی "کانپنا" کے ہیں ـ لیکن یہاں "مُراد ٹھہرنا" ہے۔

حواشی ۱ـ صدر شعبۂ اردو، گورنمنٹ کالج اٹک ۲ـ مجلہ گورنمنٹ کالج اٹک ۳ـ مقالات الشعراء مرتبہ سیّد حسام راشدی، سندھی ادبی بورڈ کراچی، ۱۹۵۷ء ص: ۱۷۲ ۴ـ تاریخ ادب اردو (جلد اوّل) مجلس ترقی اردو، لاہور جولائی ۱۹۷۵ء ـ بار اوّل ص ۶۸۱ ۵ـ غلام محمد (نام) نذر صابری (قلمی نام) سابق لائبریرین گورنمنٹ کالج اٹک، معروف شاعر، معتبر نقاد، مستند محقق ــب ذیل کتابوں کے مرتب ـ (۱) دیوانِ شاکر بہ اشتراک سیّد رفیق بخاری (۲) رومیؒ و تبریزیؒ (۳) قفۂ شارح مصنّفہ زاہد الکی غایۃ الامکان فی درایۃ الزمان والمکان مصنّفہ شیخ تاج الدین محمود اشنویؒ (۵) گلدستہ (نعتیں) (۶) تذکرہ مولانا نواب الدین ــتیؒ (۷) انتخابِ کلام ظفر احسن (زیرِ طبع)

ــ مشعل" اپریل ۱۹۸۸ء (مدیر عبدالعزیز ساحر) ص: ۹۰

یہ بیاض مختلف رسالوں کا مجموعہ ہے جو عربی اور فارسی زبان میں ہیں ـ ان رسالوں کو مختلف کاتبوں نے ــف ادوار میں تحریر کیا ہے ـ صاحبِ بیاض نے ان رسائل کو ایک ہی جلد میں یکجا کر دیا ہے اور سرخ روشنائی ــتیب وار نمبر تحریر کیے ہیں ـ بعض رسائل شروع یا آخر سے ناقص ہیں ـ بیاض کے ابتدائی اتیس اوراق دستبردِ زمانہ ــہو چکے ہیں ـ صفحات نمبر تحریر نہیں کیے گئے ـ کُل اوراق ۳۰۷ ہیں ـ ابتدائی صفحات نہ ہونے کی وجہ سے ــب بیاض کے متعلق معلوم نہیں کہ وہ کون تھا؟ اور کس عہد میں ہوا ہے ـ اس نے بیاض کی خالی جگہوں پر مطالعہ کے افادات کو رقم کیا ہے جس سے ان رسائل کی قدر و قیمت میں قابلِ قدر اضافہ ہوا ہے ـ ان رسائل موضوعات فقہ، تصوّف اور نجوم ہیں ـ حسام لاہوری کی غزل کے علاوہ اردو کے ایک قدیم شاعر ــت اللہ (مرشد شیخ بہاالدین باجن ۱۳۸۸ء تا ۱۵۰۶ء) کی بھی ایک نظم شامل ہے جس میں فقہی مسائل کو منظوم کیا گیا ہے۔ منظومات کے علاوہ فارسی کی منظومات بھی شامل ہیں ـ ساحر

شاہانہ بنت رئیس امروہوی

ہائے ماضی کی دلنشیں یادیں

۱۲ ستمبر ۱۹۱۴ء کو امروہہ کے ایک محلّے "دربار شاہ ولایت" میں علّامہ سیّد شفیق حسن ایلیا کے یہاں پہلے لڑکے کی وفات کے بعد بڑی منّتوں اور مرادوں سے ایک حسین وجمیل فرزند کی ولادت ہوئی جس کا تاریخی نام سیّد محمد مہدی تجویز ہوا۔ اماں (دادی نرجس) اور بابا (سیّد شفیق حسن) کی خوشی کا تو خیر ٹھکانا ہی نہ تھا مگر ان سے کہیں زیادہ بابا مرحوم کے بڑے بھائی سیّد نفیس حسن جو لاولد تھے ان کی خوشی قابلِ دید تھی۔ انھوں نے من موہنے بچّے کو چپکے سے اپنی سونی آغوش میں چھپا لیا۔ اس طرح وہ ابّا جی (سیّد نفیس حسن) کے بیٹے کہلانے لگے۔ خدا نے صورت اور مزاج دونوں شہزادوں جیسا بخشا تھا۔ یہ وہ زمانہ تھا جب مسلمانوں پر پوری طرح زوال نہیں آیا تھا۔ گاؤں اور جاگیریں کسی حد تک موجود تھیں اس لیے فراخ دلی سے بھائی کی ہر خواہش پوری کی جاتی۔ کہتے ہیں کہ بھائی یعنی رئیس امروہوی نے پانچ برس کی عمر تک کوئی ٹھوس غذا نہیں کھائی۔ ان کے لیے ایک بکری مخصوص تھی جس کا وہ دودھ پیا کرتے تھے۔ بکری کے ذکر پر یاد آیا کہ چچا جونؔ اور راقمؔ بتاتے ہیں کہ وہ بکری بھی بڑی نخروں والی تھی۔ ہر وقت بھی سچائی بھائی کے ساتھ لگی رہتی۔ مجال ہے جو کوئی عام چیز کھالے۔ بکری کیا تھی پوری شہزادی تھی۔ کوئی اسے کچھ کہہ نہیں سکتا تھا۔ کیوں کہ وہ بھی بڑی نازک مزاج تھی۔

بھائی نے پانچ سال کی عمر میں روٹی کا پہلا نوالہ کھایا تو کئی بکرے صدقہ کیے گئے اور اس خوشی میں محلّے والوں کی دعوت ہوئی۔ یہ تمام چونچلے ابّا جی کے ذمّے تھے۔ چونکہ بابا کے دوسرے بچّے بھی موجود تھے۔ بھائی کو خدا نے ذہانت کی نعمت سے بھی خوب نوازا۔ آٹھ برس کی عمر میں شاعری کا شوق پیدا ہوا۔ بارہ سال کی عمر میں پہلی غزل کہی۔ شاعری میں ان کے استاد بابا مرحوم تھے۔ انھوں نے ہی "رئیس امروہوی" تخلّص رکھا۔ پندرہ یا سولہ سال کی عمر میں منشی فاضل کا امتحان امتیازی نمبروں سے پاس کیا۔ اور جو بزرگ ان کے ساتھ امتحان دے رہے تھے، انھیں اور اہلِ شہر کو حیرت زدہ کر دیا۔ یوں بھی کارنامے کر کے حیرت زدہ کر دینا ان کی فطرت میں شامل تھا۔ اس کی مثال ۲۲ ستمبر ۱۹۸۸ء کی خونی شام ہے۔ اچھے بھلے ہمارے ساتھ چائے پی کر اور پان کھا کر گئے اور ایسے گئے کہ دوبارہ گھر آنا نصیب نہ ہوا۔ ہے نا حیرت کی بات!

س وقت امروہہ کی چند حسین ترین عورتوں میں شمار ہوتی تھیں۔ دونوں کی جوڑی چاند سورج کی جوڑی تھی مگر مزاجوں بں زبردست تضاد تھا۔ بھائی لاپرواشاعر، امی خاص مشرقی ماحول کی گھریلو خاتون۔ ایسے میں ذہنی ہم آہنگی ہوتی تو کیسے۔ بہرحال رفاقت کے پچاس سال جیسے تیسے گزار ہی دیے۔ آج جب وہ موجود نہیں ہیں تو امی سب سے زیادہ داس اور تنہا رہ گئیں۔ ہاں، تو میں کہہ رہی تھی کہ شادی کے کچھ عرصے بعد بھائی ملازمت کے سلسلے میں مرادآباد چلے گئے۔ رہاں ادبی حلقوں میں ہاتھوں ہاتھ لیے گئے۔ بھائی نے پہلے "جدت" اخبار میں ملازمت کی۔ پھر "مسافر" نکالنے لگے۔ وہ کافی عرصے مرادآباد رہے اس کے بعد دہلی چلے گئے۔ شروع شروع میں مختلف رسالوں میں لکھتے رہے۔ اسی زمانے میں خلیل الرحمٰن "جنگ" اخبار نکال رہے تھے۔ بھائی بھی "جنگ" سے منسلک ہو گئے۔ ایمانداری کی بات ہے کہ بڑے چچا (سید محمد تقی)، بھائی اور خلیل صاحب نے "جنگ" پر شب و روز محنت کی ہے۔ یہ حضرات تن، من، دھن سے "جنگ" اخبار کو زندہ رکھنا چاہتے تھے اور ان کی شدید محنت کا ثمر سب کے سامنے ہے۔

پاکستان کی تحریک بڑے زور وشور سے چل رہی تھی۔ بھائی بھی تحریک پاکستان کے ہراول دستے میں اپنے قلم کے ساتھ شامل تھے۔ اسی زمانے کا یہ شعر ہے جو غالباً بھائی نے ۱۹۴۶ء میں کہا تھا جو بڑا مقبول ہوا ہے

یاد رکھو وقت کا فرمان ٹل سکتا نہیں		موت ٹل سکتی ہے پاکستان ٹل سکتا نہیں

اور سب نے دیکھ لیا کہ یہ اٹل ہوتی، ہوکر رہی اور پاکستان معرضِ وجود میں آ گیا۔ ۱۹۴۷ء کے آخری مہینوں میں بھائی خلیل صاحب کے ساتھ کراچی آ گئے۔ بھائی بتاتے تھے کہ وہ جب کراچی پہنچے تو ان کی جیب میں صرف ۳۵ روپے تھے۔ اجنبی دیس کی سخت زمین، نہ کوئی مونس نہ غمخوار۔ ظاہر ہے اس بے سروسامانی کی حالت میں خود کو منوانا لوہے کے چنے چبانے کے مترادف ہے اور یقیناً انھیں شدید جدوجہد کرنی پڑی ہوگی۔ لٹے پٹے قافلے چلے آ رہے تھے۔ ہر طرف افراتفری مچی تھی۔ بہرحال لوگ کسی نہ کسی طرح آباد ہوتے لگے تب قدرے سکون ہوا۔ آہستہ آہستہ ادبی محفلیں جمنے لگیں۔ مشاعروں کی رونق سے کراچی کی بنجر زمین جاگنے لگی۔ مشاعرے کے حوالے سے ایک بڑا کربناک واقعہ یاد آتا ہے۔ ہرچند کہ یہاں اس کا تذکرہ بے محل ہے مگر سنائے بغیر چارہ بھی نہیں۔ بڑے چچا (سید محمد تقی) چھوٹے چچا (عباس) اور بھائی پاکستان آ چکے تھے۔ امروہہ میں اماں (دادی) بابا، چچا جون اور اپو (پھوپھی) رہ گئے تھے۔ چچا جون بتاتے ہیں کہ اماں تینوں بھائیوں کو یاد کرکے بہت رویا کرتی تھیں۔ چچا جون اور اپو (پھوپھی) سے چھپ کر باورچی خانے میں سر جھکائے چولھے کی راکھ میں لکیریں کھینچتی رہتیں اور آنکھوں سے ٹپاٹپ آنسو بہتے رہتے۔ بہرحال ایک دفعہ ریڈیو سے مشاعرہ نشر ہوتا تھا۔ اور اس میں بھائی کو بھی پڑھنا تھا۔ چچا جون نے اماں کو بتایا کہ آج رات بھائی بھی ریڈیو پر بولیں گے۔ وہ تمام دن بولائی بولائی سی رہیں۔ مشاعرہ شروع ہوا تو ریڈیو سے لگ کر بیٹھ گئیں اور تمام وقت ہلکے گلابی دوپٹے میں بے تحاشہ بہتے آنسو صاف کرتی رہیں۔ جب مشاعرہ ختم ہوا تو خاموش کھوئی کھوئی سی کام میں لگ گئیں۔ چچا جون نے پوچھا کہ آپ بھائی کی آواز سن کر خوش نہیں۔ انھوں نے لرزتی آواز میں کہا۔ "اچھن! مجھے بھول گیا۔ اتنا نہ ہوا کہ یہ کہہ دیتا "اماں سلام" ملاحظہ کیا آپ نے۔ یہ تھا ماں اور اولاد کے درمیان جغرافیائی حدبندی کا کرب۔ یہ نہیں کہ بھائی اماں "بابا" کو یاد نہیں کرتے تھے، مگر اس وقت

نے میں کافی مشکلات تھیں۔ اماں بیٹوں کو یاد کرتے کرتے مرگئیں۔ اس وقت بھائی نے ایک نظم "جنتِ گم گشتہ"
ہے کہی۔ اس کے دو شعر پیش کرتی ہوں

یاد ہے وہ جنتِ گم گشتہ اب تک یاد ہے
یاد اُس کی غم کی صورت قلب میں آباد ہے

داستاں معصوم طفلی کی فسانہ ہوگئی
اے بنی آدم! دوبارہ میری جنت کھو گئی

بھائی امروہہ کو یاد کرتے تھے جہاں بابا اور اماں ان کا انتظار کرتے کرتے خاک میں مل گئے۔ بھائی اباجی کو یا
جو مرتے دم تک ہر آہٹ پر چونک جاتے کہ شاید اچھن آگیا ہو۔ ان تمام کرب ناک لمحوں کے راوی اور شا
ہیں۔ انھوں نے جدائی کے پُل صراط پر چلنے والے بوڑھے رخساروں کو ہمیشہ آنسوؤں سے تر دیکھا ہے جیسے آ
ڑوے اور دکھ اور اداسی کا سمبل بن گئے۔ بھائی امروہہ کو بہت یاد کرتے تھے مگر انھیں وطنِ عزیز پاکستان
نت تھی۔ اکثر کہا کرتے کہ میں پاکستان کو کچھ دے نہ سکا۔ وہ وطنِ عزیز کے شکر گزار تھے۔ کہتے تھے پاکستان نے بہ
دیا۔ لیکن اس کا ایک رخ یہ بھی ہے کہ ۲۲ ستمبر بروز جمعرات ۱۹۸۸ء کی وہ منحوس شام جب ایک سفاک سنہ
ایک بوڑھے دانشور کا بھیجا پھاڑتی ہوئی دماغ سے آرپار ہوگئی۔ سرد مہری کی گرد میں لپٹے دو سال ہوگئے۔ کبھی کبھ
ل کہ اب اماں، بابا اور اباجی کتنے خوش ہوں گے، ان کا لاڈلا اچھن ان کے پاس ہے۔

غلام محمد

غصّہ ــــ منیر احمد شیخ کے انتقال پر

منیر احمد شیخ چپکے سے یہ کہہ کر گزر گیا" اپنے ہم عصروں میں افسانہ نگار غلام محمد مجھے اپنا ہمزاد دکھائی دیتا ہے۔ اس کی زندگی
لی غالباً آخری سطر۔ آخری شور۔ وہ تو چلا گیا مگر ایک طوفان وہ میرے اندر برپا کر گیا۔ انکار۔ اختلاف اور احتجاج اور ایسے ہی
چند لفظوں سے منیر احمد شیخ کی تصویر بنتی ہے۔ وہ مرنے کے بعد کچھ اوپر دو ماہ میرے لیے زندہ رہا پھر مر گیا۔

دعائیں دل سے نکلتی ہیں اور دل کا معاملہ کاغذ پر رقم نہیں کیا جاتا۔

پتا نہیں یہ منیر احمد شیخ کیسا آدمی تھا۔ اس کی پرائیوٹ زندگی کس طرح کی تھی۔ کہاں کا رہنے والا تھا۔ دیکھنے میں کیسا لگتا
تھا۔ گفتگو کس انداز میں کرتا تھا۔ اسے زندگی حقیقتاً کیسی محسوس ہوتی تھی۔ ذاتی سطح پر ہم لوگ ایک دوسرے سے کبھی متعارف نہ ہوئے
مگر ایک دوسرے کے دل کے بڑے قریب رہے۔ چلتے چلتے وہ شخص دلوں کی گہرائیوں میں چھپا ہوا یہ راز فاش کر گیا۔ محبت کا وہ بہت
ذکر کرتا تھا اپنی تحریروں میں۔ اور باتیں کھری کھری کرتا تھا۔ آخری انٹرویو میں اس سے پوچھا گیا تھا۔ کیا افسانے لکھنے کے لیے
محبت کرنا ضروری ہے؟ پلٹ کر بولا۔ محبت سے آپ کی کیا مراد ہے۔ محبت نہ ہو تو افسانہ تو ایک طرف، زندگی بھی آگے نہیں چلتی۔

شاید سنہ ۱۹۶۱ یا ۱۹۶۲ عیسوی کا زمانہ تھا۔ انتظار حسین نے بہ حیثیت مدیر" ادبِ لطیف میں ایک محفل سجا رکھی تھی
اس رسالے میں آسمانی تہذیب اور زمینی رشتوں پر زبردست بحث چھڑی ہوئی تھی۔ منیر احمد شیخ اس بحث میں پیش پیش تھا اور
باریکیوں سے باریکیاں نکالتا جاتا تھا۔ مسائل کی نئی نئی جہتیں دریافت کرتا تھا اور اپنے موقف کی حمایت میں انتہائی دلچسپ
مدلل اور پُر مغز تاویلیں پیش کرتا تھا۔ انتظار حسین کے بعد ادبِ لطیف کی وہ محفل اُجڑ گئی اور منیر احمد شیخ گم ہو گیا۔

سنہ ۱۹۸۸ عیسوی میں دہلی سے بلراج مین را کا خط آیا اور ہزار محبتوں کے ساتھ شعور چھٹی کتاب موسم گرما سنہ ۱۹۸۸ عیسوی
ں تاکید کے ساتھ بھیجی کہ پہلے قلم تیلے کا مطالعہ کرو۔ فہرست میں کیا دیکھتا ہوں کہ ایک جگہ لکھا ہے، آلوچنا۔ اس کے نیچے ٹیکنیکل
پورٹ: مختار صدیقی، منیر احمد شیخ۔ میں نے جھٹ صفحہ ۲۱۹ کھولا۔ ایک اہم غیر مطبوعہ تحریر۔ صرف منیر احمد شیخ کے لیے۔

TOP SECRE وغیرہ وغیرہ

منیر احمد شیخ ایک عرصۂ دراز کے بعد اپنے خط و خال میں نظر آیا تھا۔ دوسرے لفظوں میں دریافت ہوا تھا۔ لکھا ہے

اپنے مخصوص انداز میں "میرا جپال ہے مختار (صدیقی) صاحب اپنے صوفیانہ روپ کو زیادہ اہمیت دینے لگے تھے اور کوئی ایسی SENSUAL تحریر جیسی کہ یہ ٹیکنیکل رپورٹ ہے۔ شاید ان کے نزدیک ان کے اس امیج کے راستے میں حائل ہوتی تھی جس امیج کی خاطر انھوں نے سر پر ٹوپی رکھ لی تھی۔ اور ہاتھ میں تسبیح پکڑی تھی۔ قطع نظر ان سب باتوں کے یہ ایک دلچسپ تحریر ہے جس سے آپ اندازہ کر سکتے ہیں کہ مختار صدیقی کا مشاہدہ کیسا غضب کا تھا۔ اور وہ جو کہ ایک اعلیٰ شاعر تھے۔ عورت کو نثر میں کس خوبصورتی، چابکدستی اور استادانہ مہارت سے پیش کر سکتے تھے۔ اس سے پتا چلتا ہے کہ وہ عام معاملات میں بھی کس قدر صاحب نظر اور ذہین تھے۔ علاوہ ازیں یہ تحریر اپنی جگہ نثر کا ایک عمدہ ٹکڑا ہے۔ اس میں لفظوں اور تراکیب کی بناوٹ اور رکھاؤ ایسا ہی عمدہ ہے جیسا عمدہ انھوں نے یوپی کی عورت کو پایا۔"

وہ شخص بڑی اچھی اچھی باتیں لکھتا تھا۔ اپنے آخری انٹرویو (کتاب نما دہلی جون ۱۹۹۰ء بہ شکریہ ڈاکٹر آصف فرخی) جس کی آخری سطر میں اس نے مجھے رسوا کیا، کیسی غضب کی باتیں کہہ گیا ہے۔ کہتا ہے "تخلیق کے معاملے میں میں نہ اسکولوں کا قائل ہوں نہ ہاکی اسکولوں کا۔ یہ سارے اسکول آپ کو سنوارتے کم اور بگاڑتے زیادہ ہیں۔ میں نے تو ان اسکولوں میں بھی جن میں والدین نے داخل کر دیا تھا، اپنا وقت بڑی اذیت کے ساتھ گزارا ہے۔" اچھی تحریر کا معیار اس کھرے آدمی کے نزدیک نہایت سلیس اردو میں یہ رہا ہے "یہی کہ آپ کو آخر تک اکتانے کا احساس نہ ہو۔"

اس کی ضرورت میں محسوس کر رہا تھا اپنے پرچے (اردو ششماہی) کے لیے۔ میں سوچ ہی رہا تھا کہ اس سے رجوع کروں اور زمانے کا گلہ کروں۔ انتظار حسین پر بڑھاپا طاری ہو چکا ہے۔ دوسرے لوگ سہمے ہوئے یا بکے ہوئے۔ اکیلا پن تو مجھے کھائے جا رہا ہے۔ ادب میں یہ حبس کی جو کیفیت ہے جینے نہیں دے رہی ہے۔ اب تم ہی کچھ کرو۔ بس آصف فرخی نے منیر احمد شیخ کے انتقال کی خبر سنا کر مجھے مار ڈالا۔

خدا کی اس دنیا میں کوئی تا قیامت جینے کو آیا ہے۔ کون زندہ رہا ہے۔ پتا نہیں حقیقت کیا ہے آسمان کھا جاتا ہے یا زمین نگل لیتی ہے یا کچھ اور ہو جاتا ہے۔ مجھے بڑی شدت سے یہ محسوس ہو رہا ہے کہ منیر احمد شیخ اپنے وقت سے پہلے ہی بلا لیا گیا ہے بہزاد والے مسئلہ پر جھگڑا تو اپنی جگہ رہ گیا۔ سوال میرے نزدیک اٹھ کھڑا ہوا ہے کہ اس کی کمی پوری کون کرے گا۔ میرے لیے جذباتی طور پر بھی۔ میں اس موقعے پر لکھنا چاہتا ہوں بے تحاشا سی منیر احمد شیخ کے متعلق۔ اس کی ذات سے جو عہد وابستہ تھا اس عہد پر اس کے چچے تلے اور بے لاگ تبصروں کی سخت ضرورت تھی گلہ میں خدا سے کرتا ہوں کہ انصاف تو نے کبھی نہیں کیا۔ تو نے ہمیں محروم کر دیا۔ منیر احمد شیخ کے چچے تلے تبصروں سے۔

اس سے تجھے کیا مل گیا۔ کیا کمی تھی تیرے ہاں؟

ہمارا تو ایسا خسارہ ہوا ہے جس کی تلافی مجھے نظر نہیں آ رہی۔

اوپر والے کا چکر سمجھ میں نہیں آتا۔ میں مرا تھا پورے سات سال کے لیے۔ ناصر کاظمی میرے لیے اپنی موت کے بعد پورے آٹھ سال تک زندہ رہا۔ اور یہ منیر احمد شیخ زندہ رہا اپنی موت کے بعد کچھ اوپر ۲ ماہ۔ اس چکر میں نیچے والے بھی مورد الزام ٹھہرتے ہیں۔ ان پر خدا کا غضب کس لیے نہیں پڑتا؟

ہم تو لہو لہان ہو گئے۔

لخت لخت ہو گئے۔

گل ہائے رنگ رنگ

یوگوسلاوی کہانی

برانکو کوپچ / علی حیدر ملک

ہم سفر

اسکواڈ کمانڈر نکولے تینا اپنی بریگیڈ کے سربراہ سے پیچھے کی کمان کی طرف جا رہا تھا۔ اسے ڈاک اور تیس لاکھ لائر لے کر جانا تھا۔ یہ اس کا ہمیشہ کا کام تھا لیکن اس بار چھ سال کی ایک ننھی یہودی لڑکی بھی اس کے ساتھ بھیجی جا رہی تھی۔ اس لڑکی کو اسے کمان کے سپرد کرنا تھا تاکہ وہ اسے دشمنوں سے آزاد کسی علاقے میں آباد کر سکیں۔ یہ کام اس کے لیے ایک درد سر تھا۔

"یا خدا! مجھے بچوں کو بہلانا نہیں آتا۔ اس کام میں میں کچا ہوں۔" اس نے ننھی بچی پر نظر ڈالتے ہوئے بریگیڈ ہیڈکوارٹر کے سکریٹری سے کہا تھا۔

"ارے بھائی! یہ بھی کوئی کام ہے؟ کوئی مورچہ تو نہیں ہے یہ۔" سکریٹری نے ہنستے ہوئے کہا۔

"یہ بات تو میں جانتا ہوں، مگر فرض کرو راستے میں ٹینک حملہ کرتے ہوئے آجائیں تو یہ بے چاری کیسے جان بچائے گی؟"

"بس یہی ہے تمہاری مردانگی!" سکریٹری نے سمجھاتے ہوئے کہا۔

"ارے بھائی! جس طرح مشین گن بغل میں دبائے تم میلوں بھاگ سکتے ہو اسی طرح لڑکی کو بغل میں دبا کر بھاگ جانا۔ دیکھو تو یہ کتنی ہلکی پھلکی بچی ہے۔"

"مشین گن کی بات اور ہے یہ تو جیتی جاگتی بچی ہے۔"

"تم بھی کیسی باتیں کر رہے ہو؟" اب سکریٹری بھی جھنجھلا گیا تھا۔ "ابھی کچھ ہی دنوں پہلے تو ہم نے اس بچی کو دشمنوں کے پنجے سے چھڑایا تھا اور اب تم اس طرح کی باتیں کر رہے ہو۔ آخر تم چاہتے کیا ہو؟ کیا اسے کہیں پھینک دیں بتاؤ؟"

"پھینکنے کی بات کون کہتا ہے... میں تو......" اس کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ سکریٹری کی بات کا کیا جواب دے۔

اور اس طرح وہ بچی چپ چاپ اس کے پیچھے لگ گئی تھی۔ لڑکی کے چلنے میں اس کی خود اعتمادی نظر آرہی تھی۔ یہ دیکھ کر نِک نے اس سے پوچھا۔ "کیوں ری لڑکی! مجھ سے ڈر نہیں لگتا؟"

"نہیں ــ" بچّی نے اپنی بڑی بڑی سیاہ آنکھیں اس کے چہرے پر جماتے ہوئے کہا۔ اس کی معصومیت نے بِک کو الجھن میں ڈال دیا۔ اس نے دل ہی دل میں سوچا کہ یہ ننھی سی بچی کتنی سیانی معلوم ہو رہی ہے۔ نہ جانے یہ کس دیس کی ہے؟ اس کے بال کیسے سرخ ہیں۔ رات کوئی کہہ رہا تھا کہ یہ یہودن ہے۔

"اے لڑکی تیرا نام کیا ہے؟" بِک نے تقریباً ڈانٹنے کے انداز میں پوچھا۔

"ایبرنا ــ"

"ایبرنا؟ یہ کس قوم کا نام ہے؟ تُرک ہے یا جرمن یا پھر یہودی۔ کون جانے۔ ابھی سے گھبرا رہے ہو یار بِک۔ ابھی تو اس جنگ میں نہ جانے کتنے ملکوں کے لوگوں کو اِدھر اُدھر کرنا پڑے گا ــ سوچتے سوچتے بِک کے قدم تیز ہو گئے۔ پھر اس نے اس لڑکی سے پوچھا۔ "اے چھوکری تو کون ہے؟"

"جی! کیا کہا آپ نے؟"

"ارے میں کوئی پادری ہوں جو تو جی جی کر رہی ہے۔ میں پوچھتا ہوں تو کون ہے؟"

"چھوٹی بچی ــ"

"واہ کیا جواب ہے۔ چھوٹی بچی ــ جیسے میں کہہ رہا ہوں کہ تو جرمن فوج کی کمانڈر ہے" بِک بولتے بولتے اچانک رُک گیا۔ پھر اپنے سوال کو دہراتے ہوئے بولا۔ "میرا مطلب تھا کہ تو کس قوم کی ہے یعنی سربین ہے یا کروٹ یا مسلمان؟"

بچی چلتے چلتے رُک گئی۔ اپنے آگے چلتے ہوئے رائفل بردار سپاہی سے جس کی تیوریاں چڑھی ہوئی تھیں اور جو لمبے لمبے قدم اٹھا رہا تھا، اب اسے ڈر لگنے لگا تھا۔ وہ کانپنے لگی۔ اس کی نگاہیں بِک کے چہرے پر ٹکی ہوئی تھیں اور پتلیاں پھیل گئی تھیں۔ اسکواڈ کمانڈر بِک نے اسے تیز نظروں سے گھورتے ہوئے پوچھا ــ "کیا ہوا۔ اس طرح کیوں دیکھ رہی ہے؟ ــ"

بچی نے آہستہ سے کہا۔ "صاحب! آپ مجھے مار ڈالیں گے؟"

"ارے چوزہ! کیا تو نے کوئی گناہ کیا ہے جو میں تجھے مار ڈالوں گا؟"

چھوٹی بچی اسی طرح سرگوشی کے انداز میں بولی۔ "کیوں کہ میں یہودی ہوں"

اسکواڈ کمانڈر نے مصنوعی غصّے سے اسے ڈانٹا ــ "شیطان کہیں کی۔ کیا میں تجھے فاشسٹ دکھائی دیتا ہوں؟ ذرا یہ تو بتا کہ یہ سب باتیں تو نے کہاں سے سیکھیں؟"

ایبرنا اب بھی بِک کے چہرے کی طرف ایک ٹک دیکھ رہی تھی۔ وہ ہٹّا کٹّا اور غیر مہذب سپاہی یہی زبان جانتا تھا تو پھر اس سے کیا توقع کی جا سکتی تھی۔ وہ پھر غرّایا ــ "اچھا اب یہ بتا کہ تو نے کیا گناہ کیا ہے؟ یہ گدھے کی طرح اپنا چہرہ کیوں لٹکایا تو نے؟ کیا مجھ سے ڈر لگتا ہے ــ؟"

چھوٹی بچی دھیمے سے بولی ــ "ہاں!"

"ڈرتی ہے؟ تو بتا میں کیا کروں؟ اچھا میری رائفل تو پکڑ لے [illegible]"

دوں گا ـــ لے پکڑ لے ـ"
یہ کہنے کے ساتھ ہی اس نے اپنے ہاتھ میں پکڑی خود کار رائفل اس بچی کے کندھے پر ٹانگ دی اور پھر دانت بھینچتے ہوئے بولا ـ" یہ میری بد قسمتی تھی کہ تجھے میرے پیچھے لگا دیا۔ اب اتنی دیر سے میں تجھے یہی نہیں سمجھا پا رہا ہوں کہ تجھے مارنے کا میرا ارادہ نہیں ہے۔ اچھا بتا کیا اب بھی تجھے مجھ سے ڈر لگ رہا ہے ؟"
بچی نے نگاہیں نیچی کر لیں اور پلکیں جھپکاتے ہوئے ہکلاتے ہوئے لہجے میں کہا۔" ہاں ڈر تو لگتا ہے ۔"
"شیطان کہیں کی۔ اچھا بتا تجھے مجھ سے ڈر کیوں لگتا ہے ؟ ــ" نِک نے اپنے سینے کو دونوں ہاتھوں سے تھپتھپاتے ہوئے ـ" ذرا مجھے دیکھ ـــ دیکھ میں بھی تو یہودی ہوں۔ ہاں ہاں سینٹ نکولس کی قسم۔ کیا ان لوگوں نے تمہارے ساتھ کوئی بُرا سلوک کیا ؟ کیا تم پر کوئی زیادہ ظلم ہوا ؟"
چھوٹی بچی چُپ ہو گئی۔ اس نے نگاہیں نیچی کر لیں۔ اس کا چہرہ اس کے سر کے گھنے اور نارنجی جیسے بالوں کے نیچے چھپ گیا۔ نِک کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ کیا کرے۔ اس نے اپنے دونوں ہاتھ پھیلا دیے اور بچی کی طرف پیار بھری نظروں سے دیکھتے ہوئے بلند آواز میں بولا۔
"دیکھو، تم مجھ سے کیا چاہتی ہو ؟ میں تم سے ہار ماتنا ہوں ..... تمہارے لیے میں نے اپنا مذہب تبدیل کر دیا۔ ... پُرانے یوگوسلاویہ کی طرح میں تمہاری پناہ میں آ گیا ہوں پھر بھی تم ؟ ..... اب تم کیا چاہتی ہو۔ کیا میں سامنے ندی میں کود کر جان دیدوں ؟"
نِکولے تینا اس بچی کو لے کر اس چھوٹی سی ندی کے پُل پر آ گیا اور نیچے پانی میں اُچھل کود کرتے ہوئے مینڈکوں کے بچوں کو دیکھنے لگا۔ وہ سوچ رہا تھا کہ اگر میں پانی میں کود پڑوں تو لڑکی کو اچھا سبق ملے گا۔ چھوٹی بچی اپنی اُداس آنکھوں سے سپاہی نِک کی طرف دیکھ رہی تھی۔ وہ اپنا پورا وزن کبھی ایک ٹانگ پر ڈالتی اور کبھی دوسری ٹانگ پر۔
"چلو اب چلنا بھی ہے ـ" نِک نے کہا۔
"ہاں چلو ـ" چھوٹی بچی جیسے ابھی مطمئن نہیں ہوئی تھی۔ اس کے گلے میں رائفل ابھی تک لٹکی ہوئی تھی اور وہ گھسٹتی ہوئی نِک کے پیچھے چل رہی تھی۔ تھوڑی دیر یوں ہی چلنے کے بعد اس نے ڈرتے ڈرتے کہا ـــ" سپاہی جی ! رائفل بہت بھاری ہے میں اسے نہیں اٹھا سکتی ـ"
"ٹھیک ہے، مجھے دیدے ـ تیری خاطر میں ہی اسے ڈھولوں گا ـ"
اس اثنا میں لڑکی کا خوف پگھلنے لگا تھا۔ تھوڑی سی ہمت کر کے اس نے پوچھا ـ" سپاہی جی ہم کس راستے سے جا رہے ہیں ؟"
"کیا کہا تم نے ؟"
"میرا مطلب ہے ہم کس سڑک سے جا رہے ہیں ؟"
"سڑک، سڑک سے تمہارا کیا مطلب ہے ؟"

"سپاہی جی، آپ تو بے وقوف ہیں۔"

"بے وقوف ہو گا تیرا باپ، ہم نہیں۔" نِک نے گھور کر لڑکی کو دیکھا اور زیرِ لب بڑبڑایا۔" اب یہاں اسے سڑک چاہیے۔ ارے یہ جنگل ہے جنگل۔ ہم جنگل سے گزر رہے ہیں۔"

"جنگل، جنگل میں تو ڈاکو ہوتے ہیں۔" لڑکی نے گھبراتے ہوئے کہا۔

"او ہو ڈاکو! تو تم بھی اس جھوٹی افواہ پر یقین کرتی ہو۔ ارے بچی! ڈاکو تو شہروں میں ہوتے ہیں یمہاری سڑکوں پر۔"

اب وہ برچ کے درختوں سے ڈھکی پہاڑی پر آہستہ آہستہ چڑھ رہے تھے۔ اچانک بچی نے نِک کا ہاتھ کس کر پکڑ لیا اور خوف سے چیخی۔

"سپاہی جی، وہ دیکھو بھیڑیا۔"

نکولے تینا نے جلدی سے اس طرف دیکھا جدھر بچی اشارہ کر رہی تھی۔ اور پھر بچی کا مذاق اُڑانے کے انداز میں ہنستے ہوئے بولا۔" واہ واہ، یہ بھیڑیا ہے؟ کیا کہنے۔ اری بیوقوف یہ تو گدھا ہے۔" اس نے اس جانور کی طرف حقارت سے دیکھا جیسے گدھا ہونے کا وہ خود ذمہ دار ہو۔

"اسے بھیڑیا کہہ رہی ہے۔ اب بتا بیوقوف کون ہے۔ تو، یا میں؟"

اب اوک کے پیڑوں کا جنگل شروع ہوا تو نکولے تینا رُکا۔ اس نے کارتوسوں سے بھرا اپنا کمر بند کھولا۔ اور بچی کی طرف دیکھنے لگا۔

"تم تھک گئی ہوں گی آؤ تھوڑی دیر بیٹھ کر سُستا لیں۔ اوک کے درختوں کی ایک قطار کے نیچے وہ لیٹ گیا۔ سکوں کی تھیلی اس نے اپنے سر کے نیچے رکھ لی۔ اور پھر ایک بے فکری کی سانس لیتے ہوئے بڑبڑانے لگا۔ میں شرطیہ کہتا ہوں کہ وہ امیر لوگ جینا چاہتے تھے۔ ان کے سرہانے بھی لاکھوں کی تھیلی ہوتی لیکن وہ چھاؤں میں یہی سوچتے ہوئے سوتے کہ باقی لوگ جائیں بھاڑ میں۔"

اسے ابھی نیند کی پہلی جھپکی آرہی تھی کہ بچی کی چیخ نے اسے پھر سے چونکا دیا۔ ارے وہ کیا ہے؟ سپاہی جی اُدھر دیکھو نیند سے مُندتی آنکھوں کو جبراً کھولتے ہوئے نکولے تینا نے اُدھر دیکھا۔ قریب کے ایک درخت کے تنے پر ایک ہلکی سی پرچھائیں پڑی اور پھر شاخوں میں کہیں غائب ہو گئی۔

"کیا ہے وہ؟ اری بیوقوف وہ تو گلہری ہے۔ گلہری سے بھی کیا کسی کو ڈر لگتا ہے۔ تو تو ایسے ڈر رہی ہے جیسے دشمن کی فوج دیکھ لی ہو۔"

درخت پر نظریں جمائے وہ لڑکی نکولے تینا سے اور قریب ہو کر بیٹھ گئی۔ "چاچا مجھے ڈر لگتا ہے۔"

"ارے ارے۔" اسکو انگلی نذر اپنا ہاتھ ہلاتے ہوئے دھمکانے لگا۔

"جانتا تھا، تُو اسی طرح تنگ کرے گی۔ خدا نہ کرے۔ اگر دشمن کے ٹینک اِدھر آ گئے تب تو تُو اس طرح چیخ چیخ کر مجھے بھی مروا دے گی۔ اور ہم دشمن کے شکنجے میں چلے جائیں گے۔"

ایرنا نے گمبھیر ہو کر اس کی طرف دیکھا۔ "چاچا میں ٹینکوں سے نہیں ڈرتی۔"

"لو اب اس کی بات سنو۔" اسکواڈ کمانڈر چیخا۔ "تم جیسی ڈرپوک لڑکی ٹینکوں سے نہیں ڈرتی۔ واہ کیا کہنے!"

"سچ کہتی ہوں، میں ٹینکوں سے نہیں ڈرتی۔ وہ تو ہماری گلی سے روز ہی گزرتے تھے۔ چھوٹے ٹینک بھی اور بھاری ٹینک بھی۔ بڑے لوگ تو انھیں دیکھ کر ڈرتے تھے مگر ہم بچے بالکل نہیں ڈرتے تھے۔"

"سچ کہتی ہو؟"

"چاچا تم ٹینک سے ڈرتے ہو؟"

نکولے تینا کو کوئی جواب نہیں سوجھا۔ اس نے کھنکھار کر اپنا گلہ صاف کیا اور آس پاس دیکھ کر دھیمے لہجے میں کہا۔ "اچھا میری بات سنو۔ اگر تم ٹینکوں سے نہیں ڈرتیں تو پھر میں بھی کیوں ڈروں گا؟ مگر سچ یہ ہے کہ کوئی ٹینک اگر پہاڑی پر دھڑ دھڑاتا ہوا چڑھ رہا ہو...... خیر چھوڑو......"

بچی نے اپنی آنکھیں نچاتے ہوئے کہا۔ "ان پر بھی شیطان کا چہرہ بنا ہوتا ہے؟"

"بالکل وہی۔" سپاہی نے اقرار کیا۔

بچی اِدھر اُدھر ٹہلنے لگی۔ پھر سپاہی کے پاس آکر اسے ایک انگلی سے چھو کر آہستہ سے پوچھا۔ "چاچا تم کس چیز سے ڈرتے ہو؟"

"کیا واہیات سوال ہے۔ میں بھلا کس چیز سے ڈروں گا؟" نِک نے فخر سے کہا۔ مگر بچی کے معصوم سوال نے اس کے دل کو چھو لیا تھا۔ اپنے جذبات کو چھپاتے ہوئے اس نے مصنوعی غصے سے بچی کو ڈانٹتے ہوئے کہا۔ "یہ چاچا واچا کیا ہوتا ہے۔ میرا نام نکولے تینا ہے۔ تم مجھے چاچا نکولا کہہ سکتی ہو۔"

اسکواڈ کمانڈر نے پھر سے خطوط سے بھرا تھیلا اپنے کندھے سے لٹکا لیا۔ رائفل اٹھائی، کمر بند کسا اور جیسے کسی دوسرے سپاہی کو مخاطب کرتے ہوئے بولا۔ "کامریڈ ایرنا اپنے سفر پر آگے چلیں۔"

"چلو چلیں کامریڈ نکولا۔" لڑکی نے بھی اسی انداز میں کہا۔

سوما کوروف / عبدالعزیز خالد

سوزِ عشق

[سوما کوروف، روس کا پہلا کلاسیکی ڈراما نویس ہے۔ اس نے ۹ المیہ اور ۵ طربیہ ڈرامے لکھے۔ اس کے المیہ ڈرامے خاص طور پر مقبول ہوئے۔ وہ فرانس کے عظیم ڈراما نگاروں۔ کورنے لی، راسین اور والٹیئر سے بہت متاثر تھا۔ اور اسلوب و خیال میں ان کی تقلید کی سعیِ نامشکور کرتا تھا۔ آخر میں بعد از خرابیِ بسیار اسے یہ احساس ہوا کہ اس کی طبیعت ڈراما نگاری کے لیے اتنی موضوع نہیں جتنی افسانہ نگاری اور طنزیہ و عشقیہ شاعری کے لیے ـــــ اس کے کلام کا یہ حصہ اس کے ڈراموں کے مقابلے میں اگرچہ مقدار میں کم ہے مگر ادبی معیار و محاسن کے اعتبار سے بہت بہتر۔ اس کی عشقیہ شاعری کا نمایاں وصف موسیقیت اور اختراع و جودتِ بحور ہے۔

ـــــ اس کی درج ذیل نظم سے عظمت اللہ خاں کی مشہور اور انتہائی خوبصورت نظم ـــــ پیت کی ماری رانی روپ متی ـــــ ذہن میں ابھرتی ہے۔]

سعی کرتی ہوں عبث
کشمکشِ دل کو نہاں رکھنے کی
اور آسودہ و مجموع نظر آنے کی
لیکن اک پل بھی سکوں
میری قسمت میں نہیں
سعی جتنی بھی کروں
اپنی چنتا میں اضافہ ہی کروں
سیلِ گریہ سے مری آنکھیں، اور
[illegible]

کریں اس رازِ تب و تابِ نہانی کو عیاں
بے اثر میری مساعی کو بنایا تم نے
چھین لی تم نے مری آزادی
ہو اس اُفتاد کا کارن تم ہی
مجھ پہ بپتا جو پڑی صرف تمہارے باعث
دل کا شیرازہ کیا درہم و برہم تم نے
مری آزادی کو تبدیلِ اسیری میں کیا
[illegible] کو دکھ میں بدلا

بے خبر اس سے، اذیت مجھے پہنچانے کو
بے ثمر سوزِ دروں سے مجبور
ہیں بچھڑتے ہوئے تم اک دوسری عورت کے لیے
نہیں غم اس کا، تمہارا مجھ کو
مجھے ترساتے ہو تم
ستمگر تم کو
تمہیں ملنے کو تڑپتی ہوں مگر ڈرتی ہوں
میری آنکھیں ہی نہ کھانے لگیں میری چغلی
روبرو پا کے تمہیں
بدحواسی میں مجھے
کوئی سدھ بدھ نہ رہے
ہو زباں گنگ، مگر
غیر موجودگی میں کڑھتی ہوں اس بات پہ میں
کہ تمہیں علم نہیں
کس قدر تم سے محبت ہے مجھے
چاہتی ہوں تمہیں کس شدّت سے
کشمکش شرم و محبت میں بپا رہتی ہے

شرم کو ضد کہ نکل جائے محبت دل سے
اور کوشش یہ محبت کی کہ ہو شرم فرار
اس کشاکش میں دماغ ابر آلود
دلِ سیپارہ بلا حرقہ کرکے اور جلے
ہر گھڑی ایک نہ اک مجھ پہ مصیبت طاری
رکھ دوں دل کھول کے اپنا میں تمہارے آگے
شرم بھی آتی ہے ایسا کرتے
یہ بھی سچ علم نہیں مجھ کو میں کیا چاہتی ہوں
اتنا معلوم ہے بس
غم سے لبریز ہوں میں
اتنا معلوم ہے بس مجھ کو جہاں بھی ہوں
گرفتار تمہاری ہوں، تمہاری نخچیر
نظر آئے مجھے ہر سمت تمہاری تصویر
اتنا معلوم ہے بس
ایک ظالم دلِ بے تاب کے ہاتھوں بے بس
ایک سفّاک تمنّا کے شکنجے میں کسی
بھولنے سے میں تمہیں قاصر ہوں!

وکٹر ہیوگو (فرانسیسی تلفّظ، وکتوغ اوگو ہے) فرانس کے ایک عظیم شاعر، ڈراما نگار اور ناول نگار تھے۔ وہ ۱۸۰۲ء میں پیدا ہوئے۔ انھیں فرانسیسی ادب میں رومانوی تحریک کا بانی سمجھا جاتا ہے۔ ان کا انتقال ۱۸۸۵ء میں ہوا۔

خزاں

وکٹر ہیوگو/سہیل احمد صدیقی

سورج کی کرنیں مدّھم ہیں، کبھی گرم ہوا بھی چلتی ہے
پھر آسمان بھی صاف نہیں!
وہ لمبے دن بھی بیت گئے، پُر لطف مہینے ختم ہوئے
افسوس درخت مرجھانے لگے!
غمناک خزاں آئی، بے کیف ہوا اور دھند لیے
اور موسمِ گرما بیت گیا گویا..... کوئی دوست چلا گیا!

گل ہائے رنگ رنگ

۱۹۹۰ء کا نوبل انعام یافتہ مصنّف

اوکتا یو پاز

مترجم: آصف فرّخی

نیلی آنکھوں کا گلدستہ

پسینے سے تربتر میں نیند سے چونک اُٹھا۔ سرخ اینٹ کے فٹ پاتھ سے، جس پر تازہ چھڑکاؤ ہوا تھا، بھاپ کے نرم لپیٹے اٹھ رہے تھے۔ خاکستری پروں والا ایک پتنگا بدحواس ہو کر پیلی پیلی بتّی کے گرد چکّر کاٹ رہا تھا۔ میں اپنے بچھونے سے لپک کر اٹھا اور کمرے کی دوسری طرف اس احتیاط سے ننگے پاؤں چلتا ہوا آیا کہ میرا پاؤں کسی بچھّو پر نہ پڑ جائے جو تازہ ہوا کی تلاش میں اپنی کمین گاہ سے باہر نکل آیا ہو۔ میں چھوٹی سی کھڑکی کے پاس آیا اور دیہات کی ہوا میں سانس لینے لگا۔ رات کا تنفس سنائی دے رہا تھا۔ نسوانی اور عظیم الجثّہ۔ میں کمرے کے وسط میں آ گیا۔ صراحی سے پانی بیسن میں ڈالا اور تولیہ بھگو لیا۔ میں نے اپنے سینے اور ٹانگوں پر گیلا کپڑا رگڑا، ذرا سا خشک کیا۔ اور یہ اطمینان کر لینے کے بعد کہ میرے کپڑوں کی تہوں میں کوئی کیڑے کوڑے تو نہیں گھُسے ہوئے ہیں۔ تیار ہو گیا۔ میں بھاگتا ہوا زینے سے اُترا۔ مسافر خانے کے دروازے پر میری مڈبھیڑ اس کے مالک سے ہو گئی، جو ایک آنکھ سے کانا، گھُنّے مزاج کا آدمی تھا۔ بید کے مونڈھے پر بیٹھا ہوا ایک آنکھ آدھی میچے ہوئے، وہ سگریٹ پی رہا تھا۔ بیٹھی ہوئی آواز میں اس نے پوچھا:

«کہاں چل دیے، صاحب؟»

«ذرا ٹہلنے کے لیے، گرمی بہت ہے۔»

«ہوں، سارا بازار بند ہو چکا ہے۔ اور یہاں سڑکوں پر بجلی کے کھمبے بھی نہیں ہیں۔ یہیں ٹِک کر بیٹھے رہو تو اچھا ہے۔»

میں نے کندھے اُچکائے۔ زیرِ لب کہا۔ «جلدی لوٹ آؤں گا۔» اور اندھیرے میں داخل ہو گیا۔ پہلے پہل کچھ نظر ہی نہیں آیا۔ میں گلی کے پتّھروں کو ٹٹولتا ہوا آگے بڑھتا رہا۔ میں نے سگریٹ سُلگا لیا۔ اگلے ہی لمحے اچانک چاند ایک سیاہ بادل کے پیچھے سے نکل آیا اور ایک سفید دیوار کو، جو جگہ جگہ سے ٹوٹی ہوئی تھی، روشنی سے نہلا دیا۔ ہوا ہلکی سی سیٹی بجا رہی تھی۔ میں نے اجلی ستھری ہوا کو اپنے سانسوں میں اُتار لیا۔ پتّوں اور کیڑوں مکوڑوں سے بھری ہوئی رات گُنگنا رہی تھی۔ لمبی گھاس میں مینڈک اُچھل رہے تھے۔ میں نے سر اُٹھا کر دیکھا، وہاں ستاروں نے اپنی چھاؤنی چھا دی تھی۔ میں نے سوچا کہ یہ تھا، میں جس کا ایک حرف ہوں؟ وہ لفظ

بنا تا گیا جس میں سے چنگاریاں یوں اڑ رہی تھیں جیسے کسی چھوٹے سے شہاب ثاقب سے۔
میں بہت دیر تک آہستہ آہستہ ٹہلتا رہا۔ میں اپنے آپ کو آزاد محسوس کر رہا تھا۔ اور محفوظ، ان دو ہونٹوں کے درمیاں جو عین اسی لمحے اس قدر مسرت کے ساتھ مجھے ادا کر رہے تھے۔ رات آنکھوں کا باغ تھی۔ میں نے سڑک پار کی تو کسی کو دروازے سے باہر آتے ہوئے سُنا۔ میں نے مُڑ کر دیکھا، مگر اندھیرے میں کسی چیز کو پہچان نہ سکا۔ میں چلتا رہا۔ چند لمحوں بعد میں نے گرم پتھروں پر جوتیوں کے گھسٹنے کی آواز سنی۔ میں مُڑ کر دیکھنا نہیں چاہتا تھا۔ حالاں کہ میں ہر قدم کے ساتھ اس سائے کو بڑھتے ہوئے محسوس کر رہا تھا۔ میں نے بھاگنا چاہا۔ میں ایسا کر نہیں سکا۔ میں رُک گیا۔ اس سے پہلے کہ اپنا بچاؤ کرتا، میں نے اپنی پیٹھ میں چاقو کی نوک چبھتی ہوئی محسوس کی۔ اور ایک شیریں آواز:

"حرکت نہ کرنا صاحب، ورنہ اندر کر دوں گا۔"

مُڑے بغیر میں نے پوچھا:

"کیا چاہتے ہو؟"

"تمہاری آنکھیں صاحب" اس نرم، دکھی ہوئی سی آواز نے کہا۔

"میری آنکھیں؟ تم میری آنکھوں کا کیا کرو گے؟ دیکھو، میرے پاس تھوڑے پیسے ہیں۔ زیادہ نہیں، پھر بھی کچھ تو ہیں۔ میرے پاس جو ہے سب تمہیں دے دوں گا اگر مجھے جانے دو گے۔ مجھے جان سے نہ مارو۔"

"ڈرو نہیں صاحب، تمہیں ماروں گا نہیں۔ بس صرف تمہاری آنکھیں نکال لوں گا۔"

"مگر تم میری آنکھوں کا کیا کرو گے؟" میں نے ایک بار پھر پوچھا۔

"میری محبوبہ کو عجیب ضد چڑھی ہے۔ وہ نیلی آنکھوں کا گلدستہ چاہتی ہے۔ اور یہاں ایسی آنکھوں کا ملنا دشوار ہے۔"

"میری آنکھیں تمہارے کسی کام نہ آئیں گی۔ وہ بھوری ہیں، نیلی نہیں۔"

"مجھے بیوقوف بنانے کی کوشش نہ کرنا، صاحب میں خوب جانتا ہوں کہ تمہاری آنکھیں نیلی ہیں۔"

"اپنے ایک ساتھی انسان کی آنکھیں مت نوچو۔ میں تمہیں ان کے بدلے کچھ اور دے دوں گا۔"

"میرے سامنے زیادہ نیک مت بنو" وہ درشت لہجے میں بولا۔ "اِدھر مُڑو۔"

میں مُڑ گیا۔ وہ کم قد اور نازک سا تھا۔ اس کی لمبی ٹوپی نے آدھا چہرہ ڈھانپ رکھا تھا۔ اس کے سیدھے ہاتھ میں دیہاتی وضع کا چھرا تھا جس کا پھل چاندنی میں چمک رہا تھا۔

"مجھے اپنا چہرہ دیکھنے دو۔"

میں نے ماچس کی تیلی جلائی اور اپنے چہرے کے سامنے لے آیا۔ تیز روشنی سے میری آنکھیں چُندھیانے لگیں۔ اس نے مضبوط ہاتھوں سے میرے پپوٹے تھام لیے۔ وہ ٹھیک سے دیکھ نہیں پا رہا تھا۔ پنجوں کے بل کھڑے ہو کر وہ میری طرف ٹکٹکی باندھ کر دیکھا کیا۔ تیلی کے شعلے سے میری انگلیاں جھلسنے لگیں۔ میں نے تیلی کو گرا دیا۔ خاموشی کا ایک لمحہ گزر گیا۔

"اب تمہیں اعتبار آیا؟ وہ تیلی نہیں ہیں۔"

"بڑے چالاک ہو، ہیں ناں؟" اس نے جواب دیا۔ "اچھا دیکھتے ہیں۔ ایک اور جلاؤ۔"

میں نے ایک اور تیلی سُلگائی اور اپنی آنکھوں کے پاس لے آیا۔ میری آستین پکڑ کر اس نے حکم دیا:

"گھٹنوں کے بل جُھک جاؤ۔"

میں جُھک گیا۔ ایک ہاتھ سے اس نے میرے بال پکڑ لیے اور میرا سر کھینچ کر پیچھے کر دیا۔ وہ مجھ پر جُھک گیا۔ متجسس اور مجھ پر پریشان سا۔ اور اس کا چُھرا نیچے آتا رہا۔ یہاں تک کہ میری پلکوں سے چُھو گیا۔ میں نے آنکھیں بند کر لیں۔

"آنکھیں کھلی رکھو۔" اس نے حکم دیا۔

میں نے آنکھیں کھول دیں۔ شعلے سے میری پلکیں جُھلسنے لگیں۔ اچانک اس نے مجھے چھوڑ دیا۔

"ٹھیک ہے، تیلی نہیں ہیں۔ دفع ہو جاؤ۔"

وہ غائب ہو گیا۔ میں اپنا سر ہاتھوں سے تھامے دیوار سے ٹیک لگائے کھڑا رہا۔ پھر اپنے اوسان بحال کیے۔ گرتا پڑتا ٹھوکریں کھاتا اور پھر سنبھلتا کوئی گھنٹہ بھر تک اس ویران شہر میں بھاگتا رہا۔ میں جب چوک پر پہنچا تو دیکھا کہ مسافر خانے کا مالک ابھی تک دروازے کے سامنے بیٹھا ہوا ہے۔ میں ایک لفظ بھی کہے بغیر اندر چلا گیا۔ اگلی صبح میں نے وہ شہر چھوڑ دیا۔

رفتارِ ادب

آئینہ کیوں نہ دوں ——————— مصنف: اظہر حسن صدیقی

صفحات: ۲۱۴ ـ قیمت: ۱۰۰ روپے

پتا: میکون اینڈ کمپنی ـ صدر، کراچی

اظہر حسن صدیقی چھپے رستم نہیں قلم کے رستم ہیں ـ یہ دوسری بات ہے کہ انھوں نے طویل عرصے تک اپنے آپ کو بڑی خوش اسلوبی سے چھپائے رکھا مگر جب ظاہر ہوئے تو اس طرح کہ ہر شخص کو ان کا لوہا ماننا پڑا ـ ایسی رواں دواں اور شگفتہ نثر کہ جیسے ایک سبک خرام دریا موجیں مار رہا ہو ـ پیرایۂ بیان بڑا سادہ اور آسان مگر سادگی اور آسانی میں تلوار کی وہ کاٹ کہ دلوں کے پرزے ہو جائیں ـ مزاح دو دھاری تلوار ہے ـ پڑھنے والے ہی کے پرزے نہیں اڑاتا، پلٹ پڑے تو خود مصنف ہی کو شہید کر دیتا ہے ـ اظہر حسن صدیقی نے اس دو دھاری تلوار کو بڑے سلیقے اور بڑے طریقے سے استعمال کیا ہے ـ

"آئینہ کیوں نہ دوں" صدیقی صاحب کے بتیس مضامین کا مجموعہ ہے ـ سارے مضمون ایک دوسرے سے بڑھ کر ہیں ـ بظاہر یہ مضامین مختصر ہیں مگر ایک جہانِ معنی کو سمیٹے ہوئے ہیں ـ صدیقی صاحب دلِ زندہ اور دیدۂ بینا کے حامل ہیں ـ مخلص اور دردمند ہیں ـ صحت مند روایتوں کے امین ہیں ـ انھیں جہاں کہیں کوئی ناہمواری نظر آتی ہے ـ (آج کے معاشرے میں ناہمواریوں کے سوا اور ہے کیا) تو وہ اس پر کڑھنے یا افسوس کرنے کے بجائے اسے اپنے شگفتہ انداز سے اس طرح ظاہر کر دیتے ہیں کہ ہر قاری کو شگفتگی کے پس منظر میں اس ناہمواری کا صحیح ادراک ہو جاتا ہے ـ

"آئینہ کیوں نہ دوں"، فکر انگیز اور معنی خیز مضامین کا مجموعہ ہے ـ اگرچہ ان کا انداز بظاہر ہلکا پھلکا ہے لیکن بلیغ معنویت کا ابلاغ ان مضامین کا اصل مقصد ہے جس میں صدیقی صاحب پوری طرح کامیاب ہوئے ہیں ـ صدیقی صاحب کے یہ مضامین پورے معاشرے اور پوری زندگی کا آئینہ ہیں ـ جو گوشہ بھی سامنے آتا ہے صدیقی صا

کی فن کارانہ چابک دستی کو اجاگر کر دیتا ہے۔ یہ مجموعہ بڑے سلیقے اور نفاست سے شائع ہوا ہے۔

اقبال شناسی اور نوید صبح ــــــــــ مرتّب: زاہد منیر عامر

صفحات: ۲۷۲۔ قیمت: ۹۰ روپے

پتا: بزمِ اقبال ۲ کلب روڈ، لاہور

گورنمنٹ کالج سرگودھا کا میگزین "نوید صبح" اپریل ۱۹۳۳ء میں جاری ہوا۔ جنوری ۱۹۶۴ء سے یہ "ضیا بار" کے زیرِ عنوان چھپنے لگا۔ لیکن ۱۹۷۹ء میں اس کا اصل نام نوید صبح (THE DAWN) بحال کر دیا گیا۔

"نوید صبح" نے تین اقبال نمبر شائع کیے پہلا ۱۹۵۲ء میں، دوسرا ۱۹۷۳ء میں اور تیسرا ۱۹۷۷ء میں۔ اقبال شناسی اور نوید صبح" انھیں تین اقبال نمبروں کا انتخاب ہے مرتّب (زاہد منیر عامر) نے اس مجموعۂ مضامین کو کافی محنت اور دقّتِ نظری سے ترتیب دیا ہے۔ اس میں بائیس مضامین پانچ عنوانات کے تحت شامل کیے گئے ہیں۔ (۱) شخصیت و تصانیف (۲) افکار و تصوّرات (۳) شعر و فن (۴) ارتباطی مطالعہ (۵) اقبال شناسی۔ ایک مذاکرہ بہ عنوان "اقبال اور ۱۹۷۳ء" بھی شاملِ کتاب ہے جسے رفیع الدین ہاشمی صاحب نے مرتّب کیا ہے۔ اس مذاکرے میں ماہرینِ اقبالیات سے، اقبالیات سے متعلق چار مختلف نوعیت کے سوالات کیے گئے ہیں۔ یہ سوالات معنی خیز ہیں، اور جوابات سے ماہرینِ اقبالیات کے دل چسپ خیالات سے آگاہی ہوتی ہے۔

مرتّب نے انتخاب و ترتیب کے ضمن میں چند اصول متعیّن کیے۔ ایک تو یہ کہ ایسے مضامین جو "نوید صبح" میں اشاعت سے قبل کہیں شائع ہو چکے تھے انھیں نظر انداز کر دیا جائے۔ دوسرے یہ کہ ایسے مضامین جو "نوید صبح" میں چھپے مگر اب وہ مجموعۂ مضامین میں بھی شامل ہیں انھیں بھی انتخاب میں شامل نہ کیا جائے۔ علاوہ ازیں مرتّب نے اس امر کو بھی ملحوظ رکھا ہے کہ ہر مصنّف کا صرف ایک مضمون شاملِ انتخاب ہو۔ اسی طرح موضوعات کی تکرار سے بچنے کے لیے ایک موضوع پر ایک ہی مضمون منتخب کیا گیا ہے۔

"اقبال شناسی اور نوید صبح" کا بہ غور مطالعہ اس امر کو آشکار کرتا ہے کہ مرتّب نے اپنے قائم کردہ اصولوں کی بخوبی پاسداری کی ہے۔ بلاشبہ یہ ایک وقیع اور گراں قدر انتخاب ہے۔ اس انتخاب میں نہ صرف زیادہ سے زیادہ مصنّفین شامل ہو سکتے ہیں بلکہ موضوعات کا تنوّع فکرِ اقبال کی وسعت و کشادگی کی روشن دلیل ہے۔ مضمون نگاروں میں ڈاکٹر غلام جیلانی برق، ڈاکٹر عابد احمد علی، ڈاکٹر محمد عبداللہ چغتائی، ڈاکٹر شمس الدین صدیقی، بشیر احمد ڈار، ڈاکٹر وزیر آغا، ڈاکٹر محمد ریاض اور ڈاکٹر سید معین الرحمٰن شامل ہیں۔

مرتّب کی یہ کاوش بھی یقیناً لائقِ ستائش ہے کہ اس نے "نوید صبح (THE DAWN)" اور "ضیا بار" میں اقبالیات سے متعلق مطبوعہ تمام مضامین اور منظومات کی ایک فہرست، اسمائے مصنّفین کی الفبائی ترتیب اور سنہ اشاعت کے مطابق ترتیب دی ہے۔ یہ اشاریہ اقبالیات پر تحقیقی و تنقیدی کام کرنے والوں کے لیے ایک خاصے کی چیز ہے

زیرِ نظر مطبوعہ مضامین کے متعلق مرتّب کا یہ دعویٰ قطعی بجا ہے:

"'نویدِ صبح' ایک کالج کا میگزین ہونے کے باوجود، جس کے موضوعات کا دائرہ حد درجہ محدود ہوتا ہے، اقبالیاتی ادب میں نہ صرف گراں بہا اضافے کیے بلکہ اس کے ذریعے نوجوانوں کو فکرِ اقبال سے وہ آگہی حاصل ہوئی، جو نہ تو ضخیم و دقیق ادبی رسائل کے توسط سے ہو سکتی ہے اور نہ روزانہ اخبارات اس ضمن میں کوئی دیرپا خدمت انجام دے سکتے ہیں۔" (ص ۱۹)

عموماً دیکھنے میں آیا ہے کہ کالج میگزین زیادہ کد و کاوش سے مرتب نہیں کیے جاتے اور نہ ان کے خاص نمبر اتنے جامع اور وقیع ہوتے ہیں کہ ان سے کسی قسم کی علمی پیش رفت میں مدد مل سکے۔ لیکن "نویدِ صبح" اس سے مستثنیٰ ہے۔ بیشتر محققین کے مضامین صرف "نویدِ صبح" میں چھپنے کے لیے لکھے گئے۔ اقبال شناسی اور "نویدِ صبح" کو دیکھتے ہوئے ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ اگر سنجیدگی، تدبّر اور تفکر سے کالج میگزین مرتب کیے جائیں تو وہ بھی اقبالیات میں نمایاں اور قابلِ قدر اضافہ ثابت ہو سکتے ہیں۔ اس مجموعے پر ڈاکٹر رفیع الدین ہاشمی نے نظرِ ثانی کی ہے۔ (زیب النساء ایم۔ اے)

لطیفیات (حصّہ اوّل، دوم) ———— مصنّف: م۔ حسن لطیفی

صفحات: ۳۵۱۔ قیمت: ۲۰۰ روپے

پتا: ادارہ نقوش، لاہور

"لطیفیات" کا پہلا حصّہ م۔ حسن لطیفی کے طالب علمی کے زمانے میں جولائی ۱۹۲۸ء لاہور سے چھپا تھا۔ دوسرا حصّہ لدھیانہ کے کسی اشاعتی ادارے نے چھاپا تھا۔ اور اب ساٹھ برس بعد یہ دونوں حصّے ایک ساتھ منظرِ عام پر آئے ہیں۔ اس نادر اشاعت کے لیے م۔ حسن لطیفی کی صاحبزادی ڈاکٹر عذرا ظہور اور ادارہ نقوش قابلِ مبارک باد ہیں۔ اتنے عرصے بعد لطیفیات کی دوبارہ اشاعت کا ادبی حلقوں میں بصد شوق استقبال کیا گیا ہے۔ علمی و ادبی حلقے کے لیے مزید مسرّت کا سامان یوں فراہم ہوا ہے کہ م۔ حسن لطیفی کے بکھرے ہوئے تمام کلام کو "لطیفیات سوم" کے نام سے ترتیب دے کر جلد ہی لاہور کا ایک پبلشر شائع کر رہا ہے۔

بزرگوں نے کہا ہے "کہ باز خواں" کا مقولہ بلا وجہ وضع نہیں کیا تھا۔ اس کے پیچھے تاریخ کے تسلسل کو زندہ رکھنے کا عمل کارفرما ہے۔ اگر ہمارے درمیان کسی شے کو بار بار پڑھنے کا ذوق فراموش ہو جائے اور اس کی دوبارہ اشاعت نہ ہو تو ہم ماضی بعید تو ماضی بعید، ماضی قریب تک کو بھلا کر بیٹھ جائیں گے۔ باز خوانی کا یہ عمل کسی نگارش کی دوبارہ اشاعت سے بندھا ہوا ہے لہٰذا ضروری ہے کہ کتابوں کو ان کے قارئین کے درمیان زندہ رکھنے کے لیے ان کی بار بار اشاعت کی جائے۔

عام طور پر ادبی حلقے کا خیال ہے کہ آزاد نظم کو اردو ادب میں تصدّق حسین خالد اور ن۔ م۔ راشد نے متعارف کرایا۔ ایک حلقے کا یہ بھی کہنا ہے کہ اوّل اوّل اس کا تجربہ مولانا عبدالحلیم شرر نے کیا تھا۔ معروف افسانہ و ناول نگار صادق الخیری صاحب لطیفیات کے دیباچے میں رقم طراز ہیں کہ اس صنفِ نظم کو م۔ حسن لطیفی نے پہلے پہل متعارف کر دیا تھا۔ یہ تینوں آرا اپنی جگہ ہیں میرے نزدیک اوّلیت کی جستجو سے زیادہ اہم بات یہ ہے کہ م۔ حسن لطیفی کی اکثر نظمیں ساٹھ برس کے بعد بھی آج کی نظمیں ہی معلوم ہوتی ہیں۔ پتا نہیں کیوں مجھے م۔ حسن لطیفی صاحب کی نظمیں اندلس کا چاند، سپہ سالار، سرنگاپٹم اور اسی قبیل کی دوسری شعری

ات پڑھتے ہوئے بنگال کے مشہور شاعر قاضی نذرالاسلام یاد آئے ہیں۔ اس کی وجہ شاید یہ ہو کہ جس دور میں م حسن لطیفی
ی کر رہے تھے اس دور میں اردو میں قاضی نذرالاسلام کی انقلابی و ملی نظموں کے ترجمے شروع ہو چکے تھے۔ اور جدوجہدِ آزادی
منظر میں یہ نظمیں اردو اور بنگلہ دونوں زبانوں کے مسلمان شاعروں کے لیے پسندیدہ تھیں۔ کیوں کہ مسلمانوں کے ملی تشخص کے
و نذرالاسلام کی نظمیں بہت تقویت پہنچاتی تھیں۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ م حسن لطیفی کے شعری کارناموں پر اس زاویے
ی نگاہ ڈالی جائے۔

کتاب خوبصورت چھپی ہے اور اہلِ علم کے لیے دعوتِ دل و نگاہ ہے۔ (ا ـ س)

شناخت

مصنف: ناصر بغدادی
صفحات: ۲۰۷۔ قیمت: ۷۵ روپے
پتا: ندا پبلی کیشنز۔ کراچی

وہ پھول سر چڑھا جو چمن سے نکل گیا

اس مصرعے کی ایک سچائی تو وہ ہے جو اس میں بیان کی گئی ہے، اور اس سے انکار مشکل ہے۔ لیکن ایک دوسری حقیقت بھی ہے
جو پھول چمن سے نکل جاتا ہے وہ اپنی شناخت کھو بیٹھتا ہے۔ اور پھر عمر بھر اپنی شناخت کے لیے سرگرداں رہتا ہے، اور
ناخت" ہونے کی تذلیل برداشت کرتا پھرتا ہے۔ ناصر بغدادی کی کہانی "بے شناخت" اس موضوع پر ایک نہایت ہی
انی ہے۔ "بے شناخت" کا ایک کردار مسرت کی تلاش میں وطن چھوڑ کر پردیس جا بستا ہے۔ پردیس میں اسے مالی مسرتیں
ل ہو جاتی ہیں لیکن سب کچھ مالی آسودگی و مسرت ہی نہیں۔ آدمی معاشرتی حیوان ہے۔ اپنی معاشرت سے کٹ کر اجنبی
ین مغائرت کی زندگی گزارنا اس کے لیے سوہانِ روح ہو جاتا ہے۔ اور اس نتیجے پر پہنچتا ہے کہ "نقل مکانی کے جتنے
ے ہو سکتے ہیں، زمین چھوڑنے کے نقصانات بھی اتنے ہی ہیں۔ یہ ایک ایسا کاروبار ہے جس میں خالص فائدہ نام کی
ز نہیں۔ اور یہی وجہ ہے کہ میں نہیں زمین چھوڑنے کا مشورہ بالکل نہیں دوں گا۔ اگر انجانی زمین پرانجانے لوگوں کے
ن، انجانی بلاؤں سے مقابلہ ایک اٹل حقیقت ہے تو بہتر یہی ہے کہ انسان اپنی زمین پر اپنے لوگوں کے درمیان نامعلوم
ں سے آنے والی آسیبی قوتوں کا ڈٹ کر مقابلہ کرے۔ اس مقابلے میں ممکن ہے وہ اپنا سب کچھ ہار جائے مگر اس کی اپنی
ن کو اس سے کوئی نہیں چھین سکتا۔"

"بے شناخت" کے سارے افسانے اپنے اندر READABILITY رکھتے ہیں۔ قاری انھیں پڑھ کر ایک بے ساختہ
ی مسرت سے ہمکنار ہوتا ہے۔ شاید اس کی وجہ یہ ہو کہ ان کی کہانیاں کہانی پن کا دامن نہیں چھوڑتیں۔ لیکن یہاں
پر فرداً فرداً اظہارِ رائے ممکن نہیں۔ لہذا میں ناصر بغدادی کے ایک اور افسانے "آدھا گناہ آدھی عبادت" پر اظہارِ خیال
اپنی گفتگو ختم کرتا ہوں۔

"آدھا گناہ آدھی عبادت" ایک ایسا افسانہ ہے جس کی پوری فضا "مسجد کے زیرِ سایہ خرابات چاہیے" کی سی ہے۔

افسانہ یہ ہے کہ جس محلّے میں ایک حافظ جی نے گھر لیا ہے ان کے بالکل پڑوس میں ایک فاحشہ عورت اختری رہتی ہے۔ افسانے کا آغاز اختری کے گھر کے دروازے کے زور زور سے کھلنے اور بند ہونے کی کرخت آواز سے ہوتا ہے۔ رات بے حد طوفانی ہے۔ اختری کے گھر کے دروازے کا ہر وقت کھلنا اور بند ہوتا اور اس کے گاہکوں کا آتے جاتے رہنا حافظ جی کی عبادت میں مخل ہے۔ عبادت گزاری کے موقعے پر یوں بھی "شیطانی خیالات بن بلائے مہمان کی طرح ذہن میں وارد ہونے لگتے ہیں۔ یہاں تو معاملہ یہ تھا کہ حافظ جی کی پڑوسن فاحشہ اختری اور اس کے ہاں آنے والے گاہکوں کا سلسلہ بندھا رہتا تھا۔ چوں کہ حافظ جی، اختری کے اول نا خواستہ پڑوسی تھے۔ اس لیے اختری کے ہاں آنے جانے والوں پر نظر رکھتے تھے اور انھیں اس حد تک اندازہ تھا کہ وہ یہ بھی بتا سکتے تھے کہ کس وقت کون یہاں آتا ہے۔

رات طوفانی تھی، آج کچھ بہت زیادہ ہی اختری کے گھر کے دروازے کے کھلنے اور بند ہونے پر کرخت آوازیں پیدا کر کے حافظ جی کی عبادت گزاری میں مخل ہو رہے تھے۔ اور وہ اس دخل در معقولات سے اس درجہ تنگ آ گئے تھے کہ انھوں نے یہ فیصلہ کر لیا تھا کہ صبح ہوتے ہی ہنگامہ کر کے یا تو اختری کو محلّے سے جانے پر مجبور کر دیں گے یا پھر خود ہی اس جگہ کو چھوڑ دیں گے۔ لیکن جب دوسرے روز علی الصبح حافظ جی کو یہ معلوم ہوا کہ اختری کئی دنوں سے بیمار تھی۔ رات وہ مر گئی۔ اور یہ جو اس کے دروازے ہر وقت کرخت آواز سے کھلتے اور بند ہوتے تھے وہ اس وجہ سے کہ اختری اس دوران جاں کنی کے عالم میں تھی۔

یہ خبر حافظ جی کے لیے لمحۂ فکریہ بن گئی کہ اختری کے روز کے گاہکوں نے اس کو پلٹ کر کیوں نہیں دیکھا؟ حافظ جی جنھوں نے پچھلی رات یہ تہیّہ کر لیا تھا کہ صبح ہوتے ہی اختری کو محلّے سے نکال باہر کر کے چھٹکارا حاصل کر لیں گے، اس سے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے چھٹکارا پا لینے پر انھیں خوشی نہیں ہوئی تھی۔ یہ کیسا جذبہ تھا جو "بعد المشرقین" کے باوجود حافظ جی کو ملول کر گیا تھا۔ یہی انسانی جبلت اور انسانی رشتے کا اہم ترین مقام ہے۔ اس مقام پر آ کر عام قاری بھی ملول ہو جاتا ہے۔ اور میرے خیال میں یہی افسانہ نگار کی بڑی کامیابی ہے۔

کتاب خوبصورت چھپی ہے۔ قابلِ مطالعہ ہے۔ اور شاگرد نے استاد کا حق ادا کرنے کے لیے اس کا انتساب مشہور نقاد "حسن عسکری" مرحوم کے نام کیا ہے۔

(ا ۔ س)

چراغِ لالہ ——— مصنّف: پروفیسر شمس شیدائی

صفحات: ۱۲۸ ۔ قیمت: ۲۵ ٹکا / روپے

پتا: محاذ پبلی کیشنز ۲۶ ۔ لال چند مقیم لین (ٹھٹھری بازار) ڈھاکا ۔ بنگلا دیش

"چراغِ لالہ" کے شاعر شمس شیدائی کی "سرگزشتِ حیات" کو پڑھنے کے بعد جو حقائق سامنے آتے ہیں وہ یہ کہ موصوف دو شخصیات سے بے حد متاثر تھے۔ ایک مولانا ابوالکلام آزاد اور دوسرے علامہ اقبال۔ بلکہ بہ قول ان کے انھوں نے نظم گوئی کا آغاز علامہ اقبال کی شاعری سے متاثر ہو کر کیا۔ یہ دونوں حضرات اپنے اپنے انداز کے پہنا ور پیڈ رکھتے اور مسافر کے لیے اچھا ہے کہ لمحے دو لمحے کے لیے اس کے نیچے کم کرسستا لے اور آگے بڑھ جائے۔ شیدائی صاحب کا اچھا خاصا وقت مولانا

آزاد کی شخصیت پر نظمیں لکھنے اور علامہ اقبال کی پیروی میں گزر گیا۔ یوں بھی شیدائی صاحب کم گو آدمی ہیں۔ لکھنے کی رفتار کا اندازہ اس سے کیجیے کہ ۱۹۳۵ء سے ۱۹۷۴ء تک کل نو نظمیں کہی ہیں۔ مجھے ان کی شاعری کو پڑھ کر یہ محسوس ہوا کہ ان کے ہاں علامہ اقبالؒ کے بعد وقت ٹھہر گیا ہے۔

"چراغ لالہ" میں دو ایک روزن مجھے نظر آئے جن میں ایک "مہتاب نامہ" جو شاعر کی دلگدازی کا پتا دیتا ہے اور اس بات کا متقاضی ہے کہ شاعر کو فی الفور درونِ دل کے سفر پر چل پڑنا چاہیے، اور وقت کے ٹھہراؤ کو پھلانگ جانا چاہیے۔ یہاں مجھے شمس صاحب کے معنوی استاد مولانا ابوالکلام آزاد کی وہ خوبصورت باتیں یاد آ رہی ہیں جو انھوں نے یکسانیت سے بچنے بچانے کے لیے کہی تھیں، وہ من وعن تو پیش نہیں کر سکتا، مفہوم کچھ اس طرح ہے۔ مکان کو یکسانیت سے بچانے کے لیے اس میں کوئی نہ کوئی تبدیلی لاتے رہنا چاہیے۔ اگر وہ ایک منزلہ ہے تو اس پر ایک منزل اور کھڑی کر دینی چاہیے۔ ہوا داری کے لیے اگر ایک کھڑکی ہے تو اس میں کئی کھڑکیوں کا اضافہ کیا جا سکتا ہے۔ مکان کے اندر اور باہر رنگ و روغن بدلتے رہنے میں کوئی مضائقہ نہیں۔ اس سے مکان کے حسن میں اضافہ ہوتا ہے۔

میں نے شمس صاحب کو مرحوم مشرقی پاکستان میں اکثر سنا ہے۔ زبان و بیان پر گرفت کا بھی قائل ہوں ان کی عامدانہ منظوم "سرگزشتِ حیات" سے ظاہر ہے، بات وہی ابوالکلام والی ہے۔ کہ مکان کو یکسانیت سے بچانے کے لیے معمولی تبدیلیاں کرتے رہنا چاہیے۔

(ا۔ س)

ڈاکٹر انور سدید

کچھ وقت ہندوستانی کتابوں کے ساتھ

ترقی پسند ادب (پچاس سالہ سفر) ـــــ ترتیب ڈاکٹر قمر رئیس، سید عاشور کاظمی

ترقی پسند مصنفین کی تحریک کو ہندوستان میں معرضِ عمل میں لانے کا اولین منصوبہ ۱۹۳۵ء میں لندن میں اس دو[ر] کے چند فعال اور سیاسی طور پر بیدار نوجوانوں نے بنایا تھا۔ ان نوجوانوں میں سب سے زیادہ سرگرم سجاد ظہیر تھے جو نئے عالمی حالات کے زیرک ناظر تھے اور ہندوستان میں انقلاب کی ایک نئی لہر پیدا کرنے کے آرزومند تھے۔ وہ اشتراکی نظریات اور مارکسی نقطۂ نظر کے مطابق ادب، زندگی اور سماج میں ہم آہنگی پیدا کرنے اور ان کے فروغ میں ان عوامل کو ایک دوسرے کا معاون بنانا چاہتے تھے۔ سجاد ظہیر کا تعلق ایک امیر، کشادہ نظر اور علمی خاندان سے تھا۔ وہ خود بھی ادیب تھے۔ انھوں نے خاندانی امارت کی چکا چوند کو تج کر عوامی سطح پر بیداری پیدا کرنے اور ادب کو اس بیداری کا وسیلہ بنانے کا عملی آغاز کیا اور نظریہ اور عمل میں اشتراک کی مثال قائم کی۔ ہندوستان میں اس تحریک کو ابتداہی میں نہ صرف مقبولیت حاصل ہوئی بلکہ اس دور کے چند معتبر اور نامور ادبا مثلاً منشی پریم چند، مولوی عبدالحق، راجہ راؤ، ملک راج آنند، پنڈت جواہر لعل نہرو اور متعدد دوسری زبانوں کے ادیبوں کا تعاون اور سرپرستی حاصل ہوئی، نوجوان لکھنے والوں نے اس تحریک کے عوامی اور انسانی مقصد کو بالخصوص قبول کیا۔ عمل شروع ہوا تو اس کے خلاف ردِ عمل کی موثر لہر بھی ابھری جس نے اس تحریک کے فکر و نظر کے دھارے کو منموج کرنے میں اہم کردار ادا کیا۔ چنانچہ ۱۹۳۶ء سے ۱۹۴۷ء تک کے گیارہ سال اس تحریک کا طغیانی دور ہے۔ جس نے پورے ہندوستان کو اپنی لپیٹ میں لے لیا۔ اس دور میں ترقی پسند تحریک کا سیاسی زاویہ نسبتاً دبا ہوا نظر آتا ہے۔ لیکن ادبی زاویہ بے حد نمایاں ہے۔ آزادی کے بعد اس تحریک کے سیاسی زاویے نے نسبتاً زیادہ اہمیت اختیار کر لی اور تخلیقی سطح پر ادب کا عمل سیاسی نظریات کے فروغ کا وسیلہ بنایا جانے لگا تو اس تحریک میں زوال کے آثار پیدا ہو گئے۔ بلاشبہ یہ دور بھی اس تحریک کا طغیانی دور ہی تھا لیکن اب انتہا پسندی کو غلبہ حاصل ہو چکا تھا۔ رہنماؤں کا طرزِ عمل حاکمانہ اور آمرانہ بن گیا۔ تخلیقات پر فتویٰ عائد کرنے کا رجحان فروغ پانے لگا اور کشادہ نظری اور عالی ظرفی کے برعکس ایک خاص نوع کی تنگ نظری نے جنم لے لیا۔ اسی زمانے میں شمال مغرب سے سرخ انقلاب [illegible]

آگیا اور حکومت نے ان علمی سرگرمیوں پر نہ صرف نظر رکھنا شروع کر دی بلکہ پاکستان میں اس تحریک پر پابندی عائد کر دی گئی اور بعض قائدینِ تحریک کو گرفتار بھی کر لیا گیا۔ ترقی پسند تحریک نے اپنی آئندہ زندگی غیر تنظیمی حالت میں بسر کی۔ تاہم اس حقیقت سے انکار ممکن نہیں کہ اپنی زندگی کی اس نصف صدی کے دوران اگرچہ تحریک ختم ہو چکی تھی لیکن اس کے نظریاتی وابستگان کی تعداد خاصی بڑھی اور یہ ادبا ایک مخصوص سانچے کا ادب لکھنے میں بھی مصروف رہے۔

ترقی پسند تحریک کے ماضی کے اس تناظر میں یہ حقیقت بڑی معنی خیز ہے کہ برصغیر کے بعض فعال ترقی پسند ادبا نے جب حکومتی سطح پر برسرِ اقتدار طبقے سے مفاہمت کی راہ ہموار کر لی تو ۱۹۸۳ء میں لندن میں اس تحریک کا احیا فیض احمد فیض کی موجودگی اور سرپرستی میں عمل میں لایا گیا۔ ۱۹۸۶ء میں بڑے پیمانے پر اس تحریک کی گولڈن جوبلی منائی گئی جس میں شرکت کے لیے برصغیر پاک و ہند کے ثقہ ترقی پسندوں کو دعوت نامے جاری کیے گئے۔ یہ گولڈن جوبلی کانفرنس کامیاب ہوئی اور ترقی پسند تحریک کی گونج نہ صرف دُور دُور تک سنی گئی بلکہ کراچی اور لکھنؤ میں بھی دو شاندار گولڈن جوبلی کانفرنسیں منعقد کی گئیں۔ بالفاظِ دیگر ۱۹۳۵ء میں جس تحریک نے لندن سے اپنی آواز بلند کی تھی، اس کی نشاۃ ثانیہ بھی ۱۹۸۳ء میں لندن ہی میں برپا ہوئی۔ اور اس تحریک کے اثر و عمل کا جائزہ لینے کے لیے ایک جامع، بامعنی اور مستند کتاب "ترقی پسند ادب، پچاس سالہ سفر" بھی ڈاکٹر قمر رئیس اور عاشور کاظمی کی معاونت سے لندن میں مرتب ہوئی۔ یہ کتاب نیا سفر پبلی کیشنز کے زیرِ اہتمام دہلی سے شائع ہوئی ہے۔

یہ کتاب ترقی پسند تحریک کی تاریخ بھی ہے اور یہ اس تحریک کے سنجیدہ علمی اور ادبی کام کا تجزیاتی مطالعہ بھی ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ سجاد ظہیر کی کتاب "روشنائی"، علی سردار جعفری کی "ترقی پسند ادب" اس تحریک کے سرکاری نقطۂ نظر کی ترجمان ہیں۔ عزیز احمد، خلیل الرحمٰن اعظمی اور ہنس راج رہبر کی کتاب اور ڈاکٹر وحید قریشی کا طویل سلسلۂ مضامین جو ہفت روزہ "زندگی" لاہور میں شائع ہوا۔ اس تحریک پر تنقیدی اور اختلافی زاویہ ہے۔ تاہم زیرِ نظر کتاب کی حیثیت ان سب سے جداگانہ ہے۔ مرتبین نے بڑی دانش مندی سے ایسے اربابِ نظر کو موضوعات تفویض کیے ہیں جو ان پر نہ صرف بالغ نظری سے مقالہ لکھ سکتے تھے بلکہ تحریک سے ہمدردانہ رویہ بھی رکھتے ہیں۔ دوسری بات یہ کہ اس کتاب میں تحریک کے نظریاتی افق کو ضرورت سے زیادہ روشن کرنے کے بجائے مختلف اصنافِ ادب میں تحریک کی کارگزاری اور اثر و نفوذ کا مدار مرتب کرنے کی کاوش کی گئی ہے چنانچہ فکری سفر کے نشانات کے ساتھ تخلیقی سفر کا تجزیاتی مطالعہ اور اس راہ گزر کے نقوش بھی تلاش کیے گئے ہیں جس پر تحریک کا کارواں گزرتا چلا گیا۔

ترقی پسند تحریک اور زیرِ نظر کتاب کی اس پس منظری تفصیل کے بعد اب یہ بتانا ضروری ہے کہ یہ کتاب عمومی طور پر دو طویل فصلوں پر مشتمل ہے۔ پہلی فصل میں چار ابواب ہیں جن میں تحریک کے فکری اور نظریاتی مباحث کے علاوہ مختلف علاقوں میں ترقی پسند مصنفین کی تحریکی سرگرمیوں کا احاطہ کیا گیا ہے۔ علی سردار جعفری نے "تحریک، جمالیات اور سیاست" کے موضوع پر، رالف رسل صاحب نے "ترقی پسند تحریک کی لیڈرشپ"، اصغر علی انجینئر نے "ترقی پسند ادب نظریاتی بنیادیں"، محمد علی صدیقی نے "ترقی پسند ادب کے محرکات و رجحانات" اور پروفیسر صدیق الرحمٰن قدوائی نے "ترقی پسند تحریک منشوروں کی روشنی میں" کے موضوعات پر تفصیل سے بامعنی اور خیال انگیز انداز میں روشنی ڈالی ہے۔ فکری سفر کے نشانات کے باب میں اختر حسین رائے پوری، پریم چند، مجنوں گورکھپوری، ڈاکٹر عبد العلیم، سید احتشام حسین اور فیض احمد فیض نے زندگی، ادب، تہذیب، اقدار اور جمالیات کی

ترقی پسندانہ غرض و غایت کو روشن کیا ہے۔ جوگندر پال نے افسانے میں ترقی پسند فکر کا۔ ڈاکٹر رشید امجد نے فنی صداقتوں کے اظہار میں ترقی پسند رویے کا اور اقبال مجید نے مشرق کے ترقی پسند رجحانات کا عمدہ تجزیہ کیا ہے۔ یہ مضامین خیالات کو کروٹ دینے اور موضوع کو نئے زاویوں سے پرکھنے کی دعوت دیتے ہیں۔

دوسری فصل کو "عمر گزشتہ کی کتاب" کا عنوان دیا گیا ہے (یہ عنوان غالباً مرزا ظفرالحسن سے مستعار ہے لیکن انھیں کریڈٹ نہیں دیا گیا) اس فصل کے ذیلی ابواب افسانوی ادب، ڈراما، شاعری، رپورتاژ، طنز و مزاح اور "لسانی مسائل" ہیں۔ ان ابواب کے مضامین میں ادب کی روایت کو دریافت کرنے، اس روایت میں ترقی پسند تحریک کی توسیعی سرگرمیوں کا جائزہ لینے اور پھر مستقبل پر اس کے اثرات کا تجزیہ کرنے کی کاوش کی گئی ہے۔ مثال کے طور پر شہزاد منظر کا مضمون "ترقی پسند افسانہ کی روایت اور نیا افسانہ" کو جب ڈاکٹر صادق کے مقالہ "ترقی پسند افسانہ کے پچاس سال" کے ساتھ پڑھیں تو اس موضوع کا زمانی اور فکری دائرہ مکمل ہو جاتا ہے۔ اسی نوع کا ایک اور فکر انگیز مضمون "ترقی پسند نظم نظریاتی کردار کی توسیع" ہے جسے ڈاکٹر عتیق اللہ نے لکھا ہے۔ ترقی پسند نظم کے مذاکرے میں ڈاکٹر شمیم حنفی، پروفیسر قمر رئیس، ڈاکٹر عتیق اللہ، ڈاکٹر اجمل اجملی، ڈاکٹر حنیف کیفی، تنویر احمد علوی صاحب، عبدالحق اور مغیث الدین فریدی نے حصہ لیا ہے۔ اور ترقی پسند نظم کی مختلف جہات پر بامعنی بحث کی ہے۔

اس کتاب میں پیش کیے گئے سب خیالات سے اتفاق ممکن نہیں۔ یہ کتاب ترقی پسند مصنفین نے اپنا مخصوص نقطۂ نظر پیش کرنے اور تحریک کی عملی کارگزاری کو ضابطۂ تحریر میں لانے کے لیے لکھی ہے اس لیے اس میں صرف اثباتی زاویہ ہی نظر آتا ہے۔ اختلافی زاویے کو منظر پر لانا شاید اس کتاب کے مدار میں شامل نہیں تھا۔ لہٰذا اس سے اختلاف کی گنجائش موجود ہے۔ اس سب کے باوجود مرتبین کی کاوش اور محنت کی داد جتنی بھی دی جائے کم ہے۔ اس کی تاریخی اور ادبی حیثیت سے انکار ممکن نہیں اور یہ بات بھی مسلّم ہے کہ یہ کتاب آئندہ اس تحریک پر کام کرنے والوں کے لیے بے حد معاون اور مددگار ثابت ہوگی۔

پریم چند کے ۱۰۰ افسانے ـــــــ ترتیب و انتخاب پریم گوپال متل

منشی پریم چند ۳۱ جولائی ۱۸۸۰ء کو پیدا ہوئے، اور ترقی پسند مصنفین کی پہلی کانفرنس میں ایک تاریخی خطبہ ارشاد فرمانے کے بعد اسی سال ۸ اکتوبر ۱۹۳۶ء کو وفات پا گئے۔ ان کی ادبی زندگی کی ابتدا ۱۹۰۱ء میں ہوئی، ان کا آخری افسانہ جو ان کی زندگی میں شائع ہوا۔ وہ "دو بہنیں" ہے جو رسالہ "مادھوری" میں اگست ۱۹۳۶ء میں شائع ہوا لیکن اس سے چند ماہ قبل ان کے ارتقا کے فن کا عمدہ ترین نقش "کفن" رسالہ جامعہ دہلی کی دسمبر ۱۹۳۵ء کی اشاعت میں منظر عام پر آچکا تھا۔ اس تفصیل سے ظاہر ہوتا ہے کہ پریم چند کی ادبی زندگی عملی طور پر ۳۶ برسوں پر محیط ہے۔ اس تمام عرصے میں اگرچہ زندگی ان پر مہربان نہیں رہی اور انھیں متعدد مسائلِ حیات سے نبرد آزما ہونا پڑا تاہم انھوں نے ہمیشہ ایک فعّال ادیب ہونے کا ثبوت دیا اور ناول اور افسانے کی صنف کے تاریخی ارتقا میں اہم کردار ادا کیا۔ ان کی زندگی اور فن پر ان کی وفات کے بعد جتنا کچھ لکھا گیا ہے، اتنا اردو کے کسی دوسرے بڑے افسانہ نگار پر نہیں لکھا گیا۔ ڈاکٹر قمر رئیس، ڈاکٹر سید جعفر رضا، ڈاکٹر شکیل الرحمٰن، ڈاکٹر عبیداللہ خاں، ڈاکٹر خواجہ محمد زکریا، ہنس راج رہبر، ڈاکٹر انوار احمد اور ڈاکٹر شمیم نکہت نے ان پر

قابلِ قدر کام کیا ہے۔ جناب مانک ٹالہ کے لیے پریم چند تحقیق کا ایک اہم ترین موضوع ہے۔ پاکستان میں جناب عتیق احمد تحقیق و جستجو کے بعد پریم چند کے متعدد مضامین جو نظروں سے اوجھل ہو چکے تھے تلاش کیے اور کتابی صورت میں چھپوائے۔ اب حال ہی میں دہلی سے پریم چند کے سو افسانوں کا کڑا انتخاب پریم گوپال متل نے کیا ہے اور اپنے مفصل مقدمے کے ساتھ دہلی سے شائع کیا ہے۔

اس کتاب کی ایک بنیادی خوبی یہ ہے کہ منتخب افسانے تاریخی التزام سے پیش کیے گئے ہیں۔ یعنی عنوان کے ساتھ اس بات کی وضاحت بھی کر دی گئی ہے کہ یہ افسانہ پہلی بار کس رسالے اور کس زبان میں چھپا تھا اور اب پریم چند کی کس کتاب میں دستیاب ہے۔ اس ضمن میں پریم گوپال متل نے زیادہ تر ڈاکٹر سید جعفر رضا کی تحقیق پر انحصار کیا ہے۔ پریم چند کے افسانوں کا تاریخی ترتیب سے مطالعہ ان کے فن کے تدریجی ارتقا کو سمجھنے کے لیے بہت اہم ہے۔ اس کتاب کی دوسری خوبی یہ ہے کہ پریم چند کے افسانے متعدد رسائل اور کتب میں بکھرے ہوئے ہیں متعدد اصحاب نے اپنے اپنے زاویۂ نظر سے ان افسانوں کے منتخب مجموعے بھی شائع کیے ہیں تاہم اتنا ضخیم اور نمائندہ انتخاب اس سے پہلے کبھی شائع نہیں ہوا۔ چنانچہ پریم چند پر کام کرنے والوں کے لیے یہ کتاب ایک چیزے دیگر ہے۔ جو انھیں مختلف لائبریریوں میں ٹھوکریں کھانے سے بچا لیتی ہے۔ اس کتاب کی تیسری خوبی اس کتاب کا مقدمہ ہے جو بیشتر ان تنقیدی اور تحقیقی سوالات کی روشنی میں لکھا گیا ہے جو پریم چند پر کام کرنے والے ارباب ادب نے مختلف اوقات میں اٹھائے۔ پریم گوپال متل نے اگرچہ پریم چند کے ہمدرد اور مدّاح کا فریضہ ادا کیا ہے تاہم انھوں نے مختلف اختلافات کو بڑی شائستگی سے رد کرنے کی کوشش کی ہے اور پریم چند کی عظمت کا نقش مستحکم کر دیا ہے۔ اس کتاب کی آخری خوبی یہ ہے کہ پریم گوپال متل نے پریم چند کو درسی مدارس سے نکالنے کی کامیاب کوشش کی ہے۔ ورنہ یہ کتاب پیش کر کے پریم چند کو وسیع تر علمی مطالعے اور بحث کا موضوع بنا دیا ہے۔ میرا خیال ہے کہ اب پریم چند کے افسانے ایک ہی جگہ دستیاب ہیں تو ان کے بارے میں سابقہ آرا پر نظرِ ثانی کی ضرورت بھی محسوس کی جائے۔

موخر الذکر بات میں نے اپنے ذاتی مطالعے کے تناظر میں پیش کی ہے۔ میں نے "اردو افسانے میں دیہات کی پیشکش" کے موضوع پر کام کیا تو مجھے اعتراف ہے کہ مجھے پریم چند کی سب کتابیں کوٹ اڈو جیسے دور افتادہ مقام پر حاصل نہ ہو سکیں۔ نا نچہ دستیاب مواد سے میں نے یہ نتیجہ اخذ کیا کہ:

> "پریم چند نے امیر اور غریب کی طبقاتی تقسیم کو بالعموم برقرار رکھنے کی سعی کی ہے چنانچہ غریب کی غربت اور امیر کی امارت کے مظاہر دونوں کو دکھانے میں پریم چند انتہا پسندی کا شکار نظر آتے ہیں۔ . . . . . . وہ بلاشبہ غریب طبقے کے طرفدار نظر آتے ہیں لیکن امیر طبقہ تو ان کی معمولی ہمدردی بھی حاصل نہیں کر سکا۔ انھوں نے اس طبقے کو بالعموم انسانی اہداف سے عاری دکھانے کی کوشش شعوری طور پر کی ہے۔" (اردو افسانے میں دیہات کی پیشکش، ص ۶۴)

پریم گوپال متل نے میرے اس استخراجِ نتیجہ سے اختلاف کیا ہے اور درست اختلاف کیا ہے۔ میرا خیال ہے کہ اس کتاب میں متعدد ایسے افسانے موجود ہیں جو متذکرہ بالا رائے پر نظرِ ثانی کی ضرورت محسوس کراتے ہیں۔ ۹۲۴ صفحات پر مشتمل یہ کتاب موڈرن پبلشنگ ہاؤس دہلی سے دستیاب ہے۔

پہلی غلطی ـــــــ اسحاق خضر

اسحاق خضر پاک و ہند کے ان معدودے چند خوش قسمت مزاح نگاروں میں شمار کیے جاسکتے ہیں جن کی تعریف ان کے معاصرین بھی کرتے ہیں۔ ان کی کتاب "پہلی غلطی" پر یوسف ناظم اور مجتبیٰ حسین نے انھیں جو داد دی ہے اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ اسحاق خضر کے ہاں مزاح کا فطری جوہر موجود ہے اور اس کا ایک دلکش نمونہ کتاب کے ابتدائی اوراق میں یوں پیش کیا ہے:

"اس کتاب کی اشاعت میں کسی اردو اکادمی سے کوئی مالی تعاون حاصل نہیں کیا گیا۔
اندیشہ تھا کہ ایسا کرنے پر "معیاری تخلیقات" کا تقاضا پورا کرنا پڑتا۔"

اس مختصر تحریر میں اردو اکادمیوں پر جو سبک سی، لطیف سی طنز ہے اسے وہ اہلِ ادب ہی سمجھ سکتے ہیں جو کتاب چھپوانے کے لیے اردو اکادمیوں کے چکر میں سے گزر چکے ہیں۔ اسحاق خضر کے ہاں مزاح لالۂ خودرو کی طرح پیدا ہوتا ہے۔ یہ ایسا مزاح ہے جسے آرائشِ خامہ کی ضرورت نہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اسحاق خضر نے ٹیوشن، چھٹی، حاتم طائی کا انٹرویو اور فنِ گداگری جیسے مضامین میں خیال اور صورتِ واقعہ ہی کو نہیں الفاظ کو بھی شائستگی سے محفوظ رکھا ہے اور مسکراہٹ کو فطری صورت میں بیدار ہونے کی اجازت دی ہے۔ یہ انداز یوسف ناظم، مجتبیٰ حسین، نریندر لوتھر اور دلیپ سنگھ کے ہاں زیادہ نمایاں ہے۔ شاید اسحاق خضر مزاح نگاروں کے اس سلسلے ہی میں شامل ہونے کی کوشش کر رہے ہیں۔ ہمیں ان کے ہاں کامیابی کے روشن امکانات نظر آتے ہیں۔

آخری مگر ضروری بات یہ ہے کہ اسحاق خضر اگر "پہلی غلطی" کے پُرلطف مزاح پاروں کو اپنے اختیارِ تمیزی سے انشائیہ قرار دینا چاہتے ہیں تو میں اس پر اعتراض کا حق نہیں رکھتا۔ میں انھیں مشورہ دیتا ہوں کہ وہ سرگودھا کی ٹکسال کی مُہر لگوانے کے بجائے بلا توقف ان پر اپنی مہر ثبت کر دیں تاکہ بحث کا ایک نیا دروازہ وا ہو۔ انشائیہ کی بحث میں ایک نیا عنصر شامل ہو۔ یہ کتاب ۱۲۸ صفحات پر مشتمل ہے۔ مصنّف نے اسے اپنے خرچ پر چھاپا ہے۔ قیمت: ۳۰ روپے مقرّر کی ہے۔ ملنے کا پتا مکتبہ ہم زبان۔ مالی گاؤں (ناسک) درج ہے۔

رعنا اقبال

گرد و پیش

انجمن ترقی اردو پاکستان میں اردو کے جاپانی اسکالر کی آمد

اردو کے جاپانی اسکالر مسٹر ہیروشی ہاگیتا پاکستان کے دورے پر تشریف لائے تو انجمن ترقی اردو کے کتب خانۂ خاص میں ان کے ساتھ ایک نشست کا اہتمام کیا گیا۔ جاپانی اسکالر نے اپنی گفتگو کے دوران بتایا کہ میرا یہ دورہ خالص علمی و ادبی نوعیت کا ہے اور میں پاکستان کے علاوہ یورپ اور امریکہ بھی جانے کا ارادہ رکھتا ہوں۔ میرے اس سفر کا مقصد اردو کی ترقی و ترویج کے سلسلے میں ہونے والے کام کا جائزہ لینا ہے۔ خصوصاً پاکستان آنے کا مقصد جدید فکشن پر مواد اکٹھا کرنا ہے۔ کیوں کہ میں آج کل جدید فکشن پر کام کر رہا ہوں۔ ٹوکیو یونیورسٹی میں شعبۂ اردو سے منسلک مسٹر ہاگیتا نے بتایا کہ آج سے تقریباً تیس سال قبل اس شعبے کا قیام عمل میں آیا۔ انھوں نے یہ بھی بتایا کہ اردو کے تقریباً تمام بڑے افسانہ نگاروں کی تخلیقات کے تراجم جاپانی زبان میں شائع ہو چکے ہیں۔ اس کے علاوہ ۱۹۹۱ء تک پندرہ ہزار الفاظ پر مبنی اردو جاپانی ڈکشنری بھی منظرِ عام پر آجائے گی جس سے مذکورہ دونوں زبانیں سیکھنے والے خاصا استفادہ حاصل کر سکیں گے۔ واضح رہے کہ مسٹر ہیروشی ہاگیتا ٹوکیو یونیورسٹی میں اردو کے پروفیسر ہیں۔ انھوں نے بی۔ اے میں اپنے تھیسس کا موضوع سعادت حسن منٹو کو چنا تھا۔ اس کے علاوہ بیدی کے بہت سے افسانوں کا ترجمہ وہ جاپانی زبان میں کر چکے ہیں۔ جاپانی اسکالر سے گفتگو کے اختتام پر انجمن کے مشیر علمی و ادبی ڈاکٹر اسلم فرخی نے مہمان کی آمد پر ان کا شکریہ ادا کیا۔

جمیل الدین عالی کے لیے پاک کینیڈین اکیڈمی ایوارڈ

ممتاز شاعر اور دانشور جناب جمیل الدین عالی کو پاک کینیڈین برائے اردو زبان و ادب نے ۱۹۹۰ء کے "مین آف لیٹر" ایوارڈ دیا ہے۔ واضح رہے کہ یہ ایوارڈ زندگی بھر اردو زبان و ادب کی خدمت کرنے پر دیا جاتا ہے۔ "مین آف لیٹر" ایوارڈ ۱۹۸۸ء میں بھارت کے مشہور نقاد گوپی چند نارنگ اور ۱۹۸۹ء میں بھارت کے علی سردار جعفری حاصل کر چکے ہیں۔ جناب جمیل الدین عالی "مین آف لیٹر" ایوارڈ وصول کرنے کے لیے ٹورانٹو گئے ہوئے ہیں۔

امریکہ میں مذاکرہ اور مشاعرہ

مجلس سماجی کارکنانِ پاکستان نیویارک کے زیرِ اہتمام یومِ آزادی کے سلسلے میں مجلسِ مذاکرہ اور محفلِ مشاعرہ کا انعقاد کیا۔ مذاکرے کا عنوان تھا "حصولِ پاکستان کے مقاصد پر عمل درآمد کی ضرورت" اس مجلس کی صدارت ڈاکٹر جمیل احمد صدیقی کر رہے تھے جب کہ مہمانِ خصوصی ممتاز ماہرِ تعلیم اور امریکی محکمۂ تعلیم کے اعلیٰ افسر خورشید اے جان تھے۔ مجلسِ مذاکرہ سے شائستہ جعفری، ڈاکٹر دین محمد، اعظم خاں، مفتی حسن منیر، نصیر وارثی اور مجلس کے صدر و مہمانِ خصوصی نے بھی خطاب کیا۔ مذاکرے کے بعد شعری دور کا آغاز ہوا۔ محفلِ مشاعرہ کی صدارت جناب سلطان احمد نے کی جب کہ رئیس وارثی نظامت کے فرائض نبھا رہے تھے۔ شعرا کے نام درج ذیل ہیں۔ اکرم خیال، نایاب رضوی، امیہ صبا، ڈاکٹر انوار قادری، ڈاکٹر شفیع رشیدہ عیاں، نصیر وارثی، شائستہ جعفری، عبدالحئی، زاہد سعید اور جناب سلطان احمد۔

لندن میں اردو سینٹر کا قیام

یورپ میں اردو کا دائرہ وسیع تر ہوتا جا رہا ہے۔ اور یہ بات ہمارے لیے باعثِ مسرت ہے۔ جنگ گروپ آف نیوز پیپرز کے ایڈیٹر انچیف میر خلیل الرحمٰن نے یہ بات لندن میں اردو سینٹر کا افتتاح کرتے ہوئے کہی گفتگو کے دوران انھوں نے اردو مرکز کا بھی حوالہ دیا اور کہا کہ اس مرکز نے بڑے اہم کام انجام دیے ہیں۔ میر صاحب نے مزید کہا کہ برطانیہ میں جنگ کا اجرا بھی اردو سے محبت کا ہی نتیجہ ہے۔ انھوں نے اردو سینٹر کے سکریٹری مجاہد ترمذی اور ان کے رفقا کو مبارک باد دی اور اپنے مکمل تعاون کا یقین دلایا۔

قطر کے مرکزِ ادب کی نشست

بزمِ اردو قطر کے زیرِ اہتمام ایک نشست کا انعقاد ہوا جس کی صدارت بزم کے صدر جمشید الحسن رضوی نے کی۔ قاضی سرفراز احمد نے "خوف" کے عنوان سے اپنا انشائیہ پیش کیا۔ انشائیہ کے بعد قطر کے مشہور اردو شعرا نے اپنا کلام پیش کیا جن میں خوشنود بخاری، عزیز ہاشمی، سعید، محمد ممتاز راشد، رشید نیاز، حیدر اعظم اور یوسف کمال شامل ہیں۔

ریاض میں ادبی نشست

سعودی عرب کے دارالحکومت ریاض میں برِصغیر کے نامور ادیب و شاعر جناب ظہیر الدین بابر کے ساتھ ایک شام منائی گئی۔ اس نشست کا اہتمام ریاض کی مشہور ادبی و سماجی شخصیت سیّد ابوظفر صاحب کی رہائش گاہ پر کیا گیا۔ بزمِ فانوس ریاض کے شعرائے کرام اور مختلف اخبارات سے تعلق رکھنے والے صحافیوں نے بھی اس یادگار محفل میں شرکت کی۔ اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے مہمانِ خصوصی نے کہا کہ موجودہ دور میں اس بات کی اشد ضرورت ہے کہ پوری ایمان داری

اور نیک نیتی سے اردو کے نفاذ کے لیے کام کیا جائے۔ اس کے لیے باقاعدہ ایک لائحۂ عمل تیار کرنا چاہیے۔ انھوں نے اردو داں طبقے پر ذمہ داری عائد کرتے ہوئے کہا کہ انھیں چاہیے کہ وہ عوام کو اردو کتب سے زیادہ سے زیادہ روشناس کرائیں کیوں کہ اردو زبان تو دراصل وسیع انسانیت کے ایک وسیع سرمائے کا حصہ ہے۔ اس یادگار نشست میں جن شخصیات نے شرکت کی ان کے نام یہ ہیں ـــــ سید ابوظفر، مرزا سلطان بیگ، محمد حنیف شاہد، سید قمر حیدر قمر، ریحان اظہر، سید منیف اشعر، میر کرامت علی خسرو، ڈاکٹر راشد فضلی، ڈاکٹر انور نسیم، ریاض الدین قادری، افضل مرزا، قاضی ظفر منظور احمد، نصیر الدین ناصر، شمشاد علی صدیقی اور اعجاز احمد طاہر۔

ادب کا نوبل انعام

اس سال ادب کا نوبل انعام میکسیکو کے شاعر اور مقالہ نگار اوکتاویو پاز کو ملا ہے۔ اوکتاویو پاز بہ یک وقت شاعر، مقالہ نگار، نقاد، استاد، سفارت کار، طنز نگار اور مترجم ہیں۔ ان کی ایک کتاب "تنہائی کی بھول بھلیاں" اہل ادب میں بہت مقبولیت حاصل کر چکی ہے۔ نوبل انعام یافتہ شاعر کی کئی کتابیں پاکستان میں بھی دستیاب ہیں۔ سن شمارے میں اس کے ایک افسانے کا ترجمہ بھی شامل ہے۔

الخبر میں طرحی محفلِ مشاعرہ

گزشتہ دنوں الخبر میں ایک طرحی محفل مشاعرہ کا اہتمام کیا گیا۔ اس محفلِ مشاعرہ کی ایک خصوصیت یہ تھی کہ اس میں مصرع طرح ایک نہیں بلکہ دو تھے۔ یعنی ایک مصرع فیض احمد فیض کا تھا "جتنے چراغ ہیں تری محفل سے آگئے ہیں" اور دوسرا مصرع تنویر سپرا کا تھا۔ "راہبرو اندھے رستوں میں آس کے دیپ جلاؤ بھی" مشاعرے کی صدارت مشہور شاعر سالم جعفری نے کی جب کہ مہمان خصوصی کے فرائض اردو رسیرز پاکستانی رائٹرز فورم کے جوائنٹ سکریٹری اقبال احمد قمر کے سپرد تھے۔ یہ محفلِ مشاعرہ دو حصوں پر مشتمل تھی۔ پہلے طرحی نشست ہوئی اور بعد میں شعرا نے اپنا منتخب کلام نذرِ سامعین کیا۔ محفل میں شریک شعرا کے اسمائے گرامی درج ذیل ہیں۔ سالم جعفری، محمود رحیم، ذکا صدیقی، سید یونس اعجاز، ثروت زیدی بھوپالی، اقبال احمد قمر، افضل خان، سہیل چشتی، طارق بٹ اور جاوید اختر جاوید۔

میرپور خاص میں تقریبِ شاہ لطیفؒ

شاہ عبداللطیف بھٹائیؒ صرف صوبہ سندھ کے شاعر ہی نہیں بلکہ آپ کی شخصیت اور آپ کا کلام تمام دنیا کے انسانوں کے لیے مشعلِ راہ ہے۔ یہ بات پبلک اسکول میرپور خاص کے پرنسپل اور سینئر استاد جناب بدرالدین داؤ پوتہ نے روٹری کلب سیٹلائٹ ٹاؤن میرپور خاص کی تقریب میں سامعین سے خطاب کرتے ہوئے کہی۔ تقریب کا انعقاد شاہ لطیف ڈے کی مناسبت سے کیا گیا تھا۔ جناب بدرالدین نے مزید کہا کہ شاہ صاحبؒ کے کلام میں سلاست، روانی، پیار، محبت، اخلاق اور اپنی مٹی سے محبت اور انسانی فلاح وبہبود کی تعلیمات کا رنگ نمایاں نظر آتا ہے اور شاہ عبداللطیفؒ کے کلام کو ادب کا شہ پارہ بجا طور پر

کہاجاسکتا ہے۔ تقریب میں پروفیسر محمد یحییٰ، انور احمد دہلوی، یار محمد جنیجو کے علاوہ شاہ عبداللطیف بھٹائی کے عقیدتمندوں نے بھی خطاب کیا۔

ڈاکٹر فرمان فتحپوری کے اعزاز میں تقریب

اردو ڈکشنری بورڈ کے سربراہ اور ممتاز دانشور ادیب و محقق ڈاکٹر فرمان فتحپوری کے اعزاز میں نیویارک میں ایک شام منائی گئی۔ اس یادگار شام کا اہتمام ادارۂ فن وادب، ادارۂ جگر، اردو مرکز نیویارک اور کراچی یونیورسٹی المنائی کے اشتراک سے کیا گیا تھا۔ تقریب کے آغاز میں ڈاکٹر صبیحہ صبا نے ڈاکٹر فرمان فتحپوری کی ادبی، سماجی خدمات اور سرگرمیوں کا اجمالی جائزہ پیش کیا۔ فرمان صاحب نے اپنے نہایت جامع، مختصر اور معلوماتی خطاب میں اردو زبان کی تاریخ بتاتے ہوئے فی زمانہ اردو کے الفاظ کی ہیئت اور تلفظ میں ردّ و بدل کے بارے میں بے شمار حوالے دیے۔ ڈاکٹر صاحب نے اردو ڈکشنری بورڈ کے حوالے سے گفتگو کرتے ہوئے کہا کہ ڈکشنری بورڈ کے زیر اہتمام جو اردو ڈکشنری زیر ترتیب ہے اس کے مکمل ہونے پر آپ سب کو یہ معلوم ہوگا کہ اس شعبہ میں کس قدر محنت اور جد و جہد کی گئی ہے۔ انھوں نے اردو ڈکشنری بورڈ کی کارکردگی پر اطمینان کا اظہار کیا۔ تقریب کا دوسرا دور شعری نشست پر مبنی تھا جس کی صدارت معزز مہمان ڈاکٹر فرمان فتحپوری نے فرمائی۔ اس نشست میں جن شعرا نے اپنا کلام نذرِ سامعین کیا ان کے اسمائے گرامی یہ ہیں۔ ڈاکٹر صبیحہ صبا، حبیبہ شاہد، عزیز الحسن، رشیدہ عیاں، ڈاکٹر مظفر شکوہ، رئیس وارثی، مفتی حسن منیر، اعجاز احمد، فرحت سعید، حمیرا رحمان، زاہد سعید، نصیر وارثی، قمر نظامی، مامون ایم اور صدرِ محفل ڈاکٹر فرمان فتحپوری۔

بزمِ ادب مانچسٹر کی سالانہ محفلِ مشاعرہ

برطانیہ میں اردو ادب کے فروغ کے لیے جو انجمن اور تنظیمیں کام کر رہی ہیں ان میں بزمِ ادب مانچسٹر کا نام بھی شامل ہے۔ خصوصاً اس کا سالانہ مشاعرہ بڑی اہمیت کا حامل سمجھا جاتا ہے۔ گزشتہ دنوں مانچسٹر کے پاکستانی کمیونٹی سنٹر کے ہال میں اس محفلِ مشاعرہ کا انعقاد ہوا جس میں برطانیہ کے مختلف شہروں سے آئے ہوئے شعرائے کرام کے علاوہ پاکستان سے گئے ہوئے شاعر ناصر کاظمی نے بھی شرکت کی۔ محفلِ مشاعرہ کی صدارت برطانیہ کے شاعر جناب اطہر راز نے کی۔ مہمانِ خصوصی کے فرائض برطانیہ ہی کے ممتاز شاعر خالد یوسف نے انجام دیے۔ محفلِ مشاعرہ میں جناب اختر زیدی، محمد اظہر، صابر رضا، ابنِ نظامی، آغا سعید، شکیل قمر، تنویر احمد تنویر، ناصر کاظمی، اسماعیل مصباحی، ڈاکٹر ناصر الدین، خالد یوسف اور صدرِ محفل جناب اطہر راز نے اپنا کلام پیش کیا۔ قبل ازیں اس محفل میں مرحوم شعرا موج فرازی، نور احمد نور اور عبدالحمید شرار کے لیے دعائے مغفرت کی گئی۔

حروفِ تازہ

کتابیں

صلی علیٰ محمدؐ — مصنف: عابد نظامی
نعت
صفحات: ۱۶۰۔ قیمت: ۳۹ روپے
پتا: مکتبہ تعمیر انسانیت اردو بازار، لاہور۔

سیف الملوک — میاں محمد بخش / شفیع عقیل
مثنوی
صفحات: ۵۰۶۔ قیمت: ۱۵۰ روپے
پتا: انجمن ترقی اردو پاکستان، بابائے اردو روڈ کراچی ۱

نکلے تری تلاش میں — مصنف: مستنصر حسین تارڑ
سفرنامہ
صفحات: ۴۸۸۔ قیمت: ۱۲۵ روپے
پتا: سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور

منٹو راما — مصنف: سعادت حسن منٹو
افسانے
صفحات: ۹۵۴۔ قیمت: ۴۰۰ روپے
پتا: سنگِ میل پبلی کیشنز چوک اردو بازار، لاہور

مصروف عورت — مصنف: خالدہ حسین
افسانے
صفحات: ۱۷۴۔ قیمت: ۵۰ روپے
پتا: سنگِ میل پبلی کیشنز چوک اردو بازار لاہور

میراجی ایک مطالعہ — مصنف: ڈاکٹر جمیل جالبی
شخص و فن
صفحات: ۷۵۶۔ قیمت: ۲۵۰ روپے
پتا: سنگ میل پبلی کیشنز چوک اردو بازار، لاہور

مولانا صلاح الدین احمد — مرتبین: ڈاکٹر وزیر آغا، ڈاکٹر انور سدید
شخصیت و فن
صفحات: ۴۰۶۔ قیمت: ۱۰۰ روپے
پتا: انجمن ترقی اردو پاکستان بابائے اردو روڈ کراچی ۱

تجزیے اور تجربے — مصنف: جلیل قدوائی
تنقیدی مضامین
صفحات: ۲۱۶۔ قیمت: ۵۰ روپے
پتا: سی/۵ کوزی ہومز گلشن اقبال کراچی ۷۵۳۰۰

کرن کرن اندھیرا — مصنف: صباحت عاصم
شاعری
صفحات: ۲۰۸۔ قیمت: ۸۰ روپے
پتا: نیرنگ خیال پبلی کیشنز، ۸ بی۔ ایم۔ اے ہاؤس، راولپنڈی

برزخیہ — مصنف: شوکت واسطی
شاعری
صفحات: ۳۱۲۔ قیمت: ۸۰ روپے
پتا: نیرنگ خیال پبلی کیشنز ۸ بی۔ ایم۔ اے ہاؤس، راولپنڈی

اثاثہ — مصنف: اقبال ساجد
شاعری۔
صفحات: ۲۳۸۔ قیمت: ۱۵۰
پتا: جنگ پبلیشرز، ۱۳۔ سر آغا خان روڈ، لاہور

سلگتا ہوا سندھ — مرتب: احمد سلیم
مضامین
صفحات: ۲۴۳۔ قیمت: ۱۲۰ روپے
پتا: جنگ پبلشرز، ۱۳۔ سر آغا خان روڈ، لاہور

دیارِ صبحِ بہار — مصنف: حمید ہاشمی
سفرنامہ
صفحات: ۲۰۶۔ قیمت: ۷۵ روپے
پتا: جنگ پبلشرز، سر آغا خان روڈ، لاہور

گرمِ دمِ جستجو — مرتبہ: سجاد نقوی
شخصیت
صفحات: ۲۲۰۔ قیمت: ۵۰ روپے
پتا: مکتبہ اردو زبان ریلوے روڈ، سرگودھا

چاندنی بیگم — مصنف: قرۃ العین حیدر
ناول
صفحات: ۴۲۴۔ قیمت: ۱۲۰
پتا: سنگ میل پبلی کیشنز، چوک اردو بازار، لاہور

پاکستان ٹیلی ویژن کے ۲۵ سال ——— مصنف: منیر احمد
شخص و عکس
صفحات: ۲۷۲۔ قیمت: ۱۲۵ روپے
پتا: میڈیا ہوم پی او بکس ۲۱۹۸ اسلام آباد

ہاری رپورٹ کل اور آج ——— مصنف: ایم مسعود کھدر پوش
سیاسیات
صفحات: ۹۴۔ قیمت: ۸۵ روپے
پتا: جنگ پبلشرز، سر آغا خان روڈ، لاہور

سازشوں کا دور ——— مصنف: اظہر سہیل
سیاسیات
صفحات: ۱۷۰۔ قیمت: ۱۳۵ روپے
پتا: فیروز سنز پرائیوٹ لمیٹڈ لاہور، راولپنڈی، کراچی

جریدے

اقبال (عبداللہ قریشی نمبر) ——— مدیر اعزازی: ڈاکٹر وحید قریشی۔ نائب مدیر: راجہ فخر محمد ماجد
صفحات: ۱۴۴۔ قیمت: ۲۵ روپے
پتا: بزم اقبال، کلب روڈ، لاہور

علامت ——— مدیر: سعید شیخ
صفحات: ۶۴۔ قیمت: ۱۵ روپے
پتا: ۵۲۰۔ جہاں زیب بلاک۔ اقبال ٹاؤن، لاہور

ادب لطیف ——— مدیر: صدیقہ بیگم
صفحات: ۱۱۲۔ قیمت: ۱۵ روپے
پتا: ۳۳ سی۔ ۳ گلبرگ ۳ ـــ لاہور

معارف ——— مدیر: ضیا الدین اصلاحی
صفحات: ۲۴۰۔ قیمت: ۴۰ روپے سالانہ
پتا: دفتر دار المصنفین اعظم گڑھ، (بھارت)

جریدہ الاشرف ——— مدیر اعلیٰ محمد اسعد تھانوی
صفحات: ۶۴۔ قیمت: ۶ روپے
پتا: ۲۔ الاحمد مینشن ۱۳۔ بی گلشن اقبال، کراچی ۴۷

ڈاکٹر وفا راشدی

نئے خزانے

یہ اشاریہ حسب ذیل عنوانات کے تحت مرتّب کیا گیا ہے۔

- مطالعۂ پاکستان، ادب کے حوالے سے
- فارسی ادب، تاریخ و تحقیق
- ترکی ادب، تاریخ و تحقیق
- زبان، مسائل و مباحث
- ادب، مسائل و مباحث
- ڈراما نگاری اور اس کا فن
- لسانیات
- تحقیق و تنقید
- تنقید، فنِ تنقید
- تاریخ، فنِ تاریخ
- تاریخ، فن و ادب
- تہذیب و ثقافت
- علومِ اسلامیہ
- خود نوشت
- سفرنامہ
- خطوط
- شخصیات
- اقبالیات
- غالبیات
- بابائے اردو مولوی عبدالحق
- مولانا ابوالکلام آزاد
- علّامہ نیاز فتح پوری
- حسرت موہانی
- ڈاکٹر ذاکر حسین
- سیّد الطاف علی بریلوی
- جوش ملیح آبادی
- ابراہیم جلیس
- محشر بدایونی
- مجتبیٰ حسین
- انجم اعظمی
- سرشار صدّیقی
- شاکر تاجی
- دیگر علمی، ادبی، تعلیمی شخصیات
- علمی، ادبی سوانح و تذکرے
- تعلیم و تدریس، مسائل و مباحث
- علمی، ادبی، تعلیمی، ثقافتی ادارے اور تحریکیں
- سیاست، صحافت، امورِ مملکت
- مخطوطات و نوادرات
- بچوں کا ادب
- مطالعۂ کتب

اس اشاریے کی ترتیب میں جولائی ۸۹ء، اکتوبر ۸۹ء اور جنوری تا جون ۱۹۹۰ء کے رسائل و جرائد سے استفادہ کیا گیا ہے۔
صراحت حسب ذیل ہے۔

مجلّہ　جرنل خدا بخش لائبریری، پٹنہ ۵۳/۱۹۹۰ء
〃　نقوش لاہور سالنامہ شمارہ ۱۳۸

سہ ماہی۔　اردو کراچی۔ جنوری، مارچ ۱۹۹۰ء
〃　اقبال لاہور۔ اکتوبر ۱۹۸۹ء جنوری، اپریل ۱۹۹۰ء
اقبالیات لاہور جولائی ۱۹۸۹ء، جنوری ۱۹۹۰ء
〃　العلم کراچی۔ الطاف بریلوی نمبر جنوری، جون ۱۹۹۰ء
〃　دانش اسلام آباد۔ شمارہ ۲۰، ۲۱/۱۹۹۰ء
〃　روح ادب کلکتہ جنوری، مارچ ۱۹۹۰ء
〃　صحیفہ لاہور جنوری، مارچ ۱۹۹۰ء۔ اپریل، جون ۱۹۹۰ء
〃　فکر و نظر اسلام آباد۔ جنوری، مارچ ۱۹۹۰ء

ماہنامہ　آگہی کراچی جنوری ۱۹۹۰ء فروری ۱۹۹۰ء۔ سالنامہ مارچ ۱۹۹۰ء اپریل ۱۹۹۰ء مئی ۱۹۹۰ء جون ۹۰
〃　ادبِ لطیف لاہور جنوری ۱۹۹۰ء فروری ۱۹۹۰ء اپریل ۱۹۹۰ء جون ۱۹۹۰ء
〃　افکار کراچی جنوری ۱۹۹۰ء مارچ ۱۹۹۰ء اپریل ۱۹۹۰ء مئی ۱۹۹۰ء
〃　دائرے کراچی ترکی ادب نمبر جنوری ۱۹۹۰ء فروری ۱۹۹۰ء مارچ ۱۹۹۰ء اپریل ۱۹۹۰ء مئی ۱۹۹۰ء جون ۱۹۹۰ء
〃　سب رس کراچی جنوری ۱۹۹۰ء
〃　صریر کراچی جنوری ۱۹۹۰ء فروری ۱۹۹۰ء مارچ ۱۹۹۰ء۔ سالنامہ جون ۱۹۹۰ء
〃　طلوعِ افکار کراچی جنوری ۱۹۹۰ء فروری ۱۹۹۰ء مارچ ۱۹۹۰ء مئی ۱۹۹۰ء جون ۱۹۹۰
〃　فاران کراچی فروری ۱۹۹۰ء مارچ ۱۹۹۰ء
〃　قومی زبان کراچی جنوری ۱۹۹۰ء فروری ۱۹۹۰ء مارچ ۱۹۹۰ء اپریل ۱۹۹۰ء مئی ۱۹۹۰ء جون ۱۹۹۰ء
〃　معارف اعظم گڑھ جنوری ۱۹۹۰ء فروری ۱۹۹۰ء اپریل ۱۹۹۰ء مئی ۱۹۹۰ء
〃　نگارِ پاکستان کراچی جنوری ۱۹۹۰ء فروری ۱۹۹۰ء مارچ ۱۹۹۰ء اپریل ۱۹۹۰ء مئی ۱۹۹۰ء جون ۱۹۹۰ء
〃　نیرنگِ خیال راولپنڈی مارچ ۱۹۹۰ء خاص نمبر جون ۱۹۹۰ء
〃　ماہِ نو لاہور قراردادِ پاکستان گولڈن جوبلی نمبر۔ پاکستانی ادب کا پچاس سالہ جائزہ۔ مارچ ۱۹۹۰ء اپریل ۱۹۹۰ء مئی ۱۹۹۰ء جون ۱۹۹۰ء

ہفت روزہ　ہماری زبان دہلی یکم، ۸، ۱۵، جنوری ۸، ۱۵، ۲۲، فروری۔ ۲۲، مئی ۱۹۹۰ء

مطالعۂ پاکستان ۔ ادب کے حوالے سے

آفتاب زبیری، پروفیسر کچھ یادیں کچھ باتیں
(سرسید، علی گڑھ اور قائداعظم کے پس منظر میں) آگہی، کراچی جنوری ۱۹۹۰ء ص ۲۶

اجمل نیازی، ڈاکٹر پاکستانی اردو غزل، ایک اجمالی جائزہ ماہ نو لاہور خصوصی شمارہ مارچ ۱۹۹۰ء ص ۷

احسان اکبر پاکستانی ناول ہیئت، رجحان اور امکان " " " " " ص ۸۶

احمد ندیم قاسمی، انجم رومانی

رضا عابدی، شہزاد احمد تحریک پاکستان اور ادب ماہ نو لاہور خصوصی شمارہ مارچ ۱۹۹۰ء ص ۳

انور سدید، ڈاکٹر اردو ادب میں پاکستانیت دائرے کراچی جون " ص ۱۲

جمیل جالبی، ڈاکٹر ادب اور جمہوریت ماہ نو لاہور خصوصی شمارہ مارچ " ص ۱۴

جیلانی کامران تحریک پاکستان کا طرز احساس " " " " " " ص ۱۶

رشید امجد پاکستانی افسانے کا فکری، سماجی اور سیاسی پس منظر " " " " " " ص ۵۳

سجاد حیدر ملک قرارداد لاہور ہمارے وجود کی شہادت " " " " " " ص ۲۱

سعادت سعید، ڈاکٹر آزادی کے چراغ " " " " " " ص ۲۹

سعادت سعید، ڈاکٹر اردو نظم کے پچاس سال " " " " " " ص ۶۵

فارسی ادب، تاریخ و تحقیق

آصف نعیم، ڈاکٹر استعارہ در غزلے از حافظ دانش اسلام آباد ۲۰، ۲۱/ ۱۹۹۰ء ص ۸۹

احمد تمیم داری، ڈاکٹر بیدل دہلوی (عظیم آبادی) " " " " " " ص ۴۵

پروین نازکانی ہمدانی قرا یادین فیض آبادی " " " " " " ص ۱۳۵

سید مسعود حسن رضوی ادیب ۔ ثابت الہ آبادی اور اس کی واقعہ گوئی " " " " " " ص ۲۸۵

سید وحید اشرف، ڈاکٹر حافظ شیرازی کی شاعری میں تصوف معارف اعظم گڑھ مئی " ص ۳۴۴

عصمت نسرین، خانم ڈاکٹر کتاب خلاصۃ الحیات دانش اسلام آباد ۲۰، ۲۱/ " ص ۱۶۵

علوی مقدم، ڈاکٹر حاج ملا ہادی اسرار سبزواری
(یکے از فلاسفہ بزرگ قرن سیزدہم ہجری) دانش اسلام آباد ۲۰، ۲۱/ ۱۹۹۰ء ص ۵

کلثوم ابوالبشر، خانم ڈاکٹر حافظ شناسی در بنگالہ " " " " " " ص ۳۷

کلیم سہسرامی، پروفیسر مثنوی "طور معرفت" ایک جائزہ " " " " " " ص ۲۹۵

محمد تقی علی عابدی، ڈاکٹر	فارسی کے غیر مسلم شعرا کی اسلامی شاعری	دانش	اسلام آباد	۲۰، ۲۱/۱۹۹۰ء	ص ۳۰۹
محمد ریاض، ڈاکٹر	استاد اقبال شناس، سید غلام رضا سعیدی	"	"	" " " "	ص ۹۹
محمودہ ہاشمی حاتم، ڈاکٹر	اختلافِ نظر ادبی، میان شعرا و نویسندگان ہندی و ایرانی در عہد پادشاہان تیموری مغول	دانش	اسلام آباد	۲۰، ۲۱/۱۹۹۰ء	ص ۱۲۵
مہدی درخشان، ڈاکٹر	قالبہائے حافظ	"	"	" " " "	ص ۱۵۱
نصراللہ پورجوادی					
ترجمہ: محمد اقبال احمد خاں	رندیِ حافظ	اقبالیات	لاہور	جنوری ۱۹۹۰ء	ص ۱۰۳

ترکی ادب، تاریخ و تحقیق

ایرکان ترکمان، ڈاکٹر	یونس امرہ، ترکی کے سب سے پہلے صوفی شاعر	دائرے	کراچی	جنوری ۱۹۹۰ء	ص ۳۵
چینگیز التان۔ ترجمہ: کوثر بشیر احمد	بالشتیے (ترکی افسانہ)	"	"	" "	ص ۱۰۱
عزیز نیسن۔ ترجمہ: کوثر بشیر احمد	جو ملے سب لے لو (طنز و مزاح)	"	"	" "	ص ۱۰۳
عمر سیف الدین۔ ترجمہ: عابدہ خاں	بہار اور تتلیاں (ترکی افسانہ)	"	"	" "	ص ۹۴
کوثر بشیر احمد	ترکی شاعری۔ ایک جائزہ	"	"	" "	ص ۱۴
کوثر بشیر احمد	ترکی زبان کے اہم اور معروف شعرا	"	"	" "	ص ۴۶
یشار کمال۔ ترجمہ: کوثر بشیر احمد	انجے میمید[1]	"	"	" "	ص ۷۷

زبان — مسائل و مباحث

احمد الیاس	بنگلہ دیش میں اردو	آگہی	کراچی	مارچ ۱۹۹۰ء	ص ۱۰۴
صابر سنبھلی، ڈاکٹر	معانی کا سفر	ہماری زبان	دہلی	۸ر جنوری "	ص ۳
عبدالمغنی، پروفیسر	اردو زبان کی حیثیت ہندوستان کے سیاسی نقشے میں	ہماری زبان	دہلی	۸ر جنوری ۱۹۹۰ء	ص ۱
کلثوم ابوالبشر، ڈاکٹر	بنگلہ دیش کے چند اہم اردو جرائد	قومی زبان	کراچی	فروری "	ص ۲۷
میر حسین علی امام	الف سے اردو	سربمہ	"	" "	ص ۳۹

---

[1] ترکی ناول "انجے میمید" کا پہلا اردو ترجمہ ہے۔ یشار کمال کے اس ناول کا ترجمہ دنیا کی بیس سے زائد زبانوں میں ہو چکا ہے۔

ادب ــــ مسائل و مباحث

مصنف	عنوان	رسالہ	مقام	ماہ	سال	صفحہ
آفتاب زبیری، پروفیسر	شعور کی رو نیم سائنسی، نیم ادبی افق پر	آگہی	کراچی	مارچ	۱۹۹۰ء	ص ۳۷
ابن الحسن سید	کچھ اردو شاعری کے بارے میں	نیرنگِ خیال	راولپنڈی، خاص نمبر		״	ص ۳۴
ادیب سہیل	اردو فکشن کی ابتدا	صریر	کراچی	سالنامہ جون	״	ص ۴۲
احمد ندیم قاسمی	اردو افسانہ	قومی زبان	״	جنوری	״	ص ۲۹
اکبر حمیدی	ادب حزبِ اختلاف کیوں	ادبِ لطیف	لاہور	״	״	ص ۱۵
انجم اعظمی	اردو افسانے کا آغاز اور اس کی اساس	صریر	کراچی	فروری		ص ۲۲
انجم اعظمی	ادب کا بنیادی کمٹ منٹ، حقیقتِ ناتمام	افکار	״	مئی	״	ص ۱۰
جوگندر پال	کہانی کا آگا پیچھا	صریر	״	سالنامہ جون	״	ص ۵۰
خاور قریشی	شاعری میں لہجہ کا عمل	دائرے	״	فروری، مارچ	״	ص ۱۳
خلیل احمد	ادب اور انسان	״	״	״	״	ص ۱۸
راج بہادر گوڑ، ڈاکٹر	دورِ نشاۃ ثانیہ کی ناول نگاری اور تاریخی ناولوں کا دہرا رول	ہماری زبان	دہلی	۸ جنوری	۱۹۹۰ء	ص ۱
شفیق احمد شفیق	ادب، ادیب اور آفاقیت	آگہی	کراچی		״	ص ۵۷
شوق حنیف، ڈاکٹر، ترجمہ: محمد اسحاق شاکر	ادب کیا ہے؟	״	״		״	ص ۵۲
صدیق جاوید، ڈاکٹر	اردو ادب اور ادبی عمرانیات	ماہِ نو	لاہور	جون	״	ص ۵۵
غلام محمد	کہانیاں پرانی، باتیں نئی	قومی زبان	کراچی	مئی	״	ص ۳۷
فہیم اعظمی	اسٹیٹ اور ادب، کنٹرول یا خدمت	صریر	״	جنوری	״	ص ۵
فہیم اعظمی	ادب کی جامعیت اور اردو ادب	״	״	فروری	״	ص ۵
فہیم اعظمی	سیاست زدہ معاشرہ، ادب اور ادیب	״	״	مارچ	״	ص ۵
قرۃ العین طاہرہ	جدید غزل، رد و قبولیت کے دوراہے پر	ماہِ نو	لاہور	مئی	״	ص ۱۰۸
قیصر تمکین	تیسری دنیا کے دانشوروں کے لیے لمحۂ فکریہ	افکار	کراچی	جنوری	״	ص ۱۰
گیان چند، ڈاکٹر	سرور بنام میرامن	نقوش	لاہور	۱۳۸		ص ۱
محمد سلیم ملک، ڈاکٹر	اقدار کا مزاج	قومی زبان	کراچی	جون	״	ص ۲۵
محمد عالم خاں	ادب میں عصری شعور کا مسئلہ	ادبِ لطیف	لاہور	اپریل	״	ص ۲۳
محمد محفوظ علی، پروفیسر	ادب، نظریہ اور مملکت	آگہی	کراچی	مئی	״	ص ۲۲
مظہر امام	آتا د غزل	صریر	״	مارچ	״	ص ۱۷

حافظ عاشق ہرگانوی، ڈاکٹر	ہم عصر ادبی مسائل	قومی زبان کراچی جون	۱۹۹۰ء	ص ۲۹
منیر احمد شیخ	ادب اور ثقافت	نیرنگِ خیال راولپنڈی خاص نمبر	"	ص ۳۰
منیر الدین احمد، ڈاکٹر	افورسم، ادب کی ایک			
منیر الدین احمد، ڈاکٹر	بانکی صنف	افکار کراچی مئی	۱۹۹۰ء	ص ۲۴
منیر الدین احمد، ڈاکٹر	مصری افورسم	صریر " سالنامہ جون	"	ص ۶۷
میاں جمیل صدیقی	ادب کیا، معاشرتی مسائل کا حل ہے؟	نیرنگِ خیال راولپنڈی اپریل	۱۹۹۰ء	ص ۳۱
میڈلین جیسل / شاہنواز فاروقی۔	تحریر کے مقاصد (ژاں پال سارتر کے ساتھ ایک انٹرویو)	قومی زبان کراچی مارچ	۱۹۹۰ء	ص ۱۴

ماہنامہ
قومی زبان
کراچی

دسمبر ۱۹۹۰
جلد: ۶۲
شمارہ: ۱۲

مضمون نما

ادارۂ تحریر
جمیل الدین عالی
ادا جعفری
ڈاکٹر اسلم فرخی

مدیر
ادیب سہیل

بدل اشتراک
فی پرچہ ...... ۸ روپے
سالانہ عام ڈاک سے ۹۰ روپے
سالانہ رجسٹری سے ۱۶۲ روپے

بیرونِ ملک
فی پرچہ ...... ایک ڈالر
سالانہ عام ۱۰ پونڈ ۱۵ ڈالر
سالانہ ہوائی ڈاک سے ۱۵ پونڈ ۲۵ ڈالر

انجمن ترقی اردو پاکستان
اردو روڈ، کراچی، فون: ۲۲-۲۲۳

بینکاری میں "اپنی خدمت آپ" کی سہولت زیادہ سے زیادہ کھاتے داروں کو فراہم کرنے کے لئے

حبیب بینک نے آٹو کیش مشینیں کراچی کی دو اور شاخوں میں نصب کردی ہیں۔

حبیب بینک نے آپ کو ۲۴ گھنٹے، سال کے ۳۶۵ دن، نقد رقوم نکالنے کی سہولت مہیا کرنے کی غرض سے اپنی درج ذیل شاخوں میں آٹو کیش مشینیں نصب کردی ہیں۔

- کارپوریٹ برانچ، فائننس اینڈ ٹریڈ سینٹر
- سرسید روڈ برانچ متصل طارق روڈ

یہ سہولت سینٹرل برانچ، حبیب بینک پلازہ، کراچی اور لاہور و راولپنڈی میں بھی پہلے سے دستیاب ہے

حبیب بینک لمیٹڈ

PID (Islamabad) manhattan/BBDO

قیامِ پاکستان کے بعد قائدِاعظم پاکستان کے گورنر جنرل مقرر ہوئے۔ انھیں نئی مملکت کے مسائل و معاملات سے نمٹنے کا اگرچہ بہت کم وقت ملا۔ اس کے باوجود ان کی دور رس نگاہ میں جس معاملے کو ترجیح و تقدیم حاصل رہی اس پر فوراً اپنے ردِعمل کا اظہار کیا۔ قومی زبان اردو کا نفاذ بھی ایسا ہی ایک معاملہ تھا۔ تحریکِ پاکستان میں اس زبان کی خدمات قائدِ اعظم کی نگاہ سے ڈھکی چھپی نہیں تھی اور پھر قائدِ اعظم یہ بھی جانتے تھے کہ پاکستانی قوم کو آپس میں جوڑے رکھنے کا کردار بہ احسن اگر کوئی زبان ادا کر سکتی ہے تو وہ صرف اردو ہے، کیونکہ برِصغیر پاکستان و ہندستان میں قیامِ پاکستان سے پہلے بھی اس کی حیثیت "لنگوا فرینکا" کی تھی۔ لہٰذا قائدِ اعظم نے اس اعلان میں ذرا بھی تاخیر نہ کی اور اس معاملے کو دیگر قومی معاملات پر مقدم جانتے ہوئے یہ اعلان کیا کہ اردو پاکستان کی قومی زبان ہوگی۔ قائدِ اعظم کے اس اعلان کو ۱۹۷۳ء میں آئینی شکل دے دی گئی اور اس کے دفتری نفاذ کے سلسلے میں سرکاری و نیم سرکاری اداروں میں کچھ پیش رفت بھی ہوئی ہے لیکن اس کے مکمل نفاذ کا کام ابھی ہونا باقی ہے۔

۱۹۷۳ء سے حکومت کی ہر نئی تبدیلی پر ہم ارباب حل و عقد کو قومی زبان کے مکمل نفاذ کے سلسلے میں آئین میں کیے گئے وعدوں کی یاد دہانی کراتے آرہے ہیں۔ لہٰذا ہمارا فرض ہے کہ قومی زبان کے مکمل نفاذ کے سلسلے میں موجودہ حکومت کو بھی اس کی آئینی ذمہ داری یاد دلائیں۔ اور اس ضمن میں اس کی طرف سے مثبت اقدام کی توقع رکھیں۔

انجمن ترقی اردو (پاکستان) کی طرف سے چینی ادیبوں کے اعزاز میں منعقدہ استقبالیہ کے شرکا

سوانحی خاکے

[گزشتہ دنوں چینی ادیبوں کا ایک وفد پاکستان کے سرکاری دورے پر آیا ہوا تھا۔ مختلف شہروں کے دوروں کے بعد یہ وفد کراچی بھی آیا۔ انجمن ترقی اردو (پاکستان) نے اس کے اعزاز میں ایک استقبالیہ ترتیب دیا۔ اس موقعے پر چائنیز رائٹرز ایسوسی ایشن بیجنگ کی طرف سے فراہم کردہ چینی ادیبوں کے سوانحی خاکوں پر مشتمل ایک مضمون پڑھا گیا جسے قارئین کی دلچسپی کے لیے پیش کیا جا رہا ہے]

(ادارہ)

ژنگ کی: —— خاتون اہلِ قلم ۱۹۱۷ء میں حنان صوبے میں پیدا ہوئیں۔ ۱۹۳۵ء میں جاپان دشمن قومی تحریک میں حصہ لیا۔ اس وقت وہ مڈل اسکول کی طالبہ تھیں۔ انھوں نے ۱۹۳۷ء میں فوج میں شمولیت اختیار کی اور ۱۹۳۸ء میں مضامین لکھنے شروع کیے۔ جب ان کی پہلی تصنیف "تانگ اِن کے محاذِ جنگ پر" شائع ہوئی تو مسٹر ماؤ دن نے تڑواں کے قلمی نام سے اس پر تعارفی مضمون تحریر کیا۔ اس کے بعد ژنگ کی نے مختلف قسم کے متعدد مضامین لکھے جن میں انھوں نے بیس لاکھ چینی کرداروں کو پیش کیا۔ مثلاً "نئے لوگ" (ناولٹوں اور افسانوں کا مجموعہ) "چودھواں بیٹا" (ناولٹوں اور افسانوں کا مجموعہ) "تانگ ان کے محاذ پر" (رپورتاژوں کا مجموعہ) "جنگ میں" (رپورتاژوں کا مجموعہ) "ٹائی پہاڑوں پر پیش قدمی" (رپورتاژوں کا مجموعہ) "چونکہ ہم خوش ہیں" (نثر) "تاریخ میں سنگِ میل" (منظر نامہ) وغیرہ۔ ۱۹۴۹ء میں عوامی جمہوریہ چین کے قیام کے بعد انھوں نے چائنیز رائٹرز ایسوسی ایشن کی کونسل ممبر، چائنا فیڈریشن آف لیٹریری اینڈ آرٹ سرکلز کی کونسل ممبر، چائنیز رائٹرز ایسوسی ایشن کی سیچوان شاخ کی وائس چیئرمین اور چائنیز رائٹرز ایسوسی ایشن کی ین نان شاخ کی وائس چیئرمین کے فرائض بھی انجام دیے۔ اس وقت وہ ین نان لٹریری اینڈ آرٹسٹک انسٹی ٹیوٹ کی نائب صدر، چائنیز لٹریچر فاؤنڈیشن کی کونسل ممبر اور ساتھ ہی ایک پیشہ ور ادیبہ ہیں۔

لان ہوائے شانگ: —— مرد ادیب، قومیت: یاؤ۔ فروری ۱۹۴۵ء میں گوانگ ژی میں پیدا ہوئے۔ انھوں نے ۱۹۷۰ء میں لکھنا شروع کیا اور اپنے ناول "ایک روح جو ایک تنہا جزیرے پر رحلت کر گئی" "ایک مردہ آدمی کی شادی"

اور "یولونوندی" شائع کیے۔ آخرالذکر ناول کو ۱۹۸۸ء کا بلراونتر ڈرم ایوارڈ ملا جو گوانگ ژی کی عوامی حکومت کی طرف سے دیا جاتے والا بہترین ایوارڈ ہے۔ ان ناولوں کے علاوہ انھوں نے ناولٹ، افسانے، نثری مضامین، فلمی اسکرپٹ اور نظمیں بھی تخلیق کیں جن کی تعداد ایک سو سے زیادہ ہے۔ ان میں سے کچھ ان کی کتاب "بہاری عشق کی داستان" (افسانوں اور ناولٹوں کا مجموعہ) اور "می لیوڈ توؤ" (یاؤ قومیت کے قیام کا رزمیہ) میں شامل ہیں۔ آخرالذکر کتاب کو ۱۹۸۹ء میں قومی لوک ادب کا بہترین ایوارڈ ملا۔ انھوں نے طویل بیانیہ لوک نظموں کے پانچ مجموعے ترتیب دے کر شائع کیے۔ مثلاً "اسی رومال کا نغمہ"۔ لان ہوئے شانگ اس وقت گوانگ ژی فیڈریشن آف لٹریری اینڈ آرٹس سرکلز کے وائس چیئرمین ہیں۔

لیو جن من : ——— خاتون ادیبہ۔ اکتوبر ۱۹۳۶ء میں صوبہ سیچوان کے شہر شنیندو میں پیدا ہوئیں۔ انھوں نے اپنے ادبی سفر کا آغاز ۱۹۵۰ء کی دہائی میں کیا۔ ان کی پہلی تصنیف ۱۹۶۲ء میں شائع ہوئی جس کا نام "پیداواری ٹیم میں دشواری" تھا۔ ۱۹۷۹ء سے وہ چائینیز رائٹرز ایسوسی ایشن کی سیچوان شاخ میں کام کر رہی ہیں۔ ۱۹۸۳ء — ۱۹۸۲ء میں وہ چینی ادب کے مطالعے کے لیے لوژن کے لٹریری انسٹی ٹیوٹ گئیں۔ وہ ناولٹوں، افسانوں، نثری مضامین، رپورتاژوں اور ادبی تبصروں کی مصنفہ ہیں۔ جن میں پانچ لاکھ چینی کردار پیش کیے گئے ہیں۔ ان کے افسانوں کا ایک مجموعہ "تاریکی کے خاتمے پر ملاقات" کے نام سے شائع ہوا۔ ان کی کچھ تخلیقات چین کی ہم عصر خاتون ادیباؤں اور چین کے نئے دور کی ایک سو خاتون مصنفوں کی منتخب تخلیقات کے مجموعے میں شامل ہیں۔ ۱۹۸۰ء کی دہائی میں جاپان سے شائع ہونے والی کتاب "چینی خاتون اہلِ قلم کی ادبی تخلیقات" نام کے مجموعے میں بھی ان کی تخلیقات شامل ہیں۔ اس وقت وہ چائینیز رائٹرز ایسوسی ایشن کی رکن ہونے کے علاوہ ایسوسی ایشن کی سیچوان شاخ کی سکریٹری اور ایک پیشہ ور ادیبہ ہیں۔

لی گوڈ تاؤ : ——— مرد مصنف۔ ادبی نقاد، نومبر ۱۹۳۰ء میں جیانگ سو صوبے میں پیدا ہوئے۔ پہلے وہ ایک مڈل اسکول میں استاد تھے۔ اس کے بعد ماہنامہ "شانگ شی لٹریچر" کے ایڈیٹر اور چیف ایڈیٹر مقرر ہوئے۔ اس وقت وہ چائینیز رائٹرز ایسوسی ایشن کی شانگ شی شاخ کے وائس چیئرمین اور ایک پیشہ ور ادیب ہیں۔ انھوں نے لکھنے کا آغاز ۱۹۵۵ء میں کیا۔ ان کی اہم تصنیفات میں لوژن کے مضمون "جنگلی گھاس" کے فن کارانہ اسلوب پر گفتگو اسلوبیاتِ لوژن کے تخلیقی کام میں ایک نئی تفہیم اور ادبی و ثقافتی حلقوں پر تبصروں کے مجموعے شامل ہیں۔ حالیہ برسوں میں وہ ناول کی ادبی ہیئتوں پر تحقیق میں مصروف رہے ہیں اور جو مضامین شائع کیے ان میں تین لاکھ چینی کردار پیش کیے گئے ہیں۔

جی پینگ : ——— مرد شاعر۔ مئی ۱۹۲۷ء میں جی لین صوبے میں پیدا ہوئے۔ انھوں نے ۱۹۴۸ء میں لکھنا شروع کیا۔ ۱۹۵۹ء میں ان کی نظموں کا پہلا مجموعہ شائع ہوا۔ اس وقت سے اب تک ان کی نظموں اور نثری نظموں کے دس سے زائد مجموعے شائع ہو چکے ہیں۔ مثال کے طور پر "آہنی گھوڑوں پر سوار فوجی"۔ "نیلے خطے کا پانی"۔ "سقفِ جہاں پر تخلیق کی گئی نظمیں"۔ "یاسمین کی نظمیں"۔ "نغمۂ محبت"۔ "جنوب کا منظر جو شمال میں نمودار ہوا" اور "ہلکے رنگوں کے پھولوں کے گلدستے" وغیرہ وغیرہ۔ ان کی نظموں کے مجموعے کو قومی ایوارڈ دیا گیا۔ ان کی کچھ نظمیں پچاس سے زائد نظموں کے انتخابات میں شامل کی گئی ہیں۔ وہ ثقافتی، ادارتی اور تدریسی کاموں میں ایک عرصے تک مصروف رہے۔ ایک زمانے میں وہ لبریشن آرمی کے لٹریری اینڈ آرٹسٹک پبلشنگ ہاؤس سے

بحیثیت ریسرچ فیلو وابستہ تھے۔ ان دنوں وہ چائینیز رائٹرز ایسوسی ایشن کے رکن ہونے کے علاوہ چینی نثری نظم سوسائٹی کے وائس چیئرمین بھی ہیں۔

ژانگ ژاؤمینگ : ـــــ مرد ادیب۔ جنوری ۱۹۴۵ء میں جیانگ سو صوبے میں پیدا ہوئے۔ ۱۹۶۰ء کے عشرے میں بیجنگ یونیورسٹی سے گریجویشن کیا۔ ۱۹۷۹ء سے لکھنے کا آغاز کیا۔ اس وقت سے اب تک ان کے بیس سے زیادہ ناولٹ اور افسانے شائع ہو چکے ہیں۔ ۱۹۸۵ء میں ان کا پہلا ناول "ثقافتی انقلاب سے قبل گزشتہ برسوں کے گریجویٹوں کا مقدر" کے نام سے شائع ہوا۔ ۱۹۸۴ء سے وہ چائینیز رائٹرز ایسوسی ایشن کی تے جیانگ شاخ میں کام کر رہے ہیں۔ وہ اس شاخ کے سیکریٹریٹ کے سکریٹری اور چائینیز رائٹرز ایسوسی ایشن کے رکن ہیں۔

چن ژیر وو : ـــــ مرد مترجم۔ ۱۹۴۶ء میں جیلین صوبے میں پیدا ہوئے۔ انھیں بچپن سے مطالعے کا شوق تھا اور لکھنے کا آغاز اس وقت کیا جب کہ وہ مڈل اسکول کے طالب علم تھے۔ انھوں نے یونیورسٹی میں جاپانی زبان کی تعلیم حاصل کی۔ گریجویشن کرنے کے بعد سے وہ چینی جاپانی ثقافتی تبادلے کے سلسلے میں کام کر رہے ہیں۔ انھوں نے تیس سے زائد ناولوں اور ناولٹوں، ساٹھ افسانوں اور نثری مضامین کا جاپانی سے چینی میں ترجمہ کیا۔ مثال کے طور پر "مٹی کی چٹانوں کے بہاؤ سے متاثر ہونے والا خطہ"۔ "برف میں مدفون"۔ "سیلانی زندگی گزارنے والی شہزادی" اور "لی ژیانگ لان کی سوانح عمری" وغیرہ وغیرہ ـــ اس کے علاوہ انھوں نے اپنے طبع زاد نثر پارے بھی شائع کیے۔ مثلاً "غیر ممالک سے خطوط" اور "روحوں کو ملانے والا پل" وہ دنیا کے منتخب "دھوڈیونٹس" کے چیف ایڈیٹر رہے۔ آج کل وہ چائینیز رائٹرز ایسوسی ایشن کے رکن اور اسی ادارے کے ایشیائی اور افریقی معاملات کے ڈویژن کے سربراہ ہیں۔

(ترجمہ: رعنا اقبال)

AZ
ANWARZAIB
WHITE CEMENT
BS 12 1983
40 KG NET WT

ڈاکٹر سید محمد حسنین

قاضی عبدالودود کی شخصیت کا ایک رُخ

(زیرِ اشاعت کتاب قاضی عبدالودود، مزاج اور منہاج کا ایک حصّہ)

اردو دنیا قاضی عبدالودود کو ایک عظیم محقّق کی حیثیت سے جانتی ہے۔ مگر یہ ان کی وقیع ادبی شخصیت کا ایک رخ ہے، اور لاشبہ نہایت روشن روپ ہے۔ قاضی عبدالودود ایک جیّد عالمِ ادب اور منفرد دانشور بھی تھے۔ بقول پروفیسر محمد حسن:

"...... ایسا جامع الکمال شخص، ابوالفضل کے بعد شاید ہندوستان نے پیدا کیا ہو...."

دوسرے اہلِ نظر سے بھی قاضی صاحب کی ادبی شخصیت کے قدو قامت پوشیدہ نہیں۔ حمیدہ سلطان صاحبہ کے گھر سے ان کے پُرانے راسم تھے۔ موصوفہ نے ان کے علم و قابلیت کا بہت قریب سے مشاہدہ کیا ہے۔ وہ حسرت و افسوس کے ساتھ کہتی ہیں:

"قاضی صاحب جس اونچے درجہ کے ادیب اور نقّاد ہیں، انھوں نے اس کے مقابلے میں اپنے سرمایۂ علم سے کام لینے میں بڑا بخل سے کام لیا ہے۔ حالانکہ ان کی دریا دلی روپے پیسے کے معاملے میں حدِّ اعتدال سے بڑھی ہوئی ہے، لیکن مجھے افسوس ہے کہ انھوں نے اپنا بہت قیمتی وقت یونہی ضائع کر دیا...... (ص: ۲۹) معاصر

مالک رام صاحب اور جناب رشید حسن ادبی تحقیقات کے مرد میداں ہیں۔ قاضی عبدالودود کے وسیع مطالعہ اور تبحرِ علم کا ذکر کرتے ہوئے یہ اعتراف کرتے ہیں:

مالک رام۔ "افسوس ہے انھوں نے اپنی طویل تصنیفی زندگی میں کسی موضوع پر مستقل کتاب نہیں لکھی۔" (ص: ۴۵) معاصر

رشید حسن خاں۔ "وسعتِ مطالعہ کے لحاظ سے یہ واقعہ ہے کہ آج تک ان کا کوئی حریف نہیں۔" (ص: ۱۲۹) معاصر

لیکن یہ ایک حسرت ناک حقیقت ہے کہ قاضی عبدالودود کی فکر و فراست، نظر و فہم اور تجلّیاتِ دانش خود ان کی تحقیق برائے تحقیق شعوری کاوش کی نذر ہو گئی۔ ان کے گراں قدر سرمایہ علم کا جوہر اردو کے اعلیٰ سنجیدہ ادب کو نصیب نہ ہوا۔ اردو کو وہ سب کچھ نہ دے سکے جو قدرت اور وقت نے انھیں وافر دیا تھا۔

قاضی عبدالودود کی نگارشات کثیر التعداد ہیں۔ ان میں ایسے اوراق اور پارچہائے منتشر کی اکثریت ہے جنھیں سالم و مکمل

مضمون یا مقالہ نہیں کہا جا سکتا۔ وہ طبعاً آزادانہ اور غیر منصوبہ بند کام کرنے کے عادی تھے۔ مزاجاً مداخلت تا یہ کسی گوشے سے ہو، انھیں گوارا نہ ہوتی۔ علی گڑھ تاریخ ادب اردو کا پروجکٹ اور حکومت بہار کی منظور شدہ گیارہ پر مشتمل غالب سے متعلق ایک لاکھ کی اسکیم، ان کی اس افتادِ طبیعت کی تاریخی شہادتیں ہیں۔ اس نوع کے بسوط ومنا کی طرف وہ جلد مائل نہ ہوتے تھے، اور ہوتے تو تادیر متوجہ نہ رہتے۔

قیامِ انگلستان کے بعد جب وہ دہلی واپس ہوئے تو انھوں نے پیشۂ قانون اور عملی سیاست کو اپنی صحت کے غیر احسن خیال کیا۔ اور مطالعۂ علم وادب اور مقالہ نویسی کو مرکزِ شوق وشغل بنایا۔ ان ابتدائی ایام میں بھی ان کی مصروفیا منصوبہ بند کاموں کا دخل وعمل نہ تھا۔

حیرت تو یہ ہے کہ گرچہ ان کے معمولات اور مصروف روز وشب نہایت سخت ضوابط کے تابع رہتے لیکن یہ استغ استواری ان کے ادبی مشاغل پر غالب نہ رہتی۔ کسی گمنام شاعر ریختہ کے کلام کی تدوین، کسی غیر معروف تذکرہ کی ترتیب بڑے مصنف کی تحقیق کاری میں خامیوں کی نشاندہی، بالعموم یہی امور ان کے ادبی مشاغل کا میدان یا محور تھا۔

اصولِ تحقیق یا معیارِ تحقیق کے لحاظ سے یہ نگارشات (جن کی مجموعی تعداد اگست ۱۹۷۶ء تک دوسو باسٹھ تھی) عبدالودود کے مثالی کارنامے ہیں۔ لیکن اس ذخیرے میں قاضی صاحب کی ادبی شخصیت کی عالمانہ یا مفکرانہ بصیرت کی لاحاصل ہے۔

قاضی عبدالودود کی ادبی شخصیت ایک مدیر کی بھی ہے۔ رسالہ "معیار" سے ان کی ثقافتی زندگی کا آغاز ہو ایک خالص ادبی ماہنامہ تھا جو مارچ ۱۹۳۶ء کو منظرِ عام پر آیا اور چھ ماہ تک پابندی سے جاری رہا۔ اس رسالے کے وہ مالک تھے۔ ایک واضح مقصد اور سیر وگرام کے ساتھ انھوں نے "معیار" جاری کیا تھا۔

اس رسالہ میں وہ "عالمِ ادب" کے نام سے کتابوں اور ادبی مضامین پر اظہارِ خیالات کرتے۔ "معروضات، مطبوعاتِ جدیدہ" کے زیرِ عنوان نہایت محتاط انداز سے لکھتے۔ ان نگارشات میں ان کی وہ دیدہ وری نمایاں ہے جس چل کر انھیں اردو کا وحید العصر محقق بنا دیا۔

اپنے اس ادبی ماہنامہ میں قاضی صاحب نے ایسے موضوعات پر قلم نہ اٹھایا جس کا ان کے "مبلغِ علم" سے براہِ راست تھا یا جو ان کا سرمایۂ دانش تھا۔

وہ شرق وغرب کے تعلیم یافتہ تھے۔ اقتصادیات، قانون، ادبیات اور تاریخ ان کے پسندیدہ موضوعات تھے۔ ان پر گہری نظر تھی اور اپنی فکر بھی۔ لیکن قاضی صاحب کی فہم وفراست کی وہ نیرنگیاں اور تجلیاں جو ان کی غیر معمولی ذہنی قوتوں اور کاوشوں کا حاصل تھی، اس خالص ادبی رسالہ میں جلوہ گر نہ ہوئیں۔

قاضی عبدالودود نے صحافت کے آب دار میدان میں بھی اپنے علم اور ذاتی فکر ونظر کے اظہار سے احتراز کیا۔

قاضی عبدالودود اصلاً ایک محقق ہیں، تخلیق کار نہیں۔ یہ صحیح ہے کہ تحقیق کو تخلیقی کاوش نہیں کہا جا سکتا۔ یہاں وہ سائنسی اسلوب کاری شرط ہے جو دو اور دو کی صداقت ظاہر کرتی ہے۔

قاضی عبدالودود اس نقطۂ نظر کے حامی اور عامل تھے۔ انھوں نے عمداً وہ طریقۂ کار پسند کیا جو تحقیق کو رومانیات سے قریب اور ادبی تخلیقات سے دور رکھتا ہے۔ انھوں نے بات کو نہ صرف دو ٹوک کہنے کی عادت ڈالی بلکہ اسے کم سے کم الفاظ میں قلم بند کرنے کی مہارت بھی پیدا کی۔ اس اسلوب کاری میں بلاشبہ وہ با مراد رہے۔ مگر دوسری طرف سخت گیر تحقیقی مزاج سے ان کی دانشوری روپوش ہو گئی۔ یہ مبالغہ نہیں کہ ان کی تحقیقی نگارشات ہر مرض کی دوا ہو سکتی ہے۔ یہ صحت کی غذا نہیں۔ عام تحقیق پسند قاری کے لیے قاضی عبدالودود کی سائنسی زبان و بیان کا اُقلیدسی انداز باعثِ لطف نہیں ہوتا۔

دل چسپ بات یہ ہے کہ قاضی عبدالودود کی ادبی شخصیت کی پُر لطف عالمانہ و مفکرانہ جھلکیاں ان کے تکلم میں درخشاں ہیں لیکن تحریر میں نظر نہیں آتیں۔ جنھیں قاضی صاحب سے کسی سنجیدہ موضوع یا اونچے مسئلہ پر تادیر تبادلۂ خیال کے مواقع ملے ہیں انھیں اس کا ذاتی تجربہ ہوگا کہ امورِ زیرِ بحث کے مدلل، جامع اور حتمی اظہار میں بھی ان کا وہ UNCONTROLED اور SPONTANIOUS ابلاغ ان کی غیر معمولی فہم و فراست اور ندرتِ فکر کی دھوپ چھاؤں پیدا کر دیتا۔ (جو کسی محقق کی نہیں، ایک ماہرِ ادب کی گل افشاں گفتار ہے۔

قاضی عبدالودود کی تحریر و تکلم میں ابلاغ کا یہ متضاد رنگ و آہنگ، میرا خیال ہے مدت العمر عالمی تحقیق پسندانہ شعوری کاوش کا نتیجہ ہے۔ اولاً انھوں نے خود کو حقائق کی تلاش و تفتیش میں کچھ اس طرح اسیر کر دیا تھا کہ تجلیاتِ دانش دب دب کر تہہ نشیں ہو گئیں۔ دوم تلاش و تحقیق میں ان کا سخت گیر منفی طریقۂ کار انھیں کسی مبسوط و منظم تصنیفی یا تالیفی کام کی طرف مائل نہ کر سکا۔ سوم اپنے سرمایۂ علم اور استعداد سے معمور خیالات و افکار کو تحریری ملبوسات عطا کرنے سے انھوں نے دانستہ گریز کیا کہ یہ مساعی تحقیقی مزاج کے لیے مضرتِ اصل نہ ہو جائے۔

یہ سمجھنا غلط ہوگا کہ قاضی عبدالودود میں عزم و عمل کی کمی تھی۔ رسالہ "معیار" کے علاوہ "ادارۂ تحقیقاتِ اردو" ان کی فعال شخصیت کا ثبوت ہے۔ "متعینِ زمانہ"۔ "جہانِ غالب"۔ "آوارہ گرد اشعار" اور "دانش گاہوں میں ادبی تحقیقات" جیسے عنوانات کے تحت وہ ہمیشہ لکھتے رہے۔ اس نوع کی نگارشات سے ان کی اس تاریخی بصیرت اور نظر و شعور کی گرفت کا اندازہ ہوتا ہے جو ان کے عزائم اور حوصلے کے دلائل ہیں۔

پھر ایسی بات بھی نہیں کہ قاضی عبدالودود کے معاشی یا ذاتی حالات ان کے پسندیدہ مشاغل کے لیے ناساز گار رہے۔ وہ چاہتے تو تحقیق کی دنیا میں رہ کر بھی ادب میں کوئی مضبوط اور مہتم بالشان کام انجام دے سکتے تھے۔ ایسا کام جس کا مدار ان کا مزاج نہیں۔ ان کا متاعِ علم و دانش ہوتا۔

دیکھیے جو ان کی قلم بند تحریر "میں کون ہوں میں کیا ہوں" سے ماخوذ ہیں۔

(۱)

ورلڈ اسٹیٹ

"۔۔۔ سب سے بڑی بات یہ ہے کہ میں ورلڈ اسٹیٹ چاہتا ہوں۔ اور مجھے یقین ہے کہ اگر یہ وجود میں نہ آیا تو دنیا کا خاتمہ ہو یا نہ ہو، تمدن و تہذیب کا ضرور خاتمہ ہو جائے گا" (ص: ۱۲)
"میں چاہتا ہوں کہ ورلڈ اسٹیٹ وجود میں آئے۔ میری یہ بھی خواہش ہے کہ معاشرت بھی ایک طرح کی ہو۔۔۔۔" (ص: ۲۵)

احکامِ دین اور جذبۂ خدمتِ خلق

"مجھے اس کا اعتراف ہے کہ مذہب سے بہت لوگوں کو اطمینانِ قلب نصیب ہوتا ہے۔"
"اور بہتوں کو یہ برائیوں سے باز رکھتا ہے۔ لیکن یہ میرا ذاتی مشاہدہ ہے کہ بکثرت اصحاب جو شریعت کے احکام ظاہری کی سختی کے ساتھ پابندی کرتے ہیں، اچھے انسان نہیں۔ مسلمانوں کو چاہیے کہ احکام ظاہری کی پابندی کریں مگر یہ نہیں سمجھیں کہ یہ سب کچھ ہے۔ انھیں خدمتِ خلق کی اہمیت کا احساس ہونا چاہیے اور اس میں مسلم اور غیر مسلم کا امتیاز نہیں چاہیے" (ص: ۱۲-۱۳)

کیمونزم

"مجھے لاسکی کے اس قول سے اتفاق ہے کہ کیمونزم ایک مذہب ہو گیا ہے۔ اور میرے لیے یہ ممکن ہے کہ میں اسے تسلیم کرلوں کہ معاشی مساوات ہونی چاہیے۔ لیکن یہ بھی تسلیم نہیں کرسکتا کہ حصولِ مقصد کے لیے سب کچھ جائز ہے۔ اور حقیقت وہی ہے جس میں کیمونزم کو پھیلانے میں مددملے لینن کا قول ہے کہ معاہدے توڑے جانے کے لیے ہی ہوتے ہیں۔ میں کبھی جماعت پر جس کا یہ عقیدہ ہو بھروسہ نہیں کرسکتا۔ کیمونسٹوں نے ذرا ذرا سے اختلاف پر ایک دوسرے کو جو سزا دی ہے وہ میں بھول نہیں سکتا۔ اور فرد کو جس طرح غلامی کی سطح پر پہنچا دیا ہے میں اسے نظر انداز نہیں کرسکتا۔۔۔۔" (ص: ۱۱-۱۲)

کانگریس سے علاحدگی

"۔۔۔۔ میں کانگریس سے علاحدہ اس لیے ہوا کہ بتدریج مجھ پر یہ بات واضح ہوگئی کہ ہندوؤں میں ایک بڑی جماعت ایسی ہے جو یہ فراموش نہ کرسکی کہ مسلمانوں نے ان پر صدیوں حکومت کی ہے اور ان پر مظالم ہوئے ہیں۔۔۔۔" (ص: ۱۰)

اکثریت کو مشورہ

"اکثریت کو میرا مشورہ یہ ہے کہ وہ یہ بھول جائیں کہ مسلمانوں نے ان پر ظلم کیے، نہیں بھول سکتی تو یہ یاد کرے کہ آریوں نے اس ملک کے اصلی باشندوں کے ساتھ کیا سلوک کیا تھا اور اس کے مقابلے میں مسلمانوں کا سلوک اس کے ساتھ کیا تھا۔۔۔۔۔" (ص: ۱۰)

فرقہ پرستی

"۔۔۔۔۔ میرا مشورہ یہ ہے کہ مسلمان ذرا ذرا سی باتوں پر مشتعل نہ ہوں۔ اپنے مطالبات میں جائز حدود سے تجاوز نہ کریں لیکن اکثریت کے خوف سے اس کے ہر مطالبے کے آگے سر تسلیم خم نہ کریں۔ انھیں اس سے ڈرنا نہیں چاہیے کہ وہ اپنے حقوق کی حفاظت چاہیں تو فرقہ پرست کہے جائیں گے۔ فرقہ پرست دراصل اکثریت کے وہ لوگ ہیں جو اقلیتوں کے جائز حقوق سے انھیں محروم کرنا چاہتے ہیں۔۔۔۔۔" (ص: ۱۱)

ہندوستان کی اقلیتیں

"ایک مشورہ کل اقلیتوں کے لیے ہے۔ انھیں قانون ساز مجالس میں پروپورشنل ریپرزنٹیشن کا مطالبہ کرنا چاہیے۔ انھیں اقلیتوں کے ان افراد پر جو اکثریت کی دلالی کرتے ہیں ہرگز بھروسہ نہیں کرنا چاہیے۔ اور قانون کے حدود کے اندر رہ کر ہر ممکن صورت یہ ظاہر کرنے کی اختیار کرنی چاہیے کہ ان دلالوں کو اقلیتوں کے خیالات کی ترجمانی کا کوئی حق نہیں۔"

الٹی میٹ ریلی ٹیز (ULTIMATE REALITIES)

"انسان کی ذہنی صلاحیت ایسی نہیں کہ الٹی میٹ ریلی ٹیز کے مطابق کوئی فیصلہ کن بات کہہ سکے۔ میں جب اس امر پر غور کرتا ہوں کہ عالم کس طرح وجود میں آیا تو مبہوت ہو جاتا ہوں۔ میں خود قاصر ہوں تو اس کے یہ معنی نہیں کہ دوسرے جو کچھ کہیں اسے بے چوں و چرا باور کر لوں۔" (ص: ۱۲)

مختلف علوم: منطق

"منطق نے بتایا کہ تناقض و تضاد کیا ہے اور صحتِ فکر کے لیے مغالطوں سے بچنا کس قدر ضروری ہے۔" (ص: ۲۳-۲۴)

نفسیات

"نفسیات نے سکھایا کہ اعمال محرکات لازماً وہ نہیں ہوتے جو ظاہر میں نظر آتے ہیں۔ شخصیت کا مسئلہ کس قدر پیچیدہ ہے۔ اور کسی انسان کے متعلق رائے قائم کرنا کس قدر مشکل ہے۔" (ص: ۲۴)

قانون

"قانون شہادت کی تعلیم یہ ہے کہ واقعات اور آرا میں تمیز کی جائے۔ یہ دیکھا جائے کہ گواہ

جو کچھ کہنا ہے وہ کس حد تک ذاتی مشاہدے پر مبنی ہے اور کس حد تک سماعت پر" (ص: ۲۴)

ادب اور ادیب کے مسائل

" میرا خیال ہے کہ ادب کو سیاسی و معاشی عقائد کی تبلیغ کا ذریعہ نہیں بنانا چاہیے۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ ادیب کا کوئی عقیدہ نہ ہو۔ ادیب کا اپنے عہد کے مسائل سے اس قسم کا تعلق نہیں ہونا چاہیے جو ایک پارٹی کے ممبر کا ہوتا ہے" (ص: ۲۴)

جدّت کاری

" شاعری ہو یا تمثیل یا کہانی، اس میں جدّت ہو تو ٹھیک ہے۔ مگر جدّت محض برائے جدّت نہیں۔ ایسے ادب کا جو لکھنے والے کے سوا کسی کی سمجھ میں نہ آئے، قائل نہیں ۔۔۔۔" (ص: ۲۵)

دروں بینی

" میں نے اشخاص اور معاملات کو ان کی اصل شکل میں دیکھنے کی کوشش کی ہے۔ ظاہر ہے کہ کامیابی ہوئی بھی ہو تو جزوی ہو سکتی ہے۔ میں نے اپنے آپ کو بھی سمجھنے کی کوشش کی ہے۔ مگر جیسا کہ لو ویلئر نے کہا ہے اس کے لیے بڑی جرأت کی ضرورت ہے۔ نہ جانے کس حد تک میں کامیاب ہوا ہوں" (ص: ۲۶)

قاضی عبدالودود کی ذہنی ساخت اور سطح غیر معمولی تھی۔ ان کا مطالعہ وسیع، حافظہ حیرت ناک اور قوتِ استدلال بڑی پختہ تھی۔ وہ جو کچھ اور جب کبھی بالاستیعاب پڑھتے، یہ لوحِ ذہن پر جیسے ثبت ہو جاتا ہے۔ پھر اظہار ایسا تلا اور اس تیقّن کے ساتھ ہوتا کہ الفاظ کی ترتیب اور متون کے بیان میں کوئی فرق نہ ہوتا۔

قاضی صاحب کی فہم و فراست اور ذہانت اوسط درجہ سے بالا تھی اور منفرد بھی۔ غور و فکر کا مادّہ بدرجہ اتم تھا۔ اور قوتِ استخراج تیز اور اس کا عمل ہمیشہ POINT - N/P رہتا۔ یہ اوصاف انھیں اس بلندی پر لے جاتے ہیں جو حکمائے تہذیب و تمدّن کی سرزمین ہے۔ اور جن کے بارے میں یہ خیال شاعرانہ اظہار نہیں کہ "جن کی پیری میں جھلکتا ہے سحر رنگِ شباب"۔ لیکن یہ افسوس ہے کہ ہم قاضی عبدالودود کو اس بلندی پر نہ دیکھ سکے۔

اردو زبان کو ایک ایسا زیرک و ذہین "عالم محقق" (RESEARCH SCHOLAR) ملا جس کی اسکالر شپ عام اہلِ علم و دانش سے بے مثال تھی۔ لیکن اس کے مبلغِ علم کا جوہر اردو کے اعلیٰ سنجیدہ ادب کو نصیب نہ ہوا۔

پروفیسر ظہیر احمد صدّیقی

خطوطِ رشید احمد صدیقی ـــ ایک تجزیہ، ایک تبصرہ

پروفیسر خلیق احمد نظامی نے "مکاتیبِ رشید احمد صدیقی" کے مقدمہ میں لکھا ہے "رشید صاحب نے جب مزاح نگاری
لی تو ان کی تحریریں پڑھنے والے ہنستے اور وہ خود زیرِ لب مسکراتے تھے۔ لیکن آخر زمانے میں ان کے 'خندہ زیرِ لب' کی جگہ
م' نے لے لی تھی۔" نظامی صاحب کا یہ بھی خیال ہے کہ وہ آخر عمر میں معلّمِ اخلاق، ہو گئے تھے۔ حالانکہ امرِ واقع یہ ہے کہ
نے میں معلّمِ اخلاق تھے۔ فرق صرف اس قدر ہے کہ ابتدا میں مزاح کے پردے میں سب کچھ کہہ دیا کرتے تھے۔ مگر
دں نے وضاحت کے ساتھ اپنے اس مسلک کا اظہار کرنا شروع کر دیا تھا۔ البتّہ نظامی صاحب نے یہ بالکل درست
کھوں نے اپنی زندگی کا آخری زمانہ علی گڑھ کی یادِ ماضی کے سہارے گزارا تھا۔" اس کا اظہار یوں تو ان کی دوسری
ں میں بھی ملتا ہے۔ مگر ان کے خطوط نے "رازِ درونِ پردہ" کو بھی فاش کر دیا ہے۔ اپنے خطوط میں وہ "چشمِ پرنم"
تی گے اور ان کی "مسکراہٹ زیرِ لب" بھی دکھائی دے گی۔ وہ احباب سے اصرار کرتے رہے کہ ان کے خطوط ضائع
یئں۔ رشید صاحب خطوط کیوں ضائع کروا دینا چاہتے تھے۔ اس کا سبب خود ان کی زبان سے سنیے۔ مجروح سلطان پوری
امیں لکھتے ہیں۔

> "مقصود بالعموم یہ ہوتا ہے کہ کسی ممتاز اور شریف آدمی کا کوئی اسکینڈل دریافت ہو جائے تو
> نفس کو تسکین نصیب ہو۔ کیسی نامبارک تسکین۔ کسی کی خلوت میں جھانکنا اور اسے شہرت
> دینا کسی صحیفۂ اخلاق میں اچھا نہیں سمجھا گیا۔ چہ جائیکہ مسلمانوں کے صحیفۂ اخلاق میں!
> چاہے اسے علم و فن کا کتنا ہی بڑا تقاضا کیوں نہ سمجھا جائے گا۔" (ص: ۲۱۸)

خطوط کو سینے سے لگائے رہے۔ ان کے خطوط محفوظ کرنے کا مقصد محض ایک ادیب کے سرمائے کو جمع کرنا نہیں تھا
وان سے جو عقیدت اور محبّت تھی اس کا تقاضا تھا کہ ان کے خطوط حرزِ جاں بنائے رکھیں۔ مجھے رشید صاحب کے
ایسا ادیب نظر نہیں آتا جس سے لوگوں نے عاشقانہ محبّت کی ہو۔ جس کی ایک مثال لطیف الزماں خاں کی ہے
صاحب سے عقیدت ان تک کھینچ کر لے گئی۔ مگر واپس ہوئے تو اس عقیدت میں محبّت کا جذبہ اس شدت کے

ساتھ شامل ہو چکا تھا کہ شاگردانِ رشید کو بھی ان پر رشک آنے لگا۔

میں ذکر یہ کر رہا تھا کہ خط وہ واحد ذریعہ ہے جہاں انسان ہنستا، بولتا، مسکراتا، روتا، محبت اور نفرت کا اظہار کرتا ہوا نظر آئے گا۔ دوسری تحریروں میں جو نقاب پڑا ہوتا ہے وہ خطوط میں اٹھ جاتا ہے۔ شاید یہی جذبہ تھا جب رشید صاحب نے سلمیٰ صدیقی کو لکھا تھا۔ "مجھے اس خیال سے بڑی وحشت رہتی ہے کہ میرے خطوط میرے بعد شائع کیے جائیں" مجروح سلطان پوری کو تحریر کرتے ہیں کہ "پرائیوٹ خطوط کو حاصل کرنے اور ان کی اشاعت کی جو مہم شروع کی گئی ہے اسے میں اچھا نہیں سمجھتا" ان سب کے بین السطور میں یہی جذبہ کارفرما تھا کہ حقیقت کے چہرے پر نقاب پڑی رہے تو اچھا ہے۔ ورنہ ڈر ہے کہ بہت سے اس کی تاب نہ لا سکیں گے۔ وہ باتیں جو ناگفتنی ہیں، موضوعِ بحث نہ بننے پائیں۔ مگر رشید صاحب اس سلسلے میں ایک بات بھول گئے کہ پیغمبر کی طرح ادیب کی بھی کوئی ذاتی میراث نہیں ہوتی۔ اس کی زبان سے نکلا ہوا ہر لفظ اور کاغذ پر لکھی ہوئی ہر تحریر دوسروں کی ملکیت ہو جاتی ہے۔ البتہ دوسروں سے یہ توقع ضرور کی جاتی ہے کہ ان کا بےجا استعمال نہ کریں۔

رشید صاحب کے خطوط کی ایک اہمیت تو وہ ہے جو ان کی دوسری تحریروں میں بھی ہے یعنی اسلوبِ نگارش۔ رنگوں میں ڈوبا ہوا شگفتہ طرزِ بیان۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ جملوں، فقروں اور الفاظ کی ایک فوج ہے جو صرف اپنے سپہ سالار کے ابرو کے اشارے کی منتظر رہتی ہے۔ بعض لوگوں کو شکایت ہے کہ علی گڑھ رشید صاحب کے دل و دماغ پر اس قدر مسلّط ہے کہ وہ اس کے بغیر نوالہ نہیں توڑتے۔ معترض یہ بھول جاتے ہیں کہ علی گڑھ سے رشید صاحب کی محبت مسلّم مگر ان کی تحریروں میں علی گڑھ ایک علامت بن کر ابھرا ہے۔ زندگی کا ہر مسئلہ جب سوالیہ نشان بن کر سامنے آیا ہے تو اس کا جواب ان کو علی گڑھ سے ملا ہے۔ رشید صاحب کے خطوط کی اہمیت یہ بھی ہے کہ اس میں خود رشید صاحب کی ذات کی حیثیت مرکزی کردار کی ہے مگر پورا علی گڑھ اپنی ادبی اور تہذیبی سرگرمیوں کے ساتھ نظر آئے گا۔ اس کے بسنے والے اپنی خوبیوں اور خامیوں کے ساتھ متحرک کردار کی طرح سرگرمِ عمل نظر آئیں گے۔ اس عمل میں "اللہ"، انسان اور ابلیس میں کشمکش کشیدگی۔ اتصال و افتراق اور لامتناہی پیچ و خم اور ترتیب و قرار بھی ملیں گے۔"

رشید صاحب کے خطوط کے چار مجموعے شائع ہو چکے ہیں۔ پہلا مجموعہ پروفیسر خلیق احمد نظامی صاحب نے ۱۹۷۸ء میں مرتّب کر کے شائع کر دیا۔ "مکاتیبِ رشید احمد صدیقی" بس وہی خطوط ہیں جو رشید صاحب نے نظامی صاحب کو لکھے تھے۔ اس مجموعہ کی صرف یہ اہمیت ہے کہ وہ رشید صاحب کے خطوط کا مجموعہ ہے ورنہ تمام تر خطوط کاروباری قسم کے ہیں۔ البتہ چند خطوط اس روش سے ہٹے ہوئے نظر آتے ہیں۔ انہی خطوط کو ذہن میں رکھ کر نظامی صاحب نے اشارہ کیا تھا کہ "وہ مزاح نگار سے زیادہ اخلاق اور انسانیت کے مبلّغ بن گئے تھے" ذیل کے خط سے اس کا بخوبی اندازہ کیا جا سکتا ہے۔

"کبھی کبھی اپنے طلبہ کے بارے میں بے اختیار محسوس ہوا ہے کہ وہ بڑے اچھے ہیں۔ لیکن جن لوگوں کے ہاتھ میں ان کی تعلیم و تربیت اور تقدیر سونپی گئی ہے وہ اوپر سے نیچے تک بڑے کھوٹے ہیں اور نفع و نمود کے

ہاتھوں بکے ہوئے ہیں۔" (۳؍ نومبر ۱۹۶۸ء)

خاکم بہ دہن مغلوں کے آخری دور کے زوال کی کہانی کی طرح علی گڑھ میں اخلاق، تعلیم اور قدروں کے انحطاط کی تصویر سامنے آجائے گی۔

اس مجموعے میں جو کمی محسوس ہوئی وہ یہ کہ مرتب نے جا بجا ..... لگا کر بحث کو بے معنی بنا دیا ہے۔ شاید اس کا سبب یہ ہو کہ نہ صرف یہ کہ تبصرہ نگار کا اپنے عہد پر تبصرہ کرنا مشکل ہے بلکہ دوسرے کے خیال کو برملا بیان کر دینا بھی دشوار ہے۔ مقدمہ اچھا ہے مگر محسوس ہوتا ہے کہ بہت سی باتیں کہنا چاہتے تھے اور کہہ نہ سکے۔ کاش مرتب حیالی حکیم کو پیش نظر کر دیتے اور حواشی کے ساتھ اس مجموعہ کو شائع کرتے تو اس کی افادیت میں اضافہ ہو جاتا۔ مگر اس میں کوئی شک نہیں کہ اس مجموعے نے رشید شناسی کے لیے راستہ ہموار کر دیا۔

دوسرا مجموعہ ڈاکٹر سلیمان اطہر جاوید نے مرتب کر کے ۱۹۸۰ء میں شائع کیا۔ خطوط جمع کرنے کے لیے ان کو کن ہفت خواں سے گزرنا پڑا ہوگا اس کا اندازہ کرنا مشکل ہے۔ جب وہ خطوط جمع کر رہے تھے تو رشید صاحب بقیدِ حیات تھے اور لوگوں کو ہدایات دے رہے تھے کہ ان کے خطوط تلف کر دیے جائیں۔ اس مجموعے میں وہ خطوط ہیں جو رشید صاحب نے مختلف لوگوں کو لکھے تھے اس لیے یہ مجموعہ خاص طور پر لوگوں کے لیے جاذبِ نظر رہا ہے۔

اس کے ایک سال بعد ۱۹۸۱ء میں جو مجموعۂ خطوط سامنے آتا ہے وہ "رقعاتِ رشید احمد صدیقی" ہے۔ یہ خطوط رشید صاحب نے مسعود حسین صاحب کو تحریر کیے تھے۔ اس مجموعے کی اہمیت یہ ہے کہ ان میں رشید صاحب کا فن بھی نظر آتا ہے اور ایک معلمِ اخلاق کا ناصحانہ اندازِ فکر بھی نمایاں ہے۔ مسعود صاحب نے حواشی میں بعض باتوں کی وضاحت بھی کی ہے۔ ان خطوط کا ایک پہلو یہ بھی ہے کہ ان میں خود مسعود صاحب کی شخصیت کے بعض پہلوؤں کا عکس بھی دیکھا جا سکتا ہے۔ یہاں موقع نہیں ہے ورنہ اس مجموعے کا تفصیلی تعارف پیش کیا جا سکتا تھا۔

ان تین مجموعوں کے بعد ۱۹۸۸ء میں لطیف الزماں خاں کا مرتبہ "خطوطِ رشید احمد صدیقی" ہمارے سامنے آتا ہے اور اس وقت اس مجموعۂ خطوط پر تبصرہ کرنا مقصود ہے۔ میں نے ابتدا میں عرض کیا کہ رشید صاحب سے عقیدت اور محبت کا جو جذبہ میں نے لطیف الزماں خاں کے یہاں دیکھا۔ اس میں ان کے یہاں اگر کوئی شریکِ غالب ہے تو وہ غالب ہے۔ میں اس نقطۂ اتصال کو تلاش کرنے کی کوشش کر رہا ہوں جس نے لطیف الزماں خاں کو ان دونوں فن کاروں سے عقیدت پر مجبور کیا۔ میں اکثر سوچتا ہوں کہ شاید میری نیکیوں میں یہ عمل بھی شمار ہو جب میں نے رشید صاحب سے لطیف الزماں خاں کی ملاقات کرائی تھی۔ اور یہ ان کی رشید صاحب سے پہلی اور آخری ملاقات تھی۔

یہ مجموعہ "خطوط رشید احمد صدیقی" دو سو اڑسٹھ خطوط پر مشتمل ہے۔ یہ نقش ہائے رنگ رنگ کا مجموعہ ہے۔ اس میں نجی خطوط بھی ہیں اور کاروباری بھی۔ ادبی مسائل کی طرف بھی اشارے مل جائیں گے۔ اور خود رشید صاحب کی شخصیت کے پہلو بھی اپنی پوری رعنائیوں کے ساتھ جلوہ گر ہیں۔ دوسروں کے بارے میں تبصرہ کا انداز نمایاں ہے۔

نجی خطوط بھی گھر کی خیریت۔ اولاد کی شادی کے مسائل۔ خط نہ آنے پر فکرمندی کا اظہار۔ اولاد کے خط میں

وہی لب و لہجہ ہے جو ایک شفیق باپ کا ہو سکتا ہے۔ باپ کے وہ جذبات جو اولاد کی دوری پر پیدا ہو سکتے ہیں۔ وہ کرب اور بے چینی کا اظہار بھی ہے جو خیریت نہ ملنے پر ایک محبت کرنے والے باپ کو ہو سکتی ہے۔ اولاد سے ان کا کوئی مطالبہ نہیں ہوتا بجز اس کے کہ "دسویں بارھویں ایک خط خیریت کا مختصر سے مختصر بھیج دیا کریں لیکن کوئی توجہ نہیں کرتا۔ حالانکہ میری زندگی کا سہارا لخیریت کے صرف خطوط رہ گئے ہیں۔" (ص: ۱۱۹) یہ احساس اس وقت فطری طور پر اور بڑھ گیا جب صحت جواب دینے لگی تھی۔ والہانہ لگاؤ اور محبت کے ساتھ وہ اپنے اس فرض سے بھی غافل نہیں ہیں جو اولاد کی تربیت کے سلسلے میں باپ پر واجب ہے۔

"اللہ کا سب سے اچھا بندہ وہ ہے جو نیکی سے قریب اور بدی سے دور رہتا ہے۔ یہ باتیں مولویوں جیسی نہیں کر رہا ہوں۔ نہ تم کو بے وقوف سمجھ کر کر رہا ہوں۔ اپنے بیٹے سے بناوٹ کی باتیں نہیں کر سکتا۔" (ص: ۱۸۶)

دوسری جگہ لکھتے ہیں:

"انسان کا سب سے بڑا فرض، سب سے بڑا قرض اور اس کی سب سے بڑی ذمہ داری یہ ہے کہ وہ خلق کی خدمت کرے۔ کمزور، لاچار اور مظلوم کی مدد کرے۔ جہاں تک اپنے بس میں ہو شریف لوگوں میں اپنی عزت اور اپنا اعتماد پیدا کرے۔" (ص: ۱۸۶)

رشید صاحب صرف سماجی زندگی کو سلیقے سے گزارنے کی ہی تلقین نہیں کرتے بلکہ ادب کے سلسلے میں بھی بہت واضح الفاظ میں اپنا نقطۂ نظر بیان کر دیتے ہیں۔ چنانچہ اقبال رشید کو ایک خط میں تحریر کرتے ہیں:

"ہر روز کالم نہ لکھا کرو۔ ۲۔۳ مہینے بعد کوئی بڑے پایہ کا سوچا سمجھا اور ترشا تراشا مضمون کسی اعلیٰ پائے کے اردو میگزین میں لکھو۔ کراچی میں ایسے اچھے رسالے بہت ہیں۔ وہیں کے علمی حلقے میں تمہاری شہرت ہونی چاہیے۔" (ص: ۶۶)

رشید صاحب کے معلّم اخلاق ہونے کا ذکر خلیق احمد نظامی صاحب نے بھی کیا ہے۔ میری ذاتی رائے یہ ہے کہ اخلاقیات کا منبع جس کو مذہب کہتے ہیں اس سے رشید صاحب کبھی بیگانہ نہیں رہے۔ ان کے نزدیک مذہب اور اخلاق کا ایسا مضبوط رشتہ ہے کہ ایک کو دوسرے سے الگ نہیں کیا جا سکتا۔ ان کے یہاں اخلاقی اقدار کا معیار بنی نوع انسان کا احترام ہے جہاں نسل، رنگ اور تہذیب کی دیواریں منہدم ہو جاتی ہیں۔ دوسری خوبی یہ ہے کہ ان کا درس اخلاق ایسا نہیں معلوم ہوتا کہ دوسرے پر ضابطۂ اخلاق مسلّط کرنا چاہتے ہیں۔ البتہ اپنے نقطۂ نظر کا اظہار صفائی اور بڑی بے باکی سے کر جاتے ہیں۔ ایک خط میں سلمیٰ صدّیقی کو لکھتے ہیں۔

"زیرِ نظر خط میں جو لب و لہجہ، راضی برضائے الٰہی رہنے کا ہے وہ بڑا امید افزا اور صحت مند ہے۔ بشرطیکہ یہ کسی FRUSTRATION کا سبب نہ ہو بلکہ قوتِ ایمانی کی دین ہو۔ قوتِ ایمانی توفیقِ انسانی کی دلیل ہے۔ مجبوری اور معذوری کا نام نہیں ہے۔" (ص: ۹۱-۹۲)

...ر احمد لقی کو خط لکھتے وقت مذہب کی دل چسپ توجیہ کرتے ہیں:

"البتہ اس میں جذباتی، بالخصوص مذہبی ہوتے کا TONE غالب تھا۔ یہ تو تم ہمیشہ سے تھیں۔ اس پر قابو رکھنا چاہیے۔ اچھی زندگی نارمل ہونے میں ہے۔ ضرورت سے زیادہ مذہبی ہونا خود مذہب کے منافی ہے۔ جلال سے پوچھنا کہ اقبال نے اپنی نظم "تنہائی" میں اور دوسری جگہ بھی اللہ سے پوچھا ہے فلاں فلاں باتوں پر اس کا رجحان کیا رہا ہے؟ آخر میں لکھا ہے کہ "اللہ کے لب پر تبسم آیا اور کچھ نہ کہا" یہ متبسم ہوتا نارمل ہونے کا سب سے بڑا سمبل ہے۔" (ص: ۱۶۵)

...ن اقتباسات سے جو نتیجہ نکلتا ہے وہ یہ کہ پابند رضائے یار ہونا اگر جذبۂ عشق کی بدولت ہے تو یہ نیابتِ الٰہی کی تمنا ہے۔ ...ر اگر مجبوری اور ریاست کے باعث ہے تو اس کو صرف ذہنی انتشار کہا جا سکتا ہے۔ اسی طرح مذہب کی سب سے بڑی پہچان عدل ...ر توازن ہے۔ مذہب اور اخلاق کے اس مزاج کا نتیجہ "شکر" کی صورت میں پیدا ہوتا ہے۔ اقبال رشید کو ایک خط میں لکھتے ہیں:

"اتنی نعمتیں اور اس مقدار میں جس باپ کے بیٹوں کو نصیب ہوں اسے اب اس دنیا میں کیا چاہیے۔ دو چار مکروہات بھی جان کو لگی ہیں تو اس کو انگیز ہی کرنا چاہیے۔ یہ میرے گناہوں کی پاداش ہے اور چوں کہ وہ گناہ آنکھوں کے سامنے ہیں اس لیے جب کینہ اور کم ظرفی کے سلوک سے دو چار ہوتا ہوں تو اسے اللہ کی طرف سے جانتا ہوں۔ اپنے گناہوں کی پاداش خاموشی سے جھیلنا بہر حال لازمی ہے۔" (ص: ۴۵)

...یں نے ابتدا میں رشید صاحب کے بے باک اظہارِ رائے کا ذکر کیا تھا۔ اس کی متعدد مثالیں اس مجموعے تیز بعض ان خطوط ...ں مل جائیں گی جو انھوں نے پروفیسر مسعود حسین صاحب کو لکھے ہیں۔ البتہ اگر براہِ راست مخاطب ہیں تو خواہ قلم کی تلخی تمایاں ...و جائے، ورنہ دوسروں کے نام خطوط میں وہ اپنے معترض کے نام کے اظہار سے گریز کرتے ہیں۔ چنانچہ اس مجموعے میں بھی ایک ...یم فرما" کے بارے میں بغیر نام لیے ہوئے دل کا کرب نوکِ قلم پر آگیا ہے۔ مگر فاضل مرتب نے رازِ درون پردہ کو فاش کر دیا۔ ...ں سوچتا ہوں کہ رشید صاحب طنز نگار ہونے کے باوجود کبھی غنچے سے قلم دان لانے کے لیے نہیں کہتے۔

"آپ کو جن صاحب سے ملنے کا اتفاق ہوا ان کی تحریر و تقریر سے آپ بالکل مایوس اور ملول نہ ہوں۔ ان کو آپ سے یا آپ کی کتاب سے کوئی دل چسپی نہیں۔ ان کا روئے سخن تمام تر میری طرف تھا۔ اس طرح کی باتیں وہ اکثر میرے بارے میں کر چکے ہیں۔" (ص: ۲۷۷)

"..... صاحب کے خطوط کا حال معلوم ہوا۔ ان کے بارے میں کیا کہوں۔ کوئی بھی جگہ نہیں جہاں انھوں نے ڈورے نہ ڈالے ہوں۔ اور کوئی بھی اہم شخصیت ایسی نہیں ہے جس کو انھوں نے بے تکلف اپنے لیے APPROACH نہ کیا ہو۔" (ص: ۱۳۲)

...شرقی طرزِ فکر کی ایک پہچان یہ بھی ہے کہ کسی سے تکلیف پہنچی ہو تو بر بنائے تقاضائے بشریت اس کا اظہار تو ہو جاتا ہے مگر تمام

لے کر رسوا کرنا پسند نہیں کیا جاتا۔ رشید صاحب کی مشرقیت نے ہمیشہ اس بات کا لحاظ رکھا ہے۔

عجیب اتفاق ہے کہ میں تبصرہ کرنے بیٹھا تھا "خطوط رشید احمد صدیقی" پر اور قلم کتاب سے ہٹ کر رشید احمد صدیقی کی طرف متوجہ ہو گیا۔ اگرچہ یہ تفصیل بھی بے محل اس لیے نہیں ہے کہ یہ اقتباسات اور اظہارِ رائے بھی کتاب سے کوئی الگ چیز نہیں ہے۔ البتہ یہ بات برابر ذہن میں آتی ہے کہ رشید شناسی کے لیے ہمارے پاس کون سے ذرائع ممکن ہیں اور کون سا ذریعہ ایسا مستحکم اور معتبر ہے جہاں گمان پر یقین غالب آجائے۔ ظاہر ہے کہ اس کا جواب رشید صاحب کے خطوط سے ملے گا۔ اسی بات کو دوسرے الفاظ میں کہنا چاہتا ہوں کہ رشید شناسی کے لیے اگر ہمارے ناقدوں نے قلم اٹھایا تو لطیف الزماں خاں کے اس احسان کو فراموش نہ کر سکیں گے جو انھوں نے ان خطوط کو مرتب کر کے صرف شائقینِ رشید پر ہی نہیں بلکہ ادب پر بھی کیا ہے۔ رشید صاحب کی شخصیت، سیرت اور نقطۂ نظر کے نقوش کی نشان دہی ان خطوط سے ممکن ہو سکے گی۔

مجھے اس کا بھی احساس ہے کہ خطوط کے حواشی تیار کرنے میں "عزت سادات" کو داؤ پر لگا دیا ہے۔ مجھے احساس ہے کہ اپنے عہد پر تبصرہ بے حد مشکل کام ہے۔ مسعود حسین صاحب نے "رقعاتِ رشید احمد صدیقی" کے ابتدا میں لکھا ہے:

> "رشید صاحب کے 'ادبِ ممنوع' کو برسرِ عام لانے کی یہ جرأتِ رندانہ ان کی ہدایت اور اپنی شرافت کو خطرے میں ڈال کر کی جا رہی ہے۔"

مگر لطیف الزماں خاں نے ایک قدم آگے بڑھ کر رشید صاحب کے سامنے ہی نہیں بلکہ ان لوگوں کے سامنے بھی اپنے آپ کو برسرِ عام لا کر جرأتِ رندانہ کا ثبوت دیا ہے جن کا ذکر رشید صاحب نے 'حدیثِ دیگراں' کے پردے میں کیا ہے۔ ان خطوط کو پیش کر کے انھوں نے یہ بھی ثابت کر دیا ہے کہ "چشم پرنم" کے وقت بھی ان کے اندر کا مزاح نگار اپنے فرض سے غافل نہیں رہتا۔ یہ ضرور ہے کہ اس مزاح نگار نے موضوعات کی سنجیدگی کو نظر انداز نہیں کیا، بلکہ یہ کہنا چاہیے کہ سنجیدہ مسائل کی گفتگو کے درمیان وہ مزاح نگار کوئی چٹکلا ایسا چھیڑ دیتا ہے کہ بے اختیار ہنسی آجاتی ہے۔ مگر یہ ہنسی اپنے قاری کو موضوع سے ہٹنے نہیں دیتی۔ طوالت کے خیال سے ان کو نظر انداز کر رہا ہوں۔

خطوط کے سلسلے میں ایک بات ذہن میں آتی ہے اور وہ یہ کہ حواشی کے باوجود ان میں مندرج واقعات یا اشارے اپنے سیاق و سباق چاہتے ہیں۔ مثلاً وہ خطوط جو میرے نام ہیں ان کے حواشی سے کچھ معلومات فراہم ہوتی ہیں مگر خط کس سیاق و سباق میں لکھا گیا ہے اس بارے میں مرتب کوئی رائے قائم نہیں کر سکتا۔ دو خطوط جو میرے نام ہیں (خط نمبر ۱۸ اور ۲۲) ان کے بارے میں حافظہ کام نہیں کر رہا ہے کہ ان کا سلسلہ کہاں سے ملتا ہے۔ اس لیے دوسرے خطوط کے بارے میں ان کے سیاق و سباق کی وضاحت کر دوں۔

<u>خط نمبر ا</u>　یہ خط ۱۹۵۳ء کا ہے جب علی گڑھ میگزین کا ایڈیٹر تھا اور ایم۔ اے کی تعلیم مکمل کر چکا تھا۔ میں نے میگزین (طنز و ظرافت نمبر) کے لیے رشید صاحب سے مضمون کی فرمائش کی تھی۔ انھوں نے ازراہِ کرم "جینے کا سلیقہ" اور "مرحبا حسن مرحبا" مضامین عنایت کیے تھے۔ ان کا خیال تھا کہ ان کی لکھی ہوئی تحریر کاتب نہیں پڑھ سکے گا اس لیے انھوں نے مجھے ہدایت کی تھی کہ اس کو صاف صاف لکھ دوں۔

رشید صاحب کو میرے کیریر سے دل چسپی تھی اس لیے وہ چاہتے تھے کہ میں کسی ملازمت سے وابستہ ہو جاؤں۔
نہ انھوں نے وعدہ کیا کہ وہ ذاکر صاحب (جو اس وقت وائس چانسلر تھے) سے بھی کہہ دیں گے۔ اس وقت رشید صاحب
کے ذہن میں ایک تو ریڈیو کی ملازمت تھی اور انھوں نے درخواست کے فارم بھی بھجوا دیے تھے اور ذاکر صاحب سے
ی کی درخواست بھی کی تھی۔ مگر ریڈیو سے انٹرویو لیٹر ہی نہیں آیا۔ مجھے اس کا افسوس اس لیے نہیں ہوا کہ اس ملازمت
ے میرا ذہنی لگاؤ نہیں تھا۔ دوسری بات رشید صاحب کے ذہن میں یہ تھی کہ میں اور خلیل الرحمٰن اعظمی شعبہ سے وابستہ
ہو جائیں۔ اعظمی صاحب مجھ سے سینئر تھے اور ادبی حلقوں میں "نگار" کی وجہ سے معروف بھی ہو چکے تھے۔ اتّفاق کی بات کہ
استادوں (خورشید الاسلام صاحب اور معین احسن جذبی صاحب) کے چھٹی پر چلے جانے کی وجہ سے کچھ عرصے کے لیے
دونوں کا عارضی تقرّر ہو گیا۔ مگر جب ایک نئی مستقل جگہ کا اشتہار ہوا تو اس پر نہ میرا تقرّر ہوا اور نہ اعظمی صاحب
۔ بلکہ سرور صاحب نے اپنے اثرات سے کام لے کر محمد حسن صاحب کا تقرّر کرا دیا۔ اس انتخابی کمیٹی میں سرور صاحب ایکسپرٹ
حیثیت سے آئے تھے۔

ط نمبر ۴ جامعہ اردو کے ارباب حل و عقد کی خواہش تھی کہ دہلی یونیورسٹی اس کے امتحانات کو اپنے یہاں منظوری
دے۔ اس سلسلے میں رجسٹرار جامعۂ اردو نے مجھے خط لکھا اور رشید صاحب کے حوالے سے خواہش کی کہ میں اس سلسلے میں
شش کروں۔ میں نے رشید صاحب کو خط لکھا اور جامعۂ اردو کے سلسلے میں بعض مشورے دیے۔ نیز امتحانات کے سنٹر
جو بدعنوانیاں ہوتی ہیں ان کی طرف توجّہ دلاتے ہوئے بعض تجاویز پیش کی تھیں۔ میں نے یہ بھی تحریر کیا تھا کہ جامعۂ اردو
طرف سے دہلی یونیورسٹی کے وائس چانسلر کو ان سطور پر خط لکھا جائے تو پھر انشا اللہ پوری کوشش کی جائے گی کہ یہ امتحانات
لور ہو جائیں۔

ا نمبر ۵-۶ یہ دونوں خطوط دراصل ایک ہی سلسلے کی کڑی ہیں۔ یعنی ہم لوگ کوشش کر رہے تھے کہ رشید صاحب ہمارے
ں کسی سمینار کی صدارت کریں اور مقالہ پڑھیں۔ رشید صاحب ویسے بھی جلسہ جلوس سے گھبراتے تھے مگر نفسیاتی طور پر اس کا
اثر تھا کہ بعض اصحاب کوشش کر رہے تھے کہ رشید صاحب کو ملازمت میں توسیع نہ ملے۔ شعبہ کے ایک ساتھی کا رویّہ یہ تھا کہ
رشید صاحب پروفیسر ہوتے تھے تو انھوں نے بڑے ہتک آمیز انداز میں ان کے پروفیسر ہونے پر طنز کیا تھا اور اب
سرے ساتھی کوشاں تھے کہ ان کی توسیع نہ ہونے پائے۔ رشید صاحب بے حد متاثر تھے۔ ان کے کرب کا اندازہ اس اقتباس
کیا جا سکتا ہے:

"یہ تو بتائیے مذاکرے کی صدارت کے لیے مُردوں یا مجسّموں کی تلاش کیسی اور مجسمے بھی ایسے
جن کا مصرف یہ رہ گیا ہو کہ طیور ان پر بیٹ کریں اور وحوش ان کا منھ کالا کریں" (ص: ۲۰۰)

نمبر ۹ میں نے جامعۂ اردو کی بعض کوتاہیوں کی طرف اشارہ کیا تھا۔ پروفیسر عبد العلیم صاحب جامعۂ اردو کے خازن تھے۔
رشید صاحب نائب شیخ الجامعہ تھے۔ معاملات کو سلجھانے میں علیم صاحب کو غیر معمولی ملکہ حاصل تھا۔ غالباً اسی لیے رشید صاحب
یہ خط عبد العلیم صاحب کو بھجوا دیا۔ اتنا عرصہ گزرنے کی وجہ سے یہ یاد نہیں کہ وہ مسائل کیا تھے۔

خط نمبر ۱۰ اس خط پر تاریخ نہیں ہے مگر یہ خط ۱۹۵۲ء یا ۱۹۵۳ء کا ہے۔ اس وقت میں ایم۔ اے میں تھا اور انجمن
اردو ئے معلّٰی کا سکریٹری تھا۔ یہاں انجمن سے مراد انجمن اردو ئے معلّٰی ہے۔ اس انجمن کے تحت جلسے، مباحثے اور مذاکرے بڑی
پابندی سے ہوتے تھے۔ کسی اہلِ علم کو (علی گڑھ یا بیرونِ علی گڑھ) مقالہ پڑھنے کے لیے مدعو کیا جاتا تھا۔ ان مباحثوں میں
حصہ لینے والوں میں پروفیسر ڈاکٹر عبدالعلیم، پروفیسر رشید احمد صدیقی، پروفیسر ضیا احمد بدایونی، پروفیسر مسعود حسین، پروفیسر
[illegible] احمد صدیقی اور خلیل الرحمٰن اعظمی کے نام خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔
خط نمبر ۱۱ یہ خط بھی ۱۹۵۲ء یا ۱۹۵۳ء کا ہے۔ جگر صاحب کی آمد پر قبلہ والد صاحب (مولانا ضیا احمد بدایونی) نے
ان کے ساتھ کچھ احباب کو چائے پر مدعو کیا تھا۔ دیر تک محفلِ شعر و سخن جاری رہی۔ مجھے یاد ہے کہ رشید صاحب نے معذرت نامہ
بھیج دیا تھا مگر اس کے بعد خود تشریف لائے۔ اور کسی ضروری میٹنگ میں شرکت کی وجہ سے معذرت کر کے فوراً واپس چلے گئے۔
خط نمبر ۱۴ اس خط میں جس لیکچر کا ذکر ہے اس سے مراد نظامِ خطبات ہیں۔ ہم سب کی خواہش تھی کہ ایک سال رشید صاحب
نظامِ خطبات دیں، اور ہر سال رشید صاحب خوش اسلوبی سے ٹال جاتے تھے۔ چنانچہ اس خط میں بھی یہی معذرت ہے۔
بعد کو خواجہ احمد فاروقی صاحب نے رشید صاحب کو خطبات دینے کے لیے آمادہ کر لیا اور انھوں نے ۱۹۶۹ء میں نظامِ خطبات
پیش کیے۔
خط نمبر ۱۶ فتح پوری مسلم اسکول کے پرنسپل قمر قریشوری صاحب تھے۔ ان کی خواہش تھی کہ اسکول کے سالانہ جلسے میں
رشید صاحب صدارت کریں اور طلبہ کو انعامات بھی تقسیم کریں۔ قریشوری صاحب نے مجھ سے خواہش ظاہر کی تھی کہ رشید صاحب
سے سفارش کر دوں مگر رشید صاحب نے معذرت کر دی۔
خط نمبر ۱۷ اس خط میں بھی جامعہ اردو کے آئین و ضوابط میں کچھ تبدیلی کی درخواست کی تھی۔ اور ان امور کی طرف توجہ دلائی
تھی جن کی وجہ سے دہلی یونیورسٹی جامعہ اردو کے امتحانات کو منظور نہیں کر رہی ہے۔ اس وقت جامعہ اردو کے نائب شیخ الجامعہ
پروفیسر عبدالعلیم صاحب تھے۔

ان خطوط میں کتابت کی کچھ غلطیاں راہ پا گئی ہیں۔ ان غلطیوں کی طرف مرزا خلیل بیگ رسالہ "ادیب" (اکتوبر، دسمبر
۱۹۸۹ء) میں اشارہ کر چکے ہیں۔ امید ہے کہ آئندہ اشاعت میں تصحیح ہو جائے گی۔ یہاں ان کے اعادہ کی ضرورت نہیں ہے۔
نیز ان خطوط میں جو میرے نام ہیں ان میں تین جگہ درستی کی ضرورت ہے۔

۱۔ خط نمبر ۵۔ ص: ۲۰۰۔ جملہ یہ ہونا چاہیے: "مجھے تو بخش دیجیے جو القصائد کی کر گھہ کے قابل بھی نہ رہا ہو۔ ایسے تماشے
کی ترغیب نہ دیجیے۔" اس میں لفظ "کر گھہ" چھوٹ گیا ہے اور تماشے "کاشانے" لکھ دیا گیا ہے۔ جس کی وجہ سے
مطلب خبط ہو گیا ہے۔

۲۔ خط نمبر ۷۔ ص: ۲۰۱۔ حاشیہ۔ مکان کا نام "بیت الطیّب" غلط ہے۔ مکان کا نام "بیت الحبیب" ہے۔

۳۔ خط نمبر ۱۰۔ ص: ۲۰۶۔ حاشیہ۔ خواجہ احمد فاروقی کو علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے شعبۂ اردو کا صدر لکھ دیا ہے جب کہ
وہ شعبۂ اردو دہلی یونیورسٹی کے صدر تھے۔

ایک امر کی طرف توجہ دلانا ضروری ہے۔ اچھا ہوتا اگر ہر مکتوب الیہ کے خطوط تاریخی ترتیب سے لکھے جاتے تاکہ
ڑھنے والے کو تبدیلیوں کا اندازہ ہو سکتا۔
بہرنوع لطیف الزماں خاں صاحب کا احسان ہے کہ ایک طرف نوشا گردانِ رشید اور نیازمندانِ رشید کی طرف سے
ن کفایہ ادا کر دیا اور دوسری طرف ریسرچ اسکالرس کے لیے مواد فراہم کر دیا۔ ادب اس کے لیے ہمیشہ ان کا ممنون رہے گا۔
طباعت کا اہتمام کیا گیا ہے۔ سرورق کی سادگی پرکاری کا منظر پیش کر رہی ہے۔ رشید الزماں خاں صاحب نے مژدہ
ایا ہے کہ خطوطِ رشید احمد صدیقی کا دوسرا حصہ بھی اشاعت کی منزل کی طرف تیزی سے بڑھ رہا ہے۔ خدا کرے وہ منصۂ شہود
جلد از جلد آجائے۔

ابوسعادت جلیلی

"پریم ساگر" کا ایسٹ وِک ایڈیشن

پروفیسر سیّد محمد نے للولال جی کوی کی ادبی سرگزشت تحریر کرتے ہوئے "پریم ساگر" کو سرفہرست رکھ کر لکھا: یہ بھگوت گیتا کے دسویں باب کا ترجمہ ہے۔ برج بھاشا میں اس کو ایک اور پنڈت چتر بھوج مصرا نے بھی لکھا ہے۔ للولال جی نے اس نسخے سے ثقیل سنسکرت الفاظ اور غیر مانوس قدیم ترکیبیں خارج کر کے ازسرنو ایک کتاب مرتب کی۔ "پریم ساگر" میں ہندوؤں کے مشہور دیوتا سری کرشن جی کی روایتی تاریخ اور دیگر حکایات بیان کی گئی ہیں۔ اس کا پہلا ایڈیشن ۱۸۰۳ء میں شائع ہوا تھا۔ دوسرے ایڈیشن ۱۸۰۴ء و ۱۸۱۰ء اور ۱۸۲۰ء میں شائع ہوئے للولال کی یہ کتاب بہت مقبول رہی۔ ہندوستان اور یورپ کے ہندی داں طبقے نے ان کا خاطر خواہ خیر مقدم کیا۔ انگریزی میں بھی اس کے دو ترجمے ہوئے ہیں۔ ایک کپتان ہولنگس نے ۱۸۴۸ء میں کلکتہ سے شائع کیا اور دوسرا ایڈورڈ ایسٹ وِک EASTWICK نے لندن سے ۱۸۶۷ء میں۔[1]

للولال جی کوی کی اس ہندی کتاب "پریم ساگر" کا یہی موخر الذکر ایڈیشن راقم کے ہاں محفوظ ہے۔ جیسا کہ اس کے انگریزی سرورق کا منسلکہ عکس مظہر ہے۔ امر واقعہ یہ ہے کہ یہ نہ تو انگریزی ترجمہ ہے اور نہ ہی مشترکہ انگریزی و ہندی ایڈیشن۔ چنانچہ آئندہ تفصیلات سے بخوبی مترشح ہوگا کہ یہ اس ہندی ترجمے کا ایسٹ وِک ایڈیشن ہے جس پر انگریز مرتب نے یقیناً بڑی محنت کی ہے۔ کپتان ولیم ہولنگس کے ۱۸۴۸ء کے انگریزی ترجمے کو مولوی سیّد محمد نے جامعۂ عثمانیہ اور کتب خانۂ آصفیہ (اب اسٹیٹ لائبریری) کے ذخیرہ ہائے مطبوعات میں ملاحظہ کیا ہوگا۔ مگر اس ایسٹ وِک ایڈیشن کو ترجمہ کسی طرح بھی یاد نہیں کیا جا سکتا ہے جب کہ یہ مشترکہ ہندی و انگریزی ایڈیشن بھی قرار نہیں پا سکتا ہے۔ وجہ یہ کہ مثلاً "مہابھارت" ہی کے ایک اور کھنڈ کے اصل سنسکرت متن کے انگریزی ترجمے کے ساتھ شائع شدہ "نل اوپکھیانم" کی مشترک طباعت کی طرح "پریم ساگر" کے اس ایسٹ وِک ایڈیشن میں ایک سا صفحے

---

[1] مولوی سیّد محمد: "ارباب نثر اردو" حیدرآباد ۱۹۲۷ء ص: ۲۶۵/۲۶۶ [2] مونیر ولیمس: "نل اوپکھیانم" یا "اسٹوری آف نل" ڈین ملمن کے انگریزی ترجمے کی نظر ثانی شدہ اشاعت، آکسفورڈ ۱۸۷۹ء۔ مقابل صفحات پر "مہابھارت" کے چھٹے کھنڈ کا متن متعلقہ قصہ نل و دمینتی اور اس کا انگریزی ترجمہ تحریر ہے۔ مرتب کے ۴ صفحوں کے عالمانہ مقدمے کے بعد پونے دو سو صفحات پر متون درج ہیں اور ڈیڑھ سو صفحات کی مبسوط و مکمل سنسکرت انگریزی فرہنگ سمیت اس بے حد قیمتی تالیف کی کل ضخامت ۳۲۰ صفحات کو جامع ہے۔ یہ ایڈیشن بھی راقم سطور کے پاس محفوظ ہے۔

ہندی اور مقابل ورق پر انگریزی ترجمہ موجود نہیں ہے۔ دراصل ایسٹ وِک نے سرے سے ترجمہ شامل کیا ہی نہیں ہے بلکہ ہر باب کی پیشانی
ملخص انگریزی میں تحریر کر دیا ہے۔ آخر میں ایک مکمل و جامع ہندی انگریزی فرہنگ کا اضافہ بھی کیا ہے اور یہ دونوں ہی اضافے یعنی خلاصہ
ر لغت بہر اعتبار بے حد قیمتی ہیں۔

"پریم ساگر" کے اس طبع ایسٹ وِک کے سرورق کے مندرجات کا ترتیب وار ترجمہ یہ ہوگا: "پریم ساگر یا بحرِ عشق یعنی سوانح
شن بہ مطابق: دسواں باب "بھگوت" از ویاس دیو۔ چتر بھوج مِسر³ کی برج بھاشا⁴ سے ہندی میں ترجمہ۔ از للولال سابق بھاکھا منشی
ٹ ولیم کالج۔ طبع نو بہ مع فرہنگ از ایڈورڈ بی ایسٹ وِک رکن رایل ایشیاٹک سوسائٹی، رکن انجمن ہائے ایشیائی پیرس و بمبئی۔ نیز پروفیسر
دو اور ناظمِ کتب خانہ ایسٹ انڈیا کالج ہیلی بری۔ ہرٹفورڈ: طبع شدہ برائے عزت مآب ایسٹ انڈیا کمپنی بدست اسٹیفن آسٹن کتب
وش ایسٹ انڈیا کالج" اس ایڈیشن کی ترتیب یہ ہے کہ دو صفحوں کے مقدمہ مرتب کے بعد کتاب للولال جی کے ہندی پیش لفظ پر انگریزی
ڈ کے ساتھ شروع ہوتی ہے۔ اس مقدمۂ مترجم کے معاً بعد یعنی دوسرے ہی صفحے سے جہاں للوجی کا مقدمہ ختم ہوتا ہے ابواب کا آغاز ہو جاتا
ہ۔ جن کی ابتدا میں ہر باب کا ملخص چند انگریزی کلمات میں تحریر ہے۔ کتاب چھوٹے بڑے کل (۹۰) ابواب کے ساتھ (۲۴۰) صفحوں اور
ں کے بعد (۱۹۵) صفحات کی باضابطہ ہندی انگریزی فرہنگ کو محیط اور یوں مجموعاً (۴۳۵) صفحوں پر مشتمل ہے۔ "پریم ساگر" کے نوّے
اب کی تلخیص اس کتاب کے آخر میں پیش کی جا رہی ہے جن کے موضوع کو کرشن بیتی کا نام دیا جا سکتا ہے۔

جیسا کہ فرہنگ کے صفحہ اوّل کے عکس سے ظاہر ہے اس کی ابتدا بھی ایک انگریزی نوٹ سے ہوتی ہے اور اس کی ترتیب قدیم
گریزی لغات کی طرز پر قائم ہے۔ یعنی ہر صفحے میں ابتداً پہلے کالم کا اوّلین اور دوسرے کالم کا آخری لفظ پیشانی پر درج ہے۔ پھر انگریزی
حروف ایس برائے سنسکرت اور ایچ برائے ہندی وغیرہ متعلقہ لفظ سے عین قبل بطور لسانی ماخذ لکھے ہیں۔ پھر دیوناگری میں ہندی
لفظ کا اور رومن میں اسی کے انگریزی ہجّا کا اندراج ہے۔ جس کے ساتھ ہی علاماتِ قواعد بھی ہیں۔ مثلاً این برائے NOUN اور ADJ
برائے ADJECTIVE اس کے بعد معنی اور تشریح ہے جو بہت کچھ مفیدِ مطلب ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ یہ ایک بسیط فرہنگ ہے۔
نہ صرف کتابِ ہذا سے استفادے کے خصوصی حوالے سے بلکہ اس کے معاصر ہندی ادب سے بھی اکتساب کے لیے یہ قارئین کو موجودہ اور
زمانے کی بھی اچھی سے اچھی ڈکشنری سے بے نیاز کرنے کے لیے بہت کافی ہے۔ اس فرہنگ میں ہر لفظ کے متعلقات اسی کے ذیل میں
درج ہیں نہ کہ علیحدہ لفظ کے بطور، جیسے انکوار کے ضمن میں انکوار بھرنا۔ نیز مزید معنوں کے لیے انگریزی میں دو اور تین کے ہندسے لگا کر
اضافی اندراجات کیے ہیں۔ اکثر الفاظ کی تشریح کے خاتمے پر کتاب میں اولین اندراج کا اشارہ تین اعداد دے کر اس طور کیا ہے۔
مثلاً ۱۴/۱۲۴: ۸ یعنی پہلے پیراگراف کی آٹھویں سطر۔

ایسٹ وِک پیش لفظ اور للولال کوی کا دیباچہ:

ایسٹ وِک کے پیش لفظ سے محصلہ معلومات کے مطابق زیرِ تذکرہ طباعت ۱۸۰۱ء کے بقول اس کے اوّلین و بہترین

---

³ اردو میں "مِسر" اور "مِسرا" کی یہی تحریر درست ہے ورنہ مصر سے التباس ہوتا ہے۔
⁴ بھاکھا بھی چلن ہے اس لیے بعینہٖ منقول ہے۔

ایڈیشن کی ضروری احتیاط کے ساتھ تیار کردہ اشاعت تھی جس میں ابواب کی انگریزی تلخیص اضافہ کی گئی جو طلبہ کے لیے فائدہ مند سمجھی گئی۔ خاتمۂ کتاب پر ایک بھرپور فرہنگ بھی شامل کی گئی جس سے قارئین کسی ہندی لغت سے بے نیاز ہو جائیں۔ اس میں ایسے متعدد الفاظ جمع کر دیے گئے جو تھامپسن کی تازہ ترین و بہترین ہندی لغت تک میں غیر موجود تھے۔ مزید یہ کہ متنی اشارات کو بیشتر تبدیل کر دیا گیا اور حسب ضرورت سوالیہ و استعجابیہ نشانات بڑھائے گئے۔ ٹائپ کی اغلاط کا بڑی حد تک ازالہ کر دیا گیا، تاہم چند در چند نقائص کی موجودگی کو قارئین کی جانب سے قابل معافی تصور کیا گیا۔ خاص کر اس صورت میں کہ گزشتہ اشاعتوں بالخصوص طبع ۱۸۳۱ء میں بارہ سو سے زائد غلطیاں در آئی تھیں۔

ایسٹ وِک نے اس کے بعد اس تاثر کا اظہار کیا کہ یہ ذہن نشین رکھتے ہوئے کہ ہندی ہندوستان کے سب سے بڑے علاقے کی زبان ہے اور متعدد مقامی بولیوں کے روپ میں بہار، اودھ، نیپال، بُندیل کھنڈ کی زرعی آبادیوں، نیز راجپوتانہ اور سندھ و پنجاب کے قابلِ لحاظ علاقوں میں بولی جاتی ہے۔ یہ نہیں کہا جا سکتا کہ اس کے مطالعے کی اہمیت کو (گویا خواہ مخواہ) بڑھا چڑھا کر دکھایا گیا ہو۔ حکومتِ بنگال نے شمال مغربی صوبوں کو جانے والے سرکاری عمّال کو قدرتاً یہ ہدایات جاری کیں کہ وہ ہندی کے امتحان میں کامیابی حاصل کریں۔ اور یہی استعداد زیادہ بڑے پیمانے پر افسرانِ فوج کے لیے بھی مطلوب رہنی چاہیے۔ اس صورتِ حال میں "پریم ساگر" کی تصحیح شدہ اشاعت ناگزیر تھی۔ کیونکہ یہ کتاب ہندی میں بمنزلہ اردو کی "باغ و بہار" کے ہے اور اسی لیے انتظامی و فوجی عملوں کے امتحانات کے نصاب میں یہ مقرّرہ ہے۔ بنا بریں ایسٹ وِک نے امید ظاہر کی کہ عزت مآب مجلسِ نظما (ایسٹ انڈیا کمپنی) کی سرپرستی میں اس نصابی کتاب کی فراہمی ممکن ہو سکے گی۔

افسوس کہ راقم کے ہاں محفوظ اس قدیمی جلد کے سابقہ مالکوں میں سے کسی نے اس کے چند اوراق کی کرم خوردگی کے نتیجے میں مقدمہ مترجم کے صفحہ دوم پر بھی اس ورق کی حفاظت کے خیال سے ایک دبیز کاغذ چسپاں کر دیا ہے اور اس طرح ایسٹ وِک کے پیش لفظ کا اگلا اور آخری حصّہ قابلِ مطالعہ و استفادہ نہیں رہا۔ تاہم اس میں کوئی شبہ نہیں کہ ہندی فرہنگ کے اضافے اور ابواب کے ملخّص انگریزی ترجمے، نیز محتاط انداز میں متن کی تصحیح کے ساتھ پیش کردہ یہ ایسٹ وِک ایڈیشن عین وہی ہے جسے صاحبِ "اربابِ نثرِ اردو" نے ایڈورڈ ایسٹ وِک کا ۱۸۶۷ء کا ترجمہ قرار دیا ہے۔

فاضل ہندی مترجم للّو لال جی کوی کے پیش لفظ پر بھی انگریزی نوٹ موجود ہے جس کا ترجمہ یہ ہے: "فورٹ ولیم کالج کے للّو لال جی کا پیش لفظ، جنھوں نے "پریم ساگر" کو برج بھاکھا سے ہندی میں ترجمہ کیا۔ بہ عہدِ گورنر جنرل مارکوئیس آف ویلزلی" للّو جی نے اپنے پیش لفظ کا آغاز "شری گنیش رائے نام" کے الفاظ اور ایک برج قطعہ سے کیا جس کے بعد چند سطروں کے آگے بھی ایک برج قطعہ تحریر کیا۔ للّو لال کوی نے اس پیش لفظ میں جو کچھ لکھا، اردو رسم الخط میں بعینہٖ منقول ہے: "ایک سمے بیاس دیو کی شر سیمد بھگوت کے دسویں کھنڈ کی کتھا کو چتر بھوج مِسر نے دوہے چوپای میں برج بھاشا کیا۔ سو پاٹھ شالا کے لیے شری مہاراج ادھیراج سکل گن نِدھان پُنیوان مہاجان مارکولیس ولیزلی گورنر جنرل پرتاپی کے راج میں اور شری یُت گن گاہک گنین سکھ دایک جان گل کرسٹ مہاشے کی آگیا سے ۱۸۱۰ء میں شری للّو لال جی کوی برہمن گجراتی سہس اودیچ آگرے والے نے وِسس کا سار لے یامنی بھاشا چھوڑ دلّی آگرے کی کھڑی بولی میں کہہ نام "پریم ساگر" دھرا۔ پر شری یُت جان گل کرسٹ مہاشے کے جانے سے بنا آدھا

بنا چھپا آدھا چھپا رہ گیا تھا۔ سو اب شری مہاراجیشور راتی دیال کرپال لیشسوی تیجسوی گلبرٹ لارڈ منٹو پرتاپ وان کے راج میں اور شری گنوان شکھ دان کرپا ندھان بھاگیہ وان کپتان جان ولیم ٹیلر کی آگیا سے اور شری گُن پرم سجان دیا ساگر پروپکاری ڈاکٹر ولیم ہنٹر کی سہایتا سے اور شری پنڈت پرا وین دیا یت لبش ابراہام لاکٹ رتیونت کے کہے سے اسی گدی نے ۱۸۱۱ء میں پورا کر چھپوایا۔ پاٹھ شالے کے ودیارتھیوں کے پڑھنے کے لیے۔" ظاہر ہے کہ مدرسے سے مراد فورٹ ولیم کالج ہی ہے۔

للوجی لال کوی کے ممدوحوں اور مربیوں کے من جملہ گل کرسٹ کی شخصیت فورٹ ولیم کالج کے جدید اردو محققین و ناقدین میں معروف اور مقبول ہے۔ البتہ خود زیر نظر ایڈیشن کے مصحح کے سوا دیگر صاحبان کے بارے میں ضروری تحقیقات پروفیسر سید محمد سے لے کر بعد کے ریسرچ اسکالروں اور مرتبین کتب کے ذریعے سامنے آئی ہے۔ سی۔ ای بک لینڈ کی لغت ہندوستانی سوانح حیات[۵] اور ان دیگر شخصیتوں پر مختصر مفید تذکروں کو جامع ہے۔

"پریم ساگر" پر مختصر معلومات اور تاثرات:

یہ ایک عجیب وغریب سا اتفاق ہے کہ "پریم ساگر" کے ایسٹ وک ایڈیشن ۱۸۶۷ء کا کوئی حال بلکہ حوالہ تک "ارباب نثر اردو" کے بعد تادم تحریر کہیں اور مذکور نہیں ہوا ہے۔ البتہ فورٹ ولیم کالج کے محققوں اور دوسرے مصنفین کے ہاں سے للولال جی کوی کے اس کارنامے پر کچھ مختصر مفید معلومات اور تاثرات منقول ذیل ہیں۔ جیسا کہ خود فاضل مترجم کا بیان ہے۔ "پریم ساگر" کا ترجمہ ۱۸۱۰ء میں مکمل ہوا لیکن پورا شائع نہیں ہوا، بلکہ ۱۸۱۱ء میں یہ کتاب طبع ہوئی۔ پروفیسر سید محمد نے اس کا طبع اول ۱۸۰۳ء کا جو قرار دیا ہے۔ بعد کی تحقیق سے معلوم یہ ہوا ہے کہ یہ دراصل اس کا ایک نامکمل ایڈیشن موسومہ "سری بھاگوت"[۶] مطبوعہ ۱۸۰۳ء رہا ہے۔ جس کے صرف ۱۵ باب تھے[۷]۔ مختلف محققین نے "پریم ساگر" کے جن متعدد ایڈیشنوں کا حوالہ دیا ہے اور جنھیں للوجی کے مطبوعات کے باب میں درج فہرست کر دیا گیا ہے۔ ان میں غیر مکمل ابتدائی اشاعتیں بھی شریک ہیں۔ یہ امر متفق علیہ ہے کہ گل کرسٹ نے کالج سے وابستہ ادبا کے جن کارناموں پر انعامات کے لیے فہرست مرتب کی تھی اس میں "پریم ساگر" کو بھی شامل کر کے للوجی کے لیے دو سو روپے کی سفارش کی تھی۔ کالج کے ایک رکن ولیم پرایس نے جس سے چند مولفات منسوب ہیں "پریم ساگر" کا ایک لغت بھی کھڑی بولی یا ہندوی اور انگریزی میں ترتیب دیا تھا جو ہندوستانی پریس سے ۱۸۱۴ء میں شائع ہوا[۸]

فورٹ ولیم کالج کی نیز معاصر ادبیات سے کئی تحقیقی و ناقدانہ تصانیف کے من جملہ نقوی[۹] اور ڈاکٹر نشاط انجم[۱۰] کی کتابوں میں

---

۵ BUCKLAND: "ڈکشنری آف انڈین بایوگرافی" طبع نو شائع کردہ سنگ میل، لاہور

۶ ڈاکٹر سمیع اللہ: "فورٹ ولیم کالج — ایک مطالعہ" مطبوعہ مصنف سلطان پور ۱۹۹۰ء ص: ۸۶ ۔

۷ ڈاکٹر عبیدہ بیگم: "فورٹ ولیم کالج کی ادبی خدمات" نصرت پبلشرز لکھنؤ ۱۹۸۳ء ص: ۷۷۴ ۔

۸ ایضاً ص: ۶۲۶ ۔

۹ جمیل نقوی: "اردو نثر کا ارتقا: چودھویں صدی سے فورٹ ولیم کالج تک" مشمولہ "تنقید و تفہیم" مطبوعہ مصنف کراچی ۱۹۸۴ء۔

۱۰ ڈاکٹر نشاط انجم: "ادبی نثر کا ارتقا: شمالی ہند میں ۱۸۰۰ء سے ۱۸۵۷ء تک" مکتبۂ جامعہ دہلی ۱۹۸۵ء

سرے سے للولال جی کو زیب عنوان ہی نہیں کیا گیا ہے۔ جب کہ وقار عظیم[11] اور ڈاکٹر جاوید نہال[12] نے "پریم ساگر" پر کوئی اظہار رائے نہیں کیا ہے۔ ہندی شعر و ادب کی اپنی مختصر و مفید تواریخ میں علامہ نیاز فتح پوری[13] اور پروفیسر حبیب اللہ غضنفر[14] نے اجمالی تاثر تحریر کیا ہے جس سے عیاں ہے کہ دونوں افاضل ہندی ادبیات میں للولال جی کی خدمات اور ان کے اس کارنامے کے معترف تھے۔ ڈاکٹر عبیدہ بیگم اور ڈاکٹر سمیع اللہ نے اپنی رائیں پروفیسر سید محمد کی طرح براہ راست اس ترجمے پر بھی دی ہیں جو ان کے اپنے الفاظ میں پیش ہیں۔

ڈاکٹر عبیدہ بیگم نے "پریم ساگر" کی مناسب تحسین کرتے ہوئے خیال ظاہر کیا ہے کہ "پریم ساگر" میں للوجی نے آگرہ اور دہلی کی کھڑی بولی استعمال کی ہے۔ چنانچہ "پریم ساگر" میں کھڑی بولی کے بے حد رواں اور شگفتہ نمونے نظر آتے ہیں۔ زبان آسان ہے اور موضوع سے مطابقت رکھتی ہے۔ للوجی کے انداز تحریر نے "پریم ساگر" کے بیانات کو بے حد عمدہ اور نظم کی سی دل کشی عطا کی ہے۔ ہندی کے آسان الفاظ طبع لطیف پر گراں نہیں گزرتے۔ درمیان میں دوہے اور چوپائیاں بھی شامل ہیں" (ص: ۷۷۴)

ڈاکٹر سمیع اللہ نے "پریم ساگر" کے حوالے سے للولال کوی کی ہندی نثر پر عمومی رائے دی ہے: "جدید ہندی نثر کی ترقی میں للولال کی ہندی کتابیں سنگ میل کی حیثیت رکھتی ہیں۔ فورٹ ولیم کالج سے پہلے ہندی نثر کی کوئی قابل قدر تصنیف موجود نہیں تھی انھوں نے سب سے پہلے "پریم ساگر"، اور دوسری کئی کتابیں تصنیف کر کے ہندی نثر کے اعلیٰ اور وقیع نمونے پیش کیے جو بعد کے ہندی مصنفین کے لیے مشعل راہ ثابت ہوئے" (ص: ۱۵۱) موصوف نے للوجی کے ایک ممدوح اور شعبۂ ہندوستانی کے پروفیسر کپتان جان ولیم ٹیلر کا یہ تاثر بھی روایت کیا ہے کہ "ٹیلر نے ان کے کارناموں کی بڑی تعریف کی ہے اور لکھا ہے کہ خالص ہندی نثر لکھنے والوں میں للولال سے قابل کوئی دوسرا شخص نہیں" (ایضاً)۔

"پریم ساگر" اردو نثر اور نظم میں:

"پریم ساگر" کی اردو میں منتقلی کا عمل خود للولال جی کوی کے اردو ترجمے کے اردو قالب سے ہوتا ہے جس کی دو مختلف صورتوں کے حوالے چند اسکالروں کے ہاں ملتے ہیں۔ پروفیسر جاوید نہال کے یہ الفاظ اہم ہیں کہ "للوجی کی کتب کے من جملہ لطائف ہندی و دیا درپن اور پریم ساگر دیوناگری لپی کے علاوہ فارسی رسم الخط میں شائع ہوئی تھیں۔ دونوں لپیوں کی زبان ایک ہے لپیوں کے علاوہ عبارت میں معمولی فرق بھی ہے" (ص: ۱۷) افسوس یہ ہے کہ اس قدر قیمتی انکشاف کے دیگر ذرائع سے تصدیق نہیں ہوتی ہے۔ جب کہ ڈاکٹر عبیدہ بیگم نے صرف یہ کہنے پر اکتفا کیا ہے کہ "پریم ساگر ناگری اور فارسی دونوں رسم الخط میں شائع ہوتی رہی" (ص: ۷۷۴)۔ ظاہر ہے کہ ان دونوں روایات میں متعلقہ تفصیل کا فقدان ایک تکلیف دہ امر ہے۔ جدید

---

[11] سید وقار عظیم: "فورٹ ولیم کالج: تحریک اور تاریخ" یونیورسل بک، لاہور۔ طبع دوم ۱۹۸۸ء ص: ۱۳۳ تا ۱۳۵

[12] ڈاکٹر جاوید نہال: "بنگال کا اردو ادب: انیسویں صدی میں" عثمانیہ بک ڈپو کلکتہ ۱۹۸۴ء ص: ۱۶۹ تا ۱۷۳

[13] نیاز فتح پوری: "ہندی شاعری کی تاریخ" مشمولہ "نگار" "ہندی شاعری نمبر" کراچی ۱۹۸۴ء ص: ۳۹

[14] حبیب اللہ غضنفر: "ہندی ادب" (مصنفہ ۱۹۵۵ء) غضنفر اکیڈمی کراچی۔ طبع دوم ۱۹۸۸ء ص: ۸۹

اردو ڈراما کے ایک ممتاز فرد ابراہیم یوسف مرحوم کے زیرِ ملاحظہ اور ڈاکٹر عبیدہ بیگم کے زیرِ استفادہ ایک اور قالب کا بھی علم ہوتا ہے جو اغلب ہے کہ ایک ہی مترجم کے دو علاحدہ ایڈیشنوں کا رہا ہے۔ اس ترجمے کی بھی کوئی تفصیل دونوں نے تحریر نہیں کی ہے۔ البتہ دو الگ الگ مواقع سے چند سطور دونوں نے اقتباس کی ہیں۔

ابراہیم یوسف کے مطابق ان کا زیرِ حوالہ ترجمہ لالہ سوامی دیال کا کیا ہوا ہے اور ۱۹۰۱ء میں نول کشور کا شائع کردہ طبع ہشتم ہے۔ بقول مرحوم فاضل "میرے کتب خانے میں جو نسخہ ہے اس کا رسم خط اردو مگر زبان برج بھاشا ہے"[15] جس سے انھوں نے دو اقتباسات ص۲۲ نیز ص۲۸-۲۹ پر دیے ہیں۔ ڈاکٹر عبیدہ بیگم نے نول کشور کے ہی ۱۹۳۰ء میں شائع کردہ للولال جی کے "پریم ساگر" کے اردو ترجمے کا حوالہ مترجم کی صراحت کے بغیر بصفحہ ۴۹۸ دیا ہے اور غالب امکان یہی ہے کہ یہ ابراہیم یوسف کے مذکورہ ترجمے کی متعاقب طباعت رہی ہے۔ صاحبۂ موصوفہ نے "پریم ساگر" کے بیان میں للوجی لال کے دیباچے اور متن کی جو سطور بصفحات ۵، ۷۴ تا ۷۷ نقل کی ہیں۔ ان سے عیاں ہے کہ ابراہیم یوسف کے تاثر کے عین مطابق "اس کا رسم خط اردو مگر زبان برج بھاشا ہے" اس طرح نول کشور کے طبع کردہ اور لالہ سوامی دیال کے "مترجمہ" اردو "پریم ساگر" کے متن کا صرف خطی پیکر اردو ہے۔ اور تحریری قالب کے سوا للولال کوی کی کاوش میں کوئی متنی تبدیلی روا نہیں رکھی گئی ہے۔ مذکورہ افاضل کے ہاں اس اردو "پریم ساگر" کی جو سطریں اقتباس ہوئیں ان کا اعادہ وجہ طوالت ہوگا۔

للولال جی کے بھاشا سے ماخوذ اس ہندی ترجمے کے نصف صدی سے زائد بعد اصل متن سے ہی مترجمہ مستفاد منظوم "پریم ساگر" کی تخلیق کا پتا چلتا ہے۔ منظوم اردو "رامائن" کے خالق اور اپنے وقت کے مشہور نظم نگار منشی دیاشنکر فرحت نے بھاشا سے ہی "مثنوی پریم ساگر" ۱۲۸۰ھ مطابق ۱۸۶۲ء میں تصنیف کی۔ پروفیسر مسعود حسن رضوی نے اپنے ذاتی کتب خانے میں محفوظ مجلد سے اس کا احوال منشی خادم حسین افسوس کے مصنفہ ایک ناٹک کے تعارف کے دوران ضمناً تحریر کیا ہے[16]۔ لیکن "مثنوی پریم ساگر" کا اپنا متن اقتباس نہیں کیا ہے۔ پیشِ نگہ اطلاعات کی رو سے دیاشنکر فرحت کے اس منظومہ "پریم ساگر" کے آخر میں ایک اور نظم نگار رائے ہر پرشاد شاد کا "بارہ ماسہ" بھی درج ہے۔ منظوم اردو "پریم ساگر" کے اس ایڈیشن کے شروع میں منشی خادم حسین افسوس کی "تاریخ تصنیف مثنوی پریم ساگر مصنفہ دیاشنکر فرحت" نیز اخیر میں بھی افسوس کی ہی "نثر خاتمۂ کتاب" شامل ہے۔ افسوس یہ ہے کہ تا حال اس منظومہ "پریم ساگر" کے بارے میں کوئی اور معلومات دسترس میں نہیں آسکی ہیں۔

ممکن ہے اردو نظم و نثر میں للولال جی کوی اس ہندی "پریم ساگر" یا اس کی اصل پر مبنی و مشتمل کوئی اور کتاب گزشتہ زمانے میں تیار ہوئی ہو جس کا کوئی علم تا دم تحریر نہیں ہو سکا ہے۔

---

[15] ابراہیم یوسف: "اندرسبھا اور اندرسبھائیں" نسیم بک ڈپو لکھنؤ ۱۹۸۰ء حاشیہ ص: ۲۹

[16] سید مسعود حسن رضوی ادیب: "ناٹک بزم سلیمان" مندرجہ نقوش ۱۱۲ اگست ۱۹۶۹ء ص: ۵۰ اور ۵۱ و ۵۲

یو بی ایل
عالمگیر خدمات اور اعلیٰ کارکردگی
INDIAN OCEAN
یو بی ایل
یونائیٹڈ بینک لمیٹڈ
— ترقی ہمارا شعار
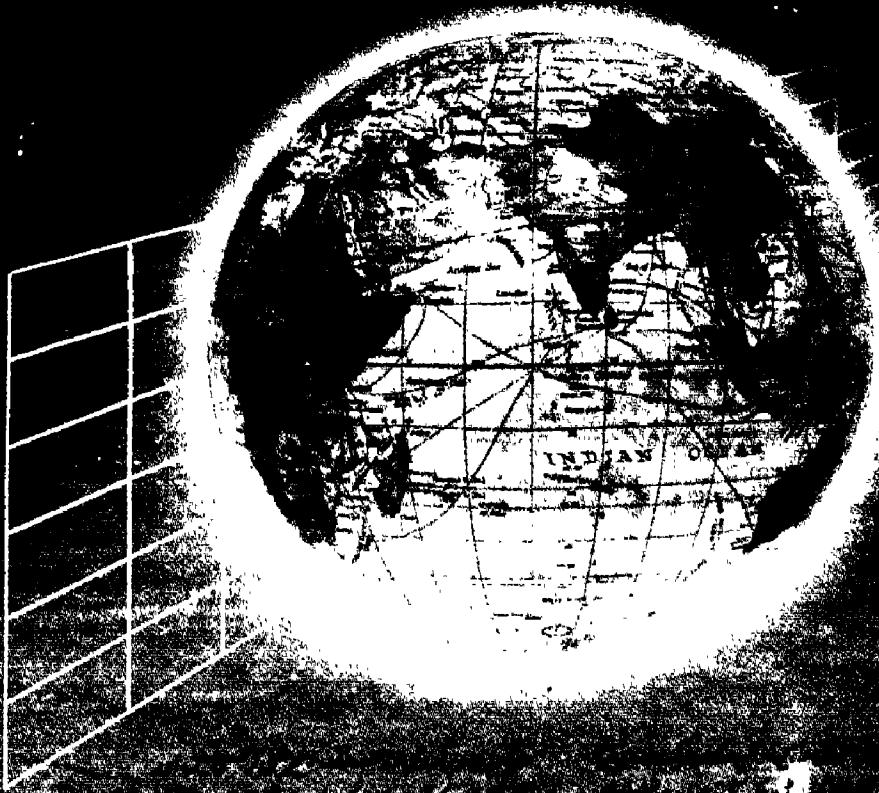
ثروت صولت

فوزیہ عبداللہ تنسل

ترکی میں جن خواتین نے علم و ادب کے میدان میں اہم خدمات انجام دی ہیں ان میں سے ہم صرف خالدہ ادیب خانم[1] کے نام سے واقف ہیں۔ حالانکہ جدید ترکی میں اہلِ قلم ترک خواتین کی کمی نہیں اور ان میں سے کئی ایسی ہیں جو ادبی تاریخ میں اپنا مستقل مقام بنا چکی ہیں لیکن ہم اہلِ پاکستان کے لیے زبانِ یارِ من ترکی و من ترکی نمی دانم کا معاملہ ہے یہی وجہ ہے کہ شاعر کفِ افسوس ملتے ہوئے کہتا ہے۔ "چہ خوش بودے اگر بودے زبانش در دہانِ من" ایسی ہی نامور ترک خواتین میں سے ایک فوزیہ عبداللہ تنسل (TANSEL) ہیں جن کا دو سال قبل انتقال ہوا ہے۔

فوزیہ عبداللہ ۲۳ر فروری ۱۹۱۲ء کو جمعہ کے دن مشرقی ترکی کے قصبے "موش" میں پیدا ہوئی تھیں۔ ان کے والد کا نام عبداللہ خلوصی اور والدہ کا نام سارہ خانم تھا[2]۔ وہ کل پانچ بہنیں تھیں علمیہ، شاذیہ، ذکیہ اور فوزیہ۔ فوزیہ ان میں سب سے چھوٹی تھیں۔ بھائی کوئی نہیں تھا۔ ابھی وہ دس برس کی بھی نہیں تھیں کہ ان کے والد کا ۲۲ر مارچ ۱۹۲۱ء کو انتقال ہوگیا۔ والدہ تین سال پہلے ہی ۱۹۱۸ء میں اللہ کو پیاری ہو گئی تھیں۔

والدہ کے انتقال کے بعد وہ اپنی بہنوں کے ساتھ استنبول آگئیں۔ یہاں انھوں نے لڑکیوں کے کالج میں ۱۹۳۱ء میں تعلیم مکمل کی۔ اس کے بعد استنبول یونیورسٹی کے شعبۂ ادبیات میں داخلہ لیا۔ یہاں ان کا خاص موضوع تاریخ، ترکی ادب اور لسانیات تھا۔ یونیورسٹی ہی میں انھوں نے فارسی زبان کی تحصیل کی۔ اسی دوران انھوں نے معلموں کے اعلیٰ مدرسے میں انگریزی زبان کی اور فنِ تدریس کی تعلیم حاصل کی اور اس طرح ۱۹۳۵ء میں اپنی تعلیم مکمل کرلی۔ اس وقت ان کی عمر ۲۳ سال کی تھی۔

تعلیم مکمل کرنے کے ساتھ ان کو ۳۱ر جنوری ۱۹۳۵ء کو شہر قونیہ کے مدرسۂ معلمات میں ملازمت مل گئی۔

---

[1] خالدہ ادیب خانم کے مفصل حالات کے لیے جو خالص ترکی ماخذ کی مدد سے لکھے گئے ہیں' ملاحظہ کیجیے راقم الحروف کی کتاب "ترکی اور ترک" جلد اوّل۔ [2] فوزیہ کے والد قاضی' اور نانا مفتی تھے۔

۲۵ اکتوبر ۱۹۳۶ء کو ان کا تقرر انقرہ کے اتاترک کالج میں ہوگیا۔ اس کالج میں فوزیہ عبداللہ نے مسلسل ۲۰ سال تک تعلیم دی۔ وہ پہلی ترک خاتون ہیں جنھوں نے ترکی کے کالجوں میں کمپوزیشن کی تعلیم کو ایک نظام کے تحت منظم کیا۔ انقرہ کے اس کالج میں ملازمت کے دوران ممتاز ترک محقق فواد کوپرولو[۳] نے ماہنامہ "اُلکو" (ÜLKÜ) کی ادارت فوزیہ عبداللہ کے سپرد کر دی۔ ماہنامہ "خلق ایولری[۴]" کی طرف سے فواد کوپرولو کی نگرانی میں شائع ہوتا تھا۔ چنانچہ ۱۹۳۶ء سے ۱۹۴۱ء تک اس ماہنامے کے ۵۶ شمارے یعنی شمارہ ۴۴ سے شمارہ ایک سو تک فوزیہ عبداللہ کی ادارت میں نکلے اور یہی مدت رسالے کا سب سے اہم دَور سمجھی جاتی ہے۔

۳۰ جون ۱۹۵۶ء کو فوزیہ عبداللہ کو تعلیم و تربیت کے محکمے میں لے لیا گیا لیکن محکمہ کو ترقی دینے سے متعلق ان کی شرائط تسلیم نہ ہونے کی وجہ سے انھوں نے یہ ملازمت پسند نہیں کی اور اتاترک کالج میں واپس آ گئیں۔

۱۹۶۰ء تا ۱۹۶۱ء کے تعلیمی سال میں فوزیہ کو ترکی کے مہمان معاون پروفیسر کی حیثیت سے کولمبیا یونیورسٹی نیویارک نے دعوت دی۔ کولمبیا یونیورسٹی میں انھوں نے یونیورسٹی کے مشرقِ قریب اور مشرقِ وسطیٰ کی زبانوں اور کلچر کے انسٹی ٹیوٹ میں ترکی زبان اور کلچر پر لیکچر دیے۔ وہ ہفتے میں چار گھنٹے جدید ترکی ادب، جدید اور قدیم ترکی رسم الخط کے موضوع پر لیکچر دیتی تھیں۔

اتاترک کالج کی ملازمت کے بعد فوزیہ عبداللہ نے ۱۹۶۳ء سے ۱۹۶۴ء تک غازی تربیتی انسٹی ٹیوٹ کے ترکی ادب کے شعبے میں تدریس کے فرائض انجام دیے۔ ۱۹۶۴ء میں انقرہ یونیورسٹی کی الٰہیات فیکلٹی میں ان کو "ترکی اسلامی ادب" کی معلمہ مقرر کیا گیا۔ اور اسی حیثیت سے وہ ۱۹۷۳ء میں پنشن پر ریٹائر ہوئیں۔

اس دوران میں فوزیہ عبداللہ نے کئی اہم علمی اداروں میں تحقیقی کام انجام دیا۔ ان اداروں میں ترکی کی انجمن تاریخ، ترکی کی لسانی انجمن اور ترکی کلچر کے تحقیقاتی ادارے کے نام قابلِ ذکر ہیں۔ اس سلسلے میں انھوں نے لیکچر بھی دیے اور مقالے اور کتابیں بھی لکھیں۔

فوزیہ ترکی کی انجمن مصنفین کی رکن بھی تھیں۔ انھوں نے انجمن کے زیرِ اہتمام محمد عاکف سیمینار میں شرکت کی اور عاکف پر ایک تحقیقی مقالہ پڑھا۔ ان کی ان علمی و ادبی خدمات کے صلے میں ۱۹۸۵ء میں ان کو اس سال کی بہترین مصنفہ قرار دیا گیا۔

---

[۳] فواد کوپرولو (۱۸۹۰ـ۱۹۶۶ء) کے مفصّل حالات کے لیے ملاحظہ کیجیے راقم الحروف کی کتاب "ترکی اور ترک" جلد اوّل۔ شائع کردہ اسلامی پبلی کیشنز، لاہور۔ [۴] خلق ایولری (عوامی گھر) ایک طرح کے کلب تھے جن کو ۱۹۳۱ء میں خلق جمہوریت پارٹی نے اس لیے قائم کیا تھا کہ ان کے ذریعے مصطفیٰ کمال کے چھ اصولوں کے تحت عوام میں ترکی قومیت کا شعور پیدا کیا جائے اور ان کے مسائل عوامی سطح پر حل کیے جائیں۔ کتب خانے قائم کرنا، رسائل نکالنا اور کتابیں شائع کرنا بھی اس کے پروگرام میں شامل تھا۔ یہ کلب ۱۹۵۱ء میں بند کر دیے گئے۔

فوزیہ عبداللہ نے ۴ر اگست ۱۹۸۸ء کو جمعرات کے دن جگر کے سرطان کے عارضہ میں وفات پائی اور ۵ر اگست کو ہفتے کے دن نماز ظہر کے بعد ان کو انقرہ کے جے بے جی (JEBEJI) عصری قبرستان میں سپرد خاک کردیا یا۔ ان کی نماز جنازہ شہر کی مشہور تاریخی مسجد جامع حاجی بیرم میں ادا کی گئی۔ انھوں نے ساری عمر شادی نہیں کی۔ روہ اپنے والد کی نسبت سے فوزیہ عبداللہ کہلائیں۔ تنسل (TANSEL) خاندانی نام ہے جس کا اختیار کرنا ا ہونا لازمی ہے۔

فوزیہ عبداللہ نے خود کو ترکی زبان اور ادب سے متعلق تحقیقی کاموں کے لیے وقف کر دیا تھا۔ ایک معلمہ ا حیثیت سے انھوں نے طلبہ کی تربیت اور ایک مصنف کی حیثیت سے انھوں نے کتابیں اور بے شمار تحقیقی مقالے ہ کر ترکی ادب میں قیمتی اضافے کیے۔ ان کا پہلا مضمون ۱۶ر اکتوبر ۱۹۲۹ء کو قصبہ بالیکسر کے اخبار "تورک دیلی" (ترکی بان) میں شائع ہوا تھا۔ اس کے بعد وہ ۵۸ سال نو ماہ تک مسلسل لکھتی رہیں یہاں تک کہ ان کو موت نے آلیا۔ ان کے ضامین ترکی کے بیشتر علمی وادبی رسالوں میں شائع ہوتے تھے۔ رسالوں کے علاوہ ترکی زبان کی اسلامی انسائیکلوپیڈیا ور ترکی انسائیکلوپیڈیا (تورک انسی کلوپیدیسی) میں ان کے بہ کثرت مقالے شامل ہیں۔ فوزیہ عبداللہ نے ترکی کے ہ اہم کتب خانوں کو کھنگال دیا تھا اور ان سے انھوں نے تلاش و تحقیق کے سلسلے میں جس طرح استفادہ کیا اس سے متعلق ۱۹۷۷ء میں ایک بیلیوگرافی شائع کی گئی تھی جو ان کے آخری تیرہ سال کی خدمات پر روشنی ڈالتی ہے۔

ترکی میں جدید علمی طریقے پر تحقیق کی بنیاد ممتاز دانشوروں اور سیاسی رہنما فواد کوپرولو نے ڈالی تھی جس کی وجہ سے ان کو "بابائے ترکیات" کہا جاتا ہے۔ انھوں نے اس مقصد کے تحت بکثرت طلبہ کی تربیت کی جن میں سے کئی بعد میں بلند پایہ محقق کی حیثیت سے ابھرے۔ فوزیہ عبداللہ بھی ان میں سے ایک تھیں۔ ان کی تحقیقی کاوش کا ایک ترک مصنف نے اس طرح ذکر کیا ہے کہ "فوزیہ ایک ایسی محنت کش خاتون تھیں جو سوئی سے کنواں کھودتی تھیں۔ ان کو نام و نمود کی پروا نہیں تھی اور جس طرح ریشم کا کیڑا خاموشی سے کویا تیار کرتا ہے۔ وہ ساری عمر اسی انداز میں کام کرتی رہیں۔"

نامق کمال، ضیا گوک الپ، شناسی، محمد عاکف اور محمد امین جدید ترکی ادب کی ایسی شخصیتیں تھیں جن کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ ترک قوم ان کی ہمیشہ زیر بار احسان رہے گی۔ فوزیہ عبداللہ نے ان کی مطبوعہ اور غیر مطبوعہ ایسی تحریروں کو جو اب تک کتابی شکل میں جمع نہیں ہوئی تھیں۔ تنقید اور تحقیق کے جدید اصولوں کے تحت یکجا کر دیا اور ایک ترک ادیب کے الفاظ میں اس طرح ان ترک بزرگوں کا جو قرض قوم کے ذمّے تھا، فوزیہ عبداللہ کی طرف سے ادا ہوا۔

۱۹۲۸ء میں ترکی رسم الخط کو عربی سے لاطینی حروف میں بدل دینے کے بعد ترکی میں ایک علمی بحران پیدا ہو گیا تھا۔ اب کتابیں عربی رسم الخط میں شائع نہیں ہو سکتی تھیں اور رفتہ رفتہ وہ نسل ناپید ہو گئی جو عربی رسم الخط پڑھ سکتی تھی۔

---

۵ نامق کمال (۱۸۴۰ — ۱۸۸۸ء) ضیا گوک الپ (۱۸۷۶ — ۱۹۲۴ء) اور عاکف (۱۸۷۳ — ۱۹۳۶ء) کے مفصّل حالات کے لیے ملاحظہ کیجیے راقم الحروف کی کتاب "ترکی اور ترک" جلد اوّل۔

اس کے علاوہ ترکی زبان کو خالص ترکی بنانے کے سلسلے میں عربی اور فارسی الفاظ اس کثرت سے نکالے اور اس کی جگہ نئے الفاظ اور اصطلاحیں وضع کی گئیں کہ پرانے مصنفین کی کتابوں کو اگر لاطینی حروف میں شائع بھی کر دیا جاتا تو نئی نسل ان کو سمجھ نہیں سکتی تھی۔ اس کا اندازہ یوں کیا جا سکتا ہے کہ مصطفےٰ کمال کا مشہور عالم خطبہ جس میں انھوں نے سلطنت کے خاتمہ اور جمہوریت کے قیام کا اعلان کیا تھا اور جسے ترک "نیوق نطق" یعنی عظیم تقریر کہتے ہیں۔ اس کو اب ترکی کی موجودہ نسل کے بڑے بڑے مصنف تک سمجھ نہیں سکتے۔ قارئین اس پس منظر میں ان مشکلات کا اندازہ لگا سکتے ہیں جو ترک مشاہیر کی تحریروں کو یکجا کرنے، نئے رسم الخط میں منتقل کرنے اور ان کو قابلِ فہم بنانے کے سلسلے میں فوزیہ عبداللہ کو اٹھانی پڑی ہوں گی۔

مقالوں کو چھوڑ کر فوزیہ عبداللہ کی مرتب کردہ کتابوں کی تعداد ایک ہی کتاب کی مختلف جلدوں کو شامل کرنے کے بعد، بیس ہے جن کی تفصیل حسب ذیل ہے۔ کتاب کے آگے جو سال دیا گیا ہے وہ پہلی اشاعت کا ہے۔

۱۔ ضیا گوک الپ کی کلیات جلد اوّل (۱۹۵۲ء) میں ضیا گوک الپ کے تمام اشعار اور عوامی کہانیاں یکجا کر دی گئی ہیں۔ ۲۔ ضیا گوک الپ کی کلیات: جلد دوم (۱۹۶۵ء) میں ان کے ملّی اور مالٹا سے لکھے ہوئے خطوط یکجا کیے گئے ہیں۔ ۳۔ شناسی کے مقالات (۱۹۶۰ء)۔ ۴۔ شاعر کی شادی (۱۹۶۰ء) یہ شناسی کا ایک ڈرامہ تھا جو ترکی زبان کا پہلا ڈرامہ تصور کیا جاتا ہے۔ ۵۔ نامق کمال کے خصوصی مکتوبات: جلد اوّل (۱۹۶۲ء) استنبول، یورپ اور قبرص سے لکھے جانے والے خطوط۔ ۶۔ نامق کے خصوصی مکتوبات جلد دوم (۱۹۶۹ء) استنبول اور جزیرہ مدلّی سے لکھے جانے والے خطوط۔ ۷۔ نامق کمال کے خصوصی مکتوبات: جلد سوم (۱۹۷۳ء) صرف مدلّی سے لکھے جانے والے خطوط۔ ۸۔ نامق کمال کے خصوصی مکتوبات جلد چہارم (۱۹۸۶ء) جزیرہ ساقز اور جزیرہ رہوڈس سے لکھے جانے والے خطوط۔ ۹۔ محمد امین کا منظوم کلام: جلد اوّل (۱۹۶۹ء)۔ محمد امین (۱۸۶۹۔۱۹۴۴ء) جن کا خاندانی نام یوردا کل (YURDAKUL) ہے، ترکی کے قومی شاعر سمجھے جاتے ہیں۔ ان کی رجزیہ نظموں کا جواب نہیں۔ انھوں نے ہی سب سے پہلے ۱۸۹۷ء میں یونان سے جنگ کے دوران اپنی وہ مشہور نظم لکھی تھی جس میں کہا گیا ہے کہ "میں ایک ترک ہوں اور میرا دین اور میری قوم اعلیٰ اور ارفع ہے۔"

۱۰۔ عمر سیف الدین کا مجموعۂ کلام (۱۹۷۲ء): عمر سیف الدین (۱۸۸۴ء۔۱۹۲۰ء) جدید ترکی افسانہ نگاری کے بانیوں میں سے ہیں۔ جو کام محمد امین نے ترکی قوم پرستی کے فروغ کے لیے شاعری سے لیا وہی عمر سیف الدین نے افسانوں سے لیا۔ ۱۱۔ محمد عاکف، حیات اور تصانیف (۱۹۴۵ء) عاکف (۱۸۷۳۔۱۹۳۶ء) ترکی کے اقبال ہیں۔ اور شاعر اسلام کی حیثیت سے شہرت حاصل کی۔ یہ کتاب ان کی بہترین اور جدید ترین سوانح عمریوں میں شمار کی جاتی ہے۔ ۱۲۔ ترک اسلام ادبیاتی (۱۹۶۷ء) قدیم ترکی کے ان ادبی شہ پاروں کو جو دینی نوعیت کے ہیں، یکجا کیا گیا ہے۔ ۱۳۔ جنگِ آزادی میں حصہ لینے والی مجاہد خواتین (۱۹۸۸ء) ۱۴۔ دینی اشعار: جلد اوّل میں بچوں سے متعلق نظمیں جمع کی گئی ہیں، جلد دوم میں تنظیمات کے دور (انیسویں صدی کا نصف آخر) کے دینی اشعار جمع کیے گئے ہیں اور جلد سوم میں ثروت فنون اور جدید دور کے اشعار جمع کیے گئے ہیں۔ موجودہ صدی کا پہلا عشرہ ترکی ادب کی

اریخ میں ثروت فنوں کا دور کہا جاتا ہے۔ اس دور میں ترکی ادب پر ایک طرف فرانسیسی افکار کا غلبہ تھا تو دوسری
رف ایسی مرصع اور مسجع تحریر لکھنے کا رواج تھا جس میں عربی اور فارسی الفاظ اور محاوروں کی بھرمار ہوتی تھی ۔ ۱۵ ۔
ذکورہ بالا کتابوں کے علاوہ اچھی اور صحیح زبان لکھنے کے اصولوں سے متعلق فوزیہ عبداللہ نے تین کتابیں لکھیں ۔ ان میں
ہلی کتاب (۱۹۴۹ء) میں اچھی تحریروں کے نمونے بھی دیے ہیں۔ دوسری (۱۹۶۲ء) تیسری (۱۹۶۳ء) جلدیں کمپوزیشن
صلاح اور رہنما کتاب کی حیثیت رکھتی ہیں۔ ۱۶ ۔ دویوشلر (DUYUSHLAR) ۱۹۳۵ء ۔ فوزیہ عبداللہ کبھی کبھی
شعر بھی کہتی تھیں ۔ دویوشلر (احساسات) ان کے اشعار کا مجموعہ ہے۔

یہ ہے مختصر تذکرہ ایک ایسی ترک خاتون کا جو یتیم اور لیسیر تھی لیکن جس نے تن تنہا وہ کارنامے انجام دیے
جو ادارے انجام دیتے ہیں۔

غزل نما

تعارف و انتخابِ کلام

ادا جعفری

مہاراجہ چندو لعل شاداں

نام راجہ چندو لعل۔ تخلص شاداں

پیدائش ۱۱۷۵ھ ۔ وفات ۱۲۶۱ھ

راجہ چندو لعل کے مورثِ اعلیٰ راجہ ٹوڈرمل تھے۔ شہنشاہ اکبر کی وفات کے بعد بھی راجہ ٹوڈرمل کے خاندان کے افراد شاہانِ دہلی کی خدمت سے وابستہ رہے۔

راجہ چندو لعل سورج بنسی کھتری تھے۔ باپ کا نام رائے نرائن تھا۔ چندو لعل کی عمر دس سال تھی جب والد کا انتقال ہوا۔ ان کی پرورش ان کے چچا رائے نانک رائے نے اپنے بچوں کی طرح کی اور ان کی تعلیم و تربیت کا انتظام بہت شفقت سے جاری رکھا۔ رائے نانک رائے کے انتقال کے بعد ان کے خاندان کا حال ابتر ہو گیا تو چندو لعل نے نواب شمشیر جنگ کی ملازمت اختیار کی۔ بعد میں بخشی بیگم کی توجہ سے سرکار دربار میں اعلیٰ عہدے حاصل کیے اور راجہ بہادر کا خطاب ملا۔ کچھ عرصے بعد ہفت ہزاری کے منصب پر فائز ہوئے۔ نواب سکندر جاہ نے ان کو مہاراجہ کا خطاب دیا۔ نواب کی رحلت کے بعد ان کے جانشین نواب ناصرالدولہ کے زمانے میں مہاراجہ چندو لعل کو وزارتِ عظمیٰ کا عہدہ ملا ۱۲۶۰ھ میں وہ ملازمت سے سبکدوش ہوئے اور ۱۲۶۱ھ میں ان کا انتقال ہوا۔

مہاراجہ چندو لعل نہ صرف ایک اعلیٰ خاندان کے رکن رکین تھے اور اعلیٰ عہدے پر فائز رہے بلکہ اپنے حسن اخلاق، حلم اور بے نظیر فیاضی کی وجہ سے بھی بہت مشہور و عزیز شخصیت تھے۔

چندو لعل اعلیٰ درجے کے انشا پرداز اور عالم تھے۔ اور علما و فضلا کی قدر دانی بھی کرتے تھے۔ وہ مشرقی اخلاق و مروّت کا ایک نمونہ تھے۔ انھوں نے اپنی دولت کا کثیر حصّہ اہلِ کمال کی قدر دانی میں صرف کیا۔ ان سے فیض پانے والوں اور حلقۂ احباب میں میر مفتون اور شاہ نصیر دہلوی بھی شامل ہیں۔

صوفی مشرب تھے۔ ان کی طبیعت پر تصوّف کا جو گہرا رنگ تھا اس کا اندازہ ان کے اشعار سے ہوتا ہے۔
ان کی حاجت روائی اور فیاضی کا اندازہ ان کے بچپن کے ایک عمل سے لگایا جا سکتا ہے۔ جب ان کے والد کا انتقال ہ

تو ان کے چچا رائے نانک رائے جو اُن کے مربّی تھے ان کو اور اپنے بیٹے کو ایک ایک روپیہ ماہانہ جیب خرچ دیتے تھے چند دن یہ روپیہ ہمیشہ فقرا اور حاجت مندوں میں تقسیم کر دیتے۔ سخاوت کا یہ انداز تمام عمر جاری رہا۔ ان کی ترقی اور نیک نامی کی اصل وجہ ان کی سخاوت ہی تھی جس نے انھیں ہر دل عزیز بنا دیا تھا اور عالی مرتبے تک پہنچایا۔

ان کی شاعری ان کے خیالات و جذبات کا اظہار ہے۔ شعری محاسن سے انھوں نے غرض نہیں رکھی۔ انھیں صرف اپنی بات دوسروں تک پہنچانا مقصود تھا۔ ان کے اشعار میں سادگی ہے۔ بے ساختگی کا حسن بھی مل جاتا ہے۔ اور ان اشعار میں تصوّف کے رنگ کے علاوہ اخلاقی مضامین بھی ملتے ہیں

یہ انتخاب کلیاتِ شاداں۔ دیوانِ اوّل و دیوانِ دوم، مرتبہ مہاراجہ سرکشن پرشاد شاد (مطبوعہ محبوب پریس حیدرآباد دکن) سے کیا گیا ہے۔

انتخابِ کلام

خالق نے کیا احمدؐ و حیدرؓ کو شہنشاہ ۔۔۔ ہر ایک ہے سرتاج عرب اور عجم کا
شاداں ہوں اسی واسطے میں صبح سے تا شام ۔۔۔ بندے کو بھروسہ ہے ترے فضل و کرم کا

ذکر تیرا تھا یہاں غیر کا مذکور نہ تھا ۔۔۔ تو ہی تھا مدِّ نظر دوسرا منظور نہ تھا
چشمِ مخمور ہی بھاتی تھی تری شاداں کو ۔۔۔ مے نہ دی تُو نے تو کیا نشے میں وہ چور نہ تھا

رات کو کیا خوب گزری پیتے ہی پیتے رہیں ۔۔۔ اِس طرف میں اُس طرف وہ بیچ میں پیمانہ تھا

جہل اور عُجب و تکبّر تو نہیں چنگے بھلے ۔۔۔ بن نہ حیوان ذرا خصلتِ انسان میں آ
چمنستاں میں عجب رنگ کے گل پھولے ہیں ۔۔۔ سبزہ و سرو و سمن دیکھنے بستان میں آ
ساقی و مطرب و مے، جام و سبو سب کچھ ہے ۔۔۔ گلبدن نام ہے تیرا تو گلستان میں آ

تیرے پروانہ ساں جو گرد پھرے ۔۔۔ شمع رو کچھ تو ہم نے جانا تھا
ہم تو مشتاقِ دید تھے صاحب ۔۔۔ اپنا منھ ہم سے کیوں چھپاتا تھا

ملتا ہے گلعذار گلے ہم سے جس گھڑی ۔۔۔ آتی ہے بو گلاب کی اپنے بدن کے بیچ
کہتی جو بات آئے کرامات ہے وہی ۔۔۔ کیا لطف ہے کہ جان نہ ہووے سخن کے بیچ

جو بشر ہوتا ہے مقبولِ الٰہی یارو — نہیں ہوتی ہے دعا اس کی اثر سے باہر

ٹک تبسم سے یار بولو تم — غنچۂ دل کی گانٹھ کھولو تم

خیال اس بتِ گلرو کا دل میں رہتا ہے — بغل میں اپنی سدا ہم بہار رکھتے ہیں
وہ کس طرح سے نہ ہووے ہم پہ مہرباں یارو — کہ اس سے آٹھ پہر کاروبار رکھتے ہیں

ساقی نے آپیالہ اب یار اور ہم ہیں — صحرا میں لطف ہے گا یو ندیں برستیاں ہیں
مکھڑا تو تم دکھاتے ہر آن ہر گھڑی ہو — لیکن ہماری آنکھیں تو بھی ترستیاں ہیں

تو دیکھتا ہے مجھ کو بہت ہی قریب سے — میرے نصیب میں ترا دیدار کیوں نہیں

میری اور تیری عجب یار لگن لاگی ہے — تیری زلفوں میں ہوا میں ہوں گرفتار کہ تو

کام نیکی کے جواب ہاتھ سے ہو ویں کیجے — یہ نہ ہو وے کہ کسی شخص کے غم خوار رہو

چھپاؤں تجھ سے کیا اے میرے صاحب — مرا احوال کب تجھ سے نہاں تھا

ہے یہی بات نصیحت کی اگر گوش کرے — رنج تو کھینچ مگر منتِ اغیار نہ کھینچ

سنتے ہیں ہم کہ دشت میں مجنوں نے گھر کیا — دیوانہ جو کہ ہو اسے کاشانہ کیا ضرور

کس نے تجھے کہا تھا کہ جا طور پر برس — اے ابر آ ادھر کسی مخمور پر برس

جو اُترا گھونٹ مے کا حلق سے جان آگئی ساقی — پلا دے جیسے کوئی گھول کر اکسیر پانی میں

پھرتے پھرتے کبھو دل چاہے تو آجاتے ہیں — ان کا احسان ہے جھمکڑا جو دکھا جاتے ہیں

کہیں تارِ نظر کو بھی نظر بھر کوئی دیکھے ہے
تو آجا چھپ کے گھر میرے خبر ہو وے تو میں جانوں
وہی ہادی ہمارا ہے وہی خضرِ طریقت ہے
وہ ہو جس راہ کا رہبر خطر ہو وے تو میں جانوں
ترا تو دیکھنا الفت بھرا ہے گا ارے شاداں
اسے تیرے نظارے سے نظر ہو وے تو میں جانوں

کہوں کیونکر کہ مجھ کو رکھ نظر میں
نہیں مجھ میں ہنر کچھ بے ہنر ہوں
تو ہے غفار میں مجرم ہوں تیرا
خطا کیونکر نہ ہو آخر بشر ہوں

اکیلا ہوں نہیں کچھ جانتا ہوں
مگر ہاں اک تجھے پہچانتا ہوں

تیرے سوائے کس کی بھلا آرزو کریں
ہے کون تجھ سا جس کی میاں جستجو کریں

کوئی ہنر نہیں ہے جس سے تو مجھ پہ ریجھے
کہہ یار میرے تجھ کو میں کس طرح رجھاؤں

اس نے دیا ہے تجھ کو اگر کم، بہت ہے یاں
پانی کو تو نہ ڈھونڈ کہ شبنم بہت ہے یاں
عاشق سے مل کے چاہیے ان روزوں تو رہے
تنہا نہ رہ کہ جاڑے کا موسم بہت ہے یاں

پھرتے تھے ہم بھٹکتے ہوئے جس کے واسطے
صد شکر ہے وہ یار ملا ہم کو راہ میں
تو ہے رحیم تیرا بھروسا ہے روزِ حشر
ساری کٹی ہے عمر ہماری گناہ میں

ارے دل باؤلے میرے محبت یار سے کر لے
تو سب باتوں کو تج دے اور سخن دلدار سے کر لے

خوشی سے آنکھ بھر کر تجھ کو دیکھوں
کبھی تو میرے گھر میں بھی تو آ رے

کنھیا الفت کی ہے سب سے نرالی
اجی دو ہاتھ سے بجتی ہے تالی

کبھی تو رحم آجائے گا اس کو
نہ غافل ہو خوشامد سے، دعا سے

دینے والے کو بجز داد و دہش کب چین ہے — خوش بہت ہوتا ہے جس دم اس کو سائل مل گئے

ہے عیب فقیروں کے لیے شوقِ کرامات — مت پوچھ کسی سے تو کرامات کسی کی
مشغول بہ دل سجدہ و تسبیح میں رہنا — ہوتی ہے ہزاروں میں یہ اوقات کسی کی

جس طرح رکھے یار اسی طرح سے رہیے — احوال نہ ہووے اسے معلوم تو کہیے

تڑپاتے میں ہر چند کہ قاتل نے کمی کی — لیکن نہ تڑپنے میں مرے دل نے کمی کی
ملک لینی تھی مجنوں کی خبر وحشتِ جنوں میں — افسوس یہاں صاحبِ محمل نے کمی کی
دیتے ہیں تو کچھ عذر نہ تھا بحرِ کرم کو — مانگا نہ سخی سے تو یہ سائل نے کمی کی

بے خودی چھا گئی مجھ پر تو خوشی کے مارے — کچھ میاں تیری مدارات نہ ہونے پائی

اس کا لکھا کہاں تلک کیجے — عمر گزری گناہ میں میری

مرا دل تھا اور آرزو تھی کسو کی — یہ وہ پھول ہے جس میں بو تھی کسو کی
ہوا اب یقیں بات تھی وہ ہماری — سُنی ہم نے جو گفتگو تھی کسو کی

برہمن بتوں کو نہ یوں مانتا ہے — خدائی کا جلوہ وہاں جانتا ہے
وہ صاحب ہے میرا میں بندہ ہوں اس کا — مرا دل اسے خوب پہچانتا ہے
جو کرتا ہے محنت وہ پاتا ہے راحت — جو پیسے ہے آٹا وہی چھانتا ہے

شکلِ ہستی سراب کی سی ہے — بے ثباتی حباب کی سی ہے

خواہ تو لے خواہ مجھ کو دے میاں — تیرے میرے درمیاں اک جام ہے

PSO

بلراج کومل

وزیر آغا کی شاعری

آلڈس ہکسلے (ALDOUS HUXLEY) نے اپنے مضامین میں بہت سے متنازعہ فیہ مسائل اٹھائے ہیں۔ ان پر اپنی رائے کا اظہار کرتے ہوئے کم و بیش ہمیشہ انتہائی فکر انگیز سلاسل سے آزاد، غیر روایتی اندازِ نظر اور طرزِ اظہار کا ثبوت دیا ہے میرا ذہن اکثر ہکسلے کے دو مضامین کی جانب خاص طور پر لوٹ کر جاتا ہے۔ پہلا مضمون "المیہ اور پورا سچ" (TRAGEDY AND THE WHOLE TRUTH) ہے۔ اس مضمون میں ہومر کی اوڈیسی کے حوالے سے ایک واقعے کا بیان ہے۔ وہ واقعہ کچھ اس طرح ہے کہ بحری مہمات کے خطرناک تو اتر سے گزرتے ہوئے ایک مرحلے پر جب ہومر کے ہیرو اوڈیسس کے چھ بہادر جانباز ساتھی سکائیلا (SCYLLA) کے جبڑوں کی نذر ہو گئے تو اوڈیسس اور اس کے باقی ماندہ رفیق سسلی کے ساحل پر اترے۔ رات بھر آرام کرنے کے لیے۔ گرچہ سب لوگ افسردہ و سنجیدہ تھے۔ انھوں نے بڑی مہارت سے رات کا کھانا تیار کیا۔ سب نے مل کر کھایا اور جب وہ بھوک پیاس کی تشفی کر چکے تو انھوں نے اپنے بچھڑے ہوئے رفیقوں کو یاد کیا۔ ان کی آنکھوں سے بے اختیار آنسو امڈ پڑے۔ اور جب وفورِ غم سے نڈھال ہو گئے تو غنودگی نے رفتہ رفتہ ان کو بے بس کر دیا۔ بالآخر ان کی آنکھ لگ گئی اور وہ گہری نیند سو گئے۔

اسی مضمون میں ایک اور واقعے کا ذکر ہے — اس واقعے کا تعلق فیلڈنگ کے ناول ٹام جانز TOM JONES سے ہے۔ ٹام جانز میں ایک کردار ہے سوفی ویسٹرن (SOPHY WESTERN) ہکسلے کا کہنا ہے کہ یہ کردار فیلڈنگ کو بہت عزیز تھا۔ کہا جاتا ہے کہ اس کردار کی وساطت سے فیلڈنگ نے اپنی پہلی بیوی (جسے وہ بہت پسند کرتا تھا) ہی کی تصویر کشی کی تھی۔ اس دل بستگی کے باوجود فیلڈنگ نے سوفی ویسٹرن کو سراپا بہ قدم "مجسم پاکیزہ" کا روپ دینے کی کوئی کوشش نہیں کی سوفی سرِ رہ گزر — اس گھوڑے پر سے گر پڑی جس پر سوار وہ جا رہی تھی۔ اس عمل میں اس کے خوبصورت جسم کے کچھ حصے برہنہ ہو گئے سڑک پر کھڑے تماشائیوں کو اس کی مدد کرنے کا خیال کچھ دیر سے آیا۔ فوری طور پر وہ محظوظ ہوئے۔ ان میں سے کچھ مسکرا دیے اور کچھ دل کھول کر ہنس دیے۔ اس پورے وقفے میں سوفی شرم سے پانی پانی ہوتی گئی۔

ہکسلے کا دوسرا مضمون جو مجھے اکثر یاد آتا ہے۔ ورڈزورتھ منطقہ حارہ میں WORDS WORTH IN TROPICS ہے۔ ہم سب ورڈزورتھ کو عظیم شاعرِ فطرت کے نام سے یاد کرتے ہیں۔ ہکسلے کا خیال ہے کہ ورڈزورتھ نے چونکہ فطرت کا تہذیب یافتہ

روپ ہی دیکھا تھا اس لیے اس نے فطرت کی تصویر کشی میں صرف انھیں محفوظ عناصر کا ذکر کیا ہے جن سے انسان کوئی خطرہ محسوس نہیں کرتا ۔ ورنہ سچ تو یہ ہے کہ فطرت کا ایک مخاصمانہ بہیمانہ روپ بھی ہے ۔ پورے سچ میں فطرت کے ہمدردانہ روپ کے ساتھ ساتھ اس کا مخاصمانہ روپ بھی شامل ہے ۔

ہکسلے کے خیال میں اسی بنا پر فطرت کا وحدت الوجودی (PANTHEISTIC) تصور غیر حقیقی اور مصنوعی ہے ۔

میں سمجھتا ہوں سلیم احمد کے حوالے سے ہم لوگ جس "پورے آدمی" کا ذکر کرتے ہیں اور وہ پورا سچ جس کا ذکر ہکسلے اپنے مضامین میں کرتا ہے ۔ ایک ہی رویّے کی جانب ہماری رہنمائی کرتے ہیں اور وہ یہ ہے کہ زندگی کا ہر یک رُخی تصور نامکمل ہے ۔ صحیح تصور زندگی کی کثیر الجہتی اور ہمہ گیری کا تصور ہے ۔

وزیر آغا کی شاعری کا مطالعہ کرتے وقت میں مختلف النوع کیفیات کے ہجوم سے گزرتا ہوں ۔ کئی قسموں کے سوالات میرے ذہن میں پیدا ہوتے ہیں ۔ ہر شاعر اور فن کار کی تخلیقی کائنات کے آئینے میں انسان کا تصور ابھرتا ہے ۔ گوئٹے ، دانتے اقبال ، سب کے ہاں انسان کا ایک تصور کارفرما ہے ۔ بعض اوقات محرک کے طور پر ، بعض اوقات حاصلِ عمل کے طور پر ، بعض اوقات نصب العین کی فتح و شکست کے علامیہ کے طور پر ۔ ذرائع ابلاغ کی یورش کے اس دور میں جزوی ردّ عمل کی سطح پر جینے والا فنکار شاید کسی حد تک محض ایک سہوِ زمانی (ANACHRONISM) ہے ۔ وگرنہ سچ تو یہ ہے کہ محدود و خانہ بندیاں جسمانی تحفظ کے امکان کی تو کسی حد تک ضامن ہو سکتی ہیں ۔ لیکن فکری ، ذہنی اور روحانی سیرابی کی کوئی امید نہیں پیدا کر سکتیں ۔

وزیر آغا کی شاعری کا بنیادی نقطہ میری دانست میں ان کی آزادہ روی ہے ۔ فطرت ، سماج ، مذہب ، جسم اور پھر پوری کائنات ، اسالیب ، لفظیات ، آہنگ کا انتخاب ، غزل ، نظم ، انشائیہ ، تنقید ، وزیر آغا کی پوری شخصیت برمحو تازہ کار ، ہزار جہت ردّ عمل کی شخصیت ہے ۔ اس میں بہ یک وقت خالص جسمانی ردِ عمل سے لے کر جذباتی ، روحانی ، وجودیاتی ردّ عمل تک ، تمام تر صورتیں ، تمام تر عوامل سرگرم کار ہیں ۔ سماجی جانور کا رتبہ اختیار کرنے کے عمل میں انسان مختلف مدارج سے گزرا ہے ۔ (یہ عمل جاری ہے) تسخیر فطرت ، سماجی تنظیم ، تہذیبی سفر کے مراحل ، وجود کی بازیافت ، متوقع انہدام ۔ وزیر آغا اگر صرف کتابی دلچسپیوں تک محدود ہوتے تو شاید تنقیدی اظہار سے مطمئن ہو جاتے ۔ وزیر آغا کا مسئلہ چونکہ تخلیقی اظہار کا مسئلہ ہے اس لیے مسلسل شکست و ریخت ، مسلسل تجدید ، مسلسل بازیافت کا مسئلہ ہے ۔

میں وزیر آغا کے ردِ عمل کی کچھ صورتوں کا ذکر بہر حال تفصیل سے کرنا چاہتا ہوں ۔ وزیر آغا کا انسان ہر ہر قدم پر ایک متضاد و متصادم صورتِ حال سے نبرد آزما ہے ۔ فطرت کا رعب بہ یک وقت ہمدردانہ بھی ہے اور مخاصمانہ بھی ۔ سماج ، تہذیب اور مذہب نے انسان کی مثبت نشو و نما کو بھی فروغ دیا اور منفی عناصر کو بھی مائل تخریب کیا ہے ۔ وزیر آغا کے ہاں توازن کی تہذیبی صورت محض ایک عارضی لمحۂ سکون کی صورت میں اُجاگر ہوتی ہے ۔ پھر یکایک منقلب ہو جاتی ہے "شام اور سائے" کی کئی نظموں میں ، خاص طور پر "اجنبی" ، "اعراف" اور "جنگل" میں یقینی طور پر وزیر آغا کا انسان مخاصمانہ قوت سے نبرد آزما ہے :

ملگجی سی روشنی میں ایک پیڑ

کانپتی انگلی سے مجھ پہ خندہ زن
آسماں پر دائرے کے روپ میں
چیختے روتے ہوئے بھوکے پرند
دم بہ دم غوطہ لگاتے میری اور
دم بہ دم مجھ پر جھپٹتے مُردہ خور
(اجنبی)

کھڑے پیڑوں کے جنگل میں
پتوں کی کالی دیواریں!
دیواروں میں لاکھوں روزن
روزن آنکھیں ہیں جنگل کی!!
وحشی آنکھیں ہیں جنگل کی
(جنگل)

کہیں دُور — دھرتی کی بے چکی ہوئی جلد سے
کالے گنجان جنگل نکل کر
ہر اک چیز کو اپنے سایوں سے ڈھانپیں
بپھرتی ہوئی ندیوں، وحشی آنکھوں، دھوئیں کے
ستد لبوں کو
کالی ردا میں چھپائیں
بڑی دور تک اپنی پرچھائیوں سے
انوکھا سا اک خوف پھیلاتے جائیں
گھنے گہرے پتوں میں، دبکے ہوئے جسم پر
کالی رنگت چھاؤ کریں
خون کے کھولنے کا تماشا دکھائیں
(اعراف)

فطرت کا یہ روپ نہ تو ہمدردانہ ہے اور نہ ہی ورڈزورتھ کے انداز میں PANTHEISTIC یعنی وحدت الوجودی. تہذیبی عوامل کا ذکر کرتے ہوئے بھی وزیر آغا پہلی سطح پر فطرت کے مخاصمانہ روپ کی منظرکشی کرتے ہیں۔ لیکن چونکہ وہ محض یک رُخی بیانیہ منظر نگاری کے شاعر نہیں ہیں اس لیے اکثر وبیشتر تصادموں کے مرحلوں میں توازن کی صورتیں تلاش کرتے ہیں۔ توازن کی یہ صورت "بات" میں بھی موجود ہے اور "تہذیب" میں بھی۔ نظم "بات" میں عناصر کی سطح پر بات کا روپ مکمل طور پر برہنہ روپ ہے۔ تہذیبی سطح پر بات کا روپ گھونگھٹ میں لپٹی ہوئی دلہن کا روپ ہے اور صورتِ حال کی IRONY یہ ہے کہ برہنہ، غیر لباس آلود "بات" نے جس مقام پر تہذیبی روپ اختیار کیا سارے عالم پر بے بس سی ایک خاموشی چھا چکی تھی:

دل کی بات بھٹکتے قدموں لب کی منڈیر پہ آئی
تاریکی میں رہی تھی برسوں سورج سے گھبرائی
چندھیائی آنکھوں کو مَل کر لی اس نے انگڑائی
لب کی منڈیر سے لگ کر اس نے سُنا انوکھا شور
اور پھر یک دم مُڑ کر دیکھا اس نے اپنی اور
ننگی گردن، ننگی بانہیں، ننگی اک اک پور!
لب کی منڈیر سے ہٹ گئی فوراً، نظروں سے شرمائی
سارے عالم پر بے بس سی اک خاموشی چھائی
پھر نکلی تو بھاری گھونگھٹ — جیسے دلہن آئی
(بات)

کائنات کے تعلق سے انسان کے سامنے کون کون سے راستے ہیں۔ مکمل تسخیرِ کائنات، مکمل تسخیر کے عدمِ امکان کی صورت میں جزوی اور بتدریج ترقی افزوں تسخیر کی کوشش، عناصرِ فطرت کے ساتھ لمحاتی مفاہمت اور ترسیلِ فطرت کے مخاصمانہ روپ کے سامنے دونا لو ہونے کا جذبہ یا پھر مکمل شکست کی قبولیت اور مکمل سپردگی کا جذبہ ـــ اس تمام سلسلے میں متوقع خطرات کا شعور و ادراک! وزیر آغا اپنے پورے سفر میں ان سب تجربات میں ہمیں شریک رکھتے ہیں۔ وزیر آغا اپنے پورے سفر میں کسی منزل پر کسی ساکت نقطے یا انجماد کے شاعر نہیں ہیں۔ بجھتے ستاروں، چلتے ہوئے جنگلوں کے درمیان بھی وہ تجربۂ وجود متحرک اور تمازت کی وساطت سے کرنا چاہتے ہیں۔ تہذیبی عمل متصادم عناصر کی یورشوں کا عمل ہے۔ اور تمام خطرات کے باوجود مسلسل آویزش کا عمل ہے۔ وزیر آغا کے ہاں تہذیب یعنی گھونگھٹ میں لپٹی ہوئی دلہن ہر لمحہ تخریبی عناصر کی یلغار میں ہے۔ شاید یہی صورتِ حال مذہب کے تہذیبی عناصر کی ہے:

چمکتے ہوئے قمقمے بجھ گئے دفعتاً
چاند غوطہ لگا کر
گھنے تند بادل کے سینے میں اترا
نم آلودہ غاروں، سیہ گھاٹیوں سے پراسرار سائے
ہزاروں برس کی تجلی سے چندھیائی آنکھوں کو ملتے
سیہ موٹے ہونٹوں پہ کالی سی اک مسکراہٹ سجائے
خنک تیز جھونکوں کے مانند
لہرا کے اٹھے
چٹانوں سے کودے
درختوں سے، کھمبوں سے اترے،
جھکی ٹین کی چھت سے پھسلے،
کبھی رہ گزر پر ہر اک سمت ناچے
بھیانک سا اک قہقہہ بن کے چیخے
سیہ ناخنوں، لمبے دانتوں، مڑے تیز پنجوں سے ہرشے پہ جھپٹے
کبھی اس سے لپٹے کبھی اس سے لپٹے
بڑی دیر تک تند بادل کی صورت گرجتے پھرے!
(تہذیب)

وزیر آغا خالص جسمانی، حسیاتی تجربے کے شاعر نہیں ہیں اور نہ ہی براہِ راست بیان کے (اگرچہ وہ بعض اوقات محسوس تفصیل اور تجریدکا امتزاج روا رکھتے ہیں) لیکن وہ وجود کا ارفع تجربہ کرنے سے پہلے جسم سے مکمل طور پر روشناس ہونا چاہتے ہیں۔ لذت کوشی کی حد تک تو شاید نہیں لیکن نشاط و انبساط کی حد تک بہرحال! زیرِ زمیں دکھ کے ہم سفر احساس کے ساتھ! جسم کی محدودیت اور جسم کی بساط ماورائیت کے امکانات کے ساتھ! جسم ـــ جو خوشبوؤں، رنگوں، روشنیوں کا محور بھی ہے اور گرم تعفن کا بھی:

میں نرم خوشبو کا ایک پیکر
ہوا کے جھونکے کا ہم سفر تھا
اور اب میں بوجھل سی گرم خوشبو میں
گرم بدبو میں ڈھل چکا ہوں
میں آج اک جسم بن چکا ہوں!

وزیر آغا اکثر ہوا کے جھونکے کا ذکر کرتے ہیں۔ لیکن لمحۂ موجود کے اس مقام پر جہاں وہ تعفن کا تجربہ کرتے ہیں۔

ا کے ہاں انتہائی پُرزور آرزو کے آزادی جنم لیتی ہے ـــ جسم سے رہائی، سماجی سلاسل سے، روایت سے رہائی! دُکھ کے
ے کا اظہار وہ اس طرح کرتے ہیں کہ یہ دُکھ بظاہر کس قدر ترنم رو کس قدر معصوم لگتا ہے لیکن جب یہ رگ و پے میں سرایت
جاتا ہے تو ساری دنیا تاریک ہو جاتی ہے:

نغمے کی گونج سانس کے سرگم میں مل گئی
گردوں سے چند اوس کی بوندیں ٹپک پڑیں
تاروں کی ہانپتی ہوئی بارات ڈھل گئی
بوڑھی گلی میں وھیرے سے چپ خیمہ زن ہوئی
کھڑکی کی آنکھ کیا بجھی، دنیا بدل گئی
دُکھ اوٹ سے کواڑ کی میری طرف بڑھا
بھیگی ہوئی نظر سے مجھے گھورنے لگا

وزیر آغا اپنے شعری سفر کے مرکزی مقام پہ اکثر اوقات تجربۂ وجود کی اس گھڑی کی تلاش میں ہیں جو بہ یک وقت انھیں وارفتگی
مسرتیں بھی عطا کرے اور ماورائیت کی متاعِ بے بہا سے سرفراز بھی کرے۔ وہ اپنے سفر کے ہر مقام پہ تجربۂ وجود کی مختلف
ہیئتوں، مختلف صورتوں اور مختلف امکانات کی دریافت اور ان کی انفرادی شناخت میں دل و جان سے منہمک نظر آتے
ں۔ وہ ہر مقام پہ ہنگامۂ زیست کے عین وسط میں ہیں۔ ان کے چاروں طرف ننگی چیختی آوازوں کا شور ہے۔ نامعلوم فاصلوں
عتوں اور پُراسرار سربستہ جہانوں کا سلسلہ ہے۔ دُکھ کا گہرا اٹھاٹھیں مارتا ہوا سمندر ہے۔ کنارہ کشی، خود بینی، دروں بینی،
ت کوشی، مراجعت، فرد نشینی، تشدّد، احتجاج ـــ کون سی کھڑکی کہاں ہے اور کب کھلے گی۔ کون سا انقلاب کب آ جائے گا اور
ب احیائے اقدار کے عروج سے گزر کر ایک بار پھر تعفّن اور انجماد میں غرق ہو کر رہ جائے گا۔ وزیر آغا کے ہاں وجودی تجربے
اظہار اکثر و بیشتر شعلگی اور آتش زدگی کے تجربے کا اظہار ہے۔ سمندر سے، عناصر سے ہم کنار، ہم کلام، ہم آہنگ ہونے کے تجربے کا
یار ہے۔ "خطرات" کی وجودیاتی انہدام کاری کا اظہار ہے۔ وزیر آغا کے وجودیاتی تجربے کی نوعیت مجید امجد کی "جست" سے
انداز سے مختلف ہے کہ مجید امجد مقاماتِ کرب سے ایک ہی جست سے گزر جانا چاہتے ہیں جب کہ وزیر آغا دورانِ عمل کی برہمی اور
تش زدگی سے گزرنا چاہتے ہیں۔ اور سفر کی انتہا تک گزر جانا چاہتے ہیں۔ یہ صورتِ حال یاس، امید یا قید و نجات کی نہیں ہے۔
ل تیز رفتار، برق صفت آتشیں موج سر برہنہ کی یلغار کی ہے۔ شاید کسی حد تک نطشے اور کارل جیسپرز کے وجودیاتی تجربات کے
ب و جوار میں:

ایک ننگی چیختی آواز
پھر چابک کا شور
کھڑکھڑاتے زنگ آلودہ سے پہیوں کی صدا
اور میں آواز کے آگے جُتا

میری آنکھوں پر نقاب
میرے منہ میں خاردار آہن کی جیب
میرے بازو
سخت چمڑے کے سیہ رستوں کے

برہم جال میں جکڑے ہوئے
اور میرے سَم
میرے چاروں رفیق
گھاٹیوں سے، پتھروں سے، بے خبر
خندقوں سے بے نیاز!

(ڈھلوان)

بادل ادھر کے آجاؤں
برکھا بن کے برس پڑوں
سیپ میں اُتروں
گھاس پہ بکھروں
پھول کے مکھ پر چمک اُٹھوں
پَر تولوں
اُڑتے اُڑتے
دودھیا کونجوں کے دھاگے میں
موتی بن کر دمک اُٹھوں
تھک جاؤں
آنسو کی اک بوند میں ڈھل کر
پلکوں سے آکاش کی ٹپکوں
اک جلتا انگارہ بن کر
مہندی والے ہاتھ پہ تیرے آن گروں
سورج کے آنے سے پہلے
وحشی سا اک رقص کروں

(سورج کے آنے سے پہلے)

وحشی سا یہ رقص بہرحال ایک الاؤ ہے اور داستان گو شاعر فن کار خود بھی سُلگتا ہوا ایک الاؤ ہے اور کائنات یعنی cosmos بھی حیاتیاتی تسلسل سے گزرتا ہوا ایک دوسرا الاؤ ۔ وزیر آغا ــــ شعلگی اور آتش زدگی کا تجربہ اس الاؤ کے وسط میں کرنا چاہتے ہیں۔

ــــــ اور داستان گو
اندھیرے کے سینے میں روشن ستارا
جو خود ہی سُلگتا ہوا اک الاؤ تھا
جس سے ابھرتی کہانی
ہواؤں، شگوفوں، پرندوں، گڈریوں
فلک پر چمکتے ستاروں
زمیں پر اُگی گھاس
اور گھاس پر تتلیوں، کالے ناگوں
درندوں کی اک مشترک داستاں تھی

(الاؤ)

اس مسلسل شعلگی اور آتش زدگی کے روحانی، جذباتی اور وجودیاتی تجربے کے الاؤ کی ہم سفر شاید ایک اور زیرِ زمیں موجِ نرم رو وزیر آغا کے ہاں شروع سے آخر تک موجود ہے ۔ سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا انسان زمین پر پھیلے ہوئے خاکدان سے مفاہمت کی کوئی صورت پیدا کر سکتا ہے؟ دکھ درد، حُزن و ملال سے ماورا جا سکتا ہے؟ جسم اور حیاتِ فانی۔ شاید نظامِ کائنات میں وہ چھپی چھپی ترتیبیں ہیں جن کی مدد کے بغیر انسان "نامعلوم" سے شناسائی حاصل کرنے کے امکان سے محروم ہو جاتا ہے ۔ اس لیے ایک بار پھر وہ عناصر کی جانب لوٹ آتا ہے ۔ زمین، آسمان، آگ، پانی، ہوا، روشنی، روئیدگی، تمازت سے ایک بار پھر رشتہ استوار کر لیتا ہے ۔ وزیر آغا کے ہاں وجودیاتی تجربہ محض خود بینی اور دروں بینی اور انکشافِ ذات کی آتش زدگی کا تجربہ نہیں ہے بلکہ دریافت اور تجدید کے سفر کے انتہا پہ ایک بار پھر حواس کی تازہ کار کیفیات اور حیاتیاتی اور کائناتی مظاہر کے ساتھ ایک نیا رشتہ استوار کرنے کا تجربہ ہے ۔ وزیر آغا کے ہاں فہم و دانش اور جذباتی اور روحانی احیا کی اس منزل پر سارے بادل

بکایک چھوٹ گئے ہیں۔ گرد کا سائبان باقی نہیں رہا۔ ساختیاتی تعمیر بحرِ متقارب یا بحرِ متدارک کا تواتر بے معنی ہوگیا ہے۔ نظموں کے مصرعے غزلوں کے مصرعوں میں ڈھل گئے ہیں۔ لفظ سادہ ہوگئے ہیں۔ اندر سے روتے کی بھیگی آواز سے مکمل شناسائی ہوچکی ہے۔ ٹرمینس یعنی پُل اپنے صحیح سیاق و سباق میں نمودار ہوا ہے:

پُل نہ ہو تو
یہاں اور وہاں میں
زنگ آلود ماضی میں اور صاف شفاف
آنے والے زمانے میں
ٹھہرا ہوا "اب" کا لمحہ
یہ سگنل، پہاڑی کی دیوار
لوہے کا کمرہ
سدا ایک نقطے پہ قائم رہے گا۔
زمانے کی پھیلی ہوئی ڈور میں
چھٹنی کھٹی گرہ ہے
گرہ کھل گئی گر
تو کچھ نہ رہے گا

زندگی کا تسلسل ہی سب سے بڑی حقیقت ہے اس کا جواز اس کے تسلسل کا ناگزیر حصہ ہے۔ حیات و موت، تخلیق و انہدام سب ایک دائرے میں رواں ہیں۔ درانتی مسلسل محوِ رقص ہے:

درانتی رقص کرتی ہے
زمیں پر گنگناتے ان گنت خوشوں کے بادل میں
درانتی کودتی پھرتی ہے!

ہر خوشے کا بوسہ لے کر کہتی ہے
تمہاری، بس تمہاری منتظر تھی میں
جھولے میں جھلاتی ہے
اسے میٹھی سی اک لوری سناتی ہے
درانتی رقص کرتی ہے
کبھی گھنگرو، کبھی مدرا
کبھی جھک کر، کبھی اک دائرے میں
گھوم کر سو بار پھرتی ہے
درانتی
اک ہراساں نسل سے دامن چھڑا کر
دوسری تک
اک یُگ کو پار کر کے
دوسرے یُگ تک
درانتی — خون کی پیاسی
درانتی ناچتی کھوری زمیں پر
صورتِ تلوار پھرتی ہے
درانتی رقص کرتی ہے

(درانتی رقص کرتی ہے)

وزیر آغا اگر صرف براہِ راست بیان کے شاعر ہوتے تو میں ان کی کامیابیوں یا ناکامیابیوں کی میزان بہ آسانی چند لوں میں کر سکتا تھا۔ ان کے تعلق سے میں نہ تو وجودیاتی تجربے کی شعلگی اور آتشِ زندگی کا ذکر کرتا اور نہ ہی تخلیقی دریافت اس عمل کا جس سے گزرتے ہوئے وزیر آغا کا لب و لہجہ، بالآخر انتہائی روشن، منوّر اور متوازن ہوگیا ہے حق تو یہ ہے کہ وزیر آغا فہم و ادراک، شعور و دانش اور فن کارانہ انکشاف کی اس منزل پر ہیں جہاں شاعر اور فن کار نہ کوئی پیغام دینا چاہتا ہے

اور نہ ہی انسانی صورتِ حال کو کوئی کتابی نصابی رُخ دینا چاہتا ہے۔ بلکہ دریافت کی اس منزل پر نئے سرے سے ایک بار پھر فاختاؤں، پھڑپھڑاتے ستاروں، طلوع و غروب کے منظروں، جھروکوں اور سبز شیدوں کے ساتھ تخلیقی رشتہ جوڑنا چاہتا ہے۔ ایک بار پھر اپنے ہونے کا اظہار و عرفان کرنا چاہتا ہے:

مجھے تو فقط
اپنے ہونے کا عرفان ہے
میں تو بس اس قدر جانتا ہوں
پروں کو ہلاتی
جیسے قوس بن کر
مری سمت آتی ہوئی
فاختہ
پھڑپھڑاتے ستارے
گھنی گھاس کی نوک پر آسماں
سے اُترتی نمی
اور پورب کے ماتھے پہ
قشقے کا مدّھم نشان
تیرگی کی گپھا سے نکلتا ہوا!
روشنی کا جہاں

دھرتیاں، کہکشائیں، جھروکے
جھروکوں میں اطلس سے کومل بدن
بھیگی پلکوں پہ دُکھ کی چمکتی چبھن
سبز شیدوں کی بہتی ہوئی آب جو
اک انوکھے پُر اسرار "معنیٰ" کے
گھاؤ سے رِستا لہو
مسکراتے ہوئے لب
یہ سب
میرے اوتار ہیں
میری آنکھیں ہیں
مجھ کو ہمیشہ سے تکتی رہی ہیں
سدا مجھ کو تکتی رہیں گی!!

(آدھی صدی کے بعد)

وزیر آغا نے مختصر نظم اور طویل نظم، غزل تینوں ذرائع اظہار پر یکساں قدرت کا ثبوت دیا ہے۔ حق تو یہ ہے کہ دورِ حاضر میں طویل نظم کا احیا انہی کے نام، انہی کی کوششوں کے ساتھ وابستہ ہے۔ ان کا تخلیقی سفر جاری ہے۔ میں نے وزیر آغا کی شاعری پر مختلف پہلوؤں سے کئی بار غور کیا ہے۔ ہمارے دور کے اکثر شعرا طے شدہ حد بندیوں کے شاعر ہیں۔ کچھ ساختیاتی مجبوریوں کے شکار ہیں کچھ مشہور ذرائع ابلاغ کے! مسئلہ یہ ہے کہ ترقی افزوں، تشدّد اور دہشت گردی کے دور میں شاعر اور فن کار کی شناخت کا کیا امکان باقی ہے؟ وہ لوگ جو اس سوال کا مثبت جواب دیتے ہیں یا جو مثبت پیغام کا مشورہ دیتے ہیں، یا تو انتہائی معصوم ہیں یا لاعلم۔ یا پھر "بطلان فروشی" کو بطور پیشہ اپنا چکے ہیں۔ حق تو یہ ہے کہ شاعر اور فن کار کا تجربہ تخلیقی تجربہ ـــــ انسانی صورتِ حال کے شعور و ادراک کا تجربہ ہے۔ جمالیاتی سطح پر یہ تجربہ ترسیل و ابلاغ کے ان روشن جزیروں کے ساتھ منسلک ہے جو غارت گری کی یورش کے باوجود سرگرمِ بقا ہیں۔ اور شاید اس جدوجہد میں کچھ صالح اور فعّال اقدار کو برقرار بھی رکھے ہوئے ہیں۔ وزیر آغا سمندر سے ترسیل و ابلاغ کا ایک تجزیہ یوں پیش کرتے ہیں:

جب آنکھ کھلی میری

دیکھا کہ ہر اک جانب
زرتار سی کرنوں کا
اک زرد سمندر تھا
اور زرد سمندر میں
چاندی کی پہاڑی پر
میں پیڑ تھا سونے کا
شاخوں میں مری ہر سو
جھنکار تھی پتوں کی
اڑتی ہوئی چڑیوں کی
یا آگ کی ڈلیوں کی
اک ڈار سی آئی تھی
اور مجھ میں سمائی تھی

قدموں کے تلے میرے
زنجیر تھی لمحوں کی
میرے زرہ بکتر سے
جو کوندا لپکتا تھا
تاروں کے جھروکوں تک
پل بھر میں پہنچتا تھا
میں جسم کے مرقد سے
باہر بھی تھا اندر بھی
میں خود ہی پہاڑی تھا
اور خود ہی سمندر بھی

(جب آنکھ کھلی)

ٹرمنیس اور ٹرمنیس سے پرے نظر آنے والے مظاہر کا جمالیاتی احساس زندہ رکھنے کی تخلیقی قوت اور بصیرت صرف چند شاعروں کے حصے میں آتی ہے۔ وزیر آغا ان خوش قسمت شاعروں میں سے یقیناً ایک ہیں!!

انور خان

اردو ناول اور عالمی معیار

اردو ناول کی عمر سوا سو (۱۲۵) سال کے لگ بھگ ہو چکی ہے۔ اس دوران کئی بہت اچھے ناول لکھے گئے جو آج ہماری روایت کے سنگِ میل ہیں جیسے توبۃ النصوح، فردوسِ بریں، فسانۂ آزاد، امراؤ جان ادا، میدانِ عمل، گئودان، ایسی بلندی ایسی پستی، آگ کا دریا، اداس نسلیں وغیرہ۔ ایک سلگتا ہوا سوال اس کے باوجود بار بار ہمارے ذہن کو مضطرب کرتا ہے کہ ہمارا کوئی ناول آج تک اس معیار کو نہیں چھو پایا جو ٹالسٹائے کے ناول "جنگ اور امن"، اینا کرے نینا دوستوفسکی کے ناول "جرم و سزا"، "احمق"، برادر کراما زوف، فلا بیر کے ناول مادام بواری اور جیمس جوائس کا فکا، بیکیٹ وغیرہ کے ناولوں نے قائم کیا۔

اس کا تجزیہ کرنے کے لیے ہمیں اپنے ناولوں پر شروع سے ایک تنقیدی نظر ڈالنی ہوگی۔ یعنی ڈپٹی نذیر احمد سے۔ ڈپٹی نذیر احمد کے ناولوں کا مقصد اپنی بچیوں کی تعلیم و تربیت اور پند و نصیحت تھا۔ یہ وہ دور تھا جب نثر ایک ایسے معاشرے میں جو شاعری کا اسیر تھا، رفتہ رفتہ اپنی جگہ بنا رہی تھی۔ اس معاشرے میں ناولوں کی اہمیت دلچسپ قصّوں اور اخلاقی حکایات سے زیادہ نہیں تھی۔ اچھے ناولوں کے لیے جو گہری بصیرت اور فلسفیانہ سوچ درکار ہے اس کا ابھی سان و گمان بھی نہ تھا۔ کچھ یہی مقصد راشد الخیری اور عبد الحلیم شرر کا رہا۔ ایک اصلاحِ نسواں کا مبلّغ تھا۔ دوسرا مسلمانوں کو احساسِ کمتری سے نکالنے کے لیے شاندار ماضی کا سہارا لے رہا تھا۔

رتن ناتھ سرشار فسانۂ آزاد کی صورت میں ایک زبردست فن پارہ دے گئے۔ محمد احسن فاروقی کا کہنا ہے کہ زندگی کو جس حسن و خوبی کے ساتھ بیان میں زندہ کیا گیا ہے ویسا اردو کی کسی تصنیف میں نہیں کیا گیا۔ عزیز احمد کہتے ہیں کہ سرشار ہر طبقہ ہر موقع کی زبان پر حاوی ہیں۔ ہر گلی کوچے کے محاورے انھیں حفظ ہیں۔

وقار عظیم کی رائے میں "فسانۂ آزاد" اردو ناول نگاری میں اس لیے زندہ رہے گا کہ ایک خاص عہد کا لکھنؤ اس کی بدولت زندہ ہے۔ فسانۂ آزاد کے کردار خاص کر آزاد اور خوجی زبردست کردار ہیں۔ لیکن تمام باتوں کے باوصف جو کتاب میں سب سے زیادہ کھٹکتی ہے وہ ہے فارم کی کمی۔ اس کتاب کو آپ کہیں سے بھی اٹھا لیں، کہیں سے پڑھیں کوئی فرق نہیں پڑتا۔ فارم کی یہی کمی کا احساس نذیر احمد اور راشد الخیری کے ناولوں میں بھی ہوتا ہے۔

فارم کا یہ احساس بہت بعد کو پریم چند کے آخری دور کے ناولوں گئودان، میدانِ عمل وغیرہ میں ڈیولپ ہوا۔ اس سے قبل فارم کی تکمیل کا احساس صرف امراؤ جان ادا اور فردوسِ بریں میں ہوتا ہے۔ بہرحال ابتدائی ناول نگاروں سے جو ایک بالکل نئی صنف کی زبان میں داغ بیل ڈال رہے تھے اس کی توقع رکھنی بھی نہیں چاہیے۔

امراؤ جان ادا فنی و تخلیقی اعتبار سے اردو کا پہلا کامیاب ناول ہے۔

ایک ناول میں طرزِ معاشرت اور جذباتِ انسانی کی بے مثل تصویر کشی کی گئی ہے۔ طوائف نہ صرف ایک سماجی علامت ہے بلکہ وہ معصومیت کا المیہ بھی بن جاتی ہے۔ یہاں معصومیت اغوا کی جاتی ہے، بیچی جاتی ہے، مجروح کی جاتی اور آخر میں بھلا دی جاتی ہے۔ (ادب و آگہی۔ مجتبیٰ حسین) بہ حیثیت ناول ہمیں اس میں صرف ایک بات کی کمی محسوس ہوتی ہے کہ امراؤ جان کا کردار اس قدر منفعل (PASSIVE) ہے کہ وہ ذہنی کشمکش جو ناول کے کسی کردار کو ہمارے ذہن پر مثبت کر دیتی ہے، کہیں نظر نہیں آتی۔ نہ ہی ناول کے کسی اور کردار میں اس کا شائبہ تک نظر آتا ہے۔ سب کردار ڈھلے ڈھلائے ہیں۔ گو ان میں تنوع ہے۔ اور ناول ہماری آنکھوں کے سامنے واجد علی شاہ کے لکھنؤ کو زندہ کر دیتا ہے۔

مرزا ہادی رسوا کے بعد ہمارے سب سے اہم ناول نگار ہیں پریم چند — پریم چند بھی راشد الخیری اور نذیر احمد کے سلسلے کے ادیب تھے اپنے پہلے ناول اسرارِ معابد میں جو اکتوبر ۱۹۰۳ء سے ۱۹۰۵ء تک بنارس کے ایک ہفتہ وار اخبار آوازِ خلق میں قسط وار چھپا۔ فرسودہ رسموں اور مذہب کے نام پر انسانوں کی لوٹ کھسوٹ کو موضوع بنایا۔ اس کے بعد پریما، ہم خرما و ہم ثواب اور بیوہ میں انھوں نے بیوہ عورتوں کی حالتِ زار بیان کی۔ ۱۹۰۵ء میں تقسیم بنگال نے ہندوستانیوں کو سیاسی اعتبار سے بیدار کر دیا۔ قومیت کا جذبہ شدت سے ابھرا۔ ہر چیز سیاسی مذہبی رنگ میں رنگ گئی۔ ۱۹۱۴ء میں پہلی جنگِ عظیم شروع ہوئی جو ۱۹۱۸ء تک چلی۔ اس نے ساری دنیا کو معاشی بحران میں مبتلا کر دیا۔ ہندوستان میں سیاسی اور معاشی جدوجہد تیز تر ہوتی چلی گئی۔ مزدور منظّم ہونے لگے۔ جگہ جگہ ہڑتالیں ہوئیں۔ کسانوں میں بے چینی پھیلی۔ پھر جلیان والا باغ کا خونچکاں واقعہ پیش آیا۔ عدم تعاون اور سول نافرمانی کی تحریکیں گاندھی جی نے شروع کیں۔ یہ ساری سیاسی طبقاتی کشمکش پریم چند کے ناولوں میں آگئی ہے۔

گوشۂ عافیت پریم چند کے ناولوں میں ایک اہم موڑ ہے۔ پریم چند اس ناول میں دیہاتی زندگی اور اس کے مسائل کی طرف متوجہ ہوئے ہیں۔ اس ناول میں کسانوں کی زندگی کی سچّی تصویریں ملتی ہیں۔ یہ ناول انھوں نے گاندھی جی سے متاثر ہونے کے بعد لکھا تھا۔ اپنی بیوی شیورانی سے انھوں نے کہا کہ میں اس وقت سے ان کا چیلا ہوں جب وہ گورکھپور آئے تھے۔ اس کے بعد ہی میں نے "گوشۂ عافیت" لکھی۔ دنیا میں میں مہاتما گاندھی کو سب سے بڑا مانتا ہوں۔ ان کا بھی یہی نصب العین ہے کہ مزدور اور کسان سکھی ہوں اور ان لوگوں کو آگے بڑھانے کے لیے جدوجہد کر رہے ہیں۔ میں لکھ کر ان کی ہمت بڑھا رہا ہوں۔

مطلب یہ کہ رُخ ضرور بدلا ہے لیکن بات وہی ہے جو ان کے شروع کے ناولوں اور ڈپٹی نذیر احمد اور راشد الخیری کے ناولوں میں ہے۔ یعنی ناول کو کسی اور مقصد کے لیے آلۂ کار بنانا۔ ناول نگار بہ حیثیت ایک ناول نگار نہیں سوچ رہا۔ افراد معاشرہ پر اس کی نظر ایک ناولسٹ کی نہیں۔ اب وہ جنگِ آزادی کا سپاہی ہے جو ناول نگاری کو اپنے مقصد کے لیے استعمال کر رہا ہے۔

معاشی زندگی کے ہر گوشے ہر پہلو کو بڑی خوبی سے سمیٹ لیا ہے۔ ان ناولوں پر کئی چھوٹے موٹے اعتراض ہوتے ہیں لیکن انھیں یہ سوچ کر نظر انداز کیا جا سکتا ہے کہ نقص سے خالی تو دنیا میں کوئی چیز نہیں ہوتی بقول سمرسٹ ماہم ناول نگاری لازمی طور پر ناقص صنعت ہے۔ اور کوئی بھی ناول پرفیکٹ نہیں۔ لائنل ٹریلنگ بھی اس پر صاد کرتے ہیں کہ ناول کبھی بھی اور کسی لحاظ سے بھی مکمل صنعت نہیں ہو سکتا۔ اس کی کمزوریاں اور خرابیاں بڑی آسانی سے گنائی جا سکتی ہیں۔ ان ناولوں کو پڑھتے ہوئے بس یہی خیال آتا ہے کہ کاش پریم چند نے یہ ناول بہ حیثیت ایک قومی سپاہی کے نہیں، بہ حیثیت ایک ناول نگار لکھے ہوتے۔ اس بات سے قطع نظر کہ "گئودان" میں شہری کردار بہت کمزور ہیں۔ فنی، سیاسی شعور وسیع کینوس اور زندگی سے بھرپور کرداروں نے البتہ "گئودان" کو ایک ایسا ناول بنا دیا ہے جو امراؤ جان کے بعد اردو کا دوسرا ناول ہے جو دنیا کے بہترین ناولوں کے قریب تر پہنچتا ہے۔

عزیز احمد پہلے ناول نگار ہیں جن کا مقصد اصلاحِ قوم یا اصلاحِ نسواں نہیں، وہ قومی تحریک کے سپاہی بھی نہیں۔ ان کی شناخت بس ایک ادیب کی ہے۔ عزیز احمد نے چھ (۶) ناول لکھے۔ ہوس، مرمر اور خون، گریز، آگ، ایسی بلندی ایسی پستی اور شبنم۔ اردو ناول میں شاید پہلی بار عزیز احمد نے جنس کو موضوع بنایا۔ ان کے ناولوں کے متعلق ممتاز شیریں لکھتی ہیں کہ عزیز احمد فطرت نگاری کے قائل ہیں۔ واقعات اور کردار جیسے ہیں جیسے گزر رہے ہیں انھیں اسی طرح پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔ وقت کے سلسلے میں واقعات کے تسلسل اور ناول کی تعمیر میں بھی ان کا انداز فطری ہے۔ مطلب یہ کہ وہ کہانی میں کسی خارجی مقصد جیسے اصلاح حب الوطنی کو جان بوجھ کر الگ سے ٹھونستے نہیں۔ ایک ناول نگار کی طرح چیزوں کو جس طرح دیکھتے اور سمجھتے ہیں پیش کرتے چلے جاتے ہیں۔ عزیز احمد یقیناً ایک بہترین ناول نگار ہو سکتے تھے لیکن مصیبت یہ تھی کہ جیسا کہ سلیمان اطہر جاوید نے کہا۔ بنیادی طور پر عزیز احمد کے ہیرو ہیروئن کسان ہوتے ہیں۔ جنسی طور پر بھوکے ہوس ناک، اپنی ہوس کی تکمیل کے لیے مواقع کے متلاشی اور زیادہ تر کامیاب وژن کی کمی نے عزیز احمد کی ساری خوبیوں کو گہنا دیا۔

عزیز احمد کے ناولوں کے ساتھ ہی کرشن چندر کے ناول "شکست" (۱۹۴۳ء) اور عصمت چغتائی کا ناول "ٹیڑھی لکیر" شائع ہوئے۔ دونوں ناکام ناول دراصل سطحی ذہنوں کا کام نہیں "شکست" پر عزیز احمد کو اعتراض ہے کہ "شکست" کے کرداروں کی زندگی، ان کا لباس، ان کے خیالات، ان کی زبان ممکن ہے پونچھ کے رہنے والوں کے ہوں۔ لیکن نہ کرشن چندر اور نہ راما نند ساگر (حالانکہ وہ پکے کشمیری ہیں) کے کسی افسانے میں کشمیری مسلمانوں کے اصل خدوخال واضح ہوتے ہیں۔ کرشن چندر کے افسانوں میں معلوم ہوتا ہے کہ سیکڑوں ہزاروں نوراں، ریشماں قسم کی کشمیری لڑکیاں محض اس انتظار میں جہلم کے کنارے پہلگام کی کھائی اور پیر پنجال کی چوٹیوں پر کھڑی ہیں کہ کرشن چندر کے افسانوں کے بدمعاش روپے پھینک کے انھیں تاریک کوٹھریوں میں لے جائیں یا انہی افسانوں کے ہیرو شبنم سے منھ دھو کے، برف سے دانت مانجھ کے ان کے لب لعلیں کے بوسے لیں۔

عصمت چغتائی کو زبان پر قدرت حاصل ہے لیکن ایک خاص طرح کی زبان پر جو افسانے کے لیے تو موزوں ہے لیکن ناول کے لیے نہیں۔ مجنوں گورکھپوری لکھتے ہیں۔ ان کو ایک خاص طبقے کی روزمرہ کی زبان پر الہامی قدرت ہے۔ ایسی بے تکان زبان

پڑھنے والا بعض اوقات ان کا ساتھ نہیں دے سکتا ہے (ادب اور زندگی) یہ انداز بیان ظاہر ہے ناول کے لیے م
نہیں۔ عصمت چغتائی نے چار ناول لکھے ہیں۔ "ضدی"، "معصومہ"، "دل کی دنیا" اور "ٹیڑھی لکیر"۔ لیکن ناول ا
میدان نہیں۔ تقسیم کے بعد جس ناول کا سب سے زیادہ ذکر ہوا وہ "آگ کا دریا" ہے۔ پریم چند کے ناول "گئو دان
اردو ناول کا اسے اگلا سنگ میل کہا جا سکتا ہے۔ یہ ناول ۱۹۵۷ء میں شائع ہوا۔ اور اس کے چھپتے ہی ادبی دنیا میں
کچھ خاموش خاموش سی تھی، بڑی ہلچل پیدا ہوئی۔ اس ناول پر بہت کچھ لکھا گیا ہے۔ اس مختصر سے مضمون میں اس پر تفصیل
ممکن نہیں اس لیے یہاں صرف مجتبیٰ حسین کے مضمون تین کتابوں، تین نسلیں سے ایک اقتباس دیا جاتا ہے جس میں کئی
ہیں۔ میں نے قرۃ العین حیدر کے ناول کو دونوں لحاظ سے پڑھا۔ مروجہ انداز میں عام طور سے جو ناول لکھے جاتے ہیں ا
بھی، اور اس لحاظ سے بھی کہ اس میں ایک نئے قسم کا تجربہ کیا گیا ہے اور اس کا خاص کردار وقت ہے۔ جیسا کہ بتایا گیا ہے:
اس میں مجھے کوئی ملا نہیں۔ فیڈران اور قیدٹا آؤرٹ کی سیدھی سادی تکنیک پر اس ناول میں عمل کیا گیا ہے۔ اس کے سوا جو کچ
یا نیا پن اس میں ملتا ہے وہ صرف اتنا کہ ایک ہی نام کے کردار مختلف تاریخی ادوار میں آتے رہتے ہیں۔ اور کہیں کہیں ان
اشتراک اور اتحاد کا ایک شائبہ سا پایا جاتا ہے۔ سو یہ چیز بھی اتنی نہیں رہی جتنی پائیدار کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔

آگے جا کے مجتبیٰ حسین اعتراف کرتے ہیں کہ "آگ کا دریا" مجھے کوئی دلچسپ ناول نہیں معلوم ہوا۔ اس میں صفحے
سپاٹ چلے جاتے ہیں جو مختلف بیانات، اقوال اور نیم جذباتی، نیم حکیمانہ باتوں سے بھرے ہوتے ہیں۔ پھر کہیں جا کر کچھ ح
حرکت کرتے نظر آتے ہیں جو یادوں کی دھند اور کہر سے نکل کر اپنی صورت ذرا دیر کے لیے آئینے میں دیکھتے ہیں۔ بس ذرا دیر کے لیے
پھر دھند اور کہر میں چھپ جاتا ہے۔

ناول کے کم دلچسپ ہونے کی وجہ یہ ہے کہ ناول اپنے کرداروں پر بھروسہ نہیں کرتا۔ اپنے بیان کی شعریت ا
پر بھروسہ کرتا ہے۔ مگر اس نوع کا جذباتی یا تاثراتی انداز بیان زیادہ دور تک ساتھ نہیں دے سکتا۔

آخر میں بحث کو سمیٹتے ہوئے مجتبیٰ حسین کہتے ہیں کہ "آگ کا دریا" ناول کے اعتبار سے ناکام ہے۔ لیکن اس کی ناک
عظمت کی حامل ہے۔ یہ بہت بڑے پیمانے کی کوشش ہے جو کامیابی اور ناکامی دونوں سے بلند ہے۔

"آگ کا دریا" کے بعد قرۃ العین حیدر کا دوسرا اہم ناول "آخر شب کے ہم سفر" ہے۔ یہ تین لڑکیوں دیپالی سرک
اور اوما دیوی، کی کہانی ہے۔ جو بنگال کی دہشت پسند تحریک میں شامل ہو جاتی ہیں۔ تینوں انڈر گراؤنڈ میں کام کرتی ہیں
اپنے گھرانوں کے لیے مایوسی کا باعث بنتی ہیں۔ اوما دیوی کامریڈ ریحان احمد سے پیار کرتی ہیں۔ ریحان احمد جو جہاں آرا سے م
دیپالی سرکار پر فدا ہیں۔ ریحان دیپالی سرکار کے سامنے شادی کی تجویز رکھتا ہے لیکن اوما دیوی اسے بہکا دیتی ہے اور
جدا ہو جاتے ہیں۔

تقسیم کے بعد ریحان الدین احمد کرپٹ ہوتا چلا جاتا ہے اور دیپالی سرکار ولیٹ انڈیز چلی جاتی ہے۔ جب وہ
ہوتی ہے تو بنگلہ دیش بن چکا ہے۔ چند نئے کردار ہیں جن میں ایک لڑکی یاسمین مجید ہے جو رتخا مہ بنتی ہے اور بعد میں یاسمی

کالی کا ذکر "آگ کا دریا" میں بھی ہے۔ اور "آخرِ شب کے ہم سفر" میں بھی۔ "آگ کا دریا" میں قرۃ العین حیدر اس کی وضاحت اس طرح کرتی ہیں۔

سامنے مرگھٹ تھا۔ کالی ناچ رہی تھی۔ کالی جو ساری کائنات کو اس کے خاتمے پر اپنے میں سمیٹ لیتی ہے۔ صرف وہی انسان اس سے خوف زدہ ہو کر اس کی عبادت کر سکتا ہے جو اپنی خواہشوں کو ختم کر کے اس کی ذات میں فنا ہو سکے۔ مرگھٹ یہاں ساری خواہشیں جا کر بھسم ہو جاتی ہیں۔ اور کالی جو ذہن اور گویائی سے ماورا ساری جاندار کائنات کو نفی میں تبدیل کر دیتی ہے وہ دنیا کو پورن بناتی ہے۔ پورن جو روشنی اور سکوت ہے۔ وہ وسعت ہے کیونکہ لامحدود ہے۔ عظیم طاقت ہے۔ مایا سے بلند تر ہے کیونکہ خود بلا بن کر دنیا کو تخلیق کرتی ہے۔

نیلمبر دت جس نے کالی کو ستی، گوری اور جوگیالیا کے روپ میں دیکھا تھا۔ انھوں نے مرگھٹ پر نظر ڈالی اور اسے پہچانا۔ کیونکہ مرگھٹ حیات کی اصلیت تھی۔

"آخرِ شب کے ہم سفر" میں اس کا ذکر اس طرح ہوتا ہے کہ دنیا کے اس پاٹ میں ماں (کالی) بیٹھی پتنگیں اڑا رہی ہے۔ لاکھوں ڈوروں میں سے وہ ایک ڈور کاٹ دیتی ہے اور جب پتنگ کٹ کر بیکراں وسعت میں پہنچ جاتی ہے تو ماں ہنس کر تالی بجاتی ہے۔

بنگال میں کالی کی پوجا عام ہے۔ ناول کی فضا اور کردار بھی بنگال کے ہیں۔ اور دہشت پسند ہیں۔ اس لیے یہ استعارہ اور معنی خیز ہو جاتا ہے۔ دیپا، اوما، روزی سب کالی ماں کی پتنگیں ہیں۔ یعنی وقت کے بطن سے نمودار ہوتی ہیں۔ سمے کے دوش پر اڑ رہی ہیں پھر کالی ماں ان کی ڈور کاٹ دیتی ہے اور وہ خلا یا عدم کے آسمان میں کھو جاتی ہیں۔ کالی کا رقص ہر طرف جاری ہے۔ دیپا جہاں جاتی ہے وہاں تباہی نظر آتی ہے۔ دوسری جنگِ عظیم، تقسیم کا سانحہ، قحطِ بنگال، بنگلہ دیش کی جنگ، بہاریوں کا قتلِ عام، انسان ان کی دانشوری، ان کا علم و فضل سب دھرا رہ جاتا ہے بس کالی کا رقص جاری رہتا ہے۔ دیپا، اوما، روزی، یاسمین مجید، ریحان احمد بڑی امنگوں سے زندگی کا سفر شروع کرتے ہیں۔ اور ناول کے آخر میں جب ان کے سپنے ٹوٹ چکے، آدرش زنگ آلود ہو گئے، وہ عدم کی راہ تکتے نظر آتے ہیں کہ کالی کب ان کی ڈور اپنے ہاتھوں سے جدا کرتی ہے۔

قرۃ العین حیدر کے ناولوں سے یہ تاثر پیدا ہوتا ہے کہ دنیا میں کہیں چین و سکون نہیں۔ اپنے گھر، اپنے محلے میں جو سکون نظر آتا ہے وہ اقتباس پیشِ نظر ہے۔

وقت کا چکر بڑی تیزی سے گھوم رہا ہے۔ دنیا میں بڑے بڑے سانحے ہر وقت وقوع پذیر ہوتے رہتے ہیں جو ہزاروں لاکھوں انسانوں کو نگل لیتے ہیں۔ انیسویں صدی کے پہلے نصف میں ہندوستان میں سات قحط پڑے جس میں پندرہ لاکھ لوگ مرے۔ دوسرے نصف میں چوبیس قحط پڑے جس میں ایک کروڑ انسان مرے۔ دو عظیم جنگیں ایک کروڑ انسانوں کو نگل گئیں پھر تقسیمِ ہند میں لاکھوں لوگ تباہ ہو گئے۔ بنگلہ دیش، جنگِ فلسطین، ویتنام، بیروت، ہر طرف تباہی ہی تباہی ہے۔ دیپالی، روزی، اوما دیوی جیسی لڑکیاں اپنی دانست میں بڑے بڑے کام کرنے نکلتی ہیں۔ دنیا کو ایک بہتر جگہ بنانے کے لیے کوشاں ہیں لیکن ان کی بساط ہی کیا۔ وقت ان کے پرزے پرزے کر دیتا ہے۔

[illegible] قرۃ العین حیدر کے ناولوں کا مرکزی کردار دراصل وقت ہے یہی صورتحال

ان کے سوانحی ناول "کارِ جہاں دراز ہے" اور "گردشِ رنگِ چمن" بیں ہے۔ موضوع کے اعتبار سے وہ ایک منفرد ناول نگار ہیں۔ لیکن فنی اعتبار سے ان کے ناول بڑا الجھاؤ پیدا کرتے ہیں۔ "آخرِ شب کے ہم سفر" کی تہذیبی فضا بندی دلچسپ اور قابلِ تعریف ہے لیکن وہ ناول کا فطری جزو نہیں بن پائی۔ یہ وارث علوی کا اعتراض ہے اور درست ہے۔ ان کا یہ اعتراض بھی صحیح معلوم ہوتا ہے کہ کردار آتے جاتے رہتے ہیں۔ ایک دوسرے سے تعلقات بھی صحیح معلوم ہوتا ہے کہ کردار آتے جاتے رہتے ہیں، ملتے جلتے رہتے ہیں۔ ایک دوسرے سے تعلقات بھی قائم کرتے ہیں۔ لڑتے جھگڑتے اور بچھڑتے بھی ہیں۔ لیکن یہ سب کچھ ایک تیز رفتار قلم کی مانند ہوتا ہے۔ گہرائی اور گیرائی کہیں پیدا ہو نہیں پاتی۔ ان کی اس بات سے البتہ میں متفق نہیں کہ مس حیدر کا پورا مواد ایسا ہے کہ اسے گلیمرائز کیے بغیر چارا نہیں۔ اُوپری طبقے کے افراد پر وہ لکھتی ہیں۔ ان افراد کی زندگی میں کوئی ڈراما نہیں لہٰذا ان کے سیدھے سادے اور معمولی اعمال کو ڈراماٹائز کیے بغیر دلچسپ بنانا ممکن نہیں۔ انسان چاہے کسی طبقے کا ہو اچھی بری کیسی ہی زندگی جی رہا ہو، اس کی زندگی بڑی سنجیدہ ہوتی ہے۔ اس لیے یہ خیال کہ اُوپری طبقے کے افراد کی زندگی میں ڈراما نہیں گمراہ کن ہے۔

وارث علوی کی یہ بات بھی غلط ہے کہ قرۃ العین حیدر فکر کو شاعرانہ شربت میں گم کر دیتی ہیں جو ان کی نظر میں فکر کی دشوار گزار منزلوں سے آسان گزرنے اور شاعرانہ زبان اور نام نہاد اساطیر کے پُرفریب پیچوں میں پناہ ڈھونڈنے کا ہمارا پرانا طریقہ ہے۔ یہ بات بس اتنی ہے کہ تمام چیزیں مل کر ایک وحدت، ایک تاثر اختیار نہیں کر پاتیں۔ کالج کے طلبہ کی زندگیوں پر اس طرح کے رزمیے تحریر کرنا ایک بنیادی غلطی ہے۔ اس کے لیے میچور افراد کو لینا چاہیے۔

قرۃ العین حیدر ایک منفرد اور خلاق ادیبہ ہیں۔ ان کے ناول ہمارے عہد کے ایسے رزمیے ہیں جو ہمیں متوجہ کرتے ہیں نذیر احمد سرشار، رسوا، پریم چند کے بعد اگر کسی ادیب کا نام ذہن میں آتا ہے تو وہ قرۃ العین حیدر کا ہے۔ یہاں چونکہ ہم عالمی معیار پر گفتگو کر رہے ہیں اس لیے یہ باتیں ذہن میں آتی ہیں۔ ورنہ ان کی اہمیت سے کسے انکار ہو سکتا ہے۔

ناول میں معاشرہ آتا ہے اور بھرپور طریقے سے آتا ہے۔ مگر فرد اور معاشرے کے باہمی تعامل کے ذریعے سے فوکس بہر حال فرد پر رہتا ہے۔ اننا کرینینا، سدھارتھ، ڈیوڈ کوپر فیلڈ، برادر کرامازوف، مادام بواری، مابی ڈک۔ سب افراد کی داستانیں ہیں۔ ناول یورپ میں نشاۃ ثانیہ کے بعد متوسط طبقے کے فروغ کے ساتھ وجود میں آیا۔ یہ فرد یا افراد کا سماجی روحانی رزمیہ ہے۔ لیکن "گئودان" ہو یا "آگ کا دریا" "آخرِ شب کے ہم سفر" ہو یا "اداس نسلیں" ان میں فرد کی حیثیت ثانوی ہے۔ اگر ان میں از خود آب و رنگ پیدا ہو جائے تو بات اور ہے۔ ناول نگار کی پوری توجہ تاریخ اور معاشرے پر رہتی ہے۔ ہوری اور گوبر اپنی پوری شخصیت کی آب و تاب کے ساتھ سامنے آتے ہیں اور اپنا اثر چھوڑ جاتے ہیں۔ ڈپٹی نذیر احمد کے وہی کردار زوردار ہیں جو معاشرے کی قدروں سے بغاوت کرتے ہیں۔ یا اپنی انفرادی آزادی کو عزیز تر رکھتے ہیں (قمر رئیس) ذرا سوچیے اگر توبۃ النصوح چھنیا کے بجائے ظاہر دار بیگ کی کہانی ہوتی تو ناول کس قدر زوردار ہوتا۔

"اداس نسلیں" ۱۹۰۶ء سے شروع ہوتا ہے اور ۱۹۴۷ء کے تقسیم ہند تک پہنچتا ہے۔ "اداس نسلیں" کا کینوس بھی بہت بڑا ہے۔ گاؤں، شہر، سیاست، دو عظیم جنگیں۔ عبداللہ حسین نے گاؤں کی چھوٹی چھوٹی جزئیات کو خوبصورتی سے پیش کیا ہے۔ موسموں کا ذکر دل نشین ہے۔ شہر کی اعلیٰ سوسائٹی کا ذکر البتہ کمزور پڑ جاتا ہے۔ بعض تاریخی واقعات کا ذکر مصنف اسی طرح کرتا ہے۔ گویا یہ اس کا ذاتی مشاہدہ ہے۔ فنی اعتبار سے ناول کا پلاٹ پیش کش بہت اچھی ہے۔ مرکزی کردار نعیم ایک کسان کا لڑکا ہے کلکتہ میں تعلیم

کرتا ہے۔ گاؤں واپس آتا ہے۔ زمیندار کی لڑکی سے شادی کرتا ہے۔ پھر گاؤں کی زندگی سے اکتا کر فوج میں داخل ہو جاتا
ہاں سے واپسی پر وہ کانگریس کی سیاست میں شامل ہو جاتا ہے اور تقسیم ہند کے موقع پر سرحد پار کرتے وقت ایک عام کسان
دور کی حیثیت سے سفر کرتے ہوئے مارا جاتا ہے۔ یعنی زندگی کے طویل سفر کے بعد اسے اپنی اصل شناخت وہی کسان یا مزدور
ہی کی معلوم ہوتی ہے۔

یہ بات ناول کے دائرے میں کامیاب تو ہے لیکن ایک بڑے تجربے کی شکل میں ہمارے ذہن کو متحرک نہیں کرتا۔ اس
ی اہمیت یہی ہے کہ تقسیم ہند اور ہندوستان کی گزشتہ پچاس سال کی سیاست پر بہت اچھا ناول ہے۔

" اداس نسلیں" کے علاوہ " باگھ" بھی ایک اچھا ناول ہے گو کہ طوالت کا شکار ہو گیا ہے اور قدرے مبہم ہے۔

عبداللہ حسین کے علاوہ شوکت صدیقی، جمیلہ ہاشمی، خدیجہ مستور، الطاف فاطمہ، انتظار حسین اور انور سجاد کے ناول ہیں جو
ل اس پائے کے نہیں جن کا ہم نے ابھی ذکر کیا۔ اس کے علاوہ چند اچھے ناولٹ لکھے گئے ہیں جیسے " شب گزیدہ" " دلندن کی ایک رات"
چاور میلی سی" " پوہ کی راتیں" ناولٹ کا ذکر ایک الگ بحث کا متقاضی ہے جس کا یہ موقع نہیں۔

اس تجزیے سے اس بات کا اندازہ ہو سکتا ہے کہ ہمارے ناول عالمی معیار تک کیوں نہیں پہنچ سکتے۔

اوّل فارم کا احساس ہمارے ناولوں میں بہت بعد کو آیا۔ یعنی پریم چند کے آخری دور کے ناولوں سے بہت بعد کو آیا۔

دوم اصلاح یا قوم پرستی یا کوئی اور مقصد سے ناول لکھا جاتا جو تک قصہ کہانیوں سے ہی ڈیولپ ہوا اسی لیے اخلاقی عنصر
دی نقطۂ نظر ہمیشہ پیش نظر رہا۔ اس لیے ناول نگار کا زندگی کے متعلق اپنا نقطۂ نظر پس پشت رہ گیا۔

اور تیسرے یہ کہ ہمارے ہاں بڑے موضوعات بڑے کینوس پر ناول ضرور لکھے گئے لیکن ناول نگار کی نظر بجائے افراد کے معاشرے
ریخ پر مرکوز رہی۔ ناول چونکہ افراد کی زندگی کا روحانی یا سماجی رزمیہ ہے اس لیے ان ناولوں میں وہ بات نہ آپائی
بنا کرے نینا جنگ اور امن اور جرم و سزا وغیرہ میں ہے۔

۱۹۸۹ء - ۱۹۹۰ء میں

این آئی ٹی کی زبردست کامیابی

اس بار

۱.۲۵ ارب روپے

سے زائد بطور منافع تقسیم کیے جا رہے ہیں

منافع کی شرح

۲ روپے

شرح منافع

۱۶٪ فیصد

ہمیشہ سے بڑھ چڑھ کر

خدا کے فضل و کرم سے ہم اپنے یونٹ خریداروں کی توقعات پر پورے اترے۔

این آئی ٹی سرمایہ کاری کا قابل اعتماد ادارہ

نیشنل انوسٹمنٹ ٹرسٹ لمیٹڈ

NATIONAL INVESTMENT TRUST LTD

صدر دفتر: نیشنل بینک آف پاکستان بلڈنگ (چھٹی منزل)، پوسٹ بکس ۵۶۷۱، کراچی، فون ۲۴۱۵۰۹

شاخیں: کراچی ... حیدرآباد ... سکھر ... لاہور ... گوجرانوالہ ... راولپنڈی ... اسلام آباد ... ملتان ... فیصل آباد ... ایبٹ آباد ... پشاور ... کوئٹہ ... میرپور (آزاد کشمیر)

UNITED PIC-1-25-8/90

یونس احمر

ابنِ انشا کی یاد میں

۱۱؍جنوری زیادہ دور نہیں ہے جب آج سے بارہ سال پہلے وہ ہم کو داغِ مفارقت دے گئے تھے۔ میں ان دنوں اسلام آباد میں تھا جب یہ جاں کاہ اور جاں گسل خبر میں نے اخباروں میں پڑھی، دل دھک سے رہ گیا۔ میں نے اس وقت ان کی شخصیت اور شاعری پر اسلام آباد کے انگریزی روزنامہ "مسلم" کے لیے مضمون لکھا جو اگلے دن ہی شائع ہو گیا۔ ان سے میری پہلی ملاقات ملٹری اکاؤنٹس کے اس بیرک میں ہوئی تھی جہاں وہ اپنے چھوٹے بھائی محمود ریاض کے ساتھ رہتے تھے۔ میں اس بیرک میں نوشاد نوری سے ملنے گیا تھا۔ وہ بھی وہیں رہتے تھے۔ ہم لوگ مصروفِ گفتگو تھے کہ نوشاد نے ایک طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا کہ ان کو جانتے ہو۔ میں نے جواب نفی میں دیا۔ انھوں نے کہا، وہ ہیں ابنِ انشا۔ اور میں فوراً ان سے ملنے اسی طرف چلا گیا۔ جب اپنا معارف کرایا تو انھوں نے گلے لگا لیا۔ اور اس حقیر فقیر سے انھوں نے ایسی والہانہ محبت کا اظہار کیا کہ یہ رشتہ اٹوٹ بن گیا۔ میں نے ان کو یاد دلایا کہ بنگلور سے شائع ہونے والے ماہانہ رسالہ "نیا دور" میں بنگلہ افسانوں کے تراجم کا جو خاص شمارہ شائع ہوا تھا اس میں ہم دونوں کی تصویریں بھی چھپی تھیں۔ یہ سن کر وہ بولے ـــــ یار تم کو تو میں عرصے سے بنگلہ تراجم کے وسیلے سے جانتا ہوں۔ وہ اس طرح مجھ سے بے تکلف ہوئے جیسے بہت دنوں کا یارانہ ہو۔ اور یہ بے تکلفی برسوں قائم رہی۔ وہ مجھے تم کہہ کر مخاطب کرتے رہے اور میں آپ کہہ کر مخاطب کرتا۔ اس کی وجہ شاید ان کی بزرگی کا نقش میرے دل پر جم گیا تھا۔ اگرچہ وہ مجھ سے تین چار سال چھوٹے تھے لیکن ان کی شخصیت نے مجھ پر ایسا جادو کر دیا تھا کہ میں بے تکلف نہ ہو سکا۔ ہم کھڑے باتیں کرتے رہے۔ پھر وہ مجھے چائے پلوانے کے لیے دوسری طرف لے گئے۔ سارے لوگ فرش پر بستر لگا کر سوتے تھے۔ یہی حال انشا جی کا بھی تھا۔ فرش پر ان کا اور ان کے بھائی کا بستر لگا ہوا تھا۔ ان دنوں وہ قانون ساز اسمبلی میں مترجم کے عہدے پر متمکن تھے۔ اور میں ریڈیو پاکستان کے کراچی اسٹیشن میں اسٹاف آرٹسٹ تھا۔ میں اپنے دفتر سے اٹھ کر ان کے پاس چلا جاتا جو زیادہ فاصلے پر نہیں تھا۔ یہ ۱۹۵۲ء کی بات ہے۔ یعنی اب سے اڑتیس سال پہلے ہم دونوں ایک دوسرے سے ملے تھے۔ ۱۹۵۳ء میں میں ڈھاکے چلا گیا۔ اس کے بعد سے میری پریشانی کا ایسا دور شروع ہوا کہ میں ذہنی اعتبار سے تقریباً پاگل ہو گیا تھا۔

[illegible] مجھے ابتدائی مہینوں میں ریڈیو پاکستان ڈھاکہ کی معرفت میرے نام انشا جی اور احمد بشیر کے خطوط ملے جو بڑا درم

ہم اللہ نے مجھے بھجوا دیے۔ ان خطوط میں میرے لیے ایسی خوش خبری تھی جس کی وجہ سے میں سہانے خواب دیکھنے لگا۔ دونوں
مجھے بشارت دی تھی کہ کراچی سے حفیظ جالندھری صاحب کی نگرانی میں "پاک سرزمین" نامی اردو اور بنگلہ میں ایک
سالہ شائع ہو رہا ہے۔ تم کو ہم اپنی ٹیم میں شامل کرنا چاہتے ہیں۔ ڈوبتے کو تنکے کا سہارا ملا۔ میں نے فوراً جواب میں اپنی
رضامندی دے دی۔ اس کے بعد انشا جی اور احمد بشیر کے کئی خط آئے۔ افسوس کہ یہ خط ضائع ہو گئے۔

بہرحال میں ایک بار پھر کراچی پہنچ گیا۔ وزارت اقتصادی امور کے تحت دیہات سدھار کا ایک محکمہ قائم ہوا
تھا۔ حفیظ صاحب اس کے ڈائرکٹر، احمد بشیر اسسٹنٹ ڈائرکٹر اور ابنِ انشا ریسرچ آفیسر (بعد میں "پاک سرزمین" کے ایڈیٹر
بن گئے) تھے۔ میں اس رسالے کا نائب مدیر تھا۔ اس دفتر میں انشا جی کی وجہ سے ادبی فضا قائم ہو گئی تھی۔ ان سے ملنے کے لیے
کراچی کے اکثر ادیب و شاعر ان کے پاس آتے تھے۔ وہ مجھے اپنے پاس بلا لیتے اور یوں میں بھی ان سے متعارف ہوتا تھا۔ یہیں پہلی بار
مشفق خواجہ سے ملاقات ہوئی جو برابر پروان چڑھتی رہی۔ اور جب پاکستان رائیٹرز گلڈ کے قیام کا منصوبہ بنا تو انشا جی
کا کمرہ عالی جی اور دیگر ادیبوں سے ہمہ وقت بھرا رہتا۔ بیشتر اوقات میں بھی ان کی باتوں میں شریک ہوتا۔

انشا جی فطرتاً بہت ہی سادہ لوح انسان تھے۔ ایک روز میں نئی بُش شرٹ پہن کر دفتر آیا۔ وہ اس شرٹ کو بہت دیر
سے گھورتے رہے پھر مسکراتے ہوئے بولے۔ "یار یہ خوبصورت شرٹ اُتار دو اور مجھے دے دو۔" میں نے شرٹ فوراً اُتار دی۔
انشا جی پہن کر کھڑے ہو گئے اور بولے، دیکھو میں اس شرٹ میں کتنا خوبصورت لگ رہا ہوں۔ میری شخصیت ہی بدل گئی ہے۔
میں نے کہا۔ تو آپ اس کو رکھ لیجیے میں دوسری خرید لوں گا۔ لیکن انھوں نے شرٹ کو اُتارتے ہوئے کہا۔ نہیں میں قبول نہیں کرتا
ہماری بیگم خفا ہو جائیں گی۔ ہر چند کہ میں اصرار کرتا رہا لیکن وہ نہ مانے اور شرٹ لوٹا دی۔

جب کبھی میں کسی مسئلے سے دوچار ہوتا ان کے پاس چلا جاتا۔ وہ میرا حوصلہ بڑھاتے اور تسلی دیتے۔ جب میں دیہات
سدھار سے ریڈیو پاکستان کی بیرونی نشریات میں آ گیا۔ پھر بھی ہمارے درمیان کوئی زیادہ فاصلہ نہ تھا، کیونکہ وہ براڈ کاسٹنگ
ہاؤس کے بالکل مقابل پاکستان نیشنل بک سینٹر میں آ گئے تھے۔ ان دنوں میری مالی حالت کچھ بہتر نہ تھی۔ میں نے ایک رقعہ لکھ کر
ان کے پاس بھیجا اور ان سے گزارش کی کہ عالی جی سے کہہ کر ہم قلم میں جز وقتی ملازمت کا انتظام کروا دیجیے۔ دوسرے دن
انھوں نے فون کیا اور بولے، میرے ہاں فوراً آ جاؤ۔ میں گیا۔ وہ اپنے کمرے میں ایک کتاب کھولے پڑھ رہے تھے۔ مجھے دیکھتے ہی
بولے۔ بیٹھو، تمہارا کام میں نے کر دیا ہے۔ تم رائیٹرز گلڈ چلے جاؤ اور وہاں دفتر کے انچارج سے مل لو۔ لیکن تنخواہ دو سو روپے
سے زیادہ نہیں ملے گی۔ میں تیار ہو گیا۔ طے یہ ہوا کہ گلڈ کے رسالہ "ہم قلم" کو باضابطہ بنانا ہے۔ اس کی اشاعت میں فی الحال
تاخیر ہوتی ہے اس پر قابو پا لو۔ میں ریڈیو پاکستان سے دن کے دو بجے اٹھتا اور سیدھے گلڈ کے آفس پہنچ جاتا۔
ڈاک دیکھتا، جواب طلب خطوط کے جواب دیتا اور مضامین کا انتخاب کر کے کاتب کے حوالے کر دیتا۔ اداریہ عالی صاحب خود لکھتے
تھے۔ میں یہاں کوئی چھ سات ماہ تک کام کرتا رہا۔ اس کے بعد دفتر کی مصروفیات اتنی بڑھیں کہ "ہم قلم" کی ذمے داری سے
سبکدوش ہونا پڑا۔

(ریڈیو جاپان میں) تقرری یقینی ہے۔ یہ سن کر میں فوراً انشاجی کے پاس گیا۔ ان کو یہ خوش خبری سنائی۔ مسکراتے ہوئے بولے۔ یار تم وہاں بہت خوش رہو گے۔ میں نے بہت سے ملکوں کا سفر کیا ہے لیکن جاپان جیسا ملک کوئی نہ دیکھا۔ یہ مشورہ بھی دیا۔ تم اس کے لیے کوشش جاری رکھو۔ لیکن جب تبادلہ اسلام آباد ہوا تو معلوم ہوا کہ میری جگہ کسی اور کی سفارش کر دی گئی ہے۔ اسلام آباد روانہ ہونے سے پہلے میں انشاجی سے ملنے پھر گیا۔ وہ لندن جانے کی تیاری میں مصروف تھے۔ میں جب ان کے دفتر پہنچا تو کمرہ خالی تھا۔ انشاجی کہیں گئے ہوئے تھے۔ لہٰذا میں ان کے نائب ابراہیم سعد صاحب کے کمرے کی طرف چلا گیا۔ وہ مل گئے۔ میں نے انشاجی کے بارے میں پوچھا۔ وہ بولے کہ کچھ دیر پہلے ایک اہم میٹنگ میں شرکت کے لیے نکل گئے ہیں۔ میں نے ان کی علالت کے بارے میں پوچھا تو انھوں نے کہا کہ بھئی ان کا مرض لاعلاج معلوم ہوتا ہے۔ اصل مرض بتانے سے پہلے انھوں نے سختی سے منع کیا کہ میں کسی سے نہیں کہوں گا۔ ان کو خون کا سرطان ہو گیا ہے۔ یہ سن کر میرا جی دھک سے ہو گیا۔ حالانکہ میں اکثر و بیشتر ان سے ملتا رہتا تھا لیکن اپنی علالت کے بارے میں انھوں نے کبھی بھی مجھ سے کوئی بات نہ کی، نہ ان کے چہرے پر فکر و تردد کی کوئی علامت دیکھی۔ ان کی بذلہ سنجی اور ہونٹوں پر ویسی ہی مسکراہٹ دیکھ کر کوئی اس بات کا کیسے اندازہ لگا سکتا تھا کہ وہ کسی موذی مرض میں مبتلا ہیں۔ میں ابراہیم سعد کو خداحافظ کہہ کر ان کے دفتر سے نکل گیا۔ اور بہت دیر تک انشاجی کا چہرہ میری آنکھوں کے سامنے گھومتا رہا۔ جب میں آخری بار ان سے ملا تھا تو دیکھا کہ ان کے ہونٹ بہت موٹے ہو گئے ہیں، پھر بھی ان سے مسکراہٹوں کے شگوفے کھل رہے تھے اور ان کے یہ الفاظ۔ "کیوں میاں کیسے ہو۔ ریڈیو کا کاروبار کیسا چل رہا ہے۔" میرے کانوں میں گونج رہے ہیں۔ "یار آؤ گلے تو مل لیں" اس دن میں کوئی اور ریشمی شرٹ میں ملبوس تھا۔ پوچھنے لگے۔ وہ ریشمی شرٹ سنبھال کر رکھنا۔ میں تم سے لے کر رہوں گا۔ لیکن نہ اب وہ شرٹ ہی ہے اور نہ اس کا چاہنے والا۔ کتنا معصوم اور بھولا انسان تھا۔ اس کی باتوں میں زعفران کی خوشبو تھی اور مسکراہٹ میں ماہ چہار دہم کی دمک۔ ان سے بچھڑے ہوئے بارہ سال سے اوپر ہو گئے لیکن کوئی دن ایسا نہ گیا کہ ان کی یاد خوشبو بن کر نہ آئی ہو۔

اب کچھ ڈاکٹر ریاض احمد ریاض کی کتاب "ابن انشا۔ احوال و آثار" کے بارے میں جسے عالی جی کے حرفے چند کے ساتھ انجمن ترقی اردو پاکستان نے شائع کیا ہے۔ حرفے چند میں ابن انشا سے عالی جی کی محبت کا بے پناہ اظہار ہے۔ اور کیوں نہ ہوتا۔ دونوں شخصیات ایک جان دو قالب کے مصداق تھیں۔ ڈاکٹر ریاض احمد نے جس محنت اور لگن سے کتاب مرتب کی وہ اپنی مثال آپ ہے۔ انھوں نے انشاجی کی شخصیت اور شاعری کا کوئی گوشہ ایسا نہیں چھوڑا ہے جس سے تشنگی کا احساس ہو۔ لندن میں آخری منصبی فرائض صفحہ ۳۱۸ سے لے کر صفحہ ۳۲۷ تک اتنا غمناک اور جانگداز ہے کہ ان صفحات کو پڑھ کر آنکھیں بھر آتی ہیں اور دل میں ٹیس سی اٹھنے لگتی ہے۔ انشاجی نے اپنے لئے آخری کی پیش گوئی ان اشعار میں اس طرح کی ہے۔

بند آنکھیں ہوئی جاتی ہیں پسارے پاؤں — نیند سی نیند ہے اب نہ اٹھانا لوگو

ایک ہی شب ہے طویل، اتنی طویل اتنی طویل — اپنے ایام بس امروز نہ فردا لوگو

سیّد مظفّر حسین رزمی

افسر ماہ پوری ــ فن اور شخصیت

افسر ماہ پوری کا پہلا شعری مجموعہ "غبارِ ماہ" جو ان کی غزلیات پر مشتمل ہے ۱۹۸۶ء میں شائع ہوا۔ یہ اشاعت اس لحاظ سے اہم ہے کہ ایک ایسے شاعر کے وجدانی اور شعری تجربات کا روشن آئینہ ہے جس نے اپنی تمام عمر شعر و ادب سے وابستگی میں صرف کی ہے۔

کسی فن پارے کے حسن و قبح کا تجزیہ اس وقت تک صحیح معنوں میں نہیں ہو سکتا جب تک فن کار اور فن کے باہمی رشتوں کا ادراک نہ ہو۔ شاعر کی شخصیت ایک آئینہ ہے اور اس کا فن ایک دوسرا آئینہ۔ شاعر کے اسی عکس در عکس منظر کی تصویر افسر صاحب نے اس شعر میں دیکھیے:

پہلے ان آنکھوں میں اک بار ذرا دیکھ تو لو　　　　پھر اسی آئینہ خانے میں سنورتے رہنا

افسر ماہ پوری عمر کے تقریباً ستّر منزلیں طے کر چکے ہیں اور ان کی عمر کی کم و بیش پانچ دہائیاں پہلے کلکتے پھر ڈھاکے میں گزریں۔ سقوطِ ڈھاکہ کے بعد کراچی آ گئے اور یہیں مقیم ہیں۔ پچاس برس، عمر کی ایک بڑی اور وقیع مدّت ہوتی ہے جس کو جزا و سزا کے بغیر شعر و ادب کی آبیاری میں گزار دینا ہر شخص کے بس میں نہیں۔

بس اک انداز سے ہم آج تک ہیں گامزن افسر　　　　نہ رفتارِ قدم ٹوٹی نہ تارِ جستجو ٹوٹا

اور واقعی قلم سے جو پیمان وفا انھوں نے اوائلِ عمر میں باندھا تھا وہ آج بھی اسی طرح استوار و محکم ہے۔ افسر صاحب کی تحسین و ستائش سے بے نیاز نام و نمود سے مستغنی شخصیت میں ایک مخصوص دل آویزی و سلیقہ مندی ہے۔

افسر ماہ پوری کی تمام عمر ایک کشمکش اور اضطراب میں گزری ہے۔ انھیں یار و اغیار دونوں کے وار سہنے پڑے مگر کوئی حرفِ شکایت کبھی ان کے ہونٹوں تک نہیں آیا۔ مگر آخر وہ بھی ایک انسان ہیں، کبھی ناقدری کا خیال آیا تو اس احساس کو سخن کے پردے میں یوں بیان کر دیا۔

گل ہو گئے ہیں خود ترے دامن کے فیض سے　　　　ایسے بھی کچھ چراغ تری انجمن میں ہیں

اس شعر میں جو طنز ہے وہ تلخ نہ ہونے کے باوجود حسّاس دلوں کو تڑپا دیتا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ ان کی شخصیت اور فن میں جو مماثلت پائی جاتی ہے وہ اور شعرا کے یہاں نایاب نہ سہی، کم یاب ضرور ہے۔

ان کی سادہ مزاجی ان کی شاعری میں یوں رواں دکھائی دیتی ہے جیسے کوئی دریا بہہ رہا ہو کسی شور و شغف کے بغیر اور پورے نظم و ضبط کے ساتھ۔

افسر ماہ پوری اپنی افتادِ طبع کے اعتبار سے رجائیت پسند واقع ہوئے ہیں۔ مایوسی اور پسپائی سے کبھی نہیں گھبراتے سنبھل سنبھل کر گرتے اور گر گر کر سنبھلتے ہیں۔ انھیں چونکہ روشنی سے پیار ہے اس لیے ان کی شاعری بھی انسان دوستی اور کشادہ دلی کی مظہر ہے۔ اور ایک ایسی روشنی ہے جو شاہراہِ زندگی میں سمت نمائی کا فرض انجام دیتی ہے۔

اسی امید پہ ہم گامزن ہیں راہِ منزل میں　　یہاں ظلمت سہی آگے کہیں تنویر بھی ہوگی

یہ دنیا ہے یہاں بے حوصلہ کچھ بھی نہیں ملتا　　جسے مہتاب لینا ہو وہ دریا میں اتر جائے

ان معروضات کے بعد یہ بات پورے وثوق کے ساتھ کہی جاسکتی ہے کہ افسر کا شعری رویّہ ان کے ذاتی تجربات اور مشاہدات پر مبنی ہے۔ اور جب یہ رویّہ شعر کے پیکر میں ڈھلتا ہے تو زندگی کی لامحدود وسعتوں کو اپنے اندر جذب کر لیتا ہے۔ حیات و کائنات کی یہ ترجمانی اسے احساس کی گہرائی اور جذبات کی گیرائی سے حاصل ہوتی ہے جس کے لیے وہ عمر بھر درد و غم جمع کرتے رہے۔ ذرا دیکھیے افسر کی ریاضت زندگی کے ان گنت گوشوں کو کیسے سامنے لاتی ہے۔

وہ کہیں ملتا تو امکانِ سفر ہو جاتا　　کو بہ کو میرا بھٹکنا بھی سفر ہو جاتا

ایک خاکہ سا بنا تا شبِ تنہائی میں　　اس میں پھر رنگ تمناؤں کے بھرتے رہنا

یہ حقیقت اہلِ نظر سے مخفی نہیں کہ شعر و ادب کا ہر دور اپنے مخصوص مسائل اور موضوعات رکھتا ہے اور انہی مسائل اور موضوعات کی بازگشت ہر فن کار کی تخلیقات میں سنائی دیتی ہے۔ البتّہ ان مسائل اور مضامین کے بارے میں ہر فن کار کا اپنا لب و لہجہ ہوتا ہے اور اسی لب و لہجے سے اس کی انفرادیت اور خصوصیت کا تعیّن ہوتا ہے۔ ہر چند افسر ماہ پوری کی شعری نشو و نما تقریباً چالیس برس پہلے ہوئی مگر وہ ہر عشرے کے مسائل و مصائب کا براہِ راست تجربہ رکھتے ہیں۔ اور اپنی شاعری میں ان کا موثر اظہار کرنے اور ان کے تقاضوں اور مطالبوں کا ساتھ بھی دیتے ہیں۔ چنانچہ آج بھی ان کی شاعری موجودہ عصری بصیرت کی آئینہ دار ہے ؎

دیکھنا یہ ہے کہ محفل میں محبّت کے دیے　　کتنے انساں نے بجھائے ہیں ہوا نے کتنے

دھجیاں اور وں کے دامن کی لیے پھرتے ہیں　　اس زمانے کے ہیں عشاق سیلانے کتنے

درختوں سے پرندوں کی صدا آتی نہیں افسر　　سحر تو ہو گئی لیکن سحر ایسی نہیں ہوتی

افسر نے صبح ہونے کی علامت کو پرندوں کی چہکار قرار دیا ہے۔ صبح ہونے کی سب سے بڑی نشانی چڑیوں کی چہکار ہوتی ہے۔ بات کرنے کے اس براہِ راست پیرایہ نے شعر میں وہ تاثیر بھر دی ہے جس کو صرف محسوس کیا جاسکتا ہے۔

ـ کی زندگی شکست خواب کا روح فرسا منظر اور پھر سقوطِ ڈھاکا کے بعد لاکھوں بے گناہوں کا قتل عام۔ لاکھوں
کو بے چراغ ہوتے دیکھنا۔ اور دل و دماغ پر اس کے انتہائی کربناک اثرات افسر کی شاعری کا ایک دردناک حصہ ہیں۔

چمن میں ہر طرف اپنا لہو دیکھا نہیں جاتا　　الٰہی یہ مآلِ آرزو دیکھا نہیں جاتا

کہنا محال ہے کہ لُٹا کیسے کارواں　　رشتے کچھ ایسے راہبر و راہزن میں ہیں

ہم کو کوئی گلہ نہیں گردشِ صبح و شام سے　　راہِ خدا میں ہم لُٹے اپنوں کے اہتمام سے

ان مصائب و مراحل کے باوجود افسر نہ تو مایوس ہوتے ہیں نہ تقدیر کے شکوہ سنج۔ بلکہ ان کا خیال ہے۔

بہار آئے گی گلشن میں تو دار و گیر بھی ہوگی　　جہاں اہلِ جنوں ہوں گے وہاں زنجیر بھی ہوگی

اسلوب ہی کے سلسلے میں ان کی ایک اور اہم خصوصیت کا ذکر ناگزیر ہے اور وہ ہے ان کی غزلوں میں تخیلی و اسلوبی
ات کی کارفرمائی۔ افسر اپنی شاعری میں نہایت دل کش علامتوں کا استعمال کرتے ہیں۔ مثلاً خواب، آنگن، چاند، پھول،
بنہ وغیرہ ان کے یہاں بار بار آتے ہیں۔

کون یاد آتا ہے آج کل خدا جانے　　چاند میرے آنگن میں رات بھر چمکتا ہے

رات بھر چلتی ہے ان کی یاد کی ٹھنڈی ہوا　　لمحہ لمحہ صبح تک دامن میں بھر جاتے ہیں پھول

وہ ایک روز مرے رنگِ جاں سے گزرا تھا　　غزل میں ڈھل گیا پھر اس کے نقشِ پا کا سکوت

وہ دستِ حنائی سے دالوں کا بکھر جانا　　شاخوں سے پرندوں کا آنگن میں اُتر جانا

ان کی یادوں سے سکوں ملتا ہے کتنا دل کو　　پیڑ او جھل ہے مگر چھاؤں گھنی ہے کتنی

اس میں کوئی شک نہیں کہ افسر ماہ پوری کے شعری تجربوں کی صداقت جب ان کے آئینۂ اظہار میں عکس پذیر ہوتی ہے
تو قاری کے دل و نظر میں ایک گلشن سا کھل اٹھتا ہے۔ اندازِ بیاں میں بلا کی سادگی ہونے کے باوجود وہ غزل کی رنگیں نوائی کا
اہتمام کچھ یوں کرتے ہیں کہ شعر شعر میں مختلف رنگوں کی چمک اور متفرق خوشبوؤں کی مہک پیدا ہو جاتی ہے۔ دردمندی و سادگی
ایجاز و اختصار اور فنِ بیان کی قدرت انھیں مکتبِ میر سے منسلک کرتی ہے یوں بھی وہ زندگی کے جس دورِ ابتلا سے گزر رہے ہیں وہ
میر کے دور سے بہت قریبی مناسبت رکھتا ہے۔ اور اسی لیے میں افسر کا شمار اس دور کے نمائندہ غزل گو شلاً ناصر کاظمی اور
حفیظ ہوشیارپوری وغیرہ کی صف میں کرتا ہوں۔ انھیں کی طرح افسر کے یہاں بھی زندگی کی کربناکی نئی زندگی کا خواب افسردگی

اداسی اور امید و رجا کی چمک دمک ملتی ہے جو افسر کی شاعری کی پہچان بن گئی ہے۔

افسر ماہ پوری کی غزل کا بنیادی مزاج کلاسیکی ہے لیکن اس کے ساتھ ہی افسر ماہ پوری کی غزل جدید طرزِ احساس سے مملو بھی ہے۔ کلاسیکی رنگ و آہنگ کے حامل شعروں کے پہلو بہ پہلو ان کے یہاں جدید طرزِ احساس کی موجودگی نے ان کی غزل میں ایک گنگا جمنی کیفیت پیدا کر دی ہے جو دلکشی سے خالی نہیں اور اسی سے افسر کی غزل کی مقبولیت کا دائرہ وسیع تر ہوا ہے۔

آتی ہے یہ آواز یہ آواز کہاں سے ‏ ‏ ملتے ہیں ہمیں جینے کے انداز کہاں سے

یکساں بیان ہوتی نہیں داستان عمر ‏ ‏ کچھ لگ گئے ہیں الٹے ورق اس کتاب میں

پہچان آدمی کی نہیں سہل آج کل ‏ ‏ اک آدمی چھپا ہوا ہر آدمی میں ہے

ایک دن دیکھنا ایسا ہوگا ‏ ‏ آئینہ ہوگا نہ چہرہ ہوگا

گلہائے رنگ رنگ
(ہندی افسانچے)

بلبیر تیاگی / شاہین فاطمہ

بغاوت

اپنی ہتھوڑی اور چھینی کے ساتھ وہ ہر وقت سنگ تراشی میں مشغول رہتا۔ پتھروں کے کٹنے اور تراشنے سے نئے نئے چہرے مجسموں کی شکل اختیار کرتے رہتے۔ بھگوان کو اس کی اس مشغولیت پر ایک دن ترس آ گیا۔ سوچا چل کر اس سے کچھ باتیں کی جائیں۔ تاکہ اس کا دل بہلے۔

بھگوان چپ چاپ جا کر اس کے اسٹوڈیو میں کھڑے ہو گئے۔ سنگ تراش اپنے کام میں اتنا محو تھا کہ بھگوان کھڑے کھڑے تھک سے گئے۔ جب وقفہ کسی قدر طویل ہو گیا تو بھگوان ایک قدم آگے بڑھ کر بولے۔ "فن کار، تم اپنی اس زندگی سے خوش تو ہو نا؟"

سنگ تراش کے ہاتھ رکے نہیں، صرف پلکیں اٹھیں۔ چھینی پر ہتھوڑی سے چوٹ مارتے ہوئے وہ بولا۔

"بس گزارا ہو جاتا ہے کسی طرح بھگوان"

بھگوان لہجے کی اداسی کو بھانپ کر بولے۔

"ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے تم اپنی زندگی سے مطمئن نہیں ہو۔ تم کو ایک فن کار بنا کر میں نے اتنی عظمت اور شہرت بخش دی پھر بھی ...."

یہ سن کر اس کے ہاتھ خود بخود رک گئے اور پیشانی پر فکر اور پریشانیوں کی لکیریں ابھر آئیں۔

"کہتے تو تم بھی ٹھیک ہو بھگوان! مگر محرومی میں عظمت کے معنی صرف مقصد ہوتے ہیں۔ اور جب مقصد حقیقت کی سنگلاخ چٹانوں سے ٹکرا کر چور چور ہو جاتے تو ......"

ایک فن کار کے منہ سے ایسی باتیں سن کر بھگوان حیرت زدہ رہ گئے۔ ان باتوں سے انھیں انقلاب کا لاوا پھوٹتا ہوا محسوس ہوا۔ انھیں قطعی امید نہ تھی کہ پتھروں میں نرم و نازک جذبات و احساسات کو ابھارنے والا فن کار بھی بغاوت پر آمادہ ہو سکتا ہے؟

اپنے ماتھے کا پسینہ پونچھتے ہوئے فن کار پھر بولا۔

"مجھ عظ... عطا کر کے آپ نے اپنے کام کو مکمل سمجھ لیا ..... ؟ جب کہ میں نے ایک بے جان پتھر کو بھگوان کا روپ

دے کر اتنا عظیم بنا دیا کہ لوگوں نے اس کو سونے اور چاندی سے لاد دیا۔ اس کا سہرا میری محنت اور فن کا رانہ لگن کے سر ہے۔ ورنہ پتھر کے پہاڑ کو کون پوچھتا ہے۔"

یہ سن کر جب بھگوان سے کچھ کہتے بن نہ پڑا تب وہ چپ چاپ وہاں سے سدھار گئے۔

انوراگ / شاہین فاطمہ

حاضری

چائے کے ایک کھوکھے والے کو گانجہ، چرس بیچنے کے الزام میں پولیس نے پکڑ کر دارو غہ جی کے سامنے پیش کر دیا۔

سالے ...... تیری ..... داروغہ جی نے روایتی گالیوں سے اس کو خوش آمدید کہا۔

"چائے کی دکان میں گانجہ، چرس بیچتے ہو۔ قانون کی خلاف ورزی کر کے ملک اور قوم سے غداری کرتے ہو۔ تیری چمڑی اُدھیڑ دوں گا۔"

کھوکھے والا دارو غہ جی کے غصّہ اور تیور دیکھ کر گھبرا گیا۔ اس کی آنکھوں سے خوف نمایاں تھا۔

"حضور، غریب آدمی ہوں۔ بال بچوں کا پیٹ کسی طرح پالتا ہوں۔ بس ایک بار معافی دے دیں دوبارہ ایسی غلطی نہیں کروں گا۔ بیوی بچے چاہے بھوکوں مر جائیں ..... بس ایک بار معاف کر دیں حضور صرف ایک بار۔"

"گانجہ چرس تو کس سے حاصل کرتا ہے؟"

"کالی چرن سے حضور۔" وہ منمنایا۔

"اوہ! وہ تو پچھلے داروغہ کا آدمی ہے۔"

"اچھی طرح سمجھ لو کہ اب تم گانجہ اور چرس اس سے حاصل کروگے۔ یہ میرا خاص بندہ ہے۔"

"سمجھ گیا حضور، اچھی طرح سمجھ گیا۔"

"اور میرا حصّہ بھی وقت پر ...."

"بالکل سمجھ گیا حضور ..... بالکل بے فکر رہیں۔"

"علاقہ کے سارے خاص خاص لوگ آکر اپنی حاضری لگا گئے۔ اور تیرے لیے سالے ..... سپاہیوں کو بھیجنا پڑا۔"

"غلطی ہو گئی حضور۔"

ہاتھ جوڑ کر وہ بولا۔ پھر اس نے جھٹ جیب سے ایک سو کا نوٹ نکال کر غلطی کی تلافی کر دی۔

دارو غہ جی نے ایک عدد موٹی سی گالی دے کر مانو اس کو جانے کی اجازت دے دی۔ اور وہ آخری سلام ٹھونک کر اِتنا ہوا تھانے سے باہر آ گیا۔

منگل پانڈے / شاہین فاطمہ

ثبوت

ریٹائرڈ ماسٹر رام چندر جب اپنی پینشن لینے دفتر پہنچے تو متعلقہ بابو نے انھیں بتایا کہ ریکارڈ کے حساب سے وہ فوت ہو چکے لہذا پینشن پانے کے وہ اب حق دار نہیں رہے۔

"میں تو آپ کے سامنے زندہ موجود ہوں" رام چندر بولے۔

"وہ تو ٹھیک ہے لیکن اس کا ثبوت کیا ہے؟ ہم کو تو ثبوت چاہیے۔ آپ خود صاحب سے مل لیں تو بہتر ہوگا"

بابو نے اسے مشورہ دیتے ہوئے کہا۔

رام چندر صاحب سے ملے تو انھوں نے بھی متعلقہ بابو کی بتلائی ہوئی بات دہرادی۔

یہ سن کر رام چندر طیش میں آگئے اور انھوں نے غصّے میں چند ہاتھ صاحب کے جھاڑ دیے۔ اس پر صاحب نے ان کے خلاف مقدمہ کر دیا۔

جب پیشی ہوئی تو رام چندر نے واشگاف الفاظ میں اقبالِ جرم کر لیا۔

جج نے ان کی ضعیفی کا لحاظ کرتے ہوئے صرف دس روپے جرمانہ عائد کیا..... اور آئندہ کے لیے تاکید کرتے ہوئے کہا۔

"ماسٹر صاحب، آپ خود سمجھ دار ہیں، دوسروں کو راہ دکھاتے ہیں... پھر اتنا غصّہ.... اور ایسی غلطی کیوں؟"

"آپ کی ساری باتیں بالکل صحیح ہیں جنابِ والا" ماسٹر صاحب نے کہا۔ "مگر اپنی زندگی کا اس سے سستا ثبوت میں کسی اور طریقے سے نہیں دے سکتا تھا۔ آئندہ آپ کی بات کا خیال ضرور رکھوں گا۔"

انک شری / شاہین فاطمہ

قید

اپنے ملک کی سرحد کے نزدیک مویشیوں کو چراتے ہوئے ایک غیر ملکی فوجی نے زبردستی اسے پکڑ لیا اور الزام لگایا کہ جاسوسی کی نیت سے سرحد اس پار اس کی فوجی حدود میں داخل ہوئی ہے۔ فوجی نے رات بھر اسے اپنے کیمپ میں نظر بند رکھا اور اگلی صبح اپنے ایک افسر کے سپرد کر دیا۔ وہ افسر اس سے کئی راتوں تک مزید تفتیش

سرحد کے قریب پکڑے جانے کے بعد ایک سے دوسرے افسر تک ہوتے ہوتے بالآخر جب وہ جیل پہنچی تو آٹھ ماہ گزر چکے تھے۔ جیل کا رجسٹر پُر کرتے وقت یہ تحریر کیا گیا کہ کل سرحد کے نزدیک جاسوسی کے الزام میں جو لڑکی پکڑی گئی ہے وہ حاملہ ہے۔

طویل عرصے بعد جیل سے رہا ہوکر جب وہ اپنے وطن واپس پہنچی تو وہ پاگل ہو چکی تھی۔ لہذا اپنے ملک کے پاگل خانے میں وہ پھر قید کر دی گئی۔

گل ہائے رنگ رنگ
پنجابی کہانی

پروین ملک / توقیر چغتائی

آسرا

"باجی جی! میں آپ کے گھر سے نہیں بھاگوں گا۔" مودے نے مجھے اطلاع دی۔
"کیا مطلب؟" میں نے پوچھا۔ کیونکہ بات میری سمجھ میں نہیں آئی تھی۔
"وہ جی، میں پہلے جن گھروں میں کام کرتا تھا وہاں سے بھاگ جاتا تھا۔ مگر اب نہیں بھاگوں گا۔
"اب کیا کوئی خاص بات ہے؟"
"جی اب میں بڑا ہو گیا ہوں۔ مجھے پتا ہے آپ جیسے اچھے لوگوں کے پاس رہنے میں میرا ہی فائدہ ہے۔" اس نے کرسی پر کھڑے ہو کر برتن دھوتے ہوئے جواب دیا۔ کیونکہ زمین پر کھڑے ہو کر اس کا ہاتھ نلکے تک نہیں پہنچتا تھا۔
"مودے! تمہاری عمر تقریباً کتنی ہوگی؟"
"پتا نہیں جی! شاید میری ماں کو پتا ہو۔ پر جی اس کو بھی کیا یاد رہی ہوگی۔ عمر بھی کوئی یاد رکھنے والی چیز ہے۔"
مودے کی اس فلاسفی کا میرے پاس کوئی جواب نہیں تھا۔ میں چپ ہو گئی۔ پر اس کو تو خواہ مخواہ بات بڑھانے کی عادت تھی۔ ابھی اسے ہمارے گھر آئے ہوئے ایک ہفتہ ہی ہوا تھا۔ مگر اس نے بول بول کر اور چیزوں کے بارے میں سوال پوچھ پوچھ کر میرا دماغ چاٹ لیا تھا۔ میری بھی مجبوری تھی۔ نوکر آج کل ملتے کب ہیں۔ اس لیے ان کی بہت ساری باتیں برداشت کرنا ہی پڑتی ہیں۔ میں نے سوچا، ایک دو دن بول بول کر جب مودے کی زبان کا زنگ اتر جائے گا تو خود ہی خاموش ہو جائے گا۔ مگر تو بہ کریں جی، وہ مودا ہی کیا جو دو منٹ کے لیے بھی زبان تالو سے لگا لے۔ اب پھر بول پڑا۔
"باجی، میرا بھی جی چاہتا ہے کہ میں پڑھوں۔ مگر ماں نے میری یہ بات سُن کر وہ پٹائی کی کہ میں ساری باتیں بھول گیا۔"
"کیوں مارا تھا تجھے ماں نے؟" میں نے یونہی بے دھیانی سے پوچھا۔
"جی! وہ کہتی تھی ہمیں کیا لینا ہے پڑھائی سے۔ کہیں کام پر لگ گئے تو چار پیسے لے آؤ گے۔ تم نے پڑھ کر کونسا بابو بن جانا ہے۔"
"تو کیا بابوؤں کے سروں پر سینگ ہوتے ہیں۔" میں نے اس کی دلجوئی کے لیے کہا۔ اگر تمہیں اتنا ہی شوق ہے تو

میں پڑھا دیا کروں گی۔"

"سچ باجی جی!" اس کے پپڑی جمے ہوئے ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیل گئی اور بجھی ہوئی آنکھیں چمکنے لگیں۔

"میں پڑھ سکتا ہوں؟ میں بھی پڑھ جاؤں گا؟"

"ہاں، ہاں کیوں نہیں" میں نے تسلی دی۔

"آپ، جی کتنی اچھی ہیں۔ میں آپ کے گھر سے کبھی نہیں بھاگوں گا۔"

یہ کہتے ہوئے شاید خوشی کے مارے اس کے ہاتھ کانپ اٹھے اور نئے سٹ کی پلیٹ کے چار ٹکڑے ہو گئے۔
میں نے مڑ کر دیکھا تو شودا اپنی جھکی نظروں میں رحم کی اپیل لیے کھڑا تھا۔ اس کی نظر بن جیسے میرا کلیجہ چیر گئیں۔ بیچارا چھوٹا سا بچہ اسے کتنی فکروں نے گھیرا ہوا ہے۔ میں دوبارہ اپنے کام میں مصروف ہو گئی۔

"باجی جی، آپ نے مجھے پیٹا نہیں؟

"کوئی بات نہیں۔ غلطی انسان سے ہی ہوتی ہے۔ اس میں پٹائی کی کیا بات ہے۔"

میں نے کہا تو اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔

"وہ جی، پہلی والی بیگمات تو مجھے بہت پیٹتی تھیں۔"

دوسرے دن میں اس کا قاعدہ اور تختی لے آئی اور پڑھائی شروع کر دی۔ مگر میں اس کی باتوں سے بہت عاجز تھی۔ سبق تو فر فر پڑھتا تھا مگر پڑھنے کے درمیان دوسری باتیں چھیڑ دیتا تھا۔ ایک دن وہ سبق پڑھ رہا تھا۔

"بابا آیا۔ آم لایا" کہنے لگا۔

"ہمیں تو پتا ہی نہیں آم کا ذائقہ کیسا ہوتا ہے۔ ابا ہوتا تو آم لاتا۔ مگر وہ تو اس وقت ہی فوت ہو گیا تھا جب میں چھوٹا سا تھا۔ مجھے تو ابا کی شکل و صورت بھی یاد نہیں۔ ماں کہتی ہے تم میری گود میں تھے جب وہ فوت ہوا تھا۔ مگر ماں نے جب دوسری شادی کی اس وقت میں بڑا ہو گیا تھا۔"

"تیری ماں نے دوسری شادی کر لی اور تجھے پھر بھی پڑھایا لکھایا نہیں؟"

"وہ جی، کیا کرتی بے چاری۔ چھ بچوں کو کیسے پالتی۔ میرا نیا ابا بھی بہت ناکارہ ہے۔ ایک پیسہ نہیں دیتا۔ روز نشہ کر کے آ جاتا تھا اور ہم سب کی پٹائی کرتا تھا۔ اس لیے ماں نے ہمیں کام پہ لگا دیا تاکہ اس کی مار سے تو بچے رہیں۔"

"اب گزارہ ہو جاتا ہے تمہارا؟"

"ہاں جی، میرے بڑے بھائی کب سے کام پہ لگے ہوئے ہیں۔ میں بھی کام کرتا ہوں۔ اب ٹھیک ٹھاک گزارا ہو جاتا ہے۔ اب میں پڑھ لکھ کر بابو بن جاؤں گا۔ اور پھر ماں کو نئے کپڑے لے کر دوں گا۔ اور جی اسے مزیدار چیزیں بھی کھلاؤں گا۔ بے چاری خشک ٹکڑے چبا چبا کر تنگ آ چکی ہو گی۔"

"اچھا، اب تم تقریر بند کرو اور سبق یاد کرو۔"

[illegible] سبق پڑھ سکا۔

ایک دن میں نے تنگ آ کر کہہ ہی دیا۔

"مُودے! اگر تم نے تعلیم حاصل کرنی ہے تو سب کام چھوڑ کر سب سے پہلے سبق یاد کیا کرو نہیں تو میں پڑھائی بند کر دوں گی۔"

پھر یوں ہونے لگا کہ میں کوئی کام بتا کر اِدھر اُدھر ہو گئی۔ جب واپس آئی تو مُودا غائب۔

"مُودے! تم کہاں تھے؟"

"باجی جی! سبق یاد کر رہا تھا۔ اس کا یہ جواب مجھے لاجواب کر دیتا تھا اور میں دل ہی دل میں شرمندہ ہو کر وہ کام خود ہی کر لیتی تھی۔ مگر جب لہسن اور پیاز کی بو میرے ہاتھوں میں رچ گئی اور برتن مانجھتے مانجھتے ناخن گھس گئے تو مجھے مُودے کی پڑھائی سے چڑ سی ہونے لگی۔ مگر کیا کرتی؟ وہ کہتے ہیں کہ جب اوکھلی میں سر ڈال دیا تو موسلوں سے کیا ڈرنا مجھے بھی اب اپنے کیے کا کوئی علاج نہیں سوجھ رہا تھا۔ ویسے کبھی کبھی مُودے سے کہہ دیتی تھی کہ پہلے کام کیا کرو اس کے بعد سبق یاد کیا کرو۔ مگر وہ سبق میں اتنا ڈوب جاتا تھا کہ قاعدہ سامنے ہو یا نہ ہو وہ آنکھیں بند کر کے طوطے کی طرح بولتا چلا جاتا تھا۔

ایک دن میں کام سے واپس آئی۔ تھکی ہوئی بھی تھی اور مجھے بھوک بھی لگ رہی تھی۔ میں نے جلدی جلدی منھ پر پانی کے چھینٹے مارے اور مُودے کو آواز دی۔

"مُودے! کھانا لے آؤ۔" اور خود اخبار دیکھنے لگی۔ پندرہ منٹ گزر گئے یا شاید آدھا گھنٹہ، مگر کھانے کی شکل نظر نہ آئی۔ میں کچن کی طرف چل دی۔ چولھے پر خالی توا رکھا جل رہا تھا اور مُودا سر ہلا ہلا کر سبق پڑھ رہا تھا۔ ایک دم میرا دماغ پھرکی کی طرح گھوم گیا۔ میں نے مُودے کے ہاتھ سے قاعدہ چھین کر دور پھینک دیا۔ وہ حیرانی سے مجھے یوں گھور رہا تھا جیسے پتھر کا بن گیا ہو۔ میں نے اس کا بستہ اٹھا کر ایک کونے میں رکھ دیا اور چیخ کر کہا۔

"بس بہت ہو گیا۔ تمہارا پڑھنا لکھنا بند۔" وہ اسی طرح کھڑا رہا اور کچھ دیر بعد آہستہ آہستہ قدم اٹھاتا جیسے نیند میں چلتے ہوئے دروازے سے باہر نکل گیا اور آج تک واپس نہیں آیا۔

گل ہائے رنگ رنگ

گارسیا لورکا / عبدالعزیز خالد

وصیّت

(گارسیا لورکا بیسویں صدی کا اسپین کا مشہور ترین شاعر ہے۔ وادیٔ غرناطہ اس کا مولد اور ۵ جون ۱۸۹۸ء اس کی تاریخِ ولادت ہے۔ جولائی ۱۹۳۶ء میں خانہ جنگی کے ابتدائی دنوں میں اس مطربِ محبّت کو چند نامعلوم دہشت گردوں نے قتل کر کے اس کی لاش کو بھی غائب کر دیا۔ فطرت کے اس البیلے رازداں کی پیش گوئی کے عین مطابق:)

مجھے یقین تھا کہ مجھے قتل کر دیا گیا ہے
انھوں نے کیفوں، قبرستانوں اور گرجا گھروں کو کھنگالا
پیپے اور کھانے کی الماریاں کھولیں۔ انھیں ٹٹولا
تین ڈھانچوں کو
ان کے سونے کے دانت نکالنے کے لیے
شکست و ریخت کیا
مگر میں انھیں نہ ملا
میں کبھی بھی انھیں نہ ملا
نہیں!
میں انھیں کبھی نہ ملا

لورکا اور پیٹوفی کے احوال و انجام میں حیرت انگیز مماثلت ہے۔ پیٹوفی کو "پیامِ مشرق" میں علاّمہ اقبال نے یوں خراجِ عقیدت پیش کیا ہے: (شاعرِ جوان مرگ ہنگری کہ در معرکۂ کارزار در حمایتِ وطن کشتہ شد۔ و نعشِ او نیافتند تا یادگارِ خاکی از و بماند)

نفسے دریں گلستاں ز عروسِ گل سرودی　　بہ دلے غمے فزودی، ز دلے غمے ربودی

تو بخونِ خویش بستی کفِ لالہ رانگارے
تو بہ آہِ صبحگاہی دلِ غنچہ را کشودی
بنوائے خودگم ہستی، سخنِ تو مرقدِ تو
بہ زمیں نہ باز رفتی کہ تو از زمیں نبودی

○

جب میں مر جاؤں تو
ایک گیٹار پہلو میں رکھ کر مرے
ریگِ دریا میں یا تو دبا دو مجھے
یا لٹا دو مجھے
بے تردّد، بلا پیش و پس
سنتروں کے پرانے گھنے جھنڈ میں،
پھولتے ہیں شگوفے جہاں ہر برس ؛

اس "وصیت" سے روسی نواگر آموساگیان AMO SAGIYAN کی "وصیت" یاد آتی ہے :

یارو! مرا تابوت بنانے کے لیے
کرنا نہ کسی پیڑ کو نذرِ تیشہ
مردوں کے لیے زندوں کو کرنا نہ تباہ
کر کے کسی پیڑ میں کوئی کھوہ تلاش
چپ چاپ مری لاش وہاں رکھ دینا
شاید کسی پیڑ بہار دن، بن کر شاخ
پھوٹوں ہرے پتوں کی قبا میں ملبوس !)

جانب داری

بنگلہ نظم

مجھے گھاس میں سے نظر آنے والا زہریلا سانپ اچھا لگتا ہے
کیونکہ اس کے چہرے پر منافقت کا نقاب نہیں
مجھے وہ اندھا آسیب اچھا لگتا ہے
کیونکہ وہ کسی خر دماغ نقاد سے زیادہ درد مند ہے
مجھے غضبناک بچھو کے ڈنک اچھے لگتے ہیں
کیونکہ ان سے جو تکلیف ہوتی ہے
وہ کسی دھوکے باز منگیتر کے گلابی بوسوں سے کہیں خوش گوار ہے
میں گھنے تاریک جنگل کے وحشی شیر کو پسند کرتا ہوں
کیونکہ وہ بدمست ڈکٹیٹر کی سفاک حکمتِ عملی سے ناقف ہے

شمس الرحمٰن / ادیب سہیل

الہلال رپورٹ

شمالی امریکہ کی ادبی اور سماجی سرگرمیاں

اٹاوا

نیشنل فیڈریشن آف پاکستان کینیڈینز کے لیے انتخابات دارالحکومت آٹوا میں منعقد ہوئے جس میں کینیڈا کے تمام اہم شہروں کے وفود نے نمائندگی کی۔ اس ضمن میں فیڈریشن نے دو روزہ پروگرام ترتیب دیا تھا جس کے پہلے دن کانفرنس اور ورکشاپ کا انعقاد ہوا جن کا موضوع "مردوں اور عورتوں کے لیے ملازمت کے یکساں حقوق" تھا۔ اس میں خواتین و حضرات کے الگ الگ گروپ نے حصہ لیا۔

ظہرانے میں آٹوا کے ممبر پارلیمنٹ مائک ہرب نے تقریر کی جب کہ بنکویٹ کے اہم مقررین میں کینیڈا کے ہائی کمشنر جناب سید محمد مراد خیری اور سینیٹر وزیر انڈرے ہاروی شامل ہیں۔ دوسرے دن فیڈریشن کے انتخابات کے نتائج یوں ظاہر ہوئے:
صدر: رشید چودھری (کیلگری)۔ سینیئر نائب صدر: آصف شجاع (ٹورانٹو) نائب صدر محمد اکرم رانا (وِنی پیگ) سکریٹری سابر پنوں (وینکوور) خازن: جمال جعفری (ٹورانٹو) اور جوائنٹ سکریٹری سلمیٰ صدیقی (آٹوا) انتخابات کے اس اہم موقعے پر کینیڈا میں پاکستانی سفیر خیری صاحب نے تمام وفود کو ظہرانے کے لیے اپنی قیام گاہ پر مدعو کیا

ٹورانٹو

فعال ادبی، ثقافتی اور سماجی ادارے رائٹرز فورم آف پاکستانی کینیڈینز کے نومنتخب ڈائرکٹرز سید خورشید عالم، مسلم حسنی، تسلیم الٰہی زلفی، اشفاق حسین اور عابد جعفری نے فورم کی سرگرمیوں کا آغاز ایک نہایت پروقار اور خوبصورت تقریب سے کیا اور ٹورانٹو میں اعلیٰ معیار کے ہوٹل ولینگٹن پارکس میں "شامِ عالی" منائی۔ ممتاز ترین شاعر، محقق، دانشور اور اردو کے سرگرم پروموٹر جناب جمیل الدین عالی کے اعزاز میں منائی جانے والی اس تقریب میں معززینِ شہر، اہلِ علم، اہلِ ادب، اہلِ ذوق اور اہلِ ہنر کے علاوہ اکابرین و کے ممبر آف پارلیمنٹ مسٹر ڈیرک لی اور قونصل جنرل پاکستان جناب و بیگم الطاف طارق نے بھی شرکت کی۔ اس موقع پر کینیڈین اکیڈمی آف لیٹرز "بجر" کی جانب سے ادب کے حوالے سے عالی جی کی نمایاں خدمات کے اعتراف میں لوح ایوارڈ اور ایک ہزار ڈالر بھی پیش کیے گئے۔

اس تقریب میں جناب جمیل الدین عالی نے اپنے خطاب میں اپنی ادبی خدمات، سرگرمیوں اور اہلِ قلم کی فلاح و بہبود کے حوالے سے روشنی ڈالی جب کہ بیدار بخت، تسلیم الٰہی زلفی، اشفاق حسین، پروفیسر عبدالقوی ضیا اور صدر محفل مسٹر ڈیرک لی

نے عالی جی کے فن و شخصیت کے حوالے سے اپنے خیالات کا اظہار اور خراجِ تحسین پیش کیا۔ آخر میں مہمان خصوصی جناب جمیل الدین عالی اور دوسرے شہروں سے آئے ہوئے مہمان شعرا محترمہ تسیم سید اور عبد القوی ضیا صاحب سے ان کا کلام سنا گیا۔

مانٹریال

اردو کونسل کینیڈا کے زیرِ اہتمام ممتاز غزل گو شاعر جگر مراد آبادی مرحوم کے صد سالہ جشنِ یوم ولادت کے موقع پر مانٹریال میں ایک "بیادِ جگر مراد آبادی" مشاعرے کا اہتمام کیا گیا جس میں برصغیر کے نامور مہمان شعرا جمیل الدین عالی، حمایت علی شاعر، محسن بھوپالی اور جون ایلیا نے شرکت کی۔ جب کہ نیویارک سے حنیف اخگر، ٹورانٹو سے تسلیم الٰہی زلفی اور جوش مندوزئی اور کینگسٹن سے تسیم سید شریک تھیں۔ اس تقریب کی صدارت پاکستان کے ہائی کمشنر جناب سید محمد مراد خیری صاحب نے فرمائی جب کہ نظامت تسیم سید کی تھی۔ تقریب کا آغاز رفعت نور نے استقبالی تقریر سے کیا جب کہ برکات ہاشمی نے جگر مراد آبادی کے فن و شخصیت پر ایک اچھا مضمون پڑھا۔ مقامی شعرا میں ارشد نعیم، رفعت نور، سفیان علوی، حسان علوی، احمال منتظر اور ڈاکٹر محمد ذکی نمایاں تھے۔

مانٹریال

بزمِ ادب مانٹریال کے زیرِ اہتمام ایک پُروقار مشاعرے کا انعقاد عمل میں آیا جس کی صدارت ٹورانٹو کے معروف شاعر اور فعال ادبی شخصیت حفظ الکبیر قریشی صاحب نے کی جب کہ مہمانِ خصوصی ٹورانٹو ہی کے جناب تسلیم الٰہی زلفی اور افضل امام صاحب تھے۔ اس محفلِ مشاعرہ کی نظامت شفیق علوی صاحب نے کی جب کہ مقامی شعرا اور سامعین کی خاصی تعداد نے شرکت کی۔

ڈیٹرائیٹ

حلقۂ اربابِ قلم ڈیٹرائیٹ کے زیرِ اہتمام ایک بڑے مشاعرے کا اہتمام کیا گیا جس میں پاکستان کے مہمان شعرا جمیل الدین عالی، حمایت علی شاعر، محسن بھوپالی اور جون ایلیا کے علاوہ نیویارک سے حنیف اخگر، ٹورانٹو کے اختر آصف، افضل امام، حفظ الکبیر قریشی اور کنگسٹن کی تسیم سید نے شرکت کی۔ مشاعرے کی صدارت جناب حنیف اخگر اور نظامت عروج اختر زیدی صاحب نے کی

واشنگٹن

علی گڑھ اولڈ بوائز ایسوسی ایشن کی جانب سے حسبِ روایت اس مرتبہ بھی ایک شاندار مشاعرے کا اہتمام کیا گیا جس میں مقامی اور بین الریاستی شعرا کے علاوہ ہندوستان سے جگن ناتھ آزاد، برطانیہ سے افتخار عارف اور پاکستان سے پیرزادہ قاسم نے شرکت کی جب کہ ٹورانٹو سے اشفاق حسین شریک تھے۔

لاس اینجلس

اردو مرکز انٹرنیشنل نے حسبِ دستور اپنے سالانہ مشاعرے اور تقریبِ ایوارڈ کا اہتمام کیا۔ اس مرتبہ ۱۹۸۹ء کی بیرونِ پاک و ہند شائع ہونے والی جس شعری تخلیق پر ایوارڈ دیا گیا وہ حسن جمیل (سویڈن) کا شعری مجموعہ "حرف پر رکھتے ہیں" ہے۔ اس سلسلے کی دوسری تقریب محفلِ مشاعرہ تھی جس میں جگن ناتھ آزاد، پیرزادہ قاسم اور سلیم کوثر کے علاوہ دیگر معروف شعرا و شاعرات نے بھی شرکت کی۔

رفتارِ ادب

محاسنِ کلام ——— مؤلف: محمد زبیر فاروقی شوکت الہ آبادی
صفحات: ۱۸۹۔ قیمت: ۴۰ روپے
پتا: محمد زبیر فاروقی ۱۰۔ جی۔ بلاک ۲، پی سی ایچ سوسائٹی ۲۹

جناب شوکت الہ آبادی اردو زبان و ادب کی بے لوث خدمت میں نصف صدی گزار چکے ہیں۔ ان کی زیرِ تبصرہ کتاب "محاسنِ کلام" حال ہی میں شائع ہوئی ہے۔ اس سے پہلے تاریخ گوئی اور علم عروض سے متعلق دو اہم کتابیں منظرِ عام پر آ چکی ہیں۔
"محاسنِ کلام" گیارہ فصلوں پر محیط ہے جن میں موضوع کے تمام پہلوؤں کا نہایت جامعیت کے ساتھ احاطہ کیا گیا ہے۔ مختلف عنوانات اور ذیلی عنوانات کے تحت فصاحت، بلاغت، علم معانی، علم بیان، علم بدیع، ضرب الامثال، محاورات، تشبیہات، استعارات وغیرہ کی تعریف کی گئی ہے۔ پھر الفاظ کی صحت، اہمیت و ماہیئت پر بسیر حاصل بحث ہے۔ اردو زبان کے قواعد اور دیگر متعلقہ فن کا تفصیل سے بیان ہے۔ آخری فصل میں اردو زبان کی اہمیت و مقبولیت کا ایک اجمالی جائزہ ہے جب کہ دسویں فصل میں اصنافِ ادب پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ اس طرح کتاب کو افادیت و معنویت کے اعتبار سے زیادہ سے زیادہ معلومات افزا اور کارآمد بنانے کی کوشش کی گئی ہے۔
جناب شوکت الہ آبادی نے جس خلوص اور لگن کے ساتھ یہ کتاب تالیف کی ہے وہ لائقِ تحسین ہے۔ بلاشبہ یہ اردو ادب کے طلبہ اور شائقین کے لیے ایک مفید کتاب ہے۔

(ڈاکٹر وقار راشدی)

قائدِ اعظم کی کہانی (بچوں کے لیے) ——— مصنف: مختار زمن
صفحات: ۱۰۴۔ قیمت: ۱۵ روپے
پتا: قائدِ اعظم اکادمی۔ کراچی

"قائدِ اعظم کی کہانی" اور مختار زمن کی زبانی۔ اب آپ ہی سوچیے اس میں کیا کچھ نہ ہوگا بچوں کی دلچسپی کے لیے ——— کتاب کا آغاز یوں ہوتا ہے کہ ایک دادی اماں اپنے پوتوں اور پوتیوں کو قائدِ اعظم کی کہانی دس قسطوں میں سناتی ہیں۔

ے پالنے سے شروع ہوتی ہے اور بہت سے موڑ کاٹتی ہوئی قائداعظم کی وفات پر ختم ہوتی ہے۔ دادی اماں سے ان قسطوں کو
ے ہوئے بچوں کی دل چسپیاں برابر قائم رہتی ہیں۔ اور بچے بیچ بیچ میں سوال بھی کرتے جاتے ہیں۔ دادی اماں کہانی کہانی
قائداعظم، تحریکِ پاکستان، پاکستان کے لیے برصغیر پاک و ہند کے مسلمانوں کی جدوجہد اور مملکتِ پاکستان کا قیام سب کچھ
بتی ہیں۔

یہ کہانی کوئی اور کہتا تو شاید اتنی موثر اور حقیقی نہ ہو پاتی۔ اس کے دو واضح اسباب ہیں، ایک یہ کہ مختار زمن تحریک
ستان کے اندر کے آدمی تھے۔ اور اس دوران میں وہ آل انڈیا مسلم اسٹوڈنس فیڈریشن کے جنرل سکریٹری اور نائب صدر رہے
یہ کہ اللہ نے انھیں باغ و بہار طبیعت اور شگفتہ قلم عطا کیا ہے۔ ان کی بوڑھوں میں بوڑھے، جوانوں میں جوان اور بچوں
بچے نظر آنے والی شخصیت نے ان سے بچوں کے لیے ایک خوبصورت اور دل چسپ کتاب لکھوا دی ہے۔ اس کتاب کو پڑھتے ہوئے
بار بار "ذکر اس پری وش کا اور پھر بیاں اپنا" یاد آیا ہے ـــــ آخر قائداعظم بھی تو قوم کے محبوب تھے!

حقیقت یہ ہے کہ قائداعظم کا مطالعہ اس نوعیت سے اب تک نہیں کیا گیا۔ یہ اپنی طرز کی پہلی کتاب ہے۔ اس طرح کی کتاب
لکھ سکتا ہے جس میں اتنی بہت ساری خوبیاں جمع ہوں۔ یعنی وہ باغ و بہار طبیعت رکھتا ہو، شگفتہ قلم ہو، تحریکِ پاکستان کا
ل فرد بھی رہا ہو، تحریکِ پاکستان سے عشق بھی کیا ہو اور قائداعظم اس کا محبوب بھی ہو۔

بچوں کے لیے ایک عرصے سے اس طرح کی کتاب کی ضرورت محسوس کی جا رہی تھی جو انھیں قائداعظم اور تحریکِ پاکستان سے
طرح آگاہ کر دے۔ "قائداعظم کی کہانی" یہ احسن یہ فریضہ انجام دیتی ہے۔ مختار زمن اس اچھی تصنیف کے لیے سارے پاکستان
توں اور ان کے والدین کی طرف سے مبارک باد کے مستحق ہیں۔

(ا۔س)

ک کتھا انوکھی ــــــــــ مصنّف: ڈاکٹر وزیر آغا

صفحات: ۹۶۔ قیمت: ۴۰ روپے
پتا: ۲۶، ستلج بلاک۔ اقبال ٹاؤن، لاہور

"اک کتھا انوکھی" ڈاکٹر وزیر آغا کا ساتواں شعری مجموعہ ہے۔ اس میں اسی عنوان سے ایک طویل نظم ہے اور باقی مختصر
ں ہیں۔ اس سے پہلے ڈاکٹر صاحب کی ایک طویل نظم کی کتاب "آدھی صدی کے بعد" منظرِ عام پر آکر مقبول ہو چکی ہے۔ اردو
ھی جانے والی طویل نظموں میں یہ ایک عمدہ اور مثالی اضافہ ہے۔

"اک کتھا انوکھی" کی زبان ہندی آمیز بلکہ اگر آپ کہیں کہ اس کی زبان گنگا جمنی ہے تو غلط نہ ہوگا۔ اس انوکھی کتھا کا
جنگل سے ہوتا ہے جو روئے زمین پر انسان کا پہلا گھر تھا۔ پھر یہ کتھا مختلف مراحل اور مناظر سے گزرتی ہوئی اس خواہش
ب پر ختم ہوتی ہے جو ایک تخلیق کار عمر بھر دیکھتا رہتا ہے۔ امید اور روشن مستقبل کا خواب ۔ نظم کے آخر میں اس خواب
ں میں جو مصرعے لکھے گئے ہیں وہ اس نظم کا کامیاب اختتامیہ ہیں۔ اور گہرے تاثر کے حامل بھی ـــ

.... میری آنکھ بھی

کشتی کا بہروپ بھرے
پال اٹھا کر
نورانی موجوں پر سفر کر کے
بجھے ہوئے اس میرے قلم کی
نوک پہ بھی اک

پر بیت جتنے
شبنم ایسے
لفظ کا دیپ جلے !!
اک لفظ کا دیپ جلے !!

ڈاکٹر صاحب ویسے تو ہیں دل و دنیا کے شاعر لیکن وہ دنیا بھی دل کے حوالے سے یا دل کی راجدھانی میں دیکھنا چاہتے ہیں اس لیے ان کی تخلیقات کی ساری فضا داخلی اور عمودی ہے۔ ان نظموں کے مزاج کے بارے میں اگر کچھ کہا جائے تو یہی کہا جا سکتا ہے کہ یہ نظمیں تیز بارش کا نہیں بلکہ ترشح کا احساس دلاتی ہیں۔ ان میں تیز گامی کا نہیں بلکہ سبک خرامی کا لطف آتا ہے۔ ڈاکٹر صاحب باہر سے ایک ایسا خطہ آب ہیں جو پرسکون ہے لیکن اس کے اندر ریل پیل کی ایک دنیا آباد ہے جس کا آب و رنگ تجسس اور تجربے سے تیار ہوتا ہے۔

ڈاکٹر صاحب نے کتاب کے دیباچے میں جو کچھ لکھا ہے اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ اپنے شعری سفر میں نہ دائرے کو اپنانے کے حق میں ہیں نہ ان کے لیے خطِ مستقیم قابلِ قبول ہے۔ ان کا خیال ہے کہ زندگی کا ہر قدم ایک نئے منظر سے متعارف کراتا ہے، اور چند قدم کی یافت بعض اوقات تمام عمر کی بافت سے بڑھ کر ہوتی ہے۔ ڈاکٹر صاحب ایک اور سفر کا ذکر بھی کرتے ہیں۔ اسے عمودی کا نام دیتے ہیں اس کے مقابل افقی سفر کو لاتے ہیں، ان کا داخلی سفر پاتال تک پہنچنا چاہتا ہے۔ عمودی سفر، پُراسراریت کے آخری سرے تک جانے کے اشتیاق میں تمام درمیانی مراحل کا لمس حاصل کرنا چاہتا ہے۔ اور افقی سفر اپنے گرد و نواح کا دامن زمین و آسمان کے مقام اتصال تک پھیلانا چاہتا ہے۔ مختصر یہ کہ ڈاکٹر صاحب کی نظم نگاری امکانات کی متنوع گذرگاہ کو نظر میں رکھتی ہے۔ ان کی تخلیق کاری اور ادارت سے جدید نظم کے فروغ کو بڑی تقویت پہنچی ہے اور بہت سی جہات کا اضافہ ہوا ہے۔

کتاب خوبصورت چھپی ہے۔ موجد کا سرورق بامعنی اور دیدہ زیب ہے۔

(ا۔س)

درو بست ——— مصنف: خالد اقبال یاسر

صفحات: ۸۸ ۔ قیمت مجلد ۱۲۵ روپے، غیر مجلد ۱۰۰ روپے

پتا: ابلاغ ۷۳۳ ۔ آئی ۔ ۱/۴ اسلام آباد

خالد اقبال یاسر نے اپنی کتاب "درو بست" کو اپنے جدِ امجد "دُلا بھٹی" کے نام معنون کیا ہے، دلا بھٹی کا تعلق شہنشاہ اکبر کے دور سے تھا، انھوں نے اپنے دور کے جبر کے خلاف آواز اٹھائی اور مار کر مقتول ہوئے۔ اس آواز کی دھمک خالد اقبال یاسر کی شاعری میں مختلف النوع انداز سے ظاہر ہوئی ہے۔

وقت بھی اس کو نہیں تھا زین کسنے کے لیے
لشکرِ جرّار آتا تھا نہتے کے لیے

جھلک دکھاتا تھا شہ جھروکے سے گاہے گاہے
اسی سے خلقِ خدا کی تسکین ہو رہی تھی

ہوئی تھی دیوارِ قصر حد سے بلند کیسی | وہ کنگرے پہ کسی نے پھینکی کمند کیسی

خالد صاحب کو فکر کی یہ دولت اور تیور جس کا اظہار ان کے اشعار میں ہوا ہے، ورثے میں ملا ہے۔ اس میں لہو کی بھی کارفرمائی ہے۔ اِس ورثے نے ان کی شاعری میں جا بجا یہ آن بان دکھلائی ہے۔

تو اگر تخت پہ یاسر متمکن ہوتا | سلطنت کے لیے تکریم کا ضامن ہوتا
امرا کیسے محلات نہ خالی کرتے | ایک خیمے میں شہنشاہ جو ساکن ہوتا
کوئی دربان نہ محافظ نہ مقرب نہ غلام | کھلے صفحوں کی طرح ظاہر و باطن ہوتا

ان اشعار کو پڑھ کر یہ محسوس ہوتا ہے کہ اس کے شاعر کا اپنا ایک خواب ہے عملی مساوات کا خواب، ایک ایسے نظامِ حکومت کا خواب جہاں معاشی و معاشرتی زندگی میں شاہ و گدا کا فرق باطل ہو، ایک ہی صف میں محمود و ایاز کھڑے نظر آئیں۔ جہاں آدمی قدغن میں بسر نہ کرتا ہو، اور اس کو باٹ گھاٹ میں ہر طرح کا تحفظ فراہم ہو اور کوئی فرد احساسِ خوف سے پیچھے مڑ مڑ کر دیکھتا ہوا نہ۔

خالد اقبال یاسر کے ان تینوں اشعار سے بار بار میرا ذہن دورِ فاروقی کی طرف بھی گیا ہے۔ وہ اپنے اشعار میں جن اقدار کا ذکر کرتے ہیں وہ دورِ فاروقی میں من وعن موجود تھیں۔ میں تو مذکورہ اشعار کو خالد صاحب کے شعری سفر کا "مینی فیسٹو" مانتا۔

خالد اقبال یاسر اپنے تیز نظر کے باوجود اپنے اشعار میں رسان رسان سے قدم بڑھاتے ہوئے نظر آتے ہیں اور قاری کو دھیمے پن کا احساس دلاتے ہیں۔ یہ اس لیے ممکن ہوسکا ہے کہ وہ خود بالطبع متین ہیں۔ دراصل انسان کے مزاج کی بہت سی پرتیں اور بہت سے SHADES ہوتے ہیں۔ انھیں سے انسان کے افعال و اعمال میں تنوع پیدا ہوتا ہے۔

ممکن ہے ابتدا میں اشیا کو نئے زاویے سے دیکھنے اور شعر کی فضا میں نیا پن پیدا کرنے کے لیے کسب سے گزرنا پڑا ہو اس لیے کہ کسی شے کا مزاج بنتے بنتے بنتا ہے لیکن اب یہی باتیں خالد اقبال یاسر کی شاعری کا اختصاص بن گئی ہیں۔ اس اختصاص کو مصرعوں کی ساخت، ردیف و قوافی کے استعمال اور لفظوں کے انتخاب میں صاف محسوس کیا جاسکتا ہے۔

مختصر یہ کہ خالد کی شاعری بصری طمانیت بھی پیدا کرتی ہے، معنویت بھی ابھری نہیں۔ سیانوں نے شاعری کی دو قسمیں بتائی ہیں، ایک سُننے کی اور دوسری پڑھنے کی۔ خالد کی شاعری پڑھنے کی ہے۔

کتاب خوبصورت شائع ہوئی ہے۔

(ا۔س)

مولانا ابوالکلام آزاد، آثار و افکار ــــــ مؤلف: پروفیسر محمود واجد ہاشمی

صفحات: ۱۲۰۔ قیمت: ۲۵ روپے

ادارہ تحقیقاتِ افکار و تحریکاتِ ملی پاکستان، کراچی

"مولانا ابوالکلام آزاد ــ آثار و افکار" پروفیسر محمود واجد ہاشمی کی تالیف اور ادارۂ تحقیقاتِ افکار و تحریکاتِ ملی پاکستان نے سلسلۂ مطبوعات، آزاد کی پائیسویں کتاب ہے۔ ایک عرصے سے یہ کتاب نایاب کی حد تک کم یاب تھی۔ اس لحاظ سے اگر دیکھا جائے تو عام لوگوں کے نزدیک اس کی افادیت و اہمیت اشاعتِ اوّل ہی جیسی ہے۔ اس کے بارے میں فاضل

دیباچہ نگار ڈاکٹر ابو سلمان شاہجہان پوری لکھتے ہیں:

"پروفیسر محمود واحد ہاشمی نے تالیف و تدوین کے سلیقے اور ادبی ذوق سے کام لے کر ایک عمدہ تالیف کے سانچے میں ڈھال دیا ہے۔ یہ ان کا علمی کارنامہ ہے۔ اور علمی و ادبی حلقوں اور مولانا ابوالکلام آزاد سے ارادت رکھنے والوں میں قدر کی نگاہ سے دیکھا جائے گا۔"

کتاب مذکور میں مولانا کے ۷۲ خطوط اور درسِ قرآن حکیم کے "نوٹس" شامل ہیں۔ یہ خطوط انھوں نے اپنے ایک شاگرد و رفیق خاص محمد ابراہیم زکریا کے نام لکھے ہیں جو ۱۹۱۲ء سے ۱۹۵۱ء تک کے عرصے پر پھیلے ہوتے ہیں۔ مولانا کے درسِ قرآنِ حکیم کا تعلق بھی ابراہیم زکریا بھاگلپوری سے ہے۔ زکریا صاحب کی شخصیت عالمانہ بھی ہے اور سیاسی بھی۔ محمود واحد نے تفصیل سے اس کا احاطہ کیا ہے۔ زکریا صاحب سے ان کا ایک انٹرویو نہ صرف کتاب کو دلچسپ بناتا ہے، بلکہ اس سے زکریا صاحب کی زندگی کے مختلف گوشوں پر بھی روشنی پڑتی ہے۔

جیسا کہ کتاب کے مندرجات میں بیان ہوا ہے۔ مولانا آزاد کے یہ خطوط ان کے دوسرے مطبوعہ ذخیرۂ خطوط میں اس لیے سب سے اہم ہیں کہ اعلیٰ علمی و فکری مناہج رکھنے کے ساتھ ساتھ خطوط نگاری کے فنی تقاضے پر بھی ہر طرح پورے اترے ہیں۔ ان خطوط کے ذریعے مولانا کی زندگی کے بعض حالات اور سیرت کے بعض پہلوؤں پر اہم روشنی پڑتی ہے۔ اور شاید پہلی بار ان کی ازدواجی زندگی کا وہ رخ سامنے آتا ہے جو بہرحال خوشگوار نہیں کہا جا سکتا۔ لیکن مولانا نے زندگی کے اعلیٰ مقاصد کی خاطر اپنی نصف بہتر کی طرف سے حاصل ہونے والی تلخی و ترشی کو تندِ مکرر بنا لیا۔ یہی انسان کی بڑائی ہے۔

اس کتاب میں افسانہ نگار محمود واحد کا ایک اور رخ سامنے آیا ہے یعنی مؤلف و محقق کا رخ۔ تحقیق و تالیف کا یہ رخ جاری رہنا چاہیے کہ یہ بھی اپنے اندر افادیت کے گوناگوں پہلو رکھتا ہے۔

(ا۔س)

اقبال (عبداللہ قریشی نمبر) ــــــــــ مدیر اعزازی: ڈاکٹر وحید قریشی

صفحات: ۲۴۴۔ قیمت: ۲۵ روپے

پتا: بزمِ اقبال۔ کلب روڈ، لاہور

ادب میں کچھ نام ایسے ہیں جو اپنی بے غرض ادبی خدمات کے سبب خموشی سے لوگوں کے دلوں میں جگہ بناتے چلے جاتے ہیں۔ ایسا ہی ایک نام محمد عبداللہ قریشی کا ہے۔ ان کا نام زبان پر آتے ہی دل میں بے اختیار جذبۂ احترام جاگ اٹھتا ہے۔ اس بات کی تصدیق ان تمام مضامین سے بھی ہوتی ہے جو اقبال کے اس نمبر میں شامل ہیں۔

وہ ڈاکٹر سید عبداللہ اور مولانا غلام رسول مہر ہوں، یا احمد ندیم قاسمی اور میرزا ادیب یا دوسرے محترم مقالہ نگار سب نے محمد عبداللہ قریشی پر لکھتے ہوئے ان کی گراں قدر علمی خدمات، ان کی درویشی، ان کی بے غرضی اور استغنائے طبع کا ضرور ذکر کیا ہے۔

ڈاکٹر سید عبداللہ اپنے رشحاتِ گرامی میں عبداللہ قریشی کے بارے میں رقم کرتے ہوئے ان کے دو خاص موضوعات کی نشاندہی کرتے ہیں جن کے لیے وہ عمر بھر شغف سے کام کرتے رہے۔ ایک کشمیر کی تاریخ و ثقافت، دوم علامہ اقبال کی حیات

اور کارنامے۔ کشمیر کے ضمن میں رسالہ "ادبی دنیا" کا پانچ سو صفحات پر پھیلا ہوا کشمیر نمبر ہے جو عبداللہ قریشی کی ادارت اور محنتِ شاقہ کا ایک زندہ جاوید ثبوت ہے۔ اس موضوع پر اس قدر جامع اور مبسوط نمبر اس سے پہلے دیکھنے میں نہیں آیا۔

اقبالیات کے سلسلے میں ڈاکٹر فرمان فتح پوری نے اپنے مضمون میں باقیاتِ اقبال، آئینۂ اقبال، روحِ مکاتیبِ اقبال، معاصرین اقبال کی نظر میں، مکاتیبِ اقبال بنام گرامی، حیاتِ اقبال کی گمشدہ کڑیاں، کا ذکر کیا ہے۔ اس کے ساتھ ان کے علمی کارناموں کو بھی بڑی محبت سے دہرایا ہے۔ "معرکۂ اسرارِ خودی" بھی ان کا ایک کارنامہ ہے۔

پروفیسر محمد اسلم نے عبداللہ قریشی کے ایک اور اہم ادبی کام کی طرف اشارہ کیا ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ قدیم لاہور کے بارے میں جتنی معلومات قریشی صاحب کو ہیں اتنی شاید ہی کسی لاہوری کو ہوں گی۔ لاہور کے ساتھ ان کی اس دلچسپی نے ان سے "نقوش" کا لاہور نمبر مرتّب کرایا۔

مولانا علم الدین سالک اور محمد عبداللہ قریشی کے ہمہ وقت ساتھ دیکھے جانے کا ذکر قریب قریب تمام شرکائے نمبر نے کیا ہے۔ اور خود عبداللہ قریشی نے اس ہمہ وقت یکجائی سے جو علمی فائدہ و فیض حاصل کیا اس کا کھلے دل سے اعتراف کیا ہے۔ اس اعتراف سے مولانا علم الدین سالک کی قدر و قیمت اور ان کی عالمانہ سطح کا اندازہ ہوتا ہے۔

احمد ندیم قاسمی نے ان دو بزرگوں کے ہر وقت ایک ساتھ دیکھے جانے پر لاہور کے حلقوں میں زبان زد ایک لطیفہ سنایا ہے۔ وہ یہ کہ اگر پروفیسر علم الدین سالک اکیلے آتے جاتے دکھائی دے جائیں تو سمجھ لیجیے کہ وہ پورے علم الدین سالک نہیں، آدھے علم الدین سالک ہیں۔

کلیم اختر صاحب نے اپنے مضمون میں عبداللہ قریشی کی کشمیر سے محبّت کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے کہ وہ جوانی میں ڈوگرہ راج کی نظر سے بچے رہنے کے لیے نشاط کاشمیری کے قلمی نام سے کشمیر کے مسائل پر لکھا کرتے تھے۔ ریاست کشمیر کے تمام صفِ اوّل کے رہنما آج بھی عبداللہ قریشی کی ان خدمات کو بہ نظر استحسان دیکھتے ہیں۔

اقبال کے عبداللہ نمبر کے دوسرے شرکا محمد اسحاق بھٹی، سیّد نظر زیدی، ڈاکٹر غلام حسین اظہر، کلب علی خان فائق، ڈاکٹر وقار راشدی، ڈاکٹر قمصام حسین جعفری، کسریٰ منہاس، م۔ ع سلام، حبیب کیفوی اور رحیم گل کے مضامین بھی محمد عبداللہ قریشی کی شخصیات کے مختلف گوشوں کو ظاہر کرتے ہیں۔

مختصر یہ کہ بزمِ اقبال کے سہ ماہی مجلّے "اقبال"، نے اپنا جولائی تا ستمبر ۱۹۹۰ء کا شمارہ عبداللہ قریشی کے لیے مختص کر کے اور ان کی زندگی ہی میں ان کی خدمات کا اعتراف کر کے ایک بہت اہم فریضہ ادا کیا ہے۔ اس کے لیے ڈاکٹر وحید قریشی اور ان کے دوسرے قریبی رفقا قابلِ مبارک باد ہیں۔

(ا۔ س)

رعنا اقبال

خبر و پیش

بمن میں چینی ادیبوں کی آمد

گزشتہ دنوں چینی ادیبوں کا ایک آٹھ رکنی وفد پاکستان کے سرکاری دورے پر آیا جس نے پاکستان کے مختلف شہروں
دورہ کیا۔ اکادمی ادبیات پاکستان اس وفد کی میزبان تھی۔ مختلف شہروں کا دورہ کرنے کے بعد یہ وفد کراچی آیا۔ جہاں
ن ترقی اردو نے اس کے اعزاز میں ایک استقبالیہ ترتیب دیا۔

انجمن کے صدر جناب نورالحسن جعفری کی صدارت میں منعقد ہونے والے استقبالیے میں چینی وفد کے اراکین کے علاوہ
بنی قونصل خانے کے کلچرل اتاشی یو آن شوائے اور مقامی ادیبوں، شاعروں اور دانشوروں نے شرکت کی۔ ڈاکٹر اسلم فرخی نے
ہمان ادیبوں اور مقامی ادیبوں کا تعارف کرایا۔ بعد ازاں انجمن نے ایک پنج ستارہ ہوٹل میں ظہرانہ ترتیب دیا۔ اکادمی
دبیاتِ پاکستان اسلام آباد کے ڈپٹی ڈائریکٹر جناب خالد اقبال یاسر اور اکادمی کے علاقائی ڈائریکٹر مقیم کراچی آغا نور محمد پٹھان
بھی اس تقریب میں شریک تھے۔

ماریشس کے جناب عنایت حسین عیدن کی انجمن میں آمد

ماریشس سے جناب عنایت حسین عیدن اپنی شریکِ حیات بیگم ریحانہ عیدن کے ساتھ انجمن ترقی اردو (پاکستان)
کے دورے پر تشریف لائے۔ کچھ دیر صدرِ انجمن جناب نورالحسن جعفری کے ساتھ مختلف ادبی مسائل پر تبادلۂ خیال کیا۔ اس موقع
پر بیگم و جناب عیدن نے انجمن کے کتب خانے دیکھے اور انجمن کے رسالوں اور مطبوعات کے بارے میں معلومات حاصل کیں۔
واضح رہے کہ جناب عنایت حسین عیدن ماریشس میں اردو کے سینئر لیکچرار اور بیگم ریحانہ عیدن اردو کی ڈپٹی ہیڈ ٹیچر ہیں۔
گفتگو کے دوران عیدن صاحب نے بتایا کہ ماریشس میں اردو کے ساڑھے چار سو اساتذہ اسکولوں میں تدریس کے فرائض
انجام دے رہے ہیں۔ جب کہ اردو پڑھنے والے طلبہ و طالبات کی کُل تعداد تیس ہزار سے زائد ہے۔ جلد ہی یونیورسٹی کی سطح پر بھی
اردو کی تدریس کا آغاز ہونے والا ہے۔ عنایت حسین عیدن صاحب بے یونیشنل اردو انسٹی ٹیوٹ کے جنرل سکریٹری
بھی ہیں، کہا کہ یہ انسٹی ٹیوٹ بیس سال سے قائم ہے۔ اس کے تحت اردو کی ترویج و اشاعت کے لیے مختلف قسم کے جلسے

منعقد کیے جاتے ہیں جن میں مشاعرے، مذاکرے اور اسٹیج ڈرامے خاص اہمیت کے حامل ہیں۔ علاوہ ازیں اس ادارے کے تحت جامعہ اردو کے امتحانات کی تیاری بھی کرائی جاتی ہے۔ انھوں نے بتایا کہ مارینٹیس سے ایک رسالہ "جستجو" کے نام سے شائع ہوتا ہے اس کے علاوہ ابھی حال ہی میں وہاں سے عیدن صاحب کے یک بابی ڈراموں کا مجموعہ "زندہ گزٹ" کے نام سے شائع ہوا ہے جس کی حیثیت رسمی کتابوں سے قطع نظر مارینٹیس سے شائع ہونے والی پہلی ادبی کتاب کی ہے۔

سیف الملوک پر شفیع عقیل کے لیے ایوارڈ

محکمۂ اطلاعات و ثقافت حکومت پنجاب نے معروف صحافی اور ادیب شفیع عقیل کو ان کی کتاب "سیف الملوک" پر خوشحال خان خٹک ایوارڈ دیا ہے۔ واضح رہے کہ "سیف الملوک" میاں محمد بخش کی مشہور پنجابی مثنوی ہے جسے شفیع عقیل نے اردو میں منتقل کیا ہے۔ ترجمے کے ساتھ ساتھ شفیع عقیل نے اس مثنوی کے سلسلے میں تحقیق بھی کی ہے۔ یہ کتاب انجمن ترقی اردو پاکستان نے حال ہی میں شائع کی ہے۔ شفیع عقیل کا شمار عالمی لوک ادب کے ماہرین میں ہوتا ہے اور اس سلسلے میں مختلف ملکوں کے لوک ادب سے متعلق ان کی کئی کتابیں منظرِ عام پر آچکی ہیں۔ انجمن ترقی اردو (پاکستان) "سیف الملوک" سے قبل شفیع عقیل کی تین کتابیں علی الترتیب "چینی لوک کہانیاں"۔ "جاپانی لوک کہانیاں" اور "پنجابی کے پانچ قدیم شاعر" شائع کر چکی ہے۔ خوشحال خان خٹک ایوارڈ میں توصیفی سند کے ساتھ بیس ہزار روپے کی نقد رقم بھی شامل ہے۔

حکومت پنجاب نے "سیف الملوک" کے علاوہ تین اور کتابوں کو انعامات سے نوازا ہے۔ اظہر حسن ندیم کی کتاب "پنجاب میں کا تقابلی جائزہ" کو علامہ اقبال ایوارڈ دیا گیا جو تیس ہزار روپے اور توصیفی سند پر مبنی ہے۔ دوسری کتاب جو پنجاب آرٹس کونسل نے شائع کی "بلھے شاہ دا کلام" ہے۔ جس کو شاہ عبداللطیف بھٹائی ایوارڈ دیا گیا۔ یہ ایوارڈ بھی توصیفی سند کے علاوہ پچیس ہزار روپے نقد پر مشتمل ہے۔ اس کے علاوہ ڈاکٹر شہباز ملک کی کتاب "پنجابی ادبی جائزے" کو جام ایوارڈ کے تحت توصیفی سند اور مبلغ پندرہ ہزار روپے نقد سے نوازا گیا۔

آل انڈیا اردو ریسرچ اسکالرز کونسل کا قیام

حیدرآباد دکن (بھارت) میں ڈاکٹر یوسف سرمست (پروفیسر شعبۂ اردو جامعہ عثمانیہ) اور پروفیسر ثمینہ شوکت صدر شعبۂ اردو حیدرآباد سنٹرل یونیورسٹی) کی سرپرستی میں اردو ریسرچ اسکالرز کی ایک تنظیم "آل انڈیا اردو ریسرچ اسکالرز کونسل" کے نام سے قائم کی گئی ہے۔

سراج القادری کے اعزاز میں تقریب

مجلسِ تعمیرِ ادب سرگودھا کے زیرِ اہتمام بزرگ شاعر اور ادیب جناب سراج القادری کے اعزاز میں ایک تقریب پام سرگودھا پریس کلب میں کیا گیا۔ اردو کے معروف نقاد اور ادیب ڈاکٹر وزیر آغا مجلس کی صدارت کر رہے تھے۔ جناب

ج القادری کی شخصیت اور ان کے فن پر ادب کی ممتاز شخصیات نے اظہارِ خیال کیا۔ سرگودھا کے ڈپٹی کمشنر میاں نوقیر احمد ایڈیشنل کمشنر رفیق گل نے بھی تقریب میں شرکت کی۔

بزمِ فکرِ نو ڈنمارک کا سالانہ اجلاس

ڈنمارک کی فکری اور ادبی تنظیم "بزمِ فکرِ نو" کا اجلاس خواجہ محمد آصف کی صدارت میں منعقد ہوا نشست کا موضوع وزبان کے حوالے سے تھا۔ اجلاس میں اردو زبان کی اہمیت، افادیت، اردو کی پہچان، یورپ میں اردو کے مستقبل کے موضوعات ظہارِ خیال کیا گیا۔ بعد ازاں تنقیدی نشست کا آغاز ہوا جس میں ڈنمارک کے اردو ادیبوں اور شاعروں نے حصّہ لیا۔

قطر میں یومِ اقبال

مصورِ پاکستان علاّمہ اقبال کے ایک سو بارھویں یومِ پیدائش پر قطر میں ایک شاندار تقریب منعقد کی گئی۔ اس تقریب کا اہتمام پاکستان آرٹس سوسائٹی نے کیا تھا۔ پاکستانی سفارت خانے کے ناظم الامور جناب عمر خان علی شیرزئی نے صدارت کے فرائض انجام دیے۔ اس پر وقار تقریب میں علاّمہ اقبال کی شعری اور نثری تصنیفات سے اقتباسات پیش کیے گئے اور ان کے فن و شخصیت کے متعلق ایک کوئز پروگرام پیش کیا گیا۔ آخر میں صدرِ محفل نے حاضرین سے خطاب کیا۔

"برق و باراں" کی تقریبِ رونمائی

جوش مندوزئی کے شعری مجموعے "برق و باراں" کی تقریبِ رونمائی آرٹس کونسل کراچی کی ادبی کمیٹی کے زیرِ اہتمام انجام پذیر ہوئی۔ پاکستانی شاعر محمد عبداللہ خاں جو جوش مندوزئی کے نام سے متعارف ہیں، گزشتہ کئی برسوں سے کینیڈا میں مقیم ہیں۔ تقریب کی صدارت بہادر یار جنگ اکیڈمی کے صدر مہدی علی صدّیقی کر رہے تھے۔ نقاش کاظمی، جاذب قریشی اور خواجہ حمید الدین شاہد کے اظہارِ خیال کے علاوہ راغب مراد آبادی نے جوش مندوزئی کو منظوم خراجِ تحسین پیش کیا۔ مہدی علی صدّیقی نے اپنے صدارتی خطبے میں جوش مندوزئی کو محبِّ پاکستان قرار دیتے ہوئے مجموعے کی اشاعت پر انھیں مبارکباد کا مستحق ٹھہرایا۔

نیویارک میں بین الاقوامی مشاعرہ

ظفر زیدی کلچرل سوسائٹی نیویارک کے زیرِ اہتمام سالانہ بین الاقوامی مشاعرہ منعقد کیا گیا۔ محفلِ مشاعرہ کی صدارت پاکستان سے گئے ہوئے شاعر ثمر نظامی نے کی جب کہ رفعت سلطان مہمانِ خصوصی تھے۔ پاکستانی شعرا کے علاوہ بھارت سے کرن سنگھ بیدی، ماریشس سے صابر گوڈر اور شاہ نواز سواتی، کینیڈا سے ڈاکٹر سعید صدّیقی، پنسلوانیا سے طلعت اشارت، نیوجرسی سے رشیدہ عیاں، کنیکٹ سے سعید جعفری کے علاوہ مقامی شعرا کی ایک بڑی تعداد نے مشاعرے میں اپنا کلام سُنایا۔

رائٹرز فورم آف پاکستان کینیڈا بینز کے انتخابات

اردو ادب کی ترویج و ترقی کے لیے پچھلے دس سال سے ٹورانٹو (کینیڈا) میں ایک بین الاقوامی شہرت یافتہ ادارہ مصروفِ عمل ہے۔ اس ادارے کا نام رائٹرز فورم آف پاکستان کینیڈا بینز ہے۔ اس فورم کے دستور کے مطابق انتخابات کا انعقاد ہوا جس میں پانچ ڈائریکٹرز کا انتخاب عمل میں آیا۔ جن میں اشفاق حسین، تسلیم الٰہی زلفی، عابد جعفری، سیّد خورشید عالم، اور مسلم حسینی شامل ہیں۔ منتخب ہونے والے ڈائریکٹرز کو مختلف شعبے تفویض کیے جائیں گے تاکہ سارے امور ذمہ داری اور خوش اسلوبی سے انجام پذیر ہو سکیں۔

مسرور انیس کے اعزاز میں جدّہ میں مشاعرے

جدّہ میں مقیم پاکستانی شاعر مسرور انیس کی وطن واپسی کے موقعے پر جدّہ میں ان کے اعزاز میں دو مشاعروں کا اہتمام کیا گیا۔ احبابِ ادب کی بڑی تعداد نے مسرور انیس سے اپنے خلوص اور قربت کا ثبوت دیا۔ شاعر موصوف کے اعزاز میں پہلا شاعرہ رشید عالم صدیقی کی رہائش گاہ پر منعقد کیا گیا جس کی صدارت کرنل حسن السعودی نے کی جب کہ دوسرا مشاعرہ نسیم سحر کی اقامت گاہ پر انعقاد پذیر ہوا۔ اور معروف ادب نواز شخصیت سید محسن باغزال نے صدارت کے فرائض انجام دیے۔ دونوں شاعروں میں بڑی تعداد میں شعرا نے اپنا کلام نذرِ سامعین کیا۔

سڈنی سے بزمِ اردو کا اجرا

انجمن ترقی اردو سڈنی (آسٹریلیا) نے بزمِ اردو کے نام سے ایک سہ ماہی ادبی رسالے کا اجرا کیا ہے جس میں دنیا بھر کے اردو ادیبوں اور شاعروں کی تخلیقات کے علاوہ آسٹریلیا میں مقیم محبانِ اردو کی سرگرمیاں اہتمام کے ساتھ شائع کی جاتی ہیں۔ بزمِ اردو کے تازہ شمارے میں جگن ناتھ آزاد، حیات اللہ انصاری، حمیدہ احسن مدنی، شمیم اسحاق، ناظم تائب، افسر ساجد وغیرہ کی نگارشات شامل ہیں۔ بزمِ اردو کی مدیرہ کنیز فاطمہ ہیں۔

انجمن ترقی اردو سرگودھا کا اجلاس

انجمن ترقی اردو سرگودھا کا ایک خصوصی اجلاس جناب اختر سرحدی کی زیرِ صدارت منعقد ہوا جس میں مشہور خاکسار میاں بشیر احمد مرحوم کے صاحبزادے اور صوبہ سرحد کی معروف ادب نواز شخصیت میاں جمیل احمد صدیقی کے اچانک آنکھوں کی بینائی سے محروم ہو جانے پر رنج و ملال کا اظہار کیا گیا۔ اجلاس میں ایک قرارداد کے ذریعے صوبہ سرحد کی حکومت، مقتدرہ قومی زبان، اکادمی ادبیاتِ پاکستان اور ہمدرد فاؤنڈیشن سے اپیل کی گئی کہ وہ میاں جمیل صدیقی کے لیے اندرونِ ملک و بیرونِ ملک علاج معالجے کے سلسلے میں تعاون کریں۔

ڈاکٹر اے۔ بی اشرف کی ترکی روانگی

اردو کے مشہور نقاد اور شعبۂ اردو بہاؤالدین ذکریا یونیورسٹی ملتان کے صدر پروفیسر ڈاکٹر اے۔ بی۔ اشرف ترکی کے لیے روانہ ہوگئے۔ جہاں وہ تدریس کے فرائض انجام دیں گے۔ ترکی روانگی کے وقت پروفیسر عرش صدیقی نے ڈاکٹر اے۔ بی اشرف کے اعزاز میں ایک عشائیہ ترتیب دیا جس میں ملتان کے ادیبوں، شاعروں اور اساتذہ نے شرکت کی۔

علامہ شبلی نعمانی کی ۷۷ ویں برسی

پاکستان نیشنل سینٹر کراچی میں شاعر، نقاد، مؤرخ اور سیرت نگار علامہ شبلی نعمانی کی ۷۷ ویں برسی منائی گئی۔ اس کی صدارت تحریکِ آزادی کے نامور رہنما اور معروف اہلِ قلم مولانا اسمٰعیل ذبیح نے انجام دی۔ اس موقع پر سید شمس الحسن علی پاکستانی اور نبیرۂ شبلی سفیان جنید نعمانی کے علاوہ پروفیسر ڈاکٹر ابوالخیر کشفی اور پروفیسر میر حامد علی نے شبلی نعمانی کی علمی و ادبی خدمات اور ان کے تاریخی کردار پر روشنی ڈالی۔

ڈاکٹر ابوالخیر کشفی نے کہا کہ شبلی نے دو انقلابوں ۱۸۵۷ء اور ۱۹۱۴ء کے درمیان زندگی گزاری اور خود ایک انقلاب برپا کر گئے۔ مولانا اسمٰعیل ذبیح نے اپنے صدارتی خطبے میں کہا کہ شبلی ادبی لحاظ سے علم وفن کے امام اور اسلامی خدمات کے حوالے سے مینارۂ نور تھے۔

سید صباح الدین عبدالرحمٰن کی تیسری برسی

مجلسِ علومِ اسلامیہ کے زیرِ اہتمام معروف ادیب، مؤرخ اور دارالمصنفین اعظم گڑھ کے ناظم مولانا سید صباح الدین عبدالرحمٰن کی تیسری برسی منائی گئی جس کی صدارت صبیح محسن نے انجام دی جب کہ ڈاکٹر غلام محمد مہمان خصوصی تھے۔ نظامت اور ابتدائی کلمات پروفیسر سید فخرالحسن نے انجام دیے۔ برسی کے موقعے پر پروفیسر ڈاکٹر ابراہیم خلیل، ڈاکٹر غلام محمد اور صبیح محسن نے مرحوم مؤرخ کی شخصیت اور خدمات کا جائزہ لیا جب کہ عبدالغنی شمس نے انھیں منظوم خراجِ عقیدت پیش کیا۔

حسن اجمل مسرت انتقال کر گئے

اردو کے ممتاز شاعر حسن اجمل مسرت آئرلینڈ کے ایک مشہور شہر ڈبلن میں انتقال کر گئے۔ وہ آئرلینڈ کے ایک فرم میں مینجنگ ڈائرکٹر کے عہدے پر فائز تھے۔ مرحوم کا مجموعۂ کلام "فروزاں" کراچی اور لندن سے شائع ہو چکا ہے۔ اس کے علاوہ انھوں نے مغربی ادبیات کے کچھ شہ پارے بھی اردو میں منتقل کیے ہیں۔

نسیم دہلوی (ہرالا) انتقال کر گئے

معروف شاعر نسیم دہلوی کراچی میں انتقال کر گئے۔ نسیم دہلوی کا اصل نام سید مظفر حسین زیدی تھا۔ مرحوم ایک اچھے شاعر تھے خصوصاً ان کی تضمینیں بڑی مقبول تھیں۔ نسیم دہلوی 'ہرالا' کے نام سے فلموں میں اداکاری بھی کرتے تھے۔

حرفِ تازہ

کتابیں

محاسنِ کلام ____________ مؤلفہ: محمد زبیر فاروقی شوکت الہ آبادی
مضامین
صفحات: ۱۸۹۔ قیمت: ۴۰ روپے
پتا: ۱۰۔ جی۔ بلاک ۲۔ پی ای سی ایچ سوسائٹی، کراچی ۲۹

دیوانِ مہ لقا چندا ____________ مرتبہ: شفقت رضوی
شاعری
صفحات: ۱۵۴۔ قیمت: ۳۵ روپے
پتا: مجلسِ ترقی ادب ۲۔ نرسنگھ داس، کلب روڈ۔ لاہور

زندہ گزٹ ____________ مصنف: عنایت حسین عیدن
ڈرامے
صفحات: ۱۰۱۔ قیمت: درج نہیں
پتا: مہاتما گاندھی انسٹی ٹیوٹ موکا۔ ماریشس

تجدیدِ وفا ____________ مصنف: نور بریلوی
شاعری
صفحات: ۱۶۰۔ قیمت: ۵۰ روپے
پتا: نور بریلوی R/۵۹۴/۹ دستگیر۔ ایف۔ بی۔ ایریا کراچی ۳۸

شبنم اور پھول ____________ مصنف: ڈاکٹر محمد محسن
شاعری
صفحات: ۱۳۶۔ قیمت: ۲۵ روپے
پتا: بک امپوریم، سبزی باغ پٹنہ (بھارت)

زاوئیے ____________ مصنف: ڈاکٹر محمد محسن
لسانیاتی و ادبی مضامین
صفحات ۱۵۲۔ قیمت: ۳۰ روپے
پتا بک امپوریم، سبزی باغ پٹنہ (بھارت)

قائدِاعظم کی کہانی ____________ مصنف: مختار زمن
بچوں کے لیے
صفحات: ۱۰۴۔ قیمت: ۱۵ روپے
پتا: قائدِ اعظم اکادمی، کراچی

سویرے سویرے — مصنف: نذیر ناجی
کالم
صفحات: ۴۱۴۔ قیمت: ۲۲۰ روپے
پتا: میک ماسٹر، میاں چیمبرز۔ ۳۔ ٹمپل روڈ، لاہور

خطباتِ مدنی — مرتّبہ: احمد سلیم
خطبات
صفحات: ۲۰۴۔ قیمت: ۹۹ روپے
پتا: نگارشات، میاں چیمبرز۔ ۳۔ ٹمپل روڈ، لاہور

میٹھا پانی — مصنّف: سیّد ضمیر جعفری
خاکے
صفحات: ۲۱۸۔ قیمت: ۱۰۰ روپے
پتا: فیروز سنز پرائیوٹ لمیٹڈ لاہور، راولپنڈی، کراچی

مقالاتِ فیض — مرتّبہ: شیما مجید
مقالات
صفحات: ۱۸۱۔ قیمت: ۱۰۰ روپے
پتا: فیروز سنز پرائیوٹ لمیٹڈ لاہور، راولپنڈی، کراچی

کلیاتِ ساحر — مرتّب: پیرزادہ عاشق کیرانوی
شاعری
صفحات: ۴۶۸۔ قیمت: ۱۳۰ روپے
پتا: المسلم پبلشرز اردو بازار، کراچی

نمکدان — مصنّف: مجید لاہوری
شاعری
صفحات: ۳۱۲۔ قیمت: ۱۵۰ روپے
پتا: جنگ پبلشرز، لاہور

موجِ ہوائے شام — مصنّف: شفیع حیدر دانش
شاعری
صفحات: ۱۲۶۔ قیمت: ۵۰ روپے
پتا: مکتبہ عالمین بی ۳۶۱۔ بلاک این، نارتھ ناظم آباد، کراچی ۳۳

زن، زر، زمین — مصنّف: واجدہ تبسم
ناول
صفحات: ۴۵۲۔ قیمت: ۱۵۰ روپے
پتا: سٹینزن پبلشرز، شیش محل، بلاسس اسٹریٹ، کراچی ۱

عینی — مصنّف: محمد محی الدین چودھری
ناول
صفحات: ۱۴۰۔ قیمت: ۶۰ روپے
پتا: دیپالی پبلیکیشنز سی ۱۸۷۔ اسٹاف ٹاؤن، جامعہ کراچی، کراچی

ڈاکٹر معاذ اشدی

نئے خزانے

گزشتہ سے پیوستہ

اس اشاریے کی ترتیب میں جولائی ۱۹۸۹ء تا اکتوبر ۱۹۸۹ء اور جنوری تا جون ۱۹۹۰ء کے رسائل وجرائد سے استفادہ کیا گیا

دوہانگاری اور اس کا فن

سمیع اللہ اشرفی، ڈاکٹر	ہندی پینگل کی مبادیات	نگار پاکستان	کراچی	جون	۱۹۹۰ء	ص ۹
سمیع اللہ اشرفی، ڈاکٹر	اردو دوہے کا فن	"	"	"	"	ص ۳۲
سمیع اللہ اشرفی، ڈاکٹر	چھیالیس یا چھپن حرفی دوہے	"	"	"	"	ص ۴۴
فرمان فتحپوری، ڈاکٹر	جمیل الدین عالی اور اردو دوہا نگاری	"	"	"	"	ص ۶۱

لسانیات

الفضا راللہ، ڈاکٹر	قدیم آریوں میں علم تحریر کا رواج	نقوش	لاہور	۱۳۸		ص ۶۰
خلیق انجم، ڈاکٹر	اردو املا، مسائل اور تجویزیں	ہماری زبان	دہلی	یکم جنوری	۱۹۹۰ء	ص ۸
شان الحق حقی	اردو اور سنسکرت	"	"	۱۵ جنوری	"	ص ۱
خواجہ/ مترجم تمکین زیدی	اردو ہندی تنازعہ	"	"	یکم "	"	ص ۳
گوپی چند نارنگ	کچھ ساختیات کے بارے میں	صریر	کراچی	فروری	"	ص ۱۵
محمد راشد ندوی، پروفیسر	ماضی اور حال کی عربی نثر نگاری کا ایک تنقیدی جائزہ ــ ۱	معارف	اعظم گڑھ	اپریل	۱۹۹۰ء	ص ۲۴۵
محمد راشد ندوی، پروفیسر	ماضی اور حال کی عربی نثر نگاری کا ایک تنقیدی جائزہ ــ ۲	معارف	اعظم گڑھ	مئی	۱۹۹۰ء	ص ۳۲۵
محمد رفیق احمد خان	ہندکو زبان تاریخ کے آئینے میں	تیرنگ خیال	راولپنڈی	مارچ	"	ص ۹

رہا جان طپش دہلوی	شمس البیان فی مصطلحات الہندوستان	نگار	کراچی	اپریل	۱۹۹۰ء	ص ۵
مظہر امام	ہندی میں اردو	ہماری زبان	دہلی ۲۲ر	فروری	〃	ص ۱
زبیر آغا، ڈاکٹر	ساختیات، احیا و ارتقا (قسط اول)	صریر	کراچی	〃	〃	ص ۸
زبیر آغا، ڈاکٹر	ساختیات، احیا و ارتقا (قسط دوم)	〃	〃	مارچ	〃	ص ۸

تحقیق و تنقید

سید یحییٰ نشیط ورد ہا، ڈاکٹر	اردو کی حمدیہ شاعری میں فلسفیانہ رجحان	معارف	اعظم گڑھ	فروری	۱۹۹۰ء	ص ۱۱۵
شاداک ذکی بدایونی	آتش کا ایک گمنام شاگرد الف خاں جولاں	روح ادب	کلکتہ	جنوری، مارچ	〃	ص ۵۵
صوفی عبدالرشید	مثنوی چشمۂ شیریں۔ ایک تعارف (قسط اول)	صحیفہ	لاہور	〃	〃	ص ۷
صوفی عبدالرشید	مثنوی چشمۂ شیریں۔ ایک تعارف (قسط دوم)	〃	〃	اپریل، جون	〃	ص ۲۷
عارف لکھنوی	دلچسپ ادبی حقائق	افکار	کراچی	جنوری	〃	ص ۲۲
عطا خورشید	رامائن کے اردو ترجمے	معارف	اعظم گڑھ	اپریل	〃	ص ۲۹۶
سماحی عبلا، ڈاکٹر	میر تقی میر اور آج کا ذوق شعری	قومی زبان	کراچی	مئی	〃	ص ۳۱
محمد رضا کاظمی	اردو میں حاشیہ نگاری	〃	〃	جون	〃	ص ۲۱
مختار الدین احمد، پروفیسر	مثنوی غلام رسول حسرت	جنرل خدابخش لائبریری، پٹنہ ۵۳ر			〃	ص ۱۹۹
مرزا حامد بیگ، ڈاکٹر	راشد الخیری اردو کا پہلا افسانہ نگار؟	ماہ نو	لاہور	جون	〃	ص ۷۲
منظور حسین شور، پروفیسر	دیوان شرقی کے پس منظر میں	آگہی	کراچی	مارچ	〃	ص ۱۱
منور مرزا، پروفیسر	ابوالاثر حفیظ جالندھری کی نعت نگاری	نقوش	لاہور ۱۳۸			ص ۹۳

تنقید فن تنقید

آفاق صدیقی	امر جلیل کی کہانیاں	قومی زبان	کراچی	جون	۱۹۹۰	ص ۶۵
ابوالکلام قاسمی، ڈاکٹر	عربی زبان میں ادبی تنقید کی روایت	نقوش	لاہور ۱۳۸			ص ۳۴۳
اسلم حنیف	ہماری شاعری پر ایک نوٹ	روح ادب	کلکتہ	جنوری، مارچ	۱۹۹۰ء	ص ۱۳
اسلوب احمد انصاری	حرفے چند[1]	قومی زبان	کراچی	جون	〃	ص ۱۱
اظہار صہبائی	اردو ناول کا ابتدائی سفر	طلوع افکار	〃	مئی	〃	ص ۳۰

---

[1] "نقد و نظر" علی گڑھ جلد ۸ شمارہ ۲/۱۹۸۶ء سے ماخوذ

انور خان	قرۃ العین حیدر کے مختصر افسانے	قومی زبان	کراچی	جون	۱۹۹۰ء	ص ۱۵
انور سدید، ڈاکٹر	میر انیس کے کلام	دائرے	"	فروری، مارچ	"	ص ۷
پروین پروازی، ڈاکٹر	دو ہائیکو مجموعہ کا تنقیدی جائزہ	طلوع افکار	"	مئی	"	ص ۲۳
جمیل جالبی، ڈاکٹر	انیس اور دبیر کی شاعری کا فرق	دانش	اسلام آباد	۲۰، ۲۱/	"	ص ۲۷۹
جوزف فرہنگ / سید نوری شاہ	جدید شعر و ادب میں مکانی حیثیت	قومی زبان	کراچی	مئی	۱۹۹۰ء	ص ۱۳
خورشید احمد	محمد عمر میمن کی کہانی "واپسی" ایک تجزیہ	صریر	"	سالنامہ جون	"	ص ۲۵۸
سعادت علی صدیقی، ڈاکٹر	مثنوی زہر عشق	قومی زبان	"	فروری	"	ص ۳۹
سلیم اختر، ڈاکٹر	سائنسی تنقید کے ممکنات	ماہ نو	لاہور	خصوصی شمارہ مارچ	"	ص ۴۸
سلیم اختر، ڈاکٹر	ناول، پس منظر اور پیش منظر	صحیفہ	"	اپریل، جون	"	ص ۳
سید معین الرحمن، ڈاکٹر	تاج کا ڈراما انارکلی	نقوش	"	۱۳۸	"	ص ۱۰۰
شمس الرحمن فاروقی	نئی اصطلاحیں	صریر	کراچی	سالنامہ جون	.	ص ۴۰
صباح مقبول حسین	تخلیق اور جمالیاتی اقدار	ماہ نو	لاہور	مئی	۱۹۹۰ء	ص ۳۷
عبدالسلام، ڈاکٹر	پس جدیدیت اور پس جدید ناول	دائرے	کراچی	جون	"	ص ۱۱
علی احمد فاطمی، ڈاکٹر	نئی تنقید کے نئے اقدار	طلوع افکار	"	مئی	"	ص ۱۳
غلام محمد	کہانیاں پرانی، باتیں نئی	دائرے	"	جون	"	ص ۲۰
فرمان فتحپوری، ڈاکٹر	کچھ میر انیس اور ان کے سلام کے بارے میں	ہماری زبان	دہلی	یکم جنوری	۱۹۹۰ء	ص ۲
کلیم سہسرامی، پروفیسر ڈاکٹر	اردو مرثیہ نگاری اور مرزا دبیر	روح ادب	کلکتہ	جنوری، مارچ	"	ص ۵
کلیم سہسرامی، پروفیسر ڈاکٹر	غیاث احمد گدی کے دو افسانوں کا فنی تجزیہ	دائرے	کراچی	مئی	"	ص ۶۸
مظفر مہدی، ڈاکٹر	صنف افسانہ نگاری	آگہی	"	"	"	ص ۶
نجیب جمال	راشد کی ایک نظم	صریر	"	سالنامہ جون	"	ص ۲۵۴
نظیر صدیقی	آزاد نظم کے بارے میں چند خیالات	دائرے	"	جون	"	ص ۷
وزیر آغا، ڈاکٹر	اردو تنقید کا مرد آہن	ادب لطیف	لاہور	فروری	"	ص ۵
وزیر آغا، ڈاکٹر	عصمت چغتائی کے نسوانی کردار	صریر	کراچی	سالنامہ جون	"	ص ۹
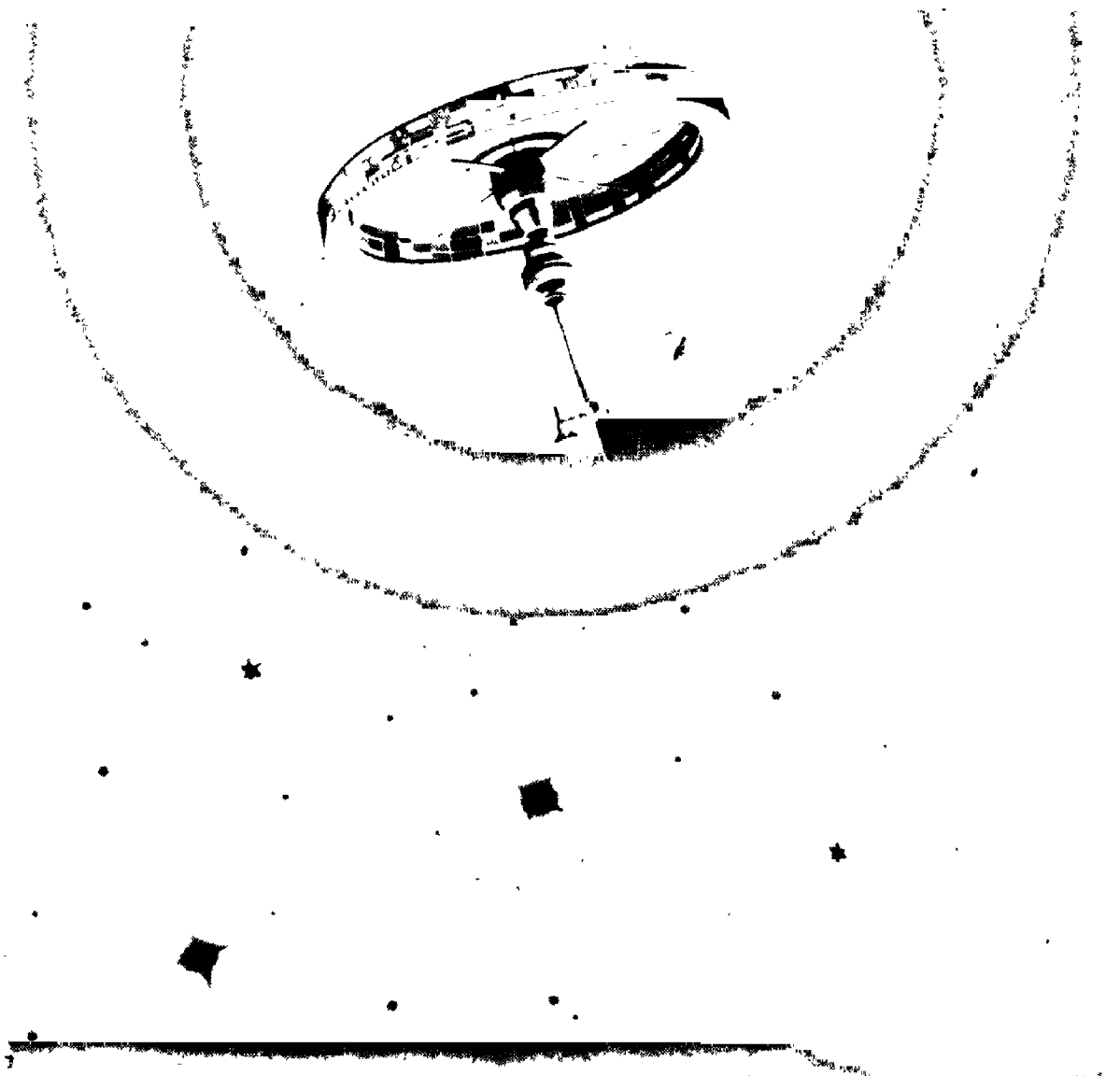
(جاری)

Regd M. No. 270 Phone: 724023

Monthly **QAUMI ZABAN** Karachi

انجمن کی مجوزہ عمارت کا نقشہ
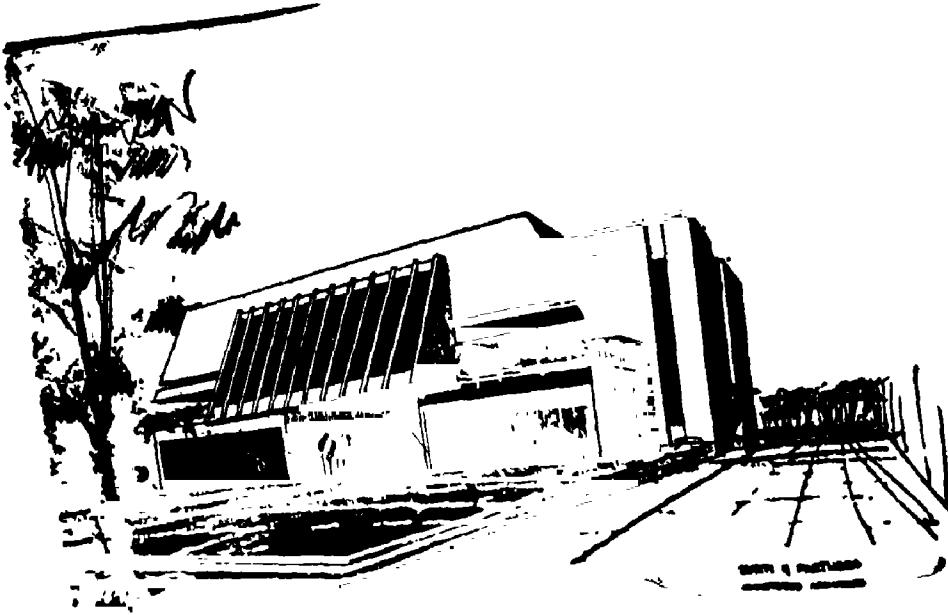
ایک خواب

جسے شرمندۂ تعبیر کرنے کے لئے ہر پاکستانی کے تعاون کی ضرورت ہے

مدیر: ادیب سہیل، طابع: مشہور آفسٹ پریس، مقام اشاعت: انجمن ترقی اردو پاکستان، بابائے اردو روڈ، کراچی نمبر ۱